شیطان کے پجاری
کاشف زبیر
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

شیطان کے پجاری

کاشف زبیر

عزم جوان ہو اور مقصد کے حصول کی لگن سچی ہو تو کامیابی قدم ضرور چومتی ہے۔ ایک ایسے ہی حوصلہ مند اور کھلی آنکھوں سے اپنے اطراف پر نظر رکھنے والے ذہین پولیس افسر کی کہانی جس نے محض اپنی ذہانت اور عزم صمیم کے ذریعے درندہ صفت مجرموں کی راہ کھوٹی کردی تھی۔

شیطان کی خوشنودی میں معصوم بچوں کا خون بہانے والے سفاک پجاریوں کا ماجرا

ایک تو سرما کی بارش اوپر سے گرج چمک۔ ہم اپنے اپنے بستر میں دبکے سردی سے کانپ رہے تھے اور گرج ہمارے دلوں کو دہلا رہی تھی۔ اس وقت میری عمر بارہ سال تھی اپنے والد رابرٹ کی میں تیسری اولاد تھا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ یہ 1914ء کی بات ہے اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی خاصی کم عمری میں ہو جاتی تھی۔ میری بڑی بہن جولیا کی شادی صرف سترہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی اس سے چھوٹی میلینا پندرہ سال کی تھی۔ امکان یہ تھا کہ ایک دو سال میں وہ بھی شادی کر کے اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی۔ میرے ماں باپ یعنی مارگریٹ اور رابرٹ سٹ کا کی شادی بھی خاصی کم عمری میں ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں دو جوان بچیوں اور ایک بیٹے کے ماں باپ اور ایک نواسے کے نانا نانی ہونے کے باوجود ابھی تک جوان نظر آتے تھے۔

امریکا کی سرحد سے ذرا فاصلے پر ہمارے علاقے کا شمار کینیڈا کے خوب صورت ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ اونچے پہاڑ۔ گھنے جنگلات اور مغرب میں خلیج الاسکا تھی۔ اس علاقے میں شہر اور قصبات بھی تھے لیکن ہمارا خطہ اسپن دیہاتی طرز کا تھا۔ تقریباً چالیس مربع میل کے علاقے میں چار ہزار افراد

آباد تھے۔ مگر سب گھر دور دور تھے۔ صرف چرچ، پوسٹ آفس اور شیرف کا دفتر قریب قریب تھے۔ یہ جگہ اسپن ٹاؤن کہلاتی تھی، کچھ امرا نے اپنے گھر اس جگہ بنا رکھے تھے لیکن باقی گھر اور اہم عمارتیں الگ الگ جگہوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں اسکول بھی تھے ہائی اسکول بھی۔ اسپتال اور بار از بھی تھے۔ علاقے کے باسیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت گزشتہ ایک سو سال میں پورے علاقے میں راستوں کا جال اس طرح بچھا دیا تھا کہ کہیں آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی تھی۔

موسم کے لحاظ سے یہ علاقہ معتدل تھا۔ مارچ سے جولائی تک بہار کا موسم ہوتا تھا۔ اگست اور ستمبر میں کسی قدر گرمی پڑتی تھی۔ اکتوبر میں موسم ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ نومبر سے لے کر فروری تک شدید سردی ہوا کرتی تھی۔ برف باری کم ہوتی تھی لیکن پورے سرما میں بے پناہ بارشوں کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا۔ یہ آخر نومبر کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ دوپہر سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ میں اسکول سے جلدی آ گیا تھا۔ میلینا ماں کے ساتھ کھانا بنا رہی تھی اور پاپا حسبِ معمول آتش دان کے سامنے کرسی پر جھول جھول کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ صبح وہ لکڑیاں چیر رہے تھے جب میں اسکول گیا تھا۔ پاپا حد سے زیادہ جفاکش اور محنتی شخص تھے۔ پورے علاقے میں ان جیسا کوئی شخص نہیں تھا۔ ان کا ایک چھوٹا سا فارم تھا جس پر وہ سرما میں مکئی اگاتے تھے اور اس سے مرغی اور ٹرکی کی پرورش کیا کرتے تھے۔ یہی پاپا کا بزنس تھا۔ ان پرندوں کے علاوہ دودھ دینے والی ایک گائے اور درجن بھر بھیڑیں بھی پاپا کے فارم کا حصہ تھیں۔ بھیڑوں کو گوشت کے لیے پالا گیا تھا۔ سرما کے آغاز میں پاپا چند بھیڑیں کاٹ کر ان کا گوشت تہ خانے میں بنے سرد خانے میں محفوظ کرلیا کرتے تھے اور ساری سردیوں میں ہم اس گوشت پر گزارا کرتے تھے۔ پاپا کا بزنس اچھا چل رہا تھا۔ اس لیے ہمارا شمار علاقے کے خوش حال گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ہمارے اس دو منزلہ مکان میں اس وقت سہولت کی ہر شے تھی۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ جولیا کے گھر کا ایک چکر لگاؤں گا۔ وہاں میرا بھانجا میکناز بے تابی سے میرا انتظار کیا کرتا تھا۔ ہمارا سارا گھر اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ جولیا ہفتے کی رات ڈنر ہمارے ہاں کرتی تھی اور اس رات کا ہم پورے ہفتے بے تابی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ کیونکہ جولیا کے ساتھ ننھا میکناز آیا کرتا تھا۔ درحقیقت ہم سب کو اس کا بے تابی سے انتظار ہوتا تھا۔ جولیا کا شوہر ہنری لکڑہارا تھا اور اس کی آمدنی بھی اچھی تھی۔ ہنری نے جولیا کو خوب صورت سے مکان میں پُرآسائش طریقے سے رکھا ہوا تھا۔ اس دن بارش کی وجہ سے میں اس کے مکان تک نہیں جا سکا۔

میرے کمرے میں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑی جلنے کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی لیکن سردی کی شدت ایسی تھی کہ میں بستر پر کمبلوں میں دبا کانپ رہا تھا۔ لگ رہا تھا آنے والا موسم سرما زیادہ ہی شدید ہوگا۔ اگر بارش کل بھی جاری رہتی تو پاپا کو زمین سے آلو اور شکر قندی نکالنے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑتا اور اگر کل یہ کام نہیں ہوتا تو آنے والے دنوں میں پاپا کو اکیلے ہی یہ کام کرنا پڑتا۔ کیونکہ مجھے صرف اتوار کے دن چھٹی ملتی تھی۔ اسکول کے بعد میں مقامی بڑھئی کے پاس جا کر کام کرتا تھا۔ وہاں میں کام بھی سیکھ رہا تھا اور اس کا مجھے کچھ معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔ مستقبل کے لیے میرا ارادہ فرنیچر ساز بننے کا تھا۔ ہمارے علاقے میں فرنیچر بنانے کے لیے درکار اعلیٰ معیار کی لکڑی افراط سے پائی جاتی تھی۔

لیکن اس رات نے نہ صرف میرا مستقبل بلکہ ہمارے خاندان کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ نصف رات کے قریب جب میں غنودگی میں تھا نیچے کسی نے شدت سے دروازہ بجایا۔ بارش کے شور میں ہلکی سی آواز میرے کانوں تک آئی۔ آنے والا اتنا بدحواس تھا کہ جب تک پاپا نے جا کر دروازہ نہیں کھولا وہ اسے بجاتا ہی رہا تھا۔ ”کیا بات ہے جم؟“ میں نے پاپا کی تیز آواز سنی۔ جم ہمارا پڑوسی تھا۔ جولیا کا مکان اس کے گھر سے سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن جم ہم سے کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر رہتا تھا۔ میں نے جم کی ہذیانی سی آواز سنی۔ میں اس کا مفہوم نہیں جان سکا تھا لیکن پاپا کی گرج دار آواز نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ میں جھٹکے سے بستر سے اٹھا اور سلیپر پیروں میں ڈالتا نیچے کی طرف بھاگا۔ میں نے پاپا کو کبھی اتنی بلند آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جب میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا مجھے مام کا بلند آواز سے رونا سنائی دیا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ضرور کوئی سانحہ ہو گیا تھا۔ میں نیچے پہنچا تو پاپا جم کو شانے سے پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ وہ بکواس نہ کرے۔

”خدا کی قسم!“ جم چلّایا ”میں نے کھڑکی سے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہنری کرسی پر پڑا تھا اس کی گردن کٹ گئی تھی اور جولیا اس کے پاس فرش پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ اس کی پشت میں چاقو پیوست تھا۔ اس سے زیادہ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ میں سیدھا تمہاری طرف بھاگا۔“

اس دوران میں پاپا خود پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے

مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''موبی جلدی سے تیار ہو کر آؤ ہمیں جولیا کے گھر جانا ہے۔ مجھے خوف ہے وہاں کوئی سانحہ ہو گیا ہے۔''

''میں بھی جاؤں گی۔'' مام چلّائیں۔

''تم گھر میں میلینا کے پاس رہو گی۔'' پاپا نے حتمی انداز میں کہا اور جم سے بولے ''کیا تم اتنی زحمت کرو گے کہ شیرف کو اس سانحے کی اطلاع دو؟''

جم نے سر ہلایا اور مڑ کر باہر نکل گیا۔ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے میں نے جا کر گرم کپڑے پہنے۔ اوور کوٹ لیا اور چھتری لے کر باہر آ گیا۔ مام اور میلینا لیونگ روم میں ایک دوسرے سے چپکی بیٹھی رو رہی تھیں۔ پاپا نے مام سے اندر سے دروازہ بند کرنے کو کہا اور انہیں سختی سے حکم دیا کہ جب تک کوئی جانی پہچانی بھروسے والی آواز نہ سنیں دروازہ نہ کھولیں۔ پاپا نے اپنی رائفل لے لی تھی اور پستول اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ مجھے پاپا نے کوئی ہتھیار لینے کو نہیں کہا تھا اس لیے میں ایسے ہی ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بارش کی شدت میں تیزی آ گئی تھی اور بجلی بھی زیادہ چمک رہی تھی۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ رات اتنی تاریک تھی اور موسلا دھار بارش نے ماحول اتنا دھندلا دیا تھا کہ پاپا کے ہاتھ میں موجود لیمپ بھی بیکار لگ رہا تھا۔ اس کی روشنی بس پاپا تک محدود تھی۔

بجلی کی گرج چمک کے سہارے ہم جم کے مکان تک پہنچے۔ جولیا اور ہنری کے مکان تک جانے کا راستہ الگ تھا لیکن وہ خاصا طویل تھا۔ جم کے مکان کے پاس سے شارٹ کٹ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا جم نے جو کہا تھا وہ سچ ہے یا وہ مذاق کر رہا تھا۔ جم کے مذاق مشہور تھے لیکن اس نے کبھی کسی سے اتنا بے رحم مذاق نہیں کیا تھا اور پاپا سے تو وہ ایسا مذاق کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ پاپا بے حد سنجیدہ شخص تھے۔ میں نے آج تک کسی کو ان سے مذاق کی جرأت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ جم کے فارم کے ساتھ چلتے چلتے ہم او پر واقع جولیا اور ہنری کے کیبن تک پہنچے۔ یہ چار کمروں کا پُرآسائش کیبن تھا اس کے سامنے والے حصے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ جن پر پردے نہیں تھے اور اندر کا سارا منظر صاف نظر آتا تھا جیسے ہی میں کیبن کے سامنے پہنچا اور میری نظر شیشے سے اندر پڑی تو مجھے اپنی چیخ روکنے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا۔ اندر پیٹرومیکس لیمپ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں کمرے کا سارا منظر واضح تھا۔ جم نے لفظ بہ لفظ جو بیان کیا تھا اندر ویسا ہی منظر تھا۔ ہنری اپنی آرام کرسی پر اس طرح دراز تھا کہ اس کا سر اوپر کی طرف اٹھا تھا۔ اس کا کٹا

ہوا گلا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی قمیص سینے سے خون میں تر بتر تھی اس کے پاس جولیا اس طرح فرش پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی کہ اس کی پشت میں بڑا سا شکاری چاقو دستے تک گھسا ہوا تھا۔ پاپا نے سامنے والے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ پاپا کے شانے یک دم ڈھلک گئے تھے اور وہ بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

میں کیبن کے دروازے پر گم صم کھڑا تھا۔ بلاشبہ ہنری اور جولیا مر چکے تھے۔ میں جولیا کی پشت میں لگے اس شکاری چاقو کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے بارہا ہنری کو اس چاقو سے مختلف کام کرتے دیکھا تھا۔ وہی چاقو جولیا کے دل میں اتر گیا تھا۔ اگر جولیا کو ہنری نے قتل کیا تھا تو ہنری کا گلا کس نے کاٹا تھا؟ اچانک پاپا چلائے۔

''میکناز کہاں ہے؟''

میں اندر کی طرف لپکا۔ میں نے ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ لیے لیکن وہاں مجھے کہیں میکناز نظر نہیں آیا۔ وہ پورے گھر میں کہیں نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں تھا۔ پاپا بھی دیوانہ وار اسے دیکھ رہے تھے۔ میکناز کی عمر ابھی صرف ایک سال اور ایک مہینہ تھی اور وہ از خود کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ یقیناً جس نے ہنری اور جولیا کا قتل کیا تھا وہی میکناز کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اچانک پاپا جیسے ہوش میں آگئے۔ انہوں نے میرا بازو پکڑا اور باہر آگئے۔

''ہمارے چلنے پھرنے سے ایسے نشان خراب ہوسکتے ہیں جو قاتلوں کی نشان دہی کرسکیں۔'' انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

پاپا نے کیبن کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ ہم برآمدے میں کھڑے ہو کر شیرف کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ اسپن ٹاؤن خاصے فاصلے پر تھا اور اوپر سے موسلا دھار بارش کا سلسلہ جاری تھا اس لیے اس کی آمد میں تاخیر ہو رہی تھی۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد شیرف اپنے ماتحتوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار آن پہنچا۔ شیرف جیراڈ بل مخلص اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے علاقے میں امن وامان قائم کر رکھا تھا۔

''رابرٹ کیا بات ہے۔ کیا جم درست کہہ رہا ہے؟'' شیرف جیراڈ نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

پاپا نے مشکل سے اثبات میں سر ہلایا ''ہاں...... یہ ایک تکلیف دہ سچ ہے...... کسی درندے نے میری بیٹی اور داماد کو مار دیا ہے...... اور میرا نواسا غائب ہے...... تم سب سے پہلے اسے تلاش کرو......''

شیرف نے یہ سنتے ہی اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ کیبن کے اردگرد پھیل کر میکناز کو تلاش کریں۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ معصوم میکناز از خود کہیں جا سکے' پھر بھی اسے تلاش کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد شیرف جیراڈ اپنے ڈپٹی وگ فیلڈ کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میں اور پاپا انہیں کھڑکی سے اپنا کام کرتے دیکھ رہے تھے پھر پاپا نے مجھے گھر جانے اور مام کو تسلی دینے کو کہا۔ میں وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن پاپا کے کہنے پر مجھے جانا ہی پڑا۔ ماما اور میلینا جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ جیسے ہی میں نے آواز دی۔ مام نے دروازہ کھول دیا اور انہوں نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں اور میلینا ان سے لپٹ گئے۔ جولیا ہماری بھی اس کی موت نے بلکہ جواں مرگی نے ہمارا دل چیر کر رکھ دیا تھا پھر میں نے مام اور میلینا کو بتایا کہ میں نے جولیا کے کیبن میں کیا دیکھا تھا وہ روتی رہیں۔ پھر مام نے چونک کر وہ سوال پوچھ لیا جس سے میں ڈر رہا تھا۔

''میکناز کہاں ہے۔ کیا قاتل نے اسے بھی؟''

''نہیں مام...... لیکن میکناز وہاں نہیں ہے۔ ہم نے اسے کیبن اور اس کے آس پاس ڈھونڈا تھا وہ کہیں نہیں ملا۔ پاپا کہہ رہے تھے کہ قاتل اسے لے گیا ہے۔''

یہ سن کر مام کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاپا بھی میکناز کی گمشدگی محسوس کر کے اسی طرح گم صم ہوگئے تھے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟ لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں اس بارے میں مام سے سوال جواب کرتا۔ ہم ساری رات جاگتے رہے اور جولیا کو یاد کر کے روتے رہے۔ ابھی دو دن پہلے ہی وہ ہنری اور میکناز کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی۔ میں میکناز سے کھیلتا رہا تھا۔ حتی کہ مام نے ڈانٹ کر مجھے سونے کے لیے بھیجا تھا کیونکہ صبح مجھے جلدی اسکول جانا ہوتا تھا اور آج وہ مر چکی تھی۔ میکناز غائب تھا۔

پاپا صبح کے قریب تھکے ہوئے آئے۔ ایک ہی رات میں وہ جیسے اپنی عمر سے دس سال آگے چلے گئے تھے۔ انہوں نے سست لہجے میں مام کو بتایا کہ ہنری اور جولیا کو کسی نامعلوم شخص نے انہی کے چاقو سے ہلاک کیا تھا اور وہ میکناز کو اغوا کر کے لے گیا۔ اس پر مام نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا ''مجھے ڈر ہے راب...... یہ وہی بات نہ ہو۔''

''نہیں...... نہیں......'' پاپا نے کمزور لہجے میں تردید کی۔ ''اس بات کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔''

''تم بھول رہے ہو۔ یہ وارداتیں ہر گیارہ سال بعد ہی ہوتی ہیں۔'' مام نے پرزور لہجے میں کہا۔

مام کی اس بات پر میں چونکا تھا۔ مجھے یاد آیا ہنری نے

ہی مجھے بتایا تھا۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران ہر گیارہ سال کے بعد علاقے میں شیر خوار بچوں کے اغوا کی وارداتیں ہوتی تھیں اور ان بچوں کا پھر کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ اغوا کرنے والوں کا مقصد عام طور سے صرف بچوں کا اغوا ہوتا تھا لیکن اگر ان کی راہ میں کوئی حائل ہوتا تو یہ اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کی وارداتوں میں کئی افراد مارے جا چکے تھے۔ لگ رہا تھا کہ جولیا اور ہنری بھی ان بچے اغوا کرنے والوں کا شکار ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر چار بار ہونے والی ان وارداتوں میں چودہ بچے اغوا ہوئے تھے۔

سب سے پہلے 1870ء میں بچے اغوا ہوئے اسی سال اسپن کو ٹاؤن کا درجہ ملا تھا۔ ایک ہی خاندان کے دو شیر خوار بچے اغوا ہوئے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ مردہ پائی گئی۔ اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ایک کسان کا دو سالہ بچہ غائب ہوا۔ وہ گھر سے باہر گھاس پر کھیل رہا تھا۔ اس کی ماں نے کچھ دیر بعد اسے غائب پایا پھر اس کا بھی پتا نہیں چلا۔ بچوں کے اس اغوا نے علاقے میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔ پولیس نے زور و شور سے تحقیق شروع کی لیکن مجرموں تک رسائی میں ناکامی کے بعد پولیس کا کام دھیما پڑتا چلا گیا، حتیٰ کہ کیس داخل دفتر ہو گئے۔

خاص بات یہ تھی کہ وارداتیں نومبر کے مہینے کے آخر میں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد 1881ء کے موسم سرما کے آغاز میں ایک بار پھر یہی واقعات دہرائے گئے۔ اس سال پانچ بچے اغوا ہوئے اور دو افراد قتل ہوئے۔ پانچ میں سے دو بچے ایک ہی گھرانے کے تھے اور جڑواں بہن بھائی تھے۔ ان بہن بھائیوں کے ماں باپ کو اغوا میں مزاحمت پر قتل کر دیا گیا۔ جیسے ہنری اور جولیا کو قتل کیا گیا تھا۔ اس رات بھی شدید بارش ہو رہی تھی اس لیے کوئی نہیں جان سکا کہ قاتل کون تھے۔ ابھی بچوں کے اغوا اور ان کے ماں باپ کے قتل کا واقعہ ہی مدھم نہیں ہوا تھا کہ دسمبر کی پہلی تاریخ کو تین شیر خوار بچے اپنے گھروں سے اغوا کر لیے گئے۔ یہ کام اتنی صفائی سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ بچوں کے ماں باپ اور رشتے دار بلبلا اٹھے تھے اس بار پولیس کے ساتھ مقامی رضا کاروں نے بھی زور و شور سے بچوں کی تلاش میں حصہ لیا لیکن کئی ہفتے تک جاری رہنے والی اس مہم کا نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔ مشتبہ افراد تفتیش اور پوچھ گچھ کے بعد بے گناہ ثابت ہوئے تھے۔

اس بار بچوں کی گمشدگی کے واقعات ملکی سطح پر مشہور ہوئے تھے۔ ٹورنٹو تک سے کئی بڑے نامہ نگار ہمارے علاقے میں آئے اور اس کیس کی کوریج کی۔ اخبارات نے سنسنی خیز سرخیاں لگائیں۔ مختلف قیاس آرائیاں کی گئیں۔ جیسے اغوا کرنے والے اصل میں بچوں کو بیچا کرتے تھے۔ وہ ان بچوں کے بدلے بے اولاد لیکن دولت مند جوڑوں سے بھاری رقوم وصول کرتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ مجرم کہاں سے آتے تھے اور بچوں کو اغوا کر کے کس راستے سے نکل جاتے تھے۔ اسپن میں آنے جانے کے چند ہی راستے تھے اور اغوا کی وارداتوں کے بعد ان راستوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی تھی اور ہر شخص کے سامان اور گاڑی کی تلاشی لی جاتی تھی۔ یہ شبہ ظاہر کرنے والے یہ دلیل دیتے تھے کہ اغوا کرنے والے امریکا کی طرف سے آتے تھے اور اپنا کام کر کے اسی طرف چلے جاتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ امریکا سے آنے والے مجرموں کو بھلا کیا معلوم کہ کس گھر میں شیر خوار بچے ہیں اور پھر وہ اتنی مہارت سے واردات کر کے کس طرح چلے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنانے کے لیے اسپن جیسے دور دراز اور غیر ملک میں واقع خطے کو کیوں منتخب کیا۔ دلیل دینے والے دلیل دیتے کہ اس لیے منتخب کیا کہ اسپن میں اکثر گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں اور ایک گھر میں ہونے والی واردات کا علم دوسرے گھر کو نہیں ہوتا۔ حیرت انگیز بات تھی آٹھ بچے اغوا ہوئے تھے اور اب تک تین قتل ہو چکے تھے لیکن کسی قاتل یا اغوا کرنے والے کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک افواہ بھی تھی کہ بچوں کا اغوا دراصل آدم خوروں کا کام ہے اور اس میں خاصا وزن بھی تھا۔ انیسویں صدی میں خاص طور سے یورپ میں اس قسم کے واقعات عام تھے جب کوئی ایک فرد یا گروہ آدم خوری پر اتر آیا۔ ان میں سے اکثر پکڑے گئے تھے اور انہوں نے کڑی سزائیں بھی پائی تھیں۔ امریکا میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے تھے جو کینیڈا کا پڑوسی ملک تھا۔ اس ملک میں زیادہ تر لوگ انگلینڈ اور فرانس سے آتے ہیں جہاں آدم خوری کے واقعات زیادہ ہوتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اسپن میں بھی آدم خور آ بسے ہوں اور وہ بچوں کو اغوا کر کے اپنی جبلت کی تسکین کر رہے ہوں۔ پولیس نے اس نقطہ نظر سے بھی چھان بین کی لیکن علاقے میں آباد کسی گھرانے پر شبہ نہیں کیا جا سکا کہ وہ آدم خوری کر رہا ہے۔ کم آبادی کی وجہ سے تقریباً سب ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ اگر کوئی خاندان اس بد عادت میں مبتلا ہوتا تو وہ زیادہ دن تک دوسروں کی نظروں

سے نہیں بچ سکتا تھا۔
وقت گزرنے کے ساتھ یہ واقعات دبتے چلے گئے اور لوگ انہیں تقریباً بھول گئے تھے مگر علاقے کے شیرف کے ذہن میں یہ واقعات تازہ تھے۔ 1892ء کا سال آیا اور سرما کا آغاز ہوا تو اسے یہ خوف ستانے لگا کہ پھر کہیں کوئی واردات نہ ہوجائے۔ اس وقت پہلی بار اسپن ٹاؤن میں مکمل پولیس اسٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ ورنہ پہلے صرف معمولی سی چوکی تھی جو امن وامان قائم رکھنے اور گرفتاری کے لیے تھی۔ کسی واردات کی صورت میں تفتیش کرنے کے لیے قریبی شہر سے پولیس کے ماہرین آتے تھے۔ اس وقت کے شیرف فنس بولارڈ نے سرما کے آغاز میں ہی علاقے میں رضا کاروں کی ٹولیاں بنادی تھیں جو گشت کرتی تھیں۔ شیرف نے علاقے کے لوگوں کو بھی خبردار کردیا تھا کہ پھر وہی وارداتیں دہرائی جاسکتی ہیں۔ لوگ بھی ہوشیار ہوگئے۔
مگر کرنے والے اپنی کر گزرے۔ سب سے پہلے مقامی لکڑ ہارے کا شیر خوار بچہ غائب ہوا۔ اس بچے کی ماں کی طبیعت خراب تھی۔ لکڑ ہارا گھوڑے پر بٹھا کر اپنی بیوی کو اسپن ٹاؤن کے اسپتال لے گیا تھا۔ گھر میں شیر خوار بچہ اور اس کا چار سالہ بڑا بھائی اکیلے تھے جب میاں بیوی واپس آئے تو مکان کی عقبی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی اور شیر خوار بچہ غائب تھا جب کہ بڑا بے ہوش پڑا تھا۔ ان پر قیامت گزر گئی۔ لکڑ ہارے نے فوری طور پر شیرف کو اطلاع دی۔ جب تک پولیس آئی ماں کی کوششوں سے بڑے بچے کو ہوش آگیا تھا اس نے صرف اتنا بتایا کہ سیاہ لباس پہنے ہوئے دو افراد کمرے میں آئے اور اس کے بھائی کو لے گئے پھر ایک نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور وہ سوگیا۔ بچے کی گردن پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لگتا تھا اسے کوئی چیز سونگھا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ پولیس نے آنے والوں کے نشانات تلاش کیے مگر عقبی حصے میں کوئی فنگر پرنٹ نہیں ملا۔
صبح ہوتے ہی بچے کے اغوا کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی اور لوگ لکڑ ہارے کے پاس افسوس کرنے کے لیے آنے لگے۔ انہی میں ایک میاں بیوی تھے جن کا گود کا بچہ تھا۔ یہ لڑکی تھی، ماں اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اس نے بچی کو اس کی گاڑی سمیت باہر دھوپ میں چھوڑ دیا اور جب وہ لکڑ ہارے کی بیوی کو تسلی دے کر واپس آئی تو اس کی اپنی بچی غائب تھی۔ پولیس مصیبت میں آگئی۔ اس کی موجودگی میں ایک اور بچے کا اغوا ہوگیا تھا۔ سرگرمی سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن کسی نے بھی کسی شخص کو بچی کو لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ سب حیران تھے کہ بچی درجنوں لوگوں کے درمیان سے کیسے غائب ہوگئی تھی۔
اس بار صوبائی دارالحکومت سے تفتیشی ماہرین آگئے جو خاص طور سے بچوں کے اغوا کے معاملات کے ماہر تھے۔ انہوں نے ایک ماہر نفسیات کی مدد سے لکڑ ہارے کے بڑے لڑکے سے پوچھ گچھ کی۔ اس سے اغوا کنندگان کا جو حلیہ سامنے آیا وہ خاصی حد تک شیطان کے پجاریوں سے ملتا تھا یعنی کالے رنگ یا اسی سے ملتے جلتے کسی گہرے رنگ کا ایسا چوغہ جس نے ان کے چہروں تک کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پھر بچے کا پراسرار انداز میں بے ہوش ہوجانا۔ شیطان کے پجاری ایسی نشہ آور اشیا رکھتے تھے جن کے سونگھنے سے ہی آدمی حواس گنوا دیتا تھا۔ محض نصف صدی پہلے برطانیہ میں ان لوگوں کا ایک گروہ پکڑا گیا تھا۔ یہ گروہ بھی بچوں اور کم سن دوشیزاؤں کے اغوا میں ملوث تھا۔ شیطان کے یہ پجاری اس کے حضور بچوں اور دوشیزاؤں کی قربانی دیا کرتے تھے۔ چار سالہ بچے کی شہادت کے بعد یہ بات پھر سے ابھر کر سامنے آگئی کہ ان وارداتوں کے پیچھے کوئی جرائم پیشہ نہیں بلکہ کوئی شیطانی گروہ سرگرم عمل ہے، جو مخصوص مقاصد کے تحت بچے اغوا کررہا ہے۔ مگر اکثر افراد محض ایک بچے کی شہادت پر اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا اس کام کے پیچھے کوئی خاص جرائم پیشہ گروہ ہے۔
چند گھنٹوں کے فرق سے دو شیر خوار بچوں کے اغوا نے علاقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اب جن جن کے گھر میں دودھ پیتے بچے تھے وہ مسلح ہوکر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب تک کی وارداتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اغوا کرنے والے صرف دو سال کی عمر تک کے بچوں کو اغوا کرتے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں نے اپنے بڑے بچوں کو بھی گھروں میں بند کرلیا تھا۔ بہت سارے بچوں کو اسکول جانے سے روک دیا گیا تھا۔ رات کے وقت مسلح رضا کاروں کی ٹولیاں گشت کرنے لگی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے نومبر کے مہینے میں کوئی اور واردات نہیں ہوئی۔ آخری بچے کے اغوا نے ثابت کردیا تھا کہ ان وارداتوں میں علاقے کا کوئی شخص یا گروہ ملوث ہے۔ لکڑ ہارے کے گھر آنے والے میاں بیوی کی بچی جب اغوا ہوئی تو وہاں پر کوئی اجنبی یا علاقے سے باہر کا فرد نہیں تھا۔ اس بات نے مزید سنسنی پھیلادی تھی کہ بچوں کا اغوا کنندہ اسی علاقے میں موجود تھا اور گزشتہ بائیس سالوں سے نہ صرف بچے اغوا ہورہے تھے بلکہ لوگ بھی مارے جارہے تھے اور کسی کو مجرموں کا سایہ تک نظر نہیں آیا تھا۔ لکڑ ہارے کے بچے کی گواہی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا وہ محض چار سال کا تھا اور اتنا

سا بچہ کسی کے بارے میں کیا بتا سکتا تھا۔

آنے والے عشرے میں ہمارے علاقے میں بھی ساری دنیا اور خاص طور سے شمالی امریکا کی طرح تبدیلیاں آرہی تھیں۔ ٹرین کی پٹری اسپن سے صرف چھ میل کے فاصلے سے گزرنے لگی تھی۔ ایک پختہ ہائی وے بھی وادی سے لگ کر جاتی تھی اس سے بیرونی دنیا سے روابط اور سفر کی سہولتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ علاقے میں تار اور بجلی کی سہولت آگئی تھی۔

اس عشرے میں ہمارے علاقے میں پہلی موٹر کار آئی تھی۔ ان ترقیوں اور پھر فرنیچر بنانے والے کارخانوں کے قیام سے روزگار کے مواقع بڑھے۔ دور دراز سے لوگ آکر اسپن میں آباد ہونے لگے۔ لیکن اسپن ٹاؤن کی آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لوگ اب بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر آباد تھے۔

1903ء کا سال اور نومبر کا مہینہ ایک بار پھر قیامت بن کر اسپن کے گھروں پر ٹوٹا تھا۔ اس بار دو ہفتے کے دوران میں پانچ مختلف گھرانوں سے پانچ بچے اغوا ہوئے یہ سب دو سال سے کم عمر اور شیر خوار بچے تھے۔ اغوا میں مزاحمت کرنے پر دو افراد مارے گئے۔ باقی تین بچوں کو ان کے گھروں سے اور ان کے پنگھوڑوں سے اتنی صفائی سے اغوا کیا گیا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ وارداتوں نے ایک بار پھر پورے علاقے میں صفِ ماتم بچھا دی تھی۔ صدیوں سے آس پاس رہنے کی وجہ سے سب ہی لوگ ایک دوسرے کے رشتے دار بن گئے تھے۔ اس لیے سب ہی نے بچوں کے اغوا کی تکلیف محسوس کی تھی۔ اسپن کی تاریخ میں پہلی بار لوگوں نے ردعمل کا اظہار کیا۔ مقامی حکومت کے خلاف جلسہ ہوا اور شیرف کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ حالانکہ وہ دیانت دار اور اپنی ذمے داری احسن طریقے سے پورا کرنے والا شخص تھا مگر اس معاملے میں اسے قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ حکومت نے اسے برطرف کر کے ایک اسپیشل ایجنٹ کو اس کیس کی تفتیش کے لیے بھیجا تھا۔

اسپیشل ایجنٹ جان ولیم برنی نے اس کیس میں بڑی جان ماری۔ خاصی عرق ریزی کی۔ بے شمار افراد سے انٹرویوز کیے۔ خود پورے علاقے میں پھرتا رہا جن گھرانوں کے بچے اغوا ہوئے تھے ان کے ماں باپ سے بیانات لیے اس نے اپنی کوششوں سے کیس کا ایک خاکہ بنا لیا تھا لیکن جب وہ کیس کی یہ فائل لے کر اسپن سے صوبائی دارالحکومت جا رہا تھا تو اس کی گاڑی حادثاتی طور پر سڑک سے نیچے کھائی میں گر گئی۔ جان ولیم برنی اس حادثے میں مارا گیا لیکن سب سے پراسرار بات یہ ہوئی کہ اس کی کار سے فائل غائب پائی گئی۔ اس بات نے پولیس کو بھی چکرا دیا تھا۔ قیاس کیا جانے لگا کہ ولیم برنی کی موت کا بچوں کے اغوا کرنے والوں سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔

جان ولیم برنی کی موت کے بعد حکومت نے ایک اور اسپیشل ایجنٹ بھیجا، لیکن اس میں ولیم برنی جیسی صلاحیتیں نہیں تھیں اس لیے اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے رہ کر وہ واپس دارالحکومت چلا گیا۔ اس دوران میں جیراڈ بل کو علاقے کا نیا شیرف مقرر کر دیا گیا تھا۔ نومبر پہلے ہی گزر چکا تھا اس لیے مزید کوئی واردات نہیں ہوئی۔

1903ء کا یہ سال لوگوں کے دلوں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ کتنے ہی عرصے تک علاقے میں کوئی تقریب نہیں ہوتی تھی۔ لوگوں نے سوگ میں پارٹیاں دینا بند کر دی تھیں لیکن رفتہ رفتہ حالات معمول پر آتے چلے گئے۔ لوگوں میں زندہ دلی لوٹنے لگی اور سال بھر کے اندر لوگوں نے اس سانحے کو تقریباً فراموش کر دیا تھا۔ اس سے اگلے سال میں پیدا ہوا تھا۔

1914ء کا سال پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا لیکن ہمارے علاقے میں اس سال کے آغاز سے ہی بچوں والے لوگ محتاط ہو گئے تھے۔ پچھلے چوالیس سال کی تاریخ ان کے پیش نظر تھی۔ لوگ اس بارے میں آپس میں بات نہیں کرتے تھے لیکن ان کے دلوں میں خوف سرسرا رہا تھا۔ خاص طور سے جن لوگوں کے شیر خوار بچے تھے وہ پریشان تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو مضبوط بنانے کی سعی شروع کر دی تھی۔ جن کے پاس اسلحہ نہیں تھا انہوں نے رائفلیں، پستول وغیرہ خرید لیے تھے۔ بچوں کی حفاظت کے لیے لوگوں نے کتے پال لیے تھے۔

پاپا نے اپنے گھر میں دو عدد السیشن...... پال رکھے تھے۔ حالانکہ ہمارے ہاں کوئی شیر خوار بچہ نہیں تھا۔ اس وقت ہم میکناز کو بھول گئے تھے۔ مام نے کئی بار دبے لفظوں میں پاپا اور ہنری کو مشورہ دیا کہ وہ میکناز کی حفاظت کے لیے اپنے کیبن کو مضبوط بنائے۔ یہ کیبن ہنری نے خود بنایا تھا اور اس کی تعمیر میں اس نے مضبوطی سے زیادہ خوب صورتی کو مدنظر رکھا تھا لیکن ہنری نے مام کا یہ مشورہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اور اب اس کا خمیازہ نہ صرف اس نے بلکہ جولیا نے بھی بھگتا تھا۔

نومبر کا مہینہ رفتہ رفتہ گزرتا چلا گیا اور جب اس کی آخری تاریخیں آگئیں تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان

پراسرار وارداتوں کا سلسلہ شاید ہمیشہ کے لیے رک گیا ہے مگر ہنری اور جولیا کے قتل اور میکناز کے اغوا نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ اگر یہ علاقے کے لیے دھچکا تھا تو ہمارے لیے شدید ترین دھچکا تھا۔ دو روز بعد جب جولیا اور ہنری کی تدفین تھی تو سارا علاقہ چرچ میں سمٹ آیا تھا۔ تدفین کے بعد لوگ وفد کی صورت میں شیرف جیراڈ بل کے پاس گئے اور اس سے مطالبہ کیا کہ قاتل اور اغوا کرنے والے کی گرفتاری کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں اور میکناز کو بازیاب کرایا جائے۔

بے چارہ شیرف جیراڈ پہلے ہی پوری سرگرمی سے قاتل کی تلاش میں تھا۔ اس نے کیبن کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا لیکن ایسا کوئی نشان نہیں ملا جس سے ظاہر ہوتا کہ قاتل زبردستی کیبن میں داخل ہوا تھا اس کے اندازے کے مطابق قاتل ایک سے زیادہ تھے اور ہنری ان پر اتنا اعتماد کرتا تھا کہ اس نے قاتل یا قاتلوں کو اندر بلا لیا تھا۔ ایک آدمی ہنری کو اس طرح قتل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خاصا طاقت ور آدمی تھا۔ ایک آدمی نے اسے قابو کیا ہوگا اور دوسرے نے اس کی گردن پر چاقو پھیر دیا ہوگا۔ اس کے بعد قاتل نے یہی چاقو جولیا کی پشت میں اتار دیا ہوگا۔ کیبن سے کچھ غائب نہیں تھا، اس کا مطلب تھا آنے والے محض میکناز کے لیے آئے تھے کیونکہ ہنری اور جولیا انہیں اسے لے جانے کی اجازت نہیں دیتے اور نہ ہی اغوا کنندگان انہیں بعد میں گواہی کے لیے زندہ چھوڑ سکتے تھے۔ قاتلوں کے لیے انہیں قتل کرنا ناگزیر تھا۔ شیرف نے جم سے بھی بیان لیا۔ وہ رات کے وقت بار سے آرہا تھا اور ہنری کے کیبن کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اتفاق سے اندر دیکھ لیا تھا۔

اس سانحے نے پورے اسپن کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر شخص بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ رات کو رضا کار اور پولیس کے جوان مل کر گشت کرنے لگے تھے۔ خراب موسم کے باوجود یہ لوگ ساری رات پہرا دیتے۔ ایک ایک گھر جا کر لوگوں کی خیریت دریافت کیا کرتے تھے مگر اول تو اتنے بڑے علاقے کی نگرانی ممکن نہیں تھی۔ دوسرے اگلا وار مجرم یا مجرموں نے ایسی جگہ کیا تھا جس کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسپن ٹاؤن کے چرچ کے ساتھ ہی چھوٹا سا یتیم خانہ تھا۔ یہ چرچ کی زیر نگرانی کام کر رہا تھا۔ اس چرچ میں بارہ یتیم اور بے سہارا بچے پرورش پا رہے تھے۔ ان میں دو شیر خوار بچے بھی تھے چرچ کی دو ننیں ان بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش پر مامور تھیں۔ رات سوتے وقت انہوں نے حسب معمول بچوں کو دیکھا۔

سب بچے سکون سے سو رہے تھے۔ چیک کرنے والی نن نے ساری لائٹس بند کیں۔ دروازے اور کھڑکیاں شدید سردی کی وجہ سے پہلے ہی بند تھے۔ نن سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے انہیں چیک نہیں کیا۔ ایک کھڑکی کھلی تھی۔ رات کسی وقت وہ شیطان اس راستے سے اندر آئے اور دونوں شیر خوار بچوں کو لے گئے۔ اتفاق سے ہال میں سونے والے ایک بچے کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی عمر دس سال تھی اس نے دیکھا کہ کھڑکی کھلی ہے اس سے دو افراد جنہوں نے سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کے چوغے پہنے تھے آئے، انہوں نے دونوں شیر خوار بچوں کو اٹھایا اور اسی خاموشی سے کھڑکی سے باہر چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے کھڑکی اسی طرح بھیڑ دی۔

لڑکا مارے خوف کے دم بہ خود تھا ان لوگوں کے جانے کے بعد اسے ہوش آیا اور وہ چیختا چلاتا ہال سے باہر چرچ کی طرف بھاگا۔ چرچ کے پادری ابراہام جیسن اپنے دفتر میں تھے۔ بچے کی چیخ و پکار سن کر وہ باہر آئے بچے پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ پوری بات بتا نہیں پا رہا تھا اس کی حالت دیکھ کر پادری اسے لے کر ہال میں آیا اور بچوں کو غائب پا کر اس نے فوری طور پر ایک شخص کو شیرف کے دفتر روانہ کیا۔ چند منٹ میں شیرف وہاں تھا۔ رضا کاروں اور لوگوں کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوری طور پر اسپن ٹاؤن کا رخ کیا۔ واردات کے آدھے گھنٹے کے اندر انہوں نے اسپن ٹاؤن کے آس پاس کے جنگل کو کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی شیرف کے آدمی گھر گھر جا کر دیکھ رہے تھے اور لوگوں سے ان چوغہ پہنے لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے جو چرچ کے یتیم خانے سے دو بچوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔

اس واردات سے پولیس کا ذہن گیارہ سال پہلے لکڑہارے کے بچے کے اغوا کی طرف گیا۔ اس کے چار سالہ بچے نے بھی ایسے ہی چوغہ پوشوں کا ذکر کیا تھا مگر اس کی کم سنی کی وجہ سے کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ گیارہ سال بعد چرچ کے اس دس سالہ بچے نے اغوا کرنے والوں کا بالکل وہی حلیہ بتایا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ سوائے ان دو بچوں کے اور کسی نے بھی ان سیاہ پوشوں کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف رات کی تاریکی میں اس حلیے میں شکار کے لیے نکلتے تھے۔ جو بچے دن دہاڑے اغوا ہوتے تھے انہیں یہ مجرم عام افراد کے حلیے میں اغوا کرتے تھے۔

اس بار شیرف نے اپنے خاص اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے پورے اسپن میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ اس نے تمام افراد کے رات نو سے صبح چھ بجے تک

اپنے گھروں سے نکلنے پر پابندی لگادی۔ خلاف ورزی کرنے والے کوکڑی پوچھ گچھ اور جرمانے کے لیے تیار رہنا تھا۔ اس کے بعد شیرف نے اپنے ماتحتوں کے ہمراہ پورے اسپین کے ایک ایک گھر کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ ایک ایک گھر کی باریک بینی سے مکمل تلاشی لیتے تاکہ گمشدہ بچوں کا کوئی نشان مل جائے یہ تلاشیاں اس مفروضے کے تحت لی جارہی تھیں کہ یہ جرائم علاقے کا ہی گروہ کررہا ہے۔ اس میں باہر کا کوئی فرد ملوث نہیں ہے۔ شیرف نے اعلان کیا کہ وادی کی ایک ایک عمارت کی مکمل تلاشی لی جائے گی۔ حتیٰ کہ اسپتال اور پولیس اسٹیشن کی بھی تلاشی لی جائے گی۔ تلاشیوں کا یہ سلسلہ پورے ایک مہینے تک جاری رہا لیکن حیرت انگیز طور پر کسی گھر سے کوئی مشتبہ چیز نہیں ملی۔ لوگ چکرا گئے تھے۔ آخر بچے اغوا کرنے والے اور لوگوں کو قتل کرنے والے کہاں سے آتے تھے اور کہاں چلے جاتے تھے کیا یہ بدارواح کی کارستانی تھی جو ماورائے عقل طریقے سے یہ کام کررہی تھیں؟ مگر کئی باتیں ایسی تھیں جو اشارہ کرتی تھیں کہ یہ کارروائیاں انسانوں کی ہیں۔ اول مزاحمت کرنے والوں کا قتل جو قطعی مادی طریقے سے کیے گئے تھے۔ اگر یہ غیر انسانی مخلوق کا کام ہوتا تو وہ انسانوں کو مارنے کے لیے ایسے طریقے اختیار نہ کرتی۔

تلاشیوں میں ناکامی کے بعد شیرف جیراڈ بل نے کیس کے حل کے لیے صوبائی حکومت سے درخواست کی۔ اس بار وہاں سے دو اسپیشل ایجنٹ بھیجے گئے۔ وہ کئی مہینے تک ان واقعات کی تفتیش کرتے رہے۔ کئی بار ہمارے ہاں بھی آئے مگر اس سے نہ تو ہنری اور جولیا کے قاتلوں کا پتا چلا اور نہ ہی میکناز اور چرچ کے یتیم خانے سے غائب ہونے والے بچوں کا سراغ ملا۔ اسپیشل ایجنٹ ناکام واپس چلے گئے۔ ہمیں بھی رفتہ رفتہ صبر آ گیا۔ وقت چپکے سے گزرتا گیا۔ دو سال بعد میلینا کی شادی علاقے کے خوب رو ڈاکٹر نوبرٹ اسکاٹ سے ہوگئی۔ وہ عمر میں میلینا سے دس سال بڑا تھا لیکن باصلاحیت اور دولت مند شخص تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میلینا اس سے محبت کرنے لگی تھی اس لیے ہم سب گھر والے خوشی سے اس شادی پر رضامند ہوگئے۔

ایک سال بعد میلینا نے ایک پیارے سے لڑکے کو جنم دیا تو سب نے متفقہ طور پر اغوا ہوجانے والے میکناز کی یاد میں اسے میکناز کا نام دے دیا۔ اسے پا کر ہمیں لگا جیسے ہم نے دوبارہ گمشدہ میکناز کو پالیا ہو۔ اگرچہ اس ننھے میکناز کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وارداتیں ہمیشہ گیارہ سال بعد نومبر کے آخر مہینے میں ہوا کرتی تھیں لیکن مام اور پھر میلینا اس معاملے میں اتنے حساس ہوگئے تھے کہ میلینا شوہر سمیت ہمارے گھر آ گئی۔ نوبرٹ نے خوش دلی سے اپنا خوب صورت مکان چھوڑ کر ہمارے ساتھ رہنا قبول کرلیا تھا۔ میلینا تین سال ہمارے ہاں رہی پھر نوبرٹ کو ٹورنٹو جانے کا موقع ملا اور وہ میلینا اور ننھے میکناز سمیت وہاں چلا گیا۔

انہی دنوں میں نے ہائی اسکول پاس کرلیا تھا اور مزید تعلیم کے لیے میں نے قریب ہی واقع شہر کے کالج میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا مگر جب میں وہاں پہنچا تو کالج میں داخلہ لینے کے بجائے میں نے وفاقی پولیس میں ملازمت کے اشتہار کے جواب میں درخواست دے دی۔ شروع سے میرا رجحان پولیس کی طرف ہی تھا۔ دو سال کی تربیت کے بعد مجھے اپنے علاقے میں ہی وفاقی پولیس کے ہیڈ کوارٹر بھیج دیا گیا۔ اب میں ایک اسپیشل ایجنٹ تھا۔ کم عمری اور ناتجربے کاری کی وجہ سے مجھے زیادہ تر فیلڈ ورک کے کام دیے جاتے تھے۔ کیسز کی تفتیش کا موقع ابھی تک نہیں ملا تھا حتیٰ کہ 1925ء کا سال آ گیا۔ میرے ذہن میں شروع سے اپنی وادی میں ہونے والے پراسرار واقعات کا خیال تھا۔

میں نے اپنے باس انسپکٹر گریڈی سے درخواست کی کہ مجھے اس کیس پر تحقیق کی اجازت دی جائے۔ انسپکٹر گریڈی اس کیس کی طویل پراسرار تاریخ سے واقف تھا بلکہ اس علاقے کا ہر شخص اس کیس سے واقف تھا۔ انسپکٹر گریڈی بھی ہماری وادی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے مجھے حیرت ہوئی جب اس نے انکار کردیا اور خشک لہجے میں بولا۔

''مسٹر موبارٹ سٹ کا...... ہمارے پاس اور بھی بہت سے حل طلب کیس موجود ہیں۔ تم ان پر بھی توجہ دے سکتے ہو۔''

''یقیناً...... لیکن یہ بھی ایک حل طلب کیس ہی ہے اور اگر میں اس پر کام کرنا چاہتا ہوں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

انسپکٹر گریڈی نے اس بار بھی رکھائی سے انکار کردیا ''فی الوقت تم سام کے ساتھ مل کر بینک ڈکیتی کے کیس پر کام کرو۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ باس تھا اور اس کا حکم ماننا بھی ضروری تھا۔ میرا پارٹنر سام ان دنوں بینک ڈکیتی کے ایک کیس پر کام کررہا تھا اور وہ کامیابی کے خاصا نزدیک پہنچ گیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ انسپکٹر گریڈی نے مجھے اس کے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا ہے تو اس نے خاصا برا منایا تھا۔ حالانکہ میں نے اسے بتایا بھی کہ یہ کام مجھے میری مرضی کے خلاف سونپا گیا ہے۔ سام کا رویہ بھی درست تھا۔ میں بلاوجہ

اس کی کامیابی میں شریک بن جاتا جب کہ سارا کام اس نے ہی کیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنا حق اس طرح ادا کر دیا کہ جب مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے ریڈ کیا گیا تو ان کی جوابی فائرنگ سے سام کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اس وقت میری کوشش سے اس کی جان بچی۔

اس کے بعد بھی میں نے انسپکٹر گریڈی سے اپنے علاقے میں جا کر بچوں کے پُراسرار اغوا پر تفتیش کرنے کا مطالبہ جاری رکھا لیکن اس نے ہر بار انکار کر دیا حتیٰ کہ اکتوبر آن پہنچا اور مجھے یقین تھا کہ اس بار بھی نومبر میں بچوں کے اغوا کی وارداتیں ہوں گی۔ انسپکٹر گریڈی کے رویے سے مایوس ہو کر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یکدم ...خود کو تھکا تھکا ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ دفتری امور میں غلطیاں کرنے لگا۔ ایسا ظاہر کرتا جیسے میرے ذہن پر کوئی دباؤ ہو۔ گزشتہ تین سال سے میں نے ایک بھی فالتو چھٹی نہیں کی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق میرے ساتھیوں نے اصرار شروع کر دیا کہ مجھے کچھ دن کی چھٹیاں لے کر آرام کرنا چاہیے۔ انسپکٹر گریڈی نے میرے چھٹی مانگنے پر انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے بہ خوشی مجھے دو مہینے کی چھٹی دے دی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے کہ میں آئے دن اس کا دماغ کھاتا تھا۔

چھٹیاں ملتے ہی میں نے سامان باندھا اور اسپن کے لیے روانہ ہو گیا۔ سفر چار گھنٹے کا تھا اور میں رات کے وقت گھر پہنچا۔ پاپا اور مام مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ اب وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ میں نے انہیں...... بھی نہیں بتایا کہ میں کس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا۔ میں نے انہیں یہی بتایا کہ میں کام کرتے کرتے تھک گیا تھا اس لیے اب چھٹی لے کر آرام کرنے آیا ہوں۔ مام یہ سن کر بے حد خوش ہوئی تھیں کہ میں پورے دو مہینے ان کے پاس رہوں گا۔

اگلے پندرہ دن دوستوں اور جاننے والوں سے ملنے ملانے میں گزر گئے تھے۔ اس دوران میں یہ بھی سوچتا رہا کہ میں تفتیش کے کام کا آغاز کیسے کروں۔ میں قانونی اور سرکاری طور پر اس کیس پر کام کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ اگر انسپکٹر گریڈی کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں اپنے طور پر اس کیس پر کام کر رہا ہوں تو میری شامت بھی آ سکتی تھی۔ گریڈی خاندان اسپن ٹاؤن سے ذرا فاصلے پر ایک بڑی سی حویلی میں آباد تھا۔ اس خاندان میں ملا کر کل چوبیس پچیس افراد تھے۔ دولت اور رسوخ کے اعتبار سے اسپن کا کوئی گھرانا ان کی ٹکر کا نہیں تھا۔ کوئی سو سال پہلے اس گھر کا سربراہ اسکاٹ لینڈ سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا۔ اس کے پاس دولت تھی اس لیے اس نے جنگل کی کٹائی اور اسپن میں سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے لینا شروع کر دیے۔ موجودہ حویلی بھی اسی شخص نے بنوائی تھی۔ جس میں آج اس کے خاندان کی پانچویں نسل آباد تھی۔ یہ لوگ بعد میں سرکاری ملازمتوں میں بھی آئے۔ علاقے کے صوبائی اسمبلی کے ممبرز اور ٹاؤن کونسلر کے لیے ان کی حمایت لازمی ہوتی ہے۔ تبھی وہ انتخابات میں کامیاب ہوتے ہیں۔ گریڈی خاندان کے کئی افراد اعلیٰ سرکاری اور انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ یہ لوگ شائستہ، مہذب اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ بے پناہ اثر و رسوخ کے باوجود اسپن میں ان کا حلقۂ احباب محدود تھا اور یہ زیادہ تر خود میں مگن رہتے تھے۔ وہ پارٹیاں دینے اور دوسروں کی پارٹیوں میں شرکت کرنے کے معاملے میں محتاط تھے۔

ایک طرح سے یہ بات میرے لیے اچھی ہی تھی کہ گریڈی خاندان کے لوگ وادی کے لوگوں سے کم ہی ملتے جلتے تھے۔ یعنی اس بات کا امکان کم تھا کہ انسپکٹر اونیل گریڈی تک یہ بات پہنچ سکے کہ میں پراسرار اغوا کے کیس کی نجی طور پر تفتیش کر رہا ہوں۔ بالآخر میں نے کام کا آغاز ہنری اور جولیا کے کیبن سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا کوئی وارث نہیں تھا سوائے ہمارے۔ اس لیے یہ کیبن ہماری تحویل میں تھا۔ میں نے پاپا سے اس کی چابی لی اور ایک صبح وہاں پہنچ گیا۔ برسوں سے بند اس کیبن کی حالت باہر سے ہی بے حد خراب ہو رہی تھی۔ پاپا نے کبھی اس کی صفائی نہیں کرائی۔ میں نے سامنے والے دروازے پر لگا تالا کھولا۔ تالا زنگ آلود ہو رہا تھا۔ خاصی مشکل سے کھلا۔ اندر ہر شے گرد آلود تھی فضا میں بری سی باس بسی تھی۔ ناک پر رومال رکھتے ہوئے میں نے وہاں کی چیزوں کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اسی طرح جیسی آج سے گیارہ سال پہلے تھی۔ وہ آرام کرسی جس پر ہنری کی لاش پائی گئی تھی اسی جگہ رکھی تھی۔ اس کے برابر میں فرش پر جولیا کی لاش کی جگہ چاک سے نمایاں کی گئی تھی وہ اب بھی ایسی ہی تھی۔ کمرے کی کوئی چیز چھیڑی بھی گئی تھی تو وہ اب اپنی جگہ پر رکھی تھی۔

میں نے باریک بینی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میری یادداشت میں اس کمرے کی گیارہ سال پہلے کی حالت تھی مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کمرے میں کیا کیا تھا۔ اسی وجہ سے آتش دان کے اوپر بنی کارنس پر سجے شوپیسز میں اس مجسمے کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ یہ مجسمہ بندر کا تھا یعنی جسمانی طور پر جیسے کوئی بندر ہاتھ پاؤں سمیٹ کر بیٹھا ہو لیکن اس کا چہرہ شیطان کا تھا۔ مخصوص نقوش اور سر پر آگے دو چھوٹے چھوٹے سینگ تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے

پہلے اس مجسمے کو کبھی یہاں نہیں دیکھا تھا۔ ہنری یا جولیا کو اس قسم کی چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ان دونوں کا رجحان مذہب کی طرف تھا اور وہ کبھی اس قسم کا شیطانی مجسمہ یہاں نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر یہ مجسمہ کہاں سے آیا تھا۔ میں نے اسے کارنس سے اٹھایا۔ یہ تین انچ لمبا سیاہ لکڑی سے بنا مجسمہ تھا۔ کیا اسے بعد میں کسی نے لا کر رکھا تھا؟

اس سوال کا جواب پاپا سے ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ معائنے کا بقیہ کام مکمل کر کے میں واپس گھر آیا۔ پاپا گھر میں تھے میں نے مجسمہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا ”یہ کہاں سے آیا؟“

اس کا مطلب تھا پاپا نے اس مجسمے کو وہاں نہیں رکھا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات کھٹکنے لگی۔ آخر یہ مجسمہ وہاں آیا کیسے؟ میں اسپن ٹاؤن کے شیرف کے دفتر پہنچا۔ جیرالڈ بل ابھی تک وہاں کا شیرف تھا اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور جب میں نے ہنری جولیا مرڈر کیس کی فائل مانگی تو اس نے بلا حیل و حجت لا کر دے دی۔ میں نے اس میں جائے واردات پر موجود اشیا کی فہرست نکالی اور اس فہرست میں بندر کے اس شیطانی مجسمے کا ذکر موجود تھا۔ گویا شیرف کو یہ وہاں جائے واردات پر ملا تھا۔ میں نے اس سے بندر کے مجسمے کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس جگہ سے ملا تھا۔ اس نے اپنی خشخشی داڑھی میں انگلیاں گھمائیں پھر بولا۔

”مجھے صحیح سے یاد نہیں...... ایسا کرو تم ہینزل سے پوچھ لو۔ اس قسم کے کام وہی کرتا تھا۔“

ہینزل ان دنوں ڈپٹی شیرف تھا۔ اس نے تصدیق کی کہ فہرست اسی نے بنائی تھی۔ میں نے اسے بندر کا مجسمہ دکھایا۔

”تم نے اسے بھی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ کہاں تھا؟“

”یہ ہنری کی آرام کرسی کے نیچے پڑا تھا۔“ اس نے وثوق سے کہا ”لیکن تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ ہنری اور جولیا اپنے گھر میں اس قسم کی کوئی شے نہیں رکھتے تھے۔“ میں نے جواب دیا ”کیا تم نے سوچا نہیں کہ اس چیز کا تعلق قاتلوں سے ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا اور ہینزل کو حیرت زدہ چھوڑ کر شیرف کے دفتر سے نکل آیا۔

شیرف اور اس کے ماتحتوں نے اس کیس کی اتنی بے دلی سے تفتیش کی تھی کہ اتنی چونکا دینے والی چیز کو نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس شیطانی بندر کا تعلق قاتلوں سے تھا۔ عین ممکن ہے جب انہوں نے ہنری کو قابو کرنا چاہا ہو تو اس سے ہاتھا پائی کے دوران قاتل کے پاس سے یہ بندر گر گیا ہو اور اسے پتا ہی نہ چلا ہو۔

اگلے روز میں پھر شیرف کے آفس گیا اور اس سے گزشتہ پچپن برس میں ہونے والی اغوا اور قتل کی وارداتوں کا مکمل ریکارڈ مانگا۔ شیرف نے غور سے مجھے دیکھا۔

”تم یہ سب کس لیے کر رہے ہو؟“

”میں اپنے طور پر اس کیس پر تحقیق کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان وارداتوں کا سلسلہ اب رک جائے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم مجرموں تک پہنچ جائیں۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ شیرف نے سر ہلایا ”لیکن کسی اتھارٹی کے بغیر سرکاری ریکارڈ تمہارے حوالے کرنے سے میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”کل تو تم نے مجھ سے پورا تعاون کیا تھا۔“ مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی پھر مجھے ایک خیال آیا ”سنو...... بے شک تم ریکارڈ مجھے نہ دو لیکن مجھے اتنی اجازت دو کہ میں تمہارے دفتر میں ہی اس ریکارڈ کا مطالعہ کرلوں اور ان میں سے ضروری پوائنٹس نوٹ کرلوں۔“

شیرف نے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلایا ”اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اس کے بعد میں نے معمول بنالیا کہ صبح ناشتا کر کے شیرف کے آفس آجاتا۔ وہاں بیٹھ کر 1860ء سے شروع ہونے والی ان وارداتوں کے کیسز کی تفصیل فائل بہ فائل پڑھنے لگا۔ شیرف کے ماتحت تفتیش کے معاملے میں سست سہی لیکن انہوں نے فائلوں کو مکمل کر کے رکھا تھا۔ ہر کیس کی مکمل تفصیل ان فائلوں میں موجود تھی۔ ان میں تاریخیں بھی تھیں۔ میرے دل میں نہ جانے کیوں خیال آیا۔ میں نے جن جن تاریخوں میں بچے اغوا ہوئے تھے ان کی تفصیل ایک الگ کاغذ پر اتار لی۔ یہ نومبر کی ہی مختلف تاریخیں تھیں۔ بعض ابتدائی مہینے کی اور بعض درمیانی اور بعض آخری تاریخیں تھیں۔ ان میں کوئی ربط نہیں تھا، لیکن کیا واقعی کوئی ربط نہیں تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ان تاریخوں میں چاند کی تاریخیں بھی چیک کروں۔ شیرف کے پاس ریکارڈ میں چاند کی تاریخوں کا کوئی ذکر نہیں تھا اور میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اتنی پرانی چاند کی تاریخیں نکالتا۔ اس موقع پر مجھے اپنے جغرافیے کے استاد مسٹر سی بل مین کا خیال آیا۔ وہ اسکول میں ہمیں جغرافیہ اور فلکیات پڑھاتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ میں اس معاملے میں ان سے مدد لوں۔ سی بل مین اب ریٹائر ہو گئے تھے اور وہ اسپن ٹاؤن کی ایک دو منزلہ عمارت کے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو وہ اپنے ایک

پرانے شاگرد کو دیکھ کر خوش ہوگئے۔ جب میں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا تو وہ فوراً میری مدد پر آمادہ ہوگئے۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ جہاں چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ایک خاص کیلینڈر تھا۔ اس کی مدد سے انہوں نے کوئی حساب لگایا اور ایک کاغذ پر مجھے نومبر کی ان تاریخوں کی چاند کی تاریخیں نکال کر دے دیں پھر انہوں نے ذرا تجسس سے پوچھا ''تم نے یہ کام کیوں کروایا ہے؟''

''یہ بات خود تک ہی محدود رکھیے گا۔'' میں نے ان سے کہا ''میں پراسرار نومبر کی وارداتوں کی تفتیش کررہا ہوں۔''

انہوں نے خلوص سے کہا ''اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

اس رات آتش دان کے سامنے بچھے قالین پر دراز ہوکر میں نے چاند کی تاریخوں کا معائنہ کیا۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ پورے چاند سے پہلے کی تاریخیں تھیں۔ عام طور سے دس سے تیرہ کے درمیان کی تاریخیں۔ چند ایک تاریخیں نو کی بھی تھیں، لیکن ان میں سے ایک تاریخ بھی پورے چاند یا اس کے بعد کی نہیں تھیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ ساری تاریخیں پورے چاند سے پہلے کی تھیں۔ پہلے وہ شیطانی بندر اور پھر بچوں کے اغوا کی چاند کی یہ خاص تاریخیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ان وارداتوں میں کوئی شیطانی گروہ ملوث ہے جو بچوں کو اغوا کرکے اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل کررہا ہے۔ لیکن فی الوقت میرے پاس اس نظریے کے حق میں کوئی ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا فرد تھا جس پر میں شبہ کرسکتا۔

صرف دو بار ایسا ہوا کہ اغوا کرنے والوں کو دیکھا گیا اور دونوں بار معصوم بچوں نے انہیں دیکھا اور شاید اسی وجہ سے زندہ رہ گئے۔ ورنہ جن بڑے افراد نے انہیں دیکھا اور ان سے مزاحمت کرنے کی کوشش کی وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ مجرم اسی علاقے کے رہنے والے تھے اور انہیں ہر شخص پہچانتا تھا ورنہ وہ ہر اس شخص کو جو انہیں دیکھ لیتا اتنی بے دردی سے قتل نہ کرتے۔ پھر وارداتوں کا انداز بھی بتاتا تھا کہ اس میں کوئی مقامی گروہ ہی ملوث ہے۔ بیرونی افراد کو غائب ہونے میں وقت لگتا اور وہ کسی نہ کسی کی نظر میں آجاتے۔ میں نے رپورٹس میں پڑھا کہ اس دوران میں جب کہ یہ وارداتیں ہوئی تھیں اسپن میں آنے والے تمام بیرونی افراد شبے سے بالاتر نکلے تھے اور ان میں سے کوئی ان وارداتوں میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔

یہ سوچ کر مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے کہ اس وادی میں ایسے درندہ صفت لوگ بھی آباد ہیں جو نامعلوم مذموم مقاصد کے لیے شیر خوار بچوں کو اغوا کرتے تھے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ بچوں کو ہلاک کردیتے تھے۔ کیونکہ ان پچپن سالوں میں اغوا کیے جانے والے سترہ بچوں میں سے ایک بھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی کسی بچے کی لاش یا اس کی باقیات سامنے آئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اغوا کرنے والوں نے انہیں ہلاک کرکے ان کی لاشوں کو اس طرح سے غائب کیا کہ وہ کسی کو مل نہ سکیں۔ یقیناً انہیں یہ خطرہ بھی تھا کہ بچوں کی لاشیں ملنے سے ان کے مذموم مقاصد سامنے آسکتے ہیں۔ میں نے کاغذ پر نوٹس بنائے اور اس میں جن نکات پر زور دیا گیا تھا۔ انہیں ترتیب وار لکھ لیا۔

(1) مجرمان کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔

(2) وہ اتنے مہذب اور شریف نظر آتے ہیں کہ کسی کو ان پر شبہ تک نہیں ہوتا۔

(3) انہوں نے ایسے انتظامات کررکھے ہیں جن کی مدد سے وہ نظروں میں آئے بغیر آسانی سے بچوں کو اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔

(4) بچوں کے اس اغوا سے ان کی کوئی مالی یا مادی منفعت منسلک نہیں ہے۔

(5) تاریخوں اور سال کے تسلسل سے ثابت ہوتا ہے کہ بچوں کے اغوا میں کوئی شیطانی اور نفسیاتی سوچ کارفرما ہے۔

(6) یہ لوگ اتنے سفاک ہیں کہ راہ میں آنے والے ہر فرد کو بے دریغ قتل کردیتے ہیں۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے بھی یہ ہر فرد کو مار دیتے ہیں جس سے انہیں شناخت کرلیے جانے کا خطرہ ہو۔

(7) ان وارداتوں میں ملوث افراد کا تعلق ممکنہ طور پر ایک ہی خاندان سے ہے۔

(8) ان کی انتہا درجے کی رازداری برقرار رکھنے کی کوشش بتاتی ہے کہ ان کا تعلق کسی خفیہ شیطانی فرقے سے ہے۔

(9) ممکنہ طور پر یہ شیطان کے پجاری ہیں۔

ان نکات کی روشنی میں مجھے ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ عملی کام کا آغاز کیسے کروں۔ جب میں تربیت حاصل کررہا تھا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ جب کسی کیس میں کوئی سرا ہاتھ نہ آرہا ہو تو سب سے پہلے کسی مشتبہ کو تلاش کرنا چاہیے۔ بدقسمتی سے وارداتیں گزشتہ پچپن سال سے جاری تھیں اور اب تک ایک بھی فرد ایسا سامنے نہیں آیا تھا جسے مشتبہ قرار دیا

جا سکتا۔ اس وادی کا کوئی بھی گھریا فرد مشکوک ہو سکتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کسے مشتبہ قرار دیا جاتا۔ اس کا طریقۂ کار کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا تو مجھے نقشے کا خیال آیا۔ میں نے اگلے روز شیرف کے دفتر میں جا کر اس سے علاقے کے مکمل نقشے کا مطالبہ کیا۔ شیرف جیراڈ نے اپنی میز کی دراز سے ایک رول نکالا۔

''تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے کچھ دن پہلے علاقے کے تفصیلی نقشے کی کچھ کاپیاں چھپوائی ہیں۔ ایک تم لے لو۔''

اس نے رول میں سے ایک نقشہ نکال کر مجھے دے دیا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے میں نقشہ لے کر چلا آیا۔ پاپا کی اسٹڈی میں یہ نقشہ پھیلا کر میں نے ان جگہوں پر نشانات لگائے جہاں پر وہ مکانات تھے جہاں سے بچے اغوا ہوئے تھے۔ اس طرح میں یہ جاننے کے قابل ہوا تھا کہ وارداتوں کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام وارداتیں اسپن ٹاؤن کے گرد ایک دائرے کی صورت میں ہوئی تھیں۔ اسپن دراصل ایل کی صورت میں پھیلی دو وادیوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ اس کے دونوں جانب اونچے گھنے جنگلات سے پُر پہاڑ تھے۔ ایل کا چھوٹا سرا آگے جا کر جنگلات کے ایک بڑے سلسلے سے مل جاتا تھا جو امریکا کینیڈا سرحد پر کئی سو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس حصے میں آبادی کم تھی۔ زیادہ تر لکڑ ہارے آباد تھے کیونکہ اس حصے میں جنگلات ہونے کی وجہ سے ان کو روزگار ملتا رہتا تھا۔ ایل کے بڑے حصے میں زیادہ آبادی تھی یہ ایل ایک طویل وادی کی صورت میں خلیج الاسکا تک چلا جاتا تھا لیکن عملاً اسپن سمندر سے بارہ میل پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ جس جگہ ایل کے دونوں سرے ملتے تھے۔ اسپن ٹاؤن بڑے حصے میں ذرا نیچے کی طرف واقع تھا اور زیادہ تر آبادی اس کے گرد ہی تھی۔ میں نے حساب لگایا۔ تقریباً ساری ہی وارداتیں اسپن ٹاؤن سے چار میل کے دائرے کے اندر ہوئی تھیں۔ گویا ان وارداتوں کا مرکز اسپن ٹاؤن تھا۔ اس دائرے میں پورے اسپن میں آباد لوگوں کا نوے فی صد حصہ رہتا تھا لیکن قابلِ غور بات یہ تھی کہ جو لوگ بھی اسپن ٹاؤن سے ذرا فاصلے پر رہتے تھے ان کے ہاں سے کوئی بچہ غائب نہیں ہوا تھا۔

میں نے اسپن ٹاؤن پر سرخ قلم سے دائرہ بنایا۔ مجھے ممکنہ مشکوک فرد یا گھرانے کو اس دائرے میں تلاش کرنا تھا۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ وارداتوں کا سلسلہ 1870ء سے کیوں شروع ہوا تھا اس سے پہلے یا بعد میں کیوں نہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے میں اسپن ٹاؤن کے شہری ریکارڈ کے دفتر میں گیا وہاں میرا اسپیشل ایجنٹ کا حوالہ کام آیا اور کلرک نے بہ خوشی مجھے وادی میں آباد ہونے والے خاندانوں کی فہرست اور تفصیل دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ فائل خاصی ضخیم تھی لیکن میری دلچسپی کا محور 1870ء کا سال تھا۔ اس سال صرف ایک خاندان باہر سے آ کر اسپن میں آباد ہوا تھا۔ یہ ڈاکٹر رابرٹ شا کا خاندان تھا۔ رابرٹ شا اس وقت جوان تھا اور اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ باہر سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا۔ بعد میں اس کے چار بچے ہوئے اور وہ چاروں اسپن میں آباد تھے۔ ڈاکٹر شا کا 1912ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے ڈاکٹر نے ایناٹومی کے مقصد کے لیے بچوں کو اغوا کرایا ہو لیکن یہ خیال خود مجھے نہیں جچا۔ اول تو اینا ٹومی اتنی عام ہو گئی تھی کہ اس کے لیے شیر خوار بچوں کو اغوا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پھر رابرٹ ڈاکٹر بننے کے دوران میں یہ سارے تجربات پہلے ہی کر چکا تھا۔ بالفرض محال اسے کسی خاص طبی تجربے کے لیے بچوں کی ضرورت تھی بھی تو اس کے لیے وہ اتنی سفاکی اور مہارت سے قتل و غارت گری کیوں کر سکتا تھا۔

پھر ڈاکٹر رابرٹ اکیلا تھا اور وارداتوں کا انداز شروع سے گروہ والا رہا تھا۔ میں نے 1870ء سے ایک عشرے پہلے کی فہرست چیک کی۔ اس کے مطابق اس عرصے میں چار مزید خاندان آ کر اسپن میں آباد ہوئے۔ ان میں دائرے کے اندر آباد ہونے والے دو خاندان تھے ایک جیمس ماہر کا خاندان تھا۔ وہ کاشت کار تھا اور اسکاٹ لینڈ سے آیا تھا۔ اس نے اسپن ٹاؤن سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل صاف کیا ہوا ایک رقبہ لیا تھا اور وہاں پر پھل اور سبزیاں کاشت کرتا تھا۔ جیمس ماہر بھی اکیلا آیا تھا اس نے یہیں شادی کی۔ اس کے چھ بچے ہوئے تھے۔ ماہر کا انتقال 1902ء میں ایک حادثے میں ہوا تھا۔ اب اس کے بیٹے اور پوتے فارم چلاتے تھے۔ انہوں نے فارم کو اتنی وسعت دی تھی اور اسے جدید خطوط پر اس طرح استوار کیا تھا کہ وادی میں پیدا ہونے والی سبزی اور پھلوں کا ایک چوتھائی ان کے فارم پر پیدا ہوتا تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود یہ لوگ ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے عالیشان دو منزلہ مکان میں آئے دن تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ جن میں دو سو سے زائد افراد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ ماہر خاندان اسکاٹش ہونے کے باوجود کنجوس نہیں تھا۔ وہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان دنوں وہ وادی کی پیداوار کو بیرونی وادی تک پہنچانے کے لیے ایک کمپنی قائم کر کے اسپن سے باہر تک ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گھناؤنے کام میں وہ بھی

ملوث نہیں ہوسکتے تھے ان کا کردار سب کے سامنے تھا۔ ان کے گھر بے شمار لوگوں کا آنا جانا تھا اور اس قسم کی وارداتیں کرنے والے لوگ دوسروں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے کہ ان کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

دوسرا خاندان جم کا تھا اس جم کا جس نے آکر پاپا کو ہنری اور جولیا کے قتل سے آگاہ کیا تھا۔ وہ کینیڈا کے صوبے کیوبک سے آئے تھے۔ جہاں فرانسیسی نژاد باشندوں کی اکثریت ہے اور وہ کینیڈا سے الگ ہونے کی تحریک چلاتے رہے ہے تھے۔ جم کا خاندان کیونکہ انگریز تھا اس لیے خراب حالات کی وجہ سے اس کے دادا کو کیوبک چھوڑ کر اسپن آنا پڑا۔ یہ دراصل دو بھائی تھے۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ ایک کے بچے نہیں تھے اور دوسرے کے کئی بچے تھے جن میں جم کا باپ بھی شامل تھا۔ انہوں نے ہنری کے کاٹیج سے کچھ فاصلے پر مکان بنایا اور وہاں رہنے لگے تھے۔ فطرتاً یہ لوگ بدمعاش اور بلاوجہ جھگڑا کرنے والوں میں سے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے پڑوسی ان سے دور رہنے لگے تھے۔ دونوں بھائی معمولی محنت مزدوری کرتے تھے اور ان کے بیوی بچے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ روزانہ شام کو دونوں بھائی بار میں آجاتے اور اس وقت تک وہاں رہتے جب تک نشے میں دھت نہ ہوجاتے۔ اپنی محنت کی بیشتر کمائی وہ شراب میں اڑا دیتے تھے۔ پھر ایک بھائی جگر کی بیماری میں مبتلا ہوکر انتقال کرگیا۔ دوسرا بھائی یعنی جم کا دادا اسی روش پر قائم رہا اور یہی خصوصیات اس کی اولاد میں بھی آئیں۔ جم کا باپ بھی اور دو چچا عادی شرابی تھے۔ خود جم بار سے آرہا تھا جب اس نے ہنری اور جولیا کو مردہ حالت میں دیکھا تھا۔

مجموعی طور پر اس خاندان کے اطوار ایسے نہیں تھے کہ شرفا انہیں منہ لگاتے۔ پاپا اور ہنری پڑوسی ہونے کے باوجود ان سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ خاندان 1864ء میں آکر وادی میں آباد ہوا تھا۔ اپنی حرکتوں اور بداطواری کی وجہ سے یہ شک کے قابل تھا۔ جب شیرف نے ہنگامی حالات کا اعلان کرکے سب گھروں کی تلاشی لی تھی تو جم کے گھر سے چاقو اور چھریوں جیسے بے شمار ہتھیار ملے تھے۔ ان کے پاس سولہ رائفلیں اور بائیس پستول تھے۔ یہ سارا اسلحہ گھر کی دیواروں پر جابجا سجایا گیا تھا۔ اسپن ایک پُرامن مقام رہا ہے قطع نظر ان وارداتوں کے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے میں اتنا اسلحہ رکھنا تعجب خیز تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جم کے خاندان کے خلاف چھان بین کا آغاز کروں گا۔

اگلے روز میں نے شیرف کے دفتر جاکر جرائم کی رپورٹس پر مبنی فائلیں دیکھیں۔ انہیں سال بہ سال ترتیب سے رکھا گیا تھا اور مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جم کے خاندان کے خلاف ہر سال کوئی نہ کوئی رپورٹ تھی۔ ان میں مار پیٹ، دوسروں کی املاک کو نقصان پہنچانا، قوانین کی خلاف ورزی، جنگل میں آگ جلانا اور نشے میں دھت ہوکر غل غپاڑا مچانے جیسے جرائم شامل تھے۔ سب سے سنگین الزام جم کے دادا کے خلاف لگا تھا۔ شراب خانے میں ہونے والے جھگڑے میں اس نے ایک شخص کی ران میں چاقو گھونپ دیا تھا۔ ناکافی ثبوت کی وجہ سے اسے سزا تو نہیں ہوئی تھی لیکن جج نے ایک مہینے کے لیے اس پر کسی بھی بار میں جانے پر پابندی لگادی تھی۔

ان رپورٹس کو پڑھتے ہوئے مجھے ایک بار پھر احساس ہونے لگا کہ میں نے غلط گھر کو چنا ہے۔ یہ لوگ اوباش اور بداطوار ضرور تھے لیکن اس قسم کے جرائم کے لیے جس چستی، سفاکی اور مہارت کی ضرورت تھی وہ ان میں مفقود نظر آتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ نچلے درجے کے لفنگے تھے۔ بچوں کے اغوا میں کوئی منظم ترین گروہ ملوث تھا۔ ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ گزشتہ نصف صدی سے بچوں کا اغوا کررہے تھے اور کسی نے ان کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی تھی وادی میں رہ گروہ اپنی کارروائیاں پوری دیدہ دلیری سے جاری رکھے ہوئے تھے۔

اس موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے کام میں رکاوٹ ڈالی جارہی ہے۔ چند روز بعد میں دوبارہ شیرف کے آفس کا ریکارڈ دیکھنے اس کے پاس گیا تو اس نے کسی قسم کے تعاون سے صاف انکار کردیا اور رکھائی سے کہا "میں تمہارے کسی کام آنے سے قاصر ہوں۔ آئندہ اتھارٹی کے بغیر میرے دفتر میں آنے سے گریز کرنا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "لیکن اب تک تو تم مجھ سے پورا تعاون کرتے آئے ہو پھر اچانک کیا ہوگیا؟"

شیرف جیراڈ کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ اس نے کہا "میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ کچھ لوگوں کو تمہارا تحقیق کرنا پسند نہیں ہے۔ مجھے اوپر سے حکم ملا ہے۔"

"کیا تم بتاؤ گے کہ یہ "کچھ لوگ" کون ہیں جنہیں اس وادی میں ہونے والے گھناؤنے جرائم کے حل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"بہتر ہوگا تم اس کام کو یہیں روک دو اور اپنی چھٹیاں آرام سے گزارو۔"

"شیرف تمہارے مشورے کا شکریہ!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر دروازے کے پاس جاکر رکا "تمہیں یاد دلادوں

کہ خونی نومبر کا پرسوں سے آغاز ہو رہا ہے اور نصف نومبر سے پہلے وارداتوں کا دوبارہ امکان ہے۔"

شیرف کو حیرت زدہ چھوڑ کر میں اس کے دفتر سے نکل آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان وارداتوں میں ملوث شیطانی طاقتیں میرے آڑے آنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ طاقت ور ہی نہیں سرگرم بھی تھیں اور ان کی طرف سے بچوں کے اغوا کی وارداتوں کا پورا امکان تھا۔ اس بار پورا چاند وسط نومبر میں پڑ رہا تھا۔ اس لیے امکان تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ بچے اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگلے دو روز تک میں وادی کے نقشے پر مزید کام کرتا رہا اور اس کی مدد سے میں نے اپنا ایک نقشہ مرتب کیا تھا۔ یہ اسپن ٹاؤن کے آس پاس آمد و رفت کے راستوں کا نقشہ تھا۔ ساتھ ہی میں نے اگلے مرحلے کا آغاز کیا۔ اب مجھے معلوم کرنا تھا کہ کس کس گھر میں ایسے دو سال سے کم عمر بچے تھے جو شیر خوار تھے۔ یہ کام ذرا محنت طلب بھی تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس کام کی تشہیر بھی نہ ہو۔ اس لیے میں نے اسپن ٹاؤن کمیٹی کے دفتر پیدائش اور اموات کے ریکارڈ سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ کام میں براہِ راست نہیں بلکہ بلا واسطہ کرنا چاہتا تھا تاکہ پھر مجھے نہ روک دیا جائے۔

دفتر کا انچارج جارج پاپا کے بچپن کے دوستوں میں سے تھا اور اب بھی ہر ہفتے کی رات پاپا سے ملنے آتا تھا۔ اتفاق سے اگلے دن ہفتہ تھا اور جارج حسبِ معمول پاپا سے ملنے آیا۔ جب وہ پاپا سے خوشگوار موڈ میں بات کرتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا تو میں نے موقع غنیمت جان کر اس سے درخواست کی کہ مجھے گزشتہ دو سال کا پیدائش و اموات کا ریکارڈ دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ جارج نے ہنس کر کہا "یہ کون سا مسئلہ ہے کل لنچ کے بعد تم دفتر آ جانا میں ریکارڈ دکھا دوں گا۔"

"لیکن یہ بات کسی اور کے علم میں نہیں آنی چاہیے۔" میں نے کہا "دراصل میں نومبر میں اغوا ہونے والے بچوں کے بارے میں تحقیق کر رہا ہوں۔"

جارج نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔ اگلے روز میں لنچ کے بعد اس کے دفتر گیا اور اس نے وعدے کے مطابق مجھے ریکارڈ دکھایا۔ میں نے ایک کاغذ پر گزشتہ دو سال کے دوران پیدا ہونے والے بچوں کا مکمل ریکارڈ نوٹ کر لیا۔ گھر آ کر میں نے اپنے بنائے ہوئے نقشے پر ان بچوں کے نام ان جگہوں پر درج کر دیے جہاں ان کے گھر والے رہتے تھے۔ ایسے بچوں کی تعداد بارہ تھی۔ ان میں سات لڑکیاں اور پانچ لڑکے تھے ان سب کی عمر دو سال سے کم تھی۔ میرے دائرے میں آنے والے بچوں کی تعداد نو تھی۔ چھ لڑکیاں اور تین لڑکے...... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے لڑکیاں بھی اغوا کی تھیں اور لڑکے بھی۔ انہیں بس دو سال سے کم عمر کے بچے درکار ہوتے تھے۔ اندراج کے بعد میں نے ایک اور خیال کے تحت اپنے نقشے پر لائنیں کھینچیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جہاں سے بچے اغوا ہوئے تھے ان کا مرکز کہاں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان کا مرکز اسپن ٹاؤن سے دو کلومیٹر مشرق میں تھا۔ یہ جگہ گریڈی ہاؤس کے آس پاس تھی۔ یہ سوچ میرے اندر موجود تھی کہ مجرمان ہمیشہ پیدل جا کر واردات کرتے تھے۔ اتنے مختصر سے فاصلے کے لیے کوئی سواری ہونا لازمی نہیں تھی۔ اگر ان کا مرکز یہی تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں واپس اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جاتے ہوں گے۔

نو میں سے چھ بچے بڑے گھرانوں کے تھے یعنی ان خاندانوں میں زیادہ افراد ایک ہی جگہ آباد تھے۔ زیادہ افراد کا مطلب تھا زیادہ حفاظت...... البتہ تین بچے ایسے تھے جو صرف ماں باپ یا چھوٹے بہن بھائیوں والے گھرانے میں تھے اور ان کو اغوا کیے جانے کا نسبتاً زیادہ امکان تھا۔ میں نے ان تین بچوں کے ناموں پر دائرہ لگا دیا۔ ممکنہ طور پر ان میں سے کوئی نہ کوئی بچہ شیطانی گروہ کا اگلا نشانہ ہو سکتا تھا۔ ان کی حفاظت کرنا ضروری تھا اور ان کی مدد سے ہی میں اس گروہ تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن میں اکیلے یہ کام نہیں کر سکتا تھا بلکہ مجھے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ سب سے پہلے میں نے پاپا کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں اپنے بچپن کے دوست ہیری کا خیال بھی تھا۔ وہ دلیر اور عقل مند نوجوان تھا اور ان دنوں فرنیچر بنانے کا اپنا کارخانہ چلا رہا تھا اس کے تخلیق کیے فرنیچر کی مانگ اسپن سے باہر تک تھی۔ ماہر خاندان ریل کی جو پٹری بچھانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کے لیے لکڑی کے سلیپر ہیری نے مہیا کرنے کی پیشکش کی تھی۔ اس رات میں ہیری کے گھر جا پہنچا۔ اس نے حال ہی میں شادی کی تھی اور اس کی بیوی کے ہاں ولادت متوقع تھی اس نے بے حد مسرور لہجے میں بتایا۔

"میں نومبر کی دس گیارہ تاریخ تک باپ بن جاؤں گا۔"

میں نے اسے مبارک باد دی اور اپنے عزائم کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا "اس شیطانی گروہ کا خاتمہ ہم سب کا فرض ہے۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

''تمہیں میری معاونت کرنی ہے۔'' میں نے اس سے کہا ''سب سے پہلے مجھے دو ایسے ہوشیار اور ذہین نوجوانوں کی ضرورت ہے جو میری ہدایات کے مطابق کام کرتے رہیں۔''

''ہو جائے گا یہ کام...... اتفاق سے میرے کارخانے میں ایسے دو لڑکے ہیں۔ میں انہیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''ان جوانوں کو پستول وغیرہ چلانا آتا ہے؟''

''بڑی اچھی طرح...... دونوں کا نشانہ اچھا ہے۔ ان کے پاس ریوالور ہیں۔''

میں خوش ہو گیا ''یہ تو اچھی بات ہے۔ میں ان سے کل ملوں گا اور انہیں سمجھاؤں گا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں سختی سے منع کر دینا کہ یہ بات کسی اور کے علم میں نہ آئے۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔'' ہیری نے اعتماد سے کہا تھا۔

اگلے روز میں صبح سویرے گھر سے نکل گیا میرے پاس اپنا بنایا ہوا نقشہ تھا۔ کیونکہ مجھے خاصا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا اس لیے میں پاپا کا گھوڑا لیتا گیا۔ دوپہر تک میں نے اپنے نشان لگائے ہوئے سارے راستوں کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ یہ سارے راستے عام سڑکوں سے ہٹ کر تھے اور ان پر لوگ زیادہ تر قریبی جگہوں تک جانے کے لیے سفر کرتے تھے۔ درختوں اور بعض جگہ گھنے جنگلوں کے بیچ سے گزرنے والے یہ راستے عام نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں نے اپنا کام درست طریقے سے کر لیا ہے تو میں نے نقشے پر ان راستوں پر بعض جگہ نشانات لگائے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے چار نشان لگانے پڑیں گے اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ مجھے کل چار جگہوں پر نشان لگانے پڑے تھے۔

اسپن ٹاؤن میں چین کے ہوٹل میں لنچ کر کے میں نے ہیری کے کارخانے کا رخ کیا۔ اس کا کارخانہ وادی کی ایل کے کونے پر واقع تھا۔ یہ جگہ اسپن ٹاؤن سے کوئی پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ میں تین بجے ہیری کے کارخانے پہنچا۔ اس کی رہائش بھی اس سے متصل تھی۔ کاریگروں کے شیڈ میں وہ بیٹھا کاغذ پر ایک میز کا خاکہ تیار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر آواز لگائی ''نک...... شالوم ادھر آؤ۔''

ڈانگری پہنے دو نوجوان جن کی عمریں بیس اکیس برس تھیں اندرونی شیڈ سے باہر آئے۔ دونوں پُرجوش اور ذہانت کے حامل لگ رہے تھے۔ ہیری نے میرا تعارف کرایا اور ان سے کہا ''اب موبی تمہیں جو کہے تمہیں وہی کرنا ہے۔''

میں نے ان سے کہا ''ہمارا اصل کام رات کو شروع ہوگا۔'' پھر میں نے میز پر نقشہ بچھا کر انہیں سمجھایا ''یہ دیکھو اسپن ٹاؤن اور اس کے چاروں طرف سفر کے لیے شارٹ کٹ راستے ہیں۔ ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے لیکن یہ چار پوائنٹ ایسے ہیں جہاں پر کوئی شخص نگرانی کرے تو ان تمام راستوں پر سفر کرنے والا اس کی نظروں میں آئے بغیر نہیں رہتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' شالوم نے پُراعتماد لہجے میں کہا ''یہ بتاؤ کہ کوئی مشکوک فرد نظروں میں آئے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔''

''کچھ نہیں...... بس خاموشی سے اس کا پیچھا کرو اور انہیں کوئی غلط حرکت کرتے دیکھو تو یہ سیٹی بجا دینا۔ اس کے بجانے سے پہاڑی الو کی تیز چیخ جیسی آواز نکلتی ہے۔ اس سے کسی کو نگرانی کا شک نہیں ہوگا۔''

میں نے ان تینوں کو ایک ایک سیٹی دی اور انہیں سمجھانے لگا کہ کیا صورتِ حال پیش آئے تو انہوں نے کیا کرنا ہے۔

''ہمارا مقصد اس شیطانی گروہ کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں پورے صبر و تحمل سے نگرانی کرنا ہوگی کوئی ایسی جلد بازی نہیں کرنا ہوگی جس سے مجرم ہوشیار ہو کر فرار ہو جائیں۔''

''اگر اس بات کا خطرہ ہو کہ وہ اغوا کیے جانے والے بچے کو نقصان پہنچائیں تب......'' شالوم ذہین تھا اس نے میری بات سمجھ کر سوال کیا تھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ اپنے مخصوص ٹھکانے تک جانے سے پہلے کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ اس وقت تک ہمیں بھی صبر کا ثبوت دینا ہوگا۔ قبل از وقت کسی کارروائی سے وہ ہوشیار ہو گئے تو ان پر ہاتھ ڈالنا محال ہو جائے گا۔''

''اگر ہم نے ان کا ٹھکانا دیکھ لیا تب؟'' اس بار نک نے سوال کیا۔

''تب تم مجھے یا ہیری کو مطلع کرو گے اور ہم فوری طور پر شیرف کے دفتر کی طرف روانہ ہو جائیں گے اس دوران میں تم لوگ ان لوگوں کے ٹھکانے کی نگرانی کرو گے۔''

''ہمیں یہ کام کب سے کرنا ہے؟'' ہیری بولا۔

''آج رات سے...... اگرچہ ابھی پورا چاند ہونے میں نصف مہینہ ہے لیکن عین ممکن ہے۔ وہ لوگ وقت سے پہلے کارروائی کر گزریں۔''

''پورا چاند!'' ہیری چونکا تھا ''اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟''

''ہے۔'' میں نے ہیری کو بتایا۔ پھر میں نے اسے بتایا

کہ کس طرح اب تک کی بچوں کی اغوا کی وارداتیں چاند کے پورا ہونے سے پہلے ہی ہوئی ہیں ''شاید پورے چاند کا ان وارداتوں سے گہرا تعلق ہے۔''

''تم بالکل درست انداز میں تفتیش کررہے ہو۔'' ہیری نے پرجوش انداز میں کہا تھا ''مجھے یقین ہے تم ان مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب رہو گے جو بچے اغوا کررہے ہیں۔''

''تم نہیں...... ہم......'' میں نے تصحیح کی ''میں سرکاری نہیں...... بلکہ نجی حیثیت میں اس کیس کی تحقیق کررہا ہوں اور تم لوگوں کے تعاون کے بغیر میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔''

مگر ہیری بہت متاثر نظر آرہا تھا ''دیکھو گزشتہ پچاس سال سے کتنے ہی شیرف اس کیس پر کام کرچکے ہیں۔ وفاقی حکومت کے ایجنٹس بھی آئے لیکن کوئی بھی اس انداز میں کام نہیں کرسکا جیسے تم کررہے ہو۔ تم نے اسباب کے چکر میں پڑنے کے بجائے یہ دیکھا کہ وارداتیں کس طرح ہورہی ہیں اور انہیں روکنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔''

''شاید اسی وجہ سے کہ میں اس علاقے کا رہنے والا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وارداتوں میں یہیں کے لوگ ملوث ہیں۔ ایک بار ساری تفصیل پھر سے بتادوں تاکہ تم لوگوں کو کوئی شک نہ رہ جائے۔''

میں نے انہیں بتایا کہ انہیں کیا کیا کرنا ہے۔ میرے پیش نظر وارداتوں کا وقت بھی تھا۔ بیشتر وارداتیں جو رات میں ہوئیں۔ وہ گیارہ سے صبح چار کے درمیان میں ہوئی تھیں اس بات کا امکان تھا کہ واردات کرنے والے دن میں اپنا کام کر گزریں جیسا کہ انہوں نے پہلے بھی کئی بار کیا تھا۔ اس کے سدِباب کے لیے میں نے ہیری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ چند دنوں میں وادی کے ہر اس گھر میں جائے جہاں دو سال سے کم عمر کوئی بچہ ہو اور انہیں اپنے بچے کی حفاظت کا کہے۔ ہیری پریشان ہوگیا تھا۔

''اس طرح تو پورے اسپن میں سیکڑوں گھرانے ہیں جہاں دو سال سے کم عمر کا کوئی نہ کوئی بچہ ہوگا۔''

''ان کی کل تعداد ایک سو بیس ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا ''لیکن سب سے زیادہ خطرہ ان نو بچوں کو ہے کیونکہ یہ میرے نظریے کے مطابق خطرے کے بالکل پاس ہیں۔ تمہیں جاکر ان لوگوں کو خبردار کرنا ہے۔ اگر میں نے خود یہ کام کیا تو عین ممکن ہے ان شیطانی طاقتوں کی نظروں میں آجاؤں اور وہ محتاط ہوکر یہاں واردات کرنے کے بجائے کسی اور دور دراز گھر کا رخ کریں۔ اور تم بھی میرا نام نہیں لوگے بلکہ اپنے طور پر لوگوں کو خبردار کروگے۔''

''تم فکر مت کرو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔'' ہیری نے یقین دلایا۔

اس رات ہم چار افراد اسپن ٹاؤن کے نواحی جنگلات میں سے گزرنے والے راستوں پر نگرانی کررہے تھے۔ ہم سب ایک دوسرے سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ میں نے انہیں جو سیٹی دی تھی۔ اس کی آواز اتنے فاصلے تک آسانی سے آسکتی تھی۔

سردی سے بچنے کے لیے ہم سب نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس پستول تھا اور میرے پاس دو عدد پستول تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ٹارچیں تھیں۔ میں جس جگہ کی نگرانی کررہا تھا وہ اسپن ٹاؤن کے مشرق کی طرف جانے والے بیشتر راستوں کا مرکز تھی۔ اس طرف وادی کی سب سے زیادہ آبادی تھی۔ میں رات دس سے صبح پانچ بجے تک وہاں رہا۔ اکا دکا افراد میرے سامنے سے گزرے لیکن ان میں سے کوئی بھی مشکوک نہیں تھا۔ یہ سب عام سے افراد تھے جو شاید اپنے گھروں کی طرف جارہے تھے۔ رات دو بجے کے بعد کوئی شخص نہیں گزرا تھا۔ چند دن پہلے ہونے والی برف باری کی وجہ سے سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ جب کوئی خاص بات نہیں ہوئی تو طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم پانچ بجے ایک جگہ جمع ہوئے۔ کسی نے کوئی مشکوک فرد یا حرکت نہیں دیکھی تھی۔ پھر ہم اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے ہمیں نیند اور آرام کی ضرورت تھی۔

شام تک سونے اور آرام کرنے کے بعد میں ہیری کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہیری گھر پر ہی تھا۔ وہ تھکا ہوا ابھی آیا تھا۔ اس نے میرے بتائے سارے گھروں کو خبردار کردیا تھا کہ وہ اپنے بچے کی خاص حفاظت کریں۔ میں نے اس سے رات کا پروگرام طے کیا۔ اس بار میں ہنگامی حالات میں اشارہ دینے والی پھلجڑیاں بھی لایا تھا۔ رات کی تاریکی میں ان کی تیز روشنی دور سے نظر آتی تھی۔ اگر کسی فوری ضرورت کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو اشارہ دینے کی ضرورت ہوتی تو وہ ان پھلجڑیوں سے اشارہ دے سکتا تھا۔ ان کا طریقہ کار بھی آسان تھا۔ بہ وقتِ ضرورت انہیں کسی سخت چیز پر مار کر زمین پر پھینک دیا جاتا۔ ان سے چنگاریاں نکل کر اردگرد تیز روشنی کردیتیں۔ ساتھ ہی میں نے سب کو نیند بھگانے والی گولیاں بھی دیں۔

اس رات بھی کوئی مشکوک فرد یا حرکت سامنے نہیں آئی۔

تیسری رات ہیری ہمارے ساتھ نہیں جاسکا تھا۔ اس کی بیوی نے شام کو ایک بیٹے کو جنم دیا تھا اور وہ بیوی کی دیکھ بھال کے

لیے اپنے گھر میں موجود رہا تھا۔ بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے اگلی رات بھی نہیں آ سکا۔ اس رات میں دوبارہ مشرق کی طرف جانے والے راستے کی نگرانی کر رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ سرد اور بدن کو چیرنے والی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اب تک ایک فرد بھی اس راستے سے نہیں گزرا تھا۔ ظاہر ہے اتنی سردی میں کون اپنے گرم گھر یا بستر کو چھوڑ کر باہر آتا۔ چرمی جیکٹ اور اونی کپڑوں میں لپٹا ہونے کے باوجود میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں پرامید تھا۔ بچے اغوا کرنے والوں کے لیے یہ ایک آئیڈیل رات تھی۔ انہیں کسی کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔

دو بجے اچانک مجھے اپنے سامنے کی طرف جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ کوئی جانور ہے۔ اکثر پہاڑوں سے ریچھ اور دوسرے جانور سردی سے بچنے کے لیے نیچے آ جاتے تھے۔ لیکن جلد ہی جھاڑیاں ہٹیں اور ان میں سے ایک شخص نکلا اس نے سر سے پاؤں تک سیاہ چوغہ پہن رکھا تھا جس سے اس کے خدوخال بھی چھپ گئے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے ایک اور چوغہ پوش تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی تھی آخر کار وہ کردار سامنے آ گئے تھے جو ان مکروہ وارداتوں میں ملوث تھے۔

جھاڑیوں سے نکل کر وہ اسپن ٹاؤن سے مخالف سمت جانے والے راستے پر روانہ ہو گئے۔ جب وہ اتنی دور نکل گئے کہ میں صرف ان کا ہیولا ہی دیکھ سکتا تھا تو میں بھی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ میں پوری احتیاط سے ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ ان کا رخ شا خاندان کے گھر کی طرف ہے۔ آگے راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب انہوں نے شا خاندان کے گھر کی طرف جانے والے راستے کو منتخب کیا تھا۔ شا خاندان میں ایک دو سالہ بچہ تھا جو شیر خوار تھا۔ میرا دل کانپ گیا یہ لوگ مذموم عزائم کے ساتھ اس طرف جا رہے تھے۔ میں نے پستول پر اپنی گرفت سخت کر لی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر انہوں نے اس معصوم بچے کو اغوا کرنے کی کوشش کی تو میں انہیں آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن ڈاکٹر شا کے گھر کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ مکان کے چاروں طرف پیٹرومیکس کے تیز روشنی والے لیمپ روشن تھے۔ اندر روشن کھڑکیوں سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ جو مکان کے اندر ہیں جاگ رہے ہیں اور پھر ایک کھڑکی پر ایک رائفل بدست شخص کا سایہ نظر آیا تھا۔ اس چیز نے چوغہ پوشوں کو واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دبے قدموں پلٹے۔ میں جلدی سے ایک چوڑے تنے والے درخت کی آڑ میں ہو گیا۔

چوغہ پوش میرے پاس سے گزر کر جس راستے سے آئے تھے اس پر واپس جانے لگے جب وہ خاص فاصلے تک چلے گئے تو میں ان کا تعاقب کرنے لگا۔ تعاقب کا اختتام ان جھاڑیوں پر ہوا جہاں سے چوغہ پوش برآمد ہوئے تھے۔ وہ انہی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ جھاڑیاں ہلنے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصی دور نکل گئے ہیں ان کے جانے کے بعد میں جھاڑیوں میں گھسا اور حتی الامکان خاموشی سے ان کے پیچھے جانے لگا۔ جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں تعاقب کا یہ سلسلہ خاصی دیر جاری رہا۔ جب آواز آنا بند ہو جاتی تو میں بھی رک جاتا تھا۔ اگر میرے چلنے کی آواز ان تک پہنچ جاتی تو وہ چوکنا ہو جاتے۔ جب آواز آتی تو میں بھی آگے بڑھتا۔

اچانک آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ میں بھی رک گیا۔ جب خاصی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا وہ شک میں پڑ گئے تھے کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا ہے یا جھاڑیوں سے نکل گئے تھے۔ اس جنگل اور جھاڑیوں کا سلسلہ خاصی دور تک پھیلا ہوا تھا اور اسپن ٹاؤن کے پاس جا کر ختم ہوتا تھا۔ اس جنگل میں گزرنے کے مختلف راستے تھے۔ جب خاصی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تو میں نے خطرہ مول لے کر حرکت شروع کی۔ میں ہر ممکن آہستگی سے بے آواز طریقے سے آگے بڑھنے لگا پھر بھی کچھ نہ کچھ آواز پیدا ہو رہی تھی۔ اچانک میں نے خود کو جھاڑیوں سے پار پایا اور میں ایک گھر کے سامنے تھا۔ یہ گھر مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ کیونکہ یہ گھر کا عقبی حصہ تھا اس لیے میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ کیا وہ چوغہ پوش اب اس مکان کی طرف گئے تھے؟ کیا یہاں بھی کوئی چھوٹا بچہ تھا۔ میں جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے کی طرف جانے لگا اور سامنے والے حصے میں آتے ہی میں نے مکان پہچان لیا تھا۔ اعلیٰ درجے کی لکڑی اور پتھر سے بنا یہ مکان گریڈی ہاؤس تھا۔ میری معلومات کے مطابق گریڈی ہاؤس میں کوئی شیر خوار بچہ نہیں تھا پھر چوغہ پوش یہاں کیوں آئے تھے؟ اس سوال سے یہ سوال ابھرا کہ کیا چوغہ پوش گریڈی ہاؤس سے گئے تھے۔ اور ضمنی سوال یہ تھا کہ بچوں کے پراسرار اغوا کا تعلق گریڈی خاندان سے تھا۔

مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ آخر یہ خاندان کیوں بچے اغوا کر رہا تھا۔ میں خاصی دیر اس مکان کے چاروں طرف منڈلاتا رہا لیکن مجھے وہ پراسرار چوغہ پوش

دوبارہ نظر نہیں آئے گریڈی ہاؤس بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہاں کے سب لوگ سو چکے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔

باقی رات میں نے اپنی مقررہ جگہ نگرانی کرتے گزاری اور وقت گزاری کے لیے کیس کی کڑیاں آپس میں بٹھانے کے لیے ذہنی مشق کرتا رہا۔ گریڈی خاندان واحد مشکوک کے طور پر سامنے آیا تھا۔ چوغہ پوش گریڈی ہاؤس کے پاس جا کر غائب ہوئے تھے۔ پھر اس کیس کی تحقیق میں پہلے تو گریڈی خاندان کے انسپکٹر شیرز گریڈی نے مجھے کیس دینے سے انکار کیا اور اس کے بعد شیرف جیراڈ نے جس طرح مجھ سے تعاون کرنے سے انکار کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر اوپر سے دباؤ آیا تھا۔ گریڈی خاندان اثر و رسوخ والا تھا اور وہ شیرف پر دباؤ ڈلوا سکتا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ انسپکٹر شیرز گریڈی کو میری اس نجی تفتیش کا علم ہو گیا تھا۔

صبح میں نے ہیری کو رات ہونے والے واقعے سے آگاہ کیا تو اس کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا ''ہم ابھی شیرف کے پاس جا کر اسے بتاتے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''ابھی نہیں...... ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ لوگ صاف بچ نکلیں گے۔ بہتر ہوگا ہم نگرانی کرتے رہیں اور کوئی پکا ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''

ہیری نے سوچا ''مجھے شیرف جیراڈ بھی مشکوک لگتا ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں اس کے نائب پال کو اپنے ساتھ شامل کر لیں وہ میرا کزن ہے اور مجھے امید ہے میری بات مان جائے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''خیال اچھا ہے ہمیں بہر حال قانون کی مدد حاصل کرنا ہوگی۔ اگر پال ہمارے ساتھ شامل ہو گیا تو ہمیں آسانی ہو جائے گی۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''میں آج ہی اس سے بات کر لیتا ہوں۔'' ہیری نے کہا اور ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

آنے والی رات نگرانی شروع کرنے سے پہلے میں نے جیراڈ بل کے نائب پال ایڈگر سے ہیری کے مکان میں ملاقات کی۔ وہ تقریباً تیس برس کا سنجیدہ شخص تھا۔ اس نے میری بات سنی اور بولا ''بات مشکوک ہے لیکن یہ گریڈی خاندان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کو گریڈی ہاؤس میں نہیں جاتے دیکھا۔''

''یہی بات میرے ذہن میں ہے۔'' میں نے اعتراف کیا ''اسی وجہ سے ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑی جو قانون سے تعلق رکھتا ہو۔ میں وفاقی پولیس کا ایجنٹ ہوں لیکن باقاعدہ قانونی اتھارٹی کے بغیر میری کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے جب کہ تم وادی کے قانونی معاملات براہِ راست دیکھ سکتے ہو۔''

''اگر ایسی بات ہے تو تم مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔'' پال نے سوچ کر جواب دیا۔

ہیری کھل گیا ''مجھے یقین ہے ہم سب مل کر وادی سے ان پراسرار وارداتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔''

پال نے تجویز پیش کی ''ایک آدمی کو براہِ راست گریڈی ہاؤس کی نگرانی کرنی چاہیے۔ اگر چوغہ پوش وہاں سے برآمد ہوتے دیکھے گئے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان وارداتوں میں گریڈی خاندان کے افراد ملوث ہیں۔''

''میری تحقیق کا محور بھی ان لوگوں کی تلاش ہے۔ اس کے بعد بچوں کے اغوا کا معما حل ہو جائے گا۔''

طے پایا کہ گریڈی ہاؤس کی نگرانی پال کرے گا۔ وہ ہمارے ساتھ روانہ ہوا میں نے اسے گریڈی ہاؤس کے عقب تک جانے والا جھاڑیوں کا راستہ دکھایا ''میرا اندازہ ہے بچوں کو اغوا کر کے ایسے ہی راستوں سے لے جایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ کسی کی نظروں میں نہیں آتے۔''

پال نے میرے نظریے کی تائید کی۔ اسے وہاں چھوڑ کر میں نگرانی کے لیے اپنی جگہ آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اچانک چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ اس جگہ سے آئی تھی جہاں پر ہیری تھا۔ میں تیزی سے اس طرف روانہ ہوا۔ ہیری بے حد مضطرب تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''مجھے لگ رہا ہے میرے گھر میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرا ملازم پوٹر گھوڑے پر تیزی سے اسپن ٹاؤن کی طرف گیا ہے وہ اتنا بدحواس ہو رہا تھا کہ اس نے میری آواز بھی نہیں سنی تھی۔''

ہیری کی بات سن کر میرے اندر بھی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ابھی دو دن پہلے ہی ہیری کے ہاں بچہ ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''اپنے گھر چلو...... جلدی......'' ہم نے دوڑنا شروع کیا۔ ہیری آگے تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم ہیری کے گھر کے سامنے جا پہنچے۔ جہاں روشنیاں تھیں اور شدید سردی کے باوجود ہیری کے ملازمین اور گھر والے برآمدے میں موجود تھے چند لمحے بعد ہمارے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے۔ نامعلوم افراد نے ہیری کے بچے کو اغوا کر لیا تھا اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ملازم شیرف کی طرف گیا

تھا اور دوسرا ڈاکٹر کو بلانے...... ہیری اپنی بیوی کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہیری کی بیوی اپنی خواب گاہ میں بستر پر بے ہوش پڑی تھی۔ بہ ظاہر اس کے جسم پر کسی چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ اسے کوئی چیز سونگھائی گئی تھی یا وہ صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔

''مجھے تمہارے گھوڑے کی ضرورت ہے۔''

''تم اصطبل سے لے لو۔'' ہیری تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ وہ بے حد دکھی نظر آرہا تھا۔

میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا لیکن وقت نہیں تھا۔ میں گھوڑا لے کر تیزی سے روانہ ہوگیا۔ دس منٹ کے اندر میں گریڈی ہاؤس کے پاس تھا۔ گھوڑے کو درخت سے باندھ کر میں جھاڑیوں سے ہوتا ہوا اس طرف بڑھا جس طرف میں نے پال کو چھوڑا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا کہ پال اپنی جگہ سے غائب تھا۔ وہ کہاں چلا گیا۔ میں نے ٹارچ جلا کر زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں پر گزشتہ رات ہونے والی ہلکی بارش کے بعد زمین پر قدموں کے نشانات نمایاں تھے۔ پال کے جوتے کے علاوہ اور بھی کئی نشانات بنے تھے۔ سب سے بڑھ کر ایک جگہ معمولی مقدار میں خون بھی تھا۔ پال غائب کیا گیا تھا۔ اگر وہ زندہ بھی تھا تو اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ چونغہ پوش سچ مچ شیطانی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے ہماری نگرانی کے باوجود نہ صرف ہیری کے بچے کو اغوا کرلیا تھا بلکہ پال پر بھی وار کر گئے تھے۔ نہ جانے وہ کیسے اس کے وجود سے واقف ہوئے۔ گریڈی ہاؤس کسی تاریک قلعے کی طرح خاموش اور پُراسرار تھا۔

میں واپس ہیری کے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر پال اور ہیری کا بچہ زندہ بھی تھے تو ان کی جان خطرے میں تھی۔ اس سے پہلے کہ انہیں نقصان ہوتا گریڈی ہاؤس پر چھاپا مارا جانا ضروری تھا۔ شیرف جیراڈ ہیری کے مکان میں موجود تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے مختصر الفاظ میں اب تک کی تحقیق اور پال کے غائب ہونے کی خبر سنائی۔ ''اس سے پہلے کہ اسے کوئی نقصان ہو گریڈی ہاؤس پر ریڈ لازمی ہے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا ثبوت ہے کہ وہ لوگ اس معاملے میں ملوث ہیں۔'' شیرف ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

''اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ گریڈی ہاؤس کی نگرانی کرنے والا پال غائب ہے۔ میں نے خود وہاں زمین پر خون پڑے دیکھا تھا۔''

ہیری جو اب تک خاموش بیٹھا تھا ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا ''شیرف اگر تم کچھ نہیں کر سکتے ہو تو میں خود وہاں جاؤں گا۔ میرے بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔''

ہیری نے اپنے ملازم جمع کیے اور انہیں مسلح ہو کر چلنے کے لیے کہا۔ شیرف نے اسے روکنا چاہا ''ہیری تم حماقت کر رہے ہو میں تمہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''مجھے تم بکے ہوئے لگتے ہو۔'' ہیری اس وقت جیسے دیوانہ ہو رہا تھا ''تمہیں چلنا ہے تو چلو ورنہ اپنے دفتر میں جا کر بیٹھو۔''

شیرف جیراڈ بل سوچتا رہا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ مان جائے ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر اس نے اثبات میں سر ہلایا ''لیکن ایسی کوئی بات نہ نکلی تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔''

ذرا سی دیر میں ہم سب گھوڑوں پر سوار گریڈی ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ شیرف کے تین نائبین کے علاوہ ہم چھ افراد بھی تھے گویا کل دس آدمی تھے اور ہم سب مسلح تھے۔ ہم سب سامنے ....کی طرف سے پہنچے تھے۔ اس سے پہلے کہ شیرف گھنٹی بجاتا اس نے کچھ افراد کو مکان کی عقبی سمت میں بھیج دیا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور ایک شخص باہر آیا۔ اس نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے شیرف......تم اتنی رات گئے کیوں آئے ہو؟''

اس شخص کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن وہ نیند میں قطعی نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا وہ انسپکٹر گریڈی کا کزن اور خاندان کے موجودہ سربراہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ شیرف نے نرم لہجے میں کہا ''میں قانون کے نام پر تمہارے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ مجھے شبہ ہے ایک بچہ اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے شیرف۔'' اس نے برہمی کا مظاہرہ کرنا چاہا لیکن ہیری نے آگے بڑھ کر اپنی شاٹ گن اس کے پیٹ پر رکھ دی تھی۔

''اندر چلو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' ہیری کے لہجے میں ایسی درندگی تھی کہ وہ لرز گیا پھر شیرف کے اشارے پر ہم سب اندر گھس گئے۔ شیرف نے اپنے نائبین کو حکم دیا کہ سب گھر والوں کو بڑے سے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

''شیرف تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' ڈین گریڈی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ''یہاں کوئی اغوا شدہ بچہ نہیں ہے۔''

ذرا سی دیر میں شیرف کے ماتحت سب کو جمع کر کے لے آئے تھے۔ یہ کل تیرہ افراد تھے۔ شیرف نے تیز نظروں سے انہیں دیکھا ''ایلن اور سبسٹن کہاں ہیں؟''

ایلن......ڈین کے باپ کا نام تھا وہ گریڈی خاندان کا

سربراہ تھا۔ سبسٹن اس کا بھائی تھا۔ ڈین نے ہونٹوں پر زبان پھیری ''وہ دونوں باہر گئے ہیں لیکن کہاں یہ مجھے بھی نہیں معلوم......''

''انہیں گھر میں تلاش کرو اور بچے کو بھی دیکھو۔'' شیرف نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ان کے ساتھ میں اور ہیری بھی اندر گئے۔ گریڈی ہاؤس خاصا وسیع وعریض مکان تھا۔ اوپر نیچے ملا کر اس میں پندرہ سولہ کمرے تھے۔ ایک گھنٹے میں ہم نے مکان کا ایک ایک کونا چھان مارا لیکن نہ تو ہیری کا بچہ نظر آیا اور نہ پال ملا۔ جب کہ مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں اسی مکان میں تھے شاید یہاں کوئی خفیہ جگہ بھی تھی۔ میں نے واپس آ کر شیرف کو ناکامی سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر مایوسی کے ساتھ تشویش بھی چھا گئی تھی۔ شاید اسے جواب دہی کا خوف ستا رہا تھا لیکن اسی لمحے میری نظر ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے صورتِ حال بدل دی۔ صوفے کے نیچے کوئی چیز چمک رہی تھی۔ میں نے جھک کر اسے نکالا۔ یہ سونے کے پانی والی جیبی گھڑی تھی اور اسے میں نے پال کے پاس دیکھا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔

''یہ دیکھو پال کی گھڑی ہے۔ وہ یہیں ہے۔''

اس بار شیرف کے تاثرات بے حد تیزی سے بدلے تھے اس نے لپک کر گھڑی لی اور پھر اپنے ایک نائب کو حکم دیا کہ جا کر اس کے باقی ماتحتوں اور رضا کاروں کو لے آئے۔ اس نے گریڈی خاندان کے لوگوں سے کہا ''دیکھو مجھے بتا دو کہ پال اور ہیری کا بچہ کہاں ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کروں گا۔''

''ہمیں ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔'' ڈین نے کھوکھلی سی آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

میں قصہ مختصر کرتا ہوں۔ ماتحتوں اور رضا کاروں کے آتے ہی شیرف نے مکان کی بھرپور طریقے سے تلاشی لی اور ایک خفیہ تہ خانہ تلاش کر لیا جہاں نہ صرف ایلن اور اس کا بھائی سبسٹن موجود تھے بلکہ پال بھی ایک طرف بندھا پڑا تھا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان دو درندوں نے ہیری کے نومولود بچے کو پتھر کی ایک سل پر لٹا کر ذبح کر دیا تھا اور اس معصوم کا خون پیالے میں بھر کر شیطان کے بندر نما بت کو اس سے غسل دیا تھا۔ یہ فٹ بھر لمبا ویسا ہی بت تھا جیسا کہ مجھے ہنری اور جولیا کے گھر سے ملا تھا۔ ایلن اور سبسٹن چوغہ نما لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے گلوں میں سیاہ ڈوریوں سے بندھے ویسے ہی مجسمے لٹک رہے تھے۔ جب وہ میکناز کو اغوا کرنے گئے تھے تو ہنری سے ہاتھا پائی کے دوران ایک مجسمہ ڈوری سے نکل کر گر گیا تھا اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایلن اور سبسٹن ہی جولیا اور ہنری کے قتل اور میکناز کے اغوا میں ملوث تھے۔ معصوم بچے کی لاش دیکھ کر مجھے ننھا میکناز یاد آ گیا تھا۔ اسے بھی اسی طرح اس مکروہ بت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ جو شیطان کا تھا۔ جب ایلن اور سبسٹن کو گرفتار کیا جانے لگا تو ایلن نے چلا کر کہا تھا ''شیطان دیوتا تمہیں تباہ کر دے گا۔''

فساد کے خطرے کے پیش نظر شیرف نے شہر سے بھاری نفری منگوالی تھی ورنہ علاقے کے لوگ مشتعل ہو کر گریڈی خاندان کے کسی فرد کو زندہ نہ چھوڑتے۔ ہیری اپنے بچے کی لاش دیکھ کر غم و غصے سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ اگر میں اس سے شاٹ گن نہ چھین لیتا تو وہ ایلن اور سبسٹن کو مار دیتا۔ اگلے روز اس اطلاع نے وادی کے لوگوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ پولیس کے پہرے کے باوجود انہوں نے گریڈی ہاؤس پر حملہ کیا اور پتھر مار کر اس کے شیشے توڑ ڈالے۔ اس خاندان کے سارے افراد گرفتار کر لیے گئے تھے۔ جو گھر میں نہیں تھے انہیں بعد میں گرفتار کیا گیا۔ انسپکٹر گریڈی اطلاع پاتے ہی فرار ہو گیا تھا لیکن ایک مہینے بعد اسے سرحد پار کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔

شیرف اور اس کے ماتحتوں نے بے حد محنت سے تفتیش کی اور اس سارے جرم کی پوری تاریخ کھود نکالی۔ یہ لوگ کئی صدیوں سے شیطان کے پجاری تھے۔ جب اسکاٹ لینڈ میں ان کی حرکتوں کا پول کھلنے لگا تو یہ وہاں سے فرار ہو کر کینیڈا کے اس دور دراز علاقے میں آ بسے تھے۔ کچھ عرصے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے اپنی مکروہ سرگرمیاں دوبارہ شروع کیں اور شیطان کو معصوم بچوں کی بھینٹ دینے لگے۔ ان بچوں کی ہڈیاں بعد میں گریڈی ہاؤس کے پاس ایک تاریک کنویں سے برآمد ہوئی تھیں۔

گریڈی خاندان کے سترہ افراد پر مقدمہ چلا لیکن سزا صرف چھ کو ہوئی۔ ایلن اور سبسٹن کو ان کے چار بیٹوں سمیت سزائے موت سنادی گئی اور اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ باقی افراد کو معمولی سزائیں ہوئیں یا وہ رہا کر دیے گئے۔ لیکن علاقے کے باسی انہیں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ وادی چھوڑ کر چلے گئے۔ آخر میں بتا دوں کہ پال کی گھڑی نے انہیں پکڑوا دیا تھا جو اس نے موقع پا کر صوفے کے نیچے پھینکی تھی تا کہ ہم وہاں آئیں تو جان جائیں کہ پال وہیں ہے۔

کارلوس قاہرہ سے طویل پرواز کے بعد سنگاپور کے راستے انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ پہنچا۔ وہاں سے ایک چھوٹے جیٹ طیارے نے اسے انڈونیشیا کے ایک مغربی جزیرے پر اتارا جہاں سے ایک ہیلی کاپٹر اسے لے کر جنوب مشرقی بحر الکاہل کے کھلے سمندر میں لنگر انداز بحری جہاز ''ایس ایس سائپرس'' کی طرف روانہ ہوا۔ سائپرس دنیا کے بڑے کروز شپ میں شامل تھا اور اس پُرتعیش بحری جہاز پر بحیثیت مسافر صرف ارب پتی حضرات ہی قدم رکھتے تھے یا بڑے اسپورٹس مین اور معروف فلمی اداکار اور اداکارائیں اس پر مہمان کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے۔ کارلوس کے لیے ایک شاہی سوٹ ہمیشہ مخصوص رہا کرتا تھا۔ اس کا تعلق اسپین کے شاہی خاندان سے رہا تھا۔ کارلوس کی ماں لبنانی اور باپ اسپینی تھا۔ ان دونوں نسلوں کے ملاپ سے کارلوس میں ایسی مقناطیسی کشش آ گئی تھی کہ عورتیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ دنیا کے چالیس سے زیادہ ممالک میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ کارلوس سیمی کنڈکٹر بنانے والی ایک بڑی کمپنی کا مالک تھا جس کے گاہکوں میں ٹی وی بنانے سے لے کر ایٹمی آبدوزیں بنانے والے ادارے تک شامل تھے۔ کارلوس نے محض بیس لاکھ ڈالرز سے یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ اور دس سال بعد وہ اربوں ڈالرز کے اثاثوں کا مالک تھا۔

دل کی گہرائیوں پر اثر کرتی ایک طرح دار مغربی کہانی

کاشف زبیر

ایک ارب پتی کے بے خانماں ہو کر دنیا سے کٹے جزیرے پر جا پہنچنے کا ماجرا، وہاں اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مگر بہت کچھ تھا لیکن جو کچھ وہاں تھا وہ اس کے لیے صرف وہیں بامصرف تھا اور اس کی وجہ وہ خود جانتا تھا۔

کارلوس جتنی تندہی سے اپنے بزنس کو فروغ دیتا تھا اور اس نے گڈ بزنس مین کی ساکھ بنا رکھی تھی۔ کاروبار سے فارغ ہو کر وہ اتنا ہی کھل کر تفریح اور عیاشی کرتا تھا۔ ہر ملک میں جہاں اس کا کاروبار تھا، حسین ترین عورتیں اس کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ ان میں عام عورتوں سے لے کر شوبزنس کی جان تک سب ہوا کرتی تھیں۔ کارلوس جہاں جاتا، پہلے کاروباری اُمور نمٹاتا اور اس کے بعد اپنی من پسند عورت کو لے کر تفریحی مقامات کی طرف نکل جاتا تھا۔ اسے سمندر سے عشق تھا کیونکہ جنوبی اسپین کے ایک ساحلی قصبے میں پلا بڑھا تھا۔ دوسرا یہ کہ سمندر اس کی مصروفیات کی پردہ پوشی کرتا تھا۔ وہ معروف شخص تھا اور میڈیا اس کی ٹوہ میں رہا کرتا تھا۔ سمندر کے دور دراز حصے اس کی گرفت سے آزاد تھے۔ دنیا کی درجن بھر بندرگاہوں پر اس کی تفریحی کشتیاں کھڑی رہا کرتی تھیں۔

نئے سال کے موقع پر اس کے پاس بے شمار جگہوں سے دعوت نامے آتے تھے لیکن اس نے سائپرس کا انتخاب کیا تھا۔ اس جہاز میں شوبز اور بزنس کی تقریباً تین ہزار معروف ترین شخصیات جمع ہو کر نئے سال کا جشن مناتیں۔ ان میں سے ایک کارلوس بھی تھا۔ تفریح اور کاروبار کے لیے سائپرس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ خاص طور سے ہالی ووڈ کی نئی ساحرہ کیٹ کی موجودگی وہ کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ چھ مہینے پہلے میکسیکو کے ایک ہوٹل میں کیٹ سے ہونے والی مختصر اور پُراثر ملاقات اسے اب تک یاد تھی۔

قاہرہ سے انڈونیشیا کے مغربی جزیرے تک کا سفر بہ عافیت طے ہوا تھا لیکن جب ہیلی کاپٹر ساحل سے کوئی دو سو میل کے فاصلے پر آیا تو اچانک اس کے انجن میں خرابی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ کارلوس خود بھی اچھا پائلٹ تھا اور چند خوفناک جھٹکوں کے بعد ہی اس نے لائف جیکٹ کی تلاش شروع کر دی تھی۔ جس وقت اس نے لائف جیکٹ پہنی، ہیلی کاپٹر کا انجن بند ہو چکا تھا اور وہ بڑی تیزی سے پانی کی طرف جا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ چھپاکے سے پانی سے ٹکرایا۔ کارلوس نے دیکھا ونڈ اسکرین ٹوٹ کر پائلٹ اور اس کے ساتھی کو لگی تھی۔ ایک ثانیے کے اندر ہیلی کاپٹر میں پانی بھر گیا تھا۔ کارلوس نے اپنے اوسان بحال رکھے۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر کے اندر پوری طرح پانی بھرا اس نے کوشش کر کے دروازہ کھولا اور تیرتا ہوا سطح کی طرف جانے لگا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ تیزی سے اُوپر جانے کے لیے اس نے ڈوری کھینچ کر لائف جیکٹ میں ہوا بھر لی تھی۔ چند لمحے بعد وہ سمندر کی سطح پر تیرتا ہوا سانس لے رہا تھا۔

حادثے کی چند نشانیاں اس کے اردگرد تیر رہی تھیں۔ پائلٹ اور اس کے ساتھی کو نکلنے کا موقع نہیں ملا اور اب ان کے بچنے کا امکان بھی نہیں رہا تھا۔ اگر وہ لائف جیکٹ نہ پہنتا تو اس کی لاش بھی ہیلی کاپٹر میں پھنسی رہ جاتی کیونکہ ڈوبنے کے بعد ہیلی کاپٹر بڑی تیزی کے ساتھ تہ کی طرف گیا تھا۔ کارلوس نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ شام کا وقت تھا اور سورج ڈوبنے والا تھا۔ اندھیرا چھانے کے بعد اس کی تلاش بہت مشکل ہو جاتی۔ پھر وہ دنیا کے جس حصے میں تھا وہاں سمندر میں تلاش اور امدادی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہ ہیلی کاپٹر بھی اس کے لیے خاص طور سے جکارتہ سے ہائر کر کے منگوایا گیا تھا۔

کارلوس نے تیزی سے تجزیہ کیا تھا۔ اسے تلاش کیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ کم سے کم اگلی صبح سے پہلے کسی قسم کی امدادی پرواز کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر اگلی صبح اس کی تلاش شروع بھی کی جاتی تو اتنے وسیع رقبے پر پھیلے سمندر کو کھنگالنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ وسائل درکار تھے۔ یعنی اس کو تلاش کیے جانے کا امکان چند فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بزنس نے اسے سکھایا تھا، کامیابی بعض اوقات غیر متوقع طور پر ملتی ہے۔

سورج ڈوبتے ہی تاریکی چھا گئی تھی۔ لائف جیکٹ کی وجہ سے اسے تیرنے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ اچانک کسی شے نے اس کی پتلون پر کاٹنے کی کوشش کی۔ اس نے جلدی سے پاؤں چلایا۔ کوئی خاصی بڑی سی مچھلی یا سمندری مخلوق تھی جو لات کھا کر بھاگ گئی۔ اس نے ضروری سمجھا کہ ہاتھ پاؤں چلاتا رہے ورنہ دیگر سمندری مخلوقات اسے مردہ سمجھ کر کھانے کی کوشش کریں گی اور کسی نے اس کی لائف جیکٹ پھاڑ دی تو وہ مارا ہی جائے گا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا جیسے وہ پانی کے دھارے کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ اس نے ہراساں ہو کر ہاتھ پاؤں مارے پھر اسے یاد آیا کہ سمندر میں اس قسم کے دھارے ہوتے ہیں۔ یہ دھارا بھی اسے ساتھ لیے جا رہا تھا۔ یعنی وہ جائے حادثہ سے اسے دور لے جا رہا تھا اور یوں تلاش کیے جانے کا امکان مزید کم ہو جاتا۔ یہ سوچ کر اس نے دھارے کے خلاف تیرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن ذرا سی دیر میں اس کے بازو شل ہو گئے تھے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد اس نے تھک کر ہتھیار ڈال دیے تھے اور خود کو دھارے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ کئی

گھنٹے گزرنے کے بعد اس پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ خاصی دیر تک وہ اس سے لڑتا رہا اور پھر اس نے موت کو اٹل سمجھتے ہوئے غشی کی آغوش میں پناہ لے لی۔

☆☆☆

اچانک اسے لگا جیسے کوئی اس کے پاس ہی بات کر رہا ہو۔ اس نے آنکھیں کھولیں سامنے ہی ایک سادہ اور معصوم سا چہرہ تھا۔ یہ کوئی لڑکی تھی۔ سلونی سنہری رنگت، سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں، ہلکی سی متورم اور چھوٹی سی ناک۔ وہ اسے ایک تحیر کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ وہ کراہ کر اُٹھا تو لڑکی جلدی سے پیچھے ہوگئی۔ کارلوس نے دیکھا وہ ساحل پر پڑا تھا اور ذرا فاصلے پر ناریل کے گھنے درختوں کا سلسلہ تھا۔ نہ جانے وہ کیسے اس سمندری دھارے سے بچ کر اس جزیرے تک آ گیا تھا۔ پورے جسم میں تشنجی سا درد تھا اور گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ذرا سا سر اُٹھا کر لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی نے گلے سے گھٹنوں تک ایک ڈھیلا سا لباس پہن رکھا تھا اور یہ لباس کپڑے کے بجائے باریک بیلوں سے بن کر تیار کیا گیا تھا۔ کارلوس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ وہ کسی غیر متمدن جزیرے میں آن پھنسا تھا۔ بہرحال سمندر میں ڈوب کر مرنے سے یہ بہتر ہی تھا بشرطیکہ اس لڑکی کے قبیلے والے وحشی نہ ہوتے۔

کارلوس نے سب سے پہلے لائف جیکٹ اور چمڑے کے اکڑ جانے والے جوتے اُتار پھینکے۔ اسے سکون ملا تھا پھر اس نے لڑکی سے اشارے سے پانی کا کہا۔ ہاتھ سے پینے کا انداز بتایا۔ لڑکی اس کے نزدیک آئی اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر بے تکلفی سے ایک طرف لے جانے لگی۔ ایک جھنڈ سے گزرتے ہوئے دو مردوں نے انہیں دیکھا اور ساتھ ہولیے۔ وہ اپنی زبان میں لڑکی سے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ جواب دیتی جا رہی تھی۔

چشمے تک پہنچتے پہنچتے درجن بھر مرد و زن کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہو گیا تھا۔ کارلوس نے بے تابی سے اُوپر سے آنے والے اس قدرتی چشمے کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ اس کے حواس ٹھکانے آئے تو اس نے پہلی بار ان لوگوں کا جائزہ لیا۔ یہ تمدن سے دور لیکن پُرامن قسم کے انسان تھے۔ ان میں سے نہ تو کسی کے پاس کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی چہرے پر خوفناک تاثرات۔ اس کے برعکس وہ اسے ایک تجسس آمیز دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے اس کے لباس کو ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن لڑکی کے کہنے پر پیچھے ہٹ گئے۔

صبح کی روشنی پھیل چکی تھی یعنی وہ رات بھر سمندر میں رہا تھا اور صبح سویرے کسی وقت جزیرے تک پہنچا تھا۔ یہ جگہ اسے جزیرہ ہی لگ رہی تھی۔ ایک طرف بلند سی چوٹی تھی جس کے اُوپر بادل چھائے ہوئے تھے اور نیچے گھنا جنگل تھا۔ لڑکی پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگی۔ ذرا دیر بعد وہ بانس کے تنوں اور ناریل کے پتوں سے بنے جھونپڑوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہی خلقت بھی جمع ہوگئی تھی۔ لڑکی شاید اسے اپنے جھونپڑے تک لائی تھی۔ اسے ایک طرف بچھے گھاس کے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ کھانے پینے کا سامان نکالنے لگی۔ تازہ ناریل اور گزشتہ رات کی بھنی مچھلی کے قتلے تھے۔ عام حالات میں وہ ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتا لیکن اس وقت بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ وہ بلاتکلف کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی بے تابی دیکھ کر لڑکی کہیں اور سے مچھلی کے کچھ قتلے اور لے آئی۔

اس دوران میں جھونپڑی کے باہر کوئی ڈھائی تین سو افراد جمع ہو چکے تھے اور یہی اس جزیرے کی کل آبادی تھی۔ یہ سب انڈونیشیا کی مخصوص نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے جسم قدرے مضبوط اور طویل قامت اور رنگت صاف

تھی۔ جسم کسے ہوئے اور چست تھے یعنی وہ محنت والے کام زیادہ کرتے تھے۔ چند گھنٹوں میں کارلوس ان لوگوں کی طرف سے بالکل مطمئن ہوگیا تھا۔ وہ اس کے لیے خطرہ نہیں تھے بلکہ اس کی آمد سے خوش تھے کیونکہ ناشتے کے بعد ہر شخص ہی اس کے لیے کھانے کی کوئی نہ کوئی شے لیے چلا آ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں لڑکی کا جھونپڑا ان چیزوں سے بھر گیا تھا۔ کچی اور پکی ہوئی مچھلی، پرندوں کے اُبلے انڈے، ناریل کا تازہ اور خشک گودا اور بعض مقامی پھلوں کے ساتھ اناناس بھی تھا۔

آخر میں ایک بوڑھا سا سفید بالوں والا مرد آیا تھا۔ وہ اس سے اپنی زبان میں کچھ پوچھنے لگا۔ کارلوس کو ہسپانوی کے علاوہ انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانیں آتی تھیں مگر یہ ظاہر ہے کوئی مقامی زبان تھی اور شاید ایسی زبان جو صرف اس جزیرے پر بولی جاتی تھی کیونکہ اب تک کارلوس کو کوئی ایسی نشانی نظر نہیں آئی تھی جس سے پتا چلتا کہ اس جزیرے کے باسیوں کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ ہے۔ ان کے پاس کوئی دھاتی چیز نہیں تھی اور نہ ہی کسی نے کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ متمدن دنیا سے بے خبر نظر آتے تھے۔ کارلوس نے اشاروں سے بوڑھے مرد کو بتایا کہ وہ بہت دور سے آیا ہے۔ اور حادثاتی طور پر اس جزیرے تک پہنچا ہے۔ اس دوران میں لڑکی اس کی طرف سے کچھ بولتی رہی تھی۔ شاید اس نے خود کو کارلوس کا ترجمان مقرر کرلیا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے نے کارلوس کے جوتے اور لائف جیکٹ اسے لاکر دی تھی۔ وہ جوتوں کی ضرورت محسوس کررہا تھا حالانکہ اس جزیرے پر پیروں کو تکلیف دینے والی کوئی شے اب تک کارلوس نے محسوس نہیں کی تھی۔ آنے جانے والے تمام راستے صاف ستھرے تھے اور ان پر نرم چکنی مٹی تھی جو پیروں سے چپکتی بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود کارلوس ننگے پاؤں چلنے میں اُلجھن محسوس کررہا تھا۔ جوتے خشک اور اپنی اصل حالت میں آ گئے تھے۔

بوڑھے نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ان کے کاموں پر روانہ کردیا اور کارلوس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ پیٹ بھرنے کا خمار الگ طاری تھا۔ لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام ہوچکی تھی اور باہر الاؤ اور مشعلیں روشن کی جارہی تھیں۔ وہ اُٹھا اور باہر آیا۔ لڑکی چند دوسری عورتوں کے ساتھ نزدیک ہی ایک الاؤ پر مچھلی بھون رہی تھی جس کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ لوگ مچھلی کیسے پکڑتے تھے کیونکہ کارلوس نے ساحل پر ایک بھی کشتی نہیں دیکھی تھی۔

لڑکی اسے دیکھتے ہی لپک کر آئی اور جوش و خروش سے کچھ کہنے لگی پھر اس نے مچھلی کے فرائی کیے جانے والے قتلوں کی طرف اشارہ کیا۔ چند اور عورتیں تیز دھار والے پتھروں سے مچھلیوں کی صفائی کر کے ان کے قتلے بنا رہی تھیں۔ کارلوس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے سالم پکی مچھلی سے گھن آتی تھی۔ ایک طرف مرد تاڑی کے درختوں سے لکڑی کی بنی ہانڈیوں میں جمع ہونے والی تاڑی اُتار رہے تھے۔ یہ یہاں کی مقامی شراب تھی۔ کارلوس تاڑی کے ذائقے سے آشنا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک شخص نے لکڑی کا برتن اسے لادیا جس میں تاڑی بھری ہوئی تھی۔

تاڑی خوش ذائقہ اور ہلکے سے کیف آگیں نشے سے بھرپور تھی۔ چند گھونٹ پی کر کارلوس کو سرور آنے لگا تھا۔ وہ مردوں کی ٹولی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ اسے دیکھ کر چپ ہوگئے تھے۔ کارلوس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنی بات جاری رکھنے کو کہا تو وہ دوبارہ چہکنے لگے تھے۔ ان کا انداز خوش گپیوں والا تھا۔ سارے دن کی محنت کے بعد یہی ان کی تفریح تھی۔ عورتیں کھانا بنانے کے ساتھ آپس میں باتیں بھی کررہی تھیں۔ ان کی نسوانیت سے بھرپور ہنسی فضا میں منتشر ہورہی تھی۔ ان آوازوں کے پس منظر میں چھوٹے بچوں بچیوں کے کھیلنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماحول سکون، خوشیوں اور امن سے پُر لگ رہا تھا۔ بانس کے تنے گاڑ کر ان پر مشعلیں لگائی گئی تھیں۔ یہ ایک طرح سے اسٹریٹ لائٹس تھیں۔ ان کی روشنی سے یہ پورا میدان جگمگا رہا تھا جس کے گرد دائرے میں جھونپڑیاں تھیں۔

کارلوس نے محسوس کیا جھونپڑیاں ایک خاص ترتیب سے بنائی گئی تھیں۔ ان کے لیے زمین کو خاص طور سے صاف، ہموار رکھتے ہوئے ساحل کی طرف ہلکا سا ڈھلان رکھا گیا تھا تاکہ بارش کا پانی رُکنے نہ پائے۔ اُوپر ڈھلان سے آنے والے پانی کو روکنے کے لیے بستی کے باہر نیم دائرے میں ایک پتھروں اور مٹی سے دیوار بنائی تھی۔ جھونپڑیاں عام سطح زمین سے فٹ بھر اُونچی تھیں۔ کارلوس کو یہ لوگ تعلیم اور تمدن سے دور ہونے کے باوجود ذہین لگے تھے۔ میدان میں گھاس اُگائی گئی تھی جسے باقاعدگی سے تراشا جاتا تھا۔ الاؤ جلانے کے لیے پتھروں سے بنے چولہے تھے۔

جب کھانا بنا تو سب سے پہلے بچوں کو دیا گیا۔ کارلوس کے لیے یہ حیرت انگیز تھا کیونکہ اس قسم کے قبائلی معاشروں میں مردوں کو ہر معاملے میں اولیت دی جاتی ہے۔ عورتوں اور بچوں کا نمبر آخر میں آتا ہے۔ تمام بچے جن میں بارہ سال

کی عمر تک کے لڑکے لڑکیاں شامل تھے، مشترکہ طور پر کھانا کھا رہے تھے۔ جب وہ کھا چکے تو اپنا دسترخوان اُٹھا کر اور جھاڑ کر جھونپڑیوں کی طرف چلے گئے تھے۔ گویا اب مردوں اور عورتوں کی باری تھی۔ اس بار ناریل کے زیادہ پتے بچھائے گئے تھے۔ یہ کام نوجوان لڑکے لڑکیوں نے کیے تھے۔ اس کے بعد ان پر مچھلی کے قتلے، ناریل، اناس اور مقامی پھل سجا دیے گئے۔ لکڑی کے بڑے پیالوں میں پانی اور ناریل کا دودھ تھا۔

کارلوس کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بوڑھے سردار کے برابر میں جگہ ملی تھی اور اس کے سامنے خاص طور سے جھینگوں کی ڈش رکھی گئی تھی۔ شاید جھینگے عام نہیں ملتے تھے اس وجہ سے خاص ڈش تھی۔ سب کچھ مزے کا تھا حتیٰ کہ کارلوس کو اناس اور ناریل کا ذائقہ بھی مختلف لگا تھا۔ شاید آلودگی اور کیمیائی کھادوں سے پاک زمین پر پیدا ہوتے تھے اس لیے بہترین ذائقہ رکھتے تھے۔ کھانے کا یہ دور خاصی دیر تک چلا تھا۔ جب سب سیر ہوئے تو بچا کھچا کھانا سمیٹ کر صبح کے لیے رکھا جانے لگا۔ دسترخوان میدان سے باہر جھاڑے گئے۔ میدان صاف کیا گیا۔ اس کے بعد مردوں نے نئے سرے سے تاڑی کے پیالے بھرے اور میدان میں دائرے میں بیٹھ گئے۔ نوجوان لڑکیاں اور عورتیں وسط میں آگئیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دائرے میں گھومنے اور دھیمی لے میں کچھ گانے لگیں۔ یہ دھیما سا رقص اور دھیمی لے کا گانا کارلوس کو عجیب سا لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ اسے خون گرما دینے والے میوزک پر پارے کی طرح مچلتے جسموں کو دیکھنے کی عادت تھی۔ پھر عورتوں نے ہاتھ چھوڑ دیے اور تالیوں سے تال دینے لگی تھیں۔ مرد بھی ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔ پھر عورتیں دائروں میں گھومنے لگیں۔ شانے ایک طرف جھکاتے ہوئے اس طرح دائرہ مکمل کرتی تھیں کہ ایک عورت کا سر دوسری کے اُٹھے بازو تلے سے گزر جاتا تھا۔ ان کے رقص میں اتنی ترتیب اور نظم تھا کہ کارلوس نے صرف اعلیٰ ترین اوپیراز کے رقاصوں میں یہ بات دیکھی تھی۔ وہ مسحور رہ گیا تھا۔ کمال کا رقص تھا سادہ ترین اور پرکار۔ ایسا رقص جس سے ان عورتوں کی نسوانیت کا بھرپور اظہار ہوتا تھا لیکن ہوس کی جھلک تک نظر نہیں آتی تھی۔ اچانک عورتیں ساکت ہوئیں تو اسے ہوش آیا۔ عورتوں کے چہرے شعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں چہرہ اس کی میزبان لڑکی کا تھا۔

اس کے بعد عورتیں اور لڑکیاں بھی جھونپڑیوں میں چلی

گئیں۔ مردوں میں سے وہ گئے تھے جن کی عورتیں اشارے کر کے گئی تھیں۔ رہ جانے والوں نے ان کے اُٹھنے پر زوردار قہقہے لگائے تھے۔ آوازیں کسی تھیں۔ رہ جانے والے مرد جن میں زیادہ تعداد بوڑھے، ادھیڑ عمر اور نوخیز لڑکوں کی تھی، بچی ہوئی تاڑی سے دل بہلا رہے تھے پھر مردوں میں سے بھی چھ سات اُٹھ کر ساحل کی طرف چلے گئے اور بوڑھے مرد نے کارلوس کو اس کی جھونپڑی کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میدان میں سوائے وسط کی چند مشعلوں کے باقی سب بجھا دی گئی تھیں۔ یعنی اب سونے کا وقت آ گیا تھا۔ البتہ ہر جھونپڑی کے سامنے ایک مشعل جل رہی تھی۔ کارلوس کو ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ تاڑی زیادہ پینے سے وہ مثانے پر دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک مرد سے اشارے سے پوچھا تو اس نے کارلوس کی اس جگہ تک رہنمائی کی جہاں بستی کے لوگ فارغ ہوئے تھے۔ جابجا چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ بدبو تھی لیکن گندگی نہیں تھی۔ فارغ ہو کر کارلوس واپس آیا تو لڑکی اپنے جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ کارلوس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لائی تو اس کا جسم انوکھے احساسات سے سنسنا اُٹھا تھا۔ اس جنگلی حسینہ سے قربت کا خیال ہی سنسنی خیز تھا لیکن اس وقت اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی جب لڑکی نے اسے اشارے سے بستر پر لیٹنے کو کہا اور جھونپڑے سے چلی گئی۔ یہاں مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے نہیں تھے اس کے باوجود اسے خاصی دیر سے نیند آئی تھی۔

اس کی آنکھ کسی کی تیز آواز سے کھلی تھی۔ صبح ہو چکی تھی اور جھونپڑی کے عقبی حصے میں کوئی عورت زور سے بول رہی تھی۔ اس نے اُٹھ کر بانسوں کی دیوار کے سوراخوں سے دیکھا۔ اس کی میزبان لڑکی تھی اور اس کے سامنے ایک لمبا گندمی جلد والا نوجوان تھا۔ وہ طاقتور جسم کا مالک تھا اور خوش شکل بھی تھا۔ نہ جانے اس کی لڑکی سے کس بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ وہ غصے کا اظہار کرتا وہاں سے چلا گیا اور لڑکی اندر آ گئی۔ کارلوس کو جاگتے دیکھ کر جلدی سے مسکرانے لگی تھی۔ کارلوس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تین چار بار اپنا نام دُہرایا۔ لڑکی سمجھ گئی اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بیلا۔''

''تم بیلا ہو؟'' کارلوس نے کہا تو وہ سر ہلانے لگی گویا تصدیق کر رہی تھی پھر وہ باہر چلی گئی۔ کارلوس نے ضرورت کے تحت پھر اس جگہ کا رُخ کیا جو حوائج ضروریہ کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں چند معمر افراد اس جگہ پرانے گڑھے بند کر کے نئے گڑھے کھود رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک پردے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ فارغ ہونے کے بعد کارلوس نے ندی سے منہ ہاتھ دھویا۔ وہ واپس آیا تو بیلا اس کے لیے تازہ ناریل کے گودے، دودھ اور اناس کی قاشوں کا ناشتا لیے انتظار کر رہی تھی۔ اس نے خود نہیں کھایا تھا۔ کارلوس کو پیش کرتی رہی۔ اس نے اشارے سے بتایا وہ ناشتا کر چکی تھی۔ کل وہ اس کے لیے عام سی لڑکی تھی لیکن گزشتہ رات وہ اسے جس طرح چھوڑ کر گئی وہ اس کے لیے خاص ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کوئی عورت اسے یوں نظر انداز کر سکتی ہے۔ لڑکی سادہ اور معصوم تھی لیکن یہ بات یقینی تھی جوانی اور اس کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہ رہی تھی، کوئی لڑکی ان تقاضوں سے ناواقف ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس قسم کے قبائلی معاشروں میں فطری تعلقات ڈھکا چھپا کر انجام نہیں دیے جاتے تھے۔ وہ صبح سے جس طرح اس کے ساتھ لگی اس کی ضروریات کا خیال رکھ رہی تھی۔ جب رات ہوئی تو اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر کارلوس نے اسے اشارے سے باہر چلنے کو کہا۔ وہ باہر آئے۔ بستی سے گزر کر کارلوس نے پہاڑی ڈھلان کے گھنے جنگل میں قدم رکھا۔ بیلا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اس کا ساتھ دے رہی تھی بلکہ آگے آگے جا رہی تھی۔ وہ یقیناً یہاں کے راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ پہاڑ کی چوٹی خاصی اُونچی تھی۔ موسم اچھا خاصا تھا۔ لیکن وہ پسینے پسینے ہو گئے تھے۔ کارلوس کو بار بار سانس دُرست کرنے کے لیے رُکنا پڑتا تھا۔ وہ دو گھنٹے بعد چوٹی تک پہنچے تھے۔ کارلوس کو اندازہ تھا وہ کم سے کم دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے لیکن یہاں سے جو منظر دکھائی دیا اس نے کارلوس کی ساری تھکن دور کر دی تھی۔ پہاڑ جزیرے کے ایک کنارے پر تھا۔ اس طرف سے پہاڑ تقریباً سیدھا سمندر میں جا رہا تھا۔ اس طرف جزیرہ ایک نیم دائرے کی صورت میں ایک بڑا کٹاؤ لیے ہوئے تھا جس کے دونوں بازو دور تک کھلے سمندر میں پھیلے تھے۔ اس کٹاؤ میں بے شمار رنگوں کا پانی تھا۔ رنگ اصل میں مونگے کی چٹانوں کے تھے۔ کھاڑی کے کناروں پر جزیرے کے باسی مچھلی اور جھینگے پکڑ رہے تھے اور اتنی بلندی سے بمشکل ہی نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف جزیرہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ البتہ دائیں جانب اس کا پھیلاؤ زیادہ نہیں تھا۔ کسی زمانے میں آتش فشاں نے جب سمندر سے سر نکالا ہوگا تو اس کے لاوے نے ایک طرف جزیرہ تشکیل دیا اور دوسری طرف جب آتش فشاں پھٹا تو اس کی

دیواریں سمندر میں گرنے سے مذکورہ کٹاؤ وجود میں آیا۔ اب آتش فشاں مردہ تھا اور جزیرے پر تقریباً تین سو افراد کا قبیلہ آباد تھا جنہیں دنیا کی اور دنیا کو ان کی کوئی خبر نہیں تھی۔

دنیا کا ایک ارب پتی بزنس مین دنیا سے کٹے اس جزیرے کی چوٹی پر ایک لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ اس ارب پتی کے معیارِ حسن پر نہیں اُترتی تھی لیکن وہ اس کے لیے کشش انگیز ضرور بن گئی تھی۔ کارلوس کے خیال میں اس جگہ ان کے سوا کوئی نہیں تھا اس لیے اس نے بیلا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ اس نے بیلا کے عریاں شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی اور جب کارلوس نے اس کے دوسرے شانے پر بھی ہاتھ رکھا تو وہ کسمسانے لگی تھی۔ یہ اتنا ردعمل نہیں تھا کہ کارلوس کے ارادے کمزور پڑتے۔ اس نے بیلا کو اپنی طرف کھینچا تو وہ مزاحمت پر اُتر آئی۔ اس نے یکدم کارلوس کو دھکا دیا۔ کارلوس دھان پان سی نظر آنے والی لڑکی سے ایسی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ نیچے گر گیا۔ بیلا پیچھے ہٹی پھر نیچے کی طرف بھاگی۔ کارلوس آواز دیتا اس کے پیچھے لپکا تھا۔

''بیلا رُک جاؤ!'' اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ بیلا اس کی بات کہاں سمجھے گی۔

اسی لمحے اس کے پاؤں تلے آنے والا پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا۔ کارلوس نے قلابازی کھائی اور لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ اس کا سر نہ جانے کس چیز پر لگا، یکدم اس کے حواس جواب دے گئے۔ بس پھر اسے اتنا احساس تھا کہ اسے کوئی سہارا دے کر لے جا رہا ہے۔ سر میں اور بازو میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ نرم و نازک وجود اسے سنبھال کر پہاڑ سے نیچے لا رہا تھا۔ وہ خاصا وزنی تھا تقریباً اسّی کلوگرام وزنی تھا۔ نہ جانے بیلا اسے کتنی دُشواریوں سے نیچے لائی تھی۔

تکلیف کا احساس اسے ہوش میں لایا تھا۔ وہ جھونپڑے میں پڑا تھا اور بیلا کے ساتھ ایک معمر شخص بھی تھا جو کسی محلول سے اس کے سر کا زخم صاف کر رہا تھا۔ کلائی کے قریب ہاتھ سوج گیا تھا۔ نہ جانے ہڈی پر ضرب آئی تھی یا محض گوشت پھٹا تھا۔ جب اس کا زخم صاف کیا جا رہا تھا تو محلول اسے بالکل اسپرٹ کی طرح لگا تھا۔ شاید یہ کوئی اینٹی سپٹک تھا۔ کارلوس اندازہ لگا رہا تھا کہ بیلا نے ان لوگوں کو حقیقت بتائی ہے کہ وہ اس پر دست درازی کی کوشش میں اس حال کو پہنچا تھا۔ ویسے جس طرح گرا تھا اس کا بچ جانا ہی غنیمت تھا۔ اس نے معذرت طلب نظروں سے بیلا کی طرف دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا تھا لیکن وہاں سے گئی نہیں تھی۔

''آئی ایم سوری بیلا۔'' اس بار اس نے زبان کا سہارا لیا۔

بیلا نے اس کے الفاظ تو نہیں سمجھے لیکن مفہوم سمجھ لیا تھا۔ اس لیے دوبارہ اس کی طرف رُخ کر لیا۔ سر کا زخم صاف کر کے معمر شخص نے اس کے سوجے ہوئے ہاتھ پر ہلکی سی مالش کی اور اس پر کسی پودے کے چوڑے پتے لپیٹ کر اُوپر سے بیل کی ڈوریاں باندھ دیں۔ وہ اپنی زبان میں اسے کچھ کہہ رہا تھا پھر لڑکی نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ اسے اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دینی ہے۔ اس کا لباس شاید خراب ہو گیا تھا وہ اس کے جسم سے غائب تھا اور اُوپر سے بیلوں سے بنی چادر پڑی تھی۔ معمر شخص کے بعد بیلا بھی جانے لگی تو کارلوس نے اسے آواز دی۔ وہ رُک گئی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں شرمندہ ہوں۔''

بیلا کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر باہر چلی گئی۔ کارلوس نے مایوسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد بیلا پھر آئی تھی۔ وہ پرندوں کے اُبلے ہوئے انڈے لائی تھی۔ اگرچہ ان سے کراہت آمیز بو آ رہی تھی لیکن بیلا نے اصرار کرنے کے انداز میں اسے کھلا دیے۔ شاید یہ اس کے زخموں کے لیے ضروری تھے۔ انڈے نگل کر وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید اس طرح تکلیف سے اس کی توجہ ہٹ جائے۔ حیرت انگیز طور پر وہ سو بھی گیا تھا۔ کچھ گھنٹے بعد وہ جاگا تو سر کی تکلیف میں خاصی کمی آ گئی تھی لیکن ہاتھ کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ بیلا اس کے پاس ہی تھی۔ وہ کراہا تو وہ جلدی سے اس کے پاس آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے لگی تھی پھر اس کے خشک ہونٹوں سے اس نے اندازہ لگایا وہ پیاسا تھا۔ اس نے پیالے سے اسے پانی پلایا۔ اس کے بازو کی سوجن بڑھ گئی تھی۔

پانی پی کر وہ خاموشی سے لیٹ گیا تھا۔ یکدم اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اسے اس جگہ سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ کسی طرح اس جگہ سے نکل کر بھاگ جائے۔ وہ اضطراری طور پر اُٹھ بیٹھا۔ بیلا تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے لٹانے لگی۔ اس کے نرم ہاتھ کا لمس محسوس کر کے کارلوس کی وحشت کم ہونے لگی تھی۔ وہ لیٹ گیا۔ بیلا اس کے پاس بیٹھ کر اس کے چہرے اور سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بیلا کا ہاتھ ایک بار اس کے ہونٹوں تک آیا۔ کارلوس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے دبایا اور آہستہ سے چوم لیا۔ بیلا حیرت سے اسے دیکھ

رہی تھی لیکن اس نے ہاتھ نہیں کھینچا۔
اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ بیلا اور کارلوس نے بیک وقت دیکھا۔ دروازے پر وہی نوجوان کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر بیلا کو گھورتا رہا پھر جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ بیلا نے اُٹھنا چاہا لیکن کارلوس نے اسے روک لیا۔ جب بیلا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو کارلوس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ بیلا نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پھر بیٹھ گئی۔ کارلوس کو اندازہ لگانے میں خاصی دُشواری پیش نہیں آئی کہ وہ نوجوان بیلا کو چاہتا تھا اور اسے کارلوس کے قریب برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بتدریج کارلوس کی گرفت بیلا کے ہاتھ پر ڈھیلی پڑتی چلی گئی تھی پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ بیلا اُٹھ کر باہر چلی گئی۔
''میں شاید پاگل ہوگیا ہوں۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''دنیا کی منتخب حسین عورتیں میری ایک نظر کو ترستی ہیں اور میں اس معمولی لڑکی کے پیچھے پاگل ہورہا ہوں۔ اس کی خاطر اس حال کو پہنچ گیا۔ اب میں اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔''
اسے اپنا سر گرم ہوتا محسوس ہوا تھا اور نظروں کے سامنے غبار سا چھانے لگا تھا۔ کچھ دیر میں وہ شدید بخار اور غشی کی حالت میں غافل پڑا تھا۔ اس حالت میں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ کبھی کبھی سر کی تپش ٹھنڈ میں بدل جاتی تھی اور یہ ٹھنڈ اسے بھلی لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا بخار اُترنے لگا اور جب پسینے میں شرابور اس کی آنکھ کھلی تو اس کا گلا پیاس سے خشک ہورہا تھا۔ اس نے بے تابی سے پانی مانگا۔ بیلا لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے اس کے پاس بیٹھی تھی اور سر اور جسم کے نیچے نمی بتا رہی تھی کہ اس پر پانی ڈالا گیا تھا۔ شاید تبھی اس کا بخار اُترا تھا۔ بیلا نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اُونچا کیا اور ناریل کا پانی پلانے لگی۔ تراوٹ نے اسے پھر سے زندہ کردیا تھا۔ بازو کی سوجن اور تکلیف برقرار تھی شاید اس کی وجہ سے اسے بخار ہوا تھا۔ پانی پی کر اس نے بیلا کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ایک پیالے میں ناریل اور انناس کے گودے کو ملا کر تیار کیا جانے والا ملغوبہ لے آئی۔ یہ خوش ذائقہ بھی تھا اور توانائی بخش بھی۔ اسے کھا کر کارلوس کی ناتوانی کم ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے باہر اور اندر جلتی مشعلیں بتا رہی تھیں کہ رات ہوچکی تھی۔ کارلوس کی کلائی کی گھڑی پانی میں گرنے کے بعد سے رُک گئی تھی اور اب محض ایک کڑے کی طرح اس کی کلائی میں پڑی تھی۔ اس نے گھڑی اُتار کر بے زاری سے زمین پر پھینک دی۔ بیلا نے اسے اُٹھایا اور مشعل کے پاس لے جاکر دلچسپی سے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے خیال میں یہ بھی آرائش کی کوئی شے تھی۔ پھر اس نے احتیاط سے اسے جھونپڑی کے اُوپری حصے میں رکھ دیا۔
رات میں کارلوس کو دو مرتبہ اور بخار چڑھا اور بیلا نے پانی کی مدد سے اس کا بخار کم کیا تھا۔ وہ بے چاری رات بھر جاگتی رہی تھی بلکہ بار بار پانی بھی بھر کر لاتی رہی۔ پانی لانے اور رکھنے کے لیے ان کے پاس بڑے ناریلوں کے خول تھے۔ ان خولوں میں آرام سے تین چار لیٹرز پانی آجاتا تھا۔ ایسے برتن کارلوس نے ہر جگہ دیکھے تھے اور یہ ایک طرح سے ان کے کین تھے۔ ناریل کے اُوپری حصے میں سوراخ کرکے اندر سے گودا نکال لیا جاتا تھا اور پانی بھرنے کے لیے کین تیار ہوجاتا۔ تیسری دفعہ کارلوس کی آنکھ کھلی تو اس کا بخار مکمل طور پر اُتر چکا تھا اور جسم میں ایک سکون آمیز خنکی تھی۔ بیلا ایک طرف جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس بار بازو کی سوجن اور تکلیف بھی کم تھی۔ اس نے خود اُٹھ کر پانی پیا۔ پیالے میں رکھا ناریل اور انناس کا مغلوبہ کھایا۔
ذرا سی حرکت نے اس کی سانس پھلا دی تھی۔ ایک دن اور ایک رات کے بخار نے اسے نچوڑ دیا تھا۔ وہ لیٹ کر بیلا کو دیکھنے لگا۔ وہ ہلکی سی ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ بال چہرے پر آرہے تھے اور وہ اتنی معصوم نظر آرہی تھی۔ کہ اسے دیکھتے ہوئے کارلوس کے دل میں کوئی غلط خیال نہیں آیا حالانکہ سونے کے انداز سے اس کا مختصر لباس سمٹ کر اور بھی مختصر ہوگیا تھا۔ کارلوس اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ کوئی اور تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ دنیا سے انجان تھی، جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ کتنا دولت مند اور بارسوخ شخص ہے۔ اس کے پاس اس لڑکی کو دینے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ اتنی تندہی سے اس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ چوبیس گھنٹے سے جاگ رہی تھی۔ اس کی محنت کے نتیجے میں بغیر کسی دوا کے اس کا بخار اتنی جلدی اُتر گیا تھا۔
کارلوس نے بچپن سے محبت کے بارے میں سنا تھا۔ اس نے انگریزی سیکھنے کے دنوں میں رومیو جولیٹ کا فسانہ بھی پڑھا تھا لیکن ایک مرد اور ایک عورت کو ایک دوسرے سے بے غرض محبت کیسے ہوجاتی ہے یہ بات وہ آج تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس نے محبت ایک ہی طرح کی دیکھی تھی۔ لینے اور دینے والی محبت۔ دنیا جہان کی عورتیں اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے بے تاب رہا کرتی تھیں کیونکہ کارلوس ایک دولت مند ترین شخص تھا۔ انہیں وہ سب دے سکتا تھا۔

جس کی تمنا وہ کرسکتی تھیں۔ کارلوس کو آج تک ایک عورت بھی ایسی نہیں ملی جو اس لینے اور دینے والی محبت کے فارمولے پر یقین نہ رکھتی ہو لیکن یہ لڑکی اس سے کیا چاہتی تھی اور وہ اسے کیا دے سکتا تھا۔ اس جزیرے کی حد تک وہ مفلس ترین آدمی تھا اور اپنی ساری دولت کے ساتھ بھی وہ بیلا کو مطمئن نہیں کرسکتا تھا۔

اچانک بیلا چونکی اور سیدھی ہو کر اپنے کھلے بال جوڑے کی صورت میں باندھنے لگی۔ اسے جاگتا دیکھ کر مسکرائی اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ کارلوس کچھ دیر بعد سمجھا تھا وہ اسے حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے چلنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور بیلا کا سہارا لے کر روانہ ہوا۔ کچھ دیر بعد بیلا ہی اسے واپس لے آئی۔ راستے میں ملنے والے ہر فرد نے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ الفاظ تو سمجھ سے باہر تھے لیکن انداز سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ بیلا اس کے لیے تازہ ناشتا لائی۔ اس بار وہ مچھلی کے تلے بھی لائی تھی۔ شاید اسے طاقت کی ضرورت تھی اس لیے۔ پرندوں کے انڈے بھی تھے۔

ناشتے کے بعد کارلوس نے بیلا کو اشارے سے کہا کہ وہ ساحل کی طرف جانا چاہتا ہے۔ بیلا نے انکار کیا اور جوابی اشارے سے بتایا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آرام کرے مگر جب اس نے اصرار کیا تو بیلا سوچ میں پڑ گئی پھر اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ آئی اور کارلوس کو اشارے سے بلایا۔ وہ باہر نکلا۔ دو افراد بانس اور بیلوں سے بنا ایک اسٹریچر لیے کھڑے تھے۔ کارلوس جھنجلا گیا تھا۔

”میں اس پر نہیں جاؤں گا۔ کیا میں مریض ہوں۔“

وہ خود ساحل کی طرف چل پڑا۔ بیلا اس کے پیچھے لپکی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی شاید معذرت کر رہی تھی۔ جوش میں کارلوس تیز قدموں سے چلتے ہوئے بھول گیا تھا کہ وہ ابھی بخار سے اُٹھا ہے۔ اچانک زمین آسمان اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے۔ اگر بیلا نے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ گر جاتا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ بیلا کو دیکھا اور اس بار احتیاط سے چلنے لگا۔ بیلا اسے سہارا دیے ہوئے تھی۔ وہ ناریل کے جھنڈ سے گزر رہے تھے اچانک وہی نوجوان سامنے آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا تھام رکھا تھا اور آنکھوں سے خطرناک عزائم جھلک رہے تھے۔ اس نے بیلا سے کچھ کہا اور ایک قدم بڑھا۔ بیلا یکدم غضب ناک نظر آنے لگی۔ جیسے ہی نوجوان نے ڈنڈا تولا وہ کارلوس کے سامنے آ گئی۔ اس بار نوجوان نے براہِ راست کارلوس سے کچھ کہا تھا۔ شاید وہ اسے دعوتِ مبارزت دے رہا تھا۔

”کیا دنیا کی قدیم ترین وجہ فساد اس دعوت کی وجہ ہے۔“ کارلوس نے سوچا۔ اس کا دعوت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ زخمی تھا اور بخار سے اُٹھا تھا۔ اس حالت میں وہ اس چست و چالاک نوجوان کا کس طرح مقابلہ کرسکتا تھا۔ اس کا ڈنڈا پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے استعمال کا ماہر ہے۔ بیلا سامنے آئی تو اس کے اور نوجوان کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔ ایک موقع پر لڑکی نے اسے زور سے دھکا دیا اور جوابی دھکے پر پلٹ کر درخت سے ٹکرائی تھی۔ اس کا سر تنے سے لگا تھا۔ سر سے خون نکلتا دیکھ کر کارلوس بے قابو ہو گیا اور اس نے اپنے کیے پر حیران پریشان نوجوان کے منہ پر گھونسا مارا۔ اس پر صرف اتنا اثر ہوا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون کی پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی۔ بیلا اپنا زخم بھول کر لپکی اور کارلوس سے لپٹ گئی تھی۔ نوجوان نے شاید صفائی پیش کی تھی۔ بیلا نے تند و تیز لہجے میں اس سے کچھ کہا اور وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا گیا۔ کارلوس نے بے تابی سے اس کا زخم دیکھا۔ معمولی سا کٹ تھا لیکن خون زیادہ بہہ رہا تھا۔ کارلوس نے پتوں سے اس کا زخم صاف کیا پھر ساحل پر لے جا کر دُھویا۔ کچھ دیر بعد خون رُک گیا تھا۔ پھر وہ سمندر کے کنارے پتھروں سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ سمندر کا ٹھنڈا پانی پیروں کو گدگداتا ہوا جا رہا تھا۔ باتیں وہ کیا کرتے لیکن جذبے خود زبان بن گئے تھے۔ بیلا نے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا اور کارلوس نے وہیں اُگا ایک پھول توڑ کر اس کے بالوں میں اٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

کارلوس ساحل پر کھڑا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ دو ہفتے میں اس نے یہاں سے کوئی طیارہ گزرتے دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی جہاز یا کشتی نظر آئی تھی۔ جزیرے کے باشندے کشتی رانی سے ناواقف تھے۔ وہ عقبی کھاڑی کے پانی میں اُتر کر نوکیلے بانسوں کی مدد سے مچھلیاں اور جھینگے شکار کرتے تھے۔ ایک دن ایک نوجوان ماہی گیر نے چھوٹی شارک شکار کی تھی۔ اس روز سب بے حد خوش تھے کیونکہ شارک کا گوشت ذائقے دار تھا اور اس کی کھال ان کے بہت کام آتی تھی۔ جس کے پاس شارک کی کھال ہوتی تھی اسے بڑا شکاری مانا جاتا تھا۔

کارلوس کے بازو کی تکلیف تقریباً ختم ہو گئی۔ بس کبھی کبھی بازو پر زور آتا تھا تو ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ ان دو ہفتوں

میں اس پر ایک بات واضح ہوگئی تھی۔ بیلا اس سے محبت کرتی تھی لیکن یہ کس قسم کی محبت تھی وہ سمجھا نہیں تھا۔ وہ نہ تو اس کے پاس آتی تھی اور نہ اسے اپنے پاس آنے دیتی تھی۔ کارلوس نے چند ایک بار پیش قدمی کرنا چاہی لیکن وہ گھبرا کر پیچھے ہوگئی۔ اب کارلوس اس سے زور زبردستی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر جھنجلا جاتا تھا کہ یہ کیا ہورہا تھا۔

لہروں کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کبھی اس جزیرے سے نکل بھی سکے گا یا نہیں۔ اسے تلاش کرنے والوں نے اب تک اسے مردہ تصور کرلیا ہوگا۔ شاید کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو کہ وہ ایک جزیرے پر زندہ سلامت ہے۔ اس کے عزیز و اقارب اسے مردہ قرار دلوانے کی کاغذی اور عدالتی کارروائی میں مصروف ہوں گے اور اس کی دنیا بھر میں پھیلی محبوبائیں کسی اور کی فکر میں ہوں گی۔ ان کی خوبصورتی اور دلکشی کسی اور کے لیے مخصوص ہوچکی ہوں گی۔ وہ اسے بھلا کر کسی اور سے چہلیں کررہی ہوں۔ اس کے لیے یہ سب قطعی تعجب انگیز نہیں تھا۔

تعجب کی باتیں تو اسے جزیرے پر ملی تھیں۔ گزشتہ دو ہفتوں میں بیلا نے اسے اشاروں میں اس جزیرے کے رسم ورواج اور تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتادیا تھا۔ آباو اجداد شمال کی طرف سے آئے تھے۔ اس جزیرے پر ان کا مسکن بنا اور وہ اس جزیرے سے یوں نہیں نکل سکتے تھے کہ اس کے باہر سمندر میں تیز دھارا بہتا تھا جو اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو بہا کر لے جاتا تھا۔ صرف سامنے کا ساحل اور عقبی کٹاؤ محفوظ تھا۔ دائیں بائیں سمندر میں سوفٹ جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا یہی وجہ تھی وہ کشتی استعمال نہیں کرتے تھے۔

ان لوگوں کے رسم ورواج بہت سادہ سے تھے۔ مذہب کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے بارے میں شاید سوچا ہی نہیں تھا۔ ان کی زندگی کا مرکز اپنی زندگی اور اپنی نسل کی بقا تھی۔ جزیرہ چھوٹا تھا اور شاید اس سے زیادہ افراد کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ان لوگوں کا طرز زندگی صحت مندانہ تھا۔ یہ تہذیب سے ناآشنا ہونے کے باوجود صاف ستھرے اور اچھی عادتوں کے مالک تھے۔ سوائے جھونپڑوں اور بعض ذاتی اشیا کے سب مشترک تھا۔ خاص طور سے خوراک سب مل کر کھاتے تھے۔ میاں بیوی کا رشتہ تھا اور جوان لڑکے لڑکیاں اپنا شریکِ حیات خود منتخب کرتے تھے اور عام طور سے ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے جب تک کسی ایک فریق کا انتقال نہ ہوجائے۔ بچوں کی شرح اموات زیادہ تھی۔ تین میں سے دو ہی بچے بڑی عمر کو پہنچتے تھے اور بڑی عمر کو پہنچنے والے افراد عام طور سے بڑھاپے تک زندہ رہتے تھے۔

اچانک کسی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ کارلوس نے چونک کر دیکھا، وہ بیلا تھی۔ ہونٹوں میں پھول دبائے مسکرا رہی تھی۔ کارلوس نے بازو پھیلا کر اسے اپنے قریب کرلیا۔ ''چھوٹی سی اور عام سی لڑکی! تم کیا چیز ہو۔ دنیا کی کوئی عورت مجھے اس طرح نہیں ترسا سکتی ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو میں اس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھوں لیکن تم میں کیا ہے جو میں بار بار تمہاری طرف دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ اس کے بازو میں سمٹی مسکراتی رہی۔ شاید وہ کارلوس کی بات سمجھ رہی تھی یا نہیں سمجھ رہی تھی۔ کارلوس نے بات جاری رکھی۔ ''بیلا! تمہارا یہ جزیرہ اس زمین پر جنت ہے۔ مجھے نہیں معلوم جنت کیسی ہے۔ میں اس پر یقین بھی نہیں رکھتا لیکن اگر کہیں جنت ہے تو وہ یہی جزیرہ ہے۔'' کارلوس کا لہجہ دھیما ہوگیا تھا۔ ''لیکن میں تمہاری اس دنیا میں، اس جنت میں نہیں رہ سکتا ہوں کیونکہ یہ میری دنیا نہیں ہے۔ جیسے مچھلی پانی سے باہر نہیں رہ سکتی۔ جس طرح آدمی پانی میں نہیں رہ سکتا اسی طرح میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے معلوم ہے میں اس جگہ قید ہوکر رہ گیا ہوں۔ شاید مجھے کبھی یہاں سے نکلنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کبھی اس جگہ کو اپنی دنیا سمجھ کر نہیں رہ سکتا۔''

بیلا گھوم کر اس کے سامنے آئی۔ چند لمحے اسے محبت سے دیکھتی رہی پھر اپنے ہونٹوں میں دبا پھول اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔ کارلوس نے پھول ہونٹوں سے پکڑلیا۔ بیلا مسکرا رہی تھی پھر نزدیک لگے پھولدار پودے سے پھول توڑ کر اس کی طرف بڑھادیا۔ کارلوس نے ہنس کر پھول لیا اور اس کے بالوں میں لگادیا۔ اسے معلوم تھا بیلا اس کے بعد ہنستی اور اٹھلاتی چلی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ اس کی محبت بس اس حد تک تھی۔ اب تو کارلوس بھی اس کا عادی ہوچلا تھا۔ کبھی اسے ہنسی آتی اور کبھی غصہ اور کبھی وہ بے بسی کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ بہرحال وہ کسی بھی صورت میں اس معصوم لڑکی کو دکھی نہیں کرسکتا تھا اس لیے وہ اس کے سامنے پوز کرتا تھا۔ بیلا کے جانے کے بعد وہ ساحل پر کھڑا ہوگیا۔ اس بار اسے آہٹ ہوئی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ آنے والا بیلا کا عاشق سیمور تھا۔

بیلا نے اس کا یہی نام بتایا تھا۔ جس دن بیلا کے سر سے خون نکلا تھا اس دن کے بعد سے وہ ان کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا تھا۔ ممکن ہے بیلا سے ملتا ہو لیکن کارلوس کے سامنے آنے سے گریز کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی راستہ بدل دیا

کرتا تھا مگر اس وقت وہ کارلوس کے سامنے تھا اور اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔ کارلوس کو ہلکا سا خوف محسوس ہوا تھا۔ ساحل پر بس وہ دونوں تھے اور نہ جانے سیمور کے دل میں کیا تھا۔ اگر وہ اس کے خلاف کوئی جارحانہ قدم اُٹھاتا تو کارلوس زیادہ دیر مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ فطرت اور سادگی کی آغوش میں پلا یہ نوجوان اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا۔

مگر کچھ کرنے کے بجائے اس نے کچھ کہنا شروع کر دیا۔ چہرے کی طرح اس کے الفاظ بھی بے چین تھے۔ وہ متحرک قدموں سے اِدھر اُدھر ہوتا رہا اور بولتا رہا لیکن اس کی آواز میں جوش آجاتا اور کبھی وہ کمزور سا لہجہ اختیار کرتا تھا۔ کبھی اپنے سینے پر ہاتھ مارتا اور کبھی سر جھکا لیتا تھا۔ ظاہر ہے کارلوس اس کے کہے کا ایک لفظ سمجھنے سے بھی قاصر تھا مگر نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا۔ وہ بیلا کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت اور بے چینی بیان کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سیمور کو دیکھتا رہا جواب چپ ہو کر سمندر کی لہروں کی طرف گھور رہا تھا پھر کارلوس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا تھا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر بستی کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز بستی کے لوگوں نے دیکھا کارلوس پہاڑ کی طرف سے سیاہ جلے ہوئے بڑے بڑے سائز کے پتھر اُٹھا کر ساحل کی طرف لے جا رہا ہے۔ دراصل یہ جزیرہ آتش فشانی عمل سے بنا تھا اس لیے اس کی اصلی زمین جلے ہوئے لاوے کی طرح تھی۔ لاکھوں سال کی ٹوٹ پھوٹ سے پتھروں اور زرخیز مٹی نے جنم لیا تھا۔ بستی کے کئی افراد نے کارلوس سے اس حرکت کی وجہ جاننی چاہی لیکن وہ جواب دیے بغیر اپنے کام میں مگن رہا تھا تو یہی لوگ اس کی مدد کرنے لگے۔ پہاڑی کی طرف سے بڑے سیاہ پتھر اُٹھا کر ساحل کی طرف لانے لگے۔ کارلوس نے ایک وسیع ریتیلا حصہ منتخب کیا تھا جہاں ریت بے حد سفید تھی پھر وہ ان پتھروں کو ریت پر خاص ترتیب سے جمانے لگا۔

وہ محنت مشقت کا عادی نہیں تھا اس لیے جلد تھکن سے اس کا برا حال ہو گیا لیکن وہ دوپہر کے کھانے کے علاوہ مستقل لگا رہا۔ شام کو جب اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تو جزیرے والوں کو مزید پتھر لانے سے روک دیا۔ تقریباً تیس فٹ چوڑے اور پچاس فٹ لمبے چوکور حصے میں اس نے پتھروں کو جما کر ایک دو فٹ چوڑی لائنوں کی مدد سے لفظ HELP لکھا تھا۔ یہ لفظ اتنا بڑا اور نمایاں تھا کہ اسے یقین تھا یہ لفظ ایک میل بلندی سے گزرنے والے طیاروں سے بھی نظر آئے گا۔ عام طور سے چھوٹے طیارے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ اگرچہ اسے اب تک کسی طیارے کی جھلک نظر نہیں آئی تھی لیکن یہ بھی ممکن تھا کوئی طیارہ اِدھر آنکلتا۔ اس دن تھکن سے اس کا اتنا برا حال تھا کہ وہ رات کا کھانا کھائے بغیر سونے کے لیے جھونپڑی میں آگیا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ غافل ہو گیا تھا۔ نصف رات کے بعد اس کی آنکھ بیلا کے جھنجوڑنے سے کھلی تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا لائی تھی۔

اسے سچ مچ بھوک لگ رہی تھی ورنہ اتنی آسانی سے آنکھ نہ کھلتی۔ ایسی ہی تھکن تھی اس نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ بیلا اسے محویت سے دیکھتی رہی تھی۔ جب وہ پتے اور پیالے اُٹھا کر جانے لگی تو کارلوس نے اسے اشارے سے روک لیا۔ ''بیلا!''

وہ رُکی اور معصومانہ نظروں سے کارلوس کی طرف دیکھا۔ کارلوس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے اپنی بات کیسے سمجھائے۔ بہرحال اس نے اشاروں سے کوششیں شروع کیں۔ بیلا اسے دیکھتی رہی اور اس کی آنکھوں میں دُکھ جمع ہوتا رہا پھر وہ روتی ہوئی جھونپڑی سے چلی گئی۔ کارلوس تھکے ہوئے انداز میں بستر پر لیٹ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کبھی بیلا کو اپنی بات نہیں سمجھا سکے گا۔ اسے قائل نہیں کر سکے گا۔

اگلے روز اس نے ان خشک کی ہوئی بیلوں سے ایک لمبا اور چوڑا کپڑا تیار کرنا شروع کر دیا جس سے مقامی لوگ لباس بناتے تھے۔ بننے کا طریقہ کار آسان اور سادہ سا تھا۔ دو دن کی محنت کے بعد وہ تقریباً دس گز لمبا اور پانچ گز چوڑا کپڑا تیار کرنے میں کامیاب رہا۔ ان بیلوں کا رنگ سفید تھا جس سے کپڑا بنا تھا پھر اس پر سیاہ رنگ کی بیلوں سے SOS لکھا تھا۔ یہ فوری مدد کا ہنگامی پیغام تھا۔ اس کام میں بیلا اور چند دوسری عورتوں نے اس کی مدد کی تھی جبھی وہ اتنی جلدی اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ کپڑا اور ایک بڑا سا بانس لے کر وہ چند افراد کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ بانس پر یہ کپڑا لگا کر اس نے بانس پہاڑ کے سب سے بلند مقام پر اس طرح نصب کر دیا کہ چاروں طرف سمندر سے یہ صاف نظر آسکے بشرطیکہ دن ہو اور موسم صاف ہو۔

اس جزیرے سے نکلنے کے لیے وہ جس حد تک کر سکتا تھا اس نے کر دیا تھا اور اب یہ اس کی تقدیر پر منحصر تھا کہ کوئی طیارہ یا بحری جہاز اس طرف آنکلے اور اس کے بنائے ہوئے ہیلپ کے نشان یا جھنڈے کو دیکھ لے۔ ان کاموں سے

فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنا لباس اُتار کر اسے دھو کر اور سنبھال کر رکھ دیا تھا اور خود بیلوں کے کپڑے سے بنی ایک چھوٹی اسکرٹ نما چیز پہن لی تھی۔ جزیرے کے مردوں کا پہناوا یہی تھا۔ اس نے اپنے لیے ناریل اور اناناس جمع کرنے کا کام چن لیا تھا۔ اگرچہ بستی والے اس کے کام کرنے سے خوش نہیں تھے۔ وہ اسے مہمان سمجھتے تھے لیکن کارلوس نے بے کار بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ لوگ اپنے لمبے بال دھاگوں سے باندھ لیا کرتے تھے لیکن ان میں چوٹی کرنے کا رواج نہیں تھا۔ مردوں کے چہروں پر قدرتاً برائے نام بال آتے تھے۔ صرف چند ایک کی باقاعدہ داڑھی تھی۔ ایک مہینے کے اندر خود کارلوس کی داڑھی اچھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ سارا دن دھوپ میں کام کرنے سے اس کی سرخ و سفید رنگت بھی سنولا گئی تھی اور کوئی باہر کا آدمی جزیرے پر آ جاتا تو شاید اتنی آسانی سے مقامی باشندوں اور اس میں تمیز نہ کر پاتا۔ رفتہ رفتہ کارلوس ان کی زبان کے بہت سارے لفظ سمجھنے اور بولنے لگا تھا۔

ایک روز اس نے اپنے لیے الگ سے جھونپڑا بنانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ اب اسے ساری عمر اس جزیرے میں رہنا ہے۔ جب اس نے جھونپڑا بنانا شروع کیا تو بستی کے لوگ بے حد خوش تھے۔ انہوں نے جھونپڑا بنانے میں اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ پھر بیلا شرمائی شرمائی سی رہنے لگی تھی۔ شام کو جب وہ کھانے کے بعد جمع ہوتے اور رقص و موسیقی کی محفل جمتی تھی تو لڑکیاں بیلا کو چھیڑتی تھیں اور وہ شرما جاتی۔ بات کچھ کچھ کارلوس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ یہاں مرد و عورت کے درمیان بنا شادی کے تعلق کا تصور نہیں تھا اور شادی کے لیے بڑی سادہ سی شرط تھی مرد اپنا جھونپڑا بنائے اور اپنی من پسند عورت کے ساتھ اس میں رہنے لگے۔ اب وہ اپنا جھونپڑا بنا رہا تھا تو بیلا سمیت سب کا یہی خیال تھا وہ بیلا کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔

کارلوس کسی قدر پریشان ہوا تھا لیکن اس نے جھونپڑا بنانا جاری رکھا۔ شام کو اپنے روزگار سے فارغ ہو کر وہ سارے مردوں کی طرح کچھ دیر آرام کرتا تھا اور پھر جنگل کا رُخ کرتا تھا تاکہ تعمیر کا سامان لا سکے۔ روزانہ دو تین مرد اس کی مدد کے لیے جاتے تھے۔ ویسے وہ اکیلے یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بڑے بانس کاٹنا اس اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان بڑے بانسوں سے جھونپڑے کا بنیادی ڈھانچا کھڑا کیا گیا تھا پھر چھوٹے بانسوں سے دیواریں اور چھت بنائی جارہی تھی۔ آخری مرحلہ چھت کو بارش سے بچانے کے لیے اس پر ناریل کے پتے بچھا کر بیلوں سے اس طرح باندھنا تھا کہ بارش کا پانی اندر نہ آئے۔ فرش پر مٹی کی بھرائی بچوں نے کی تھی۔ وہ سارا دن ناریل کے خولوں میں مٹی بھر بھر کر لاتے تھے اور جھونپڑے کے فرش پر ڈالتے جاتے۔

جیسے جیسے جھونپڑے کی تکمیل کے دن قریب آرہے تھے، بیلا کے رُخساروں پر گلاب کھلتے جا رہے تھے۔ اب وہ کارلوس کے پاس کم آتی تھی البتہ روز اس کے لیے پھول ضرور لاتی تھی۔ اس جزیرے پر کارلوس نے ایسے انوکھے پھول دیکھے تھے جن کی رنگت اور خوشبو دنیا کے پھولوں سے الگ تھی۔ ایک روز اس نے صبح سویرے چند عورتوں کو دیکھا۔ وہ ندی کے پانی سے بیلا کے جسم پر پھول مل مل کر اسے نہلا رہی تھیں اور اپنی زبان میں کچھ گا رہی تھیں۔ کارلوس کو دیکھ کر بیلا جلدی سے پانی میں چھپ گئی تھی۔ عورتوں نے قہقہے لگائے اور کارلوس کی طرف پانی اُچھالا۔ وہ کھسیا کر وہاں سے چلا گیا۔

اب کارلوس کو بھی اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔ جھونپڑی کی تکمیل کے بعد بیلا اس کی ہوگی یہ تصور ہی سنسنی خیز تھا۔ جب وہ جھونپڑے پر کام کر رہا ہوتا تھا تو یہی سنسنی جوش بن کر اس کی رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔ اس نے اپنی جھونپڑی میں بعض اختراعات کی تھیں۔ اس نے ناریل کے تنوں کو جوڑ کر ایک چھپر کٹ بنایا تھا اور اس پر مقامی کپڑے میں نرم گھاس بھر کر بنایا ہوا گدا بچھایا تھا۔ یہ نئی شے اتنی انوکھی تھی کہ ساری بستی اسے دیکھنے آئی تھی۔ بس اب ایک دن کا کام باقی تھا۔ اگلے روز کارلوس نے چھٹی کی تو بستی والوں پر واضح ہوگیا کہ وہ آج رات ہی بیلا کو اپنی دُلہن بنا کر جھونپڑے میں لے جائے گا۔ اس کی رضامندی حاصل کر کے بستی والوں نے شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میدان صاف کیا جا رہا تھا۔ بیلا کو لڑکیاں اور عورتیں سجانے سنوارنے کے لیے ایک الگ جھونپڑے میں لے گئی تھیں جو شاید اس کام کے لیے مخصوص تھا۔

شام تک کارلوس اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ جھونپڑا ہر لحاظ سے تیار تھا۔ وہ گرمی اور تھکن سے نجات حاصل کرنے ندی تک آیا تھا۔ وہ اس کے سرد پانی سے لُطف اندوز ہوتا رہا اور آنے والی رات کے بارے میں سوچتا رہا جب بیلا اس کے پاس ہوگی۔ ایک بار اس نے پانی میں ڈبکی لگائی اور سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے چند لمحے کے لیے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا طیارہ نظر آیا تھا اور وہ خاصا نیچے

پرواز کررہا تھا۔ ندی کے پانی کے شور میں اس کی آواز نہیں آئی تھی۔ کارلوس بے ساختہ بازو لہرانے لگا تھا اور چیخ چیخ کر طیارے کے لوگوں کو آوازیں دینے لگا تھا پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ ندی سے نکل کر ساحل کی طرف بھاگا۔ طیارے والوں نے یقیناً ہیلپ کے الفاظ دیکھ لیے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا ساحل پہنچا تو وہاں پہلے ہی سے کئی افراد سر پر چکر لگاتے اس طیارے کو دیکھ رہے تھے۔ کارلو ہیلپ کے الفاظ کے درمیان میں جا کر ہاتھ ہلانے لگا تھا۔

طیارہ جزیرے سے ذرا دور گیا اور پھر گھوم کر پانی میں اُترنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ اس کے نیچے پانی میں اُترنے والے پیڈلز بھی لگے تھے۔ جوش اور مسرت سے کارلوس بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا کر طیارے کی رہنمائی کر رہا تھا حالانکہ طیارہ ان کی سمت ہی آ رہا تھا۔ ساحل پُرسکون تھا اس لیے طیارے کو اُترنے اور ساحل تک آنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ڈیڑھ دو فٹ گہرے پانی میں ایک شخص نیچے کودا۔

''تم میں سے کوئی انگریزی جانتا ہے؟'' اس نے بلند آواز سے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' کارلوس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں کارلوس ہوں۔ میرا ہیلی کاپٹر کریش ہو گیا تھا۔''

''میرے خدا! تم ہو وہ کروڑ پتی شخص! تمہیں تو مردہ سمجھ لیا گیا تھا۔''

ذرا سی دیر میں طے ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ نزدیک ترین مہذب آبادی یہاں سے پانچ سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ طیارہ نیوگنی سے انڈونیشیا جا رہا تھا۔ ''کیا تم لوگ صرف آدھے گھنٹے کے لیے رُک سکتے ہو؟''

''ہاں، اتنا انتظار کرلیں گے۔'' طیارے کے پائلٹ نے ہچکچا کر کہا تھا۔

کارلوس سب سے پہلے بستی کے معمر سربراہ کے پاس آیا اور اسے اشاروں میں سمجھایا کہ پہاڑی سے جھنڈا اور ساحل کی ریت سے پتھر ہٹا دے۔ اس کے بعد بیلا کے پاس آیا۔ سیمور ذرا دور کھڑا تھا۔ بیلا اسے افسردہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں آنسو تیر رہے تھے پھر اس نے سیمور کو بلایا اور دونوں کو لے کر بستی کی طرف چل پڑا۔ بستی والے ان کے پیچھے تھے۔ کارلوس نے اپنی نوتعمیر جھونپڑی کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر بیلا کا ہاتھ سیمور کے ہاتھ میں دے کر اشارے سے بتایا کہ جھونپڑی اب ان دونوں کی ہے۔ بیلا اس کی بات سمجھ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ کارلوس نے اس کے آنسو صاف کیے۔

''بیلا! مجھے جانا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔ ''اپنی دنیا میں۔''

بیلا نے زور زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ کارلوس اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''نہیں بیلا! میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔ وہ تمہاری دنیا نہیں ہے۔ تمہاری دنیا یہ ہے۔'' اس نے چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''تم اس دنیا میں نہیں رہ سکتیں۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔''

بیلا اس کی بات نہیں سمجھی لیکن اس کا مفہوم جان گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے اس کے سینے سے لگی اور پھر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ کارلوس پیچھے ہٹا۔ اس نے اندر جا کر اپنے کپڑے نکالے اور باہر آیا۔ ''بیلا! مجھے پتا ہے یہ جزیرہ دنیا کے مکر و فریب سے پاک ایک جنت ہے لیکن بعض لوگوں کو یہ راس نہیں آتی۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ بیلا! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ شاید میں بھی تمہارے لائق نہیں ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔''

وہ ذرا رُکا پھر رُخ پھیر کر ساحل کی طرف روانہ ہو گیا جہاں پائلٹ اور اس کا ساتھی بے تابی سے کارلوس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب طیارے نے پانی پر رینگنا شروع کیا تو کارلوس کو کھڑکی سے ناریل تلے کھڑی بیلا نظر آئی تھی۔ یہ اس کی آخری جھلک تھی۔ چند منٹ بعد طیارے نے پانی کو چھوڑا اور فضا میں بلند ہوتا گیا۔ جب طیارہ ہمواری سے پرواز کرنے لگا تو کارلوس نے ذرا آگے ہو کر ان دونوں سے کہا۔

''میری درخواست ہے اس جزیرے کا ذکر کسی سے مت کرنا۔'' اس کا لہجہ سرد اور تحکمانہ تھا۔

''مگر کیوں جناب؟''

کارلوس نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''اس صورت میں چند دن کے اندر تمہارے بینک اکاؤنٹس میں ایک ایک لاکھ ڈالرز منتقل ہو جائیں گے۔''

''شکریہ جناب! اب یہ بات کبھی ہمارے منہ سے نہیں نکلے گی۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' کارلوس نے کہا اور سوچنے لگا اس دنیا میں کچھ جگہیں ایسی ہونی چاہئیں جو جدید تہذیب کی خرابیوں سے ناآشنا ہوں۔ اس نے نشست کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کمالِ قدرت

کاشف زبیر

قسمت کی دیوی مہربان ہو تو ناممکن بھی پلک جھپکتے ممکن میں بدل جاتا ہے اور راہ میں حائل بڑے بڑے پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ کر راستہ بنادیتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسا ہی ماہر انجینئر تھا جسے خود پر انتہا کا بھروسا تھا مگر ایک مقام ایسا بھی آیا جب اسے صرف دعاؤں کی ضرورت تھی اور پھر اس نے کسی کی دعاؤں کا کرشمہ بھی دیکھ لیا۔

اپنے علم پر گھمنڈ کرنے والے ایک انجینئر کا دلچسپ ماجرا

میسن ٹرین سے اترا اور اس نے پٹری کا معائنہ کیا۔ اس کے ساتھ اس کا نائب جوزف بھی تھا۔ اس جگہ سے پٹری ٹھیک طرح سے گزری تھی اور ان کو سفر کے دوران ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ بہرحال اس کا معائنہ لازمی تھا کیونکہ میسن کو رپورٹ کرنا تھی اور اس کے بعد ہی کام آگے بڑھایا جانا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں راکی ماؤنٹین سے ریل کی پٹری گزاری جارہی تھی اور یہ اس دور میں دنیا میں انجینئرنگ کا سب سے بڑا منصوبہ تھا جس میں ہزاروں افراد کام کررہے تھے۔ میسن بھی اس کے ایک حصے کا انجینئر تھا اور یہ ان پہاڑوں کا سب سے دشوار حصہ تھا۔ اس سے پٹری گزارنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ اس وقت وہ نارٹن نامی قصبے کے قریب تھے اور ریلوے لائن کو اس کے قریب ایک پہاڑی دریا کے ساتھ ساتھ گزرنا تھا اور یہی اس کے حصے کا سب سے مشکل کام تھا۔

اس شام نارٹن کے قصبے میں ریلوے لائن کے بارے میں بات ہورہی تھی۔ مزدور پیشہ لوگ بہت خوش تھے کیونکہ اس سے ان کو روزگار ملتا۔ اسی طرح کاروباری حضرات بھی خوش تھے کہ اس سے ان کے کاروبار میں تیزی آجاتی مگر بعض لوگ ناخوش بھی تھے ان کا کہنا تھا کہ ریلوے لائن اس علاقے کی معاشرتی اقدار کو تباہ کردے گی اور ان کے علاقے میں

دوسرے لوگ بہ آسانی آسکیں گے اوراس کے بعد یہاں کی اقدار کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔ ان لوگوں کا سربراہ جے تھا اس کا پورا نام جوائے کرول تھا مگر مختصراً سب اسے جے کہا کرتے تھے۔ وہ ہی ریلوے لائن کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ریل اس قصبے کو تباہ کر دے گی کیونکہ یہ قصبہ اس دشوار علاقے میں ایک پڑاؤ تھا اور ریلوے لائن بچھ جاتی تو کوئی یہاں نہیں ٹھہرتا اور سب آگے چلے جاتے۔ یہاں نہ تو کوئی کان تھی اور نہ ہی روزگار کا کوئی اور ذریعہ تھا، اس لیے قصبہ ویران ہو جاتا۔ لوگ روزگار کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف چلے جاتے۔

اس وقت بھی جیمس کے بار میں زور وشور سے اس پر بحث چل رہی تھی کہ ریلوے لائن بننا چاہیے یا نہیں۔ جے کے دلائل اس معاملے میں پُر اثر تھے کیونکہ وہ پڑھا لکھا تھا اور اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔

''دوستو! ایک بار یہ منحوس لائن یہاں آگئی تو یقین کرو کہ نارٹن تباہ ہو جائے گا۔'' جے کہہ رہا تھا۔ ''میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں تین سال بعد نارٹن کا نام ونشان نہیں ہوگا۔''

اس پر ایک عادی شرابی ہنس دیا حالانکہ وہ ٹھیک طرح سے اس کی بات بھی نہیں سمجھا تھا...... بس ایسے ہی ہنس دیا تھا۔ اس پر وہ لوگ بھی جو جے سے متفق نہیں تھے۔ جے نے خونخوار نظروں سے شرابی کی طرف دیکھا مگر اسے پروا ہی کہاں تھی۔ وہ تو اپنی بوتل میں کھویا ہوا تھا۔ بار کے مالک جیمس نے کہا۔

''قصبہ کیسے ویران ہو جائے گا؟''

''دیکھو نارٹن شمال سے جنوب کی طرف جانے والی شاہراہ پر ہے اور یہاں ہمیشہ لوگ رکتے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے جنہوں نے رکنا ہوگا وہ بہرصورت رکیں گے۔'' جیمس بولا۔

''ریلوے لائن آنے کے بعد لوگوں کو ایک متبادل ذریعہ مل جائے گا اور وہ اس کی مدد سے سفر کریں گے تو ہمارے قصبے میں کون ٹھہرے گا؟'' جے نے اپنی دانست میں بڑی زبردست دلیل دی تھی اور کم علم حضرات قائل بھی نظر آنے لگے تھے مگر جیمس بھی پڑھا لکھا تھا۔ اس نے کہا۔

''ریلوے لائن صرف شمال اور جنوب کو ملائے گی، اس سے مقامی طور پر سفر کرنے والوں پر خاص فرق نہیں پڑے گا۔''

''کچھ نہ کچھ فرق تو پڑے گا اور پھر ممکن ہے مقامی طور پر بھی ریلوے لائن بچھ جائے۔''

''اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے ترقی ہوگی، روزگار کم نہیں ہوگا۔'' جیمس نے گلاس چمکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر ترقی صرف شہروں تک محدود ہو جائے اور ہمارے علاقے اس سے محروم رہے تو لوگ خود شہر چلے جائیں گے مگر جب ترقی کی چیزیں ہمارے علاقے میں آجائیں تو لوگ یہاں سے کیوں جائیں گے۔ مجھے یقین ہے اس ریل کی وجہ سے نارٹن اور اس پورے علاقے میں ترقی کا نیا دور شروع ہوگا۔''

''ترقی......'' جے نے برا سا منہ بنایا۔ ''بلکہ...... یہاں سب تباہ ہو جائے گا۔''

اسی لمحے بار کا دروازہ کھلا اور میسن اندر آیا۔ وہ مناسب قد وقامت کا خوش شکل جوان تھا۔ اس کے ہاتھ اور کلائیوں کا سائز بڑا تھا۔ سنہرے بال بھی بکھرے تھے اور سارا دن دھوپ میں کام کر کے اس کا رنگ ہلکا سا سنولا گیا تھا۔ اس نے ایک نظر سب کو دیکھا اور بلند آواز سے بولا۔

''میں ریلوے لائن کا مقامی انجینئر میسن ٹرنکور ہوں۔ کیا اس بار میں مجھے ایک جام مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں مسٹر ٹرنکور۔'' جیمس نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہاں سب تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

''سب نہیں۔'' جے نے منہ بنا کر کہا۔

''کیونکہ جے کے خیال میں ریلوے لائن آنے سے یہ علاقہ تباہ ہو جائے گا۔'' ایک نے کہا۔

''ریلوے لائن آنے سے علاقہ کیسے تباہ ہو جائے گا؟'' میسن نے حیرت سے کہا اور اپنے سامنے رکھا گلاس اٹھالیا۔

''جے کا مطلب ہے کہ اس سے یہ علاقہ ویران ہو جائے گا۔'' جیمس نے وضاحت کی۔ ''اس سے روزگار ختم ہو جائے گا۔''

''میں پانچ سال سے ریلوے لائن بچھانے کا کام کر رہا ہوں مگر میں نے کبھی کسی ایک علاقے میں بھی روزگار ختم ہوتے نہیں دیکھا۔ بلکہ ریل آنے سے تو روزگار بڑھ جاتے ہیں کیونکہ لوگ اپنی مقامی پیداوار دور دراز علاقوں میں بھی لے جاسکتے ہیں۔''

''میں بھی یہی کہتا ہوں۔'' جیمس نے کہا۔

''ہونہہ......'' جے نے بے زاری سے ہنکارا بھرا۔ ''اس علاقے میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے جو ہم باہر بھیج سکیں۔''

''کیوں کیا یہاں مویشی نہیں چرائے جاتے ہیں، میں نے ابھی آتے ہوئے یہاں اعلیٰ درجے کے انگور دیکھے ہیں۔ یہاں بہت اچھی نسل کے گھوڑے پائے جاتے ہیں۔'' میسن نے کہا۔ ''دوستو! زمانے کے ساتھ چلنا سیکھو' ماضی سے مت چمٹے رہو۔'' اس نے گلاس خالی کر کے رکھ دیا اور جیمس کے سامنے ایک سکہ رکھا تو اس نے منع کر دیا۔

"یہ میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔"

"شکریہ......" میسن نے سکہ واپس رکھ لیا۔ "میں کچھ دن اسی قصبے میں رکوں گا کیا یہاں کوئی معقول قسم کا ہوٹل ہے جہاں مجھے کمرے کے ساتھ تین وقت کا کھانا بھی مل جائے؟"

"ذرا آگے مون کا ہوٹل ہے۔" جیمس نے بتایا۔

"اس کے پاس کمرے بھی اچھے ہیں اور وہاں کھانا بھی بہت اچھا ملتا ہے۔"

"مون کو دیکھنا سمجھ لو بونس ہے۔" کوئی بولا۔

"مون۔" میسن نے زیرِ لب کہا۔ "نام تو خوب صورت ہے۔"

"خود نام سے بڑھ کر ہے۔ چاند میں تو داغ بھی ہوتے ہیں۔" جیمس نے ذرا شاعرانہ انداز میں کہا اور میسن مسکراتے ہوئے بار سے نکل گیا۔ اس نے دیکھا نہیں تھا کہ جے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اپنے طور پر وہ مون کا واحد عاشق تھا یہ اور بات تھی کہ مون اسے منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆

مورینا نیلسن جسے پیار سے مون کہا جاتا تھا۔ تقریباً ستائیس برس کی خوب صورت اور دلکش عورت تھی۔ اسے عورت کہنا ہی مناسب تھا کیونکہ وہ ایک بار شادی کر چکی تھی اور اس کا شوہر دو برس پہلے ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ دریا کے کنارے سے گزرتے ہوئے اس کا گھوڑا پاؤں پھسل جانے سے دریا میں جا گرا تھا اور ایڈگر نیلسن کی لاش دو دن بعد ملی تھی۔ یہ ہوٹل اسی نے بنایا تھا جسے اب مون چلا رہی تھی۔ اپنی کاروباری مہارت اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس نے اپنے ہوٹل کو قصبے کا سب سے بہترین ہوٹل بنا دیا تھا۔ وہ کھانے بہت مزے کے بناتی تھی اور سروس کا معیار اعلیٰ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نارٹن میں آنے والا ہر معزز فرد اس کے ہوٹل میں ٹھہرنا پسند کرتا تھا۔

اس وقت مون کاؤنٹر پر رجسٹر دیکھ رہی تھی، اس نے اپنے کلرک ٹومی سے کہا۔ "یہ دو کمرے خالی ہیں اور تم نے ان کے آگے ٹِک لگا رکھا ہے۔"

"سوری میڈم۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں نے بے دھیانی میں ایسا کر دیا تھا۔"

"ذرا دھیان رکھا کرو...... میں دیکھ رہی ہوں ان دنوں تمہارا دھیان کام کے بجائے کہیں اور رہتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مون نے ہوٹل کی میڈ مشل کی طرف دیکھا وہ ایک نوعمر اور دلکش لڑکی تھی اور ٹومی ان دنوں اس کے چکر میں تھا۔ اسی لمحے میسن اندر آیا۔ اس نے ہوٹل کا جائزہ لیا اور

بھینس

یہ بہت مشہور جانور ہے۔ قد میں عقل سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے۔ چوپایوں میں یہ واحد جانور ہے کہ موسیقی سے ذوق رکھتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس کے آگے بین بجاتے ہیں۔ کسی اور جانور کے آگے نہیں بجاتے۔

بھینس دودھ دیتی ہے لیکن وہ کافی نہیں ہوتا۔ باقی دودھ گوالا، یعنی دودھ والا دیتا ہے اور دونوں کے باہمی تعاون سے ہم شہریوں کا کام چلتا ہے۔ تعاون اچھی چیز ہے لیکن دودھ کو چھان لینا چاہیے تاکہ مینڈک نکل جائیں۔

کاؤنٹر کی طرف آیا۔

"مجھے ایک کمرے کی ضرورت ہے، کم سے کم ایک مہینے کے لیے۔"

"ایک مہینے کے لیے؟" مون چونکی تھی۔ "اتنے دن تم کیا کرو گے؟"

"مجھے میسن ٹرنکور کہتے ہیں اور میں مقامی ریلوے لائن بچھانے کے کام کی نگرانی کر رہا ہوں، اس لیے مجھے یہاں ایک مہینے تو رہنا ہی ہو گا ممکن ہے زیادہ بھی ٹھہرنا پڑ جائے۔" اس نے وضاحت کی۔

"نارٹن میں خوش آمدید۔" مون مسکرائی۔ اسے زیادہ عرصے رکنے والے گاہک اچھے لگتے تھے۔

"تم یقیناً مس مون ہو؟"

"مورینا نیلسن۔" مون نے اپنا نازک سا ہاتھ آگے کیا جسے تھام کر میسن نے بوسہ دیا تھا۔ "ویسے تم چاہو تو مجھے مون کہہ سکتے ہو۔"

"شکریہ...... میں تمہاری تعریف سن کر آ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس قصبے کا سب سے اچھا ہوٹل یہی ہے اور یہاں سروس اور کھانے کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔"

"تم نے درست سنا ہے۔" مون خوش ہو گئی۔ "مجھے امید ہے تم اس ہوٹل کو توقع سے بڑھ کر ہی پاؤ گے۔ ٹومی مسٹر ٹرنکور کے لیے ہوٹل کا سب سے اچھا کمرا کھول دو۔"

"مگر ہمارے پاس صرف دو کمرے ہیں۔" ٹومی نے آہستہ سے کہا۔

"ان میں سے ایک کھول دو۔" مون نے اسے گھورا۔

"کوئی بات نہیں مس مون۔ میں گزارا کرنے والا آدمی ہوں، ویسے بھی میرا بیشتر وقت تو کام میں گزرے گا اور

میں صرف رات گزارنے آؤں گا مگر مجھے کھانا اچھا چاہیے۔"

"تمہارے لیے میں خود بناؤں گی۔" مون بولی وہ اتنے اچھے گاہک کے آنے سے خوش تھی۔ ٹومی نے اسے اوپر لے جا کر کمرا دکھایا۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا باتھ روم بھی تھا اگرچہ کمرا کوئی خاص نہیں تھا مگر صاف ستھرا اور اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔ رات کا وقت قریب تھا۔ ٹومی نے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ "ڈنر میں کیا لینا پسند کریں گے سر؟"

"کوئی بھی اچھی چیز ہو اور ہاں میں گوشت صرف بیف لیتا ہوں۔"

"کھانا کہاں پسند کریں گے سر؟"

"کمرے میں لے آنا۔" میسن نے اپنا مختصر سا بیگ الماری میں رکھا۔ اس کے پاس چند ایک جوڑے اور تھوڑا ہی سامان تھا۔ "مجھے کپڑے بھی دھلوانے ہیں۔"

"آپ دے دیں کل تک مل جائیں گے۔"

"نہیں مجھے صبح چاہئیں۔"

"مل جائیں گے سر۔"

میسن نے اسے کپڑے دے کر رخصت کیا اور خود اپنے کام سے متعلق کاغذات دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اس نے کہا۔ "آ جاؤ۔"

مون اندر آئی۔ اس نے ایک کارڈ اٹھا رکھا تھا۔ "میں نے تم کو پریشان تو نہیں کیا؟" وہ کاغذات دیکھ کر بولی۔

"نہیں...... تم بتاؤ کیا کام ہے؟"

"یہ کارڈ دیکھ کر بتا دو کہ اگلے دو دن میں تم کو کس وقت کون سے کھانے چاہئیں۔"

میسن نے کارڈ دیکھا اور اسے کھانے نوٹ کرانے لگا، اس کے بعد اس نے اسے کپڑوں کے بارے میں یاددہانی کرائی۔ "مجھے ہر صورت میں کل کپڑے درکار ہیں۔"

"تم فکر مت کرو میں خود دھو کر تمہیں دے جاؤں گی۔"

"تم خود دھوؤ گی؟" میسن کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں اس ہوٹل کے اکثر کام میں ہی کرتی ہوں اور تم تو پھر بھی ہمارے مہمان ہو۔ اس علاقے کے لیے کام کر رہے ہو۔"

"اچھا تم ایسا سمجھتی ہو۔ یہاں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو ریلوے لائن کے خلاف ہیں۔"

"وہ کم نظر اور بے وقوف ہیں۔" مون نے کہا۔ "میرے خیال میں تو ریل سے ہمیں بہت فائدہ ہوگا اور پھر کوئی دریا کے ساتھ والے راستے سے نیچے نہیں گرے گا۔" یہ کہتے ہوئے مون کے چاند سے چہرے پر غم کی بدلی سی چھا گئی تھی۔ میسن نے بھانپ لیا۔

"کیا کوئی وہاں سے گر چکا ہے؟"

مون نے سر ہلایا۔ "وہ میرا شوہر تھا اس کا گھوڑا اچھل گیا تھا۔"

"اوہ مجھے افسوس ہوا۔" میسن نے کہا۔ "میں نے وہ جگہ دیکھی ہے اور وہاں سے پٹڑی گزارنا بہت مشکل کام ہوگا۔"

"خاص طور سے اس جگہ سے جہاں سے گھوڑے کی نعل نما کٹاؤ ہے۔"

"اور تم بھی اس کام کو سمجھتی ہو۔" میسن نے ستائش سے کہا۔

"نہیں اصل میں میرا شوہر اسی جگہ سے گرا تھا۔"

"اور اسی جگہ سے ریل گزارنے کے لیے مجھے بہت محنت کرنا ہوگی۔"

"مجھے اندازہ ہے، مگر مجھے یہ امید بھی ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔" مون نے اس کے کاغذات کے نقشے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس سنڈے کو چرچ جاؤں گی تو تمہاری کامیابی کے لیے خاص طور پر دعا کروں گی۔"

میسن مسکرایا۔ "میں اپنے کام کے سلسلے میں دعاؤں سے زیادہ عمل کا قائل ہوں اور میں نے اپنے سارے مسئلے اسی طرح حل کیے ہیں۔"

"اچھی بات ہے مگر بعض اوقات انسان کو قدرت کی مدد کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

"ممکن ہے۔" میسن نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "مجھے کھانا کب تک مل جائے گا کیونکہ مجھے جلدی سونا اور صبح جلدی بیدار ہونا ہے۔"

"صرف آدھے گھنٹے میں مل جائے گا۔" مون نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ حسبِ وعدہ اس نے آدھے گھنٹے میں کھانا لگا دیا جو بہت اچھا بنایا گیا تھا۔ جب ملازمہ برتن لینے آئی تھی تو میسن نے اس سے مون کو شکریہ کہلوایا تھا جس نے اسے اس جگہ اتنا اچھا کھانا کھلایا تھا۔ اگلے روز اسے کپڑے بھی وقت پر تیار ملے تھے اور ایک شاندار قسم کا ناشتا کر کے وہ سائٹ پر جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔

پٹڑی ابھی دریا سے کوئی نصف میل پیچھے تھی مگر اس پر جس رفتار سے کام چل رہا تھا اسے دریا تک آنے میں شاید ایک مہینا بھی نہیں لگتا۔ پٹڑی بچھوانے کا کام جوزف کی نگرانی میں جاری تھا وہ بھی انجینئر تھا اور اپنا کام اچھی طرح جانتا تھا۔ میسن اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کے کنارے پہنچا تو اس کا عملہ اپنا کام کر رہا تھا اور انہوں نے پیمائشیں لینا شروع کر دی تھیں۔ دریا کے ساتھ یہ سارا راستہ ہی بہت خطرناک تھا مگر کٹاؤ والی جگہ تو بہت مشکل تھی اس پر سے پٹڑی گزارنے

کے لیے اسے بھرنا ضروری تھا، مگر عملی طور پر یہ ناممکن ہی نظر آتا تھا کیونکہ پہاڑی کے ساتھ کوئی چھ سو گز تک صرف ڈھلان تھی اور اس ساری ڈھلان کو نہ تو کاٹنا ممکن تھا اور نہ ہی اسے پاٹنا ممکن تھا۔ کیونکہ چھ سو گز تک سوائے چٹانوں اور مٹی کے کچھ نہیں تھا۔ خاص طور سے نعل نما کٹاؤ ایک بہت بڑی چٹان سے بنا ہوا تھا اور اس کی شکل کسی نصف پیالے جیسی تھی۔ اس پر سے پُل گزارنا بھی مشکل تھا کیونکہ یہاں سے دریا گھوم رہا تھا اور ریل کی پٹری کو ایک حد سے زیادہ موڑنا ممکن نہیں تھا۔ ورنہ ٹرین قابو سے باہر بھی ہو سکتی تھی۔ میسن سارا دن وہاں سر کھپاتا رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہاں سے پٹری کس طرح گزارے۔ اس جگہ راستہ نہ صرف بہت تنگ تھا بلکہ اسے چوڑا کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ راستے کے عین اوپر ایک بڑی سی گیند نما چٹان رکھی تھی اور اسے ہٹائے بغیر راستہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ بارود اتنی بڑی چٹان کو نہیں اڑا سکتا تھا، واضح رہے کہ اس زمانے میں نائٹرو گلیسرین جیسا طاقتور دھماکا خیز مادہ ایجاد نہیں ہوا تھا اور عام بارود میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ بہت بڑی چٹانوں کو اڑا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ راستے بنانا اور خاص طور سے پتھریلے پہاڑوں میں سرنگیں بنانا بہت مشکل کام تھا جو کام آج کل ایک دن میں ہو جاتا ہے اسے کرنے میں بعض اوقات مہینا لگ جاتا تھا۔

میسن کام روک کر جانے والا تھا کہ اسے جے گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اسے یاد آیا کہ کل اس شخص نے ریلوے لائن کی مخالفت کی تھی اور وہ اس وقت وہاں آرہا تھا۔ اس نے نزدیک آکر غور سے میسن کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”کیوں دوست کوئی حل سمجھ میں آیا اس مشکل کا؟“ اس نے پہاڑی کٹاؤ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے انداز پر میسن کو غصہ آگیا تھا۔

”تم فکر مت کرو کام کرنے والے ہر مسئلے کا حل نکال لیتے ہیں اور جنہوں نے کچھ نہ کرنا ہو وہ صرف کاموں میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔“

جے ہنسا۔ ”طنز بھی اچھا کر لیتے ہو مگر دوست اس جگہ سے ریل کی پٹری نہیں گزر سکتی ہے، میں اس پر ملین ڈالرز کی

شرط لگانے کو تیار ہوں۔''

''تم بلاوجہ اپنی رقم مت ضائع کرو۔ پٹری گزرے گی اور اسی جگہ سے گزرے گی۔''

''واقعی۔'' جے کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا ہوگیا تھا۔ ''تم کو اتنا یقین ہے اور شرط لگانے کے لیے تیار نہیں ہو۔''

''اگر تم کو شرط لگانے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ شرط اس طرح اکیلے میں نہیں لگائی جاتی ہے سب کے سامنے لگائی جاتی ہے۔''

''چلو سب کے درمیان لگالیں گے۔'' اس نے کہا اور گھوڑا موڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میسن نے اپنے کاغذات سمیٹے اور خود بھی مون کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا تھکن اور اس سے زیادہ مایوسی سے برا حال تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے کہیں ناکامی نصیب نہ ہو جائے اور اس کے شاندار کیریئر پر دھبّا لگ جائے۔ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈگری لے کر اپنا کام شروع کیا تھا پھر وہ اس فرم میں ملازم ہوگیا اور اسے پہاڑوں میں ریل بچھانے کا ٹھیکا مل گیا۔ فرم کے مالکان نے میسن سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر اس نے پٹری بچھانے کا کام کامیابی سے کرلیا تو اسے فرم کے مالکان میں شامل کرلیں گے۔

میسن کے لیے یہ ایک پُرکشش پیشکش تھی مگر اس سے بھی بڑھ کر اس کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ ہو جاتا جب تک یہ پٹری رہتی اسے بھی یاد رکھا جاتا اور اس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے تیار تھا۔ جب اسے اس جگہ کے نقشے دیے گئے تھے تب اس نے یقین سے کہا تھا کہ وہ اس جگہ سے پٹری گزار لے گا۔ حالانکہ اس کے باس نے کہا تھا کہ وہ دعویٰ کرنے سے پہلے جا کر مذکورہ جگہ دیکھ لے۔

اور اب اسے احساس ہو رہا تھا اس نے بہت بڑا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ یہ کام ناممکن حد تک مشکل تھا۔ اس نے ہوٹل آکر نہا دھو کر ایک گلاس پینے کے لیے جیمس کے بار کا رخ کیا۔ وہاں جے کو موجود دیکھ کر اس کا موڈ پھر خراب ہو گیا۔ جے اسے دیکھ کر بلند آواز سے بولا۔

''انسان بعض اوقات اپنی ہمت سے بڑھ کر دعوے کرنے لگتا ہے۔''

''مجھے ایک بیئر دو۔'' میسن نے اس کی بات نظرانداز کر کے جیمس سے کہا۔ اس نے مگ میں بیئر بھر کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''سنا ہے آج تم نے دریا کے کنارے کٹاؤ والے حصے کا معائنہ کیا ہے؟''

میسن نے ایک گھونٹ بھرا۔ ''ہاں ...... اس جگہ سے ریل گزارنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔''

''میری اور ہم سب کی نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں کہ تم یہ کام کرلو۔'' جیمس نے خلوصِ دل سے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا۔''

''بہ شرطیکہ کٹاؤ کا کوئی مسئلہ نکل آیا۔'' جے نے پھر بلند آواز سے کہا۔

''اس میں شرط لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میسن نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر تم کو شبہ ہے تو تم شرط لگا سکتے ہو۔''

''اچھا۔'' جے کے لہجے میں چیلنج آگیا تھا۔ ''ایک لاکھ ڈالرز کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

جے کی بات نے بار میں سنسنی دوڑا دی تھی، خود میسن کا ہاتھ لرز گیا تھا اور کچھ بیئر چھلک گئی۔ اس نے بے یقینی سے جے کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''سو فی صد۔'' وہ بولا۔

''ایک لاکھ ڈالرز بہت بڑی رقم ہے۔'' میسن نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں۔ اگر تمہارے لیے بڑی ہے تو تم بتا دو کہ کتنی رقم لگا سکتے ہو۔'' جے کا لہجہ مذاق اڑانے والا ہوگیا تھا۔ میسن کو لگا کہ اس کا سارا خون کھنچ کر چہرے پر آگیا ہے۔ اس نے گلاس کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔''

''مسٹر ٹکور۔'' جیمس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بہت بڑی شرط ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میسن نے جے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے دریا کے ساتھ ریل کی پٹری بچھا دی تو تم مجھے ایک لاکھ ڈالرز دو گے؟''

''ہاں مگر یہ کام ایک مخصوص وقت میں ہونا چاہیے۔'' جے بولا۔

''میں دو مہینے میں یہ کام کرلوں گا۔''

''مجھے منظور ہے، مگر تم پٹری نہ بچھا سکے تو کیا تم مجھے ایک لاکھ ڈالرز دے سکتے ہو؟'' جے کا انداز استہزائیہ ہوگیا تھا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' میسن نے غصے سے کہا۔

''مسئلہ تو ہے اگر تم نے بعد میں خالی جیب دکھا دی تو میں کیا کرلوں گا میرے تو لاکھ ڈالرز گئے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں ایک صاحبِ جائداد آدمی ہوں، یہ کام تو میرا شوق ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو جے نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے میں دیکھوں گا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرتے

ہو یا نہیں۔"

اس شرط نے اتنی سنسنی پھیلائی تھی کہ جب میسن بار سے ہوٹل پہنچا تو وہاں تک یہ بات پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ مون بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟"

"اوہ تم تک بھی خبر آ چکی ہے۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"ہاں...... تم نے جے سے ایک لاکھ ڈالرز کی شرط لگا لی ہے؟"

"پہلے کھانا...... مجھے بہت زور سے بھوک لگ رہی ہے، اس کے بعد بات کریں گے۔" میسن نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اندر جاتے ہی اسے بند کر دیا۔

مجبوراً مون واپس چلی گئی۔ اس کے انداز سے میسن نے محسوس کیا کہ اسے میسن کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ کیا اس نے جے سے شرط لگا کر کوئی غلطی کی تھی؟ اس نے سوچا، پھر وہ اس بات کو جھٹک کر اپنے آج کے کام کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اس نے دریا کے ساتھ ریل کی پٹری بچھانے کے لیے کچھ خاکے تیار کیے تھے اور اب ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے چکر میں مون آج جلدی کھانا لے آئی تھی اور کھانا اس کے سامنے رکھ کر خود بھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ابھی بات کرو گی؟" میسن نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ لڑکی شروع سے کچھ خاص لگی تھی۔

"ہاں...... میسن میں بتا رہی ہوں تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ جے لوگوں کو اسی طرح اپنے جال میں پھنساتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے اس سے اتنی بڑی شرط لگا لی ہے۔ اس ریاست کے قانون کے مطابق کوئی شخص ایک لاکھ ڈالرز کی شرط لگاتا ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ اسے جیتنے کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتا ہے۔"

"اتنا احمقانہ قانون؟" میسن حیران رہ گیا تھا۔

"قانون تو بس قانون ہے۔ جے اس کا فائدہ اٹھا کر پہلے بھی کئی لوگوں کو نقصان پہنچا چکا ہے اور مجھے ڈر ہے وہ تمہارے ساتھ بھی یہی کام کرے گا۔"

"اگر اس نے میرے ساتھ کوئی غلط حرکت کی تو میں بھی اسے نہیں بخشوں گا۔"

"اف تم سمجھ نہیں رہے ہو تم کام کرو گے اور وہ تم کو روکنے کی کوشش کرے گا تو یہ اس کا فائدہ ہے۔ تم کیا کر لو گے؟"

میسن نے سوچا، واقعی وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے مون کی طرف دیکھا۔ "اب میں کیا کروں۔ میں نے غصے میں آ کر اس کی شرط مان لی تھی؟"

"اس نے تم سے کوئی شرط کی دستاویز دستخط کرائی ہے؟"

"نہیں...... ابھی ایک گھنٹے پہلے کی تو بات ہے۔"

"وہ بہت مکار آدمی ہے وہ تم سے ایسی کوئی دستاویز ضرور دستخط کرائے گا جو اس شرط کو ریاست کے قانون کے اندر لے آئے۔"

"یعنی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے اس کا تحریری ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں اس کے بغیر یہ قانون کے دائرے میں نہیں آئے گی۔"

"تب ٹھیک ہے میں ایسی کسی دستاویز پر دستخط کرنے سے انکار کر دوں گا۔" میسن نے کہا۔

"بالکل یہی کرنا۔" مون خوش ہو گئی۔ "تم ایک لاکھ ڈالرز کیسے ادا کرو گے؟"

"ہاں میں اتنی رقم ادا نہیں کر سکتا۔" اس نے مون کے سامنے اعتراف کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔

"یعنی تم اس شرط سے دست بردار ہو رہے ہو؟"

"نہیں میں اتنے لوگوں کے سامنے زبان دے چکا ہوں اور اس سے پھرنا میرے بس کی بات نہیں ہے ہاں میں اسے موقع نہیں دوں گا کہ وہ مجھ پر کوئی غیر قانونی حربہ استعمال کر سکے۔"

"کیا تم اس کی شرط مان کر ریل کی پٹری بچھاؤ گے؟" مون چلّا اٹھی۔ "تم جانتے ہو یہ کتنا مشکل کام ہے؟"

"ہاں وہ تو میں جانتا ہوں مگر میں اس کا چیلنج قبول کر چکا ہوں۔"

"میسن خدا کے لیے......" مون نے کہنا چاہا۔

"میں زبان دے چکا ہوں۔" اس نے مون کی بات کاٹی۔

"میرے خدا۔" مون نے بے قراری سے کمرے کا ایک چکر لگایا۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"تم مجھے احمق کہو یا کچھ اور...... بات تو طے ہو چکی ہے۔"

"جے تم سے دستاویز بھی دستخط کرا لے گا۔"

"اب میں اتنا احمق بھی نہیں ہوں۔"

"سنو...... تم دو مہینے کیا چار مہینے میں بھی اس جگہ سے پٹری نہیں گزار سکتے۔"

میسن کو اس کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا۔ "یہ میرا کام ہے اور میں جانتا ہوں کہ کس طرح کرنا ہے۔"

"تم جتنی آسانی سے جے کے ہاتھوں بے وقوف بن

گئے ہو اس کے بعد تم اس قسم کی باتیں کرتے اچھے نہیں لگتے ہو۔" مون نے ترحم آمیز انداز میں کہا۔ "بہر حال یہ بعد کے معاملات ہیں ابھی تو تم کھانا کھاؤ۔"

کھانے کے دوران بھی میسن سوچتا رہا اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک دیہاتی نے اسے کتنی مہارت سے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اور اب وہ اس کے سامنے مجبور تھا یا تو ہار مان لیتا یا اس کا دیا ہوا چیلنج پورا کرتا اور نا کام ہو جاتا تو اسے ایک لاکھ ڈالرز بھی دینا پڑتے اور اس کی ساکھ بھی خاک میں مل جاتی۔ وہ ایک دلدل میں پھنس گیا تھا اور اب اس سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اب ہر حال میں یہ کام کر کے دکھائے۔ مون کمرے میں موجود تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھانا ختم کیا تو وہ بولی۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"یہی کہ میں اس کا چیلنج پورا کر کے دکھاؤں گا۔"

"میرے خدا تم کس قدر ضدی آدمی ہو۔" مون نے پاؤں پٹخے اور کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میسن نے سوچا۔

"یہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف نہیں ہو رہی ہے۔"

اگلے روز وہ تیار ہو کر ہوٹل سے نکلا تو جے دروازے پر اس کا منتظر تھا اور اس کے ہاتھ میں شرط کی تحریری دستاویز تھی۔ "تم اس پر دستخط کر دو۔" اس نے کاغذ میسن کے آگے کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے میں نے تم کو زبان دی ہے اور مرد کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔"

"زبان کی بات نہیں ہے اس ریاست کے قانون کے مطابق کوئی بھی شرط تحریر میں لانا ضروری ہے۔" جے چالاکی سے بولا۔

"مگر میرا تعلق جس ریاست سے ہے وہاں اس قسم کا کوئی قانون نہیں ہے۔ اس لیے زبان ہی کافی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

جے نے بہت کوشش کی کہ اس سے کاغذ پر دستخط کرا لے مگر اس نے انکار برقرار رکھا اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس روز اس نے پوری جانفشانی سے کام کیا اور دریا کے اس کنارے کا ہر ممکن زاویے سے جائزہ لیا کہ کسی طرح اس سے ریل کی پٹری گزر سکے۔ مگر اس روز اسے پہلے سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی۔ کٹاؤ پر سے پٹری گزارنا بہت مشکل کام تھا اور اس میں نہ صرف وقت بلکہ رقم بھی بہت زیادہ لگ سکتی تھی اور یہ کام دو مہینے میں ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر پچھتایا تھا کہ اس نے جے سے اتنی واہیات شرط کیوں لگائی تھی۔

اس نے ایک رپورٹ بنا کر اپنے باس کو روانہ کی اور اس میں تجویز دی کہ دریا کے کنارے کٹاؤ پر فولادی پل بنایا جائے اور اس پر سے پٹری گزاری جائے۔ یہ ایک قابلِ عمل تجویز تھی بس اس میں دو قباحتیں تھیں ایک تو وقت بہت لگتا اور دوسرے پیسا اندازے سے بھی زیادہ خرچ ہو سکتا تھا۔ مگر کام تو کرنا تھا مگر وقت نہیں تھا اس نے سوچا تھا کہ وہ دن رات کام کرائے تو دو مہینے میں کام مکمل ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس نے باس پر زور دیا تھا کہ وہ جلد اس رپورٹ کی منظوری دے۔

تیسرے دن فرم کی جانب سے اس کے منصوبے کی منظوری کے ساتھ ایک پل بنانے کا ماہر بھی آ گیا تھا۔ رابرٹ ہنکس نامی یہ شخص اپنے کام کا ماہر تھا اور میسن پہلے بھی اس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ مقررہ وقت میں پل تیار کر دے گا مگر جب اس نے کٹاؤ دیکھا تو حیران ہو کر میسن سے کہا۔

"تم اس جگہ پل بنانا چاہ رہے ہو؟"

"ظاہر ہے، پٹری نے اس جگہ سے گزرنا ہے اس لیے پل بھی اسی جگہ بنے گا۔"

"یہ جگہ پل بنانے کے لیے ناموزوں ہے۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "اور یہاں پل بنانا بہت مہنگا اور خطرناک کام ہے۔"

"تم کوشش تو کر سکتے ہو۔ ہمیں بہرصورت یہاں سے ریل کی پٹری گزارنی ہے۔"

"تمہارا دماغ درست ہے اس جگہ پل بنانا ناممکن ہے۔"

"دیکھو دوست...... اگر اس جگہ پل نہ بنا تو ریل کی پٹری اس جگہ سے نہیں گزر سکے گی اور ہمیں اسے کوئی بیس میل پیچھے لے جانا ہوگا اور اس کا مطلب ہے کہ کمپنی ہم سب کو فارغ کر دے، کیونکہ اتنی لمبی لائن بچھانے پر آنے والا خرچ کل نفع سے زیادہ ہی ہوگا تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"میرے خدا۔" رابرٹ نے سر پر ہاتھ مارا۔ "تم ساری مشکلات میرے لیے ہی کیوں کھڑی کرتے ہو؟"

"مجبوری سمجھو۔" میسن نے کہا۔ "تو تم پل بنانے کی کوشش کرو گے؟"

"ظاہر ہے مگر میں بتا دوں اس جگہ پل بنانا بہت خطرناک ہے۔ یہ گر سکتا ہے اور اس سے گزرتے ہوئے پوری ٹرین دریا میں جا سکتی ہے۔"

"تمہیں چٹانوں کا یہ پیالہ بہت مضبوط ہے۔"

"مگر اس کی ساخت کی وجہ سے اس پر مضبوط پل بنانا مشکل ہے۔"

"تم کوشش تو کرو۔" میسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

رابرٹ نے کام شروع کر دیا تھا وہ اپنا کام کر کے واپس چلا گیا تا کہ پُل کی تیاری کا کام کر سکے۔ پُل کے مختلف حصے ٹرین کے ذریعے بھیجے جاتے اور ان کو یہاں جوڑا جانا تھا۔ میسن نے اس دوران میں کٹاؤ کے آس پاس پتھر اور مٹی کی بھرائی شروع کرادی تا کہ پُل کو سہارا مل سکے، سارا دن دھول مٹی میں کام کر کے جب وہ واپس ہوٹل جاتا تھا تو کھانا کھاتے ہی بستر پر گر کر سو جاتا تھا۔ اس کے پاس مون سے دو باتیں کرنے کا وقت اور ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔

پندرہ دن بعد پُل کے مختلف حصے آنا شروع ہو گئے تھے اور اب ان کو جوڑ کر پُل تیار کرنا تھا۔ یہ کام رابرٹ کا تھا اس لیے میسن اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک مہینے بعد آیا تھا جب کہ پُل کے حصوں کی تیاری کا بیشتر کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے آتے ہی لوہے کے پُل کے مختلف حصے جوڑنا شروع کر دیے۔ اگلے مرحلے میں ان کو کٹاؤ والی جگہ پر نصب کرنا تھا اور یہی سب سے مشکل کام تھا۔ میسن نے اس کے لیے کچھ مشینیں بھی منگوائی تھیں مگر یہ بھی خاص مدد نہیں دے پا رہی تھیں اور لگ رہا تھا کہ پُل کی تنصیب کا مرحلہ آسان نہیں ہو گا۔ اس نے دو ماہروں سے بھی مشورہ مانگا اور انہوں نے بھی یہی کہا کہ اس جگہ پُل بنانا آسان نہیں تھا۔ لوہے کے ٹنوں وزنی حصوں کو اٹھا کر اپنی جگہ رکھنا بہت مشکل کام تھا اور اس کے لیے کرین کی ضرورت تھی۔ چیزوں کی ضرورت بڑھ رہی تھی اور اسی لحاظ سے اخراجات بھی بڑھ رہے تھے، میسن کو ڈر تھا کہ ابھی ہیڈ آفس سے جواب طلب کر لیا جائے گا۔ وہ اس کا جواب تو دے سکتا تھا اگر پُل بن جاتا اور اس جگہ سے ریل کی پٹری گزر جاتی دوسری صورت میں اس کی چھٹی ہو جاتی۔ اس سے بھی بڑھ کر اسے شرط ہارنے کی صورت میں ایک لاکھ ڈالرز دینا پڑتے۔ اس کے پاس ایک لاکھ ڈالرز نہیں تھے، مگر اسے دینا تو تھے۔ ہر گزرتا دن اسے ناکامی کے قریب لا رہا تھا چالیس دن گزر چکے تھے اور اب اس کے پاس پُل نصب کرنے کے لیے صرف بیس دن تھے۔

میسن نے دوگنا مزدور بھرتی کر لیے اور ان سے پُل کی تنصیب کا کام کرانے لگا۔ دوسری طرف پٹری دریا کے کنارے کٹاؤ والے حصے تک آ گئی تھی اور اب صرف پُل بچھانے کی دیر تھی اس پر سے پٹری گزاری جا سکتی تھی۔ مزدور اپنی بساط سے بڑھ کر کوشش کر رہے تھے اور پُل کے مختلف حصے کٹاؤ میں نصب کر رہے تھے۔ ان کی انتھک کوشش سے پُل بننے لگا اور اس کی صورت واضح ہو رہی تھی۔ میسن کو جے کی طرف سے شرارت کا خطرہ تھا اس لیے اس نے پُل کی حفاظت کے لیے محافظ مقرر کر دیے تھے جو رات کے وقت پُل کے پاس رہا کرتے تھے۔

ابھی پانچ دن باقی تھے اور پُل تقریباً مکمل ہو گیا تھا کہ بارشیں شروع ہو گئیں اور بارش بھی ایسی قیامت کی کہ اس میں کچھ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دریا کے ساتھ کا حصہ خطرناک ہو گیا تھا اور مزدور وہاں کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میسن روز پُل کی طرف جاتا تھا اور بے نیل و مرام لوٹ آتا تھا۔ شرط کی مدت ختم ہونے میں دو دن رہ گئے تھے۔ میسن پُل کی طرف سے لوٹ رہا تھا اس وقت بھی قیامت خیز بارش جاری تھی۔ وہ پناہ کے لیے جیمس کے بار میں گھس گیا۔ حسبِ معمول وہاں جے موجود تھا۔ اس نے میسن کو دیکھا اور انگلیوں سے وی کا اشارہ کیا۔

”تم فکر مت کرو دوست...... پُل تقریباً بن چکا ہے اور جیسے ہی بارش رکی اس پر سے پٹری گزار دی جائے گی۔“ میسن نے کہا۔

”یہ بارش رکنے والی نہیں ہے...... ابھی یہ کم سے کم ایک ہفتہ اور جاری رہے گی۔“ جے بولا وہ بہت خوش تھا کیونکہ بارش کے ہوتے ہوئے پُل بننا اور اس پر سے پٹری گزرنا ممکن نہیں تھا۔

”بارش ہوتی رہے یا رک جائے۔ کل ہر صورت کام ہوگا۔“ میسن نے ایک عزم سے کہا۔

”اس حالت میں کوئی مزدور کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا اور جیمس سے وہسکی مانگی۔ آج موسم سرد ہو چلا تھا۔ یہاں سے نکل کر اس نے جوزف سے ملاقات کی اور اسے کل کام کے بارے میں کہا۔ وہ فکرمند ہو گیا تھا۔

”اس حالت میں مزدور تیار نہیں ہوں گے اور بارش میں کام کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”کام بہر صورت ہونا ہے تم مزدوروں سے کہو کہ ان کو کل کام کرنے کی دوگنی مزدوری ملے گی۔“

”میں بات کرتا ہوں لیکن مشکل ہے کہ یہ لالچ بھی ان کو راضی کر سکے کیونکہ اس میں خطرہ ہے۔“

”جوزف یہ کام کل تک ہونا چاہیے۔“ میسن نے اضطراب سے کہا۔ ”ورنہ میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

”تم نے جو شرط لگائی ہے اس کی بات کر رہے ہو؟“

میسن نے سر ہلایا۔ ”ہاں...... ورنہ مجھے ایک لاکھ ڈالرز دینا ہوں گے۔“

”اس شرط کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے تم انکار کر

سکتے ہو۔" جوزف نے مشورہ دیا۔

"نہیں یہ میری عزت کا سوال ہے۔" اس نے انکار کیا۔ "مجھے شرط پوری کرنی ہے یا اسے ایک لاکھ ڈالرز ادا کرنے ہیں۔"

"تم بھی پاگل ہو۔" جوزف نے سرد آہ بھری۔ "ایک تو ایسی شرط لگائی ہے اور اب اسے پورا کرنے کے چکر میں خود بھی پاگل ہو رہے ہو اور دوسروں کو بھی پاگل کر رہے ہو۔"

"تم مزدوروں کو راضی کرو اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دو۔"

جوزف مزدوروں سے بات کرنے ان کے کیمپ میں چلا گیا۔ باہر سے آنے والے مزدور ایک کیمپ میں مقیم تھے اور جن کا تعلق نارٹن سے تھا وہ اپنے گھروں میں رہ رہے تھے۔ رات تک جوزف ان سے بات کر کے ان کو قائل کرتا رہا۔ میسن ہوٹل میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مون نے اس کے لیے کھانا بنا لیا تھا مگر اس نے بے دلی سے چند لقمے لے کر کھانا چھوڑ دیا تھا۔

"کیا کھانا ٹھیک نہیں ہے؟" مون نے پوچھا۔

"نہیں تو......" وہ چونکا۔ "کھانا مزے کا ہے مگر میرا موڈ نہیں ہو رہا ہے۔"

"کل آخری دن ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں ایسا ہی ہے...... اگر میں نے پرسوں تک اس جگہ سے ریلوے لائن نہ گزاری تو مجھے جے کو ایک لاکھ ڈالرز دینا ہوں گے۔"

"میسن تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرو گے؟" مون کے لہجے میں فکر آ گئی تھی۔

"یہ میں نے ابھی نہیں سوچا ہے مگر اس صورت میں اسے رقم ضرور دوں گا۔"

مون سوچتی رہی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "سنو...... اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔"

"تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟" میسن نے اسے غور سے دیکھا۔

"میرا یہ ہوٹل ہے اس کے علاوہ بہت اچھا مکان ہے کچھ اور زمین بھی ہے۔ یہ سب مل ملا کر پچاس ہزار تک میں فروخت ہو سکتے ہیں۔"

"تم مجھے اتنی بڑی رقم دینے کو تیار ہو...... کیوں؟" میسن نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو تم خود سے پوچھو۔"

"میں خود سے کیا پوچھوں؟" اس نے غور کیا۔

"تم سچ مچ بدھو ہو۔" مون چڑ کر بولی۔ "میں تم کو پسند کرتی ہوں اور عورت جسے پسند کرتی ہے اس کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے۔"

"تم مجھے اتنا پسند کرتی ہو؟" میسن دنگ رہ گیا تھا۔ "میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو مگر یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا کہ تم اس حد تک پسند کرتی ہو۔"

"میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔" مون نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ "نیلسن کے بعد تم پہلے آدمی ہو جس نے میرے دل تک رسائی حاصل کی ہے۔"

"تم بھی مجھے اچھی لگتی ہو۔" میسن نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن میں اپنے مسائل خود حل کرنے کا قائل ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تم کو تو خدا کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" مون نے اس کی بات یاد دلائی تو وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ آدمی عملی طور پر کام کرے اور پھر خدا پر بھروسا کرے۔ کچھ کیے بغیر خدا سے توقع رکھنا کہ وہ سب ٹھیک کر دے گا میں اس کا قائل نہیں ہوں۔"

"میں کل چرچ جا کر پھر تمہارے لیے دعا کروں گی۔" مون نے کہا۔ "اور تم خود کو اکیلا مت سمجھنا۔"

اس بار میسن نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "ہاں اب میں نے خود کو اکیلا سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔"

ملازمہ اچانک اندر آئی تو وہ بوکھلا کر الگ ہو گئے تھے۔ ملازمہ ان سے زیادہ بوکھلا گئی تھی۔ "وہ مجھے برتن لینے تھے۔"

"ہاں...... ہاں لے لو۔" مون نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور ملازمہ کے جانے کے بعد بولی۔ "کل تک ہمارے تعلق کی خبر پورے نارٹن کو ہو چکی ہوگی۔"

"اچھی بات ہے۔" میسن مسکرایا۔ "اس کی خبر کبھی نہ کبھی تو دوسروں کو ہونا ہی تھی...... تو اب سہی۔"

☆☆☆

"بارش کے زور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس لحاظ سے جے کی پیش گوئی درست ثابت ہو رہی تھی کہ یہ بارش اب ایک ہفتے سے پہلے رکنے والی نہیں ہے۔ مگر جیسے ہی صبح کی روشنی نمودار ہوئی مزدور کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے پل کے حصے اٹھا کر مطلوبہ مقام پر پہنچانا شروع کر دیے۔ بارش کی وجہ سے یہ کام دشوار ہو رہا تھا مگر مزدور ہمت کر کے لگے ہوئے تھے۔ وہ احتیاط سے کام کر رہے تھے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ دوگنی مزدوری نے ان کو یہ خطرہ مول لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

خود میسن مزدوروں کے ساتھ لگا ہوا تھا تاکہ وہ جوش

سے کام کریں۔ ایک ایک کر کے پُل کے حصے اپنی جگہ بیٹھ رہے تھے۔ شام کے قریب یہ کام مکمل ہو گیا تھا۔ اب پُل تیار تھا اور اس پر سے ریل کی پٹری گزاری جا سکتی تھی۔ میسن کے لیے اپنی مسرت پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا اس نے نہ صرف اپنا چیلنج پورا کرا دیا تھا بلکہ وہ جے سے ایک لاکھ ڈالرز بھی وصول کر سکتا تھا۔ شام کو اس نے مزدوروں سے کہا کہ نہ صرف ان کو دوگنی مزدوری بلکہ اتنا ہی بونس بھی ملے گا اس نے فیصلہ کیا تھا کہ یہ بونس وہ اپنی جیب سے دے گا، کیونکہ یہ مزدور ہی تھے جن کی وجہ سے وہ یہ ناممکن حد تک دشوار کام کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ واپس آنے سے پہلے اس نے پُل کے پہریداروں کو ہوشیار رہنے کو کہا اور خود قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیمس کے بار میں آج موضوع اسی کی ذات تھی اور جب وہ اندر آیا تو سب نے اسے مبارک دی تھی۔ جے بھی وہاں موجود تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ اس پر کوئی طنز کرے گا مگر میسن نے اسے نظر انداز کر کے اپنے لیے ایک وہسکی مانگی اور بلند آواز سے بولا۔ ''کل پُل پر سے پٹری گزرے گی۔''

''کل ابھی بہت دور ہے۔'' جے نے زہریلے لہجے میں اس سے کہا۔

''اب اتنا دور بھی نہیں ہے۔ بس چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔''

''چند گھنٹے میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔'' جے نے کہا اور وہاں سے چلا گیا اس کے جانے کے بعد جیمس نے آہستہ سے کہا۔

''اس سے ہوشیار رہنا...... تم نے پُل کی حفاظت کے لیے آدمی رکھے ہیں؟''

''ہاں تم فکر مت کرو۔'' میسن نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے آدمی ہوشیار ہیں۔''

''جے بہت کمینہ شخص ہے اس سے ایسے ہوشیار رہو جیسے زہریلے سانپ سے ہوشیار رہتے ہیں۔''

''میں نے کہا نا تم فکر مت کرو۔''

''سنا ہے آج کل مون تم پر بہت مہربان ہے۔'' جیمس کا لہجہ بے تکلفانہ ہو گیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے مون نے ٹھیک کہا تھا اس قصبے میں خبریں بہت تیزی سے پھیلتی ہیں۔'' میسن مسکرانے لگا۔ اس نے گلاس خالی کر کے ایک سکہ میز پر رکھ دیا۔ مگر جیمس نے لینے سے انکار کر دیا

''یہ آج کی کامیابی پر میری طرف سے۔''

''شکریہ۔'' میسن نے کہا اور بار سے نکل گیا اُسے معلوم تھا مون بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہو گی اور ایسا ہی تھا وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی۔

''میں نے سنا ہے پُل مکمل ہو چکا ہے؟''

''تم نے درست سنا ہے۔'' میسن نے سر ہلایا۔

''اوہ میرے خدا۔'' مون خوشی سے چلّائی اور اس سے لپٹ گئی۔ ''اس کا مطلب ہے آج میں نے چرچ میں جو دعا مانگی تھی وہ قبول ہو گئی۔''

''کل پُل پر سے پٹری گزرے گی اور اس سے اگلے دن میں جے سے ایک لاکھ ڈالرز وصول کروں گا۔''

اچانک مون فکر مند ہو گئی۔ ''جے بہت ڈھیٹ آدمی ہے اور اس سے کسی بھی گری ہوئی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''اگر تم پُل کی طرف سے فکر مند ہو تو اس معاملے میں بے فکر ہو جاؤ، میں نے پُل کی حفاظت کے لیے چار مسلح افراد لگا دیے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کوئی پُل کے پاس بھی پھٹک نہیں سکتا ہے۔''

''میں نے بھی ٹومی کو جے کی نگرانی پر لگا دیا ہے اگر اس نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہمیں پتا چل جائے۔''

''میری جان تم بلا وجہ فکر کر رہی ہو۔''

''بلا وجہ نہیں تم جے کو اتنا نہیں جانتے ہو جتنا میں جانتی ہوں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میسن نے موضوع بدل دیا۔ ''مجھے بہت زور سے بھوک لگی ہے اور آج میں تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔''

''سچ۔'' مون خوش ہو گئی۔ ''میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔''

''نہیں آج ہم ڈائننگ ہال میں کھائیں گے تاکہ جن کو ہمارے تعلق کا علم نہیں ہے ان کو بھی پتا چل جائے۔''

''جیسی تمہاری مرضی...... ویسے پتا سب کو چل گیا ہے۔''

''پھر بھی میں ڈائننگ ہال میں کھانا چاہتا ہوں۔''

''میں کب انکار کر رہی ہوں۔'' مون نے جاتے ہوئے کہا۔ ''آدھے گھنٹے بعد نیچے آ جانا۔''

میسن سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت تھا اس نے اتنی دیر میں نہا کر کپڑے بدل لیے اور نیچے آیا تو ٹومی نے اس کی ایک سجی میز تک رہنمائی کی۔ ''سر آپ اور میڈم یہاں ڈنر کریں گے۔''

میز پر تازہ پھولوں کا دستہ اور نیا میز پوش بچھا تھا۔ چند منٹ بعد مون آ گئی وہ بھی تیار تھی۔ اس نے مسحور کن خوشبو لگا رکھی تھی اور ہال میں موجود لوگ ان کو دیکھنے لگے تھے۔ ''تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' میسن نے اس کے رخسار پر پیار کیا۔

''شکریہ۔'' وہ شرمائی۔ ''تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔''

میسن نے پہلے شمپین کا آرڈر دیا اور بوتل آئی تو میسن

نے اس کے اور اپنے لیے شیمپین نکالی۔ ''آج خاص موقع ہے اس کے نام۔''
''ڈیل کی کامیابی کے نام۔'' مون نے اپنا جام بلند کیا۔
''نہیں ایک نئی زندگی کے آغاز کے نام۔'' میسن نے کہا اور اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اسے مون کو پیش کیا۔ ''تمہارے لیے۔''
''اس میں کیا ہے؟'' مون نے ڈبیا لی۔ اسے کھول کر دیکھا تو اندر ایک نازک سی سونے کی انگوٹھی تھی جس میں ہلکے نیلگوں رنگ کا ہیرا لگا تھا۔ ''میرے خدا کتنی خوب صورت ہے۔''
''تم سے زیادہ نہیں۔'' میسن نے اسے شوق سے دیکھا۔ ''مون میں تم کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں منظور ہے؟''
''ہاں......'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ''منظور ہے۔''
میسن نے انگوٹھی لے کر اس کی انگلی میں پہنا دی تھی اور اچانک ہی ڈائننگ ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو وہاں موجود سب ہی لوگ کھڑے ہو کر ان کے لیے تالیاں بجا رہے تھے وہ دونوں جھینپ گئے تھے۔ پھر ملازمہ نے کھانا لگانا شروع کیا اور وہ ڈنر کرتے ہوئے مستقبل کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اس روز وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ خاصی دیر بعد میسن کو ہوش آیا اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔
''بہت رات ہوگئی ہے مجھے صبح جلدی جانا ہے۔''
''اچھا تم سو جاؤ۔'' مون نے بادل ناخواستہ کہا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میسن اس کے پاس سے اٹھ کر جائے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ کل کا دن بہت اہم تھا اور میسن کا چاق و چوبند ہونا ضروری تھا۔ میسن اپنے کمرے میں آیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ مگر ابھی اس کی آنکھ لگے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی نے زور سے دروازہ بجایا۔
''کون ہے؟'' اس نے زور سے پوچھا۔ باہر بارش کا شور بھی جاری تھا اور اس میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو بدحواس ٹومی یوں اندر آیا جیسے کسی نے اسے باہر سے دھکا دیا ہو۔
''کیا بات ہے؟''
''جناب جلدی چلیں۔'' ٹومی نے ہانپتے ہوئے کہا۔
''جے ابھی ابھی اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ پل کی طرف گیا ہے۔''
''پل کی طرف۔'' میسن نے تشویش سے کہا۔ ''کیا تم کو یقین ہے؟''
''جی جناب میں نے خود دیکھا ہے...... میڈم نے میری ڈیوٹی لگائی تھی میں بارش میں اس کی نگرانی کر رہا تھا۔''
''ایک منٹ رکو۔'' میسن اندر آیا اس نے جلدی سے کپڑے پہنے اور اپنا پستول نکال لیا۔ باہر آ کر اس نے ٹومی سے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''
وہ نیچے آئے تو مون بھی ڈائننگ ہال میں موجود تھی۔ وہ ان کی طرف لپکی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''
''ٹومی نے بتایا ہے کہ جے اپنے ساتھیوں کو لے کر پل کی طرف گیا ہے شاید وہ کسی شرارت کے موڈ میں ہے۔ میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔''
''میں بھی چلوں گی۔'' مون نے کہا۔
''نہیں تم یہاں رکو......'' میسن نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اس سے پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔ ٹومی اصطبل سے گھوڑے نکالنے گیا تھا جب تک اس نے گھوڑے نکالے، مون ایک عدد رائفل لے کر آگئی۔ ''خدا کے لیے کیا تم کسی سے لڑنے جا رہی ہو؟''
''شاید اس کی ضرورت پڑے۔'' مون نے کہا۔ اب چلو دیر مت کرو اس سے پہلے کہ وہ پل کو کوئی نقصان پہنچائیں۔''
''اس کی حفاظت کے لیے میرے ساتھی کافی ہیں۔'' میسن نے یقین سے کہا تھا۔
ٹومی گھوڑوں کے ساتھ دو عدد لالٹین بھی لے آیا تھا اور جب وہ شدید بارش میں بھیگتے ہوئے پل کے کنارے پہنچے تو میسن کے لگائے پہریدار وہاں سے غائب تھے۔ میسن نے چاروں طرف دیکھا۔ ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''
میسن نے تشویش سے اپنے آدمیوں کو آواز دی مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے گھوڑے سے اترتے ہوئے ٹومی سے کہا۔ ''تم جا کر میرے نائب جوزف کو پیغام دو کہ وہ اپنے آدمی لے کر یہاں پہنچ جائے۔''
''جی جناب۔'' ٹومی نے کہا اور گھوڑا موڑ کر چلا گیا۔
میسن اور مون پل کے پہریداروں کو تلاش کرنے لگے۔ ان کو جے یا اس کا کوئی ساتھی بھی وہاں نظر نہیں آیا تھا۔ مون دریا کے ساتھ چھوٹی چٹانوں کو دیکھ رہی تھی اچانک اس نے میسن کو آواز دی۔ ''ادھر آؤ...... یہ دیکھو۔''
میسن بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔ ''کیا ہوا؟'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اس کے چاروں پہریدار اس جگہ بندھے پڑے تھے اور ان میں سے ایک ہی ہوش میں تھا اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میسن نے کپڑا نکالا اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہے تم کو کس نے باندھ کر ڈالا ہے۔''

"پتا نہیں جناب...... وہ لوگ اچانک ہی ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ہم مدافعت نہیں کر سکے اور انہوں نے ہم کو یہاں باندھ کر ڈال دیا۔"

"تم نے کسی کو دیکھا نہیں؟"

"نہیں جناب...... انہوں نے منہ پر نقاب لگا رکھے تھے اور ان کے پاس بارود کی پیٹیاں تھیں۔"

"بارود کی پیٹیاں۔" میسن اچھل پڑا تھا۔ "احمق آدمی تم اب بتا رہے ہو۔" وہ اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور مون سے بولا۔ "تم ان سب کو کھول کر لے کر آؤ۔"

"تم اکیلے مت جاؤ۔" مون نے بے قراری سے کہا۔

"تم فکر مت کرو میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔"

میسن نے گھوڑے کو پل کی طرف بھگانا شروع کیا۔ اسے پہلے پل کے پاس کوئی نظر نہیں آیا تھا مگر اب اسے پتا تھا کہ جے اور اس کے ساتھی کہاں ہوں گے۔ وہ پل کے نزدیک پہنچا اور گھوڑے سے اتر کر نیچے کی طرف بھاگا۔ اس نے پل سے نیچے جھانکا تو تاریکی میں اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تو اسے ڈھلان کے ساتھ کچھ لوگ نیچے دریا میں اترتے دکھائی دیے اس نے پل پر بارود کی پیٹیاں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ شاید انہوں نے کہیں لگا دی تھیں اور اتنے بڑے پل میں ان کو تلاش کرنا ناممکن تھا۔ اس کا دل خدشات سے لرزنے لگا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اتنی برستی بارش میں بارود کو کیسے آگ لگائیں گے؟

اس سوال کا جواب بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا تھا۔ انہوں نے بارود کی پیٹیوں کے ساتھ رسیاں باندھ دی تھیں۔ جن کے ساتھ آگ لگانے والا مسالا ہوگا اور جیسے ہی رسی کو کھینچا جاتا بارود کو آگ لگ جاتی۔ وہ لوگ رسیاں لے کر دریا کی طرف اتر رہے تھے جہاں وہ کشتی میں سوار ہو کر کہیں بھی جا سکتے تھے اور ان کو پل تباہ کرنے کے لیے محض رسی کھینچنے کی ضرورت پڑتی۔ میسن نے پستول نکالا اور نیچے موجود افراد پر فائرنگ کرنے لگا مگر وہ اس کی حد سے باہر تھے۔ اسے نیچے سے ایک قہقہہ سنائی دیا اور جے کی آواز آئی۔

"تم پل نہیں بچا سکتے...... اپنی جان عزیز ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ۔"

جواب میں میسن نے اس پر کئی گولیاں چلائیں۔ یہ غصہ نکالنے والی بات تھی۔ ورنہ وہ اس کی حد سے باہر تھا اور تاریکی میں درست نشانہ لینا ویسے بھی ممکن نہیں تھا۔ اسی اثنا میں مون اس کے پہریداروں کو لے کر آ گئی اور اس نے مون سے رائفل لے کر ان لوگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر اب وہ دریا تک جا چکے تھے۔ اسے خطرے کا احساس ہوا اس نے چلّا کر کہا۔

"سب پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"کیوں؟" مون نے پوچھا۔

"انہوں نے پل میں بارود کی پیٹیاں لگا دی ہیں کسی لمحے بھی پل اڑ سکتا ہے۔"

ابھی میسن کے الفاظ منہ میں تھے کہ دھماکے شروع ہو گئے اور شعلے اٹھ کر اوپر تک آئے تھے وہ بے ساختہ پیچھے کی طرف بھاگے۔ "میرے خدا۔" میسن کے منہ سے نکلا تھا۔ شدتِ غم سے اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ شعلے بارش کی وجہ سے فوراً ہی بجھ گئے تھے مگر دھماکوں نے پل کو تباہ کر دیا تھا اور اس کا ملبا اب بھیانک آواز کے ساتھ دریا میں گر رہا تھا۔ میسن نے نیچے دیکھا اسی لمحے بجلی چمکی اور اس نے دیکھا کہ پل کا ملبا دریا میں کھڑی کشتی کی طرف جا رہا تھا اور اس میں سوار افراد عجلت میں کشتی کو دور لے جانے کی کوشش کر رہے تھے مگر ان کی یہ کوشش ناکام رہی اور فولادی پل کا ایک شہتیر سیدھا کشتی پر جا گرا اور اس کے پرخچے اڑا دیے اس میں موجود کوئی شخص زندہ نہیں بچا تھا ان کی چیخیں اوپر تک سنائی دی تھیں۔ انہوں نے جو گڑھا کھودا تھا وہ خود اس میں گر گئے تھے۔ میسن کو نہیں معلوم تھا کہ ان میں جے تھا یا نہیں...... اسے اپنے پل کا غم مارے جا رہا تھا۔ مون اس کے پاس کھڑی تھی اس نے تسلی دینے کے انداز میں میسن کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میسن...... فکر مت کرو۔ تم پھر سے پل بنا سکتے ہو۔"

"نہیں...... اب میری کمپنی والے اس کام میں پیسا نہیں لگائیں گے۔" اس نے مایوسی سے سر جھٹک کر کہا۔ "اب سب ختم ہو گیا ہے یہ کام بھی ختم ہو جائے گا۔"

"میسن خدا پر بھروسا رکھو وہ بہتر کرے گا۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے سر تھام لیا تھا۔

مون کا خدا پر ایمان غیر متزلزل تھا اس نے پھر کہا۔ "خدا چاہے تو سب ہو سکتا ہے۔"

"شاید......" میسن کے لہجے میں یقین نہیں تھا۔

وہ کٹاؤ کے کنارے کھڑے تھے کہ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی، ایک محافظ نے اوپر دیکھا اور چلّایا۔ "پیچھے ہٹو...... اوپر سے چٹان گر رہی ہے۔"

وہ سب پیچھے ہٹے، کٹاؤ کے عین اوپر جو بڑی سی گیند نما چٹان تھی وہ اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی، شاید بارودی دھماکوں سے اس کی جڑ ہل گئی تھی اور پھر بارش نے بھی اسے کمزور کر دیا تھا۔

جیسے ہی وہ اس جگہ سے ہٹے یہ گیند نما چٹان ایک خوف ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ لڑھک کر کٹاؤ پر آگری۔ چاروں طرف کیچڑ کے چھینٹے اڑے تھے اور وہ وہاں سے بھی بھاگے کیونکہ چٹان اتنی بڑی تھی کہ اس سارے کنارے کو توڑ سکتی تھی۔ چٹان کٹاؤ میں غائب ہوگئی۔ مون ہانپتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے ہم اس کے نیچے نہیں تھے ورنہ مارے ہی جاتے۔"

اب کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ جوزف اپنے آدمیوں کے ساتھ آگیا تھا۔ میسن نے اسے ساری بات بتائی اور اس سے کہا کہ وہ دیکھے کسی کو مدد کی ضرورت تو نہیں ہے اور یہ بھی دیکھے کہ پٹری کے بچ جانے والے حصے کو تو نقصان نہیں ہوا ہے۔ جوزف کو ہدایات دے کر وہ مون کے ساتھ واپس ہوٹل روانہ ہوگیا تھا۔ مون نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ اتنا دل شکستہ ہو رہا تھا کہ مون کی باتیں بھی اس کا دل نہ بہلا سکی تھیں۔ ہوٹل میں آتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بھاگ دوڑ نے اسے تھکا دیا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سو گیا تھا۔ صبح اس کے کمرے کا دروازہ پھر کسی نے بجایا۔

"اب کون آگیا۔" اس نے بےزاری سے دروازہ کھولا۔

"میسن ......" سامنے کھڑے جوزف نے کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ، ایک چیز دکھانی ہے۔"

"کیا کچھ اور بھی تباہ ہوا ہے؟" میسن نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بہت زبردست چیز ہے۔" جوزف کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ "تم چلو تو۔"

میسن تیار ہوا اس کا دل ناشتا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا اس لیے وہ ایسے ہی جوزف کے ساتھ روانہ ہوگیا تھا۔ اس نے جوزف سے پوچھا۔ "کیا بات ہے جس پر تم اتنا خوش ہو رہے ہو؟"

"ابھی چل کر خود دیکھ لینا۔" اس نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

کٹاؤ والی جگہ مزدور کام کر رہے تھے اور مٹی لا لا کر جمع کر رہے تھے، جوزف اسے کٹاؤ کے کنارے لایا تو اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ گزشتہ رات اوپر سے گرنے والی چٹان کٹاؤ کے نیم دائرے میں اس طرح سے پھنس گئی تھی کہ اس نے ایک قدرتی پل بنا دیا تھا اور اس کا نیچے گرنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ یہ دائرے میں پوری طرح فٹ ہو گئی تھی۔ دوسری بات یہ ہوئی تھی کہ جس جگہ پہلے چٹان تھی اس جگہ اب راستہ بن گیا تھا۔ پہلے اس چٹان کی وجہ سے راستہ تنگ رہتا تھا اور اس کی وجہ سے پٹری کو بہت تنگ زاویے سے چٹان کے اوپر پل بنا کر گزارا جا رہا تھا۔

"میرے خدا یہ تو کام ہی آسان ہوگیا ہے۔" اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"سچ میں نا۔" جوزف نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے معلوم تھا تم ایسا ہی کہو گے اس لیے میں نے پٹری گزارنے کی تیاری کر لی تھی۔"

"کام فوری طور پر شروع کرو۔"

مزدور چٹان کی سابقہ جگہ سے مٹی صاف کر رہے تھے اور نکالی جانے والی مٹی کٹاؤ میں پھنس جانے والی چٹان پر گرائی جا رہی تھی تاکہ رہا سہا خلا بھی ختم ہو جائے۔ میسن کے لیے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا اس کی اتنی بڑی ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ کل تک وہ مایوس تھا اور اب پُرامید تھا۔ اس نے فوری طور پر پٹری کے گزرنے والی جگہ میں تبدیلی کی اور اب پٹری بغیر تنگ موڑ کے آسانی سے اس جگہ سے گزر سکتی تھی، جہاں پہلے چٹان تھی۔ میسن بھاگ بھاگ کر مزدوروں کو خود ہدایات دے رہا تھا۔ اس دوران میں جوزف نے اسے کل کے باقی واقعات کی رپورٹ بھی دی تھی۔ اس نے بتایا کہ کشتی پر پل کا ملبا گرنے سے دو افراد مارے گئے تھے اور جے زخمی حالت میں ملا تھا اس کی جان بچ گئی تھی مگر ابھی اسے خاصے دن اسپتال میں گزارنے تھے۔ میسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے بھی اس سے ایک لاکھ ڈالرز لینے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔"

☆☆☆

نارٹن کے ریل اسٹیشن پر پہلی ٹرین آ رہی تھی اور اس کے استقبال کے لیے سارا قصبہ وہاں موجود تھا۔ میسن اور مون کے لیے تو یہ موقع اور بھی خاص تھا کیونکہ ان کی کچھ دیر پہلے شادی ہوئی تھی اور وہ اس ٹرین سے ہنی مون منانے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ ٹرین آئی تو مجمع بے قابو ہو کر ٹوپیاں اچھالنے لگا تھا۔ پھولوں کی بارش میں میسن اور مون ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ میسن نے جے سے ایک لاکھ ڈالرز وصول کر لیے تھے اور اب وہ اپنی کمپنی کے مالکان میں شامل تھا۔ ٹرین روانہ ہوئی اور جب کٹاؤ والی جگہ سے گزرنے لگی تو میسن نے مون سے کہا۔

"پہلے مجھے قدرت پر اتنا یقین نہیں تھا مگر اب میرا خیال ہے کہ قدرت انسان کے لیے بہتر کرتی ہے۔"

انتونیو پریک نے گھوڑے پر سوار دور تک پھیلی وادی کو دیکھا۔ سردیوں کے دن قریب تھے اور جنوبی کیلیفورنیا کے اس علاقے میں خزاں نے رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ انتونیو ایریزونا سے آرہا تھا اور اسے باجا کیلیفورنیا کے علاقے تک جانا تھا۔ 1840ء تک یہ علاقے صرف سونے‘ چاندی کی کانوں اور ان دو دھاتوں کے لیے کی جانے والی قتل و غارت گری کے لیے مشہور تھے۔ یہاں بسنے والوں کو جنوب کے وحشی کہا جاتا تھا۔ خاص طور سے باجا کیلیفورنیا کا علاقہ بے حد خطرناک تھا یہاں ذرا ذرا سی بات پر ہتھیار نکل آنا عام سی بات تھی۔ ایسے مناظر عام تھے کہ کسی مصروف بازار میں اچانک گولیاں چلنا شروع ہو گئیں اور چند لاشیں گریں‘ اس کے بعد جب امن ہوا تو لاشیں اٹھالی گئیں اور ایک گھنٹے کے اندر بازار معمول کے مطابق مصروف ہو گیا۔

اس کے مقابلے میں ایریزونا ایک پُرسکون علاقہ تھا جہاں اسلحہ تو عام تھا مگر اس کے استعمال کی نوبت شاذ ہی آتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی قتل ہو جاتا تو اس کی خبر ہفتوں زیر بحث رہا کرتی تھی۔ جب تک کوئی نیا واقعہ نہ ہو جاتا یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انتونیو کو جب بتایا گیا کہ اسے باجا کیلیفورنیا کے ایک ایسے گاؤں میں بھیجا رہا ہے جہاں اس کے پیش رو کو قتل کر دیا گیا تھا تو اس نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر شانے جھٹک کر اپنے سربراہ سے کہا۔ ”میں تیار ہوں جناب۔“

”ہمیں امید ہے تم وہاں صورتِ حال کو سنبھال لو گے۔“ سربراہ نے نرمی سے کہا۔ ”اگرچہ وہاں بسنے والے لوگ بہت وحشی ہیں۔“

”جناب، میں ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹ سکتا ہوں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں۔“ سربراہ نے کہا۔ ”لیکن میرے پیشِ نظر یہ بات ہے کہ وہاں کسی طریقے سے امن و

ایک مختلف انسان کے منفرد روپ، دلکش انداز

کبھی کبھی دل برائی سے اس طرح بھی بیزار ہو جاتا ہے جیسے کوئی میٹھا کھاتے کھاتے اکتا جائے ...... اس نے بھی ایک دن اچانک یونہی راستہ بدلا اور انجانی منزل کی جانب بڑھ گیا ...... اگرچہ راہ میں کئی حادثات منتظر تھے لیکن جب کوئی کسی کے لیے دعا کرتا ہے تو راستے خود بخود اپنی سمت کا تعین کر لیتے ہیں اور پھر دعاؤں کا یہی حصار انہیں منزل تک لے آتا ہے۔

ذرا مختلف

کاشف زبیر

سکون قائم ہو جائے۔"

"جناب میری پوری کوشش ہوگی مگر آپ جانتے ہیں تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے اور اگر مجھے وہاں سے تعاون ملا تو میں کامیاب رہوں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" سربراہ نے کہا۔ "اسی وجہ سے کونسل نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔"

"میں کونسل کے اعتماد کا شکرگزار رہوں۔"

مگر انتونیو کے دل میں کچھ خدشات تھے، اس نے روانہ ہونے سے پہلے اس علاقے کے بارے میں معلومات حاصل کیں جو بڑی ہولناک تھیں۔ جس گاؤں میں اسے بھیجا جا رہا تھا اس کی آبادی کوئی تین ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ان میں سے ایک درجن افراد بھی ایسے نہیں تھے جن کو شریف قرار دیا جا سکتا۔ وہاں سال بھر میں پچاس سے زیادہ قتل ہوتے اور روزانہ جرائم کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ دوسرے کا مال ہتھیا لینا، چوری کرنا اور دوسروں کے مویشی نکال لے جانا بری بات نہیں تھی۔ بری بات اس وقت ہوتی تھی کہ جب ان چیزوں کا مالک ان کو روکنے کی کوشش کرتا تھا اور ان لوگوں کو اپنے چند کارتوس ضائع کرنا پڑتے تھے۔ ان لوگوں کو اس کی بہت تکلیف ہوتی تھی۔

اسے جا کر ان لوگوں کو جرائم سے روکنا اور نیک کاموں کی طرف لانا تھا۔ اس کے پیش رو کو صرف اسی وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک مقتول کی جگہ لینا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس لیے اس بارے میں زیادہ فکرمند نہیں تھا، ہاں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنا کام کس طرح کرے کہ اس میں قتل وغیرہ کی نوبت نہ آئے۔ آج سے چند برس پیشتر اسے یہاں بھیجا جاتا تو وہ خوشی سے جاتا کیونکہ اسے خود بھی مار دھاڑ اور گولیوں کی آواز پسند تھی۔

انتونیو کا تعلق جنوب مغربی ٹیکساس سے تھا اور اس کے آبا و اجداد اسپین سے آ کر وہاں آباد ہوئے تھے۔ اس علاقے میں ہسپانویوں کی کثرت تھی جن کا اپنا طرز زندگی تھا اور وہ اس میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے خاص طور سے جب مداخلت سفید فاموں کی طرف سے ہو۔ عجیب بات ہے امریکا کو دریافت کرنے والے اور یورپ سے آنے والے ہسپانوی نژاد میکسیکن باشندے خود کو سفید فام نہیں کہتے ہیں اور ان کے نزدیک یورپ کی دوسری اقوام سفید فام ہیں خاص طور سے وہ انگریزوں سے چڑتے ہیں اور اپنی پسماندگی کا ذمے دار انگریزوں کو قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ امریکا کی آزادی میں ان کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔

انتونیو بھی اپنے آبا و اجداد کی طرح سفید فاموں کو اپنے مصائب اور پسماندگی کا ذمے دار سمجھتا تھا اور اس میں ان لوگوں سے انتقام لینے کی آرزو تھی۔ اس نے صرف بارہ سال کی عمر میں آتشیں اسلحے کا استعمال سیکھ لیا تھا حالانکہ اس زمانے میں یہ نیا نیا آیا تھا اور ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ انتونیو کا ایک چچا معروف بدمعاش تھا اور سب سے پہلے جدید اسلحہ بھی وہی لے کر آیا تھا۔ اسی نے ننھے انتونیو کو اسلحہ چلانا سکھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کبھی اپنے دشمن پر گولی چلاتے ہوئے مت ہچکچانا۔ اس کھیل میں وہی مارے جاتے ہیں جو ہچکچاتے ہیں۔"

انتونیو نے چچا کی یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی اور اس کی وجہ سے کم سے کم دو مواقع پر اس کی جان بچی تھی۔ ایک بار ڈاکوؤں نے اس کے باس کے گلّے کو لوٹ لے جانے کی کوشش کی تھی۔ ڈاکو تعداد میں زیادہ اور اسلحے سے لیس تھے۔ ایک ڈاکو نے انتونیو کے گلے سے سونے کی چین اتارنے کی کوشش کی تھی۔ انتونیو نے مزاحمت کی تو اس نے پستول نکال لیا تھا۔ انتونیو نے جب اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے جان لیا ڈاکو نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے بے حد پھرتی سے اپنا پستول نکالا اور ڈاکو سے پہلے گولی چلا کر اسے ڈھیر کر دیا۔ اس پہلے فائر کے بعد وہاں جنگ چھڑ گئی۔ اس میں انتونیو نے مزید دو ڈاکو ہلاک کر کے ان کو اتنا خوف زدہ کر دیا کہ وہ برتر ہونے کے باوجود بھاگ نکلے۔ اس واقعے کے بعد انتونیو کے نشانے اور دلیری کی دھوم مچ گئی تھی اور اسے ایک اور بڑے گلّہ بان نے اپنے گلّے کی رکھوالی کے لیے ملازم رکھ لیا تھا۔ دوسرا موقع اس وقت آیا جب وہ ایک بار میں بیٹھا وہسکی پی رہا تھا کہ اچانک ایک بدمعاش سوڈی اندر آیا۔ اس کا بھائی ایک مقابلے میں انتونیو کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور وہ اس کا بدلہ لینے آیا تھا۔ اس نے آتے ہی انتونیو پر فائر کیا تھا اس کی خوش قسمتی کہ سوڈی کا ہاتھ بہک گیا اور گولی بارٹینڈر کو جا لگی۔ اس سے پہلے کہ سوڈی دوسرا فائر کرتا، انتونیو نے پھرتی سے اپنا پستول نکال کر اس پر فائر کیا اور پھر اس وقت تک فائر کرتا چلا گیا جب تک سوڈی لڑکھڑاتا ہوا بار سے باہر نہیں جا گرا، اس نے موقعے پر دم توڑ دیا تھا۔ بارٹینڈر بچ گیا جس کے شانے پر گولی لگی تھی۔ اس واقعے کے بعد جرائم پیشہ افراد اس کے سائے سے بھی بچنے لگے تھے۔ وہ جہاں ہوتا وہاں کا رخ کرنے سے گریز کرتے تھے۔

عمر کے تیس برس تک وہ انہی کاموں میں مصروف رہا

تھا۔ اس کے بعد اچانک ہی اس کا دل ان سب کاموں سے بیزار ہو گیا اور اس نے جب مار دھاڑ کو ترک کیا تو اسے علاقہ بھی چھوڑنا پڑا ورنہ اس کے دشمن اسے نہیں چھوڑتے۔ اس نے ٹیکساس سے ایریزونا کا رخ کیا اور وہاں ایک چھوٹے سے گاؤں میں سکونت اختیار کر لی اور جب دل زیادہ ہی بیزار ہو گیا تو اس نے اس ادارے میں شمولیت اختیار کر لی۔ ضروری تربیت کے بعد اسے یہیں تعینات کر دیا گیا تھا اور وہ بہت دل جمعی سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے لگا۔

دو سال بعد اسے ادارے کے صدر دفتر بلایا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے مگر جب اسے بتایا گیا کہ اسے باجا کیلیفورنیا بھیجا جا رہا ہے اور اس کا انتخاب خاص طور سے ہوا ہے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ سابقہ زندگی کے پس منظر میں یہ جگہ اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی مگر اب اسے اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ اس لیے وہ کسی قدر فکر مند تھا۔

وہ اپنا سامان لے کر گھوڑے پر روانہ ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک رائفل اور ایک پستول، دونوں اس کے لیے آزمودہ اور اپنے کام کے لحاظ سے بہترین ہتھیار تھے۔ اسے اپنے پرانے علاقے سے بھی گزرنا تھا۔ وہاں اکثر لوگ اس کے دوست اور کچھ دشمن بھی تھے۔ اس زمانے میں وہاں ریل نہیں آئی تھی اور آمدورفت زیادہ تر گھوڑوں کی مدد سے ہوتی تھی۔ اس نے گھوڑے پر سفر کرنے کو ترجیح دی۔ اس طرح وہ اپنا گھوڑا بھی ساتھ لے جا رہا تھا۔ ہتھیاروں کی طرح یہ بھی اس کا پرانا ساتھی تھا اور اس نے اس کی پشت پر بہت طویل سفر کیے تھے۔ تیسرے دن وہ اس وادی میں داخل ہوا تھا جس میں دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ چرواہے بھی اپنے جانور لے کر جا چکے تھے۔ شاید اب وہاں خزاں رسیدہ گھاس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مگر نہیں، یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ شام کے قریب وہ ایک تنگ سی گھاٹی سے گزر رہا تھا جس کے دونوں اطراف اونچی چٹانیں تھیں اور گھاٹی کے وسط میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے انتونیو نے اس کے سرد اور شیریں پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ ایک ہفتے میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا اگر راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو اور اب تک کا سفر پُرسکون اور بغیر کسی گڑبڑ کے گزرا تھا۔ اسے امید تھی کہ باقی سفر بھی اسی طرح سکون و عافیت سے گزر جائے گا۔

اچانک ہی اسے گولیاں چلنے کی آواز آئی تو اس نے

گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اس کی متجسس نگاہیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ فائرنگ کی آواز گھاٹی کے پار سے آرہی تھی اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے دو گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہوں۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے دوڑاتا ہوا گھاٹی کے پار پہنچ گیا، اس نے بلندی سے دیکھا۔ ایک پیالہ نما وادی کے وسط میں ایک رکی ہوئی بگھی کے آس پاس کم سے کم تین لاشیں پڑی تھیں اور نصف درجن افراد مختلف سمتوں سے بگھی کی طرف گولیاں برسا رہے تھے۔ بگھی کے اندر سے بھی جوابی فائر کیے جارہے تھے مگر صاف لگ رہا تھا کہ اندر والوں کی مزاحمت دم توڑ رہی ہے اور ان کی طرف سے بہت کم گولیاں آرہی تھیں۔

انتونیو بلندی پر محفوظ تھا۔ نیچے والے اسے یہاں سے نہ تو دیکھ سکتے تھے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس نے اپنے تھیلے سے ایک دوربین نکالی اور اس کی مدد سے نیچے موجود لوگوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ بگھی کو گھیرے میں لینے والے ڈاکو تھے اور بگھی میں ممکنہ طور پر کوئی قیمتی چیز جارہی تھی۔ یہ فولاد سے بنی مضبوط بگھی تھی۔ جس میں عام طور سے کوئی قیمتی چیز ہی لے جائی جاسکتی تھی۔ بگھی کے اندر بھی کم سے کم تین افراد تھے کیونکہ وہ سب جوابی فائرنگ کررہے تھے۔ انتونیو نے پہلے سوچا کہ اسے اس معاملے میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ انجام کار اسے ہتھیار اٹھانے پڑتے اور وہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا۔

مگر پھر اسے بگھی والوں کی بے چارگی پر ترس آگیا۔ ان میں سے نصف مارے جاچکے تھے اور باقی نصف بھی کچھ دیر کے مہمان تھے۔ ڈاکو ان کو مار دیتے یا ان پر قابو پالیتے۔ کیلیفورنیا کے ڈاکو بے رحم مشہور تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنی رائفل نکالی اور سب سے پہلے بگھی کے نزدیک ترین ڈاکو کا نشانہ لیا۔ انتونیو کی کوشش تھی کہ وہ اسے جان سے نہ مارے مگر اتنی دور سے درست نشانہ لینا بہت مشکل تھا اس لیے جب ڈاکو کے سر سے خون کا فوارہ نکلا تو اسے افسوس ہوا تھا۔ بہرحال اس کے پاس افسوس کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا، اس نے فوری طور پر رائفل دوسرے ڈاکو کی طرف کی اور اس کا بازو چھید دیا۔ اس کے فوراً بعد اس کی طرف گولیوں کی بوچھاڑ آئی مگر وہ اپنے گھوڑے سمیت محفوظ تھا جیسے ہی گولیوں کی آمد رکی، اس نے تیسرے ڈاکو کو نشانہ بنایا اور جب وہ چیخ مار کر اپنے گھوڑے سے گرا تو باقی سب کی ہمت جواب دے گئی اور وہ اپنے گھوڑوں پر گرتے پڑتے وہاں سے فرار ہوگئے۔ انتونیو جانتا تھا کہ وہ پھر آسکتے تھے اس لیے اس نے جاتے جاتے ان میں سے ایک اور کو مار گرایا۔ اس کے بعد ان کے لیے رکنا یا واپس آنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بگھی سے بھی محصور افراد نکل آئے تھے اور بھاگنے والوں پر فائرنگ کررہے تھے۔ وہ اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے اس زخمی کو جس کے بازو میں گولی لگی تھی اور گھوڑا اسے گرا کر بھاگ گیا تھا، گولی مار کر ہلاک کردیا۔ انتونیو گھوڑے پر سوار ہوکر نیچے پہنچا اس نے افسوس سے اس زخمی کی لاش دیکھی اور ان تینوں سے کہا۔

"تم نے بلاوجہ اسے مار دیا۔"

"ہمیں افسوس ہے۔" ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے سامنے آکر کہا۔ "مگر انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو بے دردی سے مار ڈالا۔ ہمیں اس کا غصہ تھا۔"

انتونیو نے جائزہ لیا۔ ان کے تین ساتھی ہلاک ہوچکے تھے اور چار ڈاکو بھی مارے گئے تھے۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔ "انہوں نے کیوں حملہ کیا تھا؟"

"ہمارے پاس کچھ سونا ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے ذرا محتاط انداز میں کہا۔ "انہوں نے اسے چھیننے کے لیے حملہ کیا تھا۔"

"کچھ سونے کی خاطر تم لوگوں نے سات افراد کی جانیں گنوا دیں۔"

"انہوں نے موقع کہاں دیا تھا۔ یہ تینوں تو پہلے ہی مار دیے تھے اور ہم چھپ کر جانیں نہ بچاتے تو ہم بھی مارے جاتے۔" وہ ناگواری سے بولا۔ "ان تین کو تو تم نے مارا ہے۔"

"ہاں، میں ایسا نہ کرتا تو یہ تمہیں مار دیتے۔"

اس اثنا میں اندھیرا ہوچکا تھا اس لیے انتونیو نے اسی جگہ رکنے کا فیصلہ کیا۔ ادھیڑ عمر شخص مورفس رائڈ سونے کا تاجر تھا اور کیلیفورنیا کی کانوں سے سونا خرید کر لے جارہا تھا۔ راستے میں ان ڈاکوؤں نے حملہ کردیا۔ مورفس کے ملازمین نے لاشوں کو دفنایا اور پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ ان لوگوں کے پاس خشک گوشت، پنیر، انڈے اور روٹی بھی تھی۔ کئی دن بعد انتونیو نے ڈھنگ سے کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد مورفس نے قیمتی شراب کی بوتل نکالی مگر انتونیو نے معذرت کرلی تھی۔ "میں نہیں پیتا۔"

"نہیں پیتے!" مورفس نے حیرت سے کہا۔ "کیا کوئی طبی مسئلہ ہے؟"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو کیا کبھی پی ہی نہیں؟"

”نہیں، چند سال پہلے تک میں بہت پیتا تھا مگر اب چھوڑ دی ہے۔“
”تمہاری مرضی دوست۔“ مورفس نے بوتل کھول لی۔
”یہ تمہارے نام۔ اگر تم نہ آتے تو آج اس ویرانے میں ہماری لاشیں پڑی ہوتیں اور ڈاکو سونا لوٹ کر لے جا چکے ہوتے۔“
”تمہاری جان میں نے نہیں خداوند نے بچائی ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
”پھر بھی وسیلہ تو تم بنے۔“ اس نے اصرار کیا۔
”شاید۔“ اس نے کہا اور اپنا کمبل اوڑھ لیا۔ رات کو خاصی سردی ہو جاتی تھی اور کمبل کے بغیر سونا ممکن نہیں تھا ذرا فاصلے پر آگ جل رہی تھی۔ مورفس کا ایک آدمی پہرا دے رہا تھا۔ جبکہ دوسرا سو گیا تھا۔ وہ آدھی رات کے بعد پہرا دیتا۔ صبح جب انتونیو ناشتے کے بعد جانے کے لیے تیار ہوا تو مورفس نے اسے ایک تھیلی دی۔
”یہ میری طرف سے تمہارے لیے۔“
”اس میں کیا ہے؟“ انتونیو نے دریافت کیا۔
”کچھ سونا ہے۔“
”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ”نہ میں نے اس لیے تمہاری مدد کی تھی۔“
جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو مورفس ہاتھ میں تھیلی لیے حیران سا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اتنی آسانی سے سونا ٹھکرا سکتا ہے۔ انتونیو اس روز سارا دن سفر کے بعد شام کے وقت ایک چھوٹے سے صحرائی قصبے میں داخل ہوا تھا۔ جس کی آبادی شاید پانچ سو نفوس پر مشتمل ہوگی۔ وہاں ایک ہوٹل بھی تھا جس کے نیچے بار تھا۔ اگرچہ ہوٹل گندہ اور شور سے بھرپور تھا مگر اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ایک کمرا لے لیا تھا۔ اسے کمرا دکھانے والا لڑکا اسے لے کر اوپر آیا۔ کمرا کسی قدر صاف ستھرا سا تھا۔
”برخوردار تمہارا نام کیا ہے؟“
”رچرڈ جناب، مجھے رچی بھی کہتے ہیں۔“
انتونیو نے سر ہلایا ”یہاں کھانا کیسا ملتا ہے؟“
لڑکے نے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”بہت بکواس...... اگر آپ کہیں تو میں کھانے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“
”وہ کہاں سے؟“
”باہر سے آنے والے مسافروں کے لیے میری بہن کھانا بناتی ہے مگر ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔“
”تو کھانا کہاں دیتے ہو؟“
”اس کے لیے آپ کو میرے گھر چلنا ہوگا۔“
انتونیو نے سوچا، کسی کے گھر جانا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے انکار کر دیا۔ ”نہیں اگر تم کھانا یہاں لا سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔“
لڑکے کا منہ لٹک گیا تھا۔ ”یہاں...... اگر شاویز نے دیکھ لیا تو میری کھال اتار دے گا۔“
”شاویز کون ہے؟“
”اس ہوٹل اور بار کا مالک ہے۔ بہت سخت آدمی ہے، اپنے ملازمین کو ذرا سی غلطی پر بے دردی سے مارتا ہے۔“
”تم اس کی ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ انتونیو نے اپنا بیگ الماری میں رکھا۔
”اس کے علاوہ یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ قصبے کا ہوٹل، اصطبل اور جنرل اسٹور سب شاویز کی ملکیت ہیں۔“
”تمہاری بہن صرف کھانا بناتی ہے؟“
”ہاں کیونکہ وہ جسم نہیں بیچنا چاہتی۔“
”کیا مطلب؟“ انتونیو چونکا۔
”شاویز چاہتا ہے کہ جولیٹ اس کے بار میں بیٹھے اور یہاں آنے والے گاہکوں کا دل لبھائے۔“
اس کا مطلب تھا کہ جولیٹ اچھی لڑکی تھی۔ انتونیو نے رچی کو ایک سکہ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ انتونیو نے کھانے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں جانے کا فیصلہ کیا۔ سردی کے باوجود اسے کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے نیچے کا رخ کیا۔ بار اور اس کا فرنیچر گھٹیا درجے کا تھا اور وہاں سستی شراب اور تمباکو کی بو رچی ہوئی تھی۔ اس نے ایک دور کی میز کا انتخاب کیا جہاں شور نسبتاً کم تھا۔ کھانے کے بارے میں رچی کا کہنا بالکل درست تھا۔ انتونیو نے اتنا خراب کھانا زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ گوشت کی بوٹیاں چمڑے سے زیادہ سخت اور جلی ہوئی تھیں اور اسٹو سے ایسی بُو آرہی تھی جیسے اسے دو دن پہلے پکایا گیا ہو۔ پڈنگ کھانے کے لیے ہمت کا ہونا ضروری تھا۔ اس نے چند لقمے کھا کر باقی چھوڑ دیا۔
کھانے کی ادائیگی کر کے وہ باہر آیا اسے رچی کی تلاش تھی۔ رچی اسے بار کے برآمدے میں مل گیا جہاں وہ ایک آدمی کے جوتے پالش کر رہا تھا۔ انتونیو نے اسے ملنے کا اشارہ کیا اور خود سڑک کے پاس اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کے بارے میں استفسار کیا۔ اصطبل

کے رکھوالے نے اسے بتایا کہ گھوڑے کو چارا دے دیا گیا تھا اور وہ اپنے اسٹال میں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ باہر آیا تو رچی اس کا منتظر تھا۔

''یس سر!''

''مجھے کھانے کے لیے اپنے گھر لے چلو۔''

رچی مسکرانے لگا۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ آپ سے یہاں کا کھانا نہیں کھایا جائے گا۔''

''ایسا ہی ہوا ہے تو اب چلو۔'' انتونیو نے تسلیم کیا۔

''میں نہیں جا سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا پھر اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا چاندی کا سکہ نکالا۔ ''آپ خود جا سکتے ہیں۔ سامنے والی گلی میں الٹے ہاتھ کا پانچواں مکان ہے۔ اس کے سامنے پھولوں کی کیاری بنی ہے۔ آپ سکہ دکھائیں گے تو میری بہن آپ کو اندر آنے دے گی۔''

''یہ کیسا طریقہ ہے؟''

''مجبوری ہے سر، میں یہاں کام پر ہوتا ہوں اور میری بہن گھر میں اکیلی ہوتی ہے اس لیے ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' انتونیو نے سر ہلایا اور اس گلی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اور رچی دونوں بے خبر تھے کہ ایک آدمی ان کو غور سے دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی انتونیو اس گلی کی طرف بڑھا، وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ انتونیو کو مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دستک کے جواب میں ایک چھوٹی سی کھڑکی سے جولیٹ نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

''مجھے رچی نے بھیجا ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کس لیے؟''

''کھانے کے لیے۔''

''سکّہ دکھاؤ۔'' جولیٹ نے مطالبہ کیا۔

انتونیو نے سکہ نکال کر کھڑکی کے سامنے کر دیا اور فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اس کے سامنے ایک گداز بدن کی خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سنہری بال اس کی کمر سے بھی نیچے آ رہے تھے۔ اور اس نے ایک صاف ستھرا فراک پہن رکھا تھا۔ اس نے انتونیو کا معائنہ کیا اور پھر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں چار افراد کے لیے میز تھی۔ جولیٹ نے اسے ایک کرسی دی اور پوچھا۔

''تم کیا کھانا پسند کرو گے مسٹر......؟''

''انتونیو!'' اس نے جواب دیا۔ ''کوئی بھی چیز بنا لو مگر اچھی بنی ہو۔''

''مٹن پائی اور اسٹیک کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں شوق سے کھاتا ہوں۔'' اس نے کہا تو جولیٹ فوراً ہی کھانے کی تیاری میں لگ گئی اس نے انتونیو کو بتایا۔

''تمہیں پون گھنٹا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں اگر اس دوران میں کافی مل جائے تو میں اس کی بھی ادائیگی کر دوں گا۔''

''کیوں نہیں۔'' جولیٹ نے فوراً کافی کا پانی رکھ دیا۔ ''رچی تم کو کہاں ملا؟''

''شاویز کے ہوٹل میں۔''

یہ سن کر جولیٹ کے چہرے پر تشویش آ گئی۔ ''میں نے رچی کو کہا ہے کہ شاویز کے گاہکوں کو یہاں مت لایا کرے، وہ برا مناتا ہے۔''

''اگر کوئی شخص کھانے کے لیے تمہارے پاس آ رہا ہے تو اسے کیا مسئلہ ہے؟''

''اس قصبے میں سارے کاروبار اسی کے قبضے میں ہیں اور وہ کسی اور کو اجازت نہیں دیتا کہ اس کے مقابل آئے۔''

''تم نے کوئی ہوٹل نہیں کھولا ہے پھر اسے کیا اعتراض ہے؟''

''میں یہی کام گھر پر کر رہی ہوں اس لیے اسے اعتراض ہے۔ وہ کئی بار اس معاملے میں مجھے دھمکیاں دے چکا ہے۔''

''اگر وہ اتنا ہی طاقت ور ہے تو تم اس کے سامنے کیوں کھڑی ہو رہی ہو کیا تم کو ڈر نہیں ہے کہ وہ تم کو یا تمہارے بھائی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟''

''ڈر تو لگتا ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''مگر ہم کیا کریں، ہمیں کام بھی تو کرنا ہے ورنہ شاویز کی غلامی کرنا پڑے گی۔ رچی اس کے لیے کام کرتا ہے مگر اسے صبح سے شام تک کام کرنے کا بس اتنا ہی معاوضہ ملتا ہے کہ ہم دونوں اس سے گزارا نہیں کر سکتے۔ اس لیے مجھے یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔''

بولنے کے ساتھ ساتھ جولیٹ کے ہاتھ بھی برابر چل رہے تھے اور اب کچن خوشبو سے مہکنے لگا تھا۔ انتونیو کو خوشبو سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت اچھا کھانا بناتی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''اگر شاویز کو علم ہو گیا کہ میں نے معاوضہ دے کر تمہارے گھر کھانا کھایا ہے تو اس کا کیا ردِعمل ہوگا؟''

''بہت خوف ناک۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''اس کا نتیجہ رچی کو بھگتنا پڑے گا کیونکہ وہی گاہک لے کر آتا ہے۔''

''اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے؟''

''بہت بری طرح، ایک سال پہلے شاویز کے گرگوں نے اسے اتنا مارا تھا کہ وہ دو دن بستر سے نہیں اٹھ سکا تھا۔''

انتونیو نے افسوس سے سر ہلایا۔ اس قصبے میں واقعی ظلم ہو رہا تھا مگر اس کے ذمے دار بھی یہ لوگ خود ہی تھے جو خاموشی

سے شاویز کا ظلم برداشت کر رہے تھے۔ اس دوران میں جولیٹ کھانا تیار کر چکی تھی، اس کی پھرتی قابل داد تھی۔ وہ کسی خوش رنگ تتلی کی طرح کچن میں حرکت کر رہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے انتونیو کو جو کافی پلائی تھی وہ بھی بہت اچھی تھی۔ کھانا تو بہت ہی اچھا تھا۔ انتونیو یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے زندگی میں بہت کم اتنا اچھا کھانا کھایا تھا۔ وہ کھانے کے دوران اس کی تعریف کر رہا تھا تو جولیٹ کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے انتونیو کو ایک بار پھر کافی پلائی۔ اس کا بل بھی بہت مناسب تھا۔ جس وقت انتونیو جانے کی تیاری کر رہا تھا اچانک دروازے پر کسی نے اجڈ پن سے دستک دی۔ جولیٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک نظر انتونیو کو دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی زخمی رچی لڑکھڑا کر اندر گرا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ جولیٹ نے چیخ ماری اور بے تابی سے بھائی کو بازوؤں میں لے لیا۔

''یہ کیا ہوا ہے رچی؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' دروازے کی طرف سے آواز آئی اور ایک شخص اندر آیا۔ ''تم دونوں کو منع کیا تھا کہ اپنا کاروبار بند کر دو۔''

''جوزیو۔'' جولیٹ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ آدمی صرف کھانا کھانے آیا تھا۔''

''اسی سے تو منع کیا تھا۔'' بدمعاش نظر آنے والا جوزیو غرایا۔ ''تو نے سنا نہیں تھا۔''

''ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔'' جولیٹ کسی قدر دلیری سے بولی۔ ''اپنا کام کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔''

''اس قصبے میں یہ جرم ہے، یہاں شاویز کی اجازت کے بغیر کوئی بھی کام کرنے والے کا یہی انجام ہوگا۔'' اس نے رچی کی طرف اشارہ کیا۔

رچی کراہ رہا تھا مگر اسے کوئی خطرناک زخم نہیں آیا تھا۔ انتونیو نے اندازہ لگایا کہ وہ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ رچی نے بہن سے کہا۔

''شاویز نے مجھے ملازمت سے نکال دیا ہے اور اس نے ہمیں قصبے سے بھی نکل جانے کا حکم دیا ہے۔''

''وہ کون ہوتا ہے ہمیں یہاں سے نکالنے والا؟'' جولیٹ چلائی۔

''شاویز اس جگہ کا مالک ہے۔'' جوزیو نے غرور سے کہا۔ ''تم دونوں کے پاس کل شام تک کی مہلت ہے۔''

''سنو۔'' جولیٹ، جوزیو کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ''یہ مکان میرا ہے اور مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔''

جوزیو نے اچانک ہی جولیٹ کے لمبے سنہری بال پکڑ لیے۔ ''شاویز سب کر سکتا ہے۔''

''چھوڑو مجھے۔'' جولیٹ کراہی مگر جوزیو نے مزہ لینے والے انداز میں بے دردی سے اس کے بال گھمانا چاہے تھے کہ اس کی کلائی جیسے کسی شکنجے میں آ گئی، اس نے بوکھلا کر دیکھا تو انتونیو نے اس کی کلائی پکڑ رکھی تھی۔ اس نے نرمی سے کہا۔

''عورت پر ہاتھ اٹھانا مردوں کا کام نہیں ہے۔''

جوزیو نے جھٹکا دے کر کلائی چھڑانا چاہی تو انتونیو کی گرفت اتنی سخت ہو گئی کہ اس نے بلبلا کر جولیٹ کے بال چھوڑ دیے۔ انتونیو نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے انتونیو کو مکا مارنا چاہا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی کہ انتونیو غافل ہے اس نے نہایت آسانی سے جوزیو کا ہاتھ قابو کر کے اسے موڑ کر پشت سے لگا دیا۔ کہنی پر دباؤ آیا تو جوزیو کی حالت بری ہو گئی۔ انتونیو نے اسی حالت میں اسے دروازے تک لے جا کر دھکا دیا اور نصیحت کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اب ادھر مت آنا۔''

دو بار زور آزمائی کر کے جوزیو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انتونیو اس کے بس کی بات نہیں تھا۔ اس لیے وہ گالیاں اور دھمکیاں دیتا رخصت ہو گیا۔ جولیٹ کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، اس نے انتونیو سے کہا۔

''تم نے مداخلت کر کے اچھا نہیں کیا، اب نہ جانے کیا ہو؟''

انتونیو نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''امکان ہے کہ ابھی شاویز کے مسلح غنڈے آئیں گے اور تم اکیلے ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔''

''فرض کرو میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکا تو پھر کیا ہوگا؟''

''بہت برا، کیا تم نے رچی کی حالت نہیں دیکھی؟''

''اس صورتِ حال میں مجھے اپنا سامان شاویز کے ہوٹل سے لے لینا چاہیے۔''

''خدا کے لیے، تمہیں سامان کی فکر پڑی ہے۔'' جولیٹ بولی۔ ''تم اپنی فکر کرو۔ میرا تو مشورہ ہے تم اس بات کے شاویز تک پہنچنے سے پہلے اس قصبے سے نکل جاؤ۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اپنا سامان نہیں چھوڑ سکتا، اس میں میری بہت اہم چیزیں ہیں۔''

''تمہاری جان سے بھی زیادہ اہم؟'' رچی نے پوچھا۔

''ہاں، جان سے بھی زیادہ اہم۔''

''کیا اس میں سونا یا جواہرات ہیں؟'' جولیٹ بولی۔

''نہیں وہ کسی اور کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے قیمتی ہے۔'' اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جولیٹ اس

کے پیچھے آئی۔

"کیا تم چلے جاؤ گے؟"

"نہیں میں رات کو سفر نہیں کرتا اور چوروں کی طرح چھپ کر جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم ایک رات کے لیے مجھے اپنے مکان میں ٹھہرا سکتی ہو؟ میں اس کا معاوضہ دوں گا۔"

"تم رک سکتے ہو اور بات معاوضے کی نہیں ہے مگر شاویز کو پتا چلے گا تو وہ مزید بھڑک جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں کوئی اور ٹھکانا دیکھ لوں گا۔"

انتونیو یہ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ جب وہ ہوٹل پہنچا تو بظاہر وہاں امن وسکون نظر آ رہا تھا مگر جب وہ اپنا سامان لے کر نیچے آیا تو اس نے کاؤنٹر کے پاس جوزیو کو چند بدمعاشوں کے ساتھ موجود پایا۔ ان کے پیچھے شاویز خود موجود تھا مگر اس کا انداز کسی باس کا تھا جس کے کارندے صورتِ حال سے نمٹنا بخوبی جانتے تھے اور اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انتونیو نے ایک لمحے کو رک کر ماحول کا جائزہ لیا اور غیر متوقع طور پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا شاویز کے پاس جا پہنچا۔

"مسٹر شاویز! کیا تمہیں مجھ سے کوئی مسئلہ ہے؟"

شاویز اس کے اچانک آنے اور سوال سے گڑبڑا گیا تھا، اس نے کہا۔ "نہیں تو۔"

"تو پھر یہ شخص میرے پیچھے کیوں آیا تھا؟" اس نے جوزیو کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے مجھے اور میرے شریف میزبانوں کو تنگ کیا تھا۔"

اب کے شاویز سنبھل گیا تھا۔ "بات یہ ہے مسٹر انتونیو کہ اس قصبے میں کوئی شخص میری اجازت کے بغیر کوئی کاروبار نہیں کر سکتا۔"

"اس چیز کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ میں یہاں صرف ایک دن کے لیے رکا ہوں اور کل چلا جاؤں گا۔"

"تم سے نہیں لیکن جولیٹ سے تعلق ضرور ہے۔" اس نے چالاکی سے کہا۔ "وہ اس جگہ کی رہنے والی ہے۔"

"اس شخص نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی کوشش کی تھی۔" اس نے پھر جوزیو کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" جوزیو غرایا۔

"تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔" شاویز نے اسے تاکید کی۔ "ورنہ اپنے نقصان کے ذمے دار خود ہوگے۔"

"آج رات میں رچی کے گھر رکوں گا اور کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اس نے اعلان کیا۔ "میرا خیال ہے اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ وہ مجھے بلا معاوضہ مہمان بنا رہا ہے۔"

شاویز نے دانت پیسے۔ "اسے تو میں دیکھ لوں گا۔"

انتونیو نے اپنا بیگ اٹھایا۔ "بہتر ہوگا کہ تم لوگوں کو تنگ کرنا بند کر دو ورنہ تم کسی دن اچانک قدرت کی گرفت میں آجاؤ گے۔"

وہ ہوٹل سے نکل آیا۔ اس کے بر وقت اقدام نے اسے فوری تصادم سے بچا لیا تھا۔ اس نے باہر نکل کر سوچا کہ اب کہاں جائے۔ اس نے شاویز سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ رچی کے گھر رکے گا۔ حالانکہ اس کا ارادہ یہ نہیں تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اس قصبے میں ایک ہی ہوٹل تھا اور وہاں سے وہ نکل آیا تھا۔ اچانک اس کے شانے پر کوئی چیز آکر لگی۔ اس نے چونک کر دیکھا، ایک تاریک گوشے میں کوئی کھڑا تھا۔ اس کے متوجہ ہونے پر اس نے ہلکی سی آواز بھی نکالی تھی۔ انتونیو اس طرف بڑھا۔ وہ جولیٹ تھی۔ اس نے جلدی سے انتونیو کا ہاتھ تھاما اور بولی۔

"میرے ساتھ چلو، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔"

"کہاں؟"

"اپنے گھر۔" وہ ذرا نادم ہوگئی تھی۔ "تمہارے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا تھا۔ تم نے مجھے اس وحشی سے بچایا اور میں نے تمہیں ایک رات کے لیے رکنے کو بھی نہیں کہا۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے تمہاری مجبوری کا احساس ہے۔" انتونیو نے نرمی سے کہا۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"رچی کی حالت اب کیسی ہے؟"

"بہتر ہے، اسے کمر اور بازو پر زیادہ چوٹیں آئی ہیں مگر اب ٹھیک ہے۔" جولیٹ بولی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "شاویز اور اس کے آدمیوں نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں مگر ان کے تیور خراب تھے میں نے ان کو کہہ دیا ہے کہ میں رات تمہارے گھر رکوں گا۔"

"یہ تم نے کیا، کیا؟" جولیٹ پریشان ہوگئی تھی۔ "اب وہ سیدھے میرے گھر پر آئیں گے۔"

انتونیو مسکرانے لگا۔ "اس کے برعکس میرا خیال ہے وہ اب تمہارے گھر کا رخ کرنے سے گریز کریں گے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ جھوٹ بولا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سچ بن جائے گا۔"

جولیٹ اس سے متاثر نظر آنے لگی۔ "تم دلیر آدمی ہو۔"

"نہیں، میں عام سا آدمی ہوں۔" اس نے انکساری سے کہا۔

جولیٹ کو اب اس کے بارے میں تجسس ہونے لگا تھا۔ "تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

''میں ایریزونا سے آرہا ہوں اور با جا کیلیفورنیا جا رہا ہوں۔'' اس نے بتایا البتہ سوال کا پہلا حصہ وہ گول کر گیا تھا۔

جولیٹ کا گھر خاصا خوب صورت تھا اور اس نے اسے اچھے انداز میں سجایا تھا۔ انتونیو کو تعجب ہوا کہ اس علاقے میں کوئی با ذوق لڑکی بھی پائی جاسکتی ہے۔ وہ اس قابل تھی کہ کسی اچھے قصبے میں رہتی لیکن یہاں وہ زندگی گزارنے کے لیے بھی جدو جہد کرنے پر مجبور تھی۔ جولیٹ نے اس کے لیے کافی بنائی۔ وہ میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''تم ان اچھی لڑکیوں میں سے ہو جن سے میں اب تک ملا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا تم اس سے پہلے بھی کچھ لڑکیوں سے مل چکے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''کئی ایک...... مگر اس بات کو عرصہ گزر چکا ہے۔''

''کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟''

''نہیں، کئی سال پہلے میں نے وہ طرزِ زندگی چھوڑ دی تھی جس میں مار دھاڑ، آوارگی، شراب اور لڑکیاں تھیں۔''

اس نے تعجب سے انتونیو کو دیکھا۔ ''تو پھر کیوں چھوڑ دیا!''

''اب مجھے ان باتوں سے وحشت ہوتی ہے۔''

اس نے جولیٹ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا مگر وہ خود ہی اپنے بارے میں بتانے لگی۔ جولیٹ کا باپ ایک دولت مند آدمی تھا اور اس نے سونے کی تجارت کر کے خاصی دولت کمائی تھی۔ مگر بدقسمتی سے ایک بار سفر کے دوران وہ ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا۔ جنہوں نے اسے لوٹنے کے بعد قتل کر دیا تھا۔ اس کے پاس دوسرے لوگوں کا سونا بھی تھا اور انہوں نے کلیم کر کے اس کی دولت اور جائداد کا بیشتر حصہ حاصل کر لیا تھا۔ جولیٹ اس وقت صرف سولہ سال کی تھی اور رچی تو پانچ چھ سال کا تھا۔ اس لیے ان کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تھوڑی بہت رقم کے ساتھ ان کو یہ مکان ملا تھا۔ تب سے وہ محنت مزدوری کر کے گزارہ کر رہے تھے۔ رچی دس سال کی عمر سے محنت کرنے لگا تھا اور اب وہ بارہ سال کا تھا۔ اس لحاظ سے جولیٹ کی عمر تئیس برس تھی۔ اس نے ابھی تک شادی کر کے گھر بسانے کا نہیں سوچا تھا۔

''مجھے اب تک کوئی ایسا شخص ہی نہیں ملا جسے دیکھ کر دل گھر بسانے کا چاہے۔''

''اس جگہ اکیلی عورت بہت غیر محفوظ ہے۔ بہتر ہوگا تم کوئی مناسب آدمی دیکھ کر شادی کر لو۔'' انتونیو نے اسے مشورہ دیا۔

''میں نے ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے۔'' جولیٹ نے نہ جانے کیوں اس سے نظریں چرائیں۔

''بہتر ہے اس بارے میں سوچو۔'' انتونیو کھڑا ہو گیا۔

''تم کمرے تک میری رہنمائی کر سکتی ہو؟''

جولیٹ اسے اوپر کے ایک کمرے میں لائی۔ ''پاپا نے یہ کمرا مہمانوں کے لیے رکھا تھا مگر سالوں گزر گئے۔ یہاں آنے والے پہلے فرد تم ہو۔''

''تم لوگوں کے رشتے دار یا جاننے والے نہیں ہیں؟''

''نہیں، پاپا خود میکسیکو سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔''

اس رات انتونیو بہت چوکنا ہو کر سویا تھا، اسے خدشہ تھا کہ شاویز کی جانب سے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ مگر رات سکون سے گزر گئی۔ صبح وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو جولیٹ ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے انتونیو کو تیار دیکھ کر کہا۔

''تم اتنی جلدی جا رہے ہو؟''

''ہاں، میرا سفر ابھی طویل ہے اور مجھے جلد اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔''

''تم واپس آؤ گے؟'' جولیٹ کے لہجے میں سوال تھا۔

''ممکن ہے مستقبل میں یہاں سے گزرنا ہو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر میں وعدہ نہیں کر سکتا۔''

جولیٹ کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی اداسی چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انتونیو نے رچی کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ سو رہا ہے، رات اس کا درد بڑھ گیا تو میں نے اسے افیم دے دی تھی۔'' جولیٹ نے بتایا۔

''کیا یہاں حکومت کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔ میں نے پولیس چوکی بھی نہیں دیکھی؟''

''یہاں پولیس چوکی تھی مگر شاویز نے نہ جانے کیا سازش کی کہ اسے ہٹا دیا گیا۔ تب سے اس کی حکومت ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

''اس میں تم لوگوں کا بھی قصور ہے جو اس کے آگے جھک جاتے ہو۔'' انتونیو نے ملامت سے کہا۔

''تم نے ٹھیک کہا مگر لوگ اس کی طاقت سے ڈرتے ہیں۔ اس علاقے کے چھٹے ہوئے غنڈے اس کے ملازم ہیں۔''

جولیٹ اس کے سامنے میز پر ناشتا سجانے لگی تھی کہ اچانک ہی باہر سے کسی نے فائر کیا اور جولیٹ چیخ مار کر میز پر گری۔ انتونیو کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا اور اسے لڑھک کر نیچے گرنے سے بچایا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ انتونیو نے اسے پھرتی سے نیچے لٹا دیا کیونکہ اس پہلے فائر کے بعد اندھا دھند گولیاں چلنے لگی تھیں۔ اس نے جولیٹ کو کھینچ کر ایک محفوظ

کونے میں کیا اور خود پستول نکال کر فرش پر رینگتا ہوا دروازے کے ساتھ والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ جولیٹ کو زخمی دیکھ کر اس کا خون کھول گیا تھا۔ وہ فائرنگ میں وقفے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ باہر کم سے کم پانچ افراد گولیاں برسا رہے تھے۔ جیسے ہی گولیوں کی برسات ذرا تھمی اس نے باہر دیکھ کر چند فائر کیے۔ جواب میں ایک بار پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ اس نے اپنا نشانہ دیکھ لیا تھا اور سکون سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی گولیاں رکیں اس نے اٹھ کر سامنے والے مکان کے برآمدے میں موجود شخص کو نشانہ بنایا، وہ چیخ مار کر سامنے آگرا تھا۔ ایک کم ہونے سے ان لوگوں کے حوصلے پست ہوئے تھے اور انہوں نے ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں لکڑی کی دیواروں سے گزر کر اندر آ رہی تھیں لہٰذا وہ محفوظ نہیں تھا۔ اس کے پستول میں چند گولیاں رہ گئی تھیں اور اضافی کارتوس اس کے بیگ میں تھے جو سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ فرش پر لڑھک کر میز تک آیا اور بیگ اپنے اوپر گرا لیا۔ اضافی کارتوس نکال کر وہ واپس دروازے تک آیا۔ اب سامنے کوئی نہیں تھا۔ سب کناروں پر چلے گئے تھے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور آہستہ سے رینگ کر مکان کے عقبی حصے میں آیا۔ اس نے عقبی دروازہ کھول کر اپنا ہیٹ ذرا سا ظاہر کیا، فوراً ہی ایک گولی نے اس میں سوراخ کر دیا۔ وہ بال بال بچا تھا اگر وہاں اس کا سر ہوتا تو اس میں سوراخ ہو جاتا۔

اس نے اب دوسرا طریقہ سوچا اور رائفل لے کر اوپر کی منزل پر چڑھ گیا۔ اس نے ایک کھڑکی سے جھانکا اور اسے دوسرا شکار نظر آ گیا جسے گولی لگی تو نیچے موجود دشمن بدحواس ہو گیا۔ اب ان کا نشانہ اوپر والی منزل تھی۔ رچی افیم کے زیر اثر بے سدھ پڑا تھا۔ انتونیو نے اسے بستر سے کھینچ کر نیچے ڈال دیا۔ وہ پھر نیچے آیا اور اس بار عقبی طرف موجود شخص کو نشانہ بنایا۔ یہ اس کا تیسرا شکار تھا، اس کے بعد حملہ آوروں کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ آس پاس کے لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

انتونیو، جولیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ گولی اس کے بازو کا گوشت پھاڑتی گزر گئی تھی مگر زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ انتونیو نے شراب سے اس کا زخم دھویا اور اپنے بیگ سے ایک مرہم نکال کر اس پر لگا دیا۔ اس دوران میں وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ انتونیو نے اسے تسلی دی اور اس سے پوچھا کہ کوئی ایسا فرد ہے جو اس کی دیکھ بھال کر سکے۔

''برابر والی مسز گبریل اچھی عورت ہے، تم اسے بلا دو۔''

انتونیو اسے بلانے گیا تو گبریل نے انکار کر دیا مگر اس کی بیوی حوصلے والی عورت تھی، وہ اپنے شوہر کو لتاڑ کر اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ جولیٹ پریشان تھی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ پھر آ جائیں گے۔''

''تم بے فکر رہو، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔'' انتونیو نے اسے تسلی دی۔ ''میں بس ابھی آ رہا ہوں۔'' انتونیو اس کا رخسار تھپتھپا کر باہر نکل آیا۔ اس نے اپنا پستول اور رائفل ساتھ لے لی تھی۔ اس نے دونوں کو لوڈ کیا اور شاویز کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر لوگ اس کے راستے میں آنے سے گریز کر رہے تھے۔ شاویز کے ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے اس کی آمد کی اطلاع وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ہوٹل کے سامنے جا کر بلند آواز سے شاویز کا نام لیا۔ ''شاویز۔''

کسی طرف سے جواب نہیں آیا مگر ہوٹل کی مختلف کھڑکیوں سے رائفلیں جھانکنے لگی تھیں۔ انتونیو تن کر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے پھر بلند آواز سے کہا۔ ''شاویز...... بزدل سامنے آؤ۔ میں تم کو ڈوئل کا چیلنج کرتا ہوں۔''

اس پر ردعمل ظاہر ہوا تھا اور کچھ دیر بعد شاویز اندر سے نکلا یہ اس کی ساکھ کا سوال تھا اگر وہ آج نکلنے سے انکار کرتا تو وہ قصبے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ان لوگوں میں ڈوئل کا چیلنج قبول نہ کرنا انتہا درجے کی بزدلی سمجھی جاتی تھی۔ اس نے پستول اپنے ہولسٹر میں باندھ رکھا تھا کیونکہ انتونیو کا پستول بھی اس کے ہولسٹر میں تھا۔ شاویز ڈرا ہوا تھا، اس نے انتونیو سے کہا۔ ''تم مجھ سے کیوں لڑنا چاہتے ہو؟''

''ابھی تمہارے آدمیوں نے چھپ کر رچی اور جولیٹ کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ مجھ سے سامنے آ کر مقابلہ کر سکو۔''

''بکواس مت کرو۔'' شاویز بھڑک گیا۔ ''ابھی یہاں سے تمہاری لاش اٹھے گی۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔''

''اس کا پتا تو چل جائے گا مگر بہتر ہوگا اس ڈوئل کے لیے ایک آدمی جج بنا دیا جائے۔'' انتونیو نے تجویز دی۔

شاویز نے بلند آواز سے کہا۔ ''کوئی باہر آئے اور اس مقابلے کا جج بنے۔ میرا کوئی آدمی باہر نہ آئے۔''

''چلو تم میں اتنا ظرف تو ہے۔'' انتونیو نے طنزاً کہا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص سامنے آیا۔ اس نے مقابلے کی شرائط بتائیں۔ ''تم دونوں ایک دوسرے سے تیس قدم کے فاصلے پر رہو گے۔ پہلے گولی چلانے کے لیے ٹاس ہوگا جو جیتے گا وہی پہلی گولی چلائے گا۔ دونوں کو صرف تین تین گولیاں

چلانے کی اجازت ہوگی۔ اگر کوئی بھی نہ مرا یا زخمی نہ ہوا تو مقابلہ ختم ہو جائے گا اور مقامی رواج کے مطابق دونوں ایک مہینے سے پہلے پھر مدِ مقابل نہیں آسکتے کیا تم دونوں کو یہ شرائط منظور ہیں؟''

''سوائے پہلی شرط کے۔'' انتونیو نے کہا۔ ''ٹاس کی ضرورت نہیں ہے، پہلی گولی چلانے کا حق میں شاویز کو دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' شاویز نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے کوئی رعایت کروں گا۔''

''مجھے تم جیسے شخص سے کوئی رعایت درکار بھی نہیں ہے۔'' انتونیو نے جواب دیا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

''ہاں۔'' شاویز بولا اور تیس قدم پیچھے ہٹ گیا۔ انتونیو بھی تیس قدم پیچھے چلا گیا تھا اب ان کے درمیان ساٹھ قدم کا فاصلہ تھا مگر اس سے پہلے کہ جج ڈوئل شروع کرنے کا اشارہ کرتا۔ اچانک ہی جولیٹ بھاگتی ہوئی وہاں آگئی اور آتے ہی انتونیو سے لپٹ گئی، اس نے چلا کر کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟''

''جولیٹ، تم ایک طرف ہو جاؤ۔''

''نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''جولیٹ...... چیلنج میں نے دیا ہے۔'' انتونیو کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ ''کیا تم مجھے ذلیل کراؤ گی۔''

''نہیں۔'' جولیٹ نے روتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اگر تم کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا تم میرے لیے یسوع مسیح سے دعا مانگو۔'' انتونیو نے اسے نرمی سے خود سے جدا کر دیا۔ جولیٹ آنسو صاف کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ انتونیو نے شاویز کی طرف دیکھا جو اسے گھور رہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں صاف دکھائی دے رہی تھیں شاید وہ جولیٹ پر بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔ جج نے رومال والا ہاتھ بلند کیا اور زور سے بولا۔

''تیار۔''

شاویز نے پھرتی سے پستول نکالا اور عجلت میں انتونیو کی طرف فائر کر دیا شاید اسے خدشہ تھا کہ انتونیو دھوکا کرے گا اور اس پر پہلے فائر کر دے گا۔ انتونیو ترچھا ہو گیا اور نشانہ خطا گیا۔ جج نے بلند آواز سے کہا۔

''اب مسٹر انتونیو کی باری ہے۔''

شاویز نے اسے ایک گندی سی گالی دی اور دوسرا فائر کر دیا، اس بار تو گولی خاصی دور سے نکل گئی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور تیسرا فائر تو اس نے مکمل بدحواسی میں کیا تھا۔ انتونیو نے اپنی جگہ سے ہلنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

''بس، اب تمہاری باری ختم ہوئی۔'' انتونیو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب میری باری ہے۔''

جواب میں شاویز نے گندی گالی دی اور ڈوئل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چوتھا فائر کرنا چاہا مگر انتونیو نے بے حد پھرتی سے اپنا پستول نکال کر ایک ہی فائر کیا اور شاویز کے ماتھے پر سوراخ نمودار ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی انتونیو نے گونج دار آواز میں کہا۔ ''کوئی اور سامنے آنا چاہتا ہے؟''

مگر جواب میں خاموشی رہی۔ انتونیو جولیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب شاویز نے پہلا فائر کیا تھا تب ہی وہ گر پڑی تھی۔ انتونیو نے اسے بازوؤں میں اٹھایا۔ اس کے گھر لا کر اس نے جولیٹ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آگئی تھی اور انتونیو کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی تھی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟'' اس نے گلو گیر لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' انتونیو نے اسے پھر لٹا دیا۔ ''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں گولی تو نہیں لگی۔ شاویز کہاں ہے؟'' اس نے ایک سانس میں کئی سوالات کیے۔

''مجھے گولی لگی ہوتی تو میں تمہارے سامنے نہ ہوتا اور شاویز اب تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔''

''وہ مر چکا ہے۔'' جولیٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ بہت برا ہوا، اب اس کے گرگے ہمیں تنگ کریں گے۔''

''کوئی ایسی جرأت نہیں کرے گا۔'' انتونیو نے جواب دیا اور اس کا زخم دیکھنے لگا۔ ''تم نے اپنا زخم پھر خراب کر لیا ہے۔''

''مجھے اب تکلیف کم ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا تم چلے جاؤ گے؟''

''ہاں، میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا مگر تمہاری حالت بہتر ہونے تک رکوں گا۔'' انتونیو نے اسے تسلی دی۔

اس روز اس نے دوسرا معاملہ نمٹایا۔ چار مقامی معززین نے اس معاملے میں گواہی دی اور شاویز کی موت کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب اس سلسلے میں کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ اس کی تمام دولت اور جائداد اس کی بیوہ کے حصے میں آئی تھی جو اس کی زخم خوردہ تھی اس لیے اسے بیوہ ہونے پر کوئی خاص افسوس نہیں تھا۔ شاویز کے گرگے اس کے مرنے کے بعد یتیم ہو گئے تھے۔ انتونیو نے ان کو وارننگ دی کہ اگر انہوں نے شرافت سے رہنا ہے تو رہیں ورنہ جہاں سینگ

سمائیں چلے جائیں۔ اس وارننگ کے بعد جوزیو سمیت کئی بدمعاش قصبے سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کے جانے سے قصبے کے لوگوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ انتونیو نے مقامی لوگوں کو غیرت دلائی کہ وہ برائی کے خلاف متحد ہو جائیں تو کوئی ان کے سر پر کیوں مسلط ہو۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اب کسی شاویز کو اپنے سر پر مسلط نہیں ہونے دیں گے۔

دوسرے دن بھی وہ مصروف رہا تھا۔ اس نے کوشش کر کے شاویز کی بیوہ سے بات کی اور اسے آمادہ کر لیا کہ وہ جولیٹ کو اپنے ہوٹل کے بزنس میں شامل کر لے۔ جولیٹ کو کھانا بنانا آتا تھا۔ رچی کو دوسرے کام آتے تھے۔ دونوں بہن بھائی مل کر یہ کام کر سکتے تھے۔ جب جولیٹ کو پتا چلا تو اس نے انکار کر دیا۔ ''میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟'' انتونیو نے حیرت سے کہا۔

''کیونکہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''مگر میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔''

''کیوں، کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟'' جولیٹ کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔

''نہیں...... مجھے تم پسند ہو۔'' اس نے کہا۔

''پھر مجھے کیوں نہیں لے کر جا رہے ہو؟''

''کیونکہ میں جس جگہ جا رہا ہوں وہاں تمہاری جیسی نرم و نازک لڑکی نہیں رہ سکتی، وہ بہت سخت جگہ ہے اور پتا نہیں میں وہاں سے زندہ واپس آتا بھی ہوں یا نہیں۔''

''تب تم مت جاؤ۔'' جولیٹ نے بے قراری سے کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔ مجھے بھیجا جا رہا ہے اور جس شخص کی جگہ بھیجا جا رہا ہے وہ قتل کیا جا چکا ہے۔''

''با جا کیلیفورنیا بہت خوفناک جگہ ہے۔ میں نے اس کے قصے سن رکھے ہیں۔ خدا کے لیے تم مت جاؤ۔''

''میں نے کہا نا۔ یہ ممکن نہیں ہے، مجھے اپنی ذمے داریاں پوری کرنی ہوں گی۔''

''کیا تم شیرف کے آدمی ہو؟''

''تم اس معاملے میں مت الجھو۔'' انتونیو نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ جولیٹ نے اسے حسرت سے دیکھا۔

''تم کبھی نہیں آؤ گے؟''

''ضرور آؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر زندہ رہا اور مجھے کسی اور علاقے میں نہ بھیج دیا گیا تو ضرور آؤں گا لیکن کیا تم میرا انتظار کر سکو گی؟''

''ہاں، میں انتظار کروں گی۔'' جولیٹ نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔

''ممکن ہے مجھے کئی سال لگ جائیں۔''

''میں تاعمر انتظار کروں گی۔''

''نہیں میں تم پر اتنا بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ اگر میں تین سال تک واپس نہیں آیا تو تم آزاد ہو گی۔''

''میں ہمیشہ تمہارا انتظار کروں گی۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

''جولیٹ میرے لیے دعا کرنا۔ جب انسان کسی کے لیے دعا کرتا ہے تو خدا اس کی دعا ضرور سنتا ہے۔''

''میں خدا سے دعا کروں گی کہ تمہیں صحیح سلامت اور جلد لے کر آئے۔''

مگر جب اگلے روز انتونیو روانہ ہو رہا تھا تو جولیٹ کے اشک نہیں رک رہے تھے۔ بہت سارے لوگ اسے قصبے کے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اس کے شکر گزار تھے جس نے ان کو شاویز جیسی مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ انتونیو اداس تھا۔ اسے رہ رہ کر جولیٹ یاد آ رہی تھی کئی بار اس کا دل چاہا کہ اسے بھی ساتھ لے چلے۔ مگر وہ جہاں جا رہا تھا اسے اپنی زندگی کا نہیں پتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو۔ جبکہ اس کی ذمے داری بھی ایسی تھی جس سے وہ روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں اس کے دوست اور حامی کم ہوتے اور دشمن بے شمار ہوتے کیونکہ وہ انہیں ان کی طرز زندگی سے روکتا۔ ان کو برائی کرنے سے منع کرتا، ان کو اچھائی کی تلقین کرتا۔ تب لوگ اس کے دشمن بن جاتے۔ ایسے میں جولیٹ کو ساتھ لے جانا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ اس نے دل پر جبر کر کے جولیٹ سے جدا ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ راستے میں اور بھی حادثات اس کے منتظر ہوں گے مگر اس کا باقی سفر آرام اور سکون سے کٹا تھا۔ البتہ جب وہ اس گاؤں کے پاس پہنچا جہاں اسے بھیجا گیا تھا تو اسے دو گروہ آپس میں لڑتے نظر آئے۔ دونوں طرف سے دھواں دھار فائرنگ ہو رہی تھی اور دونوں میں سے کوئی بھی ہلکا نہیں لگ رہا تھا اس لیے انتونیو نے ان کے معاملے میں دخل اندازی سے گریز کیا اور ایک طویل چکر لگا کر دوسرے راستے سے گاؤں میں داخل ہوا۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو اسے مخصوص لباس میں ایک شخص سامنے سے آتا دکھائی دیا تھا۔ اس نے گھوڑا روک لیا۔ وہ آدمی قریب آیا تو انتونیو نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ خوش ہو گیا۔

''آپ آ گئے جناب۔ میں کئی دن سے آپ کا انتظار

کر رہا تھا آپ دیر سے آئے ہیں۔“
”ہاں، راستے میں کچھ مسائل پیش آ گئے تھے۔“ انتونیو گھوڑے سے اتر کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ”تم کون ہو؟“
”میں آپ کا نائب ہوں، میرا نام جیکب ارڈی ہے۔“ اس نے تعارف کرایا۔ ”میرے ساتھ آئیں میں نے آپ کی رہائش گاہ صاف کرادی ہے۔“
وہ اسے ایک عمارت میں لے کر آیا۔ اس کی دوسری منزل پر دو صاف ستھرے کمرے اس کے لیے مخصوص تھے۔ اس نے اپنا سامان کھول کر رکھا اور کھانے کے لیے نیچے ہال میں آیا جہاں اس کے مقامی دفتر کا سارا عملہ جمع تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ لوگ ڈرے ہوئے اور خوف زدہ تھے۔ کھانے کے بعد اس نے ان سے بات کی تو ان کا خوف کھل کر سامنے آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مقامی جرائم پیشہ ان کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ ان کے کاموں میں ٹانگ نہ اڑائیں۔ انتونیو نے ان کو تسلی دی۔
”ان کا کام دھمکیاں دینا ہے اور ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ اس لیے فکر مت کرو۔“
”جناب، آپ سے پہلے جو تھے ان کا حشر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آیئے آپ کو بھی دکھاتے ہیں۔“
وہ اسے عمارت کے عقبی حصے میں لے گئے جہاں دیوار پر ابھی تک گولیوں کے نشانات تھے اور صاف کرنے کے باوجود خون کے دھبّے بھی محسوس کیے جا رہے تھے۔ اس کے پیش رو کو بہت بے دردی سے مارا گیا تھا۔ وہ سب اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ بھی خوف زدہ ہو جائے گا مگر اس کے لیے یہ سب عام سی باتیں تھیں۔ ابھی آتے ہوئے اس نے مجبوری میں سہی لیکن سات افراد کا خون کیا تھا۔ اس نے اپنے عملے سے کہا۔
”ہمیں ڈرے بغیر اپنا کام کرنا ہے۔ میں کل مقامی لوگوں سے بات کروں گا۔“
”کیا ان کو بلا لیا جائے؟“ اس کے نائب جیکب نے سوال کیا۔
”ہاں، ان سب کو بلا لیا جائے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں چاہتا ہوں اپنا کام جلد از جلد شروع کر دوں۔“
شام کے وقت وہ گاؤں کی سیر کے لیے نکلا تھا۔ یہ مخصوص میکسیکن انداز کا گاؤں تھا۔ سفید اور زیادہ تر مٹی، پتھر سے بنے مکانات، کچے گرد آلود راستے، سپاٹ اور کھردرے چہروں والے لوگ، جو یوں خاموشی سے حرکت کر رہے تھے جیسے بے جان، چابی سے چلنے والے کھلونے ہوں۔ بچے بے شمار تھے۔ اس کے باوجود وہاں بہت سناٹا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گول تنکوں کے بنے ہوئے ہیٹ والے مقامی بیٹھے تھے ان میں سے بیشتر تمباکو چبا رہے تھے اور اس کی غلیظ پچکاریاں مار رہے تھے۔ گاؤں کی سب سے چھوٹی عمارت وہاں کا اسکول تھا اور دوسرے نمبر پر چرچ کی عمارت تھی، اس سے ظاہر تھا کہ ان لوگوں کو ان دو عمارتوں کی خاص ضرورت نہیں تھی مگر یہ ایک گاؤں کی معاشرتی زندگی کا لازمی جزو ہوتی ہیں اس لیے یہاں بھی موجود تھیں۔ گاؤں کے باہر ہونے والی جنگ اب بھی جاری تھی اور وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے گاؤں کے ایک نوجوان سے پوچھا۔
”یہ کون لڑ رہے ہیں؟“
”مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے حقارت سے زمین پر تھوک کر کہا۔ اس کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔
”بیٹے بڑوں سے اس انداز میں بات نہیں کرتے۔“ انتونیو نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔
”بیٹا۔“ اس نے پہلے سے زیادہ پُرحقارت لہجے میں کہا اور اسے گھورتا وہاں سے چلا گیا۔ انتونیو نے گہری سانس لی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں کے لوگ کچھ زیادہ ہی بگڑے ہوئے تھے اور ان کو سدھارنے کے لیے انتونیو کو بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ وہ واپس اپنی رہائش گاہ لوٹ آیا۔ رات اس نے سونے سے پہلے ساری تیاری کر لی تھی۔ پہلے وہ لوگوں کو پیار و محبت سے سمجھاتا، وہ پھر بھی نہ سمجھتے تو اس کے پاس دوسرا راستہ تو تھا ہی۔ اسے اسی وجہ سے اس جگہ بھیجا گیا تھا۔ اگلے روز ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور اپنا مخصوص لباس پہن کر باہر آ گیا۔ جب وہ ہال میں پہنچا تو وہاں کی بیشتر کرسیاں خالی تھیں۔ اس نے اپنے نائب جیکب کی طرف دیکھا۔ اس نے بے چارگی سے شانے اچکائے اور اس کے پاس آ کر آہستہ سے بولا۔
”میں نے کل پورے گاؤں کو بتا دیا تھا کہ آپ خطاب کریں گے مگر یہی معدودے چند لوگ آئے ہیں۔“
”کوئی بات نہیں ہم انہی سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔“ انتونیو نے کہا اور ڈائس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کتاب کھولی اور اس گاؤں کے چرچ کے پادری کی حیثیت سے اپنا پہلا وعظ دینے کو تیار ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس گاؤں کے لوگ شرافت سے اس کی بات نہیں سنیں گے مگر اسے امید تھی کہ وہ جلد اس کی بات سننے پر مجبور ہو جاتے جب ان کو پتا چل جاتا کہ وہ ذرا مختلف قسم کا پادری تھا۔

ریٹا نے کمرے میں جھانکا۔ ''اٹھ جاؤ جیک...... ہمیں جانا نہیں ہے کیا؟''

جیک نے کروٹ لی اور سر پر تکیہ رکھ لیا کہ اسے تنگ نہ کیا جائے مگر ریٹا ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے اندر آ کر تکیہ کھینچ لیا۔ ''جیک میں اور بچے تیار ہونے جا رہے ہیں اور جب ہم تیار ہوں تو تم ہمیں کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ملو......اوکے؟''

''آج چھٹی کا دن ہے۔'' جیک نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

''ہاں ڈیئر اور تم بھول رہے ہو۔ ہم نے بچوں کو ساحل پر لے جانے کا وعدہ کیا ہے' اب تم اٹھتے ہو یا میں مگ میں پانی بھر کر لاؤں۔''

بادلِ نخواستہ جیک کو اٹھنا پڑا۔ ریٹا کچن میں آ گئی۔ یہاں سات سالہ ایڈی اور پانچ سال کی لائلہ ناشتا ختم کر رہے تھے۔ ریٹا نے تالی بجائی ''چلو بچوں......تم دونوں کے کپڑے تیار ہیں فوراً جا کر چینج کر کے آؤ۔ جب تک میں برتن دھوتی ہوں۔''

ریٹا کچن کی صفائی اور برتن دھونے میں لگ گئی۔ جیک کے لیے کافی پوٹ میں کافی تھی اور اس کے لیے دو عدد ایگ سینڈوچز ریپر میں لپٹے رکھے تھے۔ جیسے ہی ریٹا نے آخری برتن دھو کر رکھا۔ جیک کچن میں آیا۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ریٹا اور اس کا دس برسوں کا ساتھ تھا جن میں شادی کے نو برس بھی شامل تھے۔ وہ اس کے اندر معمولی سی تبدیلی کو بھی بھانپ جاتی تھی۔ اس نے گہری سانس لی ''ڈیئر کیا بات ہے' کھل کر کہو۔''

''وہ بات یہ ہے کہ......'' جیک ہچکچایا ''آج ممی آ رہی ہیں۔''

''ممی......'' ریٹا نے دہرایا ''تمہارا مطلب ہے

نفرت کے سرطان کی کوکھ سے جنم لیتی محبت کا مغربی قصہ

ساس کہیں کی ہو "ساس" ہوتی ہے اس کے انداز جدا اور تیور حد درجہ مختلف ہوتے ہیں ...... اس کا واسطہ بھی ایک ساس سے تھا مگر اسے اپنی ساس کو برتنا بخوبی آگیا تھا۔

سخت نرم

کاشف زبیر

تمہاری ماں؟''

جیک نے سر ہلایا تو ریٹا نے ایپرن اتارتے ہوئے پٹخا...... وہ کچن سے نکل گئی، جیک اس کے پیچھے پیچھے آیا۔

''ریٹا میری بات سنو۔ یقین کرو...... مجھے خود کل پتا چلا جب مام کا فون آیا تھا۔''

''اور تم مجھے اب بتارہے ہو۔ جب میں اور بچے جانے کے لیے تیار ہیں۔'' ریٹا نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔

''یقین کرو۔''

ریٹا نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کرلیا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے سے برآمد ہوئی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''بچو! تیار ہو؟''

''یس ممی۔'' دونوں چلّاتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آئے۔

ریٹا نے لائلہ کا اسکرٹ درست کیا ''تم دونوں جا کر کار میں بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

''آپ...... ممی' ڈیڈی نہیں جارہے۔'' ایڈی نے پوچھا۔

''تم دونوں جاؤ۔'' ریٹا بولی اور وہ دوڑتے 'اچھلتے' کودتے باہر چلے گئے۔ جیک لیونگ روم سے نکلا۔ ''خدا کے لیے ریٹا کچھ سمجھنے کی کوشش کرو بھئی۔''

''تم شوق سے اپنی ماں کا استقبال کرو مگر میں اپنے بچوں کی تفریح برباد نہیں کرسکتی۔''

''ہم انہیں اگلے ہفتے لے جائیں گے۔'' جیک نے نرمی سے کہا۔

''ہم نے ان سے آج کا وعدہ کیا تھا۔''

''ڈیئر' ہم ان کو سمجھا سکتے ہیں۔''

''لیکن میں سمجھانا نہیں چاہتی۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولی اور پرس اٹھا کر باہر آگئی۔ اس نے پرس برابر والی نشست پر پھینکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی۔ اس نے اگنیشن پر ہاتھ رکھا مگر انجن اسٹارٹ نہیں کیا...... وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا۔

''تمہاری دادی آرہی ہیں۔''

''رئیلی۔'' لائلہ خوش ہوئی۔

''ہاں۔'' ریٹا نے لہجہ خوش گوار رکھنے کی کوشش کی۔ ''اس لیے ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اگلی اتوار کو پکنک پر جائیں؟''

''ممی...... پلیز!'' ایڈی نے منت کی۔

''بیٹا' دادی اس گھر میں پہلی بار آرہی ہیں۔''

''وہ مجھے اچھی نہیں لگتی ہیں۔'' ایڈی نے منہ بسورا۔ ''انہوں نے مجھے کبھی گفٹ نہیں بھیجا نہ کبھی سالگرہ پر وش کیا۔''

لائلہ کا جوش ذرا دھیما پڑ گیا تھا۔ ''ممی کیا دادی کو ہم سے محبت نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے۔'' ریٹا نے مسکرا کر کہا ''لیکن بعض لوگ اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتے ہیں۔''

''اگلی اتوار کو جائیں گے۔'' ایڈی نے پوچھا۔

''پرامس' ضرور جائیں گے۔''

دونوں بچے کار سے باہر آگئے اور ریٹا بھی بوجھل دل کے ساتھ کار سے اتر آئی۔

☆☆☆

جیک سے ریٹا کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ریٹا گریجویشن کے آخری سال میں تھی اور جیک ایم ایس سی کررہا تھا۔ وہ بایوکیمک ڈیپارٹمنٹ میں تھا اور ریٹا لسانیات کے شعبے میں۔ اس نے فرانسیسی زبان منتخب کی تھی۔ دونوں شعبہ جات میں خاصا فاصلہ تھا لیکن ایک دن بارش ان کی ملاقات کا بہانہ بن گئی۔ اس روز ریٹا چھتری لانا بھول گئی تھی۔ اس لیے عمارت کے گیٹ تک جاتے جاتے شرابور ہوگئی۔ اس نے مزید بھیگنے سے بچنے کے لیے بیگ سر پر رکھ لیا تھا۔ بیگ واٹر پروف تھا اس لیے اسے خدشہ نہیں تھا کہ کتابیں بھیگ جائیں گی۔

اچانک اس کے پاس آکر ایک کار رکی اور ایک تر و تازہ سے نوجوان نے کھڑکی سے جھانکا ''کیا تمہیں لفٹ چاہیے؟''

ریٹا ہچکچائی۔ سرما کی بارش تھی اس لیے اسے سردی لگ رہی تھی پھر وہ ہچکچاتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی ''شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔ میرا نام جیک ہے...... جیک روڈر۔''

''ریٹا نکلسن۔'' اس نے بھی تعارف کرایا۔

''میں بایوکیمک شعبے میں ہوں۔''

''اور میں شعبۂ لسانیات میں۔'' ریٹا ذرا شرما رہی تھی۔ اس کی ہلکی سی قمیص بھیگ کر بدن سے چپک گئی تھی اس نے اپنا بیگ سینے سے لگالیا۔ جیک نے عقبی نشست پر پڑی جیکٹ اٹھا کر اسے دے دی۔

''یہ پہن لو تمہیں سردی لگ رہی ہے۔''

ریٹا کو سچ مچ سردی لگ رہی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور جیکٹ پہن لی۔ ''تم کہاں رہتی ہو؟''

''گرلز ہاسٹل۔''

''او کے...... میں بوائز ہاسٹل میں رہتا ہوں۔''

دونوں ہاسٹل آمنے سامنے تھے۔ ریٹا ہاسٹل کے سامنے اتری' اس نے جیکٹ دینی چاہی تو جیک نے منع کر دیا۔

''ابھی بارش جاری تھی۔ تم بعد میں دے دینا۔''

''بعد میں کب؟''

''کل رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اگر تم فارغ ہو تو؟''

''میں فارغ ہوں۔'' ریٹا بولی۔ اس کے ذہن میں لفظ انکار آیا تھا مگر دل نے اقرار کرنے میں پہل کر دی تھی۔

''میں سات بجے لینے آؤں گا۔''

اگلے روز ریٹا نے پانچ بجے سے تیار ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے کمرے کی ساتھی لڑکی کلارا حیران تھی کیونکہ اس سے قبل کبھی ریٹا کسی کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئی تھی۔

''ایسا کون ہے جس کے لیے اتنی تیاری ہے؟'' کلارا نے شوخی سے پوچھا۔

''آ کر بتاؤں گی۔''

''اچھا واپسی کب ہوگی' رات میں یا صبح؟'' کلارا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

ریٹا جھینپ گئی ''صرف ڈنر کا پروگرام ہے میں رات گیارہ بجے تک آ جاؤں گی۔''

''اچھا...... صبح آنے والا موقع بھی کبھی آ جائے گا۔''

وہ رات گیارہ تو نہیں بارہ بجے تک آ گئی تھی۔ جیک اسے ایک ساحلی ریستوران میں لے گیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ دیر تک ساحل پر ٹہلتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ ریٹا کا تعلق فلوریڈا کے ایک دیہی علاقے سے تھا۔ وہ اپنے بل بوتے پر پڑھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ تین سے چھ بجے تک ایک ساحلی ریستوران میں بہ طور ویٹریس کام کرتی تھی۔ اتوار کے دن کی ٹائمنگ صبح آٹھ سے دوپہر تین بجے تک ہوتے تھے۔ اسے اتنا مل جاتا تھا کہ وہ آرام سے اپنے سارے اخراجات پورے کر سکے۔ اس کی تعلیم یا عام خرچ ایک ٹرسٹ اٹھا رہا تھا۔ جو ذہین طلبہ کو وظائف دیتا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ریٹا کا ارادہ شہر میں رہائش اور نوکری کا تھا۔ جیک ٹامپا کا رہنے والا تھا۔ اس کی ماں دولت مند تھی اور وہی اسے اعلیٰ تعلیم دلوا رہی تھی۔ جیک کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔

''ماسٹرز کرنے کے بعد تم کیا کرو گے؟''

''اپنے باپ کا کاروبار دیکھوں گا۔ ان کی لیب تھی۔ وہ میری ماں نے ایک اور شخص کو دی ہوئی ہے۔''

جیک کی ماں لاریل خاندانی دولت مند تھی۔ اس کے باپ نے جیک کے باپ سے پسند کی شادی کرنے پر عارضی طور پر ناراض ہو کر اسے عاق کر دیا تھا لیکن بعد میں اپنی موت سے پہلے دوبارہ اسے اپنا وارث مقرر کر دیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ساری دولت کی وارث لاریل قرار پائی تھی لیکن جیک کے باپ نے بیوی کے دولت پر عیش کرنے کے بجائے خود محنت سے اپنا کاروبار جمایا اور جب ایک کار حادثے میں اس کا انتقال ہوا تو وہ اپنی لیب قائم کر چکا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد جیک نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود بایو کیمک بن کر اپنے باپ کی لیب چلائے گا۔ اگرچہ اس کی ماں نے مخالفت کی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ جیک بزنس کی ڈگری حاصل کرے اور اپنے نانا کا بزنس سنبھالے۔ جسے... فی الحال کمپنی کے ڈائریکٹرز چلا رہے تھے مگر جیک نے ماں کی یہ خواہش ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

''اب بھی مام زور ڈالتی ہیں کہ میں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کروں۔''

''تم ان کی خواہش پوری کیوں نہیں کر دیتے؟''

''میں زندگی کے فیصلے خود کرنے کا قائل ہوں۔'' جیک نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اگلے روز ریٹا یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ریستوران آئی تھی۔ وہ ایک گاہک کو سرو کر رہی تھی جب اس نے جیک کو دیکھا۔ وہ ایک میز پر بیٹھا اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ریٹا اتنی بے قراری سے اس کی طرف بڑھی کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی

''تم۔'' اس نے گرم جوشی سے کہا ''لنچ کرو گے؟''
''ہاں' ایک سینڈ وچ اور کافی مل جائے...... میں باقاعدہ لنچ نہیں کرتا۔''
''میں ابھی لائی۔'' ریٹا بولی ''میں نے بھی لنچ نہیں کیا ہے۔ میں دس منٹ کا وقفہ لیتی ہوں۔''
ریٹا اس کے اور اپنے لیے لنچ لے کر آئی۔ دس منٹ بعد ریستوران کے سپر وائزر نے اسے گھورنا شروع کیا تو وہ بادلِ نخواستہ اٹھی تھی۔
''او کے' میں تم سے پھر ملوں گا۔'' جیک نے جانے سے پہلے وعدہ کیا تھا۔
وہ ہفتے میں ایک دو بار ملتے تھے اور ریٹا محسوس کر رہی تھی کہ ان دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس تعلق پروان چڑھ رہا ہے۔ ملاقات کے چھ مہینے بعد ریٹا کے امتحانات شروع ہو گئے اور جیک بھی اپنے تعلیمی سیشن میں مصروف تھا' اس لیے ان کی ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ گریجویشن کے پیپرز دے کر ریٹا نے سکون کا سانس لیا تھا اور امریکا میں شائع ہونے والے ایک رسالے کے فرانسیسی ایڈیشن میں بہ طور آزاد ایڈیٹر کام کرنے لگی تھی۔ اس کے ذمے رسالے میں چھپنے والے کلاسیک فرانسیسی ادب کی پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ تھی۔ ان دنوں جیک کے امتحانات شروع ہو گئے تھے۔ اس کا یہ سیکنڈ لاسٹ سمسٹر تھا۔ ان چار مہینوں میں وہ بمشکل دس بار ملے ہوں گے۔
خدا خدا کر کے جیک کے امتحانات بھی ختم ہوئے۔ انہوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ رات کو اس ریستوران میں جائیں گے۔ جہاں جیک پہلی بار اسے ڈنر پر لے گیا تھا۔ ریٹا کو احساس تھا کہ اس روز کوئی خاص بات ہوگی۔ اس لیے وہ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ منی اسکرٹ اور نیٹ بلاؤز میں اس کا سراپا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ نسبتاً طویل قامت تھی...... خوش بدن اور خوش شکل بھی۔ جیک کا قد اس سے دو انچ زیادہ تھا۔ چھریرا جسم اور معصوم چہرہ...... درحقیقت جیک اور اس کی جوڑی خوب جچتی تھی۔ اسے دیکھ کر جیک کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔
اس نے ریٹا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آج تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔''
''شکریہ۔'' وہ شرمائی ''تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔''
وہ ریزرو میز پر آئے۔ ریستوران کا بینڈ ایک معروف دھن بجا رہا تھا۔ ریٹا نے محسوس کیا کہ جیک اس سے کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے۔ انہوں نے پہلا جام پیا...... پھر جیک نے گویا ہمت جمع کی۔
''ریٹا...... میں...... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''
''سچ!'' ریٹا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
''ہاں سچ اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
اس بار ریٹا رو دی اور جیک کو اٹھ کر باقاعدہ اس کے آنسو پونچھنے پڑے اور جب ارد گرد موجود افراد نے تالیاں بجانی شروع کیں تو ان کو ہوش آیا تھا۔ دونوں جھینپ گئے پھر آرکسٹرا نے ان کے لیے فلم ٹائی ٹینک کی دھن بجائی تھی۔ جیک نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی تھی۔ پلاٹینم رنگ تھی جس پر خاصے بڑے سائز کا ہیرا جڑا تھا۔ اس رات ڈنر کے بعد انہوں نے مستقبل کے منصوبے بنائے تھے۔ جیک کا خیال تھا کہ جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہوگی۔ وہ شادی کر لیں گے۔
''لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے ہم اپنی زندگی سیٹ کر لیں۔''
''یہ کام ہم مل کر کریں گے؟''
حقیقت یہ تھی کہ ان کی منگنی کو ابھی ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا اور ریٹا کو جیک کے بغیر رہنا محال لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی جیک کے ساتھ چلی جائے مگر اس نے جیسے تیسے خود پر قابو پایا۔ ابھی جیک کی تعلیم مکمل ہونے میں چھ مہینے باقی تھے۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے ریٹا نے فرانسیسی زبان کے ایک ایڈوانس کورس میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس چار مہینے کا تھا۔ اس کی رسالے والی جاب بھی جاری تھی۔ رسالے کی انتظامیہ نے اسے پُرکشش تنخواہ کے ساتھ کمپیوٹر سسٹم بھی دیا تھا۔ جس کی مدد سے وہ رسالے کے دفتر سے مستقل رابطہ رکھتی تھی۔ اسے انٹرنیٹ کے ذریعے دفتری کام ملتا تھا جسے وہ بذریعہ انٹرنیٹ ہی واپس بھیجتی تھی۔ کورس کی وجہ سے اس کا فالتو وقت بھی مصروف گزرنے لگا تھا۔ چھ مہینے دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے تھے۔
جیک کی تعلیم مکمل ہوئی اور ریٹا اس کی طرف سے شادی کے پیام کا انتظار کرنے لگی مگر اس کے بجائے جیک نے اسے اپنی ماں سے ملوانے کو کہا۔ ریٹا نے ابھی تک لاریل کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔ ریٹا کا خیال تھا کہ اس کی اور جیک کی زندگی میں لاریل کا کردار نہ ہونے کے برابر ہوگا۔ اس لیے اسے جیک کی بات اچھی نہیں لگی۔ اب جب کہ ان کے درمیان سب طے پا چکا تھا تو جیک اسے اپنی ماں کے سامنے پیش کرنا چاہ رہا تھا۔ بہر حال جیک کی محبت میں اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک روز وہ اور جیک ٹامپا کے لیے روانہ ہوئے تھے۔
ریٹا نے راستے میں جیک سے پوچھا۔ ''اگر تمہاری

ماں نے مجھے مسترد کر دیا تو......"

جیک نے حیرت سے اسے دیکھا۔"میں تمہیں اپنی ماں سے ملوانے جا رہا ہوں۔ اس سے منظور کرانے نہیں......شادی کا فیصلہ ہم کر چکے ہیں۔"

ریٹا نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے اندیشے چھٹ گئے تھے۔ لاریل ایک عالی شان مینشن میں رہتی تھی جو اس کا باپ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ مینشن کے پورچ میں ان کی منتظر تھی۔ وہ دبلی، لمبی اور چہرے سے خشک مزاج نظر آنے والی عورت تھی۔ اس نے بیٹے کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور تنقیدی نظروں سے ریٹا کا جائزہ لیا۔

"تو تم ہو......ریٹا......جو میرے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔" ریٹا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یس مام......یہ تو ہم دونوں کا فیصلہ ہے۔"

اس پہلے تاثر نے ریٹا کو یقین دلا دیا کہ لاریل اس کے لیے روایتی ساس ثابت ہوگی۔ اس نے بادلِ نخواستہ ریٹا کو قبول کیا تھا کیونکہ اس کے بیٹے نے اسے پسند کر لیا تھا۔ ٹامپا میں قیام کے دوران جیک نے ماں سے پوچھا کہ وہ ان کی شادی میں شریک ہوگی یا نہیں۔

لاریل نے جواب دیا۔"اگر تم لوگ ٹامپا میں شادی کرو گے تو میں شریک ہو سکتی ہوں۔"

ریٹا نے سنا تو صاف انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت ٹامپا میں شادی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے جیک سے کہا۔
"میں میامی میں شادی کروں گی۔"

"یہاں کیوں نہیں؟"

"یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے، میرے تمام دوست میامی میں ہیں۔"

جیک بادلِ نخواستہ راضی ہوا تھا۔ انہوں نے میامی کے ایک چرچ میں شادی کی تھی اور لاریل اس میں شریک نہیں ہوئی تھی البتہ اس نے ان لوگوں کے لیے تحفہ بھجوایا تھا۔ یہ ایک فلیٹ کی چابی تھی جو اس نے ان کے لیے میامی میں خریدا تھا اور شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ انہوں نے ہنی مون کے لیے جیک کے نانا کا فارم منتخب کیا تھا جو فلوریڈ کے ساحل کے پاس تھا۔ شادی کے دوسرے دن وہ اور جیک ہنی مون منانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جیک اور ریٹا ایک دوسرے کے ساتھ بے حد خوش تھے۔

فارم بے حد خوبصورت اور پُرفضا مقام پر تھا۔ اس کے اندر ایک شفاف پانی والی ندی بہتی تھی اور ساحل بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ایک جدید طرز کا فارم ہاؤس تھا۔ ریٹا نے خوابوں میں ایسی جگہ ضرور دیکھی تھی لیکن اصل میں نہیں......یہی وجہ تھی وہ فارم اور ارد گرد کا علاقہ دیکھ کر پاگل ہو گئی تھی۔

"جیک میں نے سوچا بھی نہیں کہ میں ایسے کسی علاقے میں ہنی مون مناؤں گی۔"

فارم کی ندی کے اطراف میں بے شمار رنگوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے شفاف پانی میں اتنی گہرائی تھی کہ وہ باآسانی تیراکی کر سکتے تھے۔ اس جگہ کا موسم معتدل تھا۔ معمولی سی گرمی ہوتی تھی جو تیز ہوا کے دھارے میں زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فام ہاؤس سے ذرا فاصلے پر ایک جھیل تھی جس میں وہ کشتی چلاتے تھے۔ اردگرد آبادی نہ ہونے سے ماحول پُرسکون تھا لیکن اس میں کوئی خطرناک یا بڑا جانور نہیں تھا۔ ساحل پُرکشش تھے۔ جہاں بے حد سفید ریت پر نیلگوں پانی سر پٹختا تھا۔ وہ دو ہفتے کے لیے آئے تھے مگر یہ سب دیکھ کر ریٹا مچل گئی تھی۔

"ہم ایک مہینا نہیں رک سکتے؟"

"پہلے دو ہفتے تو گزر جائیں۔" جیک نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں ایک مہینہ۔" ریٹا نے کہا۔

"او کے......ایک مہینہ۔"

لیکن تیسرے دن جب وہ ندی کے سرد پانی میں تیراکی کر رہے تھے تو ریٹا نے ایک نیلی رولز رائس فارم میں داخل ہوتے دیکھی اور اس کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا...... یہ اس کی ساس کی کار تھی اور وہ خود اسے ڈرائیو کر رہی تھی۔ ریٹا کا سفید چہرہ دیکھ کر جیک نے پیچھے دیکھا اور بڑبڑا کر بولا"مام......یہ کہاں آ گئیں؟"

"جیک کیا تم نے ان کو بلایا ہے؟" ریٹا نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"نہیں......تم مجھ سے قسم لے لو۔"

ریٹا پانی سے نکلی تو تولیہ شانے پر ڈالا اور اندر چلی گئی۔ لباس تبدیل کر کے وہ نشست گاہ میں آئی تو لاریل جیک سے کہہ رہی تھی"میں نے سوچا تم مجھے یاد نہ کر رہے ہو، اس لیے چلی آئی۔"

"جی مام......بالکل۔" جیک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ویسے مام کیا آپ ایک دن کے لیے آئی ہیں۔ آنے سے پہلے کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"نہیں......پندرہ دن تو رکوں گی۔" لاریل نے

اطمینان سے جواب دیا اور پھر ریٹا کو دیکھا ''ریٹا کیسی ہو تم..... شادی کے بعد تم نکھر گئی ہو۔''
''شکریہ۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا ''آپ بھی خاصی اسمارٹ نظر آرہی ہیں۔''
''وہ تو میں ہوں۔'' لاریل مسکرائی۔ ''یہ بتاؤ..... دوپہر کے کھانے میں کیا ہے؟''
''مجھے نہیں پتا۔ جیک سے پوچھیں۔'' ریٹا نے شانے اچکائے۔
''مام ہم لنچ کے لیے باہر جائیں گے۔ آپ کے لیے کچھ لیتا آؤں؟''
''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' لاریل کی بات سن کر ابھی انہوں نے اطمینان کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ دوسرے جملے نے سارا اطمینان غارت کردیا ''میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔''
''مام وہاں دو آدمیوں کے لیے ریزرویشن ہے۔''
''کوئی بات نہیں ابھی وقت ہے تم فون کرکے تین آدمیوں کی ریزرویشن کرادو۔''
''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ریٹا نے جیک کو آنکھ سے اشارہ کیا وہ بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ ''ہم تین آدمیوں کے لیے کہہ دیتے ہیں۔ ریستوران والے کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔''
بادلِ نخواستہ وہ لاریل کے ہمراہ لنچ کے لیے روانہ ہوئے۔ ریٹا کا خوش گوار موڈ غارت ہوچکا تھا اور وہ راستے بھر چپ رہی پھر ریستوران میں لاریل نے اس کے منتخب کردہ کھانوں میں مین میکھ نکالی۔
''مام سب کو اپنی پسند کا کھانے کا حق ہے۔'' جیک نے ملائمت سے کہا۔
''ہاں لیکن کھانا تو ڈھنگ کا ہو۔ یہ سب عام لوگ کھاتے ہیں۔''
''غالباً مجھے اسپاگیٹی کے بجائے وہیل مچھلی کے کباب منگوانے تھے..... خاص لوگوں کا کھانا۔'' ریٹا نے طنز کیا۔
اس پر لاریل نے اسے سرد نظروں سے دیکھا ''جیک سے شادی کرکے تم ہمارے طبقے میں شامل ہوچکی ہو۔ اس کا خیال رکھو اب تمہیں اپنے لائف اسٹائل میں تبدیلی لانی ہوگی۔''
''پلیز مام، میں اور ریٹا خود کو عام طبقے کا فرد سمجھتے ہیں اور ہمیں آپ کی دولت سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی خود بنانا چاہتے ہیں۔''
''میں جانتی ہوں جیک..... تم خوددار ہو۔'' اس نے معنی خیز نظروں سے ریٹا کی طرف دیکھا۔ ''لیکن سب لوگ دولت کے لیے اس طرح نہیں سوچتے ہیں۔''
ریٹا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو اطمینان رکھیں۔ میں جیک کے خیال سے سو فی صد متفق ہوں۔ ہم کسی کی خیرات پر عیش کرنے پر اپنی کمائی سے ایک عام اور متوسط زندگی گزارنے کو ترجیح دیں گے۔ جس میں کسی بڑے کا کوئی دخل نہ ہو۔''
لاریل طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''میں نے بیشتر نچلے طبقے کے لوگوں کو ایسی باتیں کرتے دیکھا ہے لیکن جب ان کے سامنے دولت آتی ہے تو وہ.....''
ریٹا کھڑی ہوگئی' اس نے جیک کی طرف دیکھا ''میں باہر کار میں بیٹھی ہوں جب تم کھانا کھالینا تو باہر آجانا۔''
''ریٹا سنو تو.....'' جیک نے اس سے کہا اور وہ سنی ان سنی کرکے چلی گئی۔ جیک نے ماں کی طرف دیکھا ''پلیز آپ کیوں ہمارے ہنی مون کو خراب کررہی ہیں؟''
لاریل بھی سنی ان سنی کرکے مزے سے کھانا کھاتی رہی..... وہ باہر کی طرف لپکا اور بہ مشکل منت سماجت کرکے ریٹا کو اندر لایا۔ اس نے اندر آنے سے پہلے جیک سے کہا۔ ''تمہاری ماں مجھ سے نفرت کرتی ہے اور وہ ہمارے ہنی مون کو تباہ کرنے آئی ہے۔'' جیک کو بھی اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ لاریل آنے کے بعد جم کر بیٹھ گئی تھی اور اس کا جلد واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ ان کے ہر معاملے میں اس طرح مداخلت کرتی تھی کہ سوائے بیڈروم کے ان کو اور کہیں بھی پرائیویسی میسر نہیں رہی تھی۔ پانچ دن بعد ریٹا کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے جیک سے واپسی کے لیے کہنا شروع کردیا۔ تین دن بعد اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کیا تو جیک نے ہتھیار ڈال دیے اور وہ ہنی مون ادھورا چھوڑ کر میامی کی طرف روانہ ہوگئے۔
اگرچہ چند مہینے بعد جیک اسے بہاماز کے جنت نگاہ جزائر کی طرف لے گیا تھا اور وہاں پر انہوں نے ایک شاندار اور پُرلطف ہفتہ گزارا تھا۔ ریٹا فرانسیسی زبان کے رسالے کے لیے کل وقتی کام کرنے لگی تھی۔ اگرچہ اس کا دفتر ابھی بھی گھر میں تھا اسے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ تھا جب جیک شام کو دفتر سے آتا تو وہ اسے تروتازہ اور تیار ملتی تھی۔ اس کے بعد وہ کھانا کھاتے' ٹی وی پر اپنی پسند کا پروگرام دیکھتے یا مووی دیکھنے نکل جاتے تھے جب وہ رات کا کھانا باہر کھاتے تو لازمی طور پر تھیٹر دیکھتے تھے۔

جن دنوں وہ پہلی بار امید سے ہوئی۔ ان ہی دنوں لاریل نے جیک کو ٹاما بلالیا۔ اس کے کاروبار میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ جیک نے جاکر معاملات دیکھے تو انکشاف ہوا کہ بعض ڈائریکٹرز نے دل کھول کر خرد برد کی تھی ان میں سے دو ڈائریکٹر تو چپکے سے بیرون ملک فرار ہو چکے تھے۔ دو ڈائریکٹر تاحال لاپتا تھے۔ معاملہ پولیس کے سپرد ہوا اور بات عدالت تک گئی۔ دونوں ڈائریکٹرز کو مالیاتی فراڈ کے الزام میں دس سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا مگر ساتھ ہی کمپنی بھی ڈوب گئی' اسے دیوالیہ قرار دے دیا گیا تھا۔ لاریل کی دل جوئی اور غم بٹانے کے لیے جیک اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے آنے کی خبر سن کر ریٹا کا خون خشک ہوگیا تھا۔

اگرچہ لاریل کے باپ کا کاروبار ختم ہوگیا تھا لیکن اس سے اس کی دولت مندی پر خاص اثر نہیں پڑا تھا اب بھی اس کے پاس لاکھوں ڈالرز کا بینک بیلنس اور ملین ڈالرز کے شیئرز تھے۔ ریٹا کے خیال میں اسے ہمدردی کی اتنی ضرورت نہیں تھی کہ جیک اسے لاکر ریٹا کے سر پر سوار کرادیتا۔ حسبِ توقع لاریل کے آنے سے ان کے گھر کا پُرسکون ماحول درہم برہم ہوگیا۔ لاریل کو بات بات پر اعتراض کرنے کی عادت تھی اور اسے خاص طور سے ریٹا سے بیر تھا لہٰذا وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ وہ پہلی بار ماں بن رہی تھی اور یہ خوبصورت دن وہ جیک کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی' اس کی عفریت نما ماں کے ساتھ نہیں۔

صبح سویرے وہ تیز آواز میں میوزک لگا کر ایکسر سائز کے نام پر واہیات حرکتیں شروع کردیتی تھی جو ریٹا کے خیال میں اس عمر کی عورت کو ہرگز زیب نہیں دیتی تھیں۔ اس کے بعد ناشتے کی تیاری کے دوران کچن کا جو حشر کرتی تھی' اسے دیکھ کر ریٹا خون کے آنسو رو پڑتی تھی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی اپنا کچن بہت عزیز تھا۔ مزے کی بات تھی کہ لاریل صرف اپنے لیے ناشتا بناتی تھی اور اس نے کبھی کسی اور کے لیے یہ زحمت نہیں کی تھی۔ جب ریٹا اپنا اور جیک کا ناشتا تیار کرتی تب کچن بھی سمیٹتی تھی اور دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ رات کو اکیلے میں وہ جیک سے لڑتی تھی کہ وہ اپنی ماں کو سمجھائے۔ ناشتے کے بعد لاریل عام طور سے لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے ڈٹ جاتی تھی اور دوپہر تک وہ مختلف اشیا جیسے آئس کریم' پوپ کارن اور چپس کھا کھا کر ریپر ڈبے وہیں پھینکتی رہتی تھی۔ ریٹا جانتی تھی وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ کیونکہ اپنے عالی شان مکان میں ریٹا نے کبھی لاریل کو ایسی حرکتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں بڑی نفاست سے رہا کرتی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھانے وہ کسی اچھے ریسٹوران یا کیفے میں جاتی تھی۔ البتہ رات کا کھانا ریٹا خود تیار کرتی تھی اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اپنے کچن کا حشر برداشت کرتی۔ اس لیے خراب طبیعت کے باوجود اس نے رات کا کھانا اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جیک بے چارہ دونوں طرف سے پستا تھا پھر لاریل جب ٹی وی سے فارغ ہوتی تو فون سنبھال لیا کرتی تھی اور نہ جانے کہاں کہاں کال کرتی تھی۔ پندرہ دن بعد نیا مہینا شروع ہوا اور بل آیا تو جیک اسے دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

اس نے ریٹا سے کہا ''اتنا بل کیسے آیا؟''

''یہ تم اپنی ماں سے پوچھو۔ اسے فون کرنے کا مرض ہے۔''

لاریل اکثر قومی اور بین الاقوامی کالز کرتی تھی اور براہِ راست فون کرنے سے یہ کالز بہت مہنگی پڑتی تھیں۔ جیک نے ماں سے کہا ''آپ نے اتنی کالز کیوں کی ہیں۔''

''میں تو اتنی ہی کرتی ہوں۔'' لاریل نے بے نیازی سے جواب دیا ''ویسے کالز تو ریٹا بھی کرتی ہے۔ تم نے اس سے پوچھا؟''

''مام' وہ کبھی فون بے جا استعمال نہیں کرتی ہے۔'' جیک نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا ''ہمارے فون کا بل کبھی اتنا زیادہ نہیں آیا ہے۔ ابھی میں نے کام شروع کیا ہے اور یہ مکان بھی قسطوں پر لیا ہے۔ میری مالی حالت بہت اچھی نہیں ہے پھر ریٹا کی ڈلیوری کا وقت بھی قریب آرہا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' لاریل نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''مام آپ سمجھدار ہیں' براہِ کرم مجھ پر میری بساط سے زیادہ بوجھ مت ڈالیں۔'' جیک نے عاجزی سے کہا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے دفع ہوجاؤں۔'' لاریل نے جاہل عورتوں کی طرح واویلا شروع کردیا۔ ''تم یہ صلہ دے رہے ہو میری محبت کا۔''

ایک طویل جھگڑے اور فساد کے بعد لاریل جیک اور ریٹا کے گھر سے رخصت ہوئی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ریٹا کو امید تھی کہ اس جھگڑے کے بعد اس کی ساس ایک طویل عرصے تک ان کے گھر کا رخ نہیں کرے گی۔

☆☆☆

مگر ریٹا کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ایڈی کی پیدائش پر وہ پھر آدھمکی تھی اور اس نے ان لوگوں کو تنگ کرنے میں کوئی

کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ ہر پانچویں چھٹے مہینے آدھمکتی تھی۔ آخری بار وہ سال بھر پہلے آئی تھی اور اس نے جاتے جاتے دو نقصان کیے۔ ایک تو ان کا ٹی وی جلا دیا تھا۔ اس نے غلطی سے کولڈ ڈرنک کا ٹن ٹی وی پر رکھ دیا تھا جو الٹ گیا اور شارٹ سرکٹ سے ٹی وی سے شعلے نکلنے لگے تھے۔ دوسرے اس نے ریٹا کے نئے مائیکرو ویو اوون کو تباہ کر دیا جو اس نے اپنی تنخواہ سے قسطوں پر لیا تھا۔ لاریل نے اس کی گنجائش سے بڑے سائز کی مرغی ٹھونس دی تھی۔ اس وجہ سے دھماکا ہوا اور اوون کے ہمراہ کچن کا بھی ستیاناس ہو گیا تھا۔ اس بار جھگڑا ریٹا نے کیا اور اپنی ساس کو وارننگ دی ''آئندہ آپ نے میرے کچن میں قدم رکھا یا بلا اجازت میرے گھر کی کسی شے کو چھوا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''یہ تمہارا نہیں، میرے بیٹے کا گھر ہے۔''

''ہاں لیکن میں اس میں برابر کی شریک ہوں اور آپ نے مائیکرو ویو تباہ کیا ہے۔ اسے میں نے خریدا ہے۔ ابھی تو پورے ایک سال تک اس کی قسطیں کٹوانی ہیں۔'' ریٹا روہانسی ہوگئی۔

''کوئی بات نہیں، میں تمہیں نیا لے دوں گی۔''

''شکریہ، میں خود بھی لے سکتی ہوں۔'' ریٹا نے زہریلے لہجے میں کہا ''لیکن برائے مہربانی اب میری زندگی میں دخل اندازی بند کر دیں۔''

اس بار جاتے ہوئے لاریل نے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ وہ کچھ افسردہ تھی۔ ریٹا کو ترس آیا کہ اس کا سوائے جیک کے اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا مگر اس نے لاریل کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد لاریل کی نیلی رولز رائس ان کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیک اور بچوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ خاص طور سے لائلہ دادی سے محبت کرتی تھی۔ وہ سب سے پہلے جا کر ان سے لپٹ گئی۔ لاریل نے اسے جھک کر پیار کیا پھر ایڈی کو پیار کیا اور آخر جیک کا رخسار چوما۔ ریٹا کو ماضی کی طرح نظرانداز تو نہیں کیا لیکن اس سے صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ خود ریٹا نے بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ریٹا کا منہ نہیں چوما۔

''کیسی ہو تم؟''

''آپ کے سامنے ہوں۔'' وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولی۔

''آپ کے صاحب زادے نے عین موقع پر آپ کی آمد کی اطلاع دی۔ میں اور بچے پکنک پر......''

''ارے......ریٹا اندر چلو ناں۔'' جیک نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

''ایک منٹ جیک۔'' لاریل نے اسے ٹوکا پھر ریٹا کی طرف مڑی ''تم اور بچے پکنک پر جا رہے تھے۔''

''جیک بھی...... لیکن اس نے ابھی بتایا کہ آپ آرہی ہیں۔''

لاریل نے پُرملامت نظروں سے جیک کی طرف دیکھا ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم مجھے کل بتا دیتے میں ایک دن کی تاخیر سے بھی آسکتی تھی۔''

''بس مجھے خیال نہیں رہا۔'' جیک نے ریٹا سے نظریں چراتے ہوئے کہا ''ویسے بھی آپ اتنے عرصے بعد آئی ہیں۔''

لاریل بچوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ جیک اور ریٹا ڈرائیو وے میں رہ گئے تھے۔ ریٹا نے حیرت سے جیک کی طرف دیکھا ''آج مسز ہارڈی۔ کچھ سافٹ لگ رہی ہیں۔''

''ہاں......شاید ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

ریٹا کا بھی یہی خیال تھا ورنہ لاریل تو دوسروں کی طبیعت خراب کر دینے والی عورت تھی۔ جیک نے کار سے اس کا خاصا بڑا سوٹ کیس اور پھر ایک بڑا سا بیگ نکالا۔ ریٹا تشویش میں مبتلا ہوگئی تھی ''لگتا ہے تمہاری مام طویل عرصے تک رکنے کے ارادے سے آئی ہیں۔''

''فکر مت کرو...... ویسے بھی ہم نے دو ہفتے بعد لاس اینجلس جانا ہے۔''

''اور انہوں نے بھی چلنے پر اصرار کیا تو؟'' ریٹا کو ایک فکر لاحق ہوگئی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔ ویسے بھی مام کی صحت اب ان کو اتنے لمبے سفر کی اجازت نہیں دیتی ہے۔'' جیک نے اسے تسلی دی مگر ریٹا کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی لاریل اسے تکلیف دینے کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل سکتی ہے۔ وہ اندر آئی۔ لاریل اپنا بیگ کھول رہی تھی، اس میں بچوں اور ان کے لیے تحائف تھے، وہ ہمیشہ بچوں کے لیے تحفے لاتی تھی لیکن اس بار وہ جیک اور اس کے لیے بھی تحفے لائی تھی۔ جیک کے لیے پینٹ اور شرٹس تھیں جب کہ ریٹا کے لیے ایک جڑاؤ بریسلٹ تھا۔ البتہ بچوں کے لیے وہ بے شمار تحائف لائی تھی۔ ایڈی کے لیے وہ ویڈیو گیم پلے اسٹیشن لائی تھی۔ ایک ایرگن اور گولیوں کا سیٹ تھا۔ لائلہ کے لیے جدید ماڈل کی باربی ڈول تھی اور اس طرح کی بے شمار چیزیں تھیں۔

آخر میں لاریل نے بچوں سے کہا۔ ''میں سوری کرتی ہوں' مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آج پکنک پر جارہے ہیں۔''
''پکنک نہیں...... بہت دنوں سے یہ ساحل پر جانے کو کہہ رہے تھے۔ صرف پانی میں جانے کا پروگرام تھا۔''
''تب تم لوگ چلے جاؤ۔ میں ذرا تھکی ہوئی ہوں' آرام کرلوں گی۔''
''اب تو پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔'' ریٹا نے دل پر جبر کر کے کہا حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فوراً یہ پیش کش قبول کرلے۔
''ایک دو گھنٹے کی تاخیر سے فرق نہیں پڑتا ہے اور میں تھکی ہوئی ہوں۔ بیڈروم میں جاکر آرام کروں گی۔'' لاریل بولی ''اس لیے تم بلاوجہ اپنا پروگرام مت خراب کرو۔''
''مام آپ ابھی آئی ہیں اور آپ کو چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' جیک نے کہا تو ریٹا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
''تم نے سنا نہیں' مام آرام کریں گی بلکہ بچے شور کریں گے تو مام ڈسٹرب ہوں گی۔''
''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کی آوازیں سننے کو میرے کان ترستے ہیں۔'' لاریل نے جلدی سے تردید کی۔
ریٹا جیک کو ایک طرف لے گئی۔ ''جب وہ ٹانگ نہیں اڑا رہی ہیں تو تمہیں کیوں یہ شوق چرا رہا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا ''بس اب چلو۔''
''اوکے' مام آپ آرام کریں۔'' جیک نے ماں کے پاس جا کر کہا ''ہم کوشش کریں گے کہ جلد واپس آجائیں۔''
اور ریٹا نے دل میں فیصلہ کیا کہ جب تک سورج کی دھوپ باقی رہے گی وہ ساحل سے نہیں ہلے گی۔ اس نے آج کے لیے خاص طور سے بکنی سوٹ لیا تھا۔ اسے غسلِ آفتاب لیے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ ساحل کی طرف روانہ ہوئے جو ان کے علاقے سے دو کلومیٹر دور تھا۔ پورے میامی میں ساحلی علاقوں میں رہائش اتنی مہنگی ہے کہ صرف دولت مند افراد اسے برداشت کرسکتے ہیں۔ وہ چند منٹ میں ساحل پر پہنچے۔ انہوں نے لباس تبدیل کیے۔ جیک نے ایک جگہ منتخب کر کے لوازمات وہاں پہنچائے۔ ایڈی اور لائلہ فوراً ہی لہروں میں گھس گئے۔ ان کو احتیاطاً لائف جیکٹس پہنا دی تھیں کہ کوئی لہر ان کو کھینچ کر گہرے پانی میں لے جائے تب بھی ان کے ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو۔
ریٹا چھتری تلے لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد جیک اس کے اور اپنے لیے یخ بستہ بیئر لے آیا تھا۔ بچوں کے لیے ٹن تھے اس روز خاصی گرمی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساحل پر بے پناہ ہجوم تھا۔ ان کے اردگرد لوگ ہی لوگ تھے مگر وہ اس سے پریشان نہیں تھے۔ وہاں ہر ایک خود میں مگن تھا۔ ریٹا نے یخ بیئر کا گھونٹ لیا۔ ''آج تمہاری مام کچھ...... بلکہ خاصی بدلی ہوئی نہیں لگ رہی ہیں۔''
''ہاں محسوس تو میں نے بھی کیا ہے...... ممکن ہے ان کی طبیعت خراب ہو۔''
''تب خدا کرے ان کی طبیعت ایسی ہی رہے۔'' ریٹا نے خلوص سے دعا دی۔
''تم میری مام کو بددعا دے رہی ہو۔'' جیک نے اسے گھورا۔
''معاف کرنا وہ تمہاری ماں ہے ورنہ ان میں اور کوئی خوبی نہیں ہے...... بلکہ میرے لیے تو وہ ناقابلِ برداشت ہے۔'' جیک نے غصے سے خالی بوتل آئس بکس پر پٹخی اور اٹھ کر پانی کی طرف بڑھ گیا۔ اپنی بوتل خالی کر کے ریٹا بھی اس کے پیچھے لپکی۔ جیک نے پانی سے چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا آگے جانے لگا۔ ریٹا اس کے پیچھے رہی۔ آخر ایک جگہ جیک رک گیا اور ریٹا نے فوراً اس سے معذرت کرلی۔
''سوری...... تمہیں میری بات بری لگی ہے۔''
''ریٹا تم اکثر مام کے بارے میں بات کرتی رہتی ہو لیکن میں نے کبھی برا نہیں منایا کیونکہ میں جانتا ہوں۔ مام اکثر تمہارے ساتھ زیادتی کر جاتی ہیں لیکن اس بار وہ مجھے پہلے سے بہت مختلف لگی ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم بھی اپنے رویے میں تبدیلی لاؤ۔''
''میں خیال رکھوں گی۔'' ریٹا نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ لاریل کسی خاص مقصد کے تحت اس طرح پوز کر رہی ہے۔ ریٹا کم سے کم اپنے لیے اس سے کسی اچھائی کی توقع نہیں کرتی تھی۔ شام کو جب جیک نے سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے واپسی کا کہنا شروع کیا تو ریٹا ان سنی کر کے پانی میں چلی گئی اور بچوں کے ساتھ تفریح کرتی رہی۔ جیک غصّے سے نہیں آیا۔ اپنی جگہ بیٹھا رہا اور جب اس کے تاثرات بدلنے شروع ہوئے تو ریٹا نے واپس جانے میں عافیت سمجھی۔ جیک کو کبھی کبھی ایسا غصہ آتا تھا۔
لاریل لان پر جھولے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر بچوں سے محبت سے ملی۔ ریٹا نہ چاہتے ہوئے بھی جیک کے ساتھ اس کے پاس گئی ''لگتا ہے تم لوگوں

نے خوب انجوائے کیا ہے۔''
''جی اور آپ نے خوب آرام کیا ہے۔'' ریٹا نے گویا جوابی چوٹ کی۔
جیک نے اسے گھورا اور جلدی سے بولا ''ہاں مام اب آپ تازہ دم لگ رہی ہیں۔''
''میں نہانے جارہی ہوں۔'' ریٹا نے کہا اور اندر چلی گئی۔ اسے جیک کے انداز پر غصہ آرہا تھا۔ ماں کیا آئی تھی اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ اب وہ اسے صرف غصّے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پہلے کبھی جیک نے اس سے یہ سلوک نہیں کیا تھا۔ شاور سے برستے پانی میں اس کے آنسو بھی شامل ہوکر اسے نہلا رہے تھے۔ آخر خاصی دیر بعد اس کے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہوا...... وہ باہر آئی۔ بچے سارا دن پانی میں کھیل کر تھک گئے تھے۔ وہ نہا دھوکر سوگئے۔ خود ریٹا کا جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے جیک سے کہا ''آج رات باہر سے کھانے کے لیے لے آؤ۔ میری ہمت نہیں ہے۔''
''اپنے لیے میں لے آؤں گا لیکن مام کے لیے پرہیزی کھانا ہوتا ہے۔''
''سوری، میں نے کہا نا مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' ریٹا بے رخی سے بولی۔
جیک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا تھا پھر اس نے سر ہلایا۔
''اوکے۔ میں بنالوں گا، تم آرام کرو۔''
جیک کھانا لینے چلا گیا اور ریٹا ٹی وی چلا کر اس کے سامنے ڈھیر ہوگئی تھی۔ چند منٹ بعد جب ٹی وی کی آواز ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی تو اس نے ٹی وی بند کردیا اور اٹھ کر اپنے لیے بلیک کافی تیار کی اور اس کے ساتھ دو عدد ڈسپرین کی گولیاں لیں۔ تب کہیں جاکر اسے سکون محسوس ہوا تھا۔ لاریل نیچے مہمانوں والے کمرے میں رکتی تھی اور آج خلافِ معمول اس نے ٹی وی لاؤنج میں اپنا ڈیرہ نہیں جمایا تھا۔ شاید اس کی تھکن ابھی صبح سے نہیں اتری تھی۔ نہ جانے کیوں ریٹا کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ کچن میں کافی بنانے گئی تو اس نے وہاں ایک پرچہ رکھا دیکھا جس پر پرہیزی کھانوں کی ترکیبیں لکھی تھیں۔ نہ جانے لاریل کو کیا مسئلہ تھا کہ وہ پرہیزی کھانا کھارہی تھی۔
حالت بہتر ہونے پر ریٹا نے کچن کا رخ کیا۔ اس نے ان پرہیزی کھانوں میں سے سبزیوں کا سوپ منتخب کیا۔ اسے بنانے کے لیے تمام چیزیں گھر میں تھیں اور یہ آسانی سے بن جاتی۔ بیس منٹ میں اس نے ڈش تیار کرکے مائیکرو ویو اوون میں رکھ دی تاکہ وہ گرم رہے۔ یہ عام سا مائیکرو ویو اوون تھا کیونکہ ابھی تک ریٹا تباہ ہوجانے والے مائیکرو ویو کی قسطیں بھر رہی تھی۔ وہ بیڈ روم میں آئی اور ٹی وی پر اپنی پسند کا پروگرام دیکھنے لگی۔ چند منٹ بعد جیک نے کمرے میں جھانکا۔ ''میں کھانے کے لیے برگر لایا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے نہایت طنزیہ نظروں سے ریٹا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس کی ماں کے لیے پرہیزی کھانا بنانے کے لیے طبیعت خراب تھی اور اب ٹی وی دیکھنے کے لیے ٹھیک ہے۔
''جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری ماں۔'' ریٹا نے تپ کر سوچا ''غلطی کی جو اس چڑیل کے لیے پرہیزی کھانا بنایا۔ اسے زہر دینا چاہیے۔ مکار عورت نہ جانے آتے ہی جیک کو کیا چیز گھول کر پلادی ہے۔'' چند منٹ بعد جیک نے دوبارہ اندر جھانکا۔ ''فریج میں کچھ سبزیاں تھیں۔''
''میں نے ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔'' ریٹا کا غصہ بڑھتا جارہا تھا اس لیے اس نے یہ جواب دیا۔
''لگتا ہے تمہارا دماغ درست نہیں ہے۔'' جیک غصّے سے دروازہ بند کرکے چلا گیا اور ریٹا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس دن جیک بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔ ریٹا رات بھر جاگتی رہی اور روتی رہی۔ صبح اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جیک بچوں کو ناشتا کرا کے انہیں اسکول روانہ کرنے کے بعد دفتر گیا تھا۔ ریٹا دس بجے کے قریب اٹھی، اس نے ہمت کرکے ناشتا بنایا اور دوائی لے کر دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ اس دوران لاریل نے اس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ سوچنے سے ریٹا کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نے سونے کی کوشش کی اور سوگئی۔ دوپہر میں وہ جاگی تو اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی اور اسے شدید قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ گزشتہ رات اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور صبح بھی ہلکا سا ناشتا کیا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھوکر کچن میں آئی۔ اس نے فریج کھولا تو اس میں ایک پیزا پڑا تھا۔ اسی اثنا میں لاریل کچن میں داخل ہوئی۔
''اٹھ گئیں تم...... اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' اس نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔
''حیرت ہے آپ کو میری خراب طبیعت کا پتا ہے۔'' ریٹا تلخی سے بولی۔
''ہاں، صبح جیک نے بتایا تھا...... تم سو رہی تھیں۔ اس لیے میں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔''
''میں سو رہی تھی...... بعد میں اٹھ گئی تھی۔''
''اچھا مجھے معلوم نہیں ہے۔ خود میری بھی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے تمہارے لیے پیزا منگوایا ہے۔''

’’شکریہ...... میں پیزا نہیں کھاتی۔‘‘ ریٹا نے رکھائی سے کہا اور اپنے لیے نوڈلز نکالے۔
’’اچھا۔‘‘ لاریل نے کسی قدر مایوسی سے کہا ’’تم پہلے تو شوق سے کھاتی تھیں۔‘‘
’’کیا میں اپنی مرضی سے اپنی پسند تبدیل نہیں کرسکتی؟‘‘ جملے کے آخر میں ریٹا تقریباً چیخ اٹھی تھی۔
’’وہ میرا...... یہ مطلب نہیں تھا۔‘‘ لاریل گڑبڑا گئی تھی پھر تیزی سے کچن سے چلی گئی۔
’’مکّار عورت۔‘‘ ریٹا ذرا سی دیر میں غصّے سے ہانپنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا‘ لاریل نے اسے تنگ کرنے کے لیے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کردی تھی۔ اب وہ اس طرح بلاواسطہ ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب جارہی تھی۔ نوڈلز کھانے کے بعد ریٹا نے بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ کپڑے بدل کر آرام کر رہے تھے۔ لنچ وہ اسکول میں کرکے آئے تھے۔ ریٹا نے ان کو پیار کیا اور کل رات کے کھانے کے بارے میں پوچھا۔
’’دادی نے ہمیں برگر گرم کرکے دیے تھے۔‘‘ لائلہ بولی۔
ساس کے ذکر نے ریٹا کا منہ مزید کڑوا کردیا تھا
’’گرینڈ ماما نے کیا کھایا تھا؟‘‘ اس نے خود کو نارمل کیا۔
’’پاپا نے ان کے لیے ویجی ٹیبل سوپ بنایا تھا۔‘‘ ایڈی نے آگاہ کیا تو ریٹا کا خون کھول اٹھا تھا۔
’’یہ ماں بیٹے ایک نمبر کے مکّار ہیں۔‘‘ اس نے دل میں سوچا۔ جیک نے اس کا بنایا سوپ ماں کو پلادیا اور اس سے اپنی غلط فہمی پر معذرت تک نہیں کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس سے اس طرح ملے بغیر دفتر چلا گیا۔ ریٹا کا رونے کو جی چاہ رہا تھا لیکن وہ بچوں کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ جب تک جیک اس سے معافی نہیں مانگے گا۔ وہ اس سے بات نہیں کرے گی۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے کمپیوٹر پر دفتر کا کام دیکھا۔ دو گھنٹے میں ایک افسانہ ایڈیٹ کرکے اس نے اسے دفتر کو ای میل کیا۔ اسی اثنا میں کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک معروف الیکٹرونکس تیار کرنے والی کمپنی کی گاڑی کھڑی تھی اور کمپنی کی مونوگرام والی جیکٹ میں ایک نوجوان دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا۔
’’مسز جیک ہارڈی۔‘‘ نوجوان نے کلپ بورڈ کی طرف دیکھا۔
’’ہاں فرمائیے۔‘‘
’’ہماری کمپنی کو آڈر دیا گیا ہے۔ ہم مائیکرو ویو اوون اور ٹی وی سیٹ سسٹم کی تنصیب کرنے آئے ہیں۔‘‘
’’لیکن میں نے یا میرے شوہر نے ایسا کوئی آڈر نہیں دیا ہے۔‘‘
’’درست ہے...... یہ آڈر مسز لاریل ہارڈی نے دیا ہے اور انہوں نے کمپنی کو مکمل ادائیگی کردی ہے۔ آپ اجازت دیں تو ہم سامان لے آئیں۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ انسٹالیشن صرف آدھے گھنٹے میں مکمل ہوجائے گی اور اس کے لیے کوئی اضافی ادائیگی بھی نہیں کرنی پڑے گی۔‘‘
بے خیالی کی کیفیت میں ریٹا نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا اسے کچن اور ٹی وی لاؤنج دکھایا۔ اب ان کے پاس ایک چھوٹا سا ٹی وی تھا۔ بات یہ تھی کہ جیک کا کام زیادہ اچھا نہیں چل رہا تھا اور ان کو کھینچ تان کر گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ان لوگوں کو کچن اور ٹی وی لاؤنج کا راستہ دکھا کر ریٹا نے ساس کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی نیوز ویک کا تازہ شمارہ دیکھ رہی تھی۔
’’آپ نے اوون اور ٹی وی کا آڈر کیا تھا؟‘‘ ریٹا نے بلاتمہید پوچھا۔
’’ہاں......‘‘ لاریل نے کہنا چاہا۔
’’کیوں؟‘‘ اس بار ریٹا کا لہجہ سخت تھا۔
’’کیوں۔‘‘ لاریل کچھ حیران ہوئی۔ ’’اس لیے کہ میں ان کی خرابی کی ذمے دار تھی اور اس لیے بھی کہ میں اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہتی تھی۔‘‘
’’آپ پہلے سے بہت بدل چکی ہیں۔‘‘ ریٹا کے لہجے میں طنز تھا ’’مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں آرہا ہے۔‘‘
لاریل نے غور سے اسے دیکھا ’’تمہارے خیال میں‘ میں دکھاوا کررہی ہوں یا اس میں میری کوئی چال ہے؟‘‘
’’سچی بات ہے میرے ذہن میں یہی خیال آرہے ہیں۔‘‘ ریٹا نے صاف گوئی سے کہا۔
’’میں تمہارے شبہات کا علاج نہیں کرسکتی۔‘‘ لاریل نے نیوز ویک اٹھالیا ’’بہرحال تم چاہو تو اوون اور ٹی وی کو میری جانب سے تحفہ یا دل چاہے تو تلافی سمجھ لو۔‘‘
ریٹا باہر آگئی۔ مائیکرو ویو اوون دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ یہ جدید ترین ماڈل کا اتنا بڑا سا مائیکرو ویو اوون تھا کہ اس میں بھیڑ کا بچہ بھی مسلّم کیا جاسکتا تھا اور ٹی وی چھپن انچ کا پینل ٹی وی تھا جس میں ڈش ریسیور سے لے کر ڈی وی ڈی تک تھا حد یہ کہ ٹی وی کے اندر مکمل کمپیوٹر سسٹم کے

ساتھ انتہائی زیادہ گنجائش کی حامل میموری تھی جس میں دو سو گھنٹے کے پروگرام ریکارڈ ہو سکتے تھے۔ دونوں چیزیں بیش قیمت تھیں۔ ریٹا اور جیک ان کے خواب ضرور دیکھ سکتے تھے لیکن فی الحال ان کو لینے کی گنجائش دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ریٹا خود کو لاریل کا ممنون ہونے سے قاصر پا رہی تھی۔ شام کو جیک آیا تو وہ ٹی وی اور اوون دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ اس نے ماں کا شکریہ ادا کیا لیکن ریٹا نے اپنے گزشتہ رات کے رویے پر معذرت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

البتہ کچھ دیر بعد جب ریٹا اپنے کمرے میں آئی تو ڈریسنگ ٹیبل پر ایک خوب صورت بوکے رکھا تھا اور اس کی چھوٹی سی چٹ پر ''سوری'' لکھا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی اور اس کی اندر کی کدورت اور تلخی جیسے دھل گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کے کھانے پر زبردست اہتمام کرے گی۔ فریزر میں ایک عدد تیار ٹرکی رکھا تھا۔ ریٹا نے اس میں چاول بھر کر بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ چاول پکنے کے بعد اس رم ملا کر کھائے جاتے ہیں۔ رات کا کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ خاص طور پر لاریل نے بہت تعریف کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا پسندیدہ ٹام، ڈک اینڈ ہیری شومل کر دیکھا تھا۔ چھپن انچ کی اسکرین پر ٹی وی دیکھنے کا اپنا الگ ہی مزا تھا۔ رات سونے سے پہلے ریٹا حسب معمول کافی بنانے کے لیے اٹھی تھی۔ اسے لاریل کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ وہ اتنی مستحق تو تھی کہ وہ اس سے کافی کا پوچھتی۔ ریٹا نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

''کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ہاں یہ شرط کہ تم بھی ساتھ دو۔'' لاریل نے جواب دیا ''مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔''

کچن میں کافی تیار کرتے ہوئے ریٹا نے سوچا۔ ''لگتا ہے بلی تھیلے سے باہر آرہی ہے۔''

جب وہ کافی بنا کر لائی تو لاریل کھڑکی میں کھڑی باہر لان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریٹا نے کافی اسے دی اور انتظار کرنے لگی کہ کب لاریل شروع ہوتی ہے مگر جب خاصی دیر تک وہ خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتی رہی تو ریٹا نے اکتا کر پوچھ لیا ''آپ نے مجھے کچھ کہنے کے لیے بلایا تھا۔''

لاریل چونک کر مڑی ''ہاں......معاف کرنا......میں ذرا خیالوں میں کھو گئی تھی۔''

''اس عمر میں ایسا ہوتا ہے۔'' ریٹا نے خوشگوار لہجے میں طنز کیا۔

''ہاں شاید......اس مارچ میں پورے تہتر برس کی ہو چکی ہوں۔''

''آپ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہتی تھیں۔'' ریٹا نے پھر اسے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں......ریٹا میری تم سے درخواست ہے، میں آنے والے چند مہینے تم سب کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے لاریل کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا تھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' ریٹا نے دل میں سوچا ''اس وجہ سے بڑی بی اتنی مہربانیاں کر رہی ہیں۔''

لاریل اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''سنو تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔''

''دباؤ۔'' ریٹا نے تلخی سے کہا ''جیک کا رویہ دیکھ رہی ہیں۔ کیا اس کے ہوتے ہوئے میں اس کی ماں کو اس کے گھر میں رکھنے سے انکار کر سکتی ہوں۔''

''نہیں جیک کو اس معاملے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''پتا۔'' اس بار ریٹا نے دل میں کہا ''میرے ساتھ زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں مسز ہارڈی۔''

لاریل کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے پر مایوسی جھلکنے لگی تھی ''شاید تم راضی نہیں ہو۔''

''ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے بالکل نہیں۔'' ریٹا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن ان دنوں آپ کا جو رویہ ہے اسے دیکھتے ہوئے اگر آپ چند دن ہمارے ساتھ رہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اوہ!'' لاریل کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔

''اور اگر آپ نے اوون یا ٹی وی کی مہربانی بھی اس وجہ سے کی ہے تو بے شک آپ انہیں واپس لے سکتی ہیں۔''

''اوہ نہیں۔'' لاریل بولی ''یہ تو میں نے پورے خلوص سے تمہیں تحفہ دیا ہے۔''

ریٹا اٹھ کر دروازے تک پہنچی۔ ایک لمحے کے لیے رکی اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی ''مجھے افسوس ہے۔''

درحقیقت ریٹا کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس بار لاریل کا رویہ سچ مچ مختلف تھا اور ریٹا اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ بہرحال وہ اندر سے مطمئن نہیں تھی کہ نہ چاہنے کے باوجود لاریل کی التجا ٹھکرا رہی ہے۔

☆☆☆

اگلے روز لاریل نے ناشتے کی میز پر اعلان کیا۔ ''میں کل یا پرسوں واپس چلی جاؤں گی۔''

''اتنی جلدی۔'' ریٹا کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو جیک نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور ماں سے کہا۔
''آپ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں؟''
''بھئی میرے آنے کے دو مقاصد تھے۔ تم لوگوں سے ملنا اور اپنے چند ضروری کام نمٹانا۔ دونوں کام ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب میں واپس جاؤں گی۔''
''مام آپ ہفتہ دس دن کے لیے رک جائیں۔'' ریٹا نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔
لاریل نے غور سے اسے دیکھا ''شکریہ ریٹا...... لیکن اب رکنا مشکل ہے پھر کچھ مہینے میں تم لوگوں سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔''
جیک کے ساتھ بچے بھی لاریل کے جانے کا سن کر اداس ہو گئے تھے۔ خوش ریٹا بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے اندر بے کلی سی محسوس کر رہی تھی۔ لاریل اگلے پورے دن گھر سے باہر رہی تھی۔ رات کے وقت وہ تھکی ہوئی آئی تھی اور اس نے رات کے کھانے پر بتایا تھا کہ وہ صبح ناشتے کے بعد روانہ ہو جائے گی۔ ریٹا کے دل میں خیال آیا کہ اس کی بات مان جائے۔ اسے روک لے مگر اس نے اندر کی آواز کو دبا دیا۔ صبح ناشتے کے بعد لاریل نے اپنا بڑا سا سوٹ کیس گاڑی میں رکھا اور ان سب سے مل کر دکھی سی رخصت ہوئی۔ پہلی بار... ساس کے جانے پر ریٹا بھی افسردگی محسوس کر رہی تھی ورنہ اس سے پہلے کے تمام مواقع پر وہ بے پناہ خوش تھی۔ جیک خاموش تھا۔
''مام ٹامپا میں بالکل اکیلی ہیں۔ کاش وہ ہمارے پاس رہ سکتیں۔ میں نے اس بار ان کو بہت روکا مگر وہ مانی ہی نہیں۔ اس بار تو شاید تم بھی ان کے رکنے پر اعتراض نہ کرتیں۔'' جیک نے ماں کے جانے کے بعد کہا۔
''آں...... ہاں۔'' ریٹا ہچکچائی۔ اس کا مطلب تھا لاریل نے اپنے وعدے کا پاس کیا تھا اور جیک کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ریٹا اسے کیا بتاتی کہ اس کی ماں تو مہینوں کے ارادے سے آئی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اسے لیے لاریل جلد چلی گئی۔ ایک دو دن تک گھر کی فضا کچھ معمول سے ہٹی رہی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ معمول پر آ گئی تھی۔ ریٹا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اسے لاریل کا التجا آمیز لہجہ یاد آ جاتا تھا تو وہ کچھ دیر کے لیے بے چین ہو جاتی تھی۔
لاریل کے جانے کے ایک ہفتے بعد لائلہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے کھانسی ہو رہی تھی۔ ریٹا اسے دکھانے کے لیے مقامی اسپتال لے گئی۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر یوجین سے ہوئی۔ ڈاکٹر یوجین سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ نسلاً فرانسیسی تھا اور اس نے خاص طور سے فرانسیسی زبان سیکھی تھی۔ وہ فرانسیسی رسالے کا باقاعدہ قاری تھا۔
''ہیلو ریٹا کیسی ہو؟'' ڈاکٹر یوجین اسے دیکھ کر ویٹنگ روم میں رک گیا۔ وہ بایوپسی کا ماہر تھا۔ ''تمہاری ساس کیسی ہیں۔ شاید لاریل نام ہے ان کا؟''
''ہاں انہیں کیا ہونا ہے ٹھیک ہیں۔''
''ٹھیک ہیں۔'' ڈاکٹر یوجین نے حیرت سے کہا۔ ''تیسرے درجے کے کینسر کا مریض کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ انہیں جگر کا کینسر ہے۔''
ریٹا سن سی رہ گئی ''لیکن...... ہمیں تو...... نہیں معلوم!'' اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ کر نکلے تھے۔
''اس کا مطلب ہے انہوں نے تمہیں بتایا ہی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر یوجین نے افسوس سے سر ہلایا ''ان کی بایوپسی میں نے ہی کی ہے۔ کینسر نے جگر کے ستر فی صد حصّے پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے پاس چند مہینے سے زیادہ وقت نہیں ہے۔''
''میں نے کیوں انہیں بے رحمی سے انکار کر دیا تھا۔'' ریٹا نے سوچا اور منہ سے بولی۔ ''تمہارا شکریہ ڈاکٹر...... تم نے مجھے بروقت خبردار کر دیا۔''
اب وہ تلافی کر سکتی تھی۔
☆☆☆
ان کی گاڑی مینشن کے پورچ میں آئی تو لاریل ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ انہوں نے ریٹا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ جیک اور بچوں سے ملنے کے بعد وہ ریٹا کی طرف بڑھی تو وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔
ساس کا رخسار چوم کر اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''مام...... ڈاکٹر یوجین نے مجھے کچھ بتایا تھا لیکن آپ کا یہ راز میرے سینے میں رہے گا جب تک آپ چاہیں گی۔''
''شکریہ میری بچی۔''
ریٹا اس سے الگ ہوئی اور بلند آواز میں بولی ''مام ہم آپ کو لینے آئے ہیں لیکن اس سے پہلے چند دن ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔''
''کیوں نہیں ڈیئر۔ یہ بھی اب تمہارا گھر ہے۔''
جیک حیران پریشان سا ساس بہو کو دیکھ رہا تھا جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں۔
❀

جواب

کاشف زبیر

انگیٹھی میں آگ دہکتی رہے تو درو دیوار حرارت سے پُر رہتے ہیں... لیکن گر دیوار میں باقی رہ جائے معمولی رخنہ بھی تو انگیٹھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور سرد خیزی ہر شے کو جما دیتی ہے... اس کے دل میں بھی ایک ایسی ہی آگ دہک رہی تھی... اور وہ کسی طور اس دہکتی آگ کو سرد نہیں کرنا چاہتا تھا... تاوقتیکہ اپنا مقصد نہ پالیتا...

جان و مال کے لٹیروں میں گھر جانے والے مسافروں کی دردناک کہانی

میں بس اڈے پر تھا۔ یہاں سے بسیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ ایک ہوٹل کے چھپّر تلے رکھی میزوں اور کرسیوں پر مسافر یا آنے جانے والے لوگ بیٹھے تھے۔ میرے سامنے چائے کا کپ رکھا ہوا تھا مگر مجھے اس بدذائقہ چائے سے دلچسپی نہیں تھی، ایک گھونٹ لیتے ہی میرا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔ صبح کا وقت تھا اور بیشتر لوگ دن میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ سندھ کے اس حصے میں ڈاکو راج ہے۔ یہ راج کبھی ہلکا

پڑ جاتا ہے، جب سرکار ذرا تیزی دکھاتی ہے تو ڈاکو پہلے ہی دور جنگلوں میں اپنے محفوظ ٹھکانوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ پکڑ دھکڑ میں چھوٹے موٹے ڈاکو یا بے گناہ پکڑے جاتے ہیں۔ جب اخباروں میں تصویریں چھپ جاتی ہیں اور پولیس والوں میں تمغے اور انعامات تقسیم کردیئے جاتے ہیں تو ڈاکو پھر لوٹ آتے ہیں۔ ان کا سب سے آسان نشانہ سڑک پر سفر کرنے والے عام لوگ ہوتے ہیں۔

شکار پور سے کشمور تک گھنے جنگل اور دشوار گزار علاقے ہیں جو ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہیں اور ان کے کوئی نصف درجن بڑے گروہ سرگرم ہیں۔ ہر گروہ میں ایک سے دو درجن ڈاکو شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے گروہ ہیں جو چھپ چھپا کر وارداتیں کرتے ہیں کیونکہ انہیں پولیس کے ساتھ ساتھ بڑے ڈاکو گروہوں سے بھی خطرہ رہتا ہے۔ بڑے گروہوں کے پاس تیز رفتار گاڑیاں ہوتی ہیں جو ہر قسم کے راستوں پر چل سکتی ہیں۔ اسی طرح جدید ترین اسلحہ ہوتا ہے جس میں راکٹ لانچر بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان کے پاس رابطے کے لیے جدید ترین آلات ہوتے ہیں۔ اب تو موبائل نے رابطہ آسان کردیا ہے مگر ڈاکو احتیاطاً اس کا استعمال کم کرتے ہیں کیونکہ اس سے سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے پاس درمیانے اور طویل فاصلے پر کام کرنے والے واکی ٹاکی ریڈیو ہوتے ہیں۔ بڑے ڈاکو گروہوں کے تنخواہ دار مخبر ہوتے ہیں جو انہیں موٹی آسامیوں کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں۔

رات کے وقت سفر کرنا ڈاکوؤں اور موت کو دعوت دینے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ سورج ڈھلتے ہی علاقے سے قانون کا راج ختم ہوجاتا ہے اور ڈاکو راج شروع ہوجاتا ہے۔ اس لیے سفر کرنے والے شام ہونے سے پہلے پہلے اس علاقے سے نکل جانا پسند کرتے ہیں۔

مجھ سے دو میز آگے ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ گورا رنگ اور ذرا تیکھے سے لیکن خوب صورت نقوش تھے۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی جو ہلکے بھورے رنگ کی تھی اور اس کے چہرے پر اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر بڑے شیشوں والا دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ موسم کی مناسبت سے ہلکی جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس میں اس کے بال چھپ گئے تھے۔ اس کے پاس لیدر کا ایک بیگ تھا جو اس نے ---- میز پر رکھا ہوا تھا۔ نیچے مٹی تھی یہ قیمتی بیگ تھا خراب ہوجاتا اسی لیے اس نے میز پر رکھا ہوا تھا۔ مگر اس طرح یہ نمایاں ہو رہا تھا اور یہاں کوئی قیمتی چیز نمایاں کرنا اچھی بات نہیں تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی سامان نظر نہیں آرہا تھا۔

اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے مگر یاد نہیں آرہا تھا۔ میری یادداشت تیز ہے اور میں بہت کم کسی کو بھولتا ہوں مگر اس نوجوان کو دیکھ کر بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے کہاں اور کب دیکھا ہے۔ جب مجھے یاد نہیں آیا تو میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ سورج بلند ہوگیا تھا مگر دھند کی وجہ سے دھوپ نمایاں نہیں تھی۔ میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹوٹا چائے کے کپ میں ڈال دیا۔ اسی لمحے نوجوان کی نظر مجھ سے ملی اور وہ بلا ارادہ مسکرا دیا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کر اپنا بیگ لیا اور اس کے پاس آگیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر تم برا نہ مانو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“

”کیوں نہیں سائیں۔“ اس نے صاف لہجے میں کہا۔ وہ پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ جیکٹ تلے اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں موزے اور اعلیٰ درجے کے پمپ شوز تھے۔ اس کی کلائی پر براؤ گھڑی تھی۔ بائیں ہاتھ کی چوتھی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں نیلم جڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً دولت مند تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی اگر اس کے پاس دولت تھی تو اسے اپنی گاڑی میں ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح بس میں سفر کرنا ڈاکوؤں کو دعوت دینا تھا۔ اس کی وجہ سے دوسرے بھی مارے جاتے۔ ویسے گاڑی میں سفر کرنے والے بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس کے سامنے بھی چائے کا کپ پورا بھرا رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”یہاں کی چائے بکواس ہے۔ اس ہوٹل میں آکر پچھتا رہا ہوں۔“

”جی سائیں ایک گھونٹ سے زیادہ نہیں پی جاسکتی ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ بس اڈے کے سب سے قریب یہی ہوٹل ہے۔ دور جاؤ تو بس کے جانے کا پتا نہیں چلتا۔“

”تم کہاں جارہے ہیں؟“

”کشمور۔“

”بس میں؟“

”جی سائیں میری گاڑی ہے لیکن وہ چند میل پہلے خراب ہوگئی۔ ایکسل ٹوٹ گیا تھا اب مرمت کے لیے ایک ورکشاپ میں چھوڑی ہے۔ جانا بھی ضروری ہے اس لیے بس میں جارہا ہوں۔“

میں نے آس پاس دیکھا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ اپنا بیگ گود میں یا نیچے رکھ لیں، یہاں ایسی چیزوں کا نمایاں ہونا اچھی بات نہیں ہے۔''

وہ چونکا اور کسی قدر مضطرب انداز میں کہا۔ ''کیوں..... یہاں خطرہ ہے؟''

''ڈاکوؤں کا۔'' میں نے بدستور دھیمی آواز میں کہا۔

''مگر وہ تو راستے میں ہوتا ہے۔''

''ان کے مخبر یہیں ہوتے ہیں اور وہ بندہ تاڑ کر ڈاکوؤں کو اطلاع کرتے ہیں کہ آسامی آرہی ہے اور وہ راستے میں روک لیتے ہیں۔''

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے جلدی سے بیگ اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ یک دم ہی چوکنا نظر آنے لگا تھا اور اس کی نظریں آس پاس دیکھ رہی تھیں جیسے ڈاکوؤں کے ممکنہ مخبر کو کھوج رہی ہوں۔ مگر مخبر کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا ہے اور وہ ہوتا بھی عام طور سے بس اڈے پر کام کرنے والوں میں سے..... ہے جیسے ہوٹل کا بیرا یا گاڑی صاف کرنے والے لڑکے یا پھر بھیک مانگنے والے۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ یوں چوکنا ہو کر بھی نہ بیٹھے کہ دور سے نمایاں ہو۔ مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا کہ یہ زیادہ ہی دخل اندازی ہوتی۔ وہ میری طرف سے مشکوک ہو سکتا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو میں نے موبائل نکال کر دیکھا۔ مومل کال کر رہی تھی۔ مومل میری بیوی اور میرے دو سال کے بیٹے کی ماں ہے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں کال کی ہے؟''

''سائیں تم کب آؤ گے؟'' مومل نے وہی سوال کیا جو وہ پچھلے ایک ہفتے سے کر رہی تھی۔

''آج۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا۔

''سائیں۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''یہ تو تم ایک ہفتے سے کہہ رہے ہو۔''

''آج پکا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بابو کیسا ہے؟''

ہمارے بیٹے کا نام دیار شاہ ہے مگر ہم پیار سے اسے بابو کہتے ہیں۔ مومل نے بتایا۔ ''تم کو بہت یاد کرتا ہے۔ کل رات اتنا رویا کہ میرے لیے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔''

بیٹے کے رونے کا سن کر میں تڑپ گیا۔ ''بس آج ضرور آؤں گا۔''

مومل شوخ ہونے لگی۔ ''بیٹے کا سن کر تڑپ گئے اور بیوی کا خیال ہی نہیں ہے۔''

''تیرا خیال تو ہر لمحے رہتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''بس فکر مت کر آج رات تک آجاؤں گا۔''

کال کاٹ کر میں نے موبائل رکھا تو نوجوان مسکرا رہا تھا۔ ''بیوی ہوگی؟''

اگرچہ میں کسی غیر آدمی سے اپنی بیوی کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا ہوں لیکن اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ مجھے برا نہیں لگا۔ میں جواباً مسکرایا۔ ''ہاں بیوی تھی۔''

''جب آدمی گھر سے باہر ہو تو بیوی سب سے زیادہ بے چین رہتی ہے۔''

اس بار میں ہنسا۔ ''لیکن یہی آدمی دو دن گھر بیٹھ جائے تو بھی سب سے زیادہ بے چین بھی بیوی ہوتی ہے۔''

وہ بھی ہنسا۔ ''ہاں سائیں..... یہ بیویاں بھی عجیب مخلوق ہوتی ہیں۔ مرد کو اپنے پاس بھی دیکھنا چاہتی ہیں اور اسے گھر میں بھی کم برداشت کرتی ہیں۔''

''تم شادی شدہ ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جی سائیں، تب ہی تو بیوی کے بارے میں اتنا جانتا ہوں۔ میری بیوی بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ میں گھر میں رہوں تو اسے بے چینی ہوتی ہے کہ کام پر کیوں نہیں جا رہا اور باہر نکلوں تو بار بار مجھے کال کر کے پوچھتی ہے کہ واپس کب آؤں گا۔''

کشمور جانے والی کوچ تیار ہو رہی تھی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر مل کر اس کو چیک کر رہے تھے۔ آئل، ریڈی ایٹر کا پانی اور ٹائروں کی ہوا دیکھی جا رہی تھی۔ راستے میں ان میں سے کوئی چیز کم ہو جائے تو بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس سڑک پر تو ڈرائیور رفتار بھی کم نہیں کرتے ہیں۔ کنڈیکٹر عام طور سے چھت پر ہوتا ہے تاکہ اگر راستے میں ڈاکوؤں نے کوئی رکاوٹ ڈالی ہو تو دور سے نظر آجائے اور وہ ڈرائیور کو خبردار کر دے۔ اگرچہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکو اب تمام چیزوں کا سوچ کر آتے ہیں اور ان سے بچنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ نوجوان نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔

''سائیں تم بھی اسی بس سے جا رہے ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''میرا گھر کندھ کوٹ کے پاس ہے، میں وہاں اتر جاؤں گا۔''

نوجوان اسی بس میں جا رہا تھا۔ اس کا سوال ہی بتا رہا تھا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اور اس نے ہارن دیا۔ یہ اشارہ تھا کہ اس بس میں سفر کرنے والے آجائیں۔ اصل میں یہ بس تیس کلومیٹرز دور سکھر سے چلتی تھی، اس کا روٹ کشمور سے ہوتے ہوئے راجن پور تک کا تھا۔ کچھ مسافر سکھر سے بیٹھے اور کچھ یہاں سے بیٹھتے۔ ہارن بجتے ہی مختلف

میزوں پر بیٹھے لوگ اٹھنا شروع ہوگئے۔ میں اور نوجوان بھی اٹھ گئے۔ ٹکٹ میں پہلے ہی لے چکا تھا۔ میں نے اپنا بیگ کنڈیکٹر کے حوالے کیا جس نے اسے سامان والے خانے میں رکھ دیا اور مجھے پرچی بنا کر دینے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے ایک سگریٹ اور سلگا لیا۔ بس میں میں سگریٹ پینے سے گریز کرتا تھا کیونکہ اس سے دوسروں کو دھواں لگتا تھا اور لوگ شور مچاتے تھے۔ میں لڑائی جھگڑے اور نمایاں ہونے سے گریز کرتا تھا۔ نوجوان اندر چلا گیا تھا۔ تقریباً تمام مسافر بس میں سوار ہوگئے اور ڈرائیور نے آخری ہارن دیا۔

میں نے آخری کش لے کر سگریٹ پھینک دیا اور اندر آگیا۔ ڈرائیور نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ کنڈیکٹر باہر رہ گیا تھا اور اب وہ چھت پر جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا خیال درست نکلا تھا۔ میں نے سیٹوں کا جائزہ لیا تو مجھے حیرت ہوئی میری سیٹ نوجوان کے برابر والی تھی۔ ٹکٹ پر یہی لکھا تھا۔ یہ درمیان میں دائیں طرف کی راہداری والی سیٹ تھی۔ کھڑکی کی طرف نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ بس کی اسی فیصد نشستیں بھری ہوئی تھیں اور کوئی پندرہ کے قریب خالی تھیں۔ میں چاہتا تو ان میں سے کسی پر بھی بیٹھ سکتا تھا لیکن میں نوجوان کے پاس آگیا۔ اس کے برابر میں بیٹھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''سائیں لگتا ہے اس سفر میں ہم ساتھ ہی رہیں گے۔''

میں نے اعتراف کیا۔ ''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میرا ٹکٹ اس سیٹ کا ہے۔''

اب تک ہمارے درمیان تعارف نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مجھے عنایت اللہ قریشی کہتے ہیں۔ سکھر کا رہنے والا ہوں۔''

''عامر شاہ۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''سائیں پولیس میں کام کرتے ہو؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''کچھ عرصے میں بھی فورس میں رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب نہیں ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''رشی کو پسند نہیں تو میں نے چھوڑ دی۔''

میں نے جھجک کر پوچھا۔ ''رشی کون؟''

''میری بیوی راشدہ..... میں اسے رشی کہتا ہوں۔''

''بچے ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، اللہ نے دو بار امید دی لیکن پھر پوری ہونے سے پہلے واپس لے لی۔ اب کوئی امکان نہیں ہے۔ رشی ماں نہیں بن سکتی ہے۔''

مجھے افسوس ہوا۔ ''تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

''نہیں کر سکتا۔''

''اس لیے کہ اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟''

اس نے مبہم سے انداز میں سر ہلایا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس نے اقرار کیا تھا یا انکار۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ یہ اے سی کوچ تھی جس کی کھڑکیاں نہیں ہوتی ہیں۔ شیشے فکس تھے اور کیونکہ سردی کا موسم تھا اس لیے اے سی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سردی بھی اتنی نہیں تھی کہ ہیٹر چلانے کی ضرورت پیش آتی۔ بس کے اوپر مختصر سامان رکھنے کے لیے خانے بنے ہوئے تھے لیکن اس نے اپنا لیدر بیگ اپنے پاس رکھا تھا۔ یہ اس نے پاؤں کے پاس کھڑکی کے عین نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''اب کیا کرتے ہو؟''

''سائیں اپنا آبائی کام۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم ذات کے قریشی ہیں۔ ادھر سکھر میں گوشت کی ساری مارکیٹیں ہماری ہیں۔''

میرا اندازہ تھا کہ وہ کشمور جانور لینے جا رہا ہے۔ ادھر بلوچستان اور اوپر سرحد تک سے بیوپاری اپنا مال لاتے تھے۔ ڈاکو راج کی وجہ سے وہ آگے آتے ہوئے گھبراتے تھے اس لیے کشمور تک ہی اپنا مال فروخت کر کے چلے جاتے تھے۔ عنایت اللہ نے کچھ دیر بعد مجھ سے پوچھا۔ ''سائیں آپ کی پوسٹنگ کہاں ہے؟''

''جیکب آباد میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سائیں اِدھر ڈاکو پولیس کے دشمن ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کوئی پولیس والا مل جائے تو ساتھ لے جاتے ہیں۔ بدلے میں اپنے آدمی رہا کراتے ہیں یا پھر مار دیتے ہیں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو اسی لیے میں سادہ لباس میں ہوں۔ بیلٹ اور اسلحہ وہیں چھوڑ کر آیا ہوں۔ بال بھی بڑھائے ہوئے ہیں۔''

''کارڈ ہوگا؟''

''وہ ہے لیکن ایسی جگہ چھپایا ہے کہ کوئی تلاش نہیں کر

سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے تم نے مجھے فکرمند کردیا ہے میں سوچ رہا تھا کہ کوئی مجھے پولیس والے کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا۔''

''عام آدمی نہیں کرسکتا، لیکن میں فورس میں رہ چکا ہوں۔''

''فورس کب چھوڑی؟''

''دو سال ہوگئے ہیں۔''

''آفیسر تھے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''نوکری بھی مزے کی تھی نہ زیادہ تر فارغ بیٹھے رہتے تھے۔''

''جب آرام سے بیٹھ کر کرنے والی نوکری تھی تو کیوں چھوڑی؟''

''آرام والی تو تھی، پر خطرہ بھی تھا اور رشی سے یہ برداشت نہیں تھا۔ شادی کے فوراً بعد اس نے نوکری چھوڑنے اور اپنا کام کرنے کو کہنا شروع کردیا تھا۔''

''یہ تو ہے پولیس کی نوکری کتنے ہی آرام والی کیوں نہ ہو اس میں خطرہ تو ہوتا ہے۔''

''سائیں تم خطرناک علاقے میں ڈیوٹی کررہے ہو، تم کو پتا تو ہوگا۔''

''ہاں بھائی ادھر ہم پولیس والوں کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ بازار بھی جاتے ہیں تو دو تین اور مسلح ہوکر جاتے ہیں۔ آج کل ڈاکو سخت دشمن بنے ہوئے ہیں۔''

''آپریشن کے بعد سے ایسا ہورہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پچھلی بار جب میں کشمور جارہا تھا تو راستے میں کچھ دیر پہلے ہی پولیس کی موبائل پر فائرنگ کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں دو پولیس والے مارے گئے تھے اور تین زخمی ہوئے تھے۔ بعد میں وہ بھی مرگئے تھے۔''

''بس اسی سے اندازہ لگالو کہ ہم کتنے خطرناک حالات میں کام کررہے ہیں۔''

''پر سائیں حقیقت تو یہ ہے کہ خود ہمارے اندر کالی بھیڑیں ہیں۔ جو ڈاکوؤں سے ملی ہوئی ہیں۔ اپنے ہی بھائیوں کو مرواتے ہیں مخبری کرکے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''پولیس والوں کے قتل میں اکثر اندر کے لوگ ہی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مخبری کرتے اور ڈاکوؤں کو ان کے بارے میں بتاتے ہیں۔ پچھلے ایک سال میں صرف سکھر ڈویژن میں بائیس پولیس والے گھات لگا کر ماردیے اور ایک کا قاتل بھی ہاتھ نہیں آیا۔''

''دولت بُری چیز ہے سائیں۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''یہ بھائی کے ہاتھ بھائی کو مروادیتی ہے۔ سچی بات ہے کہ ان باتوں نے بھی فورس سے میرا دل خراب کیا اور میں نے جاب چھوڑ دی۔ کیا فائدہ جب آدمی برسوں کسی کے ساتھ رہے اور وہ تھوڑے سے پیسوں کی خاطر آپ کا سودا کرلے۔''

بس شکارپور سے خاصی آگے نکل گئی تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے پون گھنٹا ہوگیا تھا۔ غوث پور نزدیک آرہا تھا اور اس کے بعد کندھ کوٹ تھا۔ میرے موبائل نے ایس ایم ایس ٹون دی۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا۔ ایک میسج آیا ہوا تھا۔ میں جواب دینے لگا۔ عنایت اللہ نے منہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ وہ دوسروں کی پرائیویسی کا خیال رکھنے والا آدمی تھا۔ میں نے میسج کا جواب دیا اور موبائل رکھا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مسکرایا۔ ''بھابی کا میسج ہوگا۔''

''اسے چین کہاں ہے۔ پوچھ رہی تھی کہ کہاں ہو، میں نے بتایا کہ راستے میں ہوں۔''

اس نے باہر دیکھا۔ ''اب زیادہ فاصلہ نہیں رہا ہے غوث پور آنے والا ہے۔ اس کے بعد کندھ کوٹ تک مشکل سے آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ شکر ہے ادھر سڑک ٹھیک ہوگئی ہے۔''

''اسٹاپ سے میرا گھر رکشے میں دس منٹ کے فاصلے پر ہے۔''

''ایسا لگ رہا ہے کہ تم گھر کم جاتے ہو؟''

''ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''پچھلے چھ مہینے میں بس دو ہفتے گھر میں گزارے ہیں۔''

''بھابی بیٹے کو ادھر جیکب آباد لے جاؤ۔''

''سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پر اس صورت میں بچت مشکل ہوجائے گی۔''

''کندھ کوٹ میں اپنا گھر ہے؟''

''ہاں باپ کی زمین ہے۔ بھائی دیکھتا ہے۔ میرے حصے کے بدلے وہ میرا گھر بھی چلاتا ہے۔ ادھر سے چلا گیا تو کچھ رقم پکڑادے گا۔ وہ زیادہ کام نہیں آئے گی۔''

''یہ تو ہے۔'' عنایت اللہ نے سر ہلایا۔ ''آدمی اپنے علاقے سے جتنا دور جاتا ہے، اخراجات اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں۔ پوسٹنگ کے دور میں میں کشمور میں رہا ہوں۔ رشی کو ساتھ رکھا ہوا تھا اور مجھے وہاں رہنا مہنگا پڑتا تھا۔ سمجھ لو کہ ساری تنخواہ وہیں خرچ ہوجاتی تھی۔''

کشمور کے نام پر میں چونکا اور میرے ذہن میں کوئی

بات آئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ واضح ہوتی، اچانک شور بلند ہوا۔ کنڈیکٹر بس کی چھت پر ہاتھ مار کر چلّا رہا تھا۔ کچھ لوگ کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے بھی اچک کر دیکھنا چاہا تھا کہ جھٹکے سے بس کے رکنے سے میں آگے والی سیٹ سے ٹکرایا اور پھر واپس اپنی سیٹ پر گرا۔ دوسرے کھڑے ہونے والے بھی گرے تھے۔ شور میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے عنایت اللہ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
''ڈاکو ہیں؟''
''نہیں کوئی اور بات ہے۔'' میں نے کہا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔
''ڈاکو ہیں۔'' اس بار اس نے اطلاع دی۔ ''ایک بڑی جیپ اُدھر کچے سے نکل کر بس کے پیچھے آئی ہے۔''
میں ایک بار پھر اٹھا تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا تنا نظر آ گیا۔ وہ کوئی دو سو گز آگے تھا اور اس کا سائز ایسا نہیں تھا کہ دور سے نظر آتا مگر بس کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے کافی تھا۔ اب میں نے پیچھے دیکھا تو جیپ بس کے بالکل عقب میں آ گئی تھی اور اس سے مسلح افراد اتر رہے تھے۔ عنایت اللہ کی بات درست تھی۔ دوسرے مسافروں نے بھی مسلح افراد کو دیکھ لیا تھا اور سب ہی ڈاکو ڈاکو بول رہے تھے۔ کچھ اپنی نقدی اور دوسرا قیمتی سامان چھپانے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ سب بیکار تھا۔ ڈاکو ہر فرد کی اور پوری بس کی تلاشی لیتے۔ اگر کسی نے کچھ چھپایا ہوتا اور وہ نکل آتا تو چھپانے والے کی شامت آجاتی اور اس کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ جو ایسا کر رہے تھے، وہ لٹنے کے ساتھ ساتھ پٹنے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ عنایت اللہ نے گھبرا کر کہا۔ ''اب کیا کریں میرے پاس تو بڑی رقم ہے۔''
میں نے اس کے چرمی بیگ کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہاں چھوٹا سا پرس بھی نہیں چھپا سکتے۔ یہ تو بہت بڑا بیگ ہے۔ ویسے کتنی رقم ہے؟''
''ساڑھے چار لاکھ کی رقم ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ لٹنے کے خیال سے اس کا سفید رنگ اور سفید پڑ گیا تھا۔ ''نوٹ بھی زیادہ تر سو والے ہیں۔ دو ہی گڈیاں پانچ سو کی ہیں۔ اگر ہزار کے نوٹ ہوتے تو میں کپڑوں میں ہی چھپا لیتا۔ چھوٹے نوٹوں کی وجہ سے یہ بیگ لانا پڑا۔''
میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ابھی تم دیکھ لوگے کہ یہ کس طرح لوگوں کی تلاشی لیتے ہیں، گڈی بہت بڑی چیز ہے یہ سکہ تک تلاش کر لیتے ہیں۔''

اس دوران میں ڈاکو بھاگتے ہوئے دروازے تک آئے اسے کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد ڈرائیور کو باہر سے رائفل دکھائی تو اس نے گھبرا کر ہینڈل کھینچ دیا اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار ڈاکو دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ اندر آتے ہی آگے والے نے چلّا کر کہا۔
''خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ سب اپنے ہاتھ اوپر کرلیں جس کا ہاتھ نیچے ہوا اسے کاٹ کر رکھ دوں گا۔''
سب نے بلا چوں چرا اپنے ہاتھ یوں اوپر کر لیے کہ ڈاکوؤں کو واضح نظر آئیں۔ ایک ڈاکو نے ڈرائیور کو بس چلانے کو کہا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کیسے چلاؤں آگے، تنا پڑا ہوا ہے۔''
اس پر ڈاکو نے بڑی فحش بات کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت گندی ذہنیت والے لوگ تھے۔ ڈرائیور نے بس آگے بڑھائی۔ ڈاکوؤں کی جیپ پیچھے آرہی تھی پھر اس نے بس کو اوورٹیک کیا اور تنے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اس سے دو افراد اترے اور انہوں نے پھرتی سے تنا سڑک سے ہٹایا اور دوبارہ جیپ میں سوار ہوگئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ڈاکو چلتی بس میں تسلی سے لوٹ مار کرنا چاہتے تھے۔ ایک عقب میں چلا گیا۔ ایک ڈرائیور کے سر پر تھا اور باقی دو مسافروں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کسی مسافر کا ہاتھ ذرا بھی نیچے جاتا تو ان میں سے کوئی گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہاتھ اوپر کرنے کا حکم دیتا۔ عنایت اللہ نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''یہ بہت گندے لوگ ہیں ان کو عورتوں کا خیال بھی نہیں ہے۔ کیسی زبان استعمال کر رہے ہیں؟''
''یہ ڈاکو ہیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''ان کا اخلاق اور تمیز سے کیا تعلق؟''
''تم دونوں اپنی زبانیں بند رکھو۔'' نسبتاً قریب کھڑے ڈاکو نے ہمیں حکم دیا۔ اس نے ہماری سرگوشیاں سن لی تھیں۔ مگر شاید الفاظ نہیں سن سکا تھا ورنہ اتنی شرافت سے خاموش رہنے کا حکم نہ دیتا۔ ہمیں گالیاں پڑ جاتیں۔ جس وقت ڈاکو بس میں سوار ہو رہے تھے اور سڑک پر تنا پڑا ہوا تھا اتفاق سے اس وقت سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نظر نہیں آئی۔ گویا کسی کو پتا نہیں تھا کہ اس وقت ہماری بس میں ڈاکو سوار تھے۔ جب تنا ہٹنے کے بعد بس آگے روانہ ہوئی تو ڈاکوؤں نے ڈرائیور کو رفتار تیس میل فی گھنٹا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی بس کی کھڑکیوں کے ساتھ لگے پردے برابر کیے جانے لگے۔ یہ کام ڈاکو خود کر رہے تھے۔ پردے برابر کرنے کے دوران مسافروں کے ہاتھ اوپر ہی

تھے۔ موبائل سب کے پاس ہوتا ہے۔ شاید ان لوگوں کو خطرہ تھا کہ کوئی مسافر خاموشی سے پولیس کا نمبر نہ ملا دے۔

اگر چہ اول تو پولیس والے نمبر اٹھانے کی زحمت نہیں کرتے ہیں لیکن اس کا امکان تھا کہ کسی مسافر کا کوئی پولیس والا رشتے دار یا واقف کار ہو اور وہ اسے کال کر دے۔ اپنے پیٹی بند بھائی کے لیے پولیس حرکت میں آسکتی تھی اس لیے مسافروں کے ہاتھ اوپر کرائے ہوئے تھے۔ ڈاکو سب پر عقابی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جس منظم طریقے سے کام کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا ہر فرد کو پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ پردے برابر کرنے کے بعد ایک ڈاکو نے بڑا سا کپڑے کا تھیلا لیا اور آگے سے شروع کیا۔ پہلے وہ بائیں قطار کی طرف آیا۔ اس نے مسافروں سے کہا۔ ''سوائے تن کے کپڑوں کے سب اس میں ڈال دو۔ یہ بات یاد رکھنا بعد میں تلاشی لی جائے گی اگر کسی کے پاس سے کچھ نکل آیا تو ہم اسے ساتھ لے جائیں گے اور آرام سے اس کے کپڑے اور اس کے بعد اس کی کھال اتاریں گے۔ جو اپنی کھال بچانا چاہتے ہیں، وہ سب اس میں ڈال دیں۔''

یہ سن کر مسافروں کی حالت خراب ہونے لگی۔ وہ سب اپنا سب کچھ تھیلے میں ڈالنے لگے۔ یاد کر کے اور جیبوں کی تلاشی لے کر چیزیں نکال رہے تھے کہ بعد میں کھال کی محرومی سے بچ سکیں۔ جو پیچھے تھے، انہوں نے پہلے ہی چیزیں نکالنا شروع کر دی تھیں۔ اپنے موبائل، پرس، رومال، مرد انگوٹھیاں اور گلوں میں پہنے تعویذ یا چین، عورتیں اپنا زیور اور پرس تھیلے میں ڈال رہی تھیں۔ جیسے جیسے ڈاکو پیچھے کی طرف آرہا تھا، تھیلا بھرتا جارہا تھا۔ وہ پیچھے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ تھیلا پوری طرح بھر گیا۔ اس نے تھیلے کے سرے پر موجود رسی کو کھینچ کر اسے بند کیا اور ڈرائیور کے پاس موجود ساتھی کے حوالے کر کے دوسرا تھیلا نکالا اور جہاں سے سلسلہ چھوڑا تھا وہیں سے دوبارہ شروع کیا۔ جو مسافر چیزیں دیتے جارہے تھے، ان کو ہاتھ نیچے کرنے کی اجازت مل رہی تھی۔

چوتھا فرد جو فارغ تھا، وہ ٹہلنے کے انداز میں تمام مسافروں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ جہاں کوئی ذرا سی حرکت کرتا وہ اس کے سر پر پہنچ جاتا۔ تھیلے والا آخر سے ہو کر اب دائیں قطار کی طرف آگیا تھا اور پیچھے سے آگے آرہا تھا۔ میں اور عنایت اللہ اسی قطار میں تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ بیگ کو پاؤں سے سرکا کر سیٹ کے نیچے کر دے۔

اگر چہ یہ کوشش بیکار ہی تھی کیونکہ ڈاکو کہہ چکے تھے کہ وہ چیک کریں گے اور تلاشی لیں گے۔ بس دھیمی رفتار سے چل رہی تھی اور غوث پور کی آبادی شروع ہوگئی تھی۔ بس کا یہاں اسٹاپ نہیں تھا اس لیے وہ ہائی وے پر رہی۔ ویسے اگر اسٹاپ ہوتا بھی تو ڈاکو کون سا اسے یہاں رکنے دیتے۔ سورج خاصا بلند ہو چکا تھا اور دھند تقریباً غائب ہوگئی۔ میں سامنے ونڈ اسکرین سے پار دیکھ رہا تھا۔

ڈاکوؤں کی جیپ کچھ فاصلے پر جارہی تھی۔ یہ خاصی بڑی والی جیپ تھی جس میں آگے پیچھے سیٹوں کے ساتھ ہی عقبی حصے میں بھی خاصی جگہ ہوتی ہے۔ ڈاکو بہ ظاہر چھ تھے لیکن اس کا امکان تھا کہ ان کی اصل تعداد اس سے زیادہ ہو۔ جیپ کی حالت گرد مٹی سے خراب تھی مگر یہ تقریباً نئی جیپ تھی۔ میں نے کہا نا کہ یہاں ڈاکوؤں کے پاس جدید ترین اسلحہ اور گاڑیاں تھیں جن پر وہ اس علاقے میں دندناتے پھرتے تھے۔ پولیس والوں کے پاس پرانے طرز کی خستہ حال موبائلز تھیں جو چل جاتیں تو اسے ہی غنیمت سمجھا جاتا۔ البتہ اسلحہ کسی قدر بہتر دے دیا گیا تھا۔ ایس ایم جی اور جدید رائفلیں آئی تھیں۔ اس طرح غیر ملکی پستول تھے۔ اس کے باوجود ڈاکوؤں کے پاس زیادہ جدید اسلحہ تھا۔ عنایت اللہ نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر تم اپنی سرکاری گن لے آتے تو اس وقت مزاحمت کر سکتے تھے۔''

''شکر ہے کہ میں نہیں لایا ورنہ یہ باقی کسی کو کچھ نہیں کہتے مگر مجھے ضرور ساتھ لے جاتے اور ایک گن سے میں بھلا کیا کر لیتا۔ یہاں تو چار گنز ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا کیونکہ تھیلے والا ڈاکو نزدیک آگیا تھا۔ اس نے ہماری پچھلی سیٹ پر بیٹھے جوڑے سے کہا۔

''چل نکال جلدی جو کچھ تیرے پاس ہے۔''

عورت منمنا رہی تھی شاید منت سماجت کر رہی تھی۔ مرد اسے سمجھا رہا تھا شاید اس کے پاس کوئی چیز تھی اور وہ دینے کو تیار نہیں تھی۔ اچانک ڈاکو نے دہاڑ کر کہا۔ ''دیتی ہے یا ہاتھ کاٹ کر اتار لوں۔''

''دے دے۔'' مرد نے برہمی سے کہا۔ ''اب یہ تیرا ہاتھ پکڑے گا۔''

''اور تو بے غیرت دیکھتا رہے گا۔'' عورت نے تنک کر کہا۔

''تو کیا جان دے دوں۔'' مرد بولا۔

''لو یہ چار چوڑیاں بچی تھیں، یہ تم لے لو۔'' عورت

نے غصے سے چوڑیاں اتار کر تھیلے میں ڈال دیں اور پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ مرد نے بھی اپنی ساری چیزیں تھیلے میں ڈال دی تھیں۔ کسی نے عورت کے رونے دھونے پر توجہ نہیں دی کیونکہ وہاں سب ایسے ہی حالات سے گزر رہے تھے۔ غوث پور گزر رہا تھا۔ ڈرائیور کے پاس کھڑے ڈاکو نے اسے حکم دیا۔

''رفتار اور کم کرلے پچیس میل سے اوپر نہ جائے۔''

غالباً ڈاکو لوٹ مار کے لیے مزید وقت چاہتے تھے۔ چلتی بس میں لوٹ مار سے یہ فائدہ تھا کہ اگر کہیں پولیس سے سامنا ہو جاتا تب بھی اسے شک نہ ہوتا۔ شکار پور کے بعد اگلی پولیس چوکی جہاں بس کو روک کر چیک کیا جاتا، کندھ کوٹ میں تھی۔ وہ کندھ کوٹ پہنچنے سے پہلے پہلے اپنا کام کر لینا چاہتے تھے۔ اب ہماری باری تھی جیسے ہی ڈاکو تھیلا لے کر ہمارے پاس آیا، میں نے جیب سے اپنا پرس اور موبائل نکال کر اس میں ڈال دیا۔ ڈاکو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ اور ہے تو ابھی ڈال دے بعد میں مال بھی دے گا اور پچھتائے گا بھی۔''

''جو میرے پاس تھا، وہ دے دیا ہے اب ایک بیگ ہے جس میں سامان اور کپڑے ہیں، وہ بس کے سامان والے خانے میں ہے۔''

ڈاکو نے عنایت اللہ کی طرف دیکھا۔ ''چل تو بھی نکال جو کچھ ہے۔''

اس نے اپنا پرس، موبائل، انگوٹھی اور گھڑی اتار کر تھیلے میں ڈال دی۔ ''بس یہی ہے۔''

اتنی دیر میں ڈاکو چرمی بیگ دیکھ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اڑے مسخری کرتا ہے۔ یہ کیا چھپایا ہوا ہے؟''

غالباً پوری بس میں کسی اور کے پاس ایسا بیگ نہیں تھا۔ ڈاکو نے اپنے فارغ ساتھی کو آواز دی۔ ''اڑے نمبر چار ادھر آ دیکھ سیٹھ کے پاس کیا ہے؟''

وہ لپک کر آیا اور بیگ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی تھی۔ اس نے جھپٹ کر بیگ اٹھایا اور بے تابی سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ ''اڑے یہ تو لاک ہے۔''

''چابی کدھر ہے۔'' تھیلے والے ڈاکو نے عنایت اللہ سے پوچھا۔

''میرے پرس میں۔'' اس نے جواب دیا۔ اتنی بڑی رقم اور اپنا سب کچھ جاتے دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ گھڑی، موبائل اور انگوٹھی قیمتی تھی۔ اس کے پرس میں بھی یقیناً خاصی رقم ہوگی لیکن اصل مال تو بیگ میں تھا اور وہ اب ڈاکوؤں کے پاس جا چکا تھا۔ تھیلے والے ڈاکو نے تھیلے میں جھانکا اور بدمزگی سے بولا۔ ''اب اتنے سارے پرسوں میں سے تیرا کہاں تلاش کروں۔ اس میں ہے کیا؟''

''ساڑھے چار لاکھ روپے۔'' عنایت اللہ نے مردہ لہجے میں کہا تو ڈاکو کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے چیخ کر کہا۔

''سردار اپنا جیک پاٹ لگ گیا ہے۔ اڑے اس بیگ میں ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں۔''

سردار جو ڈرائیور کے سر پر تھا، وہ ساڑھے چار لاکھ کا سن کے لپک کر آیا اور اس نے بیگ اپنے ساتھی سے جھپٹ لیا۔ اس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''اسے ٹھکانے پر چل کر دیکھیں گے۔ ابھی تو باقی کام کرو۔''

ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ چھوٹے درجے کے ڈاکو تھے جنہیں ایک واردات سے شاید لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے اور اتنی ہی مالیت کی قیمتی اشیا مل جاتی تھیں۔ ان کے لیے ساڑھے چار لاکھ خاصی بڑی رقم تھی۔ یہ انہیں دو تین مہینے کے لیے واردات سے بے نیاز کر دیتی۔ سردار نے بیگ سینے سے لگائے لگائے واپس ڈرائیور کا رخ کیا۔ تھیلے والا اب عجلت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی باقیوں سے بھی چیزیں وصول کرنا شروع کر دیں۔ آگے جاتے جاتے یہ تھیلا بھی بھر گیا تھا۔ اگرچہ اس میں کام کی چیزیں کم تھیں۔ یعنی نقدی، سونا اور قیمتی چیزیں جیسے موبائل، گھڑیاں وغیرہ، کیونکہ ڈاکوؤں نے سب تھیلے میں ڈالنے کو کہا تھا اس لیے لوگوں نے ہر چیز دے دی تھی۔ سب سے زیادہ جگہ عورتوں کے پرسوں نے بھری تھی تقریباً ہر عورت کے پاس بیگ سائز کا پرس تھا۔

اب ان کے پاس تھیلے نہیں تھے اس لیے تھیلے والے ڈاکو نے ایک مسافر کا بڑا سا رومال لیا اور باقی سامان اس میں جمع کرنے لگا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈاکوؤں نے عنایت اللہ کے بیگ کے علاوہ بھی خاصا مال حاصل کر لیا تھا۔ جب تک مسافر لٹ رہے تھے، وہ خاموش اور سہمے ہوئے تھے مگر لٹنے کے بعد ان کا غصہ ابھرنے لگا تھا۔ وہ دھیمی آوازوں میں اس کا اظہار کر رہے تھے۔ جب یہ آوازیں ایک حد سے بلند ہونے لگیں تو فارغ ڈاکو دہاڑا۔ ''بک بک بند کرو..... ورنہ..... شکر کرو مال گیا کھال بچ گئی ہے۔''

اس کی دہاڑ سن کے سب کی سٹی ایک بار پھر گم ہوگئی۔ ..... پھر سردار نے حکم دیا کہ ساری عورتیں پیچھے چلی

جائیں۔ اس پر مسافروں نے احتجاج کیا۔ ''عورتیں کیوں پیچھے جائیں ..... ہم اپنی عورتوں کو پیچھے نہیں بھیجیں گے ..... تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

جواب میں ڈاکوؤں نے اپنی گنز تان لی تھیں۔ مسافروں کے پاس ان کا جواب نہیں تھا۔ مجبوراً تمام عورتیں اٹھ کر پیچھے چلی گئیں۔ اب عورتوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے دبے ہوئے احتجاج اور رونے دھونے سے ہوا تھا۔ اس پر مرد بھی شور کرنے لگے مگر ڈاکوؤں نے تمام عورتوں کی تلاشی لے کر ہی انہیں چھوڑا تھا۔ اس کے بعد مردوں کی باری آئی۔ ان کی تلاشی لی جاتی اور انہیں آگے بھیج دیا جاتا۔ ان کی خالی ہونے والی جگہوں کی بھی تلاشی لی جا رہی تھی کہ کسی نے سیٹوں یا ان کے نیچے کچھ چھپانہ دیا ہو۔ ڈاکو جیبوں والی جگہوں پر ہاتھ مار رہے تھے، پوری جسمانی تلاشی نہیں لے رہے تھے۔ پتا نہیں عورتوں کی انہوں نے کیسے تلاشی لی تھی۔ وہ جس طرح کے لوگ تھے ان سے بعید نہیں تھا کہ انہوں نے عورتوں کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ جب میری تلاشی لے لی گئی اور مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا۔

''تم لوگوں نے جو لینا تھا، وہ لے لیا ہے اب جاؤ۔''

''بکواس نہ کر۔'' سردار غرایا۔ ''ابھی سامان باقی ہے۔''

''ایسا نہ ہو تم لوگ سامان کے چکر میں ہاتھ آئے مال سے بھی جاؤ۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کندھ کوٹ زیادہ دور نہیں رہ گیا ہے اور وہاں پولیس چوکی ہے۔''

سردار کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ روپے ہاتھ آ گئے ہیں اور ڈیڑھ دو لاکھ کا دوسرا مال ہے اس لیے زیادہ کا لالچ نہیں کرنا چاہیے۔ مگر اسے سامان کا خیال بھی تھا۔ بہت سے لوگ سفر کے دوران اپنا روپیہ یا کوئی قیمتی چیز بڑے سامان میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ وہ آسانی سے تلاش نہ کیا جا سکے۔ اس طرح اگر ڈاکا پڑے تو یہ چیز ڈاکوؤں سے بچ جاتی کیونکہ وہ سارا سامان نہیں لے جا سکتے اور اتنا وقت بھی نہیں ہوتا ہے کہ سامان کی مکمل تلاشی لیں۔ وہ صرف اسی مال پر اکتفا کرتے ہیں جو مسافروں کے پاس سے مل جائے۔

سردار میری بات کے بعد سوچ رہا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے ڈرائیور سے بس روکنے کو کہا۔ ڈرائیور نے اسے سڑک کے کنارے کرتے ہوئے رفتار کم کر دی۔ فوراً ہی آگے جاتی جیپ کی رفتار کم ہوئی اور وہ بس سے پہلے رک گئی۔ بس اس کے تقریباً پیچھے رکی تھی۔ ڈاکوؤں نے لوٹ کا مال اٹھایا اور دروازے کے پاس جمع ہونے لگے۔ جیسے ہی بس رکی اور ڈرائیور نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ کھولا تو سردار نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ ''بس اس وقت تک یہیں رکے گی جب تک ہماری جیپ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی۔ اس سے پہلے بس حرکت میں آئی تو ہم واپس آ جائیں گے۔''

''اب کیا لینے آؤ گے؟'' ایک نوجوان نے ہمت کر کے پوچھا تو سردار غرایا۔

''تیری جان۔''

نوجوان واپس سیٹ پر دبک گیا۔ سردار کے باقی ساتھی اتر گئے تھے مگر وہ ابھی بس میں تھا۔ اس نے اترنے سے پہلے میری طرف دیکھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرے ہاتھ پر ایک ہاتھ آ گیا۔ یہ عنایت اللہ کا ہاتھ تھا اور اس کا ایسا انداز تھا جیسے وہ مجھے منع کر رہا ہو۔ میں نے سوچا اور پھر غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا اور سردار نیچے اتر گیا۔ اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے جیپ کی طرف چلے گئے جیسے ہی سردار نیچے اترا۔ میرے برابر میں بیٹھا ہوا عنایت اللہ حرکت میں آ گیا۔ اب میں نے اس کا بازو پکڑا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا تھا مگر عنایت اللہ نے اس سے پوچھے بغیر ہینڈل کھینچ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا کر رہے ہو ..... وہ ابھی دور نہیں گئے ہیں۔''

عنایت اللہ نے اس کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''خاموش بیٹھے رہو۔''

میں دم بہ خود سا بیٹھا ہوا تھا۔ عنایت اللہ نیچے اتر گیا تھا۔ ڈاکوؤں کی جیپ روانہ ہونے والی تھی۔ پھر وہ حرکت میں آئی لیکن شاید بیس گز آگے گئی تھی کہ اچانک دھماکا ہوا اور جیپ سے شعلے نکلنے لگے۔ جیپ کے ساتھ میں بھی اچھل پڑا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے جیپ سے شعلے نکلتے دیکھ رہا تھا۔ جیپ کے دروازے اُڑ گئے تھے اور عقبی دروازے کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ مگر اس میں سوار افراد میں سے کسی کو نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بس میں موجود لوگ کچھ دیر کے لیے دنگ رہ گئے اور پھر انہوں نے شور مچانا شروع کیا تھا کہ عنایت اللہ واپس اندر آیا اور اس نے ہینڈل کھینچ کر دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ ''چلو اب رکے رہنے کی

ضرورت نہیں۔''

ڈرائیور ہوش میں آیا اور اس نے بس اسٹارٹ کر کے ذرا پیچھے کی اور پھر جلتی جیپ سے ممکن حد تک دور سے نکال کر اسے آگے لے گیا۔ عنایت اللہ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ بس سے اتر رہا تھا تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا اور واپس آتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ جیب میں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور تاثرات ایسے تھے کہ میں چاہنے کے باوجود اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے گرم ٹوپی اتار دی تھی اور ماتھے کے ہلکے سے پسینے سے لگ رہا تھا کہ وہ گرمی محسوس کر رہا ہے۔ تب میں نے پہلی بار اس کی کنپٹی پر زخم کا پرانا لیکن گہرا نشان دیکھا۔ جیپ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اندر دھماکے نے ڈاکوؤں کے پرخچے اُڑا دیے تھے اور ان کے بچ جانے والے جسم اب جل رہے تھے۔ کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی دھماکے میں بچ بھی گیا تھا تو اس شدید آگ سے کیسے بچتا؟

ہم کچھ آگے نکلے ہوں گے کہ جیپ میں موجود ایمونیشن آگ کی وجہ سے پھٹنے لگا اور گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس بار ڈرائیور نے تیزی دکھائی اور دس منٹ بعد ہم کندھ کوٹ کی پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ وہاں ڈرائیور اور مسافروں نے ڈاکے اور پھر ڈاکوؤں کی جیپ کے دھماکے سے تباہی کی رپورٹ کی تھی۔ پولیس نفری جائے وقوع کی طرف روانہ کر دی گئی تھی۔ یہاں پولیس زیادہ نہیں تھی اس لیے بڑے تھانے سے پولیس منگوائی گئی۔ آس پاس کی پولیس چوکیوں کو بھی خبردار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بس اور اس کے سارے مسافروں کو روک لیا گیا کہ بیان اور اپنے کوائف دیے بغیر وہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ کچھ فیملی کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور انہوں نے احتجاج کیا مگر یہ کارروائی بھی ضروری تھی۔ تمام مسافروں کو چوکی کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔

دوپہر کے بعد بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسافر بتا رہے تھے کہ ان کا کیا کیا گیا تھا۔ فیملی والوں کو پہلے فارغ کیا گیا۔ اس کے بعد اکیلے سفر کرنے والوں کی باری آئی۔ جب میری اور عنایت اللہ کی باری آئی تو ہم نے پرس، موبائل اور معمولی اشیا لوٹے جانے کی رپورٹ کرائی۔ عنایت اللہ نے اس بیگ کا ذکر نہیں کیا جس میں ساڑھے چار لاکھ روپے تھے۔ شام گئے مسافروں کو وہاں سے جانے کی اجازت ملی تھی۔ مگر اب مسافر کہاں جاتے ان کے پاس نہ سفر کے لیے کچھ تھا اور نہ رہائش کے لیے۔ یہ کام انتظامیہ کر رہی تھی۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ گھر نزدیک ہی تھا۔ میرا پولیس کا حوالہ کام کر گیا اور مجھے شام تک جانے کی اجازت مل گئی تھی بس عنایت اللہ کی وجہ سے رکا رہا۔ اس کی باری خاصی دیر میں آئی اور جب اسے اجازت ملی اور وہ چوکی سے باہر آیا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ مجھے منتظر پا کر وہ ٹھٹک گیا۔ ''تم گئے نہیں ابھی تک، تم تو یہیں رہتے ہو۔''

''تمہاری وجہ سے رکا ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت کہاں جاؤ گے، میرے ساتھ چلو۔''

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ایک شرط پر؟''

''میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔'' میں نے اس کے کہنے سے پہلے کہا۔ ''ہاں اگر تم خود بتانا چاہو تو تمہاری مرضی۔''

میں نے ایک رکشا کیا اور عنایت اللہ کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ میری آواز سن کر مول اتنی خوش ہوئی کہ اس نے پورا دروازہ کھول دیا اور پھر عنایت اللہ کو دیکھ کر جھجک کر جلدی سے دروازے کے پیچھے ہو گئی۔ مول اندر گئی تو میں عنایت اللہ کو مہمان خانے میں لے آیا۔ اسے وہاں چھوڑ کر اندر آیا۔ مول اور بابو سے ملا جو مجھ سے یوں چمٹا جیسے میرے جسم کا حصہ بن جانا چاہتا ہو۔ مول بھی خوش تھی۔ میں نے اسے عنایت اللہ کے بارے میں بتایا کہ وہ مہمان ہے اور اس ... کے لیے رات کے کھانے میں کچھ اچھا بنائے۔ میں بابو کے ساتھ واپس مہمان خانے میں آ گیا۔ عنایت اللہ نے بابو کو پیار کیا اور پھر اس نے اپنے موزے میں پنڈلی کے ساتھ لپٹے ہزار کے چند نوٹوں میں سے ایک نکال کر بابو کو دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم میرے مہمان ہو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ ہماری روایت ہے۔''

شام ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے مہمان خانے کے لیے ایک انگیٹھی جلائی اور جب وہ اچھی طرح سلگ گئی تو اسے اندر لے آیا۔ دروازے، کھڑکیاں بند کرنے سے مہمان خانہ گرم ہونے لگا۔ کچھ دیر میں مول نے کھانا تیار کر لیا۔ اس نے بکرے کا بھنا گوشت اور ساگ بنایا تھا۔ میں نے عنایت اللہ کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد میں اس کے لیے چائے بنوا کر لایا۔ مول بابو کو سلا رہی تھی۔ عنایت اللہ نے کھانے اور چائے کی دل کھول کر تعریف کی۔ ''شاہ سائیں تم خوش قسمت ہو جو ایسی بیوی ملی ہے۔''

"ہاں اللہ کا احسان ہے جو اس نے مجھ جیسے گناہ گار پر اتنی عنایت کی ہے۔"

"تمہارا بچہ بھی بہت پیارا ہے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"بابو میں میری جان ہے۔" میں نے کہا۔ "مومل میری بیوی ہے پر مجھے اس سے بھی اتنی محبت نہیں ہے جتنی کہ بابو سے ہے۔"

گفتگو کے دوران میں اچانک میرے موبائل کی بیل بجی اور میں نے موبائل نکالا تو عنایت اللہ چونک گیا۔ ایک جاننے والا کال کر رہا تھا۔ اس سے بات کر کے میں نے موبائل واپس رکھا تو عنایت اللہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"شاہ جی آدمی کے لیے دونوکریاں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک کہا مگر بعض اوقات آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔"

"پیسے سے؟"

"نہیں بیوی بچوں سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کی وجہ سے آدمی دوسروں کی بہت سی باتیں ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں بھی بہت مجبوری میں تھا۔ پر اب اللہ کا شکر ہے۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "کیوں سائیں اب مجبوری باقی نہیں رہی ہے؟"

"ہاں اب مجبوری باقی نہیں رہی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے میں تمہارا بھی شکر گزار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے چائے کا کپ ٹرے میں رکھا۔ "میں نے جو کیا، وہ اپنے لیے کیا۔"

"نہیں سائیں تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔" میں نے اصرار کیا۔ "ورنہ شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔"

"اگر میں نے کچھ کیا ہے تو اس کی وجہ تمہاری بیوی بچہ اور ان سے تمہاری محبت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں اٹھ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "ڈاکے میں تمہاری کوئی اہم چیز یا کاغذ تو نہیں گیا؟"

وہ مسکرایا۔ "درحقیقت میرا کچھ بھی نہیں گیا۔ گھڑی اور انگوٹھی نقلی تھی اور پرس میں کچھ نہیں تھا۔"

"موبائل؟"

"ڈمی تھا۔"

"اور چرمی بیگ؟"

شیخ سعدی

شیخ سعدیؒ صبح جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ ایک دن ان کے والد محترم کے علاوہ باقی کے تمام لوگ سو رہے تھے۔ شیخ سعدی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

"افسوس صبح کا وقت ہے اور عبادت کا وقت ہے مگر یہ سب لوگ مُردوں سے شرط لگا کر سو رہے ہیں۔"

آپ کے والد نے جواب دیا۔ "بیٹا دوسروں کے عیب نکالنے سے بہتر تھا کہ تم بھی سو رہے ہوتے۔"

اٹک سے عبدالغفور خان ساغری خٹک کا تحفہ

"اس کے بارے میں مت پوچھو۔" اس نے کہا۔

"اگر وہ اسے وہیں کھول لیتے؟"

"تب بھی انہیں اوپر نوٹوں کی گڈیاں ہی ملتیں مگر وہ سب جعلی نوٹ ہوتے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ پوری پلاننگ سے آیا تھا۔ میں اندر آیا تو مومل بے تابی سے میری منتظر تھی، وہ دو مہینے سے مجھ سے دور تھی۔ اس سے جدائی کی کسر پوری کرتے کرتے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا کہ صبح میری آنکھ مومل کے جھنجھوڑنے سے کھلی۔ اس نے شوخی سے کہا۔ "سائیں کتنا سوؤ گے۔ اپنا نہیں تو مہمان کا خیال کرو وہ بے چارہ بھوکا پیاسا ہوگا۔"

مگر جب میں مہمان خانے میں آیا تو عنایت اللہ وہاں نہیں تھا۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ وہ شاید صبح چہل قدمی کرنے نکلا ہو۔ حاجت کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ مہمان خانے کے ساتھ ہی باتھ روم تھا۔ اسے آس پاس دیکھ کر واپس آ رہا تھا کہ چھوٹے بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ "بھائی تمہارا مہمان صبح سویرے چلا گیا۔ مجھ سے ملا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم سے معذرت کر لوں، اسے اچانک جانا پڑ رہا ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ عنایت اللہ اچانک کیوں چلا گیا تھا، اسے ڈر تھا کہ میں پولیس والا بن کر انکوائری پر نہ اتر آؤں مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہر حال اس نے جو مناسب سمجھا، وہ کیا۔ میں نے مومل یا کسی کو نہیں بتایا تھا کہ آتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی کبھی نہیں بتایا تھا۔ دوپہر

کو میں گھر سے نکلا اور اپنے ایک واقف کار کو کال کی جو کندھ کوٹ تھانے میں تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے ڈاکے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ''شاہ سائیں اس میں منگی گروہ ملوث تھا۔ وہ سب جیپ میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے۔ خیال ہے کہ ان کی جیپ میں دھماکا خیز مادّہ تھا جو غلطی سے پھٹ گیا۔ ڈاکو منگی سمیت اس کے چھ ساتھی مارے گئے۔ سمجھ لو کہ پورا گروہ ختم ہو گیا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ منگی کے کُل چھ ہی ساتھی تھے جو اس کے ساتھ ڈاکوں میں حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ ان کا ایک ساتھی اور بھی تھا جو اُن کے لیے شکار تلاش کرتا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں چار دن کی چھٹی پر آیا تھا۔ ان چھٹیوں کا زیادہ وقت میں نے گھر میں گزارا تھا۔ اس دوران میں بس ڈاکے کا کیس پولیس نے تفتیش کی حد تک مکمل کر لیا تھا اور ڈاکوؤں کی جیپ کی تباہی کو حادثہ قرار دیا تھا۔ صرف دو افراد جانتے تھے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا ہوا واقعہ تھا۔ چار دن بعد میں واپس جا رہا تھا تو مومل اور بابو دونوں رو رہے تھے۔ میں نے اس بار سوچ لیا تھا اور میں نے مومل سے کہا۔ ''تو تیار رہ..... میں وہاں جاتے ہی کوئی مکان تلاش کرتا ہوں اور پھر تجھے اور بابو کو اپنے پاس بلا لوں گا۔''

مومل رونا دھونا بھول گئی۔ ''سچ کہہ رہا ہے نا؟''

''بالکل سچ، اب میں بھی تم لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ زیادہ نہیں ہفتہ پندرہ دن لگیں گے بس تم لوگ اپنی تیاری پوری رکھنا۔''

واپسی پر میں شکارپور اترا مگر جیکب آباد کے بجائے میں نے سکھر جانے والی بس پکڑی اور سکھر میں پولیس ہیڈ کوارٹر آیا۔ وہاں ڈی آئی جی انویسٹی گیشن کے دفتر میں میرا بچپن کا دوست عطا حسین کام کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ چائے اور سموسے منگوائے اور ہم گپ شپ کرتے رہے پھر بات منگی گروہ کی ہلاکت کی طرف مڑ گئی اور میں نے کہا۔ ''اس کے کارنامے بھی بہت زیادہ ہیں۔''

''کم سے کم تیس بندوں کا قتل اُن کے نام پر ہے۔'' عطا نے انکشاف کیا۔ ''صرف بندوں کے نہیں، یہ عزتوں کے بھی لٹیرے تھے۔ عورتوں کے اغوا اور زیادتی کے بھی درجن کیس ان کے نام پر ہیں۔ اتفاق سے آج ہی ڈی آئی جی نے فائل منگوائی تو میں نے دیکھا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔''

''فائل کہاں ہے؟''

''ابھی میرے پاس ہے۔'' اس نے میز کی دراز سے ایک موٹی فائل نکالی۔ ''ذرا کرتوت دیکھو ان کمینوں کے۔''

سچی بات ہے کہ میں خود اسی چکر میں آیا تھا مگر عطا نے بغیر کہے ہی فائل میرے سامنے رکھ دی تھی۔ میں فائل دیکھ رہا تھا کہ اسے صاحب نے کسی کام سے بلا لیا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے تیزی سے دو سال پہلے کا ایک کیس نکالا۔ ڈاکو منگی اور اس کے ساتھیوں نے کشمور سے آنے والی ایک گاڑی کو روکا تھا۔ گاڑی میں ایک جوڑا تھا۔ شوہر کا تعلق پولیس کے بم ڈسپوزل یونٹ سے تھا اور وہ ایس آئی تھا۔ اس کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی بیوی بہت حسین اور کمسن تھی۔ منگی کی رال ٹپک گئی۔ اس نے عورت کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ شوہر نے مزاحمت کی تو اس کے سر پر شدید ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ ڈاکو اس کی بیوی کو لے گئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ گاڑی لے کر نزدیکی پولیس چوکی پہنچا اور جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو پولیس فوری حرکت میں آ گئی۔

پولیس نے عورت کی بازیابی کے لیے منگی کے مشکوک ٹھکانوں پر چھاپے مارنا شروع کیے مگر منگی اور اس کے ساتھی نہیں ملے۔ البتہ عورت کی لاش ایک گاؤں کے نزدیک کھیت سے مل گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ کئی دن تک اجتماعی زیادتی کی گئی تھی اور اس کی موت اسی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم اور دوسری ضروری کارروائیوں کے بعد لاش شوہر کے حوالے کر دی گئی۔ وہ اسے لے کر چلا گیا تھا۔ ایف آئی آر منگی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف کاٹی گئی تھی مگر وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے حتیٰ کہ دستِ اجل نے انہیں آ لیا۔ سرکاری رپورٹ یہیں تک تھی۔ اس میں عورت اور اس کے شوہر کی تصویریں بھی تھیں۔ بیوی واقعی بہت حسین اور کمسن تھی۔ شوہر بھی کم نہیں تھا۔ دونوں کا جوڑا بہت اچھا تھا مگر شیطان صفت ڈاکوؤں نے انہیں برباد کر دیا۔

مجھے شوہر کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کتنی کوشش کی اور بہت محنت کر کے وہ بالآخر ان ڈاکوؤں تک پہنچ گیا جو اس کی بربادی اور اس کی بیوی کی موت کے ذمّے دار تھے۔ اس نے ان سے بدلہ لے لیا تھا مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ حالانکہ میں ان کا ساتھی تھا اور میں ہی ان کو شکار کے بارے میں بتاتا تھا۔ ایک بار پولیس آپریشن کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر منگی کے ہتھے چڑھ گیا تھا، اس نے اس

شرط پر میری جان بخشی کی تھی کہ میں اس کے لیے کام کروں گا۔ دوسری صورت میں وہ میری بیوی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو نہیں چھوڑے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً میں اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اگرچہ دل میں اس سے اور اس کے آدمیوں سے نفرت کرتا تھا۔ ان کی موت پر عنایت اللہ کے بعد اگر کوئی فرد خوش ہوسکتا تھا تو، وہ میں تھا۔

عنایت اللہ نے اپنا نام غلط بتایا تھا، اس کا اصل نام اشفاق خان تھا۔ برادری کے بارے میں بھی غلط بتایا تھا۔ البتہ وہ سکھر کا ہی رہنے والا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ سب کیسے کیا۔ یقیناً وہ میری مدد سے منگی تک پہنچا تھا کیونکہ میں نے اس کا بیگ تاڑ کر اس کو اطلاع دی تھی۔ اس نے راستے میں میسج کر کے مجھ سے کنفرم کیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اشفاق بے خبر ہے مگر اسے سب معلوم تھا۔ میں اس کے ہاتھوں استعمال ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں اپنی موت کا سامان خود لیے جا رہا تھا۔ اگر اشفاق عین موقع پر نہ روک لیتا تو اس وقت میری بھی جلی ہوئی ادھوری لاش کہیں پڑی ہوتی۔ اپنے طور پر میں نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور تھیلے میں ڈمی پرس اور موبائل ڈالا تھا۔ وہ جانتا تھا اور میں اس وقت تک بے خبر رہا تھا جب تک اس نے بس سے اتر کر بیگ میں موجود بم کا ریموٹ استعمال نہیں کیا۔ بم لازمی ریموٹ سے اُڑنے والا تھا۔ اس کے بغیر وہ بیکار رہتا۔ وہ بم ڈسپوزل میں تھا جہاں بموں کو ناکارہ بنایا جاتا ہے مگر ساتھ ہی وہ بم بنانا بھی جانتے ہیں۔ بم اشفاق نے خود بنایا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ بس سے نیچے کیوں گیا تھا۔ عام طور سے منگی اور اس کے ساتھی مجھے بہ ظاہر یرغمال بنا کر لے جاتے تھے۔ اس طرح میں پولیس کا سامنا کرنے سے بچ جاتا تھا۔ میرے بارے میں کسی کو علم نہیں ہوتا تھا اور اگر اتفاق سے بس میں کوئی واقف کار نکل آئے تو میں پھر رک جاتا تھا۔ یہ منگی نے مجھ پر چھوڑا ہوا تھا وہ جانے سے پہلے اسی طرح آنکھوں میں مجھ سے پوچھتا تھا اور میں اسے جواب دیتا تھا۔ شاید اشفاق نے مجھے اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ میں اس کی بیوی کی موت کا براہِ راست ذمے دار نہیں تھا۔ یا پھر اس نے میرے بیوی بچے کی وجہ سے مجھے بخش دیا تھا جیسا کہ اس نے مجھ سے مہمان خانے میں کہا تھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، آج میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش اور مطمئن ہوں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝

جو پیدا ہوا ہے، اسے لوٹ کر اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے۔ آج کوئی اور، تو کل ہماری باری ہے۔ ادارے سے اپنا قلمی کیریئر شروع کرنے اور مسلسل وابستہ رہنے والے ہونہار، نوجوان، باشرع، پیروں سے معذور مگر عزم و حوصلے کے پیکر اور صاحب طرز کہانی نگار، کاشف زبیر کئی ہفتوں تک علالت سے نبرد آزما رہنے کے بعد 22 فروری کی سہ پہر خالقِ حقیقی سے جاملے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

ادارہ اور اس کے جملہ اراکین مرحوم کے پسماندگان کے اس صدمے اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں کہ رب العزت انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

حد طلب

کاشف زبیر

جب ایک کے بعد دوسرے جہاز نے بھی آگ پکڑلی تھی تو طیارے کو مزید کیسے اڑایا جاسکتا تھا اور پھر وہ کسی قریبی رن وے پر کریش لینڈنگ کی کوشش کرتے ہوئے طیارہ حادثہ کا شکار ہوگیا۔ الاسکا کے اس برف پوش پہاڑی علاقہ میں اندھیری رات میں کسی بھی قسم کی امداد کی توقع اور زندہ رہنے کی امید بس ایک معجزے کی شکل میں ہوسکتی تھی۔

کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

الاسکا رقبے کے لحاظ سے امریکا کی سب سے بڑی ریاست ہے لیکن یہ ریاست ہوائی کی طرح امریکا کی سرحد سے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا زمینی جغرافیہ کینیڈا اور قطب شمالی سے جڑا ہے لیکن قطب شمالی کوئی زمین نہیں ہے بلکہ منجمد سمندر ہے جس پر برف کی ایک بے حد موٹی تہ ہمہ وقت تیرتی رہتی ہے۔ برف کی یہ تہ بعض مقامات پر حیرت انگیز حد تک موٹائی رکھتی ہے۔ یوں عملاً امریکا کی ریاست تین اطراف سے سمندر سے گھری ہے۔ اس کے ساحل کا رقبہ امریکا کے مشرقی ساحل کی طوالت کے برابر ہے۔ اس ریاست کی کل آبادی محض پانچ ملین (یعنی پچاس لاکھ) ہے لیکن گرمیوں میں سیاحوں کی آمد سے آبادی میں ایک سے دو ملین افراد کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

قطب شمالی سے جڑے ہونے کی وجہ سے الاسکا کا موسم بے حد سرد اور مرطوب ہے مگر اندرونی کینیڈا کے علاقوں کی نسبت یہ کہیں زیادہ سرسبز اور شاداب خطہ ہے۔ اس کا ستر فی صد رقبہ گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ ان جنگلوں میں ایک عجیب قسم کا جنگل بھی پایا جاتا ہے جس کی ظاہری شکل وصورت خط استوا کے برساتی جنگلات سے مشابہ ہے۔ بے حد

ہریالی اور نمی کی وجہ سے ان جنگلوں میں ہمہ وقت بوندا باندی جاری رہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ استواری جنگلات کے مقابلے میں یہاں بے پناہ سردی ہوتی ہے۔ ان جنگلوں میں ریچھ، بارہ سنگھے اور بھیڑیے عام ملتے ہیں۔ خاص طور سے الاسکا کا سرخ ریچھ ایسا جانور ہے جو دنیا میں کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ نو سے گیارہ فٹ تک اونچے اس سبزی خور اور مچھلی خور حیوان کا وزن بارہ سو پونڈ تک چلا جاتا ہے۔ یہ پنجوں والا دنیا کا سب سے بڑا حیوان ہے۔ وزن میں صرف برفانی ریچھ اس کا مقابلہ کرسکتا ہے لیکن یہ خوں خواری میں برفانی ریچھ سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

الاسکا میں فطری ماحول کسی حد تک برقرار ہونے کی وجہ سے یہاں پر جانوروں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں جن کے شکار کے لیے دنیا بھر کے شکاری الاسکا کا رخ کرتے ہیں۔ الاسکا میں لاتعداد دریا، ندیاں اور جھیلیں ہیں۔ ان میں دنیا کی لذیذ ترین ٹراوٹ مچھلیاں پائی جاتی ہیں، جن کے شکاری گھنٹوں پانی کے کنارے بنسیاں ڈال کر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بارہ سنگھے اور دوسرے جانوروں کے شکاری بھی آتے ہیں شکار کا شمار الاسکا کی بڑی صنعتوں میں ہوتا ہے اور سیاحت کے ذریعے بھی یہاں خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں بے شمار معدنیات موجود ہیں جن میں سرفہرست پیٹرولیم اور قدرتی گیس کے بے پناہ ذخائر ہیں دیگر متعدد معدنیات اور دھاتیں اس کے علاوہ ہیں۔ الاسکا کے جنگلات امریکا کا اثاثہ ہیں مگر چالاک امریکی حکومت نے اپنے دیگر معدنیاتی اور قدرتی اثاثہ جات کی طرح انہیں بھی محفوظ رکھا ہے۔ ایک طرف کینیڈا کے جنگلات امریکا کی ضرورت کے لیے بے دریغ کاٹے جا رہے ہیں تو دوسری طرف الاسکا کے جنگلات کو محفوظ رکھا جاتا ہے بلکہ ان میں اضافے کے لیے کوشش کی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے الاسکا کا محض پانچ فی صد رقبہ انسانی استعمال میں ہے اور مقامی حکومت لوگوں کو نئی زمینیں آباد کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

الاسکا میں آلودگی پھیلانے والی صنعتوں کی اجازت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ الاسکا میں افرادی قوت کا ستر فی صد سے زیادہ سروسز سے منسلک ہے۔ صرف بارہ فی صد افراد صنعتوں سے وابستہ ہیں۔ اس وسیع و عریض رقبے والی ریاست کے باشندوں کا محض پانچ فی صد حصہ زراعت کا کام کرتا ہے۔ بے انتہا وسعتوں اور ناہموار زمین کی وجہ سے زراعت محدود ہے اور یہاں پیدا ہونے والی اشیا زیادہ تر یہیں استعمال ہوتی ہیں، کیونکہ ان کی برآمدات مہنگی پڑتی ہیں۔ چاروں طرف سمندر ہونے کی وجہ سے ماہی گیری بھی خاصی ہوتی ہے لیکن زیادہ تر ماہی گیری امریکا کی دوسری ریاستوں سے آنے والے ماہی گیر کرتے ہیں۔ مقامی ماہی گیروں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔

ایک دلچسپ حقیقت جس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ آج سے کوئی سوا صدی پہلے الاسکا کا خطہ سوویت یونین یعنی اس زمانے کی روسی سلطنت کا حصہ تھا لیکن اس خطے پر کوئی خاص روسی آبادی نہیں تھی۔ چند سرکاری اہل کاروں کے علاوہ یہاں پر اس وقت مقامی قبائل آباد تھے اور ان کی خاصی تعداد تھی پھر روسی حکومت نے الاسکا کو ایک بے کار خطہ جانتے ہوئے 1877 میں اسے امریکی حکومت کے ہاتھ فروخت کردیا۔ جی ہاں ستّر برس تک ایک دوسرے کے جانی دشمن رہنے والی ان حکومتوں کے مابین ایک زمانے میں زمین کی خرید و فروخت کا یہ معاملہ بھی طے پایا تھا اور آپ جانتے ہیں اس رقبے کے عوض امریکی حکومت نے روسی حکومت کو کتنی رقم ادا کی تھی؟ صرف پچھتر لاکھ امریکی ڈالرز..... جی ہاں صرف اتنی سی رقم کے عوض امریکا تقریباً تین لاکھ مربع میل کے علاقے پر پھیلی اس ریاست، اس کے تمام وسائل اور اس پر آباد تقریباً تین لاکھ انسانوں کا مالک بن گیا تھا۔ شاید ہی تاریخ میں کسی طاقتور سلطنت نے ایسی فاش غلطی کی ہو جو روس نے امریکا کو الاسکا کو فروخت کرکے کی تھی۔ ایسا ہی ایک سودا تقریباً اسی زمانے میں انگریزوں نے ڈوگرہ راجا سے کیا تھا اور کیا اتفاق ہے کشمیر کی قیمت بھی اتنی لگی تھی جتنی کہ الاسکا کی یعنی پچھتر لاکھ نانک شاہی سکے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ الاسکا کی فروخت نے اس کی تقدیر بدل دی آج یہ ترقی یافتہ امریکا کی ایک خوب صورت ریاست ہے اور کشمیر جیسے چوروں نے قزاقوں کے ہاتھ فروخت کیا تھا، اس کے ساتھ ڈوگرہ راج نے قزاقوں سے بھی بدتر سلوک کیا تھا۔

الاسکا کی بے انتہا وسعتوں اور بے حد کم آبادی کی وجہ سے یہاں پر سفر کے زمینی ذرائع بے شک ترقی یافتہ ہیں۔ الاسکا کے پورے خطے میں سڑکوں اور ہائی ویز کا جال بچھا ہوا ہے لیکن لوگ سفر کے لیے زیادہ تر ہوائی ذریعے پر انحصار کرتے ہیں، کم وقت میں اور سہولت سے سفر کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے کیونکہ اونچے نیچے پہاڑوں، وادیوں اور جنگلوں میں بل کھاتی سڑکوں پر سفر کرنا بے حد پُرلطف تو ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ سفر بہت زیادہ وقت بھی لیتا

ہے۔ الاسکا کے جنوب مغربی شہر سینٹ ماریز سے ایک پرواز 29 جنوری 1997 کی رات گیارہ بجے سے ذرا پہلے روانہ ہوئی۔ دو انجنوں والے اس مسافر بردار طیارے میں اس طیارے کی ایئر لائن الاسکا ساؤتھ سینٹرل ائر کا چالیس سالہ مالک جم لینسن، جو اس طیارے کا پائلٹ تھا اور اس کے ساتھ اس کا کو پائلٹ چونتیس سالہ اسٹیو والٹر تھا۔ اچانک انہوں نے سنا کہ ان کے ہیولیسٹڑ کارابو طیارے کے ایک انجن نے چیخنا شروع کر دیا! اس سے شعلے نکل رہے تھے۔

یہ ہنگامی صورتِ حال تھی لیکن لینسن نے گھبرائے بغیر اپنے نائب سے کہا ''بہتر ہوگا اس انجن کو بند کر دو۔''

اس وقت وہ طیارے کو بار برداری کے لیے استعمال کر رہے تھے اور انہیں ایک ڈھائی ٹن وزنی ایئر کمپریسر الاسکا کے ایک جنوب مشرقی شہر کینائی تک پہنچانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس طیارے میں صرف یہی لوگ سوار تھے۔ ابھی والٹر نے طیارے کا دایاں انجن بند کر کے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ طیارے کو اڑانے والے واحد انجن نے بھی شعلے اگلنا شروع کر دیے۔ اس بار صورت حال واقعی سنگین تھی۔ لینسن نے ایئر ٹریفک کنٹرولر سے رابطہ کیا اور اسے صورتِ حال بتاتے ہوئے اس سے اپنے راستے میں آنے والے نزدیک ترین شہر اسپاری دون کے رن وے پر اترنے کی اجازت مانگی۔ اے ٹی ایف نے انہیں اجازت دی اور ساتھ ہی پوچھا۔

''کیا تم لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے؟''

''لازمی طور پر۔'' لینسن نے صورتِ حال دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں لگ رہا کہ ہم اسپاری دون تک بھی پہنچ سکیں گے۔'' انکوریج ایئر ٹریفک کنٹرول سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے لینسن کا اندرونی وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ نارمل انداز سے اپنے طیارے کو لینڈ نہیں کر سکیں گے۔

وہ گزشتہ بیس سال سے طیارے اڑا رہا تھا۔ یہ کمپنی اس نے بڑی محنت کے بعد قائم کی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب وہ تقریباً ناکارہ طیاروں پر فی گھنٹا معاوضے پر کام کرتا تھا۔ بے حد سخت دن تھے۔ پیسے جمع کر کے اپنا ذاتی طیارہ خریدنے کی دھن میں اس نے بعض اوقات فاقے بھی کیے تھے اور بالآخر وہ الاسکا ساؤتھ سینٹرل ایئر قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

آج اس کے پاس تین طیارے تھے جن پر وہ خود بھی پرواز کرتا تھا۔ عام طور پر سیزن میں ان کے پاس اتنا کام ہوتا تھا کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اپریل سے ستمبر تک کا عرصہ سیزن کا ہوتا ہے۔ جنوبی الاسکا ویسے بھی سیاحت کے نقطۂ نظر سے بہترین جگہ ہے۔ آج لینسن ایک خوش حال اور مطمئن زندگی گزار رہا تھا اس نے جو چاہا تھا حاصل کر لیا تھا۔

اسپاری دون ان کے روٹ سے دائیں جانب تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت طیارے کے انجنوں میں آگ لگی وہ اسپاری دون کے نزدیک پہنچ چکے تھے، مسئلہ یہ تھا کہ یہ سارا علاقہ بے حد اونچے پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ جہاں ہموار زمین نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسپاری دون کی واحد ائر فیلڈ ایک ترچھی ڈھلان پر اس طرح واقع تھی کہ اس کا آخری سرا ایک گہری کھائی تک چلا جاتا تھا۔ رن وے پر صرف دو روشنیاں تھیں جو رن وے کے آغاز کی نشاندہی کرتی تھیں۔

عملاً یہ رن وے صرف دن میں استعمال کیا جا سکتا تھا وہ بھی چھوٹے طیاروں کے لیے جو ہلکے ہونے کی وجہ سے فوری بریک لگا سکتے تھے۔ بھاری طیاروں کے لیے یہ رن وے دشوار تھا۔ کارابو بھاری طیارہ تھا، اور اس پر اضافی وزن بھی تھا اس لیے اس رن وے پر اسے اتارنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

جم لینسن اور اسٹیو والٹر اپنے واحد انجن کے سہارے اسپاری دون تک آ پہنچے تھے لیکن اس وقت پورے علاقے پر اندھیرا مسلط تھا۔ آسمان تاریک تھا نیچے اسپاری دون کا قصبہ پہاڑ کی ڈھلان پر خوابیدہ تھا۔ اس علاقے میں بہترین جنگلات اور شکار کے وسیع مواقعوں کی وجہ سے سیاح اور شکاری سیزن میں جوق در جوق یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ چھوٹا سا رن وے تعمیر کیا گیا تھا۔

''ہم ساڑھے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں اور نیچے آ رہے ہیں۔'' لینسن نے ایئر ٹریفک کنٹرول کو آگاہ کیا۔ ''ہمیں رن وے کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔''

''گڈ...... کوشش کرو کہ طیارے کو عین روشنیوں کے اوپر لینڈ کرو اور پھر پورے طور سے بریک لگانا۔'' ایئر ٹریفک کنٹرولر نے انہیں مشورہ دیا۔

لینسن اور والٹر جانتے تھے بہ صورت دیگر کیا ہوگا۔ یہ کہ وہ کئی ہزار فٹ گہری کھائی میں جا گریں گے۔ طیارے کا انجن شعلے اگل رہا تھا لیکن ساتھ ہی کام بھی کر رہا تھا۔ اسے بند کرنے کا وہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بے شک کارابو سلائیڈ کر سکتا تھا لیکن انجن بند ہونے کی صورت میں طیارہ الاسکا کے پہاڑوں میں چلنے والی تیز ہوا کی وجہ سے اپنا راستہ بھٹک سکتا تھا، وہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک آ چکے تھے اور اسپاری دون کا رن وے ان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اچانک سامنے کے رخ سے تقریباً پچاس ناٹ فی گھنٹے کی

رفتار سے چلنے والی تند ہوا طیارے سے ٹکرائی اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ طیارہ تیزی سے نیچے جانے لگا اور اسے سنبھالنے کی کوشش میں رن وے گزر گیا اور اس سے آگے اندھیرا تھا۔ طیارے کی کھڑکی کے باہر تاریکی مسلط تھی، لینسن کو جو آخری چیز یاد تھی وہ یہ کہ وہ طیارے کو بلند کرنے کی جدوجہد کررہا تھا تاکہ وہ کسی پہاڑی سے نہ ٹکرا جائے۔

یہ نصف شب کا وقت تھا جب فورٹ رچرڈسن آرمی بیس ڈینلائی میں واقع ریسکیو کوآرڈینیشن سینٹر میں ہنگامی حالات کا سائرن بجنے لگا۔ وہاں پر موجود آپریشن انچارج اپنے عملے پر چیخ چلا رہا تھا اور بیس پر ایک بھاگ دوڑ کا سماں تھا۔ الاسکا میں یہ امریکا کا سب سے بڑا فوجی اڈا ہے کم از کم معلوم فوجی اڈوں میں یہ سب سے بڑا ہے ورنہ بعض روایات کے مطابق الاسکا میں امریکا کے میزائل سسٹم کا ستر فی صد حصہ ہے یہاں پر اس کے نیوکلیئر بلاسٹک میزائلوں کا نوے فی صد ذخیرہ ہے، کیونکہ الاسکا کی سرحد سے محض بائیس میل کی دوری پر رشین فیڈریشن ہے اور اس کے سائبیریا اور آرکٹک اوشن کے علاقے میں اس کی تمام فوجی قوت جمع ہے۔ الاسکا سے چین اور یورپ کے ممالک کا فاصلہ بھی کم ہے۔

اس آرمی بیس کا ایک حصہ امدادی مشنز کے لیے مختص تھا۔ جیسے ہی اطلاع آئی کہ ایک طیارہ اسپاری دون کے نزدیک کہیں کریش ہوگیا ہے فوری طور پر ایک امدادی مشن ترتیب دیا جانے لگا۔ جلد ہی ایک ایچ ایچ 60 ہیلی کاپٹر امدادی عملے سمیت پرواز کرگیا۔ اس کی رہنمائی کے لیے ایک سی ون تھرٹی ہرکولیس طیارہ پہلے ہی روانہ ہوچکا تھا لیکن برفانی دھند اور محدود حدِ نگاہ کے باعث ہیلی کاپٹر پرواز کے پندرہ منٹ بعد ہی واپس آنے پر مجبور ہوگیا۔ اب امدادی مشن مکمل طور پر ہرکولیس اور اس پر سوار تین امدادی افراد پر انحصار کررہا تھا۔ ان میں ٹیم لیڈر سینئر ماسٹر سارجنٹ مائیک ڈرمونڈ تھا۔ پینتیس سالہ مائیک اپنے شعبے کا بے حد تجربے کار شخص تھا۔ ٹیکنیکل سارجنٹ تیس سالہ جان پاف اور انتیس سالہ اسٹاف سارجنٹ جان موس اس کے ساتھ تھے۔

طیارہ حادثے کے مقام کی طرف پرواز کررہا تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ درست جگہ پہنچ بھی پاتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر درست مقام پر پہنچ بھی جاتے ہیں تو کیا وہ اس موسم اور گھپ اندھیرے میں امدادی مشن انجام دے سکیں گے یا نہیں۔ کسی ہیلی کاپٹر کے مقابلے میں طیارہ خراب ترین موسم میں بھی پرواز کی کہیں بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔ سی ون تھرٹی ہرکولیس ویسے بھی ہر موسم میں دن رات اڑنے کے لیے مثالی طیارہ ہے۔ آج سے نصف صدی قبل سروس میں آنے والے اس طیارے نے طویل ترین خدمت کا ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ خاص طور سے باربرداری اور فوجی امداد کے لیے بنایا جانے والا یہ ٹربو پراپ طیارہ جلد امدادی کاموں کے لیے استعمال ہونے لگا اور آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کا متبادل وجود میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دو درجن ممالک کی ایئرفورس اس طیارے کو فرنٹ لائن باربردار کے طور پر استعمال کررہی ہیں جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔

بہتر صلاحیتِ پرواز کے باوجود کسی بھی طیارے کے لیے زمینی امدادی مشن انجام دینا خاصا دشوار کام ہوتا ہے جو کہ ایک ہیلی کاپٹر آسانی سے انجام دے سکتا ہے۔ دشوار گزار اور ناہموار پہاڑی مقامات پر ایک ہیلی کاپٹر ہی درست طریقے سے امدادی مشن انجام دے سکتا ہے خاص طور سے جب زخمیوں کو فوری طور پر اسپتال منتقل کرنے کی ضرورت ہو۔

فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث ہرکولیس کو بتائی ہوئی جگہ پہنچنے میں خاصا وقت لگا اور جب رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے تو طیارہ اسپاری دون کے اوپر تھا۔ ریڈار اور دیگر آلات کے ساتھ یہ طیارہ دشوار ترین علاقے میں بہترین پرواز کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مطلوبہ مقام تک پہنچ کر طیارہ چار ہزار فٹ کی بلندی پر چکر لگانے لگا مگر مکمل تاریکی کی وجہ سے نیچے کچھ دیکھنا ناممکن تھا سوائے نائٹ ویژن گاگلز کے...... اس لیے طیارے کے لوڈ ماسٹر کرک وائٹ ہارٹ نے ایک فلیئر نیچے گرایا۔ بے حد تیز روشنی کے ساتھ جلنے والا یہ فلیئر پیراشوٹ کے سہارے ہوا میں معلق ہوجاتا ہے اور اس کی تیز روشنی میں نصف مربع میل کا علاقہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حالیہ عراق پر امریکی حملے کے دوران بغداد اور دوسرے شہروں پر رات کے وقت بمباری کے دوران اسی قسم کے فلیئر روشنی کے لیے فائر کیے جاتے تھے جو ماحول کو اس قدر روشن کردیتے کہ بمباری کرنے والے پائلٹوں کو زمین پر بھاگتا بلی کا بچہ بھی صاف نظر آتا تھا۔ (افسوس کہ ان امریکی پائلٹوں کو پھر بھی عام آبادی اور فوجی تنصیبات کا واضح فرق نظر نہیں آتا تھا) اسی قسم کا ایک لائٹ فلیئر ہرکولیس سے چلایا گیا جس نے نیچے ماحول کو اتنا روشن کردیا کہ طیارے کے کوپائلٹ کیپٹن پیٹر کائنز نے چند ہی لمحے میں گر جانے والے طیارے کو دریافت کرلیا تھا۔ طیارہ ایک مختصر سے پہاڑی کنارے پر اس طرح پڑا تھا کہ

اس کی دم ہوا میں معلق تھی۔ ڈرمونڈ نے نیچے دیکھا اسے طیارے کی پوزیشن بے حد خطرناک لگی تھی۔

اس وقت تک طیارہ کریش ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ جنوری میں اس علاقے کا... درجۂ حرارت مستقل منفی رہتا ہے اور خاص طور سے راتیں تو حد سے زیادہ سرد ہوجاتی ہیں۔ منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ معمول کی بات ہوتی ہے۔ اس قیامت کی سردی میں دو گھنٹے کھلے آسمان تلے گزارنا ناممکن ہی تھا۔ یہاں فوراً سردی لگ جاتی تھی جسے ''ہائپوتھرمیا'' کہتے ہیں۔ اس کا شکار جسمانی درجۂ حرارت کھو کر رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ ڈرمونڈ نے سوچا۔ اس موسم میں اور پچاس میل گھنٹے کی رفتار سے چلتی یخ بستہ ہوا میں چھلانگ لگانے اور پھر چٹانوں تک پہنچ کر کارابو تک رسائی حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ دو انسان ان کی نظروں کے سامنے امداد کا انتظار کر رہے تھے ممکنہ طور پر وہ زندہ تھے مگر امدادی مشن ان کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اب وہ نیچے طیارے میں موجود انسانوں کے لیے دعا ہی کرسکتے تھے۔

☆☆☆

ہوش میں آتے ہوئے لینسن کو جو پہلا احساس ہوا وہ بے پناہ سردی کا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی یخ بستہ سمندر میں اتر گیا ہو اور برفیلا پانی اس کے جسم کو سن کر رہا ہو۔ اس نے بروقت آنکھیں کھولیں۔ وہ تاریک کاک پٹ میں پڑا تھا اور کاک پٹ کے ٹوٹ جانے والے حصوں سے فراٹے بھرتی ہوا اندر آرہی تھی۔ اس سرد ہوا نے کیبن کے درجۂ حرارت کو نقطۂ انجماد سے کئی درجے نیچے پہنچا دیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ بارہ بج کر تنتالیس منٹ ہوئے تھے گویا وہ پون گھنٹے سے بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے اپنے پاس ہی سیٹ پر پڑے والٹر کی طرف دیکھا ہلکی سی روشنی میں اس کا ہیولہ بالکل ساکت تھا۔

لینسن نے اپنی نشست سے ذرا اٹھتے ہوئے بہ دقت خود کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کیا۔ اس نے ذرا جھک کر والٹر کو چھوا، اس کا ہاتھ اگرچہ پہلے ہی سرد ہو رہا تھا لیکن والٹر کے ہاتھ نے جیسے اسے منجمد کردیا تھا وہ حد سے زیادہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ لینسن نے ہمت کی اور ایک بار پھر والٹر کی کلائی تھامی وہ اس کی نبض محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہاں کسی قسم کی حرکت نہیں تھی اس نے دوبارہ کوشش کی۔ پھر کوشش کی اور پھر اس نے جان لیا کہ اس کا ساتھی مر چکا تھا۔ اس کی ناک اور کان سے خون نکل کر منجمد ہوگیا تھا۔ شاید اس کے سر پر چوٹ آئی تھی جس نے اس کی جان لے لی تھی۔

والٹر سے مایوس ہوکر لینسن نے ریڈیو دیکھا وہ اس سے ایک فکسڈ سگنل بھیجنا چاہتا تھا تاکہ امدادی مشن پر آنے والے طیارے یا ہیلی کاپٹر اسے تلاش کرسکیں۔ اس نے کوشش کی مگر حادثے میں ریڈیو مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا اور اس سے کسی قسم کا سگنل بھیجنا ممکن نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال مایوسی میں اضافہ ہی کررہی تھی۔

''مجھے اس لعنتی ہوا سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں سے نکلنا چاہیے۔'' اس نے سوچا۔

اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کا جسم کہاں کہاں سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہے۔ مگر پورے جسم میں کچھ اس طرح درد ہو رہا تھا کہ کسی ایک جگہ کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کا ذہن اب پوری طرح کام کرنے لگا تھا اور کسی حد تک جسم بھی حرکت کر رہا تھا۔ ونڈ شیلڈ اور کاک پٹ کے دوسرے حصوں سے آتی یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے اس نے طیارے کے عقبی کارگو والے حصے کی طرف جانے کا سوچا۔ اسے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کریش ہونے سے طیارے کے عقبی حصے کا کیا حشر ہوا ہے مگر ایک امید دل میں لیے وہ عقبی حصے کی طرف رینگنے لگا جب اس کے پورے جسم نے حرکت کی تو اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کی بائیں ٹانگ اور بائیں شانے کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے اور ان کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا دایاں پاؤں ٹخنے اور پنڈلی سے دکھ رہا تھا۔ درد دبانے کے لیے وہ دانت پیتا پیچھے کی طرف رینگتا رہا حتیٰ کہ اس حصے تک جا پہنچا جہاں اس کے اور والٹر کے اوورکوٹ رکھے تھے۔ اس نے اپنا اوورکوٹ پہن لیا اور پھر انجن کو ڈھانکنے والے کورز اوڑھ کر لیٹ گیا وہ جانتا تھا اسے ابھی طویل انتظار کرنا ہے۔ طاقتور ہوا کے تھپیڑوں نے اس کے طیارے کو کسی اجنبی جگہ لا پھینکا تھا۔ اسے تلاش کرنے اور اس تک مدد پہنچانے میں امداد کے لیے آنے والوں کو کئی گھنٹے لگ سکتے تھے۔ اوورکوٹ پہن کر کورز اوڑھنے اور سب سے بڑھ کر باہر سے آتی قیامت خیز سرد ہوا سے محفوظ ہوکر اس کے جسم میں کسی قدر حرارت آئی تھی مگر یہ حرارت زیادہ دیر اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس وقت درجۂ حرارت منفی پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ تھا اور یہ سردی اس کے جسم کی ساری حرارت رفتہ رفتہ چوس جائے گی اور وہ ہائپوتھرمیا کا شکار ہوکر رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں جا سوئے گا۔

وہ ذرا سکون سے بیٹھا تو والٹر کا خیال اس کے دل میں

کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ بانکا سجیلا والٹر گذشتہ کئی سالوں سے اس کے ساتھ تھا۔ اس حادثے میں والٹر ہی کیوں مارا گیا۔ وہ کیسے بچ گیا وہ زخمی تھا لیکن کوئی بھی زخم سنگین نوعیت کا نہیں لگ رہا تھا اپنے زخموں کے بارے میں سوچتے سوچتے خیالوں کا رخ ایک بار پھر والٹر کی طرف مڑ گیا تھا۔ جب والٹر اس کے پاس ساؤتھ سینٹرل ایئر بیس آیا تو وہ اٹھارہ سو گھنٹے کی پرواز کا شاندار تجربہ رکھتا تھا۔ خاص طور سے وہ چھوٹے طیارے خراب حالات میں بھی اڑانے کا ماہر تھا۔ اسے طیارے کی مشینری پر مکمل عبور حاصل تھا۔ گذشتہ کچھ عرصے سے والٹر اور اس کی بیوی سمندر کے پار ایک طویل پرواز کا پروگرام بنا رہے تھے ان کا مقصد غیر ممالک میں کام کرنے والے مشنریز کے لیے فنڈز جمع کرنا تھا۔ اب وہ بے چاری کبھی اس پرواز پر نہیں جاسکے گی۔ مسز والٹر بھی اچھی پائلٹ تھی۔ کئی بار وہ ساؤتھ سینٹرل ایئر کی پرواز پر والٹر کے ساتھ رہی تھی۔

والٹر اور اس کی بیوی کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کو اپنی بیوی سوزن کا خیال آیا جو بے تابی سے گھر پر اس کا انتظار کررہی ہوگی۔ وہ جب بھی رات کی پرواز پر جاتا تھا سوزن اس کے لیے بے حد فکر مند رہا کرتی تھی۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی کہ کوئی وفا شعار بیوی اپنی شوہر سے کرسکتی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سوزن کو اس کے طیارے کے حادثے کی اطلاع ملی ہے یا نہیں اور ملی ہے تو وہ کس حال میں ہے۔ لینسن نے تصور میں اسے نم آنکھوں کے ساتھ فون کے پاس کسی اچھی خبر کے انتظار میں بیٹھے دیکھا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ لینسن ہر تھوڑی دیر بعد اپنی گھڑی دیکھتا تھا۔ رات دو بجے کے قریب اسے کسی طیارے کی آواز سنائی دی۔ اس کے تجربے کار کانوں نے اسے ایک سی ون تھرٹی طیارے کے طور پر شناخت کرلیا۔ یہ طیارہ یا تو فوجی باربردار یا پھر امدادی مشن کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ ایک دم پُر امید ہوگیا اس کا مطلب تھا کہ امداد آگئی تھی لینسن چونک کر اٹھ گیا تھا۔ اسی لمحے طیارے سے فلیئر گرایا گیا۔ اس کی روشنی طیارے کی باڈی میں ہوجانے والے سوراخوں سے اندر آنے لگی۔ لینسن کے پاس ایک ٹارچ تھی وہ طیارے کے سوراخوں سے اس کی روشنی گھمانے لگا تاکہ اگر سی ون تھرٹی والوں نے اس کے طیارے کو دیکھ لیا ہے تو وہ اس روشنی سے اندازہ کرسکیں کہ طیارے میں ابھی زندہ لوگ ہیں اور ان کی امداد کے لیے زمین پر جانا ضروری ہے۔ لینسن جانتا تھا کہ تاریکی اور پچاس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہوا میں کسی قسم کا امدادی فضائی مشن ممکن نہیں ہے۔ اس موسم میں نہ تو ہیلی کاپٹر پرواز کرسکتا ہے اور نہ پیراشوٹ سے نیچے اترا جاسکتا ہے اس کے باوجود ایک امید کے سہارے وہ دیوانہ وار ٹارچ سوراخوں سے گھماتا رہا۔ طیارہ جاچکا تھا۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ ٹارچ گھمائے جارہا تھا۔

☆☆☆

جب سی ون تھرٹی واپسی کے لیے بلندی پکڑ رہا تھا اچانک جان پاف چلایا ”اے! واپس۔ چلو...... میں نے طیارے میں ایک روشنی دیکھی ہے۔“

یہ سنتے ہی سب پُر امید ہوگئے تھے۔ سی ون تھرٹی واپسی کا ارادہ ملتوی کرکے دوبارہ نیچے آنے لگا اب ہر ایک نے اس روشنی کو دیکھ لیا تھا جو طیارے کے سوراخوں سے کبھی نظر آتی اور کبھی غائب ہوجاتی۔ ڈرمونڈ نے دوربین سے اس روشنی کو دیکھا۔ یقینی طور پر طیارے کے اندر کوئی ٹارچ سے سگنل دے کر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ یعنی اس نے بھی طیارے کی آواز سن لی تھی اور وہ پُر امید تھا کہ مدد آگئی ہے۔ کیا وہ اس شخص کی امید توڑ کر واپس چلے جائیں محض اس لیے کہ حالات امدادی مشن کے لیے موزوں نہیں تھے؟ کیا وہ نیچے اترنے کا کوئی راستہ تلاش نہیں کرسکتے تھے؟

فلیئر جلتا ہوا زمین پر گرنے سے پہلے گرنے والے طیارے سے میلوں دور جاچکا تھا۔ تیز ہوا اسے حقیر تنکے کی طرح اڑائے لیے جارہی تھی اور اس ہوا میں براہِ راست کارابو تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا محفوظ طریقے سے زمین تک پہنچ جانا بھی معجزہ ہی ہوتا۔ تیز ہوا ان کے پیراشوٹ کے چیتھڑے اڑاسکتی تھی یا انہیں پہاڑ پر دے مارتی۔ عین ممکن تھا کہ وہ نیچے گر کر خود مدد کے محتاج ہوجاتے۔

اس نے کیپٹن کانٹنس کی سے کہا ”کیا ہمیں کسی طرح نیچے زمین پر چلنے والی ہوا کی رفتار معلوم ہوسکتی ہے؟“

کیپٹن کو یاد آیا کہ اسپاری دون میں ایک انٹر اسپیڈ میٹر لگا ہے۔ اس نے اسپاری دون ریڈیو پر پیغام بھیجا اور ان سے ہوا کے بارے میں رپورٹ مانگی۔ ذرا سی دیر میں رپورٹ آگئی تھی۔ بلندی پر ہوا کی رفتار پچاس ناٹ تھی۔ جب کہ اسپاری دون کے رن وے پر اس کی رفتار نصف یعنی پچیس ناٹ فی گھنٹا تھی اور زمین پر اس کی رفتار اسی ناٹ تک تھی۔ اسپاری دون کا رن وے اس قابل نہیں تھا کہ اس پر ہرکولیس طیارہ لینڈ کرسکتا۔ البتہ وہ دو ہزار فٹ تک جاکر پیراٹروپرز کو اتار سکتا تھا۔

ڈرمونڈ نے چھلانگ لگانے کی تیاری کرتے ہوئے نیچے اسپاری دون کے رن وے کے آخری سرے پر کھڑی ایک فوجی گاڑی کے اوپر جلتی لائٹس کو اترنے کا نشان بنالیا۔ انہیں اس جگہ لینڈ کرنا تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے امدادی سامان کا پیک نیچے گرایا اس طرح اس بات کی آزمائش بھی ہوجاتی کہ ہوا اور نیچے اترنے کی جگہ کے بارے میں ان کے اندازے درست ہیں یا نہیں۔ سامان کا تینتالیس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہوا میں فوجی گاڑی کے پاس کھلے میدان میں جا اترا تھا۔ اپنے اندازے سے مطمئن ہوکر ڈرمونڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''تیار ہوجاؤ دوستو...... طیارہ ہمیں گرانے کے لیے پلٹ رہا ہے۔'' سی ون تھرٹی ایئر ڈراپ کے لیے مثالی طیارہ ہے۔ نچلی سطح پر پرواز کے دوران اس کی رفتار اتنی ہلکی ہوجاتی ہے کہ یہ تقریباً فضا میں معلق ہوجاتا ہے یعنی صرف پچاس ناٹ فی گھنٹا ......اس کا مضبوط ترین ڈھانچا اتنی کم رفتار پر نچلی پرواز کے دوران پیدا ہونے والے دباؤ کو بہ خوبی سہار جاتا ہے۔ کسی اور طیارے میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ واحد طیارہ ہے جو زمین سے چند فٹ اوپر اسی رفتار سے اڑتے ہوئے بھاری گاڑیاں اور ٹینک تک میدان جنگ میں اتار سکتا ہے۔

ڈرمونڈ اور اس کے ساتھی طیارے کے عقبی حصے میں منتظر تھے کہ جیسے ہی طیارہ مطلوبہ مقام پر پہنچے وہ نیچے چھلانگ لگادیں۔ اندازے کی ذراسی غلطی انہیں رن وے اختتام پر واقع کھائی میں لے جاتی۔ یہی غلطی لینسن سے ہوئی تھی اس نے ہوائی رفتار کو نظر انداز کرکے اترنے کی کوشش کی تھی۔ ڈرمونڈ کی نظریں سرخ بلب پر جمی تھیں جیسے ہی یہ روشن ہوتا انہیں نیچے کود جانا تھا۔ اور جیسے ہی بلب روشن ہوا ان تینوں نے یکے بعد دیگرے چھلانگ لگادی۔ لیڈر ہونے کے ناتے ڈرمونڈ نے سب سے پہلے چھلانگ لگائی۔ اس کے پیچھے جان موس آیا اور اس کے بعد جان پاف نے چھلانگ لگائی تھی۔

فضا میں آتے ہی ڈرمونڈ کو جو پہلا احساس ہوا وہ بے پناہ تیز اور یخ ہوا کا تھا۔ ہوا کے شدید تھپیڑے اسے اڑا لے جانے کے لیے بے قرار تھے۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ چھلانگ لگانے کے پانچ سیکنڈ بعد اسے پیراشوٹ کھول لینا تھا۔ اتنی سی دیر میں وہ کوئی دوسو فٹ نیچے آچکا تھا اور پیراشوٹ کھلتے کھلتے وہ مزید سوفٹ نیچے آجاتا اس کے بعد رن وے کی زمین ان سے صرف پانچ سوفٹ کے فاصلے پر رہ جاتی اتنے کم فاصلے سے چھلانگ میں ساری اہمیت وقت کی ہوتی ہے۔ اندازے کی ذراسی غلطی انہیں کسی دردناک انجام سے دوچار کرسکتی تھی۔ ڈرمونڈ نے پانچ سیکنڈ پورے ہوتے ہی پیراشوٹ کھولنے والی ڈوری کھینچ لی۔ اسے جھٹکا لگا پہلے چھوٹا پیراشوٹ کھلا اور اس کے بعد بڑا پیراشوٹ۔ زمین جو اس کی طرف جھپٹ رہی تھی یک دم رک گئی۔

ان کا اندازہ اس قدر درست تھا کہ موس عین گاڑی کے پاس اترا تھا۔ جب کہ ڈرمونڈ اور پاف ذرا فاصلے پر زمین پر گرے تھے۔ انہوں نے تیز ہوا کے باوجود مکمل اور محفوظ لینڈنگ کی تھی۔ ان کے اترنے کے فوراً بعد ہرکولیس سے امدادی سامان کا بڑا پیک گرایا تھا اس میں طبی امداد کا سامان، خوراک اور حرارت حاصل کرنے کے لیے ایندھن تھا۔ یہ سامان ان سے کچھ دور زمین پر اترا تھا۔

فوجی گاڑی کے انچارج فل یازرسکی نے ان کا استقبال کیا۔ اس کا کام انہیں لینسن کے طیارے کے قریب تر لے جانا تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سامان اور پیراٹروپرز کو گاڑی میں سوار کیا اور وہ حادثے کے مقام کی طرف روانہ ہوگئے۔ گاڑی نے تقریباً تین سو میٹرز پہلے انہیں اتار دیا اس سے نیچے گاڑی نہیں جاسکتی تھی۔ اس جگہ سے نیچے انہیں پیدل جانا تھا۔ راستہ بے حد خطرناک اور برف کی وجہ سے پھسلواں ہورہا تھا۔ سب سے پہلے موس اور پاف فوری طبی امدادی سامان لے کر ہر ممکن تیزی سے نیچے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کے عقب میں ڈرمونڈ باقی سامان لے کر نسبتاً آہستگی سے جارہا تھا ان کے مشن میں مدد کے لیے اوپر چکر لگاتا ہرکولیس ہر تین منٹ بعد سولہ لاکھ موم بتیوں کی روشنی کی سی طاقت رکھنے والے فلیئرز چھوڑ رہا تھا تاکہ انہیں تاریکی کی وجہ سے کوئی دشواری نہ ہو۔ ہر فلیئر ساڑھے تین منٹ تک علاقے کو روشن رکھ سکتا تھا۔ ایک فلیئر کے بجھنے یا دور جانے سے پہلے ہی ہرکولیس سے دوسرا فلیئر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

سب سے پہلے موس طیارے کے نزدیک پہنچا جہاں اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا تھا۔ کارابو نے اس جگہ واحد ہموار حصے پر کریش لینڈنگ کی تھی پہاڑی چھجے کا یہ حصہ محض تیس میٹرز لمبا چوڑا تھا۔ طیارہ بالکل درست جگہ گرا تھا۔ ذرا سا ادھر ادھر ہونے کی صورت میں طیارہ سیکڑوں فٹ گہرائی میں جاگرتا۔ اس وقت بھی طیارے کی دم کا بیشتر حصہ اسی چھجے کے کنارے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اگر یہ حصہ نصف سے ذرا زیادہ ہوتا تو طیارہ نیچے گرسکتا تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں ڈھائی ٹن وزنی ایئر کمپریسر لدا ہوا تھا۔ اس لمحے موس کی نظریں اسی منظر پر پڑیں جس نے اسے دہشت زدہ کردیا تھا۔

طیارہ بہ ظاہر سالم لگ رہا تھا لیکن زمین سے تصادم نے اس کی نوک تباہ کردی تھی۔ کاک پٹ اس بری طرح تباہ ہوا تھا کہ تقریباً غائب ہی ہوگیا تھا۔ دونوں پر مڑ کر عقبی سمت میں چلے گئے تھے اور ان کے بہت قریب سے طیارہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا جڑا تھا جس کی وجہ سے طیارے کا عقبی حصہ کھائی میں گرنے سے بچا ہوا تھا لیکن ہوا جتنی شدت سے طیارے کو جھنجوڑ رہی تھی کسی وقت بھی یہ مختصر سا ٹکڑا جواب دے جاتا اور اس کے ٹوٹتے ہی طیارے کا دم والا حصہ وزنی ہوجاتا اور پروں سے نیچے کیبن کا حصہ بھی اسی کے ساتھ نیچے جا گرتا۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ طیارے کے اس حصے سے روشنی نظر آرہی تھی گویا بچنے والے لوگ اسی حصے میں تھے اور اس خطرے سے بے خبر تھے کہ طیارے کا یہ حصہ کسی وقت بھی کھائی میں گر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے پہاڑ کا یہ حصہ مکمل طور پر تقریباً چالیس ناٹ کی رفتار سے چلنے والی ہوا کی زد میں تھا' موس نے احتیاط سے طیارے کے فیوز لیگ پر پاؤں رکھا اور چلایا ''ادھر کوئی ہے؟''

اندر سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی زخمی جانور کراہ رہا ہو اور آٹھ سیلوں والی طاقت ور ٹارچ کی روشنی تھرتھرانے لگی۔ موس نے اندر جھانکا اسے اوورکوٹ میں لپٹا لینسن بے اختیار لرزتا نظر آیا' واضح طور پر وہ ہائپوتھرمیا کا شکار ہوچکا تھا اور اس مرحلے پر اس موذی مرض کا شکار موت کے اتنے نزدیک ہوجاتا ہے جتنا کہ یہ طیارہ کھائی کے نزدیک تھا۔ بدنصیب شخص کا درجۂ حرارت تیزی سے گرتا ہے اور جب اس کا جسمانی درجۂ حرارت ستاسی درجے فارن ہائیٹ تک گرجاتا ہے تو اس کا دل رک جاتا ہے۔

''پلیز...... مم...... میری...... مدد کرو۔'' لینسن نے بری طرح لرزتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ ہی خطرناک حد تک نیلا پڑ چکا تھا۔ موس تیزی سے پلٹ کر پاف کے پاس پہنچا۔ میرا خیال ہے کو پائلٹ مر چکا ہے تم اس کی تصدیق کرکے ادھر میرے پاس آجاؤ۔ دوسرے شخص کو مدد کی اشد ضرورت ہے ورنہ وہ بھی مر جائے گا۔ معلوم کرو کہ ڈرمونڈ کتنی دیر میں ایندھن کے ساتھ نیچے آجائے گا۔''

پاف نے تصدیق کی کہ کو پائلٹ والٹر مر چکا تھا۔ پھر اس نے ریڈیو پر ڈرمونڈ سے رابطہ کیا ''تم کب تک نیچے آرہے ہو یہاں ایک شخص کو حرارت دینی ہے۔''

''میں دس سے پندرہ منٹ میں آرہا ہوں۔'' ڈرمونڈ نے جواب دیا۔

موس اندر آیا اس نے اوورکوٹ ہٹا کر جم لینسن کا معائنہ کیا۔ ''جم۔'' اس نے کہا ''سب سے پہلے تمہاری اس ٹوٹی ٹانگ کو ران سے ٹخنے تک سخت پٹی میں جکڑنا ہوگا۔ ورنہ حرارت ملنے پر تمہیں قیامت خیز درد کا سامنا کرنا پڑے گا۔

لینسن نے سر ہلایا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس پر غشی طاری ہورہی تھی۔ پاف بھی اندر آگیا تھا ان دونوں نے مل کر لینسن کی ٹانگ سخت پٹی میں اس طرح جکڑ دی تھی کہ وہ ہل کر کوئی نقصان نہ کرسکے۔ حادثے میں لینسن کی یہ ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ جب تک وہ اس کام سے فارغ ہوتے ڈرمونڈ بھی باقی سامان کے ساتھ آگیا۔ اس کے پاس پلاسٹک کا بنا ایک ٹب نما اسٹریچر بھی تھا۔ انہوں نے لینسن کو اس پر لٹا کر پٹیوں سے جکڑ دیا اور اسے ایک گرم کمبل اوڑھا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے طیارے کا جائزہ لیا۔ طیارے کا عقبی حصہ خطرناک حالت میں تھا۔ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہوا اس حصے کو کھائی میں گرادیتی انہیں لینسن کو یہاں سے لے کر نکل جانا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ اس خوفناک سردی میں کھلے آسمان تلے وہ اسے کہاں رکھتے۔ وہ تو پہلے ہی ہائپوتھرمیا کا شکار تھا۔

ڈرمونڈ نے کہا۔ ''میں نے یہاں آتے وقت دیکھا تھا کہ کاک پٹ کے عقبی حصے کی کھڑکی ٹوٹ چکی ہے اور وہاں خاصی جگہ ہے۔ اگر ہم فرش سے دھات کاٹ کر اسے کھڑکی پر چڑھا دیں تو ہمیں ایک کمرا مل جائے گا جہاں ہم لینسن کو لے جانے تک سردی سے بچا سکتے ہیں۔''

موس اور پاف نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ ان کے پاس دھات کاٹنے کے لیے چھوٹا سا گیس کٹر تھا۔ پاف اور ڈرمونڈ دھات کاٹ کر مطلوبہ کمرا تیار کرنے میں لگ گئے جب کہ موس لینسن کو طبی امداد دینے لگا۔ اس نے سب سے پہلے اسے کالر پہنایا تاکہ اس کی گردن کو اس حادثے میں کوئی چوٹ لگی بھی ہو تو وہ نقصان سے محفوظ رہے۔ پھر اسے خیال آیا ''ادھر کھڑکی کے پاس ایک ٹول بکس رکھا ہے اس میں ٹین کاٹنے والا کٹر ہے۔'' اس نے ساتھیوں سے کہا جس وقت موس لینسن کو ہائپوتھرمیا کی شدت کم کرنے کے لیے ایک انجکشن دے رہا تھا پاف نے اپنا کام شروع کردیا تھا اور پھر جیسے ہی اس نے ٹن سے بنی طیارے کی اندرونی باڈی کا ایک حصہ کاٹا اس سے فوارے کی صورت میں پیٹرول نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ پاف نے غلطی سے تیل کی لائن کاٹ دی تھی۔ ملبے میں ہر طرف تیل پھیل رہا تھا اور طیارہ آگ لگنے کے خطرے سے دوچار ہوچکا تھا۔

''میرے خدا اب ہم گیس کٹر استعمال نہیں

کر سکتے۔'' ڈرمونڈ نے کراہ کر کہا تھا۔

درحقیقت طیارہ ایک اور خوف ناک صورتِ حال سے دوچار ہوگیا تھا۔ اس کے گرنے کا خطرہ ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور آگ لگنے کا خطرہ زیادہ ہوگیا تھا۔ طیارے کے چلنے والے انجن سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس انجن میں ابھی حرارت باقی تھی اگر تیل اس انجن تک رسائی حاصل کر لیتا تو طیارے کا سلب فوراً آگ پکڑ لیتا۔ ان کے پاس اتنی مہلت بھی نہ ہوتی کہ لینسن کو نکال لے جاتے۔

''لینسن کو باہر لے جانا ہے۔'' ڈرمونڈ نے فوری فیصلہ کیا۔ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

اس کے بعد وہ کٹر سے فیوز لیگ کی ایک دیوار کاٹنے لگا تاکہ لینسن کو باہر لے جایا جائے۔ وہ خاص احتیاط سے کام لے رہا تھا کہیں پر کوئی پائپ لائن یا کوئی برقی تار نہ کٹ جائے۔ اس صورت میں شارٹ سرکٹ سے پیدا ہونے والی ایک چنگاری بھی طیارے کو شعلوں میں بدلنے کے لیے کافی ہوتی۔ دس منٹ میں اس نے اتنا بڑا سوراخ کر دیا جس سے لینسن کو باہر لے جایا سکتا تھا۔ وہ فوری طور پر اسے باہر لے آتے۔ انہوں نے اسے ایک گرم سلیپنگ بیگ میں ڈالا اور اس کے اندر کیمیائی طریقے سے حرارت پیدا کرنے والے پیڈز رکھ دیے۔ کھلی فضا میں ایندھن کی حرارت بیکار ثابت ہوگی۔

یہ کام کر کے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کھلی جگہ میں مدد کی توقع محال ہے۔ اگر وہ لینسن کو ادھر لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو وہ اسپاری دون کے کسی میڈیکل سینٹر تک تو لے جا سکتے تھے۔ انہوں نے پلاسٹک کے بنے اس اسٹریچر کو اوپر لے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے جوتوں کے تلے بدلے اور ایسے تلے لگائے جو برف اور چٹانوں پر گرفت قائم رکھ سکیں۔ انہیں تقریباً سو کلو وزنی اسٹریچر اور دوسرے سامان کے ساتھ بیس سے پینتیس ڈگری زاویے والی ڈھلان پر چڑھنا تھا۔ یہ کام کر کے انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہرکولیس نے ایک اور فلیئر فائر کیا تھا لیکن تیز ہوا اسے اڑا لے گئی۔ وہ تاریکی میں تھے۔ ڈرمونڈ نے اندازہ لگایا کہ بلندی پر ہوا مزید تیز ہوگئی ہے اور اس صورت میں پھینکے جانے والے فلیئر صرف چند سیکنڈ کے لیے ان کے اوپر چلتے تھے اور پھر انہیں اڑا کر دور لے جاتی تھی۔ تاریکی میں اس ڈھلان پر چڑھنا خطرناک کام تھا اور کسی بھی حادثے کا پورا امکان تھا مگر وہاں رکنے کی صورت میں لینسن کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ درجۂ حرارت منفی بائیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ ڈرمونڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ہمیں اوپر جانا ہوگا دوستوں۔''

''اتنی تاریکی میں یہ کام بے حد خطرناک ہوگا۔'' موس نے نشاندہی کی۔

انہوں نے سرچ لائٹس نکال کر اپنے ہیلمیٹوں پر لگالی تھی۔ پاف نے اسٹریچر کو سامنے سے اٹھایا جب کہ موس اور ڈرمونڈ نے اسے پیچھے سے تھام لیا۔ یہ کمر توڑ دینے والی مشقت تھی۔ وہ ان تھک اوپر چڑھنے لگے لیکن جب وہ بیس منٹ بعد سانس لینے کے لیے رکے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی کارکردگی اچھی خاصی تھی۔ سر پر لگی ہونے والی سرچ لائٹ اس معاملے میں زیادہ کارآمد نہیں تھی۔ اسی لمحے ہرکولیس واپس آگیا تب انہیں اندازہ ہوا کہ طیارے میں فلیئر ختم ہوگئے تھے اور وہ کسی نزدیک ایئربیس سے مزید فلیئر لے کر لوٹا تھا۔ اس نے آتے ہی فضا میں تین عدد فلیئر چھوڑے جن کی وجہ سے پورا ماحول منور ہوگیا جیسے ہی روشنی ہوئی انہوں نے دیکھنا چاہا کہ اتنی دیر میں انہوں نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا اور یہ دیکھ کر ان کے گلے خشک ہونے لگے کہ وہ کسی طرف بھی نہیں جا رہے تھے انہوں نے جو فاصلہ طے کیا تھا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ بے حد مایوس ہوئے تھے اوپر جانا انہیں گھنٹوں کا کام لگ رہا تھا۔

''فکر مت کرو۔'' بالآخر ڈرمونڈ نے نرم آواز میں کہا۔ ''ہمیں اوپر جانا ہی ہے' چاہے اس میں کتنی ہی دیر کیوں نہ لگے۔ چلو دوستوں چل پڑو۔''

اس وقت ہلکی برف باری ہو چکی تھی اور ڈھلان پر نرم برف کی پتلی سی تہ جم گئی تھی۔ اس برف میں جوتوں کی دھاتی کیلیں اس طرح گرفت نہیں کر رہی تھیں جیسی کہ انہیں کرنی چاہیے تھی۔ ان کے پاؤں ہلکے ہلکے سے پھسل رہے تھے اور اس طرح اوپر جاتے ہوئے ایک پھسل جاتا تو باقی دو کے لیے اسٹریچر سنبھالنا ناممکن ہو جاتا اور لینسن کا اسٹریچر اس ڈھلان سطح پر رکے بغیر سیکڑوں فٹ گہرائی میں جا گرتا۔ ان میں صرف پاف ایسا تھا جس کے جوتے کی نوک دھاتی تھی اور اس کے نیچے بڑی کیلیں بھی لگی تھیں جو اسے زیادہ بہتر گرفت فراہم کر رہی تھیں اسی لیے اس نے تجویز پیش کی۔

''تم لوگ پیچھے کیوں نہیں آجاتے میں آگے سے برف میں قدم جما کر اسے زیادہ بہتر طریقے سے کھینچوں گا اور جب میں رکوں گا تو تم اسے آگے دھکا دینا۔''

پاف کی تجویز معقول تھی۔ ڈرمونڈ نے سوچا اور اسے قبول کر لیا۔

وہ اس وقت اسٹریچر کو اٹھانے کے بجائے اسے برف پر رکھ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اس طرح کہ پہلے دو آگے سے کھینچتے تھے اور پھر ایک پیچھے سے دھکا لگاتا تھا۔ پاف آگے چلا گیا۔ ان تینوں میں وہ سب سے زیادہ طاقتور آدمی تھا۔ اس نے اسٹریچر آگے سے تھام لیا جب کہ ڈرمونڈ اور موس اسے پیچھے سے دھکیلنے لگے یوں لینسن کا اوپر کے لیے سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ وہ سینٹی میٹر کی رفتار سے اوپر جا رہا تھا' لیکن جا رہا تھا کشش ثقل' تیز ہوا' پھسلن برف اور ڈھلان نے ان کے سفر کو بے حد دشوار کر دیا تھا۔ پاف کے آگے جانے کے بعد ڈرمونڈ اور موس پیچھے سے دھکا لگا رہے تھے۔ وہ بار بار گر جاتے تھے اگر پاف نے اوپر سے اسٹریچر نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ بلاشبہ لینسن کو کھو چکے ہوتے۔

ایک موقع پر اوپر جاتے موس کا پاؤں اس طرح پھسلا کہ وہ نیچے گرا اور اگر اس نے اسٹریچر نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ لڑھکتا ہوا کھائی میں جا گرتا۔ زبردست دھچکے سے پاف اور ڈرمونڈ بھی تیزی سے نیچے آئے تھے۔ اس موقع پر وہ زبردست جدوجہد کر کے خود کو نہ سنبھالتے تو پھر کم سے کم لینسن ضرور نیچے چلا جاتا۔ خاصی دیر تک وہ اپنی سانسیں بحال کرتے رہے۔ اس دوران میں ہرکولیس کے فلیئر ایک بار پھر ختم ہوگئے تھے اور مشن کے اس مرحلے میں اس کی واپسی بے کار تھی اس لیے طیارہ اپنے عملے سمیت واپس رچرڈسن بیس کی طرف چلا گیا۔

اب انہیں تاریک آسمان کے ساتھ بغیر روشنی کے اوپر کا سفر جاری رکھنا تھا یہ کام پہلے کی نسبت کہیں زیادہ دشوار ہوگیا تھا۔ مزید دشواری یوں آن پڑی کہ ہوا اب سامنے کی سمت سے چل رہی تھی۔ اس کی تیزی ان کے اوپر جانے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ ساتھ میں برف کے ننھے ذرات ملی یہ ہوا ان کی آنکھوں میں گھس رہی تھی اور وہ تقریباً اندھے ہو کر اوپر کی طرف سفر کر رہے تھے انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں پر ہیں انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ اس وقت ایک ڈھلان پر کھڑے ہیں اور انہیں اوپر کی طرف جانا ہے۔

چیختی چنگھاڑتی ہوا میں ڈرمونڈ اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے انہیں چلا چلا کر اوپر کی طرف بڑھنے کو کہہ رہا تھا۔ ''رکو مت ساتھیوں...... بس اب تھوڑا ہی فاصلہ ہے۔''

پاف جو اوپر تھا اب تک بے مثال ہمت اور طاقت کا مظاہرہ کرتا آیا تھا۔ اکیلے تقریباً سو کلوگرام وزنی اسٹریچر (اس میں لینسن کا وزن ہی تراسی کلوگرام تھا) اوپر کھینچ رہا تھا۔ بعض مواقع پر اسے یوں لگا جیسے ابھی اسٹریچر اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ وہ جانتا تھا اس صورت میں لینسن تو ہاتھ سے جائے گا ہی اس کے دونوں ساتھیوں کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اچانک خود اس کا پاؤں نرم برف کے بجائے کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا اس کا توازن بگڑا اور وہ پشت کے بل گرا اس کے ہاتھ میں اسٹریچر کا ہینڈل تھا جسے اس نے پوری قوت سے تھام رکھا۔ اس کے ساتھی بھی اس اچانک رفتار سے لڑکھڑا گئے تھے۔ لینسن کے وزن سے اسٹریچر گویا نیچے جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ پاف کے پاؤں دیوانہ وار ٹک جانے والی کسی چیز کی تلاش میں تھے مگر نیچے نرم پھسلن برف کے سوا کچھ تھا ہی نہیں وہ سب نیچے کی طرف پھسلنے لگے۔

''میرے خدا۔'' پاف نے دہشت زدہ ہو کر سوچا ''مدد فرما۔''

اسے معلوم تھا اگر ایک بار وہ پھسل گئے تو ان کا سفر تحت الثریٰ میں جا کر ختم ہوگا۔ پھر جیسے پاف کی دعا قبول ہوگئی۔ اس کا بایاں پاؤں اس پتھر سے ٹک گیا جس سے ٹکرا کر وہ نیچے گرا تھا۔ اس نے پوری قوت سے پاؤں اس پتھر سے ٹکا دیا اس دوران میں ڈرمونڈ اور موس کو بھی سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ انہوں نے قدم جمائے تو پاف بھی اٹھ کھڑا ہوا اور انہوں نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ مسئلہ وہی تھا کہ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس موقع پر ڈرمونڈ نے خوش طبعی سے کہا ''خوب...... ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اوپر کی سمت کس طرف ہے کھینچو میرے ساتھیوں۔''

☆☆☆

اب پوزیشن بدل گئی تھی۔ موس اور ڈرمونڈ آگے چلے گئے تھے۔ وہ دونوں پہلے اسٹریچر کھینچتے پھر گرتے دوبارہ اٹھتے...... دوبارہ اسٹریچر کھینچ کر پھر گر جاتے۔ عقبی حصے کو پاف نے سنبھال رکھا تھا۔ جب ان کے ایک طرف کا جسم درد کی شدت سے چلانے لگتا تھا تو وہ سائیڈ بدل لیا کرتے تھے۔

بے پناہ سردی رفتہ رفتہ اب ان پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ ان کے سانس پھول رہے تھے اور سردی کی وجہ سے جسم کے مسلز اکڑن کا شکار ہونے لگے تھے۔ وہ چلتے' جب تھک جاتے تو رک کر آرام کرتے۔ منٹ گھنٹوں میں بدلتے جا رہے تھے۔ ان تھک جدوجہد کے دوران میں انہیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ستانے کے دوران وہ اوپر ڈھلان کی طرف آنکھیں کر کے دیکھتے تو وہ انہیں اتنی ہی

دور نظر آتی۔

سردی کی وجہ سے ان کے چہروں، داڑھیوں اور مونچھوں میں برف جم گئی تھی۔ جب وہ سانس لیتے تو یوں لگتا جیسے ہوا نہیں سیال برف ان کے جسم میں جا رہی ہے۔ ان کا جسم جتنی حرارت پیدا کر رہا تھا وہ اس سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس وقت تک وہ کم سے کم نصف راستہ طے کر چکے تھے اس بلندی پر موسم خاصا صاف ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی ان کے سفر کا دشوار ترین مرحلہ آن پہنچا تھا۔ چالیس درجے زاویے والی خوف ناک ترین ڈھلان تھی اور اس پر اکیلے آدمی کا خالی ہاتھ چڑھنا ہی دشوار تھا اور ایک عدد اسٹریچر کے ساتھ یہ کام بلاشبہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے کم نہیں تھا۔ اس ڈھلان پر تیز دھار چٹانیں نکلی ہوئی تھیں جو ایک رکاوٹ تھیں۔ ان سے ٹکرا کر بھی وہ زخمی ہو سکتے تھے اور نیچے بھی گر سکتے تھے۔ بہ ظاہر ناممکن نظر آنے کے باوجود ان کی جدوجہد جاری تھی۔ وہ ان چٹانوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی رفتار گھونگھے جتنی تھی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب وہ ڈھلان کے آخری حصے میں کھڑے تھے، تقریباً سو میٹرز طویل یہ حصہ سب سے دشوار گزار تھا وہ حیران تھے کہ کیا وہ اس پر چڑھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ یہاں چٹانوں پر برف کی تہ تھی اور پھسل جانے کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ تھے۔ انہیں اوپر جانے کی جدوجہد کرتے ہوئے تین گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا۔ جسم تھکن سے چور تھے اس لیے وہ رک کر اس آخری جدوجہد کے لیے ہمت جمع کرنے لگے۔ اسی موقع پر مدد بالکل غیر متوقع انداز میں آئی۔

''کیا میں نیچے تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' فوجی گاڑی کے پاس سے سارجنٹ یارزسکی نے پکارا۔

یارزسکی ایک فوجی تھا لیکن اسے اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے ڈرمونڈ نے سوچا اور اسے منع کر دیا ''شکریہ...... ہم یہ کام کسی نہ کسی طرح کر ہی لیں گے۔''

''کیا میں اوپر سے بھی کوئی مدد نہیں کر سکتا؟'' یارزسکی نے کسی قدر مایوسی سے پوچھا۔

سارجنٹ کو منع کرنے کے باوجود کوئی شے ڈرمونڈ کے ذہن میں کھٹک رہی تھی جب یارزسکی نے دوبارہ پوچھا تو اسے یاد آنے لگا۔ اس نے چلا کر کہا ''اے رکو...... سارجنٹ کیا تمہاری گاڑی میں کوئی رسی ہے؟''

''بالکل ہے۔'' یارزسکی نے جواب دیا۔

''تب اسے اپنی گاڑی کے بمپر سے باندھو اور اس کا دوسرا سرا نیچے پھینک دو۔'' ڈرمونڈ نے اسے ہدایت دی۔

یارزسکی نے پھرتی سے حکم کی تعمیل کی۔ وہ گزشتہ چار گھنٹے سے ایسے ہی کھڑا تھا اور اسے خوشی تھی کہ اسے کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا یہ رسی اس نے پہلے اپنی گاڑی کے بمپر سے باندھی اور پھر اسے نیچے کی طرف اچھال دیا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔

''سر اب میں کیا کروں؟''

''جب میں کہوں تو گاڑی کو صرف دو میل فی گھنٹے کی رفتار سے پیچھے لے جانا۔'' ڈرمونڈ نے اسے حکم دیا۔

پھر ڈرمونڈ اور اس کے ساتھیوں نے لینسن کا اسٹریچر رسی سے اس طرح باندھا کہ وہ اوپر جاتے ہوئے الٹا نہ ہو۔ باقی رسی انہوں نے ایک ایک کر کے اپنی بیلٹوں میں لگے کلپوں سے باندھ لی۔ اسی طرح وہ بھی اسٹریچر کے ساتھ اوپر پہنچ جاتے۔ جب ڈرمونڈ نے اشارہ کیا تو یارزسکی نے اپنی جیپ نما گاڑی کو ریورس میں بے حد آہستگی سے چلانا شروع کر دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ میں لینسن اور وہ اوپر پہنچ چکے تھے۔ ڈرمونڈ پچھتا رہا تھا کہ اس نے پہلے ہی یہ ترکیب سوچ لی ہوتی تو وہ کئی گھنٹے پہلے ہی اوپر آ چکے ہوتے اور لینسن ابھی کسی اسپتال میں ہوتا۔ بہرحال دیر سے سہی لینسن اوپر پہنچ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی لینسن کو لے کر تیزی سے رن وے پر کھڑے آرمی ہیلی کاپٹر کی طرف روانہ ہوگئی جو اسے لے کر انکوریج کی طرف روانہ ہو گیا جو الاسکا کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ امدادی ٹیم نے اپنا کام کر دکھایا تھا ایک گھنٹے بعد لینسن انکوریج ڈسٹرکٹ اسپتال میں تھا۔ جہاں معائنے کے بعد ڈاکٹروں نے اس کے بائیں پاؤں میں متعدد فریکچر پائے۔ اس کی ناک بھی ٹوٹ گئی تھی۔ شانے کی ہڈی متاثر تھی۔ دائیں ہاتھ پر شدید نوعیت کا زخم تھا۔ آنکھ پر بھی چوٹ آئی تھی۔ وہ چھ دن اسپتال میں رہا اور اس دوران میں اس کے دو آپریشن ہوئے، خوش قسمتی سے امدادی ٹیم کی کوششیں کامیاب رہی تھیں اور اس کا ہائپوتھرمیا خطرناک مرحلے میں داخل نہیں ہوا تھا۔

امدادی ٹیم کے تمام ارکان کو اس کامیاب آپریشن پر انسانی جان بچانے پر امتیازی فضائی تمغہ دیا گیا تھا۔ چھ مہینے بعد وہ دوبارہ پرواز کر رہا تھا لیکن اپنے دوست والٹر کے بغیر اس کا اس کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ آخر 1998 میں لینسن نے ایئر لائن ہی بند کر دی تھی۔

حروف ساز

کاشف زبیر

کچھ لوگ عہد ساز ہوتے ہیں۔ وہ ایسا کام کر جاتے ہیں کہ پھر آنے والے دور بھی انہیں فراموش نہیں کرسکتے۔ یہ ایک ایسے ہی شخص کا قصہ ہے جس نے اردو فن طباعت کو بین الاقوامی معیار تک لانے کے لئے رات دن جدوجہد کی اور بالآخر اس قابل بنادیا کہ آج ہم جدید ٹکنالوجی کے استعمال پر قادر ہوسکے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو کتابت و طباعت کے حوالے سے ہم جمیل مرزا کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔

اردو زبان سے محبت کرنے والے ایک سچے محبِ وطن کا احوال

لفظ "ترقی" بڑا متنازعہ ہے۔ دو قوموں میں، دو مذاہب میں، دو گروہوں میں، دو نظریات میں حتیٰ کہ دو افراد میں بھی اس لفظ کے معنی پر سخت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مغرب ترقی کے حوالے سے کسی اور سمت میں سوچتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشی ومادی ترقی ہی سب کچھ ہے (دنیا آج اسی نظریئے کے ہولناک نتائج بھگت رہی ہے) دوسری طرف مشرق میں اقدار اور اخلاق کی ترقی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ معاشی ترقی۔ ایک مشرقی باشندہ چاہے وہ کسی قوم یا ملک اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ محض معاش کے لیے اپنی اقدار اور تہذیب سے کٹ کر خوش نہیں رہ سکتا۔

ترقی کا لفظ دھوکا بھی دیتا ہے۔ انسان کو بلندیوں پر چڑھنے کے لیے اکساتا ہے اور جب وہ ان بلندیوں تک پہنچتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ سب سے کٹ گیا ہے اور اس کے ہاتھ سوائے ایک احساسِ کامرانی کے اور کچھ نہیں آیا ہے۔ جیسے کسی بلند چوٹی پر پہنچنے والے کو سوائے برف اور یخ ہوا کے کچھ نہیں ملتا۔ باقی سب تو ایک احساس ہے۔ موجودہ دور میں ترقی کو پیمانہ بنالیا گیا ہے۔ دو افراد، دو ملکوں اور دو قوموں میں فرق کا فلاں ملک فلاں سے اتنا زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ فلاں قوم فلاں سے اتنی آگے ہے۔ اور فلاں فرد فلاں سے اتنا زیادہ دولت مند ہے۔

اگر ہم موجودہ ترقی کے دور کو دیکھیں تو اس کی بنیاد بارھویں صدی عیسوی میں پڑ چکی تھی۔ جب اسپین کے راستے اس وقت کے جدید علوم اور خیالات یورپ تک پہنچے تھے۔ پندرھویں صدی تک جب مسلمانوں کا ذوقِ علم اور جذبۂ جستجو ماند پڑ چکا تھا تو یورپ نے علم کی شمع کو سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے علم وفنون کو آگے بڑھایا۔ مسلمانوں سے جو سیکھا اسی پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ گئے تھے بلکہ انہوں نے اس علمی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اگلی دو صدیوں میں سائنس مکمل طور پر یورپ کے قبضے میں آچکی تھی۔

انہوں نے بے شمار ایجادات کیں لیکن اس دور کی وہ ایجاد جس نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ ابتدا میں بے حد معمولی سی نظر آئی تھی۔ جرمنی کے شہر گٹن برگ میں ایک جرمن نے ایک مشین ایجاد کی جو کسی بھی عبارت کو کاغذ پر چھاپ دیا کرتی تھی۔

پہلے وضاحت کردی جائے کہ کاغذ اور چھاپا خانہ یعنی پریس دونوں چینیوں کی ایجاد تھے۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے چینی لکڑی کے بلاکوں پر حرف لگا کر اس سے چھپائی کیا کرتے تھے لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں، ایک تو یہ کہ ایک بلاک صرف ایک بار ہی استعمال ہوتا تھا۔ یعنی اس سے ایک ہی عبارت چھاپی جاسکتی تھی چاہے ایک بار چھاپی جائے یا ہزار بار، دوسرے لکڑی کے بلاکوں سے معیار بھی اتنا اچھا نہیں آتا تھا۔ یہ چینی چھاپے خانے صرف سرکاری احکامات یا دستاویزات کی اشاعت میں کام آتے تھے۔ عوام کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ انہیں اس کی خبر بھی نہیں تھی۔ چینی جو کاغذ بناتے تھے۔ وہ چاول کے گودے اور بانس کے تنے کے گودے سے تیار ہوتا تھا۔ کاغذ کی تیاری بھی ایک سرکاری راز تھا۔ جس کی حفاظت کی جاتی تھی۔ جس طرح ریشم سازی کا طریقہ خفیہ رکھا جاتا تھا اور اگر کوئی چینی کسی دوسری قوم کو اس راز سے آگاہ کرتا تھا تو اسے غدار قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

لیکن کوئی راز بھی تادیر راز نہیں رہتا۔ جب مسلمانوں نے وسط ایشیا اور جنوب مشرقی چین پر حملہ کیا اور ان جنگوں میں چینیوں کو شکست دی تو قید ہونے والے چینیوں میں سے کچھ کاغذ سازی اور چھاپے خانے کے راز سے واقف تھے۔ انہوں نے یہ راز مسلمانوں کو بتادیا۔ اب اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لالچ، تشدد یا قیدیوں سے مسلمانوں کا حسنِ سلوک، بہرحال یہ قیمتی راز مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور انہوں نے کاغذ سازی کو نئی جدت دی اور محض ایک صدی میں پوری

مہذب دنیا کاغذ کے وجود سے آشنا ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے اعلیٰ درجے کا نفیس اور مضبوط کاغذ بنانا شروع کیا جو کتاب سازی میں بہ آسانی استعمال ہو سکتا تھا۔ کاغذ کی وافر دستیابی نے علوم کی ترقی کو بے حد تیز کر دیا تھا۔ محض دو صدیوں میں مسلم سائنس دانوں نے وہ کام کر دکھائے جو ان سے پہلے دو ہزار سال میں بھی نہیں ہوئے تھے۔ اندازہ ہے کہ مسلمانوں نے تیں لاکھ سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں فطری علوم کا حصہ بہت زیادہ تھا۔

لیکن مسلمان چھاپے خانے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا رسم الخط تھا جو عربی رسم الخط کہلاتا تھا اور اس میں آزاد حروف کے بجائے مرکب حروف ہوتے تھے بلکہ اس دور میں پوری پوری عبارت ملا کر لکھنے کا تصور بھی تھا۔ یعنی دو الفاظ کے درمیان جگہ خالی نہیں ہوتی تھی۔ اس سے خطاطی اور خوش نویسی کے فن کو تو بے حد ترقی ملی لیکن جہاں تک چھپائی کا تعلق تھا، تو اس کے لیے یہ رسم الخط ناکافی تھا۔ دوسرے خود مسلمانوں نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی لہٰذا چھاپا خانہ کی ایجاد جوں کی توں مسلمانوں کے پاس رکھی ہی رہی تھی۔ البتہ جب مسلمان ہسپانیہ گئے تو انھوں نے وہاں نئے اور جدید رسم الخط پر چھاپے خانے کی آزمائش کی تھی مگر یہ تجربہ انفرادی حد تک محدود رہا تھا۔

زیادہ تر مشرقی زبانیں خاص طور سے عربی اور ایرانی زبانیں اس خط میں لکھی جاتی ہیں۔ جس کی بنیاد کوفہ میں پڑی تھی۔ اس سے یہ کوفی خط کہلایا۔ بعد میں اس کی متعدد شاخیں بنیں جن سے خطِ نسخ وجود میں آیا جو اردو کا معیاری خط بنا۔ اس کے بعد خطِ نستعلیق نے اس کی جگہ لی اور اب جدید ترین نوری.... نستعلیق استعمال ہو رہا ہے۔ ان تمام خطوں کی خرابی ان کے جوڑ ہیں یعنی ایک حرف کو دوسرے

حرف سے ملا کر لکھنا۔ اس نے فنِ خطاطی کو تو بے حد ترقی دی مگر یہی جوڑ چھاپے خانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے بے حساب علمی ترقی کے باوجود چھاپے خانے کو استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ اگر کوشش کی جاتی تو چھاپا خانہ بھی لگ سکتا تھا اور خط کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آتا۔

یورپی زبانیں زیادہ تر لاطینی سے اخذ کردہ ہیں جو سترھویں صدی تک یورپ کی مقبول ترین زبان رہی تھی۔ اس کے بعد علاقائی زبانوں نے ترقی شروع کی تو لاطینی کی حیثیت زبان کے طور پر ختم ہوگئی لیکن اس کے الفاظ اور اصطلاحات آج بھی بیشتر یورپی زبانوں کا جزو ہیں۔ بعض زبانیں تو نوّے فیصد الفاظ کا ذخیرہ لاطینی سے رکھتی ہیں۔ جیسے جرمن اور انگریزی زبانیں۔ ان ممالک میں لاطینی کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے لیے فارسی، ترکی اور عربی زبانوں کی ہے کیونکہ اردو کا بیشتر ذخیرہ الفاظ ان ہی زبانوں سے آیا ہے۔

جب چھاپا خانہ یورپ والوں کے ہاتھ لگا تو صحیح معنوں میں اس ایجاد کی قسمت کھل گئی کیونکہ یورپی زبانوں میں جوڑ کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ الگ الگ حروف سے بننے والا لفظ مکمل سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ”The“ کو اگر The یا THE بھی لکھا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن اگر ہم اردو میں کتاب کو ک ت ا ب لکھیں تو شاید ہی کسی کی سمجھ میں آئے۔ معدودے چند الفاظ کے نمونے بنانا اور انہیں پریس میں لگانا بے حد آسان تھا۔ مثال کے طور پر انگریزی کے کُل چھبیس حروف ہیں۔ اگر چھوٹے بڑے حروف الگ سے شمار کیے جائیں تو تعداد دوگنی ہوجاتی ہے۔ یعنی ایک چھاپے خانے کو کوئی بھی عبارت لکھنے کے لیے کُل باون الفاظ کی ضرورت پڑتی تھی۔ باقی کومے اور نقاط تو آہی جاتے تھے۔

دوسرے یورپ والوں نے لکڑی کے بلاک کے بجائے لوہے یا تانبے سے بنے ہوئے حروف استعمال کیے جن کو باربار استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ گھستے نہیں تھے اور نہ ہی ان کی شکل بدلتی تھی۔ اس چھاپے خانے نے یورپ کی غیر علمی فضا میں انقلاب برپا کردیا تھا۔ وہاں ہاتھ سے لکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی تھی پھر خوش خط افراد کی تعداد تو اور بھی کم تھی۔ یہ چیز یورپ میں اشاعتِ علم میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھی جسے چھاپے خانے نے دور کردیا۔ پہلے ایک کتاب مہینوں میں جاکر تیار ہوتی تھی تو اب ہفتے بھر میں اس کی ہزار کاپیاں چھپ جاتی تھیں۔

اگر یورپ کے صنعتی اور علمی انقلاب کو اس چھاپے خانے کی مرہونِ منت قرار دیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یورپ میں ایک خاص طبقے کو چھوڑ کر نہ تو وہاں علم کا شوق تھا اور نہ ذوقِ جستجو۔ عوام کلیسائی احکامات سے مجبور تھے اور سولھویں صدی تک یہ حال تھا کہ سوائے بائبل کے کوئی اور کتاب گھر میں رکھنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اس ماحول میں علم کی اشاعت ناممکن حد تک مشکل کام تھا لیکن دیوانوں نے اسے ممکن کر دکھایا۔ چھاپا خانہ ایجاد تو جرمنی میں ہوا تھا لیکن اس سے سب سے زیادہ فیض انگریزوں نے اٹھایا کیونکہ لکھنے کی حد تک انگریزی سب سے آسان زبان تھی اور اب بھی ہے۔ اس کے حروف چھاپے خانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ صنعتی انقلاب کا سرخیل رہا اور بیسویں صدی کے آغاز تک وہ علم وفنون کا گہوارہ بھی تھا۔

پھر ٹائپ رائٹر کی ایجاد نے ایک طرف تو ہاتھ سے لکھنے کا مسئلہ حل کردیا دوسری طرف اس سے کتابیں چھاپنے والوں کو معیاری خط ملنے لگا۔ جو شروع سے لے کر آخر تک یکساں ہوتا تھا۔ اس کے بعد تو ایجادات کا سلسلہ چل نکلا۔ پھر کمپیوٹر آپہنچا۔ گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں ہی ترقی یافتہ ممالک کمپوزنگ کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنے لگے تھے کیونکہ ابتدائی سافٹ ویئر ہی انگریزی زبان میں بنے تھے لہٰذا یہ مشین مکمل طور پر انگریزی زبان کے مقاصد کو پورا کرتی تھی۔ اس میں کمپوزنگ بھی شامل تھی۔ یعنی پہلے جو کام ٹائپ رائٹر اور کاغذ پر ہوتا تھا وہ اب کمپیوٹر پر ہونے لگا۔ اس سے وقت اور سرمائے کی کثیر بچت ہونے لگی۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں تو ایسے کمپیوٹر وجود میں آگئے جو چھاپا خانہ بھی خود چلاتے تھے۔ بس ان میں چھاپنے کے لیے مواد ڈالنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سے کتابوں کی اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہوا تو علم کی ترقی بھی بے پناہ بڑھ گئی۔

فارسی اور اردو میں کمپوزنگ ہمیشہ ایک مسئلہ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے نہ تو اس کا کوئی معیاری خط بن سکا اور نہ ہی یہ زبانیں انگریزی یا کسی اور یورپی زبان کی طرح مشینوں پر آسکیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ پہلی زبان جس نے ایشیا میں چھاپے خانے کی شکل دیکھی 'ترکی' تھی۔ وہ بھی انیسویں صدی کے آخر میں جب کہ یورپ کو چھاپا خانہ استعمال کرتے ہوئے تین صدیاں ہوچکی تھیں۔ تقریباً اسی زمانے میں پہلی بار اردو پرنٹنگ کے مرحلے سے گزری اور برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنی مدد آپ کے تحت پتھر کے بلاکوں سے اخبارات اور کتابیں چھاپیں۔ مگر اوّل تو اس کا معیار بے حد خراب تھا دوسرے سب سے بڑا مسئلہ معیاری کتابت کا تھا۔ ان دنوں خوش نویسی اصل میں مشکل نویسی بھی تھی۔

جس طرح مشکل زبان بولنا علمی ذوق کی علامت سمجھا جاتا تھا اسی طرح مشکل طریقہ نویسی بھی مقبول تھا لہٰذا ان کاتبوں کی کمی تھی جو آسانی سے سمجھ میں آجانے والے خط میں لکھ سکیں۔ زیادہ مقبول خطِ نسخ تھا۔ اور نستعلیق ابھی مقبولیت کی منزل سے دور تھا۔ لہٰذا انیسویں صدی میں اردو کی اشاعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے مقابلے میں مشکل سمجھی جانے والی دیوناگری زبان تیزی سے آگے آرہی تھی۔

اردو کے ساتھ بھی وہی مسئلہ تھا یعنی جوڑوں کا جس کی وجہ سے اسے مشین پر چڑھانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا بلکہ ابھی تک تھا۔ پھر دفتری زبان ہونے کی وجہ سے انگریزوں نے خود اردو کی ترقی میں دلچسپی لی تو بالآخر اردو کا معیاری چھاپا خانہ بھی وجود میں آگیا۔ سرسید نے جہاں اس تباہ حال قوم پر متعدد احسانات کیے ان ہی میں سے ایک احسان ان کی تحریروں میں آسان بیانی کی تحریک بھی تھی۔ ان سے پہلے صرف غالب نے ایسی اردو نثر کی شکل میں لکھی تھی جو آسانی سے سمجھ میں آگئی تھی اور شگفتہ بیان بھی تھی۔ (البتہ اشعار بہت مشکل کہہ گئے تھے) لیکن غالب کا یہ انداز روایت نہ پاسکا تھا۔ اردو داں طبقہ بدستور مشکل زبان بولنے اور لکھنے پر مُصر تھا۔ جب سرسید نے علی گڑھ اور سائنٹیفک سوسائٹی جیسی تحریکیں شروع کیں تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ سب بے کار ہوگا۔ جب تک مسلمان زبان کے عذاب سے نہیں نکلیں گے یعنی زبان کو بجائے ذریعہ اظہار کے اپنی علمیت کی تشہیر کا وسیلہ بنائے رکھیں گے، تب تک دیگر علوم کی ترقی بے حد مشکل ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے رفقا کے ساتھ اردو زبان کو بدلنے کی جدوجہد شروع کی۔ خود بھی لکھا اور دوسروں سے بھی لکھوایا۔ نہ صرف نثر بلکہ نظم کی اصلاح بھی کی اور ان کی کاوش سے مدوجزرِ اسلام جیسی نظمیں وجود میں آئیں۔

سرسید کی تحریک کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زبان اور خاص طور سے تحریروں میں آسان اردو لکھنے کا رواج چل نکلا تھا۔ اخبارات اور رسائل نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ جب زبان آسان ہوئی تو رسم الخط بھی آسان اختیار کیے جانے لگے۔ اردو پریس کے عہد میں داخل ہوئی تو اس کی قسمت کھل گئی تھی۔ حالانکہ ابھی اس کی مشکلات انگریزی بلکہ برّصغیر کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں۔ اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل نہیں تھی۔ سوائے حیدرآباد دکن کے جہاں نظام سرکار نے اسے اپنی سرکاری زبان قرار دے رکھا تھا۔ ابھی تک اردو کی ترقی بدستور افراد کی مرہونِ منت تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُمید بندھی تھی کہ اب اردو ملک کی سرکاری زبان بنے گی اور اسے اس کا صحیح مقام مل جائے گا۔ پہلا خواب تو پورا ہوگیا لیکن دوسرا ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ انگریزی کے مقابلے میں اردو سے ہمیشہ سوتیلی اولاد کا سا سلوک کیا گیا۔ اسے حقیر اور غیر ترقی یافتہ زبان قرار دیا گیا۔ مغرب زدہ بیوروکریٹ طبقہ دلیل دیتا تھا کہ جس زبان میں ایک معیاری ٹائپ رائٹر نہیں بن سکا وہ کیوں کر دفتری اور سرکاری زبان ہوسکتی ہے۔ جبکہ انگریزی نہ صرف ایک بین الاقوامی زبان ہے جس میں ہر قسم کے علوم کا بے پناہ ذخیرہ ہے بلکہ یہ گزشتہ دو صدیوں سے مشینی ٹائپ استعمال کررہی ہے۔

بے شک یہ دلیل درست تھی لیکن ہمارے حکمران ایک چیز کو نظرانداز کرگئے کہ انگریزی اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ایک غیر ملکی زبان تھی اور علم کی اشاعت اپنی ہی زبان میں سب سے بہترین ہوتی ہے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی اردو کی ترقی کے لیے جتنے ادارے بنے، سب ذاتی طور پر قائم ہوئے۔ ان میں سے کوئی ایک ادارہ بھی حکومت نے قائم نہیں کیا۔ چاہے وہ حکومت گورے انگریزوں کی ہو یا کالے انگریزوں کی سائنٹیفک سوسائٹی سے مقتدرہ قومی زبان تک افراد کی مرہونِ منت رہی تھی اور ان لوگوں کا اخلاص ہی تھا جو اردو نے اس دور میں بھی اور تمام تر مخالفت کے باوجود اپنا آپ منوالیا۔ اب آپ کسی بھی شعبے میں اردو کو انگریزی یا کسی بھی بین الاقوامی زبان سے کم تر قرار نہیں دے سکتے۔ ان افراد میں سرسید بھی تھے۔ الطاف حسین حالی، مولوی عبدالحق بھی تھے اور میجر آفتاب حسن بھی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین جیسی علمی شخصیت اردو کی وکیل تھی۔ مگر اس

سرگزشت کی شخصیت ایک اور فرد ہے جس نے اردو کو کمپیوٹر کے دور میں داخل کیا۔ یہ فرد..... مرزا جمیل ہیں جنہوں نے اردو کے لیے تنِ تنہا وہ کام کیا جو کسی بھی دوسری زبان کے لیے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں افراد نے مل کر ضرور کیا ہوگا۔

دنیا جب کمپیوٹر کے وجود سے آشنا ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ آیا جسے ہزار طریقے سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ غالباً چراغ الہ دین کا جن بھی اتنے کام نہیں کرسکتا تھا جتنے کہ کمپیوٹر کرتا ہے اور اس کے روز نت نئے استعمال وجود میں آرہے ہیں۔ صرف ایک شعبے یعنی پبلشنگ نے اس سے جو فائدہ اٹھایا' وہ آج سب کے سامنے ہے۔ صرف اس شعبے میں کمپیوٹرز سالانہ اربوں ڈالرز کا کاروبار کررہے ہیں۔ وہ دور گیا جب کاتب ہاتھ سے لکھتا تھا تو جاکر چھپائی کے لیے چیز تیار ہوتی تھی پھر کاتب کے لیے مہارت بھی شرط تھی لیکن آج کے دور میں ایک عام سا فرد (یعنی راقم بھی) کمپیوٹر پر اعلیٰ درجے کی اردو کمپوزنگ کرسکتا ہے اور اس کی رفتار کسی بھی کاتب سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

یورپ اور امریکا نے تو اس ایجاد سے فوراً فائدہ اٹھایا اور وہاں کتابت کمپیوٹر پر ہونے لگی حالانکہ پہلے بھی ان کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ کتابت ٹائپ رائٹروں بلکہ مشینوں پر ہوا کرتی تھی۔ لیکن کمپیوٹر کے استعمال سے وقت اور سرمائے دونوں کی بچت ہونے لگی۔ اوّل تو ٹائپ رائٹر کی رفتار سست تھی۔ دوسرے غلطی سے بعض اوقات پورا صفحہ ضائع ہوجاتا تھا اور اسے نئے سرے سے لکھنا پڑتا تھا۔ جب کہ کمپیوٹر میں یہ غلطی ایک بٹن دبا کر درست کی جاسکتی تھی۔ رفتار میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا۔ سب سے بڑھ کر کمپیوٹر پر کی جانے والی کمپوزنگ کو بغیر چھاپے بھی کہیں پر بھی منتقل کرنا آسان تھا۔ بالکل ایسے جیسے ٹیلکس یا فیکس آتے جاتے ہیں۔ اس کی ترقی یافتہ شکل انٹرنیٹ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک اخبار جو متعدد جگہوں سے شائع ہوتا تھا یا ایسے رسائل جو مختلف ممالک سے مختلف ایڈیشن نکالتے تھے' ان کے لیے ضروری نہیں رہا کہ ہر جگہ کمپوزنگ کے لیے الگ عملہ رکھیں۔ صرف مقامی ایڈیشن کے لحاظ سے معمولی ردّوبدل کی جاتی جو چند افراد پر مشتمل عملہ بھی آسانی سے کرلیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ریڈرز ڈائجسٹ ہے جس کے دنیا بھر میں کئی درجن ایڈیشن نکلتے ہیں۔

لیکن جہاں تک اردو کا تعلق ہے' ابھی تک ہم اردو ٹائپ رائٹر ہی نہیں بنا پائے تھے اور آج بھی جب کہ اسے بنے ہوئے تین دہائیاں گزر چکی ہیں' سوائے چند ایک سرکاری اداروں کے شاذ ہی کہیں ٹائپ رائٹر استعمال ہورہا ہو۔ اس کی وجہ ایک تو حکومت کا ہی رویہ ہے کہ اردو قومی زبان بے شک ہوسکتی ہے لیکن سرکاری زبان نہیں۔ دوسرے ٹائپ رائٹر سے اردو لکھنا اچھا خاصا مشکل کام ہے جسے خاص مہارت کے افراد ہی کرسکتے ہیں۔ اس پر بھی رفتار نہایت سست ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کمپوزنگ کی آمد سے قبل پبلشنگ کا سارا ہی کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ بڑے بڑے اخبارات ہاتھ کی کتابت سے تیار ہوکر شائع ہوتے تھے کیونکہ ٹائپ رائٹر پر نہ تو یہ کام ممکن تھا اور نہ ہی اسے کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جبکہ ساری دنیا میں طباعت کمپیوٹر پر منتقل ہوچکی تھی۔ ہمارے ہاں اب تک ہاتھ سے یہ کام ہورہا تھا۔ جس نے پبلشنگ انڈسٹری کو محدود کردیا تھا۔ نہ تو حکومت کو اور نہ ہی کسی بڑے پبلشنگ کے ادارے کو فکر تھی کہ اردو کمپوزنگ کو کمپیوٹر پر لانے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ یہ خیال سب سے پہلے ... مرزا جمیل کے ذہن میں آیا تھا۔

○☆○

ان دنوں تحریکِ خلافت عروج پر تھی۔ پورا برّصغیر خاص طور سے مسلم علاقے اس تحریک کے طوفان میں ڈول رہے تھے۔ مسلمانوں کی توانائیاں ایک ایسی تحریک پر صرف ہورہی تھیں جو ابتدا سے ناکامی کی طرف گامزن تھی۔ اگرچہ اس کی شدت نے انگریز حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پورا شمالی ہندوستان اور مسلم عظمت کے نشان دہلی' لکھنؤ اور علی گڑھ اس تحریک کے خاص مراکز تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد پہلی بار مسلمانانِ برّصغیر کسی سیاسی تحریک میں حصہ لے رہے تھے۔

ان حالات میں ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو..... مرزا جمیل نے ایک مغل گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے آباواجداد وسط ایشیا سے ترکی بولتے آئے تھے۔ ہندوستان کے ماحول میں انہوں نے فارسی کو اپنالیا اور مغل حکومت کے خاتمے تک فارسی سرکاری زبان رہی۔ اردو گلی کوچوں میں پلتی رہی تھی۔ جب مسلم دشمنی میں انگریزوں نے فارسی کو حکومت اور نصاب سے خارج کردیا اور اس کی جگہ اردو کو آگے کیا تو مسلمانوں نے بھی اردو کو اپنی زبان تسلیم کرلیا۔ دہلی اور لکھنؤ اس کے گڑھ بن گئے تھے۔ لکھنؤ مشکل پسندی میں آگے تھے۔ وہاں مسجع اردو پسند کی جاتی تھی تو دہلی میں معیاری اردو بولی جاتی تھی۔ جس میں فارسی سے زیادہ ترکی اور عربی کے ساتھ کسی

قدر ہندی کا اثر تھا۔ غالب بھی اپنی شاعری سے اس زبان کو نہیں بدل سکے تھے۔ مجبوراً انہوں نے نثر میں وہ زبان اپنائی جو بعد میں مقبولِ عام ہوئی تھی۔

....مرزا جمیل کا خاندان بھی اردو کا خادم تھا۔ ان کے والد اور چچا اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔ ان کے بڑے بھائی مرزا منظور احمد مصور تھے۔ انہوں نے قائدِاعظم کی تصویر بنا کر پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ گھر میں ہر طرف کاغذ، قلم اور خوش خطی کا راج تھا۔ یہ گھریلو ماحول کا اثر تھا اور کچھ فطری صلاحیت کہ مرزا جمیل کو بچپن سے آرٹ سے لگاؤ تھا۔ ابھی وہ پانچ برس کے ہی تھے کہ ان کے خاندان نے دہلی سے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ مرزا جمیل کے لیے یہ فیصلہ سود مند رہا کہ والد صاحب نے انہیں جے جے فائن آرٹس اسکول میں داخل کرا دیا لیکن اس سے پہلے ہی وہ والد صاحب سے دینی تعلیم کے علاوہ خوش خطی اور خوش نویسی کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ اپنی فطری صلاحیت کی بدولت وہ جلد اسکول کے ممتاز طالبِ علموں میں شمار ہونے لگے تھے۔ دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں کی طرح جے جے فائن آرٹس اسکول میں بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس شعبے میں کوئی مسلمان ان سے آگے نہ نکلنے پائے۔

مگر جمیل کی صلاحیتوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ انہوں نے اسکول سے اوّل انعام حاصل کرنے والے پہلے مسلمان طالبِ علم ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور امتیازی نمبروں سے آرٹ کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد دو سال کا میرین ڈیکوریشن کا ڈپلوما کیا لیکن اس وقت.... مرزا جمیل اور دوسرے فائن آرٹس کے طلبہ میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ان کا آرٹ کا کام اچھا تھا لیکن اسے غیر معمولی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ یہی حال خطاطی کا تھا۔ وہ کئی خطوں میں کام کرنے کے ماہر تھے لیکن انہیں ماہرِ فن نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ ان کے والد یا چچا تھے۔ خاندان کے دیگر کئی افراد بھی اس کام میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے لیکن مرزا جمیل ان میں نمایاں نہیں تھے۔

اسی زمانے میں انہوں نے بھانپ لیا کہ آنے والا دور آرٹس میں بے شمار تبدیلیاں لائے گا اور بے شمار نئے فنون آئیں گے تو بے شمار پرانے فنون مٹ جائیں گے۔ ان دنوں وہ ایک منفرد میدان میں ڈپلوما رکھنے اور امتیازی انعام حاصل کرنے کے باوجود وہ بے روزگار پھر رہے تھے۔ جیسا کہ بتایا، اسی میدان میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی اور وہ کسی مسلمان کو اس شعبے میں آگے نہیں آنے دیتے تھے۔ سوائے ان کے جن کے پاس غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی تھیں یا قسمت یاوری کرتی۔ ان دنوں آرٹ تیزی سے کمرشل حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ خاص طور سے برِصغیر کی فلمی صنعت نے اس شعبے میں بے شمار آسامیاں پیدا کی تھیں۔ مرزا جمیل نے بھی اس شعبے میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

مگر اس سے پہلے ہی قسمت نے انہیں ایک موقع دیا۔ اس زمانے میں وہ تصویریں بنایا کرتے تھے۔ حبیب بینک نے ایک یتیم خانہ قائم کیا اور اس کے لیے جن چالیس افراد نے سب سے زیادہ عطیہ دیا تھا ان کی تصویریں بنوا کر یتیم خانے میں آویزاں کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقابلے میں بے شمار لوگ شریک ہوئے لیکن کامیابی مرزا جمیل کے حصے میں آئی۔ ان کا انتخاب ایک کمیٹی نے کیا تھا اور یہ انتخاب خالصتاً صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوا تھا۔ طے ہوا کہ انہیں ایک تصویر کا پچاس روپے معاوضہ دیا جائے گا۔ مرزا جمیل نے محض ایک مہینے میں ہی یہ چالیس تصویریں تیار کردیں اور دو ہزار روپے کمائے۔ انہیں آج کے دو لاکھ کے برابر ہی سمجھیے۔

اس کام سے پہلے مرزا جمیل کے والد اکثر کہا کرتے تھے "یہ بھوکا مرے گا۔ بھلا آرٹ کی کس کو ضرورت ہے؟"

مرزا جمیل کو ان سے اختلاف تھا لیکن وہ ان کے احترام میں خاموش رہا کرتے تھے۔ انہیں بہ خوبی معلوم تھا کہ آنے والا دور آرٹ کا ہے۔ اور یہ شعبہ بے حد ترقی کرے گا۔ ابتدا میں انہیں شدید محنت کرنا پڑی تھی۔ بمبئی میں قیام کے دوران میں مرزا جمیل نے بے شمار تصاویر بنائی تھیں۔ وہ زیادہ تر رئیل آرٹ میں کام کرتے تھے اور اس کی مانگ بہت کم تھی۔ اس لیے سال بھر میں چند ایک تصاویر ہی بکا کرتی تھیں بعد میں وہ اپنا سارا ہی کام ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان چلے آئے تھے۔ اب نہ جانے یہ فن پارے کہاں ہوں گے۔

مرزا جمیل کے ایک دوست تھے باسودیش پرشاد سنگھ۔ انہوں نے فلم سازی کا لائسنس خریدا۔ فلم سازی اس دور میں اتنا نفع بخش پیشہ تھا کہ حکومت اس کی اجازت کے بدلے معقول فیس لیا کرتی تھی۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس زمانے میں ریلیز ہونے والی نوّے فیصد فلمیں کامیاب ہوتی تھیں جبکہ اس صنعت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور باقی دس فیصد بھی کسی نہ کسی طرح اپنی لاگت نکال جایا کرتی تھیں۔ انشورنس کمپنیاں بلا جھجک فلمی پروجیکٹس کو انشورڈ کرلیا کرتی تھیں۔ باسودیش نے مرزا جمیل کو بھی اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی تھی۔ جو انہوں نے قبول کرلی۔ فلم

پروجیکٹ ایران کی ثقافت کے بارے میں تھا۔ باسودیش کتنے ہی دوست سہی لیکن تھے تو ہندو' جب انہوں نے مرزا جمیل کے تین مہینے کی محنت کا معاوضہ صرف پچاس روپے دیا تو ان کا دل کھٹا ہوگیا کیونکہ اتنی رقم تو انہوں نے ایک دن میں کمائی تھی جب وہ یتیم خانے کے لیے تصویریں بنا رہے تھے۔

فلم کی تیاری کے زمانے میں ہدایت کار پی سی بروا کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ انہیں اس نوجوان میں کچھ نظر آیا تو انہوں نے ..... مرزا جمیل کو اپنے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کردی۔ یہ اتنی بڑی پیش کش تھی کہ ان کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ بروا بہت سخت مزاج شخص تھے اور مرزا جمیل کو فلم آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کا اندازہ انہیں باسودیش کی فلم کی تیاری کے دوران میں ہوگیا تھا۔ دوسری طرف بروا کا یہ حال تھا کہ معمولی سی خطا پر برطرفی تو ہوتی ہی تھی' بے عزتی الگ ہوتی تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ کام کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ لیکن مرزا جمیل کو چیلنج قبول کرنے میں مزہ آتا تھا اور یوں بھی وہ پی سی بروا کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوگئے تھے۔

ان دنوں برّصغیر کا فلمی مرکز بمبئی نہیں بلکہ کلکتہ تھا۔ جہاں سال میں بے شمار فلمیں بنا کرتی تھیں۔ بہت سارے فلم اسٹوڈیو تھے۔ درحقیقت یہ ہالی ووڈ کے بعد دنیا میں دوسرا بڑا فلمی مرکز تھا اور تکنیکی سہولتوں کے لحاظ سے بھی اس سے کم نہیں تھا۔ برّصغیر کے فلمی آسمان پر آفتاب بن کر چمکنے والی متعدد شخصیات نے کلکتہ سے ہی اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا۔ پی سی بروا بھی کلکتے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا فلم اسٹوڈیو بھی وہیں تھا۔ کلکتہ آکر معلوم ہوا کہ وہ فلم آرٹ کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے تھے۔ بے شک وہ آرٹ کے ماہر تھے لیکن فلم آرٹ ایک قطعی مختلف چیز ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ عنقریب انہیں بے عزتی کے ساتھ رخصت کردیا جائے گا۔

مگر پی سی بروا نے انہیں ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ اتنے کم عقل نہیں تھے کہ مرزا جمیل کو فلم آرٹ کا ماہر سمجھ لیتے۔ جن کی عمر ابھی بہ مشکل اکیس بائیس سال تھی لیکن انہوں نے نوجوان جمیل کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اس نوجوان پر محنت کی جائے تو یہ بہت جلد سب کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ فلم آرٹ سے مراد ہے کہ ایک فلمی سین کے پس منظر میں جو نظر آرہا ہے۔ اسے ترتیب دینا۔ مثال کے طور پر گاؤں کا منظر' رقص کے اسٹیج اور عالی شان محلات کے سیٹ' یہ سب بالکل حقیقی نظر آنے چاہئیں تاکہ شائقین کو مصنوعی پن کا احساس نہ ہو۔ یہ آرٹ ڈائریکٹر پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک حقیقی نظر آنے والے سیٹ بناتا ہے۔ جس طرح ہدایت کار اداکاروں سے کام لیتا ہے اس طرح آرٹ ڈائریکٹر بے جان چیزوں سے کام لیتا ہے۔

جس وقت مرزا جمیل کلکتہ سے بوریا بستر گول کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے' خوش قسمتی سے ان کی ملاقات والد کے ایک دوست محمد حسین سے ہوگئی جو سیٹ ڈیزائننگ اور سیٹ اریکشن کے ماہر تھے۔ جب انہیں جمیل کی مشکل کا علم ہوا تو انہوں نے فراخ دلی سے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔"

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ مرزا جمیل فوراً محمد حسین کے ساتھ ہوگئے۔ جو آرٹ ڈائریکٹر تو نہیں تھے لیکن اس شعبے میں ان کا تجربہ کسی بھی آرٹ ڈائریکٹر سے کم نہیں تھا۔ فلمی دنیا کا یہ نرالا دستور تھا اور رہا ہے کہ وہاں صلاحیتوں سے زیادہ فرد کو دیکھا جاتا ہے۔ فلم انڈسٹری میں بندہ جاتا کسی اور مقصد سے ہے اور اسے وہاں کسی اور کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ اب فلم آرٹ سے نا آشنا ایک شخص ... فلم ڈائریکٹر تھا جبکہ اس کام کا ماہر صرف سیٹ اریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن اس دور کی ایک خصوصیت قناعت بھی تھی۔ لوگ اپنی جگہ خوش اور مطمئن رہا کرتے تھے۔ کم ہی لوگوں کو شکایت ہوتی تھی کہ انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں ملا۔ یہی وجہ تھی کہ بے شمار تجربہ کار افراد معمولی کاموں میں لگے ہوئے تھے تو بہت سارے ناتجربہ کار اونچی جگہوں پر جا پہنچے تھے۔ اس کے باوجود لوگوں میں حسد کا مادہ کم تھا۔ محمد حسین نے پورے خلوص اور لگن سے اس نوجوان کو کام سکھانا شروع کردیا۔

بہ قول مرزا جمیل' سیٹ لگانا بلکہ اسے ڈیزائن کرنا بھی ایک بے حد مشکل کام تھا۔ بعض اوقات تو ہم تین تین دن لگاتار کام کرتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلم کو شیڈول کے مطابق چلنا ہوتا تھا اور سیٹ کے بغیر فلم کیوں کر بنتی۔ دوسرے یہ کہ اکثر سیٹ اسٹوڈیو میں لگائے جاتے تھے۔ جن کا کرایہ ادا کیا جاتا تھا۔ لہٰذا فلم سازی کی کوشش ہوتی تھی کہ جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر کرائے کی رقم بچائے۔ شامت بے چارے سیٹ ڈیزائنر اور اس کے عملے کی آجاتی تھی۔ جنہیں دن رات کی پروا کیے بغیر بہرصورت اپنا کام مقررہ مدت میں ختم کرنا ہوتا تھا۔

یہ دو تین سال مرزا جمیل کے لیے بے حد سخت تھے۔ گھر سے دور ایک ایسے شہر میں تھے جہاں ہم زبان بھی مشکل سے

ملتا تھا۔ وہ دہلی کی نفیس ڈھلی ہوئی اردو بولا کرتے تھے۔ جبکہ کلکتہ میں اوّل تو بنگالی بولی جاتی تھی اور اگر کوئی اردو بولتا بھی تھا تو اتنی بگڑی ہوئی کہ سمجھنا مشکل تھا۔ مرزا جمیل کو بنگالیوں کا مزاج بالکل مختلف اور اپنی طبع کے خلاف لگا۔ اگر روزگار کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ یہاں ہرگز نہ ٹھہرتے۔

۱۹۴۷ء میں پی سی بروا اپنی کثرت شراب نوشی کے ہاتھوں بیمار ہوگئے اور صحت کی بحالی کے لیے یورپ چلے گئے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے افراد بے روزگار ہوگئے تھے۔ ان میں مرزا جمیل بھی شامل تھے لیکن وہ گزشتہ چار پانچ سال میں اتنا سیکھ چکے تھے کہ انہوں نے کہیں ملازمت کرنے کے بجائے اپنا آرٹ اسٹوڈیو قائم کرلیا اور معاوضے پر فلم سازوں کے لیے کام کرنے لگے۔ جلد ہی مووی آرٹ نامی اس ادارے نے کلکتہ میں اپنی ساکھ بنالی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب فلم کے متعلق کسی بھی شعبے میں آزادانہ کام کرنے کا تصور نہیں تھا۔ سب فلم ساز اسٹوڈیو سے منسلک ہوتے تھے حتیٰ کہ اداکار بھی اسٹوڈیو کے ملازم ہوتے تھے۔ لہٰذا پورے کلکتہ میں گنتی کے آرٹ اسٹوڈیو تھے اور وہ بھی بڑے فلم سازوں کی ملکیت تھے۔ ان کے مقابلے میں مرزا جمیل کے پاس سوائے صلاحیتوں کے کچھ نہیں تھا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو منوا کر دم لیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب برّصغیر کی فضا پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ تقسیم ہندوستان مقدر ہوچکی تھی اور انگریز و ہندو اس مقدر سے لڑنے کی سکت تو نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اس کی جھلاّہٹ مسلمانوں پر نکالنے کی تیاری کررہے تھے۔ اور جیسے ہی تقسیم کا اعلان ہوا، خوں ریز ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ مرزا جمیل کے گھر والے جو دوبارہ دہلی چلے گئے تھے، ہنگاموں کی زد میں آگئے۔ بلوائیوں نے ان کا مکان جلادیا تھا اور وہ بہ مشکل جان بچاکر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی پرانے قلعے میں پناہ لی تھی۔ مرزا جمیل کو معلوم ہوا تو وہ کسی نہ کسی طرح دہلی جاپہنچے اور انہوں نے گھر والوں کو بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی روانہ کردیا۔

"تم بھی چلو" بھائی بہنوں نے اصرار کیا۔

"میں اپنا جما جمایا کام چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں" مرزا جمیل نے عذر پیش کیا۔ "پھر بنگال کے حالات پُرسکون ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ تقسیم کے وقت بنگال میں وہ خوں ریزی نہیں ہوئی تھی جو برّصغیر کے دوسرے خطوں میں ہوئی تھی۔ مگر کلکتہ کا عظیم فساد ہی سب پر بھاری تھا۔ جب ایک ہی دن میں پچاس ساٹھ ہزار افراد مارے گئے تھے۔ اسی روز کلکتہ کے گلی کوچے لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ اس خانہ جنگی نے کمپنی سرکار کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ برّصغیر کے مسائل کا حل تقسیم ہی میں ہے۔ مرزا جمیل نے ان خونی فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتے تھے۔ گھر والوں کے بعد انہوں نے رختِ سفر باندھا اور دوبارہ کلکتہ آگئے۔ یہ جولائی ۱۹۴۷ء کے دن تھے۔ اگلے دو سال تک مرزا جمیل وہیں سے گھر والوں کو رقم بھیجتے رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کا کام بہت اچھا چل رہا تھا لیکن حالات رفتہ رفتہ تبدیل ہورہے تھے۔ کلکتہ سے فلم ساز بمبئی کا رخ کررہے تھے اور کلکتہ کی فلمی صنعت رفتہ رفتہ مقامی نوعیت کی بنتی جارہی تھی۔ جہاں زیادہ تر بنگلہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔

ان حالات میں مرزا جمیل نے محسوس کیا کہ اب انہیں کلکتہ سے رختِ سفر باندھ لینا چاہیے۔ ایک دن اچانک وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچھ دوستوں کے ہمراہ کلکتے سے ڈھاکا جاپہنچے۔ یہ ۱۹۴۹ء کا زمانہ تھا۔ ڈھاکا میں بھی ان کے بہت سارے جاننے والے تھے۔ جن میں خواجہ محمد بھی شامل تھے۔ جو کلکتے میں اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس تھے اور بعد میں انہوں نے پاکستان کی جانب سے سفارت کاری کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ انہوں نے مرزا جمیل کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ ڈھاکا میں ہی رہ جائیں لیکن مرزا جمیل اب بنگال کی سرزمین سے بے زار ہوچکے تھے۔ لہٰذا وہ کراچی چلے آئے جہاں ان کے دیگر گھر والے رہ رہے تھے۔ بہت عرصے بعد انہوں نے گھریلو ماحول دیکھا تھا۔

کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے۔ دولت اور ملازمت بھی ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بن سکی اور وہ پاکستان کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھوں چلے آئے تھے۔ مرزا جمیل کا کلکتے میں ہزاروں کا کاروبار تھا۔ صرف گڈول ہی ہزاروں کی تھی۔ وہ چاہتے تو ٹھاٹ سے وہاں رہتے لیکن وطن اور گھر والوں کی محبت انہیں کھینچ لائی۔ اس وقت وہ جوان تھے۔ ان کے پاس ہنر تھا اور صلاحیت بھی۔ کام کا تجربہ اضافی تھا لیکن کراچی میں مواقع کم تھے۔ نئی نئی مملکت بنی تھی اور ابھی تو تقسیم کے زخم ہی نہیں بھرے تھے۔ برباد بھی ابھی آباد نہیں ہوئے تھے۔ نہ صنعت تھی نہ تجارت۔ ایسے میں کام کہاں سے ملتا۔

مرزا جمیل بھی بے روزگاری کے کڑے دن صبر شکر سے گزارنے لگے۔ تلاشِ بسیار کے بعد ایک اشتہاری ایجنسی

میں کام ملا۔ انہوں نے مرزا جمیل سے خوب کام لیا اور مہینے بھر بعد انہیں پچیس روپے تھمائے تو اگلے دن وہ ملازمت پر گئے ہی نہیں۔ یہ ان کی صلاحیتوں کی توہین تھی۔ اس زمانے میں وہ پلازہ سینما کے پاس رہتے تھے اور روزانہ کام کی تلاش میں میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) تک پیدل آتے اور جاتے تھے لیکن روزگار کی دیوی تھی کہ ان پر مہربان ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ ہر آنے والا دن ایک نیا حوصلہ دیتا تھا اور ہر جانے والی شام مایوسی دے کر جاتی تھی۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ لوگ ان کے کام سے واقف نہیں تھے۔ بات صرف قسمت کی تھی جو ان کا صبر آزما رہی تھی۔ اور پھر تقدیر کو ان کی صبرو شکر والی بات پسند آگئی۔ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے، صرف خدا سے لو لگائے رہتے تھے، جو مانگنا ہوتا تھا، اسی سے مانگتے تھے اور پھر اس نے ایسا عطا کیا کہ انہیں زندگی بھر کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اصل چیز تو دل کا اطمینان تھا جو انہیں بے حساب میسر تھا۔ وہ دل کے غنی تھے۔

ان ہی دنوں نیشنل ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو آرٹ ڈائریکٹر کی ضرورت پیش آئی۔ مرزا جمیل نے بھی اسامی کے لیے درخواست بھیجی تھی اور انہیں منتخب بھی کر لیا گیا تھا۔ بے روزگاری کے سخت دن گزارنے کے بعد پانچ سو روپے ماہانہ کی ملازمت کسی بادشاہی سے کم نہیں تھی لیکن تنخواہ سے زیادہ مرزا جمیل کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان سے ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جا رہا تھا۔ آرٹ ڈائریکٹر کی ملازمت ایک فنی کام تھا اور وہ فن کی دنیا میں ہی مطمئن رہتے تھے۔ ایجنسی کے مالکان ان کے کام سے اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے تیسرے مہینے ان کی تنخواہ میں ڈیڑھ سو کا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اب ساڑھے چھ سو روپے تنخواہ لے رہے تھے۔ اسے آج کے پچاس ہزار کے برابر سمجھئے۔

کوئی اور ہوتا تو اس پُرآشوب دور میں ایسی شاندار ملازمت پر قناعت کر کے بیٹھ جاتا۔ لیکن مرزا جمیل کا نقطۂ نظر کبھی ملازمت یا اچھی تنخواہ نہیں رہی تھی۔ وہ اچھا کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی ملازمت اور اپنے کام سے بے حد مطمئن تھے کہ ایک واقعے نے ان کی سوچ کو بدل دیا۔ ایجنسی کا دفتر اس زمانے میں برنس روڈ پر تھا جو آج کل محمد بن قاسم روڈ کہلاتی ہے۔ ایجنسی میں مختلف افراد کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک دن ایک صاحب سنسنی خیز خبر لے کر آئے کہ ان کے دفتر میں ایک نئی طرح کی پرنٹنگ مشین آئی تھی جسے بلاک کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اسے کاغذ پر نمونہ دیا جائے تو وہ ویسا ہی دوسرا نمونہ بنا دیتی ہے۔ مرزا جمیل بھی ہکا بکا رہ گئے تھے کیونکہ ان کے علم میں ایسی کوئی مشین نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اپنی معلومات اپ ٹو ڈیٹ کرتے رہتے تھے۔

"میاں جی، وہ کوئی اور مشین ہوگی" انہوں نے ان صاحب کو سمجھایا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کوئی بھی پریس مشین بغیر بلاک کے کام نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

لیکن وہ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے "آپ کو یقین نہیں ہے تو میرے ساتھ چل کر دیکھ لیجیے۔"

اتفاق سے ان صاحب کا دفتر سڑک پار کی ایک بلڈنگ میں تھا۔ فرصت پاتے ہی مرزا جمیل وہاں پہنچ گئے اور جب وہاں جا کر دیکھا تو وہ مشین ڈپلی کیٹر نکلی جسے وہ صاحب بغیر بلاک کا پریس قرار دے رہے تھے۔ یہ ڈپلی کیٹر آج بھی ذرا سی تبدیلیوں کے ساتھ دفتروں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں فوٹو کاپیئر نہیں ہوتے تھے یہ بہت بعد میں آئے تھے۔ ڈپلی کیٹر ایک مہنگی مشین ہوتی ہے اور صرف وہاں کارآمد ہوتی ہے جہاں کسی ایک دستاویز کی بہت ساری کاپیاں مقصود ہوں۔ ایک آدھ خط یا کاغذ کے لیے اس کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کوئی فوٹو کاپی کا کام پریس سے لے لے۔

یہ جرمنی کی تیار کردہ ڈپلی کیٹر تھی۔ اتفاق سے روٹا پرنٹ کا ایک دفتر کراچی میں تھا۔ مرزا جمیل ان سے جا کر ملے اور معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ڈپلی کیٹر ہے۔ مرزا جمیل نے یہ اطلاع دوسروں تک پہنچائی تو کئی دن تک ان صاحب کا مذاق اڑتا رہا لیکن اس واقعے نے مرزا جمیل کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آرٹ کی دنیا میں مشینوں کا عمل دخل بڑی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے اور پاکستان میں اس کا ابھی کوئی شعور نہیں تھا۔ آرٹ انڈسٹری کو آگے آنے اور دوسرے ممالک کے ہم پلہ ہونے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ کلکتہ میں جدید ترین مشینیں دیکھ چکے تھے اور استعمال بھی کر چکے تھے اور یہاں لوگوں کو ابھی ان کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

یہ وہ دور تھا جب کوئی بھی شخص اپنے ساتھ اپنے شعبے کی فلاح کے بارے میں بھی سوچتا تھا۔ جذبہ ایک دوسرے سے نہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے مقابلے کا ہوتا تھا۔ ہر شخص میں جذبہ ہوتا کہ اس کا ملک کسی معاملے میں کسی دوسرے ملک، خاص طور سے ہندوستان سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اس کے لیے وہ مالی منفعت کی پروا کیے بغیر تن من دھن سے کام کر رہے تھے۔ افسوس کہ آج یہ جذبہ اتنا نہیں رہا۔

مرزا جمیل نے اس چیز کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ وہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہو گئے۔ دوستوں اور بہی

خواہوں نے روکا کہ اتنی اچھی ملازمت کیوں چھوڑ رہے ہو، یہ بے وقوفی مت کرو لیکن مرزا جمیل فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد انہوں نے جو کام کیے وہ یقیناً ان کی ملازمت سے ہزار گنا زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ملک میں پبلشنگ کو ایک نیا معیار دیا تھا۔ اس میں جدت متعارف کرائی تھی۔ یہ سچ ہے کہ بہت سارے لوگ "بے وقوفیاں" نہ کریں تو ترقی کا عمل رک جائے۔

پبلشنگ کے شعبے میں آنے کا فیصلہ انہوں نے ایک اور وجہ سے بھی کیا تھا۔ ان کا سارا خاندان ہی آرٹ سے وابستہ تھا مگر ان میں کاروباری ذہنیت نہیں تھی۔ ان کے کام سے دوسروں نے لاکھوں کما لیے لیکن انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ اگر مرزا جمیل پبلشنگ شروع کرنا چاہتے تو ان کے پاس ان کے والد اور بھائی کا کام ہی بہت پڑا تھا۔ والد نے خوش نویسی اور طغریٰ سازی میں اعلیٰ معیار کا بہت سارا کام کیا اور بڑے بھائی منظور احمد تو تھے ہی مصور۔ جب مرزا جمیل اپنے پبلشنگ ادارے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو بہت سارے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ صرف پرنٹر کیوں نہیں بن جاتے جو زیادہ نفع بخش کام ہے۔ جبکہ پبلشنگ ہمارے ملک میں ایک دردِ سر سے کم نہیں ہے۔ لیکن آسان کام کرنا ہوتا تو مرزا جمیل ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی ملازمت ہی کیوں چھوڑتے۔ لہٰذا وہ پبلشر بننے کے فیصلے پر قائم رہے۔ آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے مرزا جمیل کی پبلشنگ کی دنیا میں اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی تھی۔

اب مسئلہ پبلشنگ کے لیے سرمائے کا تھا۔ بے شک وہ سستا زمانہ تھا لیکن پھر بھی اس کام پر ہزاروں کا خرچہ آتا تھا۔ ایک سال کی نوکری اور اچھی ملازمت کے باوجود وہ کچھ خاص جمع نہیں کر سکے تھے کیونکہ ان کا خاندان بہت بڑا تھا اور اس کے خرچے بھی بڑے تھے۔ اس زمانے میں روٹا پرنٹنگ کی مشین پندرہ ہزار کی آ گئی تھی۔ اس موقع پر وہ لوگ آگے آئے جنہوں نے مرزا جمیل سے کام کروانا تھا۔ وہ اس حد تک آگے گئے کہ انہوں نے کاغذ اور سیاہی کی رقم پیشگی ادا کر دی تھی۔ اس رقم سے مرزا جمیل نے اپنی پہلی مشین خریدی۔ اس زمانے میں جرمنی کی بنی ہوئی مشینیں اعلیٰ معیار کی اور سستی ہوتی تھیں۔ دوسرے یہ ادارے جو مشینیں بناتے تھے، براہِ راست اپنے نمائندوں کے ذریعے مشین فروخت کیا کرتے تھے لہٰذا جب کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ کمپنیاں خود اسے حل کرنے کے لیے آگے رہا کرتی تھیں۔

مرزا جمیل نے اپنے ادارے کا نام ایلیٹ تجویز کیا تھا جو مختصر عرصے میں پبلشنگ کی دنیا میں معیار کی علامت بن گیا تھا۔ مشین لگتے ہی دن رات چلنے لگی تھی۔ آرڈرز کی اتنی بھرمار تھی کہ کسی طرح پورے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مرزا جمیل نے سوائے عید بقرعید کے کبھی چھٹی نہیں کی تھی۔ یہ معمول پورے دس سال جاری رہا تھا۔ اس زمانے میں اعلیٰ درجے کی کلر پرنٹنگ جسے سپر کلریشن بھی کہتے تھے یہاں نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس مقصد کے لیے یہاں کوئی مشین ہی نہیں تھی۔ اس لیے اعلیٰ درجے کے کلر کام کے لیے مرزا جمیل اپنی اشیا کو جرمنی بھیجا کرتے۔ جہاں یہ سپر کلریشن کے مرحلے سے گزر کر آتی تھیں اور انہیں پاکستان میں پرنٹ کیا جاتا تھا۔ قارئین کو یقیناً ایلیٹ کے کیلنڈرز، ڈائریاں اور پوسٹرز یاد ہوں گے جو مرزا جمیل کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

اس زمانے میں ملک میں لیتھوگرافی کا سامان بھی دستیاب نہیں تھا۔ سپر کلریشن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مرزا جمیل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ملک میں یہ تکنیکس متعارف کرائی تھیں۔ مشینوں کے بغیر یہ کام بے حد مشکل تھا۔ مرزا جمیل کے والد کو پرنٹنگ پریس، کیلی گرافی اور فوٹو لیتھوگرافی کا وسیع تجربہ تھا لیکن ملک میں اس کا سامان نایاب تھا۔ مرزا جمیل نے اس کا حل یہ نکالا کہ بلاک میکر سے کلر سیپریٹڈ نیگیٹو تیار کروائے اور پھر لال رنگ سے ڈاٹس کو ہلکا کیا اور اس کا نیگیٹو نکال لیا۔ یہ بے حد مشکل کام تھا کیونکہ نیگیٹو پلیٹوں پر بنتے تھے۔

اس زمانے میں کلر پرنٹنگ بے حد مشکل اور مہنگا کام تھا۔ ملک میں اچھے سامان و پریس، مشینوں اور ہنرمند افراد کی کمی تھی اس کے باوجود مرزا جمیل نے کام کے معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی چیز تیار ہو کر سامنے آئی تو گاہک تو بے حد مطمئن تھا لیکن خود مرزا جمیل کی فنکارانہ حس کی تسکین نہیں ہوئی لہٰذا انہوں نے کام مسترد کر کے اسے دوبارہ کروایا اور جب تک خود مطمئن نہ ہو گئے کام کو گاہک کے حوالے نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ مرزا جمیل معیار کے پیچھے دوڑتے ہیں اس لیے پیسہ ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس زمانے میں ان کے پاس بے حساب کام تھا۔ صبح سے رات بارہ بجے تک اخبارات اور رسائل کے کام چلتے تھے۔ اس کے بعد دو تین گھنٹے اپنا کام کرتے تھے اور صبح آٹھ بجے پھر پریس میں ہوتے تھے۔

روایت کے مطابق مرزا جمیل اور ایلیٹ کے حاسد

بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ اچھا کام کرنے والے سے لوگ حسد کرتے ہیں کہ خود تو نہ بن سکے تو اسے بھی تباہ کردیں۔ کاش کہ یہ رشک کا جذبہ ہوتا کہ ہم بھی ان جیسے بن جائیں تو آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔ ہم نے تو ہمیشہ معمار کے بجائے تخریب کار کا کردار ادا کیا ہے اور اب بھی ہماری حالت نہیں بدلی ہے کیونکہ مرزا جمیل کارکنوں کی قدر کرتے تھے اور ان پر مالی عنایات بھی جاری رکھتے تھے اس لیے قدرتی طور پر سب سے بہترین کارکن ایلیٹ کو میسر تھے۔ جب دوسرے پریسوں نے دیکھا کہ وہ ایلیٹ کے معیار کا... کام نہیں کرپارہے ہیں تو انہوں نے دن رات ایک کرکے انہیں کام سکھایا تھا۔ یہ تربیت پورے ملک میں کوئی اور شخص نہیں دے سکتا تھا۔ ان سے مرزا جمیل کا رشتہ باپ بیٹے کا سا تھا۔ انہوں نے اپنے کارکنوں کو اپنی اولاد کی طرح رکھا تھا بلکہ ان لوگوں سے ان کا واسطہ گھر والوں سے زیادہ پڑتا تھا۔ گھر وہ بہ مشکل تین چار گھنٹے کے لیے جاتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت پریس میں ان کارکنوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ کھانا پینا اور سونا جاگنا ان کے ساتھ تھا۔ وہ بالکل اپنے تھے۔

لیکن جب یہ "اپنے" اچانک دھوکا دے گئے تو مرزا جمیل کے دکھ کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے کسی کو باندھ کر نہیں رکھا تھا اور نہ ہی لازم تھا کہ ان سے سیکھنے والا صرف ان کے ساتھ کام کرے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے" ترقی ہمیشہ سفر سے ملتی ہے۔ ایک جگہ ٹھہرنے والا مسافر بھلا کیوں کر منزل پاسکتا ہے؟" وہ اکثر اپنے کارکنوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تمہیں کہیں بہتر موقع مل رہا ہے یا تم خود اپنا کام کرنا چاہ رہے ہو تو کبھی مت ہچکچاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔

مرزا جمیل نے دوسروں کو سکھانے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ حالانکہ وہ جو تعلیم دے رہے تھے' اگر کوئی انسٹی ٹیوٹ ہی کھول لیتے تو لاکھوں کماسکتے تھے لیکن انہوں نے یہ کام بلامعاوضہ کیا بلکہ کام سیکھنے والے لوگوں کو اپنی جیب سے دیا کرتے تھے۔ آج ان کے سکھائے سیکڑوں نہیں تو درجنوں لوگ ملک کی پریس اینڈ پبلشنگ انڈسٹری میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔ افسوس کہ لوگ ایسے بے غرضوں کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ بیک وقت کئی آدمی چلے جانے سے مرزا جمیل کو مالی طور پر دھچکا ہوا لیکن زیادہ دکھ اپنوں کے یوں دھوکا دینے کا تھا۔ وہ خاصے عرصے اس کے شاک میں مبتلا رہے تھے۔

ان کے گھر میں چمپا کا ایک پودا لگا تھا جو کچھ عرصے سے ایک جگہ رک گیا تھا۔ مزید نہیں بڑھ رہا تھا۔ بلیاں راتوں کو آکر چمپا کے اس پودے کے پاس لڑا کرتی تھیں۔ تنگ آکر ایک ملازم کی ڈیوٹی لگادی گئی کہ بلیوں کو اس کے پاس نہ آنے دینا۔ ایک رات بلیاں حسب معمول دھاچوکڑی مچا رہی تھیں کہ ملازم نے آکر کلہاڑی گھمائی۔ بلیوں کو تو کیا لگتی' ہاں چمپا کے پودے کا سر قلم ہوگیا۔ کئی دن بعد مرزا جمیل نے دیکھا تو چمپا کے کٹے ہوئے سرے سے آٹھ دس نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اچانک ان کے ذہن میں آیا کہ خدا ایک محرومی کے بدلے دس گنا نواز دیتا ہے تو پھر میں کیوں اتنا افسردہ ہو رہا ہوں۔ اگر لوگ جاتے رہتے ہیں تو نئے آتے بھی رہتے ہیں۔

قدرت کی اس فراخدلی سے انہوں نے دیکھا کہ کسی کو سکھانے میں کبھی بخل سے کام لینا نہیں چاہیے۔ یہی نصیحت ان کے والد کی تھی ورنہ اس حادثے کے بعد شاید وہ نئے آنے والوں کو سکھانے کا ارادہ ترک کردیتے اور یہ ملک کی پبلشنگ کے لیے ایک بڑا نقصان ہوتا۔ اس زمانے میں تو ہنرمند افراد کی قلت تھی۔ وہ اپنے کارکنوں کو کام سکھاتے تھے اور ساتھ ہی کہتے "دیکھو' تم لوگ صدر دروازے سے آرہے ہو۔ صدر دروازے سے ہی جانا۔ کبھی موری کا راستہ نہ اختیار کرنا۔ یہ کم ظرف لوگوں کی نشانی ہوتی ہے۔"

مرزا جمیل پہلے سے زیادہ تن من سے لوگوں کو سکھانے اور ایلیٹ کو ترقی دینے میں مصروف تھے۔ اس چمپا کی ایک شاخ ان کے پریس کے صدر دروازے پر لگی تھی جو ہمیشہ اس واقعے کی یاد دلاتی رہتی تھی۔

○☆○

اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی شخص مرزا جمیل کے پاس کوئی چیز چھپوانے کے لیے لاتا تو وہ اسے کہتے کہ پہلے اس کی اچھی کتابت کرا کے لائے پھر اسے چھاپیں گے۔ یہ سن کر وہ شخص پریشان ہوجاتا تھا کیونکہ اچھے کاتبوں کا ہمیشہ سے کال رہا ہے اور اعلیٰ درجے کے کاتب تو بہ مشکل ہی ملتے تھے۔ اس وقت ملک میں اعلیٰ درجے کے کاتبوں کی تعداد بہ مشکل سو بنتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر اخبارات اور پبلشرز کے پاس ملازم تھے اور جو آزادانہ کام کرتے تھے' ان کے پاس کام کا اس قدر انبار تھا کہ وہ کوئی بھی کتاب سال بھر سے پہلے کتابت کرکے نہیں دے سکتے تھے۔ انفرادی طور پر چھپوانے کے خواہش مند افراد کے لیے اچھی کتاب کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

خود مرزا جمیل کو بھی اس کا اندازہ تھا کیونکہ ان کے تایا اور چچا زاد بھائی بدستور خوش نویسی میں مصروف تھے اور وہ ان سے اس لیے کام نہیں لیتے تھے کہ وہ رشتے داری کے لحاظ میں سب چھوڑ کر پہلے ان کا کام کریں گے، اس سے ان کو نقصان ہوتا۔ اسی وجہ سے وہ اصرار کرتے تھے کہ پہلے گاہک کتابت کرا کے لائے پھر وہ اس کا مسودا شائع کریں گے۔ یہ مسئلہ آٹھویں دہائی تک پوری شدت سے جاری رہا تھا۔ ملک کی پبلشنگ انڈسٹری تیزی سے پھل پھول رہی تھی تو اچھے کاتبوں کا بھی اس کے ساتھ ہی کال پڑتا جا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ابتدائی اسکولوں میں کاپی پنسل کا استعمال تھا۔ پہلے بچے تختی پر بانس کے قلم سے لکھا کرتے تھے۔ اس لیے سو میں سے نوّے بچے خوش خط نکلتے تھے۔ اسی طرح ان میں اعلیٰ درجے کے خوش نویسوں کا تناسب زیادہ تھا لیکن بعد میں یہ ہوا کہ سو میں سے دس ہی بچے خوش خط نکلتے تھے لہٰذا خوش نویسوں کا تناسب اسی لحاظ سے گھٹ گیا تھا۔

مرزا جمیل اکثر سوچا کرتے تھے کہ کیا اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکلے گا؟ آخر ہم کب تک ہاتھ سے کتابت پر انحصار کرتے رہیں گے۔ انگریزی زبان میں صدیوں پہلے ہاتھ سے کتابت ختم کردی گئی تھی۔ پہلے ٹائپ رائٹر اور پھر فوٹو ٹائپ سیٹنگ مشینیں آئیں اور برقی سیٹنگ مشینیں ان کے بعد آئیں۔ جنھوں نے کتابت کی رفتار کو گویا پر لگا دیے تھے۔ اسے یوں سمجھیے کہ ہاتھ سے لکھنے میں ایک سال لگتا ہے تو ٹائپ رائٹر سے ایک مہینہ، فوٹو ٹائپ یا برقی سٹنگ سے کتاب محض ایک ہفتے میں تیار ہو جاتی ہے۔ کمپیوٹر کی آمد کے بعد سادی سی کتابت اب کمپیوٹر کی مدد سے بے حد تیزی اور سہولت سے ہو جاتی ہے۔

لیکن ہم بیسویں صدی میں بھی وہی ہاتھ سے کتابت کر رہے تھے۔ جو سست، مہنگی اور بے قاعدہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو لکھائی کے متعدد خط تھے اور ہر خط دوسرے سے اتنا مختلف ہوتا ہے کہ دو خطوں میں لکھنے والے بہ مشکل ہی ملیں گے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ دو دہائی پہلے اخبارات، رسائل اور کتابوں میں کتنے رنگا رنگ خط دیکھنے کو ملتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ تمام اخبارات اور رسائل تقریباً ایک ہی خط پر شائع ہو رہے ہیں اور خالی صفحہ پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ہم کون سا اخبار یا رسالہ پڑھ رہے ہیں۔

اپنے کام کے سلسلے میں مرزا جمیل کا بیرونِ ملک آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ پبلشنگ کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں سے آگاہ رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یورپ اور امریکا میں ۶۰ء کے عشرے سے کتابت کمپیوٹر کی مدد سے ہو رہی تھی لیکن اوّل تو یہ کمپیوٹر بہت بڑے اور بہت مہنگے تھے دوسرے انہیں چلانے کے لیے خاصی فنی مہارت کی ضرورت تھی لہٰذا پاکستان میں اس کا استعمال ناممکن تھا۔ دوسرے یہ صرف انگریزی یا رومن حروف کی کتابت کرتے تھے اور ملک میں اردو پریس کا حصہ پچانوے فیصد ہے۔ یہ کمپیوٹر اس قدر مہنگے تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا ادارہ بھی انہیں لینے اور اپنے ملک میں لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت پرسنل کمپیوٹر نہیں آئے تھے اور کسی بھی قسم کے کمپیوٹروں کی کل تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں تھی۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں پرسنل کمپیوٹرز کی آمد کے ساتھ ہی اس مشین کی رسائی تیزی سے ان اداروں اور افراد تک ہوتی چلی گئی جو پہلے کمپیوٹر لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پہلے کمپیوٹر ایک بڑی عمارت کے برابر جگہ گھیرتا تھا پھر یہ ایک کمرے میں آنے لگا۔ اس کے بعد ایک بڑی الماری کے سائز کا لیکن پرسنل کمپیوٹر آپ کی میز پر آجاتا تھا اور آج یہ حال ہے کہ ایک جدید پرسنل کمپیوٹر دنیا کے پہلے سپر کمپیوٹر سے کہیں زیادہ برق رفتار اور طاقت ور ہے۔ سب سے بڑا فرق قیمتوں میں آیا تھا۔ اولین کمپیوٹر اتنے مہنگے تھے کہ صرف حکومتیں ہی ان کا خرچ اٹھا سکتی تھیں۔ اس کے بعد قیمت کم ہوئی تو بڑے تجارتی اور صنعتی اداروں نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ تیسرے عہد کے کمپیوٹرز عام تجارتی اور صنعتی اداروں میں استعمال ہونے لگے تھے اور پرسنل کمپیوٹر گھروں تک پہنچ گیا تھا۔ قیمت کروڑوں سے ہزاروں میں آگئی تھی۔

مشین سے زیادہ ترقی اس کے پروگراموں میں ہوئی تھی جس کی بدولت کاموں میں بے انتہا آسانی پیدا ہوئی اور اب ایک بچہ بھی کمپیوٹر چلا سکتا لیکن اس وقت پاکستان اس منزل سے دور تھا۔ ہمارے لیے کمپیوٹر بدستور ایک مہنگی اور پیچیدہ مشین تھی لیکن نیا خیال تو ذہن میں پہلی بار آتا ہی ہے بے شک اسے عملی جامہ پہنانے میں کتنا ہی عرصہ لگ جائے۔

مرزا جمیل نے بھی سوچا کہ کیا اردو کتابت کمپیوٹر پر ممکن ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کمپیوٹر کو ڈی جیٹل مرحلے میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یعنی اس کی یادداشت بجائے مقناطیسی فیتے کے اب مقناطیسی ڈسک پر محفوظ ہونے لگی تھی اور نہ اب تک کتابت کے لیے فوٹو ٹائپ سیٹنگ کا طریقہ ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقے کی سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں تصحیح کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ یعنی ایک لفظ بھی خراب ہو گیا تو سارا کام نئے سرے سے کرنا

پڑتا تھا۔

۱۹۷۹ء میں مرزا جمیل پبلشنگ سے متعلق ایک نمائش دیکھنے کے لیے سنگاپور گئے۔ وہاں انہوں نے پہلی بار ایک پرسنل کمپیوٹر پر انگریزی کمپوزنگ ہوتے دیکھی تھی۔ یعنی ہاتھ کے ہاتھ کوئی بھی عبارت ٹائپ کرکے اسے مختلف سائز اور کالمز میں کمپوز کیا جارہا تھا۔ مشین بیک وقت کئی طرح خطوں میں کمپوز کرسکتی تھی۔ یعنی آپ چاہتے تو سرخی کسی اور خط میں اور عبارت کسی اور خط میں ممکن تھی پھر اس میں جیسی چاہتے تبدیلی کرکے دکھاتے۔ گویا یہ کام اب محض انگلیوں کا محتاج رہ گیا تھا اور اتنا آسان کہ ایک شخص محض چند گھنٹوں میں اسے سیکھ جائے۔ مرزا جمیل نے وہیں کھڑے کھڑے یہ طریقہ سیکھ لیا تھا۔ اچانک انہیں محسوس ہوا کہ انہیں اسی مشین کی تلاش تھی۔

یہ کمپیوٹر وہاں ایک برطانوی فرم نے رکھا تھا اور اس پر استعمال ہونے والا پروگرام بھی اسی فرم نے تیار کیا تھا جس پر کئی سال اور لاکھوں پاؤنڈز کا خرچہ آیا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ کمپیوٹر کے حافظے میں انگریزی کے تمام الفاظ اور لکھنے والے تمام خطوط محفوظ کردیے گئے تھے۔ باقی پروگرام ان کو استعمال کرنے سے متعلق تھا۔ یہ بہت سادہ اور چھوٹا سا پروگرام تھا۔ آج اس سے کہیں جدید پروگرام میسر ہیں۔ کمپیوٹر استعمال کرنے والے حضرات نے ایم ایس آفس میں اس کا تجربہ کیا ہوگا۔ یہ پروگرام کسی بھی پبلشنگ ادارے کے لکھنے کی تمام ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ اسی وقت مرزا جمیل کے ذہن میں بجلی کی طرح یہ خیال آیا تھا۔ انہوں نے برطانوی فرم کے سنگاپور کے سیلز منیجر سے اس سلسلے میں بات کی "میں چاہتا ہوں کہ آپ اردو پر بھی کام کریں۔ اس کے لیے مزید بات چیت ہم کراچی میں کریں گے۔ اگر آپ واپسی میں میرے پاس سے ہوتے ہوئے جائیں۔"

سیلز منیجر مرزا جمیل کے جاننے والوں میں سے تھا، اس نے بتایا "ہم نے اس سلسلے میں کام کیا تھا اور مقتدرہ قومی زبان کو کمپوز کیا ہوا ایک نمونہ بھی دیا تھا لیکن وہ انہیں پسند نہیں آیا۔ دراصل اردو زبان کی ساخت ایسی ہے کہ اسے کمپیوٹر پر لانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔"

"ہر کام شروع میں ناممکن لگتا ہے" مرزا جمیل نے اصرار کیا "آپ ایک بار کراچی آیئے تو سہی۔"

اردو سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ رسم الخط میں یہ بغیر جوڑوں کے لکھی جا ہی نہیں سکتی ہے۔ اور ان جوڑوں کی تعداد تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔ یعنی ہر حرف دوسرے حروف سے جس طرح جڑتا ہے۔ وہ ایک جوڑ کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر "م" اور "ر" کو ملایا جائے تو "مر" کا جوڑ درمیان آرہا ہے۔ اس طرح حرف بلندی کے لحاظ سے جوڑوں کی چار اقسام بن جاتی ہیں اور پھر ہر حرف کو دوسرے حروف سے جوڑنے کے لیے بالکل الگ جوڑ کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض حروف ایسے ہوتے ہیں کہ جوڑ لگنے سے ان کی ساخت بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "ی" ہے۔ اگر یہ شروع میں ہو تو "ا" کے ساتھ مل کر لفظ "یا" بنائے گی جو اس کی اصل ساخت سے بالکل مختلف ہے جبکہ آخر میں ہونے کی صورت میں یہ اپنی اصل ساخت میں آتی ہے مثلاً "ج" کے ساتھ مل کر "جی" صرف حروف ہی نہیں بلکہ اردو میں زیر، زبر، پیش، مد، محراب اور شوشوں کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ ان سب کو اپنی مکمل ترکیبوں کے ساتھ کمپیوٹر میں ڈالنا بے حد مشکل تھا اور اس کے لیے کسی صاحب علم شخص کی ضرورت تھی۔ جو اردو سے ناواقف انگریزوں کی اس معاملے میں مدد کرسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ سیلز منیجر نے اس کام کو ناممکن قرار دیا تھا۔

اس سے پہلے مرزا جمیل نے کمپیوٹر پروگرام تیار کرنے والے متعدد اداروں کو اس تجویز کے بارے میں خطوط لکھے تھے اکثر نے تو خط کا جواب دینے کی زحمت ہی نہیں کی اور جنہوں نے جواب دیا انہوں نے بھی حوصلہ شکنی کی کہ آپ اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس قسم کے پروگراموں کی تحقیق پر ہی بے پناہ خرچہ آتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یورپ کی چھوٹی چھوٹی زبانوں میں اس قسم کے پروگرام تیار کیے تھے۔ جن کے بولنے والوں کی تعداد بھی چند لاکھ میں آتی ہے لیکن اردو کے لیے وہ اس قسم کا پروگرام تیار کرنے کو تیار نہیں تھے۔

یہ بات مرزا جمیل کے ذہن میں بھی تھی اور انہوں نے خود کو تیار کرنا شروع کردیا تھا کہ جہاں تک جوڑوں یا پیوندوں کا تعلق تھا۔ وہ انہیں خود کروانے پڑیں گے۔ پبلشنگ کی دنیا میں ان کی اتنی جان پہچان تھی کہ انہیں اعتماد تھا، وہ یہ کام کروالیں گے۔ لہٰذا جب سیلز منیجر صاحب کراچی آئے تو انہوں نے اپنی تجویز ان کے سامنے رکھی اور کہا۔

"اگر آپ کو پورے الفاظ ٹکڑوں یا جوڑوں کے بجائے کتابت کیے ہوئے مل جائیں تو کیا یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔"

سیلز منیجر اس تجویز پر راضی ہوگیا۔ "اگرچہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ ہوجائے تو کیا بات ہوگی۔"

کراچی سے لندن جاکر ان صاحب نے اپنے ادارے کے ڈائریکٹروں سے بات کی جو اس قسم کے تجربات میں پہلے ہی خاصا نقصان برداشت کرچکے تھے لیکن اصولی طور پر وہ مزید بات چیت کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ لہٰذا ادارے کے سیلز ڈائریکٹر کراچی آئے۔ انہوں نے مرزا جمیل سے اس تجویز پر کھل کر بات کی۔ لیکن آخر میں انہوں نے کہا "دیکھیے صاحب، اس قسم کے کاموں میں بہت خرچہ آتا ہے اور کامیابی کی ضمانت پھر بھی نہیں دی جاسکتی ہے۔"

"اگر میں تمام خرچہ برداشت کروں" مرزا جمیل آخری حد تک چلے گئے۔

"تب پھر ہم سوچیں گے" سیلز ڈائریکٹر نے کہا "میں واپس جاکر یہ معاملہ اپنے ڈائریکٹرز کے سامنے اٹھاؤں گا۔"

یہ بات کسی حد بڑھی تھی۔ لندن کی فرم نے اس معاملے پر دو کمیٹیاں بنائیں جن میں ٹیکنیکل اسٹاف بھی تھا اور سافٹ ویئر انجینئر بھی۔ انہوں نے مسئلے پر خاصی بحث کے بعد دو گروپ بنالیے۔ ایک گروپ کا کہنا تھا کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور کامیابی کا امکان بہت کم لہٰذا ہمیں معذرت کرلینی چاہیے لیکن دوسرا گروپ کہہ رہا تھا کہ ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔ جبکہ تمام اخراجات بھی گاہک برداشت کرنے کو تیار ہے۔ یہ نازک وقت تھا اگر فرم تیار ہوجاتی تو اردو کی تقدیر ہی بدل جاتی اور اگر انکار کرتی تو یہ معاملہ طویل عرصے کے لیے ٹھپ ہوجاتا۔ ممکن ہے ہم آج بھی ہاتھ سے کتابت کے محتاج ہوتے کیونکہ حکومت آج تک اردو زبان میں ایک بھی ڈھنگ کا سافٹ ویئر نہیں بنوا سکی ہے۔ اس سلسلے میں جتنا کام ہوا ہے سب نجی شعبے میں ہوا ہے۔

مرزا جمیل برابر لندن سے رابطہ کیے ہوئے تھے اور بالآخر انہوں نے فرم کو تیار کرلیا۔ وہ بھی راضی ہوگئی کہ چلو ایک تجربہ ہی سہی، نقصان بھی ہوا تو وہ سب دوسروں کو برداشت کرنا تھا۔ اوّلین تجربہ بغیر جوڑ یا پیوند کے مکمل لفظ کمپیوٹر کی یادداشت میں ڈالنا تھا۔ جن کی مدد سے وہ ایک عبارت کمپوز کرسکتا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک لفظ کو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ لیا جائے اور دوسرے کو دوسرے ٹکڑے پر۔ اس طرح ہر لفظ کے لیے الگ ٹکڑا استعمال کیا جائے تو اسے ایک خاص ترکیب میں رکھ کر کوئی بھی عبارت لکھوائی جاسکتی تھی۔ بالکل یہی معاملہ کمپیوٹر کا تھا۔ اسے ایک خاص طریقے سے لفظ یاد کرادیے گئے اور جب اسے حکم دیا جاتا تو وہ مطلوبہ الفاظ ایک ترتیب میں، خاص سائز اور مخصوص کالمز میں لے آتا۔ اب اسے چاہے تو اسکرین پر دیکھ لیجیے یا کاغذ پر پرنٹ کرلیں۔ یہ طریقہ بے حد پیچیدہ تھا۔ یعنی سب سے پہلے تو ایک خاص لفظ کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔ وہ خاص لفظ کوئی سا بٹن دبانے سے آتا تھا۔ یہ بھی کمپیوٹر چلانے والے کو یاد رکھنا پڑتا تھا کیونکہ کمپیوٹر میں حروف نہیں ڈالے گئے تھے۔ جن سے وہ الفاظ بناتا۔ معاملہ وہاں ٹھپ ہوجاتا تھا جب کوئی لفظ جو عبارت کے لیے چاہیے ہوتا تھا کمپیوٹر کی یادداشت میں سرے سے موجود ہی نہ ہوتا۔

یہ کام کرنے والے گروپ نے پہلے ہی مہینے میں کامیابی حاصل کرلی اور جس کام کو وہ بے حد مشکل سمجھ رہے تھے، وہ ان کی حد تک آسانی سے ہوگیا کیونکہ اس پہلے صفحے کی کمپوزنگ میں صرف ڈھائی سو الفاظ استعمال ہوئے تھے۔ اصل کامیابی یہ تھی کہ ان الفاظ کو جس سائز میں اور جتنے بڑے یا چھوٹے کالم میں چاہتے، آرام سے لکھ سکتے تھے۔ یوں معلوم ہوگیا کہ یہ عملی طور پر مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ۱۹۸۰ء میں برمنگھم میں ہونے والی نمائش میں اس مشین کے تیار کردہ نمونوں کو رکھا گیا تھا۔ پہلے پہل تو لوگوں نے اسے تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا لیکن جب انہیں کہا گیا کہ یہ چیز عملی طور پر بھی ان کے سامنے تیار کی جاسکتی ہے اور پھر لوگوں کی فرمائش پر ان کی کہی عبارتیں کمپوز کرکے دکھائی گئیں تب انہیں یقین آیا۔ اس کے بعد لوگوں نے فرمائشوں کی بھرمار کردی تھی۔ مشکل سے مشکل فرمائش مشین نے اتنی آسانی سے پوری کردی کہ حیرت ہوتی تھی۔ جو کام ایک اعلیٰ درجے کا کاتب پورے دن میں کرتا تھا۔ وہ کام مشین دس منٹ میں کرلیتی تھی۔ واضح رہے کہ مشین سے مراد وہی کمپیوٹر ہے جو آج کل استعمال میں عام ہے۔

آنکھ سے دیکھ کر تو لوگوں نے یقین کرلیا تھا۔ لیکن ملک میں پبلشنگ انڈسٹری سے وابستہ افراد نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک کمپیوٹر کیونکر اردو کی کتابت کرسکتا ہے اور وہ بھی اتنی صفائی سے کہ دو یکساں لفظوں میں فرق تلاش کرنا، ناممکن ہوا اور پھر رفتار ایسی ہوش ربا جیسے بیل گاڑی کے مقابلے میں سپرسونک طیارہ۔ ابتدا میں خیال تھا کہ ایک کمپیوٹر میں بیس ہزار الفاظ محفوظ کرکے اس سے کوئی بھی عبارت کتابت کرائی جاسکتی تھی اور یہ کام وہ شخص بھی کرسکتا تھا جو کتابت سے قطعی ناآشنا ہو۔

لیکن یہ صرف ابتدا تھی۔ ظاہر ہے محض دو ڈھائی سو الفاظ سے کام نہیں چل سکتا تھا اردو کے ایک اخبار کی اشاعت کے لیے کم از کم سولہ سترہ ہزار الفاظ کی ضرورت

پڑتی ہے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ تمام الفاظ کو بنانے کے لیے ڈھائی لاکھ کے قریب جوڑ ہیں لیکن اندازہ تھا کہ ان میں سے کوئی بیس ہزار جمع کر لیے جائیں تو کام چل سکتا تھا۔ اس معاملے میں مرزا جمیل کو خوش قسمتی سے مقتدرہ قومی زبان کے سید مطلوب الحسن کی خدمات حاصل تھیں۔ جو اردو زبان کے چند ماہرین میں سے ایک تھے۔

جب یہ کام چلنا شروع ہوا تو جناب مطلوب الحسن نے الفاظوں کے جوڑ جمع کرنا شروع کردیے۔ ابتدا میں خیال تھا کہ زیادہ جوڑوں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی لیکن جیسے جیسے معاملہ آگے بڑھا، جوڑ بھی بڑھتے چلے گئے۔ دونوں نے مل کر کوئی سولہ سترہ ہزار ٹکڑے جمع کر لیے اور مرزا جمیل کے خیال میں اب بھی پورے ٹکڑے نہیں آئے تھے۔ خاص طور سے پریس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس میں مزید ٹکڑوں کی ضرورت تھی۔ ڈھائی لاکھ کے مقابلے میں یہ تعداد کم تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی۔ اس کی بنیاد ہمارے ہاں استعمال ہونے والا نستعلیق کا خط تھا۔ اس خط میں جب حروف کو جوڑا جاتا ہے تو بننے والے الفاظ کی شکلیں بھی بدل جاتی ہیں بلکہ تیسرے حرف کے فرق سے جوڑ کی جگہ بھی بدل جاتی ہے اور ساخت بھی۔ مثال کے طور پر جب ”ج“ اور ”ی“ کو ملاتے ہیں تو ”جی“ بنتا ہے۔ اس میں جوڑ درمیان میں آرہا ہے لیکن جب ”جی“ کے ساتھ ”ا“ کا اضافہ کیا جاتا ہے تو لفظ ”جیسا“ بنتا ہے اور جوڑ نیچے آجاتا ہے۔ یوں نستعلیق میں اوپر نیچے کئی جگہ جوڑ آجاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی جگہ کی بچت تھی یعنی کم سے کم جگہ پر زیادہ مواد آجاتا تھا۔ جبکہ دیگر خطوط بہت جگہ گھیرتے تھے۔ نستعلیق کی یہی خوبی اس کی مقبولیت کا باعث بنی۔

لیکن جب معاملہ کمپیوٹر پر کمپوزنگ کا آیا تو نستعلیق کی یہی خوبی اس کی خامی بن گئی۔ جوڑوں کی منزلوں کی وجہ سے لاتعداد جوڑ بن گئے تھے اور ان میں سے کوئی دوسرے کی جگہ استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔ اب کمپیوٹر کو یہ سکھانا بہت مشکل تھا کہ کون سا جوڑ کس جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت مرزا جمیل اور ان کے رفقا اس مسئلے کو اردو کے جوڑوں کے درد سے تعبیر کرتے تھے۔ جو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ مجبوراً انہوں نے حروف کے بجائے پورے پورے پیوندوں کو لینے کا فیصلہ کیا تو اس سے جوڑوں کا مسئلہ ہی ختم ہوگیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کمپیوٹر کو اردو کتابت کیوں کر سکھائی جائے تو اس کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ ہر لفظ کو ”اسکین“ کر کے کمپیوٹر کی یادداشت میں ڈالا جائے اور پھر اسے ایک سافٹ ویئر کے تحت کردیا جائے۔ جسے ہدایات دی جائیں تو وہ ان الفاظ کی مدد سے ایک خاص عبارت، ایک خاص سائز اور ایک خاص کالم میں ترتیب دے سکتا تھا۔ بعد میں یہ سب ہو بھی گیا اور نوری نستعلیق جیسی خوبصورت چیز وجود میں آئی۔ اس کی مدد سے کوئی بھی شخص جسے قلم بھی نہ پکڑنا آتا ہو ایک بٹن دبا کر ایک لفظ کو بہترین انداز میں لکھ سکتا تھا۔ بلکہ ایک ہی صفحے پر اعلیٰ درجے کی کتابت کرسکتا تھا۔ دو یا تین مختلف سائزوں میں لکھ سکتا تھا۔ اس کی مثال آپ سرگزشت کے صفحے سے لیں۔ کہانی کے پہلے صفحے پر آپ کو تین چار طرح کی مختلف کتابتیں ملیں گی جو معیار میں یکساں لیکن سائز میں مختلف ہوں گی۔ اس میں سب سے چھوٹا سائز کہانی کا ہوتا ہے۔ جو گیارہ کہلاتا ہے۔ اوپر کہانی کا نام بڑے سائز میں ہوتا ہے یہ عام طور سے اڑتالیس ہوتا ہے۔ جبکہ کہانی کے بارے میں تبصرہ چودہ یا سولہ کے سائز میں ہوتا ہے۔ قارئین کے خطوط جس سائز میں شائع کیے جاتے ہیں وہ نو ہوتا ہے۔

گویا ایک ہی صفحے پر آپ کو مختلف سائز کے الفاظ لیکن یکساں خط میں ملیں گے تو اس کی وجہ کمپیوٹر سے کی گئی کمپوزنگ ہے۔ اگر یہی چیز ہاتھ سے کی جاتی تو سائز کے ساتھ معیار میں بھی فرق آجاتا۔ یکساں معیار کے مقابلے میں سب سے زیادہ فرق رفتار پر پڑا جیسے کہ بتایا جاچکا ہے کہ ہاتھ سے کتابت کی صورت میں جو کتاب سال بھر میں جاکر تیار ہوتی تھی، وہ اب محض ایک ہفتے میں تیار ہوجاتی ہے۔ بلکہ زیادہ افراد مل کر کام کریں تو دو ڈھائی سو صفحے کی کتاب ایک دو دن میں بھی کتابت ہوسکتی ہے جبکہ معیار یکساں ہوگا کیونکہ سارا کام ایک ہی پروگرام کے تحت کیا گیا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں ہاتھ سے کتابت کی جاتی تھی تو اوّل تو یہ ہی ممکن نہیں تھا کہ رفتار بڑھائی جاسکے اور بالفرضِ محال کسی خوش قسمت کو زیادہ کاتب یا خوش نویس میسر آبھی جاتے تو کتابت میں یکساں معیار لانا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ایک کتاب کوئی ایک ہی شخص کتابت کرتا تھا۔ چاہے اس میں سال لگے۔ آپ کے چہیتے سرگزشت کے مزے ہیں کہ اس نے جنم ہی کمپیوٹر کمپوزنگ کے دور میں لیا۔ لیکن اس کے بڑے برادران یعنی محترم جاسوسی اور محترم سسپنس نے وہ دور دیکھا ہے جب کتابت ہاتھ سے کی جاتی تھی اور مشکلات سر پر رہا کرتی تھیں۔ مصنف صاحب کا موڈ نہیں ہورہا ہے اور کہانی کا پتا نہیں، اب اشاعت کی تاریخ سر پر آرہی ہے۔ لیجیے دو دن پہلے کہانی ملی اور اب کاتبوں سے کام لیجیے۔ معراج

صاحب پریشان ہیں کہ کاتبوں کے ہاتھ میں تیزی کیوں کر لائیں۔ کون سا نسخہ آزمائیں کہ کہانی جلد از جلد تیار ہوجائے۔ اس دور کی مشکلات تو اب خواب لگتی ہیں۔ آج کل حال کچھ یوں ہے کہ کہانی ڈائجسٹ کے پریس میں جانے سے ایک دن پہلے آرہی ہے۔ کہانی آتے ہی کمپیوٹر پر فانٹ اس کی کمپوزنگ کرلی گئی۔ وہیں پُروف ریڈنگ ہوگئی۔ کہانی کے لیے صفحات مخصوص تھے۔ اگر کہانی کم پڑگئی تو کچھ اشتہارات اور لطیفے ڈال کر کمی پوری کرلی گئی اور صفحات کم پڑگئے تو اگلی پچھلی کہانیوں سے مندرجہ بالا اشیا نکال کر جگہ پوری کرلی گئی اور یہ کام کسی صاحب نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کرلیا۔ نہ کاتبوں سے جھگڑا اور نہ پُروف ریڈنگ کا مسئلہ۔ اس سارے کام میں (کمپوزنگ کے علاوہ) شاید نصف گھنٹا بھی نہ لگے ورنہ پہلے ڈائجسٹ کی ترتیب بدلنے کے خیال سے ہی پورے عملے کو گھبراہٹ ہونے لگتی تھی کیونکہ یہ خاصا مشکل کام تھا۔

آج کل ہم کمپیوٹر پر جدید ترین اردو کمپوزنگ سے مستفید ہورہے ہیں۔ پہلے جو جوڑوں کا مسئلہ تھا، اب وہ بھی حل ہوچکا ہے کیونکہ نئے پرسنل کمپیوٹرز اور جدید سافٹ ویئرز کی آمد سے اس مشین کو گویا بازیچۂ اطفال بنادیا ہے جو چاہے کھیلے۔ مگر اس وقت یعنی ۱۹۸۰ء کے شروع میں یہ کام ناممکن حد تک دشوار نظر آتا تھا لیکن داد دیجیے مرزا جمیل کی ہمت کی کہ انہوں نے انگریزوں کی رائے بھی مسترد کردی جو ان دنوں کمپیوٹر کے میدان پر قابض تھے، اس وقت ایشیائی اقوام اس معاملے میں پیچھے تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ مرزا جمیل کمپیوٹر کی تھیوری سے واقف تھے۔ دوسرے وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا بھر میں کمپیوٹر وہ کام بھی کررہے تھے جو پہلے اس کے لیے ناممکن سمجھے جاتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ مشین وہ سب کچھ کرسکتی تھی جس کے لیے اس میں خاص ہدایات (سافٹ ویئر) موجود ہوتیں اور ضرورت اس خاص ہدایت کو تیار کرنے کی تھی۔ مرزا جمیل اس کے لیے کوشاں تھے۔ کمپیوٹر میں کسی قسم کی بھی معلومات چاہے وہ لکھی ہوں خاکے کی شکل میں یا تصویر کی صورت میں، انہیں یادداشت میں داخل کرنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل کام ان معلومات کو ایک خاص سافٹ ویئر کے تحت استعمال کرنا ہے۔
ان کا کام تو اس لحاظ سے اور مشکل تھا کہ وہ اردو سافٹ ویئر بنانے کی کوشش کررہے تھے اور جو صاحبان یہ کام کررہے تھے، وہ اردو کے ایک لفظ سے بھی واقف نہیں تھے۔ یعنی لندن میں بیٹھے سافٹ ویئر انجینئر۔ ان کی مدد کے لیے اردو الفاظ کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ تھا۔

ساتھ ہی ہر لفظ کے ساتھ وضاحت بھی تھی کہ کون سا بٹن دبانے سے کون سا لفظ بنتا تھا۔ یہ دراصل سافٹ ویئر کے ساتھ ہارڈ ویئر یعنی کمپیوٹر کی بھی تیاری تھی۔ بہ الفاظِ دیگر یہ پروگرام جس قسم کی مشینوں پر تیار کیا گیا تھا، اسی قسم کی مشینوں پر چلتا تھا لیکن بعد میں یہ مناسب ردّوبدل کے تمام اقسام کے کمپیوٹروں پر استعمال ہونے لگی تھی۔

اس سلسلے میں بہتر ہوگا کہ پیوندوں کی وضاحت بھی کردی جائے۔ کسی بھی جوڑ سے بننے والا لفظ ایک پیوند کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر "م" اور "ا" کا ملاپ "ما" کو جنم دیتا ہے جو بذاتِ خود کوئی لفظ نہیں ہے لیکن اس کی مدد سے دوسرے پیوندوں کو ملا کر ایک مکمل اور بامعنی لفظ بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر "ما" کے ساتھ "ن" لگانے سے "مان" بن جاتا ہے یا "ں" لگانے سے لفظ "ماں" بنتا ہے جو بالکل مکمل اور بامعنی لفظ ہے۔ مرزا جمیل اور ان کے ساتھی سید مطلوب الحسن کا خیال تھا کہ سولہ سترہ ہزار پیوندوں سے کام چل جائے گا جبکہ اردو میں ڈھائی لاکھ کے قریب جوڑ موجود ہیں لیکن فی الوقت روزمرہ کے کاموں اور زبان میں ان میں صرف بیس ہزار پیوند استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے پوری زبان ادا ہوجاتی ہے۔

اگرچہ پبلشنگ کی صنعت کے دوسرے افراد مرزا جمیل سے متفق نہیں تھے مگر میر خلیل الرحمٰن نے ایک ٹی وی مذاکرے میں کہا تھا کہ ایک اخبار کے ذریعے روزانہ دس کے قریب الفاظ زبان میں داخل ہوجاتے ہیں، ان کے لیے نئے پیوندوں کی ضرورت پڑے گی۔ یعنی سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نئے الفاظ آتے تھے۔ میر خلیل الرحمٰن مشکوک تھے کہ کیا کمپیوٹر ان سب کا احاطہ کرسکے گا۔ باقی افراد تو سرے سے اس چیز کی کامیابی کے بارے میں مشکوک تھے۔ صرف میر خلیل الرحمٰن ہی پُرامید تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے لاہور جنگ کا ڈکلیریشن حاصل کیا تھا۔ انہوں نے مرزا جمیل سے رابطہ کیا۔
"کیا یہ صحیح ہے، آپ اردو کی کمپیوٹر کمپوزنگ تیار کروا رہے ہیں؟"

"بالکل میر صاحب، اور میں اسے کرکے دکھاؤں گا۔"
"اگر آپ کامیاب ہوتے ہیں جیسا کہ میری دعا ہے تو میں چاہوں گا، اس کا سب سے پہلا تجربہ میرے اخبار میں کیا

جائے۔"

"اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا میر صاحب!" مرزا جمیل خوش ہوگئے۔

"یہ کام کب تک ہوجائے گا؟"

"یہ بات تو لندن والے صاحبان ہی بتا سکیں گے' آپ ایسا کریں کہ لندن آجائیں۔ وہاں نمونہ بھی دیکھ لیں اور اس پر بات بھی کرلیں گے" مرزا جمیل نے دعوت دی۔

ستمبر ۱۹۸۰ء میں میر خلیل الرحمٰن لندن گئے اور وہاں انہوں نے کمپیوٹر پر تیار کیے ہوئے نمونے دیکھے تو وہ خوش ہوگئے۔ انہوں نے فوراً پہلی مشین لینے پر آمادگی ظاہر کردی لیکن ساتھ ہی انہوں نے جلدی کا شور مچادیا۔ دوسری طرف جب اس کام کی تکنیکی کمیٹی کے ارکان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ اس کام میں چھ مہینے لگ جائیں گے۔

"اس میں پون انچ کے قلم سے 10 x 10 انچ سائز کے پیوندے تیار ہوں گے" مرزا جمیل نے انہیں آگاہ کیا۔

اس پر کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ اس کام میں پانچ سال لگیں گے۔ یہ سن کر مرزا جمیل پریشان ہوگئے کہ میر خلیل الرحمٰن تو کسی صورت پانچ سال تک انتظار نہیں کریں گے۔ وہ اس کام کے لیے اتنا آگے جاچکے تھے کہ اب ان کے لیے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ اس پروجیکٹ کی ناکامی تھی' ان کی اپنی ناکامی اور اس بات کا زیادہ ہی ڈھنڈورا پیٹ چکا تھا۔ ان کے مخالفین تو ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ مرزا جمیل ناکام ہوں اور وہ ان کا مذاق اڑائیں۔ اگلے پچھلے سارے بدلے نکالیں گے۔ افسوس کی بات تھی کہ انڈسٹری کے اکثر لوگوں کا رویہ کچھ ایسا ہی تھا سوائے چند ایک معقول افراد کو چھوڑ کر۔

مرزا جمیل جانتے تھے کہ پانچ سال کا مطلب پروجیکٹ کی ناکامی تھی۔ کمپیوٹر کی دنیا میں اتنی تیزی سے ترقی ہورہی تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ پانچ سال بعد اس کی ضرورت پڑے گی بھی یا نہیں۔ انہوں نے فرم کے ذمے داروں سے پوچھا "دیکھیے' پیوندوں کی تیاری کے علاوہ باقی کام یعنی مشین کی پروگرامنگ' پیوندوں کو حافظے میں محفوظ کرنا اور انہیں مختلف سائز میں ترتیب دینے میں کتنا وقت لگے گا؟"

اس پر انجینئرز نے ڈیڑھ سال کا تخمینہ لگایا لیکن یہ مدت بھی بہت زیادہ تھی۔ مرزا نے پوچھا "کیا اس میں کچھ کمی نہیں ہوسکتی ہے؟"

"ہوسکتی ہے" ایک رکن نے کہا "بہ شرط کہ ہم دو تین شفٹیں لگاکر یہ کام مکمل کرلیں۔"

"گویا چھ مہینے" مرزا جمیل خوش ہوگئے "کیا آپ اتنی مدت میں اپنا کام ختم کرلیں گے؟"

یورپی ممالک میں عام دفتری کاموں کو یا تحقیقی کاموں کو شفٹ میں کرنے کا رواج نہیں تھا۔ صرف وہی کام شفٹ میں کیے جاتے تھے جن کی چوبیس گھنٹے ضرورت رہتی تھی یا پھر اشد مجبوری میں۔ کمیٹی والے بھی شفٹوں میں کام کرنے کو تیار نہیں تھے لیکن انہوں نے یہ سوچ کر ہامی بھرلی کہ بھلا مرزا جمیل پانچ سال سے پہلے کہاں پیوند تیار کرکے لائیں گے۔ کیونکہ ان کا کام تو مرزا جمیل کے کام سے مشروط تھا۔ جب وہ ایک چیز تیار کرکے انہیں دیتے تو وہ اسے کمپیوٹر میں ڈالتے۔ انہوں نے حامی بھرلی تو مرزا جمیل نے بھی کہا "میں آپ کو سارا کام چھ مہینے میں کرکے دوں گا۔ میں کراچی پہنچنے کے ایک مہینے کے اندر آپ کو کام بھجوانا شروع کردوں گا اور آپ اس کو کمپیوٹرائز کریں گے۔"

"یعنی تھوڑا تھوڑا کرکے" کمیٹی کے ارکان پریشان ہوگئے تھے۔

"ظاہر ہے' میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ پہلے میں چھ مہینے میں پورا کام کرکے دوں تو آپ مزید چھ مہینے لگاکر اسے مکمل کریں۔ یہ تو ہاتھ کے ہاتھ ہونا چاہیے۔ فرق ایک مہینے سے زیادہ کا نہ ہو" مرزا جمیل نے کہا "یعنی جب میں آخری کام روانہ کروں تو اس کے ایک مہینے کے اندر آپ اپنا کام مکمل کرچکے ہوں۔"

یہ ایک چیلنج تھا جو مرزا جمیل نے انگریزوں کے سامنے رکھا تھا اور انہوں نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ مرزا کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ پاکستان واپس جاکر بیس پچیس اچھے خوش نویس اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیں گے اور اگر ایک خوش نویس روز بیس پچیس پیوند تیار کرتا ہے تو روز کے دو ڈھائی سو پیوندوں کے حساب سے پورا کام محض چھ مہینے میں نمٹ جائے گا۔ بلکہ تین مہینے میں ہوجائے گا۔ یوں اردو سافٹ ویئر چھ مہینے کی مقررہ مدت میں ان کے پاس ہوگا لیکن جب وہ کراچی آئے اور انہوں نے کاتبوں کی تلاش شروع کی تو انہیں معلوم ہوا کہ چھ مہینے کے لیے کوئی کاتب اپنا کام چھوڑ کر ان کے پاس آنے کے لیے تیار نہیں ہے اور کام بھی وہ جو ان کی روزی پر لات مارے گا۔ سب نے معذرت کرلی۔

"صاحب' میں اپنا کام چھوڑ کر چھ مہینے کے لیے آپ کے پاس کام کروں اور جب آپ جواب دے دیں تو پھر میں کہاں جاؤں گا۔ اس کے بعد میں کہاں کام کرسکوں گا۔ میرے بیوی بچے تو بھوکے مرجائیں گے۔"

مرزا جمیل ایک بات نظرانداز کرگئے تھے کہ الگ الگ

کاتبوں کے کام کرنے کی صورت میں بھلا یکساں معیار کیوں کر آئے گا۔ وہ تو سب اپنا اپنا لکھیں گے اور مشکل میں لندن والی کمیٹی کے ارکان پڑجائیں گے۔ دوسرے پروگرامنگ میں الگ مشکل ہوگی اور لکھائی کی خوبصورتی غارت ہوجائے گی۔

تلاشِ بسیار کے بعد بہ مشکل ایک استاد ملے۔ مرزا جمیل نے انہیں سمجھایا کہ کیا کرنا ہے تو وہ بولے۔

"میں ایک دن میں دو سو تیار کروں گا۔"

استاد کام کو آسان سمجھ رہے تھے جب مرزا جمیل نے انہیں بتایا کہ کام پون انچ کے قلم سے دس بائی دس کے سائز میں کرنا ہے تو ان کے ہوش اڑ گئے، بولے "میں ایک دن میں پانچ دس کرسکتا ہوں۔"

لیکن وہ اب بھی نہیں سمجھے تھے لہٰذا مرزا نے انہیں بتایا کہ کمپیوٹر کیا ہوتا ہے اور کس طرح کام کرتا ہے۔ نیز وہ کیا تیار کروانا چاہتے ہیں۔ جب بات پوری طرح ان کی سمجھ میں آگئی تو کہا "اب دو دن میں ایک کرکے دوں گا۔"

مرزا صاحب کو تسلیم کرنا پڑا کہ انگریز صحیح کہتے تھے کہ یہ کام پانچ سال سے پہلے ممکن نہیں ہے۔ یہ خاصا کٹھن وقت تھا، وہ سب کچھ طے کرچکے تھے۔ کام میں ابتدائی کامیابی بھی حاصل ہوچکی تھی۔ اب بات صرف پیوندوں کی تیاری کی رہ گئی تھی تو اس میں وقت حائل ہو رہا تھا۔ بھلا کون پانچ سال انتظار کرتا اور خود مرزا جمیل کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پانچ سال اس کے پیچھے سب کچھ چھوڑ کر رکھیں۔ دوسری طرف معاملہ چیلنج کا تھا جو وہ انگریزوں کو دے آئے تھے۔ اپنوں کی تو خیر تھی مگر غیروں کے سامنے سبکی انہیں گوارہ نہیں تھی۔ گویا نہ آگے بڑھنا ممکن دکھائی دیتا تھا اور پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت مارے فکر کے مرزا جمیل کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس دور میں تھے جب انسان کے اعصاب زیادہ بوجھ برداشت نہیں کرسکتے۔ انہوں نے چالیس سال تک دن رات محنت کی تھی۔ بہت نام، دولت اور عزت کمائی تھی لیکن اس عمر میں وہ سب مٹی میں ملتی نظر آرہی تھی۔ ان کا نام ہی معیار کی ضمانت تھا جب مرزا جمیل کوئی کام ہاتھ میں لیتے تو لوگوں کو کامیابی کا یقین تو ہوتا ہی تھا۔ ساتھ میں یہ یقین بھی ہوتا تھا کہ اعلیٰ درجے کا ہوگا۔ اردو میں مشینی کمپوزنگ ان کا خواب تھا۔ انہوں نے تنِ تنہا اس کی تعبیر کے لیے جدوجہد کی تھی۔

سید مطلوب الحسن جو اس پروجیکٹ میں شروع سے ان کے ساتھ تھے اور انہوں نے پیوندوں کی درجہ بندی میں ان کی بے حد مدد کی تھی۔ وہ صرف ساتھی اور شریکِ کار ہی نہیں بلکہ مرزا جمیل کے بہترین دوست بھی تھے اور مرزا ان کے مشوروں کی قدر کیا کرتے تھے۔ وہ مرزا کی پریشانی دیکھ رہے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے مشورہ دیا۔

"آپ خود یہ کام کیوں نہیں کرلیتے؟"

"سید صاحب، یہاں میری جان پر بنی ہے اور آپ کو مذاق کی سوجھ رہی ہے" مرزا خفگی سے بولے۔

"بات یہ ہے کہ یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں کیونکہ اس کی اہمیت بھی آپ سمجھتے ہیں" سید صاحب نے اصرار کیا۔

"میں اپنا کاروبار کروں گا یا یہ کتابت، میں نے کبھی یہ سیکھی تھی لیکن گزشتہ تیس سال سے کاغذ قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں یہ نہیں کرسکتا۔"

"بھئی، آپ اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساری عمر لوگوں کو کام کرتے دیکھتے رہے۔ آپ کے والد صاحب اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے لیکن میں نے عملاً ہاتھ سے کوئی کام نہیں کیا۔"

"بس تو پھر سب بھول جائیے۔ ختم کیجیے اس معاملے کو۔ آپ کو اردو میں ایک نئی چیز لانے کی خوشی ہو رہی تھی۔ اسے بھی فراموش کردیجیے۔"

یہ بات ایسی تھی کہ مرزا جمیل سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ کیا واقعی وہ اپنے خواب کو فراموش کرسکتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے کس قدر کاوش اور کوشش کی تھی اور جبکہ کامیابی کی منزل قریب تھی تو وہ اسے ترک کرنے پر مجبور ہو رہے تھے کیونکہ انہیں مطلوبہ افراد نہیں میسر تھے۔ جوان کا کام کرکے دیتے۔ کس قدر افسوس کی بات تھی، یہ کام ایسا تھا کہ پوری پبلشنگ انڈسٹری کو مرزا جمیل کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ ناقد تو سب بنے ہوئے تھے۔ حوصلہ افزائی کرنے والے بھی معدودے چند تھے اور وہ بھی زبانی کلامی حوصلہ افزائی پر اکتفا کر رہے تھے۔ حالانکہ انڈسٹری کے چند بڑے مل کر اس کا ذمہ لیتے تو یہ کام واقعی بہت آسانی سے ہوجاتا۔ کاتبوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا، یہ سب مل کر دس پندرہ اچھے خوش نویس فراہم کرسکتے تھے۔ ان کی تنخواہ کا بوجھ اٹھاسکتے تھے اور یہ ضمانت بھی دے سکتے تھے کہ بعد میں بھی ان کا کام چلتا رہے گا۔

مرزا جمیل اس دوراہے پر تھے جہاں ایک منزل ناکامی کی طرف جاتی تھی تو دوسری طرف کامیابی تھی لیکن راستہ بے حد دشوار گزار اور مشکل تھا۔ وہ خود میں ہمت جمع کررہے

تھے کہ اس راستے پر قدم رکھ سکیں۔ روزانہ ان کے ذہن میں نئی تجویزیں آتی تھیں۔ آخر انہوں نے خود کو تیار کرلیا کہ اب یہ کام انہیں خود ہی کرنا تھا۔ وہ خود آرٹسٹ تھے اور انہیں گرافک آرٹ کی تمام اقسام کے بارے میں معلوم تھا۔ پھر وہ گزشتہ تیس سال سے اس کام سے منسلک تھے لہٰذا یہ سب ان کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے تجربے کے طور پر چند پیوند خود تیار کیے اور یہ اتنے اچھے بنے کہ وہ خود حیران رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان پیوندوں کی ہیت سے جتنا اچھا وہ واقف تھے، اتنا کوئی دوسرا واقف نہیں تھا۔ اتنا وقت تو کاتب کو سمجھانے میں لگ جاتا جتنی دیر میں انہوں نے یہ پیوند خود تیار کیے تھے۔

لیکن یہ ابتدا تھی۔ اب اصل منزل بہت دور تھی۔ ایک فردِ واحد کے لیے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اور فرد بھی وہ جس نے آج سے تیس سال پہلے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ سولہ ہزار پیوند ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح بلند اور ناقابلِ تسخیر دکھائی دے رہے تھے پھر مرزا جمیل عمر کے اس حصے میں تھے جب نیا کام تو ایک طرف رہا، پرانے کام میں بھی غیر معمولی مشقت اچھی نہیں لگتی ہے۔ انہوں نے لگاتار دس سال تک سولہ سترہ گھنٹے بھی کام کیا تھا لیکن ایک تو وہ نوجوانی کا دور تھا۔ دوسرے یہ کام وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ تیسرے ان کے ساتھ بے شمار دوسرے لوگ بھی تھے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ایک ایسا کام جو پہلے نہیں کیا ہو پھر کام بھی ایسا کہ اس فن کے استادوں نے کانوں کو ہاتھ لگالیے تھے۔ قارئین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ کس قدر مشکل تھا مگر سب سے بڑی دشواری یہ بھی کہ کام انہیں تنہا اور مقررہ مدت میں کرنا تھا۔

مرزا جمیل کی قوتِ ارادی بے پناہ تھی جب وہ کسی کام کی نیت کرلیتے تو اسے کرکے ہی دم لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں متعدد ایسے کام کیے تھے جو دوسروں کے لیے رسک تھے لیکن وہ چیلنج قبول کرکے کبھی نہیں پیچھے ہٹے تھے۔ انہیں یوں لگا کہ ان کے چالیس سال کا کام ایک طرف تھا اور یہ چھ مہینے کا کام ایک طرف۔ خدا نے انہیں اس مقام تک پہنچایا ہی اس مقصد کے لیے تھا۔ یہ بات ان کے لیے حوصلے کا باعث تھی کہ جب خدا نے انہیں یہاں تک پہنچایا تھا تو آگے بھی وہی راستہ نکالے گا۔ یہ سوچ کر مرزا جمیل نے اپنا کام چھوڑا۔ گھر والوں سے رابطہ ختم کیا اور اپنے کمرے میں صرف پیوندوں کی تیاری میں لگ گئے۔

وہ صبح سے شام تک کام کرتے اور کچھ دیر آرام کرکے دوبارہ کام میں جت جاتے تھے۔ کتنی بار تو ایسا ہوا کہ وہ مسلسل چوبیس گھنٹے کام میں لگے رہے تھے۔ کتنی بار کھانا بھول گئے۔ ملازم دبے قدموں آکر چائے رکھ جاتا جو رکھے رکھے ہی ٹھنڈی ہوجاتی تھی مگر انہیں کاغذ و قلم سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ خوش نویسی آسان کام نہیں ہے۔ انسان کا جسم گھنٹوں ایک ہی پوزیشن میں رکھے رکھے اکڑ جاتا ہے۔ بہت سارے کاتب کمر جھک جانے سے کبڑے نظر آتے ہیں۔ بعض ایک شانہ جھکا کر کام کرتے ہیں تو ان کا یہ شانہ مستقل ہی جھک گیا۔ بوریت کی انتہا ہوجاتی ہے اور پھر اس کام میں کوئی کشش بھی نہیں ہے۔ ہاتھ کا اتنا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ بال برابر سے زیادہ فرق نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ کام کے دوران میں یہ لوگ بے انتہا چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔

انہیں کام میں کسی چیز کا ہوش نہیں تھا بس یہ دھن تھی کہ کسی طرح جلد از جلد کام مکمل کرکے لندن بھیجا جائے۔ ایک مہینے بعد انہوں نے پیوندوں کا پہلا کام روانہ کیا تھا۔ اس میں صرف ابتدائی نوعیت کے پیوند تھے۔ ابھی بہت کام باقی تھا۔ اس میں سب سے پہلی مشکل یہ تھی کہ فردِ واحد کس حد تک کام کرسکتا تھا۔ خود مرزا جمیل محسوس کررہے تھے کہ ان سے بہت کچھ چھوٹ جائے گا۔ دوسرے انہیں ایک خیال اور تھا کہ کسی بھی زبان میں تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ نت نئے الفاظ آتے رہتے ہیں اور پرانے الفاظ متروک ہوجاتے ہیں۔ مرزا جمیل چاہتے تھے کہ ایک دفعہ یہ پروگرام بن بھی جائے تب بھی اس میں ایسی گنجائش ہونی چاہیے کہ نئے رائج ہونے والے الفاظ کے پیوند شامل کیے جاسکیں اور وہ الفاظ جو متروک ہوچکے ہیں، انہیں خارج کیا جاسکے۔ انہوں نے لندن میں ٹیکنیکل کمیٹی سے بات کی تو انہوں نے مرزا جمیل کو اطمینان دلایا کہ پروگرام میں اس کی گنجائش ہوگی۔

”یہ سن کر میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ ایک بار پروگرام ہمارے ہاتھ میں آجاتا تو ہم اس میں اپنی مرضی کے نئے پیوند ڈال سکتے تھے اور نکال بھی سکتے تھے“ مرزا جمیل نے بعد میں کہا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام تر توجہ بنیادی نوعیت کے اہم پیوندوں پر مرکوز کردی اور اگلے چھ مہینے میں ناقابلِ یقین طور پر سولہ ہزار پیوند تیار کردیے تھے اور لندن کمیٹی نے فوری طور پر انہیں کمپیوٹروں میں ڈالنے کا کام جاری رکھا تھا۔ کمپیوٹر کی یادداشت میں اتنی گنجائش تھی، اس میں پچیس ہزار الفاظ آسکتے تھے لیکن اس کی یادداشت لامحدود رکھی جاسکتی تھی۔ وہ اس طرح کہ ایک کے بجائے دو یا تین ہارڈ ڈسک لگادی جائیں۔ اس زمانے میں ۸۰ ایم بی کی ہارڈ

ڈرائیوز آتی تھیں۔ ان ڈرائیوز نے کمپیوٹر کو اس قابل بنادیا تھا کہ اس میں مستقل نوعیت کے پروگرام اور معلومات ذخیرہ کی جاسکتی تھیں۔ اس سے پہلے کمپیوٹر صرف عارضی ڈرائیوز کے سہارے چلتے تھے جسے فلاپی بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی یادداشت صرف چند کلوبائٹ تک محدود تھی۔

ہارڈ ڈسک نے گویا معلومات ذخیرہ کرنے کی گنجائش کو لامحدود کردیا تھا۔ ہر سال ان ڈرائیوز میں گنجائش دوگنی ہوتی چلی گئی اور آج کل گیگا بائٹ کی ہارڈ ڈرائیوز دستیاب ہیں۔ بازار میں دستیاب ۴۰ جی بی کی ڈرائیوز ایک ہتھیلی پر آجاتی ہے لیکن اس کی گنجائش اتنی ہوتی ہے کہ اس میں پورا ایک کتب خانہ آسکتا ہے۔ یہ اردو اور جمیل مرزا کی خوش قسمتی تھی ورنہ معلومات کو محفوظ کرنے کے لیے بڑے مشکل طریقے استعمال کیے جاتے تھے جن میں پنچ کارڈ اور مقناطیسی ٹیپ شامل تھی۔ تیسری صورت فلاپی تھی جو پرسنل کمپیوٹر میں استعمال ہوتی تھی مگر اس کی استعداد اتنی نہیں تھی کہ اس میں اس پروگرام کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی آسکتا۔ جس کمپیوٹر پر اردو سافٹ ویئر کی تیاری کی جارہی تھی اس میں ۸۰ ایم بی کی دو ہارڈ ڈسکس لگی تھیں جو پورے سافٹ ویئر کے لیے کافی تھیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی ان میں اتنی گنجائش بچ جاتی کہ بعد میں نئے پیوند ڈالے جاسکتے تھے۔ جیسا کہ مرزا جمیل کا پروگرام تھا۔

چھ مہینے میں پیوندوں کی کتابت کا کام مکمل کرکے مرزا جمیل نے لندن روانہ کیا۔ جہاں کمیٹی والے حیران تھے کہ اس قدر کام کس نے کیا ہوگا۔ اوّل تو پیوندوں کے نمونے دیکھ کر ہی وہ حیران تھے جو ان کے لیے کسی ڈیزائن سے کم نہیں تھے۔ پھر ان میں زبردست یکسانیت تھی۔ مرزا جمیل نے اتنا تک کیا تھا کہ ہر پیوند کے ٹکڑے کے ساتھ ایک وضاحتی نوٹ بھی لکھ دیا تھا کہ پروگرام میں اس کا مقام کہاں ہے۔ ان کے خیال میں یہ سب کام اتنی جلدی ایک گروہ نے کیا ہوگا۔ جس میں سب ماہر فن افراد شامل ہوں گے۔ تب ہی نمونوں میں اتنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ کام خود مرزا جمیل نے تن تنہا کیا ہے تو ان کی حیرت کی حد نہ رہی تھی۔ ایک آدمی اتنا کام کرے' یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور کام بھی اتنے اعلیٰ معیار کا کہ وہ اردو زبان سے نابلد ہونے کے باوجود اس کی خوبصورتی کے قائل ہوگئے تھے۔ شاید وہ حیرت سے پاگل ہوجاتے اگر انہیں معلوم ہوتا کہ مرزا جمیل نے زندگی میں پہلے کبھی کتابت نہیں کی تھی اور وہ بھی اتنے بڑے قلم سے اتنے بڑے سائز میں تو ہرگز نہیں کی تھی۔ شاید یہ دل کی لگن تھی جس نے مرزا جمیل سے اتنا بڑا کام کروالیا۔

اب چیز تیار تھی اور اسے آزمایا جاسکتا تھا۔ یہ کام مرزا جمیل نہیں کرسکتے تھے اور انہوں نے کیا بھی نہیں۔ مونو ٹائپ کارپوریشن نے جس نے یہ پروگرام تیار کیا انہوں نے پہلے دس کمپیوٹر تیار کیے تھے۔ اس کی خاص قیمت متعین کی گئی اب مسئلہ اس پر ڈیوٹی معاف کرانے کا تھا۔ اس پر اخباری صنعت نے شور مچایا کہ صرف دس مشینوں سے کیا ہوگا۔ حکومت درآمد کی جانے والی تمام مشینوں پر ڈیوٹی معاف کرے۔ مزے کی بات ہے کہ حکومت نے یہ دس مشینیں بھی نہیں منگوائی تھیں بہرحال دوسرے ذریعے سے یہ دس مشینیں منگوائی گئیں اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کہا کہ پریس والے پہلے ان دس مشینوں کو تو استعمال کریں۔

یورپ اور امریکا میں ساٹھ کی دہائی میں کمپیوٹر رائج ہوچکا تھا۔ وہاں حکومتوں نے اس معاملے میں پوری حوصلہ افزائی کی اور اکثر جگہوں پر کمپیوٹر کی صنعت کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ اس صنعت کی حیرت انگیز ترقی کی صورت میں نکلا تھا۔ وہ ممالک جو کمپیوٹر کی صنعت نہیں لگاسکتے تھے۔ انہوں نے سافٹ ویئر کی طرف توجہ دی اور اسی مقصد کے لیے ملک میں کمپیوٹر کے ہارڈویئر کی درآمد کی فراخ دلانہ اجازت تھی۔ ان میں بھارت سرفہرست تھا۔ اس نے ۱۹۷۰ء میں کمپیوٹر کی تعلیم و تربیت کی طرف بھرپور توجہ دی تھی۔ اس کے نتیجے میں آج بھارت سافٹ ویئر کے شعبے میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے اور وہاں پانچ لاکھ کے قریب ماہرین پائے جاتے ہیں۔

پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ اشیائے تعیش کی درآمد پر تو کھلی اجازت تھی۔ یورپ اور امریکا سے لوٹنے والوں کو الیکٹرانکس کا سامان اور دوسری اشیا لانے کی تو مکمل اجازت تھی لیکن کمپیوٹر کی درآمد پر ٹیکس تھا۔ اس کی وجہ سے کمپیوٹر اتنا مہنگا تھا کہ عام آدمی تو کیا' بڑے بڑے تجارتی اداروں کی پہنچ سے بھی باہر تھا۔ اور عام طور سے ملک میں وہ کمپیوٹر آتے تھے جو یورپ اور امریکا میں متروک ہوچکے ہوتے تھے۔ اس وقت کمپیوٹر صرف وہاں ہی بنا کرتے تھے۔ جاپان میں چپ سازی کی جاتی تھی۔ لیکن جب مقابلہ بڑھا اور دوسرے ممالک بھی اس میں آگے آگئے۔ آئی بی ایم اور انٹیل جیسی مائیکرو پروسیسر بنانے والی کمپنیوں نے مشرق بعید کے ممالک میں اپنے پلانٹ لگائے تو کمپیوٹر کی قیمت حیرت انگیز سرعت سے گرتی چلی گئی۔ ۱۹۸۶ء میں

پاکستان میں ٹوایٹ سکس کمپیوٹر دو لاکھ روپے میں دستیاب تھا۔ تو ۱۹۹۵ء میں پینٹیئم ون جو اس سے دس گنا زیادہ تیز رفتار تھا، پچاس ہزار میں ملنے لگا۔ ۱۹۹۸ء میں پینٹیئم تھری آیا جس کی قیمت چالیس ہزار تھی اور اب پینٹیئم فور پرسنل کمپیوٹر صرف چالیس ہزار میں دستیاب ہے۔ ۱۹۸۶ء میں دو لاکھ میں بکنے والا کمپیوٹر اب کوئی دو ہزار میں بھی نہیں لیتا۔ اس سے کمپیوٹر میں تیزی سے گرتی قیمتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ آج ایک پی فور کی مشین دنیا کے پہلے سپر کمپیوٹر سے بھی کئی گنا زیادہ طاقت ور ہے اور یہ وہ سب کام کرسکتا ہے جو کوئی سپر کمپیوٹر کرتا ہے۔ سافٹ ویئر کے شعبے میں ترقی کا یہ حال ہے کہ ابھی ایک سافٹ ویئر پوری طرح استعمال بھی نہیں ہوتا تو اس کی جگہ اس سے بہتر ورژن آ جاتا ہے۔ مائیکروسافٹ نے ڈوس اور ونڈو جیسے بے مثال آپریٹنگ سسٹم متعارف کرا کے پرسنل کمپیوٹر کی تقدیر ہی بدل دی (خود مائیکروسافٹ کارپوریشن کے صدر کی تقدیر بھی بدل دی۔ آج وہ دنیا کا امیر ترین اور پہلا ڈالرز میں کھرب پتی شخص ہے یعنی بل گیٹس)

نوری نستعلیق کے لیے جو کمپیوٹرز استعمال کیے گئے تھے وہ نسبتاً بڑے کمپیوٹرز تھے۔ لیزر کامپ کہلانے والے ان کمپیوٹروں کا شمار منی کمپیوٹرز میں ہوتا تھا۔ حسب ارادہ سب سے پہلا کمپیوٹر جنگ اخبار نے اپنے لاہور ایڈیشن کے لیے استعمال کیا تھا اس وقت ملک میں کمپیوٹر آپریٹرز کا قحط تھا کیونکہ اس وقت یہ سچ مچ ایسی پیچیدہ مشین تھی کہ اسے استعمال کے لیے ایک تربیت یافتہ آپریٹر کی ضرورت پڑتی تھی۔ مشین کے ساتھ مکمل مینول تھا لیکن اسے سمجھنے والے بہت کم تھے۔ لہٰذا استعمال میں کچھ دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ میر خلیل الرحمٰن نے ایک ٹی وی انٹرویو میں شکایت کی تھی کہ مشین میں بعض خامیاں ہیں اور یہ براہِ راست غلطیوں کی تصحیح نہیں کر رہی ہے۔

اگرچہ مرزا جمیل نے عملی طور پر لیزر کامپ پر زیادہ کام نہیں کیا تھا لیکن پیوندوں کی تیاری اور پروجیکٹ کے دوران میں وہ اس کی تھیوری اتنی بار پڑھ چکے تھے کہ انہیں اس کا طریقۂ استعمال ازبر ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے میر خلیل الرحمٰن سے رابطہ کر کے انہیں وضاحت سے بتایا کہ کمپیوٹر کس طرح غلطیوں کی خودکار تصحیح کرتا ہے اور یہ کام اتنا آسان ہے کہ محض ایک بٹن دبانے سے ہو جاتا ہے۔ بنیادی غلطی تکنیکی عملے کی تھی جو اس چیز کو صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ اخبار میں اچھی خاصی نوری نستعلیق کے درمیان اچانک ایک لفظ ہاتھ سے کتابت کیا ہوا سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں اوّل تو کی بورڈ آپریٹر کی ناتجربہ کاری، دوم خبر لکھنے والے نے خبر اس طرح جلدی میں لکھی کہ کچھ کا کچھ لکھ گیا۔ رپورٹر حضرات کے پاس تو ویسے ہی وقت کی کمی ہوتی ہے اور نہ ہی ہر شخص کی تحریر آسانی سے پڑھنے میں آتی ہے۔ ایک کی بورڈ آپریٹر ایک منٹ میں پچاس الفاظ آسانی سے ٹائپ کر لیتا ہے۔ بہ شرط کہ اسے دی جانے والی تحریر پڑھنے کے قابل ہو۔ لہٰذا جلد بازی میں اور بعض اوقات تو سمجھے بغیر آپریٹر جو سمجھ میں آتا ہے، لکھ دیتا ہے۔ اب یہ تحریر جب مدیر کے پاس جاتی ہے اور وہ اس میں سے غلطی دریافت کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ اسے کمپیوٹر ہی سے صحیح کروایا جائے، غلطی کی تصحیح ہاتھ سے کر دی جاتی، یہ طریقہ غلط تھا۔

لیزر کامپ میں ایک حصہ ایڈیٹنگ کا بھی تھا۔ یعنی جو غلطی ہو جاتی اسے کمپیوٹر ہی میں درست کیا جا سکتا تھا۔ یہ نہ صرف رواں صفحے بلکہ سابق صفحات یعنی پورے مدار میں کہیں بھی ہونے والی غلطی آسانی سے درست کر دیتی تھی۔ اس میں ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔ آج کل تو طریقہ یہ ہے کہ ادھر آپریٹر خبر کو کمپیوٹر پر کمپوز کر رہا ہوتا ہے، دوسری طرف مدیر اپنے سامنے کمپیوٹر پر فوری کے فوری اسے دیکھ کر تصحیح کا کام بھی کرتا جاتا ہے۔ کیوں کہ تصحیح کا اختیار اس کے پاس بھی ہوتا ہے۔ بلکہ وہ چاہے تو حسبِ ضرورت خبر میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔ اب تو پورے پورے صفحے اور میگزین کمپیوٹر پر ہی تیار ہوتے ہیں اور اسی حالت میں پریس بھیجے جاتے ہیں۔ جدید ترین پریس میں جو مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہوتے ہیں، اب کاغذ کی ڈمی بنانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی بلکہ تمام امواد یعنی پورا اخبار یا رسالہ کمپیوٹر سے اٹھا کر پریس کے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہاں سے چھپ کر آ جاتا ہے۔

اس وقت لیزر کامپ کی یہ خوبی بھی تھی کہ اگر کوئی ایسا لفظ جو موجودہ پیوندوں کی مدد سے نہ بن رہا ہو، اسے بہ آسانی خطِ نسخ میں لکھا جا سکتا تھا۔ یہ عربی خط ہے اور اس میں جوڑوں کی منزلیں نہیں ہوتیں جیسی کہ نستعلیق میں ہوتی ہیں جو فارسی خط ہے۔ یوں الفاظ بے شک الگ نظر آتا تھا لیکن اس سے بھی فائدہ ہوتا تھا کہ یہ قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ جیسے خاص طور سے جلی کیا ہوا حرف ہو۔ بعد میں مرزا جمیل نے نوری نستعلیق میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی تھیں جن سے وہ الفاظ بھی آرام سے کتابت ہو جاتے تھے جن کے

پیوند... کمپیوٹر میں نہیں ہوتے تھے۔

مرزا جمیل خوش تھے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ اگرچہ ابتدا میں کوئی چیز بھی مکمل نہیں ہوتی بلکہ اس کے شروع اور بعد کی شکل میں زمین آسمان کا فرق آجاتا ہے۔ گاڑی کی مثال لیجئے' ایک صدی پہلے جب یہ ایجاد ہوئی تھی تو اس وقت کی اور آج کی گاڑیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن نوری نستعلیق ایسی چیز تھی جو ابتدا سے ہی خاصی حد تک مکمل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تبدیلیوں کے اس تیز رفتار دور میں بھی یہ چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ویسی ہی استعمال ہو رہی ہے۔

جب یہ کام مکمل ہوگیا تو مرزا جمیل نے سوچا کہ کسی ذریعے سے اسے قوم کے سامنے پیش کیا جائے۔ سید مطلوب الحسن نے تجویز پیش کی کہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے پاس چلا جائے۔ وہ اردو کے ایک باوقار سپاہی تھے اور ان سے زیادہ کوئی حق دار نہیں تھا جسے یہ خبر سنائی جاتی۔ ڈاکٹر قریشی اس زمانے میں بے حد ضعیف ہوچکے تھے اور بیماریوں کے ہاتھوں بھی تنگ تھے لیکن مقتدرہ کے دفتر باقاعدگی سے آتے تھے۔ اس زمانے میں میجر آفتاب حسن ان کے دستِ راست تھے اور عملی طور پر مقتدرہ کو وہی چلا رہے تھے۔ بہرحال یہ دونوں صاحبان ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں خوش خبری سنائی کہ اردو کا اوّلین سافٹ ویئر تیار ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر قریشی یہ سن کر بے حد خوش ہوئے تھے' بولے۔

"آج کے دور میں میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری کیا ہوسکتی ہے' تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر قریشی نے اس پروگرام کے بارے میں سوالات شروع کیے تو مرزا جمیل کو پہلی بار ان کی علمی حیثیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ ماہرِ تعلیم تھے لیکن ان کے سوالات سے ظاہر تھا کہ انہیں کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ فکر تھی کہ لوگوں کے سامنے جانے سے پہلے پروگرام میں کوئی خامی نہ رہ جائے جب انہیں اطمینان ہوا تو انہوں نے کہا "بھئی' یہ اپنے مطلوب الحسن تو مقتدرہ کی کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس کام کو مقتدرہ کی طرف سے صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش کردوں؟"

مرزا جمیل خوش ہوگئے "ڈاکٹر صاحب' میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی ہے کہ آپ اسے اپنے ہاتھوں سے صدر صاحب کو پیش کریں۔"

اتفاق سے ڈاکٹر صاحب' صدر ضیاء الحق کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ اسی بنا پر وہ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے اور اسلام آباد کے اعلیٰ حلقوں میں ان کا بے حد احترام تھا۔ لہٰذا اپنی علالت کے باوجود ڈاکٹر قریشی خود اسلام آباد گئے اور صدر سے ملاقات کرکے انہیں اس کام کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس پر ضیاء الحق مرحوم نے کہا تھا "ان دونوں حضرات (یعنی مرزا جمیل اور سید مطلوب الحسن) نے اپنا نام تاریخ میں محفوظ کرلیا ہے اور اردو کے لیے اس سے بڑا کارنامہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

مرزا جمیل نے ڈاکٹر قریشی سے کہا تھا کہ اوّل وہ پندرہ مشینوں پر ڈیوٹی معاف کرائیں۔ دوسرے مالیاتی ادارے ان لوگوں کو قرض دیں جو اس کام کو آگے بڑھا رہے ہیں اور تیسرے لائسنس کی حد پچیس لاکھ سے بڑھا کر پچاس لاکھ کردی جائے۔ جب ڈاکٹر صاحب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ پہلی دس مشینوں پر ڈیوٹی معاف کردی گئی تھی۔ مالیاتی اداروں کو بھی ہدایات جاری کردی گئی تھیں اور لائسنس کی حد بھی پچاس لاکھ تک بڑھانے کا وعدہ کرلیا گیا تھا۔ اب مرحلہ تھا کہ اسے قوم کے سامنے پیش کردیا جائے لہٰذا ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو مقتدرہ کے دفتر میں پریس کانفرنس ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے نوری نستعلیق کے بارے میں اعلان کیا تو فرطِ جذبات سے ان کی آواز بھرّا گئی تھی' انہوں نے کہا۔

"مقتدرہ کے پاس نہ تو وسائل تھے اور نہ ہی افرادی قوت۔ اس کے باوجود نوری نستعلیق کو اس کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جارہا ہے تو یہ ان لوگوں کی فراخ دلی ہے۔ اردو اشاعتی صنعت کے لیے یہ سب سے بڑا کام ہے۔"

اس پریس کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب نے حکومت کی جانب سے دس کمپیوٹروں پر ڈیوٹی معافی کا اعلان بھی کیا اور یہ وعدہ بھی کہ دسمبر کے دوران میں لائسنس کی حد پچاس لاکھ تک کردی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب پریس کانفرنس کے بعد مطمئن ہوکر نہیں بیٹھ گئے تھے بلکہ وہ اپنی علالت اور پاؤں میں تکلیف کے باوجود کئی بار مرزا جمیل کے گھر اور ان کے پریس آئے تھے۔ ان کے جوش کا عالم دیکھنے والا ہوتا تھا۔ وہ اپنی پوری توجہ اس پروگرام پر دے رہے تھے۔ حتیٰ کہ جب ایک صاحب نے ارادہ کیا کہ وہ دس کی دس مشینیں لینے کو تیار ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"یہ شخص موقع سے فائدہ اٹھا کر مشینوں کو بلیک کرنا چاہ رہا ہے' میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

دراصل ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ یہ ایجاد صحیح معنوں

میں اردو کی خدمت گار بنے۔ نہ کہ اندھا دھند کمانے کی لالچ میں مبتلا لوگوں کا آلۂ کار بن جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ لیزر کامپ مشینوں کو ایک ہاتھ میں بلکہ ایک شہر میں بھی جمع نہ ہونے دیا جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ پبلشنگ کے ادارے اور افراد اس سے مستفید ہوں۔ مرزا جمیل مطمئن تھے کہ اس مشکل وقت میں ڈاکٹر صاحب ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ یہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب ۳۱ جنوری ۱۹۸۱ء کو انتقال کر گئے تھے۔

ابتدائی کمپیوٹر لیزر کامپ کی مدد سے کام کرتے تھے یعنی جو چیز بھی کتابت کرنی ہوتی تھی' پہلے لیزر کی مدد سے اسے اسکین کرکے کمپیوٹر میں ڈالا جاتا جہاں اس کی ایک فلم بن جاتی۔ اسے پنچ کارڈ کی ایک قسم سمجھیے۔ اس کی مدد سے کمپیوٹر مواد کو برقی طریقے سے ہارڈ ڈسک پر محفوظ کرلیتا تھا۔ یہ سی ڈی ڈرائیو کی ابتدائی شکل تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ سی ڈی ڈرائیو پر کچھ لکھا نہیں جاسکتا یہ صرف پڑھنے کے کام آتی ہے۔ لیزر کامپ ایک بے حد مشکل طریقہ تھا' اس کے مقابلے میں آج کسی بھی ڈیٹا کو اسکیننگ کے ذریعے بہ آسانی کمپیوٹر میں ڈالا جاسکتا ہے اور یہ بغیر کسی فلم یا پنچ کارڈ کے براہ راست ہارڈ ڈسک میں محفوظ ہوجاتا۔

طریقہ یہ تھا کہ تمام الفاظ یا پیوند لیزر کامپ کی مدد سے کمپیوٹر میں محفوظ کرکے اسے فروخت کردیا جاتا۔ اس میں ایک عدد کی بورڈ ہوتا تھا۔ جس پر واضح ہوتا تھا کہ کون سا بٹن دبانے سے کون سا حرف لکھا ہوا آئے گا۔ مثال کے طور پر م اور الف کا بٹن دبانے سے اس کا پیوند بن جاتا۔ اب سب سے پہلے تو آپریٹر اپنے پاس مواد کو کی بورڈ کے ذریعے سے کمپیوٹر میں داخل کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ مواد کمپیوٹر میں ایکسپوزنگ کمانڈ کو پڑھنے کے لیے دیتا جو دیکھتا کہ کوئی لفظ موجود پیوندوں کی پہنچ سے باہر تو نہیں ہے' اس مقصد کے لیے کمپیوٹر اپنی پوری یادداشت استعمال کرتا تھا۔ ساتھ ہی وہ لائنوں کی لمبائی اور کالمز میں غلطی بھی درست کرتا تھا اور یہ کام اتنی تیزی سے کرتا تھا کہ ایک پورے اخبار کے صفحے کے برابر معلومات پڑھنے میں اسے صرف ڈیڑھ منٹ لگتا تھا گویا محض ایک گھنٹے میں پورے صفحات کے برابر مواد ٹائپ اور ایڈٹ کیا جاسکتا ہے اور یہ کام صرف ایک کی بورڈ آپریٹر آسانی سے کرلیتا ہے۔ ہاتھ سے کتابت اور تصحیح کی صورت میں کتنا وقت لگتا اور کتنے افراد استعمال ہوتے اس کا اندازہ آپ خود کرلیں۔

لیزر کامپ کی ایک اور خوبی ایک ہی صفحے پر مختلف کالموں کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار کا کام تھا۔ یعنی یہ سوا دو انچ کے آٹھ کالمز ایک ساتھ کمپوز کرسکتی تھی۔ اسی طرح مختلف مضمون مختلف چوڑائی میں کیے جاسکتے تھے۔ اگر دو چار یا آٹھ کالم الگ الگ کرکے کمپوز کرنا چاہیں تو یہ بھی ممکن تھا۔ اسی طرح تصویروں کے لیے خالی جگہ بھی چھوڑی جاسکتی تھی۔ بلکہ پیج ایک بار تیار ہونے کے بعد خیال آتا کہ نہیں' یہ تصویر کے لیے مناسب جگہ نہیں تھی بلکہ تصویر اس خبر کی جگہ ہونی چاہیے تھی تو یہ کام بھی نہایت آسانی سے ممکن تھا اور اس کے لیے پھر سے پروف ریڈنگ بھی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اسی طرح کسی کتاب کی تیاری کے لیے کتابت کے بعد معلوم ہوا کہ سو میں سے صرف نوّے صفحے استعمال ہوئے ہیں یا سو کے بجائے ایک سو دس صفحے آرہے ہیں۔ تو کمپیوٹر کی مدد سے لائنوں کے درمیان جگہ کم کرکے یا بڑھا کر اس کمی بیشی کو بہ آسانی پورا کیا جاسکتا تھا۔

اردو میں عام طور سے ایک پریشانی دیکھنے میں آتی ہے کہ اس میں ایک لفظ ایک ہی لائن میں آتا ہے اور اس کا کوئی جزو دوسری لائن میں نہیں آسکتا کیونکہ اردو میں ہائفن موجود نہیں ہے۔ جیسے انگریزی میں ایک لفظ اگر سطر ختم ہوجانے سے نامکمل رہ جائے تو اسے ایک ہلکا سا ڈیش لگا کر بقیہ لفظ دوسری سطر کے آغاز میں دے دیا جاتا ہے لیکن اردو میں ایسا ممکن نہیں تھا نتیجے میں سطریں یکساں نہیں رہتی تھیں لیکن نوری نستعلیق میں یہ مسئلہ بھی ختم ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ اگر لفظ بڑا ہے تو لفظوں کے درمیان فاصلہ معمولی سا بڑھا کر سطر پوری کردی جاتی اور اگر لفظ چھوٹا ہوتا تو لفظوں کے درمیان فاصلہ کم کرکے اس کی گنجائش بھی نکال لی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر لفظ ہے مراحل۔ اگر مرا' سطر کے آخر میں آئے اور حل دوسری سطر کے شروع میں تو اس سے خاصی گڑبڑ ہوجاتی۔ خاص طور سے بچے اسے غلط پڑھتے۔ نوری نستعلیق نے یہ مشکل بھی آسان کردی تھی۔

ایک اور مسئلہ الفاظ کے درمیان فاصلے کا ہوتا ہے۔ جس سے دو لفظ آپس میں یوں مل جاتے کہ ایک ہی لگتے تھے۔ خاص طور سے اردو سیکھنے والوں کے لیے یہ مسئلہ بن جاتا تھا کہ وہ کن دو الفاظ کو ملا کر پڑھیں اور کسے چھوڑ دیں۔ اس کا حل یہ تھا کہ ہر دو الفاظ کے درمیان معمولی سا فاصلہ دے دیا جائے۔ جن کی مدد سے ہر لفظ دوسرے سے جدا معلوم ہو۔ یہ طریقہ اب بچوں کی کتابوں میں عام ہوگیا ہے اور اس سے انہیں فائدہ بھی ہوا ہے۔ وہ ہجے آسانی سے کرلیتے ہیں اور

انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کون سا لفظ الگ ہے اور کون سا ملا ہوا چاہے وہ تین چار پیوندوں پر مشتمل کیوں نہ ہو۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود لفظ "اردو" ہے۔ بچے اسے اردو ہی پڑھتے ہیں نہ کہ حرفِ تہجی سمجھ کر پڑھیں۔

جب مرزا جمیل پیوند... کتابت کر رہے تھے تو ساتھ ہی انہوں نے یہ نوٹ بھی لکھ کر دیے کہ اس پیوند... سے دوسروں کا فاصلہ کتنا ہوگا۔ اوّل تو یہ چیز انگریز سمجھتے ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ بات کمپیوٹر کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کیونکہ نوری نستعلیق پر کام کرنے والا کمپیوٹر بھی بنیادی طور پر انگریزی کا کمپیوٹر تھا۔ اردو کے الفاظ اور پیوند... اس کے لیے محض ایک ڈیزائن یا نمونے کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ کمپیوٹر پہلے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتا مثلاً و کا مطلب ڈبلیو ہے اور پھر اس لفظ کو اپنی مشینی زبان جسے ڈیجی ٹائز کرنا بھی کہتے ہیں، تبدیل کرتا ہے۔ تب کہیں جاکر بات آگے بڑھتی ہے۔ مکمل طور پر اردو میں پروگرامنگ سے لیس کمپیوٹر تو اب بھی نہیں آیا ہے البتہ سنا ہے کہ اسے بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا مواد انگریزی کی نسبت کہیں جگہ گھیرے گا۔ مثال کے طور پر ایک صفحہ انگریزی کا ایک کلوبائٹ جگہ گھیر رہا ہے تو اردو کا ایک صفحہ دس کلوبائٹ جگہ گھیرے گا۔

یہ چھوٹے چھوٹے امور تھے لیکن ان کے بغیر نہ تو اردو سافٹ ویئر صحیح طریقے سے بنتا اور نہ ہی صحیح طریقے سے کام کرتا۔ مرزا جمیل نے ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسی چیز نے لوگوں کی توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی اور وہ سب کر دکھایا جو دوسروں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ابتدائی زمانے میں نوری نستعلیق پر اعتراض کیا گیا کہ اس سے عبارت تو آجاتی لیکن سرخیوں کا مسئلہ تو پھر بھی قائم رہتا کیونکہ سب سے بڑا سائز چوبیس تھا جبکہ سرخیوں کے لیے بہتّر کا سائز درکار ہوتا ہے جو کہ کمپیوٹر میں دستیاب نہیں تھا۔ اس مسئلے کے لیے جب مرزا جمیل سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے جنگ کے تکنیکی عملے کو سمجھایا کہ سرخیوں اور اخبار کے نام "جنگ" کو چوبیس کے سائز میں کمپوز کرلیں اور پھر اسے جتنا چاہے بڑھالیں لیکن یہ کام وہی کرسکتا تھا جسے لے آؤٹ کا سلیقہ ہو اور وہ خبروں اور سرخیوں کی کاٹ پیٹ بھی کرسکتا ہو۔ بعد میں پروگرام میں پیوند کرکے سائز میں مزید اضافہ ہوا اور بعد میں تو بیس بائی تیس سائز کے پوسٹر تک بہ آسانی بننے لگے تھے جن کی کتابت پون انچ کے قلم کے حساب سے ہوتی تھی اور یہ شناخت کرنا تقریباً ناممکن تھا کہ کتابت ہاتھ سے کی گئی ہے یا مشین سے۔

انگریزی زبان میں سادہ عبارت کے درمیان کسی خاص لفظ یا فارمولے کو اجاگر کرنے کے لیے خاص لکھائی استعمال کی جاتی ہے جسے ایٹالکس (ITALICS) کہتے ہیں۔ اس میں حروف سیدھے کے بجائے ترچھے ہوتے ہیں یوں لفظ باقی عبارت سے الگ ہوکر واضح نظر آنے لگتا ہے۔ اردو میں یہ کام خطِ نسخ سے لیا جاتا ہے جو نستعلیق سے مختلف ہے لیکن نوری نستعلیق میں پہلی بار اردو کو بھی اٹالکس کے انداز میں اجاگر کیا گیا تھا۔ یعنی الفاظ کسی قدر ترچھے کردیے۔ اس سے عبارت میں انوکھی دلکشی پیدا ہوگئی۔ بعد میں یہ انداز مستقل حیثیت اختیار کرگیا۔

ایک لیزر کامپ کمپیوٹر سے چالیس کی بورڈ آسانی سے استعمال کیے جاسکتے تھے۔ یعنی ایک ہی کمپیوٹر پر بیک وقت چالیس افراد الگ الگ کتابت کرسکتے تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ کسی ایک ہی چیز کی کتابت کریں بلکہ وہ الگ الگ کام بھی کرسکتے تھے اور ایک ہی اخبار یا کتاب کا کام بھی نمٹا سکتے تھے۔ اس کے لیے ان کا کیلی گرافی یا خوش نویسی سے واقف ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کے کام میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ کی بورڈ آپریٹر پر سے جلدی کام کرنے کا دباؤ ہٹ گیا تھا اور یوں غلطیوں کا تناسب بھی کم ہوا اور کام بھی جلدی ہونے لگا۔ یہ چیز خاص طور سے ضمیموں میں کام آتی تھی جب کام کے دباؤ کے باوجود اضافی آپریٹر لگاکر کام جلدی نمٹا لیا جاتا۔

ابتدا میں تین مختلف اقسام کے کی بورڈ تھے۔ ان میں حروف تین شکلوں میں ہوتے تھے یعنی ابتدائی، درمیانی اور آخری۔ اب کسی بھی آپریٹر کے لیے تینوں کو یاد رکھنا مشکل تھا۔ لہٰذا مرزا جمیل نے یہ کیا کہ صرف ایک کی بورڈ رائج کردیا۔ اس میں آپریٹر کو یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی اور سارا کام بھی آسانی سے ہوتا چلا گیا۔ اس زمانے میں مقتدرہ والوں نے بھی اپنا کی بورڈ پیش کیا تھا جو کتابت کے نقطۂ نظر سے خاصا پیچیدہ تھا اور انہوں نے اسے صدرِ پاکستان سے بطور سرکاری کی بورڈ منظور کرالیا تھا یعنی اب سرکاری دفاتر میں یہی کی بورڈ استعمال ہوتا۔ اس سے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ لیزر کامپ کمپیوٹر یا نوری نستعلیق استعمال کرسکتے ہیں۔ اس موقع پر چند مفاد پرستوں نے کوشش کی کہ مرزا جمیل اور مقتدرہ کا آپس میں جھگڑا کروادیا جائے لیکن اتفاق سے دونوں جگہوں پر سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لوگ تھے لہٰذا اس کی نوبت

ی نہیں آئی۔ مرزا جمیل نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ میں یاست میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو بس اپنا کام کر رہا ہوں۔

کی بورڈ کا مسئلہ بالآخر ماہرین کی کمیٹی نے حل کر دیا اور ب پورے ملک میں ایک ہی معیاری کی بورڈ استعمال ہو رہا ہے۔ کی بورڈ سے مراد وہ چیز نہ لی جائے جس پر بیٹھ کر عبارت ٹائپ کی جاتی ہے بلکہ اس سے مطلب ہے کہ ایک بٹن دبانے سے ہی یہ لفظ بنے گا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ایک کی بورڈ کے ایک ٹن سے کوئی لفظ بن رہا ہے تو دوسرے کی بورڈ کے اس بٹن سے کوئی دوسرا لفظ بن رہا ہے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ایک کی ورڈ پر کام کرنے والے فرد کو دوسرے کی بورڈ پر خاصی شکلات پیش آتی تھیں۔ اس کا حل ایک ہی کی بورڈ میں پوشیدہ تھا۔

مرزا جمیل نے شروع سے واضح کر دیا تھا کہ ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ اور کمپیوٹر کے کی بورڈ میں خاصا فرق ہوگا کیونکہ ٹائپ رائٹر کا کی بورڈ پہلے ہی منظور ہو چکا تھا۔ یہ مقتدرہ کا تیار کیا ہوا کی بورڈ تھا جبکہ کمپیوٹر کی ضروریات اس سے قطعی مختلف تھیں۔ کمپیوٹر کی بورڈ نہ صرف کتابت کرتا تھا بلکہ یہ تصحیح، پیوند و اضافے کے ساتھ متعدد دوسرے کام کرتا تھا جو ٹائپ رائٹر پر ناممکن تھے لہٰذا لوگوں کا یہ اصرار کہ مقتدرہ کا کی بورڈ ہی استعمال کیا جائے قطعی بے جا تھا۔ دونوں قسام کے کی بورڈ کے استعمال میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ اردو ٹائپ رائٹر ایک بے حد پیچیدہ مشین ہے جسے ستعمال کرنا خاصی فنی مہارت کا کام ہے۔ ایک ٹائپسٹ کو کسی اچھے انسٹی ٹیوٹ سے سیکھنے میں چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کمپیوٹر کی بورڈ اتنا آسان ہے کہ دس بارہ سال کے بچے بھی دو تین ہفتے میں کام سیکھ جاتے ہیں۔

ٹائپ رائٹر کی کیز کو طاقت سے دبانا پڑتا ہے۔ اس سے نہ صرف انگلیوں پر زور پڑتا ہے بلکہ رفتار بھی سست ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں کیز میکینیکل طریقے سے کام کرتی ہیں۔ جبکہ کمپیوٹر بورڈ میں سافٹ کیز ہوتی ہیں جو انگلیوں کے معمولی دباؤ سے کام کرتی ہیں۔ یہ طریقہ برقی ہے لہٰذا کی دبانے کے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے اندر مطلوبہ لفظ ٹائپ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر رفتار کی کوئی حد نہیں ہے۔ اگر ایک اچھا ٹائپسٹ ایک منٹ میں پچاس ساٹھ حرف ٹائپ کرتا ہے تو ایک کمپیوٹر آپریٹر ایک منٹ میں پچاس ساٹھ لفظ لکھ دیتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے کمپیوٹر کی آمد نے اردو ٹائپنگ کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ پھر ایک ٹائپسٹ کی نہ تو تنخواہ اچھی ہوتی تھی اور نہ اسے کلرک سے اوپر کا رتبہ ملتا تھا۔ جبکہ کمپیوٹر آپریٹر کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور اب بھی دی جاتی ہیں بلکہ یہ کام اعلیٰ فنی صلاحیت کا حامل سمجھا جاتا ہے پھر اس میں آگے بڑھنے کے بے شمار مواقع ہیں۔ اسی بنا پر نوجوان طبقے نے بہت تیزی سے کمپیوٹر کو قبول کیا۔

مرزا جمیل نوری نستعلیق کے خالق کی حیثیت سے اس کی خوبیوں اور کام کرنے کی صلاحیتوں سے واقف تھے لیکن اشاعتی صنعت کے اکثر عام افراد اور بعض کرتا دھرتا بھی اس سے پرہیز کر رہے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس چیز سے ہزاروں کاتبوں اور خوش نویسوں کا کاروبار خطرے میں پڑ جائے گا۔ دوسرا انہیں اعتراض تھا کہ یہ طریقہ بہت مہنگا تھا۔ حالانکہ ایسی بات ہوتی تو ادارہ جنگ سمیت کئی ادارے اس چیز کو استعمال نہ کرتے۔ مرزا جمیل نے اپنے کیریئر میں جو بات سب سے شدت سے محسوس کی تھی۔ وہ اشاعت کا سست ترین طریقۂ کار تھا۔ اس کی وجہ سے کسی بھی کتاب کو بازار میں آنے کے لیے سال بھر کا عرصہ درکار ہوتا تھا اور کوئی بہت جلدی بھی کرتا تب بھی یہ کام چھ سات مہینے سے پہلے نہیں نمٹ سکتا تھا۔

اشاعتی صنعت کی ترقی میں تیز رفتار اشاعت ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے جو ملک تیز رفتار اشاعتی صنعت رکھتے ہیں ان کے ہاں کتابیں بکنے کا تناسب بھی زیادہ ہوتا ہے۔ امریکا یا یورپ میں کوئی بھی کتاب ایک ہفتے کے اندر بازار میں آجاتی تھی اور اب تو یہ دورانیہ صرف دو دن پر محیط رہ گیا ہے۔ یعنی آج کتاب مصنف نے ختم کی اور دو دن بعد یہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ لوگ الیکٹرانک میڈیا کی اس تیز رفتار ترقی کے باوجود کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں کبھی کتابوں کی فروخت میں کمی نہیں آئی بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ یہ ترقی انگریزی زبان کی تیز رفتار کمپوزنگ کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے تو ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جاپان اور چین میں بھی کتابوں کی اشاعت چند دن میں ممکن ہو جاتی ہے اور وہاں لوگ مغربی ممالک سے زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں اور اس کا تعلق شرح خواندگی سے بھی نہیں بنتا ورنہ سری لنکا اور ایران جیسے ممالک میں کتابیں پڑھنے کا اتنا رواج نہیں ہے۔ جتنا کہ ہونا چاہیے یہاں شرح خواندگی خاصی زیادہ ہے۔

پاکستان میں اس معاملے میں ایک خاص ماحول ہے۔

ہمارے ہاں شرح خواندگی زیادہ نہیں ہے لیکن لوگوں میں پڑھنے کا شوق اب بھی برقرار ہے۔ اگرچہ برقی میڈیا نے اس رجحان کو خاصا کم کردیا ہے لیکن اب بھی بے شمار افراد کتابیں پڑھتے ہیں۔ مسئلہ وہی ہے کہ انہیں اپنی دلچسپی کے موضوع پر کتابیں نہیں ملتیں۔ لہٰذا ہماری اشاعتی صنعت صرف ناول' کہانیاں' شاعری اور طنزومزاح چھاپنے تک محدود رہ گئی ہے۔ حالانکہ حالاتِ حاضرہ کے معاملے پر چھپنے والی کتابیں فوراً بکتی ہیں کیونکہ لوگ ان میں دلچسپی لے رہے ہوتے ہیں۔ اب مثال کے طور پر کوئی صاحب افغانستان کے حالات پر کتاب لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں اور وہ اسے چھپوانے جاتے ہیں مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ کتاب چھ مہینے میں تیار ہوگئی اور چھ مہینے میں حالات نہ جانے کیا سے کیا ہوجائیں۔ نہ معلوم لوگوں کو اس میں دلچسپی لگے یا نہ لگے۔ اس بات کا تجربہ اخبارات کو ہوتا ہے کہ کسی بھی خاص واقعے کی صورت میں اخبارات ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو پورے شہر میں ایک بھی کاپی نہیں بچتی۔ جبکہ عام دنوں میں ڈھیروں اخبار پریس میں واپس آتا ہے۔ اگر اخبار آج کی خبر دو دن بعد دے گا تو اسے کون پڑھے گا۔ اخبار خریدے گا کون لیکن حالاتِ حاضرہ کے بارے میں کوئی خاص بات ہو تو اَن پڑھ لوگ بھی اخبار خرید لیتے ہیں۔

نوری نستعلیق کے آنے سے یہ ہوا کہ جو کتابت پہلے چھ سات مہینے یا سال بھر میں ہوتی تھی' وہ اب ایک ہفتے میں ہونے لگی۔ ایک کتاب جو سو صفحات پر مشتمل ہو۔ اسے ایک شخص بہ آسانی لیزر کامپ پر ہفتے بھر میں کتابت کرسکتا ہے۔ اگر مزید جلدی مقصود ہو تو دو یا تین آدمی بھی لگائے جاسکتے ہیں اور ہفتے بھر کے اندر کتاب تیار ہوکر بازار میں آجاتی ہے۔ اب ہمارے ہاں بھی رفتہ رفتہ ایسی مثالیں قائم ہونے لگی ہیں۔ اس طرح کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو ترمیم واضافے کے بعد سال کے سال شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی اشاعت کے لیے ہر دفعہ نئے سرے سے کتابت کرنی پڑتی تھی اور خرچہ اتنا ہی آتا۔ اب یہ ممکن ہے کہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کو فلاپی ڈسک میں محفوظ کرلیا جائے اور بعد میں جب بھی ضرورت ہو۔ نوری نستعلیق کے ذریعے اس میں ترمیم اور اضافے کے ذریعے نیا ایڈیشن کتابت کرکے چھپوالیا جائے۔ یعنی نہ وقت ضائع ہوا نہ سرمایہ اور کتاب تیار' نہ جانے کیوں درسی اور نصابی کتب چھاپنے والے اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہر دفعہ نئے سرے سے کتاب تیار کی جاتی ہے اور وقت الگ ضائع ہوتا ہے کہ طلبہ بے چارے کتاب کے لیے پریشان پھرتے رہتے ہیں۔

مرزا جمیل سے بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ نوری نستعلیق بہت مہنگی ہے۔ عام کتابت دس یا بیس روپے فی صفحے کے حساب سے ہوجاتی ہے لیکن نوری نستعلیق میں پچاس ساٹھ روپے فی صفحے خرچہ آتا ہے۔ یہ خرچہ پبلشروں کو بہت کھلتا تھا اور بہت سارے پبلشر بدستور ہاتھ سے کتابت کرارہے تھے۔ انہیں مرزا جمیل نے سمجھایا کہ نوری نستعلیق ان کے لیے بھی سستی ہے۔ اس کی مثال یوں لیں کہ یہ کم جگہ گھیرتی ہے۔ اب ہاتھ سے کتابت سے سو صفحے بن رہے ہیں تو یہ کام نوری نستعلیق اسّی صفحات پر کردے گی۔ گویا بیس صفحے یعنی کاغذ اور روشنائی کا خرچ تو یوں ہی بچ گیا۔ دوسرے پبلشر کا وقت بھی بچ رہا ہے' وہ ایک کتاب پر چھ مہینے لگاتا جو دردِ سر سے کم نہیں تھا لیکن نوری نستعلیق سے یہ کام اسے ایک ہفتے میں مل جاتا اور وہ کتاب بازار پہنچا کر ایک نئی کتاب کی تیاری میں لگ جاتا یعنی اس سے بزنس کی رفتار میں بھی تیزی آجاتی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو کتاب آج ایک لاکھ کی تعداد میں بکتی تو ممکن ہے چھ مہینے بعد اس کی دس ہزار کاپیاں بھی نہ بکتیں۔ اب پبلشر کی مرضی کہ وہ ایک لاکھ کاپیاں بیچ کر زیادہ کماتا ہے یا دس ہزار کاپیاں بیچ کر کم کماتا ہے۔ مرزا جمیل نے لوگوں کو یقین دلایا کہ ابھی یہ ابتدا ہے۔ کمپیوٹر بہت مہنگے ہیں اور پورے ملک میں چند ایک ہی ہیں لیکن جیسے جیسے کمپیوٹرز سستے ہوں گے۔ ملک میں ان کی تعداد بڑھے گی۔ زیادہ تربیت یافتہ کی آپریٹر سامنے آئیں گے۔ ویسے ویسے کتابت کی قیمت بھی گرتی چلی جائے گی۔ ان کی یہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ آج بیس سال گزرجانے کے بعد بھی جدید ترین اردو کمپوزنگ کی شرح پچاس روپے فی صفحے سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی بیس سال پہلے والی حالانکہ دیگر چیزوں کی قیمت سے موازنہ کیا جائے مثلاً کاغذ اور سیاہی کی قیمت سے تو اس میں بھی کم ازکم تین گنا اضافہ ہونا چاہیے تھا اور اگر کسی کے پاس اپنا کمپیوٹر ہے تو وہ یہ کام بالکل مفت میں کرسکتا ہے یعنی کمپوزنگ خود کرے۔

نوری نستعلیق کی بدولت اخبارات اور رسائل کے دفتروں میں کم عملے کی ضرورت پڑنے لگی۔ یوں عملے پر سے کام کا دباؤ کم ہوا۔ کمپیوٹرز کی آمد نے دفتروں کو نیا رنگ دیا۔ ان کی سجاوٹ اور بناوٹ کسی طرح کسی بڑے تجارتی ادارے سے کم نہیں ہے۔ اس کی آمد سے یہ فائدہ ہوا کہ پبلشنگ انڈسٹری پچھلی دو دہائیوں میں کم سے کم بھی دوگنی ہوچکی ہے۔

صرف ڈائجسٹوں کے شعبے میں دیکھیں تو پہلے جو مقبول ترین ڈائجسٹ تیس چالیس ہزار کی تعداد میں چھپتے تھے۔ اب ان کی اشاعت کئی کئی لاکھ ہے۔ اس طرح پہلے یہ ڈائجسٹ خاصی تاخیر سے شائع ہوتے تھے تو اب بعض ڈائجسٹوں کا یہ حال ہے کہ مئی کے مہینے میں ان کا جولائی کا شمارہ آچکا ہوتا ہے۔

یہ بات اکثر پبلشرز کی سمجھ میں آگئی۔ خاص طور سے درسی کتابیں چھاپنے والے پبلشرز نے اس کا بہت فائدہ اٹھایا اور ایک دن میں کتاب مارکیٹ میں لانے لگے کیوں کہ رنگارنگ انگلش میڈیم اسکولوں نے نت نئے نصاب اپنا لیے ہیں جس کی وجہ سے ہر روز مارکیٹ میں ایک درسی کتاب آنے لگی۔ اس بہتی گنگا میں پبلشرز نے خوب ہاتھ دھوئے لیکن نوری نستعلیق کے زمانے میں جبکہ یہ چیز نئی نئی تھی کم ہی لوگوں نے اس چیز کو استعمال کیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مرزا جمیل نے اپنے ادارے میں نوری نستعلیق رائج نہیں کی تھی۔ اس پر لوگوں نے ان سے پوچھا "آپ نے اب تک خود اس مشین کو استعمال نہیں کیا' اس کی وجہ؟"

مرزا جمیل نے جواب دیا "یہ معاملہ خاصا پرانا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ایلیٹ نے پاکستان میں پہلی بار سیر کلریشن کا کام شروع کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے پہلا کلر اسکینر لگایا۔ پورے ایشیا میں جاپان کے بعد پاکستان دوسرا ملک تھا جہاں کلر سپریشن میں کلر اسکینر کا استعمال شروع ہوا۔ دیکھا دیکھی کچھ اور افراد اور اداروں نے اس جیسی یا اس سے بہتر مشینیں منگوائی تھیں لیکن ایک تو ان کے پاس کام کا تجربہ نہیں تھا اور دوسرے مطلوبہ افراد بھی نہیں تھے لہٰذا ان کا یہ تجربہ ناکام رہا اور انہیں نقصان اٹھانا پڑا اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ صرف جمیل اور ایلیٹ کے ماہر ہی برقی مشینوں کو صحیح طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے بددل ہو کر دوسرے اداروں نے خاصے عرصے تک اس ٹیکنالوجی کو استعمال نہیں کیا کیونکہ نوری نستعلیق کے بنانے اور اسے رائج کرنے میں' میں ہی سب سے زیادہ سرگرم رہا تھا لہٰذا میں ہی اسے سب سے پہلے ایلیٹ کے لیے لیتا اور دوسرے ادارے اسے صحیح طریقے سے استعمال نہیں کر پاتے تو پھر وہی تاثر ابھرتا جو اس ایجاد کے لیے سخت نقصان دہ ہوتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت میں اسے استعمال نہیں کروں گا۔ لیکن دیکھوں گا۔ اگر کسی اور صاحب نے اسے نہیں لگایا تو میں اسے استعمال کر کے دکھاؤں گا۔"

بعد میں ایسا ہی ہوا' جنگ لاہور کی دیکھا دیکھی دوسرے اداروں نے بھی اس چیز کا استعمال شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نوری نستعلیق اشاعت کی دنیا میں لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کر گئی اور آج بھی یہ اس قسم کے کسی مقبول ترین پروگراموں میں شامل ہے کیونکہ ایک اچھے خوش نویس کی تیاری پر پانچ سے دس سال کا عرصہ لگتا ہے۔ اس دوران میں سیکھنے والا کوئی اور کام نہیں کر سکتا جبکہ نوری نستعلیق پر کام کرنے والا شخص محض ایک مہینے میں ماہر ہو جاتا تھا۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سب سے طاقت ور طبقہ مفاد پرستوں کا ہے جو ہر کام کو اپنے مفاد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انگریزی اردو سے زیادہ اہم رہی ہے اس لیے یہ ہر اس کام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے مفاد کے لیے اردو کو کوئی قومی و سرکاری ادارہ نہیں بننے دیا۔ لہٰذا جب نوری نستعلیق کا پروگرام سامنے آیا

توانہوں نے اس کی ہر ممکن مخالفت کی۔ حتیٰ کہ پریس کو اس کے خلاف استعمال کیا اور بعد میں بھی یہ سرگرم عمل رہے۔ مزے کی بات تھی کہ نوری نستعلیق کی مخالفت میں بعض بیانات اور مضامین نوری نستعلیق میں ہی کمپوز..... ہو کر چھپے تھے۔ مرزا جمیل نے سیاست سے ہمیشہ گریز کیا۔ لہٰذا انہوں نے اس قسم کی مخالفت کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنے کام سے کام رکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی ایجاد اپنی اہمیت خود منوالے گی۔

البتہ انہوں نے قومی ترقی کے لیے حکومت کو مشورے ضرور دیے۔ جن میں ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ حکومت درآمد کیے جانے والے دس کمپیوٹرز خود خرید کر انہیں مختلف شہروں میں اشاعتی صنعت کے لحاظ سے لگوادے اور اس کے لیے ایک ٹائپ سیٹنگ کارپوریشن بنادے جو پبلشروں کو اپنی خدمات بیچے۔ ہر آدمی اپنی ضرورت کے مطابق فلاپی پر اپنی کتابت کرواسکے گا۔ اس سے لوگوں کو بھی فائدہ ہوتا کہ انہیں معیاری کتابت سستی اور فوری ہوجاتی کوئی مفاد پرست مشین سے زیادہ نفع نہیں حاصل کرسکتا تھا۔ دوسرے اس سے حکومت بھی کماتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی ٹیکنالوجی بہت جلد پورے ملک میں رائج ہوجاتی۔ مگر افسوس کہ اس تجویز کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ایک فرد یا ادارہ ایک مشین لے اور اس کے کی بورڈ دوسرے اداروں کو فروخت کردے۔ اس زمانے میں ایک کی بورڈ ایک لاکھ روپے کا آتا تھا۔ (ہے نا ناقابلِ یقین بات۔ آج یہی کی بورڈ اس سے زیادہ کوالٹی اور خصوصیات والا صرف دو ڈھائی سو روپے میں آجاتا ہے) اس کا فائدہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے کی بورڈ سے کام لے سکتا تھا۔

تمام تر مخالفتوں کے باوجود نوری نستعلیق نے اپنی اہمیت منوالی تھی۔ بے شک آج اس سے بہت زیادہ جدید پروگرام آچکے ہیں لیکن اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی لیکن آپ اس کا موازنہ گراہم بیل کے پہلے فون سے کریں جو آج ایک مضحکہ خیز آلہ لگتا ہے جدید قسم کے رنگارنگ فون سیٹوں کے سامنے۔ اس طرح دنیا کا پہلا ریلوے انجن کیا تھا۔ آج یقیناً اس طرح کے انجن نہیں چل رہے ہیں۔ کمپیوٹر کی دنیا میں تو اور بھی تغیر ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہر تیسرے سال میں پرسنل کمپیوٹرز کی نئی اقسام آجاتی ہیں۔ اب تو ہمارے ہاں بھی نوّے فی صد کمپیوٹرز پانچ سال میں بدل دیے جاتے ہیں یا اپ گریڈ کرلیے جاتے ہیں۔ سافٹ ویئر کی دنیا میں تو اس سے بھی زیادہ تغیر ہے۔ ابھی ایک سافٹ ویئر صحیح طریقے سے استعمال بھی نہیں ہوتا کہ دوسرا اس سے جدید سافٹ ویئر آجاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ونڈو آپریٹنگ سسٹم ہے جس کی سات آٹھ الگ اقسام آچکی ہیں جبکہ ان کی بھی متعدد ذیلی اقسام ہیں۔

نوری نستعلیق غالباً واحد نان آپریٹنگ سافٹ ویئر ہے جو گزشتہ بیس سال سے استعمال ہورہا ہے۔ کمپیوٹر کی دنیا میں یہ عرصہ عمرِ خضر سے کم نہیں ہوتا۔ سافٹ ویئرز تو دو تین سال کے عرصے میں مکمل طور پر بدل جاتے ہیں یا ان کی جگہ دوسرے پروگرام آجاتے ہیں۔ نوری نستعلیق کے لیے اپنی اہمیت برقرار رکھنا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی کئی اعلیٰ درجے کے اردو کتابت کے پروگرام آئے۔ جیسے شاہ کار لیکن نوری نستعلیق جیسی شہرت کسی کو حاصل نہیں ہوئی قومی اہمیت کے اس پروگرام کی تیاری تنِ تنہا مرزا جمیل کے سرجاتی ہے۔ جنھوں نے اس کے لیے نہ صرف سرمایہ فراہم کیا بلکہ اس کے لیے خود بھی دن رات شدید محنت کی۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے سکون و آرام حتیٰ کہ اپنے کاروبار پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ جوان کے روزگار کا ذریعہ تھا۔ خدا نخواستہ یہ منصوبہ ناکام ہوجاتا تو انہیں بھاری مالی خسارہ برداشت کرنا پڑتا۔ مگر خدا نے ان کی محنت اور خلوص کو قبول کیا اور انہیں بے مثال کامیابی دی۔ ان کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا تھا۔ حکومت نے ان کی خدمت کے اعتراف میں انہیں تمغائے امتیاز سے نوازا لیکن ان کے لیے اصل تمغا نوری نستعلیق کی کامیابی ہے جو ہمیشہ ان کے سینے پر فخر سے جگمگاتا رہے گا۔

آج کل مرزا جمیل تقریباً ریٹائر ہوچکے ہیں۔ ان کا قائم کردہ ادارہ ایلیٹ پبلشرز آج بھی وطنِ عزیز کے چند اہم ترین پبلشنگ اداروں میں شامل ہے۔ اب یہاں مرزا جمیل کی اگلی نسل...کام کررہی ہے۔ کبھی کبھی خود مرزا جمیل بھی اپنے لگائے اس تناور درخت کی چھاؤں میں سستانے آجاتے ہیں۔ عمر کی اسّی بہاریں دیکھ کر وہ خوش اور مطمئن ہیں۔ ایک فرد کے ذمّے دوسرے فرد، خاندان، معاشرے اور انسانیت کے جو فرائض ہوتے ہیں، مرزا جمیل نے انہیں بڑے احسن طریقے سے ادا کیا۔

انسان فانی ہے، ممکن ہے کل مرزا جمیل ہم میں نہ رہیں لیکن ان کا کام اور ان کا نام نوری نستعلیق کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(6)

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کرسکتے

کاشف زبیر

روزِ ازل سے عشق کی فسوں کاریاں اور بوالعجبیاں جاری و ساری ہیں۔ یہ عظیم و لافانی جذبہ ہر دور، ہر خطۂ زمین پر نت نئے رنگ دکھاتا اور اپنے پیچھے ہزاروں سوال چھوڑ جاتا ہے۔ برِاعظم افریقہ سے ایک ایسی ہی محبت بھری کہانی پیشِ خدمت ہے جو اس لافانی جذبے کی حیرت انگیز جلوہ نمائی کرتی ہے۔

ذات پات، رنگ و نسل سے ماورا ہو کر دھڑکنے والے دو دلوں کا جاں سوز قصہ

گائیڈ کے ساتھ گزرتے ہوئے میں نے اس بوڑھے افریقی کو اس قبر کے سرہانے بیٹھے دیکھا۔ اس کے سرہانے لگی صلیب ظاہر کر رہی تھی کہ قبر کسی عیسائی کی ہے اور یہ بوڑھا مجھے کہیں سے عیسائی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مقامی طرز کا سرخ رنگ کا روایتی لبادہ پہن رکھا تھا جو ہلکی سی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بوڑھا بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ قبر کی مٹی پر تھا اور وہ اس پر اتنی آہستگی سے انگلیاں پھیر رہا تھا جیسے کوئی اپنے کسی پیارے کو سوتے میں سہلاتا ہے کہ کہیں اس کی نیند نہ اچاٹ

ہو جائے۔ اس کے انداز میں اتنی والہانہ محبت تھی کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک ہفتہ پہلے میں کینیا آیا تھا جہاں افریقہ کا سب سے بڑا سفاری خزانہ پایا جاتا ہے۔ نیروبی سے میں شمال مغربی کینیا کی طرف آیا۔ یہ علاقہ کسی قدر صحرائی تھا جہاں کہیں کہیں جنگلات تھے ورنہ جھاڑیوں اور گھاس کے میدان تھے جن میں ہرن، بارہ سنگھے، زیبرے اور زرافے چرتے پھرتے تھے کہیں کہیں ہاتھیوں کے غول پھرتے نظر آرہے تھے اور شیر چیتوں کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ میں نے کرائے پر ایک لینڈ کروزر حاصل کی۔ یہ ڈبل کیبن جیپ تھی اور ایک گائیڈ کی خدمات بھی حاصل کیں۔ میں نے حال ہی میں اپنا ماسٹر مکمل کیا تھا اور اب افریقہ کی سفاری پر ایک مقالہ لکھ کر ڈی فل کرنا چاہتا تھا۔ میرا کینیا کا سفر اسی مقصد کے لیے تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک اسپانسر مل گیا تھا جو اس سفر کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔

میرا نام جین جان فرینک ہے۔ دوست مجھے فرینک کہتے ہیں۔ ٹیکساس کے ایک زرخیز علاقے میں میرے ڈیڈی کا فارم ہے اور جانوروں کا ایک بہت بڑا گلہ ہے۔ ڈیڈی کو اپنے فارم اور جانوروں سے جتنی محبت ہے مجھے ان سے اتنی ہی بیزاری محسوس ہوتی تھی میرے خیال میں دنیا میں اور بھی زمینیں ہیں اور بے شمار جانور پائے جاتے ہیں۔ خود کو چند ایکڑ زمین اور چند جانوروں تک محدود کر لینا عقل مندی نہیں تھی۔ ڈیڈی کا خیال مختلف تھا۔ وہ کہا کرتے تھے یہ زمین اور جانور ان کی دولت ہیں اس لیے ان تک محدود رہنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔

ہائی اسکول پاس کرتے ہی میں نے سب سے پہلے کیلی فورنیا اسٹیٹ یونیورسٹی کے شعبۂ فطری حیات میں داخلہ لیا۔ پانچ سال بعد مجھے ماسٹر کی ڈگری ملی اور ساتھ ہی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کے لیے وظیفہ بھی دے دیا تو میں نے واپس ٹیکساس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شروع سے افریقہ میرے خوابوں کی سرزمین رہا ہے۔ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ افریقہ کا سفر کروں اور وہاں کی فطری حیات کو قریب سے دیکھوں۔ امریکا میں، میں نے جو سفاری پارک دیکھے تھے میرے خیال میں وہ فطری حیات کے ساتھ کسی مذاق سے کم نہیں تھا۔ کہیں اور کے پودوں اور جانوروں کو لا کر زبردستی کسی اور جگہ رکھنا مذاق ہی تو ہے۔ بہرحال ان کا اتنا فائدہ ہوا کہ لوگوں میں فطری حیات اور ماحول کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔

ڈی فل کے لیے میں نے افریقہ کے فطری حیات کا انتخاب کیا تھا۔ ریاست کے ایک مخیر سرمایہ دار نے ذہین طلبا کی تعلیم کے لیے ایک فنڈ قائم کیا تھا۔ اس فنڈ سے مجھے اتنی رقم مل گئی کہ میں تین سال آرام سے افریقہ میں گزار سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے کینیا کا انتخاب کیا جو ایک پُرامن ملک تھا اور یہاں فطری حیات بھرپور انداز میں جلوہ گر تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وہیں مرکز بنا کر اپنا تحقیقی کام کروں گا۔ فطری حیات کے ایک جریدے سے میرا معاہدہ بھی ہوا کہ میں ان کے لیے مضامین لکھا کروں گا اس سے.... مجھے جو آمدنی ہوتی اس سے میں اضافی اخراجات پورے کر سکتا تھا۔ جیسے مجھے وقفے وقفے سے افریقہ کے دوسرے خطوں تک بھی جانا تھا۔

ایک ہفتہ تک گھومنے پھرنے کے بعد مجھے اس علاقے میں ایک فارم میں جگہ مل گئی۔ فارم ایک انگریز جان ایکسن کا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں کینیا آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بقول ایکسن کے ایک زمانے میں یہ علاقے کا سب سے بڑا اور شاندار فارم تھا۔ جس میں ضرورت کی ساری سہولتیں تھیں مگر اب یہ صرف ایک معمولی سا فارم رہ گیا تھا جہاں ایکسن اپنے دو افریقی ملازموں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کی ساری اولادیں اسے چھوڑ کر انگلینڈ جا چکی تھیں مگر اس نے کینیا سے جانے سے انکار کر دیا ایکسن نے دور تک پھیلی مونگ پھلی کی فصل کی طرف اشارہ کیا۔ یہی میرا وطن ہے۔ میں افریقہ کا سفید فام بیٹا ہوں۔ ایکسن کے فارم پر ہی اس کا وسیع و عریض اور خوب صورت سا گھر تھا۔ جس کے بیشتر کمرے خالی پڑے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمرا اس نے میرے حوالے کر دیا۔ باقی معاملات میں فراخ دل ایکسن پکا کاروباری ثابت ہوا تھا۔ اس نے کرائے کے معاملے میں مجھ سے کوئی رعایت نہیں کی تھی البتہ اس کرائے میں ناشتا ضرور شامل تھا۔ باقی دو وقت کے کھانے کے لیے مجھے اسے ادائیگی کرنا پڑتی۔ اس علاقے میں بجلی نہیں تھی لیکن ایکسن نے ایک جنریٹر رکھا تھا۔ یہ جنریٹر بائیو گیس سے چلتا تھا۔ گیس کے لیے اس نے ایک ٹینک بنا رکھا تھا جس میں وہ اپنے جانوروں کا فضلہ ڈال دیتا تھا۔ اکثر رات کے وقت ہی جنریٹر چلتا تھا۔ باقی مجھے اگر ضرورت پڑتی تو اس نے ایک بیٹری رکھی تھی۔

مکان کے چاروں طرف باغ اور عقبی حصے۔ میں گھنے درختوں کے سائے میں ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔ محض بارہ سو ڈالرز سالانہ میں مجھے یہ جگہ بری نہیں لگی۔ اگر کسی وجہ سے میں قبل از وقت جانے کا ارادہ کرتا تو وہ میری باقی رقم واپس کر دیتا۔ شروع میں مجھے ذرا اجنبی سا لگا تھا لیکن جلد ہی فارم اور گھر کے ماحول سے مانوس ہو گیا تھا۔ ایکسن کے پاس دو

گھوڑے بھی تھے جن پر وہ اکثر سواری کرتا تھا۔ ٹیکساس کے باشندے کے لیے گھوڑے اتنے ہی مانوس ہوتے ہیں جیسے بچے کے لیے ماں۔ جلد میری گھوڑوں سے دوستی ہوگئی۔ ان میں کئی زیادہ ہوشیار اور ذرا غصہ ور تھا۔ البتہ جیسی طاقت ور اور شریف گھوڑا تھا۔ جب ایکسن کو زیادہ دور جانا ہوتا تھا تو وہ جیسی کا انتخاب ہی کرتا تھا۔

چند دن تو مجھے اپنا سامان ترتیب دینے اور شیڈول بنانے میں گزرے۔ گائیڈ اور کرائے کی جیپ میں واپس بھیج چکا تھا۔ اور اس علاقے میں گائیڈ ذرا مشکل سے ہی ملتا تھا۔ گائیڈ ملنا تو اور بھی محال تھا۔ ایکسن نے گاڑی کا مسئلہ یوں حل کردیا کہ اس کے پاس پرانی ملٹری ماڈل جیپ تھی۔ جو دیکھنے میں تو خستہ حال تھی لیکن چلنے میں خوب تھی۔ اس نے پیش کش کی کہ جب مجھے ضرورت ہو وہ دس ڈالرز روز کے حساب سے یہ جیپ مجھے کرائے پر دے گا۔ ڈیزل اس کی طرف سے ہوگا۔ میری باچھیں کھل گئی تھیں کیونکہ شہر سے آنے والی جیپ مجھے اس سے دوگنا مہنگی پڑتی اور اس میں ایندھن بھی مجھے خود ہی ڈلوانا پڑتا مگر گائیڈ کا مسئلہ بدستور تھا۔ افریقہ میں گائیڈ کے بغیر اندرونی علاقوں میں سفر کرنا ایسا ہی تھا جیسے آنکھ بند کرکے کسی پہاڑی راستے پر چلنا۔ ایکسن نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اردگرد کے علاقوں سے واقفیت بڑھاؤں۔ اس سے مجھے آسانی بھی ہوگی اور مجھے کوئی نہ کوئی اچھا گائیڈ بھی مل جائے گا۔

میں نے فارم کے اردگرد کے علاقوں میں گھومنا شروع کردیا۔ اس طرف روایتی قبائل نہیں تھے بلکہ سفید فاموں کے فارمز میں کام کرنے والے افریقی مزدور آباد تھے۔ میں ان میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اس سے میری مقامی زبانوں سے واقفیت ہونے لگی۔ یہ لوگ زیادہ تر عربی آمیز افریقی بولتے تھے اور شمالی افریقہ سے آئے تھے۔ جہاں خوف ناک خشک سالی نے زراعت کو تباہ، کرکے رکھ دیا تھا۔ کام کی تلاش میں یہ جنوب کی طرف جارہے تھے۔ میں روزانہ صبح سویرے ناشتا کرکے نکل جاتا اور خوب گھومتا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ میں نے ایک ٹیپ ریکارڈ اور ایک کیمرا ساتھ رکھا تھا۔ جو بھی موزوں چیز نظر آتی اس کی تصویر لے کر اس کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کرلیتا۔ گھر آکر اسے میں اپنی نوٹ بک میں اتار لیتا۔

چند مہینوں میں میری مقامی زبانوں میں اچھی خاصی واقفیت ہوگئی اور کچھ افریقی میرے اچھے دوست بن گئے۔ میں ان سے معلومات حاصل کرتا اور ساتھ ہی افریقہ کے بوڑھے لوگوں سے ملتا جو ستّر اسّی برس کے تھے اور ان سے پرانی معلومات حاصل کرکے اس کا موازنہ کرتا۔ اس سے مجھے اپنے مقالے کے موضوع کا تعین کرنے میں آسانی ہوتی۔ میں نے افریقہ میں فطری حیات کے توازن پر مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ساتھ ساتھ میں مضامین لکھ کر میگزین کو بھیج رہا تھا اس کا مجھے اچھا معاوضہ ملنے لگا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع ہوئی تو میں نے سفر پر نکلنے کا فیصلہ کیا۔

خوش قسمتی سے مجھے ایک نوجوان مل گیا جو بچپن سے گائیڈ کا کام کرتا آرہا تھا۔ چوبیس سالہ سوشی خاندانی لحاظ سے پیشہ ور گائیڈ تھا اور شمال مشرقی افریقہ سے اچھی طرح واقف تھا۔ میرا ارادہ جنوبی کینیا کے گھنے جنگلات کی طرف جانے کا تھا جہاں نہ صرف فطری حیات زیادہ بہتر طور پر موجود تھی بلکہ وہاں پر رہنے والے قبائل بھی اپنے پرانے رسم ورواج کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ مغرب میں یہ خیال عام ہے کہ افریقہ میں رہنے والے قبائلیوں کو اپنی فطری حیات کی حفاظت کا کوئی شعور نہیں ہے۔ افریقہ کی فطری حیات کی تباہی میں زیادہ تر ہاتھ ان کا ہی ہے۔ بس اس بات کو غلط ثابت کرنا چاہتا تھا میرے خیال میں افریقہ کی فطری حیات کی تباہی میں زیادہ تر بیرونی عوامل ملوّث تھے۔

میں نے ایکسن سے ایک ہفتے کے لیے جیپ حاصل کی۔ ضروری سامان لیا اور چل پڑے۔ سوشی میرے ساتھ تھا۔ وہ چوڑے چہرے اور بے حد سفید دانتوں والا ہنس مکھ نوجوان تھا۔ اچھی انگریزی بولتا تھا لیکن میں اس سے زیادہ تر مقامی زبان میں بات کرتا تھا۔ اس نے مجھے افریقہ کے بارے میں بہت ساری ایسی باتیں بتائی تھیں جن سے میں ناواقف تھا۔ وہ مجھے راستے میں آنے والے علاقوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے بے شمار تصویریں لیں ایک جگہ مجھے شیر جنگلی بھینسوں پر جھپٹتے نظر آئے۔ سیکڑوں کی تعداد میں قوی الجثہ بھینسے چند شیروں کے خوف سے بدحواسی میں فرار ہورہے تھے۔ پھر شیروں نے پہلے سے منتخب بھینسے کو گھیرلیا۔ یہ اصل میں حاملہ مادہ تھی جو تیز نہیں بھاگ سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ سولہ شیروں کی اس ٹولی نے بھینسے کو مار گرایا اور اس کے حصے بخرے کرنے لگے۔ ان کے غرّانے، گوشت کھانے اور ہڈیاں توڑنے کی آواز ہم تک آرہی تھی۔ ایک شیر نے مادہ کا پیٹ چیر کر بچہ نکالا اور اسے لے کر دوسرے شیروں سے ذرا دور جاکر کھانے لگا۔

''افریقہ ایسا ہی سفّاک ہے۔'' سوشی نے تبصرہ کیا ''فطرت ہمیشہ سفّاک ہوتی ہے۔''

ہم آگے روانہ ہوگئے۔ خوش قسمتی سے یہ خشک موسم تھا

اس لیے راستے میں آنے والی ندیاں نالے خشک تھے۔ ایک دریا ہم نے اس طرح عبور کیا کہ پانی جیپ میں ہمارے پیروں تک تھا۔ برسات کے زمانے میں اس دریا کو کشتی میں عبور کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ دوسرے دن ہم جنوبی کینیا کے گھنے جنگلات میں داخل ہو گئے تھے۔ تمدن کی دنیا اب پیچھے رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا یہ قبائلی اپنے علاقے میں کسی غیر افریقی کی موجودگی برداشت نہیں کرتے تھے لیکن اب یہاں پر بھی بعض سفید فاموں کے کافی اور چائے کے باغات ہیں۔

میں نے دیکھا کہ واقعی یہاں پر بھی سفید فام آباد تھے لیکن کم تعداد میں۔ ان کے چائے اور کافی کے فارمز پر افریقی مزدور کام کر رہے تھے۔ مقامی قبائل سفید فاموں کے پاس کام کرنا اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی فارم پر رک کر ہم ذرا دیر کے لیے ستائے تھے۔ اب تک ہم نے کوئی پانچ سو میل کا سفر طے کیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب جیپ یہاں ہی چھوڑ دینی چاہیے یہاں کا جواں سال منیجر باب رابرٹ اچھا آدمی تھا۔ اس نے میری جیپ اپنے فارم پر رکھنے کی حامی بھرلی۔ اس نے رات میری دعوت کی.... اس کی حسین بیوی مشہور ہیروئن جولیا رابرٹس سے ملتی تھی۔ اس نے لذیذ ڈنر تیار کیا تھا۔ صبح رابرٹ نے مجھے سفر کے لیے دو عدد صحت مند گدھے فراہم کیے۔ ان علاقوں میں سفر کے لیے یہ بہترین جانور ہے۔

''کوشش کرنا کہ جنگل کے کنارے کنارے سفر کرو۔ جنگل کے اندر جانا صحیح نہیں ہوگا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''میں اس کے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔''

رابرٹ کے فارم سے آگے ... ہم گدھوں پر روانہ ہو گئے تھے۔ ایک پر میں سوار تھا اور دوسرے پر سامان تھا۔ ایک گھنٹے بعد سوشی گدھے پر سوار ہو گیا اور میں پیدل چلنے لگا۔ سوشی میرے اس سلوک پر حیران ضرور ہوا تھا لیکن وہ خوش بھی ہوا۔ میں نے کہا ''اس طرح ہم ایک ٹیم بن کر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔''

سوشی نے مجھے بتایا کہ واقعی جنگلات کے اندر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں باہر ہی سفر کرنا چاہیے۔

کینیا کے جنگلات افریقہ میں فطری حیات کا سب سے بڑا خزانہ رکھتے ہیں۔ گدھوں پر سفر سے رفتار سست تھی لیکن ان دشوار گزار جنگلوں کے لیے اس سے بہتر سواری اور کوئی نہیں تھی۔ ہم سارا دن سفر کرتے تھے۔ میں تصویریں لیتا اور ریکارڈ میں اپنے تاثرات محفوظ کرتا تھا۔ رات کو جب ہم خیمہ لگاتے تو میں سونے سے پہلے اپنے نوٹس لکھتا تھا۔ سوشی رات کو پہرہ دیتا اور صبح میں جاگتا تو وہ سو جاتا۔ اس معاملے میں وہ ایک حیرت انگیز آدمی تھا سارے دن کی تھکن کے بعد وہ محض چار پانچ گھنٹے سو کر تازہ دم ہو جاتا تھا۔

چار دن بعد ہم واپس رابرٹ کے فارم پر آگئے تھے۔ تھکن سے میرا برا حال تھا۔ اس لیے میں نے فوری واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ رابرٹ نے بھی اصرار کیا کہ میں ایک دن اس کے پاس ٹھہروں۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنے نوٹس ترتیب دیے اور میگزین کے لیے آرٹیکل لکھا۔ اسے تصویروں سمیت رابرٹ کے حوالے کر دیا۔ اس نے کہا کہ جب وہ اپنی خوراک لینے نزدیکی شہر جائے گا تو میرا یہ لفافہ بھی پوسٹ کر دے گا۔ اگلے روز ہم واپس چل پڑے۔ راستے میں، میں نے اس بوڑھے کو قبر پر بیٹھے دیکھا تھا۔

اگلی بار میں تقریباً ایک سال بعد جب رابرٹ سے ملنے کے لیے آیا تب بھی میں نے اس بوڑھے کو دیکھا۔ وہ اسی طرح قبر کے پاس بیٹھا محبت سے مٹی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں رابرٹ کے ساتھ علاقے کی سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ بوڑھا کون ہے اور قبر کس کی ہے؟''

رابرٹ افسردہ ہو گیا تھا ''یہ بھی ایک الم ناک کہانی ہے۔ تم اسے محبت کی کلاسک بھی کہہ سکتے ہو۔ سچی کلاسک۔''

''یعنی قبر کسی عورت کی ہے؟''

اس نے سر ہلایا ''یہ بادائی ہے۔ مقامی قبائلی سردار کا بیٹا تھا لیکن اب صرف اس قبر کا مجاور ہے۔''

''اور لڑکی۔''

''وہ مسز ولیم ہاس کی بیٹی تھی۔ سارہ ہاس۔''

میں دنگ رہ گیا ''یعنی لڑکی سفید فام تھی۔''

اس نے سر ہلایا ''ہاں لیکن یہ پرانی بات ہے۔ میں صرف چھ سال پہلے آیا ہوں اس لیے مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ نہ تو بادائی کا باپ اور نہ ہی سارہ کا باپ اس رشتے پر آمادہ تھے۔ اس نے محبت کو المیے میں بدل دیا۔''

ہم باتیں کرتے واپس آگئے۔ میں اس انوکھی محبت کے بارے میں سوچتا رہا، سیاہ فام اور سفید فام کی محبت کوئی انوکھی بات نہیں ہے اب تو امریکا میں بھی ایسی شادیاں عام ہو گئی ہیں لیکن وہ روایتی محبت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ محض پسند یا تبدیلی کے لیے لوگ اس قسم کی شادیاں کر لیتے ہیں مگر اس بوڑھے کے انداز میں جو محبت تھی وہ مجھے سب سے الگ لگی تھی۔ رابرٹ نے بتایا تھا کہ بادائی کی اس محبت کو مرے

بائیس برس گزر چکے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے سارہ کل ہی مری ہو۔ اس نے اسے ابھی ابھی دفن کیا ہو۔ بے اختیار مجھے تجسس ہوا کہ میں بادائی کی اس محبت کے بارے میں جانوں۔

رابرٹ نے بتایا کہ بادائی کسی سے بات نہیں کرتا۔ قبر کے پاس ہی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اس کے قبیلے والے اس کی ضروریات کی چیزیں اس کی جھونپڑی میں رکھ جاتے ہیں مگر اس سے بات کوئی نہیں کرتا۔ اس کے باپ نے اسے قبیلے سے خارج کردیا تھا۔ اب بادائی خود کسی سے بات نہیں کرتا ہے۔ ایک روز میں خود رابرٹ کے فارم سے نکلا اور پیدل ہی بادائی کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوگیا۔ حسبِ معمول وہ قبر کے پاس بیٹھا محبت سے اس کی مٹی درست کر رہا تھا اس نے سرہانے گلاب کے تازہ پھول رکھے تھے۔ اس علاقے میں گلاب دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں قبر سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری موجودگی محسوس کرلی تھی لیکن نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا اور پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ نہ تو اس نے ایک لفظ کہا اور نہ ہی میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ اگلے روز میں پھر آیا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ تیسرے دن اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ خدا کی پناہ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ اس نے جلدی سے نظریں دوبارہ جھکالیں۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور سر کے بال مینڈھیوں کی صورت میں بندھے اس کے شانوں تک آرہے تھے۔ حسبِ معمول اس نے سرخ رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس سے اگلے روز اس نے مجھے دیکھا اور مسکرایا بھی۔ پانچویں دن جب میں نے خود بھی قبر پر جاکر پھول رکھے تو اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔

''نوجوان تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''پہلے تو میں اس کی صاف انگریزی سن کر حیران رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر کہا'' جناب...... مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا۔ میں افریقہ کی فطری حیات کا مطالعہ کرنے آیا ہوں۔''

''تب تو تمہیں میری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔''

''جناب میرے خیال میں محبت سے زیادہ فطری شے کوئی نہیں ہوتی۔ میں فطرت کا عاشق ہوں۔''

''تو تم بھی میری کہانی سننا چاہتے ہو؟'' اس نے گہری سانس لی۔

''میں آپ کی کہانی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چونکا تھا۔ ''تم پہلے شخص ہو جس نے ایسی بات کی ہے۔ پتا ہے میری کہانی دکھ ہے...... اس میں تلخی ہے لوگ اسے سن کر تفریح تو لیتے ہیں لیکن اسے محسوس کرنے کی بات صرف تم نے کی ہے۔''

وہ دوبارہ خاموش ہوگیا میں بھی چپ کرکے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ ضرور بولے گا بالآخر اس نے گہری سانس لی نوجوان میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا۔ وہ سب بھی جو میں نے آج تک کسی کو نہیں سنایا۔

☆☆☆

میں بادائی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے باپ نے نو شادیاں کی تھیں لیکن اولاد صرف میری ماں سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ بچپن سے میری ناز برداریاں کی جاتی تھیں۔ محبت کے باوجود باپ نے میری تربیت پر پوری توجہ دی تھی کیونکہ اس کے بعد مجھے ہی قبیلے کا سردار بننا تھا۔ مجھے سارے فنون کی تربیت دی گئی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں، میں نے پہلا شیر مارا تھا۔ اس نے میرے باپ کی دو گائیں ماردی تھیں اور میں نے اس کا تعاقب کرکے اسے اپنے نیزے سے چھیدا۔ اتنی سی عمر میں شیر کا شکار اس سے پہلے ہمارے قبیلے کے کسی فرد نے نہیں کیا تھا۔

بس میرے باپ کو ایک ہی فکر تھی کہ میں لڑکیوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ سردار زادہ ہونے کی وجہ سے قبیلے کی ہر لڑکی میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور یہ بھی ٹھیک تھا کہ مجھے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھ میں جوانی کے جذبات نہیں تھے مگر ایسا لگتا تھا جیسے یہ لڑکیاں میرے لیے نہیں ہیں۔ کوئی چیز مجھے اندر سے بے چین رکھا کرتی تھی اور میں اپنے علاقے میں گھومتا پھرتا تھا۔ گھر میں مجھے ذرا کم ہی سکون ملتا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک میں تمام فنون میں طاق ہوچکا تھا۔ کاشت کاری سے لے کر سالانہ شکار تک میں سب سے آگے رہتا تھا۔ میرا باپ مجھ سے بے حد خوش تھا اور اس کی خواہش تھی کہ قبیلے کی سرداری میرے پاس ہی آئے کیونکہ اس کے لیے ایک مقابلہ ہوتا تھا اور جو بھی اس مقابلے کو جیتتا تھا وہی قبیلے کا سردار بنتا تھا۔

ان کاموں کے علاوہ میں زیادہ تر سفر میں رہتا تھا۔ میں اپنا نیزہ لے کر نکل جاتا۔ بھوک لگتی تو کوئی جانور شکار کرلیتا یا جنگل سے پھول توڑ کر کھالیتا۔ میں ان جنگلوں میں زیادہ سکون محسوس کرتا تھا۔ ایک روز میں ایسے ہی پھر رہا تھا جب میں نے پہلی بار سارہ کو دیکھا۔ شیر کی دھاڑ اور پھر ایک نسوانی چیخ نے

مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نیزہ لے کر اس طرف دوڑا تھا۔ اس وقت ہمارے علاقے میں سفید فام پہلی بار آئے تھے اور انہوں نے یہاں کی زمینوں پر قبضہ کر کے فارمز بنا لیے تھے۔ ہم سیاہ فام ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ خود میں بھی سفید فاموں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی ان کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ علاقے کے اکثر نوجوان سفید فاموں پر حملے کو بہادری سمجھا کرتے تھے اور فخر سے اپنے کارنامے بیان کرتے تھے۔ میرے خیال میں نہتے سفید فاموں پر حملہ کرنا کوئی بہادری نہیں تھی اور یہ بھی کہ آنے والے سفید فام ہمارے رسم ورواج میں مداخلت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے آنے سے سیاہ فاموں کو روزگار ملنے لگا تھا۔ وہ جنگل میں آنے سے گریز کرتے تھے جہاں ہمارا قبیلہ آباد تھا۔

میں بھاگتا ہوا اس جگہ پہنچا تو ایک شیرنی کسی پر غرا رہی تھی جو جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ کوئی مقامی ہے اس لیے میں نے جوش میں شیرنی کو للکارا اور نیزے سے اسے دھمکانے لگا۔ میرے باپ نے شیر کے شکار میں مجھے جو سب سے پہلا گُر بتایا تھا وہ یہ کہ اگر میں نے شیر کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اسے یقینی طور پر مارنے کی کوشش کروں۔ کوئی ہلکا وار شیر کو صرف زخمی کرے گا۔ اس کے بعد شیر زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ اگر شیر کو مارنے کا ارادہ نہ ہو تو صرف دھمکایا جائے۔ میں بھی کوشش کر رہا تھا۔ شیرنی ڈر جائے اور بھاگ جائے۔ جب وہ دہاڑتی تو میں بھی حلق کی پوری طاقت سے آواز نکالتا اور آہستہ آہستہ شیرنی کی طرف بڑھتے ہوئے اسے نیزے سے دھمکاتا۔ رفتہ رفتہ وہ پسپا ہونے لگی۔ ایک بار میں نے ذرا جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نیزہ چبھویا تو وہ بھاگ نکلی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ذرا سی دیر میں میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ میں پلٹ کر جھاڑی کی طرف آیا اور جب اس میں سے پتے ہٹا کے سارہ سامنے آئی تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ ہمارے قبیلے میں ایک دیوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے حسین عورت ہے۔ تو مجھے لگا جیسے وہ دیوی سامنے آ گئی ہو۔ اتنا حسین چہرہ کہ میں شیرنی کو بھول گیا کہ وہ پلٹ کر حملہ نہ کر دے۔ میں تو خود کو بھی بھول گیا تھا۔ میرے اندر سے کسی نے کہا یہی وہ چہرہ ہے جس کی ہمیشہ سے مجھے تلاش ہے۔ سارہ نے خاکی پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ مارے خوف کے اس کا جسم لرز رہا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ شیرنی سے ڈر رہی ہے۔ میں نے اسے اپنی زبان میں سمجھایا ''تم ڈرو نہیں شیرنی بھاگ گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں ذرا اس کے قریب گیا تو وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی تب مجھے پتا چلا کہ وہ مجھ سے خوف زدہ تھی۔ میں نے جلدی سے نیزہ پیچھے کر لیا اور نرم آواز میں کہا۔

''ڈرو مت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔'' یہ بات میں نے اشارے میں بھی کہی تو اس کا خوف ذرا کم ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا ذرا آگے اس کی رائفل پڑی تھی اس وقت ہمیں اس ہتھیار کے بارے میں نہیں پتا تھا۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اس کا الٹ پلٹ کر معائنہ کیا۔ سارہ خوف زدہ سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ٹریگر کو ہاتھ لگایا تو وہ چلا اٹھی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور رائفل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے جلدی سے رائفل لے لی اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں اسے دیکھتا رہا پھر میں نے اسے کہا ''میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔''

خاصی مشکل سے میں نے اسے اپنی بات سمجھائی اور وہ گھوم کر چل پڑی۔ اپنے لباس میں اس کے جسم کی ساخت نمایاں تھی میں نے آج تک کسی عورت کو اتنی خوب صورت جسمانی ساخت میں نہیں دیکھا تھا۔ گرنے سے اس کے بال کھل گئے تھے اور اس کے ہیٹ سے نکل کر سنہری گچھوں کی طرح اس کی پشت پر بکھر رہے تھے۔ وہ آگے آگے چلتی رہی اور میں پوری طرح چوکنا اس کے پیچھے چلتا رہا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے مجھے اشارے سے سامنے نظر آنے والا فارم دکھایا اور کہا کہ میں اب واپس چلا جاؤں۔ اس کا گھر آ گیا ہے۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس سے جاؤں لیکن میں اس کے گھر میں نہیں جا سکتا تھا وہ سفید فام تھی اور مقامی لوگ کسی سفید فام کے گھر نہیں جاتے تھے۔ میں نے اسے اشاروں میں سمجھایا اس طرح اکیلی نہ نکلا کرے۔ اس علاقے میں بے شمار درندے ہیں چار پیروں والے بھی اور دو پیروں والے بھی۔ اس نے سر ہلایا اور چلی گئی۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ پھر میں واپس آ گیا۔ رہ رہ کر اس کی صورت میری نظروں کے سامنے آ رہی تھی۔ اگلے دن میں پھر اس کے فارم کے سامنے تھا۔ وہ اس فارم میں گئی تھی۔ فارم کے گرد جنگلی جانوروں سے بچانے کے لیے باڑھ لگی تھی۔ ایک بار میں باڑھ کے پاس چلا گیا پھر واپس آ گیا۔ میں نے پورے فارم کے گرد چکر لگایا اس امید میں کہ شاید اس کی صورت نظر آئے مگر مجھے مایوسی ہی ہوئی۔ میں اگلے روز پھر وہاں موجود تھا۔ اس روز بھی مجھے وہ نظر نہ آئی۔ تیسرے دن میں فارم کے آس پاس پھر رہا تھا کہ آناً فاناً دو سفید فاموں نے مجھے گھیر لیا ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے جن سے شعلے نکلتے تھے اور آدمی مر جاتا تھا۔ میں ڈرتا نہیں تھا

لیکن میں تو سارہ کو دیکھنے آیا تھا کسی سے لڑائی کرنے نہیں۔ یہ بات میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سمجھے نہیں۔ اس کے بجائے مجھے دھکیل کر فارم میں لے گئے دیکھتے ہی دیکھتے کئی افراد اور آ گئے اور انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ میں سارہ کی خاطر یہ سلوک برداشت کرتا رہا۔ وہ مجھے فارم کے وسط میں بنے ایک خوب صورت سے مکان تک لائے۔ تو میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ شاید سارہ یہیں رہتی تھی۔ اس مکان کے سامنے باغ تھا۔ زمین پر ہموار گھاس تھی۔ کرسیاں رکھی تھیں اور اس پر ایک سفید فام بیٹھا تھا اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ انہوں نے اسے بتایا۔ پھر اس نے مقامی زبان میں مجھ سے پوچھا۔

''تم کئی دن سے ہمارے فارم کے اردگرد پھر رہے ہو کیوں؟''

میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ میں سارہ کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس وقت مجھے اس کا نام بھی پتا نہیں تھا۔ میں خاموش رہا تو ایک سفید فام نے میری پشت پر ہاتھ میں پکڑا ہنٹر مارا۔ میں بپھر گیا۔ میں نے گھوم کر اسے لات ماری تو وہ دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی باقی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میرے ہاتھ بندھے تھے۔ اس کے باوجود میں ان کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ میرے اندر جان تھی میں جس کو لات مارتا اسے تارے نظر آ جاتے تھے پھر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں بے اختیار رک گیا۔ یہ سارہ تھی جو مکان کی طرف سے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سب بھول گیا۔ اپنے اوپر برستے ہاتھ بھی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا۔ دیوتا کی قسم نہیں ہوا کہ مجھے مار پڑ رہی ہے۔ سارہ پاس آتے ہوئے چلاّ رہی تھی۔ ہاتھ کے اشارے کر رہی تھی کہ مجھے چھوڑ دیا جائے۔ نہ مارا جائے پھر اس نے پاس آ کر اپنے نازک ہاتھوں سے دوسروں کو دور دھکیلنا شروع کر دیا۔ اسے دیکھ کر سب رک گئے۔ کرسی پر بیٹھے شخص نے غصے سے اسے کچھ کہا تو سارہ نے اسے بتایا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ غالباً یہ کہ میں نے اسے شیر سے بچایا تھا۔ کرسی پر بیٹھے شخص کے تاثرات بدلنے لگے۔ اس نے نوکروں سے کچھ کہا۔ انہوں نے جلدی سے میرے ہاتھ کھول دیے۔ میرے جسم پر چوٹوں کے نشانات تھے ہونٹ پھٹ جانے سے خون بہہ رہا تھا۔ سارہ ان لوگوں پر سخت برہم تھی۔ انہیں نہ جانے کیا کیا کہتی اس نے میرا بازو پکڑا اور اندر لے جانے لگی۔ کسی نے اسے روکنے کی جرأت نہیں کی۔ اندر ایک صاف ستھرے کمرے میں لا کر اس نے مجھے نرم گدے والی کرسی پر بٹھایا پھر اس نے گرم پانی لا کر اور اس میں لال دوائی ملا کر میرے زخم صاف کیے۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا بس میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے میرا ہونٹ صاف کرنا چاہا تو میں نے اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑا کر زخم صاف کیا۔ لڑائی میں میرا لبادہ بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کی نظر پشت پر ہنٹر کے زخم پر پڑ گئی۔ اس نے اس پر دوائی لگائی۔ ساتھ ہی وہ کچھ کہے جا رہی تھی میری سمجھ میں ایک لفظ نہیں آ رہا تھا مگر اس کا بولنا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے لے جا کر ایک سفید رنگ کے کمرے میں چھوڑا وہاں لکڑی کا بڑا سا ٹب تھا۔ جس میں پانی بھرا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں ٹب میں بیٹھ جاؤں۔ اس نے مجھے ایک نرم کپڑا دیا اور باہر چلی گئی۔ میں کپڑے اتار کر اس ٹب میں بیٹھ گیا۔ پانی گرم تھا۔ مجھے اس میں اچھا لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس طرح گرم پانی کا ٹب استعمال نہیں کیا تھا۔ وہاں ایک گول سی ٹکیا بھی رکھی تھی۔ میں نے اسے چھوا تو میرا ہاتھ چکنا ہو گیا۔ نہا کر میں ایسے ہی باہر آ گیا۔ نرم کپڑا میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو بے اختیار منہ چھپا کر ہنستے ہوئے بھاگی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن پھر ایک مقامی سیاہ فام نے مجھے سفید رنگ کا لبادہ لا کر دیا اور سمجھایا کہ سفید فاموں میں بغیر کپڑوں کے دوسروں کے سامنے آنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ فارم ولیم ہاس نامی گورے کا ہے۔ سارہ اس کی بیٹی ہے۔ اس کے فارم پر ڈیڑھ سو سے زائد افراد کام کرتے تھے۔ یہ بہت دولت مند آدمی تھا۔ میں نے سارہ کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ وہ اپنے ملک سے آئی ہے اور اپنے باپ کے پاس رہ رہی ہے۔ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ شخص گھبرا گیا تھا۔ دیوتا کے لیے...... یہ بات کسی اور کے سامنے مت کہنا۔ ولیم ہاس ایک کالے کے منہ سے اپنی بیٹی کے لیے ایسے الفاظ نہیں سن سکتا۔''

''میں سب کے سامنے کہوں گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا ''میں کسی سے نہیں ڈرتا۔''

اسی اثنا میں سارہ اندر آئی تو اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی نوکر وہاں سے چلا گیا۔ سارہ نے ٹرے میز پر رکھی اس میں کھانے کی ایسی چیزیں رکھی تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں ایک بار اسے دیکھنے لگا اس نے اشارے سے کہا کہ میں کھاؤں لیکن میں اسے ہی دیکھتا رہا۔ اس کی سنہری سی رنگت اچانک سرخ ہو گئی تھی۔ وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھی پھر اس نے ایک چیز اٹھا کر مجھے دی میں نے کھائی...... اس کے ہاتھ سے آئی تھی اس لیے ذائقہ اچھا لگا۔

پھر اس نے ایک پیالی میں سیاہ رنگ کا سیال ڈالا اس میں دودھ ملایا اور سفید سی کوئی چیز بھی ڈالی اور پیالی مجھے دے دی۔ میں نے یہ گرم سی چیز پی۔

"سارہ۔" اچانک ولیم ہاس وہاں آ گیا اور تیز لہجے میں بیٹی سے کچھ کہنے لگا۔ سارہ نے جواب دیا تو وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے باپ کو میرا اس کے ساتھ بیٹھنا اور اس کا میری طرف اتنی توجہ دینا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اٹھ کر جانے لگا تو وہ راستے میں آ گئی۔ اشاروں سے معذرت کرنے لگی۔ میں نے اسے نرمی سے ایک طرف کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ عزت ہم قبائیلیوں کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ ہم کھانے کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن عزت کے بغیر نہیں۔

کتنے ہی دن میں بے کل سا پھرتا رہا میرے ماں باپ نے میری اس بے کلی کو ایک بار پھر جوانی کے تقاضے جانا۔ ایک رات میں اپنی جھونپڑی میں آیا تو وہاں گھاس کے نرم بستر پر نوما میرا انتظار کر رہی تھی۔ نوما ہمارے قبیلے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ ہر نوجوان اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا لیکن اسے طلب کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی کیونکہ وہ قبیلے کے رچ ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ اس سے سارا قبیلہ ڈرتا تھا۔ میرے باپ کے بعد قبیلے میں اسی کا مقام تھا بلکہ بعض دفعہ تو میرا باپ بھی اس کے سامنے مجبور ہو جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پھولوں سے سجی نوما کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب ہے۔ پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "تُو یہاں کیا کر رہی ہے...... میرے جھونپڑے میں۔"

اس نے شرما کر کہا "تیرے اور میرے باپ نے مجھے یہاں بھیجا ہے اب میں تیری دلہن ہوں۔"

"مجھے تیری ضرورت نہیں ہے۔ تُو یہاں سے چلی جا۔" میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں رہ گئی تھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے یوں ٹھکرا سکتا ہے نوجوان تو اس کی آرزو میں آپس میں لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے اور میں نے اسے جانے کو کہہ دیا۔ اس کی اتنی توہین کسی نے نہیں کی تھی۔ میں نے جب دوبارہ اسے سختی سے جانے کے لیے کہا تو وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔ "بادائی تُو اچھا نہیں کر رہا ہے کیا میں خوب صورت نہیں ہوں۔" اس نے اپنے بدن سے پھول نوچ ڈالے تھے۔

"مجھے تیری خوب صورتی سے کچھ نہیں لینا ہے۔" میں نے اس انداز میں کہا تو وہ بلند آواز سے روتی وہاں سے چلی گئی۔ ذرا دیر بعد میرا باپ آ گیا۔ اس نے آتے ہی طیش میں مجھ سے نوما کو واپس بھیجنے کی وجہ پوچھی۔

"کوئی وجہ نہیں ہے۔ بس مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ میں جس سے بھی کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا۔"

"نوما میں کیا برائی ہے۔ تو نے اسے ٹھکرا کر مہا پجاری کی توہین کی ہے۔ تو جانتا ہے وہ اس قبیلے کا سب سے طاقت ور شخص ہے۔ وہ اشارہ کر دے تو میری سرداری بھی چھن جائے۔"

"مجھے سرداری نہیں چاہیے۔" میں نے اکھڑ لہجے میں کہا "میں نوما یا کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

باپ نے مجھے بغور دیکھا "کیا تو کسی دوسرے قبیلے کی لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسے بھی بیوی بنا لے مگر نوما بھی تیری بیوی بنے گی۔"

میں نے پھر انکار کیا۔ باپ برابر مجھ پر دباؤ ڈالتا رہا۔ اس نے مجھے ضد کے نتائج سے ڈرایا مہا پجاری سے دشمنی مول لینے کا مطلب اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لینا ہے۔ وہ جس سے ناراض ہوتا تھا وہ پراسرار طور پر مر جاتا تھا۔ موت کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ باپ نے مجھے عبرت ناک موت سے بھی ڈرایا لیکن میں اس وقت جس ہوا میں اڑ رہا تھا مجھے یہ ساری باتیں اور دھمکیاں بے معنی لگ رہی تھیں۔ میرا باپ مایوس ہو کر چلا گیا۔ وہ بجا طور پر رچ ڈاکٹر سے ڈر رہا تھا۔ یہ بوڑھا شخص بے پناہ طاقتوں کا مالک تھا۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھی اور شیر بھی فرماں بردار ہوتے دیکھے تھے اس کی نگاہوں میں ایسی چمک تھی کہ کوئی اس سے آنکھ نہیں ملا پاتا تھا۔ میں بھی اس سے ڈرتا تھا لیکن سارہ کی محبت نے مجھے بے خوف کر دیا تھا۔ باپ کے غضب سے بچنے کے لیے میں اپنا نیزہ اٹھا کر جھونپڑے سے نکل گیا۔ جنگل میرے لیے دوسرا گھر ہی تھا۔ کئی دن بعد میں واپس آیا تو بظاہر سب معمول کے مطابق تھا۔ اس کے بعد میرے معمولات لوٹ آئے میں اکثر قبیلے سے باہر وقت گزارتا، مجھے انسان سے وحشت ہوتی تھی۔ تنہائی اور سارہ کے خیال سے زیادہ اچھی چیز میرے لیے کچھ اور نہیں تھی۔

ایک روز میں بے خیالی میں پھرتے پھراتے سارہ کے باپ کے فارم کی طرف جا نکلا۔ حالانکہ میں نے عہد کیا تھا کہ اس طرف نہیں جاؤں گا۔ وہاں میری بے عزتی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں واپس آتا میری نظر گھوڑے پر آتی سارہ پر پڑی۔ میں جلدی سے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ سارہ چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آواز دینا شروع کر دی مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے پکار رہی

تھی۔ میرا نام لے رہی تھی۔ دبے دبے لہجے میں جیسے اسے خطرہ ہو کوئی اور نہ سن لے جیسے ہی وہ نزدیک آئی میں درخت کی آڑ سے نکل آیا۔ میرے اچانک سامنے آنے سے گھوڑا گھبرا کر اگلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ سارہ تیار نہیں تھی۔ اس نے چیخ ماری لیکن وہ زمین کے بجائے میرے بازوؤں میں گری تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے مہکتے پھولوں کے ڈھیر کو اٹھا لیا ہو۔ میں نے اسے پاس ہی گھاس پر بٹھایا اور اپنی زبان میں پوچھا ''تمہیں چوٹ تو نہیں لگی۔''

''میں...... ٹھیک ہوں بادائی۔'' اس نے میری زبان میں جواب دے کر مجھے حیران کر دیا۔

''تم نے ہماری زبان بھی سیکھ لی۔''

''تھوڑی سی۔'' وہ مسکرائی ''تمہارے لیے۔''

''میرے لیے۔'' اس کے الفاظ نے جیسے مجھ پر نشہ طاری کر دیا تھا۔

''ہاں۔'' اس نے میرے بازو سے سر ٹکا دیا۔ کتنا سادہ سا اقرار تھا۔ اس لمحے میرا دل چاہا کہ وقت تھم جائے۔ وہ ہمیشہ یونہی میرے بازو سے سر ٹکائے بیٹھی رہے۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے ذرا سا بھی غلط خیال نہیں آیا۔ میرے ہاتھ نرمی سے اس کے بال سہلانے لگے پھر میں نے سادگی سے اظہارِ عشق کر دیا۔

''سارہ، میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا تمہاری شادی۔'' وہ کہتے ہوئے جھجک گئی ''تمہارے ہاں تو بہت کم عمری میں شادی ہو جاتی ہے۔''

''میں نے شادی نہیں کی اور نہ ہی کسی لڑکی کے پاس گیا۔ میں تو بس تمہیں......''

اس نے شرما کر میرے بازوؤں میں منہ چھپا لیا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا پھر رات ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

''مجھے جانا ہوگا۔ پاپا پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''پھر کب آؤ گی۔'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کل اسی جگہ۔'' اس نے جواب دیا اور یوں مجھ سے جدا ہوئی جیسے شاخ سے پھول جدا ہوتا ہے۔

اگلے روز میں صبح سے اس جگہ موجود تھا۔ وہ دوپہر میں آئی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں روشنی آ گئی تھی۔ آج میں نے خود اسے بازوؤں میں لے کر گھوڑے سے اتارا اس نے شرما کر شکریہ ادا کیا۔ ''آج چلو میرے ساتھ میں تمہیں جنگل کی سیر کراتا ہوں۔'' میں نے گھوڑے کی باگ تھام لی۔

وہ ایک لمحہ ہچکچائے بغیر تیار ہو گئی۔

ہم پیدل ہی چلنے لگے۔ میں اسے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ میری زندگی کی روداد بہت مختصر اور سادہ تھی۔ اتنی سی کہ کچھ ہی دیر میں ختم ہو گئی۔ پھر وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ وہ افریقہ سے بہت دور اپنے وطن انگلینڈ میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ لارڈ تھا اور ملک میں اس کی بہت عزت تھی۔ جیسے میرا باپ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے پڑھا لکھا تھا میری سمجھ میں پڑھنا لکھنا آیا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی شے نہیں پائی جاتی تھی اس نے زمین پر لکھ کر مجھے بتایا کہ اس طرح لکھا جاتا ہے جو لکھا جاتا ہے اسے سمجھنے کو پڑھنا کہتے ہیں۔ اس نے وضاحت کر کے دکھایا۔ اس نے مجھے اپنی زبان کے کچھ الفاظ بھی سکھائے ایسے ہی کچھ الفاظ میں نے اسے اپنی زبان کے سکھائے۔ پھر میں نے اسے ایک پھل توڑ کر کھلایا۔ جس کے اندر میٹھا پانی بھرا ہوتا ہے اور اس کا گودا بہت مزے کا ہوتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس پھل کو وہ لوگ کوکونٹ کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ وقت ایسا گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ جب شام سر پر آئی تو وہ حسرت کے ساتھ مجھ سے جدا ہو گئی۔

تیسرے دن میں نے اس سے کہہ دیا کہ اب میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ میں اس سے شادی کروں گا اور وہ میرے جھونپڑے میں رہے گی۔ یہ سن کر وہ رونے لگی۔ اس کے شفاف سے رخساروں پر آنسو بہتے دیکھ کر میں بے قرار ہو گیا تھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ پہلے لڑکا لڑکی کے گھر والے راضی ہوتے ہیں پھر ان کی شادی ہوتی ہے۔''

''میں اپنے باپ کو راضی کر لوں گا۔''

''لیکن میرے پاپا راضی نہیں ہوں گے۔'' اس نے آنسو صاف کیے ''وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ ان کی بیٹی ایک سیاہ فام سے شادی کرے۔''

''کیوں؟'' میں نے غصے سے پوچھا ''میں اپنے قبیلے کا سب سے طاقت ور نوجوان ہوں۔ قبیلے کے سردار کا بیٹا ہوں۔''

اس نے سر جھکا لیا پھر اس نے مجھے بتایا کہ سفید فام اپنے آپ کو دنیا کی سب سے برتر مخلوق سمجھتے ہیں اور باقی رنگ کے لوگوں کو حقیر خیال کرتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک ان کے ملک میں سیاہ فام غلام ہوا کرتے تھے پھر غلامی ممنوع قرار

دے دی گئی لیکن اب بھی سفید فام، سیاہ فاموں کو خود سے کم تر قرار دیتے ہیں۔ ان سے رشتے داری نہیں کرتے اور کسی سفید فام لڑکی کی شادی کسی سیاہ فام سے قطعی ناممکن ہوتی ہے۔ میں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ میں بچپن سے اپنے اردگرد سیاہ فام دیکھتا آیا تھا مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ سیاہ رنگ حقیر یا بدصورت ہوسکتا ہے۔ سارہ بھی مجھے اس لیے اچھی لگی تھی کہ اس سے پہلی نظر میں محبت ہوگئی تھی۔ اس میں اس کے رنگ کا اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

''بادائی...... یہ سب بہت مشکل ہے میرا باپ کسی صورت نہیں مانے گا۔''

میں ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کہوں اگر سارہ کو حاصل کرنے کی لیے مجھے پاگل ہاتھی سے بھی لڑنا پڑتا تو میں لڑ جاتا لیکن سارہ کے باپ کی ناں کو کیسے ہاں میں بدلواتا۔ یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اسے تسلی دینے کے لیے میں نے پہلی بار اسے سینے سے لگالیا ''چپ کر جاؤ سارہ۔''

وہ چپ ہوگئی پھر اس نے کہا ''بادائی...... مجھے سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ پاپا تو کسی اعلیٰ نسب کے خاندانی شخص سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں......''

''سارہ...... تمہاری شادی صرف مجھ سے ہوگی۔'' میں نے اسے مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ سہمی چڑیا کی طرح میرے بازوؤں میں کانپتی رہی تھی۔ آنے والا وقت ہم دونوں کو سہما رہا تھا۔ میں جانتا تھا صرف سارہ کا باپ ہی نہیں میرے قبیلے والوں کو بھی پتا چلا تو ایک قیامت آجائے گی۔ میرا باپ کبھی سارہ سے میری شادی برداشت نہیں کرے گا اور پھر مجھے رچ ڈاکٹر کا خیال آیا۔ میں نے نوما کو ٹھکرا دیا تھا اس کے دل میں بھی میرے خلاف غصہ تھا وہ قبیلے کے لوگوں کو میرے خلاف ضرور بھڑکاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹوں۔ میں اور سارہ روز ملتے تھے۔ روز روتے اور روز ایک دوسرے کو تسلی دیا کرتے تھے۔ پھر ایک روز سارہ نہیں آئی۔ اس سے اگلے روز بھی نہیں آئی۔ اس سے اگلے روز بھی نہیں۔

میں جیسے پاگل ہوگیا تھا۔ سارہ نہیں میرے حواس مجھ سے چھن گئے تھے۔ وہ اپنے فارم پر ہی تھی۔ ایک روز میں اس کے فارم پر جا پہنچا۔ دو افراد نے میری راہ میں آنے کی کوشش کی میں نے انہیں دور جھٹک دیا۔ جب میں سارہ کے مکان کے سامنے پہنچا تو اس کا باپ بندوق تھامے کھڑا تھا۔ اس نے کڑک کر کہا ''واپس جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔''

میں رکے بغیر اس کی طرف بڑھتا رہا۔ اس وقت مجھے جنون سا سوار تھا۔ مجھے پروا نہیں تھی کہ ولیم مجھے گولی ماردے گا۔ مجھے پاس آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ میں نے آرام سے بندوق اس سے لے لی اور زور لگا کر اس کی نال ٹیڑھی کردی۔ پھر اسے دور پھینکتے ہوئے کہا ''یہ سب چیزیں سارہ کو مجھ سے دور نہیں رکھ سکتیں۔ وہ کہاں ہے۔''

مکان کی اوپری منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سایا سا لہرایا تھا میں نے چلا کر سارہ کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوڑتی ہوئی مکان سے نکلی اور آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے باپ کا چہرہ مارے طیش کے کسی بھیڑیے جیسا ہوگیا تھا۔ میں سارہ کو بازو میں لے کر واپس جانے لگا تو بے شمار لوگوں نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ میں نے گرج کر کہا۔

''ہٹ جاؤ میرے راستے سے...... میں بادائی ہوں...... میرا نیزہ ہمیشہ نشانے پر لگتا ہے۔''

کچھ لوگ ہٹ گئے لیکن ایک سفید فام ہاتھ میں چھوٹی سی بندوق لیے میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کے تیور سے لگ رہا تھا وہ مجھ پر حملہ ضرور کرے گا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا، ولیم ہاس نے چلا کر کچھ کہا اور اس نے میرا راستہ چھوڑ دیا۔ میں سارہ کو لیے وہاں سے چلا آیا۔ سارہ مجھ سے یوں ملی جیسے صدیوں بعد ملی ہو۔ اس کے انداز میں ایسا والہانہ پن تھا کہ مجھے لگا جیسے میں ضبط کھو دوں گا۔ میں اسے شادی سے پہلے بیوی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔

''سارہ ہوش کرو۔''

''نہیں کرنا مجھے ہوش۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے کہا ''آج مجھے اپنا بنالو۔''

''میں تمہیں ایسے نہیں اپنانا چاہتا۔ ہمارے ہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اب میں واپس نہیں جاؤں گی۔ پاپا نے میرے باہر نکلنے پر پابندی لگادی ہے۔ میں تم سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

خود میرا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ واپس جائے۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے روک لینا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں اسے اپنے پاس نہیں روک سکتا تھا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی ہم جدا ہوگئے۔ اسی رات قبیلے کا ایک فرد میرے باپ کا بلاوا لے کر آگیا۔ میں جب اپنے باپ کے پاس پہنچا تو وہ اپنے جھونپڑے میں زخمی شیر کی طرح ٹہل رہا تھا۔

''بادائی، تو کیا کررہا ہے؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی گرج کر کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"تو ایک سفید فام لڑکی سے ملتا ہے۔" اس کے تیور خراب تھے "کیوں ملتا ہے؟"

"میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی میرے باپ کے تیور اور خراب ہوگئے تھے اس نے دہاڑ کر کہا "یہ ممکن نہیں ہے۔ آج تک ہمارے قبیلے کے کسی فرد نے قبیلے سے باہر شادی نہیں کی ہے۔ تو ایک سفید فام لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

میں چپ چاپ اپنے باپ کی باتیں سنتا رہا وہ مارے طیش کے ہانپنے لگا تھا۔ "بادائی تیرا اس لڑکی سے ملنا بے حد خطرناک ہے۔ آج اس کا باپ آیا تھا اس نے دھمکی دی ہے کہ تو نے اس سے ملنا نہیں چھوڑا تو وہ تجھے جان سے مار دے گا۔"

"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" میں نے سینہ تان کر کہا "میں سارہ سے ملتا رہوں گا۔ صرف موت ہی مجھے روک سکتی ہے۔"

میرے باپ نے غصے میں اپنے بال نوچے "بادائی...... تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ اگر تو اس سے ملتا رہا تو قبیلے والے تیرے خلاف ہوجائیں گے۔ تو جانتا ہے ہم سفید فاموں سے کتنی نفرت کرتے ہیں اور تو ایک سفید فام لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسے بھول جا۔"

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اپنے نیزے سے میرے سینے سے دل نکال لو۔"

میں باپ کے پاس سے چلا آیا۔ اس نے میرے دوستوں کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے سمجھائیں لیکن یہ سمجھنے والی بات ہی نہیں تھی۔ آج تک کوئی نہیں سمجھا۔ میں کیسے سمجھتا۔ دوست ناکام واپس چلے گئے۔ میں نے اس جگہ ڈیرہ ڈال لیا جہاں سارہ مجھ سے ملنے آتی تھی۔ اس امید میں کہ وہ پھر ملنے آئے گی اور میری غیر موجودگی میں آئی تو اسے کتنی مایوسی ہوگی۔ میں دن رات اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب شدت سے بھوک لگتی تو کسی جانور کو شکار کر لیتا تھا۔ پانی کے لیے پاس ہی ایک چشمہ تھا اس سے پانی پی لیتا تھا۔ مجھے پتا تھا سارہ کے باپ نے اس پر نکلنے کی پابندی لگا رکھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔ میرا الیقین درست ثابت ہوا تھا۔

رات کی تاریکی میں، میں ایک درخت سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ میں رات کو نہیں سوتا تھا کیونکہ رات کو درندے شکار کے لیے نکلتے ہیں۔ اچانک مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر ہلکی سی آواز آئی۔ "بادائی۔"

میں نے تڑپ کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ سارہ تھی۔ اس کی جانی پہچانی مہک نے مجھے سرشار کر دیا۔ "میں تیرا انتظار کر رہا تھا۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے سرگوشی کی "میں خود بھی تڑپ رہی تھی پر موقع نہیں مل رہا تھا۔ پاپا نے گھر پر پہرا بٹھا دیا ہے میں کھڑکی سے رسّی باندھ کر اتری ہوں۔"

جھاڑیوں سے الجھتے ہوئے اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ چاند جیسے جسم پر سرخ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ میں نے چاند کی ہلکی سی روشنی میں اس کے جسم کی خراشوں کو دھویا۔ یہ رات ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گزاری کہ صبح کا پتا ہی نہیں چلا۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو وہ چونکی۔ اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا "اب تک پاپا کو پتا چل گیا ہوگا۔ وہ مجھے......"

اس کی آواز کتے کے بھونکنے کی آواز میں دب گئی۔ کتے کئی تھے اور اسی طرف آرہے تھے۔ میں اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اپنا نیزہ سنبھال لیا۔ سارہ کا چہرہ سفید ہوگیا۔ اس نے آہستہ سے کہا "یہ تھامس کے کتے ہیں۔"

"تھامس کون؟"

"میرا کزن ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا "بادائی تم بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ کتے تمہیں چیر پھاڑ دیں گے۔ بڑے خون خوار کتے ہیں۔ تھامس نے انہیں خاص طور سے شکار کے لیے سدھایا ہے۔"

"میں انہیں دیکھ لوں گا۔ تم پیچھے ہوجاؤ۔" میں نے اسے ایک درخت کے ساتھ کر دیا "یہاں سے ہلنا مت۔"

پہلا کتا جھاڑیوں سے نمودار ہوا اور اس نے براہِ راست مجھ پر چھلانگ لگائی۔ وہ سیدھا آیا تھا اس لیے مجھے اسے اپنے نیزے میں پرونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے میں نیزہ واپس کھینچتا دوسرا کتا آگیا۔ میں نے نیزہ چھوڑ کر خنجر نکال لیا۔ اس نے چھلانگ لگائی۔ اس سے بچنے کی کوشش میں، میں گر گیا تھا۔ کتے نے پلٹ کر مجھ پر سوار ہونا چاہا۔ میں اس کے دانتوں اور پنجوں سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ افریقی نسل کے یہ شکاری کتے اگر زیادہ ہوں تو ببر شیر کو بھی چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ میں نے ایک ہاتھ سے کتے کی گردن پکڑی۔ وہ اپنے پنجوں سے میرا سینہ نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا لبادہ تار تار ہو رہا تھا لیکن پھر مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کتے کا پیٹ چاک کر کے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ سارہ لپک کر میرے پاس آئی میرے سینے سے خون بہتا

دیکھ کر اس نے چیخ ماری۔ میں نے اسے تسلی دی کہ معمولی زخم ہے اور کتوں کے بھونکنے کی آواز قریب آرہی تھی اس لیے میں نے سارہ کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے بھاگا۔ کتے ہمارے تعاقب میں تھے اور اس بار ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ میرے پاس ایک خنجر تھا اور میں اتنے کتوں سے بیک وقت مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ سارہ بھاگتے ہوئے میرا ساتھ دینے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ میں نے اسے شانے پرلا دلیا۔ اب میں زیادہ تیزی سے دوڑ سکتا تھا میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ وہاں میری ایک کشتی تھی جس میں اکثر دریا کی سیر کرتا تھا۔ سارہ مجھ سے اتارنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"میں تیز چل رہا ہوں اور فکر نہ کرو۔ دریا پاس ہی ہے۔"

لیکن دریا کے کنارے پہنچتے ہی عقب سے کتے بھی نمودار ہوگئے۔ میں نے کشتی ایک درخت کے پاس رکھی تھی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کشتی لا سکتا۔ میں نے سارہ سے کہا کہ مجھے عقب سے گردن میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے جکڑے اور کسی صورت مجھے نہ چھوڑے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دریا میں چھلانگ لگادی۔ بارشوں کی وجہ سے پانی کی روانی بہت زیادہ تھی۔ میں سنبھل نہ سکا اور دھارے کے ساتھ بہتا چلا گیا۔ میں نے اس سفید فام کو کتوں کے ساتھ نمودار ہوتے دیکھا جس نے مجھ پر چھوٹی بندوق تانی تھی۔ وہ حسرت سے ہمیں پانی کے ساتھ جاتا دیکھ رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر میں نے دوسرے کنارے پر پہنچنے کی کوشش شروع کردی۔ اس سے ذرا آگے دریا آبشار کی صورت میں گرتا تھا اور اس کے نیچے چٹانیں تھیں۔ اگر ہم آبشار سے گرجاتے تو ہمارے جسموں کا بھی پتا نہ چلتا۔ یہ سوچ کر میرے بازو دیوانہ وار پانی سے لڑنے لگے۔ ایک ایک انچ آگے بڑھنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑرہی تھی۔ نہ جانے کیسے میں کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھ پر غشی طاری تھی۔ سارہ نے مجھے کھینچ کر کنارے پر ڈالا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ میرے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ میں نے بے تابی سے اسے ہلایا۔

"سارہ...... تم ٹھیک ہو؟"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرائی تو میں سب کچھ بھول گیا۔ خود سے کیا عہد بھی بھول گیا۔ میں نے سارہ کو اپنی بیوی بنالیا۔ ہم جس جگہ آئے تھے۔ یہ کسی بھی قبیلے کی حدود سے باہر تھی۔ آبشار کے اوپر دریا کی ایک چھوٹی سی شاخ کے پار بنا دریا تھا۔ میں نے اور سارہ نے اسی جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے باپ کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی اور میں اپنے قبیلے نہیں جانا چاہتا تھا۔ کچھ دن کی محنت کے بعد میں نے سارہ کے لیے اس جگہ ایک جھونپڑا بنالیا۔ کھانے کے لیے میں نیچے جھیل سے مچھلیاں لے آتا تھا یا کوئی جانور شکار کرلیا کرتا تھا۔ وہاں پر پھل دار درخت بھی تھے اور ایسے پودے بھی جنہیں ہم کھا سکتے تھے۔ سارہ نے کبھی ایسی زندگی نہیں گزاری تھی اس کے باوجود بے حد خوش تھی اس نے بارہا مجھے یقین دلایا کہ اسے زندگی کی آسائشوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسے بس میری ضرورت ہے۔ اس کے باوجود میں نے رفتہ رفتہ اس کے لیے کئی چیزیں جمع کرلیں۔ میرے پاس سنہری دھات کے کچھ ٹکڑے تھے ان کی مدد سے میں جا کر گھر کا سامان اور سارہ کے لیے لباس لے آیا۔

نوجوان دوست میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ زندگی میرے لیے کتنی اچھی تھی۔ میں دنیا کے ہر شخص سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ میرے پاس سارہ اور اس کی محبت تھی۔ میں اپنے قبیلے اور سارہ کے باپ کی طرف لاحق خطرات بھی بھول گیا تھا ایسا لگ رہا تھا۔ یہ میری زندگی ہمیشہ ایسے ہی جاری رہے گی۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔ ایک روز میں شکار سے واپس آیا سارہ کو ہرن کا گوشت اچھا لگتا تھا۔ خاصی کوشش کرکے میں اس کے لیے ہرن مار کر لایا لیکن واپسی پر میں نے اسے پریشان اور خوف زدہ پایا۔ مجھے دیکھتے ہی میری بانہوں میں چھپ گئی اور خوف زدہ لہجے میں بولی "بادائی یہاں کوئی آیا تھا کوئی مجھے دیکھ کر گیا ہے۔"

"یہاں کوئی نہیں آسکتا۔" میں نے اسے تسلی دی اور اسے جھونپڑے میں چھوڑ کر باہر نکلا۔ میں نے جزیرے پر آنے والے راستوں کا جائزہ لیا۔ پھر ایک جگہ مجھے انسانی پیروں کے نشان نظر آئے۔ یہ میرے پیروں سے چھوٹے تھے اور سارہ کے پیر سے بڑے تھے لیکن یہ کسی مرد کا پیر نہیں تھا۔ کسی بچے کا یا عورت کا پیر تھا۔ وہ جھونپڑے تک آئی تھی اور پھر واپس چلی گئی۔ مجھے سارہ کی بات کا یقین آگیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی ہمارے اس خفیہ ٹھکانے سے آگاہ ہوگیا تھا مجھے فکر ہونے لگی۔ وہ اگر مقامی شخص تھا تو یہ بات میرے باپ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اور اگر وہ سارہ کے باپ کی طرف سے آیا تھا تب بھی خطرہ تھا۔ سارہ نے کئی بار کہا تھا کہ اس کا باپ ایک ضدی شخص ہے۔ جو اپنی خاندانی انا پر اسے بھی قربان کرسکتا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ سارہ میرے ساتھ رہ رہی ہے میری بیوی بن گئی ہے تو وہ سارہ کو مار دے گا اور پھر خود کو بھی مار دے گا۔

میں واپس آیا۔ سارہ سہمی بیٹھی تھی۔ ''کیا کوئی آیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اس سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا ''لیکن ممکن ہے کوئی بھولے سے اس طرف آ نکلا ہو۔''

''وہ میرے باپ کی طرف سے آیا ہوگا؟''

''اس صورت میں اب تک اس کی طرف سے کوئی نہ کوئی آ چکا ہوتا۔ ایسا ہی میرا باپ بھی کرے گا۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ میں کہاں ہوں تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس طرف آ جائے گا۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔''

''میں بھی اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہوں۔'' سارہ افسردگی سے بولی۔

میں نے سارہ کو جنگل میں زندگی گزارنے کے طریقے سکھائے تھے۔ اسے نیزہ چلانا سکھایا درختوں پر چڑھنا اور جنگل میں سفر کرنے کے طریقے بتائے۔ جزیرے پر وہ جانوروں سے محفوظ تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے بتایا کہ کوئی جانور اس طرف آ نکلے تو اسے کسی طرح اپنا بچاؤ کرنا ہے۔ بس اسے جزیرے سے باہر لے کر نہیں جاتا تھا۔ خود بھی میں اشد ضرورت کے وقت ہی باہر جاتا تھا۔ ہمارا زیادہ تر وقت ساتھ گزرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی زبان انگریزی سکھانا شروع کردی۔ اس نے میرے لیے ایک وقت مقرر کردیا تھا جب مجھے پڑھاتی تھی اور دنیا کے بارے میں بتاتی تھی۔ اس کی زبان سے جدید دنیا کے عجائبات سن کر میں حیران رہ جاتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ مجھے اپنی زبان سکھادی۔ پھر اسے بولنے کی مشق کرانے لگی حتیٰ کہ میں اس کی طرح بولنے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں اس جزیرے میں کتنے دن گزر گئے لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ سے اس کے ساتھ ہی رہتا آرہا تھا۔ اتنے عرصے بعد یہ پہلی پریشان کرنے والی خبر ملی تھی۔

کئی دن ہم نے ڈرتے ہوئے گزارے تھے پھر رفتہ رفتہ ہم بے فکر ہونے لگے۔ بعض اوقات مجھے ایسا لگتا تھا کہ کوئی ہمیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ خاص طور سے جب میں اور سارہ ساتھ ہوتے تھے لیکن جزیرے پر اس کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ کاش کہ میں اسے درست سمجھتا اور سارہ کو لے کر یہاں سے چلا جاتا۔ میں آج تک اس پر پچھتا رہا ہوں ایک روز میں اور سارہ پانی کے ساتھ اگی نرم گھاس پر لیٹے پیار و محبت کی باتیں کررہے تھے۔ سارہ کا سر میرے شانے پر تھا۔ اچانک وہ باتیں کرتے کرتے ساکت ہوگئی۔ میں نے اسے ہلایا تو وہ نیچے گرگئی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ سانس بھی لے رہی تھی لیکن بالکل ساکت تھی۔ میں نے اسے ہلایا۔ جھنجوڑا لیکن وہ بے حس رہی۔ پھر میرے ہاتھ پر کوئی چیز چبھی۔ یہ ایک ننھا سا تیر تھا جو اس کی پشت کی طرف پیوست تھا۔ اس تیر کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا۔ یہ تیر ایک ایسے زہر میں بجھا کر اپنے کسی دشمن کو مارا جاتا ہے جو انسان کو لگتے ہی اسے بے حس کردیتا ہے۔ اس کا توڑ کوئی نہیں جانتا۔ سوائے میرے قبیلے کے رچ ڈاکٹر کے۔ وہی سارہ کی جان بچا سکتا تھا۔

میں نے سارہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور بنا رکے چلتا ہوا اپنے قبیلے تک آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے یہ فاصلہ کیسے طے کیا۔ بس میں کسی طرح قبیلے تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ میرے بازوؤں میں بے جان لٹکی سارہ کو دیکھ کر سب میرے گرد جمع ہوگئے تھے۔ میں بنا رکے چلتا رچ ڈاکٹر کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے چلا کر اسے آواز دی۔ رچ ڈاکٹر باہر آیا۔ میں نے سارہ کو اس کے سامنے ڈال دیا۔ ''اسے زہریلا تیر لگا ہے۔ اسے تم ہی ٹھیک کرسکتے ہو عظیم پجاری۔'' میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''میں اس کا علاج نہیں کرسکتا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''میں کسی سفید فام کا علاج نہیں کروں گا۔''

''یہ انسان ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

لیکن رچ ڈاکٹر نے صاف انکار کردیا۔ وہ واپس اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔ میں بے بس تھا اسے زبردستی علاج پر مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ پھر میں نے نوما کو دیکھا۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ مجھے اس کی بات کا جواب مل گیا کہ سارہ پر تیر کس نے چلایا ہے۔ میں نے اگر کسی عورت پر ہاتھ اٹھانے کی قسم نہ کھا رکھی ہوتی تو اس وقت میرا نیزہ ضرور اس کے آر پار ہوجاتا۔ پھر میں مرتی سارہ کو اٹھا کر یہاں لے آیا۔ میں نے اس کی زندگی میں اس کی قبر کھودی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ہاں مردے دفن کیے جاتے ہیں۔ قبر تیار کرکے میں اسے اپنے بازوؤں میں لے کر بیٹھ گیا۔ حتیٰ کہ وہ مرگئی۔ پھر میں نے اسے اس قبر میں دفن کردیا۔ اس پر اسی طرح سے لکڑی لگائی۔ اس بات کو آج تک ہزاروں دن گزر گئے ہیں۔ میں تب سے اس قبر کے ساتھ ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ کبھی اپنے قبیلے کی حدود میں نہیں جاؤں گا۔ اپنی سارہ کے پاس رہوں گا۔''

میں سوچ رہا تھا کہ محبت کا اپنا ہی ایک رنگ ہوتا ہے۔ اسے انسان کے رنگ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

سمندر میں

کاشف زبیر

کہتے ہیں، مزاجِ یار اور موسم کا کوئی بھروسا نہیں۔ خلیج گونزاگا پر پکنک منانے والے اُس ادھیڑ عمر جوڑے کو اس کہاوت کا علم نہ تھا۔ وہ بیچ سمندر میں تھے کہ موسم کی ستم ظریفی کا شکار ہو گئے۔ اُن کی کشتی اُلٹ گئی اور خاتون شدید زخمی ہو گئی۔ ساحل بہت دُور تھا اور موت بے حد قریب۔ اُس کا ساتھی باقی زندگی اُس کے بِنا گزارنے کے خیال سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

دوست کی زندگی بچانے کے لیے موت سے مقابلہ کرنے والے مہم جُو کے کڑے سفر کی داستان

میکسیکو میں واقع خلیج گونزاگا ایک دل فریب اور قدرتی مناظر سے بھرپور تفریح گاہ ہے۔ یہ میکسیکو کے شہر سان ڈیاگو سے تقریباً سات گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ ہوٹل اور موٹل کی سہولت بہت کم ہے اس لیے زیادہ تر افراد ذاتی یا کرائے کے ٹریلر میں آتے ہیں۔ یہ ایک طرح کے چلتے پھرتے گھر ہیں جن میں تمام سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ خلیج حسین ساحلوں اور شفاف پانیوں سے مزیّن تھی۔ اس میں جا بجا مونگے کی چٹانوں سے بنے ہوئے جزائر تھے۔ جو تفریح کے شائق تنہائی پسند افراد کے لیے کسی جنت سے کم نہیں۔

موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا اور لوگوں کی بڑی تعداد یہاں آچکی تھی۔ جا بجا رنگ برنگے ٹریلر اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان ہی میں ایک جوڑا رون فینوچی اور می جی وارڈ رئیل کا تھا۔ رون ایک دریائی اسٹیمر میں بطورِ گائیڈ کام کرتا تھا۔ گرانٹس پاس کے قریب دریائے روگی میں یہ اسٹیمر سیاحوں کی تفریح کا ذریعہ تھا۔ وہیں می جی

ایک اسپیشل ایجوکیشن اسکول میں ٹیچر تھی۔ وہ دونوں پرانے دوست تھے مگر ان کی ملاقات تقریباً پانچ سال کے بعد ہوئی تھی۔

یہ جون کی ستائیس تاریخ تھی۔ دونوں پرانی یادوں میں کھو گئے۔ جب انہوں نے ۱۹۸۹ء کا رافٹنگ سیزن اکٹھے گزارا تھا۔ رون ان دنوں چھٹیاں منا رہا تھا اور اس کی کچھ چھٹیاں باقی تھیں۔ اس نے می جی کو خلیج کونزاگا چلنے کی دعوت دی۔

"ہم تمہاری چالیسویں سالگرہ وہیں منائیں گے۔" رون نے تجویز پیش کی اور می جی مسکرا دی۔

خوب صورت خلیج میں ان کا وقت توقع سے کہیں زیادہ پُرلطف گزرا۔ انہوں نے دل بھر کر انجوائے کیا۔ خوب تیراکی کی، مچھلیاں پکڑیں، جزیروں پر گئے اور نت نئے ڈیزائن کی سیپیاں چُنیں۔ ان کے جانے کا وقت قریب آرہا تھا۔ چناں چہ انہوں نے ایک بار پھر جزیروں کے سفر کا پلان بنایا۔

صبح سویرے سے، جب خواب ناک دُھندلکا طاری تھا، ساحل کی ریتیلی ائر اسٹرپ سے کچھ ہی دور چند ٹریلر کھڑے تھے۔ بے حد خاموشی تھی جسے رون کے ریڈیو نے توڑ دیا۔ وہ موسمی رپورٹ سن رہا تھا جس کے مطابق آج دن بھر آسمان بالکل صاف رہے گا اور دھوپ خوب کھُل کر برسے گی۔

می جی اسنیکس سے بھرا تھیلا ربر کی بنی ہوئی ہوا بھری کشتی میں رکھتے ہوئے بولی "رون تیار ہو جاؤ۔" وہ انجن پر جھکا ہوا تھا۔

"ہم پھر اس جزیرے پر جائیں گے جہاں سے ہم نے شیل اکٹھے کیے تھے۔" وہ انجن اسٹارٹ کرکے بولا۔

انجن غرایا اور کشتی حرکت میں آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ جیٹی سے نکل کر نیلے پانیوں میں سفر کررہے تھے۔ سمندر شیشے کی طرح ہموار تھا۔ دور اُفق پر مچھلیاں پکڑتے ٹرالر ننھی مُنّی کشتیاں لگ رہے تھے۔ اچانک کچھ دور ایک وھیل نے سر نکالا اور فضا میں ایک فوارہ سا اُچھال دیا۔ ایک قوسِ قزح سی بکھر گئی۔ ابھرتے سورج کی روشنی میں یہ منظر ناقابلِ یقین حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ رون اور می جی مسحور نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

بوٹ نے پانی پر پھسلتے ہوئے چار میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ ایک گھنٹے بعد رون کشتی کو جزیرے کے ہاربر پر لگا رہا تھا۔ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر ہرے بھرے جنگلات اور ریتیلے ساحلوں سے پُر تھا۔ اس میں نمکین پانی کی ایک شفاف ترین جھیل بھی تھی۔ ان دونوں نے جھیل میں تیراکی کی، ایک دوسرے پر پانی اُچھالا اور مچھلیاں پکڑیں۔ یہاں پائی جانے والی ٹرائیگر فش نہایت لذیذ ہوتی تھی۔

"کل ہم ٹرائیگر کا شکار کریں گے۔" رون نے کہا۔ می جی بھی تیار ہوگئی۔ ویسے بھی خلیج کونزاگا کا سب سے بڑا تفریحی پہلو یہی مچھلی کا شکار تھا۔ تیراکی کے بعد انہوں نے لنچ کیا اور پھر ساحلوں پر گھومنے لگے۔ وہاں انہوں نے سیپیوں کے خول جمع کیے۔ وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ جلد ہی ساحل پر ڈوبتے سورج نے ایک بڑی آتشیں گیند کی شکل اختیار کرلی۔

جب رون نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا تو تاریکی چھانے لگی تھی۔ اس نے کشتی کا رخ اپنے کیمپ کے ساحل کی طرف کردیا جو صرف چار میل دور تھا۔ دور دکھائی دینے والی پہاڑیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے سیاہ پانی میں ڈوب رہی ہوں۔ ساحل پر ایک روشنی نظر آرہی تھی۔

"ہمیں جلدی چلنا چاہیے تھا۔" می جی نے انجن کے شور کے باعث چیخ کر کہا "کیوں نہ ہم واپس چلیں اور رات جزیرے پر گزار لیں۔"

"فکر مت کرو۔" رون نے اسے تسلی دی "ہم صرف ایک گھنٹے میں ساحل پر ہوں گے۔"

مگر عین اسی لمحے اس نے لہروں اور ہواؤں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو محسوس کرلیا۔ پُرسکون خلیج جھاگ اڑاتے سمندر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہوائیں جیسے خطرے کی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ کشتی کی رفتار بہت سُست ہوگئی تھی۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے خاص جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی "یہ لہریں کہاں سے آرہی ہیں؟" می جی نے فکر مند ہو کر پوچھا۔ جب کہ موسم کسی طوفان کی نشان دہی بھی نہیں کر رہا تھا۔

"می جی فکر مت کرو۔" اس نے کہا۔ می جی مضبوطی سے اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ رون نے اسے تو تسلی دے دی تھی مگر خود اسے آثار اچھے نہیں نظر آرہے تھے۔ لہریں بڑھ رہی تھیں اور پہلے سے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ ہوا کا دباؤ بھی پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا۔ اس کا مقابلہ ان کی چھوٹی اور ہلکی پھلکی کشتی کرنے سے قاصر تھی۔ رون کو سمت درست رکھنے کے لیے خاصی سخت جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ لہریں کشتی کو اُچھال رہی تھیں۔ اس کے انجن کے پروپلر بار بار پانی سے باہر نکل آتے تھے۔ شام کے جھٹپٹے میں اس کے اسٹیل کے بلیڈ چمک اٹھتے تھے۔

لہریں مسلسل کشتی کے سامنے والے حصے پر آکر بکھر رہی تھیں۔ ان کے دباؤ کے باعث کشتی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ رون انجن کے ہینڈل کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو جھٹکوں کے باعث اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ کشتی میں خاصا پانی بھر گیا تھا۔ می جی بھی بار بار اپنی گیلی سیٹ سے پھسل جاتی تھی۔

"خود کو سنبھالو۔" رون نے چلّا کر کہا۔ اسے صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" می جی نے جواب دیا اور مضبوطی سے کشتی میں نصب ہینڈل کو پکڑ لیا۔ وہ گیلا ہو چکا تھا۔ می جی کو اپنی گرفت برقرار رکھنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی۔

رون نے تشویش سے کشتی میں بھرتے پانی کو دیکھا "اس پانی کو باہر نکالنا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ عین اسی لمحے ایک چڑھتی ہوئی لہر آئی اور کشتی دائیں طرف جھکنے لگی۔ می جی اس طرف ہی بیٹھی

تھی۔ رون نے دیکھا کہ می جی ہینڈل پر اپنی گرفت کھو چکی تھی اور جھکی ہوئی سائیڈ کی طرف پھسل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ دیوانہ وار کسی سہارے کو تلاش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ رون اس کی مدد کے لیے کچھ کرتا' وہ سمندر میں گری اور غائب ہوگئی۔ ایک ساکن اور خاموش لمحے کے بعد رون نے کشتی کے پروپلر کی طرف سے "کٹ" کی آواز سنی جیسے کوئی چیز اس کے بلیڈ کی زد میں آگئی ہو۔ رون کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ احساس بہت خوف ناک تھا کہ می جی پروپلر کی زد میں آگئی ہے۔

اس نے تیزی سے انجن بند کردیا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی اور چیخا "می جی تم کہاں ہو؟" لیکن وہاں اس کا کوئی نشان نہیں تھا۔ رون نے مضطرب ہو کر دوبارہ اسے پکارا "می جی!" مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ اگلے لمحے رون بھی پانی میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا "اوہ میرے خدا' می جی کہاں گئی!" اس نے سوچا۔ وہاں چاروں طرف اونچی نیچی لہریں تھیں اور پرشور ہوائیں تھیں۔ ایک سرد دہشت نے اس کے جسم کو مفلوج کردیا مگر می جی کا خیال اسے تیرتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" اس نے خود سے کہا "اوہ خدا! مجھے ہر صورت اسے تلاش کرنا ہوگا چاہے اس کوشش میں میں خود کیوں نہ ڈوب جاؤں۔" اس کے چاروں طرف پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

○☆○

می جی جیسے ہی پانی میں گری' کوئی چیز اس کے چہرے سے ٹکرائی اور اس کے حواس گم ہوگئے۔ جلد ہی دم گھٹنے کا احساس اسے ہوش میں لے آیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا دایاں ہاتھ کام نہیں کر رہا۔ اس کا سر بھی زخمی تھا۔ وہ بہ مشکل ابھر کر سطح پر آئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"میرے سر اور بازو کے ساتھ کیا ہوا ہے؟" می جی نے بے بسی سے سوچا۔ وہ زیادہ تیزی سے حرکت نہیں کر پا رہی تھی "میں ڈوبنے والی ہوں۔" اسے خیال آیا۔ اس نے خود کو سطح پر رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔

اچانک اسے روشنی سی دکھائی دی "یہ روشنی کیسی ہوسکتی ہے؟" اس نے خود سے کہا "ممکن ہے کہ یہ چاند کا عکس ہو۔" وہ آہستگی سے گہرے تاریک سمندر میں اس سمت تیرنے لگی مگر وہ روشنی چاند کی نہیں تھی اور نہ ہی کسی کشتی کی تھی۔ ذرا سی دیر تیرنے سے اس کا جسم شل ہوگیا تھا اور طاقت جواب دینے لگی تھی۔ اچانک وہ غوطہ کھا گئی اور سمندر کا پانی اس کے منہ میں چلا گیا۔ اس وقت پانچ بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔

○☆○

رون کی بے قرار نگاہیں می جی کی تلاش میں تھیں۔ اچانک اس نے اپنے عقب میں کچھ آوازیں سنیں جیسے کوئی کھانسا ہو۔ وہ پلٹا اور تیزی سے اس سمت میں تیرنے لگا۔ ایک لہر نے اسے اٹھا کر پٹخا تو وہ می جی سے چند فٹ ہی دور تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کھانس رہی تھی۔ شاید سمندری پانی اس کے منہ میں چلا گیا تھا۔ وہ ڈوبنے کے قریب تھی۔ رون نے تیزی سے اسے پکڑ لیا "اوہ می جی"... وہ کراہا۔

"فینو جی!" اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں کہا۔ رون نے اس کے جسم کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اسے پکڑ لیا۔ می جی نے اپنے زخمی بازو کو ساکت کرلیا اور اپنا بوجھ رون پر ڈال دیا۔

وہ اس سے پوچھ رہا تھا "می جی تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟" مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ طوفان پہلے ہی اسے دہلا رہا تھا۔ می جی کی خاموشی نے اسے بدحواس کردیا۔ اس نے می جی کو جھنجھوڑا "یہ کیوں بے جان ہو رہی ہے۔" اس نے سوچا "اٹھو می جی' جاگو۔" می جی بڑبڑائی اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

اس کے چاروں طرف بپھری ہوئی لہریں تھیں اور اس پر ایک بے ہوش وجود کا بوجھ تھا۔ یک دم اسے شدید اور خوف ناک تنہائی کا احساس ہوا۔ جیسے ساری دنیا میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ کئی کئی فٹ بلند لہروں کی وجہ سے وہ بہ مشکل دو' تین میٹر تک دیکھ پا رہا تھا۔ اب اسے اپنی کشتی کی تلاش تھی "کشتی کہاں ہے؟" اس نے سوچا۔ اسے تیرتے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے مگر کشتی غائب ہوگئی تھی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کشتی کہاں ہوسکتی ہے۔

"ہراساں مت ہو۔" اس نے خود سے کہا "کشتی کی تلاش بے سود ہے۔ مجھے اپنے اردگرد موجود ماہی گیروں کی کشتیوں کو ڈھونڈنا چاہیے۔" مگر سمندر اس وقت دغا پر آمادہ تھا۔ لہریں امنڈ امنڈ کر انہیں غرق کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ می جی زخمی تھی اور تیر نہیں سکتی تھی۔

"مجھے می جی کو ہر صورت سطح پر رکھنا ہوگا۔" مگر کیسے؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آخرِ کار آسان طریقہ سمجھ میں آگیا۔ یہ لائف گارڈز کا انداز تھا۔ اس نے بے ہوش می جی کو پیچھے سے کمر کے گرد ہاتھ لپیٹ کر پکڑلیا اور دوسرے ہاتھ سے پیچھے کی سمت تیرنے لگا۔ یہ طریقہ اسے آسان لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رک کر اپنی گرفت درست کرتا اور اسے بھی جھنجھوڑتا "جاگتی رہو۔ می جی! جاگتی رہو۔" وہ ہر دفعہ اسے آنکھیں کھول کر دیکھتی تھی اور پھر موند لیتی تھی۔

رون سوچ رہا تھا "مجھے اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھنی ہوگی۔ اگر یہ میرے ہاتھ سے نکل گئی تو اسے اس تاریکی میں دوبارہ تلاش کرنا ممکن نہیں ہوگا۔" اب اسے پچھتاوا ہونے لگا "مجھے انجن بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مگر یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ می جی کو سنبھالے آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کی سوچ می جی کی دونوں بیٹیوں کی طرف مڑگئی۔

انیس سالہ اسٹیفنی اور تیرہ سالہ ایلی ماں کے ساتھ سان ڈیاگو کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھیں۔ لڑکیاں ابھی کم عمر تھیں اور اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ می جی کی بیٹیوں کا خیال آتے ہی رون کے جسم میں حوصلے کی لہر دوڑ گئی "لڑکیوں کو ان کی ماں کی ضرورت ہے اور میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔" اس نے پُرعزم انداز میں سوچا۔

انہیں تیرتے ہوئے شاید دو گھنٹے گزر چکے تھے مگر رون کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ طویل مدت سے یوں ہی تیر رہا ہے "میں کتنی دیر تک مزید تیر سکتا ہوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ جواب مایوس کن تھا۔ سمندر بپھرا ہوا تھا۔ لہریں ان دونوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔ ان کے دباؤ کا مقابلہ کرتے کرتے رون کے بازو اور پیر تھکن سے شل ہوگئے تھے اور ہر گزرتی لہر، ہر گزرتا لمحہ اس تھکن میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے می جی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ لہروں کے سخت دباؤ کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے اس کے پٹھے جواب دینے لگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب ساحل بہ مشکل ایک ڈیڑھ میل دور تھا مگر اس کی ہمت تیزی سے جواب دے رہی تھی۔ اسے لگا کہ اگر وہ چند منٹ اور یوں ہی تیرتا رہا تو ڈوب جائے گا۔ اس نے اندھیرے میں بغور دیکھا مگر ساحل کا کوئی نام و نشان نہیں تھا "یہ بہت دور ہے۔" اس نے مایوسی سے سوچا "اب ہم دونوں ساتھ ہی ڈوبیں گے۔"

رون، می جی کو لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ اس کی رفتار بہت سست تھی مگر وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کے پیر سے کوئی چیز ٹکرائی، کوئی زندہ چیز۔ اسے واضح طور پر زندہ جسم کا احساس ہوا "کوئی ڈولفن؟" اس نے سوچا۔ اسے وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں ڈولفن نے مصیبت میں گھرے تیراکوں کی مدد کی تھی۔ پھر ایک دہشت ناک خیال اس کے ذہن میں گونجا "ممکن ہے کہ یہ ایک شارک ہو۔" خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ جانتا تھا کہ شارک بہت فاصلے سے بھی خون کی بُو محسوس کرلیتی تھی اور می جی زخمی تھی۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے کسی شارک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہو۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شارک گھپ اندھیرے میں بھی اپنے شکار کے جسم کی حرکت سے اس تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ منتظر تھا مگر کسی شارک کے نوکیلے دانتوں نے اس کے پیروں کو نہیں چھوا۔ مجبوراً اس نے پھر تیرنا شروع کردیا۔ وہ زیادہ دیر ساکت نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ اس پر ایک بوجھ تھا۔ اس نے می جی کو دوسرے بازو میں منتقل کیا تو اس کے پاؤں رون کے پیر سے ٹکرائے۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ایک فریب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ یہ کوئی شارک نہیں بلکہ می جی کے پیر تھے جو اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ بالکل بے جان انداز میں اس کے بازو میں جھول رہی تھی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا وزن جیسے بڑھتا جا رہا تھا۔

بے ہوش می جی اچانک ہوش میں آگئی۔ وہ ایک ڈوبتے شخص کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی "مجھے جانے دو۔" وہ چیخی اور رون کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ رون نے بہ مشکل اسے سنبھالا مگر ہر لمحے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ اس جدوجہد میں وہ اپنا توازن کھونے لگا۔

"میں اسے اوپر نہیں رکھ سکتا۔" اس نے مایوسی سے سوچا "اے خدا مجھے طاقت دے۔" وہ گڑگڑایا۔ لہریں انہیں ہڑپ کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر می جی نے جدوجہد خود شروع نہ کی تو سمندر کی تہ ان دونوں کا مقدّر بن جائے گی۔

"می جی!" وہ چلّایا "میری مدد کرو۔ اب میں اکیلا نہیں تیر سکتا۔" لیکن می جی کا جسم بدستور بے حرکت تھا۔ اب رون نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

"می جی پیر چلاؤ۔ ایلی اور اسٹیفنی کے بارے میں سوچو! وہ تمہاری منتظر ہیں۔ وہ تمہیں بلا رہی ہیں۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔" اس کی ترکیب کامیاب رہی۔ می جی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آہستگی سے پاؤں چلانے لگی۔ رون پُرجوش انداز میں بولا۔

"تم تیر سکتی ہو می جی! پاؤں چلاؤ می جی، پاؤں چلاؤ۔"

اس کے پیروں کی حرکت میں تھوڑی تیزی آگئی۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی۔ اب رون کے لیے تیرنا خاصا آسان ہوگیا تھا۔ چناں چہ اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔ وہ جلد از جلد ساحل تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ حادثے کو تین گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ ایک ناقابلِ یقین جدوجہد کے بعد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ساحل سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

آخرِ کار رون نے ساحل پہ لہروں کا شور سن لیا "می جی!" اس

نے کہا "ہم ساحل پر پہنچ گئے ہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت کرو۔"
اسی لمحے اس کے پیر مٹی سے ٹکرائے۔ اس نے پاؤں جما کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ساحل سے واپس آتی لہریں بار بار انہیں پیچھے دھکیل رہی تھیں۔ شدید محنت کے بعد آخر کار وہ ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
"تھینکس گاڈ!" می جی کو ساحلی ریت پر لٹاتے ہوئے رون نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ ساحل ویران تھا۔ اس جگہ سے بہت دور جہاں انہوں نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ آسمان پر چاند ہر سو اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ رون نے می جی کا معائنہ کیا اور اس کا زخم دیکھ کر اسے شدید دھچکا لگا۔ اس کی ٹھوڑی سے لے کر گردن پر سے ہوتے ہوئے دائیں شانے تک ایک کم از کم پندرہ انچ لمبا زخم تھا۔ اس سے خون مسلسل بہے جا رہا تھا۔ سمندر میں تیرتے ہوئے رون اسے محسوس نہیں کر سکا تھا۔ ایک سیاہ اور بد صورت سوراخ سے خون بہہ کر ایک دھار کی شکل میں می جی کی گردن تک آ رہا تھا۔ کٹی ہوئی کھال کا ایک بڑا ٹکڑا زخم کے مقام سے الگ ہو چکا تھا۔ انجن کے پروپلر کے بلیڈ نے اس کو شدید زخمی کر دیا تھا اور وہ مسلسل خون بہنے سے موت کے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔
"گڈ بائی رون!" اس نے رون کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔
"نہیں۔" رون چیخا۔ اسی لمحے اسے بہت دور کسی ٹریلر کی روشنی دکھائی دی۔

○☆○

لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک جگہ جمع کیمپ کے لوگوں نے تاریکی میں سے نکل کر آنے والے خستہ حال شخص کو دیکھا جو اپنے شانے پر ایک بے حس و حرکت عورت کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے عورت کو نیچے لٹا دیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بے ربط انداز میں بولا۔
"یہ کشتی سے گر گئی تھی۔ پروپلر نے اسے..... کاٹ دیا۔"
وہاں موجود افراد نے دیکھا کہ عورت کے چہرے کے قریب گردن پر ایک خوف ناک اور بد صورت زخم تھا۔ جس سے خون بہہ رہا تھا۔
ان میں سے ایک اٹھ کر ایک قریبی ٹریلر کی طرف دوڑا جہاں اے کوستا موجود تھا۔ وہ فائر فائٹر تھا اور لانگ بیچ، کیلی فورنیا سے آیا تھا۔ اس شخص کی بات سن کر اس نے پھرتی سے اپنا میڈیکل باکس اٹھایا۔ جب وہ می جی کے پاس پہنچا تو وہ ہوش میں آ چکی تھی مگر ایک شاک کی سی کیفیت میں تھی۔ اے کوستا نے صاف پانی سے اس کا زخم دھویا۔ اس کی نوعیت دیکھ کر وہ لرز اٹھا۔ گہرے گھاؤ سے کٹا ہوا گوشت، چربی اور نسیں جھانک رہی تھیں۔ جن سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔
"کتنا خطرناک زخم ہے۔" اے کوستا نے سوچا "یہ عورت مرنے والی ہے۔"
اس نے ایک صاف پٹی احتیاط سے زخم پر لپیٹ دی اور رون کی طرف مڑا "میں نے اپنی سی کوشش کر لی ہے مگر اسے ہاسپٹل لے جانا ضروری ہے۔"
"مگر کیسے۔ ہم قریب ترین شہر سے بھی سیکڑوں میل دور ہیں۔" رون نے مایوسی سے کہا "اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ان ناہموار سڑکوں پر سفر کر سکے۔ صرف ٹی جونا تک جانے میں سات گھنٹے لگتے ہیں اور اس کا پہلے ہی بہت خون ضائع ہو چکا ہے۔"
"کیا کوئی اور راستہ ممکن ہے؟" اے کوستا نے خود سے کہا اور اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

○☆○

ڈون ریم بائی سان ڈیاگو میں جائیدادوں میں سرمایہ کاری کرتا تھا۔ وہ سہ پہر کو اپنے فور سیٹر سیسنا میں گونزاگا پہنچا تھا۔ اس رات اس نے ایک ڈنر کا اہتمام کیا تھا جس میں اس کی بیوی اور دوست شریک تھے۔ ابھی ڈنر ختم ہی ہوا تھا کہ اے کوستا حادثے کی خبر لے کر آ گیا۔ خبر سنا کر اس نے ریم بائی سے پوچھا "کیا تم سان ڈیاگو تک اسے لے جاؤ گے۔ اس کی جان بچانے کا یہ آخری موقع ہے۔"
ریم بائی فوراً تیار ہو گیا "مگر ہم رات کو پرواز نہیں کر سکیں گے۔ ہم صبح جا سکیں گے۔"
دراصل میکسیکن قوانین اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کوئی طیارہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے بغیر رات کو پرواز کرے۔
یہ ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ اے کوستا یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ زخمی عورت صبح تک زندہ بھی رہ سکے گی یا نہیں۔ اس کا خون بہت بہہ چکا تھا۔ بہرحال اے کوستا نے وعدہ کیا کہ ہم صبح اسے تیار رکھیں گے۔
"کیا تمہیں اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہے؟" جین بری فیننگھم بولی۔ وہ ڈنر کے مہمانوں میں سے ایک تھی۔
"ممکن ہے تم اسے سونے میں مدد دے سکو۔" اے کوستا نے جواب دیا "وہ سخت تکلیف میں ہے۔"
اے کوستا نے واپس آ کر رون کو صورتِ حال بتائی۔ پھر اس نے اور رون نے مل کر احتیاط سے می جی کو جین کے ٹریلر میں منتقل کر دیا۔ رون یہ سن کر پریشان ہو گیا تھا کہ می جی کو صبح سے پہلے لے جانا ممکن نہیں۔ اسے پہلے ہی اپنی ساتھی کی حالت اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن یہ اچھی علامت تھی کہ وہ تکلیف محسوس کر رہی تھی یعنی اس کے کومے میں جانے کا امکان نہیں تھا۔
انہوں نے می جی کو ایک صاف اور نرم بستر پر لٹا دیا۔ جین نے گیلے کپڑے کی مدد سے اس کے جسم پر لگی ریت صاف کی اور اس کا چہرہ صاف کیا جہاں خون کے دھبّے لگے ہوئے تھے۔ می جی اب پوری

طرح ہوش میں تھی اور سخت تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار بستر پر کروٹ بدل رہی تھی۔ درد مسلسل بڑھتا جا رہا تھا اور زخم سے رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی تھیں۔

جین اس کے سرہانے بیٹھ گئی "فکر مت کرو۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے می جی کو تسلی دی مگر اس کے زخم کی گہرائی دیکھ کر جین کو جھرجھری آ گئی۔ اس نے اس سے پہلے اتنا خوف ناک زخم نہیں دیکھا تھا۔ وہ می جی کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○☆○

ڈون ریم بائی سیسنا کو اُڑانے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عورت کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے اس لیے اس نے پہنچتے ہی روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ساتھ اس کا کو پائلٹ اور رون بھی موجود تھے۔ انہوں نے جہاز کو اس قابل بنا لیا تھا کہ می جی اس میں با آسانی سفر کر سکے۔ ریم بائی نے تکیوں اور کمبلوں کی مدد سے ایک آرام دہ بستر تیار کر لیا تھا۔

صبح کا اُجالا پھیلتے ہی انہوں نے می جی کو طیارے میں منتقل کر دیا۔ وہ جاگ گئی تھی۔ آخر کار ڈون ریم بائی نے جہاز کا انجن اسٹارٹ کیا۔ اس نے رون سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے رون! تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکو گے۔ طیارے میں گنجائش نہیں ہے۔"

رون تھکے ہوئے انداز میں مسکرایا "میں تم سب کا بے حد شکر گزار ہوں۔" وہ بولا "مجھے خوشی تب ہوگی، جب میں می جی کو دوبارہ زندہ سلامت دیکھ سکوں گا۔"

می جی کو الوداعی پیار کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے "میں ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا جلد ہی آ جاؤں گا۔ تم بالکل فکر مت کرنا۔ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اس نے می جی کو تسلی دی۔

ریم بائی نے الوداعی انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا اور طیارہ آگے بڑھا دیا۔ سیسنا ائراسٹرپ پر دوڑا۔ وہ تھوڑا تھوڑا سا لرزا اور پھر ٹیک آف کر گیا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ مشرق سے سورج ابھر رہا تھا۔ دوران پرواز میں ریم بائی نے ایک ریڈیو پیغام کی مدد سے ائرپورٹ کے عملے کو اس حادثے کے بارے میں بتا دیا۔

جب وہ سان ڈیاگو کے مونٹیگو ائرپورٹ پر اتر رہا تھا تو وہاں میری ہاسپٹل اینڈ میڈیکل سینٹر کی ایمبولینس می جی کو ہاسپٹل لے جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔ طیارے کے رُکتے ہی ایمبولینس اس کے پاس پہنچ گئی۔ میڈیکل اسٹاف نے پھرتی مگر احتیاط سے می جی کو ایمبولینس میں منتقل کیا۔ دوران سفر میں جھٹکوں سے اس کے زخم سے خون پھر بہنے لگا تھا۔ ایمبولینس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے بڑی تشویش سے می جی کے زخم کا معائنہ کیا اور ڈرائیور کو جلد از جلد ہاسپٹل پہنچنے کی ہدایت کی۔ اس وقت سات بج کر پینتالیس منٹ ہو رہے تھے۔ حادثے کو چودہ گھنٹے گزر چکے تھے۔

آپریشن روم میں سرجنوں نے ایک طویل آپریشن کے بعد می جی کے زخم کو سی دیا۔

"تم بہت خوش قسمت ہو۔" سرجن نے بعد میں می جی سے کہا "صرف دو انچ ادھر بلیڈ لگتا تو تمہاری شہ رگ کٹ جاتی۔ اس کے باوجود بھی تم خطرناک حد تک خون ضائع کر چکی تھیں۔ یہ کوئی جذبہ تھا جس نے تمہیں زندہ رکھا۔"

می جی کا زخم آہستہ آہستہ بھرنے لگا۔ رون اس کو باقاعدگی سے ملنے آتا تھا۔ آخر ایک مہینے کے بعد اس کا زخم بھر چکا تھا مگر اپنا نشان ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

"اب میں زندگی کو ایک نئے انداز سے دیکھ رہی ہوں۔" می جی نے ٹھیک ہونے کے بعد کہا "میں اپنی نئی زندگی کے ہر دن کو انجوائے کر رہی ہوں۔ یہ زندگی مجھے رون نے بخشی ہے۔ وہ ایک ہیرو ہے۔"

"مجھے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگا۔" رون نے ایک بار بتایا "می جی کا زخمی ہونا، پھر ساحل پر پہنچنے کی ناقابلِ فراموش جدوجہد اور پھر ان لوگوں کی شان دار کوشش جو می جی کو بچانے کے لیے کی گئی۔ یہ ایک حقیقی معجزہ ہے اور یہ می جی کی ہمت تھی کہ اتنے خوف ناک حادثے کے باوجود اس نے بہادری سے موت کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دی۔"

ایک مہینے کے بعد جب می جی ہاسپٹل سے رخصت ہوئی تو رون اس کے ہمراہ تھا۔ می جی کی نئی زندگی اسی کی عنایت تھی اور می جی نے اسے رون کے نام ہی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

دنیا کا پہلا کالم نگار، ڈاکٹر جان ہل

ڈاکٹر جان ہل کو دنیا کے پہلے کالم نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۱ مارچ ۱۷۵۱ء کو ڈاکٹر جان ہل کا پہلا کالم "لندن ایڈورٹائزر اینڈ لٹریری گزٹ" نامی اخبار میں شائع ہوا۔

مرسلہ۔ واجد رضا اصفہانی

وحشی ہاتھی

کاشف زبیر

جانور خواہ کوئی بھی ہو اگر غصہ میں آجائے یا اس پر وحشت سوار ہوجائے تو اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا اور پھر اگر وہ ایک عظیم الجثہ، بڑے بڑے دانتوں والا ہاتھی ہو تو الامان! آسام کے چائے کے باغات اور ان کے ارد گرد کے علاقہ میں ایک..... وحشی ہوجانے والے ہاتھی کی ہلاکت خیزیاں، جس نے کئی انسانوں کو نہ صرف جان سے مارا بلکہ اپنے پیروں تلے یوں مسلا کہ ان کی شناخت مشکل ہوگئی۔

موت کے پیروں تلے روندے جانے والے ایک باہمت شخص کا ماجرا

ان دنوں میں کلکتہ میں اپنے دوست الفریڈ سیل کے گھر آرام کررہا تھا۔ ایک منٹ، پہلے میں اپنا مختصر تعارف کرادوں۔ میرا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے۔ والدین جوہانسبرگ کے رہنے والے تھے۔ میرے والد ڈونالڈ ریمنگٹن نے اسٹیل کا کاروبار کررکھا تھا اس لیے معاشی طور پر بے حد پُر آسائش زندگی گزاری۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہائی اسکول پاس کرکے میں ایک سفاری میں ملازم ہوگیا۔ وہاں مجھے جس جانور سے سب سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا، وہ جنوبی افریقہ کے دیوہیکل اور خونخوار ہاتھی تھے۔ آئے دن یہ غریب افریقی کسانوں کی املاک اور کھیتوں کو اپنے پیروں تلے روندتے رہتے تھے۔ میں اس خاص شکاری دستے میں شامل تھا جو خطرناک اور انسانوں کے لیے باعثِ آزار بن جانے والے ہاتھیوں کا شکار کرتا تھا۔ تین سال کے عرصے میں میں نے کوئی دو درجن ہاتھی شکار کیے تھے۔ اس وقت ہاتھی کے شکار اور اس کے دانت کی تجارت پر پابندی نہیں تھی۔ (یہ 1938ء کا ذکر ہے) اس لیے میں نے جب دو درجن ہاتھیوں کے دانت جوہانسبرگ میں لاکر فروخت کیے تو مجھے اس سے خاصی بڑی رقم ملی تھی۔ چنانچہ میں نے دوبارہ تعلیمی

سلسلہ شروع کیا اور زولوجی میں ماسٹر کیا۔ کچھ عرصے میں کیپ ٹاؤن میں پڑھاتا بھی رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں میں رضاکار کے طور پر سنگاپور اور ہانگ کانگ میں رہا۔ جنگ کے بعد میں تھکن اتارنے کے لیے ہندوستان چلا آیا جو ان دنوں آزادی کی پُرجوش تحریک میں گھرا ہوا تھا۔ سیاست سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں اپنے تاجر دوست سیل کے گھر آرام کررہا تھا۔ ہانگ کانگ میں ایک حادثے میں مجھے اپنے بائیں گھٹنے میں فریکچر کی تکلیف سہنا پڑی تھی اور چار ہفتے میں اسپتال میں داخل رہا تھا۔ اس وقت تو یہ تکلیف ٹھیک ہوگئی مگر ادھر میں نے کلکتہ کی زمین پر قدم رکھا اور ادھر گھٹنے کی تکلیف نے پھر سر اٹھایا۔ میں ہندوستان سیل کی دعوت پر آیا تھا۔ اس کا آسام میں چائے پیدا کرنے والے باغات کے مالکان سے تاجرانہ تعلق تھا اور اسی وجہ سے وہ آئے دن آسام کے دورے کرتا رہتا تھا۔ وہ وہاں سے چائے حاصل کرکے انگلینڈ بھیجا کرتا تھا۔ اسے میری تکلیف کا پتا چلا تو اس نے فوراً مجھے معروف سرجن ڈاکٹر ولیم بروک سے ملوایا۔ اس نے میرے گھٹنے کا معائنہ کیا۔

''مسٹر جونی ریمنگٹن...... کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ تم تین ہفتے آرام کرو۔ بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔''

ڈاکٹر بروک نے مجھے ایک ایسی پٹی دی جو گھٹنے کو سختی سے جکڑ لیتی تھی ''جب گھر سے باہر جاؤ تو اسے باندھ لیا کرنا لیکن کوشش کرنا اس کی نوبت کم سے کم آئے اور اگر درد زیادہ ستائے تو یہ گولیاں پانی سے نگل لینا۔'' اس نے مجھے ایک شیشی بھی تھمادی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے مجھے انجکشن لگانے کی کوشش نہیں کی۔ بچپن سے ہی مجھے انجکشن سے خوف آتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں سفاری کی ملازمت کے دوران بارہا زخمی ہونے کے باوجود علاج کے دوران میں نے کبھی انجکشن نہیں لیا تھا البتہ ہانگ کانگ میں آپریشن کے وقت مجھے بے ہوشی کا انجکشن لگایا گیا تھا۔ انجکشن کا یہ خوف آج بھی برقرار ہے۔

سیل کا گھر کلکتہ میں دریا کے ساتھ واقع تھا۔ اس کے خوب صورت بنگلے کے لان سے دریا کا نظارہ بے حد خوب صورت نظر آتا تھا۔ شام کو عام طور سے میں لان میں کرسی ڈلوا کر بیٹھ جاتا اور دریا میں آتی جاتی کشتیوں کو دیکھا کرتا۔ جب اس مشغلے سے اکتا جاتا تو کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ سورج غروب ہوتے ہی سیل کا مقامی ملازم باغ میں لگے برقی قمقمے روشن کردیتا تھا اور ساتھ ہی میرے لیے میز پر وہسکی کی بوتل، گلاس اور برف کے ٹکڑوں کا پیالہ لاکر رکھ دیتا تھا۔ سیل عام طور سے رات گئے گھر آتا تھا۔ ان دنوں چائے سے بھری کشتیاں اس کے دریائی بندرگاہ کے گوداموں میں آرہی تھیں اور وہ ان کو انگلینڈ بھیجنے کے انتظامات کررہا تھا۔ جہاں سے یہ ڈبوں میں پیک ہوکر واپس ہندوستان بکنے آتی تھی۔ سیل نے مجھے یہ بتا کر حیران کردیا کہ جو چائے ڈبے کی صورت میں پانچ یا چھ روپے کلو بکتی تھی۔ وہ چند پیسے کلوگرام کے حساب سے خریدتا تھا۔ نسلاً انگریز ہونے کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوا کہ انگلینڈ کس طرح سے اپنے زیرِ قبضہ ممالک کے وسائل لوٹ رہا تھا۔ سیل جب گھر آتا تو میرے ساتھ ہی ڈنر کرتا تھا۔ اس کی جوان العمر بیوی کا زیادہ تر وقت کلکتہ میں انگریزوں کی اعلیٰ سوسائٹی میں گزرتا تھا وہ گھر پر کم ہی قیام کرتی تھی۔ چند روز ہی میں مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ سیل اور اس کی بیوی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہیں اور سیل اس صورتِ حال سے اندرونی کرب کا شکار تھا۔ سیل بنیادی طور پر بہت اچھا انسان تھا۔ اس سے میری ملاقات سنگاپور میں ہوئی۔ عمروں کے فرق کے باوجود جلد ہماری دوستی مضبوط ہوگئی اور جب وہ سنگاپور سے جانے لگا تو اس نے مجھے کلکتہ آنے کی دعوت دی تھی۔ میں دو سال بعد اس کی دعوت سے مستفید ہوسکا تھا۔

کلکتہ کا موسم گرم تھا۔ خاص طور سے دن میں بے پناہ گرمی ہوجاتی تھی اور میں سارا دن پنکھے کے نیچے نیکر پہن کر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے باوجود پسینہ پانی کی طرح جسم پر بہتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں جنوبی افریقہ میں بھی خاصی گرمی پڑتی ہے پھر سنگاپور بھی گرم ملک ہے، لیکن کلکتہ جیسی گرمی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اس کے باوجود میں وہاں کے قیام کو انجوائے کررہا تھا۔ سیل کا باورچی مجھے خاص مشرقی کھانے بنا کر کھلا رہا تھا جن کا ذائقہ انوکھا اور مزیدار تھا۔ اس کے علاوہ سیل کی لائبریری بڑی شاندار تھی اور اس میں بے شمار موضوعات پر کتابیں تھیں۔ شام کے وقت لان میں اچھا وقت گزرتا تھا۔ باغ کے ایک گوشے میں سیل نے رنگا رنگ پرندے پال رکھے تھے۔ میں ان سے بھی دل بہلاتا تھا۔

ایک شام میں مقامی نسل کے ایک ہرے طوطے کو انگریزی کے کچھ الفاظ سکھانے کی کوشش کررہا تھا کہ مجھے دریا کی جانب سے چیخ و پکار سنائی دی۔ میں بھاگ کر لان کے سامنے والے حصے کی طرف آیا۔ سامنے ایک خوف ناک منظر تھا۔ عورتوں اور بچوں سے بھری ایک کشتی دریا میں الٹ گئی تھی۔ پچاس کے قریب عورتیں اور بچے دریا کے پانی میں غوطے کھارہے تھے۔ کشتی چلانے والے دو ملاح کچھ بچوں کو

سہارا دے کر کنارے کی طرف لا رہے تھے۔ مگر بچانے والے دو تھے اور جن کو مدد چاہیے تھی ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کشتی کنارے سے کوئی تیس گز دور الٹی تھی میں نے چلا کر عبدل (باورچی) کو آواز دی اور خود بھی دریا کی طرف دوڑا۔ کئی دن مسلسل آرام کرنے کے بعد میرے گھٹنے میں درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا لیکن جب کنارے پر پہنچ کر میں نے دریا میں چھلانگ لگائی تو میرے گھٹنے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ چند لمحے تو میں پاؤں کو حرکت بھی نہ دے سکا تھا پھر میں نے ہمت کر کے تیرنا شروع کیا۔ کچھ عورتیں بھی تیراکی جانتی تھیں۔ لیکن زیادہ تر عورتیں صحیح طرح سے تیرنے سے قاصر تھیں۔ دو عورتوں کو میں نے پانی میں غائب ہوتے دیکھا۔ سب سے پہلے میں ایک عورت تک پہنچا۔ جس نے شیر خوار بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اسے پانی میں جانے سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور اپنی پشت پر لاد کر کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں عبدل بھی آ گیا تھا۔ وہ بنگال کا رہنے والا تھا اور بے حد مشاق تیراک تھا۔ میں جب تک اس عورت اور بچے کو کنارے تک پہنچا کر آیا۔ اس نے کئی عورتوں کو بچا لیا تھا۔ ملاح بھی مدد کر رہے تھے۔ ٹانگ میں ہونے والے درد کے باوجود میں نے کئی عورتوں اور بچوں کو بچا کر کنارے تک پہنچایا تھا۔ جب عبدل بچ جانے والی آخری عورت کو لا رہا تھا تو میں پانی سے نکل کر کنارے پر آیا۔ اس ذرا سی مشقت سے میری ٹانگ میں درد کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے لیے یہ ذرا سی مشقت تھی کیونکہ جنوبی افریقہ کے بپھرے دریاؤں میں، میں نے تیراکی کی خوب مشق کی تھی۔

کشتی کے حادثے میں چار بچے اور دو عورتیں ڈوب کر ہلاک ہوئی تھیں مگر بیشتر عورتیں اور بچے بچا لیے گئے تھے۔ عبدل نے رات کو سیل کو گھر آتے ہی میرا کارنامہ جوش و خروش سے سنایا۔ پھر میں نے سیل کو بتایا اور ساتھ ہی مطلع کیا ”شاید کل مجھے پھر ڈاکٹر بروک کے پاس جانا پڑے۔ اب میں چلتا ہوں تو گھٹنے میں ٹیس سی اٹھتی ہے۔“

”یہ اچھی علامت نہیں ہے۔“ سیل بھی فکر مند ہو گیا تھا۔

”کل میں خود تمہیں ڈاکٹر بروک کے پاس لے چلوں گا۔“

اگلے روز سیل مجھے ڈاکٹر بروک کے کلینک لے گیا۔ اس نے میری ٹانگ کا معائنہ کیا اور کسی قدر مایوسی سے کہا ”تم نے بے احتیاطی کر کے اپنا کیس خراب کیا ہے۔ اب تمہیں مزید دو ہفتے آرام کرنا ہوگا۔“

یہ سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ خدا خدا کر کے تین ہفتے پورے ہونے کو آئے تھے اور اس کے بعد میرا ارادہ سیل کے ساتھ آسام جانے کا تھا۔ وہ کچھ نئے کاروباری معاہدے کرنے آسام جا رہا تھا۔ اس کی روانگی پانچ دن بعد تھی اگر میری ٹانگ اس مشقت میں نہ پڑتی تو میں پانچ دن بعد الفریڈ سیل کے ہمراہ آسام جا رہا ہوتا۔ سیل نے مجھے بھوٹان اور تبت کے پاس واقع اس علاقے کے بارے میں اتنا بتایا تھا کہ مجھے بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ کچھ ہفتے سیل کے پاس گزار کر واپس وطن کی راہ لوں گا مگر آسام کے تذکروں نے مجھے روک لیا تھا۔ میری مایوسی دیکھ کر سیل نے مجھے تسلی دی۔

”تم فکر مت کرو جونی۔ میں اپنی روانگی کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو گے۔“

میں خوش ہو گیا تھا لیکن ابھی دن تین گزرے تھے کہ آسام سے سیل کو اپنے بزنس منیجر کا تار ملا جس میں اس نے بعض کاروباری معاملات میں گڑبڑ کی نشاندہی کرتے ہوئے اس سے فوری طور پر آسام آنے کی فرمائش کی تھی اس لیے سیل کو مجبوراً میرے بغیر ہی روانہ ہونا پڑا۔ میں ایک بار پھر مایوس ہو گیا تھا کیونکہ اگلے مہینے سیل کو انگلینڈ جانے والے جہاز پر سوار ہونا تھا اور اس کے پاس دوبارہ آسام جانے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ درد ٹھیک ہوتے ہی میں وطن کا قصد کروں گا۔

مجھے گھر سے دور ہوئے پورے تین سال ہونے کو آئے تھے۔

سیل کو گئے ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اب میری ٹانگ کا درد کلکتہ آنے کے بعد سے سب سے بہترین حالت میں تھا اور اس روز تیز بارش کے بعد میں لان میں ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ عبدل نے ایک تار لا کر دیا۔ ''یہ میرے دوست سیل کی طرف سے تھا اور خاصا تفصیلی تار تھا۔ اس نے لکھا تھا ''پیارے دوست جونی...... میری درخواست ہے اگر تم میرے پاس آ سکتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔ یہاں ایک ہاتھی نے انسانوں پر قیامت ڈھا دی ہے۔ ہدایات کے لیے رابرٹ سے رجوع کرو۔''

رابرٹ اسٹین، سیل کے کلکتہ کے دفتر کا منیجر تھا۔ مجھے اس سے رابطہ کرنا تھا۔ اس خط میں میری دلچسپی کی سب سے اہم وجہ ہاتھی کا ذکر تھا جو لوگوں کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ سیل جانتا تھا کہ میں ہاتھی کے شکار کا ماہر تھا۔ خاص طور سے ایسے ہاتھیوں کے شکار کا جو انسانوں کے لیے خطرے کا باعث بن جائیں۔ کیا سیل چاہتا تھا کہ میں وہاں آ کر اس ہاتھی کا شکار کروں؟ اس وقت میں واپس جنوبی افریقہ جانے کا فیصلہ بڑی حد تک کر چکا تھا۔ بلکہ میں نے اپنا خاصا سامان پیک بھی کر دیا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ سیل کی اس درخواست کا کیا جواب دوں کہ شام کے وقت سیل کا دوسرا تار ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

''جونی...... برائے خدا...... جس حال میں ہو چلے آؤ...... ورنہ یہ ہاتھی مجھے ضرور تباہ کر دے گا...... اس کے خوف سے لوگوں نے چائے کے باغوں میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔''

سیل کے اس تار نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ سیل میرا میزبان تھا پھر ٹانگ کی اس تکلیف کے وقت اس نے میری جس طرح دیکھ بھال کی تھی میں اس کا احسان مند ہو گیا تھا۔ اس کو انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اگلی صبح اپنے چند جوڑے ایک سوٹ کیس میں رکھے اور سیل کے منیجر رابرٹ سے رابطہ کیا۔ سیل اسے پہلے ہی ہدایت دے چکا تھا۔ اس نے میرے لیے ریل میں ایک سیٹ بک کرائی اور میں اسی شام اس ٹی اسٹیٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک ہاتھی انسانوں کو دھمکا رہا تھا۔ ٹرین کا یہ سفر بے حد بور ثابت ہوتا اگر میں اپنے ساتھ چند کتابیں نہ لے جاتا کیونکہ میرے ساتھ اس ڈبے میں چند بیزار قسم کے انگریز سوار تھے جو سوائے خاموش رہنے کے کچھ نہیں کر رہے تھے اور چند ایک مقامی تھے جو اچھے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان انگریزوں سے دبے دبے نظر آ رہے تھے۔

ٹرین ایک دن اور ایک رات چلتی رہی۔ اگلی رات میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اترا جہاں تاریکی کا راج تھا۔ مگر اسٹیشن ماسٹر کو میرے بارے میں بتا دیا گیا تھا۔ اس نے مجھے پرانے ماڈل کی ملٹری جیپ میں بٹھا دیا جسے ایک مقامی لڑکا بے حد مہارت سے چلا رہا تھا اس نے معمولی درجے کی انگریزی میں کہا۔

''صاحب، میرا نام سامو ہے۔''

''خوب سامو۔ ابھی ہمیں کتنا سفر کرنا ہے؟''

''صاحب یہاں سے دو گھنٹے لگیں گے کوٹھی تک پہنچنے میں۔ وہاں سے ہم پیٹرول لیں گے اور ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد مزید تین گھنٹے سفر کے بعد ہم رسائی تک پہنچیں گے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن ہے۔ آپ وہاں محکمۂ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس میں آرام کر سکیں گے۔ باقی راستہ ہم صبح طے کریں گے۔''

دو گھنٹے تک دشوار گزار اور خطرناک راستوں سے گزر کر ہم برطانوی فوج کے ایک گیریژن ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ جنگ عظیم میں اسے جاپانیوں سے لڑنے والی فوج کے لیے تعمیر کیا گیا تھا مگر جنگ کے بعد یہاں کی چہل پہل نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ راشن ڈپو سے سامو نے جیپ میں پیٹرول ڈلوایا۔ اس دوران میں، میں نے میس میں ڈنر کیا۔ ایک برطانوی میجر سے گپ شپ رہی۔ اتفاق سے وہ بھی ایشیائی ہاتھی کا شکار کھیل چکا تھا۔ اس نے اپنے تجربات چند الفاظ میں بیان کر دیے۔ ''بے حد شریف اور امن پسند جانور ہے لیکن اگر دشمن ہو جائے تو اس سے زیادہ خطرناک جانور کوئی اور نہیں ہے۔''

مجھے معلوم تھا کہ ہاتھی عام طور سے ملاپ کے دنوں میں مست ہو جاتے ہیں اور ایسے وقت یہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ اپنی تنہائی میں مخل ہونے والے کو نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ لیکن یہ ملاپ کا موسم نہیں تھا اور پھر ملاپ کے دنوں میں ہاتھی عام طور سے اپنے گوشۂ عافیت میں محدود رہتے ہیں۔ باہر نکل کر انسانی آبادیوں تک نہیں آتے۔ برطانوی میجر سے بات چیت کر کے اور لذیذ ڈنر سے پیٹ بھر کر میں سامو کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس بار راستہ پہلے سے بھی دشوار اور خطرناک تھا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ اسٹیشن جہاں میں اترا تھا وہ سطح سمندر سے کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس وقت ہم کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھے مگر ہوا بہت مرطوب تھی اور کسی قدر گرمی تھی۔ اس خطے سے مشرق بعید کے مشہور برساتی جنگلات کا آغاز ہوتا تھا جو جنوب مشرق میں

ہانگ کانگ تک اور شمال مشرق میں وسط چین تک چلے جاتے تھے۔ یہ برساتی جنگلات ایشیائی ہاتھی کا گھر تھے۔

اس وقت ہم مشرقی ڈھلان پر سفر کر رہے تھے اس لیے ہوا گرم مرطوب تھی۔ رات بارہ بجے کے بعد ہم نے چوٹی والا حصہ عبور کر کے شمالی مغربی ڈھلان پر سفر شروع کیا۔ یہاں پر خنک اور خشک ہوا نے استقبال کیا تھا۔ انڈیا آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میرا خنک اور خشک ہوا سے واسطہ پڑا تھا۔ ان پیچیدہ ترین پہاڑی راستوں پر سامو اتنی مشاقی اور مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ جیپ ایک جگہ بھی راستے سے نہیں اتری تھی۔ سامو نے مجھے بتایا کہ وہ اکثر اس راستے پر آتا جاتا رہتا ہے اور اس سے اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح واقف ہے۔ وہ سیل کے آسام میں نمائندے رومیس اسپیڈن کے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی سال بعد جب سیل نے مجھے خط لکھا تو اس نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ سامو آسام میں جیپ کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا ہے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جیپ اس وقت سامو ڈرائیو نہیں کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر جیپ اس وقت سامو ڈرائیو کر رہا ہوتا تو شاید زندہ ہوتا۔

رات دو بجے ہم ساسونی پہنچے جو سطح سمندر سے تقریباً سات ہزار فٹ کی اونچائی پر ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن تھا۔ اس کی آبادی اس وقت بہ مشکل چند سو نفوس پر مشتمل تھی۔ جو وہاں بنے امرا کے بنگلوں اور ریسٹ ہاؤس میں کام کر کے روزی کماتے تھے۔ جنگلات کا یہ گیسٹ ہاؤس خاصا بڑا تھا یہاں پر محکمۂ جنگلات کا ایک دفتر بھی تھا۔ وہاں ٹھہرنے کے لیے مجھے ایک آرام دہ کمرا اور گرم گرم بستر مل گیا۔ سامو کو بھی ایک کمرا مل گیا تھا۔

صبح سویرے ہم ٹی اسٹیٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جیپ اب ترائی میں اتر رہی تھی۔ ذرا دیر بعد جیپ چائے کے تاحدِ نگاہ پھیلے باغات سے گزر رہی تھی۔ عورتیں چائے چن چن کر اپنی کمر سے بندھی ٹوکریوں میں ڈال رہی تھیں۔ سب سے اگلا گروہ پودے کی نازک اور نفیس پتیاں چن رہا تھا جس سے اعلیٰ درجے کی چائے بنتی ہے۔ باغات کے درمیان سرخ کھپریل کی چھتوں والے بنگلے تھے جن میں ان باغات کے مالکان آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ سامو پچھلی رات زیادہ تر خاموشی سے سفر کرتا رہا تھا۔ راستے کی دشواری کے پیش نظر میں بھی خاموش رہا تھا تاکہ سامو پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر سکے مگر اس آسان اور ہموار راستے پر سفر کرتے ہوئے وہ خوب بول رہا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھی کے بارے میں بتایا۔

''بہت بڑا اور خوف ناک ہاتھی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اب تک چھ آدمی مار چکا ہے۔''

''میرے خدا۔'' میرے منہ سے نکلا ''کیا اسے انسانی خون بہانے کی عادت ہوگئی ہے؟''

''صاحب وہ ہاتھی بلا ہے۔ جن چھ آدمیوں کو مارا ہے ان میں دو شکاری بھی تھے۔ اسے مارنے گئے تھے خود اس کا شکار ہوگئے۔'' سامو بولا۔

پھر سامو نے وہ واقعہ سنایا جس میں ہاتھی سے اس کا آمنا سامنا ہوا اور محض مقدر تھا جو وہ اس کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ وہ اپنے صاحب کا ایک پیغام لے کر برابر والی ٹی اسٹیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ رومیس جو سیل کا منیجر تھا اس کی ذاتی ٹی اسٹیٹ بھی تھی۔ سامو جیپ لے کر دوپہر کے وقت نکلا تھا۔ برابر والی اسٹیٹ بھی کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھی اور راستہ بے حد گھنے جنگل سے گزرتا تھا۔ صدیوں سے انسانوں نے سفر کر کے اس کے وسط میں ایک راستہ بنا دیا تھا جس پر گاڑیاں بھی گزرتی تھیں۔ سامو اس راستے سے جیپ لے کر گیا تھا۔ ان دنوں اس ہاتھی نے اپنی تباہ کاریاں شروع کی تھیں اور چائے کے باغات میں چائے کی پتیاں چنتی عورتوں پر حملہ کیا تھا۔ افراتفری میں بھاگتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر عورت گر پڑی اور ہاتھی نے اسے اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ اس پر بھی اس کی وحشت سرد نہ ہوئی تو وہ سونڈ میں دبا کر عورت کی لاش اپنے ساتھ جنگل لے گیا۔ اگلے روز جب مسلح افراد عورت کی لاش تلاش کرنے جنگل میں گئے تو انہیں وہاں اس کے جسم کی چند بوٹیاں ملی تھیں۔ باقی لاش وحشی ہاتھی نے ریزہ ریزہ کر دی تھی۔ درختوں پر لگے خون اور گوشت کے لوتھڑوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاتھی نے لاش کو درختوں پر اٹھا اٹھا کر مارا تھا۔ وہ سب دل گردے والے لوگ تھے لیکن لاش کا یہ حشر دیکھ کر وہ بھی کانپ گئے تھے۔ یہ کوئی مہینہ بھر پہلے کی بات تھی۔

سامو اس واقعے کے تیسرے دن روانہ ہوا تھا۔ اسے خوف نہیں تھا کیونکہ علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ہاتھی نے کسی وقتی اشتعال کے تحت حملہ کیا تھا۔ عام طور سے ہر دوسرے تیسرے سال ہاتھیوں کے اس طرح حملوں کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا ہی رہتا تھا۔ اسے بھی ایسے ہی واقعات میں شمار کیا گیا تھا۔ اس وقت سامو گھنی گھاس کے جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک اسے ہاتھی کی خوف ناک چنگھاڑ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ایک ہاتھی کو...... اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ ہاتھی جیپ سے مشکل سے تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ راستہ نہایت تنگ تھا اور بار بار مڑتا بھی تھا۔ اگر ایک بار جیپ

اس دیو قامت گھاس (اسے ہاتھی گھاس بھی کہتے ہیں اور اس کی لمبائی بعض اوقات دس فٹ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے) میں گھس جاتی تو چند قدم سے زیادہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔ عقب سے ہاتھی پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ایشیائی ہاتھی رفتار میں افریقی ہاتھی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اسے کھلا میدان مل جائے تو یہ تقریباً پینتیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے کئی میل تک دوڑ سکتا ہے جب کہ اس راستے پر جیپ بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ نہیں دوڑائی جا سکتی تھی۔

ساموں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور ہر ممکن رفتار سے جیپ آگے بڑھانے لگا۔ ساتھ ہی وہ دعا کر رہا تھا کہ اس ساخوردہ جیپ میں کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے۔ اس صورت میں وہ ہاتھی سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا اور موت کا ہرکارہ پوری رفتار سے اس کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ ساموں نے دوبارہ پیچھے نہیں دیکھا کیونکہ لمحاتی غفلت جیپ کو راستے سے اتار دیتی مگر عقب سے آتی وحشی کے قدموں کی دھمک اور اس کی چنگھاڑ اسے بتا رہی تھی کہ وہ ہر لمحے اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی عقبی آئینے میں اس کی صورت نظر آتی تھی۔ ساموں کا مارے خوف کے برا حال تھا لیکن اس نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا دیر بعد گھاس کے درمیان یہ راستہ ایک چوڑی پکی سڑک پر جا نکلے گا جہاں وہ پوری رفتار سے جیپ بھگا کر اس عفریت سے پیچھا چھڑا سکے گا۔ مگر یہ پکی سڑک ابھی کچھ فاصلے پر تھی اور ہاتھی خاصا نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے اپنی سونڈ فضا میں بلند کر لی تھی اور ہاتھی اپنی سونڈ شکار کے تعاقب میں اس وقت بلند کرتا ہے جب وہ یقین کر لیتا ہے کہ شکار اس کی زد میں ہے۔ ساموں کا پورا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ بعض اوقات سخت اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا تھا لیکن اس نے جیپ کو بے قابو نہیں ہونے دیا تھا۔ یکایک جیپ ہل کر رہ گئی۔ ہاتھی نے اپنی مضبوط سونڈ اس کے عقبی حصے پر ماری تھی۔ ساموں نے بہ مشکل جیپ کو قابو کیا۔ اب وہ بلند آواز سے بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا کہ وہ اسے اس وحشی جانور سے محفوظ رکھے۔ اس تنگ راستے پر وہ ہر ممکن تیزی سے جیپ دوڑا رہا تھا۔

پھر اچانک اس نے خود کو پکی سڑک پر پایا۔ اس نے پوری طاقت سے ایکسیلیریٹر دبایا ورنہ اس بار ہاتھی نے جیپ کا عقبی حصہ پکڑ لیا تھا۔ جھٹکے سے جیپ آگے بڑھی اور ہاتھی کے سونڈ میں عقبی جنگلے کا ایک ٹکڑا رہ گیا۔ جیپ کو آگے نکلتے دیکھ کر ہاتھی سمجھ گیا کہ اس کا شکار اب ہاتھ نہیں آئے گا اور یہ ساموں کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ کیونکہ محض نصف کلومیٹر آگے جا کر جیپ کا انجن بند ہو گیا اور پھر کسی طرح اسٹارٹ نہیں ہوا۔ باقی راستہ ساموں نے اپنے پیروں پر بھاگتے ہوئے طے کیا تھا اسے سارے راستے دھڑکا لگا رہا کہ وہ وحشی ہاتھی دوبارہ اس کے تعاقب میں نہ آ جائے۔

اگلے ایک ہفتے میں ہاتھی نے مزید دو افراد مار دیے۔ یہ دونوں جنگل کی ڈھلانی سطح پر ہاتھی گھاس کاٹ رہے تھے۔ مقامی افراد اس گھاس سے اپنے جھونپڑے بناتے ہیں۔ سخت موسمی حالات کی بنا پر انہیں ہر سال ہی اپنے جھونپڑے نئے سرے سے بنانے پڑتے تھے۔ ہاتھی گھاس ان کے لیے ہلکا اور مفت میں ملنے والا مضبوط میٹیریل تھا۔ میں نے اس ہاتھی گھاس کو افریقہ میں اگنے والی ہاتھی گھاس سے زیادہ مضبوط اور لمبا پایا تھا۔ وہ گھاس اس کے گٹھے کاٹ کاٹ کر بنا رہے تھے کہ ہاتھی نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ مکار جانور اتنی خاموشی سے آیا کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ اس نے ایک شخص کو عقب سے سونڈ مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرا جب تک ہوشیار ہوتا ہاتھی نے اسے بھی زمین پر گرا کر پیروں تلے روند ڈالا۔ اس کے بعد اس نے حسبِ فطرت ان کی لاشوں کو مسلنا شروع کر دیا۔ بعض افراد جو قریب ہی گھاس کاٹنے میں مصروف تھے انہوں نے یہ لرزہ خیز.... منظر دیکھا اور وہ اپنی درانتیاں سنبھال کر بھاگے۔ انہوں نے واقعے کی اطلاع مقامی پولیس اسٹیشن میں دی۔ پولیس پارٹی نے مسلح افراد کے ساتھ جا کر ان دو افراد کی لاشیں اٹھائیں جو اس جگہ پڑی تھیں لیکن ہاتھی نے ان دونوں کا اتنا برا حال کر دیا تھا کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں تھیں۔ اگلے روز دیہاتیوں نے تحصیل دار کے دفتر جا کر ہاتھی کی شکایت کی اور درخواست کی کہ اس وحشی ہاتھی کو ٹھکانے لگایا جائے جو اب تک تین افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ تحصیل دار نے اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے انہیں ہاتھی کی کارستانیوں سے آگاہ کیا اور ہاتھی کے شکاری بھجوانے کی درخواست کی۔ اتفاق سے دو شکاری دستیاب تھے۔ وہ علاقے میں آئے۔ اس دوران میں ہاتھی نے انسانی دشمنی پر کمر باندھ لی تھی۔ روز ہی وہ چائے کے باغات تک چلا آتا۔ اس نے کئی کھیت اجاڑ دیے تھے اور کئی فارم ہاؤس تباہ کر دیے تھے۔ مقامی ٹی اسٹیٹ کے مالک کنور سنگھ کی نئی کار اس نے پرزے پرزے کر کے رکھ دی تھی۔

دونوں شکاری محکمۂ جنگلات کے ملازم تھے اور ان کا تعلق آسام سے ہی تھا۔ علاقے میں آنے کے فوراً بعد وہ ہاتھی کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ مقامی افراد نے

شہادت دی کہ مست ہاتھی آخری بار جنوبی ترائی میں ہاتھی گھاس میں دیکھا گیا تھا۔ یہ سن کر اصولاً ان شکاریوں کو جنگل کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس گھاس میں گھس کر ہاتھی کو تلاش کرنا اتنا خطرناک تھا کہ بڑے بڑے شکاری اس سے کتراتے تھے۔ یہ گھاس قدرتی طور پر ہاتھیوں کے لیے پناہ گاہ تھی۔

ان دونوں شکاریوں کے ہمراہ ایک مقامی گائیڈ بھی تھا جو جنگل اور اس کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کی رہنمائی میں وہ ترائی کی طرف روانہ ہوئے جو چائے کے باغات سے خاصا نشیبی علاقہ تھا۔ مگر چالاک ہاتھی جب چائے کے باغات پر حملہ کرتا تھا تو وہ ترائی کی طرف سے آنے کے بجائے اس کے اوپر واقع گھنے جنگل کی طرف سے آتا تھا۔ جنگل اور باغات تقریباً ملے ہوئے تھے اس لیے ہاتھی کے حملے کا اس وقت پتا چلتا تھا جب وہ باغات میں داخل ہو چکا ہوتا۔ دو افراد کو ہلاک کرنے کے بعد اس مکار جانور نے خطرہ محسوس کیا اور ترائی کی گھاس میں روپوش ہو گیا تھا۔ وہیں سے ہر دوسرے تیسرے دن نکل کر وہ باغات اور فارم ہاؤسز پر حملے کرتا تھا۔ مقامی افراد کی خوش قسمتی تھی کہ علاقے کا واحد گاؤں ٹی اسٹیشن کے عین وسط میں واقع تھا اور یہاں تک ہاتھی کی رسائی مشکل تھی لیکن وہ افراد جو کسی وجہ سے گاؤں سے باہر یا جنگل کے پاس رہا کرتے تھے ہاتھی کے ڈر سے انہوں نے اپنے گھر خالی کر دیے تھے اور گاؤں میں چلے آئے تھے۔

شکاری مقامی گائیڈ کے ہمراہ ہاتھی گھاس کی پٹی تک پہنچے۔ یہ تقریباً دس کلومیٹر لمبا اور ایک کلومیٹر چوڑا قطعہ تھا۔ دراصل یہ جگہ ایک نشیبی نالے کے ساتھ تھی جب مون سون کی بارشیں ہوتیں تو یہ ساری زمین پانی تلے آ جاتی تھی اور جب پانی اترتا تھا تو اس پر ہاتھی گھاس اگ آتی تھی۔ چند مہینے تک رہنے والی یہ گھاس مقامی آبادی کے لیے نعمت تھی۔ اس سے وہ اپنے گھر بناتے تھے، اس کی نرم شاخیں اپنے جانوروں کو کھلاتے تھے اور اس کے ٹکڑے خشک کر کے آنے والی سردیوں میں جلاتے تھے، اور یہ انہیں مفت میں ملتی تھی۔ بے چارے دیہاتی اس جانور کی وجہ سے گھاس سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

شکاری جب ہاتھی گھاس تک پہنچے تو ان کی ہمت جواب دے گئی۔ مقامی گائیڈ بھی گھبرا رہا تھا۔ اس نے شکاریوں کو مشورہ دیا کہ گھاس میں جانے کے بجائے ہاتھی کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے مگر ہاتھی کا انتظار ممکن نہیں تھا۔ اول تو اس لمبی گھاس کی پٹی میں ہاتھی کہاں سے باہر آتا یہ کہنا ممکن تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ ہاتھی ترائی کی طرف سے آنے کے بجائے اوپر جنگل کی طرف نکل جاتا۔ گائیڈ نے مشورہ دیا کہ شکاری گھاس کی پٹی سے ذرا ہی فاصلے پر واقع ایک ننھی سی جھیل کے کنارے ہاتھی کا انتظار کریں۔ اس علاقے میں یہ جھیل پانی کا واحد ذریعہ تھی جسے اوپر کے ایک نالے سے پانی ملا کرتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں یہ جھیل تقریباً خشک ہو جاتی تھی اور جنگل کے جانور پانی کے لیے نشیبی علاقوں کا رخ کرتے تھے۔ گائیڈ کی بات مان کر شکاریوں نے جھیل کے کنارے ڈیرا ڈال لیا۔ وہاں زمین پر قدموں کے نشانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھی وہاں پانی پینے آتا تھا۔ یہاں اوپری علاقوں میں خاصے ہاتھی پائے جاتے تھے لیکن وہ صرف سردی کے موسم میں نیچے آتے تھے۔ جب اوپر خوراک کی کمی ہو جاتی تھی اور پانی ملنا بھی محال ہو جاتا تھا اس وقت ہاتھی آ کر ہاتھی گھاس والی پٹی میں قیام کیا کرتے تھے اور جیسے ہی بہار کا موسم آتا یہ واپس چلے جاتے تھے۔

قاتل ہاتھی ایک تو خلافِ توقع ترائی کی طرف آیا تھا۔ دوسرے اس نے خلافِ معمول انسان دشمنی شروع کر دی تھی۔ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے انسانوں پر حملے کیوں شروع کیے پھر اس نے جس طرح تین افراد کو مارنے کے بعد ان کی لاشوں کو مسلا تھا اس سے اس کی شدید نفرت اور انسانوں کے لیے بغض واضح تھا۔ ہاتھی اس معاملے میں بے حد کینہ پرور ہے۔ بعض اوقات اسے کسی دوسرے جانور کی معمولی سی حرکت ناگوار گزرتی ہے اور یہ ان کے درپے ہو جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ سفاری میں ملازمت کے دوران میرے مشاہدے میں ایک ہاتھی آیا جو گیدڑوں کا دشمن ہو گیا تھا۔ شاید گیدڑوں نے ہاتھی کے بچے کو نقصان پہنچایا ہو اور اس کے بعد ہاتھی ان کا دشمن بن گیا ہو۔ اس ہاتھی کی وجہ سے سفاری کے بیشتر گیدڑ وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔

بات ذرا دور نکل گئی۔ شکاریوں سے بنیادی غلطی ہوئی تھی۔ انہوں نے کسی فرد سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی ہاتھی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ورنہ وہ اتنی بے پروائی نہ برتتے۔ جھیل کے پاس بانسوں کا ایک مختصر جھنڈ تھا۔ انہوں نے اس میں پناہ لی اور ہاتھی کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں اپنی طاقت ور رائفلوں پر بھروسا تھا کہ وہ چند فائر کر کے ہاتھی کو ڈھیر کر دیں گے۔ اس چکر میں انہیں یہ خیال بھی نہیں رہا کہ ہوا ان کی طرف سے ترائی کی طرف جا رہی تھی۔ ہاتھی کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ خاصی دور سے بو محسوس کر لیتا ہے اور ہاتھی نے بانسوں میں چھپے انسانوں کی بو تلاش کر لی تھی۔

قدرتی طور پر یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جو جانور انسان دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے، چاہے وہ ہاتھی ہو یا شیر یا کوئی اور جانور، وہ اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ یہ ہاتھی بھی عام ہاتھیوں سے کہیں زیادہ چالاکی دکھا رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس طرح چھپ کر رہنے والے اس کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہ سامنے سے آنے کے بجائے چپکے سے چکر کاٹ کر بانسوں کے اس جھنڈ کے عقب میں آ گیا۔ شکاری احمقانہ حرکت کرتے ہوئے آپس میں گفتگو بھی کر رہے تھے اس طرح ہاتھی کو اپنا ہدف تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے یکایک ایک خوف ناک چنگھاڑ ماری۔ شکاری جو آپس میں محو گفتگو تھے گھبرا کر رائفلیں سنبھالنے لگے اور اس دوران میں ہاتھی نے بانس کے جھنڈ کو گرانا شروع کر دیا۔ مقامی گائیڈ عقل مند تھا۔ وہ پہلے ہی جھنڈ سے نکل بھاگا۔ اس نے سیدھا ایک اونچے اور مضبوط تنے والے درخت کا رخ کیا اور اس پر چڑھ گیا۔ اس کے عقب میں شکاریوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

ہاتھی نے شکاریوں کو بانسوں تلے دبا دیا اور خود ان پر چڑھ کر کودنے لگا۔ بانسوں کا بوجھ ہی کم نہیں تھا، ہاتھی بھی چڑھ گیا تو نیچے دبے شکاریوں کا کچومر نکل گیا۔ چند منٹ ان کی چیخیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جس میں صرف وحشی ہاتھی کی دھما دھم اور کبھی کبھار فاتحانہ چنگھاڑ سنائی دیتی تھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ بانسوں تلے انسان مر چکے ہیں تو اس نے تیسرے شکاری کا رخ کیا۔ گائیڈ اس بلند درخت پر بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہاتھی نے نیچے آ کر اتنی زبردست چنگھاڑ ماری کہ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ اپنا یہ حربہ ناکام ہوتے دیکھ کر مشتعل ہاتھی نے درخت کو ٹکر ماری اور پھر اس کے تنے کو سونڈ سے پکڑ کر ہلانے کی کوشش کرنے لگا مگر گائیڈ کی خوش قسمتی کہ یہ بے حد مضبوط تنے والا درخت تھا اس لیے ہاتھی اسے ہلانے میں ناکام رہا۔ جلد ہی ہاتھی کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طریقے سے اپنے تیسرے شکار کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ کچھ دیر درخت کے نیچے غصے سے چنگھاڑنے کے بعد اس نے تالاب کا رخ کیا اور پانی پی کر واپس جنگل کی طرف چلا گیا۔ گائیڈ ساری رات درخت پر بیٹھا خوف سے کانپتا رہا تھا۔

صبح جب روشنی ہوئی اور اس نے چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ قاتل ہاتھی دور دور تک نہیں ہے تو اس نے درخت سے چھلانگ لگائی اور سیدھا گاؤں کی طرف بھاگا۔ بانسوں کے جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک شکاری کی لاش دیکھی جو بالکل کچی زمین سے پیوست ہو گئی تھی۔ اس کی رائفل پاس پڑی تھی اور ہاتھی نے اسے بھی متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ گائیڈ نے نظر آنے والے پہلے فارم ہاؤس پر پہنچ کر دم لیا اور اس نے وہاں موجود افراد کو ہاتھی کی وحشت کا آنکھوں دیکھا حال سنایا تو ان میں بھی خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دوپہر تک یہ اطلاع تحصیل دار کے دفتر پہنچ گئی تھی اور محکمۂ جنگلات کو اس کے شکاریوں کی ہلاکت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ مقامی افراد سے کوئی بھی جائے وقوع پر جا کر شکاریوں کی لاشیں لانے کو تیار نہیں تھا اس لیے اگلے روز تحصیل دار کی طرف سے ایک پارٹی آئی اور اس نے بانسوں تلے دبی شکاریوں کی لاشیں نکالیں۔

ٹی اسٹیٹ میں ہاتھی کا خوف اس بری طرح پھیل گیا تھا کہ لوگوں نے چائے کے باغات میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خاص طور سے جو باغات ترائی کے جنگل سے جا ملتے تھے، ان کے مالکان یا منیجر وغیرہ بھی فارم خالی کر گئے تھے۔ علاقے کے واحد گاؤں کے مکینوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر حفاظتی انتظامات شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ گاؤں جنگل سے خاصے فاصلے پر تھا لیکن اس بات کا خدشہ بہر حال تھا کہ ہاتھی گاؤں تک نہ آ جائے۔ اس لیے انہوں نے گاؤں کے چاروں طرف نوکدار بانسوں کی باڑھ لگانی شروع کر دی۔ جس کے ساتھ خشک گھاس کا ڈھیر جمع کیا گیا تا کہ ہاتھی اس طرف آئے تو اسے آگ دکھا دی جائے۔ ہر جانور کی طرح ہاتھی بھی آگ سے ڈرتا ہے۔ اس کے علاوہ گاؤں میں جتنا بھی اسلحہ تھا وہ ہاتھی سے مقابلے کے لیے نکال لیا گیا۔ اس اسلحے میں ایک سو تین کی رائفل جو گاؤں کے نمبردار کے پاس تھی اس کے علاوہ دو پرانی ساخت کی بارہ بور کی رائفلیں تھیں اس اسلحے کے ساتھ کسی وحشی ہاتھی کا مقابلہ ممکن تو نہیں تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔

سامو جیپ چلاتے ہوئے مجھے ہاتھی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس وقت ہم گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر تھے جس سے ذرا آگے اسیڈن کا فارم ہاؤس تھا۔ سامو نے بتایا، ہاتھی نے آخری حملہ چار دن پہلے کیا تھا۔ اس نے ایک فارم ہاؤس پر حملہ کیا اور وہاں سوتے نگران کو بے خبری میں مار ڈالا۔ چالاک ہاتھی پودوں کو تیز ہوا سے بچانے کے لیے لگائے گئے اونچے درختوں کی آڑ میں آیا اور بے چارے بوڑھے کو ہلاک کر دیا۔

دن کا وقت تھا اس لیے گاؤں میں ذرا چہل پہل پائی

جاتی تھی کچھ بچے جیپ کے پیچھے دوڑے۔ سامو نے گاؤں کے پاس سے گزر کر جیپ اوپر واقع فارم ہاؤس کی طرف موڑ دی۔"یہ اسٹیڈن صاحب کا فارم ہاؤس ہے۔" سامو نے بتایا۔

یہ دو منزلہ مکان تھا جس کے اوپر حسبِ روایت سرخ کھپریل کی چھت تھی۔ مکان زیادہ تر لکڑی سے بنا تھا اور اس کی بنیادیں پتھر سے بنی تھیں۔ جب جیپ احاطے سے گزر کر بنگلے کی طرف بڑھی تو سامنے کئی افراد نظر آئے۔ سامو کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے اس نے جیپ روکتے ہوئے کہا "کوئی گڑبڑ ہے؟"

سامنے کھڑے افراد میں دو سفید فام اور باقی مقامی تھے۔ مجھے سیل نظر نہیں آیا۔ میری چھٹی حس خبردار کرنے لگی۔ مجھے دیکھ کر ایک سفید فام میری طرف لپکا "مسٹر جونی ریمنگٹن...... میں ردمیس اسٹیڈن ہوں۔ یہاں ایک اور حادثہ ہو گیا ہے۔"

میں جیپ سے اتر آیا "کیسا حادثہ مسٹر اسٹیڈن...... سیل کہاں ہے؟"

اسٹیڈن کا منہ لٹک گیا تھا۔ "حادثہ شاید سیل کے ساتھ پیش آیا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ کل صبح گواسی گیا تھا۔ یہ ٹی اسٹیٹ یہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ لیکن شام تک وہ وہاں نہیں پہنچا۔"

"یہ کیسے پتا چلا کہ سیل وہاں نہیں پہنچا۔"

"کیونکہ شام تک وہ شخص خود یہاں آ گیا تھا جس سے ملنے سیل کو جانا تھا۔ اس کے مطابق سیل دوپہر تک گواسی نہیں پہنچا تھا۔ وہ یہاں سے دس بجے روانہ ہوا تھا۔ پانچ گھنٹے میں تو آدمی پیدل وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔"

خبر واقعی تشویشناک تھی۔ میں اسٹیڈن کے ساتھ اندر آیا۔ اس کے ایک ملازم نے میرا سامان اتار کر اندر ایک آرام دہ اور سبے سجائے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس سے ملحق غسل خانے میں میرے لیے پانی رکھا تھا۔ نہا دھو کر جب میں باہر آیا تو کھانا میز پر سجا تھا۔ اسٹیڈن میرا میزبان باہر گیا ہوا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے باہر نکل کر دیکھا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ مسٹر اسٹیڈن سیل کی تلاش میں مقامی حکام سے بات کرنے گئے ہیں کیونکہ کوئی شخص ان کی تلاش میں جنگل میں جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک گھنٹے بعد اسٹیڈن واپس آیا اس نے بتایا "مقامی حکام نے ایک مسلح دستہ روانہ کیا جو گواسی جانے والے راستے پر سیل کی گاڑی کو تلاش کرے گا۔"

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ایک مسلح ملازم اس کے ساتھ بھیجا تھا۔" اسٹیڈن نے بتایا۔

سیل کے ساتھ جانے والا نیپالی گورکھا تھا۔ یہ لوگ کچھ پیدائشی جنگجو ہوتے ہیں۔ اس کے پاس طاقت ور رائفل تھی۔

شام چار بجے تک مسلح پولیس والوں کا ایک دستہ آ گیا۔ ان کے پاس تین سو تین کی رائفلیں تھیں۔ میں نے اسٹیڈن سے کہا۔ "میں بھی اس دستے کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ظاہر ہے تم اس ہاتھی کی سرکوبی کے لیے آئے ہو۔ تمہارا اس علاقے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ میں ابھی دستے کے انچارج سے بات کرتا ہوں۔"

دستے کا انچارج انسپکٹر رام کمار نامی نوجوان شخص تھا۔ اس کے ساتھ پانچ سپاہی تھے۔ اسٹیڈن نے اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ "یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہاتھی کے شکار کا ایک ماہر ہمارے ساتھ چلے گا۔"

"میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ ظاہر ہے میں انڈیا تفریحی سفر پر آیا تھا ہاتھی کا شکار کرنے نہیں، اس لیے کوئی رائفل بھی ساتھ نہیں تھی۔ ہانگ کانگ سے میں اپنا سامان براہِ راست جنوبی افریقہ روانہ کر چکا تھا۔ اسٹیڈن نے کہا کہ اس کے پاس ایک رائفل ہے۔ اس نے مجھے ونچسٹر کا ایک پرانا ماڈل دیا۔ اس میں تین گولیوں کا کلپ پڑتا تھا۔ میں نے سفاری کی ملازمت کے دوران دو تین بار اسے استعمال کیا تھا مگر مجھے یہ رائفل پسند نہیں آئی۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور نشانے میں زیادہ درستگی بھی نہیں تھی مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ پولیس جیپ میں زیادہ افراد کی گنجائش نہیں تھی اس لیے ایک پولیس مین کو وہیں چھوڑا گیا۔ اسٹیڈن نے کہا کہ وہ سامو کے ساتھ جیپ میں آئے گا لیکن انسپکٹر نے اسے منع کر دیا۔

"جناب...... ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔ ہاتھی نہ جانے کہاں ہے اس لیے کوئی شخص بھی بلاوجہ جنگل یا گھاس کی پٹی کی طرف نہ جائے۔"

پولیس کی طرف سے جنگل یا گھاس والے حصے کی طرف جانے کی ممانعت لاؤڈ اسپیکر پر کی جا رہی تھی تاکہ گاؤں اور علاقے کے لوگ جان جائیں۔ میں انسپکٹر کمار کی برابر والی نشست پر بیٹھا تھا۔ جیپ خود انسپکٹر کمار چلا رہا تھا اور رواں انگریزی میں بات کرتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا اس علاقے میں پہلے بھی ہاتھیوں نے انسانوں پر

حملے کیے ہیں؟''

اس نے جواب دیا ''ہر دوسرے تیسرے سال ہاتھی حملہ کرتے ہیں لیکن ایک آدھ بار ہی...... ابھی تک کسی ہاتھی نے اتنے تواتر سے حملے نہیں کیے۔ یہ پہلا موقع ہے جب اس علاقے میں ہاتھی انسانوں کے درپے ہوا ہے۔''

باغات کے درمیان سے گزر کر ہم جنگل والے حصے تک پہنچے۔ گواسی جانے والا راستہ اوپر جنگل سے گزرتا تھا۔ اس لیے ہم نے گھاس کی پٹی کی طرف جانے کے بجائے جنگل کا رخ کیا تھا۔ کچا راستہ سرخ مٹی سے بنا تھا اور گزشتہ کچھ عرصے سے بارش نہ ہونے کی وجہ سے زمین خشک ہوگئی تھی۔ جیپ چلنے سے مٹی اڑ رہی تھی۔ ہوا ساکت تھی۔ یہ اچھی بات تھی اگر ہوا چل رہی ہوتی تو ہوا میں بو ہونے سے ہاتھی ہوشیار ہوسکتا تھا۔ جنگل کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم ہوشیار ہوگئے تھے۔ میں نے انسپکٹر سے کہا۔

''اپنے آدمیوں کو سمجھاؤ۔ اگر ہاتھی سے سامنا ہوجائے تو کوئی عجلت میں فائر نہ کرے ورنہ ہاتھی مشتعل بھی ہوسکتا ہے۔ تین سو تین کی گولی اس پر اتنی مؤثر ثابت نہیں ہوگی۔''

انسپکٹر نے سر ہلایا اور اپنی زبان میں سپاہیوں کو سمجھانے لگا۔ جنگل کے وسط سے گزرنے والی یہ سڑک کوئی بارہ کلومیٹر طویل تھی لیکن گواسی جانے والا راستہ بیچ سے گھوم جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی وادی تھی جس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں چائے کی کاشت کے لیے بے حد موزوں تھیں۔ ہم گواسی جانے والے راستے تک پہنچ گئے لیکن سیل کی گاڑی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔

''ایسا لگتا ہے ان کی گاڑی کسی کھائی میں گرگئی ہے۔''

یہ سن کر میرا دل شدتِ غم سے جکڑنے لگا۔ میرا پیارا دوست اور مہربان سیل اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے برابر سے گزرتی جھاڑیوں میں سفید رنگ کی کوئی شے کی جھلک نظر آئی۔ میں نے چلا کر کمار سے کہا ''گاڑی روکو...... اس طرف جھاڑیوں میں کچھ ہے۔''

انسپکٹر کمار نے بریک لگائے۔ میں جیپ سے کود کر اس طرف جھپٹا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ یہ سفید رنگ کی فورڈ کار تھی۔ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ بونٹ پچک گیا تھا۔ چھت بیٹھ گئی تھی۔

''ہاتھی کے پیر کے نشان۔'' انسپکٹر کمار نے چلا کر کہا۔ آگے راستے پر ہاتھی کے پیروں کے نشان واضح تھے۔ تباہ شدہ کار خالی تھی۔ سیل یا اس کے گورکھا محافظ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کار سے آگے گھاس اور جھاڑیاں بری طرح مسلی ہوئی تھیں۔

ہم ان مسلی ہوئی جھاڑیوں پر آگے بڑھنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ سیل کا سامنا اچانک ہاتھی سے ہوا اور بدحواسی میں کار سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ کار کے رکتے ہی ہاتھی اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ کار سے نکل بھاگے تھے اور کار پر اپنا غصہ اتارنے کے بعد ہاتھی ان کے تعاقب میں گیا تھا۔ ایک پانچ سو رائفل کار کے اندر پڑی تھی۔ گورکھے کو اسے استعمال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اسے کار میں ہی چھوڑ بھاگا تھا۔

میں خود کو کسی اندوہناک منظر کے لیے تیار کرنے لگا۔ مسلی ہوئی گھاس اور جھاڑیوں کی رہنمائی میں گزرتے ہوئے سپاہی بے حد خوف زدہ تھے۔ ان کی نگاہیں چاروں طرف مرکوز تھیں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ آپس میں بات نہ کریں اور چلتے ہوئے کوشش کریں کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ اس لیے وہ اور بھی محتاط تھے۔ سب سے آگے میں تھا۔ ذرا پیچھے انسپکٹر کمار تھا۔ میں نے اسے دائیں طرف نظر رکھنے کو کہا اور خود بائیں طرف کا خیال رکھ رہا تھا۔ سپاہیوں سے کہا تھا کہ وہ عقب پر دیکھتے رہیں کیونکہ ہاتھی مکاری سے حملہ کرنے میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ اپنے بے پناہ جثے اور وزن کے باوجود یہ اتنی خاموشی اور انسان کی بے خبری میں آتا ہے کہ جب تک خود ہوشیار نہیں کرتا پتا نہیں چلتا ہے۔

جلد میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ایک ذرا کھلی جگہ گورکھے کی لاش پہلے نظر آئی۔ ہاتھی نے صرف پاؤں رکھ کر اس کا سینہ پچکا دیا تھا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ لاش کی حالت سے لگ رہا تھا کہ گورکھے کو مرتے وقت زیادہ تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں اور دل میں گھس جانے سے اس کی فوری موت واقع ہوگئی ہوگی۔ اس کا مسالا ہونے سے یوں بچ گیا تھا کہ اس سے آگے ہاتھی سیل کے تعاقب میں روانہ ہوگیا تھا۔ سیل کو اس نے اونچی گھاس کے ایک چھوٹے ٹکڑے میں جالیا تھا۔ سیل غلطی سے اس میں جا چھپا تھا ورنہ وہ ذرا سی عقل سے کام لیتا تو کبھی اس گھاس میں نہ گھستا۔ اس میں جا کر آدمی پھنس جاتا ہے۔ اس غلطی کی وجہ سے ہاتھی نے اسے جالیا تھا ورنہ اس سے ذرا آگے اونچے اور گھنے درختوں کا ایسا جھنڈ تھا جس میں ہاتھی نہیں گھس سکتا تھا۔ گھاس کے ٹکڑے سے یہ جھنڈ مشکل سے دس گز کے فاصلے پر تھا۔

سیل کی کچلی مسلی لاش گھاس کے عین وسط میں تھی۔ اپنے دوست کی لاش دیکھ کر میری آنکھوں تلے چند لمحے کو اندھیرا سا چھا گیا تھا پھر اس قاتل ہاتھی کے لیے میرے اندر غم و غصہ

بھرنے لگا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ رائفل لے کر جنگل میں گھس جاؤں اور اسے تلاش کرکے ہلاک کر ڈالوں مگر یہ صرف جذباتی سوچ تھی۔ اس مکار حیوان کو ہلاک کرنے کے لیے ایک مکمل منصوبے کے ساتھ ہوشیاری اور مستعدی کی ضرورت بھی تھی۔ میں سیل کی لاش کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس بے چارے کے جسم کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ ہو جو وحشی ہاتھی کے پیروں تلے روندے جانے سے محفوظ رہا ہو۔ اس نے سیل کی بوٹیاں تک چور چور کردی تھیں۔ انسپکٹر کی ہدایت پر سپاہی جا کر جیپ سے چادر لے آئے اور پھر اس میں سیل کی لاش لپیٹ کر لے گئے۔ اس کے گورکھے ملازم کی لاش بھی اٹھالی گئی تھی۔
اب مسئلہ یہ تھا کہ لاشوں کے بعد جیپ میں اتنی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سب جاسکتے۔ اس لیے انسپکٹر نے دو سپاہیوں سے کہا کہ وہ یہاں رک کر انتظار کریں۔ وہ لاشیں چھوڑ کر انہیں آ کر واپس لے جائے گا۔ یہ سن کر سپاہیوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ ہاتھی کے خوف سے وہ رکنے کو تیار نہیں تھے۔ میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں نے انسپکٹر کمار سے کہا ”میں ایک سپاہی کے ساتھ رک جاتا ہوں۔“

پہلے تو انسپکٹر کمار نے انکار کیا لیکن پھر میرے اصرار پر مان گیا۔ تین میں سے ایک سپاہی بھی رکنے کو تیار ہوگیا تھا۔ انسپکٹر کمار لاشیں لے کر روانہ ہوگیا اور میں نے دوبارہ نچلے حصے کا رخ کیا۔ سب سے پہلے اس جگہ کو دیکھا جہاں گورکھے کی لاش پڑی تھی اس جگہ نرم زمین پر ہاتھی کے قدموں کے نشان واضح تھے۔ پہلی بات میں نے یہ نوٹ کی کہ اس ہاتھی کے پاؤں غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ ان کا قطر بارہ انچ کے قریب تھا بہت بڑے جثے والے ہاتھی کا پاؤں ہی اتنا بڑا ہوتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہاتھی کوئی گیارہ فٹ اونچا اور چھ سے سات ٹن وزنی ہوگا۔ یہ سب پیمانے ایک عام ہاتھی سے زیادہ تھے۔

داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے میں قارئین کو ذرا ہاتھی کے بارے میں بتادوں۔ ہاتھی دودھ پلانے والے جانوروں کی نسل سے ہے۔ اس کی اوسط عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ یعنی انسان کی اوسط عمر کے برابر۔ مگر بعض ہاتھی اسی برس تک بھی زندہ رہتے ہیں۔ ہاتھی اس لحاظ سے خوش قسمت جانور ہے کہ اسے شاذ ہی کوئی بیماری ہوتی ہے۔ ہاں آخر عمر میں اسے دل کی بیماری ہوجاتی ہے۔ دراصل ہاتھی ان جانوروں میں سے ہے جو ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں، اس لیے ان کے دل کے لیے بھی کام بڑھتا رہتا ہے۔ اور بالآخر دل جواب دے جاتا ہے۔ انسان کے علاوہ ہاتھی کو بھی ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ ایک ہاتھی دن بھر میں پچاس سے نوے کلو گرام چارہ کھاتا ہے۔ اس کی خوراک میں پتے اور نرم شاخیں شامل ہیں۔ یہ جنگلی پھل اور گھاس بھی شوق سے کاتا ہے۔ اگرچہ ایشیائی ہاتھی کو خوراک کے وافر ذرائع میسر ہیں لیکن افریقی ہاتھی نسبتاً زیادہ کھاتا ہے۔ دراصل اسے اپنی خوراک کے لیے زیادہ چلنا پھرنا پڑتا ہے اس لیے بھوک بھی زیادہ لگتی ہے اور وہ زیادہ کھاتا ہے۔ ہاتھی کئی دن پیاسا رہ سکتا ہے اور جب پانی پینے کا موقع ملے تو ایک وقت میں سو لیٹر سے زیادہ پانی پی جاتا ہے۔ یہ سونڈ سے پانی نہیں پی سکتا لیکن سونڈ سے ہی پانی پیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سونڈ میں پانی بھر کر منہ میں ڈالتا ہے۔ اس کی سونڈ میں بیک وقت کئی گیلن پانی آ جاتا ہے۔ مادہ ہاتھی دو سال تک بچے کو پیٹ میں رکھ کر جنم دیتی ہے۔ اس کا بچہ پیدائش کے وقت سو کلوگرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ یوں ہاتھی کو بلو وہیل کے بعد سب سے وزنی بچہ پیدا کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ہاتھی کا بچہ چند مہینوں میں کھانا پینا شروع کردیتا ہے۔ کیونکہ مادہ ہاتھی اپنے بے پناہ جثے کے باوجود دودھ دینے کے معاملے میں کسی بھی دودھ دینے والے جانور سے گئی گزری ہوتی ہے۔ ہاتھی کی مادہ وزن کے اعتبار سے سب سے کم دودھ دینے والا جانور ہے۔ اتنے دودھ میں اس کے بچے کا بھلا نہیں ہوتا اس لیے اس بے چارے کو خاصی کم عمری میں کھانا پینا شروع کرنا پڑتا ہے۔

ڈائنوسورس کے زمانے کے ایک جانور رینو سار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتھی کے آبا و اجداد تھے۔ ان کی صورت ہاتھی سے نہیں ملتی تھی اور یہ جسامت میں بھی آج کے ہاتھی سے نہیں بڑا ہوتا تھا۔ موجودہ ہاتھی کے آثار ہمیں رکاز کی صورت میں تین لاکھ سال پہلے کے ملتے ہیں۔ گویا ہاتھی نے ارتقائی منازل طے کرکے موجودہ صورت کوئی تین لاکھ سال پہلے اختیار کی تھی۔ اس کی ایک درمیانی کڑی میں ہاتھی موجودہ ہاتھی سے ملتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے موجودہ دو دانتوں کی جگہ ایک واحد بیلچہ نما دانت تھا جس سے یہ اپنے دشمن کو خود سے دور رکھتا تھا مگر اس بیلچہ نما دانت کی وجہ سے اسے کھانے پینے میں بے پناہ دشواری پیش آتی تھی۔ قیاس ہے کہ ضرورت کے تحت یہ بیلچہ نما واحد دانت ہاتھی کے باہر کی طرف نکلے دو دانتوں میں بدل گیا۔ اس طرح اسے نہ صرف کھانے پینے میں آسانی ہونے لگی بلکہ یہ دو نوکیلے دانت دشمنوں کے خلاف اس کا مؤثر ہتھیار بن گئے۔

جدید دور میں ہاتھی کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ ایک افریقی ہاتھی اور ایک ایشیائی ہاتھی۔ افریقی ہاتھی تقریباً پوری

مشرقی ساحلی پٹی میں گھاس کے میدانوں اور برساتی جنگلات تک پایا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں افریقہ میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے بھی زیادہ تھی لیکن بے پناہ شکار کی وجہ سے ان کی تعداد گھٹ کر محض ساٹھ ہزار رہ گئی ہے۔ دوسری قسم یعنی ایشیائی ہاتھی تعداد میں اور بھی کم رہ گئے ہیں۔ ایک زمانے میں یہ ویت نام سے لے کر انڈیا میں ہمالیہ کی ترائی تک بکثرت پائے جاتے تھے۔ برما اور آسام ان کا گھر تھے۔ لیکن بڑھتی ہوئی انسانی آبادیوں نے ان کے قدرتی مسکن تباہ کردیے اور انہیں پکڑ کر مختلف کاموں کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جس کے بعد ان کی تعداد میں خاصی کمی آگئی ہے۔ افریقی اور ایشیائی نسلوں میں خاص فرق نہیں ہے۔ ایشیائی ہاتھی کے کان اور دانت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ گھنے جنگلات میں رہتے ہیں جہاں بڑے دانت اور کان مسئلہ بن جاتے ہیں اس لیے ارتقائی مراحل میں ان کے کان اور دانت افریقی ہاتھی سے چھوٹے رہ گئے جسے افریقہ کا کھلا اور وسیع ماحول ملا تھا۔ اوسط وزن اور قدوقامت میں، میں نے افریقی ہاتھی کو نسبتاً بڑا پایا ہے لیکن بعض ایشیائی ہاتھی اچھی خوراک اور طویل عمر کی وجہ سے بہت قدوقامت حاصل کرلیتے ہیں۔

ان دونسلوں کے علاوہ آج سے چند ہزار سال پہلے تک ہاتھی کی ایک اور قسم بھی پائی جاتی تھی جسے میمتھ (بال دار ہاتھی) کہتے ہیں۔ زمین پر ہر دس سے بارہ ہزار سالوں میں برفانی دور آتا ہے جس میں پورا نصف شمالی کرہ برف سے ڈھک کر رہ جاتا ہے اور بے پناہ سردی پڑتی ہے۔ یہ دور بعض اوقات ہزار سال تک جاری رہتا ہے۔ صرف افریقہ اور آسٹریلیا کی سرزمین اس برفانی دور سے محفوظ رہتی ہے۔ افریقہ میں پائے جانے والے ہاتھی اس آفت سے محفوظ رہے لیکن شمال میں پائے جانے والے میمتھ اس برف باری سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بے پناہ برف اور سردی نے ان کی خوراک کے سارے ذرائع ختم کردیے اور چند سالوں کے اندر شمال پر راج کرنے والا یہ دیوقامت جانور صفحۂ ہستی سے نابود ہوگیا تھا۔ آج سائبیریا میں اس کے بچے کچے آثار ملتے ہیں جہاں یہ ہزاروں سال سے برف میں دبے محفوظ رہے۔ ان کے پورے پورے سالم جسم بھی برآمد ہوئے جو آج کل دنیا کے کئی زولوجیکل میوزیم میں رکھے ہیں۔ میمتھ حیرت انگیز طور پر بیس سے پچیس فٹ اونچے ہوا کرتے تھے۔ ان کے جسم پر دو فٹ سے بھی زیادہ لمبے گھنے بال ہوتے تھے جو انہیں شمال کی بے پناہ سردی سے محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اپنے زمانے میں یہ زمین پر پایا جانے والا سب سے بڑا جانور تھا۔ اس کے کئی میٹر طویل دانت ایک ٹن سے بھی زیادہ وزنی ہوا کرتے تھے۔ ایک عام میمتھ کا وزن پچیس سے تیس ٹن ہوا کرتا تھا۔ یعنی آج کے ایک عام ہاتھی سے سات آٹھ گنا زیادہ...... برف باری کے دور کے خاتمے پر (اندازاً آج سے بارہ ہزار سال پہلے) صرف افریقی ہاتھی باقی بچے تھے پھر یہ ہاتھی نسل بڑھاتے ہوئے ایشیا تک آگئے۔ بعد میں جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے ایشیا اور افریقہ میں آمدورفت ممکن نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے دونوں نسلیں جداگانہ خصوصیات کی حامل ہوگئیں۔

میرے ساتھ رہ جانے والا سپاہی گہرے سانولے رنگ کا نوعمر لڑکا تھا وہ خوف زدہ تھا لیکن بے خوف نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اردگرد نظر رکھے اور کوئی خطرہ محسوس کرے تو بے آواز طریقے سے مجھے خبردار کرے۔ میں ہاتھی کے پیروں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ آخر ایک جگہ مجھے مطلب کے نشان نظر آگئے۔ میں ہاتھی کے چاروں پیروں کے نشان ایک جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس جگہ ہاتھی کے چاروں پیروں کے نشان بالکل واضح تھے۔ یہ چاروں نشان یکساں تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہاتھی کو کوئی ایسا زخم نہیں تھا جس سے اس کی چال متاثر ہوتی۔ عام طور سے سر اور سونڈ کے علاوہ ہاتھی کے جسم پر کہیں زخم آجائے تو اس کی چال میں فرق آجاتا ہے کیونکہ چلتے ہوئے ہاتھی کا پورا جسم حرکت کرتا ہے۔ میں نے اس کے دوڑتے قدموں کے نشانات دیکھے۔ دوڑتے ہوئے ہاتھی کے پچھلے قدموں کے ناخن زمین میں گہرے لگتے ہیں اور ان کے نشانات واضح ہوجاتے ہیں۔ قدموں کے درمیان فرق سے واضح تھا کہ ہاتھی جوانی کی عمر میں ہے، بوڑھا ہوجانے پر ہاتھی زیادہ بڑے قدم نہیں اٹھا پاتا ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ انسپکٹر کمار کو سیل اور گورکھے محافظ کی لاشیں چھوڑ کر آنے میں کم سے کم ایک گھنٹا لگے گا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے اور چھ بجے تک سورج غروب ہوجاتا اور اس کے بعد پہاڑی علاقوں میں بڑی تیزی سے اندھیرا ہوتا ہے۔ روشنی میں اتنا خطرہ نہیں تھا۔ ہاتھی زیادہ تر سورج ڈوبنے کے بعد ہی اپنے ٹھکانے سے باہر آتا تھا۔ اچانک میرے سپاہی نے دبی آواز میں پکارا "صاحب...... لُک ہیر"

میں نے دیکھا دور جھاڑیاں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے کوئی بڑا جانور اوپر کی طرف آرہا ہو۔ میں نے اندازہ لگایا یہ وہی ہاتھی ہوسکتا تھا۔ میں نے اشارے سے سپاہی کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور خود تیزی سے درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا جس میں پناہ لینے کے لیے سیل بھاگا تھا۔ گھاس کے قطعے

کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے سیل کے خون کے دھبے نظر آئے تو مجھے ہاتھی پر طیش آنے لگا۔ سیل کی یاد ہوک بن کر میرے دل میں اٹھنے لگی۔ ایک مہینے بعد اسے انگلینڈ جانا تھا جہاں اس کے ماں باپ تھے۔ نہ جانے ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ سیل کی بیوی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے سیل کی موت کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوگا۔

جلد ہم درختوں کے اس جھنڈ تک جا پہنچے۔ قریب جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اتنے محفوظ درخت بھی نہیں تھے۔ اگر ہاتھی آ جاتا تو وہ ان درختوں میں بھی گھس سکتا تھا۔ اپنی لمبی سونڈ سے بھی کام لے سکتا تھا۔ میں نے ایک بلند مضبوط اور آسانی سے چڑھے جانے والے درخت کا انتخاب کیا اور نوعمر سپاہی کو اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا اس نے بڑی پھرتی دکھائی اور منٹ سے پہلے پندرہ سولہ فٹ بلند ایک شاخ پر پہنچ گیا۔ میں خود ایک تنے کی آڑ میں ہو کر ہلتی جھاڑیوں کو دیکھنے لگا جہاں سے کبھی کبھی ہاتھی کے سر اور اس کے ہلتے کانوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں نے ایک بار زمین سے مٹی اٹھائی اور اسے ہاتھ بلند کرکے آہستہ آہستہ چھوڑنے لگا۔ مٹی ہلکی سی جنوب سے شمال کی طرف گر رہی تھی اور ہاتھی بھی جنوب سے برآمد ہو رہا تھا یعنی اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ ہاتھی ہماری بو پا سکے۔ ہاتھی کی نظر کمزور ہوتی ہے پھر بھی میں ایک ایسے درخت کی آڑ میں ہو گیا جو اوپر سے بے حد گھنا تھا اور اس کے نیچے نیم تاریکی تھی۔

جھاڑیاں اس جھنڈ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھیں درمیان میں ہلکی گھاس اور چھوٹے پودوں کا ایک علاقہ تھا۔ میں نے رائفل چیک کی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہاتھی سے دو دو ہاتھ کرنے ہی پڑے تو یہ رائفل کس قدر کارآمد رہے گی۔ جواب حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اس رائفل... کی گولی زیادہ وزنی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ بڑے جانوروں کے شکار کے لیے زیادہ کارآمد نہیں تھی۔

معاً سامنے والی جھاڑیاں پھٹیں اور ان میں سے ایک قوی ہیکل ہاتھی برآمد ہوا۔ بلاشبہ وہ گیارہ فٹ اونچا تھا۔ اس کے چھوٹے کان مسلسل پنکھے کی طرح ہل رہے تھے اور سرخ آنکھیں بے چینی سے ہر طرف نگراں تھیں۔ اس کے دانت بے حد سفید اور لمبائی میں افریقی ہاتھی سے کم تھے لیکن ایک ایشیائی ہاتھی کی نسبت لمبے تھے۔ اس وقت میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے ہاتھی کو رائفل سے شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب میں ہاتھی کے ذرا آگے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پچاس گز کی دوری سے میں اس کی آنکھ میں گولی اتار سکتا تھا مگر وہ آگے آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بدستور جھاڑیوں میں جھانک رہا تھا۔ غالباً اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ یہاں اس کے لیے خطرہ ہے۔

اچانک وہ واپس جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس بار وہ جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا شمال کی طرف جا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا اس نے ہماری بو محسوس کر لی تھی مگر کیسے، جبکہ ہوا اس کے رخ سے ہمارے رخ پر چل رہی تھی۔ زولوجیکل کی ڈگری لیتے وقت میں نے ایشیائی ہاتھی کے بارے میں تفصیل سے پڑھا تھا۔ یہ ہوا کے رخ پر تین میل دور سے آنے والی بو سونگھ لیتا ہے۔ اب مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اگر مکار جانور ہماری موجودگی کو بھانپ گیا تھا تو اب کسی اور زاویے سے حملہ کرنے جا رہا تھا۔ عقب سے آ کر ہمیں بے خبری میں گھیرنا چاہتا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اس طرف ٹیلے تھے اور گھنے درخت بھی۔ ہاتھی کسی طرف سے بھی نمودار ہو سکتا تھا۔ میں نے سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ بلندی سے ذرا عقبی سمت نظر رکھے۔ اسی لمحے ہاتھی کی زبردست چنگھاڑ سنائی دی۔ چنگھاڑ پاس سے ہی آئی تھی۔ جس طرف سے ہم آئے تھے۔ اس کی چنگھاڑ میں غصہ اور نفرت تھی۔ غالباً اس نے ہماری بو محسوس کر لی تھی۔ فوراً اس کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ میں درخت کی طرف بھاگا۔ جب میں تنے پر چڑھ رہا تھا تو ہاتھی نمودار ہوا۔ وہ ست انداز میں دوڑتا درختوں کے اس جھنڈ کی طرف آ رہا تھا۔ سپاہی چلا چلا کر مجھے جلدی سے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا حالانکہ مجھے فوری خطرہ نہیں تھا۔ یہ درخت اندر کی جانب تھا اور ہاتھی کا یہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔ یہ بات ہاتھی نے محسوس کر لی تھی۔ وہ درختوں کے جھنڈ کے پاس آ کر رکا۔ اس نے ایک اور زبردست چنگھاڑ ماری اور جھنڈ میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت تک میں اوپر چڑھ چکا تھا۔ رائفل میرے شانے سے لٹکی ہوئی تھی۔

ابھی میں خود کو شاخوں کے درمیان سیٹ کر رہا تھا کہ فائر کی آواز سن کر اچھل گیا اور نیچے گرتے گرتے بچا۔ سپاہی نے اپنی رائفل سے ہاتھی پر فائر کر دیا تھا۔ گولی اس کے جسم کے اگلے حصے میں لگی تھی۔ تکلیف سے بلبلا کر ہاتھی نے ایسی چنگھاڑ ماری کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ پھر اس نے شدت سے درخت کو ٹکر ماری۔ درخت ہل کر رہ گیا تھا۔ میں ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔ سپاہی دہشت کے عالم میں ایک کے بعد ایک فائر کرتا رہا اور اس نے ہاتھی کے جسم میں تین سو تین کی کئی گولیاں اتار دی تھیں۔ گولیاں کھا کر وہ چنگھاڑتا پیچھے ہٹا اور جھنڈ سے نکل گیا۔ میں کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔ اتنے پاس سے ہاتھی پر فائر کرنے کا سنہری موقع ملا تھا جو خوف زدہ سپاہی

نے اپنی حماقت سے گنوا دیا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے اور رائفل آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ جب تک میں سنبھلتا ہاتھی جھنڈ سے باہر جا چکا تھا اور اس وقت نظروں سے اوجھل تھا۔ لیکن اس کی کرب اور غصے میں ڈوبی چنگھاڑیں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جھنڈ کے آس پاس ہی تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر جھنڈ میں گھسنے کی کوشش کرے اور میں اسے اپنی رائفل سے نشانہ بناؤں۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ انسپکٹر کمار کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور وہ اس وقت آ جاتا تو مشتعل ہاتھی اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ تین سو تین کے کارتوس نے اسے زخمی کیا تھا لیکن خاص نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ یہ میرا بارہا کا تجربہ رہا ہے جہاں ہاتھی کو کوئی کاری زخم لگتا ہے، وہ فوراً پسپائی اختیار کر کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس ہاتھی کے گولی کسی نازک جگہ لگی ہوتی تو یہ اپنے ٹھکانے کا رخ کر چکا ہوتا۔ وہ بدستور یہیں چنگھاڑ رہا تھا لیکن تمام تر غصے کے باوجود اس نے دوبارہ اس جھنڈ میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ بلندی سے اور دوسرے درختوں کی وجہ سے وہ نظروں سے غائب تھا۔ کبھی کبھی اس کی ایک جھلک سی نظر آتی تھی لیکن اسے نشانہ بنانے کے لیے یہ جھلک ناکافی تھی۔ دس پندرہ منٹ وہ جھنڈ کے آس پاس ادھم مچاتا رہا پھر اس کی چنگھاڑیں بتدریج نشیب کی طرف جاتی محسوس ہوئیں اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گئیں۔ اس کے باوجود ہم خاصی دیر تک درختوں پر بیٹھے رہے پھر سپاہی لڑکا ہمت کر کے نیچے اترا۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا پھر مجھے اشارے سے نیچے بلایا اور اپنی زبان میں سمجھانے لگا کہ ہاتھی جا چکا ہے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔

اگرچہ ہاتھی کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس مکار جانور کا بھروسا بھی نہیں تھا کہ کہیں کسی جگہ چھپ کر ہمارے جھنڈ سے باہر آنے کا انتظار نہ کر رہا ہو۔ میں نے سپاہی سے کہا کہ وہ یہیں رکے۔ میں کچی سڑک تک جاتا ہوں اور اس دوران میں وہ نیچے سے ہاتھی کو آتا دیکھے تو ہوائی فائر کر کے مجھے خبردار کر دے۔ زبان کے مسئلے کی وجہ سے اسے اپنی بات سمجھانے میں ذرا مشکل پیش آئی تھی۔ میں اوپر کچی سڑک کی طرف گیا۔ خوش قسمتی سے انسپکٹر کمار ذرا تاخیر سے آیا تھا ورنہ اس کا سامنا مشتعل ہاتھی سے ہو جاتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آتی۔ جھنڈ میں چھپے سپاہی کو لے کر ہم واپس گاؤں آ گئے۔ سیل اور گورکھے کی لاش ضروری کارروائی کے لیے نزدیکی اسپتال کی طرف روانہ کی جا چکی تھی۔ اسٹیڈن اپنے باس کی موت پر بے حد آزردہ تھا۔ رات کھانے پر اس نے مجھ سے کہا کہ وہ ہر صورت اس عفریت کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔

''مسٹر ریمنگٹن پلیز ہماری مدد کریں۔''

اس دوران میں، میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسٹیڈن سے کہا ''مسٹر اسٹیڈن! مجھے خود بھی مسٹر سیل کی موت کا بے حد دکھ ہے اور میں اس ہاتھی کو مارنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس مقصد کے لیے مجھے دو عدد چار سو یا پانچ سو کی رائفلیں چاہئیں اور ایک اسلحے کا ماہر اور دلیر آدمی درکار ہے۔''

''بس یہ چیزیں۔'' اسٹیڈن نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا ''ان کا انتظام میں کل ہی کر دوں گا۔''

اگلے روز جب میں ناشتے سے فارغ ہو کر نیچے آیا تو اسٹیڈن ایک شخص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے نقوش کچھ چینی تھے۔ میں نے اسٹیڈن سے رائفلوں کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''رائفلیں آج دوپہر تک آ جائیں گی۔ ان سے ملو یہ ہے راجا بہادر...... میں نے اسے خاص طور پر اس مہم پر تمہارا ساتھ دینے کے لیے بلایا ہے۔''

راجا بہادر گورکھا تھا۔ عمر چالیس سال تھی۔ جسم دبلا لیکن گٹھا ہوا اور چہرے پر تجربہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ مزید اچھی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان سے واقف تھا۔ راجا بہادر اس سے پہلے بھی شکاریوں کے ہمراہ جاتا رہا تھا اور اسے جانوروں سے نمٹنے کا خوب تجربہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اس مہم میں میرا پورا ساتھ دے گا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا وہ رائفلیں تیزی سے لوڈ کرنا جانتا ہے؟'' اس نے جواب دیا۔

''صاحب ابھی رائفلیں آ جائیں تو میں آپ کو عملی طور پر دکھاتا ہوں۔''

اسٹیڈن نے باہر سے رائفلیں منگوائی تھیں جو دوپہر تک اس کے فارم پر پہنچ گئیں۔ اس کے اہلِ خانہ ہاتھی کے حملوں کے بعد شہر چلے گئے تھے۔ اس لیے میں نے بے فکری سے مکان کے عقبی حصے میں ان رائفلوں کی جانچ کی۔ یہ طاقت ور رائفلیں شاندار حالت میں تھیں اور ان کی گولی کی طاقت اتنی تھی کہ فٹ بھر موٹی کنکریٹ کی دیوار کے پار ہو جاتی تھی۔ ہاتھی جیسے بڑے جانور کے لیے یہ نہایت موزوں تھی۔ پھر میں نے راجا سے کہا کہ وہ رائفل لوڈ کر کے دکھائے۔ اس نے محض دس سیکنڈ میں ان لوڈ رائفل لوڈ کر دی۔ لیکن ہاتھی کے شکار کے جاں گسل لمحات میں یہ وقت بھی زیادہ تھا۔ میں نے اس سے کہا ''اپنی رفتار تیز کرو اور ہاتھ میں اتنی صفائی لاؤ کہ

رائفل لوڈ کرتے وقت ذرا سی غلطی نہ ہو۔''

''آپ مجھے صرف دس گھنٹے دیں۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا ''کل میں آپ کو بالکل تیار ملوں گا۔''

اس پورا دن اور پھر آنے والی رات میں بھی راجا بہادر رائفلوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔ اگلی صبح اس نے مجھے صرف سات سیکنڈ میں ایک رائفل لوڈ کر کے دکھائی۔ مسلسل مشق سے اس کے ہاتھوں میں ایسی مشاقی آ گئی تھی کہ اس کی انگلیاں رائفل کے ساتھ رقص کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ اپنے نشانے، راجا کی پھرتی اور رائفلوں سے مطمئن ہو کر میں نے دس بجے گھاس والے میدان کا رخ کیا۔ سامو جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ دو دن گزرنے کے بعد ہاتھی ضرور گھاس سے باہر آئے گا۔ سامو کو میں نے اس ہدایت کے ساتھ باغات کے کنارے پر چھوڑا کہ وہ خطرہ دیکھے تو فوراً واپس چلا جائے۔ اس نے کہا۔

''صاحب میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

میں اور بہادر رائفلیں لیے ترائی کی طرف روانہ ہوئے۔ میں جان بوجھ کر کھلے علاقوں سے گزر رہا تھا تا کہ ہاتھی اگر اس طرف نگران ہو تو دیکھ لے۔ یہ حربہ اگرچہ بے حد خوف ناک تھا۔ اس میں خود میری اور راجا بہادر کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا مگر اس ہاتھی کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچانے کا یہ واحد راستہ تھا۔ ہماری بو پا کر یا دیکھ کر وہ گھاس سے باہر آتا اس صورت میں ہم اسے شکار کر سکتے تھے۔ ہاتھی کے خوف سے جنگل اور گھاس والی پٹی میں لوگوں کی آمد و رفت بالکل بند تھی اس لیے ہاتھی کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔ ترائی میں گھاس کی پٹی کے ساتھ خشک ندی کا کنارہ تھا۔ تقریباً سو گز طویل اس پٹی پر زیادہ تر ریت تھی یا معمولی درجے کے پودے لگے تھے جو دور تک دیکھنے میں رکاوٹ نہیں بن رہے تھے۔ میں اور راجا بہادر اسی پٹی پر جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ہم اونچی آواز میں بات کرتے جا رہے تھے تا کہ ہاتھی پاس ہو تو ہماری آواز سن لے۔ ہاتھی کی سماعت گینڈے جتنی تیز تو نہیں ہوتی ہے لیکن یہ خاصی دور کی آوازیں بھی سن لیتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہاتھی وہ آواز بھی سن لیتا ہے جو انسانی کان نہیں سن پاتے ہیں۔

بظاہر بے پروائی سے بلند آواز سے باتیں کرتے جاتے ہوئے ہم پوری طرح چوکس تھے۔ میں سامنے اور راجا بہادر عقب میں نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہم ایسی جگہوں سے دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں ہاتھی جیسے جثے کے کسی جانور کے روپوش رہنے کی گنجائش ہو۔ میری نظر زمین پر بھی تھی۔ کئی جگہوں پر مجھے ہاتھی کے پیر کے نشان نظر آئے تھے لیکن یہ کئی دن پرانے تھے۔ تازہ نشان کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہاتھی زخمی ہونے کے بعد اپنی پناہ گاہ سے باہر نہیں آیا تھا۔ لیکن پانی کے لیے اسے جلد یا بدیر باہر آنا ہی تھا۔ اوپر جنگل میں پانی کے سارے ذرائع خشک ہو گئے تھے۔ صرف ترائی کی جھیل تھی جہاں ہاتھی جیسا بڑا جانور اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔ میں نے راجا بہادر سے کہا ''میرا خیال ہے ہمیں جھیل کی طرف جانا چاہیے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' راجا بہادر نے میری تائید کی ''زخمی ہو کر وہ.... پیاس محسوس کر رہا ہوگا۔ پانی کے لیے اسے لازماً جھیل کا رخ کرنا پڑے گا۔''

مگر جب ہم جھیل کے کنارے پہنچے تو معلوم ہوا ہاتھی رات یا صبح سویرے کسی وقت وہاں آ کر جا چکا ہے۔ اس کے پیروں کے نشانات بالکل واضح تھے۔ گزشتہ روز ہاتھی نے چائے کے باغات کا رخ نہیں کیا تھا یعنی وہ اپنے زخم مندمل ہونے کے انتظار میں تھا تا کہ دوبارہ اپنی غارت گری کا آغاز کر سکے۔ ہاتھی عام طور سے دوپہر یا سہ پہر کے وقت پانی پیتا ہے لیکن یہ مکار جانور صبح سویرے اپنی پیاس بجھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اب امید تھی کہ ہاتھی گھاس کے میدان سے باہر آئے۔ اس کے باوجود ہم خاصی دیر تک گھاس کی پٹی کے ساتھ سفر کرتے رہے مگر ہاتھی نے اپنی جھلک تک نہیں دکھائی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

شام تک ہم واپس آ گئے۔ سامو باغات کے کنارے پر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہمیں لے کر اسٹیڈن کے فارم ہاؤس تک آ گیا۔ سارے دن کی تھکن اور گرمی سے میرا برا حال تھا۔ میں نے پہلے غسل کیا پھر چائے پی اور اس دوران میں اسٹیڈن کو سارے دن کی روداد سناتا رہا تھا۔ میں نے کہا ''وہ آج صبح پانی پی گیا ہے۔ اب اسے کل سے پہلے پانی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر کل بھی ایسی گرمی رہی تو وہ لازماً رات کے وقت جھیل پر آئے گا۔''

''رات کے وقت۔'' اسٹیڈن پریشان ہو گیا تھا ''لیکن رات کے وقت وہاں جانا بہت خطرناک ہوگا۔ نہ جانے وہ کس طرف سے آ جائے۔''

''یہ خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔'' میں نے چائے کی چسکی لی ''میں سوچ رہا ہوں۔ ایک آدمی اور دو سرچ لائٹیں بھی لے کر جاؤں۔ رات میں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

اسٹیڈن نے میری مخالفت کی۔ لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وقت ہاتھی زخمی تھا لہٰذا اس میں چستی اور برق رفتاری کا

نقدان لازمی تھا۔ ایسے میں اس کا شکار نسبتاً آسان ہوتا بہ نسبت اس وقت کے جب اس کے زخم بھر جاتے اور وہ پہلے کی طرح چست اور جارح ہو جاتا۔ بادل ناخواستہ اسیڈن نے میرے فیصلے سے اتفاق کرلیا۔ اس کے پاس آرمی کے لیے بنائی جانے والی کئی طاقت ور دستی سرچ لائٹس موجود تھیں۔ میں نے ان میں سے دو کا انتخاب کیا۔ رات تاریکی میں ان کے عملی تجربے سے مجھے ان کی افادیت کا پتا چلا۔ یہ تقریباً پچاس گز تک ہر شے کو بے حد صاف دکھارہی تھیں۔ میں خوش ہو گیا تھا۔ اب ضرورت تیسرے آدمی کی تھی جو یہ دستی سرچ لائٹس استعمال کرتا۔ میں نے اسیڈن سے کہا کہ ایک شخص کا انتظام کرے جو رضا کارانہ طور پر یہ کام کرنے کو تیار ہو۔ اس نے کوشش کی لیکن اس کے ملازمین اور گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی تیار نہیں ہوا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ تیسرے شخص کے بغیر یہ کام بے حد مشکل تھا۔

جب اگلے روز صبح بارہ بجے تک کوئی شخص دستیاب نہ ہوا تو میں مایوس ہو گیا۔ آج بھی ہاتھی کا شکار ممکن نہ تھا۔ راجا بہادر نے پیش کش کی۔ ''صاحب لائٹ بھی میں سنبھال لوں گا۔''

میں نے انکار کیا ''نہیں راجا...... تمہارا کام رائفل لوڈ کرنا ہے۔ اگر تم نے اپنا کام صحیح سے نہ کیا تو ہم سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔''

راجا بہادر نے مایوسی سے سر ہلایا ''ادھر کوئی اور جانے کو تیار نہیں۔ سب ہاتھی سے ڈرتے ہیں۔''

آج رات موقع گنوا دینے کی صورت میں ہاتھی پھر پرسوں ہی آتا اور اگر اس دوران میں بارش ہو جاتی تو ہاتھی پھر شائد ہی جھیل کا رخ کرتا اسے پہلے بھی اس جگہ گھات لگا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی جاچکی تھی۔ اس لیے وہ جھیل کا رخ کرتے ہوئے محتاط ہو گا اور کوشش کرے گا کہ نیچے نہ آئے کیونکہ کھلے میں اسے آسانی سے شکار کیا جا سکتا تھا۔ سہ پہر کے وقت میں فارم ہاؤس کے باغ میں درخت کی چھاؤں تلے آرام کرسی پر سستا رہا تھا۔ لنچ کے بعد ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ سامو کل سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اچانک وہ دروازے کی طرف سے آتا نظر آیا۔ اس نے پاس آکر سلام کیا۔

''صاحب کیا حال ہے؟''

''میں نے گہری سانس لی۔ میرے حال تو اچھے ہی ہیں لیکن یہ ہاتھی مجھے مسئلہ بنتا نظر آرہا ہے۔ دو تین دن میں اس کے زخم بھر جائیں گے اور یہ دوبارہ انسانوں پر حملے شروع کر دے گا۔''

میں نے سامو کو بتایا کہ آج رات ہاتھی کے جھیل پر آنے کا قوی امکان ہے۔ شدید گرمی میں وہ زیادہ دیر اپنی پیاس پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ سامو نے جوش سے کہا ''یہ تو اچھا موقع ہے صاحب، آپ اسے شکار کر سکتے ہو۔''

''لیکن کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا جو سرچ لائٹس استعمال کرے۔ اس کے بغیر ہاتھی کا شکار ممکن نہیں ہے۔ میری اور راجا کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''صاحب اگر میں آپ کے ساتھ چلوں۔'' سامو نے ہچکچا کر کہا۔

میں خوشی سے اچھل پڑا'' سامو تم نے تو مسئلہ حل کر دیا۔''

''وہ بھاگ کر اندر سے سرچ لائٹس اٹھالایا۔ میں نے اسے ان کے استعمال کی تربیت دی۔ بیٹری چار گھنٹے کے لیے کارآمد تھی اس لیے فکر کی بات نہیں تھی۔ سامو بے حد ذہین لڑکا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں سرچ لائٹس کے سارے فنکشن استعمال کرنا سیکھ لیے۔ اس دوران میں انسپکٹر کمار آگیا۔ اسے اپنی کاغذی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ اس نے میرا بیان لیا۔ ساتھ ہی اپنے اس سپاہی کی حماقت پر دبی زبان میں معذرت کی۔

''سر اگر آپ اس واقعے کا ذکر نہ کریں تو مہربانی ہو گی ورنہ مجھے اس کے خلاف رپورٹ کرنا پڑے گی اور اس کی نوکری چلی جائے گی۔''

میں نے انسپکٹر کمار کو تسلی دی۔ ''میں نے یہ بات کسی سے نہیں کی ہے اور تم بھی اس غریب سے کچھ مت کہنا۔ اس نے گھبرا کر فائرنگ کی تھی بلکہ اس نے ہاتھی کو زخمی کر کے اسے کچھ دنوں کے لیے محدود ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔''

''شکریہ سر۔'' انسپکٹر کمار خوش ہو گیا تھا'' اس نے کچھ دیہاتیوں سے سنا ہے کہ انہوں نے گھاس کی پٹی سے ہاتھی کی چنگھاڑنے کی آوازیں سنی ہیں۔ اس کی آواز سے کرب جھلک رہا تھا۔''

''یہ لوگ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟'' میں پریشان ہو گیا تھا۔

''یہ چرواہے ہیں۔ اگر یہ جانور چرانے نہ لے جائیں تو ان کے جانور بھوکے مرجائیں۔'' انسپکٹر کمار بولا۔ ''سر یہ غریب لوگ ہیں ان کے لیے ذریعہ معاش زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔''

''ممکن ہے آج رات ہی اس ہاتھی کا کام تمام ہو جائے۔'' میں نے کہا ''اس کے بعد علاقے کے لوگ آزادی سے جنگل اور گھاس میں جاسکیں گے۔ تم ایک بار ان۔

لوگوں کو منع کر دو اس طرف نہ جائیں۔ زخمی ہاتھی مشتعل ہے اور زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔“

”میں ایک بار پھر دیہاتیوں کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ کوئی جنگل کی طرف نہ جائے۔“ انسپکٹر کمار اٹھتے ہوئے بولا ”اس کے جانے کے بعد میں سامو کو سمجھانے لگا کہ اسے کس طرح سرچ لائٹ استعمال کرنی ہے۔ میں نے نمبر طے کر دیے کیونکہ سرچ لائٹس تین موڈز پر کام کرتی تھی۔ پہلے موڈ پر یہ عام ٹارچ کی طرح روشن ہوتی تھی۔ دوسرے موڈ میں یہ سرچ لائٹ بن جاتی تھی لیکن اس کی روشنی پھیلتی تھی۔ تیسرے موڈ میں یہ اسپاٹ لائٹ بن جاتی تھی۔ میں نے سامو سے کہا ”میں جو نمبر پکاروں تم اس موڈ میں سرچ لائٹ آن کر دینا اور رخ کا خاص خیال رکھنا۔ میں جس طرف رائفل کروں روشنی اسی طرف کرنا۔“

سامو، راجا اور میں نے ایک بار پھر ریہرسل کی تاکہ عین موقع پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ پانچ بجنے کے کچھ دیر بعد ہم روانہ ہوگئے تھے۔ اسیڈن نے ہمیں جیپ میں باغات کے کنارے تک پہنچایا۔ وہاں سے ہم درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں جھیل کی طرف روانہ ہوئے۔ پچھلے دنوں مارے جانے والے شکاریوں کا انجام میرے سامنے تھا اس لیے میں نے ایک بندوبست اور کیا۔ میں جو قمیص پچھلے دنوں سے پہن رہا تھا۔ وہ میں نے ساتھ لے لی اور جب جھیل کے پاس پہنچے تو قمیص گھاس کی پٹی کی طرف سے جھیل کی جانب آنے والے ایک راستے پر اگی جھاڑیوں پر پھیلا دی۔

جھیل کے اطراف میں زیادہ تر بانس کے جھنڈ تھے۔ ان میں چھپنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اس لیے ہم جھیل سے ذرا فاصلے پر اگی خاردار جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ مگر ذرا دیر میں اندازہ ہوا کہ ہم غلط جگہ پھنس آئے ہیں۔ جھاڑیوں کی جڑوں میں سرخ چیونٹیوں کے بل تھے ہماری مداخلت پر انہوں نے برا منایا اور ہمارے کپڑوں میں گھس کر کاٹنا شروع کر دیا۔ ہم بلبلا کر جھاڑیوں سے نکل آئے۔ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے میں نے کسی اور پناہ گاہ کے بارے میں غور کیا۔ راجا بہادر نے مشورہ دیا۔

”صاحب بانس میں چھپ جائیں۔“

میں نے مشورہ رد کر دیا ”بانس میں گھس کر ہماری حرکت محدود ہو جائے گی اور ہم ہاتھی پر نظر بھی نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ بے خبری میں ہمیں آ لے گا۔“

آخر میں جھیل کے کنارے اگی گھاس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ ترائی کے علاقے سے مخالف سمت میں تھی یعنی دوسرے کنارے پر۔ لیکن مکار ہاتھی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی شکاریوں کو دھوکا دیکر آیا تھا اور اس نے انہیں ہلاک کر دیا تھا مگر خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کسی صورت بانسوں میں نہیں گھسنا چاہتا تھا۔ راجا بہادر نے درانتی سے گھاس کاٹ کر جگہ صاف کی۔ یہاں پر گھاس کی اونچائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ یعنی اگر ہم بیٹھ جاتے تو ہاتھی کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ اس کے باوجود اس کی قوتِ شامہ اسے ہمارے بارے میں خبر دے سکتی تھی۔ اس کے علاج کے لیے میں اپنے ساتھ ایک تیز بو والا تیل اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس سے ہمارے جسموں کی بو دب جاتی۔ میں نے یہ تیل اپنے جسم پر لگایا اور ان دونوں سے بھی کہا کہ وہ تیل لگائیں۔ اس کی ناگوار بو سے اردگرد اڑنے والے کیڑے بھی ہم سے دور ہوگئے تھے۔ میں نے رائفلیں چیک کیں۔ دونوں بھری ہوئی تھیں اور دونوں میں چار چار گولیاں تھیں۔ اضافی گولیاں میرے اور راجا بہادر کے پاس تھیں۔ سامو کو صرف سرچ لائٹس سنبھالنا تھیں۔ گھاس میں چھپ کر ہم اب سوائے ہاتھی کے انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بو والا تیل لگانے کے باوجود میرے ذہن میں کچھ خدشات تھے۔ اول تو یہ کہ ہاتھی کی قوتِ شامہ بے حد تیز ہوتی ہے۔ ممکن ہے وہ تیل کی بو میں ہماری بو شناخت کر لے۔ اس کے علاوہ اس چالاک جانور سے بعید نہیں تھا کہ وہ تیل کی نامانوس بو سے کھٹک جائے۔ آج ہوا جھیل کی طرف سے گھاس کی پٹی کی طرف چل رہی تھی۔ اور ہماری بو... لازماً ہاتھی کی ناک تک جاتی۔ میں ایک دوربین بھی لایا تھا۔ جس سے وقفے وقفے سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن یہ مشاہدہ بھی سورج ڈوبنے تک جاری رہا۔ اس کے بعد تاریکی بے حد تیزی سے پھیلی۔ آج آسمان پر چاند بھی نہیں تھا اس لیے چار سو تاریکی تھی۔ بانس کے درختوں کے مدھم ہیولے ہلکی ہوا کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ پھر کیڑوں نے اپنے راگ رنگ کا پروگرام شروع کر دیا۔ اندھیرا ہونے کے بعد ہم ہاتھی کی طرف سے دیکھ لیے جانے کے خطرے سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ تاریکی میں ہاتھی تقریباً اندھا ہو جاتا ہے اس کے بعد یہ صرف سننے اور سونگھنے کی حس سے کام چلاتا ہے۔ ذرا دیر بعد تارے نکلے تو کسی قدر روشنی ہوئی۔ اب ہم چاروں طرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے تک نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے سامو اور راجا بہادر کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ بلاوجہ بات نہیں کرنی اور نہ ہی کوئی آواز پیدا کرنی ہے۔ ہاتھی کا شکار کرنے والے شکاری اس وجہ سے اس کا شکار ہوگئے تھے کہ وہ آپس

میں باتیں کررہے تھے۔ ہم خاموشی سے انتظار کرتے رہے۔

رات آٹھ بجے تک کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ماحول سوائے کیڑوں کی آواز کے بالکل خاموش تھا۔ ہم نے رات کا کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اسٹیڈن کے باورچی نے ہمارے لیے لذیذ چکن سینڈوچ بنا کر ساتھ کیے تھے۔ تھرماس میں کافی تھی۔ ہم نے سینڈوچز کھا کر کافی پی اور تازہ دم ہوگئے۔ سامو کسی قدر پرجوش تھا۔ ظاہر ہے وہ ایک نوجوان اور ناتجربے کار لڑکا تھا۔ جبکہ راجا بہادر پرانے شکاری کی طرح پرسکون تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ ہوگا یا نہیں ہوگا اس لیے اضطراب سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نو بجے سامو نے رفع حاجت کے لیے بانسوں کی طرف جانے کی اجازت مانگی۔ کیونکہ اس وقت ہاتھی کی آمد کے قطعی آثار نظر نہیں آرہے تھے اس لیے میں نے اجازت دے دی۔ سامو خاموشی سے نزدیکی بانسوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ اسے گئے ہوئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ اچانک شاخ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آواز جھیل کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ شاخ ٹوٹنے کی آواز سے لگ رہا تھا وہ کسی وزنی شے کے زیراثر ٹوٹی تھی۔ میں اور راجا چوکنا ہوگئے مگر پوری کوشش کے باوجود ہمیں کچھ نظر نہیں آیا۔ اب سوال ہم دونوں کے ذہن میں تھا کہ کیا ہاتھی آگیا ہے۔

میں سامو کے لیے مضطرب تھا۔ اگر ہاتھی آگیا تو اسے ہمارے پاس ہونا چاہیے تھا اس کی مدد کے بغیر ہم ہاتھی سے نہیں نمٹ سکتے تھے۔ لمحے جیسے رک رک کر گزر رہے تھے۔

ایک بار میرے دل میں آیا کہ خود سرچ لائٹ روشن کر کے دیکھوں مگر یہ سراسر ہاتھی کو حملے کی دعوت دینے والی بات ہوتی اور فی الوقت میں اسے چھیڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے راجا سے کہا کہ عقب میں نظر رکھے اور خود سامنے جھیل کے پار دیکھنے لگا۔ میری احتیاط کام آئی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا جارہا تھا۔ سامو کو گئے ہوئے نصف گھنٹا ہونے کو آرہا تھا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس کی فکر بھی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا ورنہ اس کی آواز ضرور آتی۔ وہ جن بانسوں میں گیا تھا وہ ہم سے کوئی بیس بائیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا ورنہ ہاتھی پاس ہوتا تو سامو سے پہلے وہ سن کر ادھر تشریف لے آتا۔ ابھی میں سامو کی فکر کررہا تھا کہ عقب سے راجا بہادر نے ٹہوکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر اشارے سے ایک طرف دیکھنے کو کہا۔ اس طرف بانسوں کا جھنڈ تھا۔ وہی جھنڈ جس میں سامو گیا تھا۔ بغور دیکھنے پر مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے راجا بہادر کی طرف دیکھا۔ اس نے دوبارہ جھنڈ کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔ میں نے پھر غور سے دیکھا اور اس بار میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ جھنڈ کے ساتھ ایک سیاہ دیوار تھی اور پھر ہاتھی نے کان ہلایا تب مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نہ جانے کب اور کیسے وہ خاموشی سے وہاں تک آگیا تھا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ گویا شاخ ٹوٹنے کی آواز ہاتھی کی وجہ سے ہی آئی تھی۔ مگر وہ جھیل سے گھوم کر اس طرف کیسے اور کب آیا مجھے یا راجا بہادر کو بالکل خبر نہیں ہوئی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ سامو کیوں بانسوں میں دبکا تھا۔ اس نے بھی ہاتھی دیکھ لیا تھا۔ میرے جسم نے پسینہ اگلنا شروع کردیا تھا۔ ہاتھی اس طرح کیوں آیا تھا کیا اسے شک ہوگیا تھا کہ ہم یہاں پر ہیں۔ میں نے سوچا مگر ہاتھی کا ساکت رہنا اس بات کی دلیل تھی کہ ابھی اسے انسانوں کی موجودگی کا یقین نہیں آیا تھا ورنہ وہ حملہ کرچکا ہوتا۔ میں نے اشارے سے راجا بہادر کو نیچے ہونے کو کہا۔ ہاتھی کا رخ ہماری طرف ہی تھا اور مجھے شک تھا کہ وہ ہماری طرف سے کسی حرکت کا انتظار کررہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اگر اس نے حملہ کیا تو ہم کیا کریں گے۔ سامو تھا نہیں جو روشنی کرتا۔ فی الوقت دونوں رائفلیں بھری ہوئی تھیں اس لیے میں نے راجا بہادر کو سرچ لائٹ اٹھانے کو کہا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے راجا بہادر کو بھی سرچ لائٹس کے استعمال کی تربیت دے دی تھی۔

ہاتھیوں سے نمٹنے کے دوران میں نے کبھی ایسی ہچکچاہٹ اور خوف محسوس نہیں کیا تھا جیسا کہ اس قاتل ہاتھی کے سامنے محسوس ہورہا تھا۔ بس میری نگاہیں اس کے ساکت کان پر مرکوز تھیں۔ عام طور سے ہاتھی چپ کھڑے ہوکر اپنے کان اس وقت ساکت رکھتا ہے جب وہ دشمن کی سن گن لینے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے اپنی رائفل ہاتھ میں لے لی تھی اور میں دس سیکنڈ میں فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہاتھی کوئی دس منٹ اس پوزیشن میں ساکت کھڑا رہا حتیٰ کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہاں کوئی ہاتھی بھی تھا یا یہ ہیولا ہماری نظر کا دھوکا تھا۔ اچانک بانسوں کے جنگل کی طرف سے چھینکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ہاتھی کی چنگھاڑ سے ماحول میں زلزلہ سا آگیا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں بانس کے درخت گرانا شروع کردیے۔ سامو کی چھینک نے ہاتھی کے شبہے کی تصدیق کردی تھی۔ میں نے چلا کر راجا بہادر سے سرچ لائٹ جلانے کو کہا اور رائفل سے ہاتھی کا نشانہ لینے لگا۔ بدحواسی میں راجا بہادر نے سرچ لائٹ کو اسپاٹ کے بجائے عام موڈ پر جلایا۔ بہرحال اس کی روشنی میں ہاتھی صاف نظر آرہا تھا۔ یہ بھورے رنگ کا قوی الجثہ ہاتھی تھا جو اب تک آٹھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار

چکا تھا۔ ہاتھی بانس گرا کر سامو کو کچلنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے اس کے شانے کا نشانہ لیا گولی اس کی شہ رگ میں لگتی تو وہیں اس کا کام تمام ہو جاتا مگر طاقت ور گولی ذرا نیچے اس کی گردن میں لگی۔ ہاتھی نے دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری اور بانسوں کا پیچھا چھوڑ کر زمین دہلاتا ہماری طرف لپکا۔ میں نے پے در پے تین فائر کیے اور رائفل رکھ کر دوسری اٹھالی۔ میں نے چیخ کر راجا سے رائفل لوڈ کرنے کو کہا۔ گولیاں کھا کر ہاتھی کی رفتار میں کمی آ گئی تھی لیکن وہ بدستور ہماری طرف آ رہا تھا۔

راجا نے سرچ لائٹ زمین پر رکھ دی اور خود رائفل لوڈ کرنے لگا۔ میں نے ہاتھی کی رفتار توڑنے کے لیے اس کے اگلے پیروں کا نشانہ لیا۔ مگر نہ جانے گولی لگی نہیں یا اسے اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ جھومتا ہوا وہ ہم سے بہ مشکل دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے حملے کے لیے سونڈ اٹھالی تھی۔ میں نے چلا کر راجا بہادر سے بھاگنے کو کہا اور ہم پاس واقع بانسوں کی طرف بھاگے۔ اس دوران میں راجا بہادر رائفل لوڈ کر چکا تھا۔ میں نے جھپٹ کر رائفل لی اور مڑ کر ہاتھی کو دیکھا جو ابھی وہاں پڑی ہمار چیزوں کو پیروں تلے روندر ہا تھا پھر اسے احساس ہوا کہ ہم تو بھاگ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر ہمارے پیچھے لپکا۔

ہم بانسوں کے عقب میں گئے تو وہ بھی گھوم کر آیا۔ راجا بہادر آگے آگے بھاگتے ہوئے مجھ سے لی رائفل کو لوڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے ٹھوکر لگی اور میں زمین پر گر گیا۔ اٹھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ ہاتھی لمحے بھر میں میرے سر پر آ چکا تھا۔ جب اس نے سونڈ بلند کی تو میں نے جان لیا میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ ہاتھی رائفل بلند کرنے سے پہلے مجھ پر سونڈ کا وار کر چکا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا اور پھر معجزہ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ہاتھی مجھ پر وار کرتا، اچانک اس پر تیز روشنی پڑی۔ یہ اسپاٹ لائٹ تھی جو براہ راست ہاتھی کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ روشنی نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے تیزی سے رائفل بلند کی اور اس کے کھلے منہ میں گولی داغ دی۔ گولی اس کے تالو سے گزر کر دماغ پھاڑ کر سر پر سے نکل گئی۔ میں نے دوسری اور پھر تیسری گولی بھی اسی طرح چلادی۔ ہاتھی پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور پھر ایک پرشور دھماکے سے زمین پر پہلو کے بل گرا۔ میں اچھل کر پیچھے لڑھک گیا کہ کہیں اس دم توڑتے وحشی کی زد میں نہ آ جاؤں۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا وہ راجا بہادر ہو گا لیکن سرچ لائٹ سامو کے ہاتھ میں تھی۔ بلاشبہ اس نے انتہا درجے کی دلیری کا ثبوت دیا اور بھاگ کر میری مدد کو آیا ورنہ ہاتھی مجھے ہلاک کر چکا ہوتا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

ایک منٹ کے اندر ہاتھی کا لرزتا جسم سرد ہو گیا تھا۔ بے انتہا تھکن کے باوجود سکون کا ایسا احساس تھا جو میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ ہم نے ٹھنڈی ہو جانے والی کافی پی کر ہاتھی کی ہلاکت کا جشن منایا پھر ہم نے واپس فارم ہاؤس کا رخ کیا۔ رات سرد ہو چلی تھی۔ پہلے فارم ہاؤس کے چوکیدار نے ہمیں گرم چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ جب میں نے اسے ہاتھی کی ہلاکت کا بتایا تو وہ دیوانہ وار یہ خبر دوسروں کو سنانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اگلے روز ساری خلقت ہاتھی کی لاش کا دیدار کرنے امنڈ آئی تھی۔ مقامی لوگوں نے اس کے دانت نکال کر مجھے تحفے میں دیے۔ یہ کوئی گز بھر لمبے اور بے حد شفاف بے داغ سفید دانت تھے۔ یہ دانت آج بھی نشانی کے طور پر میرے گھر کے لیونگ روم میں آتش دان کے اوپر سجے ہوئے ہیں۔ میں نے ہاتھی کی ہلاکت اپنے دوست کے انتقام پر کی تھی لیکن جب میں وہاں سے واپس آنے لگا تو ٹی اسٹیٹ کے مالکان نے مجھے پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم پیش کی۔ میں نے انہیں ہاتھی کی آفت سے نجات دلا دی تھی۔ مگر میں نے وہ رقم خود لینے کے بجائے سامو اور راجا بہادر میں مساوی طور پر تقسیم کر دی تھی کیونکہ اس مہم میں ان کا بھی برابر کا حصہ تھا۔

ایک اور اہم بات جس کا تذکرہ ضروری ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ہاتھی محض دشمنی جبلت کے زیر اثر انسان دشمنی پر اتر آیا ہے۔ اگلے روز جب ہاتھی کے دانت نکالے جا رہے تھے تو میں نے اس کی لاش کا بغور معائنہ کیا تھا۔ خاص طور سے اس کے پیروں کا لیکن مجھے کہیں کوئی زخم نظر نہیں آیا اور جب میں معائنہ ترک کر رہا تھا تو مجھے اسکی گردن میں ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا سوراخ نظر آیا تھا جو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے پہلے مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

میں نے اس سوراخ کا بغور مشاہدہ کیا۔ مجھے شک ہوا کہ یہ سوراخ قدرتی نہیں تھا۔ میں نے تیز دھار چاقو سے اس سوراخ کو چیرا۔ شروع میں تو کچھ نظر نہیں آیا، مگر ذرا گہرائی میں جانے پر مجھے لکڑی کا ایک نوکیلا اور بے حد نرم ہو جانے والا ٹکڑا ملا۔ یہ کسی تیر کی نوک تھی۔ کسی مقامی قبائلی نے بلاوجہ اپنے تیر کو اس دیوہیکل ہاتھی پر آزمایا تھا۔ تیر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن اس کے بعد ہاتھی انسانوں کا دشمن ہو گیا تھا۔ مقامی قبائلی بے حد امن پسند تھے اس کا مطلب تھا کہ یہ ہاتھی آسام کے کسی ایسے علاقے سے آیا تھا جہاں پر جنگجو قبائلی آباد تھے۔ یعنی دوسروں کا کیا دھرا اس علاقے کے بے گناہ لوگوں نے بھگتا تھا جس میں میرا عزیز دوست سیل بھی شامل تھا۔

پیدل سفر

کاشف زبیر

قطبِ شمالی کی خون منجمد کر دینے والی سردی مشہور ہے اکثر مُہم جُو حضرات اپنے شوقِ مہم جوئی میں اس علاقے کا سفر کرتے اور جان گنواتے ہیں لیکن ایسے خوش نصیب بھی کم نہیں جو اپنے قدموں سے اس برف زار کو روندتے فاتحانہ انداز میں واپس آتے ہیں۔ یہ چند ایسے ہی خوش نصیبوں لیکن ہمت و جرأت کے پہاڑ افراد کا قصّہ ہے۔

برفانی علاقے میں پیادہ پا سفر کرنے والوں کی جدوجہد کی رُوداد

پندرھویں صدی تک دنیا صرف تین براعظموں کے بارے میں جانتی تھی یعنی ایشیا، یورپ اور افریقہ مگر جیسے جیسے جہازرانی ترقی کرتی گئی، نت نئے براعظم اور سرزمینیں دریافت ہوتی چلی گئیں۔ امریکا اور کینیڈا کی دریافت کے بعد جب یورپ کی سفید فام اقوام ان علاقوں میں پہنچیں تو سب سے پہلے انہوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کا خاتمہ کیا اور اس کے بعد وہاں کی وسائل سے مالا مال سرزمین کو لوٹنا شروع کردیا۔ نئے آنے والے، نئے جہانوں کی تلاش میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ کینیڈا اور الاسکا کے برف زاروں تک جا پہنچے جہاں برف سارے سال جمی رہتی تھی۔ اس سے آگے ایسے خوفناک علاقے تھے جہاں انسانی حیات کا تصور بھی مشکل تھا۔ لیکن یورپی آبادکار جب وہاں پہنچے تو انہیں وہاں بھی انسان ملے۔ یہ اسکیموز تھے جو ٹنڈرا کے علاقے میں اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھے لیکن اپنے وطن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ مچھلیاں پکڑتے، پینگوئن اور برفانی ریچھوں کا شکار کرتے تھے اور رینڈیئر یعنی برفانی بارہ

سنگھے پالتے تھے۔ ان کے گھر برف کے بنے ہوئے تھے اور یہ برف پر پھسلنے والی گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ ان ہی برفانی لوگوں سے یورپ کو پہلی بار برف کے ایسے خطے کا علم ہوا جو صرف سمندر پر قائم تھا۔

یورپ کے لوگوں میں علم و تحقیق کی جستجو میں اضافے کے ساتھ ہی ان میں مہم جوئی کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ وہ یورپ کی حد سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل گئے۔ سولھویں صدی تک قطب شمالی کے برف زاروں پر پردہ پڑا رہا کیونکہ بحری جہاز اس قابل نہیں تھے کہ برف توڑ کر برف زاروں تک پہنچ سکتے۔ یقیناً کچھ لوگ پاپیادہ اس طرف گئے ہوں گے مگر تاریخ میں نہیں..... ان کی مہمات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ قطب شمالی تین اطراف سے یورپ، ایشیا اور شمالی امریکا کی سرزمینوں سے گھرا ہوا ہے اور چوتھی سمت بحراوقیانوس ہے جو بحر منجمد شمالی سے آملتا ہے۔ یہ خطہ اپنی دریافت کے بعد کئی صدیوں تک انسان کے لیے پُراسرار بنا رہا۔ بالآخر دخانی بحری جہازوں کی تیاری کے بعد انسان اس قابل ہوا کہ اس منجمد سمندر میں سفر کرسکے لیکن یہ بحری جہاز بھی ایک حد سے آگے نہیں جاسکتے تھے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ برف زاروں کے باسی قبائل میں سے کوئی قطب شمالی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں مگر باقاعدہ قطب شمالی تک پہنچنے کا اعزاز سب سے پہلے متمدن باشندوں کو حاصل ہوا۔ ان میں برطانیہ اور سوئیڈن کے افراد پیش پیش رہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں انسان سب سے پہلے قطب شمالی تک پہنچا۔ اگرچہ یہ ایک یقینی فتح نہیں تھی کیونکہ اس وقت مناسب آلات دستیاب نہ ہونے کے باعث قطب کا صحیح مقام معلوم کرنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور تھا۔ بعد میں بہتر آلات کے ساتھ کئی ٹیموں نے قطب تک پہنچنے کا دعویٰ کیا۔ لیکن مصدقہ طور پر قطب شمالی ۱۹۸۶ء میں سرہوچکا تھا۔ آپ اس مہم کی روداد سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کرچکے ہیں۔

اس کے بعد ایک سلسلہ چل نکلا۔ متعدد افراد نے طیاروں، غباروں، کتوں والی سلیج گاڑیوں پر قطب کو سر کیا۔ اب صرف ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ جس کے ذریعے قطب سر نہیں کیا جاسکا تھا یعنی آج تک کسی فرد یا ٹیم نے پیدل چل کر قطب تک رسائی حاصل نہیں کی تھی۔ اگرچہ یہ بھاری پتھر کئی بار اٹھایا گیا لیکن ہر بار چوم کر رکھ دیا گیا۔ قطب شمالی سے نزدیک ترین سرزمین کینیڈا کا شمالی ساحل ہے۔ جو قطب سے پانچ سو میل دور ہے اور ظاہر ہے یہ سمندر بھی لاکھوں سال سے منجمد ہے۔ اس کے ساحل کو کبھی لہروں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ البتہ برفانی تودے آئے دن عقبی دباؤ کی وجہ سے زمین پر چڑھ جاتے ہیں۔ قطب سے سائبیریا کی سرزمین کا فاصلہ بھی تقریباً اتنا ہی ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ ۱۹۹۰ء میں بیک وقت دو ٹیموں نے ان دو سرزمینوں سے قطب شمالی تک اپنے پیدل سفر کا آغاز کیا تھا۔

○☆○

۸ مارچ ۱۹۹۰ء کی تاریخ تھی اور جمعرات کا دن تھا۔ دوپہر کے ایک بج کر تیس منٹ ہوئے تھے۔ گرینچ مین ٹائم کے مطابق کیونکہ اس خطے میں آکر اوقات کار گڑبڑ ہوجاتے تھے۔ صبح، دوپہر شام اور رات کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس لیے بین الاقوامی طور پر اس خطے میں جی ایم ٹی نافذ کردیا گیا تھا۔ جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔ برف کی موٹی تہ میں پوشیدہ جزیرے وارڈ ہنٹ آئی لینڈ کے اوپر دو انجنوں والے اوٹر طیارے نے چکر لگایا۔ اسے کم از کم تین سو گز ہموار قطعے کی تلاش تھی۔ بالآخر پائلٹ کو طیارہ اتارنے کے لیے مناسب جگہ مل گئی۔ وارڈ ہنٹ آئی لینڈ کا جزیرہ قطب شمالی کی طرف براعظم شمالی امریکا کا آخری خشکی کا ٹکڑا بھی تھا۔

طیارے سے پہلے یہ خاکسار..... برآمد ہوا۔ میرا نام برجی آوس لینڈ ہے۔ چونکیے مت، ہم ناروے والے ایسے ہی نام رکھتے ہیں۔ میرے پیچھے گیئر تھا اور اس کے بعد ارلنگ۔ یہ دونوں میرے ہم وطن ہیں۔ پائلٹ نے سامان سے بھری تین سلیج اتاریں اور فوراً واپس روانہ ہوگیا۔ اسے خدشہ تھا کہ طیارے کا انجن بند ہوگیا یا اس کے اسکینز پر برف جم گئی تو اس کی واپسی کھٹائی میں پڑجائے گی۔ آسمان پر جمع گہرے سُرمئی بادل الگ دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہلکی برف باری جاری تھی جو کسی بھی وقت طوفان میں بدل سکتی تھی۔ ہم سمندر پر اُترے تھے۔ جہاں تہ در تہ برفانی تودے جمع ہو رہے تھے۔ یہ تودے شاید کئی سو سال پہلے قطب شمالی سے چلے ہوں گے اور ہر سال چند سومیٹر آگے کی طرف کھسکتے ہوئے بالآخر یہاں تک آپہنچے تھے۔ البتہ کھلے سمندر میں یہ تودے کہیں زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔ ان مہیب برفانی تودوں کا وزن کسی پہاڑ سے کم نہیں ہوتا۔ میں نے تھرمامیٹر کی طرف دیکھا درجۂ حرارت منفی اٹھاون درجے فارن ہائٹ تھا۔ یعنی ایک معمول کا گرم دن۔ واضح رہے کہ سرما میں یہی درجۂ حرارت منفی ایک سو نوے ڈگری فارن ہائٹ تک جاپہنچتا ہے۔ ہم سے کچھ دور برف پر خوف ناک دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور بعض دراڑیں تو پچاس فٹ چوڑی تھیں۔ جن سے بے حد سرد نیلگوں پانی جھانک رہا تھا۔

ہم تین نفوس کے ساتھ اُترنے والے سامان کا کُل

وزن تقریباً ایک ہزار پاؤنڈ یا نصف ٹن تھا۔ جو تین سلیج گاڑیوں پر یکساں طور پر منقسم تھا۔ یعنی فی کس ساڑھے تین سو پاؤنڈ۔ یہ ویسی ہی سلیج گاڑیاں تھیں جیسی اکثر برفانی خطوں میں دکھائی جاتی ہیں اور جنہیں کتے یا رینڈیئر کھینچتے ہیں۔ ہمارا یہ پُرخطر سفر براعظم شمالی امریکا میں شمال کی طرف خشکی کے آخری ٹکڑے سے قطب شمالی تک تھا۔ لہٰذا ارلنگ نے جاکر جزیرے کی سرزمین کو چھوا اور یوں ہمارے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ قطب شمالی یہاں سے پانچ سو میل دور تھا اور ہمیں یہ فاصلہ بغیر کسی جانور یا مشینی ٹرانسپورٹ کی مدد کے صرف اپنے پیروں پر طے کرنا تھا۔ اس دوران میں ہمیں نہ تو اضافی خوراک ملتی اور نہ ہی ایندھن بلکہ ہم جو آلات لے کر جارہے تھے۔ ان کے بدلے بھی کوئی دوسری چیز نہ ملتی۔ لہٰذا ہم نے ہر چیز بہت چھان پھٹک کر اور جانچ کرلی تھی۔ ہم صرف انتہائی ضرورت کی اشیا لائے تھے تاکہ وزن کم سے کم رہے اور ہم ان میں سے کسی شے کی محرومی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ ہمارا اصل زادِ راہ ہمارا حوصلہ تھا۔

اس سے پہلے میں بارہ بار قطب شمالی آچکا تھا اور میں قطب کے ساڑھے تین سو میل نزدیک جاچکا تھا۔ ہم سے پہلے بھی متعدد مہم جُو قطب شمالی تک پیدل سفر کی کوشش کرچکے تھے۔ برطانوی مہم جُو سر رینالف فینیس نے تین بار قطب شمالی سر کرنے کی کوشش کی جو بدقسمتی سے تینوں بار ناکام رہی۔ دراصل تقدیر نے اس اعزاز کے لیے ہمیں منتخب کرلیا تھا۔ سر رینالف نے پہلی کوشش ۱۹۸۶ء میں کی تھی پھر لگاتار ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء میں مگر ہر بار مہم کسی نہ کسی سبب ناکام رہی۔ جن دنوں ہم کینیڈا میں تیاری کررہے تھے، ہمیں اطلاع ملی کہ سر رینالف بھی ایک ٹیم کے ساتھ مارچ کے پہلے ہفتے میں قطب شمالی کی طرف جارہے ہیں اور اس بار ان کا ارادہ سائبیریا کی طرف سے جانے کا تھا جس کے لیے انہوں نے روس کی حکومت سے خصوصی اجازت لی تھی۔ روسی بھی کئی بار اس قسم کی مہمات پر مہم جُو بھیج چکے تھے۔ لیکن ان کا انجام معلوم نہیں ہوا غالباً وہ سب بھی ناکام رہے تھے۔

”ساتھیو، کیا تیار ہو؟“ ارلنگ نے چلّا کر کہا۔

”تیار ہیں“ ہم نے نعرہ لگایا اور اپنی سلیجز کھینچنے لگے۔

خدا کا شکر ہے کہ برف ٹھوس تھی۔ ورنہ اس پر سلیج کھینچنا خاصا مشکل ہوتا۔ البتہ جابہ جا برف کی چھوٹی بڑی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ دراصل جب کسی تودے کے بے پناہ دباؤ سے برف کی سطح تڑختی تو اس میں پڑنے والی دراڑوں سے سمندر کا پانی فوارے کی طرح نکلتا تھا۔ یہ پانی زمین پر گرنے سے پہلے ہی سخت سردی کے باعث جم جاتا اور برف کی گولیاں سی بن جاتی تھیں۔ یہ چنے سے لے کر اخروٹ تک کے حجم کی تھیں اور چلتے ہوئے ہمارے جوتوں تلے آتی تھیں اس لیے ہم بہت محتاط ہوکر قدم بڑھارہے تھے۔ ہم میں سے کوئی ٹانگ تڑوانا تو ایک طرف رہا، موچ آنے کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ گولیاں سلیجز کی اسکیز کے آگے آکر مزاحمت کررہی تھیں اور ہمیں معمول سے زیادہ زور لگانا پڑرہا تھا۔ بہرحال یہ سفر کا آغاز تھا اور ہم ابھی تازہ دم تھے لہٰذا یہ مشقت بھی بُری نہیں لگ رہی تھی بلکہ ارلنگ خاصی موج میں ناروے کا ایک لوک گیت گارہا تھا اور اس کی گلوکاری اس وقت دم توڑ گئی جب پہلی دراڑ ہمارے سامنے آئی، یہ دراڑ غالباً دو روز پہلے وجود میں آئی تھی اور اس کی سطح پر برف جم چکی تھی لیکن ہم اس کے دھوکے میں آنے والے نہیں تھے۔ سطح کی برف اتنی ہلکی تھی کہ ہم قدم رکھتے اور اگلے ہی لمحے سمندر میں غوطہ زن ہوتے۔ اس کی چوڑائی چھ سے دس فٹ تک تھی۔

”اب کیا کریں؟“ گیئر نے سوال کیا۔

”کسی ایسی جگہ کی تلاش، جہاں سے ہم دراڑ عبور کرسکیں۔“ میں نے جواب دیا۔

فیصلہ شمال مشرق کے بارے میں ہوا اور ہم سلیجز کھینچتے آگے روانہ ہوگئے۔ ایک میل بعد دراڑ ختم ہوگئی اور ہم ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔ سردی اگرچہ ٹنڈرا کے حساب سے بہت کم تھی۔ لیکن ہمارا بُرا حال تھا۔ ہونٹ نیلے پڑگئے تھے اور ہاتھ پیر سن ہورہے تھے۔ ہمارے چاروں طرف وحشت ناک برف زار تھا۔ جس میں عجیب وغریب شکلوں کے برفانی تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کہیں یہ مینار نما تھے اور کہیں پہاڑ نما۔ میں نے ایک اہرام مصر جیسا تودہ بھی دیکھا تھا۔ یہ تودے آپس میں ٹکراتے تو ان کی ٹوٹ پھوٹ سے مزید ہیبت ناک شکلیں وجود میں آتیں اور راستے میں جابہ جا برف کے ٹکڑے بکھر جاتے۔ یہاں چند گز ہموار زمین بھی نظر آرہی تھی اور اس وقت ہمیں چھٹی کا دودھ یاد آجاتا جب ہم اپنی سلیج سمیت کسی برفانی ٹیلے یا تودے کو عبور کررہے ہوتے تھے۔

شام سات بجے ہم نے پہلا کیمپ لگایا۔ ہم نے ساڑھے پانچ گھنٹے کے سفر میں محض دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ جب میں نے حساب لگایا تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی تھی۔ ”اس طرح تو ہم چھ مہینے بعد قطب تک پہنچیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اور ہمارے پاس صرف ساٹھ دن کا راشن ہے۔“ گیئر نے لقمہ دیا۔

”مایوس مت ہو دوستو، آج چونکہ پہلا دن تھا۔“ ارلنگ

نے ہمیں تسلی دی "ہمارے اصل سفر کا آغاز کل ہوگا۔"
دل خوش کرنے کو یہ خیال اچھا تھا لیکن حقیقت خاصی مایوس کن تھی۔ پہلے روز جب کہ ہم تازہ دم تھے اور راستہ بھی اتنا خراب نہیں تھا۔ جتنا کہ ہمیں آگے ملتا۔ اس کے باوجود ہم نے پانچ گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں صرف دو میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ یوں رفتار نکالی جائے تو ہم ایک دن کے سفر میں زیادہ سے زیادہ پانچ میل کا سفر طے کرسکتے تھے۔ اس لحاظ سے ہمیں قطب تک پہنچنے میں سو دن لگ جاتے۔ جبکہ ہمارا راشن چالیس دن پہلے ہی ختم ہوگیا ہوتا۔ مہم کے آغاز میں ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ ہم روزانہ دس میل کا سفر طے کریں گے اور پچاس دن میں اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔ اگر کسی غیر متوقع حادثے نے ہماری مہم کا اور خود ہمارا خاتمہ نہ کردیا۔ حادثات کی اس علاقے میں کوئی کمی نہیں تھی۔ سب سے زیادہ خوف یہ تھا کہ ہم سفر کرتے ہوئے کسی دراڑ میں نہ جاگریں۔ یا رات کو سوتے ہوئے برف تڑخنے اور ہم خیمے سمیت سمندر میں غرق ہوجائیں۔
سفر کے آغاز سے پہلے ہی ہم نے طے کرلیا تھا کہ روزانہ آٹھ گھنٹے کی نیند ہر حال میں پوری کریں گے۔ اس کے علاوہ کیمپ لگانے اور اکھاڑنے کے لیے ایک ایک گھنٹا چاہیے تھا۔ البتہ جب پریکٹس ہوجاتی تو ہم خاصے کم وقت میں یہ اکھاڑپچھاڑ کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ تین وقت کے کھانے میں ہمیں ایک گھنٹا مزید لگتا۔ یوں چوبیس میں سے بارہ گھنٹے ہمارے پاس بچ جاتے۔ جس میں ہم سفر کرکے دس میل طے کرسکتے تھے۔ لیکن پہلے روز کے سفر نے ہمیں بتادیا کہ ہمارے اندازے کس قدر غلط تھے۔ ہم نے راستے کی مشکلات کے بارے میں درست اندازہ نہیں لگایا تھا۔
اگلے روز جب ہم نے کیمپ لگایا تو درجہ حرارت کسی قدر بہتر تھا۔ یعنی باون درجے منفی فارن ہائٹ۔ اس پر بھی ہمارے بیگ، بستر اور خاص طور سے کھانے کا سامان سردی سے پتھر کی طرح سخت ہورہا تھا۔ ارلنگ بے چارے کا ایک دانت لنچ چبانے کی کوشش میں ٹوٹ گیا تھا۔ ہم اس ستم ظریفی پر خوب ہنسے تھے، سوائے ارلنگ کے۔ دانت ٹوٹنے سے اس کی رگ متاثر ہوئی تھی اور وہ خاصی تکلیف میں تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس دانت بھرنے والا پیسٹ تھا۔ پہلے میں نے ارلنگ کے ٹوٹے دانت پر پیسٹ بنا کر لگایا۔ پھر اس پر ٹوٹا ہوا دانت جمادیا۔ ارلنگ کئی دن تک دوسری داڑھ سے کھاتا رہا۔ بہرحال ہمارا علاج کامیاب رہا اور ارلنگ کا ٹوٹا دانت جڑ گیا۔
اگلے ایک ہفتے تک ہماری اوسط رفتار پانچ میل فی دن رہی تھی۔ یہ رفتار ابتدائی اندازے سے خاصی کم تھی لیکن پہلے سے بہتر تھی۔ بلکہ ہم ہر گزرتے دن بہتر کارکردگی دکھا رہے تھے اور امید تھی کہ جیسے جیسے خوراک اور راشن کا وزن کم ہوگا، جو ہم استعمال کرتے جائیں گے، ویسے ویسے ہماری رفتار بڑھتی جائے گی۔

○☆○

ارلنگ کیجی اور گیئر رینڈ بائے لا اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں میں ناروے کے ساحل پر قائم تیل کی تنصیبات پر بطور "گہرے سمندر کے غوطہ خور" کے کام کررہا تھا۔ یہ کام خاصا مشکل اور پرُخطر مگر میری مہم جو طبیعت کے عین مطابق تھا۔ اتفاق سے ارلنگ اور گیئر بھی اسی مزاج کے حامل تھے۔ لہٰذا جلد ہم میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ ہم تینوں کو ہی ایسے چیلنج کی تلاش تھی جو اس سے پہلے کسی نے نہ قبول کیا ہو۔ اگرچہ ہم تینوں ہی متعدد مہمات میں حصہ لے چکے تھے۔ گیئر ایک بار کینیڈا کے برف زاروں میں آٹھ سو میل کا سفر پیادہ طے کرچکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ سائبیریا اور گرین لینڈ کی کئی مہموں میں شرکت کرچکا تھا۔ ارلنگ ہمہ صفت قسم کا مہم جُو تھا۔ وہ برفانی علاقوں، سمندروں اور پہاڑوں پر جانے والی متعدد مہمات میں حصہ لے چکا تھا۔ اس نے امریکا، آسٹریلیا اور افریقہ سمیت متعدد علاقوں کا سفر کیا تھا اور جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں ہمیشہ سے برف زاروں کا عاشق رہا ہوں۔ یہ بالکل کسی جفاپیشہ محبوبہ کی طرح ہوتے ہیں۔ بے حد حسین لیکن اپنے جلو میں موت لیے ہوئے۔ میں کئی بار کینیڈا اور اسکینڈے نیویا کے علاقے میں مہمات پر جاچکا تھا۔ ایک بار میں نے گرین لینڈ کے جزیرے کو ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک اسکیز پر عبور کیا تھا۔ یہ فاصلہ پانچ سو میل تھا اور میں نے اسے طے کرنے میں دو دن لگائے تھے۔ قطب شمالی تک جانا میرا پرانا خواب تھا اور میں وہ منفرد طریقہ سوچا کرتا تھا جس سے آج تک کوئی قطب تک نہ پہنچا ہو۔
مگر پیدل چل کر قطب شمالی تک پہنچنے کا خیال گیئر نے پیش کیا۔ اگرچہ یہ کوئی نیا خیال نہیں تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی ٹیمیں اس کی کوشش کرچکی تھیں۔ البتہ ہمارے گروپ کے لیے یہ نیا خیال ضرور تھا اور اس میں لائق توجہ فقط یہ تھا کہ کامیابی کی صورت میں ہم پیدل چل کر قطب تک پہنچنے والے پہلے انسان بن جاتے اور یہی سوچ کر ہم نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ گیئر نے یہ خیال ۱۹۸۸ء میں پیش کیا تھا اور اگلے دو برس تک ہم اس کی تیاری کرتے رہے۔ پہلے تو ہم نے قطب کی طرف جانے والی تمام مہمات کے بارے میں

دستیاب ہر قسم کی دستاویزات کو پڑھا۔ تاکہ اس مشکل خطے کے بارے میں باریک سے باریک نقطہ بھی ہمارے علم میں رہے۔ دوسرے ہم نے مہم پر لے جانے والی اشیا کی فہرست بنانا شروع کردی جو خاصی طویل تھی۔ کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہم نے ان اشیا کو جمع کرنا شروع کردیا۔ اس سلسلے میں دو باتیں ہمارے پیشِ نظر تھیں۔ اوّل تو اشیا ہلکی ہوں' تاکہ وزن کم سے کم رہے اور دوسرے مضبوط ہوں۔ کیونکہ سفر شروع ہونے کے بعد ہمیں کسی چیز کا متبادل نہ ملتا' اس کے ٹوٹ جانے یا خراب ہوجانے کی صورت میں... ہمیں ان ہی اشیا سے کام چلانا تھا جو ہم لے کر چلتے۔

سب سے پہلے ہم نے قطب کی ناقابلِ برداشت سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب لباس تلاش کیا۔ واضح رہے' ہم سے پہلے جو افراد وہاں گئے تھے' ان کے لباسوں کا کم سے کم وزن بھی پچاس پونڈز تھا۔ لباس' ٹوپے' دستانے اور جوتے سمیت اگر ہم احتیاطاً دو لباس بھی لے جاتے تو یہ وزن سو پاؤنڈز فی کس اور تین سو پونڈ مجموعی طور پر بن جاتا۔ اس سلسلے میں ہم نے یہ لباس تیار کرنے والے ماہرین سے رجوع کیا اور ان کے مشورے سے مصنوعی ریشے' اون اور روئی سے تیار کردہ ایسے کپڑے کا انتخاب کیا جس کا وزن خاصا کم تھا۔ جوتوں اور ٹوپی کے لیے ہم نے خاص قسم کا سمور منتخب کیا تھا۔ یہ ٹنڈرا کے علاقے میں پائے جانے والے ایک نیولے نما جانور سے حاصل ہوتا ہے اور بے حد گرم ہوتا ہے۔ یہ باہر کے منفی ایک سو اسّی کے درجہ حرارت پر بھی پیروں کو اٹھاون ڈگری فارن ہائیٹ سے زیادہ سرد نہیں ہونے دیتا۔ ہم نے اس کے جوتے یوں بنوائے کہ اس کا فر باہر تھا۔ جو یخ کو پیروں تک آنے سے روکتا تھا۔ اسی فر کا ہم نے کنٹوپ بنوایا تھا۔ جوتے کے تلے پر خاص قسم کے غیر موصل مادے سے بنے ربر کا سول تھا۔ یہ سول اس قسم کا تھا کہ خراب ہونے کی صورت میں ہم بہ آسانی اسے نکال کر اس جیسا دوسرا سول لگا لیتے۔

ہم سے پہلے جو مہم جُو قطب شمالی کی طرف گئے تھے' انہوں نے لکڑی اور دھات کی بنی سلیجز استعمال کی تھیں۔ یہ نہ صرف وزن میں زیادہ تھیں' بلکہ برف پر ان کی کارکردگی بھی اچھی نہیں تھی۔ ٹھنڈ سے یہ ناقابلِ برداشت حد تک یخ ہوجاتی تھیں اور ظاہر ہے ان میں رکھا سامان بھی جم جاتا تھا جسے کھولنا اور استعمال کرنا مشکل ہوجاتا تھا۔ ہم نے پہلے مختلف قسم کے کمپوزٹ سرامکس کی سلیجز بنوائیں اور ان کی بھرپور آزمائش کرکے ایک کاربن فائبر کی بنی سلیجز کو منتخب کیا جو نہ صرف سب سے ہلکی تھی' بلکہ بہت زیادہ سردی میں بھی یخ نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اسکیٹر پر برف نہیں جمتی تھی اور اس میں رکھا جانے والا سامان جمنے سے محفوظ رہتا تھا۔ یعنی پتھر کی طرح سخت نہیں ہوجاتا تھا۔ بہ صورتِ دیگر ہمیں جو پریشانی اٹھانی پڑتی۔ اس کا اندازہ صرف ہمیں ہی تھا۔ مثال کے طور پر وہ خیمہ جو ہم ہر رات کو نصب کرتے اور صبح اکھاڑتے تھے' سلیپنگ بیگ جس میں ہم گھس کر سوتے تھے۔ یہ سب اعلیٰ درجے کے میٹریل سے تیار کیے ہوئے تھے۔ ہلکے مضبوط اور بے حد گرم۔ لیکن زیادہ سردی میں یہ نرم خیمے اور سلیپنگ بیگز فولادی چادر کی طرح سخت ہوجاتے اور انہیں کھولنے اور بند کرنے کے لیے ہمیں باقاعدہ کشتی لڑنا پڑتی۔ ہمارے خیمے خصوصی المونیم کے بنے ہوئے تھے۔ جو منفی ڈیڑھ سو درجے فارن ہائٹ پر بھی اندر کے درجۂ حرارت کو برقرار رکھتے تھے۔ اسی طرح نرم اور مصنوعی ریشے سے بنے سلیپنگ بیگ بے حد گرم تھے۔

ہمارے وزن کا سب سے زیادہ حصہ راشن اور ایندھن پر مشتمل تھا۔ جس کا مجموعی وزن پانچ سو پونڈز کے لگ بھگ تھا۔ ہم نے یومیہ دو پونڈ فی کس خوراک اور نصف پونڈ مائع گیس کا تخمینہ لگایا تھا۔ خوراک سادہ مگر غذائیت اور حراروں سے بھرپور تھی۔ اس میں گائے اور سؤر کا خشک گوشت' اُبلی ہوئی سبزیاں۔ ٹن پیک مچھلی' کھانے کا تیل' شکر اور کافی کے ساتھ کریم کے کچھ ڈبے شامل تھے۔ مزید براں ہم ملٹی وٹامن کی گولیاں بھی ساتھ لائے تھے۔ تاکہ شدید مشقت کے بعد بھی ہماری جسمانی توانائی برقرار رہے۔ یہ خوراک برابر مقدار میں تینوں سلیج گاڑیوں میں تھی تاکہ کسی حادثے کی صورت میں ہم اپنے تمام ہی راشن سے محروم نہ ہوجائیں۔ یہی صورت دیگر اشیا کی تھی جنہیں ہم نے مساوی طور پر تقسیم کرلیا تھا۔ مائع گیس کے ہمارے پاس پندرہ لیٹر والے تین سیلنڈر تھے۔ وزن کم رکھنے کے لیے سیلنڈر بھی فائبر گلاس کے بنے ہوئے تھے۔ روزانہ نصف پونڈ گیس ہمارے کھانا اور کافی وغیرہ تیار کرنے کے علاوہ چھ گھنٹے خیمے کو گرم رکھنے کے لیے کافی تھی۔ ہم اپنے ساتھ مختصر سائز کے دو چولھے بھی لے جارہے تھے۔

خوراک کے بعد ہمارے پاس دوسرا سب سے وزنی سامان جدید برقی آلات تھے۔ ان میں تین عدد دستی سائز کے ریڈیو ٹرانس مٹر شامل تھے۔ یہ وی ایچ ایف پر کام کرتے تھے اور طویل فاصلوں کے لیے کارآمد نہیں تھے۔ ہم چاہتے تو اپنے ساتھ شارٹ ویو ریڈیو ٹرانس مٹر لا سکتے تھے لیکن یہ اکیلا ٹرانس مٹر ہی ان دستی سائز کے ریڈیوز سے دس گناہ بھاری تھا۔ دستی ریڈیو پر ہم نے وہ فریکوئنسی سیٹ کرالی تھی

جو (SAS)اسکینڈے نیوین ائرسروس کے طیارے استعمال کرتے تھے۔ یہ واحد سروس تھی جو قطب شمالی کے اوپر سے گزر کر یورپ اور شمالی امریکا کو آپس میں ملاتی تھی۔ چوبیس گھنٹے میں SAS کی کم از کم تین پروازیں ٹنڈرا کے علاقے سے گزرتی تھیں۔ ہمارے پاس ان کا شیڈول تھا۔ لہٰذا ہم چاہتے تو ان سے رابطہ کرکے کوئی بھی پیغام اپنے گھر والوں کو پہنچا سکتے تھے۔

اس کے باوجود کسی ہنگامی صورتِ حال کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش آجاتا اور اس وقت علاقے سے ایس اے ایس کا کوئی طیارہ نہ گزر رہا ہو۔ تو اس صورت میں ہنگامی امداد کے پیغام کے لیے ہمارے پاس ایک بیکون ٹرانسمٹر تھا۔ جو طویل فاصلوں تک مقررہ سگنل بھیج سکتا تھا۔ یعنی اس پر بات چیت ممکن نہیں تھی بلکہ صرف ایک بٹن دبانے سے سگنل اور ہمارا جائے وقوع از خود نشر ہوجاتا۔ جائے وقوع کے لیے اس میں ایک عدد جی پی ایس ریسیور موجود تھا۔ ایسا ہی ایک ریسیور ہمارے پاس بھی تھا اور اس کی مدد سے ہمیں معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کرلیا ہے اور اب اپنی منزل سے کتنی دور ہیں۔ یہ بھاری بھرکم ریسیور ہم اپنے ساتھ لانے پر مجبور تھے۔

بیکون کا سگنل بھیجنے کا مطلب ہوتا ہے ہمیں یا ہم میں سے کسی کو فوری طور پر یہاں سے نکالا جائے۔ یہ سگنل کینیڈا میں موجود اسٹیشن کو ملتا جو قطب شمالی کی طرف جانے والی تحقیقاتی اور مہماتی ٹیموں کا بیس کیمپ تھا اور وہاں سے فوراً ایک طیارہ روانہ کردیا جاتا جو ہمیں آکر لے جاتا۔

○☆○

جمعرات ۱۵ مارچ کو ہمیں سفر کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ میں نے اس روز اپنے ننھے بیٹے میکس اور بیوی دیبچے کو بہت یاد کیا۔ جو ناروے کے ایک شہر میں اپنے خوب صورت، گرم اور محفوظ گھر میں میری بہ حفاظت واپسی کے لیے دعاگو ہوں گے۔ میری جیب میں ایک چھوٹی سی دھاتی تصویر تھی۔ اس میں دیبچے میری بانہوں کے گھیرے میں ننھے میکس کو گود میں لیے ہوئے تھی۔ ہمارے چہروں پر وہ حقیقی مسرت اور طمانیت تھی جو صرف ایک دوسرے کے لیے بے غرض محبت کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ میں جب بھی یہ تصویر نکال کر دیکھتا، میرے جسم میں توانائی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ چلتے وقت دیبچے نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں واپس ضرور آؤں گا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنی زندگی کی قیمت پر یہ مہم سر کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں از خود کوئی خطرہ نہیں مول لوں گا۔ البتہ قدرت نے میری قسمت میں کوئی حادثہ رقم کردیا ہو تو میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ دیبچے بھی جانتی تھی کہ حادثہ تو گھر میں بیٹھے آدمی کو بھی پیش آسکتا ہے۔

۱۵ مارچ کو ہم نے سات میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ آج کا دن خوش گوار تھا۔ سوائے ایک حادثے کے، میرے جوتے کا سول نکل گیا تھا اور اسے دوبارہ جوڑنے میں پورے دو گھنٹے ضائع ہوگئے تھے۔ اگر میں اپنے گھر پر ہوتا تو مجھے سول جوڑنے میں دس منٹ بھی نہ لگتے لیکن ایک برف زار میں، منفی ستر درجے کی سردی میں، نصف انچ موٹے دستانوں میں سُن ہوتی انگلیوں سے یہ کام دو گھنٹے میں ہی ہوسکتا تھا۔ یہ ہمارے پورے سفر کے دوران میں سب سے زیادہ سردی تھی۔ اوپر سے فراٹے بھرتی یخ بستہ ہوا جب ہمارے چہروں سے ٹکراتی تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ جو کھلی فضا میں آتے ہی موتیوں کی طرح جم جاتے تھے۔ ہم انہیں چہرے سے جھٹک دیتے تھے۔ اصل مسئلہ اس وقت پیش آتا تھا جب یہ آنسو ہماری داڑھی مونچھوں میں گھس کر جم جاتے تھے۔ اور ان کے وزن سے ہماری داڑھی بھاری ہوجاتی تھی۔ پھر ہم رات کو سوتے وقت چولھے کی حرارت سے انہیں پگھلا کر داڑھی مونچھیں ہلکی کرتے تھے۔

اگلے روز ہم نے اوپر سے گزرتی SAS کی ایک فلائٹ سے رابطہ کرکے اپنے گھر والوں کے لیے پیغامات ریکارڈ کرائے تھے اور اس سے اگلے دن پہلا سنگین حادثہ پیش آیا۔ جس نے ہماری پوری مہم کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ گیئر اپنی سلیج کھینچ رہا تھا کہ سلیج ایک گڑھے میں پھسل گئی۔ اور جاتے ہوئے گیئر کو بھی ساتھ کھینچ کرلے گئی۔ اس کی کمر سلیج کے کنارے سے ٹکرائی تھی۔ بہ ظاہر چوٹ خاص نہیں تھی۔ ہم نے خاصی جدوجہد کے بعد گیئر اور سلیج کو گڑھے سے نکال لیا تھا۔ اس کی چوٹ کے اثرات اگلے روز میں ظاہر ہوئے۔ اب گیئر چلتے ہوئے ہر قدم پر کراہ اٹھتا تھا۔ دوسرے روز کی شام اس نے رودینے والے لہجے میں کہا۔

”بس، اب میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم مہم ترک کرکے واپس چلیں“ ارلنگ نے کہا۔

”تم لوگ آگے جاسکتے ہو اور میرے بغیر بھی کوشش کرسکتے ہو۔ لیکن اب میں خود اپنا بوجھ نہیں اٹھا پارہا۔ بہتر ہوگا تم میرے لیے ایمرجنسی پیغام نشر کردو۔“

ظاہر ہے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

ارلنگ نے بیلون ریڈیو نکالا اور اس کا ٹرانس میٹر کرنے والا بٹن دبادیا۔ ٹرانسسٹر کا سرخ بلب روشن ہوگیا۔ جس کا مطلب تھا کہ سگنل نشر ہوگیا تھا۔

"تم اپنا سفر جاری رکھو" گیئر کی آنکھوں میں آنسو تھے "مجھے یقین ہے تم دونوں قطب سر کرلوگے۔"

ہم نے دو انجنوں والے اوٹر طیارے کی آمد سے پہلے ایک ہموار میدان تلاش کیا۔ جس پر طیارہ اتر سکے۔ یہ میدان ہمیں ایک میل بعد ہی مل گیا تھا۔ ہم نے یہیں کیمپ لگالیا۔ میرا خیال تھا کہ پیغام نشر ہونے کے چھ گھنٹے کے اندر اوٹر طیارہ آجائے گا۔ لیکن دو دن گزر گئے اور طیارہ نہیں آیا۔ میں اور ارلنگ پریشان تھے کہ ہم اس طرح ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے تو ہماری مہم کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ۱۹ مارچ کو ہمارے اوپر سے گزرنے والی SAS کی ایک فلائٹ نے ہمیں بتایا کہ ہمارا نشر کردہ سگنل وصول کرلیا گیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے شدید طوفان کے باعث یوریکا کاری فیولنگ اسٹیشن بند کردیا گیا تھا۔ لہٰذا فی الوقت اوٹر طیارے کی آمد ممکن نہیں تھی۔ البتہ امید تھی کہ یہ ۲۰ مارچ کی دوپہر تک آجائے گا۔ گویا ہمیں ایک روز اور یہاں ٹھہرنا تھا۔ اگر ہم ان تین دنوں میں سفر کرتے تو اپنی منزل سے مزید پچیس چھبیس میل قریب ہوجاتے۔

اوٹر ایک بجے کے قریب آسمان پر نمودار ہوا۔ ہم نے سرخ رنگ سے رن وے کے نشانات بنادیئے تھے لہٰذا اوٹر کو لینڈنگ میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ پائلٹ نے نیچے اتر کر کہا "تم سب نے جانا ہے؟"

"صرف اس نے" میں نے گیئر کی طرف اشارہ کیا "اور ساتھ ہی اس کا سامان بھی۔"

"یعنی تم دونوں سرپھرے آگے جاؤ گے؟" وہ ہنسا "خیر جاؤ، مجھے کیا۔ تم پول تک چلے جاؤ یا کسی دراڑ میں گر جاؤ۔ تمہیں لینے میں ہی آؤں گا۔ یہ بتاؤ سینڈوچ اور کافی چلے گی۔"

ارلنگ کا تو مجھے نہیں پتا لیکن میرا بُرا حال ہوگیا تھا۔ میں نے منہ میں بھر آنے والے پانی کو حلق سے نیچے اتارا اور پوری قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے نفی میں سرہلایا "تم جانتے ہو۔ ہم یہ مہم اس اصول کے تحت سر کررہے ہیں کہ ہم اضافی خوراک کا ایک ذرہ تک نہیں لیں گے۔"

"تمہاری مرضی؟" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ اور ہمارے ساتھ مل کر گیئر کی سلیج اور اس کے سامان کو طیارے پر بار کیا۔ اس کا سامان ہم نے پہلے ہی الگ کرلیا تھا۔ خاص طور پر راشن اور ایندھن۔ اب باقی ماندہ راشن اور ایندھن..... صرف دو افراد کے لیے تھا۔ جانے سے پہلے گیئر ہم سے گلے ملا تو شدتِ جذبات سے اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہم اس کے جذبات سمجھ رہے تھے۔ اس مہم کا خیال سب سے پہلے اسے ہی آیا تھا اور اسی نے سب سے زیادہ محنت بھی کی تھی اور منصوبہ بھی اسی نے تیار کیا تھا اور اب اسے ہی مہم درمیان میں چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا۔

"ہم کامیاب تمہارے پاس آئیں گے" میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہارے لیے دعا کروں گا" گیئر مسکرایا اور طیارے میں سوار ہوگیا۔

چند لمحے بعد اوٹر فضا میں بلند ہوا تو ہم دونوں خود کو بے حد تنہا، اداس اور مایوس محسوس کررہے تھے۔ اس سے پہلے کہ جذبات ہم پر حاوی آجاتے، ہم آگے روانہ ہوگئے۔ سامان ہم نے پہلے ہی اکٹھا کرلیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم نے جو تین دن ضائع کیے تھے، اب ان کا ازالہ کیسے کریں۔ ہم صرف دو تھے اور اب تمام ذمے داریاں جو پہلے تین افراد کے حصے میں آتی تھیں، ہمیں ہی انجام دینی تھیں۔ اس سے کیمپ لگانے، اکھاڑنے اور کھانا بنانے کے وقت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اگرچہ میں اور ارلنگ ایک دوسرے کی رفاقت کے لیے کافی تھے۔ لیکن ہمیں گیئر کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں مہم سے دستبردار ہوجاؤں لیکن پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ ارلنگ ابھی بھی مستقل مزاجی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے بھی غالباً میری مایوسی محسوس کرلی تھی۔ اس لیے وہ اکثر میرا حوصلہ بڑھاتا رہتا۔ مجھے کامیابی کے سنہرے خواب دکھاتا کہ یہ کارنامہ انجام دے کر ہم تاریخ میں امر ہوجائیں گے۔ جلد میں مایوسی اور قنوطیت کی اس کیفیت سے نکل آیا اور پہلے جیسا عزم و حوصلہ محسوس کرنے لگا۔

دوسرے ہفتے میں ہماری حالت میں تھکن، خستگی اور درماندگی نمایاں تھی۔ ہم تھکے تھکے بوجھل قدموں سے اپنی سلیجز کھینچتے آگے بڑھتے تھے۔ ہمارا ہر روز امید پر شروع ہوتا اور یاس پر ختم ہوجاتا تھا۔ ہم ہر روز چھ، سات اور آٹھ میل کا سفر طے کررہے تھے۔ جیسے جیسے ہم منجمد سمندر کے مرکز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ برفانی تودے بڑے اور مہیب ہوتے جارہے تھے۔ ان کے بے پناہ وزن سے منجمد برف جابجا سے تڑخی ہوئی تھی اور نمودار ہونے والی دراڑوں میں پانی جم رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمارے راستے میں حائل ہونے والی دراڑوں

کی تعداد اور چوڑائی میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ کم چوڑی دراڑوں کو ہم چھلانگ لگا کر عبور کرلیتے تھے۔ البتہ درمیانی اور بڑی دراڑوں کو ہم اپنی سلیجوں کی مدد سے عبور کرتے۔ سلیجوں کی شکل باتھ ٹب کی سی تھی اور یہ آرام سے پانی میں تیر سکتی تھیں۔ ہم اپنی اسکیز کو چپو کے طور پر استعمال کرتے اور دراڑ عبور کرجاتے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ دراڑیں ہمیشہ شرقاً غرباً نمودار ہوتی تھیں۔ ورنہ ہم ان میں خاصی تیز رفتاری سے کشتی چلاسکتے تھے۔ ایک دراڑ عبور کرنے یا ایک ناقابل عبور برفانی ٹیلے کے اوپر سے گھوم کر جاتے ہوئے ہمارا بہت وقت ضائع ہوتا تھا اور بعض اوقات محض ایک میل آگے بڑھنے کے لیے ہمیں دائیں یا بائیں کئی میل تک جانا پڑتا تھا۔ پھر طوفان بھی آئے دن ہمارا راستہ روکتے تھے۔ جیسے ہی طوفان کی آمد کے آثار نمودار ہوتے، ہم کسی محفوظ ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کرکے اس میں گھس جاتے اور جب تک باہر طوفان جاری رہتا، ہم اندر پڑے سوتے رہتے۔ ایک طرح سے طوفان ہمارے لیے مفید بھی ہوتے تھے۔ ہمیں آرام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ساتھ ہی برف باری کی وجہ سے گڑھے اور دراڑیں بھی بھرجاتی تھیں اور اگلے ایک دو روز تک ہم آرام سے اور کسی قدر تیز رفتاری سے سفر کرتے تھے۔

جو لوگ جغرافیہ اور ارضیات سے واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہوگا کہ اٹھاسی درجے عرض البلد کے بعد شمال اور جنوب دونوں میں دن و رات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہاں چھ مہینے دن رہتا ہے اور اتنی ہی طویل رات ہوتی ہے۔ دن کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سورج طلوع ہوکر افق پر ایک ہی جگہ اٹکا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ چند گھنٹوں کے لیے غروب بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن جون اور جولائی کے مہینوں میں یہ سورج مستقل نظر آتا ہے، بہ شرط کہ آسمان پر بادل نہ ہوں۔ قطب کے قریب یہ کیفیت اتنی کامل ہوتی ہے کہ یہاں پورے چھ مہینے کا دن اور اتنے ہی عرصے کی رات ہوتی ہے۔ ہم جب سفر کررہے تھے تو اب ہمہ وقت دن رہتا تھا۔ اگر آسمان پر بادل نہ ہوتے تو ہم بیشتر وقت سورج کو دیکھ سکتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ٹنڈرا کا سورج بھی ٹھٹھرا ہوا اور حرارت سے خالی لگتا ہے۔ اس کی بے جان کرنوں میں ذرا بھی تمازت نہیں ہوتی ہے۔ یہ بس ذرا ایک بہتر درجے کا چاند محسوس ہوتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہماری بھوک میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا اور ہم بیشتر وقت بھوکے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ ہم ڈٹ کر کھانا کھاچکے ہوتے تھے۔ میں بتاچکا ہوں کہ ہمارا راشن بہت زیادہ غذائیت والی اشیا پر مشتمل تھا۔ ہم نارمل خوراک سے کہیں زیادہ لے رہے تھے۔ تقریباً پونے چھ ہزار کیلوریز روزانہ۔ یہ ایک روز کی عام خوراک سے دوگنا زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم بھوکے رہتے تھے۔ کیونکہ شدید مشقت میں یہ سب ہضم ہوکر رہ جاتا تھا۔ میرے جسم میں چربی کا ایک فی صد بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ مجھے شبہ تھا کہ میں نے اپنا ایک یا دو پاؤنڈ وزن کھودیا تھا۔ اگر اتنی خوراک ہم عام دنوں میں کھاتے تو پھول کر کپّا ہوجاتے۔ صبح کا ناشتا انڈوں، جام، مارجرین اور دلیے پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوپہر کو ہم اُبلی ہوئی سبزیاں اور مچھلی لیتے تھے۔ ساتھ ہی پچاس گرام کھانے کا تیل بھی۔ اور رات کو سونے سے پہلے ہم اُبال کر خشک کیا ہوا سؤر کا یا گائے کا گوشت اور اس کے ساتھ تلے ہوئے آلو یا چاول لیتے تھے۔ اناج ہم نے بہت کم رکھا تھا کیونکہ یہ سب سے کم توانائی فراہم کرتا ہے۔ بہرحال اس کے نتیجے میں ہمارے پیٹ بری طرح گڑبڑ ہوگئے تھے۔ اور مہم سے واپسی پر میں خاصے عرصے شدید قسم کے قبض میں مبتلا رہا۔ اس وقت یہ میرے لیے باعث رحمت تھا کیونکہ شدید سردی میں رفع حاجت کے لیے جانے کا تصور ہی ہماری روح فنا کردینے کے لیے کافی تھا۔

"واہ مزہ آگیا!" ارلنگ کھانے کے دوران میں مسلسل کہتا رہتا حالانکہ مچھلی اور چاول اسے پسند نہیں تھے اور خوراک بھی کوئی خاص لذّت نہیں رکھتی تھی لیکن اس خوفناک بھوک میں ہمیں گھاس بھی من و سلویٰ سے کم نہیں لگتی تھی، پسند و ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب ہم دوپہر کے کھانے یا رات کے ڈنر کے وقت رکتے تھے تو ہماری بے تابی ان کتوں سے مشابہ ہوتی جنہیں خوراک ملنے والی ہو۔ اکثر ہم ادھ کچا ہی کھاجاتے تھے۔ صرف کافی ہم اچھی طرح اُبال کر پیتے تھے کیونکہ بہرحال یہ بھوک مٹانے والی شے نہیں تھی۔ اگر آج مجھ سے پوچھا جائے کہ میں نے کب سب سے بڑی مصیبت کا سامنا کیا تو میں بلا جھجک جواب دوں گا "قطب شمالی سر کرتے ہوئے بھوک لگنا۔"

ابتدا میں ہمارے ذہن خیالات سے پُر رہتے تھے۔ مہم کے بارے میں، گھر والوں کے بارے میں اور اپنی زندگی کے بارے میں لیکن ایک مہینے بعد ہمارے ذہنوں میں صرف اپنی منزل رہ گئی تھی اور وہاں تک پہنچنے کا خیال۔ ہر قیمت پر۔ ہر روز اور ہر وقت ہمارے ذہن میں یہی رہتا تھا کہ آج ہم نے کتنا فاصلہ طے کرلیا ہے اور اب ہماری منزل کتنی دُور رہ گئی ہے۔ ہم دنیا کے بدترین اور دشوار گزار ترین مقام سے

گزر رہے تھے۔ جہاں ہر طرف حادثے گھات لگائے بیٹھے
تھے کہ کب موقع پا کر ہمیں دبوچ لیں۔ کبھی ہمارے قدموں
تلے برف تڑخ جاتی اور کبھی ہماری سلیج کسی دراڑ میں لڑھک
جاتی اور ہم بہ مشکل اسے کھینچ کر نکالتے۔ کبھی کبھار سلیج
کے نچلے حصے میں پانی جم جاتا اور ہمیں سوئے اور ہتھوڑے
سے اس برف کو توڑنا پڑتا ورنہ سلیج کا وزن بڑھ جاتا تھا۔

۴ اپریل کو ہمارے سامنے ایک کم چوڑی دراڑ آئی۔
جس میں چار فٹ نیچے سرد نیلگوں پانی چمک رہا تھا۔ اس کی
چوڑائی کم سے کم پانچ فٹ تھی۔ عام حالات میں ہم اسے
پھلانگنے کی کوشش کرنے کے بجائے دراڑ کے ملنے کا انتظار
کرتے جو عام طور سے چار پانچ گھنٹوں میں مل جاتی یا اتنی مختصر
ہو جاتی کہ ہم پیر بڑھا کر اسے عبور کر لیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی
کہ اتنی چوڑی اور گہری دراڑ کے پار سلیج لے جانا مشکل کام
تھا۔ مگر اس وقت ہم وقت کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے اور
اپنے شیڈول سے خاصے پیچھے تھے اور اب ہم ایک منٹ
گنوانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ہم نے دراڑ عبور
کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے میں پار گیا اور پھر اپنی سلیج کھینچ لی۔
مگر جب ارلنگ کی باری آئی تو اس نے اپنی اسکیز اتارے
بغیر دراڑ عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔

”حماقت مت کرو“ میں نے چلّا کر کہا ”اسکیز اتار کر
آؤ۔“

”کچھ نہیں ہوتا“ وہ ہنسا تو مجھے اس کے انداز میں کسی
قدر ہیجان نظر آیا۔ غالباً وہ اسکیز اتارنے اور پہننے میں دس
پندرہ منٹ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر دوڑ
لگائی اور دراڑ کے کنارے آکر اچھلا۔ دوسرے کنارے تک
پہنچتے ہوئے معاً اس کی اسکیز کا رخ ذرا سا بدلا اور وہ دراڑ
کے کنارے سے ٹکرائی۔ ارلنگ کو جھٹکا لگا۔ اس کا نچلا دھڑ
سیدھا دراڑ میں گیا اور اوپری حصہ دراڑ کے کنارے گرا
تھا۔ فوراً ہی اس نے اپنی چھڑی کی نوک برف میں نہ گاڑ دی
ہوتی تو وہ سیدھا پانی میں جاتا مگر ابھی بھی اس کا جسم نیچے کی
طرف جا رہا تھا اور میں دوڑ کر اسے نہ پکڑ لیتا تو وہ پانی میں
گرتا۔ لیکن ہم دونوں کے مشترکہ بوجھ سے کنارا ٹوٹنے لگا۔
میں ارلنگ کو جتنا اوپر کھینچتا، برف اتنا ہی ٹوٹتی جاتی۔ میں گویا
ارلنگ کو پیچھے کھینچ رہا تھا اور اس کے جسم سے برف ٹوٹ کر
ایک نالی سی بن رہی تھی۔ بالآخر میں اسے محفوظ حد تک لے
جانے میں کامیاب رہا اور پھر ہم دونوں بے دم ہو کر گر گئے۔
دس پندرہ منٹ تک ہماری سانس قابو میں نہیں آئی۔ پھر ہم
نے اٹھ کر اپنی سلیج گاڑیوں کو کھینچا اور آگے روانہ ہو گئے۔

اس حادثے نے وقتی طور پر ہمیں دہلا دیا تھا۔ اگر ہم پانی میں
گر جاتے تو محض چند منٹ میں سردی ہماری جان لے لیتی۔
ہمیں بیکون ریڈیو سے پیغام نشر کرنے کی مہلت بھی نہ ملتی۔
دراڑ میں گر کر ہماری لاشیں بھی منجمد ہو جاتیں یا تو سمندر کی
نظر ہو جاتیں یا پھر کسی تودے میں نہ جانے کب تک کے لیے
محفوظ ہو جاتیں۔ ہم یوں غائب ہو جاتے کہ ہمارا نام ونشان
بھی نہ ملتا اور ہمارے گھر والے ہمیں روتے رہ جاتے۔

۱۲ اپریل تک ہم بُری طرح تھک چکے تھے۔ سردی،
مسلسل مشقت اور چاروں طرف پھیلے وحشت ناک سناٹوں
سے ہمارے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ ہمارے جسم کے
تمام کھلے حصوں کی جلد مردہ ہو کر بھوری رنگت اختیار کر گئی
تھی۔ ارلنگ کی ناک چھلے ہوئے ٹماٹر سے مشابہ نظر آنے لگی
تھی اور میری ٹھوڑی کا ایک حصہ مستقل سُن ہو گیا تھا۔ اس
کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ یہ فراسٹ بائٹ کا شکار ہو گیا
تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ جسم کا کوئی حرکت کرنے والا حصہ
نہیں تھا ورنہ شاید مجھے بھی واپسی کا راستہ پکڑنا پڑتا۔ اور اس
کے ساتھ ہی ہماری مہم کا خاتمہ ہو جاتا۔

نواسی ڈگری میں آتے ہی ہمیں شمال سے جنوب کی
طرف بہنے والی ہوا کی طاقت ور رو کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بے
حد یخ بستہ ہوائیں سے چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل
رہی تھی اور ہمیں آگے بڑھنے میں زبردست مزاحمت کا سامنا
کرنا پڑ رہا تھا۔ بلکہ باقاعدہ لڑ کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے
باوجود ہماری کارکردگی پہلے سے بہتر تھی۔ گزشتہ روز ہم نے
آٹھ میل کا سفر طے کیا تھا۔ ہوا میں برف کے باریک ذرات
تھے جو چھروں کی طرح ہمارے چہرے سے ٹکراتے اور اگر
ہماری آنکھوں پر عینکیں نہ ہوتیں تو یہ ذرات ہمیں اندھا
کر دیتے۔

آج ۱۴ اپریل کے دن میکس کی دوسری سالگرہ تھی۔ وہ
یقیناً گھر میں ماں اور دوسرے رشتے داروں میں گھرا کیک کاٹ
رہا ہو گا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کا باپ گھر سے ہزاروں
میل دُور ایک ہولناک برفانی ویرانے میں حادثات اور
مشکلات سے نبرد آزما تھا اور موت سے کھیل رہا تھا۔ میں نے
دل ہی دل میں میکس سے معذرت کی اور اس سے وعدہ کیا کہ
اگر میں اس مہم سے زندہ سلامت واپس لوٹ گیا تو بہت سارا
وقت اس کے ساتھ گزاروں گا۔ بس ذرا سا انتظار اور
میرے بچے۔ ساتھ ہی مجھے ڈینیچے بھی شدت سے یاد آ رہی
تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ گھر سے دور اور کسی چیلنج کا شکار
لوگوں کو سب سے زیادہ اپنی بیوی یاد آتی ہے جو اس کی سب

سے قریبی ہمدرد، مونس وغم خوار ہوتی ہے۔ دیکھیے میرے لیے صرف ایک بیوی ہی نہیں بلکہ بہت اچھی دوست بھی تھی۔

غذا دن بہ دن ہمارے لیے ناکافی ہوتی جارہی تھی۔ دن بھر مشقت اور آگے بڑھنے کی تگ ودو میں تو پتا نہیں چلتا تھا لیکن جب سونے کے لیے اپنے سلیپنگ بیگ میں جاتے تو رات بھرپیٹ میں چوہے سے دوڑتے رہتے تھے اور آنتیں بالکل خالی محسوس ہوتیں۔ سونے کے دوران میں بھی میں کھانے کے خواب دیکھا کرتا تھا اور میری ناک ان اشیا کی خوشبو سونگھا کرتی تھی جن کا اس ویرانے میں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ مثلاً چیز کیک، پنیر، سینڈوچ، بھُنا ہوا ٹرکی اور کافی کی مہک۔ مجھ سے زیادہ بری حالت ارلنگ کی ہوتی تھی۔ وہ کھانے پینے کا شوقین تھا اور اب اس بھوک کے عالم میں اسے مقررہ خوراک پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہم اپنے مقرر کردہ راشن سے تجاوز نہیں کرسکتے تھے۔ ورنہ ہم طے شدہ ساٹھ دنوں سے پہلے ہی اسے ختم کربیٹھتے۔ جبکہ موجودہ حساب سے یہ ستّر دنوں تک چل سکتا تھا اور ابھی ہم اپنی منزل سے بہت پیچھے تھے۔ یہ تو صاف لگ رہا تھا کہ ہم ساٹھ دن کے اندر قطب شمالی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

عام روایت سے ہٹ کر ہم نے شروع سے کسی کو مہم کا لیڈر نہیں بنایا تھا۔ ہم تمام کام مل جل کر کرتے تھے اور فیصلے باہم مشورے سے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ گیئر بھی مساوی حیثیت رکھتا تھا جو ایک طرح سے اس مہم کا بانی تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اور ارلنگ رہ گئے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے درمیان ذہنی ہم آہنگی کی کمی تھی اور میں تھوڑا سا پاگل بھی ہوں۔ لہٰذا ہمارے درمیان معمولی مسائل پر اختلاف ہونے لگا۔ مثلاً کون سا راستہ اختیار کرنا ہے اور راستے میں آنے والی دراڑ عبور کرنے کے لیے دائیں طرف جانا ہے یا بائیں طرف۔ وقتی طور پر یہ اختلاف ہمارے درمیان ناراضگی پیدا کردیتے تھے مگر جلد ہمارا موڈ درست ہوجاتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مسئلے کو اکثر ارلنگ سلجھایا کرتا تھا۔ وہ باہمت، بلند حوصلہ اور ذہین ساتھی تھا اور اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں راستے میں ہی ہمت ہار جاتا۔

۱۹ اپریل کی شام جب ہم کیمپ لگانے کے لیے کوئی موزوں جگہ تلاش کررہے تھے، SAS کی ایک فلائٹ ہمارے اوپر سے گزر رہی تھی۔ اوپر سے گزرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ عین ہمارے سروں پر سے گزر رہی تھی۔ بلکہ پچاس یا سو میل کے دائرے سے کہیں سے گزرتا تھا۔ تو ہم اپنے دستی ریڈیو پر اس سے رابطہ قائم کرلیتے تھے۔ معاً ہمارے ریڈیوز پر اشارہ موصول ہوا۔ میں نے اور ارلنگ نے ایک ساتھ اپنے ریڈیو آن کیے۔

"SAS۔SAS، ہیڑ، اوور!" پائلٹ کہہ رہا تھا "کیا پولرز میری آواز سن رہے ہیں، اوور!"

"ہم سن رہے ہیں اوور!" ارلنگ بولا... کیونکہ پولر ہمارا ہی کوڈ تھا۔

"تمہارے لیے پیغام ہے۔ سر رینالف فینسی کی پارٹی نے ستاسی ڈگری شمال چھتیس منٹ تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ تم ان سے خاصے پیچھے ہو۔"

یہ بات تو ہم بھی جانتے تھے کہ ہم خاصے پیچھے تھے اور یہ وہی تین دن تھے جو ہم نے اوٹر طیارے کے انتظار میں ضائع کیے تھے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ مقابلہ انسان کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ اب تک ہم سُست روی سے اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں تھے لیکن برطانوی مہم کا سن کر ہمارے جسموں میں جیسے ایک نیا جوش اور ولولہ دوڑ گیا تھا۔ ہم ان سے تین دن پیچھے تھے۔ اس کے باوجود ہم مقابلے کو تیار ہوگئے۔

"ہمیں ان کو پیچھے چھوڑنا ہوگا" ارلنگ پُرجوش لہجے میں بولا۔

"اور اس مقصد کے لیے ہمیں ایک نیا ٹائم ٹیبل بنانا ہوگا" میں نے اس کی تائید کی۔

خاصے غوروخوض کے بعد ہم نے طے کیا کہ اپنے دن کو تیس گھنٹوں میں تقسیم کرلیں۔ دن رات کا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ دن ہی دن تھا۔ جب ہم رات سونے جاتے تب بھی سورج چمک رہا ہوتا تھا۔ تیس گھنٹے کا دن کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ کھانے، پینے، سونے اور کیمپ لگانے اور اکھاڑنے میں تو وہی بارہ گھنٹے لگتے لیکن سفر کے لیے اب ہمیں کُل اٹھارہ گھنٹے دستیاب تھے۔ جس میں ہم روز چھ سات میل اضافہ کرسکتے تھے۔ لنچ کے وقفے کو ہم نے ایک کے بجائے دو گھنٹے کا کرلیا تھا۔ یوں درمیان میں کچھ دیر آرام بھی کرلیتے تھے۔ البتہ سونے کے لیے ہمیں وہی آٹھ گھنٹے میسر تھے۔ اگلے روز ہم نے بارہ میل طے کیے۔ اس سے ہمارا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔

ایک ایک گھنٹا کرکے ہم سر رینالف کی سبقت کم رہے تھے۔ جو سائبیریا کی طرف سے قطب شمالی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یعنی ہماری مخالف سمت سے۔ ان کی پارٹی بڑی تھی۔ البتہ راستے کی صعوبتیں اور رکاوٹیں ہم دونوں کے لیے یکساں تھیں۔ سوائے اس کے کہ انہیں ہماری نسبت منجمد سمندر پر زیادہ سفر کرنا پڑا تھا کیونکہ سائبیریا کی طرف سے خشکی

کا حصہ قطب سے سات سو میل پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ مہم سے زیادہ مقابلہ بن گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سر رینالف کی پارٹی ہماری پیش رفت سے بے خبر نہیں ہوگی۔

جیسے جیسے ہم شمال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سورج زیادہ روشن اور چمک دار ہوتا جا رہا تھا اور اسی تناسب سے گرمی بڑھ رہی تھی۔ ایک روز تو اچھی خاصی گرمی تھی۔ غالباً یہ بائیس اپریل کا دن تھا اور درجۂ حرارت منفی اکتیس درجے فارن ہائٹ تھا۔ خاصے عرصے بعد ہم نے ہاتھوں سے دستانے اتارے تھے۔ جن پر میل کی تہیں جم گئی تھیں۔ عام طور سے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے سرد مقام عین قطبین ہیں، یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی۔ سردیوں میں تو یہ بات درست ہوتی ہے لیکن گرمی کے دنوں میں قطبین پر اچھی خاصی گرمی ہوتی ہے اور کبھی کبھار تو درجۂ حرارت صفر درجے سینٹی گریڈ تک بھی جا پہنچتا ہے۔ اس گرمی سے برفانی تودے پگھل کر اور ٹوٹ کر خط استوا کی طرف پیش قدمی کرنے لگتے ہیں اور جیسے جیسے خط استوا سے قریب ہوتے ہیں گرمی سے پگھلتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض عظیم الشان گلیشیئر ساٹھ اور پچاس ڈگری عرض البلد تک جا پہنچتے ہیں۔ اور خاصے نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ اکثر بحری جہاز بے خبری میں ان سے جا ٹکراتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ میں نے ایسے ہی ایک برفانی تودے پر چھ دن گزارے تھے جو نصف میل لمبا چوڑا تھا اور جب اس کا سائز فٹ بال کے گراؤنڈ جتنا رہ گیا تھا تو میں اس سے اپنی کشتی سمیت رخصت ہو گیا۔ کیونکہ اب یہ خطرناک ہو گیا تھا کہ کسی وقت بھی گرمی سے ٹکڑے ہو جاتا یا اچانک ہی کروٹ بدل لیتا اور میں اگلے ہی لمحے سمندر کی تہ میں ہوتا۔

موسم بہتر ہونے کے باوجود طاقت ور قطبی ہوا کے دھارے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور گرمی بڑھنے سے برف بھی جا بہ جا تڑخ رہی تھی۔ نت نئی دراڑیں نمودار ہو رہی تھیں اور بعض جگہ تو بیک وقت درجن بھر دراڑیں یکے بعد دیگرے ہمارے راستے میں حائل ہوتی تھیں۔ ہم شدت سے کسی برفانی طوفان کے خواہش مند تھے جو ان سب دراڑوں کو بھر دے۔ مگر افسوس یہ قدرت کے اختیار میں تھا، ہمارے نہیں۔ بڑے برفانی تودے جو برف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے شدید مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے اپنی رفتار میں کوئی کمی نہیں کی۔ راشن اور ایندھن کا خاصا بڑا حصہ استعمال کر لینے سے ہمارے سامان کے وزن میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ لہٰذا اب ہم بلا تکلف سلیج گاڑیوں کو کشتی کے طور پر استعمال کر کے راہ میں حائل چوڑی دراڑیں عبور کر جاتے تھے جبکہ مجھے معلوم تھا کہ سر رینالف کی ٹیم ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے پاس جو سلیج گاڑیاں تھیں وہ پانی پر نہیں تیر سکتی تھیں اور انہیں لازماً یا تو کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں سے دراڑ عبور کر سکیں۔ یا دراڑ کے جمنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ دونوں صورتوں میں ان کا جو وقت ضائع ہوتا۔ وہ ہم سے کہیں زیادہ ہوتا۔ جبکہ ہم ان کی نسبت کہیں تیزی سے اور زیادہ وقت سفر کر رہے تھے۔ ۲۴ اپریل کو جبکہ ہماری مہم شروع ہوئے سینتالیسواں دن تھا، ارلنگ پچھلے کچھ روز سے سُست اور مایوس نظر آ رہا تھا۔ اکثر وہ مجھ سے پیچھے رہ جاتا اور مجھے رُک کر اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس کے اعصاب اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے تھے۔ ایسے میں مایوسی اور قنوطیت لازمی تھی۔ پہلے وہ مجھے حوصلہ دیتا تھا اور منزل تک پہنچنے کے خواب دکھاتا تھا تو اب یہ کام میں نے سنبھال لیا۔ میں باتوں سے اس کا دل بہلاتا۔ اگرچہ ہمارے پاس ریڈیو کے بیٹری سیل کم رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود میں اسے ناروے ریڈیو سے موسیقی سنواتا۔ ارلنگ موسیقی کا شیدائی تھا۔ خاص طور سے لوک موسیقی کا۔ اسے بے شمار گیت اور دُھنیں یاد تھیں۔ جنہیں وہ دوران سفر گنگناتا رہتا تھا۔ میری کوششوں کا نتیجہ مثبت نکلا اور ارلنگ نے جلد خود کو سنبھال لیا۔

جب ہم سفر پر روانہ ہوئے تھے... تو گیئر نے دو عدد میگنم ریوالور بھی لیے تھے۔ چھوٹے سائز کے اس ہتھیار کی ہلاکت خیزی بے مثال تھی اور یہ برفانی ریچھ جیسے طاقت ور درندے کا ایک گولی میں کام کر دیتا ہے۔ پورے سفر کے دوران میں ان میں سے ایک گن کو اپنی پشت پر لادے رہا۔ اس کا ساڑھے چار کلو کا وزن میرے لیے اذیت کا باعث بن گیا تھا۔ مہم کے پچاسویں دن میں نے میگنم نکال کر سامان میں ڈال دیا۔

"اب میں اس سے زیادہ یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔"

"ویسے بھی اب یہ بے کار ہے" ارلنگ نے کہا "میں نے سنا ہے کہ برفانی ریچھ اٹھاسی ویں عرض البلد کے بعد نہیں پائے جاتے۔ اچھا ہے تم ریوالور اب سامان میں رکھ دو۔"

جس کسی نے بھی ارلنگ کو یہ بتایا تھا کہ برفانی ریچھ اٹھاسی ویں عرض البلد کے بعد نہیں پائے جاتے اس نے قطعاً غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی دن ہماری ملاقات ایک برفانی ریچھ سے ہوگئی۔ میں آگے تھا اور اس پر

میری نگاہ اس وقت پڑی جب درمیانی فاصلہ سو فٹ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ویسے بھی سفید برف کے ڈھیر میں اس سرتاپا سفید درندے کو دیکھنا بہت مشکل ہے۔

"ریچھ!" مجھ سے پہلے ارلنگ چلّایا اور ریچھ کے کان کھڑے ہوگئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہمیں دیکھا اور پچھلے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کا قد سات فٹ کے قریب تھا اور اس کے اگلے پنجے بلا مبالغہ فٹ بھر چوڑے تھے۔ مجھے وہ بھوکا بھی لگ رہا تھا کیونکہ اس کا پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا۔ وہ ایک بھیانک غراہٹ کے ساتھ ہماری طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بھوک کے عالم میں وہ کس قدر خوفناک ہوگا۔ جب ہم انسان خوراک ملنے کے باوجود بھوک سے پاگل ہوجاتے تھے تو وہ پھر بھی درندہ تھا اور غالباً خاصے وقت سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سلیج کی طرف لپکا۔ میں نے دیوانہ وار وہ بیگ تلاش کیا۔ جس میں میگنم رکھا تھا۔ اس دوران میں ریچھ چھلانگیں مارتا۔ چاروں ہاتھ پیروں کے بل ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناچتی بھوک مجھے اتنی دور سے بھی صاف نظر آرہی تھی۔

"خدا کے لیے برو!!" ارلنگ چلّایا "جلدی کرو۔"

اسی لمحے میرے ہاتھ میں میگنم آگیا۔ میں نے گھوم کر ایک ہوائی فائر کیا کہ شاید ریچھ دھماکے سے ڈر کر بھاگ جائے۔ وہ اتنا قریب آچکا تھا کہ اس کی پُرشور سانسوں کی آواز میں صاف سن رہا تھا۔ دھماکے سے ریچھ قطعی ہراساں نہیں تھا۔ اس وقت غالباً میں توپ بھی داغ دیتا تو اس کی جارحانہ پیش قدمی میں کوئی کمی نہ آتی۔ مجبوراً میں نے ریچھ کا نشانہ لیا اور لگاتار چار گولیاں چلائیں۔ میں کوئی بہت اچھا نشانے باز نہیں ہوں لیکن میری ایک گولی بھی ضائع نہیں ہوئی تو اس کی وجہ ریچھ کی بے تحاشا جسامت تھی۔ ایک گولی اس کے شانے پر لگی۔ دو کمر میں اُتر گئیں اور ایک اس کے کھلے منہ سے حلق میں اُتر گئی اور یہی گولی جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ ریچھ ہم سے کوئی تیس فٹ کے فاصلے پر زمین پر گرا۔ دو چار لوٹیاں پوٹیاں لگائیں اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں نے اس کی موت کی تصدیق نہیں کی۔ ہم فوراً آگے روانہ ہوگئے۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ اس کا جوڑا یہاں موجود ہو جو اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر مشتعل ہوجائے اور ہمیں اسے بھی ختم کرنا پڑے۔ اب تو ارلنگ نے بھی اپنا میگنم ریوالور نکال لیا تھا۔ اس روز ہم نے نو میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔

مئی شروع ہوا تو ہم جیسے اپنی تمام جسمانی توانائی ختم کرچکے تھے۔ ہمارے جسم تھکن سے یوں بوجھل تھے جیسے گوشت و پوست کے بجائے سیسے کے بنے ہوں۔ ہڈیاں خستہ ہو رہی تھیں۔ رات کو جب ہم کیمپ لگا کر اپنے سلیپنگ بیگز میں گھستے تو فوراً سے پیشتر سو جاتے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند کے بعد جب ہم سو کر اٹھتے تو ہمارے وجود میں اس قدر توانائی آچکی ہوتی تھی کہ ہم پورا دن خود کو آگے کی طرف گھسیٹتے رہتے۔ ہمارے جسم توانائی کے ریزرو ذخائر پر چل رہے تھے۔ ایک خیال تھا جو ہمیں آگے کی طرف گھسیٹ رہا تھا کہ ہمیں فتح حاصل کرنی تھی۔ سر رینالف کی ٹیم سے پہلے قطب شمالی تک پہنچنا تھا۔

ایک دُھن میں' ایک جذبے کے زیر اثر ہم آگے بڑھتے رہے۔ برفانی تودے اور دراڑیں عبور کرتے رہے اور بالآخر ہم اٹھاون ویں روز بالکل اچانک ہی قطب پر پہنچ گئے۔ گزشتہ کئی روز سے ہم نے نہیں دیکھا کہ ہم قطب سے کتنی دور ہیں اور جب ہم نے حساب لگایا تو خود کو قطب کے بالکل نزدیک پایا۔ ہمارے اندازے میں پچاس گز کی غلطی کا امکان تھا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے تو ہمیں یقین نہیں آیا اور جب یقین آیا تو مارے خوشی کے ہم پاگل ہوگئے۔ جس کامیابی کے ہم اب تک خواب دیکھتے رہے تھے' وہ اچانک ہی حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔ ہم نے قطب کے مقام پر اپنے ساتھ لایا ناروے کا پرچم نصب کیا۔ پھر ہم نے بیکون ریڈیو پر سگنل دیا کہ ہمیں یہاں سے اٹھالیا جائے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے باقی ماندہ راشن کا فراخ دلی سے استعمال کیا۔ خوب کھایا اور خیمہ لگا کر سوگئے۔ ہم نے ۴ مئی ۱۹۹۰ء کی شام پانچ بج کر بیس منٹ پر قطب تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ ہم یعنی برجی آوس لینڈ اور ارلنگ کیجی پہلے انسان تھے جو پیدل چل کر قطب شمالی تک پہنچے تھے۔

اگلے روز اوٹر آیا تو ہم بدستور پڑے سو رہے تھے۔ طیارے کی آواز سن کر ہم خیمے سے باہر نکلے تو طیارے سے پائلٹ کے ساتھ گیئر کو اُترتے دیکھ کر حیرانی سے زیادہ خوش ہوئے۔ وہ رو رہا تھا۔ یہ بیک وقت خوشی اور دُکھ کے آنسو تھے۔ خوشی ہماری کامیابی کی تھی اور دُکھ اسے کامیابی میں شریک نہ ہونے کا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم مع اپنے سازوسامان کے طیارے میں تھے۔ فضا میں بلند ہو کر پائلٹ نے پہلے قطب کے گرد ایک چکر لگایا۔ ہم نے تصدیق کی کہ ابھی سر رینالف کی پارٹی کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور طیارہ کینیڈا کی طرف پرواز کرگیا۔

● ●

امریکہ کی ایک ریاست کے پہاڑوں میں بھڑک اُٹھنے والی آگ کا سچّا واقعہ

کہتے ہیں جنگل کی آگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ مگر یہ جس آگ کا قصّہ ہے وہ پہاڑوں میں لگی تھی اور یہ واقعہ زیادہ پرانا نہیں، دو جولائی ۱۹۹۴ء کا ہے۔ مقام ہے امریکہ کی ایک ریاست کولوریڈو۔ اس آگ پر قابو پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے گئے اور اس سے کیسے کیسے نقصانات ہوئے یہ قصّہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

کاشف زبیر

قدرت کے عناصر میں سب سے بے رحم اور سفاک چیز آگ ہے۔ ایک طرف یہ رحمتِ خداوندی ہے کہ انسان نے آگ کا استعمال سیکھا اور پھر ترقی کی منازل طے کرتے کرتے یہاں تک آپہنچا مگر دوسری طرف یہی آگ جب قابو سے باہر ہوجاتی ہے تو صحیح معنوں میں خدا کا قہر بن جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے دوزخ کی سزاؤں میں آگ کا عذاب سرِفہرست ہے۔ جن لوگوں نے ٹی وی پر گزشتہ سال انڈونیشیا اور ملائشیا کے جنگلات میں لگنے والی آگ کے مناظر دیکھے ہیں، وہ اس کی قہرناکیوں سے بہ خوبی واقف ہوں گے۔

انڈونیشیا اور ملائشیا دنیا کے ان ممالک میں سے ہیں جو بالکل خطِ استوا پر آباد ہیں۔ آب وہوا مرطوب اور گرم ہے اور بارش بے تحاشا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک کے ایک ایک انچ رقبے پر سبزہ اگا ہے۔ اور یہاں مشہورِ عالم استوائی جنگلات موجود ہیں۔ یہ بے انتہا گھنے ہیں اور اندازہ ہے کہ دنیا میں لکڑی کی کل رسد کا بیس فیصد یہی جنگلات مہیا کرتے ہیں۔ یہاں پر درختوں کی نشوونما اس قدر تیز ہے کہ

کسی علاقے میں درخت کاٹے جانے کے پانچ سال کے اندر ویسا ہی جنگل دوبارہ اگ آتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ بارشوں کی فراوانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ استوائی اور مرطوب جنگلات میں آگ لگنے کے واقعات شاذو نادر ہی ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت محدود ہوتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود جب آگ کو موقع ملا تو اس نے ہزاروں مربع میل علاقے میں پھیلے جنگلات کو جلا کر خاکستر کردیا۔ آگ مہینوں بھڑکتی رہی تھی اور اس نے سیکڑوں انسانوں کے ساتھ لاکھوں جانوروں کو بھی زندہ جلا ڈالا تھا۔ درجنوں قصبے اور شہر آگ سے متاثر ہوئے اور اس سے اٹھنے والے دھوئیں نے لاکھوں افراد کو سانس کا مریض بنادیا۔ پھر خدا کو رحم آیا اور شدید بارش نے بالآخر اس خوفناک جہنم کو بجھادیا۔ جس نے ان ممالک کی معیشت اور قدرتی وسائل کو کئی ارب ڈالر کا نقصان پہنچایا تھا۔ اس صدی کی سب سے قیامت خیز آگ اس جگہ لگی تھی جہاں آگ لگنے کے امکانات ہزار میں سے ایک بھی نہیں تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ننھی سی چنگاری کی شکل میں جنم لینے والی اس آفت کو موقع مل جائے تو یہ کیسی قیامت ڈھا جاتی ہے۔

○☆○

۲ جولائی ۱۹۹۴ء کی اس رات کسی وقت بجلی کڑکی اور روکی کے سلسلہ ہائے کوہ کے علاقے اسٹارم کنگ ماؤنٹین کے پہاڑ پر گری۔ گرمی اور خشک موسم کی پیاسی جھاڑیوں نے آسمان سے گرنے والی ان چھوٹی چنگاریوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور احتیاط سے ان کی پرورش کرنے لگیں۔ پہاڑ کے نیچے آباد قصبے گلین ووڈ اسپرنگز کے باسی بے خبر سو رہے تھے اور ان کے سروں پر قیامت ٹوٹنے والی تھی۔

وسطی امریکا کی اس ریاست کولوریڈو میں یہ مسلسل دوسرا سال تھا جب بارش برسنا بھول چکی تھی۔ پانی سے لدے بادل آتے اور برسے بغیر گزر جاتے تھے۔ درخت اور جھاڑیاں مرجھا رہی تھیں۔ زمین پیاس سے تڑخ رہی تھی۔ پائن اور جونیپر کے نوزائیدہ پودے پانی کی کمی سے مرجھا چکے تھے اور گھاس پیلی پڑ رہی تھی۔ محکمۂ جنگلات کے انسدادِ آگ کے شعبے کے افسران اس صورتِ حال کو بارود کے ڈھیر سے تشبیہ دے رہے تھے۔ جسے تباہی پھیلانے کے لیے صرف ایک چنگاری درکار تھی۔

افسران کا اندازہ درست تھا۔ بارش تو نہیں برسی۔ مگر بجلی ضرور کڑک کر گری اور اس نے پہاڑ کے اوپر انسانی نگاہوں سے اوجھل علاقے میں آگ لگادی۔ کنگ ماؤنٹین کے سلسلے میں یہاں آکر تین پہاڑوں کی ڈھلانیں گر رہی تھیں۔ یہ پہاڑ جنوب، مغرب اور شمال میں تھے۔ مشرق میں دور تک کھلی ڈھلان تھی جو آگے جاکر میدان سے مل جاتی تھی۔ یوں یہ جگہ ایک چھوٹی سی وادی بن گئی تھی مگر اس کی شکل پیالہ نما نہیں تھی۔ بلکہ اس کے اندر بھی کئی ابھرے ہوئے کنارے تھے۔ آگ کا آغاز جنوب میں وادی سے اوپر کنارے سے کئی سو گز دور پہاڑی چوٹی سے کچھ ہی نیچے ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس ڈھلان کی جھاڑیاں اور جنگل آگ سے محفوظ رہے اور آگ نے چوٹی کو عبور کرکے دوسرے اطراف میں پیش قدمی شروع کردی۔ اس کا اصل ہدف وادی اور اس کے اوپر وسیع رقبے پر پھیلے پائن کے پہاڑی جنگلات تھے، یہ شاندار اور طویل قامت درخت آگ کا ایندھن بننے والے تھے۔

یہ جگہ کیوں کہ قصبے سے دور تھی۔ لہٰذا وہاں کسی کو خطرے کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس صبح فائر ڈیپارٹمنٹ کے ایک ہلکے گشتی طیارے نے پہاڑی چوٹی پر بھڑکتی اور سست روی سے پھیلتی آگ کو دیکھ لیا جو چوٹی تک پہنچ چکی تھی اور اب کچھ ہی دیر کی بات تھی کہ شمال مغربی ڈھلان کے جنگلات اس کی زد میں آنے والے تھے۔ طیارے نے فوراً ہنگامی پیغام دیا۔

۴ جولائی کی صبح دو بجے تک انسدادِ آگ کا شعبہ پوری طرح حرکت میں آچکا تھا۔ خشک جھاڑیوں اور گھاس کی وجہ سے آگ زیادہ دھواں دیے بغیر ہی جل رہی تھی لہٰذا فائر ڈیپارٹمنٹ کو اس کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ مزید بدقسمتی کہ انہوں نے موسمیاتی چارٹ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ جس کے مطابق ۴ جولائی کی رات تک علاقے میں جنوب مغربی ہواؤں کی شدت میں تیزی آجانا تھی جو آگ کو تیزی سے پھیلا سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے صرف ایک رومیو ۹۳ ہیلی کاپٹر اور سات افراد بھیجنا مناسب سمجھا۔ ان کے پاس صرف جھاڑیاں کاٹنے کا سازوسامان تھا۔ نہ تو گیس ماسک تھے اور نہ ہی اضافی آکسیجن۔ ان سات افراد کو ایک ہلکے طیارے سے پیراشوٹ کے ذریعے آگ والے مقام پر اترنا تھا۔ اصطلاحاً ایسے فائر فائٹرز کو فائر جمپر کہا جاتا تھا۔ ان کا سربراہ ڈون میکی تھا۔ ۴۳ سالہ میکی کو اس جاب میں نو سال گزر چکے تھے اور وہ گزشتہ چھ سال سے فائر جمپر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اور دو سال سے وہ اپنے گروپ کی سربراہی کر رہا تھا۔ اس کا کام آگ بجھانے اور اسے محدود کرنے کی منصوبہ بندی کرنا، اپنے

کارکنوں کو کام دینا اور ان کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر کے دروازے کے نزدیک بیٹھا نیچے سرخ شعلوں کو دیکھ رہا تھا جن کے انعکاس سے تاریک آسمان بھی سرخ ہو رہا تھا۔

"شاید محکمے کو صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہے" میکی نے سوچا "کیا یہ آگ ان کے بس کی بات ہے ؟"

اس نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ ان میں چھ مرد اور ایک خاتون شامل تھی۔ ان میں سے ہر ایک کم از کم پانچ سال کا تجربہ رکھتا تھا اور اب تک پیراشوٹ کی سو سے زائد چھلانگیں لگا چکا تھا۔ مغربی اور وسطی امریکا میں فائر جمپرز کے نو مراکز تھے اور میکی کا تعلق میولا سے تھا۔ وہ تین گھنٹے کی طویل پرواز کے بعد یہاں پہنچے تھے اور نیچے لگی آگ دیکھ کر میکی حیران تھا کہ انہیں بلانے میں اس قدر دیر کیوں کی گئی۔

اس سال اب تک آگ لگنے کے دو سو واقعات ہو چکے تھے اور یہ ان میں سب سے بدترین آگ تھی۔ جو اس وقت بھی ڈھائی سو ایکڑ کے رقبے پر پھیل چکی تھی اور جنوب مغرب کی تیز ہوا اسے مزید پھیلا رہی تھی۔ تقریباً پچاس ایکڑ کا علاقہ مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں تھا اور وہاں موجود خشک جھاڑیاں اور گھاس آگ کا بہترین ایندھن تھیں۔ اسی اثنا میں میکی اپنے اترنے کے لیے ایک مناسب مقام دیکھ چکا تھا۔ یہ چوٹیوں کا سنگم تھا۔ جس کے ساتھ سطحِ مرتفع تھی اور یہ جگہ آگ سے محض پانچ سو گز کے فاصلے پر تھی کیونکہ ہوا آگ کی سمت سے چل رہی تھی لہٰذا اس بات کا امکان نہیں تھا کہ ان کے پیراشوٹ آگ میں جا اتریں۔

"یہ جگہ بہترین ہے" میکی نے پائلٹ کو بتایا۔ ہوا کے شور کے باعث انہیں چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔ بہرحال پائلٹ سمجھ گیا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کو ایک تنگ چکر دیا اور پندرہ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ جیسے ہی مطلوبہ مقام آیا۔ سب سے پہلے میکی نیچے کو آگیا۔ پانچ سیکنڈ بعد اس کا پیراشوٹ کھل گیا اور کودنے کے نوّے سیکنڈ بعد وہ ٹھیک سطحِ مرتفع پر اتر چکا تھا۔ اس کے ساتھی کارکن بھی دو دو کی جوڑی میں اتر آئے اور پھر انہوں نے سامان کے نو پیکٹ جمع کیے جو پیراشوٹ سے گرائے گئے تھے۔ ان میں اوزار، ایندھن، پانی، خوراک اور ضروریات کا دوسرا سامان موجود تھا۔ جس کی انہیں ضرورت پڑ سکتی تھی۔

شاید قارئین کے نزدیک کسی جنگل کی آگ اور شہر میں لگی آگ میں کوئی فرق نہ ہو حالانکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ رہائشی اور صنعتی علاقوں میں لگی آگ کو پانی اور بعض اوقات مخصوص کیمیکل کی مدد سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اندرون خانہ لگنے والی آگ کو کاربن ڈائی آکسائڈ کی مدد سے بہ آسانی بجھایا جا سکتا ہے مگر جنگلوں کی آگ بالکل مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ اوّل تو یہ وسیع رقبے پر پھیل جاتی ہے۔ دوئم اس تک مشینی ذرائع سے رسائی دشوار ہوتی ہے۔ اسے پانی کے استعمال سے بجھانا دشوار ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ بھی کھلی فضا کی وجہ سے غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان علاقوں میں فائر فائٹرز کو قطعی مختلف حکمتِ عملی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ اس وجہ سے شہری فائر فائٹرز اور جنگل کے فائر فائٹرز کے درمیان اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا کہ پولیس اور فوج کے درمیان ہو سکتا ہے۔

جنگل میں فائر فائٹرز کو کسی فوج کی طرح آگ سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ان کی کارروائی کئی مرحلوں پر مشتمل ہوتی ہے سب سے پہلے آگ کو اس کے علاقے میں محدود کرنا۔ اس کے لیے وہ آگ کے چاروں طرف ایک لائن میں درخت اور جھاڑیوں کو صاف کر دیتے ہیں یوں آگ کو نئے ایندھن کی فراہمی منقطع ہو جاتی ہے۔ اگر درختوں اور جھاڑیوں کی صفائی ممکن نہ ہو تو پانی کی مدد سے آگ کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو آگ کو پھیلنے سے روکنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے اس صورت میں صرف قدرتی ذرائع پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی بارش ہو جائے اور آگ بجھ جائے یا پھر آگ علاقے میں موجود تمام ایندھن کو چاٹ کر از خود بجھ جائے۔

ڈون میکی اور اس کے ساتھیوں نے بھی فوراً جنوب کی جانب سفر شروع کر دیا۔ رات کا آخری پہر تھا مگر شعلوں سے اتنی روشنی ضرور ہو رہی تھی کہ انہیں اپنے کام میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک حفاظتی علاقہ بنایا اور وہاں اپنا حفاظتی سامان رکھ دیا۔ اس میں خاص قسم کے المونیم سے بنا ہوا ایک بڑا سا نیلا خیمہ تھا۔ اگر فائر فائٹرز کہیں آگ میں گھر جائیں تو وہ اس خیمے میں پناہ لے کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔ یہ نہایت غیر موصل قسم کے مادّے سے بنا ہوتا ہے۔ اسے بنیادی طور پر قطبی علاقوں کی سخت ترین سردی سے سائنس دانوں اور مہم جوؤں کو محفوظ رکھنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یہ خیمہ منفی سو درجے سینٹی گریڈ پر بھی اندر حرارت برقرار رکھتا تھا۔ امریکا کی فائر ریسرچ فاؤنڈیشن کو اس کا ایک انوکھا استعمال سُوجھا۔ غیر موصل ہونے کی وجہ سے جس طرح یہ باہر کی ٹھنڈ کو اندر آنے سے روکتا تھا اسی طرح یہ باہر موجود شدید حرارت سے بھی

آدمیوں کو بچا سکتا تھا۔ تجربات میں یہ دیکھا گیا کہ فضا کے پانچ سو ڈگری سینٹی گریڈ کے ماحول میں خیمے میں درجۂ حرارت پچاس سے زیادہ نہیں ہوا تھا اور اس نے دو گھنٹے تک کامیابی سے حرارت کو بڑھنے سے روکا۔ یہ حفاظتی خیمہ جسے فائر شیلڈ کا نام دیا گیا تھا۔ پہلی بار ڈون میکی کے گروپ کو فراہم کیا گیا تھا۔

میکی نے علاقے کا جائزہ لے کر فوری طور پر ایک فائر لائن منتخب کی۔ اور اس کے ساتھی اپنے اوزار سنبھال کر درختوں اور جھاڑیوں کی کٹائی میں لگ گئے۔ دو گھنٹے کی شدید محنت کے بعد انہوں نے لائن کے ابتدائی خدوخال واضح کرلیے تھے۔ اس کے بعد میکی نے اپنے ساتھیوں کو آرام کرنے کے لیے کہا۔ اب انہیں صبح سورج کی روشنی میں کام کا آغاز کرنا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً سو گئے۔ ویسے بھی سیزن میں انہیں سونے کا موقع کم ملتا تھا۔ یہ گروپ گزشتہ ایک ہفتے سے مسلسل مصروف تھا۔ میکی اپنے پرانے ساتھی دوست اور برادر نسبتی کیون کے ساتھ ایک چٹان پر دراز ہوگیا۔ کیون اور میکی کی بہن کی شادی زیادہ عرصے نہیں چل سکی تھی اور دو بچوں کے بعد ان میں طلاق ہوگئی تھی۔ بہت ساری دوسری عورتوں کی طرح اینے بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ اس کا شوہر ہفتوں اس سے دور رہے اور بچے اس کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں۔ کیون نے اینے کو طلاق دے دی۔ اس کے باوجود میکی سے اس کے تعلقات پہلے کی طرح برقرار رہے۔ وہ بہترین دوست تھے۔

رات کسی وقت جنوب مغربی سرد اور خشک ہواؤں میں یک دم تندی آگئی اور آگ جو اب تک جنوب اور مغرب کی پہاڑی ڈھلانوں تک محدود تھی، تیزی سے بڑھی اور صبح سے پہلے شمال اور مشرقی ڈھلانوں کے درخت اور جھاڑیاں بھی اس کی زد میں آچکی تھیں۔ میکی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہوگیا تھا اور وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ شعلے اب تین اطراف سے اٹھ رہے تھے۔ اس نے ہیلی پیڈ کے طور پر جو دو جگہیں منتخب کی تھیں، وہ فی الوقت محفوظ تھیں مگر آگ ان سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے اس نہایت ناہموار علاقے میں چند ایک جگہیں ایسی تھیں جہاں ہیلی کاپٹر اتر سکتے تھے اور یہ سامان اور رسد کی فراہمی کا واحد ذریعہ تھے۔ وہاں تک کسی قسم کی گاڑی کی رسائی نہیں تھی۔ آگ ان کے اندازے سے کہیں زیادہ رقبے پر پھیل چکی تھی۔

میکی نے فائر لائن کو مکمل کرنے کا منصوبہ ملتوی کرکے... فی الوقت مشرقی ڈھلان کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں ہیلی پیڈ نمبر ون اور ان کا کیمپ تھا۔ اس کے آدمی فوراً کام میں لگ گئے اور اس نے ریڈیو پر سینٹر سے رابطہ کیا۔

"آگ پھیل رہی ہے، ہمیں مزید آدمیوں کی ضرورت ہے؟"

○☆○

دوپہر کو... پہاڑی دامن میں دو کتھئی ٹرک اور ایک سرخ فائر انجن آ کر رکا۔ ٹرک سے شوخ پیلے رنگ کی جیکٹوں میں ملبوس فائر فائٹرز اترنے لگے۔ یہ اسموک جمپر کہلاتے تھے اور دس مردوں اور عورتوں کے اس گروپ کی لیڈر ۳۲ سالہ مچلی ایرسن تھی۔ جو بیورو آف لینڈ مینجمنٹ یعنی بی ایل ایم کے مرکزی دفتر میں کام کرتی تھی۔ وہ گزشتہ چھ سال سے اپنے اسموک جمپرز کے ساتھ آگ سے لڑتی آئی تھی۔ مچلی نے ٹرک سے اترتے ہی اپنے عملے کا جائزہ لیا۔ وہ سب پیلی جیکٹوں کے ساتھ سیاہ شرٹ اور ٹراؤزر پہنے ہوئے تھے ان کے سروں پر سفید سخت ترین ہیلمٹ تھے۔ یہ تمام اشیا ایسے مادّوں سے تیار کی گئی تھیں جو بہ آسانی آگ نہیں پکڑ سکتے ہیں۔ اس کے بعد مچلی نے کنگ ماؤنٹین کا جائزہ لیا۔ اس کی ڈھلان کے دشوار گزار راستوں سے گزر کر انہیں آگ والے مقام تک پہنچنے کے لیے ایک میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ جبکہ ان میں سے ہر ایک نے پچاس پاؤنڈ وزنی سامان بھی اٹھا رکھا تھا۔ ساتھ ہی انہیں پانی کے کینوس سے بنے پائپ اور بولڈرز بھی وہاں پہنچانے تھے۔

مچلی کی خواہش تھی کہ اس کے ساتھیوں اور سامان کو بذریعہ کاپٹر اوپر پہنچایا جائے۔ اس سے بہت سارا وقت اور محنت بچ جاتی مگر بدقسمتی سے پورے آپریشن کے لیے صرف ایک کاپٹر یعنی رومیو ۹۳ میسر تھا اور وہ اس وقت بے حد مصروف تھا۔ گزشتہ بیس سال میں یہ خوف ناک ترین موسم گرما تھا اور روکی کے چھ ہزار مربع میل پر پھیلے سلسلہ ہائے کوہ میں ۶۹ جگہوں پر آگ لگنے کے واقعات ہوچکے تھے۔ فائر فائٹرز حد سے زیادہ مصروف تھے۔ ابھی وہ ایک جگہ سے آگ بجھا کر واپس لوٹتے ہی تھے کہ کہیں اور سے آگ لگنے کی اطلاع آجاتی۔ وہ نہ ڈھنگ سے کھا پاتے تھے اور نہ ہی ان کی نیند پوری ہورہی تھی۔ وہ آرام دہ بستروں کو ترس گئے تھے۔

"کسی نے الکحل استعمال نہیں کرنی ہے" مچلی نے انہیں خبردار کیا۔

اس کے بعد وہ ایک قطار کی شکل میں اوپر چڑھنے لگے۔ ان کا رخ مغربی ڈھلان کی طرف تھا اور اس دن کے خاتمے سے پہلے وہ ڈھلان کے اوپری حصے پر ایک اور ہیلی پیڈ تیار کرچکے تھے۔ جسے انہوں نے ایچ ٹو کا نام دیا۔ یہ جگہ وہاں سے کچھ ہی نشیب میں تھی۔ جہاں ڈون میکی اور اس کے ساتھی

ہیلی کاپٹر سے اترے تھے۔ آگ نے مغربی اور جنوبی ڈھلانوں
کے ساتھ اب شمالی ڈھلان کا احاطہ بھی کرلیا تھا اور بیک
وقت اوپر اور نیچے دونوں جانب سفر کررہی تھی۔ مگر جمپ
اسپاٹ اور ایچ ٹو کی ڈھلان فی الوقت محفوظ تھی کیونکہ
ہواؤں کا رخ اس سے مخالف سمت میں تھا۔ اس بات کا
امکان کم تھا کہ شعلے اس حصے تک پہنچ سکتے۔

مچلی نے ہمیشہ فائر فائٹنگ کے اوّلین اصول پر عمل کیا
تھا۔ یعنی سب سے پہلے اپنی حفاظت کو یقینی بناؤ۔ ایچ ٹو کی
تکمیل کے بعد وہ تقریباً پانچ سو فٹ بلند ایک ٹیلے پر چڑھی اور
آگ کا معائنہ کرنے لگی۔ یہاں مسطح جگہ نہ ہونے کے برابر
تھی اور پہاڑ کسی ڈھلان دار چھت کی طرح تھے۔ مغرب اور
جنوب میں بلند ہوتی ڈھلان تھی۔ جس کے درمیان ایک تنگ
گھاٹی میں پیڈ نمبر ون اور فائر جمپرز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جو ڈون میکی
اور اس کے ساتھیوں نے بنایا تھا۔ آگ جنوب اور مغرب کی
سمت سے آگے بڑھ رہی تھی اور تیز ہوا اس کی بھرپور مدد
کررہی تھی۔ مچلی نے اندازہ لگایا کہ کم از کم دو سو ایکڑ رقبہ
آگ کی لپیٹ میں تھا۔ درمیانی ڈھلان کے ساتھ ہی ابھرے
کنارے پر موجود گھاس میں ننھے منّے شعلے ناچتے پائن کے
ایک قد آور جھنڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مشرقی سمت کی
ڈھلان سے گہرا اور گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب
تھا کہ آگ تیزی سے سرسبز درختوں کو کھارہی تھی۔

صورتِ حال کو دیکھ کر مچلی کے ذہن میں پہلا سوال یہی
ابھرا ”کیا ہم اس آگ پر قابو پاسکیں گے۔“

حالات مچلی کے اندازے سے کہیں زیادہ خراب تھے،
حقیقت تو یہ تھی کہ سوائے درمیانی ڈھلان اور جنوب میں
واقع گھاٹی کی شمالی دیوار کے آگ نے چاروں طرف اپنا تسلط
قائم کرلیا تھا اور یہ ناقابلِ یقین تیزی سے پھیلی تھی۔ تقریباً
پانچ مربع میل پر محیط اس علاقے کا تین چوتھائی حصہ آگ کی
زد میں تھا اور اسے محدود کرنے کے لیے بہت سارے افراد
کی ضرورت تھی۔ فی الوقت درختوں کے بڑے جھنڈ محفوظ
تھے۔ مگر جلد یا بدیر آگ ان تک پہنچ جاتی اور اس صورت
میں اس پر قابو پانا نہایت دشوار ہوجاتا۔

اس صبح امریکا کے محکمۂ موسمیات نے اس علاقے کو
سرخ نشان زدہ کردیا اور اسے زون ۲۰۵ کا نام دیا گیا۔ اس
روز ہوا چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی اور
اگلے ایک ہفتے تک بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مچلی جانتی
تھی کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی اس کے باوجود اس
نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر جو بھی کرسکتی
تھی، وہ کر گزرے گی۔

○☆○

صبح ساڑھے نو بجے ایک بڑا ہیلی کاپٹر رومیو ۹۴۳ ان کی مدد
کے لیے آن پہنچا تھا۔ ڈون میکی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس
کی مدد کی درخواست کا یہ نہایت بھونڈا جواب تھا۔ محض
اٹھارہ افراد اور ایک ہیلی کاپٹر اتنے وسیع رقبے پر پھیلی آگ
کے خلاف کیا کرسکتے تھے۔ فی الوقت میکی کے کارکن ایچ ون
کے اردگرد جھاڑیاں اور درخت صاف کرچکے تھے اور اب
شمالی ڈھلان کو محفوظ بنانے کے لیے ایک چالیس گز چوڑی
اور تقریباً سات سو گز لمبی حفاظتی لائن بنانے میں مصروف
تھے۔ ان کی خوش قسمتی کہ گھاٹی کی جنوبی دیوار والے حصے میں
زیادہ ایندھن نہ ملنے اور ہوا کی موافقت نہ ہونے کے باعث
آگ خود بہ خود سرد ہوگئی تھی مگر میکی جانتا تھا کہ خطرہ چوٹی کی
ڈھلانوں اور وسطی اور شمالی ڈھلانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کا آگ کو محدود کرنے کا منصوبہ نہایت سادہ تھا یعنی
ڈھلانوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ حفاظتی لائن بنا کر آگ
کو محدود کردیا جائے۔ یوں بالآخر یہ خود بجھ جائے گی۔ لیکن
منصوبہ اتنا بھی سادہ نہیں تھا۔ اوّل تو انہیں تقریباً تین میل
لمبی لائن بنانے کے لیے بہت سارے آدمیوں کی ضرورت
تھی۔ جو فی الوقت میسر نہیں تھے اور آگ جس سرعت سے
بڑھ رہی تھی اس سے میکی کو اندازہ تھا کہ اس کی مجوزہ
حفاظتی لائن میں اضافہ ناگزیر ہوجائے گا۔ اس کا مطلب
تھا۔ زیادہ افرادی قوت زیادہ محنت اور زیادہ وقت۔ بدقسمتی
سے انہیں زیادہ اچھا علاقہ نہیں ملا تھا۔ اس قسم کے ناہموار
پہاڑی خطے، جہاں فائر فائٹرز کی نقل و حمل کو دشوار بناتے تھے
وہیں وہ آگ کو تیزی سے پھیلانے میں مدد دیا کرتے تھے،
مسلسل اور ڈھلوان دار ڈھلانوں نے ان کے کام کو دشوار تر بنادیا
تھا۔

ڈھلانوں کے اختتام پر مقامی فائر فائٹرز اور رضاکار
افراد جھاڑیوں کو کاٹ کر قصبے گلین ووڈ اسپرنگز کو محفوظ بنانے
کی سعی کررہے تھے لیکن میکی دیکھ رہا تھا کہ ابھی بھی بہت
ساری جھاڑیوں کی صورت میں آگ کے لیے اچھا خاصا
ایندھن میسر تھا۔ دوسری طرف اگرچہ گھاٹی کی نچلی دیوار کی
آگ بجھ چکی تھی۔ مگر چوٹی بدستور روشن تھی اور اس پر سے
شعلے چکر لگا کر بتدریج ایچ ون کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اگر
ان کی حفاظتی لائن بروقت چوٹی تک نہ پہنچ پاتی تو ایچ ون
ناکارہ ہوجاتا۔ بے پناہ محنت اور کوشش کے بعد میکی کے
کارکن چوٹی تک حفاظتی لائن پہنچانے میں کامیاب رہے۔
انہیں خاصی دیر بعد جاکر صاف اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا
موقع ملا تھا ورنہ دھوئیں اور راکھ نے ان کا برا حال کررکھا
تھا۔ بعض اوقات تو وہ آگ سے صرف دس بارہ فٹ دور کوئی

درخت یا جھاڑی کاٹ رہے ہوتے تھے۔ ان میں سے کئی کے بال جھلس گئے تھے اور تقریباً سب ہی راکھ اور دھوئیں سے سیاہ ہو رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد جب میکی کا پٹر ایچ ٹو کی جانب جا رہا تھا کہ اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ نیچے شمالی ڈھلان سے سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ ناقابلِ یقین آگ حیرت انگیز تیزی سے دامن تک جا پہنچی تھی۔ جہاں سے صرف میل بھر کے فاصلے پر علاقے کی مصروف ترین ہائی وے گزرتی تھی۔ محض ایک گھنٹے پہلے تک وہ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

○☆○

رومیو ۹۴ سے اترتے ہی میکی اوکیون ایرک سن نے فیصلہ کیا کہ انہیں مغربی ڈھلان کے ساتھ حفاظتی لائن از سرِ نو ترتیب دینا ہوگی۔ پرانی لائن غیر مؤثر ثابت ہوئی تھی اور شعلے بہ آسانی اسے عبور کرکے ڈھلان کے نچلے حصے تک جا پہنچے تھے۔ وہ دونوں تھکن سے چور تھے لہٰذا کچھ دیر کے لیے وہیں جھاڑیوں کے نیچے لیٹ گئے۔ معاً ایرک سن کو اپنے سر کے عین اوپر لکڑی چٹخنے کی آواز آئی اس نے جھاڑی ہٹا کر دیکھا اور پھر سن رہ گیا۔ شعلے عین ان کے سروں پر ناچ رہے تھے۔ انہیں علم ہی نہیں ہوا کہ کب آگ ان کے اس قدر نزدیک آگئی تھی۔

”ڈان، آگ“ اس نے بدحواس ہوکر میکی کو جھنجوڑ مارا۔ اور اس کے دس منٹ بعد وہ دونوں کارکنوں کے ساتھ وہاں کی جھاڑیاں کاٹ رہے تھے۔ ایچ ٹو سخت خطرے میں تھا اور یہ تین میل کے علاقے میں رسد کا واحد ذریعہ تھا۔ اگر آگ ایچ ٹو کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تو ان کو اپنی جان کے لالے پڑ جاتے کیونکہ شعلے اب تین اطراف سے ایچ ٹو کو گھیر چکے تھے۔ ایرک سن نگرانی کرنے والے طیارے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اتفاق سے میکی بھی اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔

”کیا ہمیں ایک نگرانی کرنے والا طیارہ مل سکتا ہے؟“ اس نے ایرک سن سے پوچھا۔

ایرک سن کا خیال تھا کہ مل سکتا ہے لیکن ان کے مرکز کا خیال ان سے مختلف تھا۔ ان کے خیال میں انہیں نگرانی کرنے والے طیارے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جبکہ ان کے پاس پہلے ہی ایک کاپٹر موجود تھا۔ جبکہ درحقیقت انہیں آبزرور طیارے کی اشد ضرورت تھی جو اوپر سے آگ پر نگاہ رکھ کر انہیں بتاتا کہ آگ اب کس سمت اور کس رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ یوں انہیں اپنی حکمتِ عملی بنانے اور اس پر عمل کرنے میں آسانی رہتی۔ آگے چل کر اس صورت حال نے المناک صورت اختیار کرلی جس کا نتیجہ ایک سنگین حادثے کی صورت میں نکلا۔

لیکن اوپر والوں کی بے حسی پر افسوس کیے سوا کیا کیا جا سکتا تھا۔ ان کے پاس افراد کم تھے۔ انہیں صرف ایک کاپٹر کی خدمات حاصل تھیں جو اپنی بڑی سی بالٹی میں پانی لاکر میکی کے بتائے ہوئے مقامات پر گرا رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ تربیت یافتہ پائلٹ نہیں تھا اور اس کے اکثر نشانے خطا جا رہے تھے۔ ایرک سن اندازہ لگا رہا تھا کہ ابھی مغربی اور شمالی ڈھلانوں میں آگ کے لیے مزید کتنا ایندھن موجود تھا۔ جواب خاصا خوف ناک تھا۔ ابھی وسطی اور اوپری ڈھلانوں کی بے تحاشا جھاڑیاں اور درخت باقی تھے جو آگ سے بچے ہوئے تھے۔ مگر جلد یا بدیر وہ آتش کی زد میں آنے والے تھے۔ اتنی افرادی قوت کے ساتھ وہ اس ڈھلان کو نہیں بچا سکتے تھے۔ ایرک سن نے میکی سے کہا۔

”میرا خیال ہے ہم جلد یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی ہم ایچ ٹو کو نہیں بچا سکتے۔“

لیکن میکی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کے خیال میں ڈھلان کو ہر صورت بچانا ضروری تھی۔ اگر آگ یہاں تک آجاتی تو انہیں حفاظتی لائن میں اضافہ کرنا پڑتا اور اس کا مطلب ہوتا کہ زیادہ افراد اور زیادہ وقت۔ جو ان کے پاس نہیں تھا۔ معاً اسے اپنے بچے یاد آنے لگے۔ انہیں دیکھے تین ہفتے گزر چکے تھے اور اگلے روز میکی کی بیٹی لاہنا کی چھٹی سالگرہ تھی۔

”میں اس پارٹی کو مس کروں گا“ اس نے ایرک سن نے کہا۔

خود ایرک سن بھی اپنے بچوں کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بعض اوقات اسے افسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ اپنے کی بات مان کر فائر فائٹر کی ملازمت چھوڑ دیتا تو آج اس کا گھر نہ ٹوٹتا۔ وہ دونوں ہی ضد میں آگئے تھے اور اس کا انجام طلاق کی صورت میں نکلا، بچے اپنے کے پاس ہی تھے۔ لیکن ایرک سن جب چاہتا ان سے مل سکتا تھا اور وہ فرصت ملتے ہی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ یہاں آتے ہوئے انہیں امید تھی کہ وہ جلد یہاں آگ پر قابو پالیں گے۔ اور پھر اپنے بچوں کے پاس جا سکیں گے لیکن فی الوقت یہاں سے گلوخلاصی ممکن نظر نہیں آرہی تھی۔ کارکنوں کو تازہ ہدایات دے کر ایرک سن اور میکی اوپر کی جانب روانہ ہوگئے۔ معاً انہوں نے پہاڑوں کے اوپر کسی طیارے کی آواز سنی۔

○☆○

اوپر طیارے میں ایرک ہیکی بیٹھا نیچے پھیلے آگ کے سمندر کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آٹھ ساتھی کیا کرسکیں گے۔ لیکن اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ پائلٹ نے انہیں چھلانگ لگانے کو کہا۔ سب سے پہلے ہیکی خود نیچے کودا۔ پانچ سیکنڈ بعد ایک جھٹکے سے اس کا پیرا شوٹ کھل گیا۔ معاً اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ معمول سے زیادہ تیزی سے نیچے جارہا تھا اور اس رفتار سے زمین پر اترنا خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔ معائنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ پیراشوٹ کی ایک ڈوری ٹوٹ گئی تھی۔ ہیکی نے دوسری ڈوریوں کو کھینچ کر رفتار کسی قدر کم کرلی اور بالآخر وہ ایک ... ہری بھری جھاڑی پر جاگرا۔ اس کے مضبوط جمپ سوٹ نے اسے نوکیلی شاخوں سے بچالیا تھا۔ ہیکی اور اس کا گروپ گزشتہ پانچ سال سے آگ بجھانے کی کارروائیوں میں حصہ لیتا آیا تھا۔ مگر کنگ ماؤنٹین پر آکر اس نے پہلی بار خود کو نروس محسوس کیا تھا۔

وہ ٹھیک ایچ ٹو کے نزدیک اترے تھے اور ہوائیں انہیں بھڑکتے شعلوں میں لے جانے کے درپے تھیں۔ مگر خوش قسمتی سے وہ آگ سے دور ہی رہے۔ ہیکی کا نائب کونی پیٹری تھا۔ تیس سالہ پیٹری اپنے کام کے لیے بہت زیادہ سنجیدہ رہنے والوں میں سے تھا مگر نیچے اترتے وقت اسے آگ سے زیادہ ہیکی کی فکر تھی۔ پہلے انہوں نے اپنے پیراشوٹ سمیٹے پھر جھاڑی میں پھنسے ہیکی کو نکالا اور اوپر کا رخ کیا جہاں وہ آگ سے دور اور محفوظ رہ سکتے تھے۔

○☆○

کریک اسٹیٹ کے دور تک پھیلے دامن تک سرمئی دھوئیں کے مرغولے آچکے تھے اور بیس فائر فائٹرز جن میں تیرہ مرد اور سات عورتیں تھیں، آگ کے خلاف پیش قدمی کے لیے بالکل تیار تھے۔ انہیں اوپر جاکر فائر جمپرز کی مدد کرنے کو کہا گیا تھا۔ فیڈرل فائر گراؤنڈ گروپس سے تعلق رکھنے والا یہ یونٹ ہاٹ شوٹس کہلاتا تھا۔ اس میں شامل افراد کے لیے ضروری تھا کہ وہ تربیت یافتہ، منظم اور جسمانی طور پر بے حد مضبوط ہوں۔ ایف ایف جی ٹی کے ملک بھر میں ۶۵ مراکز تھے اور ہر مرکز پر کم از کم ایک یونٹ موجود رہتا تھا۔ کنگ ماؤنٹین آنے والا یہ گروپ نیو پرویلی سینٹرل آرگن سے آیا تھا اور کولوریڈو میں کسی مہم میں حصہ لینے کا یہ ان کا پہلا اتفاق تھا۔

روب جان سن اور اس کا بھائی کونی جان سن یونٹ میں شامل تھے۔ روب موسم گرما میں ہاٹ شوٹس میں کام کرتا تھا اور سردیاں اسکائی دی سورٹس میں بہ حیثیت اکاؤنٹنٹ گزارتا تھا۔ یہ اس کائی سورٹس امریکا کی چند مصروف برفانی ڈھلانوں میں سے ایک ہے اور یہاں سرما کے دوران میں اسکائنگ کے شوقین حضرات اور خواتین کا ہجوم جمع رہتا ہے۔

ہاٹ شوٹس کا یونیفارم نیلے رنگ کا تھا۔ اس پر سفید ہیلمٹ اور سیلینڈر نما جیکٹ تھی۔ جو خاص طور سے ایسے ریشوں سے تیار... کی گئی تھی جن پر آگ اثر نہیں کرتی تھی۔ شدید ترین آگ میں گھرنے کی صورت میں فائر فائٹرز اس کی مدد سے اپنی جان بچاتے تھے۔ اسے کھول کر وہ سر سے پیر تک خود کو ڈھانپ سکتے تھے۔ اس کی خاص سطح حرارت کو منعکس کرکے صرف ہوا کو اندر آنے دیتی تھی۔ یوں فائر فائٹرز تپش سے بچ جاتے تھے مگر یہ صرف چند منٹ تک ہی آدمی کو آگ سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ اور انہیں ان چند منٹوں میں آگ سے نکل جانا ہوتا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں ایک حادثے کے بعد ایسی جیکٹیں فائر فائٹرز کو دی جانے لگی تھیں جو آگ زدہ علاقوں میں جاتے تھے۔ کچھ پیراشوٹرز حادثاتی طور پر آگ سے گھرے علاقے میں جاگرے۔ ان میں سے تین فوراً جل کر ہلاک ہوگئے اور چار دھوئیں سے دم گھٹنے سے مرگئے۔ ان حفاظتی جیکٹوں نے بعد میں کم از کم ڈھائی سو افراد کو مرنے یا شدید زخمی ہونے سے بچایا جو حادثاتی طور پر آگ میں گھر گئے تھے۔

روب اور کونی کا بچپن کا خواب فائر فائٹر بننا تھا اور ان کے لیے مثالی شخصیت ان کے باپ کی تھی جو ایک عام فائر فائٹر کے طور پر محکمۂ جنگلات میں ملازم ہوا اور ریٹائرمنٹ تک وہ روز برگ کاؤنٹی کا فائر مارشل بن چکا تھا۔ ان کے گھر کا ایک کمرا مکمل طور پر مارشل کی یادگار تصویروں اور ملنے والے تمغوں اور اعزازات سے بھرا ہوا تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے سے انہوں نے فائر فائٹرز بننے کی تربیت حاصل کرنا شروع کردی تھی اور یونیورسٹی میں گریجویشن کے دوران میں وہ رضاکارانہ طور پر ہاٹ شوٹس میں خدمات سرانجام دینے لگے تھے۔

روب کلاس میں لیکچر لینے کے دوران میں اچانک اپنی کرسی سے گرپڑا۔ اس کا جسم مکمل طور پر مفلوج ہورہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ کئی پیچیدہ ٹیسٹ لینے کے بعد ڈاکٹروں نے ایک خاص اعصابی بیماری گولین بیری سینڈروم تشخیص کی۔ اس بیماری کے شکار افراد مکمل طور پر مفلوج ہوسکتے تھے اور بیماری کی شدت کے باعث مر بھی سکتے تھے۔ روب اس حملے سے جانبر ہوگیا تھا مگر وہ سوائے اپنی پلکوں اور کچھ انگلیوں کے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے پر قادر نہیں تھا۔ اس موذی بیماری نے اس کے تمام خواب توڑ کر رکھ دیے تھے۔ صرف دس دن کے اندر وہ بھاگتے دوڑتے اور زندگی سے بھرپور آدمی سے ایک بے جان وجود میں تبدیل

ہوگیا۔ جو بستر کا قیدی تھا۔
کونی پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کے لیے بھائی ہی سب کچھ تھا۔ وہی اس کا ساتھی اور دوست تھا۔ اس نے بیماری کے ان دنوں میں اس کی دیوانوں کی طرح خدمت کی۔ اپنے اوپر دن رات کی نیند حرام کرلی۔ وہ اسے سہارا دیتا اور اسے یونیورسٹی لے جاتا۔ وہاں بھی اس کے ساتھ لگا رہتا۔ اس نے روب کے کمرے میں ورزش کا سامان اس طرح ترتیب دیے دیا تھا کہ اسے کسی قسم کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ تین مہینے بعد اس کی حالت میں ڈرامائی تبدیلی آئی اور وہ بستر سے اٹھ کر کسی قدر چلنے پھرنے لگا۔ پھر وہ خوش گوار دن بھی آیا جب ڈاکٹر نے روب سے کہا۔
"نوجوان اب تم مکمل صحت یاب ہو... مگر فائر فائٹر کا خیال ذہن سے نکال دو۔"
یہ پُرعزم نوجوان اس وقت تو خاموش رہا لیکن اس نے اپنے دل میں یہ عزم ضرور کرلیا کہ وہ دنیا والوں کو فائر فائٹر بن کر دکھائے گا۔ بیماری کے دو برس کے اندر وہ اپنا سابق اسٹیمنا اور قوت بحال کرچکا تھا۔ لیکن اس بات سے سوائے اس کے کوئی واقف نہیں تھا کہ اس کے دائیں گھٹنے میں ابھی کمزوری باقی تھی۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ ہاٹ شوٹس میں شمولیت اختیار کی اور تمام امتحانات کامیابی سے پاس کرلیے۔
روب اور کونی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بلندی کی طرف ایچ ٹو کی جانب گامزن تھے۔ ان کے بائیں طرف آگ نے تقریباً تمام ہی ڈھلان پر قبضہ جمالیا تھا۔ اچانک انہیں ڈان میکی کی کال ملی کہ وہ پیدل آنے کی کوشش نہ کریں، کاپٹر انہیں اوپر پہنچادے گا۔
روب جان سن پہلے جانے والی ٹیم میں شامل تھا۔ کونی کوشش کے باوجود اس کے ساتھ نہیں جاسکا۔ اور کچھ دیر بعد اسے ایک اور جگہ جانے کی ہدایت ملی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کو آخری بار دیکھ رہا تھا۔ اوپر ایچ ٹو کو محفوظ رکھنے والی نئی لائن نصف کے قریب مکمل ہوچکی تھی اور ڈون میکی مایوسی سے سوچ رہا تھا کہ شاید مزید کارکنوں کے بغیر کام نہ چلے۔ نئی حفاظتی لائن آگ کو روکنے میں ناکام نظر آرہی تھی۔ اچانک میکی کی نگاہ تیس گز نیچے پائن کے ایک درخت پر پڑی جو محفوظ علاقے میں تھا اور آگ اس کے تنے کو چاٹ کر بتدریج اوپر چڑھ رہی تھی۔
"میرے خدا!" میکی چلّایا۔ اگر آگ اس طرف پھیل جاتی تو اس کا منصوبہ مکمل طور پر ناکام ہوجاتا۔ اس نے تیزی سے ریڈیو سنبھالا "رومیو ۹۳، رومیو ۹۳، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں مزید پانی چاہیے۔"
پانچ منٹ بعد رومیو ۹۳ ایک سو اٹھاسی گیلن پانی سے بھری بالٹی لیے وہاں موجود تھا۔ مگر کاپٹر کے پنکھوں کی طوفانی ہواؤں نے آگ کو قریبی جھاڑیوں تک پہنچادیا۔ اسی لمحے اس نے بالٹی کھولی۔ پانی جلتے درخت پر گرا اور پلک جھپکنے میں آگ بجھ گئی البتہ گیلی لکڑیاں ابھی بھی دھواں دے رہی تھیں۔
"اف میرے خدا!" میکی ریڈیو پر چیخا "یہ تم نے کیا کیا۔ فوراً مزید پانی لاؤ۔"
رومیو کے عملے کو اپنی غلطی کا احساس تھا۔ لہٰذا وہ فوراً وہاں سے کچھ ہی دور واقع دریائے سفید سے مزید پانی لینے روانہ ہوگئے۔ اگلے ایک گھنٹے میں رومیو نے کئی چکر لگائے اور بالآخر آگ بجھانے میں کامیاب ہوگیا۔ میکی نے سکون کی طویل سانس لی۔ اسی وقت اسے بتایا گیا کہ مزید بیس افراد مدد کے لیے آگئے تھے۔
"اب شاید ہم اس آگ پر قابو پالیں" اس نے سوچا۔
○☆○
ہاٹ شوٹس نے آتے ہی حفاظتی لائن کو وسیع اور چوڑا کرنا شروع کردیا۔ کام کی رفتار بڑھ گئی۔ اٹھارہ افراد جھاڑیاں اور درخت کاٹ رہے تھے اور باقی یہ انبار اٹھا کر دور پھینک رہے تھے۔ ڈون میکی کی کوشش تھی کہ وہاں ایسی کوئی چیز نہ رہنے پائے جو آگ کا ایندھن بن سکے۔ ہاٹ شوٹس کٹائی کے جدید ترین اوزاروں سے لیس تھے۔ ان میں پولانسکی نامی برقی آری سرِفہرست تھی جو سخت ترین لکڑی کو بھی مکھن کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی تھی۔ وہ نہ صرف درخت اور جھاڑیاں بلکہ ان کی جڑیں تک کاٹ کر پھینک رہے تھے۔ میکی مطمئن تھا کہ اب نچلی ڈھلان کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں تھا۔ نئے افراد کی شمولیت سے فائر جمپرز کا حوصلہ بھی بلند ہوا تھا اور وہ ہر ممکن تیزی سے حفاظتی لائن کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ پولانسکی تیزی سے چل رہے تھے اور درخت اور جھاڑیاں کٹ کٹ کر گر رہی تھیں۔ ان تھک محنت کے بعد وہ دوپہر ایک بجے تک جھاڑیوں سے بھری نچلی ڈھلان کو آگ سے محفوظ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور بلاشبہ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ محض بیس افراد نے چالیس گز چوڑی اور تقریباً ایک کلومیٹر طویل حفاظتی لائن صرف ڈھائی گھنٹے میں تیار کی تھی۔ اگر آگ نچلی ڈھلان تک رسائی حاصل کرلیتی تو نہ صرف یہ وسیع رقبے پر پھیل جاتی بلکہ اس سے شمالی اور مشرقی

ڈھلانوں کے جنگل بھی آگ کی زد میں آجاتے۔ اسے بجھانا مشکل ہوجاتا۔

○☆○

ہاٹ شوٹس کے دوسرے گروپ نے اوپر روانگی سے پہلے بہتر سمجھا کہ لنچ کے ساتھ کچھ دیر آرام کرلیں۔ جہاں انہوں نے لنچ کیا تھا۔ یہ نچلی ڈھلان کا وسطی حصہ تھا۔ اسے فائر فائٹرز نے لنچ اسپاٹ کا نام دیا۔ ڈھائی بجے تک وہ اوپر ایچ ٹو کے جنوب میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ جگہ جنوبی کنارے سے تقریباً پانچ سو گز نیچے تھی۔ انہوں نے آسمان کو صاف پایا۔ اس کا مطلب تھا کہ خطرہ ٹل رہا تھا اور آگ اپنے احاطۂ عمل میں بیشتر ایندھن استعمال کرکے بجھنے کے قریب تھی۔ ڈون میکی کی حکمتِ عملی کامیاب ہوتی نظر آرہی تھی۔ اسی موقع پر وہ ہوا جو نہ میکی کے خواب وخیال میں تھا اور نہ کسی دوسرے فائر فائٹر کے۔

پونے تین بجے مغرب کی جانب سے تیز ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں جن کی ابتدائی رفتار بیس میل فی گھنٹا تھی۔ ہوا کے طاقت ور جھونکے ریت، مٹی اور کٹی ہوئی لکڑیاں اڑانے لگے۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ ہوا آگ کی سمت سے محفوظ علاقے کی طرف چل رہی تھی۔ فائر فائٹرز کا اطمینان لمحے بھر میں غارت ہوکر رہ گیا۔ لنچ کے فوراً بعد ایرک ہپکی نے اپنے آدمیوں کو حفاظتی لائن کو مزید چوڑا کرنے میں لگادیا۔ معاً ہپکی کو احساس ہوا کہ ایچ ٹو کے اطراف میں موجود جھاڑیوں اور آگ کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا اور وہاں اس بات کا امکان کہیں زیادہ تھا کہ شعلے حفاظتی لائن عبور کرلیں۔ اپنے ہائیکنگ کے تجربے اور مضبوط ٹانگوں کے سہارے ہپکی ہر ممکن تیزی سے اوپر ایچ ٹو کی جانب روانہ ہوگیا۔

روب ایچ ٹو کے دائیں جانب ایک مشکل ترین مقام پر حفاظتی لائن کو چوڑا کرنے میں مصروف تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی دیوانوں کی طرح کام میں لگے تھے۔ آگ ان سے بہ مشکل پچاس گز دور تھی اور اس کی تپش وہ واضح طور پر محسوس کررہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ جلتی لکڑیاں اور انگارے بھی ان پر برس رہے تھے۔ ان کا مقصد حفاظتی لائن کو چھ سو گز نیچے ڈھلان تک پہنچانا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ڈھلان کے اطراف سے بلند ہوتے سیاہ دھوئیں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ یہ ایک الم ناک انجام کا آغاز تھا۔

○☆○

ایچ ٹو کے بائیں جانب مچلی ایرسن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اوپری پہاڑی کٹاؤ کے ساتھ چار سو گز لمبی اور دس گز چوڑی حفاظتی لائن بنانے میں مصروف تھی۔ وہ خود ایچ ٹو سے اس کام کی نگرانی کررہی تھی۔ پہاڑی کٹاؤ سے بہ مشکل تیس گز دور شعلے اور دھواں بلند ہورہا تھا۔ مچلی صرف امید کرسکتی تھی کہ آگ مزید پیش قدمی نہیں کرے گی۔ اگرچہ تیز ہوا پہلے ہی اس کی امیدوں کو توڑ رہی تھی۔ وہ واضح طور پر محسوس کررہی تھی کہ ہوا کی تیزی بالآخر شعلوں کو محفوظ علاقے تک پہنچادے گی۔ وہ مزید کارکنوں کی ضرورت محسوس کررہی تھی۔ شاید یہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ کیونکہ اسی دوران میں رومیو مزید ہاٹ شوٹرز کو لے کر آگیا۔

"خدا کا شکر ہے" اس نے خلوصِ دل سے کہا۔

رومیو سے اترنے والا پہلا شخص کونی جان ین تھا اور اس وقت اسے آگ سے زیادہ اپنے بھائی کی فکر تھی جو آگ سے گھرے علاقے میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گھٹنے کی کمزوری کے باعث روب تیزی سے نہیں چل سکتا تھا اور یہاں تو علاقہ بھی بدترین حد تک ناہموار تھا۔ کسی قسم کے خطرے کی صورت میں وہ تیزی سے حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ کونی اور اس کے ساتھی نیچے اترتے ہی تیزی سے کام میں لگ گئے۔ وہ جھاڑیاں اور درخت صاف کررہے تھے۔ مگر ان میں سے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ زمین پر پڑے لکڑی کے ٹکڑے اور برادہ آگ کے لیے بہترین ایندھن ثابت ہوسکتا تھا۔ معاً کونی نے ہوا کے تھپیڑوں میں بہت زیادہ تندی محسوس کی۔ اسی لمحے ایک ہاٹ شوٹر چلایا۔

"وہ دیکھو" اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا۔ وہاں آگ نے حفاظتی لائن عبور کرلی تھی۔

اوپر موجود مچلی نے جلتی لکڑیوں اور انگاروں کو حفاظتی علاقے میں گرتے دیکھا۔ پلک جھپکنے میں وہاں موجود جھاڑیوں نے آگ پکڑلی۔ ہوا نے آگ کو بڑھاوا دیا اور چند سیکنڈ میں مچلی اور اس کے ساتھیوں کی گھنٹوں کی محنت برباد ہوگئی۔ آگ بلندی تک آنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مچلی نے ریڈیو پر کہا۔

"رومیو، ہمیں پانی چاہیے فوراً۔"

"کچھ دیر لگے گی" رومیو سے جواب ملا۔

"ہرگز نہیں" مچلی بولی "آگ تیزی سے پھیل رہی ہے' وہ حفاظتی لائن عبور کرچکی ہے۔"

عین اسی لمحے مچلی کے قریب ہی ایک بڑا پائن بھک کی آواز کے ساتھ شعلے میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے پتے اور ٹہنیاں یوں جلنے لگے جیسے پیٹرول میں بھیگے ہوں۔ شعلے ہوا

کے زور پر لپک لپک کر دوسرے درختوں تک جانے کی کوشش کررہے تھے۔

"رومیو، ہمیں شاور کی ضرورت ہے" مچلی ایک بار پھر چلاّئی۔

مچلی کے کارکن حفاظتی لائن عبور کرنے والی آگ کو بجھانے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد کونی اوپر سے آتا نظر آیا۔ وہ سر سے پیر تک سامان میں چھپا ہوا تھا جو اس نے مچلی کے سامنے زمین پر ڈھیر کردیا.... یہ پچیس عدد لنچ بکس تھے۔

"لنچ!" مچلی کراہی "ہمیں پانی کی ضرورت ہے۔"

عین اسی وقت رومیو اپنی بالٹی لیے آن پہنچا لیکن جب اس نے پانی گرایا تو اس کا بیشتر حصہ ہوائیں اڑا کر دور لے گئیں اور پائن بدستور جلتا رہا۔ بلکہ اب دوسرے کئی درختوں نے بھی آگ پکڑلی تھی۔ مچلی مایوسی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ جبکہ کونی کی نگاہیں وسطی ڈھلان کے اوپری حصے پر مرکوز تھیں۔ جہاں سے گہرا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ کونی نے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کی۔ اسے روب کا خیال آگیا تھا جو اسی جگہ تھا جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

○☆○

اس کے بعد جو ہوا وہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ وسطی ڈھلان کے نچلے حصے میں کونی پیٹری شمالی حفاظتی لائن کو چوڑا کرا رہا تھا۔ معاً اس کی نگاہ مشرق میں اوپر کی طرف گئی۔ وہاں کا منظر نہایت ہیبت ناک تھا۔ آگ نے وسطی جنگل کو عبور کرنے پائن کے ایک جھنڈ پر حملہ کیا تھا۔ اور سیاہ دھوئیں کے ساتھ تقریباً سوفٹ اونچے شعلے اٹھ رہے تھے۔ پیٹری نے زندگی میں پہلے اتنی شدید آگ نہیں دیکھی تھی۔ پھر اس نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ جب آگ نے سوگز کا فاصلہ محض تیس سیکنڈ میں عبور کیا اور اس کی حفاظتی لائن تک آپہنچی۔ شعلوں کی حدت وہ تقریباً ڈھائی سوگز کی دوری سے بھی واضح طور پر محسوس کرسکتا تھا۔

"اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" پیٹری نے بجا طور پر سوچا۔ آگ تین اطراف سے ان کی جانب بڑھ رہی تھی اور اب صرف اوپری کنارے کی طرف جانے والا راستہ باقی بچا تھا۔ پیٹری کے تین بچے تھے اور وہ اپنے گھر کا واحد کمانے والا تھا۔ وہ ابھی اپنے بیوی بچوں کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے فوری طور پر میکی سے رابطہ کیا۔

"صورتِ حال خراب ہے۔ آگ بے قابو ہوچکی ہے اور ہم گھر رہے ہیں۔"

"عملے کو فوراً وہاں سے نکالو" میکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میکی پچھتا رہا تھا کہ اس نے وسطی ڈھلان کو اہمیت کیوں نہیں دی۔ یہ ان کی رسد کا راستہ تھا۔ صبح یہاں آگ چند جھاڑیوں تک محدود تھی۔ لیکن اگلے چند گھنٹے کے اندر اس نے پوری وسطی ڈھلان کو جہنم زار میں تبدیل کردیا اور وہ اور اس کے ساتھی اس جہنم میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

پیٹری نے فوری طور پر کارکنوں کو جمع کرکے پیک اپ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے عجلت میں تیاری کی۔ پیٹری کو خدشہ تھا کہ کہیں آگ ان کے واحد راستے کو بھی نہ بند کردے۔ جو ایچ ٹو کے حفاظتی زون تک جاتا تھا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ایچ ٹو بھی اب محفوظ نہیں رہا ہے مگر میکی جانتا تھا' اس نے ریڈیو پر پیٹری سے کہا۔

"ایچ ٹو کے بجائے کنارے کے ساتھ اوپر جاؤ۔ ایچ ون کے قریب۔ وہاں فائر شیلٹر موجود ہے۔"

فائر شیلٹر سے مراد مخصوص المونیم سے بنا ایک بڑا سا خیمہ تھا۔ جو بھڑکتی آگ کے عین وسط میں بھی اپنے مکینوں کو محفوظ رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ فائر شیلٹر اردگرد کے تقریباً آٹھ سو ڈگری سینٹی گریڈ کے درجۂ حرارت سے اپنے مکینوں کو تقریباً تین گھنٹے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

پیٹری اور اس کے ساتھی جنوبی کنارے کے ساتھ اوپر جاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایچ ٹو کی طرف جانے والا راستہ نسبتاً محفوظ تھا۔ جبکہ جنوبی کنارے سے شعلے اب زیادہ دور نہیں تھے۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد پیٹری نے جنوبی کنارے سے اوپر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے راستے مسدود کررہی تھی۔ یکے بعد دیگرے پائن کے درخت اور جھاڑیاں شعلوں کی زد میں آرہی تھیں۔ پیٹری اوپر کی جانب لپکا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے۔

○☆○

میکی کی ہدایت پر پیٹری کا گروپ ایچ ون کی طرف جارہا تھا۔ مگر وہ خود اپنے ساتھیوں کو قائل نہیں کرپایا تھا کہ انہیں جنوبی کنارے کی طرف جانا چاہیے۔ ان کے چہروں پر شکوک تھے۔ وہ متذبذب تھے۔ مجبوراً میکی کو حکم دینا پڑا۔

"مارچ" اور وہ سب مڑے اور دوڑتے ہوئے گہرے دھوئیں میں گھس گئے۔ انہیں جلد ایک نئی حفاظتی لائن تیار کرنا تھی۔ جنگل کے بچاؤ کے لیے نہیں بلکہ اپنے بچاؤ... کے لیے۔

پیٹری کے گروپ میں کوٹس رہوڈز واحد شخص تھا جو گروپ کے ساتھ جانے کے بجائے مغرب کی سمت چل پڑا تھا۔ اس کا رخ ایچ ٹو کی طرف تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب اس نے خود کو ہیبت ناک شعلوں کے مقابل پایا تو وہ بدحواس ہو کر پلٹا اور دوڑتا ہوا اپنے گروپ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ گہرے دھوئیں اور تپش کے درمیان سے وہ گزر رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف جلنے اور تڑخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک پیٹری کو یوں لگا جیسے اس کے عقب میں کسی ڈی سی ۱۰ طیارے نے اپنے انجن کھول دیے ہوں۔ اس نے مڑ کر دیکھا' آگ کا ایک گرجتا دریا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"بھاگو!" اس نے چیخ کر کہا حالانکہ وہ پہلے ہی اپنی ہر ممکن رفتار سے چل رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف شعلے ناچ رہے تھے۔ اوپر سے راکھ اور انگارے برس رہے تھے اور عقب سے جہنمی آگ ان کے تعاقب میں دوڑی چلی آرہی تھی۔ اس کی حرارت وہ اپنے جسموں پر محسوس کر رہے تھے۔

○☆○

مغربی کنارے سے آگ اب صرف دو سو فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ وہاں ایک جونیپر کے درخت تلے کھڑا ایرک سن ریڈیو پر ہیکی اور اس کے ساتھیوں کی ایچ ون کی جانب رہنمائی کر رہا تھا' وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں؟"

آخری بار وہ دس منٹ پہلے اسے نظر آئے تھے اور اس کے بعد سے پوری ڈھلان پر سوائے شعلوں اور دھوئیں کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر ہیکی اور اس کے ساتھی اب تک ڈھلان پر تھے تو ان کی زندگیوں کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس نے دوربین سے دیکھا۔ ڈون میکی اور اس کے ساتھی آگ سے بچتے اوپر کی طرف آرہے تھے۔ ان کے بالکل عقب میں شعلوں کی ایک دیوار سی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایرک سن نے بے اختیار چلّا کر میکی کو خبردار کیا۔ مگر اتنی دور سے اس کی آواز وہاں تک جانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ریڈیو کا رابطہ پہلے ہی منقطع ہو چکا تھا۔

اسی وقت ہوا کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ سے بھی تجاوز کر گئی تھی اور چھوٹا موٹا طوفان آگیا تھا۔ ہواؤں نے پلک جھپکتے میں آگ کو پوری ڈھلان پر پھیلا دیا تھا اور اب میکی اور اس کے ساتھی ایرک سن کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی محاذِ جنگ پر کھڑا ہو اور چاروں طرف بم پھٹ رہے ہوں۔ یہ ایسی آوازیں تھیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ قیامت کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ عین اسی لمحے ایرک سن نے کچھ افراد کو اوپر آتے دیکھا۔ ان کے تعاقب میں شعلے لپک رہے تھے۔ ایرک سن بے اختیار چلّا اٹھا۔

"اے' آگ تمہارے پیچھے' سب کچھ پھینک دو۔"

آگ واقعی خطرناک حد تک نزدیک آگئی تھی۔ بدحواس کارکنوں نے اپنے اوزاروں سے جان چھڑانے میں عافیت جانی اور پوری رفتار سے اوپر کی طرف دوڑے۔ مگر شعلے بھی تقریباً اسی رفتار سے ان کے پیچھے آرہے تھے۔

○☆○

اوپری کنارے کے نزدیک موجود مچلی بے تابی سے رومیو کی واپسی کی منتظر تھی جو پانی لینے گیا تھا۔ اسے حفاظتی زون کو بچانے کے لیے پانی کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے گھوم کر چھتری نما بادل کو دیکھا۔ جس کے نیچے سرخ شعلے چمک رہے تھے۔ آگے کیا ہونا تھا وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ آگ کی ایک دیوار وسطی ڈھلان سے ایچ ٹو اور حفاظتی زون کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ مچلی کو احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ اس ڈھلان کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا" مچلی نے خود سے کہا۔

لیکن وہ کہاں جاتی' جنوبی کنارے کے پار یا پھر نیچے۔ جنوبی کنارے کی طرف جانے کے لیے انہیں آگ کے وسیع دریا کو عبور کرنا پڑتا جبکہ نیچے جانے کا راستہ ابھی محفوظ تھا۔ چند لمحے بعد مچلی اور اس کے بیس ساتھی فائر جمپرز اور ہاٹ شوٹرز ایک قطار کی شکل میں جنوبی کنارے کے متوازی نیچے اتر رہے تھے۔ معاً ان کے راستے میں شعلوں کی ایک نئی دیوار برآمد ہوئی۔

"جلدی چلو" مچلی چلّائی۔

وہ دوڑے اور دھوئیں میں گھس گئے۔ چند ثانیے کو یوں لگا جیسے وہ سب جہنم میں آگئے ہوں۔ مگر وہ بہ حفاظت اس لائن کو عبور کر گئے۔ ان کا یہ راستہ ایچ ٹو سے ہو کر گزرتا تھا۔ البتہ ایچ ون ان سے نزدیک ہونے کے باوجود ناقابل رسائی تھا۔ ایچ ٹو کے بعد وہ ایک بار پھر جلتی سلگتی جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ اچانک مچلی نے گھوم کر ایچ ون کی جانب جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ پوری نچلی ڈھلان شعلوں میں چھپی ہوئی تھی اور وہ زیادہ دیر اس میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے اعلان پر اس کے ساتھیوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا مگر اس کی ہدایت پر وہ بے چون وچرا.... جنوبی کنارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے پار

ایچ ون تھا۔ آگ ان کے تعاقب میں تھی اور وہ دوڑتے دوڑتے بے حال ہوئے جارہے تھے۔ دھوئیں نے ان کے پھیپھڑوں کو شل کردیا تھا اور راکھ ان پر برس رہی تھی۔ انگاروں نے ان کے لباس اور بالوں کو جگہ جگہ سے جھلسادیا تھا۔ ہر گزرتے لمحے مچلی کے خوف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ لیکن بالآخر وہ جنوبی کنارہ عبور کرکے ایچ ون تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔

تھکن سے چور ہونے کے باوجود مچلی اور اس کے ساتھیوں نے فوری طور پر ایچ ون کی حفاظتی لائن کو چوڑا کرنا شروع کردیا۔ اسے امید تھی کہ وہ ایچ ون کو بچالے گی۔ بہ صورتِ دیگر انہیں میدان کی طرف روانہ ہونا پڑتا۔ اور اس صورت میں کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ زندہ سلامت نیچے پہنچ بھی پائیں گے یا نہیں۔

○☆○

رومیو ۹۳ کا پائلٹ ڈک گڈ اپنے ان افراد کو تلاش کررہا تھا جنہیں اس نے فائر فائٹرز کی مدد کے لیے وسطی ڈھلان پر اتارا تھا لیکن کچھ دیر بعد جب وہ انہیں واپس لینے آیا تو پوری ڈھلان پر سوائے شعلوں اور دھوئیں کے کچھ نہیں تھا۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ مچلی اور اس کے ساتھیوں پر پڑی۔ اس نے کاپٹر ان کے نزدیک لے جاکر انہیں اٹھانا چاہا مگر ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہوا اور تقریباً دو سو فٹ بلند شعلوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی ہری کین طوفان میں پرواز کررہا ہو۔ بالآخر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ مچلی اور اس کے ساتھیوں کی کوئی مدد نہیں کرسکے گا۔ مجبوراً اس نے رومیو کو اوپر اٹھالیا اور واپس میدان کی جانب روانہ ہوگیا۔

آسمان پر اتنا دھواں جمع ہوگیا تھا کہ سورج محض چاند کی طرح نظر آرہا تھا۔ کسی دیو کی اکلوتی سرخ آنکھ جیسا۔ مچلی خوف زدہ ضرور تھی لیکن اس کا ذہن پسپائی کے ممکنہ راستوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک راستہ جنوبی کنارے کے ساتھ نیچے میدان تک چلا جاتا تھا۔ یہ راستہ طویل ضرور تھا لیکن خاصا محفوظ تھا۔ اس کے برعکس مختصر راستہ جو نچلے پہاڑی کٹاؤ کے قریب سے گزرتا تھا۔ اس کے دونوں اطراف میں آگ بھڑک رہی تھی اور وہاں سے گزرنا خود کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف تھا۔ مچلی سے ذرا ہی دور کوئی جان سن "کاپٹر کریو کے افراد کو تلاش کررہا تھا۔ اس کی درخواست رومیو کے پائلٹ ڈک گڈ نے کی تھی۔ جلد ہی اس کی توجہ سرخ ہیلمٹ پہنے افراد کی طرف ہوگئی جو پہاڑی کنارے کے ساتھ نیچے جارہے تھے۔ کوئی نے چیخ کر انہیں روکنا چاہا۔ لیکن یہ بے سود تھا۔ قیامت کے اس شور میں اس کی آواز دس فٹ سے آگے نہیں جاسکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کاپٹر کریو کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

شعلے قریب آتے دیکھ کر مچلی چلّائی "نیچے کود جاؤ۔"

یہ جگہ کسی چھت سے مشابہ تھی اور پاؤں لٹکانے کے لیے زمین بھی تیس گز نیچے تھی۔ مگر جل کر مرنے سے بہتر تھا کہ وہ جدوجہد کرتے ہوئے موت کو گلے لگاتے۔ ایک ایک کرکے مچلی کے تمام ساتھی نیچے کود گئے۔ سب سے آخر میں مچلی خود کودی تھی۔ اب وہ بیلن کی طرح لڑھکتے نیچے جارہے تھے۔ کوئی لڑھکتے ہوئے بھی اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"کیا وہ صحیح سلامت ہوگا؟" جواب مایوس کن تھا۔

اوپر وسطی اور اوپری ڈھلان پر منڈلاتے رومیو کے پائلٹ ڈک گڈ کا دل ڈوبا جارہا تھا۔ اس جگہ اس کے چھ ساتھیوں کے علاوہ کم از کم تین درجن فائر فائٹرز اور بھی تھے اور اب وہاں سوائے دو سو فٹ بلند شعلوں کے کچھ نہیں تھا۔

"کوئی نہیں، شاید ایک بھی نہیں" اس نے دکھ سے سوچا "کوئی نہیں بچا۔"

○☆○

فائر جمپر کوئی پیٹری نے اپنا ہیلمٹ اتار کر جھاڑا۔ اس پر راکھ کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ راکھ اس کے کانوں اور دانتوں میں بھی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی جنوبی کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے لیکن ابھی تک انہیں وہ جگہ نہیں ملی تھی۔ جہاں میکی نے سامان چھوڑا تھا۔ وہ حفاظتی زون جہاں فائر شیلٹر موجود تھا اور یہی چیز ان کی جان بچاسکتی تھی۔ ایچ ون سے اوپر یہ علاقہ چاروں طرف سے آگ میں گھرا ہوا تھا۔ اور یہ گھیرا ہر لمحے تنگ سے تنگ ہوتا جارہا تھا۔ ہر طرف شعلے تھے یا گہرا دھواں، آگ کے گرجنے کی آواز ایسی تھی جیسے کسی جیٹ طیارے کا انجن سپرسانک رفتار سے چل رہا ہو۔

"میرے خدا، آگ تو ہمارے قریب ہی ہے" پیٹری زندگی میں کبھی اتنا خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔

اس نے اپنے آگے موجود افراد کو دھکیلا اور وہ سب گرتے پڑتے دوڑ پڑے۔ وہ شاخیں پکڑتے، جھاڑیاں روندتے اور درختوں سے ٹکراتے اوپر جارہے تھے۔ پیٹری اپنے تین بچوں اور بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی موت کے بعد بیوی کو اکیلے ہی بچوں کی پرورش کرنا پڑتی۔

باپ کے ساتھ وہ ماں کی توجہ سے بھی محروم ہوجاتے۔ دو سو گز کی چڑھائی کے بعد دو جمپرز نے مزید آگے جانے سے انکار کردیا۔ حدت اور پانی کی کمی سے ان کے ٹانگوں کے مسلز بے کار ہوگئے تھے۔ وہ رکنا اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں چند لمحے بیٹھ کر وہ آرام کرسکتے۔ وہاں موجود درختوں اور جھاڑیوں پر آگ ابھی تک حاوی نہیں ہوئی تھی مگر وہاں گھاس سلگ رہی تھی اور کچھ درختوں کے تنے بھی آگ کی لپیٹ میں تھے۔ وہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

"ڈان نے کہا تھا کہ یہیں کہیں فائر شیلٹر ہے۔" پیٹری نے ساتھیوں سے کہا "یہاں رکنے کے بجائے اسے تلاش کرو۔"

جیسے جیسے وہ اوپر جارہے تھے۔ ہوا تند ہوتی جارہی تھی۔ کچھ دیر میں وہ چوٹی پر تھے۔ سب سے پیچھے وہ جمپرز تھے جنہوں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کردیا تھا۔ چوٹی پر ہوا بے حد طاقت ور تھی اور راکھ اور گرم انگارے ان پر برس رہے تھے۔ گرم سرخ راکھ آسمان پر اڑ رہی تھی۔

"ایک جہنمی طوفان!" پیٹری نے سوچا۔

اور جیسے ہی وہ سب کنارہ عبور کرکے ایچ ون کے عقب میں آئے، انہیں میکی کا بتایا ہوا حفاظتی زون نظر آگیا۔ یہ چالیس فٹ لمبا چوڑا علاقہ تھا جو آگ اور دھوئیں سے محفوظ تھا۔ وہاں ایک سرخ پیکٹ رکھا تھا۔ پیٹری نے تیزی سے اس پیکٹ کو کھولا۔ اندر سے المونیم سے بنا نیلا خیمہ برآمد ہوا۔ یہ فائر شیلٹر تھا۔ یہ نصب ہونے کے بعد بہ مشکل ڈھائی فٹ اونچا مگر دس فٹ لمبا چوڑا خیمہ بن جاتا تھا۔ پیٹری نے اسے نصب کرنا چاہا مگر تیز ہوا خیمے کو اس کے ہاتھوں سے اڑا لے جانے کے لیے بے چین تھی۔

"ساتھیو، میری مدد کرو" پیٹری چلّایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ خیمہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو دردناک موت سے انہیں کوئی نہیں بچاسکے گا۔ درجن بھر افراد نے مل کر بہ مشکل خیمے کو نصب کیا اور اس کے بعد اس کے اندر گھس گئے۔ انہوں نے خیمے کو یوں اپنی ڈھال بنالیا تھا جیسے کچھوا اپنی پشت کو ڈھال بنالیتا ہے۔ خیمے میں جانے سے پہلے پیٹری نے ریڈیو پر میکی سے رابطہ کیا۔

"ڈون" اس نے کہا "ہم محفوظ علاقے میں پہنچ گئے ہیں اور ہمیں حفاظتی خیمہ بھی مل گیا ہے۔"

پیٹری جواب کا منتظر تھا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے ایک بار پھر ٹرانسمٹنگ بٹن دبایا۔

"ڈون، تم موجود ہو۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے۔"

جواب میں ریڈیو سے ہواؤں کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ ڈون کہاں تھا؟ وہ جواب کیوں نہیں دے رہا تھا، ابھی پیٹری ان سب سوالوں پر غور کررہا تھا کہ اسے سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار کھانستا ہوا نیچے جھک گیا۔ جہاں ہوا نسبتاً صاف تھی۔ اور پھر تپش نے اسے بھی فائر شیلٹر میں جانے پر مجبور کردیا۔

○☆○

مغربی پہاڑی کنارے کے محفوظ علاقے میں ایرک ہپکی اور اس کے ساتھیوں نے سامنے پچھلی ڈھلان سے سیاہ دھوئیں کے مرغولے اٹھتے دیکھے۔ ان کے جلو میں کئی سو فٹ بلند شعلے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے متعدد دیو فضا میں بلند ہورہے ہوں، اس سے کچھ نیچے روب اور اس کے ساتھیوں نے آگ کو اپنی طرف بڑھنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہے۔ بیس گھنٹے کی جان لیوا جدوجہد نے اُن میں سے توانائی کی آخری رمق تک نچوڑلی تھی۔ انہیں جس رقبے کو محفوظ کرنا تھا۔ وہ چھ فٹ بال کے میدانوں جتنا تھا۔ سوائے چند ایک جگہوں کے جہاں چٹانیں اور ریت تھی، انہیں تقریباً ہر جگہ سے بے تحاشا جھاڑیاں اور درخت صاف کرنے پڑے تھے۔ ان لوگوں کے لیے ہر مرحلہ پُل صراط سے کم نہیں تھا۔ بعض جگہیں تو ایسی تھیں کہ پاؤں پھسلنے کی صورت میں ہزار فٹ نیچے جاکر ہی کہیں رکتے۔ انہوں نے چالیس گز چوڑی اور ایک ہزار گز لمبی حفاظتی لائن بنائی تھی۔ اس کے باوجود بڑھتی ہوئی آگ کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ علاقے کو بچاسکیں گے۔ ان کے آگے اور پیچھے ہر طرف آگ تھی، کارکن سخت خوف زدہ تھے۔

"ہمیں فائر شیلٹر میں پناہ لینی چاہیے" ایک فائر جمپر بولا۔

مگر اس کے لیے کوئی محفوظ جگہ درکار تھی۔ جو آگ کی براہ راست زد سے محفوظ ہو۔ ہپکی نے سوچا کہ ممکن ہے اوپر کوئی ایسی جگہ مل جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اوپر بڑھنے والی آگ کے متوازی سفر شروع کردیا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے اچانک کوئی چلّایا۔

"وہ دیکھو، آگ!" ہپکی مڑا۔ آگ نے ان کی بنائی حفاظتی لائن عبور کرلی تھی اور اب تیزی سے ان کی جانب بڑھ رہی تھی اور اب زندہ رہنے کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ آگ سے پہلے اوپر پہنچ جائیں۔ بہ صورتِ دیگر ان کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں تھی۔ ہپکی اور اس کے ساتھی ٹانگوں کی

پوری قوت سے اوپر کی طرف دوڑے۔ دو سو گز اوپر چڑھنے کے بعد ہیکی نے مڑ کر دیکھا تو غیر متوقع طور پر اسے نیلے ہیلمٹ میں ڈان میکی لنچ اسپاٹ کی سمت سے سرپٹ دوڑتا اپنی جانب آتا نظر آیا۔ اس کے عقب میں آسمان تک شعلوں کی ایک دیوار سی بلند نظر آرہی تھی اور دھوئیں نے سورج کو مکمل طور پر چھپالیا تھا۔

ہیکی نے ڈون میکی کے آنے سے ایک نیا حوصلہ محسوس کیا۔ اتنا دوڑنے کے باوجود میکی کی سانسیں ہموار تھیں جبکہ اس کے ساتھیوں کی حالت ابتر ہورہی تھی۔ اس کا اسٹیمنا قابلِ رشک تھا۔ اس نے ہیکی کو آگے دھکیلا۔

"دوڑتے رہو۔ ہم اوپر پہنچ جائیں گے۔"

معاً وہ رک گئے۔ میکی کے دو کاپٹر کریو' روب جان سن اور کچھ ہاٹ شوٹرز نیچے کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ وہ کراہا۔

"میرے خدا' یہ لوگ کہاں جارہے ہیں۔"

اس نے چلا کر انہیں رکنے اور اوپر آنے کو کہا مگر اس کی آواز گرجتی آگ میں گم ہو کر رہ گئی۔

"ڈون اوپر چلو' ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" ہیکی نے چیخ کر کہا۔

اسی اثنا میں ایسی گرج دار آواز آئی جیسے بادل گرجے ہوں۔ ان کے داہنی سمت سے آگ کے نئے فوارے بلند ہورہے تھے۔ اچانک ہی اوپر سے ایرک سن کے چیخنے کی آواز آئی "اپنے اوزار پھینک دو اور تیزی سے بھاگو۔"

ہیکی اور دوسرے لوگ تیزی سے بھاگے۔ مگر میکی وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ بھی بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں جاتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ تیزی سے مڑا اور اس سمت جانے لگا جہاں اس نے روب جان سن اور دوسرے افراد کو جاتے دیکھا تھا۔

ہیکی ہر ممکن رفتار سے دوڑ رہا تھا اور اسے آگے جانے والے دو فائر جمپرز پر غصہ آرہا تھا جو سستی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ انہیں ہر صورت میں آگ سے پہلے ایچ ون کے عقبی علاقے میں پہنچ جانا تھا۔ جہاں حفاظتی زون میں فائر شیلٹر موجود تھا۔ وہی اس وقت ان کی واحد امید تھا۔ ہیکی آگے جاتے افراد پر چیخا۔

"تیز چلو...... اور تیز...."

مگر شعلے اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تیز نکلے۔ جب وہ اور اس کے ساتھی چوٹی پر پہنچے۔ تو شعلے کنارے سے صرف دس فٹ کی دوری پر تقریباً ڈھائی سو فٹ اونچے اٹھ رہے تھے۔ پوری ڈھلان یوں سرخ ہورہی تھی جیسے اس پر سرخ چنار بچھے ہوں۔ اچانک ہیکی کو شدید حرارت اور تکلیف محسوس ہوئی اس نے چیختے ہوئے آگے چھلانگ لگائی اور منہ کے بل زمین پر لیٹ کر دیوانہ وار سانس لینے لگا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا آبِ حیات کی طرح اس کے جھلسے پھیپڑوں میں اترنے لگی۔ معاً اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی پشت پر سلگتی سلاخ رکھ دی ہو۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ اس کی کٹ کی نائلون کی پٹیوں نے آگ پکڑلی تھی۔ اس نے دیوانہ وار کٹ اتار پھینکنے کی کوشش کی اور جب تک وہ اس کوشش میں کامیاب ہوتا' اس کی جیکٹ کی آستین نے آگ پکڑلی تھی۔ اپنے گوشت اور بال جلنے کی وحشت ناک بو اس کے نتھنوں میں گھسی جارہی تھی۔ اس نے بہ مشکل مٹی ڈال کر آستین کی آگ کو بجھایا۔ بھیانک آگ ان سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی تھی اور ان کے پاس بچنے کی ایک ہی راہ تھی کہ آنکھ بند کرکے دوسری طرف کود جائیں۔ ہیکی کے پاس فیصلے کے لیے چند ہی سیکنڈ تھے۔

○☆○

مچلی ایرسن' کونی جان سن اور ان کے ساتھیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جنوبی کنارے کی ڈھلان سے نیچے اتر جائیں۔ جسے دونوں طرف سے شعلوں نے گھیر رکھا تھا۔ البتہ درمیانی راستہ محفوظ تھا۔ لیکن یہ کہنا دشوار تھا کہ ان کے نیچے جانے تک یہ راستہ محفوظ رہے گا بھی یا نہیں۔

"اپنی جیکٹس پہن لو" مچلی نے ان سے کہا "یہ جیکٹیں انہیں ڈھلان کے ساتھ ہی ملی تھیں۔ جو میکی اور اس کے ساتھیوں نے غیر ضروری جان کر وہیں چھوڑ دی تھیں۔ مچلی اور اس کے ساتھیوں نے دوڑتے دوڑتے ہی جیکٹیں جسم پر چڑھالیں۔ اچانک ایک معجزہ سا ہوا۔ شعلے معاً ہی ان کے پیچھے آنے کے بجائے اوپر کا رخ کرنے لگے۔ اسی لمحے اوپری کنارے سے کوئی چیز لڑھکتی ہوئی ان کی راہ میں آگری۔ یہ ایک انسانی جسم تھا۔ جگہ جگہ سے جھلسا اور زخمی جسم۔

"میرے خدا! یہ تو ہیکی ہے" مچلی چلا اٹھی۔

ہیکی ہوش میں تھا۔ وہ کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے بعد اس کے ساتھی بھی یکے بعد دیگرے نیچے آنے لگے۔ وہ فوری طور پر آگے روانہ ہوگئے۔ ان کے پاس وقت کم تھا اور ویسے بھی انگاروں اور راکھ کی بارش میں کھڑے رہنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنا سفر جاری رکھتے۔ دو فائر فائٹرز زخمی ہیکی کی

مدد کر رہے تھے۔ اوپری کنارے پر ایرک سن اور اس کے ساتھی ان کے متوازی سفر کر رہے تھے۔ ایرک سن کی بے قرار نگاہیں روب جان سن، میکی اور ان کے ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھیں جن کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ پھر آگ نے اسے جنوبی کنارے سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے اس کی نگاہ زخمی ہیکی پر پڑی۔ خوش قسمتی سے ایرک سن کے پاس ٹھنڈا پانی تھا جو اس نے ہیکی کے زخموں پر لگایا اور پھر اس پر ٹی شرٹ لپیٹ دی۔

ان کے عقب میں مچلی چیخ چیخ کر ان افراد کو آواز دے رہی تھی جو اس سے بچھڑ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ "میرے خدا...!" اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا "کیا میں نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ کیا آگ نچلی ڈھلان تک پہنچ چکی ہے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو موت کے منہ میں جھونک دیا۔ جو مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔"

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ دھوئیں کی وجہ سے یا پھر اپنے ساتھیوں کی موت کا سوچ کر یہ خیال بہت خوفناک تھا۔ اتنا کہہ کر وہ آگ کو بھی بھول گئی۔ ایک ذہنی بے خیالی کی کیفیت میں وہ میل بھر کا فاصلہ طے کر کے نیچے فری وے تک پہنچی تو ایمبولینس ہیکی کو لے کر روانہ ہو رہی تھی۔ وہاں اور بھی کئی افراد تھے لیکن راکھ اور جھلسے ہوئے چہروں نے ان کی شناخت چھین لی تھی۔ مچلی ایک ایک کو بہ غور دیکھ رہی تھی اور وقفے وقفے سے چلّا اٹھتی تھی۔

"اوہ، تم جان ہو، میرے خدا، جیک تم زندہ ہو۔"

کچھ دیر میں اسے علم ہو گیا کہ اس کے گروپ کے تمام ہی افراد زندہ سلامت اور خیریت سے تھے۔ آگ کے اس سمندر سے ان کا صحیح سلامت نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ البتہ کونی جان سن اپنے بھائی روب کے لیے فکر مند تھا۔ اسی طرح ایرک سن، میکی کے لیے پریشان تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ روب اور اس کے ساتھیوں کے پاس حفاظتی جیکٹیں تھیں۔ وہ صرف امید کر سکتا تھا کہ روب اور میکی اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیریت سے ہوں گے۔

علاقے کا فائر مارشل بذاتِ خود کنگ ماؤنٹین آ گیا تھا۔ مچلی اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی اور اس کا بازو تھام کر چلّائی۔

"مارشل، ہمارے کچھ ساتھی وہاں ہیں۔ پلیز، انہیں بچاؤ" وہ جس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہاں سوائے آگ اور دھوئیں کے کچھ نہیں تھا اور اگر وہاں کچھ لوگ تھے بھی تو اب ان کی زندگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مارشل کو افسوس تھا کہ انتظامیہ کی غفلت نے متعدد فائر فائٹرز کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔ اس نے بھرپور اقدامات کی درخواست کی تھی جو منظور کر لی گئی تھی اور اگلے چند گھنٹوں میں کنگ ماؤنٹین کے اس علاقے میں کولوریڈو... کی تاریخ کا... سب سے بڑا فائر فائٹنگ آپریشن شروع ہونے والا تھا۔

○☆○

شعلے اب چوٹی پر لگے پائن کے درختوں کی بلندی تک پہنچ چکے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان تک جانا چاہتے ہوں۔ اس سے محض چند گز نشیب میں پیٹری اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فائر شیلٹر تلے پناہ گزین تھا۔ طوفانی ہوا کے جھکڑوں کے سامنے انہیں خیمے کو تھامے رکھنے میں شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ جانتے تھے اگر یہ ڈھال ان کے اوپر سے ہٹ گئی تو آگ چند سیکنڈ میں انہیں روسٹ کر کے رکھ دے گی۔

لہٰذا وہ ہر ممکن مضبوطی سے خیمے کو زمین کے ساتھ لگائے رکھے ہوئے تھے۔ گرمی اور حبس سے ان کا برا حال تھا۔ خیمے کے اندر درجۂ حرارت ۴۳ ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ مگر خیمے کے باہر یہ ساڑھے چھ سو ڈگری سے بھی زیادہ تھا۔ پیٹری نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دھواں ان کی طرف نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ وہ گرمی سے نہیں تو دم گھٹ کر ضرور مر جاتے۔

"ہے کسی کے پاس سگریٹ ہے" اچانک اس نے چلّا کر کہا "ہم اسے بغیر ماچس کے بھی جلا سکتے ہیں۔"

یہ بات اس نے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہی تھی۔ جس کا خاطر خواہ ردِ عمل ایک زبردست قہقہے کی صورت میں برآمد ہوا۔ اب پیٹری اپنے بیٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان کے نام ڈومینک، کائل اور ورنس تھے۔

"اب میں کبھی ان کے ساتھ لیونگ روم کے فرش پر کشتی نہیں کر سکوں گا" اس نے حسرت سے سوچا "نہ میں کبھی انہیں پکنک پر لے جا سکوں گا۔"

دوسرے فائر جمپرز کی طرح اس کی بیوی نے بھی اس سے طلاق لے لی تھی اور اسے اور بیٹوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ فائر جمپرز اب اکثر ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے کہ ان میں طلاقوں کی شرح سو فیصد ہوتی جا رہی ہے۔ اچانک پیٹری چونکا اور باہر کی آوازیں سننے لگا۔ آگ کی گرج بتا رہی تھی کہ وہ چوٹی پر مکمل قبضہ کر چکی تھی۔ گویا اب ان کے چاروں طرف شعلے تھے اور پیٹری یہ سوچ کر ہی لرز اٹھا کہ اگر اگلے چند گھنٹے تک یہی صورتِ حال رہی تو فائر شیلٹر بھی ان کی حفاظت سے قاصر ہو جائے گا۔ اچانک ہی ایک نئی آواز کا

اضافہ ہوگیا...یہ جھاڑیاں جھلسنے کی آواز تھی جو تیزی سے نزدیک آرہی تھی۔

"اس خیمے کو زمین سے لگاؤ" پیٹری نے ساتھیوں سے کہا "آگ نزدیک آرہی ہے۔"

وہ سب اپنا تمام تر وزن استعمال کرنے لگے۔ دھواں خیمے کے اندر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ اور ہوا خیمے کو اڑالے جانے کے درپے تھی۔ نہ جانے اس جدوجہد میں کتنا عرصہ گزرا۔ رفتہ رفتہ خیمے کے اندر کا درجۂ حرارت بڑھتا جارہا تھا۔ پیٹری جب بھی حرارت پیما کی طرف دیکھتا۔ ایک آدھ ڈگری زیادہ ہی نظر آتی۔ گرمی اس کے حواس پر چھارہی تھی اور اسے اپنا ذہن جیسے تاریکی میں ڈوبتا لگ رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے اسے کوئی جھنجوڑ رہا ہو۔ شدید تپش اور دم گھٹنے کا احساس اسے ہوش میں لے آیا۔

"پیٹری' اوپر کوئی بڑا جہاز ہے" ایک فائر جمپر.... اسے جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا۔

اس وقت کنگ ماؤنٹین پر امریکا کے وفاقی محکمہ برائے انسدادِ آگ کا ایک بڑا ائر ٹینکر منڈلا رہا تھا۔ اس کی ٹینکیاں آگ بجھانے والے مخصوص گیلے کیمیائی مادے سلرے سے بھری ہوئی تھیں۔ جو پلک جھپکتے میں آگ کو سرد کردیا کرتا ہے۔ لاک ہیڈ کا تیار کردہ ہرکولیس ۱۴۰ جو چار عدد جیٹ انجنوں سے لیس تھا۔ امدادی کارروائیوں کے لیے بے مثال طیارہ تھا۔ پہلے طیارے کے عملے نے نیچے گمشدہ فائر فائٹرز کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر نیچے سوائے دھوئیں اور آگ کے کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے سلرے گرانے کا فیصلہ کیا اور یہ محض اتفاق تھا کہ انہوں نے سلرے گرانے کے لیے ایچ ون اور اس کے قریبی علاقے کو منتخب کیا جیسے ہی طیارہ مخصوص پوزیشن میں آیا' سلرے کی ٹینکیاں کھول دی گئیں اور سفیدی مائل گلابی مادہ ایک بادل کی طرح نیچے گرنے لگا۔

پیٹری کو خیمے میں ایسی آواز آئی جیسے کسی نے بھڑکتے الاؤ پر پانی کی بالٹی الٹ دی ہو۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ آگ بھڑکنے کی آوازیں بند ہوگئیں۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے خیمے سے باہر جھانکا اور یہ دیکھ کروہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچے کہ ان کے چاروں طرف خاصی دور تک آگ بجھ گئی تھی اور سلگتی لکڑیوں سے ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہر طرف سیاہ اور سفید راکھ بکھری تھی۔ اوپر ائر ٹینکر اب جنوبی کنارے کے دوسری طرف سے سلرے برسا رہا تھا۔ ان سے صرف پانچ سو گز دور آگ بدستور روشن تھی۔ ان کے اطراف میں آگ بجھ گئی تھی۔ مگر تپتی زمین اور چٹانیں ابھی تک حدت دے رہی تھیں۔

"ساتھیو... ہمیں نیچے چلنا ہوگا" پیٹری بولا "اور وہ سب ایک قطار میں جنوبی کنارے کے ساتھ نیچے اترنے لگے۔ کچھ دور انہیں جلی ہوئی لکڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر نظر آیا۔ یہ وہ انبار تھا جو انہوں نے حفاظتی لائن بنانے کے دوران میں درختوں اور جھاڑیوں کو کاٹ کر جمع کیا تھا۔ تیز ہوا' اس میں سے راکھ منتشر کررہی تھی۔ معاً پیٹری چلتے چلتے رک گیا۔ اس کے منہ سے نکلا "اوہ نہیں" اس کی نگاہیں کنارے سے کچھ دور' ایک پگڈنڈی پر مرکوز تھیں۔ جس پر کچھ جسم بکھرے ہوئے تھے۔ جو اس بری طرح جلے تھے کہ کوئلہ ہوگئے تھے۔ پیٹری نے قریب جاکر ان کا معائنہ کیا۔ وہ جان گیا کہ ان کی موت کی وجہ آگ نہیں بلکہ ٹوکسک گیس تھی۔ جس نے ان کا دم گھونٹ کر انہیں مار ڈالا۔ پہلی لاش گھٹنوں اور چہرے کے بل زمین پر پڑی تھی جیسے اس نے جان کنی کی کیفیت میں زمین کی پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں اسے ڈون میکی کی حیثیت سے شناخت کرلیا گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی جان دے دی تھی۔ اس سے پندرہ گز نیچے روب جان سن ملا۔ اس نے دونوں ہاتھ گھٹنے پر باندھ رکھے تھے اور چہرہ پیروں میں چھپا لیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ قابلِ شناخت رہ گیا تھا۔ ان سے آگے ایک ہی جگہ بیک وقت چھ فائر فائٹر ہمیشہ کی نیند سوتے نظر آئے۔

پیٹری کی آنکھیں دُھندلا رہی تھیں۔ ان میں سے بعض تو دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان سے کچھ ہی دور ان کے ساتھی کس قدر الم ناک انجام سے دوچار ہوئے اور انہیں علم ہی نہیں ہوا۔ بعد میں تحقیق کرنے والوں نے اندازہ لگایا کہ میکی اور اس کے ساتھی بھٹک کر آگ کے سامنے جانکلے اور انہیں واپسی میں تاخیر ہوگئی۔ اتنی تاخیر کہ ان کا عقبی راستہ بھی بند ہوگیا اور پھر ان میں سے کچھ دم گھٹ کر اور کچھ جل کر ہلاک ہوگئے۔ ایک ہاٹ شوٹر' بیلچا کی لاش جنوبی کنارے سے صرف چند قدم دور ملی۔ اگر وہ تھوڑا اور فاصلہ طے کرلیتا تو فائر شیلٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا۔

چند منٹ بعد ایک ہیلی کاپٹر ایچ ٹو پر اترا۔ پیٹری نے پہلے اپنے ساتھیوں کو روانہ کیا اور خود وہیں کھڑا... ڈھلان کے ساتھ بل کھاتی باریک سی پگڈنڈی کو گھورتا رہا۔ جس پر سفر کرتے ہوئے اس کے ساتھی اس دنیا سے گزر گئے تھے۔

○☆○

۴جولائی کی شام چھ بجے تک موسم نہایت خراب ہوچکا تھا۔ اسٹارم کنگ ماؤنٹین کی پہاڑیاں آتش فشاں کی طرح

آگ اُگل رہی تھیں۔ ڈھلان کا سفر طے کرنے کے بعد اب آگ گلین ووڈ اسپرنگز کے قصبے سے کچھ ہی دور تھی اور میدانی علاقے میں آتے ہی آگ سرعت سے پھیلی اور محض دو گھنٹے میں دو ہزار ایکڑ سے زائد رقبہ اس کی زد میں آگیا۔ ہنگامی حالات نافذ کردیے گئے تھے۔ فائر فائٹرز اور رضاکار ایک اور جنگ کے لیے اکٹھے ہورہے تھے۔ قصبے کو خالی کرالیا گیا تھا اور اس کے مکینوں کو محفوظ مقامات پر روانہ کردیا گیا تھا۔ انتظامیہ نے پوری ریاست سے مدد طلب کرلی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے پچاسی سے زائد فائر انجن اور کوئی درجن بھر کاپٹر اور طیارے کنگ ماؤنٹین کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ایک سو تیں فائر فائٹرز اور اتنے ہی رضاکار آگ کے خلاف مصروف تھے۔ کاپٹر قصبے کی طرف بڑھنے والی آگ پر پانی برسا رہے تھے اور اوپر ائرٹینکر سلرے گرا رہے تھے۔

یہ بلاشبہ ایک بھرپور اور بڑا آپریشن تھا۔ کارکنان قصبے کے گرد حفاظتی لائن بنا رہے تھے۔ یہ آپریشن اگلے چار روز تک جاری رہا۔ جب تک کہ آگ مکمل طور پر نہیں بجھ گئی۔ ایک ہفتے تک مسلسل بھڑکنے والی اس آگ نے دو ہزار ایکڑ سے زائد رقبے پر پھیلے سیکڑوں ملین ڈالرز مالیت کے قیمتی جنگل اور چراگاہ کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔ لیکن اصل نقصان ان چودہ جانوں کا تھا جو آگ بجھانے کے لیے آئے تھے اور خود اسی آگ کا ایندھن بن گئے تھے۔

سب سے پہلے کاپٹر کریو اور ان کے ساتھ فائر جمپرز آگ کی نذر ہوئے تھے۔ ان میں دو کاپٹر کریو اور تین فائر جمپرز تھے۔ مگر سب سے المناک سانحہ ہاٹ شوٹرز کے ساتھ پیش آیا۔ بیس ہاٹ شوٹرز بھیجے گئے تھے جن میں سے گیارہ واپس آئے' پانچ مردوں اور چار عورتوں کو آگ نگل گئی۔ مجموعی طور پر اس روز اسٹارم کنگ ماؤنٹین پر چوّن افراد ہلاک ہوئے تھے۔ جو پوری امریکی فائر فائٹنگ کی تاریخ کا بدترین حادثہ تھا۔ ایک ساتھ کبھی اتنے کارکن ہلاک نہیں ہوئے تھے۔

کونی کو جب اس کے بھائی کی موت کے بارے میں بتایا گیا تو پہلے تو وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ مگر اگلے روز وہ مقامی سیکنڈری اسکول میں رضاکاروں کے ساتھ سرگرم عمل نظر آیا۔ اس نے ایک بار پھر ہاٹ شوٹرز کے ساتھ اوپر جانے کی اجازت چاہی۔ جو کسی قدر انکار کے بعد مل گئی۔ پیٹری کو گھر بھیج دیا گیا لیکن دو ہفتے بعد وہ پھر کام پر تھا۔ ان دنوں وہ منے سوٹا کے انسٹی ٹیوٹ فار فائر ریسرچ کے ایک پروجیکٹ کے لیے کام کررہا ہے جس کا مقصد فائر فائٹرز کے لیے بہتر فائر شیلٹر تیار کرنا ہے۔ ایرک ہپکی گھر جانے سے پہلے طویل عرصے بار جو ویو برن سینٹر میں داخل رہا۔ جہاں اس کی جھلس کر غائب ہوجانے والی کھال کی گرافٹنگ کی گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے ستمبر میں کام پر جانے کی اجازت دی۔ یعنی کنگ ماؤنٹین کے حادثے کے دس ہفتے بعد۔ اس کی بیوی نے اس مشکل مرحلے میں اس کی بھرپور مدد کی۔ اس نے ملازمت پہ جانے سے پہلے پیراشوٹ کی چھلانگوں کے ذریعے اپنا اعتماد بحال کیا مگر اس نے فائر جمپر کی ملازمت ترک کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے دوست ڈون میکی کے بغیر اس کام کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

سب سے افسردہ موقع وہ تھا جب عین سالگرہ کے دن ڈون میکی کی بیٹی کو بتایا گیا کہ اس کے ڈیڈی اب کبھی نہیں آئیں گے۔ میکی کی سابق بیوی نے کہا "یہ ڈون کے کردار کی مضبوطی تھی کہ اس نے جان کی پروا کیے بغیر اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا چاہی۔"

مچلی واپس اپنے دفتر چلی گئی۔ مگر اسے زیادہ عرصے کام کرنا نصیب نہیں ہوا۔ ایک ہفتے بعد وہ پھر آگ سے نبرد آزما تھی۔ خاصے عرصے بعد اکتوبر ۱۹۹۴ء کی ایک سرد اور نم صبح جب کنگ اسٹارم پر آگ لگنے کے نشانات حیرت انگیز طور پر معدوم ہوچکے تھے' ہر طرف پائن اور جونیپر کے ننھے درخت سر اٹھا رہے تھے اور جھاڑیاں رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں... ایک بوڑھا جوڑا وسطی ڈھلان کی پگڈنڈی کے ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ یہ روزنبرگ کا ریٹائرڈ فائر مارشل جینے جان سن اور اس کی بیوی تھی۔ وہ جنوبی کنارے سے زیادہ نیچے اس بڑے سے پتھر کے پاس رکے جس کے قریب ان کے بیٹے روب جان سن نے جان دی تھی۔ انہوں نے چند لمحے کو تصور میں یہاں اونچے شعلے لپکتے دیکھے۔ پھر بے اختیار ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

سورج کی پہلی کرن ان کے چہروں پر پڑی تو یہ آنسو ہیرے کی طرح جگمگانے لگے۔ جینے نے احتیاط سے اپنے آنسو صاف کیے اور پھر تھیلے سے ایک خاصا بڑا پائن کا پودا نکالا اور کھرپی سے زمین کھودنے لگا۔ گڑھا بنا کے اس نے پودے کو زمین میں لگایا اور اسے بوتل سے پانی دیا۔ یہ پودا اس نے اپنے بیٹے اور تیرہ ان بہادر انسانوں کی یاد میں لگایا تھا جنہوں نے دوسروں کی بہتری کے لیے یہاں اپنی جانیں قربان کردی تھیں۔ جب تک یہ درخت یہاں رہے گا' ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

صحرانورد

کاشف زبیر

صحارا کا افریقہ کے ہی نہیں دنیا کے خطرناک ترین اور وسیع و عریض صحراؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا طول و عرض سابق سوویت یونین کے برابر مانا گیا ہے۔ ایک شخص کا ایسے لق و دق، بے آب و گیاہ صحرا کو اکیلے پار کرنے کا عزم کرنا بڑی ہمت و جرأت کی بات ہے لیکن انسان اگر چاہے تو کیا نہیں کر سکتا اور وہ بہرحال ایک انسان ہی تھا جس نے اس ریگ زار میں رقصاں بگولوں کے ساتھ سفر کا پروگرام بنایا تھا۔

تنِ تنہا صحرائے صحارا کو عبور کرنے والے مہم جو کا قصہ

مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں۔ مجھے سردی لگ رہی تھی لیکن سلیپنگ بیگ کی جالی سے جھلکتی روشنی بتا رہی تھی کہ دن طلوع ہو رہا تھا۔ پھر مجھے بیگی کے بلبلانے کی آواز آئی۔ ایسی آواز وہ اس وقت نکالتی تھی جب کوئی خطرہ یا مصیبت سامنے ہو۔ میں نے اپنے سلیپنگ بیگ کی زپ کھولی اور باہر نکل آیا۔ بستر کی گرمی سے باہر سرد فضا میں آتے ہی چند لمحے کے لیے مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلا کر اپنے جسم کو ذرا گرم کرنا چاہا اور اسی دوران میں مجھ سے وہ غلطی ہو گئی جس کے لیے مجھے خصوصی طور پر خبردار کیا گیا تھا۔ میں نے جوتے پہنے بغیر ریت پر پیر رکھ دیا اور اسی لمحے ریت کے ہم رنگ صحرائی بچھو نے اپنا ڈنک میری ٹانگ میں اتار دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیر میں تیزاب سے بھرا انجکشن گھونپ دیا ہو۔ میں نے بلبلا کر پیر چلایا۔ مگر بچھو اپنا کام کر کے فرار ہو چکا تھا۔ میں

نے بیٹھ کر اپنی ٹانگ کا جائزہ لیا۔ بچھو کا ڈنک میری ٹانگ میں رہ گیا تھا۔ میں نے احتیاط سے اسے نکالا کہ کہیں اس کا کوئی حصہ ٹوٹ کر اندر ہی نہ رہ جائے۔ جلتے درد کا احساس اب پوری ٹانگ میں پھیل چکا تھا اور مزید اوپر کی جانب سفر کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بچھو کا زہر تکلیف بہت دیتا ہے لیکن جان لیوا نہیں ہوتا اور یہ تو ویسے بھی خاصا چھوٹا سا بچھو تھا۔

"ٹیڈ، پریشان مت ہو۔" میں نے خود سے کہا اور ریت پر برابر میں رکھے سامان سے میڈیکل بیگ نکالا۔ جس میں ان ہی مقاصد کے لیے دوائیاں موجود تھیں۔ میں نے ایک پاؤڈر نکال کر آدھی پیالی پانی میں گھولا اور اس محلول کو قطرہ قطرہ کر کے اس جگہ ٹپکانے لگا جہاں بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ اس سے سوزش میں خاصی کمی واقع ہوئی۔ میں نے ایک جاذب پلاسٹک پٹی زخم کے منہ پر لگائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر یہ دیکھ کر میرے منہ سے خاصی ناگفتنی نکل گئی کہ میرے دس دس گیلن پانی والے چار جیری کین، جو پانی سے بھرے ہوئے تھے، اب زمین پر لڑھکے ہوئے تھے اور بیگی اور ٹریڈ غائب تھیں۔ یہ یقیناً ان ہی کا کارنامہ تھا۔ جیری کین لڑھکا کر وہ خود فرار ہو گئی تھیں۔ میں نے لپک کر جیری کین سیدھے کیے۔ مگر افسوس کہ ڈھیلے ڈھکنوں کی وجہ سے ان کا اکثر پانی رس کر نرم ریت میں جذب ہو چکا تھا۔ میں بیگی اور ٹریڈ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے بچ جانے والے پانی کا حساب لگانے لگا۔ جو صرف دس گیلن تھا۔

ابھی مجھے عظیم صحرائے صحارا کے اس ویران اور اجاڑ علاقے میں سفر کرتے ہوئے محض تیسرا دن تھا، میں چالیس گیلن پانی لے کر چلا تھا۔ جو میرے حساب سے تین ہفتوں کے لیے کافی تھا۔ میں اس سے پہلے ہی اپنی منزل پر پہنچ جاتا۔ میں نے مالی کے سرحدی قصبے یا گاؤں آراوینے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور میری منزل موریطانیہ میں واقع قصبہ کولاٹا تھا۔ یہ آراوینے سے ساڑھے تین سو میل جنوب مغرب میں تھا اور اس کے درمیان میں آکلے کا خوف ناک صحرا آتا تھا۔ جس کے بارے میں دہشت زدہ کر دینے والی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔

ابھی مجھے بہت دور جانا تھا اور میرے محفوظ پانی کا ستر فیصد حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ گویا میری مہم آغاز ہی میں ناکامی سے دوچار ہو گئی تھی۔ میری ٹانگ کے ساتھ سینے میں بھی تکلیف شروع ہو گئی تھی اور ابھی مجھے بیگی اور ٹریڈ کو بھی تلاش کرنا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں نکل گئی تھیں۔ میں نے پہلے ان کے نقشِ پا تلاش کیے جو خوش قسمتی سے جلد ہی مل گئے۔ اور پھر ان کے نقشِ پا کے تعاقب میں بالآخر میں نے انہیں ایک ٹیلے کے عقب میں پالیا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" میں نے انہیں ڈانٹا "تم دونوں نے سارا پانی ضائع کیوں کر دیا، چلو اب اٹھو۔"

وہ ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے بیگی کی ناک کی نکیل پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بلبلاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹریڈ شرافت سے خود ہی اٹھ گئی۔ میں ان کی مہاریں پکڑ کر انہیں پڑاؤ تک لایا اور ان پر سامان بار کرنے لگا۔ جی ہاں بیگی اور ٹریڈ دو اونٹنیاں ہیں جو اس سفر میں میری ہم سفر تھیں۔

افریقہ اور صحرا ہمیشہ سے ایک پُراسرار سرزمین رہے ہیں۔ یہاں کی کہانیاں اور حکایتیں ہر مہم جُو کو اپنی طرف کھینچتی ہیں تو عام آدمی ان کی دہشت ناکی سے سہم جاتے ہیں۔ افریقہ ہمیشہ سے موت کی سرزمین رہا ہے۔ جہاں صرف زندہ رہنا بھی ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو صحارا نامی ایک صحرا کے آس پاس بستے ہیں اور اس میں سفر کرنا جہنم میں سفر کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ وسعت میں سوویت یونین سے بڑا صحارا افریقہ کے تقریباً نصف رقبے پر حاوی ہے۔ اور ہر سال اس کے رقبے میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ پھیلتا صحرا آہستہ آہستہ افریقہ کی زرخیز زمینوں، جنگلات، آبادیوں اور چراگاہوں کو اپنے اندر سموتا جا رہا ہے اور وہ جگہیں جو اس صدی کے آغاز میں زرخیز اور سرسبز تھیں، اب وہاں ریت اُڑتی ہے اور بگولے ناچتے ہیں۔ صحارا کے بعض حصے اتنے ویران اور خوفناک ہیں کہ صحراؤں کے قدیم باشندے بھی وہاں جانے کی ہمت نہیں کرتے، بقول بعض عرب گائیڈز کے، وہاں آج تک کوئی انسان نہیں گیا۔ اگرچہ ان کی بات کو جھٹلانا میرے لیے مشکل ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ گزشتہ کئی سو سال سے ان علاقوں میں کسی انسان کا گزر نہ ہوا ہو۔

سفر کے چوتھے دن میں نے پڑاؤ ڈالا ہی تھا کہ مغرب کی طرف سے آسمان پر سرخی نمودار ہونے لگی جو اتنی بڑھی کہ اس میں سورج بھی چُھپ کر رہ گیا اور میں سمجھ گیا کہ کوئی خوفناک صحرائی طوفان آ رہا ہے۔ میں نے اونٹنیوں کو بٹھایا اور ان کے اگلے پیروں سے رسّی باندھی پھر ان کی مہاریں اپنی کمر سے بندھی بیلٹ سے منسلک کیں اور خود پلاسٹک کا ڈھ اور کوٹ پہن کر بیٹھ گیا۔ بیگی خوف زدہ انداز میں بلبلا رہی تھی۔ یعنی اس نے بھی طوفان کی آمد محسوس کر لی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ بیگی کسی مصیبت کے آنے سے پہلے اسے بھانپ لیتی تھی، اس کے برخلاف ٹریڈ اتنی حساس نہیں

تھی۔
میرے خیال میں دنیا میں جتنے اقسام کے طوفان رائج ہیں، ان میں سب سے بدتر صحرائی طوفان ہوتا ہے ممکن ہے دوسرے لوگوں کے تجربات اور خیالات مجھ سے مختلف ہوں۔ چنگھاڑتی ہوائیں، ٹنوں کے حساب سے برستی ریت اور بگولے کسی جہنمی بلا کی طرح نازل ہوتے تھے۔ اگر انسان ذرا سا بھی اوپر اٹھ جائے تو ہوائیں اسے اُڑا کر لے جاتیں اور پھر زمین پر پٹخ پٹخ کر اس کی ہڈی پسلی سب برابر کردیتیں۔ انسان تو کیا یہ ہوائیں اونٹ جیسے وزنی جانور کو اٹھالے جاتی ہیں۔
جب ریت کا پہلا تھپیڑا مجھ پر گرا تو میں پیسگی اور ٹریڈ کے درمیان پناہ لے چکا تھا۔ میں نے ان کی مہار مضبوطی سے تھام رکھی تھی... تاکہ وہ طوفان سے گھبرا کر اٹھ کر نہ بھاگ جائیں۔ ویسے تو اونٹ سمجھ دار جانور ہوتا ہے لیکن جانور کے بارے میں یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ کب کیا حرکت کرجائے۔ کچھ دیر بعد طوفان پوری شدت سے حملہ آور ہوچکا تھا۔ بدروحوں کی طرح چیختی چلاتی ہوائیں، مجھ پر یوں ریت پھینک رہی تھیں جیسے کسی کو قبر میں ڈال کر اسے دفن کیا جاتا ہے۔ اگر فوراً ہی ہوا ہم پر گرنے والی ریت کو نہ اُڑالے جاتی تو چند ہی منٹوں میں ہم بچ دفن ہوچکے تھے پیسگی اور ٹریڈ ریت کی اس بوچھار سے قدرتی طور پر محفوظ تھیں۔ ان کے ناک، کان اور آنکھیں کچھ اس ساخت کی تھیں کہ ریت ان میں نہیں جاسکتی تھی۔ اور نہ ان پر جمع ہوسکتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ گھبرا کر بھاگی بھی نہیں۔
ریت کا یہ طوفان شاید صبح تک جاری رہا۔ رات کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی تھی اور جب میں جاگا تو سورج طلوع ہوچکا تھا۔ سجدے میں پڑے پڑے میرا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔ خاص طور سے گھٹنے بڑی مشکل سے سیدھے ہوئے تھے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ رات کے طوفان نے میری جان نہیں لی لیکن جب میں نے دائیں بائیں دیکھا تو میرے اوسان خطا ہوگئے۔ پیسگی اور ٹریڈ ایک بار پھر غائب تھیں اور اس دفعہ ان کے نقش پا ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ رات کے طوفان نے صحرا میں ہر نقش کو مٹادیا تھا۔ بلکہ کل جو میں نے ریت کے ٹیلے دیکھے تھے، وہ غائب ہوگئے اور ان کے بجائے ہموار جگہوں پر نئے ٹیلے اُبھر آئے تھے۔ اگر پیسگی اور ٹریڈ نہ ملتیں تو میرا واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ صحرا میں پیدل سو میل کا سفر میں طے نہیں کرسکتا تھا اور پانی وخوراک کے بغیر تو ہرگز نہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ صحارا کی تمام بلائیں میری گھات میں بیٹھی تھیں اور جیسے ہی میں سفر پر روانہ ہوا، یہ یکے بعد دیگرے مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں۔
ایک گھنٹے میں میں نے اردگرد کا تمام علاقہ کھنگال مارا۔ مگر پیسگی اور ٹریڈ یوں غائب تھیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ نہ معلوم وہ ریت کے طوفان میں دب گئی تھیں اور اگر زندہ تھیں تو یقیناً آراوینے کی طرف چلی گئی تھیں۔ یہ اونٹوں کی خاص خوبی ہے کہ وہ ایک بار جس راستے سے گزر جائیں، اسے کبھی نہیں بھولتے اور کہیں سے بھی اپنے مستقر جاسکتے ہیں۔ ہمارے سفری نشان بھی رات کے طوفان نے مٹادیے تھے۔ اب میرے لیے بغیر سامان کے آراوینے تک پہنچنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ بغیر راکٹ کے خلا میں جانا۔
عین اس لمحے جب میں پیسگی اور ٹریڈ کو صبر کرچکا تھا، مجھے ریت پر ان کے قدموں کے تازہ نشان نظر آگئے۔ میں ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ ایک ڈھلان سے اُترتے ہی یہ نشانات غائب ہوگئے لیکن اگلی ڈھلان پر پھر مل گئے اور اس سے اگلی ڈھلان پر پھر غائب ہوگئے۔ یہ ملنے اور غائب ہونے کا سلسلہ جاری رہا، حتیٰ کہ پیسگی اور ٹریڈ ایک چھوٹی سی وادی میں مع سامان کے مل گئیں ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل بھی گئیں تو ان کا سامان یقیناً غائب ہوگا۔ اونٹ کی چال تو ویسے ہی بے ڈھنگی ہوتی ہے لیکن جب یہ بھڑک کر بھاگتا ہے تو اچھے اچھے ماہر شترسوار خود کو اس کی پشت پر قائم نہیں رکھ سکتے۔ سامان تو فوراً ہی گرجاتا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دونوں طوفان کے بعد اٹھیں اور چہل قدمی کرتی یہاں تک آگئی تھیں۔ یقیناً ان کا ارادہ فرار کا نہیں تھا۔ ورنہ اب تک یہ دس بارہ میل دُور جاچکی ہوتیں۔ پیسگی نے آواز نکال کر مجھے خوش آمدید کہا۔ اور میں ٹھنڈی سانس لے کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے یہ سمجھانا قطعی بے کار تھا کہ چند لمحے پہلے اس نے میرا خون خشک کردیا تھا۔ میں نے ان کا سامان درست کیا اور آگے چل پڑا۔ میں نے سفر آگے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اپنا پانی کا راشن نصف کردیا تھا۔ پھر مجھے امید تھی کہ راستے میں کبھی بارش ہوئی تو میں پلاسٹک شیٹ کی مدد سے کچھ نہ کچھ پانی اکٹھا کرلوں گا۔ روانگی سے پہلے میں نے نقشہ اور کمپاس دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں ٹھیک اپنے راستے پر تھا۔ دراصل اونٹنیاں خود اسی طرف چل پڑی تھیں جو میرا راستہ تھا اور ان کو تلاش کرتا میں بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی ایک غیبی امداد تھی۔ ورنہ مجھے واپس جاکر ازسرِنو اپنے راستے کا تعین کرنا پڑتا۔ یہ وادی تو میرے راستے میں ہی پڑتی تھی۔ اسی خوشی میں، میں رہی سہی ناراضگی بھی بھول گیا۔ اور خاصی ترنگ میں ایک صحرائی گیت گاتا چل پڑا۔ یہ میں

نے اپنے ایک عرب دوست سے سیکھا تھا۔ جو اسے "ہدی خوانی" کہتے ہیں۔ ان کے مطابق اس قسم کے گیت اونٹوں کو جوش دلانے اور ان کا مورال بلند رکھنے کے لیے گائے جاتے ہیں اور جیسے ہی میں نے یہ گیت گانا شروع کیا، میں نے محسوس کیا کہ اونٹنیوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

○☆○

میں انگلینڈ کی کاؤنٹی لنکا شائر کے ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت شہر میں پیدا ہوا، وہاں صحرا نہیں پائے جاتے۔ دس سال کی عمر تک مجھے صحراؤں کے بارے میں کچھ علم تھا بھی نہیں، جب تک میرے ایک انکل نے مجھے بائبل کی کہانیوں پر مشتمل ایک کومک بک نہیں دی تھی۔ اس میں اکثر کہانیاں صحرائی پس منظر میں تھیں۔ کتاب میں ریت کے صحرا اور اونٹوں کی بکثرت تصویریں تھیں۔ صحرا اور اونٹ دونوں میرے لیے بالکل انوکھی چیز تھے لیکن ساتھ ہی بے حد پرکشش اور پُراسرار بھی۔ کامک بک ختم ہوتے ہوتے میں ان دونوں کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ریت کے ناقابل یقین طور پر بڑے ٹیلے، جتنے بڑے انگلینڈ میں پہاڑ بھی نہیں پائے جاتے اور اونٹ جیسا عجیب الخلقت جانور۔ کہانیوں میں اسے ایک شریف درندہ بتایا گیا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اونٹ صرف شریف جانور ہوتا ہے، درندہ نہیں۔ کتاب ختم کرکے میں نے فیصلہ کیا کہ بڑے ہو کر میں ایک عدد اونٹ حاصل کروں گا اور کسی صحرا میں سفر کروں گا۔

۱۹۷۹ء میں جب میں چالیس سال کا ہو چکا تھا اور ایک اسٹیل ورکر کے طور پر بے روزگاری الاؤنس لے رہا تھا، میں نے وقت گزاری کے لیے جیوفرے مورہاوس کی خودنوشتِ حیات "فیئر فل وائڈ" پڑھنا شروع کردی۔ اس نے ۱۹۷۲ء میں صحارا کے جنوب مغربی حصے میں تن تنہا آکلے کا حصہ عبور کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش ناکام رہی تھی لیکن اس نے اپنی جرات مندانہ کوشش کو بڑی خوب صورتی سے تحریر کیا تھا کہ انسان پڑھ کر صحارا کے خیالی حسن میں کھوجاتا تھا۔ اس کتاب نے میرے اندر خوابیدہ عشق کو ایک بار پھر بیدار کردیا تھا۔ مورہاوس نے دعویٰ کیا تھا کہ آراوینے اور کولاٹا کے درمیان واقع اس اجاڑ اور ویران صحرا میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا۔ جدید نقشوں میں اس کا کوئی نام نہیں ہے، البتہ مقامی صحرائی عرب اسے آکلے کہتے ہیں۔ یہ کسی افریقی زبان کا لفظ ہے۔ جو صدیوں سے رائج ہے۔ اس کے معنی کسی کو نہیں معلوم لیکن مقامی طور پر آکلے کا مطلب ہے موت کا راستہ۔ کیونکہ اس طرف جانے والے کبھی واپس نہیں آئے۔ وہاں سبزے کے نام پر ایک پودا یا جھاڑی بھی نہیں پائی جاتی۔ سوائے چند سخت جان صحرائی کیڑوں اور چھپکلی نما جانوروں کے، کوئی جانور نہیں پایا جاتا۔

ملازمتوں کی کئی درخواستیں یکے بعد دیگرے مسترد ہونے سے میں سخت دل برداشتہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹیل کی صنعت پر سخت بحران آیا تھا۔ پہلے سے کام کرنے والے نکالے جا رہے تھے تو مجھے ملازمت کہاں سے ملتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ امریکا جاکر قسمت آزمائی کروں یا جرمنی کی طرف نکل جاؤں۔ پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ میں افریقہ کیوں نہ چلا جاؤں۔ ایک لمحے کو یہ خیال ہی مجھے احمقانہ لگا۔ لیکن جیسے جیسے میں اس پر غور کرتا رہا۔ اس کی افادیت اور اس سے میری دلچسپی سامنے آتی چلی گئی۔ حتمی فیصلے سے پہلے میں نے کولاٹا اور آراوینے کے درمیانی علاقے کے نقشے حاصل کیے۔ بہ قول جیوفرے مورہاوس آج تک کوئی انسان ان علاقوں میں نہیں گیا۔ یہ نقشے فضا سے کی گئی فوٹوگرافی کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ نقشوں میں سوائے ریت کے دیو قامت ٹیلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی وادی، نہ زمین کی بلندی اور نہ کسی راستے کا نشان۔ اگر ان نقشوں پر بھروسا کرکے کوئی آکلے جائے تو اس کے احمق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے حماقت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اونٹ پر اکیلے ہی آکلے نامی اس صحرا کو عبور کرنے کی کوشش کروں گا اور میرا یہ حال تھا کہ میں نے کبھی صحرا نہیں دیکھا تھا اور اونٹ کے نزدیک بھی نہیں پھٹکا تھا۔

ایک مہینے بعد میں تنزانیہ روانہ ہو گیا۔ اس ملک میں میرے کئی اچھے دوست رہتے تھے اور میرا مقصد اونٹ چلانے کی تربیت حاصل کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے ایک عرب دوست مہدی کا کاروبار ہی اونٹ پالنا تھا۔ میں اس کے پاس ٹھہرا۔ اگلے تین مہینے میں اس نے مجھے اونٹوں کے بارے میں گویا سب کچھ گھول کر پلا دیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اونٹ پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا ہے۔ صرف نرم، ریتیلی اور ہموار ڈھلانوں پر چڑھ سکتا ہے۔ جب یہ کسی ڈھلان سے اترتا ہے تو اس کے تمام جوڑ چٹختے ہیں اور خاصی خوفناک آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور جہاں تک میرے علم میں ہے، اونٹ صرف خوف ناک آوازیں نکال سکتا ہے، بذاتِ خود خطرناک نہیں ہے۔ ایک دن میں اور مہدی بیٹھے دنیا بھر میں رائج واحد خدا کے ناموں کی لسٹ تیار کر رہے تھے مثلاً اللہ، گاڈ، جیہوواہ اور برہما وغیرہ۔۔۔ ہم نے بہ مشکل سو ناموں کی

لسٹ بنائی تھی۔ اسی دوران میں مہدی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے' اونٹ ایک مقدس جانور ہے۔ یہ اللہ کے ہزار نام جانتا ہے۔"

مہدی کی بات سے زیادہ میرے لیے اس کے لہجے کا یقین حیران کن تھا۔ اسے اپنے کہے پر سوفیصد یقین تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا "مجھے تو چند مہینے پہلے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اونٹ کھا تا کیا ہے۔ میں اسے صرف سواری اور باربرداری کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔"

اونٹ چلانا اور اسے سنبھالنا بلاشبہ دوسرے جانوروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے جو سواری اور باربرداری میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے اس معاملے میں گدھے اور خچر کو سب سے شریف جانور پایا ہے۔ ان کے مقابلے میں اونٹ بلا کا شرارتی جانور ہے اور اپنے مالک کے ساتھ شرارت سے باز نہیں آتا۔ اس سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ جب میں تنزانیہ سے واپس جارہا تھا تو مجھے اطمینان تھا کہ میں اونٹوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔

برطانیہ آکر میں نے پہلے اپنی مہم کے اخراجات کا تخمینہ لگایا۔ جو کٹ کٹا کر بھی پندرہ سو پاؤنڈز بنتے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ ایک عام صنعتی مزدور کی سال بھر کی آمدنی کے برابر۔ لیکن جب میں نے اپنے ارادے کا اعلان کیا کہ اسپانسر تلاش کرسکوں تو اسپانسر ملنا تو ایک طرف رہا' دوست احباب اور رشتے دار میری جان کو آگئے۔

"تمہارا سفر خودکشی کی ایک باعزت کوشش ہے" میرے ایک دوست نے فیصلہ صادر کیا۔

دوستوں نے تو جو کہا سو کہا۔ رشتے داروں نے متفقہ طور پر مجھے ایب نارمل قرار دے دیا کہ مسلسل بے کاری نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص جس نے کبھی کسی صحرا میں قدم نہ رکھا ہو اور نہ ہی اونٹ چلایا ہو' جسے صحرا کی صعوبتوں کا علم ہی نہ ہو اور جس نے کبھی چالیس درجے سینٹی گریڈ سے زیادہ گرمی نہ برداشت کی ہو' وہ اعلان کرے کہ وہ دنیا کے سب سے خطرناک صحرا کے خطرناک ترین حصے کو تن تنہا عبور کرنے جارہا ہے تو لوگ اس کی دماغی حالت پر شک کرنے میں حق بہ جانب تھے لیکن میں اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ میں نے کسی مخالفت' لعنت' ملامت اور طنز کی پروا نہیں کی۔ جب لوگوں نے اس بات کو محسوس کرلیا تو خود ہی خاموش ہوگئے۔

لوگوں کو تو میں نے اپنی خاموشی سے شکست دے دی تھی لیکن اسپانسر بہرحال مجھ سے سوالات کرتے۔ انہیں یہ جاننے سے دلچسپی ہوتی کہ میں نے پہلے کس صحرا میں سفر کیا ہے اور کہاں کہاں مہمات پر گیا ہوں۔ اکثر کی دلچسپی میرے جواب کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی۔ میں نے سنڈے ٹائمز سے اس مہم کو اسپانسر کرنے کو کہا تو ان کی طرف سے جواب آیا۔

"تمہاری سفری لائن سیدھا موت کی طرف جاتی ہے۔"

تقریباً ایسے ہی یا اس سے ملتے جلتے جواب ان اداروں نے دیئے۔ جنہیں میں نے مہم کو اسپانسر کرنے کی درخواست دی تھی۔ کوئی ایسے شخص پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جس نے کبھی کسی مہم میں حصہ نہ لیا ہو اور نہ ہی کسی صحرا میں سفر کیا ہو۔ بلکہ اسے سرے سے مہم جوئی کا کوئی تجربہ نہ ہو۔ اور جس نے اپنی اکتالیس سال کی عمر کا بڑا حصہ ایک صنعتی کارکن کے طور پر گزارا ہو۔ ان کے خیال میں' میں صرف جذبات میں آکر اس خطرناک سفر پر جانے کو تیار ہوگیا۔ جس میں میری کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ مجھے اسپانسر کرنے کو رقم کا ضیاع سمجھ رہے تھے حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی صرف رقم لگتی' میں نے تو اپنی ایک ہی جان داؤ پر لگائی تھی۔

پھر ایک واقف کار نے مجھے بی بی سی نارتھ ویسٹ ٹیلی وژن کے ایلسٹر مک ڈونلڈ سے ملوایا۔ وہ ٹی وی کے لیے خاص طور سے ڈاکومینٹری تیار کرنے کا ماہر تھا۔ جب میں نے اسے اپنے منصوبے اور مہم کے بارے میں بتایا تو اس کی دلچسپی یک لخت بڑھ گئی۔ اس نے میرے لائے ہوئے نقشے بہ غور دیکھے۔

"تمہارا کہنا ہے کہ صحارا کے ان حصوں میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا؟"

"کم از کم جدید دور کا کوئی شخص نہیں گیا۔ آکلے نامی یہ صحرا بھی غیردریافت شدہ ہے۔ اس کا کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سرزمین کی کوئی تصویر ہے۔ تقریباً ستر ہزار مربع میل پر پھیلا یہ علاقہ بالکل ان چھوا ہے۔"

"میں نے جیوفرے مورہاوس کی کتاب میں اس کے بارے میں پڑھا ہے" مک ڈونلڈ بولا "وہ بھی اس علاقے میں جانے میں ناکام رہا تھا۔ بلکہ میرے خیال میں وہ کسی قدر خوف زدہ تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک ٹیم لے کر جائے۔ تو ہم اس کی مہم کو اسپانسر کریں گے۔ لیکن اس نے انکار کردیا اور تم بہ ضد ہو کہ تن تنہا اس حصے کو عبور کروگے۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ جیوفرے مورہاوس جیسا

دلیر مہم جُو اس علاقے میں جاتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ عین ممکن ہے اس نے کوئی خوف زدہ کرنے والی بات دیکھ لی ہو مگر یہ جاننے کے باوجود میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"یہی تو اس مہم کی کشش ہوگی" میں نے کہا "اگر میں ایک ٹیم لے کر جاؤں اور تمام سازو سامان سے لیس ہو کر جاؤں تو عام لوگوں کے لیے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوگی لیکن جب وہ سنیں گے کہ ایک شخص صرف دو اونٹوں کے ہمراہ دنیا کے خطرناک ترین صحرا کو عبور کرنے جارہا ہے تو وہ یقیناً اس میں دلچسپی لیں گے۔"

مک ڈو نلڈ کسی قدر پریشان نظر آنے لگا۔ "لیکن پھر ہم اس سفر کی ڈاکو مینٹری کیسے بنائیں گے؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے" میں نے کہا۔

اس ملاقات کے بعد میں خاصا مایوس تھا۔ میرے خیال میں مک ڈو نلڈ انکار کردے گا۔ وہ کوئی اخبار یا میگزین تو نکالتا نہیں تھا کہ مہم کے بارے میں میرے تاثرات شائع کرکے مطمئن ہوجاتا۔ اسے اپنے ناظرین کو ٹی وی پر دکھانے کے لیے فلم درکار تھی۔ جو صرف ایک کیمرا مین تیار کرسکتا تھا لیکن غیر متوقع طور پر اگلے مہینے مجھے مک ڈو نلڈ کی کال ملی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔

"ہم تمہاری مہم کو اسپانسر کرنے کو تیار ہیں" اس نے کہا اور پھر ایک معاہدے کی کاپی نکال کر میرے سامنے رکھ دی "یہ اسپانسر شپ کا معاہدہ ہے۔ اگر تمہیں اس کی شقوں پر کوئی اعتراض ہے تو بتادو۔"

میں نے بہ غور معاہدہ پڑھا اور بولا "مجھے کسی شق پر اعتراض نہیں ہے سوائے ایک کے۔ میں تمہیں صرف ٹی وی کے حقوق دوں گا۔ مہم کے بارے میں باقی حقوق میرے پاس رہیں گے۔"

"ہم تمہیں اسپانسر کررہے ہیں۔" اس نے گویا مجھے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے" میں نے تسلیم کیا "لیکن صرف مہم کے اخراجات کی حد تک۔ اس سے مجھے کچھ نہیں ملے گا اور سارے حقوق تم لے لوگے تو بعد میں، میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی لیکن اس نے ظاہر کیا کہ وہ بہت مجبور ہو کر میری بات مان رہا ہے۔ اب سوائے ٹی وی کے باقی تمام حقوق میرے پاس تھے۔ میں اپنی مہم کی تفصیل کسی اخبار یا میگزین کو دیتا یا اسے کتابی شکل میں شائع کرتا، اس کی تمام آمدنی مجھے ہی حاصل ہوتی۔ مک ڈو نلڈ نے شق کی تبدیلی کے بعد معاہدے کا نیا ڈرافٹ تیار کرایا جس پر میں نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے ٹیلی وژن اس مہم کے تمام اخراجات برداشت کرے گا اور اس کے بدلے میں مہم صرف بی بی سی ٹی وی کو دوں گا۔ اب کیوں کہ میں اکیلے ہی اس مہم پر جارہا تھا اس لیے مک ڈو نلڈ نے میرے لیے کچھ خصوصی آلات کا بندوبست کیا۔ یہ بہت ہلکے اور چھوٹے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر تھے۔ اس نے مجھے ان کو چلانے کی تربیت بھی دی تھی۔ اسی ویڈیو کیمرے کی مدد سے میں صحرا میں سفر کے دوران میں فلم بناتا اور اپنی آواز میں تاثرات ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرتا۔ یہ دونوں چیزیں بیٹری سے چلتی تھیں۔ میرے پاس دس گھنٹے دورانیے ریکارڈنگ کی حامل آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں بھی تھیں۔

اصل مہم شروع ہونے سے پہلے میں دوبارہ مالی کے قصبے آراوینے تک گیا۔ میں وہاں کئی مہینے مقیم رہا۔ مہم کی تیاری کے ساتھ میرا مقصد وہاں کے قدیم صحرائی باشندوں سے آگلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے مقامی زبان میں شُدبُد..... حاصل کی۔ اس زبان میں عربی کے بے شمار الفاظ تھے لیکن بولنے کا لہجہ افریقی تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ صدیوں پہلے افریقی زبان ہی تھی لیکن جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا عربی زبان اس پر غالب آتی گئی۔ افریقہ کے مشرقی ساحل کے برعکس اس کے مغربی ساحل پر اسلام ایک غالب مذہب ہے۔ یہاں کے مقامی افراد عیسائی کو نصرانی کہتے ہیں لہٰذا مجھے بھی وہ نصرانی ہی کہتے تھے۔ اگرچہ ان کے انداز میں نفرت یا عداوت نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ مجھے ناپسند کرتے تھے۔ کئی ایک نے تو صاف کہا۔

"تم صحرا میں جاکر خدا کے قہر کو دعوت دے رہے ہو۔"

میں مسکرا کر کہتا۔ جب خدا کا قہر میرا مقدر ہی بن چکا ہے تو میں اس سے کیسے فرار حاصل کرسکتا ہوں۔ دراصل آراوینے ایک مختصر جگہ ہے۔ یہاں کے باشندے صدیوں پرانے رسم و رواج کے پابند ہیں اور ابھی تک جدید تہذیب کی رمق ان تک نہیں پہنچی ہے۔ ان کے اوہام اور قدامت پرستی انہیں ایک سفید فام شخص سے بے تکلف ہونے سے روکتی ہے، ویسے میں نے ان جیسے مہمان نواز لوگ نہیں دیکھے۔ وہ بے حد غریب تھے لیکن اکثر میری کسی خدمت کے بدلے معاوضہ لینے سے انکار کردیتے تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کی خدمات میں نے خاص طور سے حاصل کی تھیں۔ مثلاً شتربان، کرائے کے اونٹوں کے گائیڈز۔ ان کے ساتھ میں اردگرد کے صحراؤں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ میرا مقصد خود کو

صحرائی زندگی کا عادی بنانا اور وہاں کی صعوبتوں اور پریشانیوں سے آگاہ ہونا تھا۔ میں قصبے کی سرائے میں ٹھہرا تھا۔ جہاں مہمان ہونے کی حیثیت سے مجھے سب سے شاندار کمرا دیا گیا تھا۔ اس میں لکڑی کا بڑا سا بستر تھا جس پر پرندوں کے پروں سے بھرا گدا تھا۔

بالآخر ۶ فروری ۱۹۸۳ء کو میں آکلے کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیسری مرتبہ آراوینے پہنچا تو مک ڈونلڈ اور اسی کے کیمرامینوں کی ایک ٹیم میرے ساتھ تھی۔ انہوں نے میری سفری تیاریوں کی فلم بندی کرنا تھی۔ میں اکثر سامان ساتھ لے کر آیا تھا۔ سوائے اس سامان کے جو یہیں سے خریدا جانا تھا اور ان میں دو عدد اونٹ سرفہرست تھے۔ نہ جانے کیسے اونٹ والوں کو میری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ قصبے کے باہر ائرفیلڈ پر اپنے اونٹوں سمیت ہمارے منتظر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے کچھ اونٹوں کی ضرورت ہے۔ میں نے بھی مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اونٹ لے لوں تاکہ روانگی تک وہ مجھ سے مانوس ہوجائیں۔ معاً میری نگاہ دو اونٹنیوں پر پڑی جو ایک ادھیڑ عمر عرب کے ساتھ خاموشی سے کھڑی جگالی کررہی تھیں۔ ان میں ایک سفید رنگ کی تھی اور دوسری ہلکے بھورے رنگ کی۔ دونوں اونٹنیاں جوان اور تنومند تھیں۔ کم ازکم میں نے اس جثے کی اونٹنیاں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ بھوک، پیاس برداشت کرنے کے معاملے میں اونٹنی، اونٹ سے کہیں زیادہ ہمت رکھتی ہے۔ ایک عام اونٹ بھی کھائے پئے بغیر دو ہفتے مسلسل سفر کرسکتا ہے جبکہ یہ دونوں زیادہ صحت مند تھیں اور میرے خیال میں بیس اکیس دن آسانی سے نکال سکتی تھیں۔

میں سیدھا اس عرب کے پاس گیا اور مختصر بھاؤ تاؤ کے بعد دونوں کو خرید لیا۔ عرب نے مجھے بتایا کہ یہ خاص طور سے طویل سفر کے لیے کارآمد تھیں۔ مک ڈونلڈ نے بھی اونٹنیوں کو پسند کیا تھا۔ اس کے کیمرامینوں نے ان کی خریداری کی فلم بنالی تھی۔ اس کے بعد ان کے شاٹ لیے جانے لگے۔ سفید رنگ کی اونٹنی کو میں نے روایتی یونانی دیومالا کے ایک کردار پیگاسس کا نام دیا جو پروں والا سفید گھوڑا تھا۔ اور دوسری اونٹنی جو موٹروں اور ہوائی جہاز کے انجن کے شور سے کسی قدر نروس لگ رہی تھی .... اسے ٹریڈیشنل کا نام دیا۔ جلد یہ نام مختصر ہوکر پیگی اور ٹریڈ رہ گئے تھے۔

مک ڈونلڈ نے ایک معقول مکان کرائے پر لے کر وہیں اپنا ڈیرہ جمالیا۔ پیگی اور ٹریڈ کو میں نے ایک اونٹوں کے باڑے والے کے سپرد کردیا۔ تاکہ وہ انہیں سفر کے لیے تیار کرے۔ دن کا بڑا حصہ میں ان دونوں کے ساتھ گزارتا تھا۔

میرے ارادے کی خبر جلد چاروں طرف پھیل گئی تھی اور مقامی عرب مجھے سمجھانے آرہے تھے۔ ان کے خیال میں، میں ایک اچھا نصرانی تھا۔ لہٰذا مجھے اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیے تھا۔ وہ سب متفق تھے کہ میرا یہ سفر خودکشی کے مترادف ہے اور ایک معمر عرب نے مجھے خودکشی کے عواقب سے بھی ڈرایا۔ اس نے کہا ”اللہ خودکشی کرنے والے کی مغفرت نہیں کرتا اور اسے تمام عمر جہنم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔“

میں بہ مشکل انہیں سمجھا سکا کہ مجھے مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے بلکہ میں صرف آراوینے اور کولاٹا کے درمیان صحرا کے اس حصے میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں سے آج تک کوئی انسان نہیں گزرا یعنی آکلے سے۔ یہ سن کر جو لوگ پہلے ہی میری دماغی حالت کے بارے میں مشکوک تھے، انہیں پکا یقین ہوگیا کہ میں ایک پاگل ہوں۔ وہ اس صحرا سے اتنے خوف زدہ تھے کہ ان کے خیال میں کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس وہاں کا رُخ نہیں کرسکتا۔ ایک معمر عرب گائیڈ نے مجھے خبردار کیا تھا۔ ”تم سفر کے دوران میں آکلے سے دُور رہنا ورنہ صرف تین گھنٹے میں ہلاک ہوجاؤ گے۔“

انہوں نے مجھے آکلے کی جو دہشت ناک کہانیاں سنائیں، ان کے مطابق وہاں قدرتی آفتوں کے بعد اب صرف بدروحوں کا ڈیرہ تھا جو وہاں جانے والے ہر فرد کو ہلاک کردیتی ہیں اور پھر اس کی روح بھی آکلے میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وہاں وقت بے وقت ریت کے طوفان آتے ہیں۔ ان طوفانوں میں ریت کے ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوجاتے ہیں۔ وہاں کہیں پانی کا کوئی قدرتی... چشمہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کنواں ہے۔ وہاں صدیوں سے بارش نہیں ہوئی۔ آکلے میں کسی قسم کا کوئی پودا نہیں پایا جاتا اور نہ ہی وہاں کوئی جانور ہے۔ وہاں صرف ویرانی ہے اور موت ہے۔

یہ سب سن کر خوف کے بجائے میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ یعنی اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہاں واقعی اب تک کوئی انسان نہیں گیا اور وہاں جانے والا پہلا شخص میں ہی ہوں۔ میری روانگی دس فروری کو تھی اور اسی دوران مک ڈونلڈ کے کیمرامینوں نے ہر زاویے سے میری فلم بنائی تھی۔ اونٹوں کے ساتھ چہلیں کرتے ہوئے۔ انہیں سفر کے لیے تیار کرتے ہوئے، پھر کچھ ایسے شاٹ جن میں بہ ظاہر مجھے صحرا میں سفر کرتے دکھایا گیا تھا۔

اگرچہ آراوینے اور کولاٹا کے درمیان فاصلہ ساڑھے

تین سو میل تھا لیکن مجھے جن راستوں سے سفر کرنا تھا' اس سے یہ فاصلہ چار سو میل بن جاتا۔ راستہ بہت خطرناک اور دشوار تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکا' میں پیدل چلوں گا۔ تاکہ اونٹنیوں پر بوجھ کم سے کم رہے۔ اس سے میری رفتار سست ہوجاتی اور یہ فاصلہ میں سولہ دن میں طے کرتا جب کہ ایک اونٹ سوار صحرا میں صرف دو دن میں اتنا فاصلہ طے کرسکتا ہے۔ روانگی سے پہلے میں نے علاقے کا سب سے بہتر نقشہ لیا اور ایسے افراد' جو آکلے کے صحرا سے کسی حد تک واقف تھے' ان کی مدد سے اس نقشے میں تبدیلیاں کیں۔ اب یہ کسی قدر بہتر نقشہ تھا۔

میرے پاس کل چھ سو پاؤنڈ وزن تھا۔ جس کا سب سے بڑا حصہ پانی سے بھرے جیری کینز پر مشتمل تھا۔ پھر خشک خوراک' کچھ کپڑے' ضرورت کی اشیا اور اس سفر پر کام آنے والے آلات تھے۔ میں نے زیادہ وزن ٹریڈ پر رکھا۔ وہ وزن اٹھانے کے معاملے میں آگے تھی۔ جبکہ پیگی سواری کے لیے مناسب اونٹنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوران سفر جب بھی سواری کروں گا' صرف پیگی پر کروں گا۔ باڑے والے نے دونوں اونٹنیوں کو اچھی طرح تیار کیا تھا۔ چار دن کی اچھی کھلائی پلائی سے ان کے کوہان کے حجم میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے غذا چربی بنا کر اپنے کوہان میں جمع کرلی تھی اور اب وہ ایک مہینے تک کھائے پیے بغیر بھی زندہ رہ سکتی تھیں۔ البتہ پانی کے بغیر وہ بیس دن ہی کام کے قابل رہتیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس مدت سے پہلے ہی میں کولاٹا پہنچ جاؤں گا۔ ویسے روانگی سے پہلے میں نے انہیں خوب پانی پلادیا تھا۔

دس فروری کی صبح مجھے رخصت کرنے کے لیے مک ڈونلڈ اور اس کی ٹیم کے ہمراہ میرے مقامی عرب دوست اور قصبے کی نصف آبادی قصبے کے باہر میدان میں جمع تھی۔ مقررہ وقت پر میں نے ٹریڈ کی مہار پیگی کی کاٹھی سے باندھی اور پیگی کی مہار کس کر اپنے سینے سے باندھ لی۔ میں نے مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ ایک تہ بند' اس کے اوپر کرتا نما ایک لباس اور اس کے اندر صدری' سر پر میرے عمامہ تھا۔ البتہ پیروں میں نائک کے بہترین جاگر شوز تھے۔ میرے لباس پر سامنے کی جانب یونین جیک بنا ہوا تھا۔ بہ ظاہر اس قسم کا لباس میرے لیے موزوں نہیں تھا کیونکہ میں اس کا عادی نہیں تھا لیکن سفر کے دوران ہی میں نے دیکھا کہ صحرا میں اس سے زیادہ مفید لباس کوئی تھا نہیں۔

پہلے دن میں نے زیادہ تر پیدل سفر کیا اور صرف پندرہ میل طے ہوسکے۔ البتہ دوسرے دن میں نے بتیس میل سفر کیا تھا اور تیسرے دن سے مصیبتوں کا آغاز ہوگیا۔ علاج سے بچھو کے کاٹے کا اثر تو ختم ہوگیا تھا۔ لیکن میرا جو پانی ضائع ہوگیا تھا مجھے اس کی فکر کھائے جارہی تھی۔ سفر کے ساتویں دن میں نے اس پورے راستے میں پہلا درخت دیکھا تھا۔ یہ صحرائی پودا تمارسک تھا۔ اس کا تنا پتلا مگر پتے موٹے اور کانٹے دار تھے اور یہ اونٹ کا مرغوب چارا ہے۔ اس درخت پر نظر پڑتے ہی پیگی اور ٹریڈ خوشی سے آوازیں نکالنے لگیں۔ مگر درخت کے پاس اس وقت تک نہیں گئیں جب تک میں نے ان کی مہار ڈھیلی چھوڑ کر اجازت نہیں دے دی۔ وہ دونوں پتوں پر پل پڑی تھیں۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس درخت کے پتوں میں شکر اور پانی کی بڑی مقدار ہوتی ہے اور مقامی عرب بھی اس کو بہ طور غذا استعمال کرتے ہیں۔ اس روز میں آکلے کی حدود میں داخل ہوگیا۔

صحارا کے صحرا میں ہونے کے باوجود یہ علاقہ بالکل مختلف نظر آتا تھا۔ یہ کسی بلند سطح مرتفع پر تھا اور اس پر سفید باریک ریت کے دیوقامت ٹیلے تھے۔ اس نرم اور پھسلواں ریت پر اونٹوں کے لیے چلنا بھی دشوار ہوتا ہے اور انسان کے لیے تو بہت ہی دشوار۔ میں نے تجربے کے طور پر ایک ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اب ہوتا یہ کہ میں ایک قدم اوپر جاتا تو پھسل کر دو قدم نیچے آجاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ پیگی اور ٹریڈ کو بھی اس علاقے میں سفر کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

اب تک میں خاصے خوش گوار موسم میں سفر کرتا آیا تھا۔ درجہ حرارت شاذ ہی نوے درجے فارن ہائٹ سے تجاوز کرتا تھا۔ میں شام کے وقت آکلے کی حدود میں داخل ہوا تھا اس لیے مجھے وہاں کے معائنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ پھر میں بے حد تھکن محسوس کررہا تھا۔ مسلسل چلنا' مشقت اور پانی کی کمی اب میرے جسم پر اثرانداز ہورہی تھی۔ میں دن میں بہت کم پانی پیتا تھا۔ پانی کا زیادہ حصہ میں رات کے وقت پیتا تھا۔ دن میں یہی پانی پسینے کی صورت میں ضائع ہوجاتا تھا جب کہ رات کو پینے کی صورت میں جسم کو زیادہ فائدہ کرتا تھا۔ میں نے ایک مختصر سی وادی میں کھونٹے گاڑ کر پیگی اور ٹریڈ کی رسیاں ان سے باندھیں۔ مزید احتیاط کے طور پر ان کے اگلے گھٹنے بھی باندھ دیئے۔ یوں اگر وہ کھل بھی جاتیں تو ان کے لیے زیادہ دور جانا ممکن نہ رہتا۔ ان کے دو مرتبہ غائب ہونے کے بعد میں ان کی طرف سے بے حد محتاط رہنے لگا تھا۔ ان دونوں کو خشک دانہ ڈال کر میں نے اپنے لیے کھانا

تیار کیا جو خشک گوشت، روٹی اور پنیر پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ خشک کیا ہوا دہی بھی تھا۔ دہی اس علاقے میں صحت بحال رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ کچھ اونٹنی کا خشک دودھ بھی تھا۔ جسے میں پانی میں ڈال کر پیتا تھا۔ دن بھر کی مشقت اور کئی میل پیدل چلنے کی وجہ سے مجھے بھوک بہت لگتی تھی۔ لیکن میں اپنے راشن کو احتیاط سے استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ کھانے کے بعد میں نے اپنا سلیپنگ بیگ نکالا' یہ خاص قسم کا ہلکا سلیپنگ بیگ تھا جس میں لگی جالی سے مکھی' مچھر یا کوئی اور کیڑا اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے حسب معمول بی بی سی کی سروس سنی۔ پھر ایک چینل سے نشر ہونے والی موسیقی سنی۔

صبح سورج کی کرنوں کی گرمی نے مجھے بیدار کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں سورج نکلنے تک پڑا سوتا رہا تھا۔ شاید گزشتہ روز کی تھکن کا اثر تھا۔ میں نے سلیپنگ بیگ سے سر نکالا۔ مشرق سے سورج کا آتشیں گولا جھانک رہا تھا۔ میرے سلیپنگ بیگ پر کم از کم ایک درجن اقسام کے کیڑے مکوڑے چل پھر رہے تھے اور ان کی تاک میں اردگرد کئی چھپکلیاں اور گرگٹ بیٹھے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک صحرائی سانپ کنڈلی مارے سو رہا تھا۔ معاً میری توجہ ایک صحرائی لومڑی کی طرف ہوگئی تھی۔ جو تیزی سے ایک ٹیلے سے نکل کر دوسرے ٹیلے کے عقب میں چلی گئی۔ میں دم بخود سا بیٹھا تھا۔ اتنی مختصر سی جگہ میں مجھے زندگی کی درجنوں اقسام نظر آگئی تھیں اور کہنے والے اس سرزمین کو زندگی سے عاری قرار دے رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کرہ ارض کا کوئی حصہ زندگی سے خالی نہیں ہے۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں' قطب کے برف زاروں ، حتیٰ کہ آتش فشانوں کے دہانوں میں بھی زندگی ملتی ہے۔

جیسے ہی میں نے سلیپنگ بیگ سے باہر قدم رکھا' تمام نظر آنے والے کیڑے مکوڑے سیکنڈوں میں غائب ہوگئے۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب غائب ہوچکے تھے۔ میں نے کافی کا پانی رکھا اور ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے پیگی اور ٹریڈ پر سامان بار کیا اور ان کی مہار تھام کر آگے چل پڑا۔ میرے آلٹی میٹر کی سوئی بتا رہی تھی کہ اس وقت ہم سطح سمندر سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ جبکہ آکلے کی اصل بلندی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ دس بجے درجہ حرارت بانوے ڈگری فارن ہائٹ تھا جو دوپہر تک دو سو درجے فارن ہائٹ سے تجاوز کرچکا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ وہاں مجھے کہیں پتھریلا حصہ نظر نہیں آیا۔ اتنی بلندی پر ریتیلا صحرا ایک عجوبہ ہی تھا کیونکہ ہوا ریت کو منتشر کردیتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ ایک مختلف علاقہ تھا اور اس کا اپنا الگ نظام تھا۔ جو اس کی ریت کو نشیبی صحرا میں منتقلی سے روکتا تھا۔ یہاں ہوا بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے تھے جو ریت پر موجود سلوٹوں کو یوں بدلتے جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں پانی کی لہریں۔ بلاشبہ یہ بے حد خوبصورت اور مبہوت کردینے والا منظر تھا۔ مگر جلد ہی ریت انگاروں کی طرح میرے تلووں کو جھلسانے لگی۔ زمین سے جیسے گرم ہوا کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور سورج سر پر روشن تھا۔ میرے اگلے چند دن بے حد گرم گزرے تھے۔ سورج طلوع ہونے کے ایک گھنٹے بعد سے لے کر سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد تک بے حد گرمی رہتی تھی۔ اس کے بعد صحرائی ریت تیزی سے ٹھنڈی پڑنے لگتی تھی اور سورج غروب ہونے کے تین گھنٹے بعد فضا خوش گوار حد تک خنک ہوجاتی تھی اور رات بارہ بجے تک شدید خنک۔ رات کو اتنی سردی پڑتی تھی کہ بغیر کسی گرم کمبل کے سونا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنے گرم سلیپنگ بیگ میں ہی چین کی نیند آتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ دن کو جو صحرا جان لیوا حد تک گرم ہوتا ہے' وہ رات کو اس قدر سرد ہوجاتا تھا۔ میں نے دن اور رات کے درجہ حرارت میں بعض اوقات چالیس ڈگری سینٹی گریڈ کا فرق بھی ریکارڈ کیا تھا۔

ٹریڈ اور پیگی دونوں پندرہ سال کی تھیں۔ ایک اونٹ کے لیے یہ بھرپور جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب وہ طاقت سے مالا مال ہوتا ہے۔ لیکن خوف ناک آکلے میں سفر کرتے ہوئے ان دونوں کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ ان کے وزن میں سرعت سے کمی ہورہی تھی۔ ہر روز مجھے وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور ہی نظر آتی تھیں۔ شام کو جب میں انہیں بوجھ سے آزاد کراتا تو وہ نڈھال ہوکر لیٹ جاتیں۔ ان کے تیزی سے گھلنے کو ہاں مجھے فکرمند کررہے تھے۔ اگرچہ تمارسک کے پتے کھاکر وہ کچھ سنبھل گئی تھیں لیکن جلد ان کی توانائی زائل ہونے لگی تھی۔ مجھے ایک اور تمارسک کے درخت کی تلاش تھی جو نویں دن مل گیا لیکن بدقسمتی سے اس میں پیگی اور ٹریڈ کے لیے زیادہ چارہ نہیں تھا۔ بہرحال ان کی کسی قدر تشفی ضرور ہوگئی تھی۔

نویں دن میں نے ماریطانیہ کی سرحد میں قدم رکھا۔ یہ میرے پورے سفر کا سب سے گرم دن تھا اور گیارہ بجے ہی

میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں معذرت کرکے پیگی پر سوار ہوگیا مگر اس روز اس کا موڈ بھی خراب تھا۔ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور اچانک بیٹھ گئی۔ میں نے اتر کر اسے چمکارا... اور دوبارہ اس پر سوار ہوا ہی تھا کہ میرے اچھی طرح بیٹھنے سے قبل ہی وہ اچانک تیزی سے اٹھی۔ میں جھٹکے سے فضا میں اُڑا اور چھ سات گز دور پسلیوں کے بل ریت پر جاگرا تھا۔ تکلیف کی شدید لہر نے مجھے دہرا کردیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری کئی پسلیاں داغ مفارقت دے گئی ہوں۔ بہ مشکل اٹھ کر میں نے پیگی کی مہار پکڑی۔ اس کی سرکشی ہوا ہوچکی تھی۔ غالباً اسے احساس تھا کہ اس نے اپنے مالک کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا لہٰذا اس نے تلافی کے طور پر خود بیٹھ کر مجھے سوار ہونے کا موقع دیا۔ جب وہ چلی تو اس کے ہر جھٹکے پر میری پسلیوں پر قیامت گزر جاتی تھی۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ میں نے جیسے تیسے معمولات نمٹائے اور درد کش ادویات کھا کر سوگیا۔

ابھی مجھے مزید ایک سو ستر میل کا سفر طے کرنا تھا اور میرے پاس صرف چھ گیلن پانی باقی تھا۔ اکیس میل فی دن کی رفتار سے میں آٹھ... دن میں یہ فاصلہ طے کرتا گویا ایک دن کے لیے میرے پاس ایک گیلن سے بھی کم پانی تھا۔ اس پر میں زخمی بھی ہوگیا تھا۔ واپسی کا راستہ دور تھا اور آگے کا راستہ نامعلوم .... بہرحال صبح میں سوکر اٹھا تو پسلیوں کی تکلیف میں خاصا افاقہ تھا۔ دسویں روز میں کمر کس کر چلنے کو تیار ہوا۔

ابھی مجھے سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزرے تھے کہ ہمارے چاروں طرف عجیب طرح کے بگولے ناچنے لگے۔ پہلے ریت پر ہلکا سا بھنور پڑتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی رفتار تیز ہونے لگتی اور پھر بگولا بن جاتا جو چاروں طرف بے تحاشا مٹی پھینکتا۔ میرے خیال میں اس وادی کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ ہَوا یہاں دائرے میں گھومنے پر مجبور ہوجاتی۔ لیکن بھنور بننے کا سبب میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ بگولے اس طرح نہیں بنتے ہیں۔ کم از کم میرے علم کے مطابق۔ میرا خیال ہے مقامی عرب ان بگولوں کو ہی بدروحوں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ معمولی قسم کے بگولے تھے۔ اگر یہ بڑے اور طاقت ور ہوتے تو مجھے، پیگی اور ٹریڈ سمیت اڑالے جاتے اور ہمارا بچنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ دو بجے تک میں بگولوں کی وادی سے نکل آیا تھا۔ میرے عقب میں کچھ ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے میرے بچ نکلنے پر بدروحیں ماتم کناں ہوں۔

دوپہر کے بعد موسم حیرت انگیز طور پر خوش گوار ہوگیا تھا۔ شاید اس میں سطح مرتفع کی بلندی کا دخل بھی تھا۔ یہاں سطح سمندر سے بلندی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ تھی۔ شام کو گہرے بادل آئے تو مجھے امید ہوئی کہ شاید بارش ہو مگر یہ امید، امید ہی رہی۔ پڑاؤ ڈالنے کے بعد میں نے حساب کتاب لگایا تو اس کے مطابق میں آکلے کے عین وسط میں تھا اور اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ یہاں قدم رکھنے والا پہلا بنی نوع آدم میں ہی ہوں۔ میں نے اپنے سامان سے یونین جیک نکالا، آپ اسے کوئی اوزار مت سمجھیں، برطانیہ کے پرچم کو یونین جیک کہتے ہیں اور پھر یہ یونین جیک میں نے وہاں دستیاب سب سے بلند ٹیلے کی چوٹی پر ایک چھڑی پر لگادیا۔ نیچے آکر میں نے ایک پائنٹ پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ جو ان حالات میں ایک عظیم عیاشی سے کم نہیں تھا۔ مجھے پورے دس دن بعد منہ ہاتھ دھونے کا ملا تھا اور اس سے میری حالت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوئے تھے۔

گیارھویں دن میں نے پیگی اور ٹریڈ کو بوجھ سے آزاد کیا تو وہ بے تابی سے پانی کے خالی جیری کینز کے اردگرد منڈلانے لگیں۔ جو ان ہی کی حماقت سے خالی ہوئے تھے۔ میں نے تمام جیری کین خالی کرکے پانی ایک چھوٹی بوتل میں ڈال دیا۔ اور یہ پانی کل پندرہ پائنٹ تھا۔ ایک تباہی کا آغاز تھا۔ اس خوف ناک صحرا میں مجھے ابھی مزید چھ دن سفر کرنا تھا۔ بلکہ اونٹنیوں کی حالت کے پیش نظر یہ وقت بڑھ سکتا تھا اور اتنا پانی تو صرف دو دن کے لیے کافی ہوتا۔ اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو میرے ذہن میں یہی خیال گونج رہا تھا کہ اب میرا خاتمہ قریب ہے۔

تیرھویں دن میں اچانک ہی ڈھلان پر اترنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آکلے کی حدود ختم ہورہی ہیں۔ کیونکہ مجھے جنوب مغرب کی طرف جانا تھا۔ بہرحال آکلے میرے اندازے سے دو دن پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ مگر بارہ میل بعد ایک بار پھر چڑھائی شروع ہوگئی اور میں دوبارہ آکلے کی حدود میں داخل ہورہا تھا۔ دراصل میں قبل از وقت ہی جنوب مغرب کی طرف مڑ گیا تھا۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ ایک گھنٹے کی ویڈیو فلم بناتا تھا اور رات کو سوتے وقت ٹیپ ریکارڈر پر اپنے تاثرات ریکارڈ کرلیتا تھا۔ اس دن کے آخر میں، میں نے اپنا پیغام ریکارڈ کیا۔

"جہاں تک نظر جاتی ہے آکلے نامی یہ صحرا پھیلا ہوا ہے۔ ابھی مجھے ایک سو میل سے زیادہ کی مسافت طے کرنی ہے اور میرا پانی ختم ہونے کے قریب ہے۔ میں خود کو مردہ آدمی تصور کررہا ہوں۔ میرے پاس اتنا پانی نہیں ہے کہ

واپس جنوب کی طرف جاسکوں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جنوب مغرب کی سمت سفر جاری رکھوں۔"

چودھویں دن صبح سے بے حد گرمی تھی۔ ریت توے کی طرح جل رہی تھی اور ہوا سے یوں لگ رہا تھا جیسے سیدھی جہنم سے آرہی ہو۔ میں نے اپنا رُخ جنوب مغرب کی سمت کرلیا تھا اور اب میرا سفر ڈھلان پر تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اب میں آکلے سے باہر نکل رہا تھا۔ یہاں ریت کے ٹیلے بہت بڑے اور پرشکوہ تھے۔ ڈھلان تہ در تہ تھی۔ اس سے نیچے اترنے کی رفتار بے حد سست تھی۔ اونٹ ویسے بھی ڈھلان چڑھنے اور اترنے کے معاملے میں کمزور جانور ہے۔ پیگی اور ٹریڈ بہت قدم جما جما کر ڈھلان سے اتر رہی تھیں۔ آکلے میں سفر کے دوران میں اکثر مجھے عرب گائیڈ کی وارننگ یاد آتی۔ اس نے کہا تھا کہ میں آکلے سے دور رہوں۔ ورنہ ایک ساعت میں ہلاک ہوجاؤں گا۔ اکثر مجھے پچھتاوا بھی ہوتا کہ میں نے اس کی بات کیوں نہیں مانی۔ مگر اس روز سہ پہر کے قریب جب اچانک ہی ناہموار ڈھلان ہموار اور دور تک پھیلے سپاٹ میدان میں بدل گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے بہ خیریت آکلے کو عبور کرلیا تھا۔ میں نے مڑ کر اس پر آخری نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل بوجھل ہورہا تھا۔ شاید مجھے آکلے سے محبت ہوگئی تھی اور اس سے بچھڑتے ہوئے مجھے دکھ ہورہا تھا۔

سہ پہر کے قریب میں قدرتی کھنڈرات میں داخل ہوا۔ دراصل اس علاقے میں لوہے کی آمیزش والی چٹانیں بکثرت تھیں۔ صدیوں سے ہوا، ریت اور پانی نے انہیں گھس گھس کر ایسی شکل دے دی تھی۔ جیسے کسی قدیم شہر کے کھنڈرات ہوں۔ وہی ستون نما شکلیں اور دیواریں تھیں۔ ایک پتھر پر مجھے شبہ ہوا کہ اس پر کچھ نقوش کھدے ہوئے تھے۔ میں نے ان نقوش کو اپنے ویڈیو کیمرے میں محفوظ کرلیا۔ ممکن تھا کہ یہ کوئی قدیم زبان نکلتی، شاید اس دور کی جب انسان نے لوہے کا استعمال شروع کیا تھا، اس جگہ لوہے کی کانیں ہوں۔ دو گھنٹے بعد میں ان کھنڈرات سے نکل گیا تھا۔

میرے پاس صرف تین پائنٹ پانی رہ گیا تھا۔ اور ابھی کولاٹا نوّے میل دور تھا۔ یہ مسافت تین دن سے کم میں نہیں طے ہوسکتی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے سفری منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کی۔ میں نے پہلے امیرسال جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مجھ سے مغرب میں دو دن کی مسافت پر تھا۔ اب تک میرا تھکن اور پانی کی کمی سے برا حال ہوچکا تھا۔ میں رات کو سونے کے لیے لیٹتا تھا تو اگلے دن کا سورج ہی مجھے جگاتا تھا۔ اس روز میں جاگا تو میں نے دیکھا اوپر فضا میں گدھ منڈلا رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا ۔ عربوں میں مشہور ہے کہ یہ پرندہ کسی انسان یا جانور کی آنے والی موت کو قبل از وقت بھانپ لیتا ہے اور پھر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ مر نہیں جاتا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کل بھی دوران سفر میں کچھ گدھوں کو اپنے اوپر منڈلاتے دیکھا تھا۔ کچھ گدھ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر ریت پر بیٹھے اپنی حریص نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے دہشت زدہ ہوکر آوازیں نکالیں اور ہاتھ چلائے تو وہ اڑ کر چند قدم دور چلے گئے۔ لیکن وہ ٹلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔

میرا پورا جسم دکھ رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل رخت سفر باندھا۔ امیرسال ابھی چالیس میل کی مسافت پر تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ دن کے بجائے رات کو سفر کروں گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے پاس صرف ایک پائنٹ پانی رہ گیا تھا اور دن میں یہ فوراً ہی بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ اگر میں دن کو آرام کرتا اور رات کو سفر کرتا تو میرے جسم میں باقی رہ جانے والا پانی زیادہ عرصے چل سکتا تھا۔ لہٰذا دوپہر کو جب میرے اندازے کے مطابق امیرسال کوئی بیس میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا، میں نے ایک چٹان کی آڑ میں پڑاؤ کیا اور سوگیا۔ میری آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ چھ گھنٹے کی نیند نے مجھے تازہ دم کردیا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھانا کھایا۔ اس روز بے حد گرمی تھی اور درجہ حرارت ایک سو بیس درجے فارن ہائٹ تک جا پہنچا تھا۔ میں نے پانی کا آخری گھونٹ پیا اور سامان اونٹنیوں پر بار کرکے چل پڑا۔ سورج سے تپتی زمین کسی قدر ٹھنڈی پڑ گئی تھی اور ہوا کے جھونکوں میں بھی خنکی غالب آتی جارہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رات کے سفر سے پیگی اور ٹریڈ بھی بے حد خوش تھیں۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے شروع ہی سے دن میں آرام کرنے اور رات کو سفر کرنے کی حکمت عملی کیوں نہیں اپنائی۔ دراصل ویڈیو کیمرے سے فلم صرف دن میں بنائی جاسکتی تھی۔ اسی بنا پر میں دن میں سفر کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ بہرحال اس کا حل بھی نکالا جاسکتا تھا۔ اگر میں پہلے ہی سوچ لیتا (البتہ جب میں نے بعد میں ایڈٹ شدہ فلم دیکھی تو مجھے دن میں سفر کرنے کا فیصلہ درست لگا۔ اس میں بہت سارے مناظر ایسے تھے جو رات کو شوٹ کیے ہی نہیں جاسکتے تھے۔ اگرچہ کیمرا سنبھالنے کے معاملے میں مجھے قطعی اناڑی کہا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس فلم نے تہلکہ مچا دیا تھا)

صبح چھ بجے کے قریب میں نے اس جگہ کو عبور کرلیا۔ جہاں میرے مفروضے کے مطابق امیر سال کو پایا جانا تھا۔ مگر ابھی تک مجھے کسی آبادی یا سبزے کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا تھا۔ چاروں طرف سپاٹ اور ہموار صحرا پھیلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں یہی تھا کہ میں نے ایک دو میل کے فرق سے امیر سال کو مس کردیا تھا۔ لہٰذا میں نے دائرے میں سفر کرتے ہوئے اونٹوں کے سفر کرنے کے تازہ نشان تلاش کرنا شروع کردیئے۔ ایک گھنٹے بعد مجھے یہ نشانات مل گئے اور میں ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے مجھے خیمے اور اونٹ نظر آئے۔ لیکن یہ امیر سال نہیں تھا۔ یہ صحرائی خانہ بدوشوں کا ڈیرہ تھا۔ وہ رات کو سفر کرتے تھے اور دن میں پڑاؤ ڈالتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ان کے قدموں کے نشانات مل گئے تھے اور میں پیاسا مرنے سے بچ گیا تھا۔

صحرائی خانہ بدوشوں نے کشادہ دلی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے اپنی ناقص عربی میں انہیں بتایا کہ کس طرح میں نے کولاٹا جاتے ہوئے امیر سال کے لیے راستہ بدلا۔ لیکن مجھے امیر سال بھی نہیں ملا۔ یعنی نہ صنم ملا اور نہ خدا۔ اس پر ایک خانہ بدوش نے انکشاف کیا کہ میں کولاٹا سے صرف انیس میل کے فاصلے پر ہوں اور امیر سال تو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں سے اس کا فاصلہ دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی غلطی کروں گا۔ صحرا میں اس قسم کی غلطی کا مطلب سوائے دردناک موت کے کچھ نہیں ہوتا اور اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر مجھے یہ خانہ بدوش نہ ملتے تو میرا انجام ایسا ہی ہوتا اور پیچھے بعد از مرگ مجھے برا بھلا کہنے والوں میں مک ڈونلڈ بھی شامل ہوتا۔ جس نے اس مہم کو اسپانسر کیا تھا۔

مجھے فوراً خانہ بدوشوں کے سردار کے خیمے میں لے جایا گیا۔ حسب توقع وہ ایک معمر آدمی ثابت ہوا۔ لیکن اس کا جسم نوجوانوں سے زیادہ مضبوط تھا اور اس کا ثبوت اس کی تین عدد بیویاں تھیں جن میں سب سے چھوٹی عمر میں اس سے شاید ایک تہائی تھی۔ انہوں نے اونٹنی کے دودھ کی بنی کھیر سے میری تواضع کی۔ دوپہر کے کھانے میں بھیڑ کا گوشت اور خمیری روٹی تھی اور اس کے ساتھ دہی۔ بہت دنوں بعد میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور پڑ کر سوگیا۔ شام کو سورج ڈھلتے مجھے جگایا گیا۔ خانہ بدوش اپنی منزل کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کررہے تھے۔ انہوں نے میری اونٹنیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی اور ازراہِ عنایت انہیں ایک ایک ڈول پانی بھی دیا تھا۔ بہ قول ساربان، یہ اونٹنیاں غیر معمولی قوت برداشت رکھتی تھیں ورنہ عام اونٹ پندرہ دن تک بغیر پانی کے نہیں رہ سکتے تھے اور انہوں نے تو اکیلے کا دشوار گزار صحرا عبور کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خانہ بدوش اس کارنامے پر میرا احترام کررہے تھے۔ بلکہ وہ پیگی اور ٹریڈ کو بھی وی آئی پی کا درجہ دے رہے تھے۔ انہیں کیونکہ کولاٹا کی مخالف سمت جانا تھا اس لیے میں نے آٹھ بجے وہاں سے رخصت لی۔ چلنے سے پہلے انہوں نے مجھے کھانا کھلایا اور ڈیڑھ گیلن پانی دیا۔ یہ بہت بڑا ایثار تھا جو انہوں نے اس شخص کے لیے کیا تھا جو ان کا ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ یہ خانہ بدوش پانی کی محدود مقدار لے کر سفر کرتے ہیں اور اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ انہوں نے مجھے واضح طور پر سمجھادیا تھا کہ کولاٹا کس سمت میں ہے اور اس کے راستے میں کیا کیا نشانیاں آئیں گی۔

روانگی کے وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں نے سمت کے تعین میں اتنی بڑی غلطی کیسے کی جبکہ میرے پاس کمپاس بھی تھا۔ میں امیر سال کی طرف جانے کے بجائے اس سے چالیس ڈگری جنوب میں نکل گیا تھا اور درحقیقت میں جنوب مغرب کی طرف ہی محوِ سفر تھا۔ معاً مجھے راستے پر پڑنے والی لوہے کی کانیں یاد آگئیں۔ اُف میرے خدا! میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ اتنی معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہاں لوہے کی بکثرت موجودگی نے کمپاس میں گڑبڑ کردی تھی اور اس کی ریڈنگ غلط نتیجہ دے رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے صحرائی خانہ بدوش مل گئے ورنہ اب تک صحرا میں بھوکے پیاسے بھٹکتے رہنے سے میرا انتقال ہوچکا ہوتا۔

میرا خیال تھا کہ میں صبح تک کولاٹا پہنچ جاؤں گا۔ لیکن تقدیر ابھی مجھے مزید آزمانے پر تُلی ہوئی تھی۔ خانہ بدوش سردار نے مجھے کولاٹا تک جانے کے لیے جو راستہ بتایا تھا اس میں آخر میں کئی وادیاں آتی تھیں۔ جو جنوب مغرب کی طرف ناقابل عبور تھیں۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ مجھے کس وادی میں اتر کر کولاٹا کی طرف جانا تھا۔ صبح دس بجے جب کہ میرے سفر کو اٹھارواں دن تھا، میں ایک پتھریلے علاقے میں پہنچا اور جہاں یہ پتھریلا علاقہ ختم ہوتا تھا، وہاں میرے قدموں کے نیچے ہزار فٹ کی گہرائی میں دور تک ایک عظیم الشان وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا سرا اتنا دور تھا کہ یہاں سے نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ میں تذبذب میں تھا کہ وادی میں اتروں یا نہ اتروں، میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ رات بھر کے سفر میں، میں نے پانی کی کافی مقدار استعمال کرلی تھی اور اب میرے پاس بہ مشکل ڈھائی لیٹر پانی

بچا تھا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں پیگی اور ٹریڈ کو لے کر وادی میں اتر گیا۔ پھسلویں ریت کے سلوپ پر ہم پھسلتے ہوئے نیچے تک پہنچے تھے۔ کپڑے جھاڑ کر میں نے ان دونوں کی مہاریں تھامیں اور وادی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا لیکن دو گھنٹے سفر کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو وادی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چاروں طرف پتھروں کی دیواریں کھڑی تھیں جو کہیں کہیں تو نوے درجے کے زاویئے پر سیدھی کھڑی تھیں اور کہیں ان میں کسی قدر ڈھلان تھی۔ ایسی ہی ایک ڈھلان کو منتخب کر کے میں نے پیگی اور ٹریڈ سمیت اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار چند قدم چڑھ کر وہ دونوں واپس آجاتیں۔ ان کی توانائی ختم ہو چکی تھی اور رہی سہی کسر رات کے سفر نے پوری کر دی تھی۔ ان کے لیے ڈھلان چڑھنا بہت مشکل تھا۔ مجبوراً میں نے کوشش ترک کر دی اور پڑاؤ ڈالنے کے لیے دو چٹانوں کے درمیان موجود سائے کو منتخب کیا۔ مجھے امید تھی کہ دس بارہ گھنٹے کے آرام کے بعد پیگی اور ٹریڈ اتنی تازہ دم ہو جائیں گی کہ اوپر چڑھ سکیں۔ ویسے تو میں ان کے بغیر خود اوپر جا سکتا تھا لیکن میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ ان دو رفیقوں کو یہاں بے یارومددگار چھوڑ جاؤں۔ جن کے بغیر میں یہ سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اب رات کو جب میں نے واپس آکر وادی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ تاریکی کے باعث کوئی خطرناک حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ مجبوراً خانہ بدوشوں کے دیئے گئے پانی کا آخری قطرہ میں نے صبح ناشتے میں حلق سے اتار لیا تھا۔ بہ وقت تمام میں پیگی اور ٹریڈ کو اس وادی سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ ہزار فٹ کی مسلسل چڑھائی چڑھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ تنے ہوئے رسے پر چل کر نیاگرہ آبشار عبور کرنا۔ بعض جگہ تو مجھے ان دونوں کو زور لگا کر اوپر کھینچنا پڑتا تھا۔ باہر نکل کر میں نے دوسری وادی کا رخ کیا۔ یہ نسبتاً کم گہری ثابت ہوئی اور یہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے لگتا تھا کہ یہ وادی عام آمدورفت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

ساڑھے تین بجے میری ہمت جواب دے گئی اور میں بادل ناخواستہ کمزور پیگی پر سوار ہو گیا۔ اسے میری حالت کا احساس تھا لہٰذا اس نے خود بیٹھ کر مجھے سوار ہونے میں مدد دی اور مجھے لے کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے چل دی۔ خدا خدا کر کے ہم شام کے قریب اس وادی سے نکلے اور باہر نکلتے ہی میری نگاہ سامنے موجود افراد اور اونٹوں پر پڑی۔ ذرا فاصلے پر کچے پکے مکانوں کی ایک بستی تھی جس کے درودیوار سورج کی ڈوبتی کرنوں میں جگمگا رہے تھے۔ وہاں موجود اکثر افراد میری طرف دوڑے۔ چند لمحے بعد میں ان میں گھرا کھڑا تھا۔

"کولاٹا؟" میں نے بستی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کولاٹا... کولاٹا" ایک سیاہ فام شخص نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

میری نگاہ بستی سے باہر موجود کنوئیں پر پڑی۔ جہاں مویشیوں کے مالک اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ میں پیگی اور ٹریڈ کو لے کر اس طرف بڑھا۔ کنوئیں سے پانی نکالنے والے نے ہماری حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے چمڑے کے بڑے بڑے ڈول سے پانی نکال نکال کر فولادی ٹب میں ڈالنا شروع کر دیا۔ پیگی اور ٹریڈ بے تاب ہو کر ٹب کی طرف لپکیں۔ انہوں نے آخری بار بیس روز پہلے سیر ہو کر پانی پیا تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بیس پچیس گیلن پانی پی لیا تھا۔ ان کے سیر ہونے کے بعد میں نے کنوئیں کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے اپنے جسم و جان کو تر کیا۔ مجھے پوری زندگی میں پانی پینے کا ایسا مزہ کبھی نہیں آیا تھا جو اس روز کولاٹا کے اس غریب سے گاؤں کے مویشیوں کے پانی پینے والے ٹب میں سے پانی پی کر آیا تھا۔ شاید ایسے ہی کچھ خیالات پیگی اور ٹریڈ کے بھی ہوں۔

قصہ مختصر مک ڈونلڈ جو مجھے مرحوم تصور کر چکا تھا اور اپنی سرمایہ کاری کو ڈوبا ہوا سمجھ رہا تھا، مجھے زندہ دیکھ کر ایک بار پھر جی اٹھا تھا۔ اس نے میرے اعزاز میں شیمپین کی بوتل کھولی تھی اور میری واپسی کے منظر کو دوبارہ شوٹ کیا تھا۔ اس نے میری بنائی ہوئی ویڈیو فلم کی بھی بے حد تعریف کی تھی۔ لیکن اس ساری تعریف و توصیف کے بعد مجھے صرف وطن واپس جانے کا ٹکٹ ملا تھا۔ پیگی اور ٹریڈ کو میں نے بھاری دل کے ساتھ ایک مقامی امیر کو بیچ دیا تھا۔ جو خود بھی اونٹوں سے عشق کرتا تھا اور اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ان عظیم اونٹنیوں سے ان کے شایان شان سلوک کرے گا۔

جب میں گھر پہنچا تو پہلی نظر میں مجھے میرے بچپن کے دوستوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا وزن دو سو پاؤنڈز سے کم ہو کر صرف ایک سو چالیس پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ میری تین پسلیاں چٹخی ہوئی تھیں اور خون میں بچھو کے کاٹے کے زہریلے اثرات موجود تھے۔ صحارا کا یہ سفر میرے لیے ایک طرف بھیانک یادیں رکھتا ہے تو دوسری طرف میں ایک بار پھر وہیں جانے کی خواہش محسوس کرتا ہوں۔

اس روئے زمین پر انسان ہمیشہ سے خون بہاتا آرہا ہے۔ وجہ چاہے جو بھی رہے لیکن ظالم بھی اور مظلوم بھی انسان ہی رہا ہے۔ کچرا جب کبھی سونے میں ڈھل جاتا ہے تو ایسے میں مافیا جنم لیتی ہے اس نے بھی مافیا کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کچرے کے ڈھیر سے ایک دن مافیا کے قبضے کو ختم کر ڈالا ہمت ہو تو ظالم ظالم نہیں رہتا۔

پولیس کے چند باضمیر اور نڈر لوگوں کی بہادری کا دلچسپ قصہ

تحریر : کاشف زبیر

مین ہٹن کے پل کو عبور کر کے بروکلین کی طرف آتے ہوئے رچرڈ کوون کا ذہن وال اسٹریٹ پر پیپر فائبر کارپوریشن کے چیمبر میں لگنے والی آگ کی جانب محو تھا۔ مشرقی دریا کے کنارے بنی لال اینٹوں کی اس چھ منزلہ عمارت میں داخل ہوتے ہوئے وہ غیر یقینی کی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی تفتیش کامیاب ہو سکے گی۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس سراغ رساں رچرڈ کوون کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ آف نیویارک کے منظم جرائم کے شعبے سے تھا اور اس کا شمار مشکل شعبوں میں ہوتا تھا۔ یہاں تفتیش کرنے والے سراغ رساں ہمیشہ دشواری میں رہتے تھے۔ اس وقت بھی کوون (COWAN) کو یقین تھا کہ وہ جس سے بھی پوچھے گا اس کا ایک ہی جواب ہوگا ”میں کچھ نہیں جانتا۔“

اس کے لیے سب سے زیادہ حیرانی کی وجہ کمپنی کے صدر سال بینڈیلو کا رویہ تھا۔ اپنے آراستہ پیراستہ دفتر میں اس نے کوون کو اس مسئلے کے بارے میں شروع سے اور آرام سے بتایا تھا۔ مسئلے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب بینڈیلو نے وال اسٹریٹ مین ہٹن میں واقع ایک بڑی عمارت میں کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے کی نیلامی میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے پہلی کمپنی یہی کام دس ہزار ڈالرز مہینہ پر کرتی تھی مگر بینڈیلو کی کمپنی نے صرف تین ہزار تین سو ڈالرز مہینہ پر یہ ٹھیکہ حاصل کرلیا۔

”اس کے فوری بعد ایک اجنبی شخص نے مجھے دھمکی دی کہ میں نے وال اسٹریٹ سے اپنا بوریا بستر گول نہ کیا تو مجھے پچھتانا ہوگا۔“ بینڈیلو نے کودن کو بتایا۔

1970ء کے عشرے میں ری سائیکلنگ پر بنی صنعتوں کے قیام کے بعد سے کچرا جمع کرنا ایک نفع بخش کاروبار بن گیا تھا۔ خاص طور سے نیویارک جیسے عمارتوں کے جنگل نما شہر میں روزانہ بیس ہزار ٹن سے زیادہ کچرا پیدا ہورہا تھا اور کُل کچرے کا ساٹھ فیصد ری سائیکل صنعتوں کو فراہم کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے کاغذ، دھاتوں اور فائبر کی صنعت کو ان دنوں سستے خام مال کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ کچرا سمیٹنے والی کمپنیاں ہی ہیں۔ باقی کچرا بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کو فراہم کردیا جاتا ہے۔ اس بزنس میں نفع کا تناسب دوگنا سے بھی زیادہ تھا اور خاص طور سے جو کچرا اکٹھا کرنے والے خود پروسیس بھی کرتے تھے ان کا نفع ڈھائی سو فیصد سے بھی زیادہ ہوجاتا تھا۔ جدید مشینی نظام کے تحت کچرا جمع کرنا اور اسے پروسیس کرنا بے حد آسان ہوگیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ 1990ء کے عشرے میں صرف نیویارک شہر میں درجنوں کچرا جمع کرنے والی نجی کمپنیاں کام کررہی تھیں۔

ایسے میں پہلی بار مافیا اس کاروبار کی طرف متوجہ ہوئی اور جب مافیا کسی کاروبار میں دخل دیتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اس کے حریفوں کو اب میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ مافیا کے پاس ہتھکنڈوں کی کمی نہیں ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مافیا نے کچرا اٹھانے کے کاروبار پر یوں غلبہ پالیا کہ اس کے علاوہ باقی کمپنیاں اپنا کاروبار ختم کرنے یا اسے محدود کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ عام گھروں کے مقابلے میں کاروباری عمارتوں سے کچرا اکٹھا کرنا زیادہ نفع بخش کام ہوتا ہے۔ اس لیے مافیا نے نیویارک کے کاروباری علاقوں پر خاص توجہ دی اور یہاں سے سارا ہی بزنس ان کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کا انہیں دوہرا فائدہ ہوا۔ اول وہ مقابلے پر کسی غیر کمپنی کو آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ بولی میں صرف مافیا کی کمپنیاں حصہ لیتی تھیں اور وہ ایک حد سے کم بولی دیتی ہی نہیں تھیں۔ یوں عمارتوں کے کچرا ٹھکانے لگانے کے بجٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ دوسری طرف مافیا نے اپنی پروسیس کی صنعت لگائی اور کچرا پروسیس کرکے اس سے حاصل ہونے والا خام مال منہ مانگے داموں ری سائیکل صنعتوں کو فراہم کرنے لگے۔

اگرچہ کاروبار قانونی تھا لیکن مافیا نے اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے مافیائی ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ انہوں نے مخالف کمپنیوں کو دہشت زدہ کیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس بزنس سے باہر نکل جائیں۔ انہوں نے کمپنیوں کو اونے پونے داموں خرید لیا اور اس طرح پہلے سے بنے بنائے سیٹ اپ کے ساتھ اس کاروبار میں داخل ہوگئے۔ مافیا کی آمد سے جہاں عمارتوں کے مالکان کے لیے مشکلات ہوئیں۔ وہیں ری سائیکلنگ کی صنعت پر بھی بحران آگیا۔ جو خام مال پہلے انہیں مناسب داموں پر مل جاتا تھا۔ اب وہ خاصے مہنگے دام پر ملنے لگا۔ پروسیس کرنے والی صنعت مافیا کے قبضے میں جاچکی تھی۔ مافیا نے اس میدان سے بھی دوسروں کو بھاگنے پر مجبور کردیا تھا اور اب ری سائیکلنگ کی صنعتوں کی باری تھی۔ اس طرح سے مافیا اس نفع بخش کاروبار کو پوری طرح اپنے قابو میں کرنے کے لیے سرگرمِ عمل تھی۔

دوسری طرف شہری انتظامیہ، کچرا اکٹھا کرنے والی کمپنیاں، پروسیس کمپنیاں اور ری سائیکلنگ کی صنعت کے نمائندے اس معاملے سے نمٹنے کے لیے جمع ہورہے تھے۔ انہوں نے مل کر میئر پر دباؤ ڈالا کہ اس کاروبار میں مافیا کو دخل اندازی سے روکے اور مقابلے کی فضا پھر سے قائم کرے۔ میئر نے انہیں تعاون کی یقین دہانی کرائی اور نیویارک پولیس کا منظم جرائم سے نمٹنے والا شعبہ حرکت میں آگیا۔ اس سے کچرا اکٹھا کرنے والی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے بولی میں حصہ لینا شروع کردیا۔ بینڈیلو نے حیران کن حد تک کم بولی دے کر اس وسیع عمارت سے کچرا اکٹھا کرنے کا اختیار حاصل کرلیا۔

نیلامی کے فوراً بعد ایک اجنبی بینڈیلو کے دفتر میں داخل ہوا اور اس نے دھمکی دی ”اگر تم نے اس کام سے دستبرداری اختیار نہ کی تو بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

بینڈیلو خوف زدہ ہوگیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اجنبی شخص درحقیقت کن کی نمائندگی کررہا ہے۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اجنبی کی بات ماننے سے انکار کردیا ”میں ایسا نہیں کرسکتا۔“

”تب مجھے خدشہ ہے تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“ اجنبی نے دھمکی آمیز انداز میں کہا اور رخصت ہوگیا۔

درحقیقت مافیا کے غنڈے پہلے ہی حرکت میں آچکے تھے۔ کمپنی کے دفتر کی پارکنگ میں کھڑے بہتر ہزار ڈالرز مالیت کے کچرا اکٹھا کرنے والے ٹرک سے یکایک شعلے بلند ہونے لگے اور جب تک اس میں لگی آگ بجھائی جاتی ٹرک جل کر تباہ ہوچکا تھا۔ یہ آگ اس اجنبی کے رخصت ہونے کے بعد چند منٹ کے اندر لگ گئی تھی۔ گویا مافیا کے غنڈے پوری تیاری سے آتے تھے۔ بینڈیلو نے اس واقعہ کی رپورٹ

نیویارک پولیس کو کی تھی جس کے نتیجے میں رچرڈ کووِن کو اس کے دفتر بھیجا گیا تھا۔

ابھی بینڈیلو رچرڈ کو بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا کہ اس کا ایک ملازم گولی کی طرح اندر آیا۔ اس نے چلّا کر کہا ''وہی آدمی پھر آیا ہے جس نے ہمارے ٹرک کو آگ لگائی تھی۔''

رچرڈ اور بینڈیلو حیران رہ گئے تھے۔ کووِن کو یقین ہونے لگا کہ یہ کام مافیا کا ہے۔ اس کے ہی غنڈے اتنے دیدہ دلیر ہوسکتے ہیں۔ ''چلو ان کو دیکھتے ہیں۔'' رچرڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باہر دفتر میں دو اجنبی افراد ملازموں کو دھمکیاں دے رہے تھے ''اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس عمارت کی طرف مت جانا ورنہ اپنے نقصان کے ذمے دار خود ہوگے۔''

رچرڈ نے معاملے میں دخل اندازی سے گریز کیا۔ وہ پہلے دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسرے ان دو میں سے ایک کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں تھا جس میں ممکنہ طور پر کوئی ہتھیار تھا۔ رچرڈ کے عجلت میں اٹھائے گئے کسی قدم سے وہاں پر خون ریزی بھی ممکن تھی۔ لہٰذا اس نے گن نکالنے اور اپنی شناخت کرانے سے گریز کیا۔ اس کے بجائے اس نے اپنے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کہا ''دیکھو آرام سے بات کرو۔ ہم کسی قسم کی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے۔''

بدمعاشوں میں سے ایک کا نام گون تھا۔ رچرڈ اسے جانتا تھا۔ گون نے غرا کر کہا ''تم کون ہو؟''

بینڈیلو نے جلدی سے مداخلت کی ''یہ میرا کزن ڈان ہے۔'' وہ محسوس کر رہا تھا کہ رچرڈ اپنی شناخت ان بدمعاشوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ رچرڈ نے اس کی بات پر اعتراض نہیں کیا اور ذہنی طور پر بینڈیلو کے کزن ڈان کا کردار ادا کرنے پر تیار ہوگیا۔ اس کے نرم رویّے سے ان دونوں بدمعاشوں کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ ان سے مرعوب ہوگیا ہے۔

''اگر تم بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہو تو اس جگہ پر آجانا۔'' گون نے تحکمانہ انداز میں کہتے ہوئے اسے ایک بزنس کارڈ پکڑا دیا اور جانے سے پہلے بولا ''آنے سے پہلے اس نمبر پر فون کرلینا۔''

جب وہ بدمعاش پارکنگ سے اپنی کار میں رخصت ہو رہے تھے تو رچرڈ ان کی کار کا نمبر نوٹ کرچکا تھا۔ رچرڈ کے خیال میں یہ اس کی پہلی کامیابی تھی۔

☆☆☆

کار نمبر ایک شخص فل بریٹی کے نام پر رجسٹرڈ نکلا۔ اس کا تعلق الفانسو میلان گون نامی کوڑا کرکٹ اٹھا کرنے والی ایک ایسوسی ایشن سے تھا اور وہ کنگ کاؤنٹی ٹریڈ ریسٹ ایسوسی ایشن کا ایڈمنسٹریٹر تھا۔ دراصل یہی ایسوسی ایشن مافیا کا شکنجہ تھی۔ جس کے تحت کچرا اٹھا کرنے کے کاروبار سے منسلک تین سو سے زائد کمپنیاں مافیا کے لیے کام کر رہی تھیں۔ ایسوسی ایشن ایک کمپنی سے سالانہ دو لاکھ ڈالرز کا خطیر معاوضہ لے رہی تھی اور بدلے میں وہ کسی کمپنی کے لیے کچھ نہیں کرتی تھی۔ واضح طور پر یہ معاوضہ مافیا کے پاس جاتا تھا۔ تقریباً ساٹھ ملین ڈالرز کی موٹی رقم مافیا کی جیب میں جا رہی تھی اور اس کی طاقت میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

پولیس اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے گزشتہ ایک دہائی میں کم سے کم سات بار مافیا کی اس کاروبار پر گرفت ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ وہ صرف سامنے نظر آنے والے چند معمولی مہرے ہی گرفتار کرسکے تھے اور اس کھیل کے پسِ پردہ کردار پولیس کی گرفت سے آزاد تھے۔ بقول رچرڈ کے پولیس مافیا کے درخت کی شاخیں اور پتے نوچ رہی تھی اور اس کی جڑیں مکمل طور پر محفوظ تھیں۔

مگر 1992ء میں ہونے والے اس واقعے کے بعد این وائی پی ڈی کے افسران نے اسے اپنے لیے ایک مناسب موقع جانا کہ وہ مافیا کی گرفت ختم کرسکیں مگر یہ کام آسان نہیں تھا۔ نیویارک کے شہر میں مافیا کی گرفت پولیس کے اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ رچرڈ نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا اور حوصلہ مند بینڈیلو نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ لانگ آئی لینڈ میں نامعلوم افراد نے کوڑا جمع کرنے والے دو افراد کو گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ وہ بینڈیلو کی کمپنی سے نہیں تھے لیکن اس کے کارکنوں کی باری بھی آسکتی تھی۔ ٹرک کو آگ لگانے والے واقعے کے بعد وہ سب خوف زدہ تھے۔ ان میں سے کئی خاندان والے تھے اور وہ اپنے خاندان کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اگر وہ کمپنی اور مافیا کی اس جنگ میں مارے جاتے تو ان کے گھروں کا کون پُرسانِ حال ہوتا۔

ان حالات میں بینڈیلو نے مناسب سمجھا کہ بریٹی سے ملاقات کرے۔ ملاقات مین ہٹن میں ایک شان دار دفتر میں ہوئی۔ جب بینڈیلو نے اپنے ٹرک کے نقصان کا ذکر کیا تو بریٹی نے اسے نظر انداز کرکے اپنے کاروباری نقصان کے حرجانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا ''مجھے تمہاری نیلامی میں حصہ لینے کی وجہ سے کئی لاکھ ڈالرز کا نقصان ہوا ہے۔ اگر تم اس نیلامی سے دستبرداری اختیار نہیں کرتے تو مجھے میرے ہونے والے نقصان کا حرجانہ ادا کرو۔''

''اور میں ایسا نہ کروں تو کیا تم عدالت میں جاؤ گے؟'' بینڈیلو نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہم عدالت میں جانے والے لوگ نہیں ہیں۔'' بریٹی نے ذرا آگے جھکتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''ہم اپنے مسائل خود حل کرتے ہیں۔''

''لیکن میں حرجانہ کیوں ادا کروں جبکہ میں نے فیئر طریقے سے بزنس حاصل کیا ہے؟'' بینڈیلو نے احتجاج کیا۔

''تمہاری مرضی۔'' بریٹی نے بے پرواہی سے جواب دیا ''اگر تم میری تجاویز سے متفق نہیں ہو تو آئندہ تمہیں ہونے والے نقصانات کا ذمے دار بھی میں نہیں ہوں گا۔''

بینڈیلو سے ذرا پیچھے بیٹھے رچرڈ کی جیب میں رکھے حساس ریکارڈر میں ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہورہا تھا۔ بینڈیلو اور بریٹی کی بات چیت کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی اور بریٹی نے انہیں سرد مہری سے اپنے دفتر سے نکل جانے کو کہا تھا۔ واپسی پر رچرڈ نے بینڈیلو سے پوچھا ''اب تم کیا کرو گے؟''

''میں کام کا آغاز کروں گا۔'' بینڈیلو نے پُرعزم انداز میں کہا ''میں ان لوگوں سے ڈر کر مقابلے سے دستبردار نہیں ہوں گا۔''

رچرڈ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ برسوں سے پولیس کے شعبہ منظم جرائم میں مافیا کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس لیے وہ اس خطرے کو جس طرح محسوس کررہا تھا، بینڈیلو نے اسے محسوس نہیں کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ مقابلے پر آمادہ تھا۔ اس کے فیصلے کے حق میں ہونے کے باوجود رچرڈ نے بہتر سمجھا کہ اسے مافیا کے خطرے سے آگاہ کردے مگر بینڈیلو کے عزائم میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر صورت اپنے گاہکوں سے کیے گئے معاہدوں کی پاس داری کرے گا۔ رچرڈ مافیا کے طریقۂ کار سے واقف تھا۔ جب بینڈیلو کی کمپنی نے کچرا اٹھانے کا کام شروع کیا تو اسے معلوم تھا اب تحریری وارننگ ملے گی (یہ ایک طرح سے دعوتِ مبارزت بھی ہوتی تھی کہ ہمت ہے تو میدان میں ڈٹے رہو ورنہ مقابلے سے دستبردار ہوجاؤ) اگر وہ اس خطرناک حکمتِ عملی میں کامیاب ہو بھی جاتے تب بھی ان کی مشکلات کم نہ ہوتیں۔ مافیا کے پاس طریقوں کی کمی نہیں تھی جن کی مدد سے وہ اپنے حریفوں پر دباؤ بڑھاتے تھے اور آخر کار وہ اپنے مخالف کو صفحۂ ہستی سے نابود کردیتے تھے لیکن یہ ان کا آخری حربہ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کام نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

پولیس نے بینڈیلو اور اس کے کارکنوں کو تحفظ دینے کے لیے اس کے دفتر اور گاڑیوں میں خفیہ کیمرے اور مائیکرو فون لگادیئے۔ جب کچرا اکٹھا کرنے والی گاڑیاں نکلتی تھیں تو مافیا کے کارندے ان کے عملے کو ہراساں کرتے۔ ایک بار دفتر میں فون کرکے بتایا گیا کہ گاڑیاں جو کچرا اکٹھا کررہی ہیں۔ ان میں سے ایک میں ٹائم بم ہے اس اطلاع پر افراتفری میں ساری گاڑیوں کو کچرے سے خالی کردیا گیا۔ بعد میں پولیس کے ماہرین کوشش کے باوجود اس کچرے سے کوئی بم برآمد کرنے میں ناکام رہے تھے۔ واضح طور پر یہ ہراساں کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اگلی بار آنے والی فون کال میں خبردار کیا گیا کہ عین ممکن ہے اگلی بار کچرے میں بم ہو۔

اس واقعے کے بعد کمپنی کے کئی ملازم ملازمت چھوڑ گئے تھے مگر بینڈیلو نے ہار ماننے سے انکار کردیا۔ پولیس نے کمپنی کے ٹرکوں میں بم کی شناخت کرنے والے آلات لگادیئے۔ ان دنوں رچرڈ پلے ماؤتھ اسٹریٹ پر ایک ری سائیکل پلانٹ پر کام سیکھ رہا تھا۔ وہ اس بزنس کے اسرار و رموز سیکھنا چاہتا تھا اور وہ جیسے جیسے سیکھ رہا تھا۔ بینڈیلو کی ہمت کا قائل ہوتا جارہا

تھا۔ وہ نہ صرف مافیا کا مقابلہ کر رہا تھا بلکہ اپنے کام کو وسعت بھی دے رہا تھا۔ کچرا اٹھانے والی ایک اور کمپنی جیسے لیو مونگلی اور اس کا بیٹا پال مونگلی چلا رہے تھے۔ ان کے گاہک ان سے نالاں تھے ان کے کام کا معیار بالکل بھی تسلی بخش نہیں تھا۔

اگلی نیلامی میں بینڈیلو نے مونگلی کی کمپنی کی جگہ بہتر پیشکش کی اور ان عمارتوں سے کچرا اٹھانے کا ٹھیکا بھی اسے مل گیا۔ مونگلی کی کمپنی اگرچہ مافیا سے تعلق نہیں رکھتی تھی لیکن مافیا نے انہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور انہیں بینڈیلو کے خلاف اکسایا۔ اس کے دو دن بعد جب رچرڈ کچرا اٹھانے والے ایک ٹرک کے ساتھ جا رہا تھا تو لیو اور پال نے اس کے ٹرک کو روک لیا۔ ان کے ساتھ چار دوسرے افراد اور بھی تھے انہوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں اٹھا رکھی تھیں۔ مونگلی نے چلا کر کہا۔

''اگر کسی نے میرے کام میں ہاتھ ڈالا تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی مونگلی اور اس کے ساتھیوں نے ٹرک پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ عقبی شیشہ لاٹھی لگنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اگلے روز رچرڈ نے نیویارک کے کچرا اٹھانے والوں کی ایسوسی ایشن کے دفتر میں جا کر اس واقعے کی رپورٹ کی جو پانچ سو بارہ کینال اسٹریٹ پر واقع تھا۔ کمپنی کے ایک ذمے دار نے اس کی شکایت سنی اور وعدہ کیا کہ وہ مونگلی کو اس کی حد میں رکھے گا اور بینڈیلو کو بزنس حاصل کرنے پر کوئی زرِ تلافی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ رچرڈ اور بینڈیلو نے اس یقین دہانی پر خاصا اطمینان محسوس کیا تھا لیکن اگلے ہی دن ان کا یہ اطمینان نقش بر آب ثابت ہوا۔

بینڈیلو کی کمپنی کا ایک ڈرائیور ایلکس کام پر نکلا اور جب اس نے اپنی گاڑی چارلس گرین کمپنی کی عمارت کے سامنے روکی۔ پہلے یہاں سے کچرا اٹھانے کا ٹھیکا مونگلی کی کمپنی کے پاس تھا۔ اسی اثنا میں مونگلی کی کمپنی کا ایک ملازم ٹرک کے پاس آیا اور جیسے ہی ایلکس نیچے اترا اس نے ایلکس کی بے خبری میں اس پر لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ اتفاق سے ایلکس کی آٹھ سالہ بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی جس کے اسکول گرما کی تعطیلات کی وجہ سے بند تھے۔ غنڈے نے بیٹی کے سامنے ایلکس کو بے دریغ تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے اتنا مارا کہ خاصے عرصے تک ایلکس اسپتال میں داخل رہا۔ بہت دنوں تک اس کے سر میں درد کی لہریں اٹھتی رہیں اور ٹرک چلاتے ہوئے وہ اپنی دائیں مٹھی کو پوری طرح بند نہیں کر پاتا تھا۔

اس واقعے نے بینڈیلو کے ملازمین میں ہراس کی لہر دوڑا دی تھی۔ رچرڈ نے اس واقعے کی رپورٹ ایک بار پھر ایسوسی ایشن کے چیمبر میں جا کر کی۔ اس بار اس نے چیمبر میں بھی ایک مائیکروفون لگا دیا اور اس نے جیو وسکو نامی شخص کو کہتے سنا ''یہ سارے مسائل اس لیے ہیں کہ بینڈیلو بات نہیں مان رہا۔'' اس شخص نے رچرڈ کو مشورہ دیا تھا ''بہتر ہوگا تم اس معاملے کو کچھ دے دلا کر ختم کرو۔ ورنہ اسی طرح مصیبت کا شکار رہو گے۔''

رچرڈ یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ اب مافیا کے گرد گھیرا تنگ کرنا آسان ہو گیا تھا۔

رچرڈ نے ڈسٹرکٹ اٹارنی اور پولیس کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا۔ بینڈیلو نے لیو مونگلی کے نام پانچ ہزار ڈالرز کے دو چیک جاری کیے۔ جو اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے گئے اور یہ ادائیگی سرکاری ریکارڈ میں آ گئی۔ اس سے ایک دن پہلے کی بات تھی اگست 1993ء میں ایک شخص ایڈ تھیملی، بینڈیلو کے دفتر آیا اور اس نے بینڈیلو سے دھمکی آمیز انداز میں کہا ''آتش زنی کی واردات دوبارہ بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم لوگ چاہتے کیا ہو؟'' بینڈیلو نے غصے سے کہا۔

''دیکھو کاروبار کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتے ہیں۔ اگر تم بزنس کرنا چاہتے ہو تو سب سے بنا کر رکھو۔'' بینڈیلو اور رچرڈ سمجھ گئے اور انہوں نے مونگلی کو ادائیگی کر دی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نیویارک کے بڑے پیپر ایسوسی ایشن کے دفتر گئے اور یہ رچرڈ کے تیرہ مہینے سے جاری خفیہ آپریشن کا بہت نازک موڑ تھا۔ ابھی تک اس کیس میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ جب رچرڈ نے اس بارے میں ڈسٹرکٹ اٹارنی سے بات کی تو اس نے صاف بتا دیا۔ ''موجودہ صورتِ حال میں ہم زیادہ سے زیادہ جبری رشوت لینے کا کیس بنا سکتے ہیں مگر تم مایوس نہ ہو۔ ممکن ہے بالآخر تم اس کیس میں کوئی بڑی مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤ۔''

جب بینڈیلو نے مونگلی کو ادائیگی کر دی تو مافیا والوں کے منہ مزید کھلے اور اگلی بار تھیملی نے رچرڈ سے کہا۔

''ابھی تمہیں اپنی رقم مزید شیئر کرنی ہے۔''

''کس سے؟'' رچرڈ نے سادگی سے کہا۔

''بگ باس سے۔'' تھیملی نے جواب دیا۔

''یہ بگ باس کون ہے؟''

دی چن گیگانٹی کے نام سے مشہور یہ شخص ایک اطالوی فیملی جینوویس کا معروف گاڈ فادر تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جو اس کیس میں سامنے آیا۔ رفتہ رفتہ یہ بات کھلنے لگی کہ کچرا اکٹھا کرنے والی مافیا کی کمپنیوں کی رہنمائی یہی شخص کرتا تھا۔ اس

کی سرپرستی میں مافیا نے بزنس میں مداخلت کی تھی اور اب کسی ہشت پا کی طرح اپنے پنجے اس کاروبار میں گاڑ دیئے تھے۔ اوپر کی ساری آمدنی ڈی چین کے پاس جا رہی تھی۔ تقریباً ساری ہی کمپنیاں اسے ادائیگی کرتی تھیں اور اس کے بدلے مافیا والے کمپنیوں کے کاروبار کو تحفظ فراہم کرتے تھے اور انہیں زیادہ شرح نفع پر کاروبار دلاتے تھے۔

رچرڈ بڑی کامیابی سے اپنے کام کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس سے پہلے اسے کبھی کسی خفیہ آپریشن پر کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنا کردار نہایت عمدگی سے نبھایا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ وہ مافیا والوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ان کے ساتھ میٹنگز میں شریک ہوتا اور ان کی باتیں ریکارڈ کرتا۔ ایسی باتیں جو بعد میں ان کے خلاف عدالت میں استعمال ہوتیں۔ رچرڈ بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اگر اس کے پاس سے ریکارڈر برآمد ہو جاتا تو مافیا کے کارندے اسے غائب کر دیتے۔ اس کے ساتھیوں اور خاندان والوں کو اس کے بارے میں پتا بھی نہ چلتا۔ ایک بار وہ پکڑے جانے سے بال بال بچا جب وہ بگ باس سے ملنے گیا اور اندر جانے سے پہلے مافیا کا ایک بدمعاش اس کے سر ہو گیا۔ اس نے رچرڈ کی تلاشی لینی چاہی اور ممکن تھا کہ وہ ریکارڈر تک پہنچ جاتا لیکن کیملی نے عین موقع پر غنڈے کو روک دیا۔

"چھوڑو!" اس نے تحکمانہ انداز میں کہا "یہ اب اپنا ہی آدمی ہے۔"

اس وقت غنڈے کے ہاتھ ریکارڈر سے محض چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر تھے۔ بادلِ نخواستہ غنڈے نے اسے چھوڑا اور رچرڈ نے سکون کی سانس لی۔ اسی طرح ایک اور میٹنگ کے دوران رچرڈ کے لباس میں رکھے ٹرانسمیٹر میں کوئی خرابی ہو گئی۔ وہ گرم ہو گیا اور اس سے ناگوار سی بو آنے لگی۔ رچرڈ نے جلدی سے مافیا کے کارکنوں سے معذرت کی اور ریستوران کے مردانہ باتھ روم میں آ کر ریڈیو نکالا۔ اس کی بیٹری سے تیزاب لیک کر گیا تھا اور ریڈیو خراب ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے توڑا اور اس کے پرزے فلش میں بہا دیئے پھر اس نے اپنے اوپر کولون اسپرے کیا تاکہ جلنے والی ناگوار بو ختم ہو جائے۔ خوش قسمتی سے اس کے پاس ایک اور ٹرانسمیٹر تھا۔ اس نے اسے آن کر لیا اور میٹنگ کی ساری کارروائی اس سے نشر کی۔ جسے پولیس کی موبائل یونٹ ریکارڈ کر رہی تھی۔ رچرڈ بتدریج کامیابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نئے نام اور شناختیں سامنے آ رہی تھیں۔ اس تناسب سے رچرڈ کے خلاف خطرات بڑھ رہے تھے۔

رچرڈ کوونن کے لیے یہ ایک صبر آزما دور تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے مافیا سے نبرد آزما تھا تو دوسری طرف سے اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے بے حد احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ اس کے نام پر (ڈان) ایک فلیٹ لیا گیا تھا اور اس کے نام پر ایک کار بھی رجسٹرڈ تھی تاکہ مافیا والے اس کے خلاف انکوائری کریں تو انہیں اس کی اصل شخصیت کا پتا نہ چلے۔ رچرڈ روزانہ گاڑی میں سوار ہو کر فلیٹ کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ تک جاتا یہاں سیاہ شیشوں والی ایک کار موجود ہوا کرتی تھی۔ رچرڈ اس میں سوار ہو کر اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے فلیٹ میں ایک آنسرنگ مشین تھی جو آنے والی ہر کال کے جواب میں آگاہ کیا کرتی تھی کہ ڈان سو رہا ہے براہِ کرم اپنا پیغام ریکارڈ کروا دیں۔ اگلی صبح رچرڈ پہلے فلیٹ میں آتا۔ مشین پر آنے والے پیغامات چیک کرتا اور پھر بینڈیلو کے دفتر روانہ ہو جاتا تھا۔ احتیاطاً ہر دوسرے تیسرے دن اس کی گاڑی بدل دی جاتی تھی۔

ان ساری احتیاطوں کے باوجود پولیس کو رچرڈ کی سلامتی کی فکر لاحق رہتی تھی۔ لہٰذا طے ہوا کہ آئندہ وہ جب بھی مافیا کے کسی کارکن سے ملے گا یا ان کی کسی میٹنگ میں شریک ہوگا تو اس کے پاس ایک خطرے کا سگنل دینے والا آلہ ہوگا۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں رچرڈ سگنل دے گا اور باہر موجود پولیس کمانڈوز کا دستہ فوری کارروائی کر کے اسے بچا لے گا۔ اس کے ڈیپارٹمنٹ کا چیف پیٹ ڈف اس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھا اس نے ایک موقع پر رچرڈ سے کہا "ہم ان ٹیپس کو استعمال کر کے ان مجرموں کو سبق سکھا سکتے ہیں۔"

بینڈیلو پولیس اور رچرڈ سے مکمل تعاون کر رہا تھا۔ وہ اس معاملے میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ اسے اپنی سلامتی کی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھا بشرطیکہ یہ بزنس مافیا سے پاک ہو جائے۔ ایک طرف وہ پولیس سے تعاون کر کے حکومت کی گڈ بک میں آ گیا تھا۔ دوسری طرف رچرڈ کی کارکردگی کی وجہ سے مافیا والے اب خود اس کے ٹرکوں کو تحفظ فراہم کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ ان کو ان کی مطلوبہ رقم فراہم کر رہا تھا۔

1994ء کے گرما تک رچرڈ نے مافیا کے ایک درجن سے زائد بھتہ خوروں کے خلاف اہم ثبوت حاصل کر لیے تھے اور ان ثبوتوں کی بنیاد پر وہ لمبے عرصے کے لیے جیل جا سکتے تھے مگر رچرڈ ان سے بڑی مچھلیوں جیو فرانکو لائن اور الفانسو

انقلابی عورتیں

نگوئن تھی چاؤ (ویت نام)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ویت نام کے آدھے سے زیادہ حصے پر ظالم امریکی تسلّط جما چکے تھے۔ باقی آدھے کو بچانے کے لیے محبِ وطن لوگ سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ آزادی کے لیے سرگرم پارٹی کے ایک نوجوان لیڈر لی ہونگ تو کی تقریر اس نے سنی تو اس لڑکی کے دل میں بھی وطن کی خدمت کے جذبے نے سر ابھارا۔ اور ایک جلوس کے عقب میں وہ بھی ہو لی۔ اس لڑکی کا نام تھی چاؤ تھا۔ وہ اٹھائیس برس کی تھی۔ طلبا کے اس جلوس پر پولیس نے لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ اس کے سر پر بھی لاٹھی لگی اور وہاں سے خون ابلنے لگا۔ اسے گرفتار کر کے ایک میجر کے عہدے کے اسپیشل ایجنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ یوتھ لیگ کی سرگرمیوں کے بارے میں بتائے۔ تھی چاؤ نے کہا مجھے کچھ نہیں معلوم۔

یہ جواب میجر کو پسند نہ آیا۔ اسے بے رحمی سے گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے جایا گیا اور اسے ایک بینچ سے باندھ دیا گیا اور لوہے کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا گیا۔ اس کے بعد صابن کا محلول اس کے منہ میں انڈیلا جانے لگا۔ جب اس کا پیٹ اس سے پھول گیا تو اس کے پیٹ کو زور زور سے دبایا جانے لگا۔ گو اس اذیت کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا لہٰذا اسکے بدن کے ساتھ بجلی کا ننگا تار مس کیا گیا اور یہ عمل روزانہ کیا جانے لگا۔ پہلے وہ اس اذیت گاہ میں اپنے قدموں پر چلی جاتی تھی بعد میں اس قابل بھی نہ رہی۔ تب میجر نے اسے لالچ دیا کہ اسے معقول مالی انعام دیا جائے گا۔ اس نے کہا ''میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔''

جیل کی دیوار پر ایک روز اس نے اپنے بالوں کے پن سے لکھا ''میرا سر ہمیشہ اونچا رہے گا۔'' جیل میں اس کی سربراہی میں آٹھ بھوک ہڑتالیں کامیاب ہوئیں۔ اسے مختلف جیلوں میں بھیجا گیا۔ جہاں وہ جاتی تھی وہاں کے افسران کا جینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ اسے جیلوں میں اتنا ستایا گیا تھا کہ اس کے ناخن ٹوٹ گئے تھے اور دانت ہل گئے تھے۔ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا ورنہ اسے جان سے مار دیا جاتا۔ ایک بار اس سے کہا گیا تم صرف ملکی پرچم کو سلامی دے دو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اس نے کہا ''سائیگون کا پرچم کیا امریکا کا پرچم نہیں؟''

پھر اس نے حقارت سے منہ موڑ لیا۔ آخر میں اسے 131 دن کی قید کی سزا دی گئی۔ جب وہ جیل سے نکلی تو ایک فاتح تھی۔ اس نے پارٹی سے رابطہ کیا اور آزاد علاقے کی طرف چلی گئی۔ وہاں اسے اطلاع ملی کہ اس کے منگیتر کو سزائے موت دے دی گئی ہے۔ اس کے پاس اس کی ایک تصویر تھی۔ اس کے نیچے وہ فقرہ لکھا ہے جو اس نے موت کے وقت کہا تھا ''افسوس کہ مجھے اتنے ہینڈ گرینیڈ نہیں مل سکے جن سے میں سارے امریکی ڈاکوؤں کو ختم کر سکتا۔''

''نگوئن تھی چاؤ...... ویت نام جنگِ آزادی کی ہیروئن کے طور پر اپنے وطن میں مشہور ہے۔''

سلانگ ون کے خلاف ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ سب بڑی مچھلیاں تھیں مگر بگ باس کے خلاف اس کیس میں ثبوت حاصل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اسے عدالت میں کھینچنا بھی بیکار تھا۔ کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے رچرڈ اور اس کے شعبے کے افسران نے بگ باس کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر الفانسو اور جیو کے خلاف ثبوت حاصل کر لیے جاتے تو یہ بھی ان کی بڑی کامیابی ہوتی۔ اصل میں یہی دونوں افراد ٹریڈ ریسٹ کے کرتا دھرتا تھے۔

رچرڈ کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ اس نے اور ایک ایجنٹ نے الفانسو کو تین سال پہلے جوئے کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا اور اس سے طویل پوچھ گچھ کی تھی۔ الفانسو اسے صورت سے پہچانتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مافیا کے اس کارندے نے اسے بھلایا نہیں ہوگا۔ اگر رچرڈ ایک بار اس کے سامنے چلا جاتا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ اس لیے رچرڈ کی ہر ممکن کوشش تھی کہ مافیا کے لوگوں سے کم سے کم ملے۔ اگر اسے پتا چلتا کہ الفانسو بھی میٹنگ میں ہوگا تو وہ خود جانے کے بجائے بینڈ یلو کو بھیج دیتا تھا۔

اس دوران میں ایک پریشان کن خبر رچرڈ تک آئی۔ بینڈیلو تک کچھ فکر انگیز فون کالز آئی تھیں۔ ان میں سے ایک فون اس کے جیو بینڈیلو کا تھا۔ اس نے بتایا۔ وہ ایک گالف

ٹورنامنٹ دیکھنے آیا تھا کہ نیویارک کے دو افراد نے اس سے اس کے کزن ''ڈان'' کے بارے میں پوچھا۔ جیو ورجینیا میں ایک ری سائیکل پلانٹ چلا رہا تھا اس نے ہنستے ہوئے بینڈیلو سے کہا ''میں اپنے خاندان کے ہر فرد کو جانتا ہوں اور ہمارے خاندان میں کوئی ڈان بینڈیلو نہیں ہے۔''

''کیا تم نے یہ بات ان افراد کو بتادی تھی؟'' بینڈیلو نے پوچھا۔

''ہاں اور ان میں سے ایک نے حیران کن بات کی۔ اس نے کہا ''تب وہ ضرور ایف بی آئی کا ایجنٹ ہوگا۔''

ان کے تاثرات نے جیو کو بتا دیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے اور وہ اس وقت خاموش ہوگیا۔ بعد میں اس نے اپنے کزن بینڈیلو کو فون کرکے اس کہانی کے بارے میں پوچھا۔ اس پر بینڈیلو نے سکون سے فوراً ایک کہانی گھڑ لی۔ اس نے جیو کو یاد دلایا کہ ان کا ایک چچا بے راہ رو ہوگیا تھا۔ یہ ڈان اس پادری چچا کا ناجائز بیٹا ہے۔ بینڈیلو نے کوشش کی کہ جھوٹ بولتے ہوئے اس کی آواز مرتعش نہ ہو۔ اس نے جیو سے کہا۔

''ناجائز ہی سہی لیکن وہ ہمارا خون ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اسے سہارا دوں۔''

''مجھے امید ہے تم نے جو کہا ہے وہ درست ہوگا۔'' جیو نے فون بند کرنے سے پہلے کہا ''بات اتنی ہے کہ میں کسی قسم کی پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتا۔ مجھ سے جن افراد نے ڈان کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ مجھے اچھے نہیں لگے۔''

''فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' بینڈیلو نے اسے تسلی دی تھی۔

اس کے چند دن بعد 12 ستمبر 1994ء کے دن جیو فرانکولائن نے رچرڈ (ڈان) کو فون کیا ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' رچرڈ نے پوچھا۔ جیو بینڈیلو سے ہونے والی انکوائری کے بعد وہ مافیا والوں سے ملنے سے گریز کر رہا تھا۔ فرانکولائن نے جواب دیا۔

''ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ایسا کرو تم ..... مین ہٹن میں پیری نوز ریستوران میں آجاؤ۔''

''میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کچھ مصروفیات ہیں۔''

''یہ ملاقات ضروری ہے۔'' فرانکولائن کا لہجہ سرد ہوگیا تھا۔ ''میں انتظار کروں گا۔''

رچرڈ نے اس کی اطلاع فوری طور پر اپنے سپروائزر کو دی۔ جو اپنے ایجنٹ کی حفاظت کے لیے مستعد ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ڈسٹرکٹ اٹارنی آفس سے ایک تفتیش کار بوبی اوڈانو نے اسے خبردار کیا ''تمہیں بے حد ہوشیار رہنا ہوگا۔ وہ تمہیں مار بھی سکتے ہیں اور تمہاری لاش کسی کچرے دان میں بھی ڈال سکتے ہیں۔ جہاں کوئی انہیں ایسا کرتے دیکھ نہیں سکے گا۔ میرا مشورہ ہے تم مت جاؤ۔''

''کیا وہ ایک بھرے پرے ریستوران میں ایسا کرنے کی جرات کرسکیں گے؟''

بوبی نے کچھ دیر بعد کہا ''وہ ریستوران مافیا کا گڑھ ہے۔ اگر انہوں نے تمہیں بلایا ہے تو انہوں نے ایسا کوئی انتظام بھی کیا ہوگا کہ کوئی غیر متعلقہ فرد وہاں نہ جانے پائے۔''

''میں اگر نہیں گیا تو میری اصل شناخت کھل جائے گی اور ایسا کرنے سے مشکلات ختم نہیں ہوں گی۔ یہ کیس جس میں ہم بہت آگے جاچکے ہیں۔ ختم ہوجائے گا۔ سب سے بڑھ کر ہمارا دوست سال بینڈیلو مشکل میں پڑ جائے گا جو اب تک پوری ثابت قدمی سے ہمارا ساتھ دیتا آیا ہے۔''

''میرا مشورہ ہے......''

''میں ضرور جاؤں گا۔'' رچرڈ نے اس کی بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا ''تم میری حفاظت کا انتظام مت کرو۔''

''اوکے ہم دیکھتے ہیں۔''

بوبی کا کہنا درست تھا۔ پیری نوز نامی یہ ریستوران مافیا کا گڑھ شمار ہوتا تھا مگر جب وہ وہاں پہنچا تو رش تھا۔ اسے ذرا اطمینان محسوس ہوا۔ اس کے خلاف فی الوقت کوئی سازش نہیں ہو رہی تھی۔ اسے ایک میز پر جیو فرانکولائن بیٹھا نظر آیا اس نے اشارے سے رچرڈ کو اپنی طرف بلایا۔ اس کی میز پر صرف مارٹینی کی بوتل اور دو جام رکھے تھے۔ ایک جام پی چکنے کے بعد فرانکولائن نے اچانک اس سے کہا۔

''ہماری ملاقات تمہارے کزن جیو بینڈیلو سے ہوئی تھی۔''

''میرے علم میں ہے۔'' رچرڈ نے سکون سے کہا۔

''اور اس نے اپنے ڈان نامی کسی کزن کو پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔'' فرانکولائن کے لہجے میں طنز تھا۔

''اس کا کہنا بھی درست تھا۔ درحقیقت میں بھی اپنے خاندان کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے تو سال بینڈیلو نے بتایا کہ میں کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا باپ پادری تھا اور ناجائز اولاد ہونے کی وجہ سے اس نے مجھے سب سے چھپایا تھا۔ اب سال بینڈیلو مجھے سہارا دے رہا ہے۔''

رچرڈ نے تفصیل سے اپنا خاندانی پس منظر جیو فرانکولائن کو سنایا لیکن وہ خاص متاثر نظر نہیں آرہا تھا۔ رچرڈ کی کہانی سننے کے بعد اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا ''تمہارے پاس کیا

ثبوت ہے کہ تم اصل میں ڈان بینڈیلو ہو۔''
رچرڈ نے اسے اپنا ڈرائیونگ لائسنس، جم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ دکھایا۔ جس میں اس کا نام ڈان بینڈیلو لکھا تھا۔ یہ سب چیزیں اصل تھیں اور انہیں خاص طور سے اس کے لیے بنوایا گیا تھا۔ فرانکولائن نے بغور ان سب چیزوں کو دیکھا اور قائل نظر آنے لگا مگر اس نے رچرڈ سے مزید کچھ سوالات کیے تھے۔ رچرڈ نے روانی سے ان سب کے جوابات دیئے اور بالآخر فرانکولائن مطمئن نظر آنے لگا۔ رخصت کرتے وقت اس سے رچرڈ سے باقاعدہ معذرت کی تھی۔

''معاف کرنا دوست ہمیں اس قسم کی انکوائری کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ ہم زیادہ دیر پولیس کی گرفت سے آزاد نہیں رہ سکتے ہیں۔ امید ہے تم نے برا نہیں منایا ہوگا۔''

''اس کے برعکس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ جب سے مجھے جیو بینڈیلو کی کال کے بارے میں پتا چلا تھا میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ تم نے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے۔''

''چلو ہم دونوں ہی مطمئن ہوگئے ہیں۔'' فرانکولائن پہلی بار ہنسا تھا۔

مگر جلد رچرڈ کو ایک اور آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ اگلی بار جب وہ بھتے کی ادائیگی کے لیے چیک لے کر بیری لوز ریستوران گیا تو وہاں پر فرانکولائن اس کا منتظر تھا۔ اس نے چیک لیے اور فرانکولائن نے اسے ایک جام کی آفر کی۔ ابھی وہ جام ختم کر رہا تھا کہ اس نے ملان گون کو ریستوران میں آتے دیکھا۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے اس نے فوری طور پر فرانکولائن سے رخصت کی اجازت چاہی ''اب میں چلتا ہوں ضروری کام ہے۔''

''ضرور...... لیکن...... اوہ یہ ہمارا دوست ہے ملان گون...... آؤ میں تمہیں اس سے ملاؤں۔'' فرانکولائن نے اندر آتے ملان گون کو دیکھ لیا تھا۔ یہ ریستوران واقعی مافیا کا گڑھ تھا۔ فرانکولائن نے آواز دے کر ملان گون کو پاس بلایا اور رچرڈ کا اس سے تعارف کرایا ''یہ ڈان بینڈیلو ہے۔ سال بینڈیلو کا کزن۔''

ملان گون نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی نظریں رچرڈ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس بات کو اب چار سال ہو رہے تھے لیکن رچرڈ اور ملان گون کی ملاقات عام ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ رچرڈ نے اسے گرفتار کرکے اس سے تفتیش کی تھی اور اسے یقین تھا کہ ملان گون اسے پہچان لے گا۔ ساتھ ہی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ اسے نہ پہچان پائے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خاصی دیر بعد ملان گون نے کہا ''تم سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر بینڈیلو۔''

رچرڈ نے سکون کا طویل سانس لیا ''مجھے بھی خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے ملان گون سے ہاتھ ملایا۔

اس کی خوش قسمتی کہ وہ اسے پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔ جبکہ وہ کیس کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور بڑا خطرہ مول لیا۔ اس نے ملان گون کے دفتر میں جاکر اس سے ملاقات کی اور اس سے ہونے والی گفتگو بھی ریکارڈ کرلی۔ اب اس کے پاس مافیا کے خلاف کافی ثبوت ہوگئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مافیا کے مختلف افراد کو ساڑھے سات لاکھ ڈالرز مالیت کے چیک دیئے تھے۔ اس نے جو گفتگو ریکارڈ کی تھی اس کے مطابق مافیا کے تمام ہی سرکردہ افراد نے اپنے جرائم کا ذکر کیا تھا یا اسے یا بینڈیلو کو دھمکیاں دی تھیں۔ ان میں قتل سے لے کر آتش زنی تک کی دھمکیاں تھیں۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی کے آفس میں ان ثبوتوں نے جوش و خروش کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اٹارنی آفس کے ایک سینئر پراسیکیوٹر نے تبصرہ کیا ''یہ ثبوت ہمارے لیے ایک طرح کا ہتھیار ہیں۔ ان کی مدد سے ہم مافیا پر تباہ کن حملے کر سکتے ہیں اور ان کی مدد سے ہم کم سے کم اس بزنس سے مافیا کو بے دخل کر سکتے ہیں۔''

اس کے بعد پولیس اور اس سے تعاون کرنے والی ایف بی آئی نے چھاپوں کی پلاننگ کی اور ایک ہی دن اور ایک وقت میں کچرا اکٹھا کرنے والی مافیا کی کمپنیوں اور ایسوسی ایشن کے دفاتر پر چھاپا مارا اور مافیا کے کم سے کم دو درجن افراد کو گرفتار کرلیا۔ ان میں الفانسو اور ملان گون کے ساتھ فرانکولائن بھی شامل تھے۔ ان کے خلاف مضبوط ثبوت تھے۔ ایک سال تک مقدمے کے بعد انہیں پانچ سے دس سال تک کی سزا ہوئی۔ اس کے بعد کچرا اکٹھا کرنے کا بزنس مافیا کے اثر سے پاک ہوگیا تھا۔

اس کامیاب آپریشن پر رچرڈ کو ترقی اور نقد انعام سے نوازا گیا تھا اور اخبارات نے اس کے بارے میں آرٹیکل لکھے تھے۔ سال بینڈیلو کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مافیا کے خلاف پولیس کا ساتھ دیا تھا۔

گھڑی

کاشف زبیر

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ گویا وہ سب دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی واقعات اس معصوم سے بچے کی زندگی میں آئے تھے جسے وہ زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔

امریکا سے درآمد پراثر واقعات میں سے ایک دلچسپ کتھا

نینا بہت چالاک تھی۔ وہ میری بڑی بہن ہے اور مجھ سے تین سال بڑی ہے۔ ان دنوں وہ دس سال کی تھی اور میں صرف سات سال کا۔ مام کے مرنے کے بعد میری دیکھ بھال بھی اسی نے کی تھی اور تب صحیح معنوں میں پتا چلا کہ وہ کس قدر تیز ہے، اپنی عمر سے کہیں زیادہ تیز ذہن رکھتی ہے۔ مام کا ایک سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ وہ نشے کی عادی تھی اور نشہ کیے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ ڈیڈی اس وقت مام سے الگ ہو گئے تھے جب اس نے نشہ شروع کیا تھا۔ مام کا کہنا تھا کہ اس نے

نشہ ڈیڈی کی وجہ سے شروع کیا تھا کیونکہ وہ اس پر اور گھر پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ڈیڈی جب اسے اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تب بھی مام نے نشہ ترک نہیں کیا تھا حالانکہ اب تو نشہ کرنے کی وجہ بھی نہیں تھی۔

مام کو ہم سے محبت تھی لیکن وہ ہماری زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ اسے صرف اپنے نشے سے مطلب تھا۔ ہاں اس نے کبھی ہمیں کھانے پینے کے حوالے سے تکلیف نہیں دی۔ اس طرح وہ ہماری سہولتوں کا خیال بھی رکھتی تھی۔ ہم اسکول جاتے تھے اور ہمارے پاس کچھ اچھے کپڑے بھی تھے۔ مام کو ان کے باپ کی طرف سے کچھ شیئرز ملے تھے جس کی آمدنی سے ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ مام نے یہ شیئرز کبھی نہیں بیچے کیونکہ یہ شیئرز بیچنے کی صورت میں اس کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہتا اور اس کے نتیجے میں حکومت ہمیں اس سے لے لیتی۔ مام کسی صورت ہم سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے ڈیڈی کو اپنے پاس موجود شیئرز میں ایک تہائی دے دیئے تھے کیونکہ ڈیڈی نے دوسری صورت میں کورٹ جانے کی دھمکی دی تھی اور وہاں وہ مام کے نشہ کرنے کی عادت کی بنا پر با آسانی ہمیں اس سے حاصل کر سکتے تھے۔ یہ ساری باتیں بعد میں نینا نے مجھے بتائیں کیونکہ میں تو صرف دو سال کا تھا جب مام اور ڈیڈی میں علیحدگی ہوئی تھی۔

نینا مام پر گئی تھی بہ ظاہر نرم لیکن اپنے معاملے میں بہت سخت تھی۔ ساتھ ہی اس میں یہ خصوصیت تھی کہ موقع سے فائدہ اٹھانے سے کبھی نہیں چوکتی تھی۔ اس معاملے میں وہ مجھے بھی نہیں بخشتی تھی۔ مام کے آخری دنوں میں جب وہ زیادہ تر نشے میں دھت پڑی رہتی تھی۔ گھر کا کام نینا ہی دیکھتی تھی اور مجھے کھانا وہی دیتی تھی۔ اس وقت وہ کھانے میں اچھی چیزیں جیسے بوٹیاں وغیرہ خود کھا جاتی تھی اور مجھے صرف شوربہ دیتی تھی۔ ایک بار مام نے مجھے بال لا کر دی تو اس نے چالاکی سے یہ بال غائب کر دی اور اگلے دن اس کے پاس ایک گڑیا تھی جو اس نے کہیں سے بال کے عوض حاصل کی تھی۔

جب مام کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو ایک دن پڑوسیوں کی کال پر پولیس نے آ کر اسے اسپتال منتقل کر دیا اور ہم دونوں بہن بھائی کو پہلے ایک رضا کار جوڑے کے سپرد کیا اور اس کے بعد ہمیں ایک سرکاری یتیم خانے بھیج دیا گیا۔ اس کے ایک مہینے بعد مام اسپتال میں انتقال کر گئی تھی اور ہمیں اس بات کا اس وقت پتا چلا جب ہمیں مام کی تدفین کے لیے لے جایا گیا تھا۔ ہمیں مام کے مرنے کا دکھ تھا لیکن بہت زیادہ نہیں کیونکہ ہمارے ذہنوں نے پہلے ہی ان کی موت کو قبول کر لیا تھا۔ آخری بار میں نے ان کو اسپتال کے بستر پر اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ بے ہوش تھیں اور ان کی ناک سے آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی۔ مام کی رنگت اتنی سفید ہو رہی تھی جیسے ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے مام کو تابوت میں لیٹے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہوں۔

ہمیں جس یتیم خانے میں بھیجا گیا تھا۔ اس کا سربراہ بینارڈ نامی ایک پادری تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک نرم اور نیک دل انسان تھا لیکن اس کا اصل روپ بہت سخت اور سفاک تھا۔ وہ بچوں کو معمولی سی غلطی پر بہت زیادہ سزا دیا کرتا تھا اور میں نے ایک بار اس کی دی ہوئی سزا بھگتی بھی تھی جب مجھ سے سوپ کا پیالہ گر گیا اور اس نے مجھے پورے دو دن تک کھانے کو کچھ نہیں دیا۔ دو دن بعد میں بھوک سے مرنے والا ہو گیا تھا تو اس نے مجھے ایک گندہ سا برگر کھانے کو دیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے اب تم تمیز سے کھانا کھاؤ گے۔“

میں اس گندے برگر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بڑی دل چسپی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ جب میرے حواس ٹھکانے آئے تو میرا دل چاہا کہ اس شخص کو قتل کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا اور مضبوط آدمی تھا اور میں صرف چھ سات سال کا بچہ تھا۔ ہم ایک سال سے کچھ کم عرصے اس کے یتیم خانے میں رہے جو درحقیقت ہمارے لیے قید خانہ تھا۔ پھر آنٹی روزا ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں۔ جب مام کا انتقال ہوا تو پولیس نے ڈیڈی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا کچھ پتا نہیں چلا پھر ہمیں یتیم خانے بھیج دیا گیا۔ پولیس نے ہمارے رشتے داروں کی تلاش جاری رکھی تھی اور اس تلاش کے نتیجے میں روزا آنٹی کا پتا چلا۔

روزا آنٹی مام کی دور کی کزن تھیں اور وہ جارجیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ روزا آنٹی کے دو بچے تھے جو بڑے ہو کر گاؤں سے دور چلے گئے تھے۔ بیٹی نے شادی کے بعد نیویارک میں سکونت اختیار کی تھی اور بیٹا کینیڈا کا شہری بن گیا تھا۔ ظاہر ہے روزا آنٹی اور ان کے شوہر پائن انکل اکیلے رہ گئے تھے۔ اس لیے جب پولیس نے ان سے رابطہ کر کے ان کو ہمارے بارے میں بتایا تو وہ بہ خوشی ہماری ذمے داری اٹھانے کو تیار ہو گئے۔

روزا آنٹی مذہبی خیالات رکھنے والی عورت تھیں اور جب نینا کو یہ بات پتا چلی تو اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”ایک

پادری سے جان چھوٹی تو دوسرے پادری کے پاس جا رہے ہیں۔"

میں سہم گیا۔"کیا وہ فادر جوزف کی طرح سخت ہوں گی؟"

"مجھے کیا پتا۔" نینا نے شانے اچکائے۔"لیکن یہ سارے مذہبی لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

میں ڈر گیا تھا کیونکہ فادر جوزف کا تجربہ بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔لیکن ہمیں جانا تھا اور ہم انکار نہیں کر سکتے تھے۔ایک پولیس کار نے ہمیں روزا آنٹی کے فارم ہاؤس تک پہنچایا اور جب میں نے اس کی پہلی جھلک دیکھی تو میں خوش ہو گیا تھا۔اس سے پہلے میں نے صرف تصویروں میں اس قسم کے فارم ہاؤس دیکھے تھے، سچ مچ دیکھنے کا پہلا اتفاق تھا۔جب پولیس کار اس طرف مڑی تو دور سے سرسبز درختوں کی قطار نظر آئی تھی۔ان درختوں کے پاس ایک خوب صورت دو منزلہ مکان تھا جس پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔

"کتنا خوب صورت ہے۔" میں نے نینا سے کہا۔

"ہاں ...ٹھیک ہے۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

لیکن جب پولیس کار مکان کے سامنے رکی تو نینا کار سے اتر کر ہمارے انتظار میں کھڑی روزا آنٹی سے یوں دوڑ کر لپٹ گئی جیسے ان سے نہ جانے کب سے بچھڑی ہوئی ہو حالانکہ ہم پہلی بار ان سے مل رہے تھے۔یہی نہیں نینا سسک سسک کر رونے بھی لگی تھی۔روزا آنٹی اس سے بہت متاثر ہوئی تھیں اور انہوں نے نینا کو خود سے مزید لپٹاتے ہوئے کہا۔"مت رو میری بچی....مجھے معلوم ہے تمہیں اپنی ماں سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہے۔"

یہ سن کر نینا کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔ میں ایک طرف کھڑا ہوا نینا کی اداکاری دیکھ رہا تھا۔صرف مجھے معلوم تھا وہ اداکاری کر رہی ہے۔ورنہ اس کا رونا دھونا ایسا تھا کہ ہمیں چھوڑنے کے لیے آنے والا پولیس افسر بھی متاثر نظر آنے لگا۔اس نے آنٹی روزا سے ایک پیپر پر سائن لیے اور واپس چلا گیا۔نینا اب نارمل تھی اور تجسس سے اس جگہ کا معائنہ کر رہی تھی۔میں نے روزا آنٹی کو ہیلو کہا تو انہوں نے مجھے پیار کیا تھا لیکن ان کے انداز میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو نینا کے لیے تھی۔روزا آنٹی تقریباً پچاس برس کی لیکن صحت مند عورت تھیں۔انہوں نے لمبا اسکرٹ اور ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی اور سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔

روزا آنٹی کا مکان ان کے فارم کے سامنے والے حصے میں تھا۔مکان کے پیچھے بڑا سا فارم تھا اور اس میں ایک جھیل بھی تھی۔جھیل کے پیچھے بڑا سا جنگل تھا۔یہ بھی روزا آنٹی کی ملکیت تھا۔پولیس کار کے واپس جانے کے بعد آنٹی نے ہم سے کہا۔"چلو بچوں سامان اٹھاؤ اور اندر چلو۔"

ہمارے پاس چھوٹے چھوٹے دو ہینڈ بیگ تھے اور اس میں بھی سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ہم اندر آئے تو روزا آنٹی نے سب سے پہلے ہمیں اوپر کی منزل پر ایک کمرا دکھایا جسے انہوں نے بچوں کے لحاظ سے سیٹ کر رکھا تھا۔اس میں دو چھوٹے بیڈ اور دو عدد الماریاں تھیں۔دو کرسیوں والی ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ایک طرف کھلونوں کا ریک رکھا ہوا تھا اور اس میں روزا آنٹی نے پہلے ہی کئی کھلونے لے کر رکھے ہوئے تھے۔انہوں نے کہا۔"نینا اور جونی یہ تمہارا کمرا ہے اگر تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہہ سکتے ہو۔میں تمہاری آنٹی ہوں۔"

"شکریہ آنٹی۔" میں نے کہا۔نینا اس وقت کھلونوں کے پاس موجود تھی۔آنٹی ہمیں کمرے کی چیزوں کے بارے میں بتانے لگیں کہ کون سے چیز کہاں رکھنی ہے اور الماری میں کپڑے کس طرح تہ کر کے رکھنے ہیں، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جوتے اور چپل کہاں رکھنی ہے۔جانے سے پہلے روزا آنٹی نے گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ایک بجے کھانا لگے گا، تم دونوں نیچے آجانا۔تمہاری اپنے انکل سے بھی ملاقات ہوگی۔"

"شکر ہے دفع ہوئی منحوس بڑھیا۔" روزا آنٹی کے جانے کے بعد نینا نے آہستہ سے کہا۔میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم آنٹی کو ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"تم نے دیکھا اس کا انداز ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمیں یہاں بلا کر اس نے کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"احسان تو ہے۔" میں نے کہا۔"تم اتنے اچھے گھر میں آئی ہو تو آنٹی روزا کا احسان ہی ہے۔ورنہ وہ ہمیں رکھنے سے انکار بھی کر سکتی تھیں۔"

نینا نے منہ بنایا۔"تم ہمیشہ دوسروں کے پیچھے رہنا۔"

"اچھا ابھی نیچے رونے کا ڈراما کون کر رہا تھا؟" میں نے طنز کیا۔

وہ بنا کسی شرم کے بولی۔"ہاں ڈراما ہی تو تھا۔اس بڑھیا کو متاثر کر رہی تھی۔تم نے دیکھا نہیں وہ بھی رونے کے

قریب ہوگئی تھی۔"

میں باتوں میں نینا سے نہیں جیت سکتا تھا۔ اس لیے میں نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا باتھ ٹب بھی تھا اور مجھے باتھ ٹب میں نہائے پورا ایک سال ہوگیا تھا۔ اس لیے میں خوش ہوگیا۔ مکان اور اس کی آرائش سے لگ رہا تھا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن بہت دولت مند نہ سہی لیکن اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ مجھے اُمید ہوئی کہ اب ہمیں یتیم خانے کی طرح ترس ترس کر نہیں رہنا پڑے گا۔

ایک بجے میں اور نینا نیچے آئے تو کچن میں کھانے کی میز پر انکل پائن ہمارے منتظر تھے۔ وہ ایک لمبے چوڑے اور ہنس مکھ چہرے والے شخص تھے۔ ان کی عمر آنٹی روزا جتنی یا ان سے کچھ زیادہ تھی لیکن صحت ان کی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کی وجہ بعد میں پتا چلی کہ وہ اپنے فارم ہاؤس پر خود کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک وہ بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرتے تھے اور یہی اُن کی صحت کا راز تھا۔ انکل پائن بھی ہم سے محبت سے ملے انہوں نے مجھ سے کہا۔

"برخوردار ابھی تم ذرا یہاں کے عادی ہو جاؤ پھر میں تمہیں مچھلی اور پرندوں کا شکار کرنا سکھاؤں گا۔"

میں خوش ہوگیا۔ "شکریہ انکل۔"

روزا آنٹی نے بہت مزے کا کھانا بنایا تھا۔ یتیم خانے میں ہمیں بدمزہ اور نپا تلا کھانا ملتا تھا اس وجہ سے میں اور نینا دونوں کمزور تھے۔ لیکن یہاں آ کر ایک ہفتے میں ہماری صحت نکھر آئی تھی۔ آنٹی ہمارے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ رات سونے سے پہلے وہ ہمیں اپنی نگرانی میں دودھ کا گلاس دیتی تھیں۔ میں اور نینا دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ یہاں بھی روزا آنٹی نے ہمیں گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ زندگی میں پہلی بار ہمیں کوئی اچھا اسکول ملا تھا۔ میں یہاں آ کر بہت خوش تھا لیکن نینا اتنی خوش نہیں تھی کیونکہ اسکول سے آنے کے بعد آنٹی روزا اسے کسی نہ کسی کام کے لیے بلا لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نینا گھر کے کام کرنا سیکھے تا کہ مستقبل میں وہ پورا گھر چلانے کے قابل ہوسکے۔ نینا کے بارے میں ایک بات بتانا میں بھول گیا کہ وہ بلا کی کام چور اور کاہل ہے اگر اس کا بس چلے تو وہ سارا دن بستر پر لیٹ کر کامک بک پڑھتی رہے۔ روزا آنٹی کی وجہ سے اسے آرام کرنے کا موقع کم ملتا تھا اس لیے وہ ان سے اور بھی چڑنے لگی تھی۔ رات کو جب ہم اپنے کمرے میں ہوتے اور نینا کو یقین ہو جاتا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن اپنے کمرے میں سو چکے ہیں تو وہ آنٹی کو بری بری گالیاں اور القاب دیتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتی۔ "تم دیکھنا جیسے ہی میں اٹھارہ سال کی ہوں گی اس قید خانے سے بھاگ جاؤں گی۔"

مجھے نینا سے شدید اختلاف تھا۔ ایک تو وہ آنٹی روزا جیسی شفیق عورت کو اتنے برے الفاظ سے نوازتی تھی دوسرے وہ ان کے اتنے اچھے اور پُرسکون گھر کو قید خانہ قرار دے رہی تھی۔ حالانکہ یہ فادر جوزف کے یتیم خانے سے لاکھ درجے بہتر تھا۔ بلکہ ان دونوں کا آپس میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ لیکن میں یہ بات نینا سے نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ وہ میری دشمن بن جاتی اور میں فی الحال اس کی دشمنی مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ یہاں آنے کے بعد میں اپنی زندگی کے بہترین دن گزار رہا تھا۔ نینا میری خوشیوں کو ملیا میٹ کرسکتی تھی۔ پھر بھی میں نے دبی زبان میں کہا۔ "یہ جگہ فادر جوزف کے یتیم خانے سے بہت بہتر ہے۔ یہاں ہمارا کتنا خیال رکھا جاتا ہے۔"

"خیال رکھا جاتا ہے۔" نینا کا چہرہ مارے غصے کے بگڑ گیا تھا۔ "یا ہم سے یہاں بیگار لیا جاتا ہے۔ اس بڑھیا کا بس نہیں چلتا ہے کہ سارا دن مجھ سے گدھوں کی طرح کام لے۔ اس سے اچھے تو ہم یتیم خانے میں تھے۔"

ممکن ہے نینا کے خیالات اس کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہوں لیکن یہاں میں بہت مزے سے تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد میں انکل پائن کے پاس کھیتوں میں چلا جاتا اور ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ وہ مجھے منع کرتے تھے کہ ابھی میں ان کاموں کے لیے چھوٹا تھا، جب میں ذرا بڑا ہو جاؤں گا تو وہ خود مجھے یہ کام سکھائیں گے۔ پھر کھانا کھا کر میں کچھ دیر آرام کرتا تھا اور شام کو انکل پائن مجھے مچھلی کا شکار سکھانے کے لیے جھیل پر لے جاتے تھے جہاں انہوں نے اچھی نسل کی مچھلیاں پال رکھی تھیں۔ اور وہ ان کو مصنوعی غذاؤں کے بجائے جھیل میں اگنے والی قدرتی غذا پر پال رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح مچھلی بہت سستی سے بڑھتی ہے لیکن گوشت لذیذ ہو جاتا ہے۔ مسلسل ایک ہفتے کی کوشش کے بعد میں ایک چھوٹی مچھلی شکار کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس شام آنٹی نے میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کی تھی اور انکل نے مچھلی سمیت میری تصویر لی تھی۔ سب خوش تھے سوائے نینا کے۔

نینا کا خیال تھا کہ آنٹی روزا اور انکل پائن میرے ساتھ خصوصی سلوک کرتے ہیں جب کہ اس کے ساتھ ان کا سلوک

ایسا نہیں ہے۔ مجھے کتے پسند تھے اس لیے انکل پائن نے مجھے ایک چھوٹا بل ٹیرر لا دیا۔ آنٹی روزا کو کتے پسند نہیں تھے اور وہ ان کا گھر میں آنا تو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے میں نے اور انکل پائن نے کتے کے لیے عقبی لان میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا گھر بنا دیا جس میں وہ رہا کرتا تھا۔ وہ اتنا سمجھدار تھا کہ نہ تو گھر میں گھستا تھا اور نہ ہی لان میں گندگی کرتا تھا۔ آنٹی روزا نے ایک سفید رنگ کی بڑے سائز کی بطخ پال رکھی تھی۔ یہ جھیل کے آس پاس رہا کرتی تھی اور مزے سے جھیل میں تیرتی تھی۔ اس وقت تک وہ فارم پر اکیلا جانور تھی لیکن کتا آیا اور گھر کے عقبی لان میں رہنے لگا تو بطخ کو لگا جیسے اس کا حریف آ گیا ہو۔

جب میں کتے کے ساتھ نکلتا تھا تو بطخ صرف گھورتی اور آوازیں نکالتی تھی لیکن اگر کتا اکیلا جھیل کی طرف جا نکلتا تو وہ اسے مارنے کو دوڑتی تھی۔ ایک بار اس نے کتے کی کمر پر ایسی زوردار چونچ ماری کہ وہاں زخم بن گیا تھا اور اس کے بعد کئی دن تک کتا ڈر کے مارے اپنے گھر سے بھی نہیں نکلا تھا۔ کیونکہ بطخ آنٹی کی چہیتی تھی اس لیے میں نے اسے کچھ کہنے سے گریز کیا لیکن مجھے اس پر غصہ بہت تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے چھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ میرے اور نینا کے امتحانات تھے۔ اس لیے دوسری ساری سرگرمیاں چھوڑ کر ہم پڑھنے میں لگے تھے۔ نینا خوش تھی کہ آنٹی اسے کام کے لیے نہیں کہتی تھیں۔ وہ مزے سے اپنے پیپرز کی تیاری کے بعد کامک بک پڑھتی تھی۔ ان دنوں آنٹی ہمارا خصوصی خیال رکھ رہی تھیں۔ انہوں نے انکل پائن کو مکان کے قریب مشینیں چلانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان کے شور سے ہماری پڑھائی متاثر ہو سکتی تھی۔

آنٹی روزا اور انکل پائن مزاج کے لحاظ سے بہت سادہ اور سیدھے لوگ تھے ان کو جدید دور کی تفریحات سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کے گھر میں نہ تو ٹی وی تھا، نہ کوئی میوزک سسٹم اور نہ ہی ان کو سینما جانے کا شوق تھا۔ دیکھا جائے تو ان کے گھر میں ایک بچے کے لیے دل چسپی کے لوازمات نہیں تھے اس کے باوجود مجھے وہاں بہت مزہ آیا تھا۔ البتہ نینا کو ٹی وی اور میوزک سسٹم کی کمی بہت کھلتی تھی۔ انکل پائن اسے جو جیب خرچ دیتے تھے اس سے رقم بچا کر اس نے ایک چھوٹا سا ایف ایم ریڈیو خرید لیا تھا اور رات کو کانوں پر ہیڈ فون چڑھا کر اس سے موسیقی سنتی تھی۔

امتحانات کے بعد ہماری چھٹیاں تھیں اور انکل پائن

سلیم بانو

سلیمہ بانو بیگم، جہانگیر کی سوتیلی ماں تھی۔

شہزادہ سلیم کو اپنے شہنشاہ باپ اکبر سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اسے ولی عہد کے شایانِ شان عزت نہیں بخشی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اکبر اس سے زیادہ اس کے بیٹے ''خرو'' سے پیار کرتا ہے اسے خدشہ تھا کہ اکبر اس کی بجائے خرو کو ولی عہد مقرر کرے گا لہٰذا اس نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اس پر ابوالفضل نے اکبر کو لکھا کہ شہزادہ سلیم کا طرز عمل درست نہیں ہے اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے اور یہ بھی لکھا کہ سختی کے بغیر علاج ممکن نہیں میں شہزادہ سلیم کو پابہ زنجیر شاہی میں پیش کروں گا۔ سلیم (جہانگیر) کو ابوالفضل کے عزائم معلوم ہو گئے تھے اس لیے اس نے بیر سنگھ بندھیلہ کے ذریعے راستے ہی میں ابوالفضل کو قتل کروا دیا۔ (ابوالفضل اکبر کا وفادار وزیر تھا اور اکبر نے ابوالفضل کے مشورے پر ہی حضرت سلیم چشتیؒ کے نسبت سے ہی جہانگیر کا نام سلیم رکھا تھا۔ اکبر کو ابوالفضل کی اچانک موت کا بڑا دکھ ہوا یوں اکبر شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے سخت ناراض ہوا اور خرو کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ان حالات میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی سوتیلی ماں سلیمہ بانو بیگم نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے شہزادہ سلیم کو نہ صرف بچایا بلکہ باپ بیٹے کے درمیان صلح بھی کروائی۔ سلیمہ بانو بیگم نے مریم مکانی حمیدہ بیگم اکبر کی ماں کے ذریعے شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی اکبر سے صلح کروائی لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی یہاں تک کہ اکبر کی وفات تک باپ بیٹے کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ جہانگیر کی اٹھارویں بیوی نور جہاں، جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی مقرب خاص تھی۔

مرسلہ: مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چھٹیوں میں وہ مجھے غلیل سے پرندوں کا شکار کرنا سکھائیں گے۔ اس علاقے میں پرندے بہت تھے، وہ فصلوں اور درخت پر لگنے والے پھلوں کو نقصان پہنچاتے تھے۔ ان کے خاتمے کے لیے مقامی کونسل نے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی کیونکہ رائفلوں اور ایئر گن کی مدد سے کسانوں نے پرندوں کا اتنا شکار کیا کہ ان کی نسلیں مٹ گئی تھیں۔ اس لیے پرندوں کو شکار کرنے کی اجازت تھی لیکن غلیل کی مدد سے، اس طرح پرندوں کا بے دریغ شکار ممکن نہیں تھا اور ان کی تعداد بھی ایک حد میں رہتی۔

انکل کے پاس کئی جدید غلیلیں تھیں جن کی مدد سے پتھر کی گولی بہت طاقت اور درست طریقے سے پھینکی جا سکتی تھی۔ میری گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو میں نے انکل پائن کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ انہوں نے مجھے المونیم کی بنی ایک ہلکی اور طاقت ور غلیل دی۔ اس میں بہت اعلیٰ درجے کا ربر لگا ہوا تھا۔ ایک سات سال کے بچے کے لیے اسے استعمال کرنا بھی آسان تھا۔ انکل پائن نے مجھ سے کہا۔ ”پہلے تم اسے چلانے کی مشق کرو اور نشانہ درست کرو۔“

انکل نے باغ میں نشانے کے لیے مصنوعی پرندے ڈوریوں سے باندھ کر درختوں سے لٹکا دیئے۔ وہ ہوا میں جھولتے تھے اور میں غلیل کی مدد سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ کئی دن کی مشق کے بعد میرا نشانہ بہتر ہو گیا تھا۔ تب میں نے انکل سے جنگل میں جا کر پرندے شکار کرنے کی اجازت مانگی۔ انکل پائن نے کہا۔ ”اصل چیز شکار نہیں ہے بلکہ یہ جاننا ہے کہ کن پرندوں کو شکار کرنا ہے اور کن کو نہیں کرنا۔“

انکل پائن کے پاس اس علاقے میں پائے جانے والے تمام پرندوں کی ایک البم تھی انہوں نے مجھے ان پرندوں کی تصویریں دکھائیں جن کے شکار کی ان دنوں اجازت تھی اور پھر ان پرندوں کے بارے میں بتایا جن کے شکار پر پابندی تھی۔ پھر انہوں نے میرا امتحان لیا اور مجھے دوبارہ البم دکھا کر پوچھا کہ کن پرندوں کا شکار کرنا ہے اور کن کا نہیں کرنا ہے۔ میں نے تقریباً سو فیصد درست جواب دیا تھا۔ انکل خوش ہو گئے اور انہوں نے مجھے جنگل میں جا کر شکار کرنے کی اجازت دے دی۔

”تم جنگل کی حد میں رہو گے اس سے آگے مت جانا کیونکہ تم اس علاقے سے واقف نہیں ہو۔ یہ سیٹی اپنے پاس رکھو۔“ انہوں نے ایک وسل میرے گلے میں ڈال دی۔ ”اگر تم کو کوئی چوٹ لگ جائے یا تمہیں کسی معاملے میں مدد کی ضرورت ہو تو یہ سیٹی بجا دینا میں آجاؤں گا۔“

میں دوپہر کو گھر سے نکلا کیونکہ اس وقت سورج سر پر ہوتا ہے اور درختوں پر بیٹھے پرندے صاف نظر آتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آج جب میں واپس آؤں گا میرے پاس موجود نیٹ کے تھیلے میں کئی پرندے ہوں گے۔ انکل پائن نے مجھے سلیٹی رنگ کی کانچ کی گولیاں دی تھیں۔ یہ وزنی ہونے کی وجہ سے شکار کو بہت قوت سے لگتی تھیں اور صحیح جگہ لگ جاتی تو ایک ہی گولی کافی ہوتی۔ میرے پاس ایسی کوئی دو درجن گولیاں تھیں۔ انکل نے کہا تھا کہ میں مارنے کے بعد گولی بھی واپس حاصل کروں کیونکہ یہ خاصی مہنگی ملتی ہیں۔ جنگل میں بے شمار درخت تھے اور ہر درخت پر بے شمار پرندے تھے۔

میں نے ان کو نشانہ بنانے کی کوشش شروع کی لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ میں ایک پرندے کو بھی نشانہ نہیں بنا پایا تھا۔ شاید پرندے جان گئے تھے کہ غلیل لے کر آنے والا ان کی تاک میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ پہلے ہی میری طرف سے ہوشیار ہو جاتے تھے اور جیسے ہی میں ان کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا وہ اڑ جاتے تھے۔ میں کئی گھنٹے تک یہ مشق کر کے تھک گیا۔ ایک بھی پرندہ میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔ ساری گولیاں بنا نشانے کے جا رہی تھیں۔ اس دوران میں کوئی ایک درجن گولیاں بھی گنوا بیٹھا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ شام ہونے کو تھی اور مجھے تھکن کے ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔

میں جھیل والے راستے سے واپس آ رہا تھا کہ میری نظر آنٹی روزا کی بطخ پر پڑی جو بڑی شان سے دھوپ میں اپنے پر پھیلا کر ان کو خشک کر رہی تھی۔ مجھے غصہ آیا ہوا تھا اور پھر مجھے بطخ کا کتے پر حملہ بھی یاد آ گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر غلیل میں گولی رکھی اور اسے کھینچ کر بطخ کو دے مارا۔ میرا ارادہ اس کے جسم کو نشانہ بنانے کا تھا تا کہ اسے بھی ایسی تکلیف ہو جیسی کتے کو ہوئی تھی۔ مگر گولی اس کے سر پر جا لگی۔ بطخ نے ہلکی سی آواز نکالی اور گر گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اچانک حملے کی وجہ سے گری ہے اور ابھی پر ہلاتی ہوئی اٹھ جائے گی۔ اس کے بعد مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑے گا، غصے میں وہ بہت خطرناک ہو جاتی تھی۔ میں اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا اور وہ ایسے ہی پڑی تھی گرنے کے بعد وہ ذرا بھی نہیں ہلی تھی۔

پہلی بار مجھے فکر ہوئی اور میں ڈرتے ڈرتے بطخ کے پاس گیا۔ وہ زمین پر بالکل ساکت پڑی تھی اور اس کی چونچ

کھلی ہوئی تھی اور اس کی چونچ کے سوراخوں سے خون نکل کر جم رہا تھا۔ میں کانپ گیا۔ مجھے لگا بطخ مر چکی ہے۔ میں نے اسے پاؤں سے ہلایا لیکن وہ پھر بھی ساکت رہی۔ اب مجھے پسینے آنے لگے تھے میں نے آنٹی روزا کی چہیتی بطخ کا خاتمہ کر دیا۔ میں نے آس پاس دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ تب مجھے درختوں کے درمیان کھڑی نینا دکھائی دی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑی تھی اور یقیناً اس نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ مسکرائی اور پھر مڑ کر مکان کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے گولی تلاش کر کے اپنی جیب میں رکھی جس سے بطخ ماری گئی تھی اور پھر بطخ کا بھاری جسم جھیل میں دھکیل دیا۔ تاکہ ایسا لگے کہ اسے جھیل میں کچھ ہوا تھا اور وہ مر گئی۔

پھر میں ڈرتے ڈرتے مکان کی طرف آیا۔ مجھے خوف تھا کہ نینا نے آنٹی روزا کو بتا نہ دیا ہو۔ لیکن آنٹی روزا معمول کے مطابق کچن میں کام کر رہی تھیں۔ نینا اوپر گئی ہوئی تھی۔ میری بھوک مر گئی تھی اس لیے آنٹی روزا کی طرف سے سینڈوچز کی پیش کش مسترد کر کے اوپر آ گیا تھا۔ نینا مزے سے لیٹی کامک بک پڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ آنٹی اور انکل پائن کو شام تک معلوم ہو گیا تھا کہ بطخ جھیل میں مردہ حالت میں تیر رہی ہے۔ انہوں نے اسے نکال کر ایک جگہ دفن کر دیا۔ آنٹی روزا کچھ افسردہ لگی تھیں لیکن انہوں نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں تھا اور اگلے روز جیسے سب نارمل تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس شام کو انکل پائن ہم سب کو لے کر ماہانہ شاپنگ پر نکلے تھے۔ گاؤں سے ذرا دور ہائی وے پر ایک بہت بڑا اسٹور تھا جہاں سے ضرورت کا تمام سامان مل جاتا تھا۔ میں اور نینا بھی اپنے جیب خرچ سے چیزیں لیتے تھے۔ نینا کامک بک خریدتی تھی اور مجھے ایروپلین لینے کا شوق تھا۔ جیسے ہی ہم اسٹور پہنچے نینا نے میرا بازو پکڑا اور بلند آواز سے بولی۔ ''جونی تم نے کامک بک لینے کو کہا تھا آج میں تمہیں کامک بک دلواتی ہوں۔''

''لیکن جونی کو تو کامک بک پسند نہیں ہے۔'' آنٹی روزا نے حیرت سے کہا۔

''پسند ہے آنٹی اس نے خود مجھ سے کہا ہے۔'' نینا نے آنٹی روزا کو جواب دیا اور آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ''بطخ یاد رکھنا۔''

اس کے بعد میں نینا کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ اس نے اپنے جیب خرچ سے کامک بک خریدیں اور اس کے بعد میرے سارے جیب خرچ سے بھی اپنی پسندیدہ کامک بکس لے لیں۔ میں چوں بھی نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اندر سے مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی نینا نے کئی بار میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا لیکن آج اس نے حد کر دی تھی۔ پچھلی بار میں نے اسٹور میں کھلونوں کے شعبے میں ایک طیارہ دیکھا اور اسے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ خاصا مہنگا تھا اور اس کے لیے میں نے سارے مہینے بچت کی تھی اور جب میں طیارہ لینے آیا تو نینا نے بلیک میل کر کے میری ساری بچت ہتھیا لی تھی۔ واپسی میں وہ خوشی سے گنگنا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔

اس روز میں نے نینا سے بات نہیں کی اور نہ ہی اسے گڈ نائٹ کہا لیکن اسے پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی کامک بکس میں کھوئی رہی تھی۔ وہ کامک بھی اپنی شخصیت کی طرح پسند کرتی تھی۔ یہ ایک برا کردار کاپر مین تھا جو جس چیز کو چھوتا اسے کاپر زنگ سے بھر دیتا تھا اگرچہ وہ بہت سارے کارنامے بھی انجام دیتا تھا۔ لیکن وہ منفی کریکٹر تھا اور اس وجہ سے نینا کو پسند تھا۔

چھٹیوں میں آنٹی روزا نینا کو کوئی نہ کوئی ذمے داری سونپ دیتی تھیں جسے اس کو انجام دینا پڑتا تھا۔ آج کل اسے روز دوپہر کے کھانے کے بعد برتن دھونا اور کچن صاف کرنا پڑتا تھا جب کہ اس کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ وہ فوراً کمرے میں جائے اور کھڑکی سے آتی دھوپ میں لیٹ کر کامک بک پڑھے۔ اسے آدھے پون گھنٹے کی ذمے داری بھی کھلتی تھی حالانکہ اسے سوائے چند معمولی سے کاموں کے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا جب کہ یتیم خانے میں اپنے برتن سے لے کر کپڑے تک اسے خود دھونے پڑتے تھے۔ وہاں وہ چوں چرا کیے بغیر سارے کام کرتی تھی اور یہاں اسے اتنی آسائشیں تھیں اس کے باوجود وہ معمولی کام کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس روز میں صبح شکار پر گیا اور میں نے دو پرندے بھی مارے تھے۔ میں ان کو لے کر آنٹی روزا کے پاس آیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ انہیں رات کے کھانے میں استعمال کریں گی۔ ان کا سوپ بہت لذیذ بنتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ آنٹی روزا نے میز پر کھانا لگا دیا اور سب آ گئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور کھانے کے بعد آنٹی روزا نے اپنا ایپرن اتارتے ہوئے کہا۔ ''نینا چلو برتن دھو کر کچن صاف کرو۔''

''آنٹی آج جونی نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ برتن دھو کر کچن صاف کرے گا۔''

آنٹی روزا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ’’کیا واقعی جونی؟‘‘

’’بالکل آنٹی۔‘‘ نینا نے خاص انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھمکی نمایاں تھی کہ میں نے اس کی بات سے انکار کیا تو وہ آنٹی روزا کو بتا دے گی کہ ان کی چہیتی بطخ کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ اس نے بنا بولے صرف ہونٹوں سے بطخ بھی کہا تھا۔ میں انکار نہیں کر سکتا تھا مجبوراً میں نے کہا۔ ’’جی آنٹی آج میں برتن دھو کر کچن صاف کروں گا۔‘‘

نینا مسکراتی ہوئی اوپر چلی گئی اور میں اس کی جگہ برتن دھونے لگا۔ مجھے کام کرنے میں کوئی عار نہ تھا بلکہ مجھے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن نینا مجھ سے جو سلوک کر رہی تھی اس نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پرانے زمانے کا غلام ہو جس سے اس کا آقا اپنی مرضی سے مشقت لے رہا تھا۔ میں نے برتن دھو کر کچن بھی صاف کیا۔ میں اوپر آیا تو نینا کو مزے کرتے دیکھ کر سلگ اٹھا اور میں نے اس سے کہا۔ ’’تم میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہی ہو۔‘‘

اس نے شرارت سے میری طرف دیکھا۔ ’’تم نے بڑا اچھا کیا تھا ایک معصوم بطخ کو بلاوجہ ہلاک کر کے۔‘‘

اس کی آواز خاصی بلند تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ’’پلیز آہستہ بولو آنٹی روزا نے سن لیا تو...‘‘

’’یہی تو میں تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اگر ان کو پتا چل گیا تو تم سوچ سکتے ہو ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔ شاید وہ تمہیں واپس یتیم خانے بھیج دیں۔‘‘

یہ خیال بڑا ہی لرزہ خیز تھا۔ میں کسی صورت اس گھر کو چھوڑ کر یتیم خانے میں نہیں جانا چاہتا تھا جہاں سے میری ایک بھی اچھی یاد وابستہ نہیں تھی۔ نینا غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اس نے سر ہلایا۔ ’’میں آنٹی سے نہیں کہوں گی اگر تم میری یہ چھوٹی موٹی باتیں مانتے رہو۔‘‘

’’مجھے تمہاری بات ماننے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اس طرح بلیک میل کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔‘‘

نینا ہنسی۔ ’’اوکے میں تمہیں بلیک میل نہیں کروں گی لیکن جب میں تم سے کچھ کرنے کو کہوں تو شرافت سے مان جایا کرو تاکہ مجھے دھمکی دینا ہی نہ پڑے۔‘‘

میں نے بے دلی سے سر ہلایا۔ میں اسے جانتا تھا اگر میں نے اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کیا تو وہ بلا تکلف آنٹی روزا کو بطخ کی ہلاکت کے واقعے سے آگاہ کر دے گی اور اسے ذرا بھی پروا نہیں ہوگی کہ اس شکایت کے نتیجے میں اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ نینا مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ میں بہت کمزور تھا اور اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ آنٹی کو اصل حقیقت کا پتا چل گیا تو مجھے واپس یتیم خانے میں بھیج دیا جائے گا۔

پھر اسکول کھل گئے اور اس دوران میں کئی بار نینا نے اسی طرح مجھے بلیک میل کر کے اپنا مطلب پورا کیا۔ ہم بڑی کلاس میں آ گئے تھے اس لیے اب ہمیں زیادہ دیر اسکول میں رکنا پڑتا تھا اور گھر میں بھی اسکول کا خاصا کام کرنا پڑتا تھا اس لیے پرندوں اور مچھلی کے شکار کی تفریح صرف اتوار کے دن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دوپہر کے بعد میں اور انکل پائن شکار پر جاتے تھے جب کہ نینا آنٹی روزا کا ہاتھ بٹاتی تھی کیونکہ اتوار کی رات وہ ذرا خصوصی اہتمام کرتی تھیں اور اس سلسلے میں انہیں نینا کی مدد درکار ہوتی تھی۔ نینا اس پر بہت چڑتی تھی۔

’’بڑھیا میرے آنے سے پہلے بھی تو اتوار کا ڈنر بناتی تھی۔‘‘

’’اس وقت وہ دو افراد تھے۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’اب ہم چار افراد ہیں، آنٹی کو یقیناً مدد کی ضرورت ہے۔‘‘

اس نے مجھے گھورا اور زہریلے لہجے میں بولی۔ ’’تو صرف میری شامت کیوں آتی ہے تم مزے کرتے ہو۔‘‘

’’میں ناشتے کے بعد زمین کی صفائی میں انکل پائن کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔‘‘ میں نے اسے یاد دلایا۔

مگر نینا قائل ہونے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی اس کا خیال تھا اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ آنے والے اتوار کو دوپہر کے بعد میں اور انکل پائن تیار ہو کر شکار پر جانے لگے تو نینا نے کہا۔ ’’جونی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آج یہ آنٹی کا ہاتھ بٹائے گا اور اس کی جگہ میں شکار پر جاؤں گی کیوں جونی کیا تھا نا وعدہ؟‘‘

میرے اندر غصہ ابھرنے لگا تھا اور شاید میں انکار کر دیتا لیکن جب میں نے نینا کی طرف دیکھا تو اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ میرے انکار کی منتظر ہے اور فوراً آنٹی روزا کو میری شکایت لگا دے گی۔ میرا غصہ سرد پڑ گیا اور میں نے سر ہلا دیا۔ ’’ہاں میں نے وعدہ کیا تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے آج نینا جائے گی۔‘‘ انکل پائن نے خوش دلی سے کہا۔

’’اور جونی میرے ساتھ کام کرے گا۔‘‘ آنٹی بولیں۔ ’’جونی آج میں ٹرکی میں چاول اور سبزی بھر کر بنانے جا رہی

ہوں۔تم نے اتنی مزے کی چیز آج تک نہیں کھائی ہوگی۔‘‘
نینا اور انکل پائن چلے گئے۔ میں آنٹی روزا کا ہاتھ بٹانے لگا۔کام کے دوران وہ مجھے بائبل کے اکتساب سنانے لگیں۔فارغ اوقات میں ان کا مشغلہ بائبل پڑھنا تھا اور وہ جب موقع ملتا ہمیں اس کا کوئی نہ کوئی حصہ سناتی تھیں۔فادر جوزف کے یتیم خانے میں رہنے کی وجہ سے ہمیں مذہب سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھیں لیکن یہاں آنے کے بعد آنٹی نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ ہم مذہب کی طرف توجہ دیں۔وہ ہمیں ہر اتوار کو چرچ لے جاتی تھیں اور رات کے کھانے سے پہلے ہمیں بائبل کا کچھ حصہ ضرور سناتی تھیں۔ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہمیں مذہبی اخلاقیات کے بارے میں بتائیں۔اس شام انہوں نے مجھے کچھ آیات سنائیں جو جھوٹ بولنے اور اپنی خطاؤں سے توبہ کرنے کے بارے میں تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خاص طور سے سنا رہی تھیں اور میں ڈر گیا کہ کہیں ان کو معلوم تو نہیں ہوگیا کہ ان کی بطخ کو میں نے ہی مارا تھا۔

لیکن انہوں نے سوائے آیات سنانے کے اور کوئی ایسی بات نہیں کی بلکہ مجھے کھانا بنانا سکھانے لگیں۔’’جونی سیکھ لو زندگی میں کبھی ایسا موقع آیا کہ جب اپنا بنایا ہوا کھانا پڑے تو تمہیں پچھتاوا نہیں ہوگا۔‘‘

’’تو آپ مجھے سکھا دیں۔‘‘

’’میں سکھاؤں گی۔‘‘ انہوں نے کہا اور مجھے سبزی کاٹنے کو دی اور اس کا طریقہ بھی سکھایا کہ کس طرح کاٹنی ہو گی۔میں نے ان کو سبزی کاٹ کر دی تو وہ خوش ہو گئیں۔’’واہ تم نے تو اتنی باریک اور اچھے طریقے سے کاٹی ہے،ایسی تو کبھی نینا نے بھی نہیں کاٹی ہے۔‘‘

میں جانتا تھا نینا کوئی کام بھی دل لگا کر نہیں کرتی ہے بلکہ وہ جان چھڑاتی تھی۔آنٹی روزا نے چاول اور سبزیاں ابالیں اور ان کو ٹرکی کے خالی پیٹ میں بھر کر اسے اوون میں رکھ دیا۔اب اسے کوئی پون گھنٹے پکنا تھا۔اس دوران میں آنٹی ساسز تیار کرنے لگیں۔وہ کھانے پینے کی ساری چیزیں خود بناتی تھیں۔اچار چٹنیاں اور مربے بھی خود تیار کرتی تھیں جو اسٹور سے آرام سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔اس روز انہوں نے مجھے کئی چیزیں تیار کرنا سکھائیں اور ان کی سکھائی ڈشز بعد میں میرے بہت کام آئی تھیں۔شام گئے انکل پائن اور نینا آئے۔نینا خوش نہیں تھی کیونکہ اسے کوشش کے باوجود کوئی مچھلی نہیں ملی تھی لیکن میں خوش تھا میری شام آنٹی روزا کے ساتھ اچھی گزری تھی۔

وہ دونوں نہانے دھونے چلے گئے۔انکل دو بڑی مچھلیاں لائے تھے جنہیں آنٹی نے اگلے روز کے کھانے کے لیے فریج میں رکھ دیا تھا۔میں اوپر آیا تو نینا نہانے کے بعد بال خشک کر رہی تھی۔اسے دیکھ کر میرا خوش گوار موڈ غارت ہو گیا تھا اور مجھے پھر سے غصہ آنے لگا۔میں نے اس سے کہا۔’’اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔‘‘

’’تب میں آنٹی کو بتا دوں گی کہ ان کی بطخ کیسے مری تھی۔‘‘اس نے اطمینان سے کہا۔

’’بے شک تم بتا دو۔‘‘

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔’’تمہیں خوف نہیں ہے آنٹی تمہیں واپس فادر جوزف کے یتیم خانے بھیج دیں گی۔‘‘

’’بے شک وہ واپس بھیج دیں۔‘‘میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

نینا مسکرائی۔’’ابھی تم غصے میں ہو اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ویسے میں آج بور ہوئی۔مچھلی کا شکار بہت بور کام ہے آیندہ میں کبھی مچھلی کے شکار پر نہیں جاؤں گی۔‘‘

میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ جہنم میں جائے۔لیکن میں نہیں کہہ سکا بس اتنا کہا۔’’میں اب ہرگز ہرگز تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔‘‘

رات کا کھانا اتنا اچھا تھا کہ انکل پائن نے بھی تعریف کی۔آنٹی روزا نے کہا۔’’میرا خیال ہے اس کا کریڈٹ جونی کو بھی جاتا ہے اس نے بہت دل لگا کر کام کیا تھا۔‘‘

’’جونی جو کام کرتا ہے بہت محنت سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔‘‘انکل پائن نے آنٹی کی تائید کی۔

نینا یہ سب سن سن کر جل رہی تھی جب اس سے برداشت نہیں ہو سکا تو وہ بول اٹھی۔’’ہاں بہت اچھا کام کرتا ہے۔بلکہ بعض اوقات تو ایسے کام کر جاتا ہے کہ آپ دونوں کو پتا چلے تو حیران رہ جائیں۔‘‘

میرا نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔انکل اور آنٹی نے بیک وقت نینا کی طرف دیکھا۔

’’کیا مطلب؟‘‘آنٹی روزا نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

’’جونی کوئی کام چھپا کر نہیں کرتا ہے۔‘‘ انکل بھی بولے۔

’’کرتا ہے۔‘‘نینا تیز لہجے میں بولی۔ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے وہ ابھی میرا بھانڈا پھوڑ دے گی۔لیکن اس کے

بجائے وہ کرسی سے اٹھی اور پاؤں پٹختی اوپر کی طرف چلی گئی۔ کھانے کی میز پر چند لمحے پہلے جو خوش گوار ماحول تھا وہ ختم ہوگیا اور پھر سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نینا آنٹی کے ساتھ برتن دھلواتی تھی لیکن اس رات وہ نہیں تھی اس لیے میں نے آنٹی کے ساتھ برتن دھلوائے حالانکہ انہوں نے منع کیا تھا لیکن میں نہیں مانا۔ میں ایک طرح سے نینا کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ انکل پائن سارا دن کام کرنے کے بعد گھر میں بنائی بیئر سے شغل کرتے تھے ۔ یہ ان کی واحد تفریح تھی۔ آنٹی ان کے پاس بیٹھ کر ستاروں بھرا آسمان دیکھتی تھیں۔

ہمارے لیے اصول تھا کہ ہمیں رات نو بجے تک لازمی سونے کے لیے بستر پر چلے جانا ہے۔ اس لیے میں اور نینا بستر پر چلے جاتے تھے۔ میں سو جاتا لیکن نینا رات گئے تک کامک پڑھتی یا ریڈیو سنتی تھی۔ میری آنکھ کھلتی تو وہ مجھے جاگتی نظر آتی اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ دیر تک سوتی تھی اور اکثر ناشتے پر سب سے آخر میں آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ نہیں آتی تو آنٹی روزا اس کا ناشتا نکال کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ دیر سے آتی اس کا دل کرتا تو ناشتا کر لیتی اور دل نہیں کرتا تو یہ ناشتا ڈسٹ بن کی نذر کر دیتی تھی۔ آنٹی روزا کو خوراک اس طرح ضائع کرنا سخت ناپسند تھا لیکن وہ نینا کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے صرف اتنا کہا تھا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ دنیا میں کتنے لوگوں کو پورے دن کھانے کو کچھ نہیں ملتا ہے تو تم بھی خوراک کو اس طرح ضائع نہ کرو۔''

اس پر نینا سارا دن آنٹی روزا کو برا بھلا کہتی رہی تھی۔ اس رات میں اوپر گیا تو نینا کا موڈ انتہائی خراب تھا اس نے مجھے دیکھا اور پھٹ پڑی۔ ''ان بڈھے بڑھیا کو ساری خوبیاں بس تم میں نظر آتی ہیں۔''

میں سہم گیا۔ ''لیکن میں تو نہیں کہتا تھا کہ وہ میری تعریف کریں۔''

وہ کچھ دیر زہریلی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''تم کسی غلط فہمی میں مت رہنا انہوں نے تمہیں عارضی طور پر رکھا ہے اور جب تم ان کے پاس بیگار کر کر کے پریشان ہو جاؤ گے تو یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔''

''نینا یہ بہت اچھے لوگ ہیں پلیز ان کے بارے میں ایسی باتیں مت کرو۔'' میں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہ کروں۔'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''انہوں نے میرے لیے کیا کیا ہے؟''

''انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ہمیں اچھی خوراک اور لباس دیتے ہیں۔ اسکول میں داخل کرایا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ لوگ دیتے ہیں۔''

''مجھے اس سے زیادہ چاہیے۔'' وہ چلا کر بولی۔

''پلیز آہستہ بولو۔'' میں نے سہم کر کہا۔ ''انہوں نے سن لیا تو ہمیں واپس فادر جوزف کے یتیم خانے بھیج دیں گے۔''

''بھیج دیں۔'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہاں صرف تم مزے نہیں کر سکتے اگر میرے ساتھ ایسا سلوک ہوا تو میں فادر جوزف کے پاس واپس چلی جاؤں گی اور تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔''

''میں نہیں جاؤں گا۔'' میں رونے لگا تھا۔ ''میں وہاں اب نہیں جاؤں گا میں مر جاؤں گا۔''

مجھے روتے دیکھ کر نینا کھل کھلا کر ہنس دی تھی۔ ''تم جاؤ گے میرے ساتھ۔''

''نہیں جاؤں گا آنٹی روزا اور انکل پائن مجھے کبھی یہاں سے نہیں نکالیں گے۔''

''نکالیں گے۔'' وہ چڑانے کے انداز میں میرے منہ کے آگے انگلی نچاتے ہوئے بولی۔ ''جب میں ان کو بتاؤں گی کہ آنٹی روزا کی پیاری بطخ کو تم نے مارا تھا۔''

میرا دم رک گیا تھا۔ ''تم ایسا نہیں کرو گی۔''

''میں ایسا ہی کروں گی ۔'' وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ''بس انتظار کرو کچھ دن بعد ہم واپس وہیں ہوں گے۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نینا اس طرح کیوں کر رہی تھی اسے اس جگہ کیا تکلیف تھی۔ انکل پائن اور آنٹی روزا ہمارا ہر ممکن خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی ہمیں جھڑکا بھی نہیں تھا۔ ہماری ہر ضرورت اس طرح پوری کرتے تھے جیسے ہم ان کے اپنے بچے ہوں۔ اگر نینا کو اپنی بعض بری عادتوں کی وجہ سے ان سے تکلیف تھی تو اس میں ان کا قصور تو نہیں تھا۔ وہ اگر نینا پر کوئی ذمے داری ڈالتے تھے تو اس کا مقصد بھی اس کی بہتری تھا۔ مجھے وہ جو کام کہتے تھے میں دل و جان سے کرتا تھا اس لیے وہ میری تعریف بھی کرتے تھے۔ اگر نینا ایسا کرتی تو وہ اس کی تعریف بھی کرتے۔ میں نے نینا کی طرف دیکھا۔ مجھے پریشان کر کے وہ مزے سے ریڈیو سنتے ہوئے کامک بک پڑھ رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس چڑیل کو قتل کر دوں جو مجھے پھر سے اس جہنم میں جھونکنا چاہتی تھی۔

میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور پھر میری سمجھ

میں ایک ہی بات آئی کہ میں خود آنٹی روزا کو سب بتا کر ان سے معافی طلب کرلوں ممکن ہے وہ مجھے معاف کردیں۔اس کا امکان بھی تھا کہ وہ مجھے معاف نہ کریں اور اس بات پر مجھے اور نینا کو واپس فادر جوزف کے یتیم خانے جانا پڑے لیکن اس طرح میرے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا۔میں روز روز نینا کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا تھا اور ذہنی کرب سے گزرتا تھا اس سے تو نجات مل جاتی۔ میں اٹھ کر نیچے آیا۔آنٹی روزا اور انکل پائن حسب معمول برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔انکل نے مجھے دیکھ کر فکر مندی سے کہا۔"کیا بات ہے بیٹے تم سوئے نہیں تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

ان کے محبت بھرے لہجے پر میرا دل بھر آیا تھا اور میں نے سر ہلایا۔"جی انکل میں ٹھیک ہوں.....مجھے آنٹی سے کچھ بات کرنی ہے۔"

آنٹی روزا نے میری طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئیں۔"جونی میرے ساتھ آؤ ہم ذرا چہل قدمی کر کے آتے ہیں۔"

وہ مجھے الگ میں بات کرنے کے لیے لے جا رہی تھیں۔ہم ٹہلتے ہوئے سامنے والے لان کی باڑھ تک چلے آئے۔انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔"کہو جونی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے اٹک اٹک کر آنٹی روزا کو ساری بات بتا دی کہ کس طرح میں شکار سے واپس آ رہا تھا اور میں نے بطخ کو غلیل سے گولی ماری تھی اور وہ مرگئی۔"میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا اس نے کتے کو زخم دیا تھا تو میں اسے زخم دینا چاہتا تھا لیکن گولی اس کے سر پر لگی اور وہ مرگئی۔ میں نے اس بات کو چھپانے کے لیے اسے جھیل میں ڈال دیا۔"

یہ سب بتانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ بالکل پُرسکون تھیں پھر انہوں نے کہا۔"میں جانتی ہوں میرے بچے میں نے اوپر کھڑکی سے سب اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔"

میں حیران ہوا تھا۔"آپ نے دیکھا تھا اور آپ نے مجھے کچھ کہا نہیں؟"

"ہاں کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اس سے کہیں زیادہ محبت کرتی ہوں جتنا میں بطخ سے کرتی تھی۔اس لیے میں نے تمہیں معاف کر دیا اگرچہ تم نے مجھ سے معافی نہیں مانگی تھی۔"

"نینا مجھے بلیک میل کرتی رہی ہے۔"

"میں یہ بھی جانتی ہوں۔"

میں پھر حیران ہوا تھا۔"آنٹی آپ سب جانتی تھیں تو آپ نے مجھے کچھ کہا کیوں نہیں....اور نینا کو منع کیوں نہیں کیا؟"

"کیونکہ میں دیکھنا چاہتی تھی تم اس کی غلامی کہاں تک برداشت کرتے ہو۔وہ تمہاری ایک غلطی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہارا استحصال کر رہی تھی۔میں نے جب کھڑکی سے تمہیں دیکھا تھا تب سے میں منتظر تھی کہ تم مجھ سے معافی چاہو گے۔حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی معاف کر چکی تھی۔تم نادانستگی میں نینا کے اشاروں پر چل رہے تھے۔حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔تم نے خود پر بلاوجہ کا بوجھ لاد لیا تھا۔تم ایک بار میرے پاس آ جاتے تو میں تمہیں اس بوجھ سے پہلے ہی آزاد کر دیتی۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور جب یقین آیا تو تو میں آنٹی سے لپٹ گیا۔انہوں نے شفقت سے کہا۔"میرے بچے ٹھیک اسی طرح شیطان انسان کو استعمال کرتا ہے وہ اس کی کمزوری اور کوتاہیوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے۔حالانکہ خدا منتظر ہے کہ اس کا بندہ اس کی طرف آئے اور وہ اسے بتائے کہ اس نے جو خطا کی تھی وہ خدا پہلے ہی معاف کر چکا ہے کیونکہ وہ انسان سے محبت کرتا ہے اس کی خطا سے نہیں۔"

اس بات کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ میں آج ایک کامیاب انسان ہوں اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک اچھی جاب پر کام کر رہا ہوں۔میری بیوی اور تین بچے ہیں۔ میں نے ایک بیٹے کا نام انکل پائن کے نام پر اور ایک بیٹی کا نام آنٹی روزا کے نام پر رکھا ہے۔میری ایک بیٹی اور بھی ہے اور میں نے اس کا نام نینا کے نام پر رکھا ہے۔نینا جو صرف سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گئی تھی۔اس کے بعد دوبارا سے پولیس نے گھر پہنچایا۔آخری بار میں نے اسے بیس سال پہلے دیکھا تھا اس نے بھی ماں کی طرح نشہ شروع کر دیا تھا۔

جب آنٹی روزا نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا تھا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں بالکل اسی طرح خدا بھی انسانوں کو بہت زیادہ معاف کرتا ہے۔تو میں نے نینا کو دل سے معاف کر دیا اور آج بھی اس کا منتظر ہوں کہ وہ واپس آئے تو میں اسے بتاؤں کہ میں اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے نہیں بلکہ اس سے محبت کرتا ہوں۔وہ ایک بار آئے تو سہی۔

آغوشِ طوفان

کاشف زبیر

۱۹۸۰ء میں امریکا کے مشرقی ساحلوں پر تباہی مچانے والے زبردست طوفان کا ماجرا

موت کتنی بھیانک حقیقت ہے، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کے قریب سے گزرے ہوں۔ اس صدی کے دوسرے طاقتور ترین سمندری طوفان میں پھنسنے والے چار افراد کا قصہ۔ وہ زندگی اور موت کی آنکھ مچولی میں "طوفان کی آنکھ" تک پہنچ گئے تھے مگر خوش قسمتی سے زندہ بچ گئے جب کہ اسی طوفان نے ساحلوں پر موجود تقریباً پونے تین سو افراد کی جان لے لی۔

باب ہاروے نے ہاتھ بڑھا کر شارٹ ویو ریڈیو بند کردیا اور مختصر سے کیبن سے باہر نکل آیا۔ اس نے سر اٹھا کر صاف و شفاف آسمان کی طرف دیکھا اور پھر پُرسکون سمندر کا معائنہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سکون زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گا۔ ابھی وہ ماہی گیروں کے لیے موسمی خبرنامہ سن رہا تھا۔ جس میں خبردار کیا گیا تھا کہ بحراوقیانوس کے وسط سے اٹھنے والا سمندری طوفان اب جمیکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بحری جہازوں، ماہی گیر ٹرالرز اور تفریحی کشتیوں کو فوری طور پر اس علاقے سے نکلنے اور نزدیکی بندرگاہ میں پناہ لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ہاروے ہلکورے لیتی کشتی کے عرشے پر قدم جماتا چار فٹ اونچے کاک پٹ تک پہنچا۔ کشتی کو یہیں سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ وہاں اسٹیرنگ وہیل پر کشتی کا کپتان بیری گیٹل مین موجود تھا۔

"ہاروے، موسم کی کیا رپورٹ ہے؟" اس نے ہاروے کو دیکھتے ہی کہا۔

"حالات اچھے نظر نہیں آرہے ہیں۔" ہاروے مختصر سے کاک پٹ میں گھس آیا "ہری کین ہماری طرف آرہا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ ہمیں کہیں پناہ لینے کی مہلت بھی نہیں

مل گی۔"

"گڈ گاڈ۔" کھڑکی سے جھانکتے مائیک منرو کے منہ سے نکلا۔ وہ کشتی کے چار مسافروں میں سب سے کم عمر تھا۔ یعنی صرف چھتیس سال کا۔ سب سے عمر رسیدہ سینتالیس سالہ ہاروے تھا مگر اپنی مضبوط جسامت اور سیاہ بالوں کے ساتھ وہ دس سال کم کا لگتا تھا۔ چوتھا میتھیو تھا جو منرو کا تقریباً ہم عمر تھا۔ طوفان کی آمد کا سن کر وہ سب کاک پٹ کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ ۵ اگست ۱۹۸۰ء کو انہیں سفر کرتے یہ دوسرا ہفتہ تھا۔

○☆○

باب ہاروے دوسروں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر ایک طویل اور مہم جوئی سے بھرپور سمندری سفر کی خواہش ہمیشہ سے اس کے سینے میں مچلتی رہی تھی۔ خوش قسمتی سے گیٹل مین، مائیک اور میتھیو بھی اس کے ہم خیال نکلے۔ انہوں نے مل کر ایک طویل سمندری سفر کا پروگرام بنایا۔ اُن کا ارادہ جنوبی افریقہ جانے کا تھا۔ راستے میں وہ جزائر کریبیئن اور جنوبی امریکا کے مختلف علاقوں کی سیر بھی کرتے۔ اب ان کی ضرورت ایک مضبوط اور اچھی کشتی تھی۔ جو ذرا کم قیمت بھی ہو۔

مزید خوش قسمتی کہ ان ہی دنوں پرنسس فروخت ہو رہی تھی۔ مضبوط لکڑی اور دھات کی بنی یہ کشتی تقریباً تیس سال پرانی تھی مگر باقاعدگی سے دیکھ بھال اور وقفے وقفے سے اوور ہالنگ کے باعث یہ ہنوز قابلِ استعمال تھی۔ آخری مالک نے اس میں نیوی گیشن کے جدید آلات اور دو نئے ڈیزل انجن لگوائے تھے۔ ظاہری حالت سے قطع نظر پرنسس کی حالت کسی بھی جدید کشتی سے کم نہیں تھی۔ چاروں دوستوں نے اڑتالیس فٹ لمبی اور اٹھارہ فٹ چوڑی کشتی فوراً خریدی۔ انہوں نے ضروری نقشے، چارٹ اور سامان کے ساتھ کلیئرنس حاصل کی۔ کشتی کا معائنہ کرایا اور فوری طور پر سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ سفر ڈیڑھ دو مہینے پر محیط تھا۔

ہیری گیٹل مین کو کیوں کہ اس سے پہلے بھی کشتی رانی کا خاصا تجربہ رہا تھا۔ لہٰذا سب نے متفقہ طور پر اسے کپتان نامزد کردیا۔ ہاروے ریڈیو مین اور نیوی گیٹر تھا۔ جب کہ منرو اور میتھیو ملاح تھے۔ حیثیتوں سے قطع نظر وہ چاروں یکساں طور پر پرنسس کے مالک تھے۔ جوشِ سفر میں وہ ایک چیز کو نظر انداز کر گئے تھے کہ موسم گرما ہمیشہ سے بحر اوقیانوس میں بلا خیز سمندری طوفان کا زمانہ ہوتا ہے۔ جنہیں عرفِ عام میں ہری کین کہا جاتا ہے اور اب ایسا ہی ایک طوفان ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ریاست فلوریڈا کے مغربی ساحل سے پرنسس کی روانگی ہوئی۔ یہ کی ویسٹ کی بندرگاہ تھی۔ وہ فلوریڈا کے ساحل کے ساتھ سفر کرتے ہوئے خلیج میکسیکو سے کریبیئن کے سمندر میں نکل آئے۔ عمر رسیدہ پرنسس نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور وہ پرسکون لہروں پر کشتی رانی سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہوتے رہے۔ بہاماس اور برمودا کے مشہورِ زمانہ جزائر کے قریب سے یہ خیر و عافیت گزر کر انہوں نے پہلا قیام برطانوی نو آبادی بیلیز میں کیا۔ یہاں انہوں نے تازہ پانی اور خوراک کا ذخیرہ لیا اور ساتھ ہی پرنسس کے اندرونی حصے پر مہانگنی کا بیش قیمت کام کروایا۔

بیلیز سے روانگی کے وقت انہیں جنوبی اوقیانوس کے وسطی حصے میں اٹھنے والے طاقت ور ہری کین سے خبردار کیا گیا اور اب تک کے سفر میں انہوں نے اس طوفان پر کڑی نگاہ رکھی تھی مگر بد قسمتی سے جمیکا سے آگے نکلنے کے بعد ان کا شارٹ ویو ریڈیو خراب ہو گیا۔ مائیک نے دعویٰ کیا کہ وہ اسے چند گھنٹوں میں ٹھیک کردے گا لیکن یہ چند گھنٹے پھیل کر پورے ایک دن پر محیط ہو گئے اور جب ریڈیو ٹھیک ہوا تو یہ جان کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ اب ہری کین ان سے کچھ ہی دور تھا اور جمیکا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب کہ وہ طوفان اور جمیکا کے عین درمیان میں تھے۔

"ہمیں اپنی تیز ترین رفتار سے جمیکا تک پہنچنا ہوگا۔" گیٹل مین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور فوری طور پر پرنسس کو واپسی کے لیے موڑ لیا۔ اگر وہ شمالی جمیکا تک پہنچ جاتے تو کسی پناہ گاہ کے بغیر بھی ہری کین کی وحشت سے کسی قدر محفوظ رہتے مگر اب وقت نہ ہونے کے برابر تھا اور چاروں دوست محسوس کر رہے تھے کہ جنوبی جمیکا کی کسی بندرگاہ تک پہنچ جائیں تو ان کے لیے غنیمت ہے۔ ہوا موافق تھی اور انہوں نے کشتی کے انجن بھی چلا دیے تھے۔ انہوں نے ہر چیز کو رسّوں سے باندھ دیا یا خانوں میں بند کر دیا۔

عین اس وقت جب وہ جمیکا کے ساحل سے کچھ میل کے فاصلے پر تھے تو ہری کین نے انہیں آلیا۔ پہلے صاف شفاف آسمان پر سیاہ بدلیاں نمودار ہوئیں۔ ہوا کا دباؤ ہر لمحے تیز ہوتا گیا اور سمندری لہروں کا تلاطم بڑھنے لگا۔ ہاروے نے چیخ کر کہا۔

"بادبان اُتار دو۔"

پرنسس کے دو مرکزی مستول تھے۔ جن کے سہارے چھ بڑے کینوس والے بادبان لگے تھے۔ منرو اور میتھیو ہر ممکن پھرتی سے بادبان اتارنے لگے۔ بادبان اترتے ہی کشتی کی رفتار دم توڑ گئی۔ صرف انجن کے سہارے آگے بڑھنا سات

ہزار پاؤنڈ وزنی پرنس کے لیے کارِ محال تھا۔ لہریں اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں اور وہ ہلکے پھلکے کارک کی طرح سطحِ آب پر ڈول رہی تھی۔ انہیں دور سے جمیکا کے پتھریلے ساحل کی جھلک نظر آرہی تھی۔ کپتان گیٹل مین دوربین سنبھالے... چٹانوں کے درمیان اس راستے کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا جو جمیکا کی بندرگاہ پورٹ انٹونیو کا دروازہ تھا مگر موسلا دھار بارش اور بُری طرح ڈولتی کشتی اس کی کوشش کو ناکام بنائے دے رہی تھی۔ جنوبی جمیکا پر یہ واحد بندرگاہ تھی جو انہیں اس طوفان میں پناہ دے سکتی تھی مگر بارش، کہر اور اچھلتے پانی نے کچھ دیکھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ لہریں پچیس فٹ تک بلند تھیں۔ جھاگ اڑاتا پانی جیسے ابل رہا تھا۔ گیٹل مین نے کشتی کو ساحل کے نسبتاً قریب لے جانے کا فیصلہ کیا۔

"کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" منرو نے چیخ کر کہا "ساحل کے قریب جانا خودکشی ہوگی۔ یہاں جگہ جگہ زیرِ آب چٹانیں پوشیدہ ہیں۔"

"مگر ہم کھلے سمندر میں طوفان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔" گیٹل مین نے کہا۔

"مانک صحیح کہہ رہا ہے۔" ہاروے نے کہا "ساحل کے قریب جانا بہت خطرناک ہوگا۔ اگر پرنس کسی زیرِ آب چٹان سے ٹکرا گئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔"

ان تینوں کی مخالفت نے گیٹل مین کو بے بس کردیا۔ اس نے کشتی کا رخ واپس کھلے سمندر کی طرف موڑ لیا۔ یہ ایک اندھا فیصلہ تھا۔ جلد ہی طوفان پوری شدت سے ان پر حملہ آور ہونے والا تھا اور اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا کہ پرنس اس کا مقابلہ کرسکے گی۔ چاروں نے حفاظتی اقدام کے طور پر لائف جیکٹس پہن لی تھیں اور کشتی پہ موجود واحد لائف بوٹ کو عرشے پر رکھ دیا تھا پھر انہوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور پانی پی لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ طوفان کے دوران انہیں کھانے پینے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔

جمیکا سے بیس میل کے فاصلے پر ان کی ملاقات ہری کین کے کنارے سے ہوگئی۔ تند ہوا پوری شدت سے پرنس پر چڑھ دوڑی اور جیسے اس کے ٹکڑے کرنے کے درپے ہوگئی۔ ہوا کی رفتار پہلے نوے، پھر سو اور پھر ایک سو بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی تجاوز کرگئی۔ گیٹل مین کو اسٹیئرنگ وہیل سے باقاعدہ کشتی لڑنا پڑ رہی تھی۔ لہریں چالیس فٹ سے زیادہ بلند ہوکر کشتی پر آن گرتیں۔ اس کا نچلا کمرا اور کاک پٹ پانی سے بھر جاتا۔ ہاروے منرو اور میتھیو پانی باہر نکالنے میں مصروف تھے۔ گیٹل مین کی کوشش تھی کہ کشتی کو لہروں کے سامنے رکھے اب جب بھی کوئی لہر بلند ہوتی تو کشتی بھی اسی کے ساتھ اوپر جاتی پھر لہر کے نشیب میں اس کا سفر شروع ہوجاتا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے کسی تفریحی رولر کوسٹر میں سفر کررہے ہوں۔ پرنس بالکل کسی رولر کوسٹر کی طرح اوپر نیچے ہورہی تھی۔ بس ایک ہی فرق تھا کہ وہ تفریح پر نہیں تھے۔ بلکہ ایک بلاخیز سمندری طوفان میں پھنس کر زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہربار کشتی جب بلند ہوکر واپس نیچے گرتی تو ان کے دل اچھل کر حلق میں آجاتے۔ ہربار کشتی پہلے کی نسبت کچھ زیادہ بلندی سے گرتی۔ معاً عرشے کا ایک تختہ اس اٹھا پٹخ کی تاب نہ لاکر ٹوٹ گیا اور ہوا اسے اُڑا لے گئی۔ خوش قسمتی سے اس کے نیچے اور ایک تختہ موجود تھا۔ ورنہ پانی فوراً ہی کشتی کے انجن تک پہنچ جاتا۔

جدوجہد کے دوران انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ طوفان شام چھ بجے ان پر حملہ آور ہوا تھا اور اب آدھی رات تھی۔ سیاہ بادلوں سے تاریک آسمان پر رہ رہ کر بجلیاں کڑکتیں، بارش کے قطرے بندوق کے چھرّوں کی طرح ان پر برستے اور بے تاب موجیں انہیں اپنے جبڑے میں دبوچ کر زیرِ آب لے جانے کی کوشش کرتیں۔ تھکن سے ان چاروں کا برا حال تھا مگر انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ رکے تو کشتی لمحوں میں، پانی بھرنے سے ڈوب جائے گی۔ خوش قسمتی سے سکشن پمپ ابھی تک ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

ساڑھے بارہ بجے ہوا کی رفتار ایک سو ستّر میل فی گھنٹے تک جا پہنچی اور موجیں اب ساٹھ فٹ تک اٹھ رہی تھیں۔ پرنس کھلونے کی طرح لہروں کے نشیب و فراز پر ڈول رہی تھی۔ قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ وہ گزشتہ سات گھنٹے سے طوفان کا مقابلہ کررہی تھی اور اب تک اس میں کوئی سنگین نوعیت کی خرابی یا ٹوٹ پھوٹ واقع نہیں ہوئی تھی گیٹل مین کی تمام تر کوشش تھی کہ کشتی طوفان کی سیدھ میں رہے۔ اگر وہ ذرا سی بھی دائیں بائیں ہوتی تو ہوا اور طوفانی لہریں مل کر اسے ڈبو دیتیں مگر ایک موقع پر اسٹیئرنگ وہیل اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اوپر سے آتی لہر نے کشتی کو ذرا سا گھمایا اور فوراً ہی پرنس پر چڑھ کر پہلو کے بل پانی میں جاگری۔ اس کا نصف حصہ پانی کے اندر تھا۔ ہاروے، منرو اور میتھیو لڑھک کر اندرونی کیبن میں جاگرے۔ وہ سنبھل کر اٹھے اور کشتی کو سیدھا کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے مگر ایک تین ٹن وزنی کشتی کو سیدھا کرنا آسان نہیں تھا۔ جبکہ طوفان اسے غرق کردینے کے درپے بھی تھا۔

آخرکار ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد وہ پرنس کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر کشتی ہوابند نوعیت کی

نہ ہوتی تو یقیناً اس دفعہ ڈوب ہی جاتی۔ جیسے ہی کشتی سیدھی ہوئی گیٹل مین نے پھر سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ منرو اٹھ کر اس تک پہنچا۔

"بیری' کیا تم سے اب کشتی سنبھالی نہیں جا رہی؟" اس نے چلّا کر کہا۔

گیٹل مین وہیل سے زور آزمائی کرتے ہوئے مسکرایا "نوپ۔ میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اوکے' اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔"

وہ واپس اندرونی کیبن میں پلٹ آیا۔ وہاں ہاروے اور میتھیو میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ میتھیو کہہ رہا تھا۔

"ہم ریڈیو پر مدد کا پیغام بھیج سکتے ہیں۔"

"بیکار ہوگا۔" ہاروے نے مایوسی سے سر ہلایا "اوّل تو اس علاقے میں کوئی جہاز ہوگا ہی نہیں۔ اگر ہوا بھی تو ہماری کیا مدد کرے گا' اسے تو خود مدد کی ضرورت ہوگی۔ فرض کرو کہ جس کسی بڑے جہاز نے ہمارا پیغام سن بھی لیا تو وہ ہماری مدد کیسے کر سکے گا۔ وہ ہمیں تلاش کیسے کرے گا؟"

منرو نے ہاروے کی تائید کی "ریڈیو پر مدد کے لیے چلّانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔" میتھیو نے اصرار کیا "ممکن ہے کوئی ہوائی جہاز ہمارا پیغام سن لے۔"

ہاروے پھیکے انداز میں مسکرایا "اس طوفان میں کوئی جہاز اڑنے کی جرأت کرے گا اور اگر کرے بھی تو وہ ہماری کیا مدد کرے گا؟ نہیں دوستو... ہم نے جو کرنا ہے خود کرنا ہے۔ اپنی لڑائی خود لڑنی ہے۔"

بدھ کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ ہوا بدستور پونے دو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی اور دیو قامت لہریں کسی پہاڑ کی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ تاریکی' وسیع و عریض سمندر میں تنہائی' تھکن اور سب سے بڑھ کر مایوسی نے ان کے اعصاب متاثر کرنا شروع کر دیے۔ دو بجے پرنسس ایک بار پھر ہوا اور موجوں کی زد میں آکر پہلو کے بل پانی میں گر گئی۔ وہ پھر سے اسے سیدھا کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ انہوں نے پہلے فالتو اور بھاری سامان سمندر میں پھینک کر کشتی کا وزن کم کیا اور پھر اٹھے ہوئے پہلو پر دباؤ ڈال کر اسے سیدھا کر دیا۔ جیسے ہی پرنسس سیدھی ہوئی۔ پانی کی ایک دیو قامت لہر نے اسے اچھال دیا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ گیٹل مین کے ہاتھ سے نہ صرف اسٹیئرنگ وہیل نکل گیا بلکہ وہ اچھل کر کاک پٹ سے باہر عرشے پر آن گرا۔ اسی وقت پانی کا ایک بڑا ریلا کشتی پر سے گزرا اور کپتان اس کی رو میں کسی حقیر تنکے کی طرف سمندر کی طرح بہنے لگا۔ عین اس وقت جب وہ کشتی سے گرنے والا تھا اس نے دیوانہ وار ہاتھ چلائے اور معاً ایک رسّا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ اس کا نصف دھڑ کشتی کے باہر لٹکا ہوا تھا۔ لہریں اسے لپکنے کے لیے بے قرار تھیں اور طوفانی ہوا اسے سمندر میں پھینک دینے کے لیے بے تاب' اس کڑے وقت میں زندگی و موت کے درمیان حائل معمولی سا فرق رہ گیا تھا جو گیٹل مین کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رسے پر گرفت قائم رکھنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ رسّا اب چھوٹا یا تب چھوٹا۔ اگر رسّا اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تو لائف جیکٹ بھی اسے نہیں بچا سکتی تھی۔ لہریں پٹخ پٹخ کر اس کی ہڈیاں توڑ دیتیں۔

ہاروے اور منرو نے گیٹل مین کو قلابازی کھا کر کشتی کے پچھلے حصے کی طرف جاتے دیکھا۔ ان کے دل دھک سے رہ گئے۔ وہ باہر نکلے تو خود کو اپنے کپتان سے محرومی پر تیار کر چکے تھے مگر گیٹل مین انہیں کشتی کے نچلے حصے میں لہروں اور ہواؤں سے لڑتا نظر آیا۔ وہ بہ مشکل خود کو سمندر میں گرنے سے بچائے ہوئے تھا مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہ جدوجہد جاری نہیں رکھ سکے گا۔ ہاروے اور منرو رسّی لے کر محتاط انداز میں اس کی طرف بڑھے۔ برتی موجیں اور تیز ہوا کے جھکڑ ان کے قدم بھی اکھاڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ آخر کار وہ گیٹل مین تک پہنچے اور اسے واپس کشتی میں کھینچ لیا۔ اور پھر کاک پٹ میں لے آئے۔ گیٹل مین کا برا حال تھا مگر وہ اندر آتے ہی ان دونوں سے لپٹ گیا۔

"اگر تم چند سیکنڈ اور نہ آتے تو رسّا میرے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔"

اس کے انداز میں ممنونیت تھی مگر یہ ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔ اس نے فوراً اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا اور کشتی کو طوفان کے رخ پر رکھنے کی کوشش میں لگ گیا۔ شدید جھٹکوں نے پرنسس کا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا تھا۔ اس کے اندرونی خانوں میں پانی بھر گیا تھا اور وہ کسی قدر دائیں طرف جھک گئی تھی۔ یہ پانی عرشے کے تختے ڈھیلے ہونے سے اندر سرایت کر گیا تھا۔ اب تو سکشن پمپ بھی اندر گھس آنے والے پانی کو نکالنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اندرونی کیبن میں پانی کی سطح بڑھتی جا رہی تھی۔

معاً میتھیو چلّا اٹھا "وہ دیکھو۔" وہ کیبن کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

ہاروے اور منرو بھی لپکے۔ انہوں نے ایک خوف ناک منظر دیکھا۔ ایک بہت بڑا ٹورنیڈو (گھومتا ہوا بگولا) کشتی کے

عقب سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ سطح سمندر سے شروع ہو کر آسمان پر بادلوں سے جا ملا تھا۔ اس کے گھومنے سے پانی فوارے کی طرح چاروں طرف برس رہا تھا۔ وہ کسی دیو ہیکل مینار کی طرح کشتی پر چڑھائی کرنے والا تھا۔

"اف میرے خدا۔" ہاروے خوف زدہ ہو گیا "اس کی رفتار کم سے کم دو سو میل فی گھنٹا ہے اور اگر ہم اس کی زد میں آ گئے تو...."

ہاروے کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس کے خدشات عملی شکل اختیار کر گئے۔ تقریباً سو فٹ قطر کے ٹورینڈو نے تیس ٹن وزنی پرنسس کو کسی ہلکے پھلکے گلاب کی طرح سطح آب سے اچک لیا۔ اب کشتی ہوا کے دوش پر تھی۔ وہ گھومتے ہوئے اڑ رہی تھی۔

"ہم اڑ رہے ہیں۔" کاک پٹ میں موجود گیسٹل مین اس افتاد پر بدحواس ہو کر چیخا "میرے خدا' ہم سچ مچ اڑ رہے ہیں۔" اس کی نگاہ پچاس فٹ نیچے موجود سمندر پر جمی ہوئی تھی۔

اگلے لمحے ٹورینڈو نے پرنسس کو واپس سمندر پر پٹخ دیا۔ وہ تقریباً ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے پانی سے ٹکرائی۔ دھچکے کی شدت سے میتھیو پوری قوت سے کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہاروے اور منرو ہینڈل تھامے ہونے کی وجہ سے بچ گئے مگر اس تصادم نے ان کا جوڑ جوڑ ہلا مارا۔ اس دھچکے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور پرنسس کے کئی حصے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ فوراً ہی موجیں پوری شدت سے اس پر چڑھ دوڑیں اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کشتی چند لمحے کی مہمان ہو۔ ہاروے لڑکھڑاتا ہوا بہ مشکل ریڈیو تک پہنچا اور اس کے مائک میں چلّانے لگا "مے ڈے' مے ڈے۔"

ایک تند لہر نے کشتی کا دایاں حصہ پانی میں ڈبو دیا۔ اندر بھی پانی تیزی سے بھر رہا تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ انہیں جلد یا بدیر پرنسس کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ میتھیو بہ مشکل کیبن سے باہر نکلا۔ اس نے تاریک آسمان کے پس منظر میں چاروں طرف سمندر پر نگاہ دوڑائی۔ ممکن تھا کہ کوئی جہاز یہاں موجود ہوتا اور وہ انہیں بچا لیتا مگر چمکتی بجلی اور ابلتے سفید جھاگ دار پانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہنگامی ضرورت کے سامان میں ان کے پاس تیز روشنی کے فلیئرز (پھلجھڑی) اور ان کو چلانے والا لانچر تھا۔ میتھیو نے آٹھ انچ لمبا اور سگار کی طرح کا فلیئر لانچر میں ڈال کر اسے آسمان کی طرف فائر کر دیا۔

یہ فلیئرز تقریباً پانچ سو فٹ کی بلندی پر جا کر پھٹ جاتے تھے اور ان کی تیز روشنی دس سیکنڈ تک تقریباً بیس میل تک صاف نظر آتی تھی۔ خاص طور سے تاریک رات میں۔ فلیئر اوپر جا کر پھٹا اور سارا ماحول کچھ دیر کے لیے تیز نارنجی روشنی میں نہا گیا مگر چند سیکنڈ بعد وہی گھور تاریکی تھی۔ بارش کے قطرے تند ہوا کے ساتھ کنکر کی طرح میتھیو کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ طوفان کی شدت سے لگ رہا تھا کہ جیسے یہ ہمیشہ سے... یونہی جاری ہے۔ پانی اور ہوا دونوں سفید اور جھاگ دار ہو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد پرنسس از خود سیدھی ہو گئی مگر وہ کسی قدر گہرائی میں چلی گئی تھی اور یہ گہرائی ہر گزرتے لمحے بڑھ رہی تھی۔ یہ خطرہ تھا کہ اس پر کوئی بڑی لہر آن پڑی تو اسے واپس سطح سمندر پر ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ گیسٹل مین اسٹیئرنگ وہیل کو لاک کر کے ان کے پاس کیبن میں آ گیا۔ باہر طوفان کے شور میں وہ چاروں عجیب سا سکوت محسوس کر رہے تھے۔ آخر گیسٹل مین بولا۔

"ہمیں پرنسس کو چھوڑنا پڑے گا۔"

"آثار لگ رہے ہیں کہ کشتی کسی وقت بھی ڈوب جائے گی۔" منرو نے کہا۔

اگلے ایک منٹ میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ کشتی چھوڑ دیں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ ہاروے اور منرو نے ہنگامی حالات کے لیے رکھے سامان کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ طوفان نے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ میتھیو باہر نکلا۔ کشتی کے عقبی حصے میں فائبر گلاس کا ایک بھاری باکس رسی سے بندھا رکھا تھا۔ اس میں ربر کی کشتی موجود تھی۔ رسی کھولنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور رسی کاٹنے لگا۔ معاً ایک لہر اس سے آ کر ٹکرائی اور وہ خود باکس سے جا ٹکرایا۔ فوراً ہی اسے اپنے سینے کے نچلے حصے میں تیز ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔

"شاید کوئی پسلی ٹوٹ گئی ہے۔" اس نے درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے سوچا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی خنجر سے کاٹ رہا ہو۔ جیسے تیسے اس نے رسی کاٹی۔ باکس کھول کر تہ کی ہوئی کشتی نکالی۔ اس کا ہک اپنی بیلٹ سے باندھا اور گیس سلنڈر کا فیتا کھینچ لیا۔ مختصر سا پیکٹ چشم زدن میں ایک بڑی سی کشتی میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی تین تہیں تھیں۔ المونیم' نائیلون اور پھر ربر۔ یہ بہت زیادہ دباؤ برداشت کر سکتی تھی اور آسانی سے پنکچر نہیں ہوتی تھی۔ میتھیو نے اسے برابر والی طرف سے پانی میں ڈال دیا۔ کشتی ابھی ایک باریک فولادی تار کی مدد سے پرنسس سے منسلک تھی۔ میتھیو کے لیے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا مگر اس نے اپنے ساتھیوں کا انتظار کیا۔ سب سے پہلے

ہاروے نمودار ہوا۔ اس نے ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے منرو پانی کے کین سے بھرا تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔

"جلدی کرو۔ وقت کم ہے۔" گیٹل مین چلّایا۔ ہاروے پہلے کشتی میں کودا۔ منرو نے اپنا تھیلا اسے تھمایا اور پھر کیبن میں چلا گیا۔ گیٹل مین نے چیخ کر اسے آواز دی۔

"میرا انتظار مت کرو۔" وہ جواباً چلّایا "میں ابھی آرہا ہوں۔"

گیٹل مین دیکھ رہا تھا کہ اب ان کے پاس ہچکچانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس نے پہلے میتھیو کو کشتی میں اتارا اور پھر خود بھی کود گیا۔ پرنسس کا عرشہ سطح سمندر کے متوازی ہوگیا تھا اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ آخری ہچکی لے کر اپنے سفرِ آخرت پر سمندر کی تہ کی جانب روانہ ہوجائے۔ چند لمحے بعد منرو نمودار ہوا۔ بپھرتے ہوئے سمندر نے پرنسس اور ربر کی کشتی کے درمیان آخری تعلق کو بھی توڑ دیا اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ منرو نے پرنسس پر دستیاب سب سے بلند جگہ چڑھ کر سمندر میں چھلانگ لگادی مگر وہ کشتی سے خاصا دور گرا۔ لہریں اسے بہا کر مزید دور لے جانے لگیں۔

ہاروے دیکھ رہا تھا کہ منرو سخت مشکل میں تھا۔ اس نے ایک رسی اپنی بیلٹ سے باندھ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اور منرو ایک دوسرے کی طرف بڑھنے کی سرتوڑ جدوجہد کررہے تھے جو آخر کار رنگ لائی۔ جیسے ہی ہاروے نے منرو کو پکڑا اس کے ساتھیوں نے رسی کھینچ کر انہیں واپس کشتی پر سوار کرالیا۔ تقریباً چھ فٹ قطر کی ربر کشتی کی ساخت ایسی تھی کہ وہ الٹ نہیں سکتی تھی مگر اس کی دیواریں اتنی نیچی تھیں کہ معمولی سے جھٹکے سے ان میں سے کوئی سمندر میں گر سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو رسیوں کی مدد سے کشتی میں لگے ہکز سے باندھ لیا مگر اب ان کی جدوجہد کا نیا مرحلہ شروع ہوگیا۔ ہر لہر کے ساتھ پانی کشتی میں بھر جاتا۔ اس سے بچنے کے لیے انہوں نے مضبوط پلاسٹک کا بنا ایک خیمہ نکالا اور خاصی جدوجہد کے بعد اسے کشتی پر لگانے میں کامیاب ہوگئے۔ خیمہ چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھا۔ صرف ہوا آنے کے لیے سائیڈ پر ننھے ننھے سوراخ تھے۔ جن سے پانی اندر نہیں آسکتا تھا۔

یوں انہیں پانی نکالنے کی مشقت سے نجات مل گئی۔ اسی کشمکش میں پرنسس ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ نامعلوم ڈوب گئی تھی یا لہریں اسے کہیں اور بہالے گئی تھیں۔ انہیں اس مصیبت میں گرفتار ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے مگر طوفان کی شدت میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوئی تھی۔ بلکہ ہلکی پھلکی کشتی میں تو اس کی شدت پہلے سے کئی گنا زیادہ لگ رہی تھی۔ بپھری ہوئی لہریں پہلے کشتی کو پچاس فٹ تک اوپر اٹھاتیں اور پھر پٹخ دیتیں۔ بوجھ سے وہ پانی میں کئی فٹ کی گہرائی میں جا اترتی۔ ایسے وقت وہ خود کو کسی آبدوز کا مسافر محسوس کرتے۔ ان کے چاروں طرف اور اوپر نیچے پانی ہوتا۔ ان کا خیمہ ہوا کو کشید کرنا بند کردیتا اور وہ آدھے منٹ کے لیے سانس روکنے پر مجبور ہوجاتے پھر کشتی میں بھری گیس اسے سطح آب پر اچھال دیتی۔ ہوا اسے پھرکی کی طرح گھماتی اور کسی لہر پر سوار کردیتی۔

یہ کھیل نہ جانے کتنی دیر جاری رہا۔ معاً انہیں محسوس ہوا کہ جیسے لہریں تھک رہی ہوں۔ ان کی شدت اور تندی میں کمی آرہی ہو۔ ہوا کا زور بھی پہلے کے مقابلے میں ٹوٹ گیا تھا پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سمندر اور فضا پُرسکون ہوگئی اور کشتی جیسے کسی پُرسکون جھیل میں تیرنے لگی۔ میتھیو نے زپ ہٹا کر خیمہ کھولا اور باہر جھانکا جہاں تک اس کی نظر کام کررہی تھی آسمان بالکل صاف تھا۔ ستارے معمول سے زیادہ چمک رہے تھے۔

"طوفان اتنی جلدی رک گیا۔" ہاروے بڑبڑایا۔

میتھیو نے مڑ کر دیکھا "دوستو...؟" اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "طوفان ٹلا نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس کے عین درمیان میں ہیں۔ یعنی ہم طوفان کی آنکھ میں ہیں۔"

بحر اوقیانوس میں اٹھنے والے طوفان کے مرکز کو طوفان کی آنکھ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر اوپر سے دیکھا جائے تو یہ حصہ بالکل انسانی آنکھ نظر آتا ہے۔ اس کے کنارے تو نہایت سرگرم ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو یہاں تین سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے ہوا گردش کرتی ہے مگر اس کا مرکزی حصہ بالکل پُرسکون ہوتا ہے۔ یہاں فضا میں اتنا سکوت اور سمندر میں اس غضب کا ٹھہراؤ ہوتا ہے کہ کسی ناواقف شخص کو اٹھا کر یہاں پہنچا دیا جائے تو اسے ہرگز اندازہ نہیں ہوگا کہ وہ ایک بھونچال صفت طوفان کے مرکز میں ہے۔

وہ بھی جانتے تھے کہ یہ مہلت عارضی ہے۔ جلد ہی انہیں طوفان کے دوسرے نصف حصے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنے زادِ راہ کا معائنہ کیا۔ سامان میں چھ عدد دس دس اونس کے پانی کے کین تھے۔ دو عدد کینڈی بار کے ڈبے' ایک فلیئرز لانچر اور آٹھ عدد فلیئرز' فلیش لائٹ اور کچھ رسیاں اور چاقو وغیرہ تھے۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی کشتی کے پیندے سے پانی نکالا۔ خیمے میں کھل جانے والے حصوں کو اچھی طرح بند کیا اور پھر طوفان کا انتظار کرنے لگے۔ جو انہیں زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔ پہلے لہروں کی ہلکی سی گرج سنائی دی اور ہوا کے تند جھونکے

کشتی سے ٹکرائے۔ آفت ایک بار پھر ان پر پوری قوت سے ٹوٹ پڑی تھی۔ لہروں کی اونچائی ہر لمحے بڑھنے لگی اور وہ ان کی کشتی سے کسی بال کی طرح کھیلنے لگیں۔ ناقابلِ یقین طور پر اس دفعہ لہروں کی اونچائی اور ہوا کی رفتار انہیں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ طوفان کا زیادہ سرگرم حصہ تھا۔ پانی کشتی کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ وہ خیمے کے اندر اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ ہر بار ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہ میں پہنچ جائیں گے مگر پھر گویا کسی معجزے کے تحت ان کی کشتی واپس سطحِ آب پر آجاتی۔ انہیں آنے والی ہر سانس غنیمت لگ رہی تھی۔

نہ معلوم وہ کب تک لڑھکتے رہے اور جھٹکے برداشت کرتے رہے۔ تھکن نے ان کے ذہنوں کو شل کر دیا تھا اور وہ سب نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے۔ اس کیفیت میں انہوں نے ایک بار پھر طوفان کا زور ٹوٹتے محسوس کیا اور آخر کار ان کی کشتی ساکت ہو گئی۔ بھیانک شور کے بعد یہ سکوت بھی کچھ کم وحشت ناک نہیں تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ سب اٹھ بیٹھے۔ ہری کین جسے ایلن کا نام دیا گیا تھا۔ آخر کار گزر گیا۔ وہ زندہ تھے مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ وہ قطعی ناواقف تھے کہ وہ اس وقت اوقیانوس کے کس حصے میں تھے۔ صرف ایک اندازہ تھا کہ ہری کین جنوب مشرق سے شمال مغرب کی سمت حرکت کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ انہیں کریبیئن سی کے کسی حصے میں لے آیا ہوگا۔ یہ جگہ عام سمندری راستوں سے خاصی ہٹ کر تھی اور گیٹل مین کے اندازے کے مطابق کسی بھی جزیرے سے کم از کم چالیس میل دور بھی۔ سب سے خوف ناک بات یہ تھی کہ ابھی پرنسس کو مزید کئی ہفتے سمندر میں گزارنا تھے اور اس عرصے میں کوئی بھی کی ویسٹ میں ان کی گمشدگی محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی انہیں تلاش کر رہا ہوگا۔ ہاروے کو اب افسوس ہو رہا تھا کہ کاش وہ منرو کی بات مان کر طوفان سے پہلے امداد کا پیغام دے دیتا تو اس وقت ان کی تلاش شروع ہو چکی ہوتی۔ اگرچہ وسیع و عریض سمندر میں تلاش گھاس میں سُوئی تلاش کرنے کے مترادف تھی مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہتر ہی ہوتا ہے۔

ویسے تو چاروں کی حالت خراب تھی۔ ہری کین نے انہیں بے حال کر دیا تھا مگر میتھیو کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ اس کی ٹوٹی پسلی میں رہ رہ کر درد کے گولے اٹھ رہے تھے اور وہ تڑپ کر رہ جاتا۔ ان کے پاس کچھ پین کلر تھیں جو انہوں نے میتھیو کو کھلا دیں مگر درد کی شدت میں کوئی خاص کمی نہ آئی۔ وہ ایک کونے میں گٹھری سا بنا ہوا تھا۔ گیٹل مین مسلسل بھیگنے سے بخار میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی مسلسل کھارا پانی جو اس کے حلق سے اتر تا رہا تھا۔ اب معدے میں درد پیدا کر رہا تھا۔ منرو کو خون آلود الٹیاں ہوئی تھیں۔ جو اس بات کی نشانی تھی کہ اس کا پرانا السر ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ صرف ہاروے کسی قدر بہتر حالت میں تھا اور وہی اپنے ساتھیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

رات کی تاریکی نے اپنے پر پھیلا دیے تھے۔ وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے مگر لہروں کا مسلسل خیمے سے اندر چھلکتا نہایت سرد پانی ان کی کوشش کے آڑے آ رہا تھا۔ ہوا بھی بے حد خنک تھی اور ان کے کپڑے ابھی تک بھیگے ہوئے تھے۔ سوائے منرو کے سب ہی بخار میں مبتلا تھے۔ سردی سے بچنے کا انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ ایک دوسرے سے لپٹ کر لیٹ گئے۔ ان کے جسموں کی مشترکہ حرارت نے سردی کے احساس کو کسی قدر زائل کر دیا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے انہوں نے کینڈی بار کا ایک ڈبّا آپس میں بانٹ کر کھایا اور ایک کین کا پانی پیا۔ پانی کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا تھا اور جب جمعرات کا دن طلوع ہوا تو ان کے پاس پانی کا ایک ہی کین بچا تھا۔ کینڈی بار کا آخری ڈبّا انہوں نے ناشتے میں ختم کر دیا۔ آخری کین کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے وہ شام کو استعمال کریں گے۔ اس وقت تک وہ سو رہیں گے مگر دوپہر تک ان کی حالت پیاس اور گرمی سے خراب ہو چکی تھی۔ ان کی زبانیں سوج گئی تھیں۔ جلد تڑخنے لگی تھی اور ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ یہ ڈی ہائیڈریشن کی علامت تھی۔ نتیجے میں وہ دوپہر کو اس آخری کین کو بھی ختم کر بیٹھے۔ یوں ان کا زادِ راہ اختتام کو پہنچا۔ دن میں وہ خیمے کو تان لیتے تھے تاکہ سورج کی بلا خیز شعاعوں سے محفوظ رہ سکیں مگر گرمی سے ان کا مختصر خیمہ تنور بن جاتا۔ شام ہوتے ہی گرمی تیزی سے کم ہوتی۔ خنکی بڑھ جاتی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی مگر یہ ان کی پیاس کا حل نہیں تھا۔ غشی اور غنودگی کی کیفیت میں دن آخر کار گزر ہی گیا اور رات کی خنکی انہیں ہوش میں لے آئی۔ سب سے پہلے میتھیو بیدار ہوا۔ خنکی کے ساتھ ایک عجیب سا احساس اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ اس نے اٹھ کر خیمے کے پردے کھولے۔ سمندر پُرسکون تھا اور آسمان اتنا صاف تھا کہ ستارے معمول سے زیادہ چمک دار نظر آ رہے تھے۔ معاً اسے مغرب کی سمت روشنیوں کی قطار سی نظر آئی۔ وہ چلّا اٹھا۔
"زمین... زمین آگئی۔ مجھے روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔"

وہ ایک ایک کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے مگر باہر دیکھتے ہی ان کی نوزائیدہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ہاروے ایک سرد آہ بھر کر واپس اپنی جگہ لیٹ گیا۔ گیٹل مین سرد آہ بھر کر بولا۔

"یہ ستارے ہیں۔ جو طلوع ہو رہے ہیں۔"

میتھیو شرمندہ سا خاموش بیٹھ گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی نیند خراب کی۔ صاف آسمان نے ان کی مایوسی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ اب صرف بارش ہی ان کی پیاس بجھا سکتی تھی اور اس کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔ خشک حلق انہیں بولنے کی اجات نہیں دے رہا تھا۔ چپ بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر ان پر غشی طاری ہونے لگی۔ یہ رات کا دوسرا پہر تھا جب ہاروے کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے سوچا کہ کس چیز نے اسے بیدار کردیا تھا۔ بظاہر چاروں طرف کوئی ایسا نشان نہیں یا آواز نہیں تھی جو اسے چونکاتی۔

شاید چھٹی حس کا کوئی اشارہ تھا۔ اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ دور تک تاریک سمندر تھا یا آسمان پر چمکتے ستارے۔ کوئی خاص چیز نہیں تھی مگر۔۔۔ ایک عجیب سا احساس ہوا۔ جنوب کی جانب کچھ روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ ناقابلِ یقین۔ ستارے کبھی اس طرح نہیں جلتے بجھتے۔۔۔ تو پھر یہ کیا تھا۔ معاً ہاروے کو جوش کی لہر نے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ تو کوئی جہاز تھا اور یہ اس کی روشنیاں تھیں۔ رات کو جہازوں کی روشنیاں یونہی فلیش کرتی تھیں مگر ممکن تھا یہ کوئی سراب ہو۔ صحرا کی طرح سمندر میں بھی مصیبت زدہ افراد کو ایسے سراب نظر آتے تھے۔ وہ کئی منٹ تک نظریں جمائے ان روشنیوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے خوف زدہ ہو کر دوسروں کو بیدار کردیا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں یہ حقیقت ہی نہ ہو اور وہ اسے سراب سمجھ کر موقع گنوا دے۔ وہ بولا "مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے کوئی جہاز افق کے قریب سے گزر رہا ہو۔ کیا تم بھی اسے دیکھ رہے ہو؟"

وہ سب آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ واقعی جلتی بجھتی روشنیاں متحرک تھیں۔ کوئی بحری جہاز ان سے کئی میل کے فاصلے سے گزر رہا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بھوکے کی نگاہ کے سامنے سے سجا ہوا دسترخوان گزر رہا ہو۔ اپنی ٹوٹی ہوئی پسلی کے ساتھ میتھیو حیرت انگیز پھرتی سے حرکت میں آیا۔ اس نے فلیئرز اور لانچر کا ڈبا اٹھایا۔ ایک فلیئر لانچر میں لوڈ کیا اور فائر کردیا۔ راکٹ آسمان کی طرف لپکا اور پانچ سو فٹ کی بلندی پر پھٹ کر سرخ روشنی سے ماحول کو چکا چوند کردیا۔

ان کی پُرامید نگاہیں روشنیوں پر مرکوز تھیں۔ مگر ان کی سمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایک جنون کے عالم میں میتھیو نے باقی تمام فلیئرز ایک ایک کرکے فائر کردیے۔ تقریباً ڈیڑھ منٹ کے لیے تاریک رات میں گویا سورج نکل آیا۔ اس کے بعد دوبارہ تاریکی مسلط ہوگئی۔ روشنیاں بدستور ایک سمت میں گامزن رہیں۔ ان کی امید یاس میں بدلنے لگی۔ گیٹل مین اور میتھیو تھکے تھکے انداز میں واپس کشتی میں دراز ہوگئے۔ معاً ہاروے چیخ اٹھا۔

"وہ رُک رہے ہیں۔۔۔ وہ مڑ رہے ہیں۔۔۔"

واقعی جہاز مڑ کر ان کی طرف آرہا تھا۔ اس نے فلیئرز کی روشنی دیکھ لی تھی۔ اس لمحے وہ اپنے تمام دکھ اور تمام مشکلات کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہیں اپنے بھوک سے اینٹھے معدے اور پیاس سے خشک گلے بھی یاد نہیں رہے تھے۔ وہ رقص کررہے تھے، ہنس رہے تھے، چیخ چلّا رہے تھے اور ملّاحوں کا وہ مشہور نغمہ گا رہے تھے جو وہ وطن واپسی پر گاتے تھے۔ طویل صعوبتوں کے بعد ساحل، ان کے گھر اور ان کی عورتیں ان کی منتظر ہوتی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس دیو قامت جہاز کے بالکل قریب تھے۔ اس کی تمام روشنیاں جل رہی تھیں اور وہ سمندر میں تیرتا روشنیوں کا جزیرہ لگ رہا تھا۔

بارہ سو فٹ طویل ناروےجین رجسٹرڈ آئل ٹینکر "جسٹیلا" کے پینتیس رکنی عملے کے صرف ایک فرد نے فلیئرز کی روشنی دیکھی تھی۔ اسے رات کو نیند نہیں آرہی تھی اور وہ اوپری عرشے پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے کپتان کو نیند سے جگا کر روشنی کے بارے میں بتایا اور اس کے نصف گھنٹے بعد انہوں نے سمندر میں تیرتی نارنجی رنگ کی ربر کشتی کو تلاش کرلیا جس میں چار تباہ حال افراد موجود تھے۔ ٹینکر کی کرین نے انہیں کشتی سمیت جہاز پر اٹھالیا۔ دو روز بعد ٹینکر نے انہیں برطانوی نو آبادی کے مین آئی لینڈ پر اتار دیا۔ جہاں میتھیو کی زخمی پسلیوں کی مرہم پٹی کی گئی ہاتک منرو کے السر کا علاج کیا گیا۔ ان چاروں کو ایک ہفتے کا مکمل بیڈ ریسٹ دیا گیا۔ یہاں انہیں پہلی بار علم ہوا کہ ہری کین "ایلین" اس صدی کا دوسرا طاقت ور ترین طوفان تھا۔ اس نے میکسیکو، جزائر کریبین اور امریکا کے مشرقی ساحلوں پر زبردست تباہی مچائی۔ تین سو ملین ڈالرز سے زائد کا نقصان ہوا اور پونے تین سو افراد اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یقیناً وہ چاروں خوش قسمت ترین تھے جو طوفان کے درمیان سے گزر کر بھی زندہ بچ گئے۔

ورلڈ کپ

کاشف زبیر

کھیل از منہ قدیم سے انسانی زندگی میں کسی نہ کسی صورت شامل رہے ہیں، ایک دور تھا تفریح طبع کی خاطر سفاکی اور بربریت پر مشتمل کھیل کھیلے جاتے تھے، ان میں سے چند ایک کی جھلک آج کل بھی دنیا میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہے۔ تاہم گزرتے وقت کے ساتھ ان سے درندگی اور بہیمت کا عنصر کم ہوتا چلا گیا اور پھر کھیل واقعی کھیل کی صورت اختیار کر گئے۔ فٹ بال بھی ایک ایسا کھیل ہے جسے کرۂ ارض کا مقبول ترین کھیل ہونے کا اعزاز بجا طور پر حاصل ہے۔ اس سال ان ہی ایام میں اسی فٹ بال کا عالمی کپ جرمنی میں منعقد ہورہا ہے جس پر تمام دنیا کی نگاہیں مرکوز ہیں۔ ورلڈ کپ فٹ بال کے اس موقع پر اس کی تاریخ اور اس کے دلچسپ واقعات پر مبنی یہ خصوصی مضمون اس غرض سے شامل اشاعت کیا گیا تاکہ جاننے کی خواہش رکھنے والے قاری جہاں کھیل سے محظوظ ہوں وہیں وہ اس کے ماضی سے بھی بھرپور انداز میں واقف ہوسکیں۔

فٹ بال کے ماضی اور دلچسپ وانوکھے واقعات سے معمور ایک معلوماتی مضمون

آج سے کوئی چھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ وسط ایشیا کے سرسبز میدانوں میں ایک خانہ بدوش مویشی چرانے والا قبیلہ سخت سرما کے بعد موسم بہار میں اپنی بھیڑوں اور دوسرے جانوروں کو چراگاہوں کی طرف لے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سرما گزرنے کے بعد بھیڑوں سے اون اتارا جارہا تھا' ایک طرف کچھ عورتیں دستی چرخہ لیے اتارے جانے
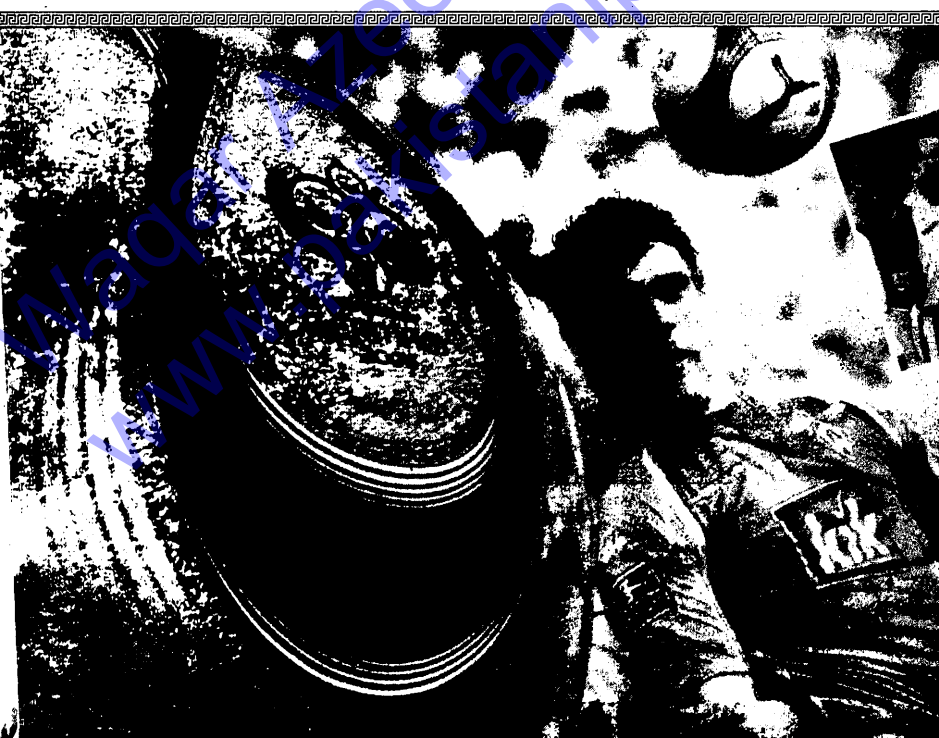
والے اون کو کات کر اس سے دھاگا بنا رہی تھیں اور کچھ اور عورتیں بنائے جانے والے دھاگے کو لپیٹ کر اس کے گولے بنا رہی تھیں۔

قبیلے کے شریر جوان ہوتے لڑکے ان عورتوں کو تنگ کر رہے تھے۔ اچانک ایک لڑکے نے چپکے سے اون کے دھاگے سے بنایا جانے والا گولا پار کیا اور دوسرے لڑکوں کے ہمراہ نزدیکی کھلے میدان میں جا پہنچا۔ جہاں یہ لڑکے اون کے اس گولے کے لیے آپس میں چھینا جھپٹی کرنے لگے۔ پھر گولا ایک لڑکے کے ہاتھ سے گرا اور اس نے اسے لات مار کر دور کر دیا تا کہ کوئی اور لڑکا اسے اٹھا نہ سکے پھر وہ سب پیروں سے مار مار کر اس گولے کو ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ تو بہت دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک لڑکے نے دور درخت کی طرف اشارہ کیا ''جو گولے کو وہاں تک لے جائے گا' وہی فاتح ہوگا۔''

اس کے بعد ان کے اس مشغلے میں نیا جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ دھاگا کھلنے سے روکنے کے لیے انہوں نے اسے کئی مرتبہ مضبوط گرہ لگائی تھی۔ اگلے روز وہ فرصت کے اوقات میں پھر یہی کھیل' کھیل رہے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا کہ ایک ہی سمت میں سب کا بھاگنا اور ایک ہی درخت تک جا کر فاتح قرار دیا جانا کچھ عجیب سا تھا۔ اس میں حریف کو مات کرنے کا صحیح لطف نہیں تھا۔ تمدن کی جانب بڑھتے ہوئے انسان نے جنگ کا تجربہ کر لیا تھا اس قبیلے کو بھی بارہا چراگاہوں اور پانی کے چشموں کے لیے حریف قبیلوں سے جنگ کرنا پڑی تھی۔ لڑکوں کو معلوم تھا' جنگ میں دونوں فریق آمنے سامنے ہوتے ہیں اور ان میں سے جو دوسرے کو مغلوب کر لے وہی فاتح ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ان لڑکوں نے بھی دو گروپ بنا لیے اور دو درخت مقرر کر لیے۔ اب وہ اون کا گولا ایک دوسرے سے چھین کر مخالف درخت تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے جو فریق دوسرے کے درخت پر اون کا گولا دے مارتا تھا' وہی فاتح قرار پاتا تھا۔ پھر وقت کے حساب سے مقابلہ ہونے لگا۔ اتنی مدت میں جو طے کی جاتی تھی' جو فریق زیادہ بار دوسرے کے درخت پر اون کا گولا مارتا تھا' وہی فاتح قرار پاتا۔ کہا جاتا ہے یہ فٹ بال کی ابتدا تھی۔

مختلف تہذیبوں میں ہمیں فٹ بال یا اس سے ملتے جلتے کھیل کے آثار ملتے ہیں۔ ایران میں کوئی چار ہزار سال پہلے کی ایک دیواری تصویر میں چند افراد کو ایک گیند نما شے سے

آپس میں پیروں سے کھیلتے دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویر چار کول سے بنائی گئی تھی۔ سمیری تہذیب میں بھی فٹ بال نما کھیل کا سراغ ملتا ہے۔ موجودہ عراق کے مقام پر ترقی پانے والی اس تہذیب کے عوام اور خواص اس کھیل میں بے پناہ دلچسپی لیتے تھے جو ایک گول چمڑے سے بنی گیند کو پیروں سے ٹھوکر مار کر کھیلا جاتا تھا۔ اس گیند کے اندر ردی بھری جاتی تھی۔ ملنے والی ایک دستاویز سے پتا چلتا ہے کہ اس کھیل کو ایک باقاعدہ میدان میں کھیلا جاتا تھا' اس کے اصول وقواعد تھے اور میدان کے چاروں طرف نشستوں پر بیٹھ کر لوگ اس کھیل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جو کھلاڑی اچھے کھیل کا مظاہرہ کرتا تھا' حاکم وقت اسے اپنے ہاتھ سے بیش قیمت انعام دیا کرتا تھا اور ان کھلاڑیوں کی قوم میں خاصی عزت ہوتی تھی۔

برصغیر کی قدیم تہذیبوں میں بھی فٹ بال نما کھیلوں کا سراغ ملتا ہے۔ اسی طرح قدیم چین' جاپان' شمالی اور جنوبی امریکا میں باشندے فٹ بال سے ملتا جلتا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ آسٹریلیا کے قدیم باشندے کینگرو کی کھال سے گیند بنا کر اور اس میں کاک کے درخت کی چھال بھر کر اس کو پیروں سے ٹھوکر لگاتے تھے۔ یہ کھیل جوان میں مذہبی حیثیت رکھتا ہے' آج بھی کھیلا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد فتح یا حریف کو ہرانے کا جذبہ نہیں ہوتا ہے لیکن اس کھیل کا انداز بڑی حد تک جدید فٹ بال سے ملتا جلتا ہے۔ اسی طرح ایمیزون کے علاقے میں پائے جانے والے قبائلی بھی ایسا ہی ایک کھیل کھیلتے ہیں جس میں فٹ بال نما چیز کو پیروں سے ٹھوکر مار کر اس کے مخصوص مقام تک پہنچایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وسط ایشیا اور ایران میں یہ کھیل بڑے پیمانے پر کھیلا جاتا تھا۔ عوام اور امرا اس میں دلچسپی لیا کرتے تھے اور اس کھیل پر بڑے پیمانے میں شرطیں لگتی تھیں۔ جب مسلمان ایران اور وسط ایشیا تک پہنچ گئے تو انہوں نے اس کھیل پر پابندی لگادی تھی۔ بعد میں جب خلیفۂ بغداد کی ان علاقوں پر گرفت کمزور پڑی تو فٹ بال نما اس کھیل کو پھر سے کھیلا جانے لگا تھا۔ اگرچہ اسے عوام میں پہلے جیسی مقبولیت نہیں ملی تھی مگر دیہاتوں اور قبائلی علاقوں میں یہ کھیلا جاتا تھا اور اس کے قواعد وضوابط بھی جدید فٹ بال سے ملتے جلتے تھے۔ جب یورپ کے باشندے صلیبی جنگوں کی وجہ سے یہاں آئے تو وہ اس کھیل سے متعارف ہوئے تھے اور وہ اس کھیل کو اپنے ساتھ یورپ لے گئے۔

آنے والی کئی صدیوں میں اس کھیل کی صورت بدلتی رہی۔ وسطی یورپ اور خاص طور سے جرمنی میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ تیرہویں صدی میں انگلستان کے چرواہے فٹ بال کھیلا کرتے تھے لیکن اس کے اصول وقواعد نہیں تھے۔ جب انگریز پہلی بار برصغیر تک آئے تو وہ اپنے ساتھ کرکٹ کے ساتھ فٹ بال کا کھیل بھی لائے تھے لیکن اس وقت فٹ بال کو نچلے طبقے کا کھیل سمجھا جاتا تھا اور انگریزی فوج کے جوان اسے کھیلا کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز پر یورپ میں اس کھیل نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ اس زمانے میں اس کے گول کے لیے نیٹ لگایا گیا ورنہ اس سے پہلے صرف پول کے ڈنڈے سے گول کا کام لیتے تھے لیکن اس میں یہ مسئلہ تھا کہ گیند اگر گول کے اوپری حصے سے گزر جاتی تو تنازع پیدا ہوتا کہ گول ہے یا نہیں ہے لہٰذا گول کے اوپری حصے پر بھدا سا ایک افقی ڈنڈا لگادیا گیا۔ اس کے باوجود بعض اوقات جب گیند بے حد تیز رفتاری سے گول کے ڈنڈے کے پاس سے گزرتی تھی تو یہ اندازہ لگانا دشوار ہوجاتا تھا کہ گیند گول کے اندر سے گزری ہے یا باہر سے۔ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ گول پوسٹ میں اب رسی کا بنا جال بھی لگایا جانے لگا۔ اس سے بالکل درست طور پر معلوم ہوجاتا کہ بال گول پوسٹ کے اندر ہی گئی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک فٹ بال کے میدان میں دونوں طرف سے بعض اوقات بیس سے بھی زیادہ کھلاڑی حصہ لیا کرتے تھے اور میدان میں ایک ہجوم کا سماں ہوجاتا تھا۔ جس طرح دوسرے کھیلوں کے قواعد وضوابط زیادہ تر برطانیہ میں تشکیل پائے تھے' اسی طرح فٹ بال کے قوانین بھی برطانیہ میں بنائے گئے۔ ان میں سب سے اہم کھلاڑیوں کی تعداد' میدان کی لمبائی چوڑائی' گول پوسٹ کی لمبائی اور اونچائی اور کھیل کے قواعد تھے۔ ریفری کا تقرر بھی برطانیہ میں انیسویں صدی کے آغاز میں ہوا' اس سے پہلے میچ بغیر ریفری کے کھیلے جاتے تھے۔

انیسویں صدی کے وسط تک فٹ بال پورے برطانیہ میں ذوق وشوق سے کھیلا جانے لگا تھا۔ قواعد وضوابط کی حد میں آنے اور ریفری کے تقرر سے اس کی دلکشی میں اضافہ ہوا تھا مگر اس وقت بھی یہ عام افراد خاص طور سے دیہاتی کسانوں اور صنعتی مزدوروں کا کھیل شمار کیا جاتا تھا کیونکہ ان طبقات کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کرکٹ جیسا طویل دورانیے کا کھیل' کھیل سکیں لہٰذا وہ فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔

1850ء تک پورے برطانیہ میں رجسٹرڈ کلبوں کی تعداد ہزار کے قریب تھی مگر طبقۂ اشرافیہ کی دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے فٹ بال کلبوں کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ بیشتر کلبوں کے پاس میدان تک نہیں تھے اور جن کلبوں کے پاس میدان تھے' وہ شہروں سے باہر تھے۔ جہاں تماشائی جانا پسند نہیں کرتے

تھے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ کرکٹ جیسا مشکل کھیل انیسویں صدی کے آغاز تک ہی دنیا کے سارے براعظموں میں کھیلا جانے لگا تھا۔ برطانیہ اور آسٹریلیا کے درمیان بین الاقوامی ٹیسٹ سیریز بھی ہو چکی تھی۔ جنوبی افریقا، امریکا، جزائر کیریبین میں، غلام ہندوستان..... حتیٰ کہ چینی علاقے ہانگ کانگ میں بے شمار کرکٹ کلب قائم ہو چکے تھے۔ مگر جزائر برطانیہ سے باہر دنیا میں فٹ بال جیسے آسان کھیل کا ایک بھی کلب نہیں تھا۔ شاید برطانیہ نے خود بھی فٹ بال کو دنیا میں متعارف کرانے میں دلچسپی نہیں لی تھی اس لیے بھی دنیا میں فٹ بال کا چرچا نہیں تھا۔

اس کی ایک وجہ اور بھی تھی، کیونکہ فٹ بال کے قواعد وضوابط برطانیہ نے طے کیے تھے اس لیے اسے برطانیہ کا کھیل سمجھا جاتا تھا اور اس وقت دنیا کا بڑا حصہ سیاسی طور پر برطانیہ کا مخالف تھا۔ یورپ میں جرمن، فرانسیسی، اسپینی اور اطالوی انگریزوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ امریکا نے خود برطانیہ سے آزادی حاصل کی تھی اس لیے وہاں پر بھی برطانیہ کے لیے ناپسندیدگی کے شدید جذبات تھے۔ امریکی اس مخالفت میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے برطانیہ کے مخصوص کھیلوں کا حلیہ تک بدل دیا تھا۔ جیسے کرکٹ کی صورت، قوانین اور میدان کا حدود اربع تبدیل کر کے اسے بیس بال بنا دیا۔ اسی طرح ٹینس جو برطانیہ میں گھاس پر کھیلی جاتی تھی، اسے پختہ میدان اور مٹی سے بنے میدان پر کھیلا جانے لگا۔ فٹ بال کے ساتھ بھی امریکیوں نے ایسا ہی کیا۔ سب سے پہلے اس کی صورت بدلی اور بال کو گول کے بجائے لمبوترا بیضوی کر دیا۔ پھر اسے پیروں کے بجائے ہاتھوں پیروں سے کھیلا جانے لگا اور گول کرنے کے بجائے محض مخالف فریق کے حصے میں جا کر گیند کو زمین پر مار دینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ یہ فٹ بال کے خوب صورت کھیل سے زیادہ کشتی کا مظاہرہ لگتا ہے۔ امریکا کے علاوہ دنیا کے معدودے چند ممالک اس طرح کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جہاں کبھی انگریزوں کی حکومت تھی اور وہاں اب بھی گورے آباد ہیں۔

یورپ، شمالی اور جنوبی امریکا میں شاذ ہی کہیں فٹ بال کھیلی جاتی تھی۔ افریقا اور آسٹریلیا میں فٹ بال کا کھیل صرف گوروں تک محدود تھا۔ حتیٰ کہ اس کا پہلا بین الاقوامی میچ برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ کے درمیان 1872ء میں کھیلا گیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ بھی دراصل برطانیہ کے ماتحت ملک ہی تھا اور اس کی خارجہ پالیسی، کرنسی اور دفاع برطانیہ کے پاس تھا۔ اس کے بعد برسوں تک کوئی بین الاقوامی میچ نہیں ہوا تھا۔ فٹ بال فرانس تک اس وقت پہنچی جب دونوں ممالک کے درمیان صد سالہ جنگ خاتمے کو پہنچی تھی۔ اس وقت تک برطانیہ اور فرانس دنیا کی بندر بانٹ خوش اسلوبی سے کر چکے تھے۔ اس لیے دونوں ممالک میں روابط شروع ہوئے اور فرانسیسی فٹ بال کا کھیل اپنے ملک میں لے آئے۔ اس کے بعد تو فٹ بال دیکھتے ہی دیکھتے یورپ بھر میں مقبول ہو گیا تھا۔ پیرس سے لے کر ماسکو تک عوام اسے یکساں ذوق وشوق سے کھیلنے لگے تھے۔ جرمنی، فرانس، اسپین، اٹلی اور سویڈن کے عوام تو دیوانے ہو گئے تھے۔ عوامی سطح پر بے شمار کلب بن گئے تھے۔ مگر قوموں میں جنگوں اور سیاسی اختلافات کی بنا پر ان ممالک میں بین الاقوامی فٹ بال ہنوز دیوانے کا خواب تھا۔

فٹ بال اگرچہ یورپی عوام میں مقبول ہو چکا تھا لیکن فٹ بال کا گھر تقدیر نے ایک اور خطے کو چن رکھا تھا۔ یہ خطہ جنوبی امریکا تھا۔ جنوبی امریکا میں اس وقت تک یورپی نسلوں خاص طور سے اسپینیوں اور مقامی نسلوں کے ساتھ افریقی نسلیں بھی مل کر ایک عجیب سا معاشرہ تشکیل دے چکی تھیں۔ یہ لوگ جوشیلے، گرم خون رکھنے والے اور ہمہ وقت مرنے مارنے پر تلے رہنے والے لوگ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کہیں اتنی خانہ جنگیاں اور قوموں کے درمیان لڑائیاں ہوئی ہوں جتنی کہ جنوبی امریکا میں اقوام کے درمیان ہو چکی ہیں۔

جب ان جنوبی لوگوں کے ہاتھ فٹ بال کا کھیل لگا تو اس کی قسمت ہی بدل گئی۔ یورپ میں بھی فٹ بال کا شمار تیز رفتار کھیلوں میں ہوتا تھا۔ وہاں کی سرد آب وہوا اسے خوب راس آئی تھی۔ سست کھیلوں سے بیزار عوام تیزی سے فٹ بال کی طرف لپکے تھے۔ اس کے باوجود یورپ میں فٹ بال پر شائستگی اور تہذیب کا غلاف چڑھا رہا تھا۔ طبقۂ اشرافیہ میں مقبول بنانے کی کوشش میں فٹ بال کی اصل روح کو کچل دیا گیا تھا اور اسے محض موزوں جسمانی حرکات اور چستی کا میکانکی مظہر بنا دیا گیا تھا، جس میں ہر حرکت نپی تلی ہوا کرتی تھی۔ یورپین فٹ بال کا یہ انداز آج بھی برقرار ہے۔ نظم وضبط کے ساتھ کھیلنے کا نپا تلا انداز۔

مگر جب یہی شائستہ فٹ بال جنوبی امریکا والوں کے ہاتھ لگی تو انہوں نے اس کے قواعد وضوابط تو وہی رکھے لیکن اس کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ یورپی فٹ بال اگر میدانی دریا کے مانند پرسکون اور رواں تھی تو جنوبی امریکی فٹ بال کسی پہاڑی دریا کے مانند تند اور شور مچاتی ہوئی تھی۔ چند سال کے اندر چلی سے لے کر پاناما تک فٹ بال جنوبی امریکا کا محبوب ترین کھیل بن گیا تھا۔ بلکہ اسے کھیل سے زیادہ مذہب کا درجہ

دے دیا گیا تھا۔ بے شمار لوگوں کی زندگی صبح سے شام تک فٹ بال کے گرد گھوما کرتی تھی۔ یہ شاید اس خطے کے لوگوں کا مزاج ہے، جس کھیل کو اپناتے ہیں، اتنی شدت سے اپناتے ہیں کہ خود اس کے ہو جاتے ہیں۔ جزائر کیریبین جو ویسٹ انڈیز کے نام سے معروف ہیں، جنوبی امریکا کا ایک حصہ ہیں۔ جب اس خطے میں انگریزوں نے کرکٹ متعارف کرائی تو ویسٹ انڈیز کے افریقی نژاد باشندے اس کے ایسے دیوانے ہوئے کہ اسے مذہب سے بھی اونچا مقام دے دیا۔ ہفتے کے دن چرچ میں حاضری ہو نہ ہو لیکن کرکٹ میچ سے غیر حاضری گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھی۔ یہی حال جنوبی امریکا میں فٹ بال کا تھا۔ معمولی سے میچ میں ہزاروں افراد کا جمع ہو جانا معمولی سی بات تھی۔ بڑے ممالک جیسے برازیل، ارجنٹائن اور چلی کے عوام تو دیوانے تھے ہی...... چھوٹے چھوٹے ممالک کے لوگ بھی فٹ بال سے عشق میں کسی طرح ان سے پیچھے نہیں تھے۔

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو دنیا بھر میں عوام کی سطح پر مقبول ترین کھیل بلاشبہ فٹ بال ہی تھا مگر اس کھیل کا مقدر بین الاقوامی مقابلے کے معاملے میں بجھا ہوا تھا۔ ابھی تک سوائے برطانیہ، فرانس اور اسکاٹ لینڈ کے مابین مقابلوں کے، فٹ بال کا کوئی ایسا ایونٹ نہیں ہوا تھا جسے بین الاقوامی کہا جا سکتا۔ سب سے پہلے جس شخص نے فٹ بال کو بین الاقوامی حلقے کا حصہ بنایا وہ جدید اولمپک کھیلوں کا بانی بیرن ڈی پیری تھا۔ پیری کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ آنے والے دنوں میں فٹ بال دنیا کا مقبول ترین کھیل بن جائے گا۔ اس کی ساری دلکشی اور جوش و ولولہ دیکھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔

1900ء میں جب دوسرے اولمپک کھیل منعقد ہوئے تو ان میں فٹ بال کا کھیل بھی شامل تھا۔ عام لوگوں کے لیے یہ انوکھا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے کئی ممالک کے درمیان فٹ بال مقابلے نہیں ہوئے تھے۔ پیرس کے عوام ان مقابلوں کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے۔ اس وقت برطانیہ کی فٹ بال ٹیم سب سے زیادہ مضبوط تھی اور اس نے بہ آسانی پہلا اولمپک ٹائٹل جیت لیا۔ اس کے بعد ارجنٹائن، یوراگوئے اور برازیل نے بھی اولمپک فٹ بال ٹائٹل جیتے تھے۔ بعد ازاں اولمپک سے فٹ بال کو خارج کر دیا گیا تھا کیونکہ اس میں شرکت کے خواہش مند ممالک کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور اس زمانے میں اولمپک منعقد کرانے میں میزبان ملک کا خاصا خرچہ ہو جاتا تھا اور فٹ بال کی دس بارہ ٹیموں کا مطلب تھا ڈیڑھ سو سے زائد افراد اور کئی میدانوں کی تزئین و آرائش کا خرچہ۔

اولین اولمپک میں فٹ بال شامل کیے جانے کا تجربہ عوام کی حد تک اتنا کامیاب رہا کہ اگلے اولمپکس کے موقع پر فٹ بال کی بین الاقوامی فیڈریشن انٹرنیشنل دی فٹ بال ایسوسی ایشن کا قیام 21 مئی 1904ء کو عمل میں آیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، فیفا کے قیام میں فرانسیسی اور اطالوی سرگرم تھے اور انہوں نے اس موقع پر انگریزوں کو الگ تھلگ کر دیا تھا۔ بعد میں انگلستان بھی فیفا کا رکن بنا۔ مزے کی بات ہے، برطانیہ عظمیٰ میں شامل ممالک انگلستان، آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ فیفا FIFA کے الگ الگ اور مکمل رکن ہیں۔

یورپ کے ممالک کے بعد جنوبی امریکا کے ممالک FIFA کی رکنیت حاصل کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ اگرچہ تعصب کی وجہ سے یورپی ممالک نے جنوبی امریکن ممالک کو رکنیت دینے کی مخالفت کی تھی، خاص طور سے جرمنی اور اٹلی کا رویہ سخت تھا۔ اس کے برعکس اسپین اور انگلستان، جنوبی امریکن ممالک کی حمایت کر رہے تھے۔ بہر حال FIFA ایک رنگ و نسل سے بالاتر ادارہ تھا اور اس کے دروازے ہر اس قوم کے لیے کھلے ہوئے تھے جو فٹ بال کھیلتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج FIFA دنیا میں سب سے زیادہ رکن ممالک رکھنے والی باڈی ہے۔ اس سے زیادہ رکن ممالک صرف اولمپک گورننگ باڈی کے ہیں لیکن یہ باڈی کسی ایک کھیل کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ رکن ممالک کی تعداد کے اعتبار سے صرف ورلڈ ٹینس فیڈریشن فیفا کا مقابلہ کر سکتی ہے مگر ممالک کی رکنیت کے لحاظ سے وہ FIFA سے بہت پیچھے ہے۔ FIFA کے رکن ممالک کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے جبکہ WTA کے رکن ممالک کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے اور ٹینس عوامی کھیل بھی نہیں ہے۔

چند دہائیوں میں جنوبی امریکن ممالک نے ایسی فٹ بال کھیلنی شروع کر دی جس کا یورپی ممالک کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس جارحانہ فٹ بال کے مقابلے میں خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا یورپی ممالک نے اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے شارٹ پاسز کی حکمت عملی ایجاد کی تاکہ گیند زیادہ سے زیادہ اپنے پاس رکھیں۔ یوں دونوں براعظموں کے درمیان کش مکش کا آغاز ہوا، جب مقابلہ یورپی اور جنوبی امریکن ٹیم کے درمیان ہو تو ان ممالک کی سرحدیں ختم ہو جاتی تھیں۔ سب یورپین ایک ہو جاتے تھے اور سب جنوبی امریکن ایک ہو جاتے۔

اس کا خوب صورت منظر 1990ء کے اٹلی کے فٹ بال ورلڈ کپ کے موقع پر دیکھنے میں آیا جب جرمنی اور ارجنٹائن کے درمیان فائنل تھا۔ اس روز ہر یورپی جرمنی کی فتح

کا خواہش مند تھا اور ہر جنوبی امریکن ارجنٹائن کی فتح کے لیے دعا گو تھا اور جب جرمنی نے فائنل ایک گول سے جیتا تو صرف جرمنی میں ہی نہیں پورے یورپ میں جشن کا سماں تھا اور شکست کا سوگ صرف ارجنٹائن میں ہی نہیں' پورے جنوبی امریکا میں منایا گیا تھا۔

FIFA کے قیام کے بعد اس امر کی کوششیں تیز ہوگئیں کہ فٹ بال کا اپنا ایک جداگانہ ٹورنامنٹ ہو جو اس کے رکن ممالک کے درمیان کھیلا جائے مگر اس وقت تک مختلف ممالک آپس میں کھیلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے شعلے سرد پڑنے کے باوجود یورپی ممالک کے اختلافات عروج پر تھے اور وہ ایک دوسرے کا کھیلوں کے میدان میں سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف جنوبی امریکا میں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ ہر ملک حالت جنگ میں تھا۔ مگر FIFA کے باہمت عہدے داران نے کوشش جاری رکھی اور پہلا ورلڈ کپ 1930ء میں منعقد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر کسی بھی یورپی ملک نے یہ ورلڈ کپ کرانے سے انکار کردیا تھا۔ روس کمیونزم کے تجربے کو مستحکم کر رہا تھا اور جرمنی میں پہلی جنگ عظیم کی شکست کے بعد کساد بازاری عروج پر تھی۔ انگلستان' فرانس اور اٹلی کا حال بھی برا تھا۔

FIFA اور فٹ بال کی خوش قسمتی کہ جولیس ریمٹ JULIES REMUT جیسا اولوالعزم شخص FIFA کا صدر بنا۔ اس نے دوسری اقوام کو ساتھ ملایا اور فٹ بال کے بین الاقوامی ایونٹس کے لیے کوششیں تیز کردیں۔ جولیس ریمٹ فرانسیسی تھا اس لیے برطانیہ کی فٹ بال فیڈریشن کا رویہ کسی بھی ایونٹ کے لیے سرد تھا اور نہ ہی جرمن اس معاملے میں سرگرمِ عمل تھے۔ صرف اٹلی ساتھ دے رہا تھا۔ جولیس ریمٹ کی کوششوں سے 1932ء کے لاس اینجلس اولمپکس میں فٹ بال کو ایک بار پھر شامل کرلیا گیا مگر امریکی حکومت نے فٹ بال میچز منعقد کرنے سے انکار کردیا۔ اوّل تو امریکیوں کو فٹ بال سے دلچسپی نہیں تھی دوسرے ان کے پاس فٹ بال میچز کرانے کے نہ تو انتظامات تھے اور نہ ہی رقوم تھیں۔

FIFA اور جولیس ریمٹ کے لیے اولمپکس سے فٹ بال کا اخراج ایک بڑا دھچکا تھا۔ دراصل اولمپک غیر پیشہ ور کھلاڑیوں کے لیے اسپورٹس ایونٹ تھا اور فٹ بال کے سارے کھلاڑی پیشہ ور ہوتے تھے' اس لیے بھی اولمپک گورننگ باڈی کو موقع ملا اور اس نے فٹ بال کو اولمپک سے خارج کرادیا۔ حالانکہ اس اولمپک میں بے شمار کھیلوں میں پیشہ ور کھلاڑی حصہ لیتے رہے تھے خاص طور سے باکسنگ اور ایتھلیٹکس میں حصہ لینے والے اکثر کھلاڑی پیشہ ور ہی ہوتے تھے۔ ایسے میں فٹ بال کو نشانہ بنانا معنی خیز تھا۔

جرمنی اور برطانیہ آپس میں حریف ہونے کے باوجود فیفا کے معاملات پر فرانس اور اٹلی کی برتری ناپسند کرتے تھے۔ جیسے وہ فٹ بال کے کھیل میں جنوبی امریکن ممالک کی برتری کے خلاف تھے اور ان دونوں ممالک کا امریکا پر اثر تھا۔ لہٰذا اولمپک سے فٹ بال کا اخراج تعجب خیز بھی نہیں تھا۔ برطانیہ یوں بھی FIFA کا مخالف تھا کہ اس نے اپنی رکنیت ہر ملک کے لیے کھول دی تھی اور اس طرح برطانیہ کی اس کھیل پر اجارہ داری کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ جیسے آئی سی سی پر اب برطانیہ اور آسٹریلیا کی اجارہ داری ختم ہوچکی ہے لیکن سخت قواعد کی وجہ سے ہر ملک اس کی مکمل رکنیت یعنی ٹیسٹ اسٹیٹس حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

FIFA کی کھلی پالیسی کا سب سے زیادہ فائدہ جنوبی امریکن ممالک کو پہنچا۔ فٹ بال کے اولمپک سے اخراج کے بعد جولیس ریمٹ کی کوششوں سے رکن ممالک کا ایمسٹرڈیم میں ایک ہنگامی اجلاس ہوا تھا۔ 26 مارچ 1928ء کے تاریخی دن یہ اجلاس ہوا جس نے فٹ بال کی قسمت بدل کر رکھ دی۔ اب تک فیفا کے عہدے داروں کی کوشش تھی کہ فٹ بال کو اولمپک میں شامل رکھا جائے۔ ممکن ہے جرمنی اور برطانیہ کی سازش کی وجہ سے فٹ بال کو اولمپک سے خارج نہ کیا جاتا اور فیفا فٹ بال کا ورلڈ کپ کرانے کا فیصلہ نہ کرتی۔ اولمپک کھیل کی حیثیت سے فٹ بال کو وہ پذیرائی نہ ملتی جو ورلڈ کپ نے اسے دلائی تھی۔

FIFA کے اس غیر معمولی اجلاس میں غیر معمولی فیصلے کیے گئے تھے۔ اس میں اہم ترین فیصلہ 1930ء میں ورلڈ کپ کا انعقاد تھا۔ اس کے علاوہ علاقائی چیمپیئن شپس' جس میں براعظم کے ممالک آپس میں حصہ لیتے اور بین الملکی کلبوں کے آپس میں ٹورنامنٹس کی خاکہ گری کی گئی تھی۔ جن کا عملی نتیجہ آنے والے سالوں میں یورپین کپ' جنوبی امریکن کپ اور افریقن کپ کی صورت میں سامنے آیا' ہر ملک میں کلب کی سطح کی فٹ بال نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ بلاشبہ یہ فیفا کے عہدے داران کی اَن تھک محنت تھی' جو فٹ بال کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

جس وقت فٹ بال ورلڈ کپ کا فیصلہ ہوا تو یورپ میں شدید نوعیت کا معاشی بحران آیا ہوا تھا۔ کساد بازاری اور افراطِ زر نے معیشتوں کو تباہ کردیا تھا' ان حالات میں سارے

ہی یورپی ممالک نے ورلڈ کپ کروانے سے معذرت کر لی۔

لہٰذا قرعہ فال جنوبی امریکا کے چھوٹے ملک یوراگوئے کے نام نکلا تھا۔ یوراگوئے کی معیشت بھی زبوں حالی کا شکار تھی اور وہ ویسے بھی زیادہ مضبوط معیشت کا حامل ملک نہیں ہے مگر اپنے عوام کی فٹ بال سے والہانہ محبت کی وجہ سے یوراگوئے نے دنیائے فٹ بال کے سب سے بڑے ایونٹ کی اوّلین میزبانی کا بار اٹھانے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ ویسے بھی یوراگوئے کی فٹ بال ٹیم دنیا کے بیشتر ممالک کی ٹیم کو شکست دے چکی تھی اور اسے عالمی سطح پر فٹ بال کی بہترین ٹیم تسلیم کیا جاتا تھا۔

اگرچہ فیفا کی تمام تر باڈی اور عہدے داران کا تعلق یورپ سے تھا مگر یوراگوئے کو ورلڈ کپ دینے کی وجہ سے یورپی ممالک نے پہلے ورلڈ کپ کا غیر علانیہ بائیکاٹ کیا اور کسی نہ کسی بہانے اپنی ٹیم بھیجنے سے معذوری ظاہر کی۔ حالانکہ ورلڈ کپ کی میزبانی سے بھی انہوں نے خود انکار کیا تھا اور جب ورلڈ کپ جنوبی امریکا کو دیا گیا تو انہوں نے تعصب کی بنا پر اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ پہلے ورلڈ کپ کی تیرہ شریک ٹیموں میں سے صرف چار کا تعلق یورپ سے تھا باقی نو ٹیمیں جنوبی امریکا کی تھیں۔ یورپی بائیکاٹ کا جنوبی امریکا کے ممالک نے برا منایا تھا اور آیندہ ورلڈ کپ میں شرکت نہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔

یورپی ممالک کی مخالفت کے باوجود فیفا نے ورلڈ کپ کا یوراگوئے میں انعقاد کر دیا۔ اپنے پہلے ہی ایونٹ سے فٹ بال ورلڈ کپ نے شائقین کی بھرپور توجہ حاصل کر لی تھی۔ جنوبی امریکا کے تمام ملکوں سے تماشائی آئے تھے۔ یورپ اور افریقا کے بعض ممالک سے بھی شائق بحری جہازوں میں بھر کر یوراگوئے جا پہنچے۔ ان دنوں یوراگوئے تک جانے کا زمینی راستہ دشوار تھا اور بے شمار صعوبتیں تھیں اس کے باوجود ہر میچ میں اسٹیڈیم مکمل طور پر بھرے ہوئے تھے۔ سنسنی خیز مقابلوں اور پُرجوش فٹ بال نے میچز دیکھنے والوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ اس زمانے میں ٹی وی نہ تھا' صرف ریڈیو تھا لیکن اس کی نشریات بھی محدود تھیں لہٰذا شائقین کے لیے میچز سے لطف اندوز ہونے کے لیے سوائے اسٹیڈیم کا رخ کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس اوّلین ورلڈ کپ میں بے شمار دلچسپ واقعات پیش آئے۔ یورپ سے رومانیہ کی ٹیم نے شرکت کی۔ حالانکہ اس کے کھلاڑی ہرگز اتنی دور دراز کا سفر نہیں کرنا چاہتے تھے اور یہ سب مقامی کلبوں کے لیے کھیلتے تھے جبکہ ورلڈ کپ میں شرکت کرنے سے انہیں کچھ نہ ملتا۔ وہ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مقامی سیزن جاری تھا اور انہیں یہ خطرہ بھی تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے کلبس دوسرے کھلاڑیوں کو ملازم نہ رکھ لیں مگر رومانیہ کے بادشاہ کیرول نے فٹ بال ٹیم کو ورلڈ کپ میں حصہ لینے کا حکم دیا اور ساتھ ہی انہیں ضمانت دی کہ جب تین مہینے بعد وہ واپس آئیں گے تو ان کی ملازمتیں برقرار ہوں گی۔ اس یقین دہانی پر رومانیہ کی ٹیم بادل نخواستہ یوراگوئے روانہ ہوئی تھی۔ یہی حالت یورپ کی باقی ٹیموں کی تھی۔ وہ مجبوری کے عالم میں یوراگوئے گئی تھیں اور انہوں نے جنوبی امریکن ٹیموں کے برعکس بے دلی سے میچوں میں حصہ لیا تھا۔ دوسرا انوکھا واقعہ جو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد پیش آیا وہ فرانس اور ارجنٹائن کے میچ کے دوران میں پیش آیا۔ جب ریفری نے غلطی سے میچ ختم ہونے سے چھ منٹ پہلے وسل بجادی اور جب کچھ دیر بعد اس غلطی کا احساس ہوا تو بہ مشکل کھلاڑیوں کو دوبارہ جمع کیا گیا' ان میں سے بعض نہانے کے لیے غسل خانے کا رخ کر چکے تھے' انہیں وہاں سے لایا گیا اور چھ منٹ کے کھیل کو مکمل کیا گیا۔ یہ میچ دو کے مقابلے میں صفر گول سے ارجنٹائن نے جیت لیا تھا۔

ایک طرف فیفا نے پیشہ ور کھلاڑیوں کی مدد سے ورلڈ کپ کا کامیاب انعقاد کیا تو دوسری طرف اولمپک کمیٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا کہ اس نے فٹ بال جیسے مقبول اور عوامی کھیل کو باہر کر کے غلطی کی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اولمپک کمیٹی کسی صورت پیشہ ور کھلاڑیوں کو اولمپک میں حصہ لینے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھی' اس کا اصرار تھا کہ صرف غیر پیشہ ور کھلاڑی ہی اولمپک مقابلوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ شرط سراسر امیر ممالک کے حق میں تھی کیونکہ اولمپک میں کسی کھلاڑی کو کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں ادا کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں غریب ممالک (خاص طور سے جنوبی امریکن ممالک کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بھاری رقم خرچ کر کے ٹیم بھیجیں۔ یورپ کے ممالک کے حق میں یہ شرط سودمند تھی کہ وہ اپنے غیر پیشہ ور کھلاڑیوں کو بھی وہ سہولتیں مہیا کرتے تھے جو جنوبی امریکا کے غریب ممالک کے پیشہ ور کھلاڑی بھی نہیں حاصل کرپاتے تھے) یہ کشاکش آنے والے برسوں میں جاری رہی اور اس شرط کی وجہ سے یورپی ممالک کی فٹ بال کے اولمپک میڈل پر اجارہ داری رہی۔ ورلڈ کپ میں معاملہ اس کے برعکس ہے' جنوبی امریکا کے ممالک نے نو بار اور یورپی ممالک نے صرف آٹھ بار ورلڈ کپ جیتا ہے۔

یورپ سے اب تک سب سے زیادہ ممالک نے

انا للہ

ایک عالی شان پلازا کے سامنے شیطان کھڑا زار و قطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انسان بہت احسان فراموش مخلوق ہے۔ ایک راہ گیر نے شیطان کو آہ وزاری کرتے اور انسان کو برا بھلا کہتے دیکھا تو وہ رک گیا اور اس نے شیطان سے اس کی وجہ پوچھی۔ شیطان نے کہا "کروڑوں روپے مالیت کا یہ پلازا دیکھ رہے ہو؟" حاجی خدا بخش نے یہ پلازا میرے مشوروں پر عمل کے نتیجے میں حاصل شدہ سرمائے سے تعمیر کیا مگر جب یہ پلازا مکمل ہو گیا تو میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس کی پیشانی پر موٹے لفظوں میں "ھذا من فضلِ ربی" لکھوا دیا۔

ورلڈ کپ کے لیے کوالی فائی کیا ہے۔ اس کے بعد جنوبی امریکا پھر ایشیا اور آخر میں افریقا کے ممالک نے ورلڈ کپ کے آخری راؤنڈ میں شرکت کی ہے۔ ورلڈ کپ کوالی فائنگ راؤنڈ اس طرح سے کھیلے جاتے ہیں کہ پوری دنیا کو چھ گروپس میں تقسیم کر کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ ہر ملک اپنے حریف سے دو میچز کھیلتا ہے۔ ایک اپنے ملک میں اور دوسرا حریف کے ملک میں۔ لیگ میچوں کی بنیاد پر ممالک آگے آتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ فیفا کرتی ہے کہ کس گروپ سے کتنی ٹیمیں لینی ہیں۔ عام طور سے سب سے زیادہ ٹیمیں یورپ سے لی جاتی ہیں جیسے اس ورلڈ کپ میں یورپ کی تیرہ ٹیمیں شریک ہیں اور جنوبی امریکا کی شرکت چار ٹیموں تک محدود کر دی گئی ہے مگر مجموعی طور پر اوقیانوس پار سے سات ٹیمیں ورلڈ کپ میں حصہ لیں گی۔ ان میں تین شمالی امریکا سے ہیں۔ گروپ کے لحاظ سے ایشیا دوسرے نمبر پر ہے، جس کی پانچ ٹیمیں ورلڈ کپ کھیلیں گی۔ افریقا سے تین ٹیمیں ہیں۔ آسٹریلیا نے کوالی فائنگ راؤنڈ میں ورلڈ چیمپئن کو ہرایا تھا، اس بنیاد پر وہ ورلڈ کپ کھیلے گی۔ فائنل راؤنڈ میں بتیس بہترین ممالک کی ٹیمیں شرکت کرتی ہیں، جنہیں چار چار کر کے آٹھ گروپس میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر گروپ کی دو بہترین ٹیمیں لیگ مقابلوں کی بنیاد پر سولہ ٹیمیں پری کوارٹر فائنل مرحلے تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ یہ ناک آؤٹ مرحلہ انتہائی سنسنی خیز اور دلچسپ ہوتا ہے کیونکہ اس میں جو ٹیم ہار گئی وہ ورلڈ کپ سے باہر ہو جاتی ہے۔

یوراگوئے کی فتح سے ظاہر تھا کہ اس نے مقامی حالات اور اپنے تماشائیوں کی فتح سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پہلا ورلڈ کپ اپنے نام کرالیا۔ یوراگوئے آنے والی کئی دہائیوں تک فٹ بال کا سپر اسٹار رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے 1950ء میں برازیل میں برازیل کو ہی فائنل میں ہرا کر ساری دنیا کو ششدر رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا مگر بعد میں سیاسی کشیدگی اور خانہ جنگی نے ملک کے حالات کو متاثر کیا اور فٹ بال پر ان کی حکومت ختم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یوراگوئے کوالی فائنگ راؤنڈ میں ہی باہر ہو جاتی تھی۔ بہر حال اب یہ ٹیم اپنے شاندار ماضی کو واپس لانے کی کوشش کر رہی ہے۔

پہلے ورلڈ کپ کی شاندار کامیابی نے یورپی ممالک کو احساس دلایا کہ انہوں نے پہلے ورلڈ کپ کا بائیکاٹ کر کے حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ لہٰذا یورپی ممالک نے اپنی بائیکاٹ کی پالیسی بدلی اور اگلا ورلڈ کپ مانگ لیا۔ کیونکہ فیفا کے سارے عہدے داران یورپی تھے اس لیے اس کی یہ درخواست قبول کر لی گئی اور برازیل کے مقابلے میں اٹلی کو ترجیح دی۔ اٹلی کا رویہ شدید قسم کا نسل پرستانہ تھا اور اس کی فاشسٹ حکومت نے رنگ دار ممالک کو فیفا سے باہر کرنے کی تحریک چلا رکھی تھی اس لیے یوراگوئے نے اس کی پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ورلڈ کپ کے لیے اپنی ٹیم بھیجنے سے انکار کر دیا۔

اس بار کیونکہ خواہش مند ممالک کی تعداد زیادہ تھی اس لیے کوالی فائنگ راؤنڈز کا اہتمام کیا گیا اور کل سولہ ٹیمیں فائنل راؤنڈز میں پہنچیں۔ تب سے 1982ء کے ورلڈ کپ تک ٹیموں کی یہی تعداد رہی تھی اور ہر بار کوالی فائنگ راؤنڈ کھیل کر چودہ ٹیموں کا انتخاب ہوتا تھا۔ میزبان ملک اور گزشتہ فاتح خود بہ خود منتخب ہو جاتا تھا۔ اٹلی نے کھیلوں کے ان مقابلوں کو اپنی فاشسٹ پالیسیوں کی تشہیر کا ذریعہ بنا لیا جیسے جرمنی نے 1936ء کے اولمپکس میں اپنے نازی خیالات کا پرچار کیا تھا۔ اس زمانے میں یہ معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اٹلی کی فاشسٹ حکومت نے ان ممالک کے تماشائیوں کو آنے کی اجازت دی، جن سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ ان ممالک کی ٹیموں کو بھی سخت پابندیوں میں رکھا گیا۔ برازیل اس وقت فٹ بال کی نئی سپر پاور بننے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ مگر اپنی فاشسٹ پالیسی کے تحت اٹلی نے برازیل اور جنوبی امریکا کی دوسری ٹیموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ انہیں کم تر درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا اور آمدورفت کے لیے انہیں گھٹیا درجے کی لاریاں مہیا کی گئی تھیں۔ انہیں یورپی ٹیموں کے ساتھ پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

1934ء کے ورلڈ کپ میں اٹلی نے اپنی میزبانی سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور فائنل میں چیکوسلواکیا کو دو ایک سے

ہرا کر فائنل جیت لیا۔ یہ اٹلی کی ورلڈ کپ کی پہلی فتح بھی تھی۔
جنوبی امریکا کی ٹیمیں اس بار بجھی بجھی تھیں۔ ایک تو انہیں بے حد مخالفانہ ماحول ملا تھا' ہر میچ کے دوران میں ان پر نسلی امتیاز پر مبنی جملوں اور گالیوں کی بوچھار کی جاتی تھی۔ یورپی کھلاڑی کھل کر جنوبی امریکی ٹیموں کے خلاف رف کھیل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس کے برخلاف جنوبی امریکن کھلاڑی کی ذرا سی غلطی پر اسے تنبیہ کی جاتی تھی۔ یورپی تماشائیوں اور کھلاڑیوں کے جارحانہ رویے نے جنوبی امریکن ٹیموں کو اس حد تک دباؤ میں رکھا تھا کہ وہ اپنے اصل کھیل کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہ گئے تھے۔ پہلے ورلڈ کپ کے کھلے اور پُرجوش ماحول کی نسبت یہ ورلڈ کپ روکھا اور پابندیوں سے بھرپور تھا۔ بہرحال اس سے اتنا اثر ضرور ہوا کہ یورپ کے لوگوں نے پہلی بار فٹ بال کے کسی ٹورنامنٹ کا انعقاد دیکھا اور بین الاقوامی مقابلوں سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

ان دو ایونٹس نے ثابت کر دیا تھا کہ دنیا میں عوام کی حد تک فٹ بال سے زیادہ مقبول کھیل اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے فیفا نے مزید ایونٹس جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ براعظموں کی ٹیموں اور ممالک کی اپنی فٹ بال لیگ منظم کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا گیا تھا۔ مگر فیفا کی ان کوششوں کو جرمنی اور اٹلی کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا تھا کیونکہ یہ دونوں ممالک یورپ سے باہر فٹ بال کے فروغ کے مخالف تھے اور برطانیہ بھی کسی حد تک ان کا حامی تھا۔ خاص طور سے اٹلی چاہتا تھا کہ ورلڈ کپ ہمیشہ یورپ کی سرزمین پر ہو اور اس میں زیادہ سے زیادہ یورپی ٹیمیں حصہ لیں۔ خاص طور سے جنوبی امریکن ٹیموں کی تعداد کو محدود کیا جائے۔ اگر آج کے حالات میں دیکھا جائے تو پون صدی بعد اٹلی کی حکمتِ عملی کارگر رہی ہے۔ تیرہ یورپی ٹیموں کے مقابلے میں صرف چار جنوبی امریکن ٹیمیں ورلڈ کپ 2006ء میں شرکت کریں گی حالانکہ جنوبی امریکا سے کئی ایک ممالک جو ورلڈ کپ میں کوالی فائی نہیں کر پائے' ان کی فٹ بال کی ٹیموں کا معیار بہت اعلیٰ درجے کا ہے جیسے پیراگوئے اور کولمبیا۔

جنوبی امریکا کے ممالک کی پیش کش کے باوجود تیسرا ورلڈ کپ 1938ء کے لیے ایک بار پھر یورپ کو دے دیا گیا اور اس بار مقام فرانس تھا۔ اس ورلڈ کپ میں یوراگوئے اور ارجنٹائن بہ طور احتجاج شریک نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ فیفا نے ان ممالک کی جانب سے ورلڈ کپ کرانے کی پیش کش رد کر دی تھی۔ یوں یوراگوئے کی ٹیم اپنے سنہری دور میں دو بار ورلڈ کپ مقابلوں سے باہر رہی۔ اس وقت یوراگوئے کا جو معیار تھا اور اسے جس پائے کے کھلاڑیوں کی خدمات حاصل تھیں' اس کا دوسری اور تیسری بار ورلڈ کپ جیت لینا تعجب انگیز نہیں ہوتا۔ مزید بدقسمتی کہ 1942ء اور 1946ء میں جنگ عظیم کی وجہ سے ورلڈ کپ سرے سے منعقد ہی نہیں کیے گئے حالانکہ جنوبی امریکا میں ان کا انعقاد عین ممکن تھا۔ کیونکہ جنگ کبھی اس براعظم تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ واحد براعظم تھا جو دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا تھا۔ مگر فیفا کے عہدے داران نے جنگ کا بہانہ کر کے ان سالوں میں ورلڈ کپ کا انعقاد موخر رکھا تھا' اس کی بڑی سادہ سی وجہ تھی۔ یورپی ٹیمیں تیاری میں نہیں تھیں۔ پورے یورپ میں جنگ کا میدانِ گرم تھا اور کھیل کے سارے میدان ٹھنڈے پڑے تھے۔ ان حالات میں ورلڈ کپ کھیلا جاتا تو میدان یقیناً کسی جنوبی امریکن ٹیم کے ہاتھ رہتا۔ اس لیے سرے سے ورلڈ کپ منعقد ہی نہیں کیا گیا تھا۔

جنگ عظیم سے پہلے آخری ورلڈ کپ میں فاتح ایک بار پھر اٹلی رہا۔ اس نے فائنل میں ہنگری کو بہ آسانی ہرا دیا مگر اٹلی کی آسان فتح کی وجہ یوراگوئے اور ارجنٹائن کا ایونٹ سے باہر ہونا تھا۔ ورنہ نتیجہ مختلف بھی ہو سکتا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد اگرچہ 1946ء میں کہیں محاذ گرم نہیں تھا مگر یورپ جس تباہی سے دوچار ہوا تھا' فوری طور پر اس کے ممالک کی ٹیمیں بین الاقوامی مقابلے کے لیے تیار نہیں تھیں لہٰذا جنوبی امریکا کے ممالک کو ایک بار پھر صبر کرنا پڑا تھا۔ اس بار ورلڈ کپ ملتوی ہونے پر جنوبی امریکن ممالک نے سخت ترین ردِعمل ظاہر کیا تھا' خاص طور سے فیفا کی رکنیت چھوڑنے کی دھمکی نے فیفا کے ہوش اڑا دیے تھے۔ لہٰذا 1950ء میں کسی یورپی ملک کی جانب سے ورلڈ کپ کے لیے میزبانی پر نہ آمادہ ہونے کی وجہ سے جنوبی امریکا کے سب سے بڑے ملک برازیل کو ورلڈ کپ کی میزبانی دے دی گئی۔

اٹھارہ سال بعد ورلڈ کپ کو دوبارہ اپنے ہاں پا کر جنوبی امریکن خوشی سے پاگل ہو گئے اور اس ایونٹ کے لیے جوش وخروش سے تیاری شروع کر دی گئی تھی۔ برازیل نے ان میچوں کے لیے اتنے بڑے اسٹیڈیمز بنائے تھے کہ نہ تو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد اتنے بڑے اسٹیڈیم بنوائے گئے تھے۔ ریوڈی جنرو کے جس اسٹیڈیم میں ورلڈ کپ کا فائنل کھیلا گیا تھا' اس میں تقریباً دو لاکھ افراد آئے تھے۔ اس سے پہلے کبھی کسی میچ میں اتنے تماشائی نہیں آئے تھے۔ کسی بھی کھیل میں اتنے تماشائی نہیں آئے تھے۔ سرکاری طور پر تماشائیوں کی تعداد ایک لاکھ ننانوے ہزار آٹھ سو

جون 199854 4 تھی۔ اتفاق سے اس کے بعد بھی تماشائیوں کی جو موجودگی کا ریکارڈ ہے' وہ بھی ایک فٹ بال میچ کا ہی ہے۔ 1977ء میں ورلڈ کپ کا کوالی فائنگ راؤنڈ کھیلنے کے لیے برازیل اور کولمبیا کے درمیان میچ تھا جسے دیکھنے کے لیے مارا کانا اسٹیڈیم میں ایک لاکھ باسٹھ ہزار سات سو چونسٹھ 162764 تماشائی آئے تھے۔

یوراگوئے نے ایک بار پھر فٹ بال میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا اور فائنل میں برازیل کو حیران کن شکست سے دوچار کیا کیونکہ اس پورے ٹورنامنٹ کے دوران میں برازیل نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناقابلِ شکست رہ کر فائنل تک رسائی حاصل کی تھی۔ یوراگوئے نے اگرچہ فائنل تک رسائی حاصل کی تھی مگر اس کا کھیل اتنا اچھا نہیں تھا کہ ماہرین اور تماشائی اس سے فائنل جیت لینے کی امید کرتے۔ یہ فٹ بال کی زوال پذیر طاقت کی آخری جھلکیاں بھی تھیں کیونکہ اس کے بعد یوراگوئے کئی ایک ورلڈ کپس میں شریک ہوئی مگر اسے فائنل تک رسائی نصیب نہ ہوئی۔ یوراگوئے کی جگہ برازیل اور ارجنٹائن جنوبی امریکا سے فٹ بال کی نئی طاقتیں بن کر سامنے آئیں۔ خاص طور سے برازیل کا کھیل گزشتہ نصف صدی کے دوران میں انتہائی شاندار رہا ہے۔ اس نے نہ صرف پانچ بار ورلڈ کپ جیتنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے بلکہ برازیل کو سب سے زیادہ فٹ بال ورلڈ کپس فائنل کھیلنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

تیسرے عالمی کپ سے یہ قانون بنا کہ میزبان اور سابقہ چیمپین خود بہ خود ورلڈ کپ میں شرکت کے حق دار ہوں گے اور انہیں کوالی فائنگ راؤنڈ نہیں کھیلنا پڑیں گے۔ اس لیے چوتھے ورلڈ کپ میں چیمپین اٹلی اور میزبان برازیل بغیر کوالی فائی راؤنڈ کے شریک ہوئے تھے۔ 1954ء کا ورلڈ کپ ایک بار پھر یورپ میں ہوا اور میزبانی سوئٹزرلینڈ کو دے دی گئی جس کا عالمی فٹ بال میں خاص مقام نہیں تھا۔ اس بار بھی ارجنٹائن کی میزبانی کی درخواست مسترد کردی گئی۔ سوئٹزرلینڈ کو صرف اس لیے میزبانی دی گئی کہ ایک تو وہ مالی لحاظ سے مضبوط ملک تھا دوسرے میزبان ہونے کے ناتے اسے ورلڈ کپ میں شرکت کا موقع ملتا اس طرح ایک یورپی ٹیم کا اور اضافہ ہوتا۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں نسل پرستانہ جذبات اگرچہ دب گئے تھے مگر جنوبی امریکا کو اب بھی یورپ کا حریف تصور کیا جاتا تھا اور اسے فیفا کے معاملات سے لے کر عالمی کپ کی میزبانی کے حصول تک ہر معاملے میں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یورپی ممالک فٹ بال پر جنوبی امریکن ممالک کی برتری سے خائف تھے اور اس برتری کو میدان سے باہر ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے جیسے انہوں نے ہاکی میں کیا۔ ایشیائی ممالک خاص طور سے بھارت اور پاکستان کی برتری ختم کرنے کے لیے انہوں نے گھاس کے میدان کے بجائے آسٹروٹرف پر ہاکی شروع کرائی اور نتیجے میں یہ دونوں ایشیائی ممالک اپنی برتری کھو بیٹھے۔ ایک زمانے میں فٹ بال کو بھی مصنوعی گھاس پر کرانے کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن تمام ہی رکن ممالک نے اس کی شدید مخالفت کی تھی اس لیے یہ تجویز مسترد ہوگئی۔

جنگ عظیم کے بعد جب یورپی ممالک تعمیرِ نو کے مرحلے سے گزرے تو کھیلوں کی طرف بھی توجہ دی۔ عوام میں بے حد مقبولیت کے پیش نظر فٹ بال کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ تمام یورپی ممالک میں کلب کی سطح اور مقامی فٹ بال لیگ کو آرگنائز کیا گیا تھا۔ جنگ کے بھیانک اثرات کے خاتمے کے لیے لوگوں کو کھیلوں کی تفریحات کی طرف راغب کیا جارہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فٹ بال یورپ کا مقبول ترین کھیل بن گیا۔ 1954ء کے ورلڈ کپ کا فائنل برن میں ہنگری اور جرمنی کے درمیان کھیلا گیا جسے دیکھنے کے لیے ریکارڈ تعداد میں لوگ آئے تھے۔ اس سے پہلے یورپ میں کسی کھیل کے میدان میں اتنے تماشائی جمع نہیں ہوئے تھے۔

اس ورلڈ کپ کی خاص بات یہ تھی کہ پہلی بار میچز براہِ راست ٹی وی پر نشر کیے گئے تھے اور یورپ کے کروڑوں ناظرین نے یہ میچز دیکھے۔ فائنل میں ایک موقع پر جرمنی دو گول سے خسارے میں تھی اور اس کی شکست سامنے نظر آرہی تھی مگر میچ کے آخری لمحات میں جرمنوں نے لگاتار تین گول کر کے فائنل تین دو سے جیت لیا۔ جرمنی میں اسے معجزۂ برن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فٹ بال کے معاملات پر یورپ کی گرفت مضبوط تر ہوتی جارہی تھی۔ معاشی ترقی کی وجہ سے یورپ کی مالی حالت جنوبی امریکن ممالک سے بدرجہا بہتر ہوگئی تھی اس لیے لگاتار تیسرا ورلڈ کپ بھی یورپ کو دے دیا گیا اور اس بار میزبان سویڈن ٹھہرا تھا۔ سویڈن کی ٹیم کا شمار آغاز سے یورپ کی چند بہترین ٹیموں میں ہوتا تھا۔ جب اسے ورلڈ کپ ملا تو پوری قوم اپنی ٹیم کی پشت پر آ کھڑی ہوئی تھی اور اپنی ٹیم کو ونر بنانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جانے لگے تھے۔ سویڈن سرد ملک ہے اور وہاں کے باشندے زیادہ جفاکش ہوتے ہیں۔ سویڈن نے میدانوں میں ایسی گھاس لگائی جس پر بھاگنا آسان نہیں تھا اور گرم ممالک سے تعلق رکھنے والے فٹ بالر اس گھاس پر

برازیل کے پیلے نے جب 1958ء کے ورلڈکپ کا فائنل کھیلا تو اس کی عمر صرف سترہ سال اور دو سو انچاس دن تھی۔ فائنل میں شرکت کرنے والا وہ سب سے کم عمر کھلاڑی ہے۔ البتہ ورلڈکپ میں سب سے کم عمر کھلاڑی کا اعزاز آئرلینڈ کے نارمن وائٹ ہیڈ کے پاس ہے۔ اس نے یوگوسلاویہ کے خلاف 1982ء کے ورلڈکپ میچ میں شرکت کی تو اس کی عمر صرف سترہ برس اور بیالیس دن تھی۔ جبکہ معمر ترین کھلاڑی کیمرون کا بوڑھا شیر راجر ملا ہے۔ اس نے 1994ء میں روس کے خلاف میچ میں بیالیس سال اور انتالیس دن کی عمر میں حصہ لیا۔ افسوس کہ کیمرون اگلے ورلڈکپ میں کوالی فائی نہ کرسکی ورنہ شاید راجر ملا چھیالیس سال کی عمر میں بھی ورلڈکپ میں حصہ لیتا۔

جلد تھک جاتے۔ ظاہر ہے اس پالیسی کا نشانہ جنوبی امریکن ٹیمیں تھیں کیونکہ ان میں سے اکثر گرم مرطوب ممالک سے تعلق رکھتی تھیں مگر جب فائنل میں برازیل، سویڈن کے مدِمقابل آیا تو نوعمر پیلے کی شاندار کارکردگی کی وجہ سے برازیل نے مقابلہ بہ آسانی جیت لیا۔ سترہ سالہ پیلے نے دو گول کیے تھے۔ اس سے پہلے وہ سیمی فائنل میں فرانس کے خلاف ہیٹ ٹرک کرچکا تھا۔ یہ کسی بھی نوعمر کھلاڑی کی طرف سے سب سے شاندار کارکردگی تھی۔ محض ایک سال پہلے پیلے کو برازیل کے سب سے بڑے فٹ بال کلب میں شامل کیا گیا تھا جس میں شمولیت کسی بھی معروف کھلاڑی کے لیے اعزاز کی بات تھی۔ 1958ء کے اس ورلڈکپ کو بجا طور پر نوجوان پیلے کا ورلڈکپ کہا جاسکتا ہے۔

جب برازیلین کلب سانتوس (SANTOSS) نے پیلے کو اپنے اسکواڈ میں شامل کیا تب ہی سے فٹ بال ماہرین اس نوجوان کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کرنے لگے تھے۔ کم عمری میں اس کے کھیل میں ایسی پختگی نظر آتی تھی جو دوسرے فٹ بالر برسوں کے تجربے کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق پیلے جیسا برق رفتار اور درست ترین فٹ بال کھیلنے والا کوئی اور نہ تو پہلے آیا اور نہ ہی کبھی بعد میں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پیلے کو جادوگر فٹ بالر بھی کہا جاتا ہے۔

1962ء کے ورلڈکپ کے موقع پر ساری دنیا کی نظریں برازیل اور پیلے پر مرکوز تھیں۔ میزبانی کا مقابلہ اس بار جنوبی امریکا نے جیت لیا اور فیفا نے رکن ممالک کے زبردست دباؤ میں ساتواں ورلڈکپ جنوبی امریکا کے مرچ نما ملک چلی کو دے دیا۔ اتفاق سے چلی کے معنی بھی مرچ کے ہیں۔ یہ ملک شمالاً جنوباً کئی ہزار میل لمبا ہے لیکن کہیں سے بھی اس کی چوڑائی ڈیڑھ سو میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اٹلس پر اسے دیکھیں تو یہ لمبی اور سوکھی مرچ کی طرح نظر آتا ہے۔ چلی کو میزبانی دینے پر کئی یورپی ممالک نے اعتراض کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چلی جیسے غریب ملک میں اتنے بڑے ایونٹ کا انعقاد ممکن نہیں ہے مگر فیفا نے رکن ممالک کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے چلی کو میزبانی دے دی۔ تمام جنوبی امریکن ملکوں نے چلی کو مالی امداد دینے اور ورلڈکپ کے انعقاد کو کامیاب بنانے میں مدد دینے کا فیصلہ کیا۔

سولہ میں سے سات ٹیمیں یورپ کی تھیں اور صرف پانچ جنوبی امریکا سے تعلق رکھتی تھیں۔ ٹورنامنٹ کے آغاز سے پہلے ہی برازیل کی ٹیم کو اس وقت دھچکا لگا جب پیلے زخمی ہونے کے باعث ٹورنامنٹ سے خارج ہوگیا۔ حالانکہ تمام نظریں اس پر مرکوز تھیں اور ماہرین پیش گوئی کررہے تھے کہ پیلے ایک بار پھر برازیل کو عالمی چیمپئن بنوادے گا۔ ماہرین کی برازیل کے عالمی چیمپئن بننے کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ پیلے کے نہ ہونے کے باوجود برازیلی کھلاڑیوں نے ہمت نہ ہاری۔ ایک کے بعد ایک فتح حاصل کرتے فائنل تک جا پہنچے جہاں برازیل کا مقابلہ یورپ کی حیران کن ٹیم چیکوسلواکیا سے تھا۔ چیکوسلواکیا کو حیران کن ٹیم اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اکثر غیر متوقع طور پر اپنے سے کہیں طاقت ور ٹیم کو شکست دے دیا کرتی تھی۔ مگر چلی ورلڈکپ میں چیکوسلواکیا کی ٹیم حیران کن کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکی اور پیلے کی عدم موجودگی کے باوجود برازیل نے بہ آسانی چیکوسلواکیا کو تین ایک سے شکست دے دی۔

1960ء کے عشرے تک دنیا جنگ عظیم کے صدمات سے سنبھل چکی تھی۔ ٹیکنالوجی میں ترقی سے ہر شعبے میں نت نئی ایجادات سامنے آرہی تھیں۔ وہ دن گئے جب کھلاڑی ایک براعظم سے دوسرے براعظم کا سفر ہفتوں میں طے کرتے تھے۔ نئے مسافر بردار طیارے سامنے آگئے تھے جو چوبیس گھنٹے سے بھی پہلے دنیا کے بعید ترین خطے تک پہنچادیا کرتے تھے۔ ٹیلی وژن بھرپور طریقے سے گھر کی تفریح کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ اب اسٹیڈیم میں جاکر میچ دیکھنا ضروری نہیں تھا۔ ٹی وی گھر بیٹھے میچ زیادہ بہتر طریقے سے مع کمنٹری دکھادیا کرتا تھا۔ طیاروں کی وجہ سے کھلاڑیوں کے لیے موقع پیدا ہوا کہ وہ دوسرے ملک جاکر لیگ کھیل سکیں اور دولت کمائیں۔

اس عشرے کو فٹ بال کی ترقی کا عشرہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ یورپ کے کروڑ پتی شوقین حضرات اپنی ذاتی فٹ بال ٹیمیں بنا رہے تھے اور منہ مانگے معاوضے پر بہترین کھلاڑیوں کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ یورپ کی حد تک بیسویں صدی کے آغاز میں فٹ بال کو پیشہ ور کھیل کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی مگر اس میں کھلاڑیوں کو سوائے لگی بندھی تنخواہوں کے کچھ نہیں ملتا تھا اور یہ تنخواہ بھی بس اتنی ہوتی تھی کہ کھلاڑی گزارا کر سکیں۔ اوّلین ورلڈ کپ میں یورپ کے کئی ملک اس وجہ سے اپنی ٹیم نہ بھیج سکے تھے کہ ان کے کھلاڑیوں نے ملازمت ختم ہوجانے کے خوف سے ورلڈ کپ کھیلنے کے لیے جنوبی امریکا جانے سے انکار کر دیا تھا۔

جنگ عظیم کے بعد بھی فٹ بال کے کھلاڑیوں کے لیے حالات بہتر نہیں ہوئے تھے مگر جب ٹی وی نے براہِ راست فٹ بال میچز دکھانے شروع کیے تو صورت حال ہی بدل گئی۔ ناظرین اب ٹکٹ لیے بغیر اپنے پسندیدہ فٹ بالر کو ٹی وی اسکرین پر ایکشن میں دیکھ سکتے تھے۔ ٹی وی کوریج سے پہلے جس میچ سے پچاس ساٹھ ہزار افراد ہی لطف اندوز ہو سکتے تھے اب ان سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہوگئی تھی۔ ٹی وی کوریج اور فٹ بال سے دلچسپی نے مشتہرین کو میچوں کے دوران میں اپنے اشتہارات دکھانے پر اکسایا، اس سے ٹی وی چینلو اور فٹ بال کلبوں کے وارے نیارے ہوگئے تھے۔ اس مسابقت نے کلبوں کو اکسایا کہ وہ بہتر سے بہتر کھلاڑی کی خدمات حاصل کریں۔ مقابلے بازی کی وجہ سے اچھے کھلاڑیوں کو تنخواہوں کے بجائے خطیر سالانہ معاوضے پر رکھا جانے لگا اور یہ معاوضہ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں اور پھر لاکھوں سے بڑھ کر ملین ڈالرز تک جا پہنچا۔ اب یہ حال ہے کہ اچھے فٹ بالر کے لیے کئی ملین ڈالرز سال میں کمالینا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ جب میراڈونا کھیلنے کے لیے یورپ آیا تو اسے سب سے خطیر معاوضہ دیا گیا تھا۔ اسے چالیس ملین ڈالرز تین سال کے لیے ادا کیے گئے تھے اور اسے ایک گول کے عوض تیس ہزار پاؤنڈز کی اضافی رقم دی جاتی تھی۔ یہی نہیں اسپانسر شپ اور دوسرے ذرائع سے وہ الگ کماتا تھا۔ یہ دس سال پرانی بات ہے، آج کل اسٹارز فٹ بالرز کے معاوضے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک کھلاڑی جب کسی کلب سے معاہدہ کرتا ہے تو وہ اس کا اثاثہ بن جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کلب بھاری رقم کے عوض اس کھلاڑی کے حقوق کسی دوسرے کلب کے حوالے کر دیتا ہے اور کھلاڑی کو اپنی مرضی کے خلاف اس کلب کی

دنیا کی کئی ٹیمیں ایسی ہیں جنھوں نے ورلڈ کپ میں حصہ لیا لیکن اب وہ کسی ورلڈ کپ میں حصہ نہیں لے سکیں گی کیونکہ دنیا سے ان ممالک کا نام مٹ چکا ہے۔ ان میں سب سے اہم ملک سابقہ سوویت یونین ہے جو 1992ء میں پندرہ ممالک میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ان میں سے کئی ملک اب نئے ناموں سے ورلڈ کپ میں شرکت کر چکے ہیں، اس طرح مشرقی جرمنی اور یوگوسلاویہ کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ مشرقی جرمنی، مغربی جرمنی میں ضم ہو کر ایک ملک بن گیا ہے جبکہ یوگوسلاویہ اپنے قبلہ وکعبہ سوویت یونین کی طرح کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ چیکوسلواکیا کا ملک بھی جمہوریہ چیک اور سلواک ریاستوں میں بٹ چکا ہے۔

طرف سے کھیلنا پڑتا ہے مگر اسے معاہدے کے وقت جتنا خطیر معاوضہ دیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی جانب سے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ 1954ء کے ورلڈ کپ تک فٹ بالر مقامی سطح پر جانے پہچانے جاتے تھے مگر 1960ء تک یہ بین الاقوامی سطح پر مشہور ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ صرف ٹی وی کوریج تھی۔

یورپین کلب لیگ کا سب سے زیادہ فائدہ جنوبی امریکا اور افریقا کے ان اسٹار فٹ بالرز کو ہوا جنھیں ان کے ملک میں زیادہ معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ پھر یورپین چیمپئن شپس موسم گرما میں ہوتی ہیں جبکہ جنوبی امریکا، افریقا اور ایشیا میں سرما میں فٹ بال لیگ ہوتی ہے اس لیے کھلاڑی بیک وقت اپنی مقامی لیگ بھی کھیل سکتے تھے اور یورپین لیگ بھی۔ ساری دنیا کے اسٹار فٹ بالرز یورپ میں ایکشن میں نظر آئے تو اس سے تماشائیوں کا شوق مزید بڑھا تھا۔ مختلف طرح کے فٹ بال کا حسین امتزاج دیکھنے میں آتا تھا۔ یورپین شائقین نے جب جنوبی امریکن، سنسنی خیز اور جوش وولولے سے بھرپور فٹ بال اپنی سرزمین پر دیکھی تو مجبوراً یورپین کوچز کو اپنی ٹیموں کے کھیل میں تیزی اور جوش لانا پڑا۔ یہ حقیقت ہے، یورپ میں اب جنگ عظیم سے پہلے کی پُرسکون اور سست رو فٹ بال متروک ہو چکی ہے اور جنوبی امریکن انداز کے امتزاج سے ایسی دلکش فٹ بال وجود میں آگئی ہے جس نے ایک دنیا کو اپنے سحر میں لے رکھا ہے۔

برطانیہ اگرچہ فٹ بال کے کھیل کا موجد ہے لیکن بین الاقوامی فٹ بال میں اس کا حصہ دوسری جنگ عظیم تک نہ ہونے کے برابر تھا۔ 1920ء میں برطانیہ نے FIFA کی

رکنیت بھی ترک کردی تھی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ ان ملکوں سے فٹ بال نہیں کھیلنا چاہتا تھا جن سے اس کے سیاسی تنازعات تھے یا جن ملکوں سے اس کی جنگ جاری تھی۔ جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کی توجہ اپنے ملک کی تعمیرِ نو پر مرکوز تھی۔ اس دوران میں کھیلوں کی بحالی پر بھی توجہ دی گئی۔ انگلینڈ کا قومی کھیل اگرچہ ہاکی ہے اور وہاں اوپری طبقہ کرکٹ کا شیدائی ہے مگر ہر ملک کے عوام کی طرح برطانوی عوام بھی جنون کی حد تک فٹ بال کے دیوانے ہیں۔ انگلش لیگ دنیا کے چند مقبول ترین مقامی فٹ بال ایونٹس میں سے ایک ہے۔

1966ء کا ورلڈ کپ برطانیہ کے حصے میں آیا اور یہ اس کا حق بھی تھا۔ چھ کروڑ برطانوی عوام اپنی سرزمین پر دنیا بھر کے اسٹارز کھلاڑیوں کو ایکشن میں دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ چلی کا ورلڈ کپ ایک ترقی پذیر ملک میں تھا جو دنیا کے بعید ترین خطے میں واقع تھا۔ وہاں ٹی وی کوریج بھی ممکن نہیں تھی اور لوگوں نے ریڈیو پر اپنی ٹیموں کے میچوں کا احوال سنا تھا۔ اس وقت ٹی وی کی نشریات مصنوعی سیارے سے نہیں کی جاتی تھیں لیکن جب ورلڈ کپ برطانیہ میں آیا تو مصنوعی سیاروں کی ٹیکنالوجی ترقی کر رہی تھی اور اس ورلڈ کپ کے دوران میں پہلی بار ٹی وی نشریات مصنوعی سیارے کے ذریعے دوسرے ممالک میں دکھائی گئی تھیں۔

اب تک فٹ بال ورلڈ کپ ایک خسارے کا سودا تھا۔ جس میں ورلڈ کپ کے میزبان کو اپنی جیب سے لگانا پڑتا تھا اور اسے حاصل وصول کم ہوتا تھا۔ برطانوی قوم ہمیشہ سے تاجر ہے اور کچرا بھی سونے کے بھاؤ بیچنے کی ماہر ہے۔ پہلی بار ورلڈ کپ کی باقاعدہ مارکیٹنگ کی گئی۔ اس کے لوگو بنائے گئے اور مختلف اقسام کے حقوق فروخت کیے گئے۔ ٹی وی کے حقوق بھی پہلی بار فروخت ہوئے اور پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی ملک نے فٹ بال ورلڈ کپ سے نفع کمایا ہو۔ برطانیہ نے صرف نفع ہی نہیں کمایا۔ بلکہ اس نے ورلڈ کپ بھی جیت لیا۔ برازیل اور پیلے جادوگری دکھانے میں ناکام رہے اور فائنل جرمنی اور برطانیہ کے درمیان ہوا تھا دونوں روایتی حریف بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کے گول پر حملے کرتے رہے اور مقررہ وقت تک میچ دو دو گول سے برابر رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی فائنل اضافی وقت تک گیا تھا۔ اضافی وقت میں برطانوی ٹیم ایک نئے جوش و جذبے کے ساتھ میدان میں اتری تھی اور اس کے فارورڈ جیف ہرسٹ نے لگاتار دو گول کر کے اپنی ٹیم کو فتح دلوادی۔ جیف ہرسٹ اولین کھلاڑی تھا جس نے عالمی کپ کے فائنل میں ہیٹ ٹرک اسکور کی۔ اس روز برطانیہ میں جشن کا سماں تھا۔ کروڑوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اتنا بڑا ہجوم اس سے پہلے اکیس برس گزرے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے دن دیکھنے میں آیا تھا۔ یہ برطانیہ کا اکلوتا اعزاز بھی ہے' اس سے پہلے اور اس کے بعد اس نے دوبارہ عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل نہیں کیا۔

1970ء کے ورلڈ کپ کی میزبانی کا اعزاز پہلی بار یورپ اور جنوبی امریکا کے باہر کسی ملک کو دیا گیا تھا اور یہ ملک شمالی امریکا کا میکسیکو تھا۔ اس ورلڈ کپ کی خاص بات پہلی بار ٹی وی پر رنگین میچوں کی نشریات تھیں جو مصنوعی سیارے کے ذریعے سمندر پار تک دکھائی گئی تھیں۔ اس ورلڈ کپ کو ٹی وی پر پچاس کروڑ سے زیادہ افراد نے دیکھا تھا۔ اس ورلڈ کپ میں پہلی بار یلو اور ریڈ کارڈ متعارف کرائے گئے اور متبادل کھلاڑی کو میدان میں اترنے کی اجازت ملی تھی۔ رنگارنگ تقریبات' پُرجوش جارحانہ فٹ بال' بہترین موسم اور داد دیتے تماشائیوں کی وجہ سے یہ یادگار ترین ورلڈ کپ ثابت ہوا تھا۔

برازیل اس عالمی کپ میں اپنے کپتان کارلوس البرٹو کی قیادت میں ایک نئے جوش سے اترا تھا۔ پیلے کی عمر زوال پذیر تھی لیکن اس کا کھیل بدستور جوان تھا۔ انگلستان کے خلاف گول کیپر گورڈن بینکس کے دیوار بن جانے کے باوجود پیلے نے برازیل کو ایک صفر سے فتح دلادی۔ بینکس نے اپنے دفاع سے ماہرین کو حیران کردیا تھا۔ افسوس کہ یہ بہترین گول کیپر ایک حادثے میں اپنی ایک آنکھ گنوا کر اپنا کیریر قبل از وقت ختم کر بیٹھا تھا۔

جرمنی کے تیور بھی جدا تھے۔ اس کے فارورڈ گریڈ مولر نے پورے ٹورنامنٹ میں دس گول کردیے' جو آج بھی ایک ریکارڈ ہے۔ کوارٹر فائنل میں جرمنی کا مقابلہ انگلینڈ سے تھا۔ جرمنی ایک موقع پر دو صفر کے خسارے میں تھا لیکن گریڈ مولر کے شاندار کھیل کی وجہ سے پہلے جرمنی نے مقررہ وقت میں دونوں گول برابر کیے اور پھر اضافی وقت میں تیسرا گول کر کے بازی جیت لی اور پچھلے عالمی کپ کے فائنل کی شکست کا بدلہ چکادیا۔ مگر اگلے میچ میں اٹلی نے بازی بالکل اسی انداز میں الٹ دی کہ اٹلی جرمنی کے مقابلے میں تین صفر کے خسارے میں تھا لیکن پھر رومنوں نے بال قبضے میں کی اور یکے بعد دیگرے تین گول کر کے میچ برابر کردیا۔ اضافی وقت میں مزید ایک گول کر کے اٹلی نے نہ صرف سیمی فائنل جیت لیا بلکہ یورپ کے ماہرین فٹ بال کے نزدیک فائنل کی فیورٹ کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔

دوسرے سیمی فائنل میں یوراگوئے نے برازیل کے

خلاف معمولی مزاحمت کی اور مقررہ وقت میں تین ایک سے ہتھیار ڈال دیے۔ ماضی کی فٹ بال کی سپر پاور اب اپنے اچھے دنوں کو یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر برازیل اس وقت کی سپر پاور تھی اور اس کے کھیل نے ایک دنیا کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ جب برازیلی ٹیم اپنے شاہانہ کھیل پر آتی تو وہ یہ نہیں دیکھتی تھی کہ اس کے مدمقابل کون سی ٹیم ہے اور اس میں کتنے اسٹارز فٹ بالر کھیل رہے ہیں۔

فائنل ایک بار پھر جنوبی امریکن عوام کے لیے جشن اور یورپ کے لیے افسردگی کا موقع لایا۔ اطالوی ٹیم اچھا کھیلی لیکن برازیل کی ٹیم سپر کھیل رہی تھی اس نے اسٹارز پر مبنی اطالوی ٹیم کو بچوں کی طرح کھلایا اور چار ایک سے بہ آسانی مقابلہ جیت کر ایک بار پھر ورلڈ کپ حاصل کر لیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جنوبی امریکن ٹیموں نے اکثر یورپی ٹیموں کے خلاف فائنل کھیل کر ورلڈ کپ جیتا۔ صرف دو بار یوراگوئے نے ارجنٹائن اور برازیل کو ہرا کر 1930ء اور 1950ء کے ورلڈ کپ جیتے تھے۔ سات بار جنوبی امریکن ٹیموں نے فائنل میں یورپی ٹیموں کو ہرا کر ورلڈ کپ جیتا جبکہ یورپی ممالک نے اکثر آپس میں فائنل کھیل کر ورلڈ کپ میں کامیابی حاصل کی۔ اتفاق سے دو ہی بار یورپی ٹیم نے فائنل میں جنوبی امریکن ٹیم کو ہرایا۔ پہلا موقع 1990ء کے ورلڈ کپ کے فائنل میں آیا جب جرمنی نے ارجنٹائن کو ایک صفر سے شکست دی اور دوسری بار 1998ء کے ورلڈ کپ فائنل میں فرانس نے زین الدین زیدان کی کرشماتی کارکردگی کی بدولت برازیل کو تین صفر کی حیران کن شکست سے دوچار کیا تھا۔ چھ بار یورپی ٹیموں نے آپس میں فائنل کھیلتے ہوئے ٹائٹل حاصل کیا تھا۔

تیسری بار جولیس ریمٹ ٹرافی جیتنے پر فیفا نے یہ تاریخی ٹرافی مستقل طور پر برازیل کو دے دی۔ ایک طرح سے دنیائے فٹ بال میں یہ برازیل کی مکمل برتری کا اظہار تھا۔ فیصلہ ہوا کہ اگلے ورلڈ کپ کے لیے اسی طرح کی نئی ٹرافی بنائی جائے گی۔ اس ورلڈ کپ کے موقع پر اگلے میزبان کا اعلان کر دیا گیا۔ جو جرمنی تھا۔ ایک بے حد شاندار تقریب میں 1970ء کا ورلڈ کپ اختتام کو پہنچا۔ برازیل کے لیے خاص بات تھی کہ اس کی طرف سے اس کے سپر اسٹار اور دنیا کے بہترین فٹ بالر پیلے کی ورلڈ کپ میں آخری شرکت تھی۔ برازیل کے ہی ماریو زاگالو کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس نے ورلڈ کپ میں کھلاڑی اور ٹیم منیجر کے طور پر شرکت کی اس سے پہلے وہ 1962ء کا ورلڈ کپ کھیل چکا تھا۔ وہ یہ اعزاز حاصل

> اس ورلڈ کپ میں تین مسلم ممالک ایران، سعودی عرب اور تیونس بھی حصہ لے رہے ہیں۔ ان سے اچھی کارکردگی کی توقع ہے لیکن دھماکا خیز کارکردگی کی نہیں۔ امید ہے پہلی ٹاپ ٹین ٹیمیں ہی کوارٹر فائنلز میں جگہ حاصل کر سکیں گی۔ برازیل کے بعد جس ٹیم پر سب سے زیادہ دنیا والوں کی نظر ہے، وہ جنوبی کوریا کی سرخ جرسی والی ٹیم ہے۔ پچھلے ورلڈ کپ میں اس نے سرخ شیطان کی عرفیت حاصل کی تھی۔ میزبان جرمنی چوتھی بار ورلڈ کپ حاصل کرنے کے لیے پرعزم ہے لیکن ورلڈ کپ کی سترہ بار کی تاریخ میں یہ کپ صرف چھ بار میزبان ملک کے ہاتھ میں آیا ہے۔

کرنے والا واحد کھلاڑی بھی تھا۔ جرمنی کا یوئے میلر اور برازیل کے پیلے نے چار ورلڈ کپس میں شرکت کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اسرائیل کی ٹیم نے پہلی بار کسی عالمی ایونٹ میں شریک کی لیکن پہلے ہی راؤنڈ میں باہر ہوگئی۔

1970ء کے ورلڈ کپ سے فٹ بال کی کمرشل اہمیت میں اضافہ ہوا تھا۔ 1974ء میں جرمنی کے عالمی کپ نے مالی لحاظ سے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ جرمنی میں ہونے والے اس ورلڈ کپ نے فٹ بال کی مقبولیت بامِ عروج تک پہنچا دی تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد جرمنی ایک معاشی سپر پاور بن کر ابھرا تھا۔ کھیل کے میدان میں جرمن فٹ بال ٹیم اٹلی اور برازیل کے ساتھ تین بہترین ٹیموں میں سے ایک رہی تھی۔ لیکن اب تک اسے صرف ایک بار ورلڈ کپ جیتنے کا موقع ملا تھا۔ جبکہ برازیل تین بار اور اٹلی اور یوراگوئے دو دو بار یہ کپ حاصل کر چکے تھے۔ ان دنوں ڈچ ایک نئے طرز کی فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اس نے روایتی دو چار، چار کے کمبی نیشن کے بجائے ایک پانچ اور چار کا کمبی نیشن آزمایا۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ پانچ مڈ فیلڈرز بہ وقتِ ضرورت ڈیفنڈر بھی بن جاتے تھے اور جب فارورڈز حملہ کرتے تو یہ ان کے ساتھ شامل ہو کر ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ اسے ٹوٹل فٹ بال تھیوری کا نام دیا گیا تھا۔

جنوبی امریکا کی پُرجوش اور کلاسیکی فٹ بال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہالینڈ کے کوچ نے یہ حکمتِ عملی ایجاد کی تھی اور جرمن فٹ بال ٹیم نے اسے فوری طور پر اپناتے ہوئے اس حکمت عملی میں مہارت حاصل کر لی اور 1974ء کا ورلڈ کپ اسی حکمت عملی کے تحت کھیلا۔ اس نئی تکنیک نے جنوبی امریکن ٹیموں کو سچ مچ پریشان کر دیا تھا۔ اس کا ثبوت جرمنی اور ہالینڈ

کا فائنل میں پہنچنا تھا۔ دونوں نے پورے ٹورنامنٹ میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

اس بار ورلڈ کپ کے کوالی فائنگ راؤنڈز میں ریکارڈ نوے ممالک نے حصہ لیا تھا اور آسٹریلیا، ہیٹی، زائر اور مشرقی جرمنی پہلی بار ورلڈ کپ فائنل راؤنڈ کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ بیلجیئم کی بہترین ٹیم ناقابلِ شکست رہنے کے باوجود محض کم گول اوسط کی وجہ سے فائنل راؤنڈ نہ کھیل سکی۔ اس بار ورلڈ کپ میں نیا طریقۂ کار آزمایا گیا۔ کوارٹر اور سیمی فائنل ختم کرکے سولہ ٹیموں کو دو حصوں میں بانٹ کر ان کے درمیان دوسرے راؤنڈ کے لیگ میچز کرائے گئے اور ٹاپ پر رہنے والی دو ٹیمیں فائنل میں پہنچیں۔ یہ طریقۂ کار سادہ اور آسان نظر آتا تھا مگر اس میں میچوں کی بہتات اور لیگ میچوں کے سبب شائقین کی دلچسپی کم ہوگئی تھی جو دلکشی کوارٹر فائنل، پھر سیمی اور آخر میں فائنل راؤنڈز کی تھی، وہ ان لیگ میچوں میں نظر نہیں آئیں۔ میکسیکو کا ورلڈ کپ اگر اپنی جارحیت اور اعلیٰ معیار کی فٹ بال کی وجہ سے یاد رکھا جاتا ہے تو جرمنی میں کھیلا جانے والا ایونٹ آج بھی بور ورلڈ کپ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا موازنہ صرف 2002ء میں امریکا میں ہونے والے بور ورلڈ کپ سے کیا جاسکتا ہے حالانکہ اس میں فٹ بال کا معیار بھی اعلیٰ تھا۔

ایک طرف ہالینڈ اپنے تمام حریفوں کو بلڈوز کرتا ٹاپ پوزیشن کے ساتھ فائنل میں پہنچا، اس کے مدِمقابل برازیل، مشرقی جرمنی اور ارجنٹائن جیسی ٹاپ کلاس ٹیمیں تھیں۔ دوسری طرف جرمنی کے لیے یہ سفر آسان نہیں تھا۔ پہلے لیگ راؤنڈز میں اسے اس کے پڑوسی ملک اور سابقہ حصے مشرقی جرمنی نے ایک صفر کی حیران کن شکست سے دوچار کیا تھا۔ ساٹھ ہزار کے قریب تماشائیوں نے میچ کے آخری حصے میں مشرقی جرمنی اسٹرائیکر جرگن اسپروز کو گول کرتے دیکھا اور جب میچ کے خاتمے کی سیٹی بجی تو تماشائی خاصی دیر تک اس شکست پر سکتے میں رہے تھے۔ اسکاٹ لینڈ نے اوّلین راؤنڈ میں معیاری کھیل پیش کیا اور ناقابلِ شکست رہنے کے باوجود دوسرے راؤنڈ تک نہ پہنچ سکی۔

فائنل ایک بار پھر یادگار ثابت ہوا۔ دونوں ٹیمیں ہالینڈ اور جرمنی ایک جیسی مہارت کی حامل تھیں۔ ہالینڈ کے پاس نیکسن اور کرف جیسے فارورڈز تھے تو جرمنی کو بیکن بائر پر ناز تھا۔ اس پائے کے فٹ بالر دنیا میں بہت کم تھے۔ دونوں ٹیمیں کپ اپنے نام کرانے کے لیے بہت پُرامید تھیں مگر جب مقابلہ شروع ہوا تو ہالینڈ کا پلا شروع سے بھاری رہا تھا۔ پہلے ہی منٹ میں کرف بال لے کر جرمن گول کی طرف بڑھا اور اسے غلط طریقے سے روکنے کی وجہ سے ہالینڈ کو پینالٹی مل گئی۔ اس پر نیکسن نے گول کرکے ڈچ ٹیم کو سبقت دلا دی۔ اس کے بعد ہالینڈ والے کھیل پر چھا گئے اور انہوں نے پے در پے مووز بنائیں مگر جرمن دفاع نے اپنی غلطی دہرائی نہیں۔ پچیسویں منٹ میں جرمنوں کو موقع ملا۔ گرڈ ملر کے پاس پر پال نے گیند جال میں پھینک کر ڈچ برتری ختم کردی اور اس کے کچھ دیر بعد ملر نے بذاتِ خود ایک خوب صورت گول کرکے جرمنی کو سبقت دلا دی۔ جو میچ کے خاتمے تک برقرار رہی۔ یوں جرمنی نے ایک بار پھر ورلڈ کپ اپنے نام کرالیا۔ تمام تر بے لطفی کے باوجود جرمنوں کے لیے یہ ایک یادگار ورلڈ کپ ثابت ہوا۔

جرمنی کا ورلڈ کپ فٹ بال میں ایک نیا تجربہ تھا۔ پہلی بار کلاسیکی فٹ بال سے انحراف کرتے ہوئے ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ جو کارآمد بھی رہا اور عارضی طور پر اس نے کلاسیکی فٹ بال پر اپنی برتری بھی ثابت کردی تھی۔ فیفا نے پہلی بار ناک آؤٹ مرحلے کی جگہ لیگ راؤنڈز متعارف کرائے لیکن میچوں کی بہتات اور ٹیموں کے دفاعی رویے کی وجہ سے تماشائیوں کو صحیح لطف نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے یورپی تماشائیوں نے ٹوٹل فٹ بال کی حکمتِ عملی کو پسند کیا ہو لیکن باقی دنیا میں اسے ناپسند کیا گیا تھا۔ خاص طور سے جنوبی امریکن، افریقن اور ایشیائی ٹیمیں ہمیشہ روایتی فٹ بال کھیلنا پسند کرتی ہیں۔

ورلڈ کپ کی میزبانی کے لیے جنوبی امریکا اور یورپ میں کھینچا تانی جاری رہتی تھی اور یہ ایک طرح سے ان کا قانون بن گیا تھا کہ ہر تیسرا ورلڈ کپ جنوبی امریکا کو دیا جائے گا لہٰذا 1978ء کا ورلڈ کپ ارجنٹائن کو دے دیا گیا۔ حالانکہ ارجنٹائن نہ تو سیاسی لحاظ سے مستحکم تھا اور نہ ہی اس کی مالی حالت مضبوط تھی۔ ملک پر مارشل لا کی حکمرانی تھی اور کرپشن کے باعث ملک اربوں ڈالرز کا مقروض ہوگیا تھا۔ اوپر سے ہنگامے اور تشدد روز کا معمول تھے لیکن جہاں تک ارجنٹائن کے عوام کی فٹ بال سے محبت اور اس کی ٹیم کی کھیل میں مہارت کا تعلق ہے، تو ارجنٹائن ورلڈ کپ کی میزبانی کا قطعی حق دار تھا۔ اس انتخاب پر کئی یورپی ممالک نے بائیکاٹ کی دھمکی دی تھی مگر فیفا نے فیصلہ دے دیا تھا۔

اگرچہ جرمنی میں دو گروپس کا تجربہ اتنا کامیاب نہیں رہا تھا اور تماشائیوں نے بے لطف میچوں کی شکایت کی تھی مگر ارجنٹائن کے ورلڈ کپ میں اس طریقے کو برقرار رکھا گیا تھا۔ اس پورے ٹورنامنٹ کے دوران میں ارجنٹائن کے بارے میں تنازعات کی افواہیں گردش کرتی رہی تھیں حتیٰ کہ یہ افواہ

عالمی کپ کی اولین ٹرافی مشہور فرانسیسی دھات ساز ایبل فلیوز نے ڈیزائن کی تھی۔ خالص چاندی سے بنی اس ٹرافی کی اونچائی پینتیس سینٹی میٹر اور وزن تین اعشاریہ آٹھ کلوگرام تھا۔ اسے سونے کا رنگ دینے کے لیے اس پر سونے کی موٹی پالش کی گئی تھی۔ اس ٹرافی میں فتح کی یونانی دیوی نائک کو ٹرافی تھامے دکھایا گیا تھا۔ پہلے عالمی کپ سے یہ رواج تھا کہ ٹرافی کی دو نقلیں تھیں۔ ورلڈ کپ جیتنے والی ٹیم کو تقریب میں اصل ٹرافی دی جاتی تھی لیکن بعد میں اصل لے کر اسے نقل دے دی جاتی تھی جو تاحیات اس کے پاس رہا کرتی تھی۔ ہر ورلڈ کپ پر نئی نقل تیار کی جاتی تھی۔

اصل ٹرافی فیفا کے ہیڈ کوارٹر اٹلی میں رہا کرتی تھی۔ **1940**ء میں جب دوستی کے نام پر جرمن، اٹلی پر قابض ہو گئے تو **FIFA** کے نائب صدر اوٹرو س بار اس نے اسے جوتوں کے ڈبے میں چھپائے رکھا تھا تاکہ جرمن اسے نہ پا سکیں مگر خوش قسمتی سے جرمنوں نے فیفا کی ٹرافی میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ **1966**ء کے انگلستان کے عالمی کپ کے دوران میں ٹرافی چرالی گئی تھی۔ اس بار بھی قسمت فیفا پر مہربان رہی اور فائنل سے صرف سات دن پہلے ایک سراغ رساں کتے کی مدد سے ٹرافی لندن کے نواحی علاقے سے برآمد کر لی گئی تھی اور اسے انگلستان کی فاتح ٹیم کو پیش کیا گیا تھا۔

1970ء تک یہی ٹرافی استعمال کی گئی تھی مگر جب برازیل نے تیسری بار ورلڈ کپ حاصل کیا تو اس کی شاندار کارکردگی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اسے مستقل طور پر یہ ٹرافی دے دی گئی مگر افسوس **1983**ء میں برازیل کے فٹ بال ہیڈ کوارٹر سے یہ ٹرافی غائب ہوگئی اور آج تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ امکان ہے کہ یہ نوادرات کے کسی شوقین کے ذاتی ذخیرے کی زینت بن چکی ہوگی جو خود اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوگا۔ ٹرافی کی نقل بعد میں فیفا نے سوا چار لاکھ ڈالرز میں نیلام کر دی تھی۔ **1997**ء میں ہونے والی اس نیلامی میں دنیا بھر سے شائقین نے حصہ لیا اور کامیابی ایک امیرزادے کے حصے میں آئی۔ یوں **1930**ء میں شروع ہونے والی جولیس ریمٹ ٹرافی چالیس سال بعد اپنی ذمے داریوں سے مستقل فارغ ہوگئی۔

اس کے بعد دوسری ورلڈ کپ ٹرافی ڈیزائن کی گئی۔ اس میں انسانی ہاتھوں کو دنیا تھامے دکھایا گیا ہے۔ یہ ٹرافی خوب صورت استعارہ ہے کیونکہ فٹ بال ساری دنیا کا پسندیدہ ترین کھیل ہے اور اس کے عالمی کپ کا فاتح بجا طور پر ساری دنیا کو ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ اسے فیفا ورلڈ کپ ٹرافی کا نام دیا گیا ہے۔ **36.5** سینٹی میٹر اونچی اس ٹرافی میں پانچ کلوگرام اصلی سونا استعمال ہوا اور پچیس فی صد ملاوٹ ہے یعنی یہ اٹھارہ قیراط سونے کی ہے۔ اس کا کل وزن چھ کلو ایک سو پچھتر گرام ہے۔

جیتنے والے ملک کا نام اور سن اس پر کندہ کر دیا جاتا ہے۔ چار سال تک فاتح ٹیم اسے اپنے پاس رکھتی ہے اور اسے ورلڈ کپ کے موقع پر لوٹا دیتی ہے۔ البتہ اس کی ایک نقل اسے دے دی جاتی ہے۔ نئے فاتح کا نام اور جیتنے کا سن پچھلے فاتح کے نام اور سن کے نیچے لکھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار اڑتیس **2038**ء کے فٹ بال ورلڈ کپ کے فاتح کے لیے اس ٹرافی پر نام اور سن لکھنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ اس لیے **2038**ء کے ورلڈ کپ فاتح کے لیے نئی ٹرافی تخلیق کرنا پڑے گی۔

بھی تھی کہ فوجی حکمرانوں نے دھمکی دی ہے اگر ارجنٹائن نے ورلڈ کپ نہ جیتا تو تمام ٹیم کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ مگر یہ افواہ ہی تھی اور شاید اس کا مقصد ارجنٹائن کا مورال کم کرنا تھا۔

ارجنٹائن نے پہلے مرحلے میں بہ آسانی کامیابی حاصل کی لیکن دوسرے مرحلے میں اسے آسانی سے کامیابی نہیں ملی تھی۔ ایک موقع پر برازیل گول اوسط میں خاصا آگے تھا۔ ارجنٹائن کو پیرو کے خلاف بڑے مارجن سے کامیابی حاصل کرنا تھی اور ارجنٹائن نے پیرو کو چھ صفر کے واضح فرق سے ہرا کر برازیل کو فائنل سے باہر کر دیا۔ دفاعی چیمپئن جرمنی زیادہ برے حالوں سے گزر رہا تھا۔ ہالینڈ اور اٹلی کے خلاف میچ برابر کھیلنے کے بعد اسے آسٹریا جیسی اوسط درجے کی ٹیم کے ہاتھوں دو تین سے عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی فائنل سے باہر ہوگئی۔ ہالینڈ نے اس ایونٹ میں بھی ٹوٹل فٹ بال تھیوری پر عمل کیا اور آسٹریلیا کو پانچ ایک کے بڑے مارجن سے ہرا کر فائنل کے لیے کوالی فائی کر لیا۔ ہالینڈ کے کئی کھلاڑیوں نے ارجنٹائن کے لیے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ خاص طور سے جوئی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ ارجنٹائن کے کھلاڑی فائنل میں بڑھ چڑھ کر کھیلے۔ کیمپس کے گول سے ارجنٹائن نے برتری حاصل کی جسے ڈریک نامنگا نے برابر کر دیا مگر برٹونی اور کیمپس نے یکے بعد دیگرے

ورلڈکپ میچوں میں سب سے زیادہ گول کرنے کے لحاظ سے جرمنی کا گرڈ میولر سرفہرست ہے۔ اس جرمن اسٹرائیکر نے 1970ء اور 1974ء کے صرف دو ورلڈکپس میں شرکت کی تھی اور اس نے صرف بارہ میچوں میں چودہ گول کیے۔ بتیس سال گزرنے کے باوجود اس کا ریکارڈ برقرار ہے۔ فرانس کا جسٹ فونٹین اس فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے لیکن اسے ایک منفرد اور شاید نہ ٹوٹنے والا اعزاز حاصل ہے' اس نے اپنے تیرہ کے تیرہ گول 1958ء کے ورلڈکپ میں کیے تھے۔ آج تک کوئی کھلاڑی ایک ورلڈکپ میں اتنے گول کرنے کا اعزاز حاصل نہیں کرسکا ہے۔ فونٹین نے یہ ایک ہی ورلڈکپ کھیلا تھا۔

برازیل کا پیلے اور برازیل کا رونالڈو تیرہ تیرہ گول کرکے فونٹین کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہیں۔ ان میں رونالڈو سے امید ہے کہ وہ جرمنی میں ہونے والے اٹھارہویں ورلڈکپ میں گرڈ میولر کا سب سے زیادہ گول کرنے کا ریکارڈ اپنے نام کرالے گا۔ جرمنی کا جرمن کلنز مان گیارہ گول کے ساتھ پانچویں نمبر پر ہے اور درحقیقت تیسرے نمبر پر ہے۔ ہنگری کا سینڈو کوسیس اور ارجنٹائن کا گبریل بھی گیارہ گول کرکے اس فہرست میں کلنز مان کے ساتھ ہیں۔ جبکہ پانچ فٹ بالر ایسے ہیں جنہیں ورلڈکپ میں دس دس گول کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ پانچ فٹ بالر جرمنی کا ہیلمٹ رہن' برازیل کا اڈیم' پیرو کا ٹیوفیلو کیوبلاس' پولینڈ کا کرز یگورز لاٹو اور برطانیہ کا گیری لائنکر ہیں۔

کسی ایک میچ میں سب سے زیادہ گول کرنے کا اعزاز روس کے اولینگو سالینکو کے پاس ہے' اس نے 1994ء میں کیمرون کے خلاف لیگ میچ میں پانچ گول کرڈالے تھے۔

ورلڈکپ میں سب سے کم عمری میں گول کرنے کا اعزاز برازیل کے پیلے کے پاس ہے۔ اس نے 1958ء کے ورلڈکپ میں محض سترہ سال اور دو سو انتالیس دن کی عمر میں ویلز کے خلاف گول بنایا تھا۔ اس کے برخلاف سب سے زیادہ عمر میں گول کرنے کا ریکارڈ کیمرون کے راجر ملا نے قائم کیا۔ اس نے 1994ء میں جب روس کے خلاف گول کیا تو اس کی عمر بیالیس سال اور انتالیس دن تھی۔ یہ ورلڈکپ میں سب سے معمر فٹبالر کی شرکت کا ریکارڈ بھی ہے۔

کرگئے' ایک گول اس نے ہاتھ کی مدد سے کیا تھا۔ یہ فاؤل تھا لیکن ریفری نہ دیکھ سکا اور گول دے دیا' بعد میں کیمرے کے سلوموشن نے واضح کیا کہ میراڈونا نے سر کے بجائے ہاتھ مار کر گیند کو گول میں پھینکا تھا۔ اس پر انگلش اخبارات نے بہت شور مچایا تھا مگر عالمی تبصروں میں اسے ''ہینڈ آف گاڈ'' کا نام دیا گیا تھا۔ اس سے میراڈونا کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فاؤل کرنے پر بھی اسے خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ اس میچ میں میراڈونا نے نصف میدان سے گیند لی اور پانچ برطانوی دفاعی کھلاڑیوں کو یکے بعد دیگرے ڈاج کرتے ہوئے گول کردیا۔ اسے ''گول آف دی سینچری'' کا خطاب ملا۔ میراڈونا کا موازنہ عظیم پیلے سے کیا جانے لگا تھا۔

جرمنی ایک بار پھر عمدہ کارکردگی دکھاتے ہوئے فائنل تک پہنچا۔ سیمی فائنل میں اس نے فرانس کو شکست دی تھی۔ اس کے ٹیم ورک کے سامنے پلاٹینی کا جادو نہ چل سکا تھا۔ فائنل میں روایتی حریف مدمقابل تھے۔ یورپ اور جنوبی امریکا ہمیشہ سے روایتی حریف رہے ہیں۔ یہ حریف اب ایک غیر جانبدار مقام پر مدمقابل تھے مگر میراڈونا کے ساحرانہ کھیل نے میکسیکن عوام کو اس طرح دیوانہ بنایا تھا کہ پورے فائنل کے دوران میں تماشائی ارجنٹائن کے نعرے لگاتے رہے اور اس کے جھنڈے لہراتے رہے۔ میراڈونا ایک بار پھر مخالف ٹیم پر حاوی نظر آیا تھا اور ارجنٹائن نے پہلے ہاف میں دو صفر کی برتری حاصل کرلی تھی مگر دوسرے ہاف میں جرمنی نے سنبھالا لیا اور ہینیز اور وولر کے گولز کی مدد سے میچ برابر کردیا۔ اضافی وقت میں میراڈونا نے پھر ایک موو بنائی اور اپنے ساتھی بروچاگا کو پاس دیا جس نے آسان گول کرکے فتح ارجنٹائن کے نام کرادی۔ میراڈونا نے اس ٹورنامنٹ میں ون مین شو کا مظاہرہ کیا۔ پیلے کے بعد وہ پہلا فٹ بالر تھا جس نے شروع سے آخر تک اپنی ٹیم کی فتوحات میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

انگریز کھلاڑی گیری اینکر بھی اپنی شاندار کارکردگی سے سب کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ 80 بین الاقوامی میچوں میں اڑتالیس گول کرکے اس نے دوسرے سب سے زیادہ بین الاقوامی گول کرنے والے انگریز کھلاڑی کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔ اگر وہ برازیل کے خلاف پینالٹی ضائع نہ کرتا تو اپنے ہم وطن کا ریکارڈ برابر کرسکتا تھا' اس نے پولینڈ کے خلاف ہیٹ

اب تک دنیا کے 202 ممالک فیفا ورلڈ کپ کے کوالی فائنگ راؤنڈ میں حصہ لے چکے ہیں اور 2002ء کے ورلڈ کپ تک دنیا کے 78 ممالک فائنل راؤنڈز میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں برازیل واحد ٹیم ہے جسے سترہ کے سترہ ورلڈ کپ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے۔ برازیل نے سب سے زیادہ بار فائنل تک رسائی حاصل کی اور سب سے زیادہ بار ورلڈ کپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ جرمنی بھی فائنل کھیلنے میں برازیل کے برابر ہے لیکن سات میں سے تین بار اسے فتح ملی اور چار بار اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جبکہ برازیل سات میں سے پانچ بار فاتح رہا۔

کل سترہ فائنلز تک رسائی حاصل کرنے والی ٹیموں کی تعداد محض بارہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں صف اول کی ٹیموں کی تعداد یہ مشکل درجن بھر ہی ہے۔ درحقیقت دیکھا جائے تو برازیل' جرمنی' اٹلی اور ارجنٹائن کے علاوہ کسی ٹیم نے عالمی فٹ بال میں تسلسل سے کارکردگی نہیں دکھائی ہے بلکہ ان میں سے ارجنٹائن کی ٹیم بھی روبہ زوال ہے۔ گزشتہ 76 سالوں میں صرف سات ممالک ورلڈ کپ ٹائٹل حاصل کر سکے ہیں یعنی برازیل' مغربی جرمنی' اٹلی' برطانیہ' یوراگوئے' ارجنٹائن اور فرانس۔

ان روایتی فٹ بال ٹیموں سے ہٹ کر جنوبی کوریا اور چین کی فٹ بال ٹیمیں بھی مستقل سامنے آ رہی ہیں۔ خاص طور سے جنوبی کوریا صف اول کی ٹیموں میں شامل ہے اور پچھلے ورلڈ کپ کے دوران میں اس کے کھیل نے ساری دنیا کے لوگوں کو متاثر کیا تھا۔

جہاں تک ورلڈ کپ جیتنے والی ٹیمیں ہیں تو ان میں سے تین کا تعلق جنوبی امریکا اور چار کا تعلق یورپ سے ہے۔ ان براعظموں کے علاوہ اور کوئی براعظم عالمی چیمپئن نہیں بنا۔ جنوبی امریکا کو تعداد کے لحاظ سے سبقت حاصل ہے اس کے تین ممالک (برازیل' پانچ بار۔ ارجنٹائن دو بار اور یوراگوئے دو بار) نے ملا کر کل نو ٹائٹل حاصل کیے ہیں۔ جبکہ یورپ کے چار ممالک نے آٹھ ٹائٹل جیتے ہیں۔ اٹلی اور جرمنی تین تین بار جبکہ برطانیہ اور فرانس نے ایک ایک بار یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ ان براعظموں سے ہٹ کر صرف میکسیکو اور جنوبی کوریا ورلڈ کپ کے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کر سکے ہیں۔

فیفا نے کوالی فائنگ راؤنڈ کے لیے دنیا کو چھ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ چھ حصے ایشیا' افریقا' شمالی اور اس کے ساتھ وسطی امریکا جیسے پانامہ' کوسٹاریکا' کولمبیا اور جزائر ویسٹ انڈیز کے ساتھ کیوبا' اوشیانا جس میں آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور انڈونیشیا شامل ہے اور یورپ ہیں۔ ان تمام حصوں سے کتنے کتنے ممالک نے حصہ لینا ہے' اس کا فیصلہ فیفا ورلڈ کپ کوالی فائنگ راؤنڈ کے آغاز سے پہلے کرتی ہے۔ راؤنڈز سے قطع نظر میزبان اور سابق چیمپئن خود بہ خود شرکت کے اہل ہو جاتے ہیں۔ اس بار فیفا نے یورپ سے 13' افریقا سے پانچ' جنوبی امریکا سے چار' ایشیا سے چار اور شمالی و وسطی امریکا سے تین ٹیمیں منتخب کی ہیں۔ آسٹریلیا برازیل کو عالمی مقابلے میں شکست دینے کی وجہ سے منتخب ہوا ہے۔

ٹرک اسکور کی اور انگلینڈ اگلے راؤنڈ تک جا پہنچا تھا۔ پھر ارجنٹائن کے خلاف دو گول کر کے وہ ٹورنامنٹ کا ٹاپ اسکورر بن گیا تھا۔ جرمن کھلاڑی وولر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اکثر نصف موقع کو پورے گول میں بدل دیا کرتا تھا۔ ارجنٹائن کے خلاف فائنل میں اس نے آخری لمحے میں گول کر کے میچ برابر کر دیا تھا البتہ اضافی وقت سے ارجنٹائن نے فائدہ اٹھایا تھا۔

1982ء میں ریڈ کارڈ متعارف کرا دیا گیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر کسی ایک کھلاڑی کو بھی ریڈ کارڈ دکھا کر میچ سے باہر نہیں کیا گیا تھا۔ 1986ء کے عالمی کپ میں انگریز کھلاڑی رے ولکنز پہلا کھلاڑی بنا' اسے مراکش کے خلاف میچ میں ریڈ کارڈ دکھا کر باہر بھیجا گیا تھا۔ کینیڈا' عراق اور ڈنمارک نے پہلی بار عالمی کپ میں کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس ورلڈ کپ میں یوراگوئے کے جوزو وستا کو صرف پچپن سیکنڈ بعد ریڈ کارڈ دکھا کر میچ سے باہر کر دیا گیا۔ میکسیکو اور پیراگوئے کے میچ میں ریکارڈ پچپن فاول دیے گئے جو اب تک کسی بھی عالمی کپ میچ میں فاول دیے جانے کا عالمی ریکارڈ ہے۔

1986ء کا عالمی کپ کھیل اور کھیل کے انتظامات کے لحاظ سے ایک مثالی ورلڈ کپ تھا۔ میکسیکو نے بے حد مختصر مدت میں ورلڈ کپ کے انتظامات کر کے عالمی سطح پر داد و تحسین حاصل کی۔ فاول پلے سے قطع نظر فٹ بال کا معیار بہت بلند

رہا اور خاص طور سے میراڈونا کے کھیل کی وجہ سے اس ورلڈ کپ کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ٹی وی کی بڑے پیمانے پر عالمی کوریج کی وجہ سے ایک ارب سے زیادہ افراد نے یہ ورلڈ کپ دیکھا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان نے عالمی کپ کے تمام میچز براہِ راست دکھائے تھے اور کروڑوں ناظرین نے ان میچز کو دیکھا تھا۔

1989ء کے عشرے میں فٹ بال میڈیا کا کھیل بن کر ابھرا تھا۔ اس سے پہلے یہ اعزاز ٹینس کو حاصل تھا مگر فٹ بال نے ٹی وی کوریج کے دورانیے اور اشتہارات کی مد میں حاصل ہونے والی رقوم کے معاملے میں ٹینس کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اسٹار فٹ بالرز ٹی وی کے ایڈز میں کام کر کے لاکھوں ڈالرز سالانہ کمانے لگے۔ فٹ بالرز کے معاوضے بھی ریکارڈ سطح پر پہنچنے لگے تھے۔ یورپین لیگ میں اسٹارز کھلاڑیوں کو ملین ڈالرز میں معاوضہ دیا جانے لگا۔ میراڈونا جو بارسلونا کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ اسے ریکارڈ معاوضہ دیا گیا۔ 1990ء کے عشرے میں فٹ بالرز نے صحیح معنوں میں کمانا شروع کر دیا تھا۔

میکسیکو ورلڈ کپ جتنا شاندار اور کھیل کے لحاظ سے معیاری رہا تھا۔ 1990ء کے اٹالین ورلڈ کپ میں اتنی ہی متنازع اور غیر معیاری فٹ بال دیکھنے کو ملی تھی۔ فائنل میں جرمنی نے ریفریز کے کئی جانب دارانہ فیصلوں کی وجہ سے ارجنٹائن کو ایک صفر سے ہرا دیا۔ واحد گول بے حد متنازع انداز میں دی جانے والی پینالٹی پر اسکور ہوا تھا۔ ارجنٹائن کے دو کھلاڑیوں کو ریڈ کارڈز دکھا کر کھیل سے باہر کیا گیا اور پورے ٹورنا منٹ کے دوران میں سولہ کھلاڑیوں کو ریڈ کارڈز دکھائے گئے۔ اس طرح ایک سو چونسٹھ کھلاڑیوں کو یلو اور گرین کارڈز دکھائے گئے۔ ٹیموں میں ارجنٹائن کا کھیل سب سے خراب تھا۔ محض دو فتوحات اور پانچ گول کے سہارے وہ فائنل تک پہنچی تھی۔ آج تک کوئی ٹیم ایونٹ میں اس قدر خراب ریکارڈ کے ساتھ فائنل میں نہیں پہنچی۔

افریقی ٹیم کیمرون نے حیران کن کھیل پیش کیا اور تماشائیوں کی پسندیدہ ترین ٹیم قرار پائی۔ اس کے اسٹرائیکر چھتیس سالہ راجر ملا نے اتنی عمر کے باوجود فٹ بال میں اپنا دم خم دکھا کر سب کو حیران کر دیا تھا۔ اس کی شاندار کارکردگی کی بدولت کیمرون کوارٹر فائنل تک رسائی حاصل کرنے والی اولین افریقی ٹیم بن گئی مگر انگریز کھلاڑیوں نے کوارٹر فائنل میں کیمرون کے خلاف رف ترین کھیل کا مظاہرہ کیا اور خاص طور سے راجر ملا کو بار بار روکا اور گرایا گیا۔ ریفری میچ کے دوران میں انگریز سائیڈ کی حمایت میں سرگرم رہے اور نتیجے میں کیمرون سیمی فائنل تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔

اٹلی نے ایک بار پھر اپنے اسٹار اسٹرائیکر ٹوٹوشلاک کو ابتدائی میچوں میں باہر بٹھائے رکھا اور جب اسے آخر میچوں میں کھلایا گیا تو وہ چھ گول کر کے ٹورنا منٹ کا ٹاپ اسکورر بن گیا۔ اس کے بعد جو شخص اس پورے ایونٹ میں نمایاں نظر آیا وہ جرمن ٹیم کا کپتان لوتھر میتھیوز تھا۔ اپنی مہارت اور گیند پر مضبوط قابو کی وجہ سے وہ بلاشبہ کپ جیتنے کی بنیادی وجہ تھی۔ خاص طور سے یوگوسلاویہ کے خلاف اس کے انفرادی گول نے جرمنی کے پری کوارٹر فائنل تک پہنچنے کی راہ ہموار کی تھی۔ کپ میں لوتھر نے مجموعی طور پر چار گول کیے اور بہترین کھلاڑی کا اعزاز حاصل کیا۔ لوتھر میتھیوز نے 1982ء سے لے کر 1998ء تک پانچ ورلڈ کپس میں شرکت کی اور مجموعی طور پر پچیس میچز کھیلے جو ورلڈ کپ کا ریکارڈ ہیں۔ 2000ء میں اس نے ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنا شاندار کیریر ختم کر کے فٹ بال کوچنگ شروع کر دی۔ بلاشبہ لوتھر میتھیوز جرمن فٹ بال کی تاریخ کا عظیم ترین کھلاڑی ہے۔ اس ورلڈ کپ سے جرمن فارورڈ کلنز مان ابھرا تھا۔ خاص طور سے کوارٹر فائنل میں اس کے ہالینڈ کے خلاف گول سے جرمنی کو سیمی فائنل کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ آج کل کلنز مان جرمن ٹیم کا کوچ ہے۔

1990ء کے ورلڈ کپ کی خاص چیز کیمرون کی ٹیم اور اس کا عمر رسیدہ اسٹرائیکر راجر ملا تھا۔ روسی کوچ نے اس غریب افریقی ملک کی ٹیم کو نکھارا۔ حالانکہ اسے افریقی زبان نہیں آتی تھی کھلاڑیوں سے وہ ترجمان کے توسط سے بات کرتا تھا۔ راجر ملا ورلڈ کپ میں کھیلنے اور گول اسکور کرنے والا عمر رسیدہ ترین کھلاڑی بھی ہے۔ فائنل کے موقع پر اسٹیڈیم میں موجود بارہ ہزار جرمن شائقین خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے اور کسی قدر بدنظمی دیکھنے میں آئی۔ سب سے زیادہ ہنگامہ آرائی انگریز تماشائیوں نے کی اور بار ہا میچ کے دوران میں وہ دوسری ٹیم کے حامیوں سے الجھتے نظر آئے۔ اطالوی پولیس کو سیکڑوں کے حساب سے انگریز تماشائیوں کو گرفتار کر کے میدان سے نکالنا پڑا تھا۔ اس کے بعد تمام یورپی ممالک نے انگریز تماشائیوں کے خلاف سخت رویہ اپنا لیا تھا۔

1990ء کا ورلڈ کپ ایک طرف رف کھیل کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا تو دوسری طرف اس کی ریکارڈ مالی کامیابی بھی یادگار رہے گی۔ فیفا نے اس کپ سے کروڑوں ڈالرز کمائے اور دنیا کی امیر ترین اسپورٹس باڈی بن گئی۔ ٹی وی پر یہ

ورلڈ کپ دو ارب سے زیادہ افراد نے دیکھا۔ صرف فائنل نوے کروڑ افراد نے دیکھا تھا یعنی اس وقت دنیا میں ہر چھ میں سے ایک فرد ٹی وی کے سامنے تھا اور اگر ٹی وی تک رسائی کی بات کی جائے تو ہر تین میں سے ایک فرد نے یہ ورلڈ کپ دیکھا تھا۔ اس ورلڈ کپ کے دوران میں اعلان ہوا کہ اگلا ورلڈ کپ امریکا میں ہوگا۔

اس اعلان نے ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا کیونکہ عالمی فٹ بال میں امریکا کا کوئی مقام نہیں تھا اور نہ ہی امریکا میں فٹ بال پسند کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود فیفا نے صرف سرمائے کے حصول اور امریکا کی وسیع اشتہاری مارکیٹ پر قبضہ کرنے کے لیے امریکا کو ورلڈ کپ دینے کا فیصلہ کیا۔ برازیل اور ارجنٹائن کی درخواست ان کی کمزور مالی حالت کے پیشِ نظر مسترد کر دی گئی۔ حالانکہ ان ممالک کے عوام فٹ بال سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور جہاں تک مالی حالت کا تعلق تھا، تو اب ورلڈ کپ خسارے کا سودا نہیں تھا بلکہ جس ملک میں ورلڈ کپ ہوتا ہے اس کی معاشی حالت ہی بدل جاتی ہے۔ ہزاروں افراد میچز دیکھنے آتے ہیں۔ اشتہارات اور ٹی وی کوریج سے آمدنی ہوتی ہے اور ٹکٹوں کی فروخت سے اس ملک کو کروڑوں ڈالرز کی آمدنی ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی ملک کی پسماندگی یا مالی کمزوری کو جواز بنا کر اسے ورلڈ کپ دینے سے انکار کرنا اور امریکا جیسے امیر ترین ملک کو یہ ایونٹ دے دینا رکن ممالک کی سمجھ سے باہر تھا۔ بہرحال بات امریکا کی تھی اور 1980ء کے عشرے میں قابلِ رشک ترقی کرنے والے ملک برازیل کی حالت سچ مچ خراب تھی اس لیے امریکا کو ورلڈ کپ دینے پر کسی جانب سے پُرزور احتجاج دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس ورلڈ کپ میں فٹ بال سے قطع نظر کئی ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے دنیائے فٹ بال کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میراڈونا جیسے عظیم کھلاڑی کا ڈوپ ٹیسٹ درست ثابت ہوا اور طاقت ور منشیات استعمال کرنے کے جرم میں اسے باقی ٹورنامنٹ سے باہر ہونا پڑا۔ اپنے ہی گول میں غلطی سے گیند پھینکنے والے کولمبیا کے دفاعی کھلاڑی ایسکو بار کو وطن واپسی پر گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا۔

کولمبیا کی ٹیم جنوبی امریکا سے فٹ بال کی طاقت ور ٹیم بن کر سامنے آئی تھی، اس نے ساؤتھ امریکن چیمپئن بن کر دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ اس بار ورلڈ کپ کی تاریخ کے حیران کن اَپ سیٹ کرے گی لیکن ایسکو بار کے اون گول نے ٹیم کے مورال کا بیڑا غرق کر دیا تھا اور وہ ابتدائی راؤنڈ سے آگے نہ بڑھ سکی اور اس پاداش میں اسے اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

مگر جہاں تک فٹ بال کے روایتی جوش و خروش کا تعلق ہے، وہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ تماشائی ٹھس سے میچ دیکھتے رہے حتیٰ کہ فائنل بھی بور ثابت ہوا۔ انتظامات اور رنگینی کے لحاظ سے یہ سپر ایونٹ تھا جسے امریکا نے بہت اچھی طرح آرگنائز کیا مگر افسوس کہ اس کے تماشائی فٹ بال سے صحیح طریقے سے لطف اندوز نہ ہو سکے تھے۔

دفاعی چیمپئن جرمنی کا کھیل معیار کے مطابق نہ تھا، اس کے برعکس ساؤتھ امریکن چیمپئن شپ نہ جیتنے والی برازیلی ٹیم شروع سے ٹورنامنٹ پر چھا گئی تھی۔ روماریو اس کارکردگی کا پاور انجن تھا، اس کا کھیل اور چابک دستی قابلِ دید تھی۔ ہر فتح میں اس کا ہاتھ لازمی تھا۔ راؤنڈ میچز میں روس، کیمرون، سویڈن اور ہالینڈ کو شکست دے کر برازیل نے کوارٹر فائنل کے لیے کوالی فائی کیا۔ روس کی ٹیم اس بار اپنے کئی اچھے کھلاڑیوں کی خدمات سے محروم تھی جو متنازع کوچ کے تقرر کی وجہ سے ورلڈ کپ میں نہیں آئے تھے۔ راجر ملا اور کیمرون اس بار کسی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے مگر راجر ملا بیالیس سال کی عمر میں بھی پوری طرح چاق و چوبند نظر آیا۔ برازیل یکے بعد دیگرے ہالینڈ اور سویڈن کی مضبوط ٹیموں کو شکست دیتا ہوا فائنل تک جا پہنچا۔

اٹلی اپنے اسٹار کھلاڑی رابرٹو باجیو کی جادوگرانہ کارکردگی کے سہارے فائنل تک آ پہنچا تھا۔ باجیو نے ہر میچ میں حیران کن فٹ بال کا مظاہرہ کیا تھا۔ نائیجیریا نے اپنی پہلی شرکت میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی اور افریقا کپ جیت کر خطرناک تیوروں کے ساتھ میدان میں اتری تھی۔ باجیو نے فیصلہ کن گول کر کے اٹلی کو شرمندگی سے بچایا اور کوارٹر فائنل تک پہنچا پھر اسپین کے خلاف بھی باجیو کی جادوگری کام آئی۔ اس کے گول کی بدولت سیمی فائنل کا دروازہ کھلا اور سیمی فائنل میں باجیو نے دوبارہ بلغاریہ کے دفاع کو درہم برہم کر کے فائنل میں اپنی ٹیم کی موجودگی یقینی بنائی۔ بلغاریہ نے یکے بعد دیگرے کامیابیاں حاصل کر کے اور پہلی بار سیمی فائنل تک رسائی حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا۔ اس کے فارورڈ اسٹو چکوف کی کارکردگی مثالی تھی۔

بلغاریہ نے راؤنڈ میچز میں میکسیکو اور ارجنٹائن جیسی مشکل ٹیموں کو زیر کیا اور پھر کوارٹر فائنل میں دفاعی چیمپئن جرمنی کو ہرا کر کمال کر دیا۔ اسٹو چکوف کی گھومتی ہوئی فری کک نے جرمنی کے ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے دفاع میں دراڑ ڈال کر اسے ٹورنامنٹ سے باہر کر دیا تھا۔ سیمی فائنل میں بھی

اسٹوئچکوف نے گول کیا مگر اس کا ملک اٹلی سے ہار گیا۔ البتہ چھ گول کے ساتھ اسٹوئچکوف ٹورنامنٹ میں سرفہرست رہا تھا۔

فائنل میں برازیل اور اٹلی نہیں' باجیو اور روماریو مدمقابل تھے مگر دونوں ہی اپنی ٹیم کے کام نہ آسکے اور معاملہ اضافی وقت سے گزر کر پینالٹی ککس تک چلا گیا تھا۔ اس مرحلے پر باجیو ہی اپنی ٹیم کی شکست کا سبب بن گیا۔ اس کی لگائی ہوئی کک گول سے باہر چلی گئی تھی اور برازیل ریکارڈ چوتھی مرتبہ چیمپئن بن گیا۔ ممکن ہے باجیو کی پینالٹی کک ضائع نہ جاتی تو اٹلی ریکارڈ چوتھی بار چیمپئن بن جاتا۔ امریکا ورلڈکپ میچوں میں تماشائیوں کی حاضری کے لحاظ سے متاثر کن رہا۔ امریکا میں وسیع وعریض اسٹیڈیم ہیں' جن میں لاکھ سے اوپر افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر 35 لاکھ افراد نے ورلڈکپ دیکھا' اس سے پہلے یہ ریکارڈ 1986ء کے میکسیکو ورلڈکپ کا تھا جسے مجموعی طور پر اٹھارہ لاکھ افراد نے دیکھا تھا۔ امریکا میں فی میچ حاضری کا ریکارڈ بھی بہترین رہا۔ اوسطاً ایک میچ دیکھنے اٹھتر ہزار افراد آتے تھے۔ فائنل ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ افراد نے دیکھا تھا۔ فیفا کی حکمتِ عملی کامیاب رہی اور اس ورلڈکپ سے اس نے اربوں ڈالرز کی آمدنی حاصل کی تھی۔

میراڈونا پر پابندی اور ایسکوبار کے زندگی سے ہاتھ دھونے کے علاوہ ٹورنامنٹ کی خاص باتوں میں جرمن کھلاڑی ایفن برگ پر تاحیات پابندی تھی۔ اس نے جنوبی کوریا سے میچ کے دوران میں تماشائیوں کی طرف دیکھ کر نازی اشارہ کیا تھا۔ اس پاداش میں نہ صرف اسے فوری طور پر واپس جرمنی بھیج دیا گیا بلکہ اسے پھر کبھی بین الاقوامی فٹ بال کھیلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیمرون کے راجر ملا نے بیالیس سال کی عمر میں روس کے خلاف گول کر کے ورلڈکپ میں گول کرنے والے معمر ترین فٹ بالر کا اعزاز حاصل کرلیا۔ یہ ورلڈکپ اپنی رنگارنگ افتتاحی اور اختتامی تقریبات کی وجہ سے بھی یادگار رہا ہے۔

1998ء کا سولہواں ورلڈکپ فرانس کے حوالے کیا گیا اور عملاً بھی ٹرافی فرانس کے ہاتھ ہی میں آئی۔ جس نے پہلے میچ سے آخری میچ تک شاندار فٹ بال کھیلی۔ فرانس کی اس فتح میں اس کے کپتان ڈیڈیئر ڈیشمپ کا کردار مرکزی تھا۔ یہ چالاک مڈفیلڈر مناسب ترین اسٹرائیکر کو پاس دینے کے لیے مشہور تھا۔ اس وجہ سے بھی فرانس نے گولز کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اس بار چوبیس کے بجائے بتیس ٹیمیں ورلڈکپ کے فائنل راؤنڈ میں شریک ہوئیں۔ یوں مزید آٹھ ٹیموں کا اضافہ ہوا تھا۔ ٹیموں کے ساتھ خراب فٹ بال اور اس کے نتیجے میں ریڈکارڈز کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ مجموعی طور پر بائیس ریڈکارڈز دکھائے گئے تھے اور اس بہتات کی وجہ سے کپ کا ماحول مجموعی طور پر خراب رہا۔ سب سے شرمناک ریڈکارڈ فرانس کے زیدالدین زیدان کو سعودی عرب کے خلاف دکھایا گیا تھا مگر اس کے بعد اسٹرائیکر کی شاندار واپسی ہوئی تھی۔ اس نے فائنل میں برازیل کے خلاف شاندار کھیل کا مظاہرہ کر کے اپنی ٹیم کو فاتح بنوادیا تھا۔ بلانک بھی سینٹر ہاف کی پوزیشن کے لیے بہترین فرانسیسی کھلاڑی تھا لیکن کروشیا کے سیمی فائنل میں اسے بلاوجہ نکالا گیا تو اس نے فائنل میں بھی کھیلنے سے انکار کردیا تھا۔

اس ورلڈکپ میں ڈنمارک نے سب کو متاثر کیا تھا۔ اگرچہ اسے کوارٹر فائنل میں برازیل کے ہاتھوں تین دو سے شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس ٹیم نے اپنے فیئر پلے سے تماشائیوں کا دل جیت لیا تھا۔ ڈنمارک کا مائیکل اپنے ملک کا بہترین فٹ بالر قرار پایا اور اسے یہ اعزاز تاحیات دے دیا گیا تھا۔ اگرچہ کوچ سے اختلاف کے باعث اسے خاصے عرصے ٹیم سے باہر رہنا پڑا تھا مگر ورلڈکپ میں اس کی شاندار واپسی ہوئی تھی اور اس نے ٹیم کے دفاع میں مضبوط دیوار کا کردار ادا کیا تھا۔

کروشیا کی ٹیم بھی شاندار انداز میں سامنے آئی تھی۔ اس ملک کو آزادی حاصل کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مگر اس کی فٹ بال ٹیم نے اپنی کارکردگی سے سب کو چونکا دیا تھا۔ کروشیا کا ہی ڈیور سکر چھ گول کے ساتھ عالمی کپ کا ٹاپ اسکورر رہا تھا۔ اس کی شاندار پرفارمنس نے ہی کروشیا کو سیمی فائنل تک پہنچایا تھا۔ اپنی اولین شرکت میں وہ سیمی فائنل تک رسائی حاصل کرنے والی اولین ٹیم بن گئی تھی۔ جرمنی کا عظیم کپتان لوتھر میتھیوز پانچواں ریکارڈ عالمی کپ کھیل کر ریٹائر ہوگیا۔ کروشیا کے روبرٹ پروسنکی نے ایک منفرد ریکارڈ قائم کیا۔ آٹھ سال قبل اس نے یوگوسلاویہ کی طرف سے کھیلتے ہوئے ورلڈکپ میں گول اسکور کیا تھا۔ پھر اس نے یہی کارنامہ کروشیا کی طرف سے انجام دیا تھا اس طرح وہ واحد کھلاڑی بن گیا جس نے دو ممالک کی جانب سے ورلڈکپ میں گول اسکور کیے تھے۔ اس نے 94ء میں یو اے ای کے خلاف گول اسکور کیا تھا اور 98ء میں یہ کارنامہ کولمبیا کے خلاف انجام دیا۔ ڈنمارک کے کھلاڑی ایبے سینڈ نے ورلڈکپ میں متبادل کھلاڑی کے طور پر شامل ہونے کے محض سولہ سیکنڈ بعد گول کردیا جو ایک ریکارڈ بھی ہے۔ مجموعی طور پر فرانس کا ورلڈکپ

غیر معیاری کھیل کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا۔ اس میں کیمرون کا برٹ مونگ ریڈ کارڈ دوبار حاصل کرنے والا اولین کھلاڑی بن گیا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فیفا نے کمرشل ازم کی طرف توجہ زیادہ کرلی ہے اور کھیل کا معیار اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے۔ جیت کے لیے کھلاڑی نظم وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر فاؤل پلے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور سخت ریفری انہیں فوری طور پر میچ سے باہر کر کے کھیل کا مزہ خراب کردیتے ہیں۔ ضابطۂ اخلاق، تعزیری قوانین سے مشابہ ہوتا جارہا ہے اور کھلاڑیوں پر سے دباؤ کم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جارہا ہے۔

ٹی وی کوریج کے لحاظ سے فرانس ورلڈکپ ریکارڈ ساز ثابت ہوا۔ اس کے تمام میچوں کو مجموعی طور پر 36 ارب افراد نے دیکھا۔ فی میچ یہ اوسط پچپن کروڑ افراد رہی تھی اور فائنل دنیا کی ایک تہائی آبادی یعنی دو ارب سے زیادہ افراد نے دیکھا۔ مگر میچوں میں تماشائیوں کی حاضری امریکا کے ورلڈکپ سے خاصی کم رہی تھی۔ 80 ہزار تماشائیوں کے سامنے فرانس نے زیدان کے دو گولوں کی وجہ سے برازیل جیسے جن کو تین صفر سے ہرادیا تھا۔ برازیل کا رویہ اس میچ میں سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے رونالڈو جیسے کھلاڑی کی جگہ فائنل میں امیڈو کو میدان میں اتارا۔ یہ پالیسی آغاز سے ہی تھی کیونکہ رونالڈو فائنل سے پہلے پریکٹس میں حصہ لینے کے بجائے آرام کرتا رہا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو اسے میدان میں اتارا گیا تھا۔ اس وقت تک شکست سامنے تھی۔ لہٰذا رونالڈو بھی کچھ نہ کرسکا تھا۔ یہ معما شاید کبھی نہ حل ہوسکے کہ آخر اس فائنل میں رونالڈو جیسے اہم ترین کھلاڑی کو کیوں نہیں کھلایا گیا؟ برازیلین کوچ، کپتان اور فیڈریشن کے صدر اس معاملے میں خاموش رہے تھے۔

تقریباً بہتر سال بعد بالآخر فیفا نے ایشیا کو بھی فٹ بال ورلڈکپ کی میزبانی کے قابل سمجھا۔ اولمپک کمیٹی کی طرح فیفا کا رویہ بھی ایشیا کے معاملے میں ایک جیسا ہے۔ ان کی توجہ کا مرکز صرف یورپ، شمالی امریکا اور آسٹریلیا ہوتے ہیں حالانکہ ایشیا میں کئی ترقی یافتہ ممالک ایسے ہیں جو بہ آسانی اولمپک یا فٹ بال ورلڈکپ جیسے ایونٹس کراسکتے ہیں۔ اس کے باوجود ایشیا کو اب تک صرف دوبار اولمپکس اور ایک بار فٹ بال ورلڈکپ دیا گیا ہے۔ 2002ء کا ورلڈکپ جاپان اور جنوبی کوریا کو مشترکہ طور پر دیا گیا تھا۔ چین نے بھی کچھ میچز اپنے ہاں کرانے کی درخواست کی مگر فیفا کے ساتھ جاپان اور کوریا نے بھی اس درخواست کو رد کردیا۔

نائن الیون کے واقعے کے بعد دنیا بھر میں سکیورٹی کے حالات بدل کر رہ گئے ہیں اور اب کھیلوں کے میدان میں بھی جنگی سماں ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جاپان اور کوریا میں چالیس ہزار سکیورٹی اہل کار تعینات کیے گئے تھے اور اسٹیڈیمز کے باہر طیارہ شکن گنیں نصب تھیں۔

اس بار برازیل نے سابقہ کارکردگی دہرانے سے گریز کرتے ہوئے فائنل میں جرمنی کو بہ آسانی دو صفر کی شکست سے دوچار کیا۔ ٹورنامنٹ کا آغاز سنسنی خیز تھا۔ دفاعی چیمپئن فرانس دوسرے راؤنڈ تک رسائی حاصل نہ کرسکی اور روایت کے مطابق پہلے ہی راؤنڈ میں باہر ہوگئی۔ عام طور سے دفاع چیمپئن کبھی فیورٹ نہیں رہی ہے مگر فرانس نے شرمناک کھیل کا ریکارڈ توڑ دیا۔ تین میں سے دو میچوں میں شکست اور ایک میچ برابر رہا۔ فرانس ایک گول بھی نہ کرسکا۔

اگرچہ برازیل نے بجا طور پر پانچویں بار عالمی کپ کا تاج اپنے سر پر سجالیا تھا مگر ٹورنامنٹ میں مقبول ترین ٹیم جنوبی کوریا کی رہی تھی۔ اس نے ریڈ ڈیولز کی عرفیت پائی اور پرتگال، اٹلی اور اسپین جیسی مضبوط ٹیموں کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس کے فٹ بالر مایونگ جو نے مردِ آہن کا کردار ادا کیا اور کوارٹر فائنل میں اٹلی کے خلاف پینالٹی پر گیند جال میں ڈال کر اپنی ٹیم کو سیمی فائنل تک پہنچادیا تھا۔ چوتھا ورلڈکپ کھیلنے والے مایونگ جو کا یہ آخری ورلڈکپ بھی تھا۔ اسی طرح اٹلی کے کپتان مالدینی کا بھی یہ آخری کپ تھا۔

گزشتہ ورلڈکپ میں برازیلین اسٹار رونالڈو کی کارکردگی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اس بار وہ بالکل مختلف انداز میں نظر آیا۔ ریوالڈو کے ساتھ اس کی جوڑی نے مخالفین کی نیندیں اڑادی تھیں۔ اوّل میچ سے فائنل تک وہ مسلسل گول اسکور کرتا رہا اور فائنل میں بھی اس کے دو گولز کی بدولت برازیل بہ آسانی فاتح بن گیا۔ جبکہ جرمنی نے ریکارڈ پانچ بار فائنل میں ہارنے کا اعزاز حاصل کیا۔

اس ورلڈکپ کی ایک اور خاص بات دو ایشیائی ٹیموں یعنی جنوبی کوریا اور ترکی کا سیمی فائنل میں رسائی حاصل کرنا تھا۔

دیکھیے جس وقت آپ اس تحریر کو پڑھ رہے ہوں گے۔ جرمنی میں اٹھارہواں ورلڈکپ اپنے وسطی مراحل میں ہوگا۔ برازیل اس بار بھی فیورٹ ہے مگر عالمی فٹ بال کا سرتاج کون ہوگا، اس کا فیصلہ نو جولائی کی شام کو ہی ہوسکے گا۔

★★

شارٹ کٹ

کاشف زبیر

عجلت پسندی کبھی کبھی سخت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اس خاندان کا قصہ جو ایک "شارٹ کٹ" کے ذریعے جلد از جلد منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا تھا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

ایک شکاری اور اس کے خاندان کو پیش آنے والے حادثے کا سبق آموز قصہ

امریکا بہت وسیع اور آب و ہوا کے اعتبار سے مختلف النوع ملک ہے۔ یہاں الاسکا جیسے علاقے بھی ہیں۔ جو سال کے چھ سات مہینے برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ ایری زونا اور ٹیکساس کے گرم ترین صحرا بھی ہیں۔ جہاں درجۂ حرارت جان لیوا حد تک بلند رہتا ہے۔ سرد شمالی سمندر ہیں جو سخت ترین سردی میں بھی کھلے رہتے ہیں اور بہاماس جیسے علاقے بھی ہیں جو سارے سال گرم اور مرطوب رہتے ہیں۔

امریکی ریاست فلوریڈا کا ایک کنارہ تو ریاست واشنگٹن تک جاتا ہے۔ یہ شدید آب و ہوا کا حامل ہے۔ جب کہ ایک سرا میکسیکو تک چلا جاتا ہے جو پتھریلے ریگستان پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک حصہ کریبین کے سمندر سے جا ملتا ہے اور یہیں سے امریکا کے واحد برساتی جنگلات ہیں۔ یہ سارا علاقہ جنگلوں، دلدلوں اور گھاس کے میدانوں سے پُر ہے۔ یہاں درندے نہیں پائے جاتے لیکن ہرنوں، بارہ سنگھوں اور دیگر جانوروں کی کمی نہیں ہے۔ جا بہ جا دلدلی جھیلیں ہیں۔ جو پرندوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہیں۔ شکار اور سیاحت کے نقطۂ نظر

سے یہ بے حد زرخیز علاقہ ہے۔ لہٰذا موسم سرما کے آغاز کے ساتھ شکاری ٹولیاں اور جنگلی حیات کے شائقین یہاں جوق در جوق آنے لگتے ہیں۔

جنگلوں اور گھاس کے میدانوں کے درمیان نشیبی علاقوں میں کھڑے پانی سے دلدلیں وجود میں آگئیں اور ان پر رفتہ رفتہ دلدلی جنگل اُگ آئے۔ بظاہر تو یہ عام جنگلوں جیسے ہی نظر آتے ہیں لیکن یہاں کے پودے اور جانور دیگر جنگلات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں خوف ناک مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں اور زہریلے سانپ بھی۔ ایسے کیڑے بھی جن کے کاٹنے سے انسان بیمار ہوجاتا ہے لیکن سب سے خطرناک یہاں کی دلدلیں ہیں۔ جانور اور آدمی اگر ایک بار ان میں پھنس جائیں تو پھر ملک الموت ہی آکر اسے نجات دلاتے ہیں۔ اس وجہ سے عام شکاری ان دلدلوں میں قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں اور ناواقف لوگوں کے لیے محکمۂ جنگلات نے جابجا خبردار کرنے والے بورڈ لگا رکھے تھے۔

بین نے سامان سمیت کرائی دیوہیکل مشینی بگھی میں رکھا۔ یہ ایک خاص گاڑی تھی۔ جو تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی اس کے اگلے ٹائر بہت بڑے تھے تقریباً چھ فٹ قطر کے اور اسے خاص طور سے نرم اور دلدلی زمین میں چلنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا حصہ کھلا تھا۔ جبکہ پچھلے حصے میں بیٹھنے اور آرام کرنے کے تمام تر لوازمات موجود تھے۔ بین کے ساتھ اس کی بیوی ڈیبی اور دو بچے چار سالہ میتھیو اور دو سالہ مارک بھی تھے۔

۱۹۹۵ء کے اکتوبر میں شکار کا سیزن شروع ہوتے ہی بین نے فلوریڈا کے شہر نیپلز میں اپنا نرسری کا کاروبار بند کیا اور بیوی بچوں کو لے کر شکار پر نکل کھڑا ہوا۔ انہوں نے تفریح سے بھرپور ایک ہفتہ گزارا تھا اور آج واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ تمام چیزیں سمیٹ کر ڈیبی اور بین نے مشینی بگھی میں رکھیں اور معائنہ کیا کہیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی تھی۔

اکتالیس سالہ ڈیبی ریاست میری لینڈ میں پیدا ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ جبکہ پینتالیس سالہ بین ٹیکساس کا باشندہ تھا۔ دونوں شادی کے بعد فلوریڈا میں آبسے تھے۔ ان کے بچے بھی یہیں پیدا ہوئے پھر بین کا نرسری کا کاروبار چل نکلا۔ فلوریڈا انہیں بہت راس آگیا تھا پھر یہاں کا معتدل موسم بھی انہیں بھا گیا۔ سال کے کچھ حصوں میں معمولی سی سردی پڑتی تھی۔ جس سے موسم مزید خوش گوار ہوجاتا تھا۔ جبکہ شمالی اور وسطی ریاستوں میں شدید سردی اور برف باری کے باعث لوگ گھروں میں دبکے رہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ سڑکیں برف سے اٹ جاتیں اور ذرائع آمدورفت منقطع ہوجاتے تھے۔

ایسے میں فلوریڈا کے ساحلی علاقے سیاحوں سے بھر جاتے۔ ہر طرف چہل پہل اور رونق ہوتی' امریکا اور یورپ بھر سے غسلِ آفتابی کے شائقین کھنچ کر یہاں آجاتے۔ فلوریڈا ہی میں مشہورِ عالم میامی بیچ ہے۔

یہاں کی کھلی فضا' چمکتا سورج اور ریتیلے ساحل ڈیبی اور بین کو بے حد پسند آئے اور انہوں نے یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کیا۔ ٹیکساس کا باشندہ ہونے کے باعث شکار کا شوق بین کی گھٹی میں پڑا تھا۔ فلوریڈا میں اس کے مواقع بھی کم نہیں تھے۔ نیپلز سے صرف اسّی میل کے فاصلے پر ایک دلدلی چراگاہ موجود تھی جو تین اطراف سے پہاڑی ڈھلانوں میں گھری تھی اور اس کا ایک کنارہ سمندر تک چلا گیا تھا۔ پہاڑوں نے اس علاقے کو شمال اور وسط کے شدید موسم سے محفوظ کردیا تھا اور سمندر نزدیک ہونے کے باعث فضا میں استوائی خطوں جیسی کیفیات پیدا ہوگئی تھیں۔ یہاں بارہ سنگھے' ہرن' اڑیال اور لومڑی کا شکار خوب ملتا تھا۔ ذرا خطرناک جانور شکار کرنے کے شوقین حضرات کے لیے بڑی نسل کے جنگلی بلے' بھیڑیئے اور دلدلی جھیلوں میں دس بارہ فٹ لمبے مگرمچھ بھی موجود تھے۔

بین جب بھی شکار پر آتا۔ ڈیبی اور بچوں کو ساتھ لے کر آتا۔ بچوں کو وہ بچپن سے شکار کے ماحول سے روشناس کرانا چاہتا تھا لیکن ڈیبی کو ساتھ لانے کی وجہ یہ تھی کہ اسے شدید قسم کی الرجی کی بیماری تھی۔ اس دورے کی کیفیت میں اس کا نظامِ تنفس ناکارہ ہونے لگتا تھا اور اگر بروقت طبّی امداد نہ مل سکے تو اس کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ یہ دورہ کسی وقت بھی پڑسکتا تھا اور اسی وجہ سے بین ہمیشہ ڈیبی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

شکار گاہ سے ہائی وے تک ایک سڑک جاتی تھی جو ریل روڈ کہلاتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ کبھی یہاں ایک متروکہ ریلوے لائن ہوتی تھی۔ جو علاقہ دلدلی ہونے کے سبب ترک کردی گئی۔ اب اس کی نشانیاں کہیں کہیں زنگ خوردہ پٹریوں کی شکل میں نظر آتی تھیں۔ ریل روڈ دلدلی علاقے کا چکر لگا کر ہائی وے تک جاتی تھی اور یہ راستہ خاصا طویل پڑتا تھا۔

بین نے صرف اس علاقے میں شکار کے لیے یہ ٹریکٹر نما مشینی بگھی لے رکھی تھی۔ جس کے اگلے پہیے ٹریکٹر سے مشابہ تھے اور ڈرائیونگ سیٹ زمین سے بارہ فٹ کی بلندی پر تھی۔ اس کے عقب میں ایک مختصر کیبن میں سیٹیں تھیں اور ان کے پیچھے سامان رکھنے کا پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اپنے پہیوں کی بدولت یہ مشینی بگھی نرم ترین زمین پر بھی باآسانی

چل سکتی تھی اور بلندی پر ہونے کے باعث ڈرائیور دور تک دیکھ سکتا تھا۔

یہ شکاری دورہ خاصا مایوس کن رہا تھا۔ بین صرف دو ہرن اور ایک لومڑی مار پایا تھا۔ لیکن ابھی تو شکاری سیزن کی ابتدا تھی۔ بین کو امید تھی کہ اگلے دورے میں وہ دل کھول کر شکار کرسکے گا۔ ہفتے بھر کی تھکن اور پھر گرمی نے ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ بچے مشینی بگھی کے پچھلے حصے میں سو رہے تھے اور ڈیبی بھی آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ روانگی کے تھوڑی دیر بعد بین کو خیال آیا۔

"ڈیب' کیوں نہ ہم دلدلی علاقے ہو کر چلیں۔ اس طرح جلدی ہائی وے تک پہنچ جائیں گے۔"

"تمہاری مرضی۔" ڈیبی نے کہا "لیکن دیکھ لو شام قریب ہے۔ اگر سورج غروب ہونے تک ہم ہائی وے تک نہ پہنچ سکے تو کسی مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہیں۔"

"فکر نہ کرو ڈیب۔ ہم اندھیرا ہونے سے پہلے ہائی وے پر ہوں گے۔"

بین نے یہ کہتے ہوئے مشینی بگھی کو دلدلی جنگل میں نظر آنے والے پہلے راستے میں گھسا دیا۔ جو خاصا تنگ تھا لیکن دیوہیکل مشین کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کے بڑے ٹائر چھوٹے بڑے پودوں کو کچلتے ہوئے اپنا راستہ خود بنا رہے تھے۔ اس وقت شام کے پانچ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

اچانک عقبی پلیٹ فارم پر بنے پنجرے میں قید بین کے دونوں شکاری کتے چونکے اور غرّانے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی ہو۔

ڈیبی نے ایک نظر کتوں پر ڈالی۔ پھر اس نے کہا "بین' کیا ہم واپس جاسکتے ہیں۔"

"واپس۔" بین نے ایک قہقہہ لگایا "مگر کیوں ڈیئر۔"

"معلوم نہیں۔" ڈیبی ہچکچائی "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آگے کوئی خطرہ ہے۔ ممکن ہے ہمیں راستہ نہ ملے یا دلدل موجود ہو۔"

"دلدل تو یہ پورا علاقہ ہے اور راستے کی فکر نہ کرو۔ مجھے معلوم ہے یہ راستہ ہائی وے کی طرف ہی نکلتا ہے۔"

بین درست کہہ رہا تھا۔ یہ راستہ سیدھا ہائی وے کی طرف ہی جاتا تھا لیکن وہ کچھ چیزوں کے بارے میں لاعلم تھا جو اس کے لیے اجنبی تھیں۔ دلدلی پودے اور جھاڑیاں مشینی بگھی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔ اس کے دیوہیکل ٹائر بے رحمی سے انہیں کچل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ڈیبی کو کتوں کی چیخ سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ہی تھا کہ بین کے چلّانے کی آواز آئی۔

"اف میرے خدا!"

ڈیبی نے بین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔ بین چلتی بگھی کی ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے پیر چلتے ٹائروں سے کچھ ہی اوپر تھے' لیکن وہ خود کو سنبھالنے کے بجائے دیوانہ وار اپنے ہاتھوں سے جینز کو رگڑ رہا تھا۔ ڈیبی نے چلّا کر اسے خبردار کرنا چاہا کہ اس کی نگاہ بین کے پیروں سے لپٹے ایک پیلے کمبل پر پڑی لیکن.... وہ کمبل نہیں تھا۔ وہ حرکت کر رہا تھا۔ اف خدا وہ تو کیڑے تھے۔ دلدلوں کی خوفناک پیلی بھڑیں۔ جن کے کاٹنے سے جسم سوج جاتا تھا اور مضروب مارے درد کے تڑپتا رہ جاتا۔ بین کو ایسی سیکڑوں نہیں ہزاروں بھڑیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ڈیبی کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بین کو کیسے اس مصیبت سے نجات دلائے۔

مشینی بگھی کے ٹائروں نے بھڑوں کا ایک بڑا مسکن تباہ کردیا تھا اور اب مشتعل بھڑیں ان پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ لاکھوں بھڑوں نے بگھی پر حملہ کردیا تھا اور وہ اس پر یوں چھا گئی تھیں کہ چند قدم کے فاصلے پر دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ بھڑوں نے دیوانہ وار ڈیبی' بین اور بچوں کو کاٹنا شروع کردیا۔ ڈیبی کو یوں لگا جیسے سیکڑوں نشتر اس کے جسم میں اتر گئے ہوں۔ اس نے بلبلا کر ہاتھ پیر چلائے لیکن ان ننھی قیامتوں

سے ممکن نہیں تھا۔ ڈیبی اٹھ کر بچوں کی طرف بڑھی۔

سوتے بچوں پر بھڑوں نے حملہ کیا تو وہ بھی روتے چیختے اٹھ بیٹھے۔ میتھیو ذرا بڑا تھا۔ وہ اٹھ کر ہاتھ پیر چلانے لگا۔ البتہ دو سالہ مارک اپنی جگہ لیٹے لیٹے چلّا رہا تھا "ممی مجھے بچاؤ۔ ممی انہیں دور کرو۔"

اگلے ہی لمحے ڈیبی نے مارک اور میتھیو کو اپنے وجود سے ڈھانپ لیا۔ وہ انہیں بھڑوں سے بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ بھڑیں اس کے کھلے بازوؤں اور گردن پر کاٹ رہی تھیں۔ ڈیبی کو معلوم تھا کہ اکاّدکاّ بھڑوں کا زہر نقصان دہ نہیں ہوتا لیکن اگر بہت ساری بھڑیں کاٹ لیں تو ان کا زہر زندگی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

بھڑوں سے لڑتے بین نے ہمت کرکے خود کو اوپر گھسیٹا۔ جب بھڑیں اس پر ٹوٹ پڑی تھیں تو بدحواسی میں وہ سیٹ سے نیچے گر گیا تھا اور مرتے مرتے بچا تھا۔ اگر وہ چلتی بگھی کے ٹائروں میں آجاتا تو چشم زدن میں اس کا قیمہ بن جاتا۔ بھڑوں کے ڈنک نے اس کے پورے جسم میں آگ سی لگادی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ پوری آستین کی جینز پہنے ہوئے تھا اور اس کے موٹے کپڑے نے اسے بچالیا۔ صرف کھلے ہاتھوں اور چہرے پر ہی بھڑوں کو طبع آزمائی کا موقع ملا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے بگھی کے بریک لگائے اور گیئر کو پیچھے کھینچ کر بگھی کو پیچھے سے جانے کی کوشش کی لیکن چند ناکام کوششوں کے بعد واضح ہوگیا کہ... گیئر کس وجہ سے جام ہوچکے تھے۔ اب بگھی نہ آگے جاسکتی تھی اور نہ پیچھے۔ بین نے خود کو اپنی حماقت پر کوسا۔ آخر اسے بگھی روکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ممکن تھا کہ کچھ آگے جاکر اس مصیبت سے چھٹکارہ مل ہی جاتا۔ بین نے محسوس کیا کہ اگر کچھ دیر اور وہ بگھی پر رہے تو مکھیاں انہیں ہلاک کردیں گی' وہ جانتا تھا کہ زہر کی زیادتی نظام تنفس کو بے کار کردیتی ہے اور مریض دم گھٹنے سے مرجاتا ہے۔ اچانک اسے ڈیبی کا خیال آیا۔ وہ پہلے ہی سانس الرجی میں مبتلا تھی۔ بھڑوں کا زہر اس کے لیے زیادہ خطرناک ہوسکتا تھا۔

"ڈیبی۔" بین چلاّیا۔

"بین۔" ڈیبی کی آواز آئی "مارک' میتھیو۔" اس کی آواز میں ممتا کا کرب جھلک رہا تھا۔ اس خطرناک موقع پر اسے صرف اپنے بچوں کا خیال تھا۔

"ڈیب نیچے کود جاؤ۔" بین نے چیخ کر کہا "میں بچوں کو دیکھ لوں گا۔"

"نہیں میں بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" ڈیبی نے کہا۔

بین نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا "ڈیب میں نیچے جارہا ہوں۔ تم بچوں کو باری باری نیچے پھینکنا۔"

اس نے نیچے جھانکا مگر بھڑوں نے ایسا سایہ کررکھا تھا کہ نیچے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نیچے خشک زمین تھی یا دلدل یا پھر پانی۔ بہرحال اسے چھلانگ تو لگانی تھی۔ اس نے جسم تولا اور نیچے کود گیا۔ اس نے زیادہ دور چھلانگ لگانے سے گریز کیا۔ اگر وہ دلدل میں جاگرتا تو پھر نجات ملنا مشکل ہوجاتی۔ بگھی قریب ہونے کی صورت میں وہ اس کا سہارا لے سکتا تھا مگر دلدل یا خشک زمین کے برعکس ایک خاصا بڑا پتھر اس کا منتظر تھا۔ اس کا پیر پتھر سے جا ٹکرایا اور غیر فطری انداز میں مڑ گیا۔ بین نے خشک لکڑی چٹخنے جیسی آواز سنی پھر وہ زمین پر جاگرا۔

"میرے خدایا۔ شاید میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔" بین نے سوچا۔

اسے کسی قسم کا درد محسوس نہیں ہوا لیکن جیسے ہی اس نے ٹانگ سیدھی کرنا چاہی اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بھڑوں کے زہر نے پہلے ہی پورے جسم میں آگ لگا رکھی تھی۔ اوپر سے وہ پیر بھی تڑوا بیٹھا۔ ایسے عالم میں درد و اذیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو بین بے ہوش ہوجاتا مگر ڈیبی اور بچوں کے خیال نے اس کے ہوش و حواس بیدار رکھے۔ اگر وہ بے ہوش ہوجاتا تو ڈیبی اور بچوں کو کون دیکھتا اور کون انہیں پتھر کے خطرے سے آگاہ کرتا۔ وہ بہ مشکل خود کو گھسیٹ کر آگے بڑھا اور اس نے ہاتھوں سے نرم زمین ڈھونڈی۔ وہاں دبیز گھاس بھی تھی جس کی جڑوں میں کیچڑ بھرا تھا پھر اس نے اوپر دیکھا۔ یہ جگہ عین پلیٹ فارم کے اوپر تھی۔ اگر ڈیب یہاں سے بچے نیچے گراتی تو انہیں چوٹ لگنے کا خطرہ نہیں تھا۔

"ڈیب' بچوں کو یہاں پھینکو۔ ڈیب تم نے سنا... یہاں۔" بین نے چلاّ کر کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ بگھی سے اترتے ہی بھڑوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے اردگرد منڈلا تو رہی تھیں لیکن اسے کاٹ نہیں رہی تھیں۔ غالباً ان کے نزدیک اصل دشمن مشینی بگھی تھی۔ جس نے ان کے گھروں کو تباہ کردیا تھا۔

اوپر ڈیبی بھڑوں کو اڑاتی اور ان کے ڈنک برداشت کرتی۔ بچوں کو پلیٹ فارم تک لے کر آئی۔ اس نے بچوں کو چادروں میں لپیٹ دیا تھا۔ اس نے بین کی آواز سن لی تھی لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔ اپنے معصوم بچوں کو بارہ فٹ کی بلندی

سے پھینکتے ہوئے اس کا دل دہل رہا تھا۔ اس نے میتھیو کو پکڑ رکھا تھا اور سوچ رہی تھی کہ اسے پھینکے یا نہ پھینکے۔ عین اسی لمحے ایک بھڑ نے اس کی گردن پر اپنا ڈنک آزمایا اور اس نے چیخ مار کر میتھیو کو نیچے چھوڑ دیا۔ وہ نہایت آرام سے دھپ کی آواز کے ساتھ نیچے جا گرا۔ بین نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ڈیب، مارک کو بھی پھینکو۔" بین نے کہا۔

اس دفعہ ڈیبی نے بغیر ہچکچائے مارک کو پلیٹ فارم کے نیچے چھوڑ دیا۔ وہ بھی بحفاظت نیچے جا گرا۔ ڈیبی خود بھی کودنے والی تھی کہ اس کی نگاہ کتوں پر پڑی۔ جو بے بسی سے پنجرے میں بند اُمید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کُوں کُوں کی فریاد بھری آوازیں نکال کر ڈیبی سے التجا کر رہے تھے کہ وہ پنجرہ کھول کر انہیں اس مصیبت سے نجات دلائے لیکن بھڑوں کے کاٹنے سے ڈیبی کا دماغ جیسے ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ اتنا بھی نہ کر سکی کہ دو قدم چل کر پنجرے کی کنڈیاں سرکا دیتی۔ کتوں کی حالت پر دل گرفتہ وہ نیچے کود گئی۔

نیچے بین دونوں بچوں کو کیچڑ زدہ کر رہا تھا۔ تاکہ وہ بھڑوں کے قیامت خیز ڈنک سے محفوظ رہیں۔ بھڑیں ابھی بھی ان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں "ڈیب میری مدد کرو۔" بین ہانپتے ہوئے بولا۔

ڈیبی بھی اس کے ساتھ مل کر بچوں کے جسم پر کیچڑ ملنے لگی۔ ساتھ ہی وہ دونوں خود بھی اپنے جسم کے کھلے حصوں پر کیچڑ مل رہے تھے۔ کیچڑ ملنے کے باوجود بھڑیں ان کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔

"ہمیں یہاں سے دور جانا ہوگا۔" بین نے ڈیبی سے کہا "تم بچوں کو دور لے جاؤ۔"

اسی لمحے ڈیبی کو احساس ہوا کہ اسے ہر چیز دھندلی اور دور نظر آ رہی تھی۔ اس کی عینک کہیں گر گئی تھی۔ افراتفری میں اسے عینک کا خیال ہی نہیں رہا۔ شاید وہ اوپر پلیٹ فارم پر کہیں گر گئی تھی لیکن ڈیبی اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ اوپر جا کر عینک تلاش کرتی اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ عینک تلاش کرنے کے لیے بھی اسے ایک عینک کی ضرورت تھی۔ اس نے مارک کو پکڑا اور گھسیٹ کر مشینی بگھی سے دور لے جانے لگی۔ اس میں اٹھنے کی جرأت نہیں تھی کیونکہ بھڑیں زمین سے صرف دو فٹ کی بلندی پر بادل کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔

"تم یہیں بیٹھو۔" ڈیبی نے مارک سے کہا "اور یہاں سے ہلنا نہیں۔"

"اوکے مام!" وہ معصومیت سے بولا۔

ڈیبی نے بے اختیار اس کے سوجے ہوئے گال چومے اور واپس رینگتی ہوئی بین کے پاس آئی جو چار سالہ میتھیو کو تھامے بیٹھا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بار بار اٹھ کر بھاگنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ڈیبی نے میتھیو کو لیا اور اسے بھی گھسیٹ کر دور لے جانے لگی۔ اس نے مارک کو مشینی بگھی سے تقریباً بیس گز دور ایک درخت تلے بٹھایا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ وہ راستہ نہ بھول جائے اور مارک اکیلا رہ جائے، لیکن مارک غالباً تکلیف اور اکیلے پن سے گھبرا کر اونچے سُروں میں رو رہا تھا۔ ڈیبی اس کی آواز کے سہارے اس تک پہنچ گئی۔ میتھیو کو اس کے پاس بٹھا کر اس نے بھائی کا خیال رکھنے کو کہا اور خود رینگتی ہوئی واپس بین کے پاس آ گئی۔ اب تک اس نے غور نہیں کیا تھا کہ بین ایک ہی جگہ کیوں پڑا تھا اور اس نے اٹھ کر اس کی مدد کیوں نہیں کی تھی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے شوہر کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اور وہ چل نہیں پا رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر دیکھا بین کی ایک ٹانگ کی پنڈلی عجیب انداز سے مڑی تھی۔

"بین اٹھو۔ یہاں سے چلو۔" اس نے شوہر کا بازو پکڑا۔

"میں نہیں چل سکتا۔" وہ کراہ کر بولا "میرا پاؤں.... اس میں چوٹ آ گئی ہے۔" اس نے غالباً بیوی کو اصل بات سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ڈیبی بچی نہیں تھی، وہ سمجھ رہی تھی کہ معاملہ چوٹ سے زیادہ سنگین تھا لیکن وہ بین کو وہاں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے بین کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اسے کھینچنے کی کوشش کی۔ کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا۔ چھ فٹ دو انچ اونچے اور دو سو بیس پونڈ وزنی بین کو کھینچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ جب کہ اس کی اپنی حالت بھی دگرگوں ہو رہی تھی۔ سانس لینے میں دشواری سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر الرجی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ غالباً بھڑوں کے زہر کا ردِ عمل تھا۔

"بین پلیز۔" وہ رو دینے والے انداز میں بولی "چلنے کی کوشش کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" بین کا چہرہ زرد ہو رہا تھا "اگر یہ ممکن ہوتا تو میں خود اس لعنتی جگہ سے نکل چکا ہوتا۔"

"اب کیا ہوگا۔" ڈیبی خوف زدہ تھی۔ ایک طرف اس کے بچے تھے اور دوسری طرف شوہر، وہ نہ بچوں کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ اس حالت میں شوہر کو۔ ڈیبی زخمی نہیں تھی۔ لیکن اچانک پڑنے والی افتاد اور پھر سانس کی تکلیف نے اس

کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ جبکہ بین کے پیر میں رہ رہ کر تڑپانے والا درد اٹھ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا ذہن تیزی سے اس مصیبت سے نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ڈیبی کی اپنی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہوتی جارہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ڈیبی پر الرجی کا شدید دورہ پڑ گیا تو وہ بے یارو مددگار اسی جنگل میں پڑے پڑے مرجائیں گے۔ واحد امید یہی تھی کہ ڈیبی جائے اور مدد لے کر آئے۔ شکاریوں کا کیمپ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈیبی پیدل بھی زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتی جس کے بعد امداد آنے میں پانچ منٹ بھی نہ لگتے۔ ابھی سورج ڈوبنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا اور ڈیبی کی فوری روانگی کی صورت میں اندھیرا ہونے سے قبل امداد آجاتی۔ بین جانتا تھا کہ اگر اندھیرا ہو گیا تو ان کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ رات گئے لگڑ بھگے اور لومڑیاں شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی تھیں۔ انہیں دو ننھے بچوں اور ایک معذور شخص اور بیمار عورت پر قابو پاتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہ تمام خیالات چشمِ زدن میں بین کے دماغ میں گھوم گئے۔ وہ کانپ اٹھا۔

"اوہ خدایا نہیں۔" اس نے کہا اور ڈیبی کو جھنجھوڑ مارا۔ وہ شاک کی سی کیفیت میں تھی۔ بین کے جھنجھوڑنے پر چونک اٹھی۔

"ڈیب، تم فوراً روانہ ہوجاؤ اور شکاری کیمپ جا کر مدد لے کر آؤ۔"

"لیکن تم اور بچے۔۔۔" ڈیبی نے کہنا چاہا۔

"ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔" ڈیبی نے سسکی لی۔

"میری بات غور سے سنو۔ اگر اندھیرا ہونے سے پہلے امداد نہیں آئی تو ہم سب یہیں بے بسی سے مرجائیں گے۔" بین نے اسے سمجھایا "صرف تم ہی جا کر امداد لاسکتی ہو۔"

"میں نہیں جاسکتی۔" وہ بے بسی سے بولی "میرا حلق بند ہو رہا ہے۔ مجھے دوا چاہیے۔"

اس کی حالت واقعی خراب ہو رہی تھی۔ سانس رک رک کر آرہی تھی اور جلد عنابی مائل ہو گئی تھی۔

"پلیز ڈیبی، میرا اور بچوں کا سوچو۔ ہمیں تم ہی بچا سکتی ہو۔" بین ملتجی لہجے میں بولا۔

ڈیبی نے چند لمحے اپنے محبوب شوہر کو دیکھا "اوکے۔" وہ بولی "میں کوشش کروں گی۔ میں شکاری کیمپ تک جاؤں گی، چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ میں جاؤں گی۔"

وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

"میری بات غور سے سنو ڈیب۔" بین یوں بولا جیسے ڈیبی کو ذہن نشین کرا رہا ہو۔ "تم بگھی کے ٹائروں کے نشانات کے سہارے واپس کیمپ تک جاسکتی ہو۔ یاد رکھنا، نشانات کو نظر میں رکھنا۔ ورنہ بھٹک جاؤ گی۔"

"میں جاؤں گی۔" وہ اسی انداز میں بولی۔ اس کی نظر اپنے زخمی شوہر پر جمی تھی "میں تمہارے اور بچوں کے لیے جاؤں گی۔ بین میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں ڈیب۔ اب تم جاؤ، وقت گزر رہا ہے۔"

ڈیبی نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور سست قدموں سے واپس چل پڑی۔ اس کی نگاہیں بگھی کے نشانات پر مرکوز تھیں بین اسے خاموشی سے جاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اور عینک کے بغیر ڈیبی کیا درست راستے پر قائم رہ سکے گی۔ یہ امکان بہت زیادہ تھا کہ وہ راستہ بھٹک جائے۔ اگر وہ راستہ بھٹک جاتی اور سورج غروب ہونے سے پہلے شکاریوں کے کیمپ تک نہیں پہنچ پاتی تو ان کی زندگیوں کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ وہ اس وقت ڈیبی کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی۔ جیسے ہی وہ درختوں کے عقب میں غائب ہوئی۔ بین نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "خدایا، وہ اندھیرا ہونے سے پہلے کیمپ تک پہنچ جائے۔" اس نے صدقِ دل سے کہا۔

○☆○

ڈیبی کراہتی، لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں زمین کے نشانات پر لگی تھیں۔ وہ جسم میں لگی آگ اور ذہن پر بار بار حملہ کرنے والی غنودگی سے لڑ رہی تھی۔ ہر قدم پر اسے لگ رہا تھا۔ وہ ابھی گر پڑے گی کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ عینک کے بغیر ہر چیز اسے دھندلی نظر آرہی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ مختلف دلدلی کیڑے اس کے جسم پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

ڈیبی کو وینوم الرجی کی بیماری تھی۔ کسی کیڑے کے کاٹنے کی صورت میں اس کی علامات ابھر آتی تھیں۔ سب سے پہلے بلڈ پریشر کم ہوجانے سے دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کو خون کی فراہمی کم ہوجاتی تھی۔ آکسیجن کی کمی سے دماغ غنودگی کا شکار ہونے لگتا تھا۔ بیرونی اعضا۔۔۔سکڑنے لگتے تھے۔ آلاتِ تنفس کام چھوڑنے لگتے تھے جس سے دم گھٹنے کی شدید کیفیت جنم لیتی۔ اگر الرجی کا حملہ شدید ہو تو آکسیجن کی کمی دماغ کو کوما میں لے جاتی ہے۔ ایسی صورت میں بعض

افراد فوراً ہی مرجاتے ہیں اور کچھ خاصی دیر میں جان دیتے ہیں۔ الرجی کے حملے کی صورت میں فوراً اینٹی الرجی انجکشن دینے سے مریض کی جان بچ جاتی ہے۔ بصورتِ دیگر اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی ہے۔

ڈیبی الرجی کے ابتدائی مرحلے میں تھی لیکن بھڑوں کے زہر نے دورے کو خطرناک بنا دیا تھا کیونکہ یہ زہر زیادہ ہونے کی صورت میں نظامِ تنفس کو ناکارہ کردیتا ہے۔ شل دماغ اور ٹوٹتے جسم کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ڈیبی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ درست راستے سے ہٹ گئی اور اب وہ ایک انجانی سمت گامزن تھی۔

یہ دلدلی جنگل تقریباً دس مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر پام نسل کے درخت اور دلدلی پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جابجا دلدلی جھیلیں تھیں۔ جن میں خوفناک جونکیں، مگرمچھ اور زہریلے سانپ پائے جاتے تھے، لیکن سب سے بھیانک یہاں کی دلدلیں ہیں۔ ان سیاہ رنگ کی دلدلوں میں پھنسنے والے انسان یا جانور کو پھر موت ہی آکر نجات دلاتی تھی۔ ڈیبی بلا سوچے سمجھے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا رخ کس طرف ہے۔ حالانکہ وہ آسمان پر سورج کی سمت دیکھ کر با آسانی شکاری کیمپ کی سمت کا تعین کرسکتی تھی مگر اس کی ذہنی حالت اسے کچھ سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

○☆○

فل پلیئر باقاعدگی سے اس وادی میں شکار کھیلنے آتا تھا۔ وہ شکاری بھی بہت اچھا تھا اور اس کا نشانہ بے مثال تھا۔ پینتالیس سالہ فل اس وقت اپنے پک اپ ٹرک میں آرام کررہا تھا۔ گزشتہ ہفتے کے دوران میں اس نے بہت اچھا شکار کیا تھا۔ اس کے گروپ کے افراد نے مجموعی طور پر جتنے جانور شکار کیے تھے۔ ان سے کچھ ہی کم اکیلے فل نے مارے تھے لیکن اس روز نہ جانے کیوں صبح سے اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ صبح کے سیشن میں بھی اس نے بے دلی سے شرکت کی تھی جب کہ اس کے دوست بہت موڈ میں تھے۔ انہوں نے ہر متحرک چیز پر رائفل آزمائی۔ اگرچہ نشانے کم ہی لگے۔

سہ پہر کو دوسرے سیشن کے لیے جاتے ہوئے انہوں نے فل کو بھی ساتھ کھینچنے کی کوشش کی مگر اس نے تھکن کا بہانہ بنا کر معذرت کرلی۔ حالانکہ وہ ہرگز نہیں تھکا تھا۔ شکار اس کا شوق تھا اور شوق میں تھکن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر بھی کوئی انجانی چیز تھی جس نے اسے جانے سے روک لیا۔ وہ اکیلے شکاری کیمپ کی بوریت سے ڈرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہیں گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے ٹیک لگائے سوچ رہا تھا کہ اس نے دوستوں کے ساتھ نہ جاکر غلطی کی۔ کم از کم بوریت سے تو بچ جاتا۔

پانچ بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔ جب اسے ٹرک کے دائیں جانب تقریباً سو گز دور جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ فل چونک کر سیدھا ہوگیا۔ جنگل سے ایک عجیب الخلقت چیز برآمد ہورہی تھی۔ وہ جھکی ہوئی تھی اور اس کا پورا جسم سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ "ریچھ" بے اختیار فل کے دماغ میں گونجا اور اس نے پاس پڑی رائفل اٹھالی مگر فوراً اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ریچھ اس علاقے میں پایا ہی نہیں جاتا تھا پھر یہ کون سا جانور تھا جو دو پیروں پر چل رہا تھا۔ فل نے بغور اسے دیکھا۔ "میرے خدا!" اس کے منہ سے نکلا "یہ تو کوئی انسان ہی ہے۔"

ٹانگوں پر شارٹس کوئی انسان ہی پہن سکتا تھا۔ وہ پک اپ ٹرک سے اتر کر اس کی طرف دوڑا۔ قریب آکر اسے علم ہوا یہ کوئی عورت تھی۔ جس کے پورے جسم پر کیچڑ کی تہہ تھی اور چہرہ سوج کر تقریباً دوگنا ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں عجیب سا تاثر تھا۔ اس کا منہ یوں کھلا تھا جیسے وہ سانس لینے کی جدوجہد کررہی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر کسی نے بری طرح تشدد کیا تھا۔ "ہے۔ تم ٹھیک ہو۔" فل نے اسے پکارا وہ گرنے کے قریب تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی "لیکن میرا شوہر اور بچے۔ وہ دلدلی جنگل میں حادثے کا شکار ہوگئے ہیں۔ پلیز انہیں بچاؤ۔ ہم پر پیلی بھڑوں نے حملہ کردیا تھا اور میرے شوہر کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔"

اب فل کو پتا چلا کہ وہ اس قدر سوجی ہوئی کیوں تھی۔ بھڑوں نے اسے بے تحاشا کاٹا تھا اور اس کے تمام کھلے حصوں پر بے شمار ڈنک پیوست تھے۔ اچانک وہ فل کا کالر پکڑ کر چیخی۔ "میرے شوہر اور بچوں کو بچاؤ!"

فل نے نرمی سے اسے سنبھالا "تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کیا تم میری رہنمائی کرسکتی ہو؟"

"نہیں۔" وہ چیخی "میں نہیں جاسکتی۔ میرا حلق بند ہورہا ہے۔ مجھے دوا کی ضرورت ہے۔ ورنہ میں مرجاؤں گی۔" اس کی آنکھیں آئینے کی طرح جھلملا رہی تھیں اور جلد گہری عنابی ہورہی تھی۔

اسے احساس ہوا کہ واقعی عورت بیمار ہے۔ اس کی سانس دمے کے مریضوں کی طرح اکھڑ اکھڑ کر آرہی تھی۔

"اوکے، میں تمہیں ...اورٹونا لیے چلتا ہوں۔" فل نے کہا "وہاں ایک میڈیکل سینٹر ہے۔ تمہیں دوا بھی مل جائے گی اور ہم وہاں سے مدد کے لیے کال بھی کر سکیں گے۔"

اورٹونا مقامی انڈین ریزرو میں واحد سینٹر تھا۔ جہاں گیس اسٹیشن، سپر اسٹور اور ریسٹورنٹ کے ساتھ ایک میڈیکل سینٹر تھا۔ جہاں ہنگامی طبی امداد کے انتظامات تھے۔ شکاری علاقہ ہونے کے باعث اس سینٹر کا قیام ضروری تھا ورنہ کسی بھی حادثے کی صورت میں زخمی کو تقریباً اسّی میل دور نیپلز لے جانا پڑتا۔ جو اس علاقے کے قریب ترین شہر تھا۔

فل نے احتیاط سے ڈیبی کو پک اپ کے عقبی حصے میں لٹایا اور پھر ہر ممکن تیزی سے اورٹونا روانہ ہوگیا۔ یہ قصبہ ریل روڈ کے ساتھ ہی واقع تھا۔ صرف پانچ منٹ بعد ڈیبی اورٹونا کے میڈیکل سینٹر میں تھی۔ اسے فوری طور پر اینٹی الرجک انجکشن لگایا گیا لیکن اس کی حالت بدستور خراب تھی اور اس کی ملتجی آنکھیں فل پر مرکوز تھیں۔ آکسیجن لگنے کے باعث وہ بولنے سے قاصر تھی مگر اس کے تاثرات فل سے کہہ رہے تھے۔ وہ واپس جائے اور اس کے شوہر اور بچوں کو تلاش کرے۔

"تم فکر مت کرو۔ میں انہیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔" فل نے اسے تسلی دی اور باہر نکل کر سیدھا ہنگامی امداد اور تلاش کے مرکز پہنچا۔ وہاں اس نے عورت کے شوہر اور بچوں کے بارے میں بتایا اور پھر فوراً اپنی پک اپ میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ پک اپ ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دلدلی جنگل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گھنی جھاڑیوں نے جنگل کو یوں گھیر رکھا تھا کہ ان میں سے کسی انسان کا گزر بھی ممکن نہیں تھا۔ بالآخر ایک جگہ اسے بہ مشکل چھ فٹ چوڑا راستہ نظر آیا۔ فل نے اسی میں پک اپ گھسا دی مگر فوراً اسے رکنا پڑا۔ آگے دور تک دلدل اور اس پر ٹھہرا پانی موجود تھا۔ پک اپ کے اگلے پہیے دلدل میں دھنس رہے تھے۔ اس نے پھرتی سے ریورس گیئر لگا کر بر وقت پک اپ کو پیچھے کھینچ لیا ورنہ وہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے خود کسی مصیبت پھنس سکتا تھا۔

کچھ دور آکر اسے مزید ایک راستہ نظر آیا جو خوش قسمتی سے خشک تھا۔ فل کو خیال آیا کہ یہ ممکنہ طور پر کوئی متروک راستہ تھا جو دلدلوں کے باعث اب استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس نے پک اپ اس راستے پر ڈال دی۔ اس وقت چھ بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ اس کے پاس بہ مشکل پون گھنٹے کا وقت تھا۔ اس کے بعد اندھیرا چھا جاتا اور عورت کے شوہر اور بچوں کی تلاش ناممکن ہو کر رہ جاتی پھر ہنگامی امداد اور تلاش کے ماہر کارکن بھی اس جنگل میں قدم رکھنے سے انکار کردیتے۔ احتیاط سے پک اپ آگے بڑھاتے ہوئے وہ مسلسل ہارن دے رہا تھا۔ تاکہ اگر مردیا اس کے بچے سنیں تو جواب دے سکیں۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے پاس مشینی بگھی تھی۔

دلدلی علاقہ شروع ہونے سے پک اپ کے ٹائر زمین میں دھنس رہے تھے اور اس کا نچلا حصہ بار بار زمین سے رگڑ کھا رہا تھا لیکن پک اپ کا طاقت ور آٹھ سلینڈر کا انجن اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ تقریباً نصف میل اندر جانے کے بعد اس کی نگاہوں نے غیر مانوس رنگ محسوس کیے۔ فوراً اس کی آنکھیں ایک پانی سے بھرے گڑھے پر مرکوز ہوگئیں۔ جہاں ایک معصوم بچہ بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ وہ گردن تک کیچڑ اور پانی میں دھنسا ہوا تھا۔ اگر یہ دلدل ہوتی تو بچہ کب کا اس میں غائب ہوچکا ہوتا۔ پک اپ سے اتر کر فل اس کی طرف بڑھا۔ بچہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فل نے اسے پچکارا "تمہاری مام میرے پاس ہیں لڑکے۔"

اس نے احتیاط سے بچے کو گڑھے سے نکال لیا۔ کیچڑ اس کے جسم پر کپڑوں کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کی سوجن نہیں چھپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور منہ، ناک سب بری طرح سوجے ہوئے تھے۔ سوکھے کیچڑ کے باعث اس کے کان مڑ گئے تھے اور جلد سفید ہوگئی تھی۔ اس پر جا بجا بھڑوں کے ڈنک چبھے ہوئے تھے۔ احتیاط کے باوجود بچے کو تکلیف ہوئی اور وہ رونے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" فل نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔

"میتھیو۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا "میری ممی کہاں ہیں۔"

"تمہاری ممی اسپتال میں ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟" فل نے اسے چمکارا۔

"مجھے نہیں معلوم ڈیڈی کہاں ہیں۔" اس نے کہا اور اچانک یوں کانپنے لگا جیسے شدید سردی لگ رہی ہو۔ اگرچہ درجۂ حرارت شام کے اس پہر بھی بتیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا "مجھے سردی لگ رہی ہے۔" بچے نے لرزتے ہوئے کہا اور اچانک ہی وہ پک اپ کی نشست پر لڑھک گیا۔ فل نے اس کی نبض دیکھی۔ جو خاصی سست چل رہی تھی۔ "میرے خدا!

اس کی حالت تو خراب ہو رہی ہے۔" اس نے سوچا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ بچے کے بھائی اور باپ کو بھی تلاش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا' مگر بچے کی اچانک بگڑتی حالت کی وجہ سے اس نے فوری واپسی کا فیصلہ کیا۔ یوں وہ کم از کم ایک اور زندگی بچا سکتا تھا۔ اس نے ہر ممکن تیزی سے پک اپ کو ریورس کرنا شروع کردیا۔ بدقسمتی سے وہاں اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ پک اپ کو موڑا جاسکتا تھا۔ وہ احتیاط سے گڑھوں سے بچتا جارہا تھا۔ اگر پک اپ کا پہیہ کسی گڑھے میں پھنس جاتا تو اسے بے ہوش بچے کو اٹھاکر تقریباً پانچ میل پیدل چلنا پڑتا۔ ممکن تھا بچے کی جان تو بچ جاتی لیکن جنگل میں پھنسے اس کے باپ اور بھائی کی زندگی ضرور خطرے میں پڑجاتی۔ فل بچے کو چھوڑ کر دوبارہ واپس آنا چاہتا تھا۔

تمام تر احتیاط کے باوجود پہیہ ایک گڑھے میں اتر گیا لیکن فل نے فوراً انجن کو ریس دے کر اسے نکال لیا۔ بالآخر وہ جنگل سے باہر آگیا۔ وہاں اس کی نگاہ ایک وردی پوش پر پڑی۔ یہ ڈپٹی شیرف کارل کول مین تھا' جو پک اپ کے راستے کو دیکھ کر وہاں تک آگیا تھا۔ فل نے گاڑی روک دی۔

"اس بچے کو فوری طبّی امداد کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا "وہاں پھنسے لوگوں کو نکالنے کے لیے مشینی بگھی استعمال کرنا ہوگی۔ عام گاڑیاں خود وہاں جاکر پھنس جائیں گی۔"

"ہمارے پاس مشینی بگھی نہیں ہے۔" کول مین مایوسی سے بولا۔

"ہمارے پاس شکاری کیمپ میں ہے۔ تم وہاں سے لے سکتے ہو۔" فل نے کہا "لیکن جلدی' ورنہ اندھیرا چھا جائے گا۔"

پھر دونوں گاڑیاں اوزٹونا کی طرف روانہ ہوگئیں۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ انہیں ریزرو کا فائر چیف ڈینس ہونسنگز مل گیا۔ انہوں نے ایک مختصر سی میٹنگ کے بعد طے کیا کہ پہلے کول مین بچے کو اوزٹونا کے میڈیکل سینٹر میں چھوڑے گا اور پھر شکاری کیمپ سے مشینی بگھی اور رضا کاروں کی جماعت لے کر جنگل کی طرف آئے گا جبکہ فل اور ہونسنگز واپس جا کر جنگل میں بچے اور اس کے باپ کو ڈھونڈیں گے۔ فیصلہ ہوتے ہی دونوں تیزی سے اپنی اپنی سمتوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس وقت چھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ سورج غروب ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔

"اگر ان لوگوں کو ڈھونڈنا ہے تو ہمیں ان کی مشینی بگھی کے ٹائروں کے نشانات ڈھونڈنے ہوں گے۔" ہولنگز نے کہا "بدصورتِ دیگر کامیابی کی امید کم ہے۔ یہ جنگل اور دلدل بہت وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔"

فل نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور وہ جنگل میں گھسنے کے بجائے شکاری کیمپ والی سمت سے جنگل کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ وہاں جابجا کیچڑ زدہ راستے بنے تھے لیکن کسی پر ٹائروں کے نشانات نہیں تھے۔

"یہ وہ دیکھو!" اچانک ہولنگز چیخا۔ اس کے اشارے کی سمت انہیں جنگل میں گھسنے والے راستے پر مشینی بگھی کے بڑے ٹائروں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ انہوں نے گاڑی سے اتر کر نشانات کا معائنہ کیا۔

"یہ نشانات تازہ ہیں اور چند گھنٹے پہلے بنے ہیں۔" فل نے انکشاف کیا "اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی راستے سے جنگل میں داخل ہوئے تھے۔"

"ہمیں فوراً آگے جانا چاہیے۔" ہولنگز نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

فل نے نفی میں سرہلایا "نہیں ہمیں یہیں رک کر کیمپ سے شکاری حضرات اور بگھی کا انتظار کرنا چاہیے ہم دونوں کا بغیر کسی کو بتائے جنگل میں جانا حماقت ہوگی۔"

ہولنگز نے اس سے اتفاق کیا "ٹھیک ہے ہم گاڑی میں آگے نہیں جاتے' لیکن ہم پیدل جاسکتے ہیں۔ اس سے پہلے میں ریڈیو پر کیمپ اطلاع دے دوں۔"

ہولنگز اپنے کام سے فارغ ہو کر آیا تو دونوں کیچڑ پر بنے نشانات کے سہارے آگے بڑھنے لگے کچھ دیر بعد دلدلی گھاس شروع ہوگئی۔ یہاں اگر گھاس نہ ہوتی تو وہ لوگ یقیناً دلدل میں دھنسنے لگتے۔

"وہ دیکھو۔" اچانک ہولنگز چیخا۔

پھر فل نے جو دیکھا اسے دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سامنے ہی ایک دلدلی گڑھے میں ایک بچہ شانوں تک غرق تھا۔ اس کا سر اور صرف ایک بازو باہر تھا۔ وہ بے بسی کی ایسی تصویر تھا جسے دیکھ کر دکھ سے ان دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ بچہ ہوش میں تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر کچھ کہنے

کی کوشش کی مگر اس کے سوکھے لبوں سے کوئی آواز نہ نکلی۔
"فکر نہ کرو لڑکے۔" ہولنگز نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا "ہم ابھی تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔"
انہوں نے مارک کو نکالا اور واپس اپنی گاڑی تک آئے۔ انہوں نے ریڈیو پر دوسرے بچے کی بازیابی کی خبر دی۔ کول مین نے کہا کہ وہ بچے کو لینے آرہا ہے۔ اس کے بعد ہولنگز اور فل آدمی کی تلاش جاری رکھیں گے۔ پانچ منٹ بعد کول مین طوفانی رفتار سے اسکواڈ کار دوڑاتا وہاں آیا اور بچے کو لے کر رخصت ہوگیا۔ ابھی تک مشینی بگھی نہیں آئی تھی لہٰذا فل اور ہولنگز نے خود جا کر آدمی کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔

○☆○

ڈیبی کے جاتے ہی بین درد کی وجہ سے بے ہوش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہوش میں آیا تو جنگل میں سکوت طاری تھا۔ ڈیبی تو خیر جا چکی تھی۔ بچوں کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ اس نے مارک اور میتھیو کو پکارا، لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بین کا دل ڈوبنے لگا۔ نہ جانے اس کے بچے کہاں نکل گئے تھے، زندہ بھی تھے یا کسی دلدل اور مگرمچھ کا نوالہ بن گئے تھے۔ یہ خیال اتنا وحشت ناک تھا کہ بے اختیار بین نے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر جیسے ہی مضروب ٹانگ حرکت میں آئی اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ ایک بار پھر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ ہڈی ٹوٹنے سے ٹانگ سوج گئی تھی اور اسکن فٹ جینز کی وجہ سے وہ مزید سوجنے سے قاصر تھی۔ جس کا اثر رگوں پر پڑ رہا تھا۔ دباؤ کے باعث گینگرین کا خطرہ تھا لیکن فی الوقت بین ان سب خطرات سے بے نیاز تھا۔
اسے دوبارہ ہوش آیا تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا اور جنگل مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ بین نے شدید قسم کی مایوسی محسوس کی۔ مدد اب تک نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیبی جنگل سے نکل کر شکاری کیمپ تک پہنچ ہی نہیں سکی تھی۔ جنگل کی آوازوں میں سب سے نمایاں ڈکرانے کی آوازیں تھیں۔ سارا دن کی گرمی کے بعد مگرمچھ اپنے پانی کے مسکنوں سے نکل آئے تھے اور ہولناک آوازوں میں ڈکرا رہے تھے بین لرز کر رہ گیا۔ اسی لمحے ایک اور آواز آئی۔ پہلے تو بین یہ سمجھا کہ کہیں قریب ہی کوئی مگرمچھ دبکا غرّا رہا ہے لیکن آواز مسلسل آنے لگی اور قریب بھی آنے لگی۔ اس کے گونجتے آہنگ کو سن کر بین خوشی سے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یہ تو مشینی بگھی کی آواز تھی پھر ایک انسانی آواز آئی۔

"بین تم کہاں ہو؟"
مارے حیرت کے پہلے تو اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکلی پھر وہ چیخا "میں یہاں ہوں۔" پھر اسے خیال آیا "اے ہوشیار رہنا یہاں پیلی بھڑوں کے چھتے ہیں۔"
کچھ بعد فل، ہولنگز اور دیگر رضا کار نمودار ہوئے۔ انہوں نے احتیاطاً برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ پہلے انہوں نے بین کو اٹھا کر مشینی بگھی پر سوار کرایا پھر انہوں نے بین کی بگھی کو اسٹارٹ کیا اور اسے پیچھے لائے۔ بین کو اورٹونا کے میڈیکل سینٹر روانہ کردیا گیا۔ جہاں فوری طور پر ابتدائی مرہم پٹی کے بعد اسے نیپلز روانہ کردیا گیا، اس کی ٹانگ کا کیس ذرا پیچیدہ تھا اور ہڈی آپریشن کے بغیر نہیں جڑ سکتی تھی۔
مشینی بگھی ہٹانے کے بعد شکاریوں نے وہاں کا معائنہ کیا۔ ایک چھوٹے درخت پر پیلی بھڑوں کا بہت بڑا چھتہ پایا گیا۔ جس کے نیچے لاکھوں بھڑیں مردہ حالت میں پڑی تھیں۔ بین نے بے خیالی میں بگھی ان کے مسکن پر چڑھا دی تھی۔ بھڑوں کا مشتعل ہونا فطری تھا۔ حیرت انگیز طور پر بھڑوں نے کتوں کو خاص گزند نہیں پہنچایا تھا۔ شاید بھڑوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ان کے گھر کی تباہی میں ان بے زبانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔
ڈیبی کی خراب حالت کے پیش نظر اسے پہلے ہی کولمبیا ایسٹ پوائنٹ ہاسپٹل روانہ کردیا گیا تھا۔ جہاں وہ موت کے منہ سے نکل کر آئی تھی۔ الرجی کے دورے اور لاتعداد بھڑوں کے زہر نے اس کے نظام تنفس کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ اگر اسے سانس دلانے والی مشین نہ لگائی جاتی تو وہ مر بھی سکتی تھی۔ بین کو اپنے گھٹنے اور ران کی ہڈی کے متعدد آپریشن کروانے پڑے لیکن وہ جلد صحت یاب ہوگیا۔ بچوں کو بھی بھڑوں نے خوب ہی کاٹا تھا لیکن وہ جلد صحت یاب ہوگئے۔
ڈاکٹر سب سے زیادہ ڈیبی کی قوتِ ارادی پر حیران تھے۔ اسے تقریباً دو ہزار بھڑوں نے کاٹا تھا اور الرجی کے دورے کے باوجود تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کرکے شکاری کیمپ تک جا پہنچی تھی جب کہ ایسی حالت میں کوئی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکتا ہے۔ کولمبیا ایسٹ پوائنٹ ہاسپٹل کے چیف سپرنٹنڈینٹ کہتے ہیں۔
"ہم اسے سوائے ایک ماں اور ایک بیوی کی قوتِ ارادی اور اپنے گھرانے سے محبت کے.... کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جس کا شوہر اور بچے خطرے میں ہوں۔"

منظر بہت زیادہ رنگین تھا۔ آسمان گہرا نیلا تھا اور دور تک گھاس کا میدان بے حد سبز ہو رہا تھا۔ دور بلند و بالا درختوں کی ایک طویل قطار تھی جو تیز ہوا کے سامنے جھوم رہے تھے۔ ایک مختصر سا خاندان اس سبزہ زار میں پکنک منانے کے انداز میں گھوم رہا تھا۔ عورت' اس کا شوہر اور دو عدد بچے۔ ان کی کھلی جیپ کچھ ہی دور کھڑی تھی۔ اس قدرتی لینڈ اسکیپ نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ وہ بے اختیار یہاں رکنے پر مجبور ہو گئے۔

"ممی' ہم وہاں جائیں گے۔" چھوٹے لڑکے نے ماں کا بازو پکڑ کر کہا۔ اس کا اشارہ درختوں کی قطار کی طرف تھا۔ یہ درخت انوکھے سے تھے۔ بچے کی ضد پر وہ ان انوکھے درختوں کی طرف بڑھے۔ میاں بیوی کا انداز محتاط تھا جبکہ بچے بے حد پُرجوش ہو رہے تھے۔ وہ اچھلتے کودتے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔ معاً میاں بیوی رک گئے۔ انہوں نے ایک عجیب سی آواز سنی تھی جیسے کوئی جانور ڈکرایا ہو پھر انہیں درختوں کی دوسری طرف کسی چیز کی حرکت کا احساس ہوا اور یہ احساس بھی بہت عجیب تھا۔ انہیں یوں لگا جیسے حرکت کرنے والی چیز بہت... بہت بڑی ہو۔

غیر معمولی فلموں کے غیر معمولی ہدایت کار اسٹیون اسپل برگ کا قصہ

بہت چھوٹی عمر میں فلم میکنگ اس کا محبوب مشغلہ بن گئی تھی۔ نسلاً یہودی ہونے کی وجہ سے وہ اکثر دوسروں کی نظر میں اپنے لیے حقارت اور نفرت کی چنگاریاں دیکھتا اور شاید یہی وہ زہر تھا جو بالآخر اُس کی رگوں میں سیماب بن کر دوڑنے لگا۔ اپنے آپ کو منوانے اور دُنیا میں کوئی بڑا کام کرنے کے لیے اُس نے ہر بڑا چیلنج قبول کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً "دی جاز" جیسی معرکہ آرا فلم منصۂ شہود پر آ گئی۔ اس کے بعد "جُراسک پارک" نے تو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے اور سب نے تسلیم کر لیا کہ وہ ہالی وڈ میں سب سے بڑا فلم میکر ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ ایک یہودی ہے اور اپنی قوم اور مذہب کے معاملے میں نہایت متعصب اور متشدد بھی لیکن فلم دیکھنے والوں کی نظر میں وہ ایک عظیم ہدایت کار ہے۔

کرشمہ کار

ترجمہ: کاشف زبیر

عورت رک گئی۔ اس نے اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام کر سرگوشی کی "مجھے لگ رہا ہے، ہم پروفیسر کی بتائی ہوئی حد سے آگے نکل آئے ہیں۔"

عین اسی لمحے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی۔ درختوں کی قطار کے اوپری حصے میں ہلچل سی ہوئی اور پھر ایک عجیب سی چیز پتّوں اور ٹہنیوں کو چیرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ ناقابلِ یقین، وہ ایک بہت بڑا سر تھا جو کسی کچھوے کے سر سے ملتا جلتا تھا لیکن یہ اکیلا سر ہی دنیا کے سب سے بڑے کچھوے سے بھی کئی گنا بڑا تھا اور وہ جس بلندی سے جھانک رہا تھا وہ اور بھی ناقابلِ یقین تھی۔ یعنی سطحِ زمین سے ساٹھ فٹ بلند۔ سر پر دو بڑی بڑی اور کچھ سرخی مائل آنکھیں تھیں جن سے استعجاب جھلک رہا تھا۔ وہ سر ان انسانوں کو اتنے ہی ناقابلِ یقین انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کہ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔

"ڈائنا سورس۔" عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ درختوں کی طرف بڑھی۔ سر جس کے منہ سے سبز پتّیاں جھانک رہی تھیں، غڑپ سے واپس درختوں کے عقب میں غائب ہوگیا۔ عورت کے پیچھے اس کا شوہر اور بچے تھے۔ جیسے ہی وہ درختوں کے قریب آئے، انہیں ایک میٹر قطر کے تنے کے عقب سے اتنے ہی موٹے چار تنے اور نظر آئے لیکن یہ تنے نہیں تھے بلکہ اس جانور کے چار عدد پیر تھے جو کچھ دیر قبل ساٹھ فٹ کی بلندی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ جتنا اونچا تھا اس سے کہیں زیادہ طویل تھا۔ اس کی موٹی سی دُم میدان میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بھاری بھرکم جسم اور مختصر سے سر کے درمیان ایک طویل اور پتلی سی گردن تھی جس کے سہارے وہ ان درختوں کے پتّے اور نرم شاخیں توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔

میاں، بیوی اور بچے سکتے کی کیفیت میں کھڑے اس عظیم الشّان جانور کو دیکھ رہے تھے جو نہایت انہماک سے شکم پروری میں لگا ہوا تھا۔ یا حیرت..... یہ کروڑوں سال پہلے نیست و نابود ہوجانے والا جانور اس دورِ جدید میں کیسے آیا۔ صرف وہی نہیں بلکہ دور دور تک اس کے بھائی بندے پھیلے ہوئے نہایت رغبت سے سبز چارا کھانے میں مصروف تھے۔ ان سے پرے دور پہاڑوں کے دامن میں چند اور بھی عجیب و غریب جانور بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ شکاری تھے اور کچھ ان کے شکار لیکن نوّے فٹ لمبا اور ساٹھ فٹ اونچا سبزہ خور جانوروں کی نسل کا یہ نمائندہ اتنا ہی بے ضرر تھا جتنا کہ ایک بکری ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عین قدموں تلے موجود انسانوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اور وہ بھی ڈرے بغیر اسے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

لیکن ٹھہریے۔ کیا یہ واقعی کوئی حقیقی منظر تھا یا پھر کسی فلم کا سین مگر فلم کے سین اتنے حقیقی اور اتنے مؤثر تو نہیں ہوتے۔ ڈائنا سورس نامی ان جانوروں پر متعدد فلمیں بنیں اور باکس آفس پر بے حد کامیاب بھی ہوئیں لیکن وہ سب بچوں کے کھیل تماشوں سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔ جانوروں کے مصنوعی ماڈل واضح طور پر مکینکل محسوس ہوتے تھے اور ان کے تاثرات ایک پپٹ (پتلی) جتنے ہوتے تھے۔ سنجیدہ لوگوں کے لیے ان فلموں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تب اگر یہ فلم نہیں تھی تو کیا حقیقت تھی!

جی نہیں۔ یہ حقیقت بھی نہیں ہے۔ یہ فلم ہی ہے لیکن حقیقت سے اتنی قریب جیسے سچ ہو۔ جن لوگوں نے سنیما میں جراسک پارک نامی یہ فلم دیکھی ہوگی وہ اس کے حقیقت سے قریب تاثرات کو بہت عرصے تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔ اس فلم میں جس طرح زمانۂ قدیم کے جانوروں کو زندہ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور شکار کرتے دکھایا گیا ہے وہ بلاشبہ متاثر کن ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ اسکرین پر دکھائے جانے والے یہ جانور ماڈل نہیں تھے بلکہ یہ ایک سُپر کمپیوٹر کا تخیل تھا۔ دیکھا آپ نے، کمپیوٹر کا تخیل! یہ وہ چیزیں ہمیں دکھانے پر قادر ہے جو حقیقت میں وجود ہی نہیں رکھتیں۔ کروڑوں ڈالر کی لاگت سے تیار ہونے والی اس فلم پر خرچ ہونے والا اکثر سرمایہ صرف ان کمپیوٹر گرافکس پر خرچ ہوا جو قدیم جانوروں کو حقیقت سے قریب ترین کرکے اسکرین پر پیش کرتے تھے۔ اس فلم نے آمدنی اور مقبولیت کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیے اور اس ریکارڈ توڑ فلم کا خالق مشہورِ زمانہ ہالی ووڈ لیجنڈ اسٹیون اسپیل برگ تھا جس نے فسانے کو حقیقت بنا کر پیش کیا۔ کمپیوٹر گرافکس کی مدد سے غیر معمولی مناظر کو بالکل حقیقی انداز میں پیش کرنے کا سہرا مشہور فلم ٹرمی نیٹر ٹو کے سر ہے لیکن ٹرمی نیٹر ٹو کے چند ایک سین کے مقابلے میں جراسک پارک کا اکثر حصہ گرافکس پر مشتمل تھا اور یہ گرافکس ٹرمی نیٹر ٹو کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ تھے۔

اسٹیون اسپیل برگ ہمیشہ سے ہی چیلنج قبول کرنے کے لیے مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اکثر فلموں کے موضوعات منفرد ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ایسے پیچیدہ موضوعات جنہیں دوسرے ڈائریکٹر فلمانے سے کتراتے

ہوں۔ اسپل برگ نے کوئی خاص شعبہ نہیں اپنایا۔ اس نے دہشت ناک فلمیں بھی بنائیں اور ایکشن کو بھی بڑی خوبی سے سینما اسکرین پر پیش کیا۔ اس نے جراسک پارک جیسا منفرد موضوع بھی فلمایا اور ایسا فلمایا کہ یہ موضوع مثال بن کر رہ گیا لیکن اس نے جو موضوع بھی اپنایا اس پر اپنی چھاپ ڈال دی۔ ہالی ووڈ میں بھی ایسے ہدایت کار کم گزرے ہیں جن کی فلموں کا ایک ایک سین اپنے تخلیق کار کی طرف اشارہ کرتا ہو۔

☆

اسٹیون اسپل برگ جرمن نژاد یہودی تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کا خاندان وسطی یورپ سے ہجرت کرکے امریکا چلا آیا۔ اس کا باپ آرنلڈ اسپل برگ ایک ملازمت پیشہ شخص تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس کے رہن سہن کے ٹھاٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی اور بھی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ خاص طور سے یہ کہانی تو بہت مشہور تھی کہ جنگِ عظیم کے دوران میں جرمنوں سے خائف یہودیوں نے اپنی قیمتی اشیا (سونا جواہرات اور نوادرات) زمین میں دفن کردی تھیں۔

آرنلڈ اسپل برگ کو ایسا ہی کوئی دفینہ مل گیا تھا۔ اس کے امریکا بھاگ آنے کی وجہ بھی یہی بیان کی گئی ہے۔ اگر وہ یورپ میں ہی رہتا تو جلد یا بدیر گمشدہ دولت کے ورثا اسے تلاش کرلیتے جبکہ وسیع وعریض ملک امریکا میں ایسا کوئی خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ امریکا آکر اسپل برگ خاندان ہمیشہ اعلیٰ درجے کی رہائش گاہوں میں رہا۔ ان گھروں میں ضرورت اور تعیش کا ہر سامان موجود رہا۔ ان کے پاس ہمیشہ بہترین کار موجود رہی۔ اسٹیون اور اس کے بہن بھائی اچھے کپڑے پہنتے تھے اور اعلیٰ درجے کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کا باپ ان کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔

اسٹیون اسپل برگ اگرچہ امریکا میں پیدا نہیں ہوا لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے خود کو امریکا میں ہی پایا۔ یہ ہیڈن فیلڈ کا قصبہ تھا اور یہاں سوائے اسپل برگ خاندان کے کوئی یہودی خاندان نہیں تھا۔ نو عمر اسٹیون ہمیشہ خود کو دوسروں سے مختلف سمجھتا تھا اور اسے یہ احساس اس کے ساتھی دلاتے تھے جو اس سے حقارت آمیز سلوک کرتے اور کسی قسم کے احتجاج پر اس کی ٹھکائی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ آرنلڈ کے اپنے پڑوسیوں اور علاقے کے لوگوں سے تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ نہ وہ ان سے ملنا پسند کرتا تھا اور نہ ہی وہ اسپل برگ خاندان سے کوئی تعلق رکھنا پسند کرتے تھے۔ آرنلڈ صرف اس وقت کسی سے ملنے جاتا جب اسے یہ شکایت کرنی ہو کہ آپ کے بچے نے میرے بیٹے کو مارا پیٹا ہے۔ اکثر لوگ اس کی شکایت پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے اور کچھ نیم دلی سے اپنے بچوں کو سرزنش کرنے کا وعدہ کرلیتے مگر شاید ہی کسی نے اپنا وعدہ وفا کرنے کی کوشش کی ہو۔ لہٰذا اسپل برگ خاندان کے بچوں کے ساتھ قصبے کے بچوں کے معاندانہ رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اسٹیون اپنے بچپن کی یادداشتوں کو کچھ زیادہ خوش گوار نہیں کہہ سکتا تھا لیکن کرسمس کے دن تو اس کے لیے دلی اذیت کا باعث بن جاتے۔ ان دنوں قصبے کا ہر گھر اور ہر گلی سجائی جاتی تھی۔ جابجا کرسمس ٹری جگ مگا رہے ہوتے تھے۔ ہر لان ان سے سجا ہوتا سوائے اسپل برگ خاندان کے لان کے۔ علاقے کے دوسرے گھر جب رنگ برنگی روشنیوں سے منور ہو رہے ہوتے تھے تو اسپل برگ وِلا تاریکی میں ڈوبا ہوتا۔ ایسا لگتا جیسے چمکتی دمکتی کہکشاں کے درمیان بلیک ہول ہو۔ اسٹیون اپنے گھر کو کرسمس پر ایک سیاہ دھبا ہی قرار دیتا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے دریافت کیا۔

"ہم کرسمس کیوں نہیں مناتے؟"

آرنلڈ اپنے چھ سالہ بچے کے سوال پر چونکا۔ اس نے

جواب دیا "اس لیے کہ ہم یہودی ہیں اور ہمیں اپنے یہودی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔"

اسٹیون یہ نہیں سمجھ سکا کہ اسے اپنے یہودی ہونے پر کیوں فخر کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ خود کو اکیلا اور سب سے الگ تھلگ محسوس کرتا تھا اور اسکول میں جاکر تو یہ احساس اور بڑھ گیا جہاں ہر طرف بچے ہی بچے تھے لیکن کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا دوست قرار دے سکتا۔ وہ اس کے ساتھ کلاس میں پڑھتے تھے اور اسکول کے پلے گراؤنڈ میں کھیلتے بھی تھے۔ ان میں ہنسی مذاق بھی ہوتا مگر ساتھ ہی ان کے رویوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہوتی تھی جو اسٹیون کو ان سے علیحدہ ہونے کا احساس دلاتی۔ اپنی زبان اور اپنے رنگ و روپ سے وہ ان ہی جیسا ایک بچہ تھا لیکن اندر سے وہ ان سے قطعی مختلف تھا۔ وہ ایک یہودی تھا۔

ہیڈن فیلڈ میں رہائش اس کے بچپن کا زمانہ تھا۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو آرنلڈ اسپل برگ اپنے خاندان کے ساتھ فی نکس (ایری زونا) منتقل ہوگیا۔ اتفاق سے اس شہر میں بھی یہودی خاندان نہ ہونے کے برابر تھے اور فی نکس کے پڑوسیوں اور اسکول کے ساتھیوں کا رویہ ہیڈن فیلڈ والوں سے بھی زیادہ خراب تھا۔ ان کے درمیان اسٹیون خود کو خلا سے آیا ہوا کوئی ایلین محسوس کرتا۔ جو باقی دنیا والوں سے قطعی مختلف ہو۔

"جب آپ جوان ہورہے ہوں تو اپنے ہم جنسوں کی یہ بے اعتنائی اور بھی اذیت ناک لگتی ہے۔" نوّے کے عشرے میں اسپل برگ نے یہ بات اپنے ایک انٹرویو میں کہی "میں شرم اور احساس کمتری کا مارا ہوا تھا۔ سوائے تعلیم کے 'میرا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ میں نے مصور بننے کی کوشش کی۔ ناکام رہا پھر موسیقی میں طبع آزمائی کی۔ اگرچہ میں اچھا پیانو بجانے لگا تھا مگر کلاس کے دوسرے بچوں کی ہوٹنگ نے مجھے دل برداشتہ کردیا۔ آخر میں نے ایتھلیٹ بننے کی کوشش کی۔ اس میں بھی مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ لڑکیوں سے میل ملاقات بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اسکول کی بدصورت ترین لڑکی کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا تھا جیسے میں لڑکے سے زیادہ کوئی جوکر ہوں۔

"کیونکہ اسکول کے میدان میں تربیت کے دوران میں دوسرے لڑکے مجھے تنگ کرتے' وہ جان بوجھ کر میرے راستے میں آتے اور میرا ردھم توڑ دیا کرتے تھے۔ لہٰذا میں اپنے گھر کے قریب پارک میں جاکر دوڑ کی پریکٹس کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ میرے حق میں اچھا نکلا۔ اسکول کی اگلی ایک میل کی دوڑ میں' میں نے تمام ہی ایتھلیٹ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ صرف ایک لڑکا تھا جو مستقل مزاجی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور جب ریس آخری مراحل میں تھی تو وہ مجھ سے کچھ ہی قدم کے فاصلے پر تھا۔ یک بیک ریس ٹریک کے اطراف میں موجود اسکول کے لڑکے لڑکیوں نے ایک آواز ہوکر اس لڑکے کی حوصلہ افزائی شروع کردی۔ میں پورے ردھم میں دوڑ رہا تھا لیکن پہلی بار مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ میں سُست پڑنے لگا۔ دوسری طرف حوصلہ افزائی پاکر اس لڑکے کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ میرے قریب آگیا۔ فنشنگ پوائنٹ کچھ ہی دور تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی آواز مزید تیز ہوگئی۔ وہ لڑکا ہر لمحے آگے نکلا جارہا تھا اور جب اس نے وکٹری لائن عبور کی تو میں اس سے چار قدم پیچھے تھا۔ وہ لڑکا لائن عبور کرتے ہی لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہاں موجود سب ہی افراد اس کی طرف لپکے۔ اسے کندھے پر اٹھایا اور ناچتے ہوئے میدان سے رخصت ہوگئے۔ میں افسردگی کی تصویر بنا وہاں اکیلا رہ گیا۔ آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے تھے۔"

جلد ہی اسٹیون اسپل برگ کی سمجھ میں آگیا کہ وہ شعبے جن میں اسے دوسروں سے مقابلہ کرنا ہو اس کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اسے کوئی ایسا مشغلہ اپنانا تھا جو اتنا مختلف اور منفرد ہو کہ اس میں کوئی اس کا مدِمقابل نہیں ہو۔ وہ جان گیا کہ وہ اس طرح ہی آگے بڑھ سکتا تھا اور دوسروں کی توجہ حاصل کرسکتا تھا۔ ان ہی دنوں وہ اپنے باپ کے ساتھ پہلی مرتبہ سنیما گیا۔ وہاں اس نے "گریٹسٹ شو آن دی ارتھ" دیکھی۔ یہ فلم حیرت انگیز اور سچے واقعات پر مبنی تھی۔ ان ہی واقعات میں ایک ٹرینوں کا آپس میں ٹکراؤ تھا۔ اس فلم نے نوعمر اسپل برگ کو بے حد متاثر کیا تھا اور اس کی فلموں سے دلچسپی اس اوّلین فلم کے ساتھ ہی قائم ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔

"پاپا' فلمیں کس طرح بنتی ہیں؟"

آرنلڈ نے اس کے سوال کا عملی جواب دیا اور اسے ایک چھوٹا مووی کیمرا لادیا۔ یہ آٹھ ایم ایم کی فلم پر منظر کشی کرسکتا تھا۔ بظاہر یہ ایک کھلونا تھا لیکن درحقیقت اس عظیم اسپل برگ کا نقطۂ آغاز تھا جس نے آگے چل کر سنیما اسکرین کے رنگ ڈھنگ ہی بدل دیے تھے۔ اسپل برگ نے اس کیمرے سے جو پہلا منظر شوٹ کیا' وہ اس کی چھوٹی سی کھلونا ٹرین کو پیش آنے والا حادثہ تھا۔ اس نے بڑی ہنرمندی سے یہ حادثہ ترتیب دیا اور پھر اسے فلم کے فیتے پر منتقل کیا۔ بعد میں اس نے یہ فلم "دی ٹرین ریک" کے نام سے اپنے

چھوٹے پروجیکٹر کی مدد سے اپنے گھر کے ایک کمرے میں ریلیز کی۔ گھر کے باکس آفس پر یہ فلم ہٹ ہوگئی اور آنے والے کئی ہفتوں تک اسپل برگ خاندان اس سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کے بعد بھی اسپل برگ نے کئی فلمیں تخلیق کیں۔ جن میں کہانی بھی ہوتی تھی اور کردار بھی۔ یہ دور الفرڈ ہچکاک کا تھا جو سسپنس فلموں کا خالق تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ننھے اسپل برگ کی زیادہ تر فلمیں ڈراؤنی اور پُراسرار ہوتی تھیں۔ ان فلموں میں عموماً چڑیل یا جادوگرنی کا کردار اسپل برگ کی بہنیں ادا کرتی تھیں۔ ایک فلم میں اس کی بہن مریضہ بنی تھی اور وہ خود دانتوں کا ڈاکٹر جو نہایت ظالمانہ طریقے سے لوگوں کو ان کے دانتوں سے محروم کردیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی بہن سچ مچ تو دانت نکلوانے پر تیار نہیں ہوئی لہٰذا اسپل برگ نے اس کا حل یہ نکالا کہ ایک پاپ کارن کے دانے کو ٹماٹو کیچپ میں لتھیڑ کر بہن کے منہ میں رکھ دیا اور پھر ایسا تاثر دیا جیسے وہ زنبور سے کھینچ کر دانت نکال رہا ہو۔ ایسا کرتے وقت اس نے اپنا جوتا زور سے بہن کے پیر پر رکھ دیا تاکہ اس کے چہرے پر درد و تکلیف کے صحیح تاثرات ابھر آئیں اور ایسا ہی ہوا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسے بچپن سے ہی فلم بندی کا شعور تھا۔ وہ اپنے مطلب کا کام لینے کا ہنر جانتا تھا۔

وہ جونیئر ہائی اسکول پاس کرکے سینئر ہائی اسکول میں پہنچا تو یہاں بھی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا گیا لیکن اب اس کے پاس ایسا حربہ آگیا تھا جس سے وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ بناسکتا تھا۔ اس نے اسکول کی تقریبات اور کھیلوں میں فوٹو گرافی کی اور جلد ہی تقریباً پورا اسکول اس کا گرویدہ ہوگیا۔ وہ اپنے ہم جماعت لڑکے لڑکیوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ان ہی دنوں پہلی بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا۔

"اگر میں سنیما کے لیے فلمیں بناؤں تو......"

پہلے پہل تو اسے اس خیال پر ہی ہنسی آگئی لیکن جیسے جیسے وہ سوچتا رہا اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ سنجیدہ ہوگیا۔ اتفاق سے اس کے ایک کزن نے جو لاس اینجلس میں رہتا تھا' اسے گرمیوں کی چھٹیاں لاس اینجلس (کیلی فورنیا) میں منانے کی دعوت دی اور اسپل برگ نے یہ دعوت صرف اس لیے قبول کرلی کہ لاس اینجلس میں ہالی ووڈ تھا۔ دنیا میں فلم سازی کا سب سے بڑا مرکز' وہ چھٹیوں کے پہلے روز اپنے کزن کے پاس پہنچ گیا۔

ہالی ووڈ کے سب سے بڑے فلم اسٹوڈیو "یونیورسل اسٹوڈیوز" نے سیاحوں کے لیے اسٹوڈیوز کی سیر کے لیے ایک بس سروس شروع کی تھی۔ یہ بس مسافروں کو لے کر پورے اسٹوڈیو میں گھومتی۔ اگرچہ کسی شخص کو بس سے اترنے کی اجازت نہیں تھی لیکن سیاحوں کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اپنے محبوب فلمی ستاروں کو قریب سے دیکھ سکیں گے۔ بے شک چلتی بس سے سہی۔

اسپل برگ جس روز لاس اینجلس پہنچا اس سے اگلے روز اسٹوڈیو کے اوّلین ٹرپ کے لیے بس پر سوار ہونے والا وہ پہلا فرد تھا۔ بس پورے تین گھنٹے اسٹوڈیو میں گھومتی رہی لیکن اسپل برگ کی تسلی نہ ہوسکی لہٰذا جب اگلی بس روانہ ہوئی تو وہ اس میں بھی موجود تھا اور اس دفعہ اس کا ارادہ صرف بس کے اندر سے اسٹوڈیو دیکھنے کا ہی نہیں تھا۔ جیسے ہی بس نے پہلا باتھ روم اسٹاپ کیا وہ چپکے سے بس سے اترا اور وہاں سے کھسک گیا۔ وہ پیدل ہی اسٹوڈیو میں گھومنے پھرنے لگا جہاں جا بجا فلم سازی کا سامان بکھرا پڑا تھا اور مختلف حصوں میں بیک وقت کئی فلموں کی شوٹنگ جاری تھی۔ کہیں کاؤ بوائے گھوڑے دوڑا رہے تھے اور کہیں گینگسٹر ایک دوسرے پر گولیاں برسانے میں مصروف تھے۔ کہیں رومانی پکچر کی شوٹنگ ہورہی تھی۔ ہیرو ہیروئن ناچنے گانے یا وہ "سب" کرنے میں مصروف تھے کہ مشرقی تہذیب جسے زیر قلم لانے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔

ایک جگہ سیٹ پر نہایت ڈرامائی منظر جاری تھا۔ ہیرو' ہیروئن سے شادی پر اصرار کررہا تھا اور بصورتِ انکار خودکشی کی دھمکی دے رہا تھا۔ دوسری طرف ہیروئن ذات پات اور خاندان کی زنجیروں میں جکڑی تھی۔ سنیما اسکرین پر یہ ایک متاثر کرنے والا سین ہوتا۔ لیکن سیٹ پر بہت سے افراد کی موجودگی میں اور صرف ایک خاص کونے میں سامان اس ترتیب سے رکھ کر کہ ایک عالی شان خواب گاہ کا منظر بن رہا ہو' یہ سین اسپل برگ کو اتنا مضحکہ خیز لگا کہ بے اختیار اس سے قہقہہ سرزد ہوگیا۔ اس سیٹ پر موجود افراد نے اسے یوں گھورا کہ اس نے وہاں سے کھسک جانے میں عافیت سمجھی۔

درحقیقت کیمرا جو منظر فلم بینوں کو دکھاتا ہے اس میں حقیقت کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ بظاہر ہیرو بیس فٹ اونچی دیوار سے چھلانگ لگاتا ہے لیکن اصل میں وہ صرف چند فٹ کی اونچائی سے کودتا ہے۔ باقی کام کیمرا اور اس کا زاویہ کرتا ہے۔ اس طرح بہت سے مناظر کیمرا ٹرک سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے جنہیں سنیما اسکرین پر دیکھ کر تماشائی بے اختیار داد دیتے ہیں۔ شام تک اسپل برگ

اسٹوڈیو میں گھوم پھر کر ہی تماشے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا' اچھا تو یہی فلم ہوتی ہے۔

اس سرگشت کے دوران میں اس کا ٹکراؤ اسٹوڈیو کی فلم لائبریری کے سامنے مشہور ہدایت کار اور اسکرپٹ رائٹر چک سلووز سے ہوگیا۔ چک نے بھانپ لیا کہ نوجوان بغیر اجازت اسٹوڈیو کی سیر کر رہا ہے کیونکہ اس کے سینے پر کسی قسم کا بیج نہیں لگا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اسپل برگ نے احتراماً اپنا ہیٹ اتارا "سر میں اسٹیون اسپل برگ ہوں۔ اسٹوڈیو کی سیر کر رہا ہوں اور میں ہدایت کار بننا چاہتا ہوں۔"

چک سلووز نے بغور اس نوجوان کو دیکھا جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ نوجوان بمشکل سترہ اٹھارہ برس کا تھا اور شاید ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ ہدایت کار بننے کی بات کر رہا تھا لیکن جب چک کے قہقہے کے برعکس وہ مسکرایا تک نہیں تو چک کو اس کی سنجیدگی کا اندازہ ہوگیا۔

"کیا تم واقعی ہدایت کار بننا چاہتے ہو؟"

"یس سر۔ صرف چاہتا ہی نہیں ہوں بلکہ بنوں گا بھی۔"

اسپل برگ کے لہجے کے یقین سے چک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم بغیر اجازت کے اسٹوڈیو میں گھوم رہے ہو؟"

"یس سر۔"

"اور تم جانتے ہو کہ یہ ایک جرم ہے۔ تمہیں گرفتار کرکے پولیس کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"یس سر لیکن ابھی تک تو کسی نے بھی ایسا نہیں کیا۔"

اسپل برگ کے انداز میں اتنی سادگی تھی کہ چک بے اختیار مسکرا دیا۔

"اوکے لیکن اگر تم اس طرح اسٹوڈیو میں بغیر اجازت گھومتے رہے تو جلد پکڑے جاؤ گے۔ میں تمہیں ایک ہفتے کا پاس دلوا دیتا ہوں مگر یہ بتاؤ کہ تم اندر کیسے آئے؟"

"باتھ روم کے راستے۔" اسپل برگ بولا۔ جب بس باتھ روم اسٹاپ پر رُکی تو وہ ایک باتھ روم میں گیا اور اس کے روشن دان سے باہر نکل گیا کیونکہ خاصے مسافر بس سے اترے تھے اس لیے ڈرائیور کو اس کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا' ورنہ وہ الارم بجا دیتا اور اسپل برگ فوراً ہی پکڑا جاتا۔

"تم اسٹوڈیو سے باہر کیسے جاؤ گے۔ گارڈ پاس دیکھے بغیر تمہیں جانے بھی نہیں دے گا۔"

اسپل برگ مسکرایا "بہت آسانی سے سر' میں آخری ٹرپ کی بس میں اسی طریقے سے سوار ہوجاتا جیسے میں اترا تھا۔"

چک سلووز اس نوجوان کی ذہانت سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے وعدے کے مطابق اسپل برگ کو ایک ہفتے کا انٹری پاس بنوا دیا۔ یہ پاس دکھا کر وہ سوائے ممنوعہ جگہوں کے' ہر جگہ جاسکتا تھا۔ اسپل برگ سورج طلوع ہوتے ہی اسٹوڈیو پہنچ جاتا اور عموماً وہ وہاں سے نکلنے والا آخری فرد ہوتا تھا۔ اس نے نوٹ کیا کہ اگر اکیلا شخص جائے تو گارڈ اس کا پاس ضرور چیک کرتے تھے لیکن کوئی بڑے ڈائریکٹر یا اسٹوڈیو کے افسران کے ساتھ جائے تو عموماً گارڈ پاس چیک نہیں کرتے تھے لہٰذا ایک ہفتے بعد جب پاس ختم ہوگیا تو وہ ایک بڑے پروڈیوسر کے ساتھ لگ کر اسٹوڈیو میں پہنچ جاتا اور گارڈ یہ سمجھتا کہ اسپل برگ پروڈیوسر کے ساتھ ہی ہے اور رہا پروڈیوسر تو وہ اتنا غائب دماغ تھا کہ اسے اپنے اردگرد کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا لہٰذا اس نے پورے تین مہینے تک اسپل برگ سے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ کون تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کیوں لگا رہتا تھا۔ اندر سینے پر آویزاں کرنے کے لیے اس نے کارکنوں کے بیج سے ملتا جلتا بیج لگا رکھا ہوتا تھا اور کبھی کسی نے بغور اسے یا اس کے بیج کو نہیں دیکھا۔

ان تین مہینوں میں اسپل برگ نے دل کھول کر سیکھا۔ وہ بغور ہدایت کاری' کیمرا ورک اور ایڈیٹنگ کو دیکھتا اور جو سیکھتا اسے اپنے پاس نوٹ بک میں محفوظ کرلیتا۔ موقع پاکر لائٹ مین اور ٹرالی چلانے والے سے فنی معلومات بھی حاصل کرلیتا۔ غرض کہ وہ اسٹوڈیو کی ایک ایک چیز پر توجہ دیتا تھا اور کسی معمولی سی چیز کو بھی نظرانداز نہیں کرتا تھا۔ گرمیوں کے ان تین مہینوں میں وہ یونیورسل اسٹوڈیو کے چپّے چپّے سے واقف ہوگیا اور اس نے "جی بلاک" کی ایک عمارت میں ایک ایسا کمرا بھی دریافت کرلیا جو ہمیشہ ہی خالی رہتا تھا لہٰذا اس نے کمرے کو اپنے فرضی دفتر کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسٹوڈیو کی بلڈنگ ڈائریکٹری میں اس کے دفتر کا یہ پتا درج تھا۔ اسٹیون اسپل برگ روم نمبر ۲۳ سی۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور وہ بادلِ ناخواستہ واپس فی نکس چلا آیا۔ یہاں اس کے لیے ایک بُری خبر موجود تھی۔ آرنلڈ اسپل برگ کو جنوبی کیلی فورنیا میں بہ نسبت بہتر ملازمت مل گئی تھی اور وہاں منتقل ہو رہا تھا لیکن یہودیوں کے حوالے سے یہ ایک بدترین علاقہ تھا کیونکہ یہ اینٹی سامی ازم

تحریک کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ اسپل برگ کی توقع کے عین مطابق وہاں اس کا بدترین استقبال ہوا۔ ہمسائے تو خیر انہیں منہ ہی نہیں لگاتے تھے لیکن اسکول میں یہ مجبوری تھی کہ سب کو ایک ساتھ بیٹھنا' پڑھنا اور کھیلنا پڑتا تھا۔ اسپل برگ کے کلاس فیلوز نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول کرلیا لیکن وہ اس کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اس کا مستقل لقب "یہودی" تھا اور اسے وہ یوں ادا کرتے تھے جیسے اسے گالی دے رہے ہوں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اسپل برگ فٹ بال میں دلچسپی لینے لگا لہٰذا اس نے ہائی اسکول کی ٹیم میں اپنا نام لکھوا دیا اور ٹرائل کے بعد اسے مڈفیلڈر کے طور پر منتخب کرلیا گیا۔ پہلی بار اس پر انکشاف ہوا کہ کوئی کھیل اگر کسی سے بدلا لینے کے لیے بہترین قرار دیا جائے تو فٹ بال اس میں سرِفہرست ہوگا۔ اسکول میں اس کے مخالفین کھیل کے دوران میں اسے اتنی چوٹیں لگاتے کہ پریکٹس کے بعد فزیو تھراپسٹ کو اس کے پورے جسم کی برف سے سنکائی کرنا پڑتی تھی۔ اسپل برگ چوٹوں سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا کہ اس سنکائی سے' ایک دن عاجز آکر اس نے فزیو سے کہا۔

"ایسا کرو' تم مجھے فریزر میں رکھ دو۔"

فزیو ہنس کر بولا "اگر تم فٹ بال کھیلتے رہے تو جلد ہی مجھے یہی کرنا پڑے گا۔"

اسپل برگ نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کلاس فیلوز کی ہر زیادتی خاموشی سے برداشت کر جاتا۔ اس طرزِ عمل نے بتدریج ان کے دل میں اسپل برگ کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا کرنا شروع کردیا۔ جب ہائی اسکول میں الوداعی پارٹی اور پریڈ ہوئی تو اسپل برگ نے ایک بار پھر اپنی فوٹوگرافی کے ہنر دکھائے۔ اس نے اتنی خوبی سے یہ فلم بنائی اور ایڈٹ کی کہ بعد میں جب یہ اسکول کے آڈیٹوریم میں چلائی گئی تو تمام طلبہ نے اسپل برگ کو مبارک باد دی۔ اس روز انہوں نے پہلی بار خلوص سے اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

فلم بنانا اسپل برگ کے لیے ایک سیفٹی والو کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب معاشرے اور اپنے ساتھیوں کے درمیان تنہائی کا اذیت ناک احساس اس کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیتا تو وہ اپنے کیمرے میں پناہ تلاش کرتا پھر اس نے فوٹوگرافی کو توجہ حاصل کرنے کا بہترین طریقہ پایا۔ بعض اوقات تو اس کے بدترین مخالف بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک بہترین فوٹوگرافر تھا۔ اس مشغلے سے اس نے لاتعداد دوست بنائے تھے اور بے شمار سنگ دلوں کو موم کیا تھا اور جب اس کے ذہن میں سنیما کے لیے فلم سازی کی خواہش ابھری تو اس کی تہ میں بھی توجہ پانے اور شہرت حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ امریکا میں کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس سے متعلق افراد' عوام میں اس قدر مقبول ہوں۔ امریکی اپنے صدر کا نام جانتے ہوں یا نہیں لیکن وہ ہالی ووڈ کے فلمی ستاروں کے بارے میں ضرور جانتے تھے۔ بڑی اسکرین کے یہ ستارے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔

ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جب اس کے باپ نے پوچھا کہ آگے اس کا کیا ارادہ ہے تو اس نے بلا ہچکچاہٹ اسٹیٹ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کا نام لے دیا۔ اسپل برگ کے نزدیک اس درس گاہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ یونیورسٹی لاس اینجلس میں تھی' یعنی ہالی ووڈ سے نزدیک۔ یونیورسٹی میں داخلہ ملتے ہی نوجوان اسپل برگ لاس اینجلس چلا آیا۔ یہاں پہلے اس نے اپنے کزن کے پاس قیام کیا لیکن جلد ہی وہ ایک کرائے کے اپارٹمنٹ میں آگیا جو یونیورسل اسٹوڈیو کے نزدیک ہی تھا۔

یونیورسٹی میں دو دن اس کی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ ان دنوں میں وہ یونیورسل اسٹوڈیوز چلا جاتا۔ وہاں نچلے درجے کے کارکن اب اسے پہچاننے لگے تھے اور کئی ایک اس کے اچھے دوست بھی بن گئے تھے۔ وہ اسے اسٹوڈیو کے آلات اور میشین استعمال کرنے کی تربیت دینے لگے۔ اسپل برگ نے اس موقع کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور خاص طور سے کیمرا ورک سے متعلق اپنے تجربات میں اضافہ کیا۔

جن دنوں وہ یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا' اس نے فیصلہ کیا کہ اب سنجیدگی سے کام کرنے کا وقت آگیا ہے۔ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ ہائی کنگ اور سیاحت کے لیے کیلی فورنیا کے ایک پہاڑی تفریحی مقام پر جارہا تھا۔ اسپل برگ نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے اس تفریحی سفر کی ایک دستاویزی فلم تیار کی اور اسے "ایم بلین" کا نام دیا۔ بعد میں اس نے یہ فلم چک سلووز کو دکھائی۔ خاصی دیر تک تو چک کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ فلم اس نوجوان نے خود تیار کی ہے' وہ بھی صرف ایک کیمرے کی مدد سے اور بغیر کسی دوسرے شخص کی مدد لیے۔ چک نے یہ فلم اسٹوڈیو کے ٹی وی ایگزیکٹیو سڈشین برگ کو دکھائی' وہ بھی سخت متاثر ہوا اور اس نے اسپل برگ کو طویل مدتی معاہدے کے تحت اپنا نائب بنانے کی پیشکش کی۔ اسپل برگ کی باچھیں کھل گئیں۔ اسے تو اس کی توقع سے زیادہ ہی مل رہا

تھا۔ اس نے فوراً یہ پیشکش قبول کرلی۔ اس وقت اس کی عمر صرف اکیس سال تھی اور یہ کسی بھی نوجوان کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی کہ وہ سڈشین جیسے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرے۔

اگلے چار برسوں کے دوران میں اس نے لاتعداد ٹی وی پروگراموں اور دستاویزی فلموں کو ڈائریکٹ کیا۔ ساتھ ہی وہ اسکرپٹ بھی لکھ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے اضافی تجربہ تھا۔ لیکن وہ ہنوز اپنے پسندیدہ میدان یعنی سنیما فلم سے دور تھا۔ آخر ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد اسٹوڈیو کے فلم پروڈیوسرز رچرڈ ینگ اور ڈیوڈ براؤن نے اسے فلموں میں ہدایت کاری کا موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اسپل برگ کو یوں لگا جیسے اس کے خوابوں کی تکمیل کا وقت آگیا تھا۔ اسے جو فلم دی گئی وہ "دی شوگر لینڈ ایکسپریس" تھی اور جہاں یہ فلم اسپل برگ کو دینے کی کئی ایک وجوہات تھیں وہاں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسٹوڈیو کے تقریباً تمام ہدایت کاروں نے یہ فلم لینے سے انکار کردیا تھا کیونکہ یہ موضوع عام ڈگر سے بہت ہٹ کر تھا اور ان دنوں حقیقت سے قریب فلم سازی کا رُجحان تھا۔ اسپل برگ بھی واقف تھا کہ اسے یہ فلم کیوں ملی ہے لیکن اس نے قطعی پروا نہیں کی اور یوں اس فلم کو اچک لیا جیسے ہفتے بھر کا بھوکا روٹی اچک لیتا ہے۔

ایک تو فلم عام موضوعات سے ہٹ کر تھی اور دوسرے اسپل برگ نے اس میں وہ تمام خیالات اور طریقے آزما ڈالے جو اس کے ذہن میں تھے۔ ان میں منفرد کیمرا ورک اور روشنیوں کا استعمال بھی شامل تھا۔ فلم بندی کے دوران میں اسپل برگ پُرامید تھا کہ فلم ایک شاہکار ثابت ہوگی اور باکس آفس پر بلاک بسٹر بن جائے گی۔ (ہالی ووڈ میں بلاک بسٹر کی اصطلاح ایسی فلموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی بھی فلم سے کم از کم دوگنا کاروبار کریں) لیکن ہوا یہ کہ فلم سُپر فلاپ ثابت ہوئی اور کسی بھی سنیما پر یہ ایک ہفتے بھی نہ چل سکی۔ اسپل برگ کے لیے یہ ایک شدید دھچکا تھا۔ اس کی متوقع "بلاک بسٹر" کا یہ حال ہوگا' یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس نے فلم کے بارے میں جو دعوے کیے تھے وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کئی ہفتے وہ مارے شرمندگی کے اسٹوڈیو ہی نہیں گیا۔ دوسری طرف اسٹوڈیو والوں کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ ایک تو فلم کا اسکرپٹ بہت کمزور تھا۔ دوسرے وہ دور بھی خیالی فلموں کا نہیں تھا۔ تمام اداکار نو آموز تھے اور فلم ڈائریکٹر صرف پچیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ جس کی یہ اوّلین فلم تھی۔ لہٰذا اپنے کھاتے میں اسٹوڈیو پہلے ہی فلم کو فلاپ لکھ چکا تھا۔ صحافی حضرات اور فلم میڈیا والوں نے بھی اس فلم کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس کے ناکام ہونے پر تنقید کرتے۔ جب اسپل برگ دوبارہ اسٹوڈیو آیا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کسی نے اس کا مذاق نہیں اڑایا اور نہ ہی وہ دعوے یاد دلائے جو اس نے فلم کے بارے میں کیے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ "دی شوگر لینڈ ایکسپریس" نامی کوئی فلم اسٹوڈیو میں بنی ہی نہیں تھی اور اگر بنی تھی تو اس کا اسٹوڈیو یا اسپل برگ سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن نہیں۔۔۔ تعلق تو تھا۔ اسپل برگ نے اس فلم میں جو کیمروں کے زاویے استعمال کیے تھے وہ اسٹوڈیو کے کرتا دھرتاؤں کو اتنے پسند آئے کہ انہوں نے اپنی اگلی فلم کے لیے ایک بار پھر اسپل برگ کو ہدایت کار منتخب کرلیا۔ فلم کا موضوع ایک خونی شارک تھی اور یہ ایک بڑے بجٹ والی فلم تھی۔ موضوع اتنا منفرد تھا کہ ایک بار پھر اسٹوڈیو کے دیگر ڈائریکٹر صاحبان نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا اور یوں فلم اسپل برگ کو مل گئی۔ وہ تمام ڈائریکٹرز جنہوں نے اس فلم کو لینے سے انکار کیا تھا۔ آنے والے کئی برسوں تک پچھتاتے رہے کیونکہ "دی جاز" نامی اس فلم نے آمدنی اور مسلسل سنیما پر چلنے کے پچھلے تمام ہی ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ یونیورسل اسٹوڈیو کمپنی جو کئی سال سے خسارے میں جارہی تھی۔ اس کے حصص کی قیمت یک دم کئی گنا بڑھ گئی۔ خود اسپل برگ معمولی ڈائریکٹرز کی صف سے نکل کر یک دم ہی اسٹوڈیو کے چوٹی کے ہدایت کاروں میں شامل ہوگیا۔ دنیا میں فلم دیکھنے والا شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جس نے "جاز" نہ دیکھی ہو۔ پاکستان میں بھی جن افراد نے یہ فلم دیکھی وہ اس کی منفرد تکنیک اور بصری اثرات کبھی فراموش نہیں کرسکے ہوں گے۔

اسپل برگ نے ایک معمولی سے موضوع کو اس طرح فلمایا کہ وہ شاہکار بن گیا۔ اس نے مصنوعی مکینکل شارک سے ایسا کام لیا کہ دیکھنے والوں کو بالکل اصلی اور ہیبت ناک آدم خور شارک نظر آئی۔ فلم کے بعض مناظر اتنے حقیقی لگ رہے تھے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ فلم کا آخری منظر اس کی جان تھا جب خونی شارک سب کا قلع قمع کرنے کے بعد ڈوبتی ہوئی کشتی کے مستول پر لٹکے ہیرو کی طرف بڑھ رہی تھی اور وہ اس پر گولیاں برسا رہا تھا۔ "جاز" ریلیز ہوتے ہی ہٹ ہوگئی اور امریکا کے بعض شہروں میں اس کی ایک سال تک کی پیشگی بکنگ ہوگئی تھی۔ ایسا اعزاز اور اتنی پذیرائی اس سے پہلے کسی فلم کو نہیں ملی تھی۔ "جاز" کی

کامیابی کے بعد اچانک ہی اسپل برگ یونیورسل اسٹوڈیوز کے لیے ایک قیمتی اثاثہ بن گیا تھا۔ انہوں نے اس سے کیا ہوا سابق معاہدہ بالائے طاق رکھ کر اسپل برگ کی مرضی اور شرائط پر نیا معاہدہ کرلیا۔ اس کی تنخواہ میں تو اضافہ ہوا ہی' ساتھ ہی اسے فلم کی آمدنی میں بھی حصہ دیا گیا۔ نیز وہ ہدایت کاری اور اسکرپٹ لکھنے کا معاوضہ الگ حاصل کرتا تھا' اگرچہ دولت اس کا مطمح نظر نہیں تھی لیکن مالی فراغت اسے اچھی لگی۔ اس نے لاس اینجلس میں ایک شاندار گھر تعمیر کرایا جس کی ڈیکوریشن پر اس نے بے دریغ رقم خرچ کی لیکن اس کے حلیے اور لباس وغیرہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہ پہلے کی طرح اپنی ذاتی آرائش سے بے نیاز رہا۔

"جاز" ایک مختلف فلم ہی نہیں تھی بلکہ اس نے امریکی فلموں کو ایک نیا انداز دیا تھا۔ اس سے پہلے تھرلر فلم کا مطلب یا تو گینگسٹروں کی لڑائی مار کٹائی ہوتا تھا یا پھر جنگیں' تقریباً ہر تھرلر فلم میں اسلحے کا بے تحاشا استعمال کیا جاتا تھا۔ شاید "جاز" پہلی تھرلر فلم تھی جو اس ڈگر سے ہٹ کر بنائی گئی۔ اسپل برگ کی پہلی فلم "دی شوگر لینڈ ایکسپریس" بھی منفرد موضوع پر تھی مگر اسکرپٹ کی کمزوری اور اسپل برگ کی ناتجربہ کاری نے اسے فلاپ کردیا۔ تجربے کی یہ کسر اس نے جاز میں پوری کرلی تھی۔ اتفاق سے جاز کا اسکرپٹ بھی جاندار تھا اور اس کا ناول جس پر فلم بنی' بیسٹ سیلرز میں شامل تھا پھر اسٹوڈیو نے اسپل برگ کو ایک بھاری بھرکم بجٹ دیا اور اسے استعمال کرنے کی مکمل آزادی بھی دی۔ پروڈیوسر کا کام صرف رقم فراہم کرنا اور اسپل برگ کی فرمائشوں کی تکمیل کرنا تھا۔ پہلے تجربے کے بعد اس نے صرف اس شرط پر یہ فلم قبول کی تھی کہ وہ ہر معاملے میں مختارِ کُل ہوگا۔ اداکاروں کے انتخاب سے لے کر ایک معمولی لائٹ مین کے انتخاب تک۔ نیز دورانِ فلم بندی میں کوئی اس کے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اسٹوڈیو نے اس کی شرائط بخوشی قبول کرلیں اور صرف فلم پبلسٹی اپنے پاس رکھ کر باقی تمام معاملات اسپل برگ کے سُپرد کردیے۔ بعد میں اگرچہ یونیورسل کے کرتا دھرتا حضرات نے کئی مواقع پر اعتراضات کیے مگر اسپل برگ نے ہمیشہ اپنی شرائط یاد دلا کر ان کے منہ بند کردیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے کسی کی مداخلت سے محفوظ رہ کر فلم کو اپنی سوچ کے تحت بنایا۔ اسٹوڈیو کے لگے بندھے معمول سے ہٹ کر کام کیا اور جاز کو اپنے وقت کی دھماکا خیز ترین فلم بنا کر رکھ دیا۔

جاز نے ہالی ووڈ پر اسٹیون اسپل برگ کی دھاک بٹھا دی۔ روایت کے مطابق اسٹوڈیو مالکان نے اسپل برگ کی شہرت کو کیش کرانے کا پروگرام بنالیا اور فیصلہ کیا کہ وہ ہر سال ایک فلم بنائے گا لیکن مالکان سے میٹنگ میں اسپل برگ یہ تجویز سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"مسٹر پریذیڈنٹ' میں ڈائریکٹر ہوں' مینوفیکچرر نہیں جو کاروں کی طرح فلم بناؤں۔"

"اسپل برگ یہی موقع ہے جب تم اپنی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔" میٹنگ میں شریک چک سلووز نے اسے سمجھایا۔

"سوری' میں اس طریقے سے فلم بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خود کو ایک تخلیق کار سے زیادہ ایک لوہار محسوس کروں جو مخصوص سانچے پر لوہا ڈال کر چیز بناتا جائے۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

اسپل برگ اسٹوڈیوز کے لیے کتنا ہی اہم سہی لیکن تھا تو ایک ملازم اور مالک اپنے ملازموں کی زیادہ ناز برداری نہیں کرسکتے۔

"اسٹیون تم بھول رہے ہو کہ تم اسٹوڈیو کے ملازم ہو اور تمہیں ہماری ہدایت پر کام کرنا ہوگا۔"

"میری ملازمت کی شرائط میں ایسی کوئی بات شامل نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ میں کہانی' اسکرپٹ اور اداکاروں کا انتخاب اپنی مرضی سے کروں گا۔"

یہ سنتے ہی سب ٹھنڈے پڑگئے۔ وہ اس معاہدے کو بھول ہی گئے تھے۔ بہرحال بڑی بحث و مباحثے کے بعد طے پایا کہ اسپل برگ سال میں ایک فلم والی بات بھول جائے۔ وہ اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کے لیے آزاد ہوگا اور اب کے بجٹ کا اختیار بھی اسے ہی حاصل ہوگا لیکن وہ جلد از جلد اپنی نئی فلم کا آغاز کردے گا۔

روایت کے مطابق اسپل برگ نے ایک اور منفرد موضوع کا انتخاب کیا۔ انسانوں کی تیسری صنف ہمیشہ سے نسلِ انسانی کا ایک المیہ رہی ہے جس کو نہ ہی قبول کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ان سے یوں پرہیز کرتے ہیں جیسے وہ انسان نہ ہوں بلکہ خلا سے آئی ہوئی کوئی اجنبی مخلوق ہو۔ ایک زمانے میں خود اسپل برگ معاشرے کے اس رویے کا مزہ چکھ چکا تھا اس لیے ایسے انسانوں کی نفسیات اور ذہنی کرب سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے معاشرے کی بے اعتنائی اور تیسری صنف کی نفسیات کو اپنی تیسری فلم "تھرڈ کائنڈ" کا موضوع بنانے کا فیصلہ کیا۔ فلم بنی اور کچھ عرصے چلی بھی لیکن اسے

جاز کی پذیرائی کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہیں ہوا۔ بزنس کے اعتبار سے بھی یہ ایک ناکام فلم تھی اور اس کی ناکامی کا ذمے دار اسپل برگ نے یونیورسل والوں کو قرار دیا جنہوں نے تقریباً زبردستی اسے فلم بنانے پر لگایا تھا لیکن اسپل برگ خود کو اس ناکامی سے الگ نہیں کرسکتا تھا کیونکہ موضوع اور کاسٹ کا انتخاب اس نے اپنی صوابدید پر کیا تھا۔

اس ناکامی سے اسپل برگ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے فلم سازی ترک کرنے اور کسی پرسکون مقام پر چھٹیاں منانے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں اس کے دوست جارج لیوکس نے اسے "ہوائی" چلنے کی دعوت دی جو اسپل برگ نے قبول کرلی۔ ریاست ہوائی کی تیز دھوپ اور مرطوب آب وہوا اسے اتنی بھائی کہ اس نے وہاں پر ساحل سمندر پر ایک کاٹیج خرید لیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر سکون سے مستقبل کی منصوبہ بندی کرسکتا تھا۔

ہالی ووڈ کے فلم ساز عموماً آئیڈیاز کو فلمانے پر زور دیتے ہیں اور ناولوں پر فلمیں کم ہی بنتی ہیں مگر اسپل برگ ناول کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے نزدیک ناول زندگی کی حقیقتوں کے زیادہ بہتر عکاس ہوتے ہیں پھر ان میں مواد بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اپنی اگلی فلم کے لیے کئی اچھے ناول اس کے پیش نظر تھے جن پر فلم بن سکتی تھی لیکن ہر ناول کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ تھا۔ ہوائی کی چھٹیوں کے آخری دنوں میں جارج نے اسے ایک فکشن ناول دیا جس کا پس منظر کسی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ یہ مشہور ناول "دی ریڈرز آف دی لوسٹ آرک" تھا۔ ناول اس گمشدہ مقدس صندوق کے بارے میں تھا جو اسرائیلیوں کے گمشدہ نوادرات میں سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس صندوق میں انبیاؑ کی اشیا رکھی تھیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا اعصا اور حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی۔ اس صندوق کو اسرائیلی دشمن سے جنگ کے وقت اگلی صفوں میں رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس مقدس اور نوادرات والے صندوق کی برکت سے خدا انہیں فتح دے گا۔ آخرکار ایک بار پھر بنی اسرائیلیوں کی نافرمانیوں پر قہرِ خداوندی جوش میں آیا اور یہ صندوق جو تاریخ میں تابوتِ سکینہ کے نام سے معروف ہے، مصری چھین کر اپنے ملک لے گئے اور وہاں جاکر یہ صندوق ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔ روایت ہے کہ قیامت سے کچھ پہلے یہ صندوق ظاہر ہوگا۔

"ریڈرز آف دی لوسٹ آرک" کی کہانی دو ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی باہمی چپقلش پر مبنی ہے۔ جنگِ عظیم دوئم میں جرمن مصر میں اس تابوت کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ اس کی کھوج ہٹلر کے حکم پر کی جارہی ہوتی ہے جس نے سن رکھا تھا کہ یہ تابوت جس فوج کے پاس ہوتا ہے اسے کبھی شکست نہیں ہوتی۔ اس تابوت کو دنیا کے دو ہی افراد تلاش کرسکتے تھے۔ ایک انڈیانا جونز اور دوسرا اس کا حریف چونکہ انڈیانا جونز امریکی تھا اور اس تک ہٹلر کی رسائی نہیں تھی لہٰذا وہ اس کے مخالف کی خدمات حاصل کرتا ہے اور گراں قدر معاوضے پر اسے تابوتِ سکینہ کی تلاش کا حکم دیتا ہے۔ دوسری طرف امریکیوں کو بھی ہٹلر کے ارادے کا علم ہوجاتا ہے اور وہ انڈیانا جونز سے رابطہ کرکے اس سے تابوت تلاش کرنے میں ان کی مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ انڈیانا جونز مصر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا حریف پہلے سے موجود ہوتا ہے چونکہ ان دنوں مصر پر جرمن قابض تھے اس لیے اسے ہر ممکن سہولت حاصل تھی۔ اس کے برعکس انڈیانا کو چھپ کر اپنا کام کرنا تھا۔ اس ناول میں واقعات اور کرداروں کو جس انداز میں بیان کیا گیا تھا اس سے اسپل برگ متاثر ہوا۔ اس نے اس ناول کو اپنی اگلی فلم کے لیے منتخب کرلیا اور فوراً اس کے حقوق حاصل کرلیے۔

یہ ایک بڑی کاسٹ اور بڑے بجٹ والی فلم تھی جس میں ہزاروں کی تعداد میں ایکسٹرا استعمال ہوئے اور اس کی شوٹنگ امریکا اور مصر میں ہونا تھی۔ اس دفعہ اسپل برگ نے جلد بازی سے گریز کیا اور نہایت ہی سکون سے کام کیا۔ ایک ایک سین کو بہت سوچ سمجھ کر فلمایا۔ اس سے فلم خاصے عرصے میں جاکر بنی اور لاگت بھی اپنے بجٹ سے بڑھ گئی لیکن جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو ایک بار پھر تہلکہ مچ بن گیا۔ "ریڈرز آف دی لوسٹ آرک" ایک اور بلاک بسٹر ثابت ہوئی جس نے آمدنی کے معاملے میں جاز کا ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں یہ فلم نہ چلی ہو۔ حتیٰ کہ روس میں بھی اس فلم نے مقبولیت حاصل کی۔ اس فلم نے جو رہی سہی کسر تھی وہ بھی پوری کردی اور جن لوگوں کو اسپل برگ کی صلاحیتوں پر جو تھوڑا بہت شبہ تھا وہ اب نہ رہا اسے متفقہ طور پر ہالی ووڈ کا سب سے بڑا ہدایت کار تسلیم کرلیا گیا۔

دی ریڈرز آف دی لوسٹ آرک اسی کے عشرے کے شروع میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسپل برگ کی اگلی فلم ۱۹۸۲ء میں سینما گھروں کی زینت بنی۔ "ایکسٹرا ٹرائیل" نامی اس فلم نے بہترین بزنس کیا اور یہ اسپل برگ کی ایک اور بے حد کامیاب فلم تھی۔ اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ اس دوران میں اسپل برگ نے کئی فلمیں بنائیں، کچھ ناکام رہیں۔ کچھ نے اچھا بزنس کیا اور کچھ خاصا بزنس کر

گئیں۔ اس صدی کی آخری دہائی کے شروع میں اسپل برگ کو ایک اور کہانی ملی جو کُلی طور پر فکشن پر مبنی تھی اور فکشن بھی ایسا جس پر بہت لکھا گیا اور لاتعداد فلمیں بنیں۔ خلا کے بعد فکشن لکھنے اور بنانے والوں کے لیے یہ شاید سب سے دلچسپ ہو۔ شرلاک ہومز کے خالق سر آرتھر کانن ڈائل نے سب سے پہلے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنا سب سے مقبول ناول "دی لوسٹ ورلڈ" تخلیق کیا۔ یہ ناول بے تحاشا پڑھا گیا۔ دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ آج بھی ہر سال اس ناول کے کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔

"جراسک پارک" کی کہانی جتنی سنسنی خیز تھی، اسے فلمانا اتنا ہی مشکل تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ ماضی کے ان دیو قامت جانوروں کو زندہ اور ان کے اصلی روپ میں سنیما اسکرین پر پیش کرنا تھا۔ اگرچہ ہالی ووڈ ڈمی میکر اب حقیقت سے قریب ترین چیز بنانے لگے تھے۔ لیکن ایک ماڈل حقیقت سے کتنا ہی نزدیک کیوں نہ ہو اس کی مصنوعی اور میکانکی حرکات تمام تاثر کا بیڑا غرق کردیتی ہیں۔ جنہوں نے کنگ کانگ، دی مائٹی ہمالین مین اور گوڈزیلا سلسلے کی فلمیں دیکھی ہیں انہوں نے ان فلموں کے کرداروں کی میکانکی حرکات کو واضح طور پر محسوس کیا ہوگا۔ اسپل برگ چاہتا تھا کہ اس کی بنائی ہوئی فلم میں ماضی کے دیو قامت جانوروں کی حرکات بالکل اصلی اور حقیقی نظر آئیں۔ ساتھ ہی وہ ان جانوروں کے انسان کے مقابلے میں جسمانی طور پر تقابل کے مسئلے کو بھی حل کرنا چاہتا تھا۔ دیگر فلموں میں یہ مسئلہ کیمرا ٹرک کی مدد سے حل کرلیا جاتا تھا لیکن پھر سین میں مصنوعی پن آجاتا تھا اور اسپل برگ یہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پیش نظر ایک ایسی فلم تھی جسے دیکھ کر تماشائی خود کو جراسک دور میں تصور کریں۔

اس مسئلے کا ایک ہی حل اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کمپیوٹر گرافکس کی مدد حاصل کرے۔ ٹرمی نیٹر ٹو اس کی نظروں میں تھی جس میں پہلی بار سپر کمپیوٹر گرافکس کی مدد سے ان مناظر کو بھی بالکل اصلی منظر کے طور پر دکھایا گیا تھا جو کمپیوٹر گرافکس کے بغیر اس طرح نظر آ ہی نہیں سکتے تھے۔ مثلاً فلم کے ہیرو روبوٹ (آرنلڈ شوارزنیگر) اور ولن روبوٹ کی لڑائی جس طرح دکھائی گئی تھی وہ فلمی کمپیوٹر گرافکس کا بے مثال مظاہرہ تھی۔ دشمن روبوٹ پارے سے بنا تھا اور ہیرو اسے گھونسا مارتا تو وہ اس کے جسم میں گھس جاتا تھا۔ اسپل برگ اس فلم کے کمپیوٹر گرافکس سے بے حد متاثر ہوا۔

ٹرمی نیٹر ٹو کے کمپیوٹر ایفکٹ، ناسا کے تحقیقاتی ادارے کے سپر کمپیوٹر پر تیار کیے گئے تھے اور اس کی مد میں ادارے کو فلم والوں نے پچیس ملین ڈالرز ادا کیے۔ لیکن اس کے بعد کمپیوٹر گرافکس ٹیکنالوجی نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ ایسی مشینیں اور پروگرام وجود میں آگئے کہ اب فلم والے خود بھی یہ گرافکس تیار کرسکتے تھے اور اس پر لاگت بھی بہ نسبت کم آتی۔ لیکن اسپل برگ کو یہ گرافکس پھر بھی ٹرمی نیٹر ٹو سے مہنگے پڑگئے، کیونکہ ٹرمی نیٹر کے چند مناظر کے مقابلے میں جراسک پارک کا اکثر حصہ گرافکس ایفکٹ پر مشتمل تھا۔ نیز یہ ٹرمی نیٹر ٹو کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ بھی تھے۔

اسپل برگ نے فلم کا جو بجٹ پیش کیا اسے دیکھ کر پروڈیوسروں کے ہوش اڑ گئے۔ وہ اس سال بننے والی اسٹوڈیو کی تمام فلموں کے مشترکہ بجٹ سے کچھ ہی کم تھا لیکن بورڈ آف ڈائریکٹرز نے بلا جھجک بجٹ منظور کرلیا۔ وہ جانتے تھے کہ اسپل برگ خرچ بہت کرتا تھا لیکن وہ اس سے کہیں زیادہ کما کر بھی دے دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسپل برگ کا بجٹ اکثر بغیر کسی کٹوتی کے منظور ہوجاتا مگر فلم بندی کے آغاز سے ہی اندازہ ہوگیا کہ بجٹ ناکافی پڑے گا اور لاگت بڑھے گی۔ فلم اسپل برگ کے اندازے سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہورہی تھی۔ اسے ایک ایک سین کے لیے مغزماری کرنا پڑ رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ انسانوں کو جانوروں کے ساتھ مکس اپ کرکے پیش کرنا تھا۔ صحیح تاثرات اور سین میں گرافکس کی سیٹنگ اتنا بڑا مسئلہ بن گئی کہ اسپل برگ اور اس کی ٹیم کی دن رات کی نیند حرام ہوگئی۔ ایک ایک سین کی درجنوں ریہرسلیں ہوئیں۔ ہر سین کے اتنے ٹیکس ہوئے کہ سیٹ پر موجود افراد مرنے کی حد تک بور ہوجاتے تھے لیکن اسپل برگ پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مزید بہتری کا مطالبہ جاری رہتا تھا۔ خدا خدا کرکے سیٹس کا کام مکمل ہوا اور اب گرافکس کی فلم مکسنگ شروع ہوئی اور پھر کمپیوٹر پروگرامرز کی جان عذاب میں آگئی۔ انہوں نے ڈائنا سورس کے دوبعدی ایفکٹ تیار کیے تھے لیکن اسپل برگ نے انہیں مسترد کردیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ماڈل سہ بعدی ہوں۔ واضح رہے کہ دوبعدی عکس تصویر کی طرح ہوتا ہے اور یہ گہرائی کا تاثر نہیں دیتا۔ جبکہ سہ بعدی گہرائی کے واضح تاثر کے ساتھ بے حد حقیقی نظر آتا ہے۔ یعنی چیز کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی کا احساس ہمارے ذہن میں ہوتا ہے۔ دوبعدی میں صرف لمبائی چوڑائی کا احساس ہوتا ہے جیسے کوئی تصویر۔

فوٹو گرافی اور بصریات کے علم سے ناواقف قارئین نہایت آسانی سے ان دونوں اصطلاحوں کا تجربہ کرسکتے ہیں۔ پہلے وہ کسی منظر یا چیز کو ایک آنکھ بند کرکے دیکھیں اور پھر دونوں آنکھوں سے دیکھیں۔ دیکھنے میں جو فرق آئے گا' وہی دو بعدی اور سہ بعدی کا فرق ہوگا۔

خدا خدا کرکے ۱۹۹۳ء کے شروع میں یہ فلم مکمل ہوئی اور ایڈیٹنگ کے بعد اسے ریلیز کردیا گیا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کی ریلیز سے پہلے ہی جراسک پارک کو باکس آفس بیسٹ سیلر قرار دیا جاچکا تھا۔ اس کی پبلسٹی بڑے پیمانے پر اور مؤثر طریقے سے کی گئی تھی۔ شائقین بے تابی سے اس فلم کے منتظر تھے اور امریکا کے تمام مووی تھیٹرز میں اس کی کئی ہفتوں کی پیشگی بکنگ کی جاچکی تھی۔ فلمی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی فلم ہو جس نے ریلیز ہوئے بغیر ہی اتنا زیادہ بزنس کرلیا۔ امریکا میں تو قوانین کی سختی کی وجہ سے بلیک مارکیٹنگ چوری چھپے ہوئی ہے لیکن دنیا کے دیگر ممالک میں اس فلم کے ٹکٹ بیس سے تیس گنا زیادہ قیمت پر بلیک ہوئے۔ کئی ملکوں میں حکومت کو اس چور بازاری کی روک تھام کے لیے خصوصی احکامات جاری کرنے پڑے۔ کچھ ممالک میں عدلیہ نے ٹکٹوں کی قیمت مقرر کردی تاکہ سینما مالکان ناجائز منافع نہ کماسکیں۔

"جراسک پارک" نے آمدنی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں اس نے دنیا بھر میں چار ارب ڈالرز کا ناقابلِ یقین بزنس کیا اور اب تک یہ ریکارڈ ناقابلِ شکست ہے (لیکن ٹائی ٹینک نے اس ریکارڈ کو خطرے میں ڈال دیا ہے) جراسک پارک کے بعد ہی گرافکس ایفکٹ تقریباً ہر ہالی ووڈ فلم کا حصہ بن گئے اور فلموں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے فلم ساز بے دریغ ان ایفکٹس کو استعمال کررہے ہیں بلکہ اب خصوصی طور پر ایسی فلمیں لکھی جارہی ہیں جو خاص طور سے گرافکس ایفکٹ کے لیے ہی ہیں۔ اس کی بہترین مثال "دی ماسک" ہے جس میں کہانی اور اداکاری سے زیادہ گرافکس ایفکٹس پر زور دیا گیا ہے لیکن دی ماسک کی ناکامی نے ثابت کردیا کہ صرف گرافکس ایفکٹ کے زور پر فلم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے اچھے اسکرپٹ اور اچھی اداکاری کی ضرورت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ورنہ جراسک پارک کی کامیابی کے بعد بعض ذہنوں میں خدشات سر اٹھانے لگے تھے کہ کہیں مستقبل کے فلم ساز اداکاروں کو اٹھا کر ایک طرف نہ بٹھا دیں اور پوری فلم ہی گرافکس کی مدد سے تیار کردیں۔ اس طرح فلم سازوں کو بیک وقت اداکاروں کے بڑھتے ہوئے معاوضوں اور ان کے نخروں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ موجودہ دور میں بعض کارٹون فلموں کی بے مثال کامیابی نے بھی ان خدشات کو تقویت دی ہے لیکن ہالی ووڈ کے سنجیدہ حلقے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ انسان کی وابستگی انسان سے ہوتی ہے' کسی خیالی کردار سے نہیں جو صرف سلور اسکرین تک محدود رہتا ہے۔ ایک گرافکس کردار چاہے وہ کتنی ہی اچھی اداکاری کرے یا کیسے ہی محیّر العقول کارنامے انجام دے وہ آرنلڈ شوارزنیگر یا ون ڈیم کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ ان سے جو لوگ جذباتی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جذبات کسی گرافکس تخلیق کے لیے ممکن ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا فی الوقت اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلمیں اداکاروں کے بغیر بنائی جائیں۔

جراسک پارک کی بین الاقوامی کامیابی کے بعد اسپل برگ کے ساتھیوں اور فلم میڈیا کا خیال تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی فلم شروع نہیں کرے گا۔ ویسے بھی اسپل برگ سکون سے کام کرنے والے ڈائریکٹروں میں شامل تھا۔ اسے فلم سازی کرتے ہوئے بیس سال ہوگئے ہیں لیکن ہنوز اس کی تخلیق کردہ فلموں کی تعداد درجن کے لگ بھگ ہے۔ اوسطاً ہر بیس مہینے میں صرف ایک فلم۔ یہ رفتار پاکستان اور ہندوستان کے ہدایت کاروں کے کام کرنے کی رفتار سے تو کم ہے ہی جو بعض اوقات سال میں پانچ چھ فلمیں بناتے ہیں لیکن خود ہالی ووڈ کے معیار سے بھی یہ رفتار بہت کم ہے لیکن اسپل برگ ہمیشہ سے معیار کو تعداد پر ترجیح دیتا رہا ہے۔

لیکن میڈیا اور لوگوں کی توقع کے برعکس اس نے اپنی اگلی فلم کے لیے زیادہ وقفہ نہیں لیا اور جراسک پارک ریلیز ہونے کے صرف تین مہینے بعد فلم "شینڈلرسٹ" کی تیاری شروع کردی۔ یہ فلم اس کا برسوں پرانا خواب تھی۔ اس کے ذہن کی نہاں تہوں میں پوشیدہ بچپن کی ان محرومیوں اور معاشرے کے رویوں کی آئینہ دار تھی جو اس کے ساتھ صرف یہودی ہونے کی بنا پر روا رکھے گئے۔ یہ فلم اذیتوں اور مظالم کی ایک لرزہ خیز داستان تھی جو ایک قوم کی طرف سے دوسری قوم پر کیے گئے۔ وہ یہ فلم باکس آفس کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے' اپنے حال میں ہی پیدا ہونے والے بیٹے کے لیے' اپنے خاندان کے لیے اور اپنی قوم کے لیے بنانا چاہتا تھا۔

○☆○

اسپل برگ نان اسٹاپ فلائٹ کے ذریعے پہلے پیرس

پہنچا اور وہاں سے ایک دوسرے طیارے نے اسے پولینڈ کے شہر کراکو پہنچا دیا۔ یہ ابتدائی سرما کا ایک یخ اور سُرمئی دن تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے جو برسنے کو بے تاب تھے۔ طیارے سے اترتے ہوئے اسپل برگ نے اپنے جذبات میں ہل چل سی محسوس کی۔ وہ خود کو ماضی کے اس ماحول میں محسوس کرنے لگا جب یہاں ہر طرف موت اور بربادی کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ جنگِ عظیم دوئم اپنے عروج پر تھی اور نازی اپنے زیرِ تسلط علاقوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہودیوں کو آشوٹزبرگ اور ہیلوکوسٹ کے اذیت کدوں میں بھیج رہے تھے۔ اسپل برگ ایسے مشن پر یہاں آیا تھا جو ذاتی بھی تھا اور پیشہ ورانہ نوعیت کا بھی لیکن اگر کوئی اسپل برگ سے پوچھتا تو وہ اسے ذاتی مشن قرار دیتا۔

اس سے پہلے صرف ایک بار اس نے حقیقی واقعے کو پردۂ فلم پر پیش کیا تھا۔ ایک عشرے پہلے ''ای ٹی'' نام کی اس فلم نے باکس آفس پر بہت مقبولیت حاصل کی تھی لیکن وہ بلاک بسٹر ثابت نہیں ہوئی۔ شینڈلرسٹ دوسری فلم تھی جو حقیقی واقعہ بلکہ واقعات پر مبنی تھی۔

جنگِ عظیم دوئم میں ہٹلر کے حکم پر نازی چُن چُن کر یہودیوں کو بہیمانہ ستم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ انہوں نے آشوٹزبرگ اور ہیلوکوسٹ میں جنگی کیمپ قائم کر رکھے تھے جہاں پورے یورپ بھر سے یہودیوں کو ہنکا کر لایا جا رہا تھا۔ ڈھائی ہزار سال قبل جب بابل کے بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے یہودیوں کا قتلِ عام کیا تھا اور باقیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا یہ یہودیوں پر آنے والی سب سے بڑی قیامت تھی، جرمن جس علاقے پر قابض ہوتے، وہاں سب سے پہلے یہودی آبادی کو دیگر لوگوں سے الگ کرتے پھر ان کو ٹرکوں یا ریل گاڑیوں میں مویشیوں کی طرح بھر کر وسطی یورپ میں قائم ان جنگی کیمپوں میں بھیج دیتے۔

یہ جنگی کیمپ کسی جہنم سے کم نہیں تھے، آشوٹزبرگ کے ریلوے اسٹیشن پر اترنے والے تمام جنگی قیدیوں کو سب سے پہلا حکم کپڑے اتارنے کا ملتا تھا۔ شدید سردی کی حالت میں یہ کسی کڑی سزا سے کم نہیں ہوتا تھا۔ قیدیوں کے کپڑے جرمن کھنگال کر ان میں چھپائی ہوئی قیمتی اشیا نکال لیتے پھر برہنہ قیدیوں کا معائنہ کر کے جوان اور تندرست مردوں اور عورتوں کو کیمپ کی طرف مارچ کرنے کا حکم دیا جاتا اور بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور کمزوروں کو گیس چیمبر کی طرف چلنے کا حکم ملتا۔ یہ مجبور اور بے بس قیدی خود اپنے قدموں سے چل کر اپنی موت کی طرف جاتے تھے۔ آشوٹزبرگ میں چار موت گھر تھے جہاں کاربن مونو آکسائیڈ کے ذریعے قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ یہاں چھ گیس چیمبر تھے اور یہ اتنے وسیع تھے کہ ان میں بیک وقت ہزاروں افراد آسکتے تھے۔ اس کے باوجود سزائے موت پانے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ انہیں اپنی باری کا کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ مظلوم افراد بے بسی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کو گلے لگا لیتے تھے تو ان کی لاشوں کو نکال کر بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا۔ وہاں شدید گرمی سے ان کا گوشت بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ صرف چربی اور ہڈیاں رہ جاتیں، یہ چربی اور ہڈیاں جرمنی بھیج دی جاتیں جہاں انہیں صابن سازی اور کھاد بنانے کی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آشوٹزبرگ کے جنگی کیمپ اور موت گھروں میں تقریباً تیس لاکھ افراد لقمۂ اجل بنے۔

جراسک پارک کی ریلیز سے پہلے اسپل برگ کی نگاہ شینڈلرسٹ کے ناول پر پڑی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک جرمن کیتھولک تھا جس نے ہیلوکوسٹ اور آشوٹزبرگ میں گیارہ سو یہودیوں کی جان بچائی تھی۔ اسپل برگ اس موضوع سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اس ناول کو اپنی اگلی فلم کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کے لیے اس نے اسکرپٹ خود لکھنے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے تحقیقات کے لیے پولینڈ پہنچا۔ ایک پرائیویٹ کار میں وہ کراکو سے آشوٹزبرگ روانہ ہوا۔ وہاں پولینڈ کے محکمۂ سیاحت کا ایک افسر اس کا منتظر تھا جو آشوٹزبرگ کے جنگی کیمپ اور موت گھروں کے آثار کا انچارج بھی تھا۔

سب سے پہلے وہ سبزہ زار میں گھرے ایک سنگی ستونوں والے دروازے سے گزرے۔ کیمپ اس احاطے کے اندر ہی تقریباً دو مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس میں قیدیوں کی بیرکس، آفیسروں اور محافظوں کی رہائش گاہیں، موت گھروں کے وسیع و عریض ہال، برقی بھٹیاں، کچرہ خانے اور مرکزی دفاتر تھے۔ کیمپ کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی تھا جہاں یورپ بھر سے قیدی مال گاڑیوں کے ڈبوں میں بھر کر لائے جاتے تھے۔ ان تنگ و تاریک آہنی ڈبوں میں کتنے ہی قیدی دم گھٹ کر مرجاتے تھے اور کتنے ہی سردی کے ہاتھوں دم توڑ جاتے تھے۔

جنگ کے بعد مشتعل عوام کے ہاتھوں اس کیمپ اور اس کی تعمیرات کو خاصا نقصان پہنچا۔ بمشکل روسی فوجیوں نے باقی ماندہ آثار بچائے اور پھر پولینڈ کی حکومت نے اس کیمپ کو بطور یادگار محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا لہٰذا اب یہ کیمپ جوں کا

تو یں تھا حتّیٰ کہ موت گھر کی برقی بھٹیوں میں ڈالے جانے والے افراد کی چربی اور ہڈیاں بدستور موجود تھیں پھرتے پھراتے اسپل برگ گائیڈ کے ساتھ ان برقی بھٹیوں کی طرف جا نکلا۔ اس نے ان کے ڈریچ سوراخ میں جھانکا۔ جہاں نیم تاریکی میں کسی زردی مائل مادّے میں سفید اور لمبی سی چیزیں چمک رہی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے گائیڈ سے پوچھا۔

"ان انسانوں کی ہڈیاں اور چربی جو اس بھٹی میں جلائے گئے تھے۔"

گائیڈ کا جواب سن کر ایک لمحے کو اسپل برگ کو چکر سا آ گیا۔ وہ جلدی سے باہر آ گیا جہاں ہر طرف سُرمئی رنگ کی بھدّی عمارتیں تھیں یا سنگی فٹ پاتھ۔

"اُف یہ سب کتنا منظم تھا۔" اسپل برگ دکھ بھرے انداز میں سوچ کر رہ گیا "اور یہ سارے انتظامات میرے ساتھیوں اور ہم مذہبوں کو مارنے کے لیے تھے۔" اس نے اس ریلوے پلیٹ فارم کو دیکھا جہاں سے ہزاروں لاکھوں افراد نے گیس چیمبر کی طرف مارچ شروع کیا تھا۔ اس کیمپ کا چپّا چپّا ظلم و بربریت اور سفاک روایتوں کا منہ بولتا امین تھا۔ شینڈلرسٹ پڑھتے وقت یہاں کیے گئے مظالم کا اسپل برگ پر جو اثر ہوا تھا' آشوٹز برگ کے اس بندی خانے میں آکر اس سے کئی گناہ زیادہ اثر ہوا تھا۔ اب وہ زیادہ بہتر طور پر اس فلم کو بنا سکتا تھا۔

"پولینڈ سے واپسی پر میں زیادہ پُراعتماد تھا اور مجھے یقین تھا کہ دنیا میں وہ واحد شخص جو اس موضوع کو بہتر انداز سے فلما سکتا تھا' وہ میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ایک اور بلاک بسٹر ثابت ہوگی۔" اسپل برگ نے اپنے دوست جارج سے کہا تھا۔

لیکن وہ پولینڈ سے واپسی پر جتنا پُرجوش تھا' اس کے ساتھی اور اسٹوڈیو والے اتنے ہی مخالف ہو رہے تھے۔ انہوں نے اسپل برگ پر اعتراضات کی بوچھار کردی کہ یہ موضوع بے حد پرانا تھا اور جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک ہزاروں مرتبہ گھسا جا چکا تھا۔ جنگِ عظیم میں صرف یہودیوں پر ہی مظالم نہیں ہوئے تھے۔ تمام یورپی اقوام اس سے شدید متاثر ہوئی تھیں لہٰذا صرف یہودیوں کے لیے فلم نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ باکس آفس پر غیر مقبول ہوگی۔ اسپل برگ کے دوستوں نے اس سے کہا۔

"یہ کوئی بہت اچھا موضوع نہیں ہے۔ لوگ فلم کو تمہاری ذاتی دلچسپی کی وجہ سے مسترد کردیں گے کیونکہ آخر تم ہو کون؟ یاد رکھو لوگوں کو کسی کی ذاتی دلچسپی اور وابستگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور پھر یہ ایک مُردہ موضوع ہے۔"

دوسری طرف پروڈیوسرز کا خیال تھا کہ اسپل برگ صرف فکشن کو ہی اچھے طریقے سے فلما سکتا تھا۔ اس کی تینوں بلاک بسٹر فلمیں فکشن پر مبنی تھیں لہٰذا اس کو اپنی اگلی فلم کے لیے کوئی فکشن کہانی ہی تلاش کرنی چاہیے لیکن اسپل برگ نے یہ تمام اعتراضات اور خدشات مسترد کردیے۔ اس نے ببانگِ دہل اعلان کیا کہ ہاں میں یہ فلم ذاتی وابستگی کی بنا پر بنا رہا ہوں کیونکہ میں یہودی ہوں اور کیوں کہ میں ایک حساس شخص ہوں۔ شینڈلرسٹ صرف یہودی مظلوموں کے لیے نہیں ہوگی بلکہ دنیا کے تمام ان لوگوں کے لیے ہوگی جو بلاوجہ نسلی امتیاز کا نشانہ بنے۔

اسپل برگ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔ اس نے کسی قسم کی معذرت نہیں کی اور نہ ہی کوئی اعتراض قبول کیا۔ نتیجے میں تمام ہی معترض ایک ایک کرکے چپ ہوگئے اور اسٹوڈیوز نے بھی فلم کی منظوری دے دی۔ اس دفعہ اسپل برگ نے جو بجٹ بنایا وہ جراسک پارک سے بھی تقریباً دوگنا زیادہ تھا۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز نے کسی قدر بحث کے بعد اس کو منظور کرلیا۔ ویسے بھی پچھلی فلم جراسک پارک نے اتنا بزنس کرلیا تھا کہ اس کے بعد اسپل برگ جو بھی مانگتا وہ اسے دینے پر مجبور تھے۔

فلم کی شوٹنگ امریکا میں ہی کی جا رہی تھی اور اکثر جنگی فلموں کی طرح اس میں تھوک کے حساب سے ایکسٹرا بھرتی کیے گئے۔ ان دنوں ہالی ووڈ میں ایکسٹراز کی کمی ہوگئی تھی اور دوسرے فلمی مراکز سے ایکسٹرا درآمد کرنے پڑے تھے۔ حسبِ معمول اسپل برگ بہت سوچ سوچ کر ایک ایک شاٹ لے رہا تھا اور اسی حساب سے اخراجات بھی ہو رہے تھے۔ عموماً وہ پہلی بار اسکرپٹ طے کرنے کے بعد دورانِ شوٹنگ میں اس میں تبدیلی نہیں کرتا تھا لیکن شینڈلرسٹ میں یہ روایت بھی ٹوٹ گئی۔ پہلی بار دوران.... فلم بندی میں بھی اسکرپٹ میں ترمیم و اضافے جاری تھے۔

پہلے اسپل برگ اور اس کے ساتھیوں کی فلم پر مخالفت اور پھر خود اسپل برگ کی تشہیر میں ذاتی دلچسپی کی بنا پر عوام بھی اس فلم میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ اسپل برگ نے ایک ایسا موضوع فلمانے کا اعلان کیا تھا جو یہودیوں کے دلوں کا ناسور تھا۔ جسے وہ گزشتہ نصف صدی سے دلوں میں چھپائے چھپائے پھر رہے تھے لہٰذا فلم کا اعلان ہوتے ہی دنیا کے گوشے گوشے سے اسپل برگ کے نام خط' فیکس اور فون

کالوں کی بھرمار ہوگئی۔ یہ سب ہیلو کوسٹ اور آشوٹزبرگ کے جہنم سے بچ نکلنے والے افراد تھے جو ان کیمپوں میں خود پر گزرنے والے روح فرسا واقعات کی بھیانک یادیں گزشتہ پچاس سال سے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ایسے افراد کی تعداد لاکھوں میں تھی لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ان میں سے کم ہی افراد اس دنیا میں باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر ستر اور اسی برس کے تھے۔ ان کی دنیا سے رخصتی میں اب وقت کم ہی رہ گیا تھا اور ایسے وقت میں ایک شخص نے اعلان کیا کہ وہ ان کے زخم اور ان کی دردناک کہانیاں دنیا کے سامنے لائے گا تو ان لوگوں کے برسوں سے دبے جذبات اُبل پڑے۔ وہ زخم جن پر وقت کی کھرنڈ جم گئی تھی پھر سے ہرے ہوگئے۔

اسپل برگ کو سیکڑوں کہانیاں، واقعات اور بچ جانے والوں کی اذیت ناک یادداشتیں موصول ہوئیں اور درحقیقت ان میں شینڈلرسٹ سے زیادہ دلچسپی موجود تھی۔ اس نے چُن کر کچھ خاص واقعات نکالے اور انہیں شینڈلرسٹ کے ساتھ ملا کر فلم کا اسکرپٹ تیار کرنے لگا لیکن اسی دوران میں اسے کچھ کہانیاں اور پسند آگئیں۔ اس نے یہ بھی اسکرپٹ میں شامل کرلیں نتیجہ یہ نکلا کہ فائنل ہوتے ہوتے اسکرپٹ خاصا ضخیم ہوچکا تھا۔

دوسرے مرحلے میں اس نے فلم کے لیے پروڈیوسرز کی تلاش شروع کردی۔ وہ ویت نام پروڈکشن کے ایگزیکٹیو منیجر برانکولس ننگ سے ملا اور جب اس کے سامنے اسپل برگ نے فلم کا مرکزی خیال پیش کیا تو بے اختیار برانکو نے اپنی بائیں آستین اس کے سامنے الٹ دی۔ کہنی سے ذرا نیچے اس کے ہاتھ پر کچھ نمبر کندہ تھے ۷۔۳۱۷۳۔

"یہ آشوٹز برگ میں میرا قیدی نمبر تھا۔" برانکو بولا "جرمنوں نے یہ نمبر مجھے لوہے کی جلتی مہروں سے داغ کر کندہ کیے تھے۔ تم سمجھے اسپل برگ، یہ تو میری ہی کہانی ہے۔"

بے اختیار اسپل برگ لرز اٹھا۔ آشوٹز برگ کا ایک کردار کتنے عجیب طریقے سے اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ اسے جس فلم کا پروڈیوسر بنانے آیا، وہ اس کہانی کا ایک کردار نکلا۔ بہرحال جب اسپل برگ، برانکو کے دفتر سے نکلا تو وہ اس کی فلم کا سینئر پروڈیوسر بن چکا تھا۔ برانکو جیسے شخص کے فلم سے منسلک ہونے کے بعد اسپل برگ کو مزید پروڈیوسرز تلاش کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ اس عرصے میں میڈیا اور فلم والوں کی مخالفت بھی دم توڑ چکی تھی بلکہ میڈیا اس فلم میں دلچسپی لے رہا تھا اور واضح طور پر اس کے پیچھے امریکی یہودیوں کا دباؤ تھا جو اسپل برگ کے اس پروجیکٹ کے دل سے حامی تھے۔ اسرائیل میں بھی اس فلم کے حوالے سے خاصا جوش پایا جاتا تھا بلکہ اسرائیلی پارلیمنٹ میں تو اس فلم پر بحث بھی ہوئی، کچھ ارکانِ اسمبلی کا مطالبہ تھا کہ حکومت اس فلم کی سرپرستی کرے، کیونکہ یہ فلم یہودی پروپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے بہت اہم تھی۔ ان دنوں مشرقِ وسطیٰ میں امن کے حوالے سے اسرائیل پر خاصا دباؤ تھا۔ اس فلم میں یہودیوں پر جو مظالم دکھائے گئے تھے۔ ان کی وجہ سے اسرائیل پر دباؤ کم ہوسکتا تھا۔

شینڈلرسٹ کی شوٹنگ شروع ہوتے ہی اسپل برگ کسی ان تھک جنّ کی طرح مصروف ہوگیا۔ وہ اس فلم کو ایک شاہکار بنا کر لوگوں کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھار تو محض ایک سین کو کیمرے نے درجنوں زاویوں سے فلم بند کیا مگر اسپل برگ مشکل ہی سے مطمئن ہوتا تھا۔ ایک ایک منظر کی دسیوں ری ٹیکس ہوتی تھیں۔ ہر بار اداکار اپنی سی بہترین کوشش کرتے تھے لیکن اسپل برگ کی کٹ کی آواز ان پر آفت بن کر گرتی۔ وہ گہری سانس لے کر اس کا طویل لیکچر سنتے اور دوبارہ کیمرے کے سامنے مکالمے بولنے کو تیار ہوجاتے۔ کبھی کبھی تو وہ مرنے کی حد تک بور ہوجاتے لیکن اسپل برگ کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک ایک فریم پر اپنی اولاد کی طرح توجہ دے رہا تھا۔ ویسے تو فلمیں ہدایت کار کی اولاد ہی کہلاتی ہیں لیکن کچھ بچے باپ کے زیادہ ہی چہیتے ہوتے ہیں۔ شینڈلرسٹ بھی اسپل برگ کی چہیتی اولاد کی طرح تھی۔ اس فلم کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے الیکس پر بھی توجہ نہیں دے پا رہا تھا جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسپل برگ کی بیوی شوبزنس سے تعلق نہیں رکھتی تھی اس لیے الیکس کو کم از کم اپنی ماں کی پوری توجہ حاصل تھی۔

شینڈلرسٹ سے پہلے اسپل برگ کا یہ اصول تھا کہ دورانِ فلم بندی میں غیر متعلق افراد کا سیٹ پر داخلہ بند ہو اور وہ اس اصول پر سختی سے عمل کرتا تھا لیکن شینڈلرسٹ کی عکس بندی کے دوران میں متعدد غیر متعلق افراد کا سیٹ پر داخلہ جاری رہتا تھا۔ یہ وہ افراد تھے جو آشوٹزبرگ اور ہیلو کوسٹ کے جہنم کدے سے بچ کر آنے والے مظلوم تھے جو دنیا بھر سے اسپل برگ کو اپنی کہانیاں سنانے چلے آرہے تھے۔ وہ اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود ان پر پوری توجہ دیتا۔ ان کی کہانیاں سنتا اور اگر اسے کوئی کہانی پسند آتی تو وہ اسے اسکرپٹ میں شامل کرلیتا۔ ایک عورت نے اسے بتایا کہ اس نے کس طرح اپنے قیمتی ہیرے ڈبل روٹی میں چھپائے اور

اپنے ساتھ ہی کیمپ میں لے گئی تھی۔ اسپل برگ نے اسی شام اس واقعے کو لکھا اور اگلے روز اسے شوٹ کرلیا گیا' یوں اصل اسکرپٹ سے ہٹ کر فلم میں کئی ایک نئے اضافے کیے گئے لیکن اس نے مرکزی خیال کو متاثر نہ ہونے دیا۔ اگرچہ نئے واقعات کے اضافے سے فلم خاصی لمبائی اختیار کرگئی اور یہ ساڑھے تین گھنٹے سے بھی زیادہ طویل تھی۔

جو لوگ اسپل برگ کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ انہوں نے اپنی کہانیاں اور متعلقہ دستاویزات اسے روانہ کیں۔ مختصر عرصے میں اسپل برگ کے دفتر کا بیشتر حصہ ڈاک سے موصول ہونے والی کہانیوں سے بھر گیا۔ یہ اتنی بڑی تعداد میں تھیں کہ اس کے لیے فرداً فرداً انہیں پڑھنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اسے کئی اسسٹنٹ صرف اسی کام کے لیے رکھنے پڑے۔

دورانِ شوٹنگ میں اسپل برگ کئی بار آشوٹز برگ گیا۔ وہ وہاں کے چرچ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے تخیل کو آزماتا کہ مرنے والوں نے کیسے جان دی ہوگی پھر اس کا دل دکھ اور غصے سے بھر جاتا۔ اس کے پاس ان جذبات کو نکالنے کا ایک ہی راستہ تھا۔۔۔ فلم' وہ آشوٹز برگ میں ہونے والے واقعات کو زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقے سے اپنی فلم میں استعمال کرنے کا سوچتا۔ وہ جزئیات کا بھرپور خیال رکھتا تھا اور جب یہ مناظر فلم بند ہوتے تو اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا دشوار ہوجاتا۔ خاص طور سے ایک سین میں جب معصوم بچوں کو ان کے ماں باپ سے جدا کرکے ٹرکوں میں سوار کرایا جارہا تھا اور وہ چیخ رہے تھے۔ یہ سین اتنا بھرپور تھا کہ اسپل برگ بے اختیار رو دیا تھا۔

درحقیقت اس فلم کا ہر ہی سین دل گداز تھا۔ دکھ ہمیشہ سے انسانی جذبات کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں اور اس پر اسپل برگ کی ہنرمندانہ ہدایت کاری لہٰذا فلم جب بن کر ریلیز ہوئی تو ایک اور بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اگرچہ اسے جراسک پارک یا دی ریڈرز آف دی لوسٹ آرک جیسی کامیابی تو نہیں ملی پھر یہودی موضوع ہونے کے باعث کیمونسٹ دنیا اور عالمِ اسلام میں اس فلم کو پذیرائی نہیں ملی۔ یورپ میں بھی فلم نے کوئی خاص بزنس نہیں کیا لیکن امریکا کی حد تک شینڈلرسٹ بے حد کامیاب رہی۔ میڈیا نے اس کی تعریفوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ظاہر ہے اس کے پس پشت یہودی پریس موجود تھا لیکن فلم کے اثر انگیز ہونے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اسپل برگ نے جو دعویٰ کیا تھا وہ کس حد تک درست کر دکھایا۔ بعد میں وہ اکثر سوچا کرتا کہ اگر وہ۔۔۔۔۔ شینڈلرسٹ کو خاص فلم بنا کر پیش نہ کرتا تو یقیناً یہ فلم دنیا کے بڑے حصے میں پسند کی جاتی بہرحال وہ مطمئن تھا۔ فلم اس کی توقعات جتنی تو نہیں لیکن بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر اس نے سات آسکر ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ جن میں بہترین عکاسی اور بہترین ہدایت کاری کے آسکر بھی شامل تھے۔

شینڈلرسٹ کے سات آسکر ایوارڈز نے ہالی ووڈ کے بہت سے حلقوں کو برہم کردیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ شینڈلرسٹ ایک اچھی فلم ہے لیکن اتنی بھی اچھی نہیں ہے کہ اسے سات آسکر ایوارڈ نواز دیے جائیں۔ اسپل برگ کے مخالف حلقے ان ایوارڈز کو یہودی دباؤ کا نتیجہ قرار دے رہے تھے پھر یہودی جس طرح سیاست اور معیشت پر چھائے ہوئے ہیں اور ہالی ووڈ میں بھی ان کا اثر و رسوخ کچھ کم نہیں ہے۔ میڈیا کا یہ الزام کچھ ایسا بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ اسپل برگ کو ان الزامات اور مخالفتوں کی کوئی خاص پروا نہیں ہے۔ وہ شینڈلرسٹ بنا کر بے حد خوش تھا۔ اس نے ایک صحافی سے کہا۔

”لگتا ہے' قدرت نے مجھے اسی فلم کے لیے فلم سازی کے میدان میں ڈالا ہے۔“

○☆○

جب اسپل برگ اسرائیل میں ہونے والا فلم کا کام مکمل کرچکا تھا تو تل ابیب میں دو بوڑھے میاں بیوی اس سے ملنے آئے۔ وہ ہولوکوسٹ سے بچ جانے والوں میں شامل تھے۔ وہ اسپل برگ کو خود پر بیتنے والی سرگزشت سنانا چاہتے تھے۔

”لیکن میں فلم کے اسکرپٹ پر کام مکمل کرچکا ہوں بلکہ اب تو فلم بھی مکمل ہونے والی ہے۔“ اس نے بوڑھے جوڑے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”لیکن ہم بہت دور سے آئے ہیں' یروشلم سے۔“ عورت ملتجی لہجے میں بولی۔ اسپل برگ بے اختیار مسکرادیا۔ وہ بولا۔

”محترم خاتون' میں اس سے کہیں زیادہ دور سے آیا ہوں۔ میرا کام ختم ہوچکا ہے۔ مجھے واپس جانا ہے اور میں آپ کے واقعات کو فلم میں نہیں شامل کرسکتا۔ اس کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“

”ہم یہ کب چاہتے ہیں کہ تم ہماری کہانی فلم میں شامل کرو۔“ بوڑھی عورت دل گرفتہ انداز میں بولی ”ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ہماری کہانی' ہمارا دکھ سن لے۔ کوئی ایسا شخص جو ہمارے دکھ کو صرف سنے ہی نہیں بلکہ اسے محسوس بھی کرے۔“

ان کے لہجے اور انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسپیل برگ ان کی بات سننے پر مجبور ہوگیا اور جب ایک گھنٹے بعد وہ میاں بیوی اس کے کمرے سے رخصت ہو رہے تھے تو بے حد مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔ مرد نے اسپیل برگ سے کہا۔

"نصف صدی بعد ہم ایسا محسوس کررہے ہیں جیسے ہمارے اندر ایک بوجھ تھا جو اب نہیں رہا۔ اب ہم سکون سے مرسکیں گے۔" اس بات نے اسپیل برگ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ واپسی کے وقت وہ طیارے میں صرف اسی بارے میں سوچتا رہا۔

"میرے خدا، ابھی ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اپنے دلوں پر بوجھ اٹھائے پھر رہے ہوں گے اور ترس رہے ہوں گے کہ کوئی ہمدردی سے ان کی بات سن لے۔" اور جب وہ لاس اینجلس ائرپورٹ پر طیارے سے باہر آیا تو ایک فیصلہ کرچکا تھا۔ شینڈلرسٹ پر کام ختم کرتے ہی اس نے اپنے عملے کو جمع کرکے ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ آشوٹزبرگ اور ہیلوکوسٹ کے بچ جانے والے افراد کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کروں۔ یہ افراد آدھی صدی سے سلگتے واقعات اپنے اندر دبائے پھر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کا موقع دوں۔ یہ ایک طرح سے امدادی مشن ہوگا۔ ہم نفسیاتی تنہائی میں گھرے ان لوگوں کی مدد کریں گے اور ان کے دکھ درد ہمدردی سے سنیں گے۔ ان میں سے اکثر افراد اب بہت بوڑھے ہوچکے ہوں گے۔ وہ قبروں میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اگر ہم ان کی سکون سے مرنے میں کوئی مدد کرسکتے ہیں تو ہمیں ہچکچانا نہیں چاہیے۔"

"لیکن ہم یہ سب کیسے کریں گے؟" اسپیل برگ کا ایک نائب بولا۔

"سب سے پہلے ہم پرنٹ اور ٹی وی میڈیا پر اس فاؤنڈیشن کی تشہیر کرکے آشوٹزبرگ اور ہیلوکوسٹ سے بچ نکلنے والے افراد سے اپیل کریں گے کہ وہ سامنے آئیں اور خود پر بیتنے والے واقعات بتائیں۔ ہم یہ واقعات ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کرکے باقاعدہ ان کا ایک میوزیم بنائیں گے تاکہ نئی نسل کے لوگ ان ہولناک واقعات سے واقف ہوں جو پچھلی نسل پر گزر چکے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی کہانیاں اور آپ بیتیاں ریکارڈ کرائیں۔ کچھ عرصے بعد جب یہ لوگ اس دنیا میں نہیں ہوں گے تب بھی دنیا کو معلوم ہوسکے گا کہ ہیلوکوسٹ اور آشوٹزبرگ میں ہم یہودیوں پر کیا گزری۔"

عام طور پر امریکیوں نے اور خاص طور سے یہودیوں نے اسپیل برگ کے اس پروجیکٹ کا خیرمقدم کیا۔ انہوں نے اسے رقم فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور اسے بھرپور طریقے سے نبھایا۔ تمام دنیا سے یہودیوں نے شوآہ ویسل ہسٹری فاؤنڈیشن کو خطیر چندے دیے۔ ابتدائی طور پر فاؤنڈیشن کا دفتر اسٹوڈیو کی حدود میں ایک ٹریلر پر قائم کیا گیا لیکن جلد ہی اسے ایک بڑی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد کی تشہیر شروع ہوتے ہی دفتر میں بے تحاشا خط، فون اور فیکس آنے لگے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ اس کی کہانی سنی جائے۔ دفتر کا عملہ جو پہلے صرف تین افراد پر مشتمل تھا جلد ہی ایک درجن سے بھی تجاوز کرگیا۔ ویڈیو ریکارڈنگ کی سہولتوں کی کئی اسٹوڈیوز نے مفت پیشکش کی۔ اسی طرح انٹرویو لینے اور کہانیاں ریکارڈ کرنے کے لیے متعدد رضاکار سامنے آگئے۔ ان میں بعض کل وقتی رضاکار بھی تھے۔

پہلے مرحلے میں امریکا میں رہنے والے افراد کو بلایا گیا پھر امریکا سے باہر سے بھی افراد نے ان سے رابطہ کیا۔ ان کی سہولت کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ جلد ہی فاؤنڈیشن کی کچھ شاخیں یورپ اور اسرائیل میں بھی کھولی جائیں اور وہاں کے افراد کے انٹرویو وہیں ریکارڈ کیے جائیں۔ پہلے سال میں فاؤنڈیشن کے پاس بیس ہزار افراد کی کہانیاں جمع ہوچکی تھیں۔ ان کہانیوں کو الیکٹرانکی طور پر منظم طریقے سے محفوظ کیا گیا۔ اب یہ تمام تر مواد انٹرنیٹ پر دستیاب ہے اور کوئی بھی شخص اپنے کمپیوٹر پر محض چند بٹن دبا کر اس ریکارڈ میں سے اپنی مطلوبہ چیز نکال سکتا ہے۔

اسپیل برگ بلاشبہ اسکرین جینئس ہے۔ اس نے فلم سازی کو نئی روایات دیں۔ اسکرین پر اپنی جادوگری سے دیکھنے والوں کو مسحور کیا اور عام سے موضوعات کو اس طرح فلمایا کہ وہ خاص بن گئے۔ وہ آج بھی مصروف ہے۔ شینڈلرسٹ کی تیاری کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس پر جو قومی اور مذہبی ذمے داری عائد ہوتی تھی، وہ اس نے ادا کردی بلکہ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر ایک مستقل ادارہ بنا دیا۔ بنیادی طور پر وہ فلم کا آدمی ہے اور فلم سازی اس کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا کہ مچھلی کے لیے پانی لیکن وہ سمندر کی گہرائیوں میں بسنے والی مچھلی کی طرح ہے جو کبھی کبھار ہی سطح پر آتی ہے لیکن جب بھی آتی ہے، دیکھنے والوں کو مسحور کردیتی ہے۔ دیکھیں، مستقبل میں اسٹیون اسپیل برگ اپنے جادو کے پٹارے سے ہمارے لیے کیا لاتا ہے۔

★★
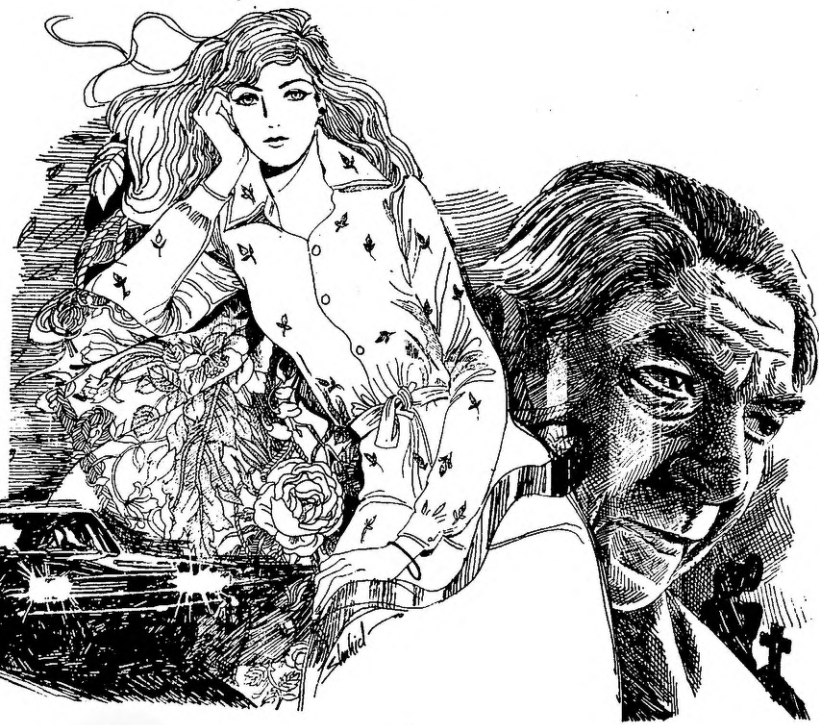
فادر مام

لبنیٰ زبیر

ماں کا رشتہ کس قدر اهمیّت کا حامل هے، اس کا اندازہ عموماً عام حالت میں نہیں هوتا۔ یہ رشتہ لڑکیوں کے لیے خصوصی طور پر نہایت اهمیّت رکھتا هے۔ وہ اپنے مسائل میں ماں هی سے رجوع کرتی هیں۔ اس لڑکی کا تجربہ جِسے ماں سے بچھڑنے کا بہت افسوس تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کررهی تھی۔

ماں باپ سے بچوں کے تعلق پر ایک سبق آموز اور دل گُداز تحریر

ماں کا زندگی میں کیا کردار ہوتا ہے، اس کا مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میری مام ایک برس تک کینسر سے جنگ لڑنے کے بعد تھک ہار کر موت کی آغوش میں جا سوئی تھیں۔ ہمارے لیے اور خاص طور سے میرے لیے مام ہی سب کچھ تھیں۔ میرے ہر مسئلے اور ہر پریشانی کو وہی حل کیا کرتی تھیں۔ ان کا انتقال ہمارے پورے گھر کا نقصان تھا۔ وہی تھیں جس نے ہمارے گھر کو جوڑ رکھا تھا۔ ہم بہن بھائی جہاں بھی ہوتے تھے، مام کی وجہ سے گھر سے ضرور رابطے میں رہا کرتے تھے۔ مام ہمارے لیے ناگزیر تھیں۔

جہاں تک ڈیڈی کا تعلق تھا تو وہ ایک خاموش کردار تھے۔ بالکل کسی فرنیچر کی طرح کارآمد اور آرام دہ مگر بالکل خاموش۔ جہاں رکھ دیا وہیں رہے۔ جب ڈیڈی دفتر سے گھر آتے تو خاموشی سے کھانا کھا کر ٹی وی کے سامنے جا بیٹھتے تھے۔ وہ بہت کم بات کرتے تھے اور ہنستے تو بالکل نہیں تھے۔ ہم پر ان کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے کسی پجاری کا بُت سے ہوتا ہے۔ وہ اس کا احترام کرتا ہے اور اس سے ڈرتا بھی ہے مگر اس سے محبت بھی کرتا ہے۔

اگر ہمارا گھر ایک جہاز تھا تو مام اس کا انجن تھیں۔ وہی

گھر صاف رکھتیں۔ ہم سب بہن بھائیوں اور ڈیڈی کے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ وہ ہمارے لیے کھانا بناتیں اور چھٹی والے دن ہماری بھرپور دعوت کیا کرتی تھیں۔ یہ مام ہی تھیں جو ڈیڈی کی محدود تنخواہ میں گھر کو اتنے اچھے طریقے سے چلاتی تھیں کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس طرح کے کچھ مسئلے مسائل بھی آرہے ہیں۔ اور مام کو کتنے کھینچ تان کر سارے اخراجات پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مام نے ہمیں بتایا کہ ایک بیوی اور ماں کو کیسا ہونا چاہیے۔ انہوں نے ہمارے اس دیہاتی طرز کے مکان کو صحیح معنوں میں ایک گھر بنادیا تھا۔

بچپن سے جب ہمیں کوئی مسئلہ ہوتا تو ہم اسے لے کر سیدھے مام کے پاس جاتے۔ وہ ہماری بات پوری توجہ سے سنا کرتی تھیں۔ اور پھر اس کا حل پیش کرتی تھیں اور ساتھ ہی آخر میں لیکچر بھی دیا کرتی تھیں۔ مگر ہم ان کے پاس سے کبھی غیر مطمئن نہیں اٹھے۔ مام ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ جہاں تک ڈیڈی کے پاس جانے کی بات تھی تو ہم ان کے پاس صرف اس وقت جاتے تھے جب ہمیں رقم کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے فلم دیکھنے کے لیے تین ڈالرز چاہییے ہوتے تھے اور ڈیڈی ایک گھنٹے کام کرنے کی شرط پر یہ رقم دے دیا کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے کبھی بھی رقم دینے سے انکار نہیں کیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ان کی آمدنی محض چھ ڈالرز فی گھنٹہ ہوتی تھی اور وہ ہر ہفتے ہم چار بہن بھائیوں کو فلم دیکھنے کے لیے بارہ ڈالرز دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ ہماری ضروریات پوری کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ چاہے اس کے لیے انہیں اضافی محنت کیوں نہ کرنی پڑتی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اکثر ڈیڈی اپنے ڈیوٹی ٹائم سے دو تین گھنٹے بعد گھر آتے تھے' جب ہم بہن بھائی کھانا کھاکر سونے کے لیے اپنے کمروں میں جاچکے ہوتے تھے' ایک دن میں نے مام سے پوچھا۔

"کیا ڈیڈی کسی پب میں جاتے ہیں؟"

"کیا تمہارے ڈیڈی ایسے ہیں؟" مام نے الٹا سوال کیا۔ میں شرمندہ ہوگئی۔ واقعی میں نے کبھی ڈیڈی کو گھر میں بیئر بھی نہیں پیتے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"پھر ڈیڈی اتنی دیر سے کیوں آتے ہیں؟"

مام نے ٹھنڈی سانس لی "تم لوگوں کی وجہ سے میری جان! ان کی جاب سے ان کو اتنی تنخواہ نہیں ملتی ہے کہ تم لوگوں کے اخراجات بھی پورے کرسکیں اس لیے وہ اضافی کام کررہے ہیں۔ ہفتے میں تین بار وہ ایک گیس اسٹیشن پر کام کرتے ہیں۔"

میں حیران رہ گئی "لیکن کبھی آپ نے یا ڈیڈی نے اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔"

مام مسکرانے لگیں "تمہارے ڈیڈی نے اس وجہ سے نہیں بتایا کہ ان کے خیال میں تم لوگ شرمندہ ہوگے مگر میں نے اس وجہ سے بتادیا ہے کہ اب تم سب بڑے ہوگئے ہو۔ اب تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنے اضافی خرچے خود پورے کرنے کی کوشش کرو۔ تاکہ تمہارے ڈیڈی پر بوجھ کم ہو۔"

اسی روز میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے اخراجات خود پورے کرنے کی کوشش کروں گی۔ ان دنوں میں ہائی اسکول میں تھی اور میں نے شام کے اوقات میں ایک سپر اسٹور میں ورکنگ گرل کے طور پر ملازمت کرلی۔ اس سے میں اپنے اضافی اخراجات پورے کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ جلد ہی دوسرے بہن بھائیوں نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا اور انہوں نے تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ اپنے طور پر بھی کمانا شروع کردیا تھا۔ اس سے ڈیڈی پر بوجھ ہلکا ہوا تھا اور انہوں نے شام کو جلد گھر آنا شروع کردیا۔ مگر ان کی خاموشی اور دیگر معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ کھانا کھاکر ٹی وی کے سامنے جابیٹھتے تھے۔ رات دس بجے تک مام اپنے آخری کام یعنی برتن دھونے سے فارغ ہوکر ڈیڈی کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ اس وقت ڈیڈی مسکرانے اور بولنے لگتے تھے۔ دونوں سرگوشیوں میں مگن ہنستے مسکراتے رہتے۔ یہ منظر اتنا دلکش ہوتا تھا کہ میں اکثر رات کو سوتے سے اٹھ کر چپکے سے دیکھنے آتی تھی اور سیڑھیوں کے اوپر سے دیکھا کرتی تھی۔

مام جب بھی ہمیں کوئی غلط کام کرتے پکڑا کرتی تھیں' جیسے مجھے بارہ سال کی عمر سے اسموکنگ کی عادت پڑ گئی تھی اور میں چوری چھپے سگریٹ پی لیا کرتی تھی۔ اس طرح میری بہن کو اسکول سے بھاگ جانے کی عادت تھی۔ مام ہمیں پکڑ کر پہلے تو لیکچر دیا کرتی تھیں پھر دھمکایا کرتی تھیں "آج میں تمہارے باپ کو ضرور بتاؤں گی۔"

یہ سن کر ہماری جان نکل جایا کرتی تھی۔ مام کی یہ ہمارے لیے سب سے خوفناک دھمکی ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد ہم سچ مچ کچھ عرصے کے لیے باز آجاتے تھے مگر فطرت سے مجبور ہوکر دوبارہ چوری چھپے اپنی حرکتوں پر اتر آتے تھے اور کوشش کرتے کہ مام ہمیں پھر نہ پکڑپائیں "مگر وہ پکڑ ہی لیتی تھیں اور ہمیں پھر ڈیڈی کی دھمکی دیا کرتی تھیں اور ہم سچ مچ ڈر جاتے۔ یہ احساس تو بہت بعد میں ہوا کہ مام کی دھمکی برائے دھمکی ہوا کرتی تھی۔ اور ان کا کبھی ڈیڈی سے کہنے کا ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم ڈیڈی سے بہت ڈرتے تھے۔ میں اکثر

ماں سے سوال کیا کرتی تھی کہ کیا واقعی ڈیڈی ہم سے محبت کرتے ہیں؟

"کیوں نہیں؟" ماں کہتیں "تمہارے ڈیڈی تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ ڈیڈی دراصل ہمیں ایک بیرونی فرد کے طور پر جانتے تھے۔ جو ان کے گھر میں رہ رہا ہو۔ ان کے نزدیک ہم اجنبی تھے' دوست نہیں تھے۔ کم ازکم اس وقت میرا یہی خیال تھا۔ ڈیڈی ہم سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ باپ کی حیثیت سے انہوں نے کبھی ہمیں اعتماد میں نہیں لیا اور نہ ہی کبھی ہم سے ہمارے بارے میں بات کی۔ حتیٰ کہ جب ہم تفریح کے لیے کہیں جاتے تھے تب بھی ڈیڈی زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے بچپن میں مہینے میں ایک بار ڈیڈی ہم سب کو اپنی بڑی سی وین میں بھر کر چارلوٹن تک لے جاتے تھے۔ یہ قصبہ مشرقی کینیڈا کے علاقے پرنس آئی لینڈ میں واقع ہے۔ ہمارے گھر سے چارلوٹن تک چوبیں کلومیٹر کا یہ فاصلہ مکمل خاموشی سے طے ہوتا تھا۔ ڈیڈی صرف ڈرائیونگ کیا کرتے تھے۔

ہم نے بے شمار بار ان راستوں پر سفر کیا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ ڈیڈی نے اس دوران میں چند سے زیادہ الفاظ کہے ہوں مگر ڈیڈی اس لحاظ سے میرے لیے اہم تھے کہ طویل عرصے تک میرے اردگرد وہ واحد مرد تھے۔ ہائی اسکول کے زمانے تک میرے تینوں بھائی خود مختار ہوکر گھر سے جاچکے تھے۔ میری چھوٹی بہن بھی وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھی لیکن نہ تو میں گھر سے باہر رہتی تھی اور نہ ہی میری کسی سے دوستی تھی' اسی طرح ڈیڈی واحد شخص تھے جو میرے نزدیک تھے۔ مگر وہ میرے نزدیک نہیں تھے۔

میں سوچتی ہوں تو میں اس میں ڈیڈی کو قصوروار نہیں پاتی۔ اس وقت ڈیڈی طاقت ور تھے۔ خاموش اور اپنی آمدنی میں اپنے خاندان کی پرورش کے لیے فکرمند رہا کرتے تھے۔ ہمیں کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ ہماری فکر میں دیکھنے کے لیے ماں تھیں۔ اس کے لیے ہمیں ڈیڈی کی ضرورت نہیں تھی اس لیے ہم ان کی خاموشی اور لیے دیے رہنے والی عادت کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔

ہماری زندگی بہت اچھی تھی۔ ہم بہت زیادہ پرآسائش زندگی نہیں گزارتے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اس وقت علاقے میں سب سے خوش اور مطمئن گھرانا ہمارا ہی تھا۔ گھر ہمارے لیے ایک سایا عافیت تھا جہاں آکر ہم دنیا بھر کے غم اور پریشانیاں بھول جاتے تھے۔ ماں ہماری ہر پریشانی اور فکر سمیٹ کر ہمیں بے فکر کردیا کرتی تھیں۔ پھر حالات بدل گئے۔ ماں بیمار رہنے لگیں اور یہ انکشاف ہوا کہ انہیں کینسر کی مہلک بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کردی تھی۔ اس موقعے پر جیسے دنیا ہمارے لیے تاریک ہوگئی تھی۔ ماں کی جدائی کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا۔ میں اور ہم سب بہن بھائی بے حد پریشان تھے' ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس موقع پر بھی ماں نے کمال حوصلے سے گھر کو منتشر ہونے سے بچایا۔ انہوں نے ہمیں جمع کیا اور ایک طویل تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ دنیا اور اس کا ہر انسان فانی ہے جو پیدا ہوتا ہے' اسے ایک دن اس دنیا سے جانا بھی ہوتا ہے۔ اگر وہ اس دنیا سے چلی جائیں گی تو اس دنیا کے کاروبار میں کوئی فرق نہیں آئے گا کیونکہ وہ نہیں ہوں گی تو ان کا کردار کوئی اور ادا کرے گا۔ رفتہ رفتہ ماں نے ہم سب بہن بھائیوں کو ذہنی طور پر تیار کرلیا اور ہم ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

البتہ ڈیڈی کو ماں نے دوسرے انداز سے تیار کیا۔ جب بیماری سے لڑتے ہوئے ماں کی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی' وہ ڈیڈی کو لے کر شاپنگ سینٹر جاتیں اور انہیں بتاتی تھیں کہ گھر کے سامان کی اچھی اور سستی خریداری کیسے کی جاتی ہے۔ اچھی مچھلی کون سی ہوتی ہے اور کس چیز کی کیا مناسب قیمت

ہے۔ انہوں نے ڈیڈی کو کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی کرنا سکھایا۔ انہیں چائے بنانا اور چند سادہ قسم کے کھانے بنانا سکھائے۔ اس وقت ڈیڈی کی عمر اکسٹھ برس تھی۔ انہوں نے یہ سارے کام آسانی سے سیکھ لیے لیکن مام نے انہیں ماں بننا نہیں سکھایا اور نہ ہی ڈیڈی نے ان سے سیکھا۔ یہ تو انہوں نے بعد میں خود سیکھا تھا۔

یہ مام کی موت سے چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں اور مام مستقبل کے بارے میں بات کررہے تھے۔

"کیا آپ ڈیڈی کے بارے میں فکر مند ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" مام نے جواب دیا۔ بیماری نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک نقاہت آمیز نرمی طاری رہتی تھی۔ انہیں شدت سے احساس تھا کہ ان کا وقت پورا ہوگیا ہے۔ ہم اس بارے میں بات کرچکے ہیں اور اسے حقیقت سمجھ کر قبول کرچکے ہیں۔ لڑکی! تمہارے ڈیڈی بہت سمجھ دار آدمی ہیں۔"

"لیکن میں فکر مند ہوں" میں نے سرگوشی میں اعتراف کیا۔ "میں اس لیے فکر مند ہوں کہ شاید آپ کے بعد ہمارے لیے اس گھر میں کچھ باقی نہیں رہے گا۔"

یہ درست ہے، ہم صرف مام کی وجہ سے اس گھر میں آتے تھے۔ ان کے وجود سے یہ گھر ایک خاندان تھا۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو شاید ہم برسوں پہلے یہاں آنا ترک کرچکے ہوتے۔ مام نے غور سے مجھے دیکھا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

میرا برسوں پرانا خوف زبان پر آگیا تھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے کیا ہم ڈیڈی کے پاس آیا کریں گے؟"

میرا اشارہ واضح تھا اور سوال بے حد نوکیلا، مام نے جواب دیا۔

"تم لوگ ضرور آؤ گے" یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ بے حد پُراعتماد تھا۔

✪✶✪

فروری 1999ء کی ایک خوبصورت شام مام نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ ان کی تکلیف کا خاتمہ ہوا تھا۔ آخری چند دن انہوں نے بے حد اذیت میں گزارے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں، میری بہن، میرے تین بھائی اور ڈیڈی ان کے سرہانے تھے۔ مام نے آخری الفاظ ڈیڈی سے کہے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی کا ہاتھ تھام کر ان سے آخری مرتبہ اقرارِ محبت کیا اور ہمیشہ کی نیند سوگئیں۔ اس لمحے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ یا کم سے کم میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔

"مام کی آخری رسومات کے موقع پر ڈیڈی نے حیرت انگیز صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمیں محبت سے تسلی دے رہے تھے اور یقین دلا رہے تھے کہ وہ ہمیں مام کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ اس وقت کم سے کم مجھے ان کی بات کا یقین نہیں تھا۔ جنازے کی تقریب سے ذرا پہلے ڈیڈی اسموکنگ کرنے گھر آگئے، انہیں احساس تھا کہ مام کو ان کی تمباکو نوشی سے چڑ تھی اس لیے انہوں نے مام کے پاس سگریٹ پینا مناسب نہ سمجھا۔ لوگ آئے اور حیرت سے ہم میں سے کسی سے سوال کرتے "تمہارے ڈیڈی نہیں آئے؟"

"نہیں وہ ذرا ایک اہم کام میں مصروف ہیں" ہم آنے والوں کو بتاتے۔ بعض اوقات تو ہمیں اپنی ہنسی بھی ضبط کرنا پڑتی تھی۔ لوگوں کے ردِ عمل پر وہ سمجھتے تھے کہ ڈیڈی کو مام کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی اس لیے وہ ان کے جنازے میں بھی نہیں آئے۔ اور جب ڈیڈی پورے وقار سے جنازے میں شامل ہوئے تو یہی لوگ شرمندہ نظر آنے لگے تھے۔ جب مام کا تابوت قبر میں اتارا جارہا تھا تو پہلی بار مجھے ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے تھے۔ مام کو زمین کے سپرد کرکے آئے تو ہم سب کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور ہم آپس میں لپٹ کر رو دیے تھے۔ ڈیڈی نے ہمیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ انہوں نے ہمیں زبردستی کھانے پر مجبور کیا۔ پھر ہم لیونگ روم میں آکر مام کی یادوں کو دہرانے لگے۔ قدرتی طور پر مام کے بارے میں سب سے زیادہ ڈیڈی جانتے ہیں۔ انہوں نے بہت کم عمری میں مام کو دیکھا۔ جب مام کی ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ صرف پندرہ برس کی تھیں اور جب وہ سترہ برس کی ہوئیں تو انہوں نے ڈیڈی سے شادی کرلی۔ یہ 1950ء کے عشرے کی بات تھی۔ اس وقت ڈیڈی بے روزگار تھے اور مام نے جاب کرکے گھر چلایا تھا لیکن جب ایک بار ڈیڈی مستقل ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو مام نے فوری طور پر ملازمت ترک کردی اور اپنی ساری توجہ گھر، بچوں اور ڈیڈی کو دینے لگی تھیں۔ صبح چار بجے میں نے خود کو ڈیڈی کے زانوں پر سر رکھے لیٹے پایا اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ مام کس قدر شاندار بیوی اور عورت تھیں۔

ہم میں سے کسی نے ایک لمحے کو آنکھ نہیں جھپکی تھی، یہ دل کو چھو لینے والے لمحات تھے۔ ہمیں ایسا لگ رہا تھا کہ مام مری نہیں تھیں، وہ ہمارے اردگرد موجود تھیں اور اس پارٹی

میں شامل تھیں۔ یہ احساس ہمارے دکھ کو کم کرنے کے لیے کافی تھا۔ دو روز بعد ہم گھر سے رخصت ہونے لگے۔ ڈیڈی بے حد افسردہ تھے، اب انہیں اکیلے ہی رہنا تھا۔ ہم پانچوں بہن بھائی اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن تھے۔ میں مونٹریال میں ایک کمپنی میں کام کرتی تھی۔ باقی بہن بھائی بھی ملک کے دوسرے حصّوں میں جاب کررہے تھے۔ اب تک ہمارے درمیان قدر مشترک خاندان سے زیادہ مام رہی تھیں۔ جاتے ہوئے میں نے خود سے سوال کیا۔ کیا میں اس گھر میں اب پہلے کی طرح آپاؤں گی، مجھے جواب نفی میں ملا تھا۔

اگلی بار میں کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آئی تھی۔ میری چھوٹی بہن اور ایک بھائی نہیں آیا تھا۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا، جب کرسمس کے موقع پر ہمارا پورا گھر جمع نہیں تھا۔ مام کے نہ ہونے سے یہ پہلا اثر تھا جو ہماری زندگیوں پر پڑا تھا۔ اب میں محسوس کررہی تھی کہ ہمارا بندھن اتنا مضبوط نہیں رہا تھا جتنا کہ مام کی زندگی میں تھا۔ میں نے ڈیڈی کو تھکاہوا اور پژمردہ پایا۔ ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہی تھی، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اپنی خوراک پر باقاعدگی سے توجہ نہیں دیتے تھے۔ مام نے اپنی زندگی میں کبھی انہیں بھوکے نہیں سونے دیا تھا۔ اب ڈیڈی کا زیادہ تر گزارا کھانوں کے بجائے چاکلیٹس بارز سے ہوتا تھا۔ جو انہوں نے اپنے کتے مارز سے چھپانے کے لیے مام کے برتنوں میں رکھے تھے۔ مارز اب ان کی تنہائیوں کا واحد رفیق تھا۔ وہ رات کو ان کے ساتھ ہی ان کے بستر پر سوجاتا تھا۔

کرسمس ڈنر کے بعد ڈیڈی پھوٹ پڑے تھے۔ انہوں نے روتے ہوئے ہم سے تنہائی کی شکایت کی۔ ان کے لہجے میں درد تھا۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ مام کے بعد واقعی ہم نے انہیں نظرانداز کردیا تھا۔ اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔ اس روز پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ ڈیڈی ایک کمزور انسان ہیں۔ ہم ساری عمر انہیں آئرن مین سمجھتے رہے۔ مام کے بعد ہم کم ہی گھر آتے تھے اور میں تو مام کے انتقال کے بعد پہلی بار آئی تھی۔

"ڈیڈی، میں نہیں جانتی تھی کہ مام کے بعد آپ اتنی تنہائی محسوس کریں گے" میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔

"میں جانتا ہوں۔ تم لوگوں نے اپنی ماں کھوئی ہے" ڈیڈی نے کہا "مگر میں نے اپنے وجود کا نصف حصّہ کھودیا ہے۔ یہ بات تم اس وقت سمجھوگے جب تم بھی اس وقت سے گزروگے۔"

کرسمس کے بعد میں نے واپس جانے کے بجائے کچھ دن اور ڈیڈی کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ نیاگرا فال دیکھنے جاؤں گی جو سردیوں میں منجمد ہوجاتی ہے مگر ڈیڈی کی تنہائی محسوس کرکے میں نے باقی چھٹیاں ان کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا اور جب میں نے ڈیڈی کو اس بارے میں بتایا تو وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔

"سچ، تم کتنے دن میرے پاس رہوگی۔"

"ابھی میری بارہ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔"

ڈیڈی میرے رکنے کا سن کر کھل گئے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر مارکیٹ جاکر کچن کے لیے کھانے پینے کا سامان لانے کا فیصلہ کیا۔ اس دن انہوں نے پوری دلچسپی سے اپنے معمولات انجام دیے۔ میں نے شام کو ان کے لیے ڈنر تیار کیا تو مارے خوشی کے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ مام کے انتقال کے بعد وہ پہلی بار عورت کے ہاتھ کا بنا کھانا کھارہے تھے ورنہ عام طور سے وہ خود ہی اپنے لیے جیسا تیسا پکالیا کرتے تھے یا ہوٹل سے جاکر کھالیا کرتے تھے۔ کھانا کھاکر انہوں نے کہا "تم بالکل اپنی ماں جیسا کھانا بناتی ہو۔"

صبح کے اوقات میں ہم ناشتے کے بعد طویل فلسفیانہ بحث کیا کرتے تھے اور رات کو ڈنر کے بعد آتش دان کے

سامنے بیٹھ کر وہ مجھے اپنے اور مام کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے اپنے اور مام کے بارے میں بہت ساری ایسی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں بتائی تھیں، میں نے محسوس کیا کہ وہ حساس تھے اور کسی سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتے تھے۔ مام کی زندگی میں انہیں کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان کی ہر بات کہے بغیر ہی سمجھ جایا کرتی تھیں۔

ڈیڈی اپنے گھر میں چھوٹے ہونے کی وجہ سے سب سے لاڈلے تھے اور بارہ برس کی عمر تک وہ اپنی مام کے ساتھ سویا کرتے تھے۔ مگر وہ مرد تھے اور 1936ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وجہ سے وہ ہم سے اپنی حساسیت چھپا کر خود کو مضبوط شخص ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان چند دنوں میں، میں ڈیڈی کے بے حد نزدیک آگئی تھی اور میں نے ان کے اندر کو جاننا شروع کردیا تھا۔ مجھے مام کی بات یاد آئی کہ میں ضرور ڈیڈی سے ملنے آیا کروں گی۔ میں ڈیڈی کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ میرے باپ تھے۔ حساس اور دکھی تھے اور انہیں میری ضرورت بھی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا، میں اب جلد جلد ان کے پاس آیا کروں گی اور وہ بھی میرے پاس مونٹریال آیا کریں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بھی آئیں گے۔ جب میں جانے لگی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"باربرا، میں چاہتا ہوں کہ تم ڈرنک کرنا چھوڑ دو۔"

"سچ مچ ڈیڈی" میں نے شرمندگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

"ہاں، کیونکہ یہ بری عادت ہے اور میں نے تینتیس برس کی عمر میں شراب چھوڑی تھی، اس وقت میں بھی ڈرنکر تھا اور بہت زیادہ پیا کرتا تھا۔ تمہاری مام کو یہ عادت بری لگتی تھی لیکن وہ مجھ سے اس بات پر کبھی نہیں جھگڑتی تھی بلکہ ہمیشہ سمجھانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ یہ اس کی کوشش تھی کہ میں نے شراب ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی۔"

میں بے اختیار رو دی تھی۔ میں گزشتہ چھ سال سے شراب کی عادی تھی لیکن پہلی بار کسی نے مجھ سے یہ بری عادت ترک کردینے کو کہا تھا۔ ڈیڈی مجھے روتے دیکھ کر بے قرار ہوگئے، انہوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔

"کیا تمہیں میری بات بری لگی۔ میں نے صرف تمہاری بہتری کی وجہ سے یہ بات کی ہے۔ اگر تم اس چیز کو چھوڑ دو تو تمہاری زندگی پہلے سے بہت اچھی ہوجائے گی۔"

"نہیں، مجھے آپ کی بات اچھی لگی" میں نے کہا "اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس عادت کو چھوڑ دینے پر سنجیدگی سے غور کروں گی۔"

میں سکون اور اطمینان محسوس کر کے ڈیڈی کے پاس سے گئی تھی۔ مجھے اچھا لگا دنیا میں مام کے بعد کم از کم ایک ایسا فرد موجود ہے جسے میرے مسائل اور میری پروا تھی۔ میں نے مونٹریال آکر سب سے پہلے ایک ترک شراب سوسائٹی جوائن کی اور مجھے بے حد خوشی ہوئی جب میں یہ عادت ترک کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ میں نے اس کے ایک مہینے بعد ڈیڈی کو خط لکھا۔ "ڈیڈی میں نے شراب ترک کردی ہے اور گزشتہ چھ سال میں یہ پہلا موقع ہے جب میں نے پورے ہفتے میں ایک قطرہ نہیں پی ہے۔ میں اس عادت سے چھٹکارا پا کر بے حد خوش ہوں اور یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا۔"

میں جب مام کی زندگی میں گھر فون کیا کرتی تھی اور ڈیڈی فون اٹھاتے تھے تو میں ہیلو کہنے کے بعد ان سے دوسری بات یہ کرتی تھی "مام کہاں ہیں؟"

ڈیڈی خاموشی سے فون رکھ کر مام کو بلاتے تھے۔ میں مام سے بات کرتی تھی اور فون رکھ دیتی۔ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ڈیڈی سے بات کروں یا اپنا کوئی مسئلہ ان کے سامنے رکھوں۔ اسی روز میں نے پریشانی کے عالم میں گھر فون کیا اور جب ڈیڈی نے فون اٹھایا تو میں نے بے اختیار کہا "کیا مام ادھر ہیں؟"

سوال کر کے میں ایک لمحے تو خود ہی خاموش ہوگئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیڈی نے رسانیت سے کہا۔

"ہنی، کیا مسئلہ ہے۔ رونے کے بجائے تم مجھے کہہ سکتی ہو۔"

اور اس لمحے میں نے اپنے ڈیڈی کے روپ میں اپنی مام کو واپس پالیا تھا۔ میرے اندر کوئی شے پگھلنے لگی تھی۔ ڈیڈی نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن ان کے اندر میرے لیے چھپے محبتوں کے سارے مفہوم بن کہے ہی میری سمجھ میں آگئے تھے۔ میں نے خود پر قابو پا کر ڈیڈی کو اپنا مسئلہ بتایا۔ انہوں نے بالکل مام کے انداز میں مجھے اس کا حل بتایا اور پھر مام ہی کی طرح لیکچر بھی دیا کہ میں نے کہاں غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں مجھے اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگلے پانچ برس تک ڈیڈی میرے لیے مام کا کردار ادا کرتے رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ میری مام اب اس دنیا سے گئی ہیں۔

کاشف زبیر

سرد جہنم

ساتویں براعظم کی دریافت نے مہم جوئی کی دنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی بے شمار مہم جو تحقیق کے لیے نکل کھڑے ہوئے مگر خون کو منجمد کردینے والے سرد موسم اور دوسری مشکلات نے انھیں پسپائی پر مجبور کردیا تھا۔ ایسے ہی تحقیقی مشن پر روانہ ہونے والے تین حوصلہ مند مہم جوؤں کا ماجرا جو اپنی تحقیقات مکمل کرکے واپسی کے لیے روانہ ہوئے تو انھیں اس سرد جہنم کی ہولناکی اور سفاکی کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔

دنیا کے سردترین خطے کی طرف جانے والی ایک مہم کا دل گداز سچا احوال

آج کے ترقی یافتہ دور میں جب ٹیکنالوجی بامِ عروج پر ہے۔ ذرائع مواصلات اتنے تیز ہو گئے ہیں کہ آدمی چوبیس گھنٹے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتا ہے۔ اپنے گھر بیٹھے دوسرے براعظموں میں ہونے والے واقعات براہِ راست دیکھ سکتا ہے۔ ہزاروں میل دور تک اپنی آواز پہنچا سکتا ہے مگر اب بھی دنیا کے کچھ علاقے ایسے ہیں جو انسانی پیروں کے چھونے سے محروم ہیں۔ ابتدائے انسانیت سے آج تک کوئی انسان ان علاقوں میں نہیں گیا۔ ایسے ہی ان چھوٹے علاقوں میں دنیا کا ساتواں براعظم انٹارکٹیکا بھی شامل ہے۔ اٹھارویں صدی تک یہ علاقہ دنیا کے لیے اجنبی تھا۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی دریافت کے بعد جب مہم جوؤں نے مزید جنوب کی طرف سفر کیا تو انہوں نے برف سے ڈھکے ایک خطے کو پایا۔ جس کی وسعت نامعلوم تھی۔ دوسری طرف جنوبی امریکا میں چلی اور ارجنٹائن کی ملکیت میں آخری جنوبی جزیروں کے بعد سفر کرنے والوں کو ایسی ہی برفانی سرزمین ملی تھی۔ جغرافیہ دانوں نے کڑی سے کڑی ملائی اور ساتویں براعظم کی دریافت کا اعلان کردیا جو دنیا کے جنوبی قطب کے اردگرد پھیلا تھا۔ اس دریافت نے مہم جوئی

کی دنیا میں ہلچل مچادی تھی۔ مہم جو تیاریاں کر کے ان چھوٹے براعظم کو دریافت کرنے نکل کھڑے ہوئے مگر وہاں کی بے پناہ سردی اور دوسری مشکلات نے مہم جوؤں کے منہ پھیر دیے تھے۔

وہ انسان ہی کیا جو ہار مان جائے۔ بار بار کی ناکامیوں نے مہمیز کا کام کیا۔ ہر بار مہم جو پہلے سے زیادہ تیار ہو کر جنوبی قطب کی طرف پیش قدمی کرتے اور بالآخر آج سے کوئی سوسوا سال پہلے انسان نے جنوبی قطب کو بھی چھولیا تھا۔ اس وقت نہ تو آج کی طرح جدید آلات دستیاب تھے نہ مواصلاتی آلات تھے اور نہ ہی گاڑیاں تھیں۔ بس انسان تھے جو پیروں پر چل کر قطب جنوبی تک پہنچے تھے۔ آج جدید سہولیات سے لیس بے شمار ٹیمیں اور ہزاروں انسان قطب جنوبی میں تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہیں۔ اس کے باوجود اس کے بہت سارے گوشے ایسے ہیں جہاں آج تک کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے۔

ساٹھ لاکھ مربع میل پر پھیلا ہوا براعظم انٹارکٹیکا باقی براعظموں سے یوں الگ تھلگ ہے جیسے زمین کی سوتیلی اولاد ہو۔ اجاڑ، ویران، بنجر اور بے پناہ سرد۔ اس پر جو سب سے بڑا جاندار پایا جاتا ہے وہ پینگوئن ہے۔ یہ پرندے بھی ساحلی علاقوں تک محدود ہیں۔ ممکن ہے برسوں پہلے پینگوئن سبزی خور ہوں لیکن جب انٹارکٹیکا کی سرزمین پر کسی قسم کا سبزہ اگنا بند ہو گیا تو یہ مجبوراً گوشت خوری پر اتر آئے اور سمندر میں اتر کر اپنی خوراک حاصل کرنے لگے۔ اس کے علاوہ یہاں سیل مچھلیاں بھی آتی ہیں۔ براعظم کے اردگرد سمندروں میں دیوہیکل وہیل بھی پائی جاتی ہیں لیکن انسانوں نے اس سرزمین کو صرف ڈھائی سو برس پہلے ہی دیکھا تھا۔

آج سے پندرہ کروڑ سال پہلے جب کرۂ ارض پر صرف ایک براعظم تھا۔ جو آج کے ایشیا اور افریقا کی جگہ واقع تھا پھر ارضیاتی تبدیلیوں نے اس اکلوتے براعظم کے ٹکڑے کرنا شروع کر دیے۔ زیرِ زمین دہکتے لاوے کے اوپر تیرتی براعظمی پلیٹیں دباؤ کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ سارے ہی براعظم کھسک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے جیسے بڑے ہونے پر بھائیوں کے درمیان بٹوارہ ہو جاتا ہے۔ انٹارکٹیکا خاموش طبع تھا لہٰذا اسے زمین کے سب سے دور افتادہ گوشے میں بھیج دیا گیا۔ جہاں کسی انسان نے قدم نہ رکھے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ٹیکنالوجی میں تحیر انگیز تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ بھاپ کے انجن کا دور گزر چکا تھا اب پیٹرول سے چلنے والے انجن ساری دنیا میں استعمال ہو رہے تھے۔ بحری جہازوں میں بھی تیل سے چلنے والے انجن نصب کیے جانے لگے ان انجنوں نے نہ صرف بحری جہازوں کی رفتار بڑھا دی بلکہ انہیں اس قابل بھی کر دیا کہ یہ منجمد سمندروں میں سفر کرنے لگیں۔ اس سے سرما میں بھی شمالی سمندر جہاز رانی کے لیے استعمال کے قابل ہو گئے۔ دوسری طرف انٹارکٹیکا کی طرف مہمات بھیجنا آسان ہو گیا تھا۔

بے مثال صنعتی ترقی نے یورپ والوں کے جذبۂ مہم جوئی کو اور بھی مہمیز دی تھی۔ 1911ء سے 1913ء کے درمیانی عرصے میں قطب جنوبی کی جانب تین بے مثال مہمیں روانہ ہوئیں۔ ان مہمات میں عزم و حوصلے اور انسانی قربانیوں کی ایسی تاریخ رقم ہوئی جو آنے والے مہم جوؤں کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام کرتی رہے گی۔ ان تینوں مہمات کے کردار مختلف ہیں۔ اولین مہم کا ہیرو مشہور تحقیق دان رولڈ ایمنسن تھا۔ اس نے 14 دسمبر 1911ء کے دن قطب جنوبی پر اپنا پرچم نصب کیا تھا۔ دوسرا شہرۂ آفاق مہم جو کیپٹن رابرٹ اسکاٹ تھا۔ اس نے ایمنسن کے ایک مہینے بعد قطب جنوبی فتح کیا اور یہ بے مثال شخص واپسی کے سفر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ تیسرا فرد آسٹریلین مہم جو ڈاکٹر ڈگلس میسن تھا۔ جو اٹھارہ افراد کی ٹیم لے کر قطب جنوبی کی مہم پر نکلا تھا۔ اس داستان کا موضوع یہی تیسری مہم ہے۔

ایڈیلیڈ یونیورسٹی میں علم الطبقات کا پروفیسر اکتیس سالہ ڈاکٹر میسن بچپن سے مہم جوئی کا شوق رکھتا تھا۔ وہ خاصے عرصے سے اس مہم کی تیاری کر رہا تھا لیکن کئی ایک مسائل درپیش تھے۔ ان میں دو اہم تھے۔ ایک مہم کے لیے رقم کی فراہمی اور اس سے بھی زیادہ اہم مسئلہ موزوں افراد کی ایک جماعت تیار کرنا تھا۔ جو سارے مصائب جھیلتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے ارادوں اور صلاحیتوں سے مالا مال ہو۔ خوش قسمتی سے اسے یہ دونوں ہی دستیاب ہو گئے۔

رقم اور موزوں افراد ملتے ہی ڈاکٹر میسن نے تیزی سے مہم کی تیاری کی اور جب نومبر کے مہینے میں آسٹریلیا میں گرمی عروج کی طرف مائل تھی۔ (واضح رہے جنوبی نصف میں گرمی ہوتی ہے جب شمالی نصف کرے میں سردی کا موسم ہوتا ہے۔) پہلی نومبر کو یہ مہم سڈنی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئی اور پانچ نومبر کو بحری جہاز نے انہیں سامان سمیت انٹارکٹیکا کے ایک برفانی جزیرے ایڈلانی تک چھوڑا تھا۔ اٹھارہ افراد کی اس جماعت کے پاس مہم کے لیے ضروری آلات،

سامان، ایندھن اور خوراک کا معقول ذخیرہ تھا۔ جو تین مہینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جس جہاز پر آئے تھے وہ انہیں واپس لے جانے کے لیے پندرہ جنوری کو آتا گویا پورے ستر دنوں کے لیے وہ باقی دنیا سے کٹ کر اس جزیرے پر تنہا رہ گئے تھے۔

ڈاکٹر میسن کا اصل مقصد تو قطب جنوبی تک جانا تھا لیکن اس سے پہلے اسے ایڈلائی کے جزیرے کے آگے تین سو مربع میل پر پھیلے علاقے کا مکمل سروے کر کے اس کا نقشہ تیار کرنا تھا۔ بہ ظاہر اس کام کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا لیکن مستقبل کے لیے یہ نہایت ضروری تھا۔ میسن کے بعد آنے والے مہم جو کم از کم اسی علاقے کے نقشے سے تو اچھی طرح واقف ہوتے پھر وہ آگے کے علاقوں کے نقشے تیار کرتے۔ جو ان کے بعد آنے والوں کی راہنمائی کرتے اور اس طرح دنیا میں ہر نیا آنے والا شخص ایک علاقہ کا نقشہ بناتا جاتا۔ رفتہ رفتہ پورا انٹارکٹیکا اسی طرح سے نقشے پر منظم ہوتا گیا اور دنیا آج اس کے نوے فیصد علاقوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ نقشہ سازی کے لیے ڈاکٹر کو مددگاروں کی ضرورت تھی۔ اس کی اٹھارہ رکنی ٹیم میں سے دو افراد سامنے آئے۔ ایک ایکس ویرمرز جس کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے تھا اور دوسرا لیفٹیننٹ بی ای ایس نینس تھا۔ ڈاکٹر میسن اس سے پہلے بھی انٹارکٹیکا آ چکا تھا مگر اس کے دونوں ساتھی پہلی بار برفانی براعظم آئے تھے۔ انہیں برف پر اسکیٹنگ کی مشق تھی اور ویرمرز شمالی قطب کا سفر بھی کر چکا تھا۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ ان کے پاس مہلت کم تھی۔ اس براعظم پر موسم گرما بہ مشکل دو مہینے کے لیے آتا تھا جو پندرہ نومبر سے پندرہ جنوری تک جاری رہتا تھا۔ اس دوران میں برفانی طوفان کم ہی آتے تھے۔ ورنہ باقی کے دس مہینے سردی اپنے عروج پر رہتی تھی اور طوفانوں کا سلسلہ تو ہمہ وقت جاری رہتا تھا۔

15 نومبر کے دن میسن، ویرمرز اور نینس نے پیروں سے لکڑی کے تختے باندھے۔ ان کا سامان تین بڑی گاڑیوں میں تھا۔ جن کے نیچے سلواں تختے لگے تھے اور ان گاڑیوں کو سولہ عدد کتے کھینچ رہے تھے۔ ان کے سامان میں پیمائش اور نقشہ نویسی کے لیے سائنسی آلات، ایندھن، خیمے اور خوراک شامل تھی۔ اسی دوران میں انہوں نے ایڈلائی کے جزیرے پر اپنا زمین دوز ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا تھا۔ کسی بھی ناگہانی آفت کی صورت میں وہ واپس آ کر یہاں سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔

بہ ظاہر یہ کوئی خاص مشکل سفر نہیں تھا لیکن جب انہوں نے سفر شروع کیا تو ہر روز ہی نئی رکاوٹیں سامنے آنے لگی تھیں۔ دو روز تک وہ گڑھوں اور برفانی ٹیلوں کو عبور کر کے آگے بڑھتے رہے۔ دو دنوں میں انہوں نے چالیس میل کا سفر طے کیا تھا۔ گرما میں بھی یہ علاقہ برف کی موٹی تہہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ درحقیقت انٹارکٹیکا کی پوری سرزمین سوائے چند ساحلی علاقوں اور جزائر کو چھوڑ کر سارے سال برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ اندر کے علاقوں میں برف کی یہ تہہ بعض مقامات پر دو میل سے زیادہ موٹی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا بھر کے میٹھے پانی کے ذخائر کا نوے فیصد اسی براعظم میں پایا جاتا ہے۔ جہاں کی کل انسانی آبادی آج بھی دس ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے جب اس جگہ سے برف اور میٹھا پانی دنیا کے ان ملکوں میں منتقل کیا جائے جہاں پانی کی شدید قلت ہے۔ جیسے افریقی ممالک اور مشرق وسطیٰ۔

سفر کے تیسرے دن غیر متوقع برفانی طوفان نے انہیں آلیا۔ ڈاکٹر میسن اور اس کے ساتھیوں نے جلدی جلدی خیمے لگائے۔ کتا گاڑیاں ایک دوسرے سے باندھ کر کتوں کو ان کے درمیان بٹھا کر اوپر سے ترپالیں ڈال دی گئیں اور وہ خود خیمے میں گھس کر آرام کرنے لگے۔ ڈاکٹر میسن جو پہلے بھی انٹارکٹیکا آ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کے طوفانوں میں

سفر کرنے کا مطلب موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔
طوفان لگا تار دو دن جاری رہا۔ برف کے ٹکڑے ہواؤں کے ساتھ اڑ کر ان کے اردگرد جمع ہوتے رہے تھے۔ دو دن بعد جب وہ خیموں سے نکلنے لگے تو انہوں نے خیموں کو برف میں دفن پایا۔ بہ مشکل برف کھود کر انہوں نے خود کو برف کی قید سے آزاد کرایا۔ خوش قسمتی سے کتا گاڑیاں نسبتاً اونچے مقام پر تھیں۔ اس لیے ان کے اوپر اتنی برف جمع نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ ان کے کتے برف تلے دب کر ہلاک ہو چکے ہوتے اور اس علاقے میں وہ کتوں کے بغیر ایک میل کا بھی سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سب سے پہلے کتوں کو خوراک دی اور آگے سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔
طوفان نے علاقے کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ پہلے جہاں صاف میدان تھا اب وہاں برف کے تودے کھڑے تھے۔ جن جگہوں پر گڑھے تھے ان پر برف کی جھلی آ گئی تھی۔ اگر کوئی غلطی سے اس پر چڑھ جاتا تو چشم زدن میں اندر جا گرتا۔ ان میں سے بعض گڑھے تو سیکڑوں فٹ گہرے اور اندر سے غار کی طرح وسیع تھے۔ ان خوفناک برفانی گڑھوں سے بچنا بے حد ضروری تھا۔ جو قدم قدم پر تھے انہیں آگے سفر بھی کرنا تھا۔ رکنا یا واپس جانا ان کی حمیت کو گوارا نہیں تھا۔ ابھی انہیں سفر کرتے ہوئے چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ بے پناہ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ ان میں اتنی زیادہ شدت تھی کہ سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ڈھکے ہونے کے باوجود ان کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ ان ہواؤں کا اثر آنکھوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ جب یہ ہوا آنکھوں پر لگتی تھی تو سامنے کی خون کی نالیوں میں خون جمنے سے عارضی طور پر بینائی ختم ہو جاتی تھی اور ایسی حالت میں برفانی گڑھوں کو بھی عبور کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا ویرمز نے مشورہ دیا۔
''ہمیں عارضی طور پر کیمپ لگا لینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ہم کسی حادثے کا شکار ہو جائیں۔''
نیس نے اس کی تائید کی تو میسن کو رکنے کا فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ انہوں نے خیمے لگا لیے اور یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے ان کے اندر روپوش ہو گئے۔ ہوائیں مزید چھتیس گھنٹے چلتی رہی تھیں۔ بالآخر ان کی شدت میں کمی آنے لگی۔ اسی دوران میں انہوں نے جی بھر کر گوشت کے کھانے کھائے، کافی اور چاکلیٹ پی۔ ایک دوسرے کو اپنی سابقہ مہمات کے قصے سنائے۔ وہ اپنے ساتھ کتابیں بھی لائے تھے، لیمپ کی روشنی میں ان کا مطالعہ کرتے رہے اور پھر آگے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔
جلد برفانی گڑھوں کا علاقہ ختم ہو گیا۔ اب وہ پانی کی منجمد جھیلوں پر سفر کر رہے تھے۔ پورے انٹارکٹیکا میں جا بہ جا ایسی جھیلیں ملتی ہیں۔ جن کا پانی اوپر سے جم جاتا ہے لیکن ان کی تہہ میں رواں پانی ہوتا ہے اور حیران کن طور پر اس پانی میں آبی حیات بھی پائی جاتی ہے۔ ماہرین حیران ہیں کہ صفر درجۂ حرارت سے کئی درجے کم اس پانی میں کوئی جاندار کیسے رہ سکتا ہے۔ ان جھیلوں کی اوپری سطح ہموار تھی لہٰذا ان پر نسبتاً تیزی سے سفر بھی ممکن تھا۔ خطرے کی صرف ایک بات تھی۔ زیرزمین پانی جب اوپر کی طرف دباؤ اچھالتا تو جھیل کی منجمد سطح پر شگاف پڑ جاتے اور یہ شگاف اتنے اچانک نمودار ہوتے تھے کہ ان پر سفر کرنے والوں کو بعض اوقات پتا ہی نہیں چلتا اور وہ شگاف میں گر جاتے۔ شگاف سے تازہ پانی ابل پڑتا تھا اور فوراً ہی جم کر اس شگاف کو پر کر دیتا تھا۔ اس سارے عمل میں بعض اوقات نصف گھنٹا بھی نہیں لگتا مگر بعض اوقات کئی کئی دن پانی ابلتا رہتا۔ جس سے جھیل کی سطح پر گلیشئر بن جاتے تھے اور پھر یہ گلیشئر رفتہ رفتہ سمندر کی طرف سرکتے رہتے تھے۔
سو میل کے فاصلے تک پھیلی جھیلیں عبور کرنے کے بعد اگلا مرحلہ تہہ در تہہ پہاڑوں کی صورت میں سامنے آیا۔ کسی زمانے میں آتش فشاں سے یہ پہاڑ وجود میں آ گئے تھے۔ سخت سردی کے باعث ان کا لاوا باہر آتے ہی منجمد ہو جاتا تھا اس لیے تہہ در تہہ پہاڑ بن گئے تھے۔ ان پر پھسلوان برف تھی۔ جو ذرا سی تحریک یا آواز سے پھسل جاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں ٹن برف اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے وادی میں آ گرتی۔
''ہمیں بے حد احتیاط سے یہ علاقہ عبور کرنا ہوگا۔''
میسن نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''دوستوں کم سے کم آواز پیدا کرنا اور کتوں کے منہ باندھ دو۔''
انہوں نے کتوں کو اچھی طرح کھلا پلا کر ان کے منہ بند کر دیے تھے اس کے بعد وہ آگے روانہ ہوئے۔ یہ سفر کے اصولوں کے خلاف تھا۔ کتوں کو ہمیشہ سفر کے اختتام پر رات دیا جاتا ہے کیوں کہ کھانے کے بعد کتوں سے مشقت نہیں لی جا سکتی ہے وہ سست ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کتوں کو کھلا کر وہ آگے روانہ ہوئے تو ان کی رفتار بہت سست تھی۔ یوں لگ رہا تھا وہ ان تہہ دار پہاڑوں پر رینگ رہے ہیں۔ اونچی نیچی سطح کے باعث ان پر سلیج کھینچنا کتوں کے لیے اور بھی دشوار ہو رہا تھا لیکن انہوں نے اس دن کے آخر تک کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ بھی عبور کر لیا لیکن اسی دوران میں وہ اس قدر تھک گئے

تھے کہ انہوں نے اگلا پورا دن خیموں میں آرام کر کے گزارا تھا۔ اس کے بعد پہاڑوں کی دوسری طرف واقع وادی میں اترنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس بار ان کی رفتار پہلے سے تیز تھی۔

وادی ایک طویل میدان کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب برف کے دیوار نما پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ یہ کم سے کم نوے میل طویل وادی تھی۔ ڈاکٹر میسن اور ان کے ساتھیوں نے اپنی زندگی میں اتنی لمبی وادی اور کوئی نہیں دیکھی تھی۔ یہ ان کے سفر کا سب سے آسان مرحلہ تھا۔ وادی کی برف نرم اور ہموار تھی۔ اس کے نیچے پوشیدہ غار بھی نہیں تھے۔ نوّے میل کا فاصلہ محض روانی میں طے ہو گیا لیکن وادی ختم ہوتے ہی سفر کا سب سے مشکل مرحلہ آ گیا۔ اس جگہ برف کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ بعض مقامات پر برف اس قدر نرم تھی کہ ان کے پیر رانوں تک اس میں دھنس جاتے تھے اور بعض جگہوں پر اتنی سخت کہ ان کی کدالیں برف توڑنے میں ناکام رہتی تھیں۔

آخر کار سفر کے چونتیسویں دن وہ ایڈلانی جزیرے سے تین سو پندرہ میل دور براعظم انٹارکٹیکا کے ایسے مقام پر پہنچے جہاں اس سے پہلے کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ اس اجاڑ اور ویران جگہ کو انہوں نے میسن پوائنٹ کا نام دیا اور وہاں پر آسٹریلیا اور سوئٹزرلینڈ کے پرچم لگائے۔ اس کے بعد انہوں نے اب تک کے سفر کو ایک نقشے کی صورت میں ڈھالا۔ سروے کا کام مکمل کیا اور واپسی کے سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

ان کی خوراک کا ذخیرہ نصف سے کچھ زیادہ باقی تھا۔ ان کے سارے کتے صحت مند تھے۔ ان کی خوراک بھی وافر مقدار میں تھی۔ ایندھن اور خوراک کا وزن کم ہونے سے ان کا واپسی کا سفر بھی آسان ہو جاتا مگر پہلا مسئلہ اس وقت سامنے آیا جب ایک سلیج شکستہ پائی گئی۔ اب اس پر مزید سفر ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا اس کا سامان بھی انہوں نے باقی دو گاڑیوں پر منتقل کر دیا۔ احتیاطاً انہوں نے خوراک کا بڑا ذخیرہ اور خیمے اور کمبل پچھلی گاڑی میں رکھے تھے اور سائنسی آلات اور دیگر سامان اگلی گاڑی میں تاکہ اگر راستے میں اچانک کوئی برفانی گڑھا آ جائے تو اس کے پاس کم از کم خوراک اور خیمے تو بچ جائیں۔ وہ تدبیر کر رہے تھے اور تقدیر ان پر مسکرا رہی تھی۔

واپسی کے سفر میں ویرمرز کی ذمے داری تھی کہ وہ آگے سفر کرے اور ان کی رہنمائی کرے۔ واپسی کے لیے انہوں نے ایک دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ علاقے کا سروے اور نقشہ سازی کا کام مکمل کیا جا سکے۔ انہوں نے اس بار سفر کے لیے ایک نرم برفانی میدان کا انتخاب کیا۔ جہاں بہ ظاہر کوئی گڑھا یا پوشیدہ غار نہ تھا۔ سب سے آگے ویرمرز اپنی اسکیٹنگ کے تختے پیروں میں باندھے چل رہا تھا۔ اس کے عقب میں دس گز کے فاصلے پر ڈاکٹر میسن پہلی کتا گاڑی چلا رہا تھا۔ جسے سات کتے کھینچ رہے تھے۔ خوشگوار موسم میں کتوں کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ سب سے عقب میں لیفٹیننٹ نینس بڑی گاڑی لیے چلا آ رہا تھا۔ اس کی سلیج کو نو کتے کھینچ رہے تھے۔ لیفٹیننٹ نینس جب موڈ میں ہوتا تھا تو بلند آواز میں گانا گانے لگتا تھا۔ اس کے گانے اس ویران اور خاموش ماحول میں زندگی بھر دیا کرتے تھے۔

چار روز تک آرام سے اور خوشگوار موسم سے لطف اٹھا کر سفر کرتے رہے تھے لیکن پانچویں روز پیش آنے والے بھیانک حادثے نے اس مہم کا رخ بدل کر اسے ایک المیہ بنا دیا۔ سہ پہر کے وقت ویرمرز سب سے آگے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر میسن اس کے عقب میں تھا اور سب سے پیچھے نینس ایک طربیہ گانا گاتا آ رہا تھا۔ یکایک ویرمرز اور میسن کو اس کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ وہ بوکھلا کر مڑے۔ ان کے سامنے بھیانک ترین منظر تھا۔ برف کی شفاف چادر یکایک پھٹ گئی تھی اور اس سے شفاف پانی ابل رہا تھا۔ لیفٹیننٹ نینس اس سے پیدا ہونے والے شگاف میں مع گاڑی اور کتوں کے گر گیا تھا۔ شگاف ہر لمحے وسیع اور طوالت میں بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ ویرمرز اور میسن بھی خطرے میں تھے۔ پہلے تو انسانی جبلت کے تحت وہ جان بچانے کے لیے آگے کی طرف بھاگے مگر پھر ان کے ضمیر نے ملامت کی۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے اس کے نیچے کوئی جھیل تھی۔ اس کے پانی کے دباؤ نے جھیل کی سطح توڑ دی تھی اور اس بات کا خطرہ تھا کہ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں بھی شگاف پڑ سکتا ہے۔ میسن ویرمرز سے کہا۔

''ہمیں اتنی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا ساتھی گڑھے میں گر گیا ہے لیکن ممکن ہے وہ زندہ ہو اور اسے ہماری مدد کی ضرورت ہو۔''

ویرمرز نے اس سے اتفاق کیا مگر شگاف کے مسلسل بڑھنے کی وجہ سے وہ اس کے کنارے نہیں جا پا رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے شگاف کئی سوفٹ چوڑا ہو گیا۔ خدا خدا کر کے شگاف نے پھیلنا بند کیا تو ویرمرز اور میسن اپنی کمروں سے

رسیاں باندھ کر شگاف کے کنارے تک آئے۔ آخر حصے میں وہ احتیاط سے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گئے تھے اور جب انہوں نے شگاف کے اندر جھانکا تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بلاشبہ کئی سوفٹ گہرا گڑھا تھا۔ جس کی تہہ تاریکی میں تھی البتہ کہیں کہیں پانی کی چمک محسوس ہو رہی تھی۔ نینس، گاڑی اور کتوں کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ گڑھا اتنا وسیع اور گہرا تھا کہ ایک کیا سینکڑوں انسان اور ہزاروں کتے بھی گر جاتے تو ان کا نام و نشان نہ ملتا اس کے باوجود انہوں نے چلا چلا کر نینس کو آوازیں دیں۔ اسی امید پر شاید وہ زندہ ہو اور جواب دے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ نینس یا تو مر چکا تھا یا پھر بے ہوش تھا اور اس کی بے ہوشی جلد ابدی نیند میں بدلنے والی تھی۔ اندر سے آنے والی واحد آواز کسی کتے کی تھی جو کراہ رہا تھا پھر یہ آواز بھی بند ہو گئی۔ اندر گرنے والا کوئی جاندار زندہ نہیں بچا تھا۔

کئی گھنٹے گزرنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ نینس زندہ نہیں ہے۔ وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ گڑھے کے کنارے سے ہٹ گئے۔ نینس ان کا دوست اور ہم سفر تھا۔ اس ویرانے میں وہ تین ہی انسان تھے اور اب دو باقی رہ گئے تھے انہوں نے سر جھکا کر خدا سے اپنے ساتھی کی مغفرت کی دعا مانگی اور بوجھل قدموں سے وہاں سے چل دیے۔ اسی علاقے میں حادثے اور سانحے اسی طرح اور اچانک رونما ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنے خوش اور مطمئن تھے اور اب ان کے پاس سوائے دکھ اور مایوسی کے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ خود ان کی زندہ سلامت واپسی بھی مشکوک ہو کر رہ گئی تھی۔ ایڈلانی جزیرہ جہاں ان کا بیس کیمپ تھا، اب بھی تین سو سے زیادہ میلوں کے فاصلے پر تھا اور ان کے پاس بہ مشکل ہفتے بھر کی خوراک تھی۔ انہوں نے عقبی گاڑی پر ساری ہی خوراک رکھ کر جو تدبیر کی تھی اسے تقدیر کے ایک ہی وار نے ناکام بنا دیا تھا۔ خوراک کے بغیر وہ یہ طویل سفر کس طرح کرتے اور اس حالت میں دشوار گزار برف زاروں کو کیوں کر عبور کرتے؟ یہ سوال رہ رہ کر ان کے ذہنوں میں آ رہا تھا۔

نہایت قلیل خوراک کے علاوہ ان کے پاس صرف ایک خیمہ رہ گیا تھا۔ دو اسکیٹنگ کے تختے اور سائنسی آلات تھے۔ کتوں کی خوراک بھی نہ ہونے کے برابر تھی اور کتوں کو خوراک نہ دی جاتی تو وہ چلنے اور گاڑی کا بوجھ کھینچنے کے قابل نہ رہتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تمام فالتو اور بھاری سامان پھینک دیں گے۔ انہوں نے اپنے سائنسی اور تحقیقاتی آلات وہیں چھوڑ دیے۔ اپنے پاس صرف ایک قطب نما اور ضروری مسودات رکھے۔ جن میں ان کی سروے رپورٹیں اور نقشے بھی تھے۔ یہی اس مہم میں ان کی محنت کا ثمر تھے۔ خوش قسمتی سے دو گرم سلیپنگ بیگز ایک چولہا اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل بچ گئی تھی۔

انہوں نے ہر ممکن تیزی سے سفر کا فیصلہ کیا۔ گاڑی پر بوجھ کم رکھنے کے لیے تاکہ کتے زیادہ رفتار سے سفر کر سکیں میسن اور ویرمرز باری باری اسکیٹنگ کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے سفر کرنے کی رفتار مایوس کن حد تک کم تھی۔ خوراک کی نپی تلی مقدار لینے کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے تھے اور کتے بھی اب ہمہ وقت بھوکے رہنے لگے تھے۔ تمام تر کفایت شعاری کے باوجود خوراک کا ذخیرہ ایک ہفتے میں ختم ہو گیا۔ جب انہوں نے خوراک کے آخری ذرے حلق سے اتارے تو ان کے چہروں پر مایوسی ناچ رہی تھی۔

''ابھی ہم اپنے بیس کیمپ سے ڈھائی سو میل کے فاصلے پر ہیں۔'' میسن نے حساب لگایا ''یہ فاصلہ کسی صورت ایک مہینے سے پہلے طے نہیں ہو سکتا۔''

''اور ایسی صورت حال میں تو ہم کبھی بھی واپس نہیں جا سکیں گے۔'' ویرمرز کے لہجے میں ایسی مایوسی تھی جس نے میسن کو بھی دہلا دیا تھا۔

''نہیں دوست'' اس نے عزم سے کہا ''ہم ضرور واپس جائیں گے اور زندہ واپس جائیں گے۔ بس حوصلہ برقرار رکھنے کی شرط ہے۔''

''ہمارے پاس خوراک ختم ہو گئی ہے۔ کتے بھی بھوکے ہیں۔ ان حالات میں پیدل سفر کر کے بیس کیمپ تک پہنچنا ناممکن ہے...... نہیں دوست موت ہمارا مقدر بن گئی ہے۔''

''سنو۔'' اچانک ڈاکٹر میسن کے ذہن میں خیال آیا۔ ابھی ہمارے پاس سات کتے ہیں۔ اگر ہم ایک کتا مار کر کھا لیں تو ہمارا کئی دن کا خوراک کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

یہ تجویز ویرمرز کے دل کو بھی لگی تھی۔ انہوں نے ایک کتے کو ہلاک کر کے اس کا سارا گوشت اور بھیجا اُبال کر رکھ لیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنتیں اور دوسرے اعضا بھی کھانے کے لیے رکھ لیے اور کھال، ہڈیاں اور پنجے دوسرے کتوں کو کھلا دیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی اور کتوں کی خوراک کا مسئلہ حل کر لیا۔ اگرچہ یہ دیرپا حل نہیں تھا مگر وہ بھوکے مرنے سے ضرور بچ گئے تھے۔ کتے کا گوشت بدمزہ بھی تھا اور ان کا جسم اس کا عادی بھی نہیں تھا۔ دونوں کی طبیعت خراب رہنے لگی۔

زندہ رہنے کے لیے انہوں نے اسے بادلِ نخواستہ قبول کیا تھا۔ دو روز بعد انہوں نے دوسرا کتا بھی کاٹ کھایا اور اس کے بچے کھچے حصے دوسرے کتوں کو کھلا دیے۔ یہ سلسلہ ایک ایک روز کے وقفے سے جاری رہا اور پہلا کتا مارنے کے پندرہ دن بعد انہوں نے آخری کتا بھی کھالیا اور اب ان کے پاس خوراک کے نام پر ایک ذرہ بھی نہیں رہا تھا اور اب کے پاس گاڑی کھینچنے کے لیے کوئی کتا بھی نہیں رہا تھا۔ انہیں بھوکے پیاسے رہ کر خود ہی سفر کرنا تھا اور اپنے ساتھ گاڑی کو بھی کھینچنا تھا۔ اس میں ان کا خیمہ اور سونے کے بیگ بھی تھے۔ جنہیں وہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے اور گاڑی کے بغیر لے جا بھی نہیں سکتے تھے۔

ہر گزرتے دن ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کتے کھانے کے بعد انہوں نے گاڑی بھی خود کھینچنا شروع کی تو ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ خوراک کی کمی اور سردی کی شدت سے پہلے ان کے بال جھڑ گئے۔ چہرے اور سر کی کھال پپڑیوں کی صورت میں اترنے لگی۔ اس کے بعد ان کے کپڑے پھٹنے لگے تو سرد ہواؤں نے ان کے جسم کی کھال بھی اتار دی اور جب سخت اونی کپڑے اندر سے نکل آنے والی نئی حساس کھال سے ٹکرائے تو درد کے مارے ان کی چیخیں نکل جاتی تھیں اور اوپر سے انہیں وزنی سلیج بھی گھسیٹنا پڑ رہی تھی۔

''ہم راستے میں ہی مر جائیں گے...... ہم کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔'' ویر مرز بار بار کہتا تھا۔

اور ڈاکٹر میسن اس کا حوصلہ بڑھاتا ''بس کچھ فاصلہ اور طے کرنا ہے پھر بیس کیمپ ہوگا۔ وہاں ہم جی بھر کر کھائیں گے اور خوب آرام کریں گے۔ وہاں ہمارے ساتھی ہوں گے اور پھر ہمیں جہاز لینے آئے گا۔ ہم واپس اپنے ملکوں کو جا سکیں گے۔''

مگر ویر مرز کی حالت ہر گزرتے دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بھوک، بے چارگی اور موت کے خوف نے اس کے ذہن پر شدید اثر ڈالا تھا۔ کبھی کبھار وہ ہذیان بکنے لگتا تھا۔ ایک روز اس نے خود کو کتے کی طرح گاڑی میں جوت لیا اور اسے چاروں ہاتھوں پیروں سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں اتنی توانائی بھی نہیں رہ گئی تھی کہ اس کام میں کامیاب ہوتا۔ ڈاکٹر میسن اس کی حالت دیکھ کر رو دیا تھا۔ وہ بہ مشکل اسے کھینچ کر خیمے تک لایا اور اسے اس کے سلیپنگ بیگ میں لٹا دیا۔ صبح اس کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی تو انہوں نے آگے کی طرف سفر شروع کیا۔ ویر مرز خود سے باتیں کرتے، ہنستے ، روتے چلا جا رہا تھا۔ ایک موقع پر ڈاکٹر میسن نے قطب نما دیکھنا چاہا تو یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ اس کی سوئی ہی ٹوٹ گئی ہے۔ اب نہ جانے یہ سوئی خود سے ٹوٹی تھی یا ویر مرز نے عالم دیوانگی میں توڑ دی تھی۔ قطب نما کے بغیر اس برفانی صحرا میں سفر کرنا بھٹک کر موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔

''یہ قطب نما کیسے ٹوٹا؟'' میسن نے غصے سے ویر مرز سے کہا۔

وہ تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے اپنی ننھی کدال برف پر ماری اور بولا ''ایسے ٹوٹ گیا۔''

ڈاکٹر میسن کو یقین ہو گیا کہ یہ اس کا کارنامہ تھا مگر وہ اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ اس ویرانے میں جہاں دور دور تک کسی دوسرے جاندار کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ اس کا واحد ساتھی تھا۔ ویر مرز کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ یہ خوب صورت جوان جو قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ اب اس کا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ داڑھی وحشیوں کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور سرخ آنکھوں سے دیوانگی جھانک رہی تھی۔ اس رات اس نے ہذیان کے عالم میں جرمن زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر میسن صرف اتنا سمجھ سکا کہ وہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا۔ اس عالم میں اس نے اپنا ہاتھ کھانے کی کوشش کی اور اپنی انگلی کاٹ کر باہر پھینک دی پھر اس پر غشی طاری ہو گئی اور صبح چار بجے اس سوئیس مہم جو کی روح اس دنیا سے پرواز کر گئی۔ ڈاکٹر میسن ایک دہشت کے عالم میں اس کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک اسے یقین نہیں آیا کہ اس جان لیوا حد تک ویران برف زار میں اس کا واحد ساتھی بھی اس سے بچھڑ گیا ہے۔ خیمے کے دروازے سے ہوا فراٹے بھر کر اندر آتی اور مرحوم مہم جو کو آخری سلام کرتی گزر جاتی۔

''میرے خدا اب میں کیا کروں گا؟'' اس کے منہ سے نکلا تھا۔

کوئی حادثہ یا سانحہ انسان کی ہمت وقتی طور پر تو توڑ سکتا ہے لیکن کسی انسان کو ہمیشہ کے لیے مایوس نہیں کر سکتا۔ نینس اور پھر ویر مرز کی موت نے عارضی طور پر ڈاکٹر میسن کو ضرور مایوس کیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ایک حوصلہ مند انسان تھا۔ ویر مرز کے مرتے وقت حالات نہایت خراب ہو چکے تھے۔ قطب نما کی سوئی ٹوٹ گئی تھی۔ گاڑی کو اکیلے کھینچنا اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ خوراک کے نام پر کتے کے گوشت کے چند ٹکڑے تھے۔ جن کا مجموعی وزن نصف پاؤنڈ بھی نہیں تھا۔ اس کا لباس پھٹ رہا تھا اور پھٹے حصوں

سے یخ بستہ ہوائیں اس کے جسم کو گلا رہی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے ویرمرز کا لباس اتار کر پہن لیا۔ اسی طرح دوہرا لباس ہونے سے سردی کا اثر کسی قدر کم ہو گیا مگر اس پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ کمزور صحت کے ساتھ صرف لباس کا وزن دس سیر سے زیادہ ہو تو سفر کرنا کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا اور پھر سفر بھی انٹارکٹیکا کا ہو۔

اس نے گاڑی سے زائد سامان اٹھا کر پھینک دیا اور صرف سونے کا خوابی تھیلا اور برف کھودنے والی چھوٹی سی کلہاڑی اپنے پاس رکھی تھی۔ جس کی ضرورت ہر قدم پر ہی پڑتی۔ اس کے بعد اس نے اکیلے ہی گاڑی کھینچنا شروع کر دی مگر جلد اس کے پیروں میں شدید درد ہونے لگا۔ ایک مرحلے پر بے چین ہو کر اس نے اپنے جوتے اتارے تو یہ دیکھ کر وہ مارے خوف کے لرز گیا تھا۔ اس کے تلوؤں کی کھال بھی جوتے کے ساتھ اتر آئی تھی۔ یہ کتے کی کھال کے بنے جوتے تھے۔ جن کے تلے موٹے چمڑے کے تھے۔ ان پر لگی کیلوں سے یخ ہوا مسلسل اس کے پیروں تک پہنچتی رہی تھی۔ سردی اور نمی نے مل کر اس کے تلوؤں کی کھال گلا دی تھی۔ نیچے سے نئی کھال نکل رہی تھی لیکن وہ بالکل کچی تھی اور اس پر ذرا سا زور ڈالا جاتا تو وہ پھٹ جاتی اور اسے سفر بھی کرنا تھا۔ رکنے کا مطلب سوائے موت کے کچھ نہیں تھا۔ اگر وہ ایک بار بیٹھ جاتا تو اس کا حوصلہ بھی جواب دے جاتا۔

اس نے اپنے پاس موجود کپڑوں کے چیتھڑوں سے پٹیاں پھاڑ کر اپنے پیروں پر باندھیں اور جوتے پہن کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی بھی اسی میل کا سفر باقی تھا۔ اس شام اس نے اپنے پاس موجود کتے کے گوشت کا آخری ٹکڑا بھی کھا لیا اور گاڑی میں ہی اپنے بیگ میں گھس کر سو گیا۔ اگلے روز اس کی حالت پہلے دنوں سے زیادہ خراب تھی۔ اس کی طبیعت مسلسل متلا رہی تھی۔ قدم قدم پر اسے چکر آتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنے بیگ میں گھس کر سو جائے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس صورت میں صرف صورِ اسرافیل کی آواز ہی اسے اٹھائے گی۔ سارے دن رینگنے کے بعد وہ اگلے بارہ گھنٹے اپنے بیگ میں سو کر گزارتا تھا۔ اس پر بھی جب سفر کرنے کا وقت آتا تو وہ بہ مشکل ہی خود کو باہر نکلنے اور آگے سفر کرنے پر آمادہ کر پاتا تھا۔ چار دنوں میں اس نے گرتے پڑتے بہ مشکل تیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس کی روزانہ سفر کرنے کی اوسط چھ میل تھی۔

اس وقت وہ گلیشئر کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ یہ تہہ در تہہ گلیشئر نہ صرف سفر کرنے میں بے حد مشکل تھے۔ ان پر سفوف کی طرح نرم برف تھی جس میں میسن کے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک دھنس جاتے تھے۔ اس خستہ حالی میں ایسا سفر اس کے لیے اور بھی عذاب بن گیا تھا۔ بھوک اور تھکن نے اسے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بہ مشکل سو گز کا فاصلہ طے کرتا اور برف پر لیٹ جاتا۔ آدھے پونے گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہی اس کی حالت اس قابل ہوتی تھی کہ وہ آگے سفر کر سکے۔ اب صرف پچاس میل کا فاصلہ باقی تھا لیکن یہ پچاس میل اسے پچاس ہزار میل کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

بعض اوقات وہ ایک ذہنی کیفیت میں چلا جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اپنی یونیورسٹی کے گھر کے باغیچے میں ٹہل رہا ہے۔ اس وقت وہ ان خطرات کو بھی فراموش کر دیتا تھا جو برفانی گڑھوں کی صورت میں ان گلیشئروں میں جا بہ جا بکھرے تھے۔ بس ایک قدم رکھنے کی دیر ہوتی تھی اور انسان سینکڑوں فٹ گہری برفانی قبر میں دفن ہو کر رہ جاتا۔ اس کیفیت میں وہ خاصا فاصلہ طے کر جاتا۔ ورنہ ہوش و حواس میں تو اسے ایک قدم چلنا بھی محال لگتا تھا۔ آخری پچاس میل کا لفظ رہ رہ کر اس کے ذہن سے ٹکرا رہا تھا۔

ویرمرز کی موت کے دسویں دن اس نے کسی نہ کسی طرح اس دشوار گزار گلیشئرز کے علاقے کو عبور کر ہی لیا۔ اسے حیرت تھی کہ اس نے بھوک اور بے سروسامانی کے عالم میں یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا۔ جب کہ ان گلیشئرز میں بے شمار پوشیدہ برفانی گڑھے بھی تھے۔ جن میں گر کر شاذ ہی کوئی زندہ بچتا ہے۔ اب اس کے سامنے ایک طویل اور ہموار میدان پھیلا تھا۔ جو کسی قدر ڈھلان کی صورت میں تھا۔ اس پر سلیج کھینچنا بھی آسان تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ کئی دن بعد اسے پہلی بار یہ امید ہوئی تھی کہ وہ شاید بیس کیمپ تک پہنچ جائے۔ اس بار اس نے سلیج کھینچنے کے بجائے اسے پیچھے سے دھکیلنے کو ترجیح دی۔ ڈھلان پر یہ کام آسان بھی تھا اور یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ سلیج اسے پیچھے سے روند نہ دے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جہاں ڈھلان زیادہ ہو گی وہ وہاں پر اسکینر کی مدد سے سفر کرے گا۔ اس کی توانائی کم خرچ ہو گی۔ ویسے بھی اس کے جسم میں برائے نام ہی طاقت رہ گئی تھی۔

اس نے سلیج کو آگے دھکیلا اور خود اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اصولاً تو اسے خود کو سلیج سے بندھی رسی سے الگ کر لینا چاہیے تھا کیوں کہ اب سلیج آگے تھی اگر وہ راہ میں آنے والے کسی برفانی گڑھے میں گر جاتی تو اسے بھی اپنے ساتھ ہی کھینچ کر لے جاتی مگر نہ جانے کیوں اس نے خود کو اس سے الگ نہیں کیا۔ شاید اسے خیال ہی نہیں آیا تھا یا پھر اس کی

چھٹی حس نے اسے آنے والے واقعے کے بارے میں خبردار کردیا تھا۔

اچانک اس کے پیروں تلے برف ٹوٹی اور وہ خلا میں گرنے لگا۔ وہ جس جگہ سے گزر رہا تھا۔ زمین وہاں سے اچانک ہی پھٹ گئی تھی۔ یہ تھی قسمت۔ وہ برفانی گڑھوں کے علاقے سے تو زندہ سلامت بچ کر نکل آیا تھا مگر اس سیدھے سیدھے ہموار میدان میں ایک گڑھا اس کے لیے جال بچھائے ہوئے تھا۔ نیچے گرتے ہوئے اس کے جسم کو اتنا شدید جھٹکا لگا کہ چند لمحے کے لیے اس کے حواس ہی کھو گئے تھے۔ جب اس کے ہوش ذرا بجا ہوئے تو اس نے خود کو رسی کے سہارے اسی خلا میں لٹکے پایا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

ڈاکٹر میسن نے نیچے دیکھا تو اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ وہ جس گڑھے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کی تہہ کم سے کم بھی ستر فٹ نیچے تھی اگر وہ اس میں گر جاتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی اور بالفرض محال، اسے کوئی نقصان نہ بھی ہوتا تب بھی اس کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ گڑھے سے نکل جاتا اور نہ ہی اس سے باہر جانے کا کوئی راستہ تھا پھر ڈاکٹر نے اوپر کا جائزہ لیا۔ رسّی کا دوسرا سرا سلیج سے بندھا تھا جس کی لکڑی کے اسکینر کنارے سے جھانک رہے تھے۔ اگر گاڑی ذرا سی ڈھلان پر نہ کھڑی ہوتی تو اب تک وہ بھی لڑھک کر اندر آ گرتی اور وہ دونوں ہمیشہ کے لیے برف میں دفن ہو جاتے۔

صورتِ حال اتنی خوفناک تھی کہ شدت کی سردی میں بھی ڈاکٹر میسن کو پسینہ آ گیا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ وہ چودہ فٹ کی گہرائی میں لٹکا تھا۔ رسا بے حد مضبوط تھا اس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا خطرہ تھا کہ گاڑی اندر آ گرے گی۔ سوائے اس کے کہ وہ کنارہ ہی ٹوٹ جائے جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پہلے ہی رسے میں گرہیں لگا دیں تھیں تاکہ اس پر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اگر وہ صحت مند ہوتا اور اس کے پیٹ میں بھوک کی شدت سے بل نہ پڑ رہے ہوتے تو وہ ایک منٹ سے پہلے اوپر پہنچ جاتا مگر اس حالت میں جب کہ پانچ دن سے اس کے منہ میں کچھ نہیں گیا تھا، اس کے ناتواں جسم میں سکت نام کی کوئی چیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اس حالت میں اسے چودہ فٹ چڑھنا کوہ ہمالیہ پر چڑھنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار کوشش کی لیکن اس کے ناتواں ہاتھوں سے رسا ہی پھسل گیا تھا۔ وہ لرز کر رہ گیا تھا۔

''کیا بس یونہی لٹکے لٹکے مر جاؤں گا۔'' اس نے سوچا۔

مایوس کن سوچوں کے درمیان یکایک اس کی فطری ہمت عود آئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اتنی آسانی سے جان نہیں دے گا۔ اس نے ایک نظر اوپر کی طرف دیکھا اور انچ انچ کر کے اوپر کی طرف چڑھنے لگا۔ اس کی انگلیاں رسی کی گرہوں پر خوب جم رہی تھیں مگر اس محنت نے ذرا سی دیر میں اس کا سانس قابو سے باہر کر دیا تھا پھر تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ہر ایک گرہ عبور کرنے کے بعد اسے سانس بحال کرنے کے لیے رکنا پڑتا تھا اور سانس درست کرنے میں دس پندرہ منٹ لگ جاتے تھے۔ تب کہیں جا کر وہ فٹ بھر اوپر دوسری گرہ پر چڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ چودہ فٹ کا یہ فاصلہ اس نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کیا تھا اور اب صرف چھ انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے یک دم بے صبری دکھائی اور رسا ہاتھ سے چھوڑ کر گاڑی کی نکلی ہوئی اسکینر تھامنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ خلا میں لہرا کر رہ گیا اور اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ چودہ فٹ کی گہرائی میں لٹکا ہوا تھا۔

زبردست جھٹکے نے اس کی کمر کو ہی نہیں بلکہ دل ودماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ مایوسی سے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو اور وہ یوں بے کسی کی حالت میں لٹکا ہوا مرنے والا ہو۔ اس کی رونئیں رونئیں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا اور پورا جسم اکڑ رہا تھا۔ اچانک اسے لگا وہ زندگی کی جنگ ہار گیا ہے۔ مایوسی کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ وہ خودکشی کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اس نے رسی کاٹ کر خود کو کھائی میں گرانے کا فیصلہ کیا مگر چاقو کی تلاش میں جیب میں ہاتھ ڈالا تو چاقو غائب پایا۔ قدرت کو اس کی فوری موت بھی منظور نہیں تھی۔ اس کا اس طرح تڑپ تڑپ کر مرنا منظور تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی طرح لٹکا رہا۔ کمر پر بندھی رسی کی گرہ بھی اتنی سخت ہو گئی تھی کہ خالی ہاتھ سے کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''مجھے اتنی آسانی سے ہار نہیں ماننی چاہیے۔'' اس نے سوچا تو اسے اپنے جسم میں حوصلے کی نئی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی ساری قوت کو جمع کیا اور ایک ایک انچ بھر اوپر کی طرف سرکنے لگا۔ وہ جانتا تھا اس کی توانائیوں کی یہ آخری حد ہے۔ اگر اس نے اس بار احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑا تو پھر کبھی اوپر نہیں جا سکے گا۔ ہر بار جب وہ ایک گرہ سرکر لیتا تو کئی کئی منٹ اس سے چمٹ کر اپنا سانس درست

کرتا رہتا تھا۔ تب ہی دوبارہ اوپر کی طرف چڑھتا تھا۔ ایک ناقابلِ بیان اور ناقابلِ یقین جدوجہد کے بعد وہ بالآخر کنارے تک جا پہنچا۔ اب گاڑی سے نکلا تختہ اس سے فٹ بھر کے فاصلے پر تھا۔ اس کے لیے یہ ایک فٹ زندگی اور موت کا فاصلہ بن گیا تھا۔ اس نے دل میں خدا سے دعا مانگی کہ کاش وہ اس ایک فٹ کے فاصلے کو طے کر سکے اور اس کھائی سے نکل جائے۔ آخری مرحلے کے لیے اس نے جیسے ہی ہاتھ اوپر کیا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ذرا سا کھائی کی طرف جھکی۔ وہ لرز کر رک گیا۔ اسے لگا اس نے دوبارہ حرکت کی تو گاڑی اس کو لیتی کھائی میں گر جائے گی۔ ڈر کے مارے اس نے خاصی دیر حرکت ہی نہیں کی تھی مگر کب تک...... آخر اس نے دوبارہ ہمت کی اور لکڑی کے تختے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اگر اسے اس وقت دنیا بھر کا سونا اور ہیرے جواہرات بھی پیش کر دیے جاتے تو وہ سوائے اس لکڑی کے تختے کے کچھ نہ قبول کرتا۔

اس نے لرزتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس تختے کو یک دم پکڑ لیا۔ اس نے دونوں پیر کنارے پر جمائے اور تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ مارے خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کتنی دیر تک وہ برف پر لیٹا ستاتا رہا اور خود کو یقین دلاتا رہا کہ وہ موت کی گرفت سے نکل آیا ہے۔ جب اس کی خوشی میں ذرا کمی آئی تو اسے آنے والے سفر کی صعوبتوں کا احساس ہوا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر گاڑی سنبھالی اور اسے دھکیلتا ہوا آگے روانہ ہو گیا۔

اب بھوک اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ برفانی علاقوں میں معدہ ویسے ہی ہمہ وقت خوراک طلب کرتا رہتا ہے۔ سردی کی شدت اور محنت مشقت کی وجہ سے جسم زیادہ توانائی مانگتا ہے اور ان کی مہم تو ویسے ہی حد سے زیادہ محنت طلب تھی۔ جب ان کے پاس وافر خوراک تھی تو وہ معمول کے دنوں سے دگنی سے بھی زیادہ خوراک کھا جاتے تھے اس کے باوجود ان کے معدے ہر وقت مزید مزید کی صدا لگاتے رہتے تھے۔ اس حالت میں جب کہ ڈاکٹر میسن نے پورے ہفتے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس کی بھوک کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخری دو دنوں میں اس کی جسمانی حالت بے حد تیزی سے بگڑی تھی۔ ناتوانی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ دو قدم چل کر اسے دو منٹ تک ستانا پڑتا تھا اور پھر قدم قدم پر ہی اسے رک کر اپنی سانس درست کرنا پڑتی تھی۔ پورے دن میں بارہ گھنٹے چل کر وہ صرف چار میل کا فاصلہ طے کر پایا تھا۔ یہ اتنی مسافت ہے کہ ایک آدمی چہل قدمی کرتے ہوئے اسے ایک سوا گھنٹے میں با آسانی طے کر لیتا ہے۔ اب وہ صرف قوت ارادی کے بل بوتے پر چل رہا تھا۔

خوش قسمتی کا پہلا نشان اسے ایک تھیلے کی صورت میں نظر آیا۔ اس میں چار پونڈ کچا گوشت تھا اور یہ تھیلا جاتے ہوئے ان کی گاڑی سے گر گیا تھا اور حیرت انگیز طور پر ستر دن سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک برف میں نہیں دبا تھا۔ قدرت نے یہ انتظام اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اس نے گوشت دیکھ کر بے صبری کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اس گوشت کو تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے حلق سے اتارا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے اپنے بھوک سے کمزور معدے پر ایک دم ہی دباؤ ڈالا تو اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس روز کھانے کے بعد پہلی بار اس نے اپنے سفر کے دنوں کا حساب لگایا تو وہ لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ وہ اسی دن سے بھی دس دن آگے تھا۔ جس روز جہاز اسے اور اس کے ساتھیوں کو واپس لے جانے کے لیے آنے والا تھا۔ یعنی اس روز 25 جنوری کی تاریخ تھی اس کا دل یک لخت مایوسی میں ڈوب گیا۔ کیا اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر واپس چلے گئے ہوں گے؟''

''نہیں۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ ''انہوں نے میرا انتظار کیا ہوگا۔ وہ مجھے اس ویرانے میں بے یار و مددگار مرنے کے لیے نہیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔

ابھی تیس میل کا سفر باقی تھا اور اس کے پاس صرف دو پونڈ گوشت باقی رہ گیا تھا۔ اگر وہ چار دن میں بھی اتنا سفر طے کر لیتا تب بھی یہ خوراک ناکافی تھا۔ بے حد کفایت شعاری سے کام لے کر وہ اسے مزید دو روز اور چلا سکتا تھا۔ حسب توقع دوسرے دن خوراک ختم ہو گئی اور اس کی منزل پندرہ میل کے فاصلے پر تھی بھوک کی شدت سے اس کا معدہ اتنی بلند آوازیں نکالتا تھا جسے وہ کانوں سے بہ خوبی سنتا۔ ایک بار پھر قدرت اس کی قوت ارادی کا امتحان لے رہی تھی۔ اگلے دو روز اس نے ایک خواب کی سی کیفیت میں سفر کرتے گزارے۔ اکثر اسے راتوں کو خواب میں دکھائی دیتا کہ اس کا جہاز اس کے ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا اور وہ اس وسیع و عریض برفانی براعظم میں اکیلا بھٹکتا پھر رہا ہے۔ کبھی کبھار تو خواب اتنا جاندار ہوتا تھا کہ اس کی آنکھ کھلنے کے باوجود بہت دیر تک اس کے سچ ہونے کا یقین رہتا تھا۔

29 جنوری کی شام وہ تھکن سے چور گاڑی کھینچے لیے جا رہا تھا کہ اس نے دور ایک سیاہ چیز دیکھی۔ اسے تعجب ہوا کہ اس سرزمین پر جہاں ہر شے برف سے سفید ہو رہی تھی یہ

سیاہ دھبا کہاں سے آ گیا پھر اسے خیال آیا کہ شاید یہ اس کے ساتھیوں نے اس کی رہنمائی کے لیے لگایا ہو۔ اس نے بے تابی سے اپنی گاڑی کو اس طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ وہ کئی گھنٹوں کی لگاتار محنت کے بعد اس کے پاس پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ ایک سیاہ کپڑا تھا جسے بانس کے سرے پر باندھ کر اسے برف میں گاڑ دیا گیا تھا۔ اس کے دامن میں ایک بڑا سا تھیلا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر میسن پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ یہ خوراک کا تھیلا تھا۔ ان کے سامان میں اس قسم کے تھیلے خوراک کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ تھیلے کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا۔ اس کے ساتھیوں نے یہ جھنڈا اسی امید پر یہاں لگایا تھا کہ شاید ڈاکٹر میسن اور اس کے ساتھی اس طرف آئیں اور خوراک کا تھیلا بھی ان کے لیے چھوڑا گیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اتنے دن میں ان کی خوراک لازماً ختم ہو گئی ہو گی۔ اہم بات یہ تھی کہ رقعہ اس دن صبح آٹھ بجے لکھا گیا تھا۔ گویا اس کے ساتھی اس روز وہاں موجود تھے۔

کتے کے بدمزہ گوشت نے اس کو جسمانی طور پر بیمار بھی کر دیا تھا۔ کتنے دن بعد اس نے تازہ خوراک دل بھر کر کھائی تھی اور خوب آرام کیا تھا۔ منزل قریب آتے دیکھ کر اس کا حوصلہ اور توانائیاں بڑھ گئی تھیں۔ اس سنگ میل سے اسے معلوم ہوا کہ وہ اب بھی ایڈلانی جزیرے سے 23 میل کے فاصلے پر ہے۔ تازہ خوراک اور آرام نے اس کی جسمانی قوتوں کی بحالی میں بڑی مدد دی تھی۔ تھیلے میں سولہ پونڈز کے قریب خوراک تھی اور وہ ایک ہی دن میں اس میں سے نصف سے زیادہ کھا گیا تھا۔ خوراک کے لیے بے تاب اس کے معدے نے حیرت انگیز طور کارکردگی دکھائی تھی۔ بعد میں اس نے ایک انٹرویو میں کہا۔

"مجھے یقین ہے اب میں چوبیس گھنٹے میں اتنی خوراک نہیں کھا سکتا اور کسی طرح کھا بھی لوں تو اسے ہرگز ہضم نہیں کرسکتا۔ یہ قدرت کا انعام تھا اس وقت میں نے وہ سب ہضم کر لیا تھا۔"

قدرت کی مہربانیاں اس پر جاری تھیں اس نے جس عزم و حوصلے کا ثبوت دیا تھا۔ لگتا تھا اس کا انعام اسے مل رہا ہے۔ اگلے روز اس نے سفر کا آغاز کیا تو ایک ایسے میدان میں جا پہنچا جہاں دور تک ہموار برف ہلکی سی ڈھلان کی صورت میں بچھی تھی اور پھر عقب سے چلتی تیز ہواؤں نے اس کی سلیج گاڑی کی اتنی رفتار سے دوڑایا کہ اسے رفتار کم کرنے کے لیے اس کے بریک استعمال کرنا پڑے تھے۔ اس نے اس روز چودہ میل کا فاصلہ بغیر چلے ہی طے کر لیا تھا اور اب اس کی منزل چند میل کے فاصلے پر رہ گئی تھی مگر اگلے روز جب اس نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا تو ہواؤں کے تیز جھکڑ برفانی طوفان میں بدل گئے۔ اسے اتنا موقع بھی نہیں ملا کہ کہیں سلیج باندھ کر خود کو محفوظ کر سکتا۔ ہوا کے تیز تھپیڑے گاڑی کو ادھر ادھر لڑھکاتے رہے۔ برف باری اتنی شدید تھی کہ چند فٹ سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے قطعی نہیں معلوم تھا کہ اس کا رخ کس طرف ہے۔ آگے کوئی گڑھا آ رہا تھا یا وہ کسی پہاڑ سے ٹکرا رہا تھا۔ اس کی گاڑی کی چول چول اس طوفان نے ہلا کر رکھ دی تھی۔ بے بسی کے عالم میں وہ اس کے ساتھ ساتھ لڑھکتا رہا۔ خوش قسمتی، جو سامنے نظر آ رہی تھی اس طوفان نے اسے یک دم غائب کر دیا تھا۔ اس نے خوراک کا تھیلا اپنی کمر سے باندھ لیا اور خود گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس نے رسے سے خود کو بھی آزاد کر لیا تھا لیکن سلیج کو ہاتھ سے تھامے رہا۔ چھتیس گھنٹے بعد یکم فروری کی سہ پہر یہ طوفان ختم ہوا تو ڈاکٹر میسن بھٹک کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔

مگر قسمت بدستور اس پر مہربان تھی۔ ڈاکٹر میسن اور

اس کے ساتھیوں کی تلاش میں بیس کیمپ سے جو امدادی جماعتیں روانہ کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک اس طرف بھی آئی تھی۔ اس نے یہاں ایک تہہ خانہ بنا کر اس میں تازہ پھلوں کا ذخیرہ کر دیا تھا جو بحری جہاز چند دن پہلے ہی لایا تھا۔ پھلوں کی خوشبو سے ڈاکٹر میسن نے برف میں پوشیدہ تہہ خانے کا سراغ لگا لیا۔ اس نے پورے تین مہینے بعد کسی تازہ پھل کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس کیا تھا۔ کھا پی کر اس نے آرام کیا۔ طوفان نے اس کے کمزور وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آرام نے از سر نو تازہ دم کر دیا۔ ان پھلوں سے ثابت ہو رہا تھا کہ انہیں لینے والا بحری جہاز آ چکا تھا اور اب اس کا جلد از جلد اپنے بیس کیمپ پہنچنا ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ اس کی واپسی سے مایوس ساتھی چلے جاتے اور وہ سچ مچ ویران براعظم میں اکیلا انسان رہ جاتا۔ وہ پُرامید تھا کہ وہ بیس کیمپ تک پہنچ جائے گا۔ اب صرف ایک دن کا سفر باقی رہ گیا تھا۔

اگلے روز قسمت ایک بار پھر پلٹا کھا گئی۔ اس نے سفر کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پھر برفانی طوفان آ گیا۔ اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ڈاکٹر میسن نے تہہ خانے میں پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔ اس کے پاس آلات نہیں تھے مگر اس نے اندازہ لگایا۔ باہر طوفانی ہواؤں کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹے سے زیادہ تھی۔ جس کے ساتھ سیر بھر وزنی برف کے گولے برس رہے تھے۔ وہ ایڈلائی جزیرے سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور طوفان کی وجہ سے باہر نکلنے سے قاصر تھا۔ طوفان مسلسل چھ روز تک جاری رہا اور وہ تہہ خانے میں رہنے پر مجبور رہا تھا۔ مایوسی کے اندھیرے میں امید کی بس ایک ہی کرن تھی کہ جس طوفان نے اسے روک رکھا ہے اسی طوفان نے اس کے ساتھیوں کو بھی بیس کیمپ میں محصور رکھا ہوگا۔

بے بسی کی حالت میں وہ پورے چھ دن اسی جگہ رکا رہا۔ اس دوران میں خوراک کا ذخیرہ بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا اور چھٹے دن اس کے پاس صرف چند سیب بچے تھے۔ جب طوفانی سیٹیوں کی آوازیں بند ہوئیں تو اس نے جان لیا کہ طوفان تھم چکا تھا۔ اس نے باہر جانے والا راستہ کھولا تو سامنے برف کی دیوار کو پایا۔ چھ روز سے جاری طوفان نے تہہ خانے پر منوں کے حساب سے برف لا کر ڈال دی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھ گیا کہ وہ اس تہہ خانے میں زندہ دفن ہو گیا تھا پھر اسے اپنی چھوٹی سی کدال یاد آئی جو اس پورے سفر میں بارہا اس کے کام آ رہی تھی۔ اس نے کدال سنبھالی اور برف کھودنے میں لگ گیا۔ اس کی خوشی کی حد نہ رہی جب دس منٹ بعد اس نے خود کو کھلی فضا میں پایا۔ ذرا سی محنت نے اس کی سانس بے ترتیب کر دی تھی لیکن وہ وقت ضائع کیے بغیر ایڈلائی کے بیس کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ پانچ میل اس نے امید و یاس کے پل پر ڈولتے ہوئے جس طرح طے کیے تھے یہ اس کا دل جانتا تھا۔ اگر اس کے ساتھی جہاز میں بیٹھ کر چلے گئے تو کہ اس ویران جگہ اس کے زندہ رہنے کی کوئی امید باقی نہ رہ جاتی۔ اس کے پاس ایک ہفتے کا سامان نہیں تھا۔ گرمی کے موسم میں یہ حال تھا کہ آئے روز ان برفانی طوفان آ رہے تھے اور درجۂ حرارت منفی بیس سے چالیس ڈگری فارن ہائیٹ رہتا تھا تو طویل سردیوں میں موسم کی شدت کا کیا عالم ہوتا۔

جب اس نے بیس کیمپ کی جگہ محض ایک خیمہ پایا تو اس کا دل جیسے رک گیا تھا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ برف پر گھٹنوں کے بل گر گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا مگر اسی لمحے اس کی نظر دور سے آتے کچھ آدمیوں پر پڑی۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا جب اس نے آنکھیں صاف کیں تو اسے یقین ہو گیا یہ اس کے ساتھی ہی تھے۔ اس نے چلا کر انہیں آواز دینا چاہی مگر اس کے حلق سے کوئی آواز ہی نہیں برآمد ہوئی تھی۔ بوکھلا کر وہ ان کی طرف دوڑا اور ان کے پاس جا کر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

ڈاکٹر میسن کے ساتھی اسے دیکھ کر دم بہ خود رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے ایک تباہ شدہ انسانی ڈھانچا تھا۔ جس کے جسم پر جلی ہوئی سیاہ کھال تھی۔ وہ کہیں سے بھی صحت مند اور خوش رو ڈاکٹر میسن نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر اسے اپنے کیمپ پہنچایا۔ جہاں تین دن بعد اسے ہوش آیا تھا۔ جب اس کی حالت ذرا سنبھلی تو اس نے انہیں اپنے سفر کی ہولناک روداد سنائی۔ نینس اور ویرمز کی موت کا ذکر کرتے ہوئے وہ رو دیا تھا۔ زندگی کا یقین ہوتے ہی اس نے بڑی تیزی سے صحت واپس حاصل کر لی تھی اور جب وہ فروری **1914** میں واپس آسٹریلیا پہنچا تو اس کے استقبال کے لیے ہزاروں لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس کی تحقیق اور شاندار مہم جوئی کی بنا پر شاہ انگلستان نے اسے ''نائٹ'' کا خطاب دیا تھا۔ بے شمار یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی ڈگریاں دیں۔ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

''ہم سونا چاندی نہیں لائے لیکن بنی نوع انسان کے لیے اپنی ہڈیوں کو راکھ کا تحفہ بنا کر لائے ہیں۔''

کاشف زبیر

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں رونما ہونے والا ایک اہم واقعہ خلیج کی جنگ تھی۔ اس جنگ کو اگر متحدہ عیسائی قوت کا حملہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ زیرِ نظر واقعہ ایک برطانوی فوجی کے عراق سے فرار کی روداد ہے۔ جو محض اپنی قوتِ ارادی کے بل پر عراق سے بچ نکلنے کی جدوجہد کرتا رہا۔ قارئین اسے صرف ایک مہم جوئی کا واقعہ سمجھ کر پڑھیں، کیونکہ اس میں ایک عیسائی فوجی کی جدوجہد ایک مُسلمان مُلک کے مقابلے میں ہے۔ اس داستان میں کئی مقام ایسے بھی آئیں گے جب آپ کو ہیرو سے نفرت محسوس ہوگی اور کئی مواقع پر آپ اسے سراہنے پر بھی مجبور ہو جائیں گے۔ یہ کہانی جون کی تون ہیرو کی اپنی زبانی پیش کی جا رہی ہے۔

خلیج کی جنگ میں عراق سے فرار ہونے والے ایک برطانوی کی رُوداد

میرا نام کرس ریان ہے۔ میں ۱۹۶۱ء میں انگلینڈ کے علاقے نیوکیسل کے قریب رولینڈز گل نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہیں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ گریجویشن کے بعد صرف ۲۳ سال کی عمر میں مجھے بائیسویں اسپیشل ائر سروس رجمنٹ میں کمیشن ملا اور اپنی کارکردگی کی بدولت میں اسنائپر ٹیم کا کمانڈر بن چکا تھا۔ جب میرے گروپ کو خلیج کے علاقے کی طرف روانگی کا حکم ملا۔

یہ رجمنٹ دشمن کی صفوں کے پیچھے ہیلی کاپٹروں اور ہوائی جہازوں سے اتر کر کارروائی کرتی تھی۔ مختصراً SAS کہلانے والی اس رجمنٹ کا قیام جنگ عظیم دوم میں افریقہ میں عمل میں آیا اور اس کے جوانوں نے نازی افواج کے عقب میں جاکر اسے شدید نقصان پہنچایا۔ یہ دراصل ایک گوریلا گروپ ہے جو دوبدو جنگ کے بجائے دشمن پر چھاپا مار کارروائی کرکے اس کے اسلحہ، رسد اور ایندھن کے دفاتر تباہ

کرتا ہے۔ آمدورفت کے راستے میں بارودی سرنگیں بچھاتا ہے۔ دشمن کی مواصلاتی لائنوں کو کاٹ دیتا ہے۔

خلیج میں دنیا بھر کی اقوام عراق کو اس کی جارحیت کی سزا دینے کے لیے امنڈ آئی تھیں۔ اتحادی افواج کی حکمت عملی تھی کہ کویت پر حملہ کرکے اسے عراق سے چھڑانے کے بجائے عراق پر حملہ کیا جائے (یہی امریکا اور اس کے اتحادیوں کا اصل مقصد تھا۔ مصنف) چنانچہ پندرہ جنوری ۱۹۹۱ء کی سرد ترین رات ہزاروں اتحادی طیاروں نے عراق پر یلغار کی اور سیکڑوں کروز میزائلوں کی مدد سے اس کے اہم نوعیت کے فوجی ٹھکانوں پر ضربات لگائی گئیں۔ اتحادیوں کو سب سے زیادہ خطرہ عراق بلیسٹک میزائلوں سے تھا۔ جن کی مار اسرائیل سے لے کر عمان تک تھی۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ عراقی میزائلوں کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ عراق کے پاس سیکڑوں کی تعداد میں اسکڈ میزائل، موبائل ٹرک تھے۔ جنہیں کہیں بھی لے جاکر چھپایا جاسکتا تھا۔ انہیں ڈھونڈنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اگلے ہی دن سے عراقیوں نے اپنے میزائلوں سے کام لینا شروع کردیا۔

جمعرات ۲۴ جنوری کی سرد اور تاریک رات میں ہمارے ائر بیس پر بڑی چہل پہل تھی۔ میرا گروپ جلدی جلدی کافی کے مگ ختم کررہا تھا کیونکہ ہماری روانگی قریب تھی۔ کافی ختم کرتے ہی ہم اپنے ہتھیار اور آلات سنبھالے ائر فیلڈ کی طرف دوڑے وہاں دو عدد بیل ہیلی کاپٹرز ہمارے منتظر تھے۔ ان کے چلتے پنکھوں سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے منتشر ہو رہے تھے۔ ہم جلدی سے کاپٹرز میں سوار ہوگئے۔ میرے ساتھ ہی گروپ کمانڈر رائنڈی مک ناب بیٹھا تھا۔

"ہماری منزل کہاں ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"شمالی عراق میں یہاں سے دو سو میل دور۔" مک ناب نے جواب دیا۔

تمام افراد کے سوار ہوتے ہی کاپٹرز پرواز کرگئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ بیل کاپٹرز کی حفاظت کے لیے دو عدد ہیریئر جیٹ طیارے بھی ساتھ تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہم شمالی عراق کے صحرا میں اتر گئے۔ ہمیں چھوڑتے ہی دونوں کاپٹرز واپس چلے گئے۔ ہمارے گروپ میں کل تیرہ افراد تھے۔ ہم نے ایک قریبی ٹیلے پر اپنے مورچے بنائے۔ ہمارا مشن کثیر المقاصد تھا۔ یعنی عراقیوں کی کمیونیکیشن لائنوں کو تباہ کرنا۔ ان کی فوجی نقل و حرکت کی اطلاع اپنے مرکز کو دینا لیکن ہمیں خصوصیت سے اسکڈ میزائل ٹرکس پر نظر رکھنے کی ہدایت ملی تھی۔ اتحادیوں کو شبہ تھا کہ عراق نے اپنی زیادہ اسکڈ موبائل اسی شمالی صحرا میں چھپا رکھی تھیں۔ جن سے اسرائیل پر میزائل پھینکے جارہے تھے (یہ حقیقت ہے کہ اتحادیوں نے جتنی سرگرمی اسرائیل کو اسکڈ میزائلوں سے بچانے کے لیے دکھائی۔ اس کا نصف بھی عرب شہروں کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں دکھائی)

سطح زمین سے تقریباً اسی فٹ بلند یہ ریتیلا ٹیلا ایک عراقی شاہراہ سے کچھ ہی دور تھا۔ ہم وہاں سے گزرنے والی ٹریفک کو رات میں دیکھنے کے لیے استعمال ہونے والی خصوصی عینک "نائٹ سائٹ" سے دیکھ رہے تھے۔ معاً میں چلایا۔ "اسکڈ بیٹری۔"

سامنے شاہراہ پر ایک دیوہیکل ٹرک نمودار ہوا۔ روسی ساختہ یہ ٹرک اسکڈ کے موبائل لانچر کو متحرک رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے پچھلے حصے میں چالیس فٹ لمبا اسکڈ میزائل ہمیں یہاں سے بھی صاف نظر آرہا تھا۔ معاً ٹرک کچے میں اتر گیا اور اس پر سوار عملہ سرگرم ہوگیا۔

"یہ میزائل فائر کرنے جارہے ہیں۔" مک ناب نے اضطراب سے کہا اور جلدی سے سامان میں بندھا ریڈیو نکالنے لگا۔ اس نے ریڈیو کا انٹینا بلند کیا اور بیس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس دوران میں ہم نے احتیاط سے ٹرک پر ایک لیزر رنگ فائر کیا۔ یہ مخصوص لیزر شعاع تھی۔ جو اپنے ہدف پر لگ کر ایک نشان ڈال دیتی تھی۔ بعد میں حملہ کرنے والے طیارے، یا ہیلی کاپٹر اس نشان کی مدد سے اپنے ہدف کو تلاش کرکے اسے تباہ کردیتے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں ٹرک میں لیزر وارننگ سسٹم نہ ہو۔ یوں عراقی ہماری موجودگی سے واقف ہوجاتے۔

"لعنت ہو۔" معاً مک ناب کی جھلائی ہوئی آواز آئی "یہ منحوس ریڈیو کام نہیں کررہا۔ فریکوئنسی میں گڑ بڑ آرہی ہے۔" ہمارے گروپ کے مکینک نے فوراً ریڈیو کا معائنہ کیا اور گڑ بڑ کی تصدیق کردی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم اپنے دستی ریڈیو "ٹاک بی" کی مدد سے کسی قریبی اڑتے طیارے کو پیغام روانہ کرتے۔ ٹاک بی کی رینج بہت محدود تھی اور ابھی ہم پیغام بھیجنے کی کوشش کررہے تھے کہ ٹرک کے عملے نے میزائل لانچر کو سیدھا کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساڑھے چھ ٹن وزنی اسکڈ اپنے پیچھے نارنجی شعلہ چھوڑتا آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگیا۔ ٹاک بی سے نشر کیا جانے والا پیغام کسی اتحادی طیارے نے تو نہیں سنا۔ مگر اس سے عراقی ہماری موجودگی سے ضرور واقف ہوگئے۔

رات گیارہ بجے کے قریب اچانک ایک عراقی رائفل کمپنی نے ہمارے ٹیلے پر حملہ کیا۔ وہ اسالٹ رائفلوں اور مشین گنوں سے بے تحاشا فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ حملہ کرنے کا روسی طریقہ تھا کہ دشمن کو بے پناہ فائرنگ پاور سے مرعوب کردو۔ خوش قسمتی سے ہم ایک محفوظ مقام پر تھے۔ جب عراقی بڑی حد تک قریب آگئے تو ہم نے جوابی کارروائی شروع کی۔ ہمارے پاس دو بھاری مشین گنوں کے علاوہ دو بھاری لانچر بھی تھے جو راکٹ دو ہزار میٹر تک فائر کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ دو سو تین فیلڈ رائفل تھی۔ یہ رائفل سنگل یا خود کار موڈ میں کام کرنے کے علاوہ گرنیڈ بھی فائر کرسکتی تھی۔

ہماری موثر فائرنگ اور راکٹ مارنے سے عراقی بد حواسی میں لاشیں اور زخمی چھوڑ کر پسپا ہونے لگے۔ ان کے جاتے ہی ہم نے اپنا سامان سمیٹا۔ ہمارے پاس ضروری آلات اور ایمونیشن کے علاوہ دس روز کا راشن بھی تھا۔ اس کے علاوہ پانی کی دو عدد ایک لیٹر والی بوتلیں بھی ہمارے پاس تھیں۔

بیس سے روانگی کے وقت کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا کہ عراق کا شمالی حصہ بے شک صحرا کا ایک حصہ ہے مگر سردیوں میں یہ سائبیریا بن جاتا ہے۔ لہٰذا ہم صرف اپنی گرم وردیوں میں چل پڑے تھے اور ہم میں سے کسی کے پاس جیکٹ نہیں تھی اور اب بے پناہ سردی ہمیں ٹھٹھرائے دے رہی تھی۔

"اس سے پہلے کہ عراقی دوبارہ آئیں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" مک ناب نے فیصلہ کیا۔

"کاش یہ ریڈیو ٹھیک ہوتا تو ہم بیس سے رابطہ کرسکتے تھے۔" میں نے سرد آہ بھری۔

اس صورت میں ہیلی کاپٹر آکر ہمیں وہاں سے لے جاتے۔ مگر اب ہمیں پیدل سفر کرنا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم کہاں جائیں۔ سعودی عرب یہاں سے ایک سو اسی میل دور تھا اور راستے میں جابجا عراقی دفاعی لائنیں تھیں۔ جن سے صحیح سلامت گزرنا تقریباً ناممکن تھا۔ دوسری طرف شام کی سرحد تھی۔ جو وہاں سے اسی میل کے فاصلے پر تھی اور وہاں عراقیوں سے سامنا ہونے کا امکان بھی کم تھا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ہم شام کی طرف جائیں گے۔

"سب ایک قطار میں ہوں گے۔" مک ناب نے ہدایت جاری کی "ہر آدمی دوسرے سے دس گز کے فاصلے پر رہے گا۔"

اندازہ تھا کہ اگر ہم رکے بغیر سفر کریں تو یہ فاصلہ تقریباً ستر گھنٹوں میں طے ہوسکتا تھا۔ اس میں دس، دس گھنٹے کے تین وقفے تھے۔ ہتھیار اور ایمونیشن ہم کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ مجبوراً ہم نے سوائے دو دن کے راشن کے باقی راشن وہیں چھوڑا اور آگے روانہ ہوگئے۔ روایت کے مطابق دشمن سرزمین پر مارچ کے دوران کمانڈر ہمیشہ درمیان میں ہوتا تھا۔ میرے پیچھے اینڈی اسٹان تھا اور ونس۔ اسٹان لمبا تڑنگا اور جسیم آسٹریلین تھا۔ جب کہ ونس دبلا پتلا مگر طویل قامت تھا۔ وہ پکا انگلش مین تھا۔ گروپ میں وہ میرا بہترین دوست تھا۔

ہم تقریباً دو میل چلے ہوں گے جب میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اسٹان اور ونس تو نظر آئے۔ مگر ان کے پیچھے باقی گروپ غائب تھا۔ دور تک پھیلا صاف صحرا کسی بھی چوتھے فرد سے خالی تھا۔ میں نے اسٹان سے پوچھا۔

"باقی پارٹی کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔" وہ بھی مجھ جتنا حیران تھا "ممکن ہے وہ راستہ بھٹک کر کہیں اور جا نکلے ہوں۔"

"میرے خدا!" میں کراہا۔ پریشانیاں ایک کے بعد ایک کرکے آرہی تھیں۔ اسی اثنا میں بے حد روشن چاند نکل آیا اور میلوں تک پھیلا صحرا روشن ہوگیا۔ مک ناب اور باقی افراد کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" ونس نے فکر مندی سے کہا "کیا انہیں جاکر تلاش کریں۔"

"ہرگز نہیں۔" ونس کی تجویز میں نے فوراً مسترد کردی "اب تک عراقی ہمارے تعاقب میں روانہ ہوچکے ہوں گے اور واپس جانا خود کو ان کے سامنے ڈال دینے کے برابر ہوگا۔ ویسے بھی ہم چھوٹا گروپ ہیں اور قواعد کے مطابق بڑا گروپ ہمیں تلاش کرے۔"

"گویا ہمیں آگے سفر جاری رکھنا چاہیے۔" اسٹان بولا۔

پھر ہم اس تجویز پر متفق ہوگئے۔ آگے روانہ ہونے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ بظاہر یہ ناممکن نظر آرہا تھا کہ اس ہموار جگہ پر کوئی گروپ راستہ بھٹک کر کہیں اور جا نکلے۔ میں نے کمپاس اور نقشے کی مدد سے اندازہ لگایا۔ ہم بالکل درست راستے پر گامزن تھے۔ ہمارا مقصد جنوب میں واقع دریا تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ جس کے پانی سے ہم نہ صرف اپنی پیاس بجھا سکتے تھے۔ بلکہ شام کی سرحد بھی وہاں سے کچھ ہی دور تھی۔ صبح پانچ بجے تک ہم خاصا فاصلہ طے کرچکے تھے SAS کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ تھا کہ دشمن سر زمین پر چاہے خفیہ ہوں یا ظاہر۔ کسی صورت میں بھی دن میں

نقل و حرکت نہیں کرنی۔ لہٰذا ہم سورج نکلنے سے پہلے کسی پناہ گاہ کی جستجو میں لگ گئے۔ تاریکی میں تو ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے جوتوں تلے کیا چیز کرکرا رہی ہے۔ مگر جب ذرا روشنی پھیلی تو ہم یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ یہ ریت نہیں بلکہ برف تھی۔ غالباً رات بھر گرنے والی اوس برف بن کر جم گئی تھی۔ بالآخر ہمیں عراقی فوج کی کھودی کچھ خندقیں مل ہی گئیں۔ ہم ان میں گھس گئے۔ سردی ہمارے مزاج پوچھ رہی تھی۔

جب ہم برطانیہ سے روانہ ہو رہے تھے تو ہمیں جزیرہ نما عرب کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہاں ہر طرف صحرا ہے جہاں ریت اڑتی ہے۔ دن میں شدید گرمی ہوتی ہے اور رات کسی قدر معتدل ہوتی ہے۔ دن میں شدید لو چلتی ہے اور یہ موسم سارے سال رہتا ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتایا کہ وہاں جنوری کے مہینے میں برف باری بھی ہوتی ہے۔ جب تک ہم چلتے رہے جسم کسی قدر گرم رہا لیکن جیسے ہی ہم خندقوں میں گھسے۔ سردی رفتہ رفتہ ہمارے رگ وپے میں سرایت کرنے لگی۔ مسلسل چلنے کی تھکن الگ تھی۔ ایک مسئلہ پیاس کا بھی تھا۔ میں نے سرد موسم کے باوجود بے صبری سے دونوں بوتلیں خالی کر دی تھیں۔ موسم سرد ہونے کے ساتھ بے پناہ خشک بھی تھا۔ اس لیے جلدی جلدی پیاس لگتی رہی تھی اور میں نے سارا پانی پی لیا۔ جب میں نے اپنی دیگر اشیا کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنا باقی ماندہ کھانا بھی کہیں گرا آیا تھا اور اب میرے پاس صرف دس کریکر بسکٹ تھے۔ بہت زیادہ غذائیت والے یہ بسکٹ ہمیں مخصوص حالت میں کھانے کے لیے دیے گئے تھے۔ جب کھانے کو کچھ اور میسر نہ ہو تو میں صرف دو بسکٹ کھا کر ایک وقت کے مکمل کھانے کے برابر غذائیت حاصل کر سکتا تھا۔

میں راستے بھر اپنے ٹاک بی پر مدد کے لیے چلاتا رہا تھا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے بیس والے ہمیں یہاں بھیج کر بھول گئے تھے۔ ہم ایک دشمن سرزمین پر اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے تھے۔ پانی ختم ہو چکا تھا اور درحقیقت ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم کہاں تھے لیکن سب سے سنگین مسئلہ ٹھنڈ تھی۔ جو ہماری گرم وردیوں سے چاقو کی طرح گزر کر ہمارے جسموں کو چبھ رہی تھی۔ انگلینڈ جیسے سرد ملک میں رہنے کے باوجود اس سے پہلے میں نے کبھی اتنے خوف ناک موسم کا سامنا نہیں کیا تھا۔ مگر میری حالت پھر بھی کسی قدر بہتر تھی۔ اسٹان اس موسم سے زیادہ ہی متاثر ہوا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ اس نے میرے قریب ہی خندق سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

"کرس، میں سونا چاہتا ہوں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا "میں بہت تھک گیا۔"

"اگر تم لیٹے اور سو گئے تو سردی سے اکڑ کر مر جاؤ گے۔" میں نے اسے خبردار کیا "ہماری عافیت اسی میں ہے کہ جاگتے رہیں۔"

سردی نے ہمیں اس حد تک بدحواس کر دیا تھا کہ ہمیں خاصی دیر تک ونس کی غیر موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا اور جب ہوا تو ہم نے باہر نکل کر دیکھا۔ مشرق سے ٹھٹھرا سورج نمودار ہو چکا تھا اور اس کی بے جان کرنوں کی روشنی میں ہمیں دور تک کسی کا سایہ تک نظر نہیں آیا۔

"میرے خدا! یہ احمق کہاں رہ گیا۔" میں بولا۔

اسٹان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہم واپس جا کر اسٹان کو دیکھیں۔ کسی قدر بحث کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم آدھے گھنٹے کی مسافت پر واپس جا کر ونس کو دیکھیں گے۔ ہم دوبارہ اپنے قدموں کے نشانات پر روانہ ہو گئے مگر نصف گھنٹے کے سفر کے بعد بھی ہمیں ونس نہیں ملا تو ہم واپس لوٹ آئے۔ یہ سارا دن ہم نے خندق میں چھپ کر گزارا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ کسی کی نگاہ ہمارے قدموں کے نشانات پر نہ پڑے۔ جو خاصی دور سے واضع نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہی سورج مغربی افق میں روپوش ہوا ہم نے راشن سے دو، دو بسکٹ کھائے اور چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پیاس لگ رہی تھی لیکن اس نے ابھی شدید صورت اختیار نہیں کی تھی۔ ونس کو بھول کر آگے جانے کا فیصلہ خاصا مشکل تھا اور ہم بوجھل دلوں کے ساتھ اپنے تھکے وجود کو گھسیٹتے آگے روانہ ہو گئے۔

سردیوں کی وجہ سے رات خاصی طویل ہوتی تھی اور دن مختصر۔ ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے اچھا ہی تھا۔ ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ رات بھر چلنے کے بعد جب سورج طلوع ہوا تو ہم بدستور برف والے علاقے میں تھے۔ غالباً ہم شمالی اور مشرقی عراق میں واقع سطح مرتفع پر سفر کر رہے تھے۔ سطح سمندر سے بلند ہونے کے باعث یہاں برف باری بھی ہوتی تھی۔ ہم نے رکنے کے بجائے اس وقت تک چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ جب تک کہ برف والا علاقہ ختم نہ ہو جائے۔ خدا خدا کر کے ہم بارہ بجے دوپہر اس برفانی جہنم سے نکل کر ایک وادی میں پہنچے۔ ہم نے یہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ سورج کی نرم گرم کرنیں ہمارے تھکے ہوئے وجود کو سہلا رہی تھیں۔ ہم ایک بلند ٹیلے پر ٹھہرے تھے جہاں سے ہم دور تک صاف دیکھ سکتے تھے۔ ہم سامان

کے بوجھ سے خود کو آزاد کر کے ستانے لگے۔ اسٹان فوراً سو گیا۔ میں بھی گزشتہ بیالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا اور نیند سے میرا برا حال تھا۔ مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ہم دونوں ہی سو جائیں۔ ہماری ایک لمحے کی غفلت ہمیں پکڑوا سکتی تھی۔

میری دور اندیشی کام آئی۔ چار بجے اس ٹیلے سے نیچے جس پر ہم تھے۔ ایک نوجوان آدمی آکر پتھر پر بیٹھ گیا اور وہاں لگی گھاس اکھیڑ اکھیڑ کر جمع کرنے لگا۔ میں نے جھنجھوڑ کر اسٹان کو جگایا اور نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے ہی اسٹان نے اس عرب جوان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”یہ کوئی کسان لگ رہا ہے۔“ اس نے سرگوشی میں کہا ”یہ شاید اپنے مویشیوں کے لیے گھاس جمع کر رہا ہے۔ اس نے گھاس لے جانے کے لیے یقیناً قریب ہی کوئی گاڑی کھڑی کر رکھی ہوگی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے الجھن سے کہا۔

”کرس، اگر ہم اس پر قابو پا کر اس کی گاڑی حاصل کرلیں تو بہت جلد سرحد تک پہنچ جائیں گے۔“

”اور ہمارے جانے کے بعد یہ جو ہمارے بارے میں سب کو بتائے گا۔ ہم سرحد تک جانے سے پہلے ہی پکڑے جائیں گے۔“

اسٹان چند لمحے سوچتا رہا ”ہم اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑیں گے کہ یہ کسی کو ہمارے بارے میں کچھ بتا سکے۔“

”تمہارا... مطلب ہے کہ ہم اسے...“

اسٹان نے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں یہ ہمارا دشمن ہے۔“

بے شک ہم دشمن سرزمین پر تھے اور یہاں موجود ہر شخص ہمارا دشمن تھا۔ ہم اسے یا وہ ہمیں قتل کرسکتا تھا مگر اس کے باوجود ایک نہتے اور ایسے شخص پر جو براہ راست جنگ میں شریک نہیں تھا۔ اسے قتل کرنے پر میرا ضمیر آمادہ نہیں تھا۔

”نہیں ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

اسٹان کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔ میرے سینئر ہونے کی وجہ سے وہ میرے حکم کا پابند تھا ”چلو ٹھیک ہے ہم اسے گرفتار کرلیں گے اور ساتھ ہی لے جائیں گے اور پھر کسی مناسب مقام پر چھوڑ دیں گے۔“

یہ تجویز قابل غور تھی۔ ہمارا جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا ہی ہمارے مفاد میں تھا اور اس مقصد کے لیے کوئی گاڑی خاص طور سے ٹریکٹر بہت مفید ہوسکتا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ اس کسان کے پاس کوئی ٹریکٹر ہی ہوگا۔

میری رضامندی پاکر اسٹان دبے قدموں ٹیلے سے اترنے لگا۔ میں اپنی رائفل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اگر اسٹان الٹا اس کے قابو میں آجاتا تو میں اسے چھڑا تو سکتا تھا۔ مناسب فاصلے پر جاتے ہی اسٹان نے اس پر چھلانگ لگائی اور نیک لاک لگا کر اسے قابو کرلیا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا مگر اسٹان کی گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نظر نہیں آتی تھی۔ میں دوڑ کر نیچے پہنچا۔ مجھے ہتھیار بدست دیکھ کر اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔

”یو اسپیک انگلش؟“ میں نے پوچھا۔

”ویری لٹل۔“ اس نے ہراساں نظروں سے مجھے دیکھا۔ میرے اشارے پر اسٹان نے اسے چھوڑ دیا۔

”یو آر امریکی۔“ اس نے پوچھا۔

میں نے اس کا سوال نظرانداز کرکے اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس کوئی گاڑی ہے۔ اس نے بھی غالباً اندازہ لگالیا تھا کہ ہم اتحادی افواج سے تعلق رکھتے تھے اور عراق سے فرار ہورہے تھے۔ اس بنا پر ہمیں گاڑی کی تلاش تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا ”گاڑی تو ہے لیکن میرے فارم پر کھڑی ہے۔“

”فارم کتنی دور ہے؟“ اسٹان نے پوچھا۔

”دو میل دور۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا ”تم اتنی دور سے یہاں پیدل آئے ہو؟“

اس نے شانے اچکائے ”مجبوری ہے۔ یہاں تک گاڑی نہیں آسکتی۔“

میں اس کی بات کا قائل ہوگیا۔ واقعی اس وادی میں کسی گاڑی کا آنا دشوار تھا۔ میں نے اسٹان سے کہا کہ ہمیں گاڑی کا خیال ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ مگر وہ مصر رہا کہ ہمیں گاڑی ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ بادل ناخواستہ میں نے اسے عرب جوان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت ساڑھے پانچ بجے تھے۔

”میں ساڑھے چھ بجے تک تمہارا انتظار کروں اور اس کے بعد یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔“

اسٹان اس عرب جوان کو گن پوائنٹ پر لے کر اس کے فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہوگیا جو مغرب کی طرف کہیں واقع تھا۔ میں ایک بار پھر ٹیلے پر چڑھ گیا اور میں نے اپنے ہتھیار تیار کرلیے تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر عراقی مجھ

تک آن پہنچے تو بھی میں آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں وقفے وقفے سے گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے چھ بجے، پھر سوا چھ اور بالآخر ساڑھے چھ بج گئے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور دور مشرقی افق پر ستارے چمکنے لگے تھے۔ اشان کو گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ اگر وہ گاڑی نہیں حاصل کر سکا تھا تو بھی اسے اب تک واپس آجانا چاہیے تھا اور اس کے نہ آنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ پکڑا گیا تھا اور اب میں بھی خطرے میں تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں بھڑکے ہوئے جانور کی طرح چوکنا ہو گیا اور میں نے وہاں سے فوراً روانگی کا فیصلہ کیا۔

گزشتہ دو دن میں، میں اپنے گروپ سے علیحدگی کے بعد بھوک و پیاس کی مصیبت جھیلتا رہا تھا۔ سردی الگ پریشان کر رہی تھی اور اب میرا آخری ساتھی بھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ گویا اب مجھے جو کرنا تھا۔ اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ میں فوراً جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے اوپر تقریباً بیس کلو کا وزن تھا۔ رائفل، اس کے ایمونیشن اور گرینیڈز کے علاوہ میرے پاس ایک سادہ سا راکٹ لانچر بھی تھا اور اس کے چار راکٹ تھے۔ ایک نائٹ سائیٹ تھی، ایک فلیش لائٹ، چاقو، کمپاس اور علاقے کا مفصل نقشہ تھا۔ کھانے میں صرف چار بسکٹ اور پانی کی دو خالی بوتلیں تھیں۔ غالباً عام لوگوں کو حیرت ہوتی ہوگی کہ ایک شخص کھائے پیے اور سوئے بغیر مسلسل کتنا سفر کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن۔ لیکن SAS دنیا کی چند مشہور ترین کمانڈوز تنظیموں میں شامل ہے۔ اس میں شامل افراد کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے کڑی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ تربیت اس قدر سخت ہوتی ہے کہ عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے یہ عام سی بات تھی کہ ہفتے بھر تک جاگتے رہیں۔ مسلسل تین چار روز بھوکے پیاسے رہیں اور کئی دن تک پیدل چلتے رہیں۔ گرمی، سردی اور برسات ہر موسم میں ہم سفر کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ گزشتہ دو دن کے حالات میرے لیے سخت ہونے کے باوجود نئے نہیں تھے۔

معاً میرے پیچھے روشنی سی لہرائی۔ میں فوراً زمین پر گر گیا۔ یہ ہموار میدان تھا اور یہاں مجھے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں رینگ کر زمین میں بنے گڑھے میں چلا گیا۔ اب میں آنے والوں کی نگاہوں سے قدرے اوجھل تھا۔ یہ دو گاڑیاں تھیں اور اپنی ساخت کے اعتبار سے جیپیں نظر آرہی تھیں۔ نوے فی صد امکان یہی تھا کہ وہ عراقی فوجی تھے جو میری تلاش میں نکلے تھے۔

"شاید اشان پکڑا گیا ہے۔" میں نے سوچا "اور اس کے ساتھ جانے والے عرب نے مقامی حکام کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔"

سردی اور خوف سے میرا جسم لرز رہا تھا۔ اگر کوئی کہے کہ وہ ان لمحات میں خوف زدہ نہیں تھا تو میں اسے جھوٹا قرار دوں گا۔ دشمن سرزمین پر دشمنوں کی قربت کا احساس انسان پر جو خوف طاری کر سکتا ہے۔ وہی خوف مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں البتہ مجھے جو تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس خوف پر قابو پانے میں مدد دے رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے کٹ سے ایک راکٹ نکالا اور اسے لانچر میں فٹ کر لیا۔ جیپیں اب مجھ سے چار سو گز دور تھیں اور بدستور میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ راکٹ کی موثر حد پانچ سو گز تھی لیکن میں ان کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک تو نشانہ خطا نہ ہونے پائے اور دوسرے ان میں سے کوئی بچ نہ جائے۔ ممکن ہے گاڑی تباہ ہو جاتی لیکن اس میں سوار افراد بچ جاتے اور مجھے گھیر لیتے۔ اس کھلی جگہ میں میرے لیے اتنے افراد کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

جیسے ہی اگلی گاڑی میرے اندازے کے مطابق دو سو گز کی حد کے اندر آئی۔ میں نے اس کی ہیڈلائٹس کے درمیان نشانہ لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ راکٹ لانچر سے نکل کر تیر کی طرح گاڑی کی طرف لپکا۔ ایک دھماکا ہوا اور گاڑی رک گئی۔ اس کے اگلے حصے سے گہرا اور گاڑھا دھواں نکلنے لگا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر لانچر میں دوسرا راکٹ فٹ کیا اور لرزتے ہاتھوں سے ٹریگر ایک بار پھر دبا دیا۔ خوش قسمتی سے اس دفعہ بھی نشانہ درست بیٹھا۔ یہ گاڑی راکٹ لگنے سے الٹ گئی تھی اور اس میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ میں نے اپنی دو سو تین کو برسٹ موڈ پر سیٹ کیا اور اٹھ کر دوڑتے ہوئے پہلی جیپ پر گولیاں چلانے لگا۔ جیسے ہی ایک میگزین ختم ہوا۔ میں نے دوسرا میگزین گن میں ڈالا مگر فائرنگ نہیں کی کیونکہ ابھی تک کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ دونوں گاڑیوں کے تمام افراد مارے گئے تھے یا اس قدر زخمی ہو گئے تھے کہ جوابی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ موقع میرے لیے غنیمت تھا۔ لہٰذا میں جلتی گاڑیوں کے زیادہ نزدیک جائے بغیر پلٹا اور ایک بار پھر جنوب کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔

اس واقعے کے دو ڈھائی گھنٹے بعد تک میرا جسم سنسناتا رہا اور دل جیسے حلق میں دھڑکتا رہا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلتا رہا اور میں نے خود فراموشی کی سی کیفیت میں نہ جانے کتنا

فاصلہ طے کرلیا۔ معاً کسی صحرائی لومڑی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ میں صحرا کے بجائے ایک سرسبز قطعے میں کھڑا تھا جس پر پام کے درخت رات کی ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ یہاں سردی بھی زیادہ نہیں تھی۔ اچانک میرے کانوں نے ایک جاں فزا آواز سنی۔ کہیں قریب ہی پانی بہہ رہا تھا۔ جیسے ہی میں پام کے جھنڈ سے نکلا۔ میری نگاہ دائیں جانب مشرق میں کسی گاؤں کی چمکتی روشنیوں پر پڑی۔ میں پانی کی آواز پر جیسے کھنچا جارہا تھا۔ جھاڑیاں ہٹاتے ہوئے بالآخر میں اس چھوٹی سی ندی تک پہنچ گیا۔ جو دور کہیں شمالی پہاڑوں سے آرہی تھی۔ میں بے اختیار جھکا اور نہایت یخ پانی جانوروں کی طرح پینے لگا۔ میرے رگ و پے میں جیسے تراوٹ اترنے لگی۔ جی بھر کر پانی پینے کے بعد میں نے دونوں بوتلوں کو بھرلیا۔ سکون کے احساس کے ساتھ ہی شدید بھوک بھی جاگ اٹھی تھی۔ میں نے بچائے ہوئے چار بسکٹوں میں سے دو پیٹ میں اتار لیے۔

اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں ایک آبادی سے قریب تھا اور ممکن تھا کہ کتے میری موجودگی محسوس کرکے بھونکنا شروع کردیتے۔ میں فوراً آگے بڑھ گیا۔ اب سردی میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سطح مرتفع عبور کرکے ایک بار پھر صحرا میں داخل ہوگیا تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق میں نصف فاصلہ طے کرچکا تھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ۲۷ جنوری کو یہ تیسرا روز تھا جب میں مسلسل سفر میں تھا اور مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں دن بھر چھپا رہ سکوں۔ سورج نکلنے سے ذرا پہلے ایک مختصر سی سنگلاخ وادی میں مجھے چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سوراخ مل گیا۔ میں رینگ کر اس میں گھس گیا اور اپنے تھکے وجود کو آرام پہنچانے لگا۔

ان تین دنوں میں میری حالت تباہ ہوگئی تھی۔ گرد آلود وردی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ جسم جا بجا زخمی تھا۔ ایڑیاں پھٹ گئی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ خوراک ختم ہونے کے قریب تھی۔ میں دوست سرزمین سے بہت دور دشمنوں کے درمیان میں تھا۔ میرے تمام ساتھی بچھڑ چکے تھے۔ ہر لمحے کے خوف نے میرا ذہن ماؤف سا کردیا تھا۔ اچانک مجھے اپنی ممی کی بات یاد آنے لگی۔ جو انہوں نے ایسے ہی کسی موقع کے لیے کہی تھی۔

"جب انسان بے پناہ مصائب میں گھر جائے اور ہر طرف سے مایوس ہوجائے تو اسے چاہیے کہ دل کھول کر روئے۔ اس طرح اس کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور نیا حوصلہ ملتا ہے۔"

میں نے رونا چاہا لیکن میرے چٹخے ہوئے چہرے اور خشک منہ سے قہقہے نکلنے لگے۔ اپنی ہنسی خود مجھے اتنی بھیانک لگی کہ میں ڈر کر چپ ہوگیا۔ پھر نہ جانے کب نہ چاہتے ہوئے بھی میری آنکھ لگ گئی۔ اس وادی کے شمالی حصے میں دریا کے کنارے دور تک آبادی پھیلی ہوئی تھی اور دریا پر عراقی فوج کا پہرہ تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد میری آنکھ کھلی تو رات کی تاریکی چھاچکی تھی۔ میں نے اٹھ کر اپنی پناہ گاہ سے باہر جھانکا اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہونے لگا کہ وہاں موجود گھروں سے لوگ نکل نکل کر جمع ہورہے تھے۔

"یہ یقیناً میری تلاش میں ہیں۔" میں نے خود سے کہا۔

تیزی سے اپنا سامان سمیٹا اور چٹانوں کی آڑ میں اس مقام سے دور جانے لگا۔ اگرچہ اس طرح میں اپنے اصل راستے سے ہٹ گیا تھا لیکن اسی راستے پر چلتے رہنے کی صورت میں، میں عراقیوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔ بادلوں کی وجہ سے رات بے حد تاریک تھی۔ میں نے نائٹ سائٹ نکال کر پہن لی۔ جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جس طرف جارہا تھا۔ وہاں بھی عراقی موجود تھے۔ مجھے ایک بار پھر اپنا راستہ بدلنا پڑا۔ اس طرح اس رات میں نے کئی بار راستہ بدلا اور زگ زیگ کی شکل میں سفر کرتا رہا۔ اس رات میں نے مزید بیس پچیس میل کا سفر طے کرلیا اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں اپنی منزل سے کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔

سورج نکلنے سے پہلے میں نے ایک غار تلاش کرلیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ جھاڑیاں بھی تھیں اور خطرہ تھا کہ کوئی چرواہا اپنے جانور چرانے کے لیے آئے مگر مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ کوئی اور جگہ تلاش کرتا۔ میں نے آخری بسکٹ کھایا اور پانی کا آخری قطرہ بھی حلق میں انڈیل کر سوگیا۔ خلاف معمول میں چودہ گھنٹے سوتا رہا مگر جب جاگا تو کسی قدر تازہ دم تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے کمپاس اور نقشے کی مدد سے حساب کتاب لگایا کہ میں ابھی اپنی منزل یعنی شام کی سرحد سے کتنا دور ہوں۔ جواب خاصا مایوس کن تھا۔ غلط سمت میں سفر کرنے کی وجہ سے میں ابھی بھی شام کی سرحد سے تقریباً پچاس میل دور تھا۔

اس رات کچھ دور چلنے کے بعد میں ایک سڑک تک جا پہنچا۔ یہ مشرق سے جنوب مغرب کی طرف جارہی تھی۔ میں نے نقشے میں دیکھا۔ یہ سڑک آگے جاکر شامی سرحد کے قریب سے گزرتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کے ساتھ ہی سفر کرنے کا فیصلہ کیا ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ طوفانی گرج کی سی آواز

آئی اور ایک چالیس فٹ لمبا اسکڈ میزائل میرے سر کے اوپر آسمان کی تاریکیوں میں غائب ہونے لگا۔ میزائل کہیں قریب ہی سے فائر کیا گیا تھا۔ یعنی میں نے ایک اور موبائل اسکڈ تلاش کرلی تھی۔ میں نے ٹاک بی نکالا اور رابطے کی کوشش کرنے لگا مگر جواب ندارد تھا۔ اس کے بعد ایک دلچسپ ڈراما ہوا۔ اچانک ہی دو اتحادی بمبار وہاں آن موجود ہوئے۔ غالباً انہیں کسی اور طریقے سے یہاں اسکڈ موبائل لانچر کی اطلاع ملی تھی۔ مگر چالاک عراقیوں نے یہ طریقہ اختیار کررکھا تھا کہ میزائل داغتے ہی موبائل لانچر کو کہیں اور لے جاتے۔

کیونکہ یہ طیارے ٹاک بی کی فریکوئنسی پر نہیں تھے۔ اس لیے میں حسرت سے انہیں ناکام واپس جاتا دیکھتا رہا۔ کاش کسی طرح میں انہیں اپنی طرف متوجہ کرسکتا۔ سڑک کے ساتھ ایک نالے نما سرنگ گزر رہی تھی۔ غالباً اس کے ذریعے برسات کا پانی کہیں ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ میں آنے والے ٹریفک کی نظروں سے بچنے کے لیے اس سرنگ میں چلتا رہا۔ پتھروں سے بنی یہ سرنگ نیچے سے چار فٹ اور اوپر سے چھ فٹ چوڑی تھی۔ چلتے چلتے جب صبح ہوئی تو میں نے اسی سرنگ میں دن گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ آس پاس چٹیل صحرا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جس کی ہموار ریت پر کہیں کہیں سمندر کی طرح لہریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں سرنگ کے کنارے اگی ایک جھاڑی تلے دبک گیا۔ جس کی شاخیں خاصی نیچے تک جھک آئی تھیں اور مجھے اس وقت تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جب تک کوئی سرنگ میں نہ اتر آتا۔

میں بھوک پیاس کے عالم میں اونگھنے لگا۔ دوپہر دو بجے کے قریب اچانک مجھے گھنٹیوں کی قریب آتی آوازوں نے چونکا دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بھیڑبکریوں کا کوئی گلہ سرنگ کی طرف آرہا ہے۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ چرواہا بھی ہوتا۔ میں فوراً اپنی رائفل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ بکریوں کا ریلا سا سرنگ پار کرنے لگا۔ کچھ بکریوں نے جھاڑی تلے گھسنا چاہا۔ مگر مجھے دیکھ کر ممناتی ہوئی بھاگ گئیں۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں چرواہے کے ساتھ کتا بھی نہ ہو۔ وہ میری موجودگی محسوس کرلیتا مگر خیریت رہی کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں آئی۔ معاً مجھے اپنے اوپر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اوپر دیکھا وہاں دو عدد انسانی پیر تھے۔ چرواہا نہ جانے کب چھلانگ لگا کر سرنگ پار کرگیا تھا اور اب جھاڑی کے قریب کھڑا اس کے پتے توڑ کر بکریوں کو کھلا رہا تھا۔ اس کے پیر میرے سر سے صرف تین فٹ دور تھے اور وہ ذرا سا جھکتا تو مجھے دیکھ لیتا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ وہ مجھے نہ دیکھے۔ میں ایک عام شہری کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ میں بالکل سرنگ کی دیوار سے چپک گیا تھا۔ خدا خدا کرکے چرواہا اور اس کا گلہ وہاں سے ٹلا تو میں تیز قدموں سے آگے روانہ ہوگیا۔ اب اس جگہ رکنا مجھے خطرے سے خالی نہیں لگ رہا تھا۔

○☆○

منگل کی رات بھی میں نے اس سرنگ میں بسر کی اور بدھ کے روز میں سرنگ سے نکل کر ایک بار پھر جنوب کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس دفعہ مجھے یقین تھا کہ میں شام کی سرحد سے زیادہ دور نہیں رہا تھا مگر میرا یقین پھر غلط ثابت ہوا۔ رات بارہ بجے کے بعد جب ہفتے کا روز تھا۔ میں بھٹک کر ایک عجیب سے علاقے میں جا نکلا۔ چاروں طرف سے چٹانوں میں گھرے اس علاقے میں عجیب وضع کی عمارتیں تھیں۔ جو کسی طور بھی رہائشی یا فوجی نوعیت کی نہیں لگتی تھیں۔ نصف مربع میل میں پھیلے میدان کے وسط میں یہ عمارتیں خاردار تاروں میں گھری ہوئی تھیں اور بالکل تاریک تھیں۔ کم از کم اس وقت یہ مجھے بالکل ویران لگی تھیں۔ ان عمارتوں سے تار نکل کر چاروں طرف جارہے تھے اور یہ کسی قسم کا مواصلاتی مرکز نظر آرہا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا ہوگیا اور رائفل ہاتھ میں لے لی۔

پہلے میں نے سوچا کہ عمارتوں سے کترا کر آگے نکل جاؤں۔ مگر پیاس نے مجھے بری طرح تنگ کررکھا تھا اور میں یہ سوچ کر خاردار باڑھ کی طرف بڑھا کہ شاید یہاں کہیں پانی ہو۔ خاردار باڑھ بھی عجیب انداز سے لگی تھی۔ کہیں اس کی یکے بعد دیگرے تین قطاریں تھیں اور کہیں ایک ہی قطار پر اکتفا کیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آیا جب میں نے ایک جگہ باڑھ میں سوراخ دیکھا اور اس کے پیچھے دوسری باڑھ نہیں تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اس سوراخ سے اندر گھس گیا۔ میں محتاط انداز میں عمارتوں کے درمیان گھومنے لگا۔ ان عمارتوں میں کہیں کھڑکیاں نہیں تھیں۔ البتہ کہیں کہیں روشن دان نظر آرہے تھے۔ تمام عمارتوں میں آہنی دروازے لگے ہوئے تھے۔ جو بظاہر مقفل نظر آرہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں روشن دان نظر آرہے تھے۔ تمام عمارتوں میں آہنی دروازے لگے ہوئے تھے۔ جو بظاہر مقفل نظر آرہے تھے۔ وہاں ہر طرف کوڑا اور گرد بکھری تھی۔ جیسے عرصہ دراز سے کوئی انسان اس طرف نہیں آیا ہو۔

گھومتا گھماتا میں عمارتوں کے پچھلے حصے کی طرف جا نکلا اور وہاں موجود شفاف پانی کی ندی دیکھ کر مجھ پر جو مسرت طاری ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ میں نے ندی سے دونوں بوتلیں بھریں اور فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ جگہ بالکل کھلے میں تھی اور اگر کوئی اس طرف آنکلتا تو میں فوراً نظروں میں آجاتا۔ میں واپس عمارتوں کی طرف آیا اور باہر کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے لگا مگر میں وہ راستہ ہی بھول گیا تھا جہاں سے آیا تھا۔ کافی دیر عمارتوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد میں جس طرف نکلا وہاں ایک چیک پوسٹ نظر آئی۔ میں فوراً پلٹ کر دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ چیک پوسٹ پر دو سنتری نظر آرہے تھے۔ بائیں جانب دس گز دور ایک بلند مینار پر اینٹی ائرکرافٹ گن لگی ہوئی تھی مگر وہاں موجود شخص مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ یعنی یہ جگہ انسانوں سے بالکل ہی خالی نہیں تھی۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے وہی لوہے کا دیو قامت پائپ نظر آیا جو کچرے اور ردی سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس میں گھس گیا۔ اب پیاس ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ میں نے بے تابی سے ایک بوتل منہ سے لگالی اور جیسے ہی پانی میرے منہ میں پہنچا۔ مجھے ایک ناقابل بیان کسیلا اور زہریلا ذائقہ محسوس ہوا۔ اگلے لمحے میں نے پانی کی کلی کر دی مگر اتنی سی دیر میں میرے منہ میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ میں نے دوسری بوتل کا پانی چکھا۔ وہ بھی اتنا ہی خراب تھا' اچانک مجھے ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا خیال آیا کہ یہ پانی کسی کیمیکل سے آلودہ تھا اور یہ جگہ ممکنہ طور پر کیمیائی اشیاء یا ہتھیار رکھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ یہاں کا پانی اور ہوا دونوں زہریلے تھے۔ میں نے فوراً دونوں بوتلیں الٹ دیں۔ دہشت سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن پر تاریکی چھا رہی ہو۔ ممکن تھا کہ یہ زہر کا اثر ہو اور ممکن تھا کہ صرف نفسیاتی اثر ہو۔

یہ بدھ کی صبح تھی۔ دن نکلنے والا تھا اور غش کے عالم میں بھی میں سوچ رہا تھا کہ اگر جلد یہاں سے نہ نکل سکا تو پھر پکڑا جاؤں گا۔ عراقی مجھے جنگی قیدی کے بجائے جاسوس قرار دے کر فوراً گولی مار دیں گے۔ جب میں عرب کی سرزمین پر اترا تھا تو میری جسمانی حالت قابل رشک تھی اور گزشتہ چھ دن کی مصیبتوں نے مجھے بے انتہا کمزور کر دیا تھا۔ زبان خشک ہو چکی تھی۔ کسی پرانے سوکھے چمڑے کی طرح۔ دانت ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ تلوے' کولہے' کہنیاں' بازو' گھٹنے' ٹخنے اور شانے زخمی تھے۔ میرا وزن خاصا کم ہو چکا تھا۔

غنودگی کی کیفیت میں اچانک یوں لگا جیسے میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ ہرفورڈ کے علاقے میں بنا یہ چھوٹا سا گھر میرے لیے جنت تھا۔ جہاں میری حسین بیوی جینٹ تھی اور میری دو سالہ بیٹی سارہ' جو ہماری زندگی کا حاصل تھی۔ ہم گھر پر کرسمس کی تیاری کر رہے تھے۔

"کرس۔" باورچی خانے میں کرسمس کیک تیار کرتی جینٹ نے چلا کر کہا "کیا تم نے کرسمس ٹری کی روشنیاں جلا دی ہیں۔"

یہ حسین کرسمس ٹری ہمارے چھوٹے سے لان میں کھڑا تھا۔ چاروں طرف برف پھیلی تھی۔ ابھی میں سوئچ آن کرنے جا رہا تھا کہ ننھی سارہ اچھلتی کودتی آئی "ڈیڈی' یہ میں کروں گی۔"

میں نے اسے گود میں اٹھا کر سوئچ تک بلند کیا اور اس نے کرسمس ٹری کی روشنیاں جلا دیں۔ رفتہ رفتہ یہ روشنیاں اتنی بڑھیں کہ ان کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ پس منظر سے سارہ کی ڈیڈی.... ڈیڈی کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔

اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "تو یہ خواب تھا۔" میں نے افسردگی سے سوچا "نہ جانے میں دوبارہ سارہ اور جینٹ کو دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔ نہ جانے یہ میرے حواس کا دھوکا تھا یا کچھ اور مجھے سارہ کی ڈیڈی' ڈیڈی کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ شاید بھوک پیاس اور تھکن نے میرے اعصابی نظام پر برا اثر ڈالا تھا۔ میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ایک بار پھر اس جگہ سے نکلنے کی راہ تلاش کرنے لگا مگر پورے کیمپ کا چکر لگا کر میں اسی چیک پوسٹ کی طرف جا نکلا۔ چیک پوسٹ اور اینٹی ائرکرافٹ گن ٹاور کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا۔ البتہ ستاروں کی کسی قدر روشنی تھی اگر سنتری اس طرف نظر رکھتے تو مجھے دیکھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔

خوش قسمتی سے آسمان پر بادل جمع ہونے لگے۔ روشنی بہت کم ہو گئی تھی۔ میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا اور چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے ہوئے کیمپ سے نکلنے لگا۔ اس کے دو فائدے تھے ایک تو میرے نظر میں آنے کا امکان کم تھا اور اگر سنتریوں میں سے مجھے کوئی دیکھ بھی لیتا تو شاید جانور سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔ میرے حواس ایک بار پھر مختل ہونے لگے۔ میں نہیں جانتا کہ کب میں کیمپ سے باہر نکل آیا اور کب تک ہاتھوں پیروں کے بل چلتا رہا اور کب دونوں پیروں پر چلنے لگا۔ میں اس قدر مدہوش تھا کہ پہلی بار دن میں بھی سفر کرتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب مجھے ہوش آیا اور میں ایک چٹان تلے گھس کر سو گیا۔

رات کی تاریکی اور خنکی میں میرے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔ میں نے بمشکل اپنا سکڑا سمٹا جسم کھولا۔ میرے جوڑ درد سے چیخ اٹھے۔

میں کراہتا ہوا مدہوش شرابی کی طرح لڑکھڑاتا آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر صحرا سنگلاخ چٹانوں میں تبدیل ہوگیا جس میں جا بجا پتھر بکھرے تھے۔ موسموں نے انہیں تراش کر گول شکل دے دی تھی۔ میں بار بار نیچے گرتا اور ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا زخم لگتا کچھ دیر میں میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا لیکن اسکا فائدہ یہ ہوا کہ ذہن پر چھائی کہر چھٹ گئی۔ اب سارہ کی آواز نہیں آرہی تھی لیکن اندر سے جیسے رہ رہ کر ڈیڈی کی صدا ابھر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی مجھے یاد کررہی تھی۔

"سارہ، میری جان میں آرہا ہوں۔" خود سے زیر لب کہتا میں اپنے تھکے وجود کو آگے کی جانب گھسیٹتا رہا۔

تین بجے مجھے دور افق پر کسی قصبے کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے نقشہ نکال کر اس کا معائنہ کیا میرے خیال میں یہ عراق کا سرحدی قصبہ ال کربلا تھا جو شامی سرحد کے قریب واقع تھا۔ یعنی اب میری منزل سچ مچ نزدیک آگئی تھی مگر خطرہ بھی اسی قدر بڑھ گیا تھا۔ شام، عراق کے خلاف اتحادی افواج میں شامل تھا اور عراق نے اس کی سرحد پر لازماً فوجی پہرہ لگا رکھا ہوگا۔ قصبے کی طرف جانا حماقت ہی ہوتی۔ لہٰذا میں اس سے کترا کر جنوب کی طرف بڑھنے لگا۔ جلد قصبے کی روشنیاں میرے پیچھے رہ گئیں۔ میں کچھ ہی آگے گیا تھا کہ ایک عدد باڑھ سامنے آگئی جو مشرق سے مغرب تک تا حد نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً آٹھ فٹ اونچی اس باڑھ میں تاروں کی نو قطاریں تھیں۔ تین نیچے سات، سات انچ کے فاصلے سے تھیں۔ درمیان میں نو انچ کا خلا چھوڑ کر دو تار تھے اور سب سے اوپر چھ، چھ انچ کے فاصلے سے پانچ تاریں تھیں۔ بظاہر کہیں سے گزرنے کا راستہ نہیں تھا۔ میں دونوں طرف خاصی دور تک گیا۔ مگر مجھے کوئی رخنہ نظر نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں واپس اسی مقام پر پلٹ آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ باڑھ لامتناہی فاصلے تک لگی ہوگی اور میں چل کر کسی ایسے مقام تک نہیں جاسکتا جہاں باڑھ ختم ہوجاتی۔ امکان یہی تھا کہ اس سے پہلے ہی میں کسی گشتی عراقی دستے کے ہتھے چڑھ جاتا۔ معاً میری نگاہ لوہے کے ان پایوں پر پڑی جن سے یہ خاردار تار بندھے ہوئے تھے۔ باڑھ عبور کرنے کی ترکیب اتنی آسان اور سامنے کی بات تھی کہ پہلی نظر میں سوجھ ہی نہ سکی۔ میں بہ آسانی کھمبے کی مدد سے باڑھ عبور کرسکتا تھا۔ میں نے سارا سامان باڑھ کے دوسری طرف رکھا اور تاروں پر پیر رکھتا اوپر چڑھ گیا۔ نقاہت کے باوجود میں آسانی سے کھمبے کو پکڑ کر دوسری طرف کود گیا۔

میں نے ایک رکاوٹ عبور کرلی تھی مگر اصل سرحد عبور کرنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ میں نے سامان اٹھایا اور ہر ممکن تیزی سے آگے روانہ ہوگیا۔ میں نے ایک بار پھر کمپاس دیکھا۔ میری زندگی میں کبھی خود کو آگے دھکیلنے کا اتنا دشوار گزار مرحلہ نہیں آیا تھا۔ تھکن سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ خالی پیٹ میں رہ رہ کر درد کا گولہ سا اٹھتا تھا۔ خشک حلق میں جیسے سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ آنکھوں تلے بار بار تاریکی آجاتی تھی اور ذہن سو رہا تھا۔ اگر اندر سے ابھرنے والی سارہ کی آوازیں مجھے حوصلہ نہ دیتیں تو میں شاید وہیں گر پڑتا کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو میں کسی پناہ گاہ کا خیال کیے بغیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ کچھ دیر بعد کسی چیز کی پھڑ پھڑاہٹ سے میری آنکھ کھلی اور میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہوگیا کہ مجھ سے کچھ ہی دور ایک بڑا گدھ بیٹھا اپنی پیلی مکروہ شکل سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتا لالچ صاف نظر آرہا تھا۔ میں لرز اٹھا اور میں نے اپنی گن اٹھائی ہی تھی کہ وہ مکار پرندہ خطرہ بھانپ کر اڑ گیا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ معاً میری نگاہ تہائی میل دور ایک فارم ہاؤس پر پڑی۔ جس کے گرد ہرے بھرے درختوں کی قطار تھی۔ یہ ۳۱ جنوری جمعرات کی صبح تھی۔ مجھے مسلسل سفر کرتے آٹھواں دن تھا۔ آخری بسکٹ کھائے مجھے پانچ دن گزر چکے تھے اور میں تین دن پہلے پانی کا آخری گھونٹ بھی پی چکا تھا۔ میری حالت اس گاڑی کی سی تھی۔ جو اپنا تمام پیٹرول ختم کرکے اب ریزرو پر چل رہی ہو۔ یہ سوچ کر میرا آخری حوصلہ عود آیا کہ اس فارم ہاؤس سے مجھے کم از کم پانی کا ایک گھونٹ مل سکے گا۔ اس وقت مجھے قطعی پروا نہیں تھی کہ میرا سامنا وہاں عراقیوں سے ہوگا اور وہ میرے دشمن ہوں گے۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے فارم ہاؤس کی طرف بڑھا۔ تہائی میل کا یہ سفر میرے لیے دنیا کے گرد چکر لگانے کے مترادف تھا۔ بالآخر میں فارم ہاؤس تک پہنچ گیا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ حد درجے کمزوری کے باوجود میں نے اسے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ راکٹ لانچر اور ایمونیشن کٹ میں پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ اچانک فارم ہاؤس کے پھاٹک سے ایک جوان آدمی نکلا۔ دوسرے عربوں کی طرح اس کے بال سیاہ اور گھنگھریالے تھے۔ ایک ہتھیار بدست سفید فام کو اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ نہ جانے ہم کب تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر میں نے گن کی نال سے زمین کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"کیا یہ شام ہے؟"

اس نے جلدی سے سرہلایا اور دہرایا "شام..... شام!" پھر میرے شانے کے پیچھے کی طرف اشارہ کرکے بولا "عراق"

میں نے اطمینان کا طویل ترین سانس لیا۔ رات کسی وقت میں عراقی سرحد عبور کرکے شام میں داخل ہوگیا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ دراصل مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ میں جس قصبے کو عراقی قصبہ ال کربلا سمجھ رہا تھا۔ وہ درحقیقت شامی قصبہ ابو کمال تھا اور وہ باڑھ دراصل شام کی طرف سے لگائی گئی تھی تاکہ اسمگلروں کی روک تھام ہوسکے۔ مجھے شام کی زمین پر قدم رکھے چار گھنٹے ہوچکے تھے۔ مارے مسرت کے مجھے چکر آگیا۔ میں لڑکھڑا کر گرنے والا تھا کہ عرب جوان نے مجھے تھام لیا۔

"یو امریکی؟" اس نے پوچھا۔

"نو۔ آئی ایم اے برٹن۔" میں نے سرہلایا۔

وہ سہارا دے کر مجھے اندر لے گیا۔ اس نے مجھے ایک بستر پر لٹایا اور اندر سے پانی لے آیا۔ میری حالت کے پیش نظر اس نے مجھے چمچے سے تھوڑا تھوڑا کرکے پانی پلایا۔ میری جان میں جان آئی تو میں نے اسے اپنی روداد سنائی۔ وہ ہمدردی سے سرہلاتا رہا۔ اس نے دو دن میری میزبانی کی۔ تا آں کہ دمشق سے برٹش ایمبیسی کے آدمی مجھے لے نہیں گئے۔ مجھے ایک اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے راستے میں جو زہریلا پانی منہ میں ڈالا تھا۔ وہ تابکار تھا اور وہ کیمپ ممکنہ طور پر عراق کا کوئی ایٹمی ریسرچ پلانٹ تھا۔ جسے متروکہ قرار دے کر بند کردیا گیا۔ وہاں موجود فاضل تابکار مادے ندی میں ڈال دیے جاتے تھے جس سے ندی کا پانی زہریلا ہوگیا۔ طبی معائنے کے بعد ثابت ہوا کہ میرے خون میں تابکاری کی معمولی سی مقدار موجود تھی۔ مگر یہ خطرناک نہیں تھی۔ آٹھ دنوں میں میرا وزن چھتیس پونڈز کم ہوگیا تھا اور میرے کچھ دانت بعد میں بھی ڈھیلے رہے لیکن جلد میں نے مکمل صحت حاصل کرلی۔ بیمار بن کر بستر پر لیٹنا میرے لیے ہمیشہ ہی بیزار کن مرحلہ رہا تھا۔

اسپتال میں مجھے گروپ سے متعلق خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ونس اور اسٹان کی تلاش جاری تھی جبکہ باقی گروپ کو کمانڈر مک ناب سمیت امدادی ٹیم نے تلاش کرلیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ مارچ کے دوران مک ناب نے کسی جیٹ طیارے کی آواز سن لی تھی اور رک کراس سے اپنے ٹاک لی پر رابطہ کرنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے پیچھے آنے والے بھی رک گئے۔ میں، اسٹان اور ونس آگے ہونے کی وجہ سے بے خبر رہے اور بدستور چلتے رہے۔ مک ناب اور دوسرے ساتھیوں کو بھی ہمارا خیال نہیں رہا اور جب خیال آیا تو ہم اتنا آگے نکل چکے تھے کہ ان کی آوازیں ہم تک نہیں آسکی تھیں۔ مک ناب نے طیارے سے رابطہ کرکے انہیں وہاں سے نکالنے کی درخواست کی تھی۔ کچھ دیر بعد آکر ہیلی کاپٹر انہیں وہاں سے لے گئے تھے۔

فروری کے دوسرے ہفتے میں واپس ال جانا پہنچ چکا تھا۔ جہاں ہمارا آپریشن بیس تھا۔ مشن بریوو زیرو یہیں سے عراق کی طرف روانہ ہوا تھا۔ بعد میں مجھے، ونس اور اسٹان کو تلاش کرنے کے لیے کئی مہمات روانہ کی گئیں مگر یہ سوچ کر کہ ہم سعودی عرب کی طرف آنے کی کوشش کریں گے۔ جبکہ ہم شام کی سرحد کی طرف مارچ کررہے تھے اور ہمارے محدود رینج والے ٹاک لی سے ان امدادی طیاروں سے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ ایمبیسی اور آپریشن بیس میں جس نے بھی میری جدوجہد کی روداد سنی۔ وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ میں عراق کے ہائی سیکورٹی زون سے کس طرح زندہ سلامت نکل آیا۔ اس دوران میں، میں نے بھوکے پیاسے دو میل کا سفر طے کیا اور عراقیوں کی دو گاڑیاں تباہ کرنے کے ساتھ انہیں جانی نقصان بھی پہنچایا۔ ڈاکٹر میری قوت برداشت پر حیران تھے۔ ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"میڈیکل سائنس اس قدر ترقی کرچکی ہے لیکن ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ انسانی جسم میں عزم و حوصلے کے کتنے ذخائر ہیں اور نامساعد حالات میں انسان ان سے کس حد تک کام لے سکتا ہے۔"

کیونکہ جنگ جاری تھی۔ لہٰذا میں پھر ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا۔ میرے گروپ نے جنگ کے خاتمے تک عراق میں کئی کامیاب کارروائیاں کی تھیں۔ ہمارے کئی ساتھی بھی مارے گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد عراق نے جو اتحادی قیدی رہا کیے۔ ان میں اسٹان بھی شامل تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ جس عراقی چرواہے کے ساتھ گیا۔ وہی اسے گرفتار کرانے کا سبب بنا۔ پہلے مقامی افراد نے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور بعد میں اسے عراقی حکومت کے حوالے کردیا۔ البتہ ونس کا نام آخر تک گم شدہ افراد کی فہرست میں شامل رہا تھا۔ نہ وہ قیدیوں میں تھا اور نہ مرنے والوں میں۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں مجھے بکنگھم پیلس میں ہونے والی ایک خصوصی تقریب میں ملکہ الزبتھ نے ملٹری کراس پہنایا۔ گھر آنے کے بعد میں نے یہ میڈل ننھی سارہ کے گلے میں ڈال دیا۔ جو اسے دیکھ کر بے حد خوش تھی۔

♠♠♠

آسٹریلیا وسیع وعریض سرزمین ہے۔ اسے ملک کے بجائے برّاعظم کہنا درست ہوگا۔ جغرافیائی ماہرین اسے ایک الگ اور جدا برّاعظم بتاتے ہیں جس کی سرزمین کا ایشیا یا انٹارکٹیکا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زمانہ قدیم میں انسان کے قدم یہاں آپہنچے تھے۔ قدیم انڈونیشیائی نسلوں کے انسان سمندری راستے سے مختلف جزیروں سے ہوتے ہوئے آسٹریلیا تک آئے تھے اور وہ پورے برّاعظم آسٹریلیا میں پھیل گئے۔ نہ صرف آسٹریلیا بلکہ وہ انتہائی جنوب میں نیوزی لینڈ تک جا پہنچے تھے۔ کس قدر حیرت ناک بات ہے، معمولی کشتیوں کے سہارے یہ لوگ بحرالکاہل اور بحرہند کے بیشتر جزائر میں جاکر آباد ہوگئے تھے۔ صرف وہی جزائر انسانوں سے خالی رہے جو آبادی کے لیے موزوں نہیں تھے۔ آبادکاری کا یہ سلسلہ آج سے کوئی نو دس ہزار سال پہلے شروع ہوا تھا۔

جب سفید فاموں کے قدم آسٹریلیا کی سرزمین پر پہنچے تو وہاں تین لاکھ سے زیادہ قدیم باشندے آباد تھے۔ یہ بے حد پُرامن اور جنگ سے ناآشنا قبائل تھے اور ان کی بدقسمتی کہ ان کا واسطہ ان سفاکوں سے پڑا تھا جو پہلے ہی شمالی اور جنوبی امریکا کے قدیم باشندوں کو نیست و نابود کر چکے تھے۔ آسٹریلیا بہت وسیع سرزمین ہے اور یہاں پر چراگاہوں کی کمی نہیں تھی۔

اعلیٰ ہمت لوگ

کاشف زبیر

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

غربت میں جا کے چمکا
گمنام تھا وطن میں

ان صفحات پر ایسے ہی چند افراد کی پیہم جدوجہد کی داستان پیمایش کی جارہی ہے جو اپنے وطن سے ایک اجنبی سرزمین کو آباد کرنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ گمنامی سے ناموری کے اس سفر میں انھوں نے کیا دیکھا، کیا جھیلا اور کیا مصائب و آلام برداشت کیے...... ان سب حالات و کیفیات سے معمور ایک دلچسپ و حیرت انگیز روداد۔

ویران و بے آباد آسٹریلیا کے ایک علاقے کے گل و گلزار بننے کا معلومات افزا قصہ

اس کے باوجود آنے والے سفید فاموں نے مقامی باشندوں کا بہیمانہ قتل عام کیا اور ان سے ان کی زمینیں چھین لیں۔ جیسے جیسے آسٹریلیا میں سفید فاموں کی آبادی بڑھتی گئی، ویسے ویسے مقامی باشندے کم ہوتے چلے گئے اور آج یہ حال ہے کہ پورے آسٹریلیا میں ان کی تعداد ڈھائی لاکھ سے بھی کم ہے اور ان کی بقا کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں بحری جہازوں میں بھر بھر کر سفید فام آسٹریلیا پہنچ رہے تھے۔ سڈنی ان کی اولین منزل ہوتا تھا، جہاں سے وہ اندرون آسٹریلیا جاتے تھے۔ نئے آنے والوں کو زمین آباد کرنے کی ترغیب دینے کے لیے حکومت قرض اور زمین دے رہی تھی۔ 1889ء میں ایک انگریز خاندان بلٹر (BILTER) سڈنی کی بندرگاہ پر اترا۔ اس خاندان کا سربراہ باسٹھ سالہ وولی بلٹر تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ میں کاشت کاری کرتا تھا مگر مسلسل بدحالی سے تنگ آ کر اس نے اپنا سارا اثاثہ فروخت کیا اور چار بیٹوں، ان کی بیویوں اور بارہ عدد پوتے پوتیوں کے ہمراہ آسٹریلیا جانے والے جہاز پر سوار ہو گیا۔ روانگی کے وقت اس کا چوالیس سالہ کزن جارج بلٹر بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وولی بلٹر کا سب سے بڑا بیٹا چارلس بلٹر تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے جن میں دو بیٹے میسن اور اینگی جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس کے بعد ولیم تھا۔ اس کے بعد کارل اور سب سے چھوٹا تیس سالہ مورفی۔ یہ خاندان کئی صدیوں سے کاشت کاری کرتا چلا آ رہا تھا۔

سڈنی کے حکومتی ارکان نے بلٹر کو شمال مشرقی کوئنز لینڈ کی ریاست میں ایک وادی دینے کی پیش کش کی۔ مگر ان سے پہلے بھی کئی افراد اس وادی میں بسنے کی کوشش کر چکے تھے اور ناکام رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ وادی میں آنے والے شدید سیلاب تھے۔ یہ وادی شمال کی طرف جانے والے راستے پر تھی۔ اگر کوئی خاندان یہاں آباد ہو جاتا تو شمال کی طرف سفر کرنے والوں کو بے پناہ آسانی ہو جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ کوئی وہاں جا کر آباد ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حکومت نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہاں جا کر آباد ہونے والے خاندان کو فی کس ہزار آسٹریلوی کرنسی اور دس عدد بھیڑیں دی جائیں گی۔ وولی بلٹر نے اس پیش کش کا جائزہ لیا۔ وہ کل بائیس افراد تھے اور بائیس ہزار ڈالرز خاصی خطیر رقم تھی۔ اس کے علاوہ دو سو بیس بھیڑیں بھی۔ اس نے اپنے بیٹوں اور جارج سے مشورہ کر کے یہ پیش کش قبول کر لی تھی۔

اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں بلٹر خاندان قافلے کی صورت میں سڈنی سے کوئی ہزار کلومیٹر شمال کی طرف روانہ ہوا۔ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے اس وادی کو آباد کیا تو وہ اس وادی کو ان کے نام سے موسوم کر دیں گے اور یہ سرکاری طور پر بلٹر ویلی کہلائے گی۔ سات دن کے صبر آزما اور دشوار گزار سفر کے بعد وہ چار ہزار فٹ اونچے ایک درّے سے وادی میں داخل ہوئے تھے۔ شمالاً جنوباً یہ وادی کوئی سات کلومیٹر طویل اور شرقاً غرباً دو سے ڈھائی کلومیٹر چوڑی تھی۔ اس کی موسمی صورتِ حال کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ نومبر سے فروری تک خاصی گرمی پڑتی تھی (واضح رہے کہ جنوبی نصف کرے میں یہ موسم گرما ہوتا ہے جبکہ شمالی نصف کرے میں سردی پڑ رہی ہوتی ہے) مارچ اور اپریل میں موسم خوش گوار ہوتا ہے جبکہ مئی سے اگست تک خاصی سردی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ستمبر اکتوبر معتدل ہوتے ہیں۔ معتدل مہینوں میں بے پناہ بارشیں ہوتی ہیں اور جنوب سے شمال کی طرف وادی کے ڈھلان کی وجہ سے نشیبی علاقوں میں سیلاب آ جاتا ہے۔ ماضی میں اسے روکنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

وادی، برسبین شہر سے کوئی تین سو کلومیٹر مشرق میں تھی۔ یہ جگہ آسٹریلیا کے اندرونی حصے میں تھی جو بہت کم آباد تھا۔ آنے والے سفید فام باشندے زیادہ تر جنوب کے ساحلوں اور ان سے منسلک دریائی علاقوں میں آباد ہو رہے تھے کیونکہ یہاں موسم معتدل ہوتا تھا۔ وسطی اور شمالی آسٹریلیا میں گرمی بہت زیادہ پڑتی تھی۔ بالکل وسطی حصہ زیادہ تر بے آباد تھا یا یہاں پر پرانی نسل کے ایبوجینز باشندوں کو دھکیل دیا گیا تھا۔ درّے کی بلندی سے وادی کا منظر بے حد دلکش تھا۔ وسطی حصے میں گھنے اور اونچے درختوں والے جنگلات تھے جبکہ جنوبی حصہ چٹیل تھا۔ مسلسل بارش کی وجہ سے اس حصے کی زرخیز مٹی بہہ کر وادی کے وسطی اور شمالی حصے میں جمع ہو گئی تھی، جو نشیب میں تھے۔ درّے کے فوراً بعد تقریباً دو کلومیٹر کا ایک ٹکڑا معمولی ڈھلان رکھتا تھا۔ یہ زیادہ تر چٹانوں پر مشتمل تھا۔ آگے سے یہ ذرا تنگ ہو گیا تھا اور اس کے بعد ایک نسبتاً چوڑے درّے سے گزر کر وہ وسطی حصے میں داخل ہوئے تھے جہاں ایک چوڑے برساتی نالے کے گرد گھنا جنگل تھا جس میں اونچے تناور درخت لگے تھے۔ شاید دو تین دن پہلے بارشیں ہوئی تھیں، ان کا پانی نالے میں بہہ رہا تھا۔ اگرچہ اس کی مقدار زیادہ نہیں تھی لیکن نالے کی دور تک گیلی زمین بتا رہی تھی کہ یہاں سے بڑی مقدار میں پانی گزرا تھا۔

بلٹر خاندان نے عورتوں اور بچوں کے لیے تین گھوڑا

گاڑیاں حاصل کی تھیں۔ مرد گھوڑوں پر تھے۔ حکومت سے ملنے والی بھیڑوں کی نگرانی کے لیے انہوں نے چار عدد کتے بھی لیے تھے۔ تمام ممکنہ اوزار وہ خرید کر چلے تھے جن کی گھر بسانے میں ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ سامانِ ضرورت انہوں نے وادی سے کوئی تیس کلومیٹر پہلے راستے میں آنے والے آخری قصبے فریڈ ہوپ سے لیا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے وادی کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ کیا تھا اور اس بارے میں انہیں مفید مشورے بھی دیے تھے۔ بہرحال فریڈ ہوپ کے باشندے ان کی آمد سے خوش تھے کیونکہ بائیس نئے افراد کی آمد کا مطلب تھا کاروبار میں اضافہ ہونا۔ برساتی نالے کے ساتھ خستہ کچا راستہ تھا جس سے ہوتے ہوئے وہ وادی کے آخری حصے میں پہنچے۔ اس جگہ انہیں آباد ہونا تھا کیونکہ پانی کی دستیابی اس جگہ ممکن تھی۔ زرخیز زمین اور چراگاہ بھی وادی کے اس حصے میں تھی۔ نالے سے گزر کر وہ نیچے پہنچے تو تاحدِ نگاہ اونچی سبز گھاس بکھری تھی۔ کوئی دو ہزار فٹ نیچے مختصر سی جھیل تھی جو بارش کے پانی سے بھر گئی تھی اور اس کے دوسرے سرے سے پانی وادی سے باہر نکل جاتا تھا۔

ودلی بوڑھا لیکن تنومند اور ہوشیار شخص تھا۔ اس نے ساری عمر محنت کی تھی اور اس عمر میں بھی جوانوں کی طرح کام کرتا تھا۔ اس کے چاروں بیٹے بھی جفاکش اور محنتی تھے۔ وہ اس وادی کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کیونکہ یہاں پر زندگی گزارنے کے تمام لوازمات تھے۔ پانی، اچھی زمین اور جنگل جہاں سے انہیں مکان بنانے کے لیے لکڑی مل جاتی۔ وہ وادی کے نچلے حصے تک پہنچے۔ ودلی نے پہلی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ پہلے والے لوگ باوجود کوشش کے کیوں آباد نہیں ہو سکے تھے؟ دراصل وادی کا نچلا حصہ دونوں طرف سے نالے کی زد میں تھا۔ نالا وسط سے اونچا تھا اور جب زائد بارشوں کا پانی اس سے ابلتا تو زیریں وادی کے دونوں حصے سیلاب کی زد میں آ جاتے تھے اور اس کا کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ اوپر سے پانی کے ساتھ آنے والی مٹی نالے کی تہ میں بیٹھ جانے سے اس کی سطح عام زمین سے اونچی ہو گئی تھی اور مٹی کی آمد مسلسل جاری تھی۔ مگر ودلی کے ذہن نے فوری طور پر اس کا حل تلاش کر لیا تھا، جس کے ذریعے وہ خود کو سیلاب سے بچا سکتے تھے۔

''میرے بیٹو! ہمیں اس ندی سے مٹی نکال کر ایک اونچا چبوترا بنانا ہوگا، جس پر ہم اپنے لیے مکان تعمیر کر سکیں۔''

''پاپا! ہم مکان کہاں بنائیں گے؟'' کارل نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ بڑھئی کا کام بھی جانتا تھا اور اسے یہ کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ ودلی بلڈر ایک نزدیکی ٹیلے پر چڑھا تو اسے بائیں جانب پرانے آباد ہونے والے لوگوں کے مکانات کے کھنڈرات نظر آئے تھے۔ جنہیں سیلاب نے برباد کر دیا تھا۔ اگرچہ یہ کسی قدر بلندی پر تھے لیکن پھر بھی پانی کی پہنچ سے باہر نہیں تھے۔ چند منٹ بعد ودلی اپنے بیٹوں، پوتوں اور جارج کے ہمراہ اس جگہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس زمین پر کنواں بھی تھا۔ انہوں نے اندر جھانکا تو پانی کی چمک نظر آئی تھی۔ کنواں اور مکانات دو بلند ٹیلوں کے درمیان میں تھے۔ ٹیلے ناہموار ہونے کی وجہ سے ان پر کسی قسم کی آبادکاری ممکن نہیں تھی۔ ودلی نے جائزہ لے کر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔

''ہمیں ان دو ٹیلوں کے درمیان والی جگہ کو بھرنا ہوگا اور کنواں بھی اونچا کرنا ہوگا۔ اگر ہم اس جگہ کو بارہ فٹ بلند کر لیں تو سیلاب سے بچ سکتے ہیں۔''

ودلی کے بیٹے اس منصوبے کو بھانپ گئے۔ یہ ایک اچھا منصوبہ تھا، اس طرح وہ کم محنت کر کے اپنے لیے ایک محفوظ جگہ تیار کر سکتے تھے۔ ''اور یہ کام ہمیں مل کر شروع کرنا ہے'' ودلی نے اپنی گرج دار آواز میں کہا تھا۔

اگلے روز سے عورتوں نے بھیڑوں اور جانوروں کو سنبھال لیا اور تمام مرد بہ شمول ودلی کے بارہ سال کی عمر تک کے پوتوں کے ندی سے مٹی کھود کر لا کر اس جگہ کو بھرنے لگے۔ بوریوں میں مٹی بھر کر وہ گھوڑا گاڑی پر لاد کر لاتے تھے۔ کارل لکڑی کے تختوں کی مدد سے کنواں اونچا کر رہا تھا اور ان کے گرد پتھروں کی دیوار بنا رہا تھا۔ ٹیلوں کے درمیان مٹی کی بھرائی کے ساتھ ساتھ وہ اسے محفوظ بنانے کے لیے پتھر بھی لا کر ڈال رہے تھے۔ ان کا عارضی قیام خیموں میں تھا۔

کارل کنوئیں کو اونچا کرنے کے بعد اب مکانات کی تعمیر کے لیے جنگل سے لکڑی جمع کر رہا تھا۔ وہ روز ایک درخت کاٹ کر گراتا اور اسے گھوڑوں کی مدد سے کھینچ کر لے آتا تھا۔ ٹیلوں کے درمیان مٹی بھرنے کی رفتار سست سہی لیکن زمین کی سطح اونچی ہو رہی تھی۔ ایک ہفتے میں ایک فٹ کے حساب سے۔ ودلی کا یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ وہ تین مہینے میں زمین کی سطح مطلوبہ حد تک اونچی کر لیں گے۔ درمیان میں کئی بار خاصی بارشیں بھی ہوئیں جن کی وجہ سے مٹی اٹھانے کا کام متاثر ہوا تھا۔ مگر ان تھک محنت کے بعد وہ ان دو ٹیلوں کے درمیان والی جگہ بھر کر اسے اس قابل بنا چکے تھے کہ اس پر مکانات کی تعمیر شروع ہوتی۔ کارل نے سب کے لیے الگ الگ مکان بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلے ایک ایک کمرا اور اس کے ساتھ باورچی خانہ بنایا جاتا۔ دو عدد لیٹرین اس نے

پہلے ہی بنالیے تھے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو مکانات کی تعمیر کا کام آسان ہوگیا۔ کارل تختے اور شہتیر پہلے ہی بنا چکا تھا۔ بس انہیں مطلوبہ جگہوں پر نصب کرنا تھا۔ زمین میں تنے گاڑ کر ان پر زمین سے تین فٹ اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا' اس کے بعد اس پلیٹ فارم پر مکانات بنانا شروع کیے گئے۔

عورتیں مویشی اور بچے سنبھالنے کے ساتھ کاشت کاری بھی کررہی تھیں۔ وادی میں آتے ہی انہوں نے زمین میں اناج اور سبزیاں اگانا شروع کردی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ مرغیاں بھی لائی تھیں۔ وہ صبح سویرے مرغیوں کو آزاد کرکے جانوروں کو چارا ڈالتی تھیں اور پھر سب کے لیے ناشتا بناتیں۔ اس کے بعد لڑکیاں بھیڑوں کو لے کر چرانے کے لیے چلی جاتیں اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتیں۔ چند مہینوں میں ان کے پاس کئی طرح کی سبزیاں تھیں۔ مکئی کی فصل تیاری کے مرحلے میں تھی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاچکی تھی۔ جب چبوترا بن کر تیار ہوگیا تو جنگل سے چھوٹے درخت لاکر اس کے گرد لگادیے گئے تھے۔ یہ درخت ڈالی جانے والی مٹی کو مضبوط کرتے۔ جنوری کے آخر تک ایک ایک کمرے کے پانچ مکان تیار ہوچکے تھے۔ ان میں توسیع کا کام آنے والے سرما تک کے لیے ملتوی کردیا گیا تھا اور سارے مرد مل کر وادی کے زیریں حصے کی زمین ہموار کرنے لگے تھے تاکہ آنے والے گرما میں بھرپور طریقے سے فصل حاصل کرسکیں۔ ان میں سے کچھ بھیڑوں کے لیے گھاس کاٹ کر سکھانے لگے تاکہ سرما میں انہیں خوراک کی کمی نہ ہو۔ کارل اب باڑے کو مکمل کررہا تھا۔ باڑا بھی چبوترے پر ہی بنایا جارہا تھا۔ یہاں بھیڑوں کے ساتھ ان کے مویشی بھی آرام سے رہ سکتے تھے۔

جنوری میں ہی سورج بے پناہ تپش دینے لگا تھا مگر وادی میں ہوا بھی خوب چلتی تھی۔ کارل نے بھائیوں اور باپ کے سامنے تجویز پیش کی کہ اس ہوا کی مدد سے چلنے والی ہوائی چکی بنائی جائے جو کنوئیں سے براہِ راست پانی کھینچ کر ایک اوور ہینڈ ٹنکی کی مدد سے گھروں کو سپلائی کرے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی مگر اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور ابھی رقم ان کے پاس نہیں تھی۔ وولی بلٹر نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر وادی کے زیریں حصے میں جھیل کے ساتھ کوئی ڈھائی سو ایکڑ زمین ہموار کی تھی۔ آنے والے گرما میں وہ اس پر بھرپور طریقے سے کاشت کاری کرتا۔ فروری کے آخر تک موسم بدلنے لگا تھا۔ گرمی کی جگہ ہلکی سی خنکی نے لے لی تھی۔ کارل گھروں کی تعمیر کے دوسرے مرحلے کے لیے سامان تیار کررہا تھا۔ کام بے شمار تھے اور کرنے والے صرف دس مرد تھے۔ عورتیں اب گھروں کو اور جانوروں کو دیکھ رہی تھیں۔ باہر کا سارا کام مردوں کو کرنا پڑتا تھا۔

مارچ سے شدید قسم کی بارشوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ دوسرے ہفتے میں اتنی بارش ہوئی کہ ان کی لگائی ہوئی فصل اور سبزیاں بہہ گئیں۔ خوش قسمتی سے سورج مکھی چند دن پہلے کاٹ لی تھی۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں لگاتار دو دن بارش ہوئی اور پانی نالے سے ابل کر وادی کے نچلے حصے میں پھیلنے لگا تھا۔ جھیل کی نکاسی کا راستہ مختصر تھا۔ اس لیے پانی بھرنے سے جھیل کا کنارا زمینوں تک آگیا تھا۔ پانی اس چبوترے سے چند فٹ نیچے رہ گیا تھا۔ جسے انہوں نے مٹی کی بھرائی سے بنایا تھا۔ صرف دو دن کی بارش سے سیلاب اس حد تک آگیا تھا۔ خوش قسمتی سے بارش رک گئی ورنہ پانی چبوترے کی سطح تک آجاتا تو کم سے کم باڑے میں گھس ہی جاتا۔

تین دن تک پوری وادی پانی سے تر رہی تھی۔ چوتھے دن جب پانی اترنا شروع ہوا تو یہ دیکھ کر انہیں بے حد مایوسی ہوئی تھی کہ ان کی زمین پر کی گئی ساری محنت اکارت گئی تھی۔ پانی کے ریلوں نے جابجا زمین کاٹ دی تھی۔ فصل کے ساتھ وہ تمام کاشت سبزیاں بھی بہا کر لے گیا تھا۔ درحقیقت ان کے پاس گھروں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ اس زمین کو ہموار کرنے پر ان کے تین مہینے لگے تھے اور اس جان توڑ محنت کو پانی نے صرف تین دن میں برباد کردیا تھا۔ چارلس بے حد افسردہ تھا۔ وہ سچا کاشت کار تھا جسے زمین سے پیار ہوتا ہے۔ زمین کو ہموار کرنے میں سب سے زیادہ محنت بھی اسی نے کی تھی۔

''پاپا' اس طرح تو ہم کبھی زمین آباد نہیں کرسکیں گے۔''
اس نے وولی بلٹر سے کہا تھا۔

''ہم زمین آباد کریں گے لیکن پہلے سیلاب کا کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔''

سرما گزارنے کے لیے ان کے پاس مکئی اور سورج مکھی کے بیج تھے۔ بھیڑ کا گوشت اور آلوؤں کا ذخیرہ تھا۔ مرغیوں سے وہ انڈے اور گوشت حاصل کرسکتے تھے مگر سبزیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ عورتوں نے چبوترے پر ہی کچھ سبزیاں لگائی تھیں۔ مگر آنے والے سرما کے باعث ان سے کچھ حاصل ہونے کی امید کم ہی تھی۔ امید کی صرف ایک کرن تھی۔ بھیڑوں نے خاصی تعداد میں بچے دیے تھے اور تقریباً تمام ہی مادہ بھیڑیں حاملہ تھیں۔ ان کے جسموں پر اون بھی بڑھ رہا تھا اور وولی کو امید تھی' اگلے موسم گرما تک وہ اون فروخت کرکے

خاصی رقم کما سکیں گے۔

اپریل کے آخر تک بارشوں کا سلسلہ رک گیا تھا اور جنوب اور مشرقی میدانوں سے یخ ہوائیں وادی تک آنے لگی تھیں۔ انہوں نے بھیڑوں کے لیے خاصا چارا جمع کرلیا تھا اور وولی کو اطمینان تھا کہ سرما میں اسے کوئی بھیڑ اس لیے ذبح نہیں کرنی پڑے گی کہ وہ فاقے سے مر رہی تھی۔ دوسرے کمرے کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا تھا اور کارل نے باقی ماندہ کمرے آنے والے گرما میں مکمل کرنے کا اعلان کیا۔ مئی کے اوّل ہفتے میں باقاعدہ سردی پڑنے لگی تھی۔ رات کو وہ آتش دان جلائے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ وولی ان دنوں اپنی آرام کرسی آتش دان کے سامنے رکھے زیادہ تر سوچتا رہتا تھا۔

وہ سب اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس امید کے ساتھ آسٹریلیا آئے تھے کہ شاید یہاں انہیں بہتر زندگی گزارنے کا موقع ملے مگر یہاں آکر انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کس قدر تاخیر کرچکے تھے۔ پہلے آنے والے آبادکار ساری اچھی اچھی زمینیں ہتھیا چکے تھے اور بعد میں آنے والوں کے لیے صرف دور افتادہ زمینیں رہ گئی تھیں جہاں تک آنا جانا ہی بے حد دشوار تھا۔ مگر واپسی کا راستہ وہ بند کرکے آئے تھے۔ شہروں میں دوسرے درجے کی زندگی گزارنا انہیں قبول نہیں تھا اس لیے وولی نے اس وادی میں رہائش قبول کرلی تھی مگر یہاں آکر وہ محسوس کررہے تھے کہ وادی کو بسانا بالکل بھی آسان نہیں ہے ورنہ ان سے پہلے لوگ کیوں ناکام ہوتے۔ شاید انہیں بھی جھک مار کر اور پچھتا کر واپس جانا پڑے۔ اگرچہ انہوں نے سیلاب سے محفوظ رہائش گاہ بنا کر کامیابی حاصل کی تھی لیکن صرف رہائش ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ انہیں زمین درکار تھی جس پر وہ کاشت کرتے۔ بھیڑوں کو محض چرا کر گزارا کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وادی میں پودے اور گھاس کی مقدار محدود تھی اور بھیڑ بکری ایسے جانور ہیں کہ انہیں آزادی سے چرنے دیا جائے تو یہ ساری نباتات ختم کرکے دم لیتے ہیں۔ یہ زمین کو بنجر بنا دیتے ہیں، اس کے بجائے ان کے پاس گائے یا بیل ہوتے تو وہ زیادہ فائدے میں رہتے۔ ان کی زمین بھی محفوظ رہتی اور گائے بیل نسبتاً مہنگے بکتے تھے۔ (یہ انوکھی بات ہے، ہمارے ہاں کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں بڑے جانور کا گوشت مہنگا ہوتا ہے۔)

وولی بلٹر جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کیا سوچ رہے تھے۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں اس نے انہیں ساتھ لیا اور وادی کے اوپری حصے کی طرف آیا۔ یہاں اس نے بہ غور اس کشادہ درے کا جائزہ لیا، جس سے بارش کا پانی گزر کر وسطی حصے میں نالے میں داخل ہوتا تھا۔ اس حصے کے چاروں طرف وسیع پہاڑ تھے اور ان کی ڈھلانوں سے بہہ کر آنے والے پانی کے گزرنے کا واحد راستہ یہی کشادہ درّہ تھا۔ وولی نے بیٹوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہے اس وادی کی ترقی اور تباہی کا راستہ...... اسے قابو میں کرلیا تو سب ہمارے قابو میں آجائے گا۔“

”وہ کیسے پاپا؟“ مورنی نے کہا۔

”ہمیں اس جگہ ایک بند بنانا ہوگا جو آنے والے پانی کو روک سکے۔ اگر اس جگہ بند بن گیا تو میں دعوے سے کہتا ہوں، چند سال میں پوری وادی سرسبز اور شاداب ہوجائے گی۔“

”مگر پاپا! بند کیسے بنائیں گے، ہم میں سے کوئی انجینئر نہیں ہے۔“ کارل نے اعتراض کیا۔

”اور پاپا! اس کام کے لیے بہت پیسا چاہیے۔“ چارلس نے کہا۔

”میں ریاستی حکام سے بات کروں گا۔“ وولی نے کہا ”سب سے پہلے یہ وادی ہمیں اپنے نام کرانی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام آسانی سے ہوجائے گا لیکن دوسرا کام ذرا دشوار ہوگا۔“

”کون سا پاپا؟“ مورنی نے پوچھا۔

”کسی بینک کو اس منصوبے کے لیے قرض دینے پر آمادہ کرنا۔“ وولی بلٹر نے پُرخیال انداز میں کہا تھا۔

☆☆☆

برسبین ان دنوں ایک ترقی پذیر شہر تھا۔ اگرچہ یہ سڈنی یا ملبورن کی طرح بڑا اور مشہور نہیں تھا مگر سرمایہ کار، صنعت کار اور مزدور تیزی سے اس شہر کا رخ کررہے تھے۔ بینکاروں میں ایک نام رابرٹ کلاڈ کا بھی تھا۔ وہ مخلوط النسل تھا۔ ماں یہودی تھی اور باپ انگریز عیسائی۔ بینکاری کی تربیت اس نے اپنے نانا اور ماموں سے حاصل کی تھی اور بہتر مواقعوں کی تلاش میں آسٹریلیا آگیا تھا۔ پانچ سال پہلے اس نے محض بارہ سو ڈالرز کے ساتھ کام شروع کیا تھا اور آج اس کا ذاتی سرمایہ ایک لاکھ ڈالرز سے تجاوز کرچکا تھا۔ اس نے برسبین کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا کیونکہ کوئنز لینڈ اپنی سونے کی کانوں کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ رابرٹ سونے کی تلاش کے لیے جاری مہمات میں سرمایہ لگاتا تھا۔ کئی ناکام مہمات کا ازالہ ایک کامیاب مہم کردیتی تھی۔ رابرٹ کی ترقی کی وجہ یہی تھی۔ وہ ایسی جگہوں پر سرمایہ لگانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا جہاں ناکامی کا خطرہ ہو لیکن کامیابی کی صورت میں وارے نیارے ہوجاتے ہوں۔

مگر اس روز وولی بلٹر نامی بوڑھے شخص کے پاس

جو تجویز تھی گو کہ وہ رابرٹ کلاڈ کے اندازِ کاروبار سے میل نہیں کھاتی تھی مگر یہ بھی ایک چیلنجنگ کام تھا اور رابرٹ کو اس قسم کے منصوبوں میں سرمایہ لگانے میں ہمیشہ دلچسپی رہتی تھی۔ اس نے وولی بلٹر کا منصوبہ سنا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے دو دن بعد رابطہ کرے۔

''مسٹر رابرٹ! میں تمہیں رقم کی واپسی کی ضمانت دیتا ہوں۔'' وولی بلٹر نے جانے سے پہلے کہا تھا ''یہی نہیں' میں اس قرض پر تمہیں اچھا نفع دوں گا۔''

وولی بلٹر کے جانے کے بعد رابرٹ اپنے بینک سے نکلا اور دو گلی پار انجینئر شیرن سامیٹ کے دفتر میں داخل ہوا۔ وولی منصوبے کے کاغذات اس کے پاس چھوڑ گیا۔ سامیٹ ایک طرح سے رابرٹ کا تکنیکی مشیر تھا۔ رابرٹ نے کاغذات اس کے سامنے رکھے ''مجھے بتاؤ سامیٹ' کہ یہ پلان کس حد تک ممکن ہے؟''

شیرن سامیٹ نے بہ غور اس نقشے کا معائنہ کیا اور بولا ''اگر یہ اعداد و شمار درست ہیں تو منصوبہ بلاشبہ قابلِ عمل ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ ایک بار تم جا کر اس مقام کا سروے کر لو اور مجھے بتاؤ کہ اس منصوبے پر کتنی لاگت آئے گی اور میری رقم کی واپسی اور نفع کا کس حد تک امکان ہے؟''

''میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں' منصوبہ قابلِ عمل ہے یا نہیں اور اس پر کتنی لاگت آئے گی۔''

''تب تم فوری طور پر روانہ ہو جاؤ۔''

سامیٹ نے ایک بار پھر نقشے کا معائنہ کیا ''یہ جگہ کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔''

''یہ وہی وادی ہے جہاں بین رہ چکا ہے مگر وہ اس کی آبادکاری سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس نے بھی اس مقام پر بند بنانے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور میں نے تمہیں اس کا پلان دکھایا تھا مگر پھر بین کا ارادہ بدل گیا اور وہ برسبین میں رہ گیا تھا۔''

''میں تیار ہوں...... لیکن مجھے آنے جانے اور سروے کے اخراجات پیشگی درکار ہوں گے۔ میرے پاس ایک مہینے سے کوئی کام نہیں ہے۔'' سامیٹ نے صاف گوئی سے کہا ''برطانیہ سے سستے انجینئرز کے آنے سے میرے بزنس میں فرق پڑا ہے۔''

''رقم کل صبح تمہیں مل جائے گی۔'' رابرٹ کھڑا ہو گیا ''میں کل ہی اس شخص سے رابطہ کروں گا لیکن مجھے امید ہے تم اس کے دباؤ میں آئے بغیر سروے کرو گے؟''

''میں اپنا کام پیشہ ورانہ دیانت داری سے کرتا ہوں۔'' شیرن سامیٹ نے کھردرے لہجے میں کہا تھا۔

☆☆☆

جون کے آخر میں پہلی بار برف باری ہوئی تھی اور پوری وادی سفید رنگ سے ڈھک گئی۔ شیرن سامیٹ' وولی بلٹر اور رابرٹ کلاڈ وادی کے اوپری حصے میں موجود تھے۔ سامیٹ گزشتہ ایک ہفتے سے کام کر رہا تھا اور اس کی طرف سے تاخیر پر بے قرار ہو کر رابرٹ کلاڈ خود چلا آیا تھا۔ حالانکہ سردی میں وادی تک کا سفر بے حد دشوار تھا' خاص طور سے آخری ستر کلومیٹر کا راستہ بالکل کچا اور خراب تھا۔ رابرٹ کلاڈ نے پہلی نظر میں محسوس کر لیا تھا کہ اس وادی میں بے پناہ مواقع تھے۔ کیونکہ اس پورے علاقے میں صرف اسی جگہ پانی میسر تھا۔ پانی کے لیے بند بنانے سے سارا سال فصلوں کو پانی مل سکتا تھا اور اس سے بے پناہ پیداوار ہوتی۔

اس شام آتش دان کے سامنے شیمپین سے شغل کرتے ہوئے شیرن سامیٹ نے وولی اور رابرٹ کلاڈ کو آگاہ کیا۔

''میرا خیال ہے' یہ منصوبہ قابلِ عمل ہے لیکن اس پر لاگت خاصی آئے گی۔ آسٹریلیا میں مزدوری سب سے مہنگی پڑتی ہے اور اس کام کے لیے مزدوروں کی اشد ضرورت ہے۔''

''کتنے مزدور چاہئیں؟'' وولی بلٹر نے پوچھا۔

''کم سے کم پچپن...... جو مسلسل اس پر کام کر سکیں تب کہیں جا کر چار مہینے میں بند مکمل ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کم سے کم ڈیڑھ لاکھ ڈالرز لاگت آئے گی۔''

''ڈیڑھ لاکھ ڈالرز......؟'' رابرٹ کے منہ سے نکلا تھا ''یہ خاصی بڑی رقم ہے۔''

''ہاں' بڑی تو ہے...... لیکن اس کا ریٹرن بھی لاکھوں میں ہوگا۔'' وولی نے اسے تسلی دی ''وادی کے نچلے حصے میں کم سے کم بارہ سو ایکڑ زمین کاشت کی منتظر ہے۔ اگر اس پر فصل لگائی جائے تو زیادہ سے زیادہ دو سال میں تمہاری ساری رقم مع سود کے واپس مل جائے گی۔''

رابرٹ کلاڈ سوچ رہا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا ''میں اس معاملے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اپنے مشیروں سے بات کر کے ہی جواب دوں گا۔''

''تمہاری مرضی۔'' وولی بلٹر نے بے پروائی سے کہا ''میرے ایک بینک سے مزید مذاکرات جاری ہیں۔ ممکن ہے وہ دس فی صد سود پر مان جائیں۔''

''دس فی صد......؟'' کلاڈ کے منہ سے نکلا تھا۔

''ہاں ......'' وولی بلٹر مسکرایا تھا ''عام ریٹ آٹھ نو فی صد سے زیادہ نہیں ہے جبکہ میرا پروجیکٹ بالکل محفوظ ہے۔ یہ میری زمین ہے' میں نے پوری وادی کی ملکیت حاصل کر لی ہے۔''

وولی بلٹر کو اس کام کے لیے خاصے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اسے ثابت کرنا پڑا تھا کہ وادی بالکل غیر ترقی یافتہ تھی اور اسے اپنی رقم خرچ کر کے اسے آباد کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے باوجود اسے وادی انچاس سینٹ فی ایکڑ کے حساب سے خریدنا پڑی تھی۔ تقریباً ستائیس سو ایکڑ اراضی اسے ساڑھے بارہ سو ڈالرز کی پڑی تھی۔ اب یہ پوری وادی اپنی تمام چیزوں سمیت وولی بلٹر کی ملکیت تھی۔ (امریکا اور آسٹریلیا میں سفید فاموں کو زمینیں اسی طرح کوڑیوں کے مول الاٹ کی گئی تھیں) رابرٹ کلاڈ کے لیے دس فی صد نفع خاصا پُرکشش تھا جبکہ اس کی رقم بھی محفوظ رہتی مگر وہ ایک بار اپنے ماہرین سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اگلے روز وہ واپس چلا گیا تھا۔ وولی اور سائیٹ میں بہت بننے لگی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ وولی نے سائیٹ سے کہا تھا۔

''میری خواہش ہے یہ کام تم کرو۔''

''صرف ڈیم ہی نہیں بنانا ہے۔'' سائیٹ نے خبردار کیا ''تم نے ایک بات نہیں سوچی ...... ڈیم بننے کی صورت میں وادی سے باہر جانے کے متبادل راستے پر کام کرنا ہوگا۔''

''میں نے سوچا ہے اور میری نظر میں بائیں سمت کے پہاڑوں سے گزرنے والا راستہ موزوں ہے اور اسے کشادہ کر کے کام چلایا جا سکتا ہے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔'' سائیٹ نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا ''مسٹر بلٹر' تم میں اس کام کی بہت سمجھ بوجھ ہے۔ اگر یہ ڈیم بن گیا تو تم ریاست کے امیر ترین شخص بن سکتے ہو۔''

''مجھے معلوم ہے' اسی وجہ سے میں نے کلاڈ سے بات کی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ رقم دے گا۔''

''مجھے بھی یقین ہے۔ کلاڈ نصف یہودی ہے اور تم نے اسے بہت پُرکشش لالچ دی ہے۔''

دو دن بعد سائیٹ اپنا کام مکمل کر کے واپس چلا گیا۔ اس نے رپورٹ مع اپنے بل کے کلاڈ کو پیش کر دی تھی۔ رابرٹ کلاڈ نے رپورٹ دیکھی' ''سائیٹ! تمہارا کیا خیال ہے مجھے قرض دینا چاہیے؟''

''یہ تمہارا کام ہے ...... تم نے میرے سپرد جو کام کیا تھا' وہ میں کر چکا ہوں۔'' سائیٹ نے شانے اچکائے ''ویسے میں بتا دوں' رقم فراہم ہونے سے بلٹر ڈیم کی تعمیر کا کام میرے سپرد کرے گا۔''

''مجھے اندازہ تھا۔'' رابرٹ کلاڈ مسکرایا ''اسی وجہ سے میں نے وولی بلٹر کو قرض دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

☆☆☆

جولائی کے آخر تک مزدور اور تعمیراتی سامان وادی میں پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ سائیٹ نے بارشوں سے پہلے کام مکمل کرنے کے لیے ڈائنامائٹ اور جدید ترین تعمیراتی مشینری حاصل کی تھی۔ وولی نے اس سے کہا تھا کہ وہ صرف پندرہ مزدور لے' باقی کمی وہ سب مل کر پوری کریں گے۔ اس طرح سے اخراجات کی خاصی بچت ہو رہی تھی۔ شیرن سائیٹ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وولی بلٹر اپنے خاندان کے سارے مردوں کے ساتھ بند کی تعمیر میں شامل تھا۔ کیونکہ مارچ تک ان کے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام تھا بھی نہیں۔

شیرن سائیٹ کام کے آغاز تک مطمئن تھا کہ وہ مقررہ چار مہینے کی مدت میں نہ صرف بند مکمل کر لے گا بلکہ وادی سے باہر جانے والی نئی سڑک بھی مکمل کر لے گا مگر کام شروع ہوتے ہی غیر متوقع رکاوٹیں سامنے آنے لگی تھیں۔ سب سے پہلے سرما نے شدت اختیار کر لی حالانکہ اب موسم کو زوال پذیر ہونا چاہیے تھا۔ پورے چھتیس گھنٹے تک جاری رہنے والی برف باری کی وجہ سے کام تین روز تک رکا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی شدید سردی کی وجہ سے کارکنان کے لیے کام کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ سائیٹ کا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے درّے کے وسطی حصے میں ایک تین فٹ اونچا بند بنا دیا جائے جسے بہ تدریج چھ فٹ اونچا کیا جانا تھا۔ اس دیوار کے اندرونی اور بیرونی حصوں کو پتھروں کی مدد سے پختہ کیا جانا تھا۔ وسط میں گیٹ لگایا جانا تھا جسے پانی کے بہاؤ کو قابو میں کرنا تھا۔ درّے کے کناروں کو مٹی سے بھر کر مضبوط کیا جانا تھا کیونکہ میدان چٹیل تھا اس لیے مٹی کنارے کے پہاڑوں سے حاصل کی جانی تھی۔ اس مقصد کے لیے پانچ گاڑیاں تھیں جنہیں گھوڑے کھینچ رہے تھے۔

سردی کی وجہ سے زمین سخت ہو رہی تھی اور تعمیراتی کام میں سخت رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ ایک مہینے بعد اگست کے آخر تک وہ بہ مشکل دیوار کو تین فٹ تک اونچا کر سکے تھے۔ آنے والے مزدور الگ پریشان کر رہے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ کام موسم بہتر ہونے تک ملتوی کر دیا جائے مگر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اکتوبر میں بارشیں شروع ہو جاتیں' جن سے نہ صرف کام میں رکاوٹ پڑتی بلکہ زیادہ بارش ہونے کی صورت میں نوتعمیر ڈیم کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی تھا۔ مجبوراً سائیٹ کو

مزدوروں کے معاوضے میں پچاس فی صد اضافہ کرنا پڑا تھا۔ برف باری کی وجہ سے راستے خراب ہونے سے سامان کی ترسیل میں بھی رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ پانچ ہفتوں میں صرف اتنا کام ہوسکا تھا جتنا وہ دو ہفتوں میں مکمل کرنے کی توقع کررہے تھے۔

مزدوروں کے خیمے' ان کے مکانات کے پاس لگادیے گئے تھے اور ان کے لیے کھانا بلٹر خاندان کی عورتیں ہی بناتی تھیں۔ سردی سے بچاؤ کے لیے وہ لوگ خیموں میں اسٹوو جلا کر سوتے تھے۔ ستمبر کی آمد کے ساتھ ہی موسم بہتر ہونے لگا اور کام میں تیزی آتی گئی۔ وہ واضح طور پر اپنے مقررہ وقت سے پیچھے تھے اس لیے سائیٹ سب سے پہلے پانی کے بہاؤ کو قابو کرنے والا گیٹ بنانے میں مصروف تھا۔ یہ لگا تار تین فولادی پٹوں والا دروازہ تھا۔ جسے میکنزم کی مدد سے اوپر اٹھا کر پانی کو راستہ دیا جاسکتا تھا۔ گیٹ بند ہونے کی صورت میں پانی ڈیم میں جمع ہوتا رہتا اور اس طرح زیادہ بارشوں کی وجہ سے وادی کا نچلا حصہ تباہ کن سیلاب سے محفوظ رہتا۔ ستمبر کے وسط تک وہ اس قابل ہوگئے تھے کہ درمیانے درجے کی بارش کی صورت میں وادی سیلاب سے محفوظ رہتی۔

وولی بلٹر کام کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ چیز اسے پریشان کررہی تھی کہ رقم توقع سے زیادہ تیزی سے خرچ ہورہی تھی۔ ایک لاکھ ڈالرز لگ چکے تھے اور ابھی تک نصف کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وولی نے اس سلسلے میں سائیٹ سے ایک میٹنگ کی۔ صورتِ حال دونوں کے سامنے تھی۔ اب صرف اس مسئلے کا حل نکالنا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں کلاڈ سے بات کرنی چاہیے۔'' سائیٹ نے تجویز پیش کی۔

''کیا وہ مان جائے گا؟''

''ہاں' اگر اسے اپنے ڈیڑھ لاکھ ڈالرز ڈوبنے سے بچانے ہیں تو اسے مزید رقم فراہم کرنا ہوگی۔''

''ممکن ہے' وہ اپنی مزید رقم کے لیے یہ خطرہ مول نہ لے۔'' وولی بلٹر نے خدشہ ظاہر کیا ''اس صورت میں منصوبہ ادھورا رہ جائے گا' جو لگایا ہے وہ بھی اکارت جائے گا۔''

''تم اس سے بات کرو۔'' سائیٹ نے اصرار کیا ''امکان ہے' وہ مان جائے گا۔ کل میں سیمنٹ اور دوسرے سامان کے لیے برسبین جارہا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

وولی بلٹر جانتا تھا کہ درحقیقت اس کا خواب تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے اور اب کوئی معجزہ ہی ڈیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا۔ ادھورا ڈیم ان کے لیے زیادہ خطرناک تھا' اس کے بیسمنٹ سے پانی آتا اور زیادہ پانی کا دباؤ ڈیم توڑ ڈالتا تو آنے والا سیلاب ان کے مکانات تک بہا کر لے جاتا۔ اس تباہی سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ کسی طرح ڈیم بارشوں سے قبل مکمل کرلیا جائے۔ اس نے سوچا کہ منصوبہ تو خاتمے کے قریب ہے اس لیے کلاڈ سے بات کرنے میں حرج نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ انکار کردے گا۔ اس صورت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ وہ مان جاتا ہے تو...... ان کا منصوبہ بچ سکتا تھا۔

''کتنی رقم کی ضرورت پڑے گی؟'' وولی نے سائیٹ سے پوچھا۔

''تقریباً ایک لاکھ ڈالرز مزید چاہئیں۔ موسم بہتر ہونے پر مزدوروں کو پرانی شرح سے معاوضہ دیا جائے گا۔ اس طرح خاصی بچت ہوسکے گی۔''

وولی نے نفی میں سر ہلایا ''بچت ممکن نہیں ہے کیونکہ اب ہم اپنی زمینوں پر کام کریں گے۔ تمہیں ہماری جگہ اضافی مزدور رکھنے ہوں گے اس لیے معاوضہ بھی زیادہ ہوجائے گا۔''

سائیٹ نے غور کیا ''میں نے مزدور دگنے کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ضائع ہونے والے وقت کا ازالہ ہوسکے۔ اس لیے تم کلاڈ سے مزید ڈیڑھ لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کرو۔ وہ مان گیا تو ٹھیک ہے ورنہ میں ڈیم کی موجودہ حالت بہتر بنانے کی کوشش کروں گا تاکہ وہ بارشوں کا بوجھ سہار سکے۔''

وولی جانتا تھا' اس صورت میں نالے کے ساتھ اور ڈیم کے کنارے والی سڑک کی تعمیر ادھوری رہ جائے گی اور وادی کے نچلے حصے میں واقع جھیل سے پانی کے نکاسی کے راستے کو وسیع کرنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔ اس صورت میں بھی وہ وادی کی زمین کاشت کے لیے مطلوبہ حد تک استعمال نہیں کرسکے گا۔ اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا' کسی طرح کلاڈ کو مزید رقم کی فراہمی پر آمادہ کرے۔ ستمبر کے تیسرے ہفتے میں سائیٹ اور وولی بلٹر برسبین کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ عجلت کی وجہ سے انہوں نے راستے میں رکے بغیر سفر کیا۔ شیرن سائیٹ سیمنٹ اور دوسرے تعمیراتی سامان کی خریداری کے لیے چلا گیا اور وولی نے رابرٹ کلاڈ کے گھر کا رخ کیا کیونکہ اتنی رات گئے اس کا دفتر بند ہی ہوتا۔ رابرٹ کلاڈ اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ بہرحال وہ اسے اندر لے گیا اور موسم کی مناسبت سے وولی کو کافی پیش کی۔ ''خیریت...... اس وقت؟''

''کلاڈ! میں مشکل میں ہوں۔ موسم کی وجہ سے رکاوٹ

آنے کے باعث اخراجات میں اضافہ ہوا ہے۔'' وولی بلٹر نے بلاتمہید کہا تھا ''مجھے مزید رقم کی ضرورت ہے ورنہ منصوبہ نامکمل رہ جائے گا' اس سے مجھے بھی نقصان ہوگا اور تمہیں بھی۔''

''مجھے...... مجھے کیوں؟'' کلاڈ بھڑکا تھا ''تم نے مجھے ضمانت دی تھی۔''

''ہاں...... لیکن میں پوری وادی بیچ کر بھی تمہیں تمہاری رقم واپس نہیں کرسکوں گا۔ عدالت مجھے دیوالیہ قرار دے دے گی۔ اس نقصان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے مزید رقم دی جائے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' رابرٹ کلاڈ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''اور تمہیں کوئی اور بینک بھی قرض نہیں دے گا۔''

''اس صورت میں تم بھی نقصان میں رہو گے۔'' وولی بلٹر نے بھی رکھائی سے کہا ''سوچ لو...... میں واپس برطانیہ چلا جاؤں گا۔ میں اور میرے بچے محنت مزدوری کر کے بھی کما سکتے ہیں مگر تم اپنے شیئر ہولڈرز کو کیا جواب دو گے؟''

رابرٹ کلاڈ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وولی بلٹر درست کہہ رہا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ ڈالرز معمولی رقم نہیں تھی۔ اگر وہ یہ رقم واپس نہ حاصل کر پاتا تو اس کے شیئر ہولڈرز اپنا سرمایہ واپس نکال لیتے اور وہ ناکام ہو جاتا۔ وہ رات بھر وولی بلٹر سے الجھتا رہا' اس سے جھگڑتا رہا۔ بوڑھا کسان اس بینکار کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اسے قائل کرتا رہا۔ آخر کار رابرٹ کلاڈ راضی ہوگیا۔ اس نے شرائط لگانے کی کوشش کی۔

''میں ایک لاکھ ڈالرز دوں گا اور اس پر بارہ فی صد سالانہ کے حساب سے سود لوں گا۔''

''میں بارہ فی صد سود دینے کے لیے تیار ہوں لیکن رقم ڈیڑھ لاکھ ڈالرز چاہیے۔ منصوبے پر کام تیز کرنے کے لیے اتنی ہی رقم کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت میں آنے والی بارشیں اب تک ہونے والا سارا کام بہا کر لے جائیں گی۔ ڈیڑھ لاکھ ڈالرز سے کم رقم دینے کا مطلب ہے اسے بھی ڈبو دینا۔''

رابرٹ کلاڈ سمجھ گیا تھا۔ بڈھا ماننے والوں میں سے نہیں ہے اور اس کا موقف بھی درست ہے۔ اس نے بادل نخواستہ رضامندی ظاہر کی ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ڈیڑھ لاکھ ڈالرز دوں گا لیکن ایک نظر ہونے والے کام پر بھی ڈالوں گا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وولی بلٹر نے جواب دیا تھا۔

اگلے روز شام کے وقت وولی واپس ہوا۔ رابرٹ کلاڈ بھی اس کے ساتھ تھا۔ شیرن سائیٹ خریدا جانے والا سامان وادی تک لے جانے کے انتظامات میں مصروف تھا۔ رابرٹ کلاڈ کو تعمیراتی کام دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی ''دو مہینوں میں ڈیڑھ لاکھ ڈالرز پھونک کر تم لوگوں نے یہ کیا ہے؟'' وہ سخت غصے میں تھا۔

''موسم نے سب سے زیادہ رکاوٹ ڈالی۔ ہمیں مزدوروں کو پچاس فی صد زیادہ معاوضہ دینا پڑا تھا۔ باربرداری کے اخراجات بھی اندازے سے کہیں زیادہ ثابت ہوئے۔'' وولی بلٹر وضاحت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

رابرٹ کلاڈ نے واٹر گیٹ کا جائزہ لیا ''اتنی سی دیوار کے ساتھ یہ اونچا گیٹ بنانے کی کیا تک تھی؟''

''ابھی دیوار مزید اونچی کی جائے گی۔'' وولی نے اسے آگاہ کیا ''تم دیکھنا' جب یہ ڈیم بن جائے گا تو صرف وادی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بھی علاقہ سرسبز و شاداب ہوجائے گا۔''

''فی الحال تو ایسا لگ رہا ہے یہ ڈیم میری زندگی کو بنجر نہ بنادے۔'' رابرٹ کلاڈ نے سرد آہ بھری ''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔''

''دیکھو کلاڈ! کچھ لوگ سوچنے میں وہ وقت گنوا دیتے ہیں جو کچھ کرگزرنے کا ہوتا ہے۔ ممکن ہے تمہارا ایک فیصلہ تمہارا نام امر کردے۔''

کلاڈ کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں ''میں ایک شرط پر مزید قرض دوں گا۔ اس ڈیم کا نام میرے بینک کے نام پر رکھا جائے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' وولی نے فوری طور پر کہا ''لیکن اس میں بلٹر کا نام بھی شامل ہوگا۔''

''مجھے منظور ہے'' کلاڈ نے جواب دیا اور یوں طے پایا کہ تکمیل کے بعد اس ڈیم کا نام کلاڈ بلٹر یونین بینک ڈیم ہوگا۔ جانے سے پہلے رابرٹ کلاڈ نے ایک تختی پر یہ نام لکھ کر ڈیم کے اوپری حصے میں نصب کروادیا تھا۔

☆☆☆

سائیٹ نے تیس کے بجائے چالیس مزدور لیے اور ان کا کیمپ ڈیم کے اوپری حصے میں منتقل کردیا۔ تمام تعمیراتی سامان آچکا تھا۔ ڈائنامائیٹ کی مدد سے پتھر توڑے جارہے تھے اور زمین کھودی جارہی تھی۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے تک ڈیم کی اونچائی پانچ فٹ کردی گئی تھی اور اس کے دونوں جانب کی دیواریں دس دس گز چوڑی تھیں' پتھروں کو سیمنٹ کی مدد سے

دیوار میں جمایا گیا تھا۔ بارشیں ہونے میں ابھی ہفتہ تھا۔ وادی کے نچلے حصے میں بلٹر نے زمین ہموار کر کے اس پر سبزیاں اور گندم لگا دی تھی۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے کے اختتام تک ڈیم کی اونچائی چھ فٹ تھی۔ سائیٹ نے وولی بلٹر کو بتایا کہ ایک بار بھرنے کی صورت میں ڈیم میں اتنا پانی جمع ہو جائے گا جو پانچ ہزار ایکڑ زمین کی چار سال کے پانی کی تمام ضرورت پوری کر سکے گا اور ڈیم کی اونچائی دس فٹ کر دی جائے تو دس ہزار ایکڑ زمین پانچ سال تک سیراب ہو سکے گی۔

رابرٹ کلاڈ نے فوری طور پر رقم فراہم کر دی تھی اور اس وجہ سے زور وشور سے تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا۔ سائیٹ نے ڈیم کے ساتھ وادی کی طرف آنے والے راستے کی بہتری کی طرف بھرپور توجہ دی تھی اور درّے سے ایک پکی سڑک ڈیم کے بائیں حصے سے ہوتی نیچے تک جاتی تھی۔ ساتھ ہی جنگل کے ساتھ نالے کو بھی کناروں سے پختہ کیا جا رہا تھا تا کہ جنگل پانی کے کٹاؤ سے محفوظ رہے۔ جنگل کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے نالے سے متعدد چھوٹی نالیاں نکالی گئی تھیں جو پورے جنگل کا چکر لگا کر واپس نالے میں گرتی تھیں۔ بہترین معاوضہ ملنے کی وجہ سے مزدور پوری طرح تعاون کر رہے تھے اور اسی وجہ سے خاصا کام نمٹ چکا تھا۔

سترہ اکتوبر کی شام بادل گھر کر آئے اور رات بارہ بجے قیامت خیز بارش شروع ہوگئی۔ مزدور اپنے کیمپ میں تھے، تمام تعمیراتی سامان، اوزار اور کیمپ محفوظ مقام پر تھے۔ صبح تک ڈیم میں فٹ بھر پانی جمع ہو چکا تھا۔ خطرے کے پیشِ نظر مزدور بوریوں میں ریت اور پتھر لا کر ڈیم کی دیوار کے ساتھ ڈال رہے تھے تا کہ وہ مضبوط رہے۔ وولی اور اس کے بیٹے بھی اس کام میں مصروف تھے۔ سائیٹ نے بارش کا انداز دیکھ کر تشویش ظاہر کی تھی۔ شاید ڈیم اگلے چوبیس گھنٹے میں بھر جاتا۔ شام سات بجے تک ڈیم میں تین فٹ پانی جمع ہو چکا تھا اور اب نقل وحرکت صرف کناروں تک ممکن تھی۔ مزدور اور وولی بلٹر کے خاندان کے مرد مسلسل پتھر اور مٹی دیوار کے اندرونی حصے میں ڈال رہے تھے اور دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ بارش رک جائے ورنہ ڈیم کا خدا ہی حافظ تھا۔

''اگر ڈیم مکمل طور پر بھر جائے تو......'' وولی بلٹر نے سائیٹ سے پوچھا۔ دونوں اس وقت برستی بارش میں ڈیم کی دیوار پر کھڑے تھے۔

''تب ڈیم ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔'' سائیٹ نے اعتراف کیا ''لاکھوں ٹن پانی کا دباؤ دیوار کو بہا کر لے جائے گا اور تین لاکھ ڈالرز پانی میں مل جائیں گے۔''

''تین لاکھ ڈالرز ہی نہیں......ہم سب بھی پانی میں مل جائیں گے۔ کوئی راستہ نہیں ہے۔'' وولی نے تصحیح کی۔

''راستہ ہے۔ جیسے ہی سطح آب پانچ فٹ تک آئے گی، ہم ڈیم کے دروازے کھول دیں گے، اس طرح پانی نیچے جھیل کی طرف جائے گا۔''

''اور جھیل پوری وادی میں پھیل جائے گی۔'' وولی بلٹر نے تلخی سے کہا تھا ''اس کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے، یہ پانی وادی سے باہر کیسے جائے گا؟''

''میرا خیال ہے، جھیل میں نکاسی کے راستے کو ڈائنامائٹ سے وسیع کر دیا جائے، اس طرح وادی میں پانی بھرنے کا خطرہ نہیں رہے گا۔''

''تب یہ کام فوری طور پر کرنا چاہیے۔'' وولی بلٹر نے ڈیم میں پانی کی بڑھتی سطح دیکھ کر کہا۔

سائیٹ نے اپنے نائب روڈی واکر کو ساتھ لیا اور جھیل کی طرف روانہ ہوگیا۔ انہوں نے ڈائنامائٹ کے بکس اور بیٹری ساتھ لے لی تھی۔ ڈائنامائٹ کچھ عرصے پہلے منظرِ عام پر آئے تھے اور فوری طور پر مقبول ہو گئے تھے۔ بڑے تعمیراتی منصوبوں میں ڈائنامائٹ کی شمولیت سے کام کی رفتار حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے سرنگ سازی میں اس نے کمال دکھایا تھا۔ سائیٹ اور واکر کشتی کے ذریعے جھیل کے دوسری طرف واقع سوراخ تک پہنچے تھے، جس سے جھیل کا پانی نکل کر آگے وسیع وعریض میدانوں کی طرف جاتا تھا۔ یہ سوراخ سو فٹ اونچے اور اتنے ہی چوڑے پہاڑ میں سرنگ کی طرح گزرتا تھا۔ آغاز میں اس سرنگ کی چوڑائی کئی گز سے زیادہ تھی مگر اختتام پر یہ محض چند فٹ کا سوراخ رہ جاتا تھا۔ سرنگ کے اس حصے کو ڈائنامائٹ لگا کر بڑا کر کے جھیل سے پانی کے اخراج کو تیز کیا جا سکتا تھا۔

''میں جاتا ہوں۔'' واکر نے رضاکارانہ اپنی خدمت پیش کی ''مجھے تیراکی بھی آتی ہے۔''

''ٹھیک ہے......لیکن پہلے ہمیں کشتی سوراخ کے اندر ممکنہ حد تک لے جانی چاہیے۔ اس طرح میں تمہیں روشنی دکھا سکوں گا۔'' سائیٹ بولا۔ وہ کشتی کو سرنگ کے اندر لے گئے۔ یہاں پانی اتھلا تھا۔ واکر نے درجن بھر ڈائنامائٹ اسٹکس نکال کر اپنی بیلٹ میں اڑس لیں۔ تاروں کے گچھے اس نے اپنے شانے پر لاد لیے تھے۔ سائیٹ نے اسے چار چار اسٹکوں کا بنڈل بنانے کو کہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دو عدد تیز روشنی والے لیمپ لائے تھے۔ ایک لیمپ واکر نے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ گھٹنوں سے کچھ اوپر پانی میں سرنگ کے دہانے کی

طرف بڑھا۔ یہ جگہ کشتی سے فاصلے پر تھی۔ آگے اتنا پانی نہیں تھا جس میں کشتی چل سکتی۔ واکر نے ایک بنڈل دہانے کے ساتھ نصب کیا۔ اس میں تاریں لگائیں اور باقی دو بنڈل اس سے ذرا فاصلے پر نصب کر کے وہ تاریں کھولتا واپس کشتی تک آیا۔

''کام ہوگیا ہے۔'' اس نے کشتی پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ وہ تاریں کھولتے ہوئے باہر تک آئے۔ کشتی کو جھیل میں محفوظ فاصلے تک لے جا کر انہوں نے تار میں بیٹری جوڑ دی۔ فوراً ہی دھماکا ہوا اور پتھر اُڑ کر جھیل تک آئے تھے۔ جب گرد و غبار بیٹھا تو انہوں نے سرنگ میں دیکھا۔ اگلا حصہ ٹوٹے پتھروں سے بھر گیا تھا۔ واکر اور سائیٹ کشتی کو ممکنہ حد تک اندر لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ پیدل اتر کر آگے بڑھے۔ پتھروں نے نچلا حصہ بند کر دیا تھا مگر سرنگ کا آخری حصہ دو گز سے بھی زیادہ کشادہ ہوگیا تھا۔ سائیٹ نے پتھروں کا معائنہ کیا اور اطمینان سے سر ہلایا ''اگر جھیل میں پانی بڑھا تو اس کا دباؤ خود ان پتھروں کو بہا لے جائے گا۔''

وہ لوگ واپس آئے۔ بارش کی وجہ سے وسطی اور نچلے حصے کا پانی جمع ہونے سے جھیل کی سطح بڑھ رہی تھی۔ رات بارہ بجے انہوں نے ڈیم کا معائنہ کیا۔ اب پانی دیوار سے صرف دو فٹ نیچے تھا۔ سائیٹ نے فیصلہ کیا کہ پانی کے مزید بڑھنے کا انتظار کیے بغیر گیٹ کھول دینے چاہئیں تاکہ دیوار پر پانی کا دباؤ کم ہو۔ اس نے چار مزدوروں کو روانہ کیا کہ وہ گیٹ کے میکنزم کو حرکت دے کر پانی کو روکنے والی فولادی چادروں کو اوپر کر دیں مگر نصف گھنٹے بعد وہ مزدور ہانپتے ہوئے واپس آئے۔

''جناب! گیٹ نہیں کھل رہا ہے۔'' انہوں نے سائیٹ کو مطلع کیا۔

''تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔'' سائیٹ دہاڑا تھا ''گیٹ کیوں نہیں کھل رہا؟''

ایک مزدور نے جواب دیا ''ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن اس کا میکنزم کام نہیں کر رہا ہے۔''

برستی بارش میں سائیٹ، واکر اور وولی بلٹر دوڑتے ہوئے ڈیم کے گیٹ تک پہنچے۔ اسے کھولنے والا میکنزم اس کے اوپر ہی تھا۔ مزدوروں نے پھر کوشش کی۔ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر چرخی پر زور لگانے لگے، جس سے گیٹ کھلتا تھا، مگر گیٹ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ سائیٹ نے متفکر ہو کر گیٹ کا معائنہ کیا۔ بظاہر کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت پانی دیوار کی سطح سے فٹ سے ذرا زیادہ نیچے تھا۔ گیٹ نہ کھلنے کی وجہ سے پورا بند ہی شدید خطرے سے دوچار ہوگیا تھا۔ چرخی اور اس سے منسلک فولادی زنجیریں بالکل درست حالت میں تھیں۔ بس لوہے کے تین متوازی پٹ اوپر ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ان میں سے ہر پٹ انچ بھر موٹا اور دو ٹن سے زیادہ وزنی تھا۔ دروازوں میں جہاں لوہے کے پٹ تھے کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''کچھ کرو ورنہ پورا ڈیم بہہ جائے گا۔'' وولی بلٹر چلا رہا تھا ''ہم تباہ ہو جائیں گے۔''

''میں کیا کروں، جب کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے ہمیں گیٹوں کے نچلے حصے چیک کرنے چاہئیں۔'' واکر نے تجویز پیش کی ''میری کمر سے رسہ باندھ دیا جائے تو میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔''

ایک رسہ واکر کی کمر سے باندھ دیا گیا۔ اس نے دیوار سے پانی میں چھلانگ لگائی اور پھر غوطہ لگا کر زیرِ آب گیٹ کے نچلے حصے کو ٹٹولنا شروع کیا تھا کہ اسے مسئلے کی وجہ مل گئی۔ گیٹ کے سامنے کئی فٹ اونچی مٹی کی تہ جمع ہو چکی تھی اور اس کے دباؤ سے گیٹ اوپر نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ مٹی نہ صرف سامنے تھی بلکہ گیٹ کے اندر بھی گھس چکی تھی اور تینوں پٹوں کو جام کر دیا تھا۔ اس نے اوپر آ کر سائیٹ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''مزید مٹی جمع ہو رہی ہے اور ہم اسے کسی صورت صاف نہیں کر سکتے۔''

سائیٹ نے تیزی سے معاملے پر غور کیا اور وولی بلٹر کی طرف گھوما ''ہمیں ڈیم کو بچانے کے لیے اس کا گیٹ اُڑانا پڑے گا۔''

''میرے خدا!'' وولی کے منہ سے نکلا تھا ''لیکن کیا ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں کہ ہم گیٹ دوبارہ بنا سکیں؟''

''فی الوقت مسئلہ ڈیم بچانے کا ہے۔ پانی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور اس سے ڈیم کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اس کی دیواریں اتنا دباؤ برداشت نہیں کر سکیں گی۔''

وولی بلٹر کو ایک بار پھر اپنے خواب مٹی اور پانی میں ملتے محسوس ہو رہے تھے۔ قدرت اس کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ سوچنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب پانی ڈیم کی دیوار سے چند انچ نیچے رہ گیا تھا۔ بیسمنٹ میں پانی کی مقدار زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھی کیونکہ دور دراز کا پانی بھی ڈیم میں آنا شروع ہوگیا تھا۔ صبح چار بجے کے قریب واکر نے گیٹ میں ڈائنا مائٹ لگا دیا تھا۔ سو گز کے فاصلے سے جیسے ہی بیٹری سے تار جوڑے، گیٹ کے پرزے فضا میں بلند ہوئے تھے اور اس

کے ساتھ ہی پانی کا ریلا برساتی نالے میں داخل ہوا تھا۔ چنگھاڑتا یہ پانی ایک منٹ سے بھی کم وقت میں نیچے تک جا پہنچا تھا۔ کیونکہ نالے میں اتنا پانی سنبھالنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے پانی کناروں سے ابل کر وادی میں پھیل رہا تھا۔ وولی بلٹر تصور کی آنکھ سے اپنے نوکاشت کھیتوں کو برباد ہوتے دیکھ رہا تھا، جس پر گندم کی فصل نے سر اٹھالیا تھا۔

بارش کی وجہ سے تیز گیس لیمپ کی روشنی میں چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس لیے پانی کے ریلے نے نیچے وادی کا کیا حال کیا تھا' اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا تھا۔ البتہ روشنی میں وہ اتنا دیکھ سکتے تھے کہ ڈیم میں پانی کی سطح بڑھنے سے رک گئی تھی۔ یہ واحد اطمینان بخش بات تھی۔ مگر ڈیم کے ادھورے رہ جانے کے تصور سے وولی بلٹر کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ گیٹ بنوانے پر تقریباً تیس ہزار ڈالرز کا خرچ آیا تھا اور دوسرے ڈیڑھ لاکھ ڈالرز میں سے مشکل سے پچاس ہزار ڈالرز کی رقم بچی تھی۔ ابھی ڈیم کو اونچا کرنے کے ساتھ سڑک کی تعمیر کا کام باقی تھا۔

سائیٹ کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ اس ڈیم کی تعمیر سے اس نے بھی بے شمار امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ اس کا کام مندا جارہا تھا اگر یہ ڈیم کامیاب ہوتا تو اس کا بزنس دوبارہ چمک سکتا تھا۔ یہ امید اب خاک میں ملتی نظر آرہی تھی۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو آسمان پر بادل ہلکے ہوچکے تھے۔ بارش کا زور ٹوٹنے سے ڈیم میں پانی کی سطح اب کم ہورہی تھی۔ سائیٹ نے روشنی ہوتے ہی تباہ شدہ گیٹ کا جائزہ لیا۔ ڈائنامائٹ کے طاقت ور دھماکے نے اسے مع بنیاد کے غائب کردیا تھا۔ رہی سہی کسر پانی کے دھارے نے پوری کردی تھی۔ گیٹ کے دونوں طرف کئی گز کی دیوار کاٹ کر رکھ دی تھی۔

نیچے وادی کا منظر اور بھی مایوس کن تھا۔ سوائے رہائشی مکانات کے ہر جگہ پانی نے قبضہ کررکھا تھا۔ کھیت برباد ہوگئے تھے۔ گندم کی فصل سر اٹھانے سے پہلے ہی تباہ ہوچکی تھی۔ دوسری مرتبہ ایسا ہوا تھا۔ وولی بلٹر اپنے آنسو ضبط کررہا تھا۔ جبکہ چارلس دھاڑیں مار کر رونے لگا تھا۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ سائیٹ نے وولی بلٹر کو تسلی دی۔

”تم فکر مت کرو، میں دوبارہ گیٹ کی تعمیر کا کام شروع کرتا ہوں۔“

وولی نے نفی میں سر ہلایا ”کم سے کم اس موسمِ برسات میں یہ ممکن نہیں ہے' شاید دسمبر میں ممکن ہو لیکن دوست! اب میرے پاس اس بند پر لگانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

سائیٹ جانتا تھا' اس کے پاس وولی کو دینے کے لیے سوائے تسلی کے اور کچھ نہیں ہے۔ دوپہر تک وادی کے بیشتر حصوں سے پانی اتر چکا تھا۔ جھیل کے پانی کی نکاسی کا راستہ بڑا کرنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ اب سیلاب کا پانی چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں رکتا تھا۔ نومبر کے پہلے ہفتے تک سائیٹ اوپری سڑک کا کام مکمل کرکے واپس برسبین چلا گیا تھا۔ تباہ ہوجانے والے گیٹ کے سامنے اس نے پتھروں کی مدد سے چار فٹ اونچا پشتہ بنادیا تھا کہ اس موسم میں اگر پھر شدید بارش ہوتو ڈیم کے بقیہ حصوں کو نقصان نہ ہو اور وادی دوبارہ سیلاب کی زد میں نہ آئے۔ ان پتھروں کے درمیان اس نے نکاس کے راستے بھی رکھے تھے تاکہ پانی بہ تدریج نکلتا رہے' جب برسبین پہنچ کر سائیٹ نے رابرٹ کلاڈ کو ناکامی کی خبر دی تو اس پر بجلی سی گری تھی۔ وہ بھاگم بھاگ وادی پہنچا جہاں وولی اور اس کے بیٹے از سرِ نو اپنے کھیت آباد کررہے تھے۔ انہوں نے مکئی' سورج مکھی اور مونگ پھلی کاشت کردی تھی۔ جبکہ ایک طرف آلو' شکر قندی اور شلجم بھی لگادیے تھے۔

”میرے تین لاکھ ڈالرز......!“ کلاڈ نے چھوٹتے ہی رودینے والے انداز میں کہا تھا ”میرے کلائنٹ مجھے نوچ کر کھاجائیں گے۔“

”مجھے افسوس ہے' مگر حالات اس وقت میرے قابو سے باہر ہیں۔ تم مجھے چند مہینے کی مہلت دو۔“

”ان چند مہینوں میں تم کیا کرلوگے؟“ کلاڈ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے تب تمہاری جو مرضی آئے کرو۔“ وولی بلٹر نے خشک لہجے میں کہا تھا۔

رابرٹ کلاڈ جانتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ مقدمہ کرنے سے صرف اتنا ہوگا کہ وولی بلٹر اپنی ساری ملکیت سے اس کے حق میں دستبردار ہوجاتا اور اس سے کل رقم کا دسواں حصہ بھی وصول نہیں ہوتا اس لیے وہ وولی بلٹر کو بادل نخواستہ تین مہینے کی مہلت دے کر واپس لوٹ گیا تھا۔ کارل نے مکانات میں مزید کمرے بنادیے تھے۔ عقبی حصے میں چار عدد لیٹرین بنائے گئے تھے اور اب وہ گودام کی تکمیل میں مصروف تھا۔ عورتوں نے مکانات والے چبوترے کی ساری فاضل زمین سبزیوں سے بھردی تھی اور انہیں اپنے لیے کوئی سبزی باہر سے نہیں منگوانی پڑتی تھی۔ اسٹرابیری کے پودے بڑے ہورہے تھے اور سفیدے کے درخت چبوترے کے چاروں طرف سروں سے اوپر نکل گئے تھے۔ نومبر کے آغاز تک بارشوں کا سلسلہ جاری رہا تھا لیکن خوش قسمتی سے کوئی بارش اتنی تیز نہیں ہوئی تھی کہ وادی کے نچلے حصے میں سیلاب آتا۔

فارغ اوقات میں بلٹر خاندان کے افراد برساتی نالے کو گہرا کرنے، اس سے نالیاں نکال کر کھیتوں تک لانے اور وادی کے اوپری حصے میں تعمیر کی جانے والی سڑک کی مرمت اور اسے پتھروں سے پختہ کرنے کا کام تھے۔ جھیل کے پانی کی نکاسی کے راستے کو بھی مزید کشادہ کیا تھا۔ اب بارش کا پانی فوری طور پر اس راستے سے نکل جاتا تھا۔ کھیتوں کو ندی کی باڑھ سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے کناروں کو مٹی اور پتھروں سے اونچا کردیا گیا تھا۔ دسمبر کے آخر تک فصلیں خاصی بڑھ گئی تھیں۔ اس دوران میں وولی بلٹر مستقل سوچتا رہا تھا کہ ڈیم کی تکمیل کی کیا صورت نکالے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اس وادی سے بے دخل ہونے سے بچ سکتا تھا۔ تمام تر مشکلات اور ناکامیوں کے باوجود اسے اور اس کے بچوں کو اس وادی سے پیار ہوگیا تھا جس کا نام انہوں نے بلٹر ویلی رکھ دیا تھا۔ یہ ان کا گھر بن گیا تھا اور وہ اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

وولی بلٹر کو حکومت نے ابتدا میں دو سو بھیڑیں دی تھیں۔ ان کی اچھی پرورش اور دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی تعداد بڑھ کر تین سو سے زیادہ ہوگئی تھی اور اب بھیڑیں اون سے لدی پھندی تھیں۔ وولی جب انہیں دیکھتا تو فخر سے اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے کہا ”میں یہ ساری بھیڑیں بیچنا چاہتا ہوں۔ اس سے حاصل شدہ رقم سے ہم ڈیم کا گیٹ بنواسکتے ہیں اور رفتہ رفتہ خود ڈیم کی دیوار کو اونچا اور مضبوط کرسکتے ہیں۔ تم لوگوں کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟“

انہوں نے آپس میں بحث کی اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ انہیں یہ رسک لے لینا چاہیے۔ ان کے پاس کچھ رقم تھی اور باقی وہ بھیڑوں کی فروخت سے حاصل کرسکتے تھے۔ گرمیاں آگئی تھیں اور ابھی بارشوں میں تین مہینے باقی تھے۔ انہیں امید تھی کہ اس دوران میں وہ نہ صرف گیٹ مکمل کرلیں گے بلکہ ڈیم کی اونچائی بڑھا کر سیلاب کا مستقل سدِباب کردیں گے۔ فیصلہ ہوتے ہی وولی اور اس کے بیٹے بھیڑیں لے کر برسبین کی طرف روانہ ہوگئے کیونکہ وہیں ان کو سب سے اچھے دام مل سکتے تھے۔

☆☆☆

وولی بلٹر نے بیس ہزار ڈالرز کی رقم شیرن سائیٹ کے سامنے رکھی تھی۔ ”اگر ہم سب تمہارا ساتھ دیں تو کیا اس رقم سے ڈیم پر گیٹ لگ سکتا ہے؟“

شیرن نے سوچا اور سر ہلایا ”بن سکتا ہے۔“

”تب تم فوری طور پر یہ کام کرو۔“ وولی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا ”ہمیں بہرصورت آنے والی بارشوں سے پہلے ڈیم مکمل کرنا ہے۔ کچھ تعمیراتی سامان میں لے جارہا ہوں، باقی تم لے کر آؤ۔“

جنوری کے دوسرے ہفتے تک جب ڈیم میں شدت کی گرمی کے باوجود دو فٹ پانی کھڑا تھا۔ گیٹ لگانے کا کام مکمل ہوگیا۔ اس بار احتیاطاً ایسے انتظامات کرلیے گئے تھے کہ دروازے کے آگے مٹی جمع ہوکر اسے جام نہ کردے۔ یہ گیٹ اتنا بڑا اور اونچا تھا کہ دس فٹ تک پانی سنبھال سکتا تھا۔ ڈیم کے پانی سے نیچے وادی میں زمینوں کی سینچائی جاری تھی۔

فروری کے آخر تک ڈیم کی دیوار سات فٹ سے زیادہ اونچی کی جاچکی تھی۔ شیرن سائیٹ نے دیوار سے باہر والے حصے پر سریا ملی کنکریٹ کی تہ چڑھانے کی تجویز پیش کی تھی، اس سے ڈیم ٹوٹنے کے خدشے سے مکمل طور پر محفوظ ہوجاتا۔ مگر اس کے لیے خاصی بڑی رقم درکار تھی۔

مارچ کے وسط میں وولی بلٹر نے رابرٹ کلاڈ کو اس کے بینک میں قرض کی پہلی قسط بیس ہزار ڈالرز ادا کی تو اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مارچ، اپریل کی بارشوں میں ڈیم مکمل طور پر بھر گیا تھا اور وادی سیلاب سے محفوظ رہی تھی۔ وولی بلٹر نے چار عدد مزدور ملازم رکھے اور ان کی مدد سے وسطی وادی میں جنگل صاف کرکے اس میں کھیت بنانے شروع کردیے۔ اوپری سڑک کی پختگی کا کام بھی جاری تھا۔

اگلے تین سال میں نہ صرف بینک کا قرض اتر گیا بلکہ ڈیم کی بیرونی دیوار پختہ کرکے اس کی اونچائی دس فٹ سے زیادہ کردی گئی۔ ڈیم میں ایک بار بھرنے کے بعد اتنا پانی ذخیرہ ہوجاتا تھا جو دس ہزار ایکڑ زمین کی تین سال تک کی کاشت کے لیے کافی تھا۔ پوری وادی سے جنگلات کا صفایا کرکے اور زمین ہموار کرکے اسے زیرِ کاشت لایا گیا تھا۔ وولی بلٹر خاندان بائیں طرف واقع ڈھلان کی اوپری محفوظ سطح مرتفع پر منتقل ہوگیا تھا۔ وہاں انہوں نے عالی شان بلٹر ولا بنایا تھا۔ جب وولی بلٹر کا ستر سال کی عمر میں انتقال ہوا تو بلٹر ولا میں اس کی بائیس اولادیں آباد تھیں۔

جھیل کو دوسرا ڈیم بنا کر بلٹرز نے وادی کے باہر بھی ہزاروں ایکڑ زمین آباد کی تھی۔ آج بلٹر ویلی اور اس کے آس پاس آباد لوگ وولی بلٹر کو اپنا محسن مانتے ہیں جس نے حوصلے اور تدبر سے کام لے کر اس سنگلاخ علاقے کو گل وگلزار بنادیا تھا۔

کاشف زبیر

خداوند قدوس نے انسان کو شعور کی دولت ودیعت کی تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کرسکے۔ وہ نوجوان بھی عقل و شعور رکھتا تھا لیکن یقین کامل سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یقین و ایمان کی اس منزل تک پہنچ نہیں پایا جس کی جستجو میں وہ صوفیانہ زندگی کے خار زار میں اترا تھا۔

صوبہ بنگال کی ایمان افروز کتھا

مشتاق نے بےزاری سے شاہ بابا کو دیکھا۔ وہ اس وقت وسطی بنگال کے ایک علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ اس دشوار اور خشک پتھریلے علاقے میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے جب وہ پیدل ہوں۔ ان کے پاس ایک ہی خچر تھا جس پر ان کا سامان لدا ہوا تھا اور سامان اتنا تھا کہ اس کے ساتھ وہ خچر پر اپنا بوجھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ اگر مشتاق اکیلا ہوتا تو خچر پر سوار ہونے سے گریز نہیں کرتا لیکن شاہ بابا کے ہوتے ہوئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسے خچر کے ساتھ اس زیادتی کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ دو سال پہلے جب مشتاق شاہ بابا کے ساتھ شامل ہوا تھا تو اس وقت وہ بڑا خوش تھا، بہت جوش اور سنسنی محسوس کرتا تھا لیکن اب اس کا سارا جوش و ولولہ ختم ہوگیا تھا۔

گرم خشک موسم اور اوپر سے قہر برساتا سورج عین ان کے سر پر تھا۔ مشتاق سے اس وقت اگر اس کی سب سے بڑی خواہش پوچھی جاتی تو وہ یقیناً کسی سایہ دار جگہ پر آرام کی خواہش کا اظہار کرتا۔ شاہ بابا کے ہوتے ہوئے دونوں خواہشیں مشکل سے ہی پوری ہوسکتی تھیں۔ وہ سارا دن سفر کرتے اور اس وقت کہیں قیام کرتے جب تاریکی کی وجہ سے سفر ممکن نہ رہتا۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے وہ ہر طرح سے تیار ہوجاتے تھے اور جیسے ہی ذرا روشنی ہوتی وہ سفر پر

روانہ ہوجاتے۔

1390 میں بنگال ایک دور دراز اور بہت کم آبادی والا ملک تھا۔ جگہ جگہ ندی نالے اور جھیلیں تھیں۔ یہاں بڑے شہر چند ایک تھے اور اکثر آبادی دور دراز خطوں میں تھی اور سفر کے لیے راستے نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ پسماندہ تھے اور دوسرے علاقوں میں سفر کم ہی کرتے تھے۔ شاہ بابا نے بچپن ہی میں مبلغ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا اور حمید الدین ناگوری کے سلسلہ چشت سے بعیت یافتہ ہونے کے بعد انہوں نے تبلیغ کے لیے بنگال کو منتخب کرلیا جہاں کی تہذیب اور زبان یکسر مختلف تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ دہلی میں بیٹھ کر تبلیغ کرنے کی بجائے سفر کرکے لوگوں کو دین کی طرف راغب کریں گے اور ان کے مذہبی مسائل حل کریں گے کیونکہ جنوب میں بنگال کے بے شمار دیہات ایسے تھے جہاں کوئی دین کا صحیح علم رکھنے والا نہیں تھا اور وہاں لوگوں کی دین سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں بھی ہر طرف غیر مسلموں کی آبادی تھی۔ شاہ بابا ان لوگوں کو دین کی طرف راغب رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انسان کو رہنمائی نہ ملے تو اس کے بھٹک جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو گمراہی سے بچانا چاہتے تھے۔

نوجوان شاہ بابا نے ایک عدد خچر لیا اور گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو دین کے اسباق پڑھانے لگے۔ شروع میں انہیں بہت مشکل پیش آئی تھی کیونکہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا اور جوانی کی بہت ساری راتیں انہوں نے بھوک سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے حالات بہتر ہوئے۔ وہ جس گاؤں میں جاتے تھے۔ وہاں لوگ ان کو خوراک اور کچھ رقم کی صورت میں زادِ راہ مہیا کردیتے۔ جب ان کے کپڑے خراب ہونے لگتے تو خدا کا کوئی نہ کوئی نیک بندہ ان کو نئے کپڑے بنوا دیتا تھا۔ گزشتہ بیس سالوں میں ان کے دو خچر اپنی طبعی عمر پوری کرکے وفات پاچکے تھے اور اب یہ تیسرا خچر تھا۔ جب ان کا ایک خچر مرجاتا تو کوئی مخیر شخص ان کو دوسرا خچر مہیا کردیتا تھا۔ خچر اس وجہ سے ان کا پسندیدہ جانور تھا کیونکہ اصحابؓ کرام اس پر سفر کرتے تھے۔

شاہ بابا نے فیصلہ کیا تھا وہ کبھی کوئی گھر نہیں بنائیں گے، کوئی تیسرا لباس نہیں بنائیں گے، کبھی تین دن سے زیادہ کی خوراک اپنے پاس نہیں رکھیں گے اور کبھی اپنے پاس دس اشرفی سے زیادہ کی رقم نہیں رکھیں گے اور سب سے اہم اصول جو شاہ بابا نے اپنایا تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔ وہ رات کو ہمیشہ کھلے آسمان تلے سوتے تھے اور گزشتہ بیس سال میں انہوں نے ایک رات بھی کسی چھت تلے نہیں گزاری تھی۔ جب سردیوں کا موسم آتا اور جنوب سے لے کر وسطی علاقہ بارش سے بھیگنے لگتا تو وہ صوبہ بہار کی طرف چلے جاتے۔ جب وہاں بے پناہ سردی ہوتی تو مشرق میں موسم معتدل ہوتا ہے اور وہ یہاں آجاتے۔

رفتہ رفتہ شاہ بابا بنگال کے دیہات میں مقبول ہوتے گئے یہاں کا ہر فرد اگر شکل سے نہیں تو نام سے ان کو پہچانتا تھا۔ اس لیے وہ کسی بھی گاؤں میں جاتے تو ان کا والہانہ استقبال ہوتا تھا۔ اب تک شاہ بابا اکیلے ہی تھے۔ دو سال پہلے وہ مغربی بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچے جو انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے وہاں بارش کی بہتات تھی۔ یہاں سال کے چھ مہینے بادل چھائے رہتے تھے اور صرف مارچ سے اکتوبر تک موسم بہتر ہوتا تھا۔ زمین کی حالت اچھی نہیں تھی اوپر سے موسم کی شدت تھی اس لیے لوگوں کی مالی حالت خراب تھی۔ اپنے سفر کے دوران شاہ بابا سال میں ایک بار اس علاقے میں ضرور آتے تھے۔ لیکن اس گاؤں میں وہ پہلی بار آئے تھے اور یہیں مشتاق نے پہلی بار ان کو دیکھا اور وہ ان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ان کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کردی۔

مشتاق اس وقت چودہ سال کا تھا لیکن کمزور صحت کی وجہ سے وہ بارہ سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مشتاق کے ماں باپ سیلابی حادثے میں چند سال پہلے ہلاک ہوچکے تھے اور اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ وہ گاؤں والوں کے رحم و کرم پر پل رہا تھا۔ اس لیے جب اس نے شاہ بابا سے التجا کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ لیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے صوفی بنتے وقت خود سے جو عہد کیے تھے، ان میں یہ عہد نہیں تھا کہ وہ ساری عمر اکیلے رہیں گے۔ اس لیے انہوں نے مشتاق کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے انہوں نے گاؤں کے اہم مردوں کو جمع کرکے ان کے سامنے مشتاق کی خواہش بیان کی اور پھر ان کی اجازت طلب کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں؟

گاؤں والوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ ان کے نزدیک شاہ بابا ایک قابلِ احترام شخص تھے اور ان کے ساتھ رہنے والے کی دنیا کے ساتھ عاقبت سنورنے کا بھی

امکان تھا۔ دوسرے مشتاق کا کوئی نہیں تھا اور وہ ایک طرح سے گاؤں والوں پر بوجھ تھا اس لیے وہ شاہ بابا کے ساتھ چلا جاتا تو ان کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ مشتاق کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے چند جوڑے کپڑوں اور ایک تھیلے کے جس میں اس کا کچھ سامان تھا۔ اس نے مدرسے میں پڑھا تھا۔ اس لیے شاہ بابا کو اطمینان تھا کہ اسے قرآن پڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ خود شاہ بابا نے صوفیانہ راہ اختیار کرنے سے پہلے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ مشتاق کو آگے پڑھا سکتے تھے۔ جب وہ اس قابل ہو جاتا کہ مدرسے کا امتحان دے سکے تو وہ اسے کہیں سے امتحان دلواد یتے۔

جب شاہ بابا اسے لے کر گاؤں سے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے مشتاق سے کہا۔ ''ایک بات یاد رکھنا.... ہمارے ساتھ جو ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اس لیے کسی مصیبت یا پریشانی میں بے صبری مت دکھانا۔''

''میں آپ کی ہدایت پر پورا عمل کروں گا۔'' مشتاق نے فرماں برداری سے کہا۔

اس سے پہلے شاہ بابا اپنا سفر خچر پر کرتے تھے کیونکہ ان کا سامان اور راشن بہت کم ہوتا تھا۔ اس لیے خچر ان کا وزن بھی با آسانی برداشت کر لیتا تھا لیکن مشتاق کے آنے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا سامان خاصا تھا۔ کپڑوں کے کئی جوڑے اور دوسرا سامان تھا۔ پھر اس کی خوراک کا اضافی وزن بھی خچر پر بار کیا جاتا تھا۔ خود خچر کی خوراک بھی اس پر ہوتی تھی۔ اس کے بعد خچر پر سواری کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اس لیے شاہ بابا نے طے کر لیا کہ وہ پیدل سفر کریں گے اور خچر صرف سامان اٹھائے گا۔

مشتاق، شاہ بابا کی شخصیت سے متاثر تھا۔ اس کے لیے اس طرح بنا گھر کے رہنا اور پورے ملک میں پھرتے رہنا بہت کشش انگیز تھا جب کہ وہ چودہ سال کی عمر تک اپنے گاؤں سے باہر نہیں آیا تھا۔ اس لیے سفر کے آغاز میں وہ بہت پُرجوش تھا۔ لیکن جب اسے عملی طور پر سفر کی صعوبتوں سے واسطہ پڑا تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ زندگی کشش انگیز تو ضرور تھی لیکن آسان ہرگز نہیں تھی۔ انہیں روزانہ کوئی تیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اگرچہ شاہ بابا نے مشتاق کے خیال سے پہلے دن صرف بیس میل کا سفر کیا تھا لیکن مشتاق کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور اس کے جوتے کی ایڑی نکل گئی تھی۔

شام کو جب وہ ایک جگہ رکے تو شاہ بابا نے اس کے چھالوں پر ایک مرہم لگایا جس سے اسے بہت آرام ملا تھا۔ پھر شاہ بابا نے اس کے جوتے کی ایڑی کی سلائی کی۔ ان کے پاس سلائی کا سامان اور چمڑے کے فالتو ٹکڑے تھے کیونکہ ان کو سفر میں ان کی مستقل ضرورت رہتی تھی۔ وہ اپنے جوتے کی مرمت خود کرتے تھے اور اسے اس وقت تک چلاتے تھے جب تک اس میں چلنے کا دم رہتا تھا۔ اس کے بعد خدا کا کوئی نہ کوئی بندہ ان کو نیا یا کچھ پرانا جوتا دلا دیتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی ان کو کچھ عرصے جوتے کے بغیر بھی گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ایک بار وہ پورے دو ہفتے تک بغیر جوتے کے سفر کرتے رہے تھے اور اس دوران میں انہوں نے پیروں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے ایک قسم کی گھاس پیروں پر باندھ لی تھی لیکن اپنے اصول کے مطابق کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ہاں کوئی اپنی خوشی سے ان کو کچھ دیتا تو وہ قبول کر لیا کرتے تھے۔

جب انہوں نے مشتاق کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کے گاؤں کے لوگوں نے بھی مشتاق کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تب انہوں نے مشتاق کے سامنے اپنے اصول رکھے تھے اور اس سے کہا۔ ''اگر تم ان کی پاسداری کا وعدہ کرتے ہو تو میں تم کو ساتھ رکھ سکتا ہوں ورنہ نہیں۔''

''میں آپ کے بنائے تمام اصولوں کی پاسداری کروں گا۔'' مشتاق نے ان کو یقین دلایا تھا۔

''اگر تم نے کبھی ان اصولوں کی خلاف ورزی کی تو میرے اور تمہارے راستے الگ ہوں گے۔'' شاہ بابا نے اسے خبردار کیا۔ ''ساتھ ہی کبھی تم محسوس کرو کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے تو تمہیں واپس جانے کی بھی مکمل آزادی ہوگی۔''

لیکن اس وقت مشتاق بہر صورت گاؤں کی بے رنگ ترستی ہوئی زندگی سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ شاہ بابا کی زندگی اور کردار سے متاثر ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان جیسا بنے۔ پہلے دن جب شام کو انہوں نے ایک درخت تلے پڑاؤ ڈالا اور شاہ بابا نے سب سے پہلے لکڑیاں جمع کیں تاکہ رات سکون سے گزرے کیونکہ دسمبر کے مہینے میں اس علاقے میں رات نہایت سرد ہو جاتی تھی۔

''آپ اتنا پیدل کیسے چل لیتے ہیں؟'' مشتاق نے

معصومیت بھرا سوال کیا۔
''میں اس کا عادی ہوں اور آج میں نے اتنا سفر نہیں کیا جتنا کہ میں روز کرتا ہوں۔ تمہارے لیے کم رفتار رکھی تھی اور فاصلہ بھی کم کر دیا ہے۔''
مشتاق کے ہوش اڑ گئے تھے کہ یہ فاصلہ جسے طے کرتے کرتے وہ ادھ مرا ہو گیا تھا، ابھی کم تھا اور امکان یہ تھا کہ چند دن میں شاہ بابا اپنی رفتار پر آ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتے بعد شاہ بابا نے زیادہ رفتار سے اور دن میں زیادہ فاصلہ طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ رات کو کہیں پڑاؤ ڈالتے تھے تو مشتاق بستر بچھا کر اس پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔ جب کہ شاہ بابا سارے کام نمٹا کر الاؤ کی روشنی میں تلاوت اور دعائیں بھی پڑھتے تھے۔ وہ مشکل سے پانچ گھنٹے سوتے تھے کیونکہ جب صبح نماز کے لیے وہ مشتاق کو باقاعدہ جھنجوڑ کر بیدار کرتے تھے تو ان کو بیدار ہوئے کوئی ایک گھنٹا گزر چکا ہوتا تھا۔ جب کہ مشتاق رات میں صرف کھانے اور رفع حاجت کے لیے اٹھتا تھا۔ وہ کم سے کم دس گھنٹے سوتا تھا۔
دو ہفتے بعد جب وہ ایک بستی میں ایک دن رکنے کے بعد روانہ ہوئے تو شام کو پڑاؤ ڈالتے ہی شاہ بابا نے مشتاق سے کہا۔ ''آج خچر سے سامان تم اتارو گے اور لکڑی جمع کر کے لاؤ گے۔''
مشتاق کا تھکن سے برا حال تھا لیکن اسے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔ مجبوراً وہ ان کاموں میں لگ گیا اور اس دن کے بعد یہ اس کی ذمے داری بن گئی۔ رفتہ رفتہ مشتاق کی تھکن کم ہونے لگی اور اسے کام میں مزہ آنے لگا۔ اب وہ سارا دن سفر کر کے بھی تازہ دم رہتا تھا۔ البتہ رات اسے نیند ویسی ہی آتی تھی۔ وہ کھانا کھا کر لیٹتے ہی سو جاتا اور صبح اس وقت اٹھتا جب شاہ بابا اسے ناشتے اور اس کے بعد روانگی کے لیے تیار کرتے تھے۔
آنے والے دو برسوں میں مشتاق نے شاہ بابا کے ہمراہ پورے بنگال کے کئی چکر لگائے۔ اس دوران میں اس نے کئی بڑے شہر اور بے شمار گاؤں دیکھے۔ شاہ بابا کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہر بار نئے راستے سے سفر کریں جہاں نئی آبادیاں آئیں اور وہ نئے لوگوں تک خدا کا پیغام ... پہنچائیں۔ اس لیے مشتاق نے دو سال میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ وہ شاہ بابا کے ساتھ اس سخت کوش زندگی کا عادی بھی ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا اس نے قرآن ختم نہیں کیا تھا، شاہ بابا نے ختم کرایا اور چیدہ چیدہ آیات اسے یاد بھی کرا دیں۔ ان کے ساتھ رہ کر مشتاق کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ اسے دنیا کے بارے میں پتا چلا جس کے بارے میں وہ بہت کم جانتا تھا۔
لیکن کبھی کبھی اسے شدت سے خواہش ہوتی کہ کاش اسے آرام کرنے کے لیے ایک چھت مل جائے اور اس کے تلے وہ جی بھر کر آرام کر سکے۔ اس کے پاس کئی اچھے لباس اور اچھے جوتے ہوں اور وہ لذیذ کھانے پیٹ بھر کر کھا سکے لیکن فی الحال اس کی خواہش پوری ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کم سے کم شاہ بابا کے ساتھ رہتے ہوئے تو بالکل بھی امکان نہیں تھا۔ دو سال میں اس کا کمزور جسم بھر گیا تھا۔ قد طویل اور پٹھے مضبوط ہو گئے تھے۔ اب وہ سخت اور مسلسل کام کر کے بھی نہیں تھکتا تھا۔ البتہ وہ مسلسل ایک ہی روٹین سے بیزار ہو چلا تھا۔
اس وقت وہ وسطی بنگال سے ذرا آگے ٹنگائل نامی شہر کے جنوب مشرق میں تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی اور اکتوبر کی آخر میں بھی یہاں موسم سرد تھا۔ رات ان کو بڑا الاؤ روشن کرنا پڑا تھا۔ مشتاق نے سامان اتارتے وقت شاہ بابا سے کہا۔ ''کیا اس بار ہم جنوب کی طرف جلدی نہیں جا رہے ہیں شاہ بابا؟''
''ہاں میرے بچے۔'' شاہ بابا نے جواب دیا۔
''اس وقت وہاں سردی زیادہ نہیں ہوتی ہے۔''
''ہمیں موسم سے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ موسم شیطان سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ نہیں ہوتا ہے۔''
''شیطان انسان کے لیے کس طرح خطرناک ہوتا ہے۔''
''شیطان کا سب سے موثر ہتھیار لالچ ہے، جب وہ کسی انسان کے دل میں لالچ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ شخص زیادہ دیر اس کی غلامی سے نہیں بچ سکتا ہے۔''
''شیطان لالچ کیسے ڈالتا ہے؟''
''کسی دوسرے کی مثال سے.... اگر مجھے معلوم ہو گا کہ فلاں شخص کے پاس دولت ہے اور وہ اس کی مدد سے پُرتعیش زندگی گزارتا ہے تو مجھے خود بہ خود لالچ گھیر لے گی کہ کاش میرے پاس بھی اتنی ہی دولت ہو اور میں بھی پُرتعیش زندگی گزار سکوں۔'' شاہ بابا نے آسان الفاظ میں سمجھایا۔
''دولت ہونا یا پُرتعیش زندگی بسر کرنا بری بات ہے؟''
''نہیں میرے بچے لیکن دولت کے حصول اور اس کے خرچ میں توازن ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ کسی کا حق مت

مارو اور دوسرے اپنے زور بازو سے جو کماؤ اسے خود تک محدود مت رکھو بلکہ دوسروں کو بھی دو۔"
"جیسے لوگ ہمیں دیتے ہیں۔" مشتاق کا لہجہ بجھ گیا تھا۔ جب اسے دوسرے کچھ دیتے تھے تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بھکاری ہے۔
"ہاں جیسے لوگ ہمیں دیتے ہیں۔" شاہ بابا نے رسانیت سے کہا۔ "کیونکہ ان کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیں دے دیتے ہیں اور یہ حکم قرآن ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اچھائی اور نیکی کا جذبہ باقی ہے۔"
مشتاق سوچنے لگا کہ اس دنیا میں ایسے برے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کے حق پر ڈاکا مارتے ہیں۔ جس وقت وہ یہ سوچ رہا تھا اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جلد اسے ان لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ اس جگہ سے کوئی دس میل مشرق میں لٹیروں کا ایک گروہ سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک بڑے زمیندار کی حویلی پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ کم سے کم دس سیر خالص سونا حاصل کیا تھا جس کی مالیت یقیناً ہزاروں اشرفی تھی۔ یہ چار افراد تھے اور سنگھ ان کا سربراہ تھا۔ سنگھ ایک پرانا مجرم تھا۔ اس نے کئی افراد کو قتل کیا تھا اور بے شمار لوگوں کو لوٹا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات بتاتے تھے کہ اس نے مار دھاڑ سے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اس کے تینوں ساتھی بھی مار دھاڑ میں اس سے کم نہیں تھے۔
لیکن اس وقت یہ لٹیرے ایک مسئلے سے دوچار تھے۔ انہوں نے چار عدد خچر بھی ہتھیا لیے تھے اور ان پر زیورات اور قیمتی سامان بار کر کے لے جا رہے تھے۔ خود وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ خچروں کی رفتار بڑھانے کے لیے انہوں نے برابر وزن کے اسباب تقسیم کر کے اپنے گھوڑوں پر بار کر لی تھی۔ مگر دوران سفر ان کا ایک خچر اپنا پاؤں تڑوا بیٹھا تھا اور اب چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کا سامان وہ کہاں بار کرتے۔ باقی خچروں اور گھوڑوں پر پہلے ہی خاصا وزن تھا اور وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے کیونکہ اس کا پورا امکان تھا کہ زمیندار مسلح ہو کر ان کے پیچھے آئیں گے۔
سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم لوگ آس پاس جاؤ اور کوئی سواری کا جانور ملے تو اسے لے آؤ۔"
"اور اگر کوئی مداخلت کرے تو؟" سنگھ کے ایک ساتھی نرمل نے پوچھا۔
"اسے ختم کر دو۔" سنگھ نے سفاکی سے کہا۔ "مجھے بہرصورت ایک جانور چاہیے۔"
سنگھ کے تینوں ساتھی کسی جانور کی تلاش میں روانہ ہو گئے اور خود سنگھ باقی سامان اور جانوروں کی حفاظت کے لیے اسی جگہ موجود رہا۔ اتفاق سے وہ سطح مرتفع کی طرف آئے تھے اور ان کو دور سے شاہ بابا کے پڑاؤ کی روشنی نظر آ گئی اور جب وہ قریب آئے تو یہ دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں کہ پڑاؤ میں ایک بہت صحت مند خچر بھی ہے۔ انہوں نے شاہ بابا کو گھیر لیا اور ان پر تلواریں تان لیں۔ شاہ بابا اس وقت تلاوت کر رہے تھے اور مشتاق گہری نیند میں تھا۔ اسے نرمل نے ٹھوکر مار کر بیدار کیا۔ شاہ بابا ان کو دیکھ کر ہراساں نہیں ہوئے تھے۔
"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"
"ہمیں یہ خچر چاہیے۔" نرمل نے خچر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمیں تم سے کوئی مطلب نہیں ہے لیکن اگر تم نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو ہمارے پاس تلواریں ہیں۔" اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔
مشتاق جو اب تک خاموش کھڑا تھا اسے غصہ آ گیا۔ "تم ہمارا خچر نہیں لے جا سکتے۔ اس کے بغیر ہمارا سامان کون اٹھائے گا۔"

کاشف زبیر مرحوم کی بعض تخلیقات ادارے میں زیر التوا تھیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت تھی لیکن قضا کے ہاتھوں سب بے بس ہوتے ہیں ان میں سے ایک مضمون ناگزیر ایڈیٹنگ کے بعد پیش خدمت ہے۔ مضامین اور کہانیوں کے علاوہ مرحوم کا ایک نامکمل سلسلہ بھی ادارے کے پاس محفوظ ہے جو مناسب وقت پر پیش کیا جائے گا۔ چند دیگر تخلیقات بھی وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں گی۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادارہ مرحوم کو ان کی خواہش پر مضامین وغیرہ موصول ہوتے ہی قبل از اشاعت ماہانہ ادائیگی کر دیتا تھا۔ ادارہ اپنی مطبوعات میں شائع ہونے والی ہر سطر کا بروقت اعزازیہ ادا کرنے کی صحت مند روایت پر روز اوّل سے کاربند ہے۔

نرمل اور اس کے ساتھی شاہ بابا کے حلیے سے بھانپ گئے تھے کہ وہ درویش ہے۔ نرمل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہارا سامان اٹھانے کے لیے یہ دو پیروں والا خچر ہے اس سے کام لینا۔'' اس کا اشارہ شاہ بابا کی طرف تھا۔

''تم ہمارا خچر نہیں لے جاسکتے۔'' مشتاق چلّایا۔

لیکن انہوں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر خچر کھولنا شروع کردیا۔ اس پر مشتاق غصے سے بے قابو ہوکر خچر کھولنے والے پر جھپٹا تھا۔ نرمل نے اس کے سر پر تلوار کا دستہ مارا اور مشتاق بے ہوش ہوکر نیچے گر گیا۔ شاہ بابا نے نرمل کی طرف دیکھا۔ ''تم نے اسے بے وجہ مارا ہے، یہ ایک چھوٹا لڑکا ہی تو ہے۔''

''شکر کرو میں نے اسے قتل نہیں کیا۔'' نرمل نے سرد لہجے میں کہا۔ اس دوران میں اس کے ساتھی خچر کھول کر اس کی لگام ایک گھوڑے سے باندھ چکے تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں وہ تاریکی میں گم ہوچکے تھے۔ شاہ بابا نے اس دوران میں کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ مشتاق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ضرب کی شدت سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور کچھ خون نکلا تھا لیکن اس کی نبض ٹھیک تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔ شاہ بابا نے اس کے زخم پر مرہم لگایا اور اسے الاؤ کے قریب لٹادیا۔ مشتاق کو کوئی ایک گھنٹے بعد ہوش آگیا تھا۔

''وہ لوگ کہاں ہیں؟'' وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ شاہ بابا نے اسے دوبارہ لٹادیا۔

''وہ لوگ جاچکے ہیں اور ابھی تم آرام سے لیٹو۔''

''ہمارا خچر.....'' مشتاق بولا۔

''وہ لے جاچکے ہیں۔'' شاہ بابا نے اسے مطلع کیا تو مشتاق کراہ کر رہ گیا تھا۔

''اب ہم سفر کیسے کریں گے؟''

''خچر کے بغیر کریں گے۔''

''کیا ہمیں کوئی دوسرا خچر نہیں مل سکتا ہے۔''

''مل سکتا ہے اگر کوئی مخیر شخص ہمیں خچر فراہم کر دے۔'' شاہ بابا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کیونکہ خچر پانچ اشرفی سے کم میں نہیں آتا ہے اور ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔''

مشتاق مایوس ہوگیا۔ خچر کے بغیر سفر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ان کو سفر تو کرنا ہی تھا۔ مشتاق نے گزشتہ ایک سال کے دوران شاہ بابا سے چھپ کر کچھ رقم جمع کی تھی اور یہ رقم پانچ اشرفی کے مساوی تھی۔ جب وہ کسی آبادی میں جاتے تھے تو مشتاق کوئی کام تلاش کرتا تھا اور اسے کام مل جاتا تو وہ اس سے حاصل ہونے والا معاوضہ جمع کر لیتا تھا۔ ان کے اخراجات ویسے ہی پورے ہوجاتے تھے۔ اسے شاہ بابا کا اصول معلوم تھا کہ ایک وقت میں ایک اشرفی سے زیادہ رقم پاس نہیں رکھنی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی بستی سے ان کو ایک اشرفی سے زیادہ کی رقم مل جاتی تو شاہ بابا اسی وقت اضافی رقم بستی کے ناداروں میں بانٹ دیتے۔ اگر ان کو علم ہوجاتا کہ مشتاق کے پاس رقم ہے تو وہ اسے خود سے الگ کردیتے۔ اگرچہ مشتاق کو یقین تھا کہ اب شاہ بابا اسے خود سے الگ نہیں کرسکتے ہیں۔

مشتاق کا زخم سرد ہوکر تکلیف دے رہا تھا لیکن اسے کسی نہ کسی طرح نیند آگئی تھی۔ صبح شاہ بابا نے جلدی سفر نہیں شروع کیا تھا۔ وہ مشتاق کے ازخود جاگنے کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر انہوں نے اسے ناشتا دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ سارا سامان دو حصوں میں تقسیم کرکے باندھ چکے تھے۔ ان دونوں کو مجموعی طور پر کوئی تیس سیر وزن اٹھانا تھا۔ کیونکہ خچر کا چارا اس کے ساتھ جاچکا تھا اور باقی رہ جانے والے سامان کا وزن اتنا نہیں تھا۔ اس میں سے بھی بڑا حصہ انہوں نے اپنے لیے رکھا اور کم حصہ مشتاق کو دے دیا۔ اس کے باوجود جب مشتاق نے وزن اٹھایا تو اس کے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ اسے تو خالی ہاتھ بے فکری سے سفر کرنے کی عادت تھی۔ اس نے فریادی لہجے میں پوچھا۔ ''بابا اب ہم کہاں جائیں گے؟''

''اس ٹیلے کے بعد ایک چھوٹی بستی ہے۔'' شاہ بابا نے ہاتھ سے جنوب مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی پندرہ میل دور ہوگی۔ ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہاں سے ہمیں کوئی مدد مل جائے۔''

مشتاق کو ایک مہینا پہلے ہی ایک بستی میں موچی نے چمڑے سے بنے شاندار اور مضبوط جوتے تحفے میں دیئے تھے اور ان کی وجہ سے اس کا سفر مزے کا ہوگیا تھا۔ موچی نے شاہ بابا کو بھی جوتے دینے کی پیش کش کی تھی لیکن فی الحال وہ اپنے پرانے جوتوں کے ساتھ خوش تھے۔ انہوں نے موچی سے کہا۔ ''ان جوتوں میں ایسی کوئی خرابی نہیں ہے کہ میں ان کو خود سے جدا کروں۔''

رات بھر سونے کے بعد مشتاق کے سر کا زخم خاصا بہتر ہوگیا تھا۔ وہ اب آرام سے سفر کرسکتا تھا۔ اس نے شاہ بابا

سے کہا۔ ”ہمارا خچر ہم سے چھن گیا اور ہم اب پیدل سفر کر رہے ہیں کیا آپ کے خیال میں اس میں بھی ہمارے لیے کوئی بہتری ہے؟“

”یقیناً۔“ شاہ بابا نے پُر یقین لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس پر پورا یقین ہے۔“

مشتاق گہری سانس لے کر رہ گیا تھا کیونکہ اسے اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا اور اس کے خیال میں ان کے لیے مشکل دور شروع ہو گیا تھا جس میں ان کو خچر کے بغیر سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

جب سنگھ کے ساتھی خچر کے ساتھ واپس آئے تو وہ خوش ہو گیا تھا کیونکہ یہ صحت مند خچر یقیناً ان کے معذور ہو جانے والے خچر کا تمام بوجھ باآسانی اٹھا سکتا تھا۔ اس نے نرمل سے پوچھا۔ ”خچر کہاں سے ملا؟“

”ادھر ایک مسلمانوں کا درویش اپنے خدمت گار کے ساتھ سفر کر رہا تھا، یہ خچر اس کا ہے۔“

سنگھ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”کوئی بات نہیں وہ پیدل بھی سفر کر سکتے ہیں ہمیں اس خچر کی ضرورت زیادہ ہے۔“

”درویش تو فوراً سمجھ گیا تھا لیکن اس کے خدمت گار نے مزاحمت کی تو اسے دوسرے طریقے سے سمجھانا پڑا تھا۔“ نرمل نے کہا۔

سنگھ ہنس دیا۔ ”تم نے یقیناً اسے قتل کر دیا ہوگا؟“

”نہیں وہ لڑکا سا ہے، اس لیے مجھے اس پر ترس آ گیا۔“

انہوں نے معذور خچر کے تھیلے اس خچر پر منتقل کیے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کو تعاقب کا اتنا خوف تھا کہ وہ رات میں بھی سفر کر رہے تھے۔ اگرچہ رفتار کم تھی۔ صبح کے قریب وہ سب تھکن سے چور ہو چکے تھے۔ جب روشنی ہوئی تو انہوں نے خود کو ایک بستی کے پاس پایا تھا۔ ایک بلند ٹیلے سے سنگھ نے بستی کا معائنہ کیا۔ یہ خاصی بڑی اور منظم طریقے سے آباد کی ہوئی بستی تھی۔ کیونکہ وہ پہلی بار اس طرف آئے تھے اس لیے انہیں اس کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ بستی کے چاروں طرف پان کے باغات اور دھان کے کھیت تھے۔

”میرا خیال ہے ہمیں بستی سے دور رہنا چاہیے۔“ سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بستی میں قانون کی عمل داری ہے اور وہ لوگ ایسی جگہوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے جہاں قانون کی عمل داری ہو۔ انہوں نے راستے سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی وادی میں پڑاؤ ڈال لیا جس میں بارش کے پانی سے بنا ایک جوہڑ بھی تھا اور اس کا پانی پینے کے لائق تھا۔ پھر یہ جگہ عام گزرگاہ سے دور تھی اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی اتفاق سے اس طرف آ نکلے۔

وہ اس جگہ رک گئے۔ ان کے پاس کھانے کو چنے اور دلیہ تھا لیکن ان کا باقاعدہ کھانا کھانے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے طے ہوا کہ ان میں سے دو جا کر گاؤں سے کھانا لائیں گے۔ اور دو یہیں رک کر سامان کی حفاظت کریں گے۔ سنگھ اور نرمل رک کر جانوروں اور زیورات کی حفاظت کرتے جب کہ ان کے دونوں ساتھی کھانا لینے جاتے۔ کیونکہ وہ گھوڑے استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے اور خچروں کی کھال پر زمیندار کا نام کھدا ہوا تھا اس لیے ان کو شاہ بابا والا خچر دے

موپلے

ساحل مالابار پر آباد ایک مسلمان قوم جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ عرب تاجروں کی اولاد ہے۔ دوسری صدی ہجری میں عرب و عجم کے کچھ مسلمان درویش حضرت آدم علیہ السلام کے نقشِ قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ (سری لنکا) جا رہے تھے کہ بادِ مخالف کی وجہ سے ان کا جہاز بھٹک گیا اور مالابار کے شہر کرنگار نور کے کنارے آ لگا۔ شہر کے راجا زیمورن (سامری) نے ان کی بہت خدمت و مدارت کی اور اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تو میں تمہارے پیغمبر اسلام کا حال بہت سن چکا ہوں لیکن آج تم اپنی زبان سے اپنے دین اور نبی کے حالات سناؤ چنانچہ انہوں نے تفصیل سے وہ تمام حالات سنائے جن کا راجا پر بہت اثر ہوا۔ راجا نے اپنے امراء اور وزراء سے کہا کہ میں بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اب سلطنت کا کام سنبھالو۔ اس کے بعد اس نے اپنا ملک ان میں تقسیم کر دیا اور خود عرب چلا گیا اور مسلمان ہو گیا۔ وہاں سے امراء کو لکھا کہ ان عرب تاجروں کے ساتھ جب یہ تمہارے علاقے میں پہنچیں تو فیاضانہ سلوک کرنا اور انہیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا چنانچہ اس کے بعد سے عرب مسلمانوں کے قافلے کے قافلے اس علاقے اور آس پاس کے دوسرے علاقوں میں آ آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ موپلا مسلمان انہی عرب (مسلمان) تاجروں کی اولاد ہیں۔

مرسلہ: حیات خان۔ جہلم

دیا گیا کہ وہ اس پر جائیں اور کھانا اور جانوروں کے لیے چارا لے آئیں۔ وہ دونوں دوپہر کو روانہ ہوئے تھے اور ان کے جاتے ہی سنگھ نے معنی خیز انداز میں نزل سے کہا۔

''لوٹنے کے لیے ان لوگوں کی ضرورت تھی لیکن اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔''

نزل کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کھانا لے کر آتے ہیں تو ان کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔''

سنگھ زور سے ہنسا۔ ''اس کے بعد یہ سونا صرف ہمارا ہوگا۔''

☆☆☆

شاہ بابا اور مشتاق خلافِ توقع جلد اس بستی تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب دن کا بڑا حصہ باقی تھا اور وہ زیادہ تھکے بھی نہیں تھے لیکن راستے میں کچھ کھایا نہیں تھا اس لیے دونوں کو شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے بستی کو سامنے دیکھ کر دونوں کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ پھر یہ ایک سرسبز اور آباد جگہ تھی۔ ورنہ جنوب میں بستیاں اجاڑ اور بہت کم آبادی والی ہوتی ہیں۔ زمین بھی زرخیز تھی۔ دھان کے کھیت نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں فصل تیار ہو رہی تھی۔ مشتاق اس بستی کو دیکھ کر اس تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو گیا اور جلدی جلدی نیچے اترنے لگا۔

''آرام سے تم ابھی زخمی ہو اور جلد بازی میں کوئی چوٹ مت لگا لینا۔'' شاہ بابا نے اسے سمجھایا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' مشتاق نے بہانہ کیا۔

''بس کچھ ہی دور ہے۔'' شاہ بابا نے کوئی میل بھر دور رہ جانے والی بستی کی طرف اشارہ کیا۔ ''جلد بازی کی صورت میں تمہیں کوئی نقصان ہو سکتا ہے۔''

مجبوراً مشتاق سست روی سے چلنے لگا، ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اس بستی تک پہنچ جائے۔ یہاں پگڈنڈی مشکل تھی۔ اصل میں بستی کی طرف آنے کا معروف راستہ شمال مغرب سے آتا تھا اور جنوب مشرق میں سارا علاقہ انتہائی دشوار تھا۔ اگر ان کا خچر چوری نہ ہوتا اور وہ پیدل نہ ہو جاتے تو شاہ بابا بھی شمال مغرب والے راستے سے آنا پسند کرتے۔ سامان کے ساتھ دشوار پگڈنڈی پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ نیچے تک آنے میں کامیاب رہے اور پھر کھیتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے بستی تک پہنچ گئے۔ راستے میں ان کو کئی جگہ بہتا ہوا پانی ملا جس سے انہوں نے اپنی پیاس بجھائی تھی۔ پانی سرد اور خوش ذائقہ تھا۔ یہاں زمین بھی نرم اور ہموار تھی اور اس میں کاشت کاری آسان تھی۔ ان کو راستے میں چند ایک لوگ ملے جنہوں نے شاہ بابا کو دیکھ کر احتراماً سلام کیے تھے۔ بعض طالب دعا ہوئے تھے اور شاہ بابا نے ان کو دعا دی تھی۔ ان سے پتا چلا کہ اس بستی کا نام ٹانگائل ہے۔

وہ بستی میں وارد ہوئے تو اس کی صفائی ستھرائی اور نظم وضبط دیکھ کر متاثر ہوئے تھے۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ وہ پیدل چلتے ہوئے ایک بھٹیار خانے تک آئے۔ وہ اپنے حلیے کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ بھٹیار خانے کا مالک خود باہر آیا اور ان کو اندر لے گیا۔ شاہ بابا مچھلی نہیں کھاتے تھے لیکن انہوں نے مشتاق کے لیے مچھلی منگوا لی۔ وہ زخمی تھا اور اسے توانائی کی ضرورت تھی۔ کھانے کے بعد شاہ بابا نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ وہ ایک مبلغ ہیں اور جسے ان کا وعظ سننا ہو وہ شام کو بستی کی مسجد کے سامنے آ جائے۔ جہاں مسجد ہوتی تھی۔ وہاں وہ مسجد کے سامنے وعظ کرتے تھے اور جہاں مسجد نہیں ہوتی تھی وہاں یہ فریضہ بستی کے چوک میں انجام دیتے۔ انہوں نے بھٹیارے کو کھانے کی قیمت دینا چاہی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ اعلان کر کے وہ باہر نکل آئے اور بستی میں گھومنے لگے۔ جہاں چند افراد نظر آتے شاہ بابا وہاں شام کے وعظ کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ دو گھنٹے میں وہ ساری بستی گھوم کر اور اعلان کر کے مسجد کے سامنے آ گئے اور وہاں درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مشتاق کو معلوم تھا کہ مسجد سے کوئی نہیں آئے گا کیونکہ صوفی مبلغوں کو یہ مسجد والے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کی بستیوں میں شاہ بابا کو مخالفانہ ماحول کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتے تھے اور اگر کوئی ان کے منہ لگنے کی کوشش کرتا تو وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

مشتاق، شاہ بابا کے ساتھ شامل ہوا تھا تو اس کے ذہن میں ان کے بارے میں کچھ ایسے خیالات تھے کہ وہ کوئی ماورائی ہستی ہیں اور وہ جو چاہیں وہ ہو جاتا ہے۔ وہ دو سال سے ان کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا یہ تاثر زائل ہو گیا تھا اور شاہ بابا اسے ایک عام سے آدمی نظر آنے لگے تھے جن کو وہ ساری مشکلات پیش آتی ہیں جو ایک عام آدمی کو پیش آتی ہیں بلکہ ان کو کچھ زیادہ ہی مشکلات پیش آتی

ہیں۔ اس بارے میں شاہ بابا کا کہنا تھا کہ مشکلات وہ نہیں ہوتی ہیں جو آدمی کو پیش آتی ہیں بلکہ مشکلات وہ ہوتی ہیں جن کی آدمی شکایت کرتا ہے اور مشتاق نے آج تک شاہ بابا کو کسی بھی مشکل کی شکایت کرتے نہیں سنا تھا۔ گویا ان کے نزدیک زندگی میں کوئی مشکل نہیں تھی۔

مشتاق ان کا احترام کرتا تھا اور ان سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے نے اس کے خیالات کچھ بدل دیئے تھے اور وہ اس وقت اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب وہ درخت کے نیچے آکر بیٹھے اور ان کو ذرا تنہائی نصیب ہوئی تو اس نے موقع غنیمت جان کر شاہ بابا سے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟''

''کہو میرے بچے۔'' شاہ بابا نرمی سے بولے۔ ان کی لمبی داڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی۔

''آپ خدا کا اچھا بندہ بننے کی کوشش کر رہے ہیں یہ درست ہے؟''

''ہاں میں کوشش کر رہا ہوں۔ جہاں تک اچھا ہونے یا نہ ہونے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''آدمی کسی کی نظر میں اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کا خیال رکھتا ہے اور اس سے اچھی طرح پیش آتا ہے؟''

''یہ بھی درست ہے۔'' شاہ بابا نے اعتراف کیا۔

''تب ہمارے ساتھ کیوں برا ہو رہا ہے۔'' مشتاق جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ''ہم دو سال سے دربدر پھر رہے ہیں۔''

''دربدر نہیں ہم خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے پھر رہے ہیں اور یہ بھی عبادت ہے۔ اب کتنے غیر مسلموں نے راہ حق کا انتخاب کیا، یہ بھی تو دیکھو؟'' شاہ بابا نے تصحیح کی۔

''چلیے خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے پھر رہے ہیں تو وہ اس کا صلہ کیوں نہیں دیتا ہے۔ ہم فقیروں کی طرح دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس نہ کھانے کو اچھا ہے اور پہننے کو اور نہ ہی سواری ہے۔ ایک خچر تھا اب وہ بھی نہیں رہا ہے۔''

''لیکن ہمارے پاس کھانے کو بھی ہے اور پہننے کو بھی ہے۔ بے شک ویسا نہیں ہے جیسا کہ تم چاہتے ہو اور کبھی کبھی میں بھی چاہتا ہوں لیکن ضرورت کے مطابق ہے تو۔'' شاہ بابا نے نرمی سے کہا۔ ''مشتاق کیا تم خدا پر شک کر رہے ہو حالانکہ وہ ہماری بہتری چاہتا ہے۔''

''خچر کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟'' مشتاق کا لہجہ گستاخانہ ہو گیا۔ ''اس کے چھن جانے میں ہمارے لیے کون سی بہتری ہے؟''

''یہ بھی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''شاہ بابا آپ مان لیں اس میں ہمارے لیے کوئی بہتری نہیں ہے بلکہ ہم اپنے واحد اثاثے سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے خدا نے چاہا تو ہمیں خچر مل جائے گا یا اس سے بھی بہتر ہو کر مل جائے گا۔''

''اس سے بہتر ہو کر۔'' مشتاق کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا تھا۔ ''کیا اس پر سونا لدا ہو گا۔''

''خدا چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے بچے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔''

''مجھے تو خیال آتا ہے ہم خدا کا کام کرنے والے انسان سب سے تنگ دست ہیں۔ اگر خچر نہ ملا تو کیا ہم اسی طرح اپنا سامان اٹھا کر پیدل سفر کرتے رہیں گے؟''

''اگر خچر نہ ملا تو ہم ایسا ہی کریں گے۔'' شاہ بابا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''خچر ایک سہولت ہے، ہمارے لیے لازمی نہیں ہے۔''

''میرے لیے تو لازمی ہے۔'' مشتاق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس طرح سامان اٹھا کر سفر نہیں کر سکتا جیسے آج ہم نے کیا ہے۔ میں اسی صورت میں آپ کے ساتھ آگے چلوں گا اگر خچر مل گیا ورنہ....'' مشتاق کہتے کہتے رک گیا۔

''ورنہ کیا میرے بچے؟''

''ورنہ میں یہیں رہ جاؤں گا۔''

شاہ بابا دیکھ رہے تھے کہ اس قصبے کی ہری بھری زندگی نے مشتاق کو مسحور کر لیا تھا اور شاید اب وہ یہاں رک جانا چاہتا تھا۔ یہاں کام کی کمی نہیں تھی۔ چاروں طرف کھیت اور پان کے باغات تھے۔ ان میں یقیناً مزدوروں کی ضرورت رہتی ہوگی پھر قصبہ بھی خاصا بڑا تھا۔ شاہ بابا نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میرے بچے اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم اپنے یہاں رہنے کے فیصلے کو خچر سے مشروط مت کرو۔ ممکن ہے وہ مل جائے اور تمہیں میرے ساتھ جانا پڑے جب کہ تمہارا دل نہیں مان رہا ہو۔''

''اس خچر کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' مشتاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ مل گیا تو میں آپ کے ساتھ جانا پسند کروں گا۔''

بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی کیونکہ لوگ آنا شروع ہو گئے اور شاہ بابا وعظ کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔ شاہ بابا کا وعظ ایک گھنٹے جاری رہا۔ ان کی الفاظ کی تاثیر اور لہجے کے درد نے بہت سارے لوگوں کو رلا دیا تھا۔ خود مشتاق بھی متاثر ہوا تھا اسے ایسا لگا جیسے آج کا وعظ شاہ بابا نے خاص طور سے اس کے لیے دیا ہے۔ بہت سارے لوگوں نے وعظ کے بعد شاہ بابا سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی زندگی مذہب کے اصولوں کے تحت گزارنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے تھے۔ البتہ چند افراد وہاں موجود رہے تھے اور وہ شاہ بابا سے ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ان میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا حمزہ بھی تھا جو بہت عقیدت سے شاہ بابا کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ بابا ان کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔ پھر رات گہری ہونے لگی۔ ایک گھر سے ان کو کھانے کی دعوت ملی تھی۔ وہ ان کے ہاں چلے گئے۔

وہ کھانا کھا کر واپس آئے اور مسجد کے سامنے گھاس پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ اس کے لیے انہوں نے مسجد انتظامیہ سے اجازت لے لی تھی۔ اگرچہ مسجد والوں نے شاہ بابا کی آمد کو پسند نہیں کیا تھا لیکن عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر انہوں نے مسجد کی حد میں ان کے قیام پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں زیادہ سردی نہیں تھی اس لیے وہ آرام سے سوئے تھے۔

صبح اتفاق سے پہلے مشتاق کی آنکھ کھلی تھی۔ روشنی پھیل رہی تھی اور شاہ بابا ابھی سو رہے تھے۔ نماز کے بعد وہ کچھ دیر تلاوت کرتے تھے پھر سورج نکلنے کے بعد سو جاتے تھے۔ مشتاق نے انگڑائی لی اور پھر اس کی انگڑائی ادھوری رہ گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے ان کا خچر موجود تھا اور اس کی پشت پر دو بڑی بوریاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے آنکھیں ملیں کہ وہ کہیں دھوکا تو نہیں کھا رہا تھا لیکن خچر اپنی جگہ موجود رہا۔ مشتاق جھپٹ کر اٹھا اور خچر کے پاس آیا اور پھر اس نے ایک بوری کو ذرا سا کھول کر دیکھا تو اسے سکتہ ہو گیا تھا کیونکہ بوری سونے کے زیورات سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے کل طنز میں شاہ بابا سے کہا تھا کہ خچر سونے سے لدا واپس ملے گا۔ آج نہ صرف خچر آ گیا تھا بلکہ وہ سونے سے بھی لدا ہوا تھا۔ مشتاق نے بدحواس ہو کر شاہ بابا کو جگایا۔

''بابا.... خچر آ گیا ہے اس پر سونا بھی ہے۔''

بابا سمجھے کہ مشتاق خواب دیکھ کر جاگا ہے لیکن جب اس نے خچر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے بوری میں دیکھا۔ اس میں واقعی سونے کے زیورات تھے۔ انہوں نے مشتاق سے پوچھا کہ خچر کہاں سے آیا تو اس نے قسم کھا کر بتایا کہ اسے نہیں معلوم، اس کی آنکھ کھلی تو خچر یہیں کھڑا ہوا تھا۔

شاہ بابا سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اگر خچر یہاں آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اسے چھین کر لے جانے والے بھی آس پاس موجود تھے اور وہ بے خبر تھے اس لیے خچر ان کے پاس سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔

''لیکن اسے کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟ شاید یہ آبادی دیکھ کر اس طرف آیا ہوگا اور یہاں اسے ہم مل گئے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ لوگ خچر کو سونا لادنے کے لیے لے گئے تھے؟'' مشتاق نے کہا۔ ''اور یہ موقع پا کر ان کے پاس سے بھاگ آیا؟''

''ہاں میرے بچے لیکن یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس پر زیورات کی بوری لدی ہوئی ہے اور اس کا یوں بھاگ آنا یقیناً آسان کام نہیں ہوگا۔ مجھے لگ رہا ہے ان لٹیروں کے ساتھ بھی کچھ ہوا ہے اور وہ یا تو اسے چھوڑ کر بھاگ گئے یا اس قابل نہیں رہے کہ خچر کو جانے سے روک سکتے۔'' شاہ بابا نے سوچ کر کہا۔ ''ہمیں اس کی اطلاع قصبے کے کوتوال کو دینی ہوگی۔''

''بابا اگر آپ نے کوتوال کو بتا دیا تو یہ سونا ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔'' مشتاق نے جلدی سے کہا۔

''تو یہ سونا اور کس کے پاس ہونا چاہیے۔'' شاہ بابا نے اسے گھورا۔ ''کوتوال اسے اس کے اصل مالک تک پہنچا دے گا۔''

مشتاق کی خواہش تھی کہ وہ سونا اپنے پاس رکھ لے لیکن شاہ بابا کے سامنے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا تھا مجبوراً اسے ان کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ قصبے کا کوتوال گزشتہ دن خود وعظ میں شریک ہوا تھا، اس نے بابا کی شکایت پر فوری توجہ دی۔ اس نے بابا سے پوچھا۔ ''آپ کو کیا شبہ ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ لٹیرے جنہوں نے ہم سے یہ خچر چھین لیا تھا اور میرے ساتھی کو زخمی کیا تھا کہیں آس پاس موجود ہیں اور شاید اس حالت میں نہیں ہیں کہ خچر کو فرار سے

روک سکیں۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔" کوتوال نے پوچھا۔

"ان کے پاس گھوڑے ہیں اور اگر خچر فرار ہوتا تو یہ اسے آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔مگر خچر آرام سے قصبے تک آ گیا۔"

کوتوال نے فوری طور پر ایک پارٹی تشکیل دی اور خچر پرلدی بوری قبضے میں لے لی۔اس کے بعد شاہ بابا نے خچر کو سہلایا اور چمکایا تو وہ ان کو لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔کوتوال اور قصبے کے کچھ مسلح رضا کار بھی ان کے ساتھ تھے کیونکہ لٹیرے مسلح تھے اوران کے سامنے نہتے جانا حماقت ہوتی۔رضا کاروں میں سے ایک نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ وہی خچر ہے جو گزشتہ دوپہر دو افراد کے ساتھ تھا اور وہ قصبے سے کھانا لے کر میدانوں طرف گئے تھے۔خچر اب آگے تھا اور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔وہ پہاڑوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔

کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد خچر دو جھیل کے درمیانی راستے کی طرف مڑ گیا۔کوتوال نے کہا۔

"اس طرف ایک چھوٹی سی وادی ہے جو کسی کے چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ممکن ہے لٹیرے وہاں موجود ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔" مشتاق بولا۔

کوتوال نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا اورانہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔وہ دبے قدموں وادی تک پہنچے اور جب انہوں نے اندر جھانکا تو ان کو چار افراد مختلف جگہوں پر پڑے نظر آئے۔وہ بالکل ساکت تھے جب کہ ان کے چار عدد گھوڑے اور تین خچر بندھے ہوئے تھے۔وہ سب نزدیک پہنچے تو جلد معلوم ہو گیا کہ وہاں موجود چاروں لٹیرے مر چکے تھے۔ان میں سے دو تو وہی تھے جو قصبے میں کھانا لینے آئے تھے اوران کو تلوار مار کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن دو کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا البتہ ان کے چہرے نیلے ہو رہے تھے اور ان کے منہ پر جھاگ سا جم گیا تھا....

دونوں آس پاس مرے پڑے تھے۔جب کہ پاس ہی کھانا پڑا ہوا تھا۔کوتوال نے ان کی لاشوں کا معائنہ کیا اور بولا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے ان دونوں نے۔" اس نے سنگھ اورنرل کی طرف اشارہ کیا۔" ان دونوں کو قتل کر دیا ہو۔" اس نے کھانا لانے والوں کو دیکھا۔" اور پھر کھانا

منی پور

بھارت کی ایک ریاست۔رقبہ 22356 مربع کلو میٹر یا 8629 مربع میل۔صدر مقام امفل (Imphal) اس کے جنوب اور مشرق میں میانمر (برما) واقع ہے۔زیادہ تر علاقہ جنگلات پر محیط ہے۔یہاں کے باشندوں کا تعلق منگول نسل سے ہے اور یہ تبتی برمی زبانیں بولتے ہیں۔اکثریت ہندو ہیں۔اگا اور کوکی قابلِ ذکر قبیلے ہیں۔1762ء میں راجا منی پور نے برطانیہ سے معاہدہ کیا جس کے تحت برطانیہ نے منی پور پر حملہ آور برمی فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔1947ء تک یہ علاقہ آسام کے زیر انتظام رہا۔پھر یونین ٹیریٹری کی حیثیت دی گئی بالآخر 1972ء میں اسے ریاست کا درجہ دے دیا گیا۔منی پوری اکثریت باشندوں کی زبان ہے۔66 فیصد لوگ زراعت پیشہ ہیں۔

مرسلہ:زویا احمد۔کراچی

کھا کر خود بھی مر گئے ہوں۔"

"لیکن ان کی موت کیسے واقع ہوئی؟" مشتاق حیران تھا۔

"شاید کھانے میں زہر تھا۔" کوتوال نے ایک رکابی میں بچے ہوئے گوشت کو غور سے دیکھا۔اس کا رنگ نیلگوں ہو گیا تھا۔" انہوں نے ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد کھانا کھایا اور خود بھی ہلاک ہو گئے۔"

"لیکن کھانے میں زہر کس نے ملایا تھا؟" مشتاق کے اس سوال پر سب کی نظریں کھانا لانے والوں پر مرکوز ہو گئیں۔

"کھانے میں زہر انہوں نے ملایا ہوگا۔" کوتوال نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" یہ سوال بھی مشتاق نے کیا تھا۔

"اس سونے کے لیے۔" بابا نے خچروں پر لدے زیورات کے تھیلوں کی طرف اشارہ کیا۔" حضرت عیسیٰؑ کے دور میں بھی کچھ لوگوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ان کو کہیں سے سونا مل گیا تھا اور وہ اس کے لالچ میں آ گئے۔وہ دوست تھے

لیکن سونے کی طمع نے ان کی دوستی کو دشمنی میں بدل دیا تھا اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اسی طرح ختم کر دیا تھا جیسے انہوں نے کیا ہے۔''

مشتاق گم صم سا زیورات کے تھیلوں کو دیکھ رہا تھا یقیناً اس میں ہزاروں کی مالیت کا سونا تھا لیکن یہ سونا کسی کو نہیں مل سکا۔ اسے لوٹ کر لانے والے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر کے لاشوں کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ کوتوال نے بھی لاشوں سے زیادہ سونے کو اہمیت دی۔ وہ بوریوں سے لدے خچر اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا اور لاشوں کے بارے میں اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی کہ وہ ان کو لے آئیں۔ قصبے میں آنے کے بعد اس نے بابا کا خچر ان کے حوالے کر دیا۔ زیورات کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ مالکوں کو اس بارے میں اطلاع کر دے گا اور وہ آ کر اپنا سونا واپس لے جائیں گے۔

جب وہ کوتوالی سے نکلے تو مشتاق شرمندہ تھا۔ اس نے بابا سے معذرت کی۔ ''مجھے معاف کر دیں میں نے آپ پر شک کیا۔''

''نہیں میرے بچے تم نے وہی کیا جو ایک انسان کی فطرت کا تقاضہ ہوتا ہے۔'' شاہ بابا نے تردید کی۔ ''ہاں تم نے خدا پر ایمان میں کمزوری دکھائی اس کے لیے تم خدا سے معافی مانگو اور میرے بچے اب ہمارے جدا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔''

''میں آپ کو کبھی نہیں چھوڑوں گا۔'' مشتاق رونے لگا تھا۔ ''میں نے غلطی کی جو آپ سے ایسا کہا۔''

''اس کے باوجود اب تمہارا اور میرا جدا ہو جانا بہتر ہے۔'' شاہ بابا نے نرمی سے کہا۔ ''ویسے بھی میرے بچے تم اس قابل ہو گئے ہو کہ اپنے طور پر زندگی گزار سکو۔''

''نہیں آپ کے ساتھ رہنا اور آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔'' مشتاق نے التجا کی۔ وہ سچ مچ بہت شرمندہ تھا۔

''میں نے کبھی نہیں چاہا کہ کوئی میری طرح بنے، میں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ لوگ اچھے اور نیک بنیں۔'' شاہ بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

مشتاق، شاہ بابا کے ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے قائل کر لیا کہ وہ اب ان سے جدا ہو جائے اور اس قصبے میں رہائش اختیار کر لے کیونکہ یہ جگہ اسے اچھی لگی تھی۔ دوسرے وہ شاہ بابا سے مختلف انسان تھا جو کام شاہ بابا خوشی سے اور پورے دل کے ساتھ کرتے تھے وہی مشتاق بے دلی سے اور خود پر جبر کر کے کرتا اس لیے بہتر تھا وہ وہی کرے جو اس کی خوشی تھی۔ اس شام شاہ بابا نے اپنے وعظ کے بعد مقامی باشندوں سے اپیل کی کہ وہ مشتاق کو اپنے درمیان جگہ دیں اور اسے اس قصبے میں آباد ہونے کا موقع دیں۔ انہوں نے لوگوں کو یقین دلایا کہ مشتاق ایک اچھا اور نیک انسان ہے۔ اس وقت تک سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے حشر کی کہانی پورے قصبے کے علم میں آ گئی تھی اور شاہ بابا ان لوگوں کے نزدیک ایک روحانی ہستی بن گئے تھے۔ ان کی اپیل رد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑھئی نے مشتاق کو اپنا شاگرد بنانے اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کا اعلان کر دیا۔ شاہ بابا نے اسی وقت اسے اس کے سامان سمیت رخصت کر دیا تھا۔ وہ افسردہ تھے لیکن خوش بھی تھے کہ مشتاق اب خوش رہے گا۔

اگلے روز وہ روانگی کا سوچتے ہوئے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اداس تھے کہ اب ان کو مشتاق کے بغیر رہنا ہوگا لیکن مشتاق کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ اب ان سے الگ ہو کر اپنی دنیا آپ بسا لے۔ اچانک ان کو اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں وہی لڑکا نظر آیا جو پہلے دن انہیں پُرشوق انداز میں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔ ''میرے بچے تم کون ہو؟''

''میں حمزہ ہوں اور میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میں بالکل اکیلا ہوں۔''

''جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا خدا ہوتا ہے۔'' انہوں نے پیار سے سمجھایا۔ ''اور جس کا خدا ہوتا ہے وہ کبھی اکیلا نہیں ہوتا ہے۔''

لڑکا جھجکا اور پھر بولا۔ ''کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے کہا۔ ''کیوں نہیں میرے بچے تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو لیکن اس کے لیے تمہیں میری کچھ شرائط ماننا ہوں گی؟''

''مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے میں آپ کی ہر بات مانوں گا۔'' حمزہ نے جوش سے کہا۔

شاہ بابا مسکرانے لگے ان کو لگا وہ اکیلے نہیں رہے تھے ان کو مشتاق پھر سے مل گیا تھا۔ ''ٹھیک ہے تب تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔''

فلم ساز

کاشف زبیر

امریکی شہر ہالی ووڈ فلم سازی کے لیے اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس شہر کے ایک معروف ہدایت کار کا عکسِ زیست جو تابشِ آفتاب و تابیدہ ماہِ کامل تھا۔ اس نے بہت کم فلمیں بنائیں لیکن اس کی فلمیں کامیابی کی ضمانت ٹھہریں۔

وہ حوادث کا منہ موڑنا جانتا تھا اور یہی بات کامیابی کی ضمانت ٹھہری

سام میش اپنے دفتر میں آرام کرسی پر جھول رہا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس سوائے آرام کرسی پر جھولنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بلکہ اس سے کہیں جونیئر بھی ان دنوں اس طرح مصروف تھے کہ ان کے پاس سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ ان دنوں کوئی فلم ساز اور ہدایت کار اپنے دفتر میں نہیں پایا جاتا تھا سوائے سام میش کے۔ سام ایک فلم ساز و ہدایت کار تھا اور اس کا شمار انڈسٹری کے چوٹی کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ بیس سال پہلے

بہ حیثیت نائب ہدایت کار سے ہالی ووڈ کے اس بڑے فلم ساز ادارے اور اسٹوڈیو میں ملازم ہوا تھا۔ دو سال تک وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا اور اس دوران میں اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے چند چھوٹی چھوٹی فلموں میں تیسرے درجے کی ہدایت کاری کرنے کے جن میں اس کا نام بھی نہیں آیا تھا۔

پھر اسے چانس ملا ہوا یہ کہ ایک درمیانے درجے کی فلم کا ہدایت کار شوٹنگ کے دوران ایک حادثے میں شدید زخمی ہوگیا اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کئی مہینے تک اس کے وہاں سے نکلنے کے امکانات نہیں تھے۔ ادارے کے کرتا دھرتا پریشان تھے کہ اب اس فلم کا کیا کریں جو تیس فی صد مکمل بھی ہوگئی تھی اور تکمیل کے بعد اسے دو سو سے زائد تھیٹرز میں ریلیز ہونا تھا۔

کوئی یہ خاص فلم نہیں تھی اور اس کا شمار ان فلموں میں ہوتا تھا جو محض خانہ پوری کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ نئے فن کاروں اور فلم ساز عملے کی جانچ ہو جائے اور نیا ٹیلنٹ بھی سامنے آتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ادارے کے چار ہزار سے زیادہ مووی تھیٹرز میں ریلیز کرنے کے لیے مناسب تعداد میں فلمیں موجود ہوں۔ اس قسم کی فلموں کے فلاپ ہونے سے عام طور سے ادارے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان فلموں کی لاگت کو ہمیشہ نقصان والے کھاتوں میں جگہ ملتی ہے۔ لیکن یہ اتنی غیر اہم بھی نہیں ہوتی ہیں کبھی کبھی ان میں سے کوئی فلم غیر متوقع طور پر غیر معمولی کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ پھر ان کا تیار ہو کر ریلیز ہونا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اس لیے ادارے کے مالکان بہر صورت اس فلم کی تکمیل چاہتے تھے۔ بڑے ہدایت کاروں نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ درمیانے درجے کے تمام ہدایت کار بے حد مصروف تھے اس لیے قرعہ فال سام کے نام نکلا۔

سام خوشی سے اچھل پڑا تھا کہ اسے کوئی کام تو ملا۔ لیکن جب اس نے فلم کا اسکرپٹ اور اس کی شوٹ ہونے والی ریلیں دیکھیں تو اس کی خوشی ماند پڑ گئی۔ یہ ایک اچھے موضوع کو لے کر بنائی جانے والی نہایت بکواس فلم تھی۔ اسکرپٹ میں ہی اس کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا اور رہی سہی کسر شوٹ میں پوری کر دی گئی تھی۔ بے شک سام نے اب تک کوئی فلم نہیں بنائی تھی لیکن اسے اتنا تو معلوم تھا کہ ایک اچھی فلم کیسی ہوتی ہے۔ یہ خراب سے بھی آگے کی کوئی فلم تھی اور اسے بنانے کا مطلب تھا سام آغاز میں ہی اپنے نام کو بٹا لگا لیتا۔ چوبیس سال کی عمر میں اس کے پاس ترقی کے لیے بہت وقت تھا اور اسے ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کہ وہ اس فلم کے ساتھ برا آغاز کرتا۔ لیکن وہ ادارے کے مالکان کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ڈپلومیسی سے کام لیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اسے فلم میں اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرنے کی اجازت دی جائے۔ نیز وہ اسکرپٹ بھی نئے سرے سے لکھوائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا جائے گا لیکن اس وقت اسے حیرت ہوئی جب اس کے تمام مطالبات مان لیے گئے۔ اصل میں ادارے کے ایک بڑے نے سام کے اندر چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے سام کے مطالبات دیکھے اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس فلم کے لیے یہی شرائط عاید کرتا ورنہ انکار کر دیتا۔ اس لڑکے میں صلاحیت ہے اس لیے میں اس کی حمایت کروں گا۔“

یوں سام کے مطالبات مان لیے گئے۔ لیکن جب اس نے فلم شروع کی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے ایک جنجال اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔ فلم میں سب ہی دوسرے درجے کے اداکار تھے جن کو اداکاری نہیں آتی تھی۔ تکنیکی عملہ اور سامان تیسرے درجے کا تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اسے جو اسکرپٹ رائٹر ملا تھا۔ وہ سرے سے کسی بھی درجے میں نہیں آتا تھا۔ اس نے اتنے اچھے خیال پر اتنا واہیات اسکرپٹ لکھا تھا کہ سر پیٹ لینے کو دل چاہتا تھا۔ جب سام نے اسے سمجھایا کہ اسے اسکرپٹ کس قسم کا چاہیے تو اس نے ترمیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکرپٹ تبدیل کیے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اب سام کے پاس اس کے سوا اور کوئی حل نہیں تھا کہ اسکرپٹ خود لکھے۔ اس نے آستینیں چڑھائیں اور اپنے ٹائپ رائٹر میں جت گیا۔ اس وقت ان کو کمپیوٹر فراہم نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سارا دن دفتر میں اسکرپٹ لکھنے کے ساتھ وہ فلم کے اداکاروں اور تکنیکی عملے سے بھی سر کھپاتا رہتا تھا۔ وہ شوٹنگ کے آغاز سے پہلے ان کا کام ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں اسے کچھ دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ وہ نو آموز تھا اور یہ دوسرے درجے کے اداکار و تیسرے درجے کا تکنیکی عملہ بھی اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ سارا دن ان سے سر مارنے کے بعد وہ شام کو اسکرپٹ اپنے ساتھ لے جاتا اور ایک تھرڈ کلاس موٹیل کے

کمرے میں رات گئے تک اس پر کام کرتا جہاں وہ ہالی ووڈ آنے کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا۔

دن رات محنت کر کے اس نے پہلے اسکرپٹ مکمل کیا اور پھر اس کے مطابق شوٹنگ کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھی اسے اہمیت نہیں دے رہے تھے لیکن جب اس نے پہلا سین شوٹ کیا اور اس کا نتیجہ پردے پر دیکھا گیا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ ایک نوآموز ہدایت کار نے پہلا ہی سین بہت اچھا شوٹ کیا ہے۔ یہ کسی بھی بڑے ہدایت کار سے کم معیار کا کام نہیں تھا۔ اداکاروں نے اسکرپٹ پر غور کیا تو ان کو کہانی میں جان نظر آئی اور انہوں نے اپنی اداکاری میں جان مارنا شروع کر دی کیونکہ فلم ہٹ ہو جاتی تو وہ سب ہٹ ہو جاتے۔

ادارے کے بڑوں نے سام کی ایک بات نہیں مانی تھی۔ اس نے فلم کا بجٹ بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا اسی مطالبے پر اسے بتایا گیا کہ اسے اسی بجٹ میں فلم تیار کرنی ہے اور سابق ہدایت کار جو خرچ کر چکا تھا وہ بھی نہیں ملے گا یعنی اسے مزید تیس فی صد کم بجٹ ملا تھا اور اس میں فلم کی تیاری بہت مشکل تھی۔ لیکن سام نے اس بات کو مسئلہ بنانے کی بجائے کام شروع کر دیا۔ توقع کے عین مطابق ابھی نصف شوٹنگ ہوئی تھی کہ بجٹ ختم ہو گیا۔ اس نے اوپر والوں کو اطلاع کر دی کہ بجٹ ختم ہو گیا ہے اب جب تک مزید رقم نہیں ملے گی شوٹنگ ممکن نہیں ہے۔ اس پر اس کی طلبی ہو گئی اور اس سے کہا گیا کہ اس نے اب تک جو کچھ شوٹ کیا ہے وہ بھی ساتھ لے کر آئے۔

سام ریلوں کے ڈبے بغل میں دبائے ڈائریکٹرز کے پاس پہنچ گیا جو اس کی گوشمالی کے لیے تیار تھے۔ سب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور اسے بہت کچھ سننا پڑا تھا۔ وہ سنتا رہا جب انہوں نے اپنی بات ختم کر لی تو سام نے اٹھ کر پروجیکٹر پر اپنی نامکمل فلم کی ریل لگا دی۔ فلم شروع ہوئی۔ پہلے ہی منظر سے اس نے میٹنگ ہال میں موجود تمام افراد کو متوجہ کر لیا۔ یہ کوئی ایک گھنٹے کی مووی تھی اور اس میں آواز اور ساؤنڈ مکسنگ بھی نہیں تھی۔ بلکہ اب تک ایفکٹس بھی نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس کے باوجود فلم کا ایک ایک سین دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک گھنٹے تک کسی نے آواز بھی نہیں نکالی تھی البتہ جب فلم اچانک ادھوری ختم ہو گئی تو ایک ڈائریکٹر نے اعتراض کیا۔ ''باقی فلم کہاں ہے؟''

''باقی فلم کے لیے ہی تو بجٹ کی ضرورت ہے۔'' سام نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے بعد بجٹ کی منظوری میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اور اگلے روز سے سام نے شوٹنگ شروع کر دی۔ مقررہ وقت پر تکمیل کے بعد جب فلم کی ریلیز کا مرحلہ آیا تو اسے بی کے بجائے اے کیٹیگری دے دی گئی اور اسے بہترین تھیٹرز میں ریلیز کیا گیا۔

فلم نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اس سے منسلک افراد راتوں رات سپر اسٹار بن گئے۔ سام کو فلم کی کامیابی پر صف اوّل کے ہدایت کاروں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے سب کو چونکا دیا تھا اور ادارے والے اب اس سے کام لینے کے لیے بے چین تھے۔

ٹیکساس کے ایک چھوٹے سے قصبے سے اٹھ کر ہالی ووڈ میں کامیابی حاصل کرنا کسی دیوانے کے خواب سے کم نہیں تھا۔ سام نوعمری سے ہدایت کار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا جب کہ اس کا زمیندار باپ چاہتا تھا کہ وہ فلم نگری کے خواب دیکھنا چھوڑ دے اور گریجویشن کر کے اس کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن سام اپنی دھن کا پکا تھا اس نے باپ کے دباؤ پر گریجویشن کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھایا اور گھر سے رخصت ہو گیا۔ اس کی جیب میں معمولی سی رقم تھی۔ لیکن اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے وہ محنت مزدوری کرنے کو بھی تیار تھا۔ پھر اسے سچ مچ دو سال ہالی ووڈ میں محنت مزدوری کر کے اپنا گزارا کرنا پڑا تھا تب کہیں جا کر اسے اس فلم ساز ادارے میں ملازمت ملی تھی۔

سام کو فوری طور پر کسی نئی فلم کے آغاز کا کہا گیا لیکن اس نے ادارے کے مالکان پر واضح کر دیا کہ وہ اس طرح سے فلم سازی نہیں کرے گا۔ جب تک اسے کسی اچھی فلم کا خیال نہیں سوجھ جاتا۔

وہ اب ان لوگوں کی مجبوری بن گیا تھا اس لیے وہ سام کے جواب کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئے اور صبر سے انتظار کرنے لگے کہ کب سام ان کو کوئی دوسری فلم تیار کر کے دیتا ہے۔ صف اوّل کے ہدایت کار فلم ساز بھی ہوتے تھے اور وہ اپنی اگلی فلم خود منتخب کر کے اوپر والوں سے صرف اس کی منظوری لیتے تھے۔

سام نے اگلی فلم بنانے میں دو سال لگا دیئے اور اس نے خوب چھان پھٹک کر ایسا موضوع لیا جس پر پہلے کم ہی فلمیں بنی تھیں اور اس نے اسے اس طرح بنایا کہ یہ اس کی

پہلی فلم سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی جب کہ اس کی پہلی فلم ابھی تک بزنس کر رہی تھی۔ سام کی شہرت، عزت اور مرتبے میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ دوسری فلم نے پوری کر دی اور اس پر دولت کی بارش ہوگئی۔ اگرچہ اسے پہلے ہی شاندار تنخواہ کے ساتھ ادارے کی طرف سے مراعات بھی مل رہی تھیں لیکن اس فلم میں اسے منافع میں بھی حصہ ملا تھا اور وہ دوسری فلم سے ملینیر بن گیا تھا۔

سام اب تک کرائے کے مکان میں رہتا آرہا تھا۔ دولت ہاتھ آئی تو اس نے بیورلی ہلز میں جہاں چوٹی کے فن کاروں کے گھر تھے ایک عالی شان ولا خرید لیا۔ اس کے پاس وہ سب آ گیا تھا جس کی ہالی ووڈ میں خواہش کی جا سکتی ہے۔ اس کے پاس بہترین گاڑیاں تھیں اور عورتیں اس کے آس پاس منڈلانے لگی تھیں۔ ان میں پرانی اداکارائیں بھی تھیں اور ابھرتی ہوئی اداکارائیں بھی۔ وہ جانتی تھیں کہ سام ایک ایسا فلم ساز تھا جو ایک ہی فلم میں ان کو آسمان کی بلندیوں تک لے جا سکتا تھا۔

سام نے پہلی محبت ایک اداکارہ سے کی تھی۔ نیٹ پارس نامی یہ اداکارہ صرف حسین و جمیل ہی نہیں تھی بلکہ بے حد ذہین بھی تھی اور اس کی ذہانت کا اندازہ تو اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے سام کو اپنی محبت پر قائل کر لیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ نظر آنے لگے اور اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر میں پائے جاتے تھے۔ سام نے ہالی ووڈ کے رواج کے برعکس اپنی محبت چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے ایک صحافی سے کہا۔ ”ہم ٹیکساس والے کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے۔ ہاں میں نیٹ سے محبت کرتا ہوں۔“

شادی کے معاملے میں دونوں ہی سنجیدہ نہیں تھے۔ نیٹ سام کی طرف آئی تو اس کا خیال تھا کہ سام اسے اپنی آنے والی فلم میں کاسٹ کرے گا۔ لیکن جب سام نے ایک سال بعد تیسری فلم کا آغاز کیا تو نیٹ اس میں نہیں تھی۔ ایک سوال کے جواب میں سام نے بڑی سادگی سے اس کی وضاحت کر دی۔ ”اس فلم میں کسی کردار کے لیے نیٹ موزوں نہیں ہے اس لیے وہ اس فلم میں نہیں ہے۔“

جب یہ خبر شائع ہوئی تو سام اور نیٹ کے تعلقات میں پہلی دراڑ آئی۔ اس کے باوجود یہ تعلقات جاری و ساری رہے تھے۔ ان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب سام نے اپنی اگلی فلم میں بھی نیٹ کو نہیں لیا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گئی۔

ان کے درمیان کیا ہوا تھا اس کا کسی کو علم نہیں تھا کیونکہ نہ تو نیٹ نے اور نہ ہی سام نے کبھی اس بارے میں اپنی زبان کھولی تھی۔ دونوں ہی اندر کی باتوں کو پی گئے تھے۔ خود کو تماشہ بنانے سے گریز کیا تھا۔

اس کے بعد سام نے کئی سال تک کسی عورت سے راہ و رسم بڑھانے سے گریز کیا۔ حالانکہ اس کے قرب کی خواہش مند عورتوں کی کوئی کمی نہیں تھی اور ان میں نامور سلی بریٹیز بھی شامل تھیں۔ سام اپنے کام میں مگن رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی فلمیں بنانے کا قائل نہیں تھا۔ وہ عام طور سے دو سال میں جا کر ایک فلم مکمل کرتا تھا۔ کسی فلم سے فارغ ہونے کے بعد وہ پہلے نئے آئیڈیے کی تلاش کرتا تھا اور پھر اسے اپنے ذہن میں پکاتا رہتا تھا۔ جب وہ پوری طرح تیار ہو جاتا تو اسے اسکرپٹ کی صورت میں لاتا تھا۔ پہلی فلم کے بعد وہ اسکرپٹ بھی خود تیار کرنے لگا تھا البتہ معاونت کے لیے وہ ادارے کے کسی اچھے اسکرپٹ رائٹر کو ساتھ رکھ لیتا تھا۔

سام کی تیسری اور پھر چوتھی فلم بھی بلاک بسٹر ثابت ہوئی۔ اس کی کامیابی کے بعد سام کا شمار آل ٹائم گریٹ ڈائریکٹرز میں ہونے لگا تھا۔ اس کی تیسری فلم پر اسے آسکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا اور اسے بہترین ہدایت کاری پر یہ اعزاز ملا تھا۔ چوتھی فلم کے بعد وہ چھٹیاں گزارنے آسٹریلیا چلا گیا اور وہاں کئی مہینے تک مقیم رہا تھا۔ آسٹریلیا سام کا پسندیدہ ملک تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ مستقبل میں یہیں رہائش اختیار کرے گا لیکن فی الحال تو وہ ہالی ووڈ سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔

اپنی پانچویں فلم کے لیے اس نے زیادہ ہی وقت لگا دیا تھا اور اس بار اس نے تین سال بعد اگلی فلم کا آغاز کیا۔ حسب معمول اس کا آئیڈیا اور اسکرپٹ بھی اسی کا تھا۔ اب تک سام واقعات پر فلمیں بناتا آیا تھا پہلی بار اس نے ایک کردار لیا اور یہ بھی اس کا تخلیق کیا ہوا تھا۔ اس کا کردار ایسا وش ماسٹر تھا جو صرف دوسروں کے کام آ سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے لیے کوئی خواہش کرتا یا کوئی ایسی خواہش کرتا جس میں اس کا مفاد بھی ہوتا تھا تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ وش ماسٹر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو کوئی خواہش کرتا ہے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مغربی کامکس میں ایسے کئی کردار تھے۔

لیکن سام کا تخلیق کیا ہوا وش ماسٹر بینگ منفرد تھا۔ اس

کے دشمن اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسے ایسی خواہشات پر مجبور کرتے ہیں جن سے اسے نقصان اور دشمن کو فائدہ ہو۔لیکن بینگ اپنی ہمت اور بہادری سے دشمن پر حاوی آجاتا ہے۔سام کی یہ فلم اس کی سابقہ تمام فلموں سے زیادہ کامیاب رہی تھی اور فلم بین بینگ کے کردار کے دیوانے ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بینگ برانڈ کی درجنوں اشیا مارکیٹ میں آگئیں۔اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے ادارے کے مالکان نے بینگ کے کردار پر فلم کی سیریز بنانے کا مشورہ دیا۔یہ مشورہ سام کے دل کو لگا تھا اور فلم کی کامیابی نے بھی اسے اکسایا تو اس نے فوراً ہی بینگ کی اگلی فلم کی تیاری شروع کردی۔

بینگ کا ہیرو ایک معمولی سا اداکار تھا لیکن سام نے بھانپ لیا کہ وہ بینگ کے کردار میں یوں فٹ ہوگا جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔یہ ایک معصوم صورت اور بھولا بھالا نوجوان ہوتا ہے جسے اس کے دشمن چالاک بناتے ہیں۔سام نے بینگ کو عام کومک کرداروں کے برعکس معاشرے کا حصہ دکھایا جو ہر اس مسئلے سے دوچار ہوتا ہے جو ایک عام آدمی کو پیش آتے ہیں۔ وہ صرف خواہش کرنے کے معاملے میں دوسرے انسانوں سے منفرد ہے اور اسی بات نے بینگ کو مقبول عام بنا دیا۔ بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار ایک ہی فلم سے دنیا بھر میں جانا پہچانا بن گیا تھا۔

سام نے پہلی فلم میں کوئی ہیروئن نہیں ڈالی تھی لیکن دوسری فلم میں اس نے ایک نئی لڑکی کو متعارف کرایا۔یہ ایک سماجی کارکن تھی اور بینگ کی پرستار بھی تھی۔ بینگ کا دشمن نئے انداز میں سامنے آتا ہے اور وہ لڑکی کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ خود لڑکی کو بھی پتا نہیں چلتا ہے۔وہ آخر میں بینگ پر قاتلانہ حملہ کرتی ہے اور بینگ مرنے والا ہو جاتا ہے۔وہ خواہش کرکے اپنی جان بھی نہیں بچا سکتا تھا کیونکہ اس کی ایسی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی جو اس کی ذات کے بارے میں ہو۔اس موقع پر پھر بینگ کی ذہانت کام آتی ہے۔ ہیروئن بینگ پر قاتلانہ حملہ کرکے پشیمان ہے اور رو رہی ہے۔تب بینگ خواہش کرتا ہے کہ لڑکی جو خواہش کرے وہ پوری ہو جائے۔لڑکی خواہش کرتی ہے کہ بینگ ٹھیک ہو جائے۔ایسا ہی ہوتا ہے۔یوں بینگ ایک بار پھر اپنی ذہانت سے اپنے دشمن کو شکست دے دیتا ہے۔یہ فلم پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہی تھی۔ بینگ اب فلم بین طبقے کی جان بن چکا تھا۔

فاس

مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا مقام سکونت۔ آبادی دولاکھ سے زائد۔محل وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔فاس درحقیقت دوشہروں پر مشتمل ہے۔ فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر) فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔صرف دارالمخزن ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔دارالمخزن ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزرائے دفاتر اور کوشک سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو اپنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔یہ شہر دریائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلوان چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فصیل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنائی گئی ہے۔ فاس صرف اپنے محل وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز ومعروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔اور انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

فلم کی شوٹنگ کے دوران سام ہیروئن ربیکا کے خاصا قریب آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف بیس سال کی تھی اور سام اب بتیس کا ہونے والا تھا لیکن دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تھی اس لیے وہ جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ فلم کی تکمیل کے دوران سام کے مخالفوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے ربیکا کو بھرتی کیا ہے اور اس میں اس کا اپنا مفاد ہے۔ جب شوٹنگ کے دوران سام اور ربیکا قریب آئے تو ان الزامات میں شدت آ گئی۔ سام نے میڈیا پر اسے بل شٹ قرار دے کر اس بارے میں بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ربیکا سو فی صد میرٹ پر آئی ہے اور جب فلم ریلیز ہوئی تو سام کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ ربیکا نے فلم میں غیر معمولی اداکاری کی تھی اور پہلی ہی فلم نے اسے سپر اسٹار بنا دیا تھا۔

سام نے سیریز کی دوسری فلم کی کامیابی کے بعد فیصلہ کیا کہ ابھی وہ آرام کرے گا۔ جب کہ ادارے کے مالکان اور ربیکا کا اصرار تھا کہ وہ جلد از جلد بینگ پر تیسری فلم بنائے کیونکہ ابھی یہ کردار مقبول تھا اور نئی فلم بھی کامیاب ہوتی۔ لیکن سام کا کہنا تھا کہ اتنی جلدی وہ فلم بنا کر اپنے کردار کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک اس کے ذہن میں کوئی بہترین آئیڈیا نہیں آ جاتا وہ نئی فلم کا آغاز نہیں کرے گا۔ اس کے جواب نے مالکان اور فلم کے لوگوں کو مایوس کیا تھا۔ ربیکا اور بینگ کا کردار ادا کرنے والا اداکار شیلر دوسری فلموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی کامیابی کی وجہ سے فلم ساز ان پر ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

ربیکا کی مصروفیات بڑھیں تو سام اور اس کا ملنا جلنا کم ہو گیا لیکن ان کا تعلق اور اس کی نوعیت برقرار تھی۔ ربیکا نے دوسری فلموں میں بھی کامیابی حاصل کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہالی ووڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن گئی تھی۔ اس وجہ سے میڈیا کی توجہ کا مرکز بھی بن گئی اور آئے دن اس کا نام کسی نہ کسی اداکار کے ساتھ لے کر خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پریشان ہو گئی تھی لیکن سام نے اسے تسلی دی کہ یہ معمول کی بات ہے اور سلی برٹیز بننے کی قیمت بھی ہے اس لیے وہ پریشان نہ ہو۔ سام کو اس پر اور اس کی محبت پر پورا اعتماد تھا۔ سام نے ربیکا کی کامیابی کو اس کی صلاحیتوں کی مرہون منت قرار دیا۔ اس نے ربیکا پر دباؤ نہیں ڈالا تھا کہ وہ بینگ سلسلے کی تیسری فلم کے لیے بھی کام کرے کیونکہ اس فلم میں اصل کردار بینگ کا تھا، ہیروئن کا کردار بہت کم تھا جب کہ ربیکا اب ایسی اداکارہ بن گئی تھی جس کو لے کر خاص کردار تخلیق کیے جاتے تھے۔ لیکن سام نے اسے پیش کش ضرور کی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ربیکا نے انکار کر دیا۔

ربیکا سے تعلق نہ تو سام نے چھپایا اور نہ ربیکا نے البتہ انہوں نے ان افواہوں کو مسترد کر دیا کہ وہ چھپ کر شادی کر چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن انہوں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ ابھی ربیکا کے کیریئر کا آغاز تھا اور اسے شادی وغیرہ کے چکر میں پڑے بغیر اپنے کام پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

سام خود بھی بینگ پر تیسری فلم جلد بنانا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس کی کہانی کو اتنا جاندار رکھنا چاہتا تھا کہ دیکھنے والے اسے پہلی دو فلموں سے کسی طرح بھی ہلکا نہ پائیں۔ اس سلسلے میں اس نے آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کیا جہاں وہ تمام جھمیلوں سے آزاد ہو کر صرف کہانی پر غور کر سکے۔ ابھی وہ آسٹریلیا میں تھا کہ نائن الیون کا واقعہ پیش آ گیا اور ساری دنیا میں بھونچال آ گیا تھا۔ امریکا پر حملہ غیر معمولی تھا اور اس واقعے نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خود سام اتنا پریشان ہوا تھا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے کہانی پر کام ملتوی کر دیا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ سب معمول پر آتا چلا گیا۔ سام نے بھی اپنی کہانی پر کام مکمل کیا اور امریکا واپس آ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ ادارے کے مالکان سے منظوری لے گا اور فلم پر فوری کام شروع کر دے گا۔ لیکن جب اس نے اپنی کہانی مالکان کے سامنے رکھی تو انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے انہوں نے سام سے کہا کہ وہ بینگ پر عالمی دہشت گردی کے حوالے سے کوئی کہانی بنا کر اسے فلمائے۔ سام نے وجہ دریافت کی تو اسے جواب ملا۔ ''اس وقت ہمیں مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔''

سام کو حیرت ہوئی کہ دنیا کی واحد سپر پاور کو بھی مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے امریکیوں کو مورل سپورٹ کی ضرورت ہے لیکن میرا کردار صرف امریکا کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک یونیورسل کریکٹر ہے۔''

''اس وقت امریکی بن کر سوچو۔'' اسے مشورہ دیا گیا۔

سام نے اس کی کوشش کی لیکن وہ خود کو قائل نہیں کر

سکا۔ اس نے مالکان کو جواب دے دیا۔ ’’میں اپنے کردار کو تبدیل نہیں کر سکتا۔‘‘

’’تب ہمیں اس کی مزید ضرورت نہیں ہے۔‘‘

سام مایوس ہوا تھا کیونکہ اس نے کہانی پر بہت محنت کی تھی اور اب موقع تھا تو یہ مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ جلد اسے معلوم ہو گیا کہ ادارے والوں کی حب الوطنی نے جوش نہیں مارا تھا بلکہ فلم ساز اداروں کو حکومت کی طرف سے حکم آیا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ فلمیں تیار کر کے عوام کا ذہن بنائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس موضوع پر تواتر سے فلمیں سامنے آنے لگی تھیں۔ سام نے شروع میں اس بارے میں کچھ سوچا نہیں تھا لیکن جیسے جیسے وہ حالات دیکھتا رہا اسے اپنے حکمرانوں کی پالیسیوں سے اختلاف ہونے لگا۔ وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے پورے ملک کو استعمال کر رہے تھے۔

سام کو ایک فلم کا خیال آیا۔ یہ جنگ کے موضوع پر طنزیہ فلم تھی۔ کیونکہ بینگ والی کہانی مسترد ہو گئی تھی اس لیے اس نے اس خیال پر کام شروع کر دیا اور بڑی عرق ریزی کے بعد اسکرپٹ مکمل کر کے ادارے کے کرتا دھرتا کو پیش کیا۔ لیکن اس کا اسکرپٹ پھر مسترد کر دیا گیا۔ عملاً اسکرپٹ اس کے منہ پر دے مارا گیا۔ ادارے کے ایک مالک جو عرف عام میں بگ برادر کہلاتا تھا اس نے اسکرپٹ کی فائل سام کی طرف پھینکی۔ ’’یہ کیا بکواس ہے؟‘‘

’’یہ ایک فلم کا خیال ہے۔‘‘

’’ہمیں اس قسم کی فلموں کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ بگ برادر نے غرا کر کہا۔

’’میرے خیال میں ضرورت ہے۔‘‘ سام نے اصرار کیا۔ ’’کیونکہ لوگ پریشان ہیں ان کو تفریح کی ضرورت ہے۔‘‘

’’لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے یہ تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ تم کسی جنگی موضوع پر کام کرو جس میں ملک کے مفاد کو اجاگر کیا گیا ہو۔‘‘

’’ایسی فلمیں تو آج کل درجنوں کے حساب سے بن رہی ہیں۔ خود ہم ابھی کم سے کم تین فلموں پر کام کر رہے ہیں۔‘‘

’’تم اس کی فکر مت کرو۔ تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔‘‘

’’سوری بگ برادر میں تفریحی فلمیں بناتا ہوں پروپیگنڈہ فلمیں نہیں۔‘‘ سام نے انکار کر دیا۔

’’تب تم جا کر آرام کرو۔‘‘

جلد سام کو اندازہ ہو گیا کہ اسے صرف مشورہ ہی نہیں دیا گیا تھا بلکہ اسے آرام کرانے کا بندوبست بھی کر لیا گیا تھا۔ اس کے پاس فی الحال کوئی فلم نہیں تھی اور اس کے دو آئیڈیے مسترد کیے جا چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد سام نے ایک رومانی اور حساس کہانی کا اسکرپٹ تیار کر کے منظوری کے لیے پیش کیا جسے پڑھے بغیر ہی مسترد کر دیا گیا کیونکہ اسے جتنی جلدی مسترد کیا گیا تھا اسے پڑھنے کے لیے اس سے دوگنا وقت درکار تھا۔ تب سام سمجھ گیا کہ اسے اس کے انکار کی سزا دی جا رہی ہے۔ اس نے مزید کسی آئیڈیے پر کام کرنے کے بجائے بہتر سمجھا کہ اپنے تیار اسکرپٹس کے لیے کوئی سرمایہ لگانے والا تلاش کرے۔ اگرچہ وہ ادارے کا ملازم تھا لیکن اسے نجی طور پر کام کرنے کی آزادی حاصل تھی بہ شرط کہ وہ ادارے کی سرگرمیوں میں خلل نہ ڈالے۔ وہ فارغ تھا اس لیے اس چھوٹ سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

لیکن جب سام نے ہالی ووڈ میں آزادانہ کام کرنے والے سرمایہ کاروں سے رجوع کیا تو ان میں سے بھی کسی نے اسے لفٹ نہیں کرائی۔ حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ سام کس پائے کا فلم ساز ہے اور اس کی بنائی کوئی بھی فلم ناکام نہیں ہوئی ہے۔ یہ وہی سرمایہ کار تھے جو اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے اور فلم بنانے کے عوض اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار رہا کرتے تھے۔ اب وہ اسے انکار کر رہے تھے اور ظاہر ہے ان کے انکار کے پس پشت سام کے باس بگ برادر کا ہاتھ تھا۔ ورنہ کوئی بھی فلمی سرمایہ کار کم سے کم بینگ کی فلم میں سرمایہ کاری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر سام بیٹھ گیا تھا۔ وہ اب استعفا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ادارے والے اسے خالی بٹھا کر ذلیل کر رہے تھے اور وہ اس دوران میں سوائے مکھیاں مارنے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ یہاں سے جان چھڑائے گا تو اسے کسی اور اسٹوڈیو کی طرف سے پیش کش ہو گی۔ فیصلہ کر کے اس نے استعفا دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی جب اس نے استعفا بگ برادر کے سامنے رکھا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’اس کا مطلب جانتے ہو؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ سام نے جواب دیا۔

’’اب تم ہالی ووڈ میں کوئی کام نہیں کر سکو گے۔‘‘

''تم بگ برادر ضرور ہو لیکن گاڈ فادر نہیں ہو۔'' سام نے طنز کیا۔ ''میں کہیں نہ کہیں کام حاصل کرلوں گا۔''

''اگر کر سکو تو ضرور کر لینا؟'' بگ برادر نے طنزیہ انداز میں کہا اور اس کا استعفا منظور کرلیا۔

سام نے کوشش کی کہ اسے کسی اور ادارے میں ملازمت مل جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اس وقت اسے دھچکا لگا جب اس کی درخواستوں کا کہیں سے جواب نہیں آیا۔ اس کے منیجر نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن کوئی مستند فلمی ادارہ اسے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ میڈیا میں بھی اس کے حق میں کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں خبریں ضرور آتی تھیں کہ سام نے اسٹوڈیو سے استعفا دے دیا یا سام کی فلاں اسٹوڈیو میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش ناکام رہی لیکن ان میں اس کے لیے ہمدردی کا عنصر نہیں پایا جاتا تھا۔ خبر برائے خبر ہوتی تھی۔

پھر ہالی ووڈ کے جنگی جنون میں مبتلا گروہ نے اس کے خلاف مہم شروع کر دی اور اس پر الزام لگایا کہ امریکا سے کمانے اور عزت و شہرت حاصل کرنے کے بعد وہ ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

سام نے ان الزامات کی تردید کی اور وضاحت کی کہ وہ صرف حکمرانوں کی پالیسیوں کے خلاف ہے جو ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت نہ تو کسی نے سنی اور نہ ہی اسے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس پروپیگنڈہ مہم کے زیر اثر رائے عامہ بھی اس کے خلاف ہوگئی تھی۔ کئی بار سام کے گھر کے سامنے لوگ پلے کارڈز اٹھا کر کھڑے ہو گئے جن میں اسے ملک کا غدار اور دشمن تک قرار دیا گیا تھا۔

سام کے لیے یہ مشکل وقت تھا اور اس کے پاس سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس معاملے میں جتنا بھی بولے گا اور وضاحتیں پیش کرے گا وہ سب اس کے خلاف جائیں گی۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ خاموشی سے ملک کے اس جنونی دور سے گزر جانے کا انتظار کرے۔ سام کو آخری فلم بنائے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ اس کے بعد اسے کوئی فلم بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس کے لوگوں میں برداشت کا مادہ نہیں ہے۔ سارتر نے فرانسیسی ہوتے ہوئے بھی الجزائر کی تحریک آزادی کی حمایت ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ اپنے ملک سے لڑا بھی تھا اس کے باوجود کسی نے اسے غدار قرار نہیں دیا بلکہ اس وقت کے صدر ڈیگال نے اس عظیم فلسفی کی گرفتاری کے مشورے پر حیرت سے کہا تھا کہ کیا میں فرانس کو گرفتار کرلوں۔ سارتر فرانس ہے اور میں پورے فرانس کو گرفتار نہیں کر سکتا۔ اور یہاں سام کو غدار قرار دیا جا رہا تھا۔

سام کے جاننے والے اور فلمی دنیا کے ساتھی رفتہ رفتہ اس سے دور ہونے لگے۔ انہیں بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ سام سرکاری عتاب میں آیا ہوا ہے اور اس کے قریب جانے والے یا اس سے ہمدردی رکھنے والے ہر شخص کا انجام سام جیسا ہی ہوسکتا تھا۔ سام کا خیال تھا کہ شاید ربیکا اس سے یہ سلوک نہیں کرے گی لیکن اسے دھچکا لگا جب ربیکا بھی اس سے دور ہونے لگی۔ سب کی طرح ربیکا کو بھی اپنا کیریئر عزیز تھا۔ لیکن اس نے دوسروں کی طرح منافقت کرنے کے بجائے سام سے صاف کہہ دیا۔ ''سام میں اب تم سے نہیں مل سکتی۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' سام نے جواب دیا۔ ''یہ تمہارے کیریئر کا سوال ہے اور مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''میں ساری عمر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔'' ربیکا نے افسردگی سے کہا۔ ''میری بزدلی پر مجھے معاف کر دینا۔''

ربیکا نے جرأت کر کے اپنی بزدلی کا اعتراف کرلیا تھا لیکن سام کے دوسرے جاننے والوں کو جواب اس سے منہ چھپائے پھرتے تھے اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس سے اعلانیہ قطع تعلق کر لیتے۔ استعفے کے بعد سام زیادہ تر گھر میں وقت گزارنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کسی فلمی تقریب میں شرکت کر لیا کرتا تھا جہاں کیمروں کے سامنے تو فلم والے اس کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے لیکن آف دی کیمرا ان کا رویہ ویسا ہی تھا۔ دوسری محبت میں ناکامی نے اسے تنہائی پسند بنا دیا تھا اور وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ قوم کا جنگی بخار اترنے لگا اور حقائق منظر عام پر آئے تو لوگوں میں ایک مخالف جذبہ نظر آنے لگا۔ اس کا اثر ہالی ووڈ کی انڈسٹری پر بھی پڑا تھا اور اب جنگ کے خلاف بھی فلمیں بننے لگیں۔ اگرچہ یہ بڑی محدود اور محتاط قسم کی فلمیں تھیں جن میں ڈھکے چھپے انداز میں جنگ کے منفی پہلو کو سامنے لایا گیا تھا۔ فارن ہائیٹ نائن الیون جیسی فلمیں کم تھیں اور ان کو بھی فیچر فلم کے بجائے ڈاکومینٹری کا درجہ

دے دیا گیا تھا۔ کسی ایک فلم میں بھی واضح نہیں تھا کہ اس ملک کے حکمران دوسرے ملکوں میں کیا کر رہے تھے۔ سام یہ سب دیکھ رہا تھا اور اس کے اندر ایک لاوا سا پک رہا تھا۔

بالآخر اس کے ذہن میں ایک فلم کا خیال پختہ ہو گیا۔ اس فلم میں تیسری دنیا کے ایک فرضی ملک کا ذکر ہے جہاں قیمتی معدنیات اور قدرتی وسائل کی بہتات ہوتی ہے اور جہاں کے لوگ پسماندہ لیکن پُرامن اور انسان دوست ہوتے ہیں۔ ایک استعماری ملک اس ملک کے وسائل پر قبضے کے لیے منصوبہ بناتا ہے اور اس ملک میں انتشار پھیلا کر خانہ جنگی کروا دیتا ہے۔ پھر اس خانہ جنگی کی آڑ میں اپنی فوج اس ملک میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن اس ملک کے حریت پسند اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بے پناہ قربانیوں کے بعد استعماری ملک کی فوج کو اپنے ملک سے نکال دیتے ہیں۔ سام نے استعماری ملک کا نام بھی فرضی رکھا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا اگر اس نے اصل نام استعمال کیے تو اس کی کہانی کبھی فلم کا روپ نہیں دھار سکے گی۔

سام کے ساتھ فلمی دنیا کی لاتعلقی برقرار تھی۔ اسے ابھی بھی کہیں سے ملازمت کی یا کسی فلم پر کام کرنے کی پیش کش نہیں ہوئی تھی۔ سام جانتا تھا وہ اس معاملے میں اکیلا شکار نہیں تھا بلکہ اس جیسے کئی باضمیر افراد تھے جو عتاب میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو جنگ کے لیے فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ بیکاری کا عذاب بھگت رہے تھے۔ سام یہ بھی جانتا تھا کہ نہ تو اسٹوڈیو اور نہ ہی کوئی فنانسر اس کی فلم پر سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوگا اسے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

یہ بڑے بجٹ کی فلم تھی اور اس پر کم سے کم بیس کروڑ ڈالرز کی لاگت آتی۔ سام کا کل اثاثہ ایک کروڑ ڈالرز کا بھی نہیں تھا۔ اسے لازمی فلم سازی کے لیے کہیں سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے بینکوں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان دنوں بینکوں پر بھی بحران آیا ہوا تھا اور اسٹاک مارکیٹ کریش ہونے کے بعد بینک تیزی سے دیوالیہ ہو رہے تھے۔ لاکھوں لوگ اپنے سرمائے سے محروم ہو چکے تھے اور دیوالیہ بینک بند ہونے سے رقم کی واپسی کی اُمید بھی نہیں رہی تھی۔ بحران کی وجہ سے بینکوں کے قرض دینے کی صلاحیت بھی کم ہو گئی تھی اور ان کی طرف سے شرائط سخت ہوتی جا رہی تھیں۔

سام نے پہلے فلم کا اعلان کرنا مناسب سمجھا اس طرح اسے قرض کے لیے بات کرنے میں آسانی رہتی۔ اس نے اپنے گھر پر فلمی میڈیا کی ایک پریس کانفرنس رکھ لی۔ اگرچہ اس نے زیادہ صحافیوں کو نہیں بلایا تھا صرف گنے چنے لوگ تھے لیکن ان میں سے بھی کم ہی آئے تھے۔ مشکل سے ایک درجن افراد تھے اور یہ سب وہ تھے جو سام سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن کھل کر اپنی ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ بات ان کے اخبارات اور چینل والوں کو گوارا نہیں تھی۔ سام نے فلم کے مختصر سے خیال کے ساتھ ان کو بتایا کہ وہ اس فلم کو خود بنانا چاہتا ہے اور اسے فنانسر کی تلاش ہے۔ ایک صحافی نے سوال کیا۔

''کیا فلم کا خیال پرانا نہیں ہے؟''

''کوئی خیال نیا نہیں ہوتا ہے۔'' سام نے جواب دیا۔ ''دیکھنا یہ چاہیے کہ اس خیال کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔''

''تمہارے خیال میں اس کی ضرورت ہے؟''

''بالکل ہے آج کی دنیا چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ گلوبل ویلج کا سب سے زیادہ شور ہم مچاتے ہیں اور اتنی زحمت نہیں کرتے ہیں کہ اپنے پڑوسی کے گھر جھانک کر دیکھ لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔'' سام کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا۔

''فلم کے لیے تم نے اپنے پرانے دوستوں سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

سام مسکرایا۔ ''اگر پرانے دوست کچھ کرنے کے لیے تیار ہوتے تو کیا میں اس وقت اپنے گھر میں پریس کانفرنس کر رہا ہوتا۔''

سام کی یہ پریس کانفرنس میڈیا میں نمایاں جگہ تو حاصل نہیں کر سکی تھی لیکن اس نے ہلچل ضرور مچا دی۔ بہت سارے لوگ جو سام کو ریٹائر سمجھ چکے تھے ان کو پتا چلا کہ سام میں ابھی دم خم ہے اور وہ ان کے مقابلے پر آ سکتا ہے خاص طور سے بگ برادر کا رویہ منفی تھا اس نے سام کے ارادے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔''

سام نے اشتہاری تکنیک استعمال کی اور بگ برادر کے بیان کے جواب میں ایک صحافی کو بیان دیا۔ ''حیرت ہے ستر سال کا بگ برادر چالیس برس کے سام کو ماضی کا حصہ قرار دے رہا ہے۔ حالانکہ وہ خود ماضی میں جی رہا ہے اور اسے بدلتی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے چند سالوں میں بگ برادر کو حیرت کے کئی جھٹکے لگیں گے۔''

اس بیان نے ایک جنگ سی چھیڑ دی اور بگ برادر کے بہت سارے حامی بھی میدان میں آگئے اور ان کی طرف سے سام پر تنقید کی شدید بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔ سام ان سب کو جواب دینے کی بجائے بگ برادر کو نشانہ بناتا تھا کیونکہ اس کے خلاف اس ساری مہم کے پس پشت وہی تھا۔ بگ برادر نے سام کی فلم اور اس کے خیال کو بھی احمقانہ قرار دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کل ایسی فلموں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سام اسے برابر کا جواب دے رہا تھا اور اس جنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اب لوگوں کی توجہ حاصل کر رہا تھا۔ امریکا میں کامیابی کا نسخہ یہی ہے جو لوگوں کی توجہ حاصل کرتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے۔

سام نے رقم کے لیے بینکوں سے بات چیت شروع کی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے آسانی سے رقم نہیں ملے گی کیونکہ اس کے پاس کوئی گارنٹی نہیں تھی اور رقم ملی بھی تو سخت شرائط کے ساتھ ملے گی۔ لیکن وہ اس وقت کسی بھی قیمت پر قرض لینے کے لیے تیار تھا۔ اس فلم کی تکمیل اس کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔ بالآخر تین بینکوں کے ایک کنسورشیم نے اس کی فلم کے لیے رقم فراہم کرنے کی ہامی بھر لی لیکن وہ چاہتے تھے کہ نفع میں بھی شامل ہوں۔ سام نے اس سلسلے میں سخت مزاحمت کی کیونکہ وہ کنسورشیم سے کمرشل ریٹ پر قرض لے رہا تھا اور انہوں نے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ سخت شرائط کے ساتھ وہ نفع میں بھی حصے دار بننا چاہ رہے تھے۔ آخر معاملہ نفع میں پانچ فی صد شراکت پر طے ہو گیا۔

رقم ملتے ہی سام نے فلم کی تیاری شروع کر دی اور یہاں سے اس کے لیے مشکلات کا آغاز ہوا۔ اس نے فلم کے کرداروں کے لیے جن اداکاروں کا سوچ رکھا تھا انہوں نے اس کی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ فلم کے تین مرکزی کردار ہیرو، ہیروئن اور ولن تینوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب اسے ان کرداروں کے لیے دوسرے اداکار تلاش کرنے تھے اس نے مزید کسی پرانے کو آزمانے کے بجائے نئے اداکاروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اشتہار دے کر نئے اداکار طلب کر لیے اور پھر ان میں سے تین افراد کو چن لیا۔ ان میں نئے ہونے کے باوجود اداکاری کی صلاحیت تھی۔

کاسٹ مکمل کرنے کے بعد جب اس نے تکنیکی عملے کی تلاش شروع کی تو یہاں بھی اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی مکمل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ کسی اعلیٰ درجے کے اسٹوڈیو میں اس کی فلم کے لیے کوئی فلور دستیاب نہیں ہے۔ دوسرے تیسرے درجے کے اسٹوڈیوز میں جگہ تھی لیکن سام ان کے معیار سے مطمئن نہیں تھا اور نہ اس نے اس قسم کے اسٹوڈیوز میں کام کیا تھا۔ اس لیے اس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا اس نے کینیڈا میں ایک فلم اسٹوڈیو والوں سے بات کی اور اپنی فلم کی تمام انڈور شوٹنگ وہیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی ساری کاسٹ سمیت وہاں پہنچ گیا تھا۔

یہ ایک طویل فلم تھی اور اس میں بے شمار مناظر تھے اس لیے شوٹنگ کے اسپیل بھی بڑے تھے۔ نئے اداکار لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ اداکار ہمہ وقت اسے دستیاب تھے۔ ایک سال میں انڈور شوٹ ختم ہوئی اور سام نے واپس آ کر فلم کے بقیہ حصوں کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن اس دوران میں ایک مسئلہ ہوا کینیڈا جا کر شوٹنگ کرنے سے اخراجات اس کی توقع سے بڑھ گئے تھے اور اب اسے فلم مکمل کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بینک کنسورشیم سے بات کی لیکن انہوں نے اسے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے دو بینکوں کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ دیوالیہ پن کی طرف جا رہے تھے۔ اگر وہ دیوالیہ ہو جاتے تو سام کے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا کیونکہ اسے رقم ایک مخصوص انداز میں ملتی تھی۔ وہ بیس کروڑ ڈالرز میں سے پندرہ کروڑ ڈالرز لے چکا تھا اور ابھی مزید پانچ کروڑ ڈالرز لینے تھے جب کہ سام کو مزید رقم کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے شوٹنگ تیز کر دی تا کہ باقی رقم جلد حاصل کر سکے۔

لیکن قسمت کی خرابی زیادہ تیز نکلی تھی۔ ابھی دو کروڑ ڈالرز کی آخری قسط ملنا باقی تھی کہ کنسورشیم کے دو بینک دیوالیہ ہو گئے۔ ان کے معاملات دوسرے بینکوں کے سپرد کر دیے گئے اور قسط کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ سام پریشان ہو گیا۔ فلم کی لاگت اندازے سے بڑھ گئی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا وہ ان پروڈیوسرز میں سے تھا جن کی فلموں پر ہمیشہ معمول سے زیادہ لاگت آتی تھی کیونکہ وہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتا تھا لیکن اس کی فلمیں اندازے سے زیادہ کما کر بھی دیتی تھیں اس لیے جب تک وہ بگ برادر کے لیے کام کرتا رہا اسے فنانس کا مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

ابھی فلم کا تقریباً بیس فی صد کام باقی تھا اور رقم ختم ہو چکی تھی۔ سام نے دوسرے بینکوں سے اس سلسلے میں بات کی

لیکن کئی جگہ بینکنگ قوانین کی وجہ سے انکار کر دیا گیا اور بعض کی شرائط اتنی سخت تھیں کہ سام نے ان سے قرض لینے سے انکار کر دیا۔ مالی مشکلات کے باوجود اس نے فلم شوٹنگ کا کام جاری رکھا کیونکہ اس شعبے میں وہ ادائیگی موخر بھی کر سکتا تھا۔ اس نے رقم کے لیے اپنا ولا اور اپنی گاڑیاں بیچ دیں۔ اب اس کے پاس صرف ایک معمولی سی وین تھی۔ بدقسمتی سے جایداد کی قیمت گر گئی تھی اور اسے ولا کی قیمت کا صرف ستر فی صد ملا تھا۔ حالانکہ شوبزنس سے وابستہ مشہور افراد کی رہائش گاہیں اصل سے زیادہ قیمت پر بکتی ہیں۔ لیکن کساد بازاری نے اس شعبے کو بھی گرفت میں لے لیا تھا۔ حاصل ہونے والی رقم سے سام نے شوٹنگ جاری رکھی۔ فلم دو سال سے بن رہی تھی۔ جایداد اور گاڑیوں کی فروخت سے حاصل شدہ رقم بھی ختم ہو گئی۔ ابھی اسے ایک کروڑ ڈالرز کی مزید ضرورت تھی اور اسے کہیں سے رقم ملنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

بگ برادر سے اس کی جنگ جاری تھی اور بگ برادر نے ایک بڑے بجٹ کی فلم شروع کر دی۔ اسے اسٹوڈیو کا ایک نامور ڈائریکٹر پروڈیوسر بنا رہا تھا۔ یہ اسٹارز کی فلم تھی اور بگ برادر کا ارادہ اسے سام کی فلم کے مقابل ریلیز کرنے کا تھا۔ گویا وہ پوری طرح اس کی مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس کی اور سام کی بیانات کی جنگ جاری تھی اور اب بگ برادر نے ایک بیان دیا کہ اس صدی میں سام کی فلم کی ریلیز کا کوئی امکان نہیں۔ سام نے جوابی بیان میں کہا۔

”بگ برادر فکر نہ کرے یہ فلم اس کی زندگی میں ہی ریلیز ہوگی۔“

لیکن حقیقت یہ تھی کہ سام بہت پریشان تھا اسے ایک کروڑ ڈالرز نہیں ملتے تو اس فلم کی ریلیز ناممکن تھی اور وہ تقریباً مکمل ہو کر بھی تھیٹرز کی زینت بننے سے رہ جاتی۔ اس نے ہر ممکن ذریعے سے کوشش کر لی تھی لیکن اسے کہیں سے رقم نہیں ملی تھی۔ صرف ایک شخص اسے رقم دینے کے لیے تیار ہوا تھا۔ یہ ہالی ووڈ کا ایک بڑا فنانسر پیری ایڈورڈ تھا لیکن اس کی شرط ناقابل قبول تھی۔ وہ فلم گروی رکھوانا چاہتا تھا اور اگر سام مقررہ تاریخ تک اس کی رقم واپس نہ کرتا تو فلم پیری کی ملکیت بن جاتی۔ درحقیقت پیری کو بگ برادر نے آگے کیا تھا کیونکہ پیری اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ سام اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جب کہ رقم کی شدید ضرورت تھی۔ فلم کا کام مکمل کرنا تھا اور بہت سارے لوگوں کو

ڈارفر کا بحران
(Darfur Crisis)

سوڈان کا مغربی شورش زدہ علاقہ، فروری 2003ء میں اس علاقے میں وہ سیاہ فام افریقی باغیوں کے مابین ڈارفر میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور اس قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے باہمی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دونوں گروپ مسلح تصادم پر اتر آئے۔ طالع آزما عناصر نے سوڈانی حکومت کے مخالف عناصر نے اسے عرب قبائل اور سیاہ فام افریقی قبائل کے مابین محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا کر دی اور 1989ء میں جنجاویڈ (Janja Weed) تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔

دونوں قبیلوں کی باہمی لڑائی کے نتیجے میں ایک لاکھ افراد سے زائد ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب کہ دو لاکھ ہمسایہ ملک چڈ کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ فریقین کے مابین اپریل 2004ء میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی طے پایا تھا، لیکن فریقین نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مصالحت کنندگان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا کیونکہ وہ فرانس کے سائز کے برابر علاقے میں خورد ونوش کی اشیاء فراہم نہ کر سکیں۔ علاقے میں خوراک کی عدم دستیابی کے باعث وہاں کے لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ 30 جولائی 2004ء میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی، جس میں سوڈان کی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 دنوں کے اندر ڈارفر کے بحران کو حل کرے ورنہ اقتصادی پابندیوں کے لیے تیار ہو جائے۔ سوڈانی وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی دی گئی مدت کو ناکافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوڈان کو اس سلسلے میں 120 دن درکار ہیں، کیونکہ ڈارفر کا بحران بڑا پیچیدہ ہے، تاہم اگست 2004ء میں سوڈانی حکومت اور اقوامی متحدہ کے مابین ڈارفر کے بحران کے حل کے لیے لائحہ عمل کے معاہدے پر خرطوم میں دستخط کر دیے۔ جس کی رو سے سوڈانی حکومت تیس دن کے اندر مہاجر کیمپوں کے علاقوں کو محفوظ بنائے گی، تاکہ شہریوں کو خوراک اور پانی کے حصول کی سہولت حاصل ہو سکے اور وہ کسی حملے کے ڈر کے بغیر کھیتی باڑی کر سکیں، نیز سوڈانی پولیس ڈارفر میں چوکیاں اور محاصرے بھی قائم کرے گی اور عرب ملیشیا کے حملے روکنے کے لیے پولیس اور فوج مل کر کام کر سکیں گے۔

مرسلہ: مبطین صدیقی، شورکوٹ

ہجرت حبشہ

جب مکہ میں کفار کے ظلم و ستم حد برداشت سے گزر گئے تو آپؐ نے حضرت جعفر بن ابی طالب کی قیادت میں اسّی مرد اور عورتوں کو حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ تاریخ میں ہجرتِ حبشہ کے نام سے مشہور ہے۔ جو ماہ رجب 5 ھ میں پیش آیا۔ یہ دو بار ہوئی۔ پہلی بار کی ہجرت کرنے والوں کی تعداد پر اختلاف ہے۔ ایک رائے میں یہ گیارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل ہے۔ تاہم ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ اسی طرح ہجرتِ اولیٰ میں دس مرد شامل تھے۔ اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان، ان کی زوجہ محترمہ رقیہؓ حضرت ابوحذیفہؓ ان کی زوجہ سہلاؓ بنت سہیل، مصعب بن نمیر، عبدالرحمان بن عوف وغیرہ شامل تھے۔ یہ دو تجارتی جہازوں کے ذریعے حبش پہنچے۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ کفار بھی ان کے پیچھے گئے اور واپسی کا مطالبہ کیا۔ نجاشی نے وفد کے قائد حضرت جعفر بن ابی طالب کو طلب کیا اور معاملہ پوچھا۔ آپ نے کہا ”اے بادشاہ! ہم جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، کمزوروں کے ساتھ برا سلوک کرتے، ان کا حق مارتے، خدا نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے حسب و نسب سے واقف ہیں۔ اس نے

ادائیگیاں کرنا تھیں اس کے بغیر اسے فلم ریلیز کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔

سام نے ہالی ووڈ میں دفتر لینے کے بجائے ایک عام عمارت میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا اور وہیں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ رقم ختم ہونے سے سارے کام ٹھپ ہو چکے تھے اب نہ فلم کی مکسنگ ممکن تھی اور نہ ایڈیٹنگ اور ابھی اسپیشل ایفکٹس کا کام بھی باقی تھا۔ اس روز سام اپنے دفتر میں سر تھامے بیٹھا تھا اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا وہ اپنا سارا اثاثہ بھی اس فلم پر لگا چکا تھا اور اس کا بینک اکاؤنٹ صفر کے قریب پہنچ گیا تھا اگر یہ فلم مکمل ہو کر ریلیز نہ ہوتی تو اس کی مالی تباہی میں کوئی شبہ نہیں تھا اس کے بعد شاید اسے واپس ٹیکساس میں اپنے باپ کے فارم پر جانا پڑتا جو آج بھی زمیندار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو سام چونکا تھا۔ یہ ایک ہی کمرے کا دفتر تھا اس نے آواز دی۔ ”آجاؤ۔“

دروازہ کھلا اور ربیکا اندر آئی تو سام بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ ”تم؟“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں میں۔“

”شاید تم میری ناکامی کا تماشا دیکھنے آئی ہو؟“

ربیکا نرمی سے بولی۔ ”سام کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟“

سام کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”سوری .... میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا شاید حالات کی وجہ سے مجھے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہا ہے۔ آؤ بیٹھو۔“

ربیکا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں تمہاری فلم کے بارے میں سنتی رہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ یہ دنیا کی بہترین مووی ثابت ہو۔“

سام نے ہاتھ پھیلائے اور مایوسی سے بولا۔ ”اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”کیوں تمہاری فلم مکمل تو ہو گئی ہے۔“

”نہیں ابھی کچھ کام باقی ہے مسئلہ یہ ہے کہ میں مالی لحاظ سے بالکل خالی ہو چکا ہوں۔ اس لیے فلم ڈبے میں بند ہو جائے گی۔“

”ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ ربیکا نے بے ساختہ کہا۔ ”ایسا ہوا تو یقین کرو مجھے اور بہت سارے لوگوں کو شدید دکھ ہو گا۔“

”میں جانتا ہوں بہت سارے لوگ میرے خیر خواہ ہیں لیکن ان کی خیر خواہی فلم کی تکمیل میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی ہے۔“ سام نے مایوسی سے کہا۔ ”خیر چھوڑو تم اتنے دن بعد آئی ہو اور میں نے تمہیں اپنے مسئلے میں الجھا لیا۔ یہ بتاؤ کیا پیو گی۔ میرے پاس پورٹ کی ایک بوتل ہے۔“

”یہی نکال لو۔“

سام نے بوتل اور گلاس نکالے۔ ”اس سال تمہاری دونوں فلمیں بہت کامیاب گئی ہیں۔“

”ہاں میری قسمت کا ستارہ فی الحال عروج پر ہے۔“ ربیکا نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ”میں یہ بات کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم نے فلمی دنیا میں مجھے متعارف کرایا تھا۔“

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ سام نے بے پروائی سے کہا۔

ہمیں اللہ کی طرف بلایا اور سکھایا کہ اللہ ایک ہے۔ ایمان لاؤ، عبادت کرو اور بتوں کو پوجنا چھوڑ دو۔ اس نے ہمیں نمازوں کا حکم دیا اور تلقین کی کہ سچ بولیں، دیانت دار رہیں، اقارب و ہمسایوں سے اچھا سلوک کریں۔ خونریزی سے بچیں، ہم اس پیغمبر پر ایمان لائے۔ اسی وجہ سے یہ ہمارے دشمن ہوئے۔ یہ ہمیں واپس بتوں کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہم بری باتوں کو جائز سمجھیں۔ نجاشی نے کہا کہ وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے۔ اس پر آپ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔ اس پر پادری رو پڑے۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور کلام موسیٰؑ دونوں ایک ہی چشمۂ نور سے نکلے ہیں۔ وہ متاثر ہوا اور قریش کے دونوں سفیروں عمیرو بن العاص اور عمارہ بن ولید سے کہا کہ میں انہیں واپس نہیں کرسکتا، تم جاؤ اور مسلمانوں سے کہا تم میری زمین پر امن سے رہو۔ پھر تین بار کہا کہ "جو کوئی تمہیں گالی دے گا اسے تاوان لگے گا۔" اس واقعے کے بعد کفار نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا۔ اس پر مہاجرین نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت زبیرؓ جو اس وقت کمسن تھے انہوں نے بھی خود کو پیش کیا۔ اللہ نے نجاشی کو فتح دی۔

مرسلہ: ربیعہ قادری عطاری، جہلم

"اب تم کیا کرو گے؟"

"ممکن ہے میں واپس چلا جاؤں اور اپنے باپ کی زمینوں پر کام شروع کردوں۔ جب میں یہاں آرہا تھا تو میرے باپ نے کہا تھا کہ یہ دھوکے کی دنیا ہے جو مجھ سے بے وفائی کرے گی۔"

"تمہارے باپ نے درست کہا تھا۔ یہاں صرف چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے اور کوئی زوال کا شکار ہو جائے تو لوگ اس سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔"

"خدا کرے تمہارے لیے وہ وقت کبھی نہ آئے۔"

سام نے خلوص سے کہا اور اپنا ہاتھ ربیکا کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ "اگرچہ اب میں تمہارے لائق نہیں ہوں لیکن میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔"

ربیکا کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ "مجھے بھی کہنے دو سام میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔"

"میں اس کے لیے تمہارا شکرگزار ہوں۔" سام نے کہا اور پھر سرد آہ بھری۔ "کاش کہ میں اور تم عام مرد عورت ہوتے۔"

"اگر ایسا ہوتا تو....؟"

"تو میں کبھی تمہیں خود سے دور جانے نہیں دیتا۔"

سام نے جواب دیا۔ ربیکا سر جھکائے بیٹھی رہی تھی پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اب میں چلوں گی۔"

سام اسے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب اسے دروازے کے باہر کوئی فوٹوگرافر یا کیمرامین نظر نہیں آیا۔ ورنہ ربیکا جیسی مشہور شخصیت کا تو باقاعدہ تعاقب کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر نکلتے ہوئے احتیاط کرتی تھی۔ ربیکا کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے اندر آیا تو میز پر ایک لفافہ رکھا تھا اسے نہیں معلوم کہ یہ لفافہ کب اور کہاں سے آگیا تھا۔ سام نے لفافہ اٹھایا تو اس میں سے ربیکا کی مخصوص مہک آئی تھی۔ وہ کھولے بغیر جان گیا تھا کہ اس میں کیا تھا۔ لفافے میں ایک بینک ڈرافٹ اور ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر ربیکا کے طرز تحریر میں لکھا تھا۔

"یہ میری طرف سے ایک محبت کرنے والے بے غرض انسان کو ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اسے ٹھکرا کر میرے جذبات کی توہین مت کرنا۔"

سام نے دھندلائی آنکھوں سے ڈرافٹ دیکھا۔ اس پر ایک کروڑ ڈالرز کی رقم درج تھی۔ اس رقم کی مدد سے وہ اپنی فلم مکمل کرسکتا تھا۔ اس میں ربیکا کا تحفہ ٹھکرانے کی ہمت نہیں تھی۔ اگلے دن اس نے ڈرافٹ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا اور جیسے ہی رقم اس کے اکاؤنٹ میں آئی اس نے فلم کا بقیہ رہ جانے والا کام مکمل کرانا شروع کردیا۔ شوٹنگ تو دو ہفتے میں نمٹ گئی تھی اور رش پرنٹ تیار تھے۔ سام کے ساتھ کوئی ادھار کام کرنے کو تیار نہیں تھا اور وہ خدا کا شکر ادا کررہا تھا کہ لوگ رقم لے کر اس کا کام کررہے تھے ورنہ حالات اس کے خلاف تھے۔

جس دوران میں فلم کی مکسنگ اور اسپیشل ایفکٹس کا کام جاری تھا سام نے فلم کی نمائش کے لیے ڈسٹری بیوٹرز

سے بات شروع کر دی۔ لیکن بد قسمتی سے یہاں بھی وہی سارے لوگ چھائے ہوئے تھے جو سام کو کسی صورت کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بڑے ڈسٹری بیوٹر اسٹوڈیوز کے تھے اور زیادہ تھیٹرز ان کے پاس تھے۔ کچھ آزاد اور چھوٹے ڈسٹری بیوٹر تھے لیکن ان کے پاس زیادہ تھیٹرز نہیں تھے اور ان کو فلم دینے کا مطلب تھا کہ اس کی آدھی لاگت بھی نہیں پوری ہوگی۔ سام کم سے کم ایک ہزار تھیٹرز میں بیک وقت اس کی نمائش چاہتا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ میں بگ برادر کے واحد حریف اسٹوڈیو کے مالکان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اگر وہ اس کی فلم ریلیز کرنے کو تیار ہو جاتے تو سام کو فلم کے لیے مطلوبہ تعداد میں مووی تھیٹرز مل سکتے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حب الوطنی اور جنگی بخار میں وہ بگ برادر سے بھی بڑھ کر تھے اور نائن الیون کے بعد جنگی موضوعات پر سب سے زیادہ فلمیں اسی اسٹوڈیو نے بنائی تھیں۔

سام نے اسٹوڈیو مالکان سے بات کی لیکن ان کی طرف سے انکار ہوگیا۔ ہالی ووڈ والوں کی طرف سے مایوس ہو کر سام نے سب سے بڑی فلم ڈسٹری بیوشن کمپنی سے بات کی جس کے پاس کوئی پانچ سو مووی تھیٹرز تھے۔ سام کے خیال میں اگر وہ پانچ سو سے ہی آغاز کرتا تب بھی برا نہیں تھا مگر ہوا یہ کہ اس کمپنی نے فلم ریلیز کے لیے نہایت کڑی شرائط پیش کر دیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فلم لے کر سام پر احسان کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے بہت معمولی سی پیشگی رقم کی پیش کش کی اور باقی رقم فلم کی کامیابی کی صورت میں دی جاتی۔ پیشگی رقم صرف دو کروڑ ڈالرز تھی یعنی کل لاگت کا دسویں سے بھی کم۔

سام سمجھ رہا تھا کہ فلم مکمل ہونے کے بعد اس کی مشکلات کم ہو جائیں گی لیکن یہاں تو مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ گرما تیزی سے قریب آ گیا تھا اور بگ برادر کی بنائی ہوئی فلم بیک وقت ملک کے ڈھائی ہزار مووی تھیٹرز میں ریلیز ہونے والی تھی۔ جب کہ سام کی فلم کو کوئی گھاس ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ حالانکہ میڈیا نے اسے غیر معمولی فلم قرار دیا تھا جس میں فلم بینوں کی دل چسپی کی تمام چیزیں تھیں۔ اس کا میڈیا پریمیئر نہایت کامیاب رہا تھا۔ سام سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اوپر والوں کی مخالفت ہے اور وہ اس کی فلم کی نمائش میں ہر ممکن روڑے اٹکا رہے تھے کیونکہ سام نے ان کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ امریکی عوام اس فلم میں بیان کیے حقائق سے واقف ہوں۔ دوسری طرف عوام بے چینی سے اس فلم کے منتظر تھے کیونکہ سام کے ساتھ ہونے والے سلوک اور پھر فلم کی راہ میں روڑے اٹکانے سے ان کا تجسس بھڑک اٹھا تھا۔ پھر مخالفین کے پروپیگنڈے نے فلم کو مزید شہرت دی تھی۔ مگر فلم ریلیز ہوتی تو لوگ دیکھتے۔ سام کے مخالف اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سام پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فلم کی ریلیز کس طرح ممکن بنائے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ ڈسٹری بیوٹر کمپنیوں کے رویے کے خلاف عدالت میں چلا جاتا۔ دوسرا طریقہ اسے ایک اسٹوڈیو کے مووی تھیٹرز کمپنی کے منیجر نے سمجھایا۔ اس نے فلم ریلیز کرنے سے انکار کرتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”جیسے تم نے فلم خود بنالی ہے اب اسے ریلیز بھی خود کرلو۔“

مذاق اڑانے کے انداز میں دیے گئے اس مشورے نے سام کو سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی ڈسٹری بیوشن کمپنی بنالے اور اس کے بینر تلے فلم ریلیز کرے۔ جیسے جیسے وہ اس پر غور کرتا رہا اسے لگا یہی واحد حل ہے۔ اس نے اس بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ کسی بھی کاروباری فرم کی طرح فلم ڈسٹری بیوشن کمپنی قائم کرنا بھی بہت آسان ہے۔ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے فوراً اپنی کمپنی رجسٹرڈ کرالی اور اس کے ذریعے فلم ریلیز کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ امریکا میں بڑی کمپنیوں اور فلم اسٹوڈیوز کے مووی تھیٹرز کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ایسے تھیٹرز بھی ہیں جو چھوٹی کمپنیوں یا فرد واحد کی ملکیت ہیں اور یہ براہ راست فلمیں ریلیز کرنے کی بجائے ڈسٹری بیوٹرز سے لے کر ریلیز کرتے ہیں۔ سام نے اشتہارات کے ذریعے ان چھوٹی کمپنیوں اور انفرادی مووی تھیٹرز کو دعوت دی کہ وہ اس کی فلم ریلیز کریں۔

اس اشتہار کا ردعمل سام کی توقعات سے بڑھ کر آیا اور دو دن میں اسے فلم کی ریلیز کے لیے آٹھ سو سے زائد درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر انفرادی مووی تھیٹرز کی طرف سے درخواستیں تھیں۔ ان مووی تھیٹرز کو کوئی بڑی فلم عام طور سے ریلیز کے ایک مہینے بعد ملتی ہے جب اکثر لوگ اسے دیکھ چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کو زیادہ بزنس نہیں ملتا ہے۔ یہ پہلی بار تھا کہ ان کو ایک بڑی مووی ریلیز کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایک

ہفتے میں کوئی دو ہزار مووی تھیٹرز فلم کی ریلیز کے لیے درخواست جمع کرا چکے تھے۔ یہ تعداد سام کی توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔

پھر ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے اس کی فلم کا لندن میں پریمیئر کرنے کی پیش کش کی جس میں دنیا جہاں سے فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ آتے۔ سام کی خوش قسمتی تھی ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ فلم کا پریمیئر کہاں کرے کیونکہ امریکا میں اسے اس معیار کا تھیٹر ملنا مشکل تھا۔ اب یہ ذمے داری ملٹی نیشنل کمپنی نے لے لی تھی اور وہ اس پریمیئر کے عوض سام کی ڈسٹری بیوشن کمپنی کو دس ملین ڈالرز ادا کر رہی تھی۔ پریمیئر میں فلم کی مکمل کاسٹ شامل تھی اور تقریب نہایت کامیاب رہی تھی۔ کئی ورلڈ ٹی وی چینلز نے اسے نشر کیا تھا۔ فلموں اور شو بزنس سے تعلق رکھنے والا کوئی چینل ایسا نہیں تھا جس نے اس کی کوریج نہ کی ہو۔

اس وقت تک ہالی ووڈ کے بڑے جان چکے تھے کہ وہ جنگ ہار گئے ہیں اپنے حکمرانوں کی طرح اور سام بازی جیت گیا تھا۔ وہ اسے فلم بنانے اور پھر ریلیز کرنے سے نہیں روک سکے تھے لیکن وہ ہار کر بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے بالکل اپنے حکمرانوں کی طرح اور انہوں نے سام کی جیت کو پروپیگنڈے سے ہار دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا زرخرید میڈیا فلم پر منفی تبصرے کرنے لگا اور خیال ظاہر کیا جانے لگا کہ یہ باکس آفس پر وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے گی جو اس سے پہلے سام کی فلمیں حاصل کرتی رہی تھیں۔

لیکن فلم بینوں کے ردِعمل نے ہالی ووڈ کے بڑوں کے اندازے غلط ثابت کر دیئے تھے۔ فلم نے پہلے ہی ہفتے میں بزنس کا ریکارڈ قائم کر دیا اور یہ سارا بزنس اسے چھوٹے مووی تھیٹرز سے ملا تھا۔ اس ایک ہفتے میں سام کی فلم نے بائیس کروڑ ڈالرز کا بزنس کیا تھا، یہ اس کی لاگت کے مساوی تھا۔ فلم کی مقبولیت دیکھ کر درمیانی درجے کی ڈسٹری بیوشن کمپنیاں بھی میدان میں آگئیں اور انہوں نے سام کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے فلم کی ریلیز کا حق حاصل کیا۔ یہی کمپنیاں پہلے سام کو شرائط پیش کر رہی تھیں۔

پہلے مہینے میں فلم نے امریکا میں ریکارڈ بزنس کیا تھا اور یہ سام کو مجموعی لاگت سے تین گنا زیادہ کما کر دے چکی تھی۔ جب کہ آنے والے ایک مہینے میں یہ ہر اس تھیٹرز میں بک ہو چکی تھی جہاں اس کی نمائش جاری تھی۔ اس کامیابی کا خود سام نے بھی نہیں سوچا تھا۔ بگ برادر نے مقابلے کے لیے جو فلم بنائی تھی اگر چہ اس نے اپنے اخراجات نکال لیے تھے لیکن اسے کسی طرح بھی کامیاب فلم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پھر فلم کو عالمی نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ ایک ایک ملک سے سام کو بے تحاشہ رقوم موصول ہونے لگیں اور چھ مہینے میں اس کی فلم ایک ارب ڈالرز کا خالص نفع کما چکی تھی۔ سام ایک ہی فلم سے ارب پتی بن گیا تھا۔ ایسی بے مثال کامیابی اس سے پہلے کسی کو نہیں ملی تھی۔ سب کا خیال تھا کہ سام اب ہالی ووڈ کا کنگ بن جائے گا اور ہر کام اس کے اشارہ ابرو پر ہوا کرے گا۔ پرانی کمپنیاں اس کے اثر میں آجائیں گی۔ لیکن سام کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ایک سال بعد اس کی فلم بزنس کے لحاظ سے ٹائی ٹینک کا ریکارڈ توڑ کر اس سے بہت آگے جا چکی تھی۔ سام نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ اس بار اس نے ایک بڑا مووی تھیٹر منتخب کیا تھا جس میں دو ہزار افراد کی گنجائش تھی لیکن وہاں آنے والوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو گئی تھی اور

پنڈت برجموھن وتاتریہ
کیفی۔1955-1866ء

اردو کے نامور ادیب، شاعر۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے فارغ التحصیل ہو کر ریاست کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر زندگی کا زیادہ حصہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) اور لاہور میں گزارا۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اردو زبان کی تحقیق، محاورات کی چھان بین اور اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ علم اللسان پر بھی کافی کام کیا۔ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تصانیف (نثر)، عورت اور اس کی تعلیم، چراغ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری، مراری دادا، تھتارنا، کیفیہ، منشورات کیفی۔ (نظم) مراۃ خیال، آئینہ ہند، صدائے کیفی، بھارت درپن، پریم ترنگنی، جنگی نظمیں، توزک قیصری، خمخانہ کیفی، واردات۔

مرسلہ: نیاز حسن کراچی

لوگ دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے۔کئی چینل اس کی پریس کانفرنس کولائیو دکھارہے تھے۔سام ڈائس پر آیا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔آج وہ اس کی عزت کر رہے تھے جس کے بارے میں کل تک خبر لگانے کو بھی تیار نہیں تھے۔سام نے کہنا شروع کیا۔

''میرے دوستوں آپ جانتے ہیں میں کل معتوب تھا بلکہ آج بھی معتوب ہوں لیکن کل میں ناکام تھا اور آج میں کامیاب ہوں۔میری کامیابی یہ نہیں ہے کہ میں نے ایک سپر بلاک بسٹر مووی بنائی ہے جس نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں بلکہ میری کامیابی یہ ہے کہ میں نے امریکا کے کردار کے بارے میں اپنے احساسات اور جذبات امریکی عوام تک پہنچانے کی کوشش کی اور مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔اس فلم کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے۔

جب نائن الیون کے واقعے کے بعد میں نے اپنے کامک کردار بینگ کو انسانیت کے بجائے امریکی مفادات کا محافظ بنانے سے انکار کیا تو مجھ پر فلم اسٹوڈیو کے دروازے بند کر دیئے گئے۔میں نے فلم بنانا چاہی تو مجھے اس سے روک دیا گیا۔میں سیاست داں نہیں ہوں اور نہ ہی میں نظام کی اندھی تقلید پر یقین رکھتا ہوں۔مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔یہاں کے لوگوں سے محبت ہے۔لیکن مجھے اتنی ہی محبت انسانوں سے بھی ہے۔جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے ملک کا سپاہی کسی اور ملک میں جاکر محض حکمرانوں کے کہنے پر اندھا دھند عمل کرتا ہے اور وہ ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ انسانوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے تو میں ایسے نظام کا حامی نہیں ہوسکتا۔کسی اور ملک کی فوج آکر امریکا پر قبضہ کر لے اور یہاں قتل عام کرے تو ہم میں سے کوئی برداشت نہیں کرے گا۔ہمیں اسی رویے کی توقع دوسروں سے بھی کرنی چاہیے۔حملہ آور فوج کو کوئی خوش آمدید نہیں کہتا ہے۔ حریت انسان کے لہو میں شامل ہے۔میرا ایمان اس پر ہے۔

مجھے معلوم ہے بہت سارے لوگوں کو میری باتیں اچھی نہیں لگیں گی کیونکہ جنگوں سے اور دوسرے ملکوں کے استحصال سے ان کے کاروبار چل رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہے جلد میرے ملک میں ایسا وقت آئے گا جب ہم دنیا کے دوسرے خطوں میں مداخلت کے خلاف مضبوط آواز اٹھائیں گے۔ہمیں بالآخر جنگ بند کرنا ہوگی۔اسی میں ہماری اور دنیا کی بقا ہے۔

میں کل بھی ایک عام فلم پروڈیوسر تھا اور آنے والے کل بھی میں ایک عام فلم پروڈیوسر رہوں گا۔کیونکہ یہ دولت کی طاقت ہے جس نے میرا راستہ روکا۔ہالی ووڈ کے بڑے دولت پاکر مغرور ہوگئے۔میرے مقابلے میں خدا بننے کی کوشش کی لیکن وہ بھول گئے خدا کوئی اور ہے۔اس لیے میں کامیاب رہا۔میری یہ کامیابی ان پسے ہوئے لوگوں کی کامیابی ہے جو تیسری دنیا میں رہتے ہیں جو امریکا اور مغرب کے استحصال کا شکار ہیں۔اس لیے میں اپنی فلم سے کمائی دولت ان لوگوں کے لیے وقف کرتا ہوں جن کو میرے وطن سے کبھی نقصان ہوا ہے۔میں تلافی کرنے کی اپنی سی محدود کوشش کروں گا۔ مجھے اُمید ہے میرے کچھ نہ کچھ ہم وطن میرا ساتھ ضرور دیں گے۔میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا آپ میری تقریر پر تبصرہ کرنے کے لیے آزاد ہیں شکریہ۔''

جب سام ڈائس سے اترا تو تالیاں بجانے والوں کی تعداد بہت کم تھی اس نے جو کہا وہ غیر متوقع تھا اور ناپسندیدہ بھی لیکن وہ اسی چیز کی توقع لے کر آیا تھا اس لیے خوش اور مطمئن تھا۔اس نے پہلے بھی اپنے بل بوتے پر کامیابی حاصل کی تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔وہ نیچے اپنی نشست تک آیا تو اس کے کچھ جاننے والوں نے اسے گھیر لیا وہ اس کی تقریر کی مبارکباد دے رہے تھے۔ سام ان کو بتانے لگا کہ وہ فلم سے حاصل شدہ دولت سے ایک آرگنائزیشن بنائے گا جو ان ملکوں میں روزگار، صحت اور تعلیم کے لیے کام کرے گی۔جو امریکی پالیسیوں کا براہ راست نشانہ بنے تھے۔

''سام۔'' عقب سے ربیکا کی آواز آئی۔اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

سام مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔''میں تو پہلے ہی تمہارا مقروض ہوں۔''

ربیکا اس کے پاس آگئی۔''تم فکر مت کرو وہ قرض میں تمہارے پاس رہتے ہوئے وصول کرلوں گی۔''

سام نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔''میری کامیابی کو اگر کوئی انعام دیا جاسکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔''

وہ دونوں ایک ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئے تھے۔

پرائی سانس

کاشف زبیر

مغربی معاشرے میں اب بوڑھوں کے لیے صرف اولڈ ہوم رہ گئے ہیں۔ ان حالات میں زیادہ تر بوڑھے نفسیاتی مریض بن چکے ہیں۔ وہ بھی خود کو اہمیت کا حامل ثابت کرنے کی خاطر ایک مہم پر نکلی تھی۔ اس نے زبردستی کی دعوتیں کھانے کے لیے کیسا سوانگ رچا تھا۔

مغرب کے بے لگام معاشرے کی ایک ہلکی سی جھلک

نینسی پارشل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہی تھی۔ شادی کے بعد اس نے اپنا خاندانی نام تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس نے جم کولین سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنا خاندانی نام تبدیل نہیں کرے گی۔ یہ روایت نینسی کے خاندان میں صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ نینسی ایک آن لائن بزنس کرنے والی فرم میں جاب کرتی تھی اور اس کا دفتر اس کے اپارٹمنٹ کے ایک گوشے میں واقع تھا۔ یعنی وہ گھر پر ہی کام کرتی تھی۔ اسے باہر نہیں

جانا پڑتا تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ایک منٹ بعد ہی دفتر میں ہوتی تھی۔

جم کولمین ایک دوا ساز کمپنی میں میڈیکل کنسلٹنٹ تھا اور وہ ڈاکٹروں اور اسپتال کے عملے کو کمپنی کی نئی ادویات کے استعمال کی تربیت دیتا تھا اسی وجہ سے وہ مہینے میں کم سے کم بیس دن گھر سے باہر ہوتا تھا۔ شادی کے بعد شاید ہی وہ کبھی مسلسل ایک ہفتہ گھر پر رہا ہو۔ جم کی خوش قسمتی کہ نینسی شروع سے تنہائی پسند رہی تھی۔ وہ ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی اور ماں باپ کا کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ اسکول اور کالج کے دور میں اس کی دوست نہ ہونے کے برابر تھیں اور جم اس کا اوّلین بوائے فرینڈ، محبوب اور بالآخر شوہر بن گیا تھا۔ اگر وہ کام کے سلسلے میں زیادہ تر باہر رہتا تھا تو نینسی کے خیال میں یہ بھی اچھا تھا ورنہ میاں بیوی ہر دن ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی بور ہو جاتے۔

''اچھا ہے کچھ دن دور رہنے سے ہماری محبت اور شادی کی گرم جوشی تادیر برقرار رہے گی۔''

''ٹھیک ہے، نہیں نیا نویلا شوہر بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔'' جم نے شوخی سے کہا۔ ''لیکن جب ہمارے بچے ہوں گے تب تو تمہیں ان کی دیکھ بھال کرنی ہی پڑے گی۔''

نینسی جانتی تھی کہ جم کو بچے اچھے لگتے ہیں اور اسے شروع سے بچوں کی خواہش تھی۔ اس نے نینسی سے کہہ دیا تھا کہ وہ بچوں سے بچنے کے لیے کوئی احتیاطی تدبیر نہیں کریں گے۔ نینسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ کوئی احتیاط نہیں کرتے تھے لیکن اب یہ قدرت کی طرف سے ہی تھا کہ شادی کے پندرہ مہینے بعد بھی نینسی کے ماں بننے کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال اس وجہ سے ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ جم جب ایک ہفتہ یا دس دن کے ٹور کے بعد واپس آتا تو نینسی اتنی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتی تھی کہ وہ خوش ہو جاتا۔ ان دنوں وہ اپنی دفتری مصروفیات کم کر دیتی تھی اور زیادہ سے زیادہ وقت جم کو دیتی۔ جب جم اپنے کام سے نکلتا تو نینسی زیادہ کام کر کے ازالہ کر لیتی تھی۔ اس طرح اس کی فرم والے بھی خوش رہتے تھے۔

نینسی کا تعلق ٹیکساس سے تھا لیکن اس کے مزاج میں جارحیت کے بجائے دھیماپن تھا۔ نینسی کے باپ کا کہنا تھا کہ یہ دھیماپن ننھیال سے آیا تھا۔ اس کے ننھیال کا تعلق فرانس سے تھا جبکہ ددھیال خالص سیکسن نسل سے تھا۔ نینسی کا باپ ایک بڑے فارم ہاؤس اور بہت سے مویشیوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی لیکن نینسی کا دل ٹیکساس میں نہیں لگا تھا۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے شمال کا رخ کیا تھا۔ وہ اسپرنگ فیلڈ چلی آئی۔ اسے یہ کھلا کھلا اور روشن شہر اچھا لگا تھا۔ اس نے یہیں ایک آن لائن کاروبار کرنے والی فرم میں جاب کر لی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے شعبے سے متعلق کچھ کورس بھی کیے۔ دو سال میں وہ افسران میں شامل ہو گئی تھی اور ان ہی دنوں اس کی ملاقات جم سے ہوئی تھی۔ جم شروع میں اسے کوئی کالج گرل سمجھا تھا اور جب اسے پتا چلا کہ نینسی ایک بڑی کمپنی میں ذمے دار عہدے پر کام کر رہی ہے تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔

''چہرے سے بالکل نہیں لگتا کہ تم اتنی خشک قسم کی جاب بھی کر سکتی ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے کوئی امپچر آرٹسٹ ہو یا اوپیرا میں کام کرنے والی کوئی گروپ ڈانسر۔''

''آرٹ کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی اور میں نے آج تک اوپیرا بھی نہیں دیکھا۔ ڈانس صرف ایک بار کیا تھا جب ہائی اسکول کی الوداعی پارٹی میں ایک لڑکے نے مجھ سے ڈانس پارٹنر بننے کی درخواست کی تھی اور اس پارٹی کے بعد وہ ایسا غائب ہوا کہ مجھے دوبارہ اس کی صورت بھی نظر نہیں آئی۔''

''وہ نہایت بدذوق ہوگا۔'' جم نے یقین سے کہا۔

''نہیں، اصل میں، میں پارٹی میں کھیتوں میں استعمال ہونے والے لانگ شوز پہن گئی تھی اور ڈانس کے دوران میں نے اتنی بار اس کا پاؤں کچلا کہ پارٹی کے بعد اس کے دوست اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ بے چارے سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔''

جم کی ہنسی نکل گئی۔ ''لیکن میرے ساتھ تو تم بالکل ٹھیک ڈانس کرتی ہو۔''

''تمہاری بات اور ہے۔'' نینسی نے سنجیدگی اور یقین سے کہا۔

جم کا تعلق ساؤتھ کیرولینا کے ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا۔ قصبے میں اس کی خاندانی ہارڈ ویئر کی دکان تھی جو پانچ نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔ چھٹی نسل جس کا اکلوتا نمائندہ جم تھا، اس نے یہ دکان چلانے سے انکار کر دیا۔ اسے میڈیکل کے شعبے سے دلچسپی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر وہ ڈاکٹر نہیں بن سکا تھا لیکن اس نے میڈیکل کنسلٹنٹ بن کر

اپنی خواہش کسی حد تک پوری کر لی تھی۔ اتفاق سے اسے بھی اسپرنگ فیلڈ پسند آیا تھا۔ اس شہر میں بیک وقت شمال کی خوب صورتی بھی تھی اور یہاں موسم بھی اتنا سخت نہیں ہوتا تھا۔ یہیں ایک تقریب میں اس کی ملاقات نینسی سے ہوئی تھی۔

جم کے تعلقات اپنے ماں باپ سے اچھے نہیں تھے انہوں نے خاندانی بزنس ترک کرنے کا خاصا برا منایا تھا اور وہ اس کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے نینسی نے اپنی ساس اور سسر کو براہِ راست نہیں دیکھا تھا بس کچھ تصویروں میں دیکھا تھا۔ اس نے ایک دو بار جم سے کہا بھی کہ وہ اس کے گھر چلتے ہیں لیکن اس بات پر اس کا موڈ آف ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ غلطی اس سے نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ کیوں جائے؟ جب تک اس کے ماں باپ اسے خود نہیں بلائیں گے اور اس سے ناراضی ختم نہیں کریں گے وہ نہیں جائے گا مگر اس کے ماں باپ کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ وہ اس سے تعلقات معمول پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ انہوں نے جم کی دعوت کے باوجود اس کی شادی پر آنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے جم بھی ان کا ذکر پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی بات تھی اور اس کا ان کی ازدواجی زندگی پر اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ اپنی زندگی سے بہت خوش تھے۔

نومبر کے آخر میں جم کو ایک طویل دورے پر جانا تھا۔ اسے ویسٹ کوسٹ کی کئی ریاستوں کا دورہ کرنا تھا اور اس بار اسے بیس دن سے زیادہ ہی لگ جاتے۔ بیس دن خاصے زیادہ ہوتے ہیں۔ آغاز میں نینسی اکیلے گھر میں رہ لیتی تھی لیکن اب چند دن بعد اسے بے چینی ہونے لگتی تھی اور اس کی خواہش ہوتی کہ جم جلد از جلد واپس آجائے لیکن نینسی نے فکر ظاہر نہیں کی، وہ پہلے ہی جم کو چھوٹ دے چکی تھی اس لیے اب اگر وہ اعتراض کرتی تو یہ اپنی بات سے پلٹنے والی بات ہو جاتی۔ اس نے جم سے کہا۔ ”ٹھیک ہے ڈیئر تم فکر مت کرو، میں پریشان نہیں ہوں گی۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن مجھے تو تمہاری فکر رہے گی۔“ جم نے کہا۔ ”میں نے اپنے باس کو وارننگ دے دی ہے اگر آئندہ اس نے میرے لیے اتنا طویل ٹرپ رکھا تو میرا استعفیٰ اس کی میز پر ہوگا۔“

اس بات پر نینسی جذباتی ہوگئی اور اس نے اعتراف کر لیا۔ ”کبھی کبھی جب تمہیں زیادہ دن ہو جاتے ہیں تو میں تمہاری کمی بہت شدت سے محسوس کرنے لگتی ہوں لیکن یقین کرو اس معاملے میں، میں نے تمہیں کبھی قصوروار نہیں سمجھا۔ تم جاب سے مجبور ہو۔“

”بس یہی سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں ورنہ میرا دل چاہتا ہے زیادہ سے زیادہ تمہارے پاس رہوں۔“ جم نے اس کے بال سہلائے۔ جب جم روانہ ہو رہا تھا تو سرما کی پہلی برف باری کا آغاز ہو گیا تھا۔ جم نینسی کو اکیلے چھوڑ کر جاتے ہوئے پریشان نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ جس اپارٹمنٹ میں رہتے تھے وہ بہت لگژری اور شاندار قسم کا تھا۔ یہاں سیکیورٹی کا بہت اچھا نظام تھا۔ آس پاس اچھی فیملیز آباد تھیں اور ان میں سے کئی سے ان کے اچھے تعلقات تھے اس لیے اگر نینسی کا دل چاہتا تو وہ کسی کے گھر بھی جا سکتی تھی۔ اتفاق سے ان کی جان پہچان والی تمام فیملیز صرف میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل تھیں۔ یہاں کوئی ساس یا سسر نہیں تھا۔

مہینے میں ایک دو بار نینسی اپارٹمنٹ کے لیڈیز کلب کا چکر لگا لیتی تھی جہاں اس کی پڑوسنوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ گفتگو کے دوران موضوع بحث سسرال آتا تو تقریباً تمام خواتین کا ردعمل ایک جیسا ہوتا تھا۔ وہ سسرالی رشتوں کا ذکر یوں کرتی تھیں جیسے دنیا میں ان سے زیادہ خوفناک چیز اور کوئی ہے ہی نہیں۔ نینسی کو کیونکہ سسرالی رشتے داروں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنی رائے محفوظ رکھتی تھی۔ البتہ وہ کبھی کبھی ان خواتین کی گفتگو پر حیران بھی ہوتی کہ کیا واقعی ایسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ بیان کرتی ہیں۔ مثلاً دو فلور اوپر رہنے والی مارشا اپنی ساس کا ذکر یوں کرتی جیسے وہ کوئی آدم خور چڑیل ہو جو صرف اس کی زندگی حرام کرنے کے لیے زندہ تھی۔ اسی طرح نینسی کے اپارٹمنٹ کے اوپر رہنے والی میلسی بھی اپنی ساس سے سہمی رہتی تھی جو ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کے گھر آدھمکتی تھی اور اسے اچھی طرح تنگ کر کے واپس جاتی تھی۔ ایک دن مارشا نے نینسی سے کہا۔

”تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری ساس نہیں ہے۔“

”نہیں، میری ساس ہے۔“ نینسی نے تردید کی۔

وہ سب اچھل پڑیں۔ ”تب تم نے کبھی ذکر کیوں نہیں کیا؟“

”کیونکہ میں ان سے کبھی ملی ہی نہیں مگر اصل میں وہ اپنے بیٹے سے ناراض ہیں اس لیے ہماری شادی میں بھی شرکت نہیں کی۔“

''تب تو تم سچ مچ خوش قسمت ہو۔'' میلسی نے رشک سے کہا۔ ''ایسی ساس قسمت والوں کو ملتی ہے جو کبھی ملنے ہی نہ آئے۔''

''ایسا نہیں ہے، میرا خیال ہے کچھ اچھی ساسیں بھی تو ہوں گی۔''

''اچھی ساسیں۔'' ان سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ''یہ کہاں ہوتی ہیں؟''

نینسی کھسیا گئی تھی لیکن اسے ان کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ ابھی دنیا اچھی ساسوں کے وجود سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ بہت دنوں سے اسے کلب جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے سوچا جم کے جانے کے بعد کلب جائے گی اور کچھ وقت گزارے گی۔ اس کا دفتری وقت صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک ہوتا تھا درمیان میں صرف ایک گھنٹے کے لیے لنچ کا وقت ملتا تھا۔ چلتے پھرتے وہ اپنے بے شار گھریلو کام نمٹا لیتی تھی۔ اس دوران میں وہ کانوں سے ایک ہیڈ سیٹ لگائے رکھتی تھی اگر اسے کوئی کال آتی تو وہ ایک لمحے میں کمپیوٹر پر آجاتی تھی۔

وہ اپنی جاب سے بہت خوش تھی۔ کیونکہ آن لائن ٹریڈنگ کا کام چوبیس گھنٹے چلتا تھا اس لیے وہ اپنی مرضی کی شفٹ بھی منتخب کر سکتی تھی تاکہ شام کا وقت اپنے شوہر کو دے سکے۔ اسے یہ سہولت بھی تھی کہ اتوار کے علاوہ بھی کسی دن چھٹی لے سکتی تھی یا مسلسل کام کر کے زیادہ دن کی چھٹی لے سکتی تھی۔ اس سہولت کا فائدہ بھی وہ جم کی آمد کے وقت اٹھاتی تھی۔ لیکن اس بار اس نے جم کی روانگی کے اگلے دن ہی چھٹی کی۔ اسے بیوٹی سیلون سے کچھ کام کروانا تھا۔ پھر اس کا ارادہ شاپنگ کرنے اور شام کو لیڈیز کلب جانے کا تھا۔

جیسے ہی اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا، ایک بڑی بی کو ایک بڑے سے ہینڈ کیری اور ایک پہیوں والے سوٹ کیس سمیت سامنے پایا۔ ایک لمحے کو نینسی گڑبڑا گئی، وہ خاموش کھڑی خشمگیں نظروں سے نینسی کو دیکھ رہی تھیں اور نینسی کو ان کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ بڑی بی کی آنکھوں پر خاصے دبیز شیشے کی عینک تھی یعنی ان کی نظر خاصی کمزور تھی۔ کچھ دیر بعد نینسی نے ہچکچا کر کہا۔ ''سوری مام میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''ہاں اب تم مجھے کیوں پہچانو گی۔'' بڑی بی کا لہجہ بھی کم خشمگیں نہیں تھا۔ پھر وہ اس کے برابر سے گزر کر اندر چلی آئیں۔ نینسی کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے لپکتے ہوئے لاؤنج تک آئی۔

''ایک منٹ آپ نے بتایا نہیں....''

''کیا نہیں بتایا؟'' وہ سامان ایک طرف رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یہی کہ آپ کون ہیں؟''

بڑی بی نے ایک بار پھر اسے غضب ناک نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ''میں پہلی بار ضرور آئی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنی ساس کو پہچاننے سے انکار کر دو۔''

''ساس....'' نینسی اچھل پڑی اور پھر اسے خیال آیا کہ تبھی بڑی بی کی صورت اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اپنی تصویروں میں وہ اتنی بوڑھی نظر نہیں آتی تھی لیکن وہ تصویریں یقیناً کئی سال پہلے کی تھیں۔ اس لیے بڑی بی اتنی مختلف لگ رہی تھیں۔ نینسی ہکلائی۔ ''آپ جم کی مام ہیں؟''

''تم اسے جم کہتی ہو؟'' بڑی بی نے اسے ایک بار پھر خوفناک انداز میں دیکھا۔ ''وہ اپنے نام کو مختصر کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی یہ جرأت کرتا تو وہ اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔''

''اب وہ پسند کرتا ہے۔'' نینسی نے ناگواری سے کہا۔ اسے بڑی بی کا بار بار یوں گھورنا بالکل پسند نہیں آرہا تھا۔ ''بہرحال یہ بتایئے کہ آپ جم سے ملنے کیسے چلی آئیں کیا آپ نے اسے معاف کر دیا؟''

بڑی بی نے شانے اچکائے۔ ''ظاہر ہے، ماں باپ ہمیشہ تو اپنی اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ جم کہاں ہے؟''

''وہ کام سے گیا ہوا ہے اور اب بیس دن بعد آئے گا۔'' نینسی نے جلدی سے کہا۔ اسی وقت اس کے ذہن میں ایک خوفناک خدشہ سر اٹھانے لگا کہ اس کی ساس یہاں رکنے کے ارادے سے آئی تھی۔ اس کے اتنے سارے سامان سے تو یہی ظاہر تھا۔

''چلو بیس دن ہی کی تو بات ہے پھر وہ آجائے گا۔''

نینسی پھر بوکھلا گئی۔ ''کیا مطلب......آپ رکنے کے ارادے سے آئی ہیں؟''

''ظاہر ہے۔'' انہوں نے اسے چشمے کے اوپر سے دیکھا۔ ''اتنا سامان میں ایک دو دن کے لیے تو نہیں لا سکتی۔ اگر میں اپنے بیٹے کے گھر رکنا چاہوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

گھر اس کا اور جم کا مشترکہ تھا لیکن اسے یہ بات کہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ بادل ناخواستہ اس نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ میں بھی مصروف رہتی ہوں اور آپ بور ہوسکتی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، میں عادی ہوں، جم کا باپ تو صبح سات بجے جاتا ہے اور رات دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں آتا۔'' بڑی بی نے جواب دیا اور چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ ''گھر تو بہت خوب صورت ہے۔''

نینسی اور جم نے یہ گھر اپنی تمام جمع پونجی سے خریدا تھا کیونکہ قسطوں پر لینے کی صورت میں یہ انہیں کئی گنا زیادہ قیمت کا پڑتا۔ اس کے لیے جم نے اپنی بیش قیمت کار بھی بیچ دی تھی اور بعد میں قسطوں پر ایک اچھی گاڑی لے لی تھی۔ جم کی طرف سے خاموشی کے بعد اس نے اپنے سسرال کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اس لیے ساس کی اچانک اور غیر متوقع آمد سے نینسی کا موڈ خراب ہوگیا تھا اور اس نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بڑی بی سے کہا۔ ''آیئے میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔ آپ اپنا سامان رکھ دیں۔''

''تم مجھے بتا دو میں خود چلی جاؤں گی تب تک تم میرے لیے ناشتا بنا دو۔ میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔''

نینسی ان کا کمرا دکھا کر کچن میں آئی اور ناشتا تیار کرنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر آنے والے دنوں میں بڑی بی کا یہی رویہ رہا تو گھر کا پُرسکون ماحول خراب ہوجائے گا۔ ساتھ ہی اسے جم پر غصہ آنے لگا کہ وہ اس بار اتنے دن کے لیے کیوں گیا ہے۔ پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ جم کو کیا معلوم تھا کہ اس کی ماں آجائے گی۔ نہ جانے کیوں نینسی کو اس عورت سے چڑ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا انداز ہی چڑانے والا تھا۔ ناشتا بنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مہمانوں کے لیے مخصوص کمرے سے کوئی چیز گرنے اور پھر ایک چھناکے کی آواز آئی وہ فرائنگ پین میں انڈا چھوڑ کر بھاگی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر اس کا صدمے سے برا حال ہوگیا کہ سیٹ کی ڈریسنگ ٹیبل کا شیشے والا حصہ اس سے الگ ہوکر نیچے پڑا ہے اور بڑی بی نہایت آرام سے بستر پر بیٹھی ہیں۔

''یہ کیا ہوا؟'' نینسی بولی۔

''میں اپنا بیگ اس پر لٹکا رہی تھی اور یہ ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔ بہت گھٹیا اور ہلکی کوالٹی کا ہے۔''

''ہلکی کوالٹی۔'' نینسی روہانسی ہوگئی۔ ''یہ پورا سیٹ چار ہزار ڈالرز کا ہے اور اب تو ڈریسنگ بھی دوسری نہیں ملے گی۔ یہ چند سیٹ تھے۔ اس میں سے آخری میں نے خریدا تھا۔ یا میرے خدا آپ نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔''

''دوسرا لے لو۔'' بڑی بی بے پروائی سے بولیں۔

اس نے تلملا کر کہا۔ ''آپ کو اس پر لٹکانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا الماری نہیں ہے سامان رکھنے کے لیے۔''

''اپنے گھر میں ہمیشہ ڈریسنگ پر لٹکاتی ہوں۔'' وہ بے نیازی سے بولیں۔ ''ویسے ناشتے کا کیا ہوا؟''

اس پر نینسی کو یاد آیا کہ وہ فرائنگ پین میں انڈا چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ بھاگی ہوئی کچن پہنچی تو انڈا سیاہ ہوچکا تھا۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کر کے فرائنگ پین ڈسٹ بن میں الٹ دیا۔ ویسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ ساس کے سر پر پھینکتی۔ وہ کچن میں چلی آئی تھیں۔ انڈے کی بو محسوس کر کے انہوں نے منہ بنایا۔ ''یقیناً جلا دیا ہوگا تم نے؟''

نینسی نے انہیں گھورا اور دوبارہ انڈا توڑ کر ڈالا۔ توس، انڈا اور کافی ان کے سامنے رکھی اور کمرے میں آکر ڈریسنگ ٹیبل کا ملبا اٹھانے لگی۔ لکڑی اور شیشے کے بے شمار ٹکڑے ہوگئے تھے۔ بھاری بیگ گرنے سے ڈریسنگ ٹیبل کی سطح پر بھی کئی خراشیں آگئی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ سارا ملبا اٹھایا۔ اس دوران میں اسے کئی زخم بھی لگے تھے۔ کرچیوں سے۔ اسے پٹیاں چپکاتے دیکھ کر بڑی بی آرام سے کافی پی رہی تھیں۔ آخر میں انہوں نے تبصرہ کیا۔ ''تم شہری لڑکیاں بڑی نازک اور پھوہڑ ہوتی ہو۔''

''کیونکہ ہم شہر میں رہتے ہیں۔'' نینسی نے بھنا کر غلط بیانی کی، ورنہ جوانی تک تو اس نے بھی ایک دیہی علاقے میں پرورش پائی تھی مگر وہاں بھی وہ نازک اندام ہی تھی۔ ''اگر میں آپ کی طرح کسی دیہات کی رہنے والی ہوتی تو یقیناً سخت جان ہوتی۔''

''انسان کوشش کرے تو کیا نہیں کرسکتا۔'' بڑی بی نے کافی ختم کی اور کھڑی ہوگئیں۔ ''میں دوپہر کا کھانا دو بجے کھاتی ہوں اور مجھے سبزیوں سے نفرت ہے۔ بیف یا چکن کی کوئی چیز بنا لینا۔''

وہ حکم دے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور نینسی دانت پیستی رہ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی تمام جاننے والیاں اپنی ساسوں سے کیوں اتنا چڑتی تھیں۔ ساس

چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔اس نے سوچا بھاڑ میں گیا لنچ۔اگر بڑی بی کو بھوک لگے گی تو خود کچھ بنالیں۔وہ اپنے لیے ناشتے کے دوران ہی کچھ سینڈوچز بنالیتی تھی اور لنچ کے وقفے میں ان سے بھوک مٹا کر کچھ اور کام کر لیتی تھی۔اس ایک گھنٹے میں باقاعدہ کھانا بنانا تو کسی صورت ممکن نہیں تھا بہر حال آج اس کی چھٹی تھی۔کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ اس کی ساس پہلی بار اس کے گھر آئی ہیں اور بہر حال وہ جم کی ماں ہیں اس لیے آج وہ ان کے لیے لنچ بنادے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ بڑی بی نے کھانے کے دوران میز بھی خاصی گندی کی تھی۔اس کی صفائی کر کے اس نے فریزر سے چکن نکالی اور اسے پگھلنے کے لیے چھوڑ دیا۔کچن کے لیے ساری خریداری وہ ہفتے میں ایک بار ہی کر لیتی تھی مگر بڑی بی نے جس طرح اپنا مینو بتایا تھا اس سے یہ سامان ناکافی ہو جاتا۔اس لیے اب اسے دوبارہ مارکیٹ کا چکر لگانا پڑے گا۔

اگلے دو گھنٹے تک وہ کچن میں لگی رہی۔اس دوران میں بڑی بی صرف ایک بار دس منٹ کے لیے کچن میں آئیں،اسے یہ بتانے کے لیے کہ ان کے علاقے میں عورتیں صبح سے شام تک انتھک کام کرتی ہیں اور اف نہیں کرتیں۔نینسی چولہے کے ساتھ ساتھ خود بھی جلتی رہی۔صرف تین گھنٹے میں اس کا سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔وہ سوچ رہی تھی کہ آنے والے بیس دن اور اس کے بعد کے دن، جب تک اس کی ساس یہاں رہے گی، کیسے گزریں گے کھانا تیار ہوتے ہوتے ہی دو بج گئے تھے۔اس کے فوراً بعد وہ آکر میز پر براجمان ہوئیں اور ڈٹ کر کھایا۔نینسی کا خیال تھا کہ اس نے اتنا بنا لیا ہے کہ شام کو بھی یہی چل جائے لیکن جب بڑی بی آواز بلند ڈکار لیتی میز سے کھڑی ہوئیں تو اس پر سوائے ہڈیوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ان کی خوراک حیران کن تھی۔کمرے میں جانے سے پہلے ان نے فخریہ اور طنزیہ انداز میں نینسی سے کہا۔

”ہم دیہاتی لوگ کام بھی ڈٹ کر کرتے ہیں اور کھاتے بھی ڈٹ کر ہیں۔“

”کام تو نہیں دیکھا میں نے ہاں کھانا ضرور دیکھ لیا ہے۔“نینسی نے جوابی طنز کیا۔

”جب وقت آئے گا تو کام بھی دیکھ لوگی۔“بڑی بی بولیں۔”شام کو میں کیلے یا اسٹرابیری کا شیک پیتی ہوں۔“

”گھر میں نہ کیلے ہیں اور نہ اسٹرابیری ہے۔“نینسی نے انہیں مطلع کیا تو وہ مسکرائیں۔

”اسی لیے تو تمہیں ابھی بتا رہی ہوں۔“

کچن اور میز کی صفائی کرتے ہوئے نینسی غصے کے ساتھ ساتھ کوفت بھی محسوس کر رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا اس کے گھر کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے اور اب یہ اسی وقت سدھرے گا جب بڑی بی سامان سمیت اپارٹمنٹ سے نکلیں گی۔کام نمٹاتے ہوئے وہ اتنا تھک گئی تھی کہ جب اپنے بیڈ روم میں آکر وہ بستر پر لیٹی تو فوراً سو گئی۔حالانکہ اسے دن میں سونے کی عادت نہیں تھی۔پھر اس کی آنکھ دروازہ پیٹنے کی آواز سے کھلی۔ چند لمحے کو تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور اسے یاد آگیا کہ آج اس کی ساس آئی ہیں۔اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ بڑی بی باہر بڑے مشکوک تاثرات لیے کھڑی تھیں۔”دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

”کیونکہ دیہات میں بغیر اجازت کمرے میں گھس آنے کا رواج بھی ہے۔“نینسی نے طنز کیا۔

”میں پانچ بجے شیک پیتی ہوں۔“بڑی بی نے گھڑی دیکھی۔”آدھا گھنٹا رہ گیا ہے۔“

”مجھے ابھی شاپنگ کے لیے جانا ہے تب ہی میں کیلے اور اسٹرابیری لاسکوں گی۔“

”میں بھی چلوں گی۔“بڑی بی نے فوراً ارادہ ظاہر کر دیا۔

”آپ تھک جائیں گی۔“نینسی نے جلدی سے ٹالنا چاہا لیکن وہ کہاں سننے والی تھیں۔جب نینسی تیار ہو کر جانے لگی تو اس نے بڑی بی کو بھی تیار پایا۔مجبوراً وہ انہیں لے کر باہر آئی۔وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کوئی پڑوسن نہ ملے ورنہ ساسوں کے بارے میں اس کے خیالات کا بعد میں زبردست ریکارڈ لگتا۔مگر اس کی دعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ اتفاق سے ہی اسے مارشا اور میلسی آتے ہوئے مل گئیں اور تعارف کے بعد جب انہیں پتا چلا کہ وہ نینسی کی ساس ہیں تو انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔اس دوران میں بڑی بی کی زبان مستقل چل رہی تھی اور وہ شہری خواتین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کھل کر رہی تھیں۔مارشا اور میلسی سے جان چھڑا کر وہ آگے بڑھی تو انہوں نے بڑی بی کو رات لیڈیز کلب میں مدعو کر لیا اور انہوں نے یہ دعوت قبول بھی کر لی۔نینسی جانتی تھی کہ انھوں نے شرارت میں یہ کام کیا ہے اور رات کو سب کے

سامنے اس کی بے عزتی ہو گی۔ باہر سڑک پر آ کر اس نے کہا۔

''مام آپ نے ضرور ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنی تھیں۔ جب آپ کو شہری عورتیں پسند ہی نہیں ہیں تو یہاں کیوں آئی ہیں؟''

''میں تو اپنے بیٹے کے پاس آئی ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولیں۔ ''اب اس نے بدقسمتی سے ایک شہری عورت سے شادی کر لی ہے تو....''

نینسی نے بات کاٹ کر کہا۔ ''بدنصیبی تو میری ہے کہ میرا اسرال دیہات سے تعلق رکھتا ہے۔''

اس پر بڑی بی نے اسے گھورا لیکن ان کی چلتی زبان خاموش ضرور ہو گئی تھی۔ نینسی نزدیکی سپر اسٹور سے شاپنگ کرتی تھی جہاں اسے تمام چیزیں بہت اچھی اور تازہ مل جاتی تھیں۔ لیکن بڑی بی کی ناک تلے یہ چیزیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں شہر میں تازہ چیزوں کا وہ معیار نہیں جو دیہی علاقوں میں ہے۔ انہوں نے سبزیوں کی خریداری روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور زیادہ زور گوشت پر دیا تھا۔ نتیجے میں نینسی کا بل معمول سے تقریباً چالیس فیصد اوپر چلا گیا تھا۔ بڑی بی نے کئی اضافی خریداری بھی کی جن کی ادائیگی نینسی کو کرنا پڑی تھی۔ اپنا پرس وہ گھر ہی بھول آئی تھیں۔ مزید انہوں نے سامان اٹھانے میں نینسی کی کوئی مدد نہیں کی اسے سب خود اٹھا کر لانا پڑا تھا۔

بڑی بی کا کہنا تھا کہ گھر میں تمام سامان جم کے پاپا لاتے ہیں اس لیے انہیں سامان اٹھانے کی عادت نہیں ہے۔ پھر گھر پہنچتے ہی شیک تیار کرنا پڑا اور جب تک بڑی بی شیک پیتی رہیں ان کا لیکچر سنا کہ آج انہیں زندگی میں پہلی بار اتنا لیٹ شیک پینا پڑ رہا ہے مگر اس سے ان کے شیک پینے کی رفتار پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو بڑے گلاس ختم کر دیئے تھے۔ بہرحال نینسی نے یہ سب اس لیے برداشت کر لیا کہ بڑی بی نے گھر آنے کے بعد لیڈیز کلب چلنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ ورنہ نینسی کو خوف تھا کہ آج رات اس کی ٹھیک ٹھاک بے عزتی ہو جائے گی۔

رات کے کھانے میں بڑی بی نے مٹن پائی کھائی اور اس بار بھی ڈش تقریباً صاف کر دی۔ نینسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بڑی بی جو اتنا کھا رہی تھیں وہ جا کہاں رہا تھا۔ اتنا تو وہ اور جم مل کر بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ میز پر ہی بڑی بی نے اس کی حیرت بھانپ لی اور بولیں۔ ''تم شاید سوچ رہی ہو کہ میں اتنا کیسے کھا لیتی ہوں؟''

''ہاں، میں واقعی یہی سوچ رہی تھی۔'' نینسی نے مروت بالائے طاق رکھ کر کہا۔ کیونکہ اسے یہ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے کہ اسے کل بھی یہ سب کرنا پڑے گا جبکہ اسے تو اپنا کام نمٹانا ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ناشتا بنا سکتی تھی۔ لنچ اور ڈنر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف ناشتا صبح سے کرتی تھی، باقی دو وقت ہلکا پھلکا کھاتی تھی۔ اس لیے اسے کچن میں زیادہ محنت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس دن تو اس نے ریکارڈ وقت کچن میں گزارا تھا۔ بڑی بی نے فخریہ انداز میں کہا۔

''ہم دیہات والے ایسے ہی کھاتے ہیں۔ اب تو میری خوراک کم ہو گئی ہے۔''

بچپن

البیرونی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ آتش پرستوں کا دور تھا۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں آتش کدے بنے ہوئے تھے۔ زرتشت کی تعلیمات عام تھیں مسلمان اقلیت میں تھے لیکن حکومت انہی کے ہاتھوں میں تھی گویا ہندوستان کا نقشہ تھا کہ اکثریت ہندوؤں کی حکومت مسلمان اقلیتوں کی۔ حکومت اور اقتدار ہی کی وجہ سے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود بے خوف خطر اپنے عقیدے پر قائم رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک ابوریان بھی تھا جو ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن علم حاصل کرنے کا بے مایا شوق اسے قدرت کی طرف سے ملا تھا۔ اس وقت خوارزم کی ریاست پر احمد بن محمد بن عراق کی نسبت سے جس خاندان کی حکمرانی تھی وہ آل عراق کہلاتا تھا۔ احمد کا چچا زاد بھائی امیر ابونصر منصور علمی مزاج رکھتا تھا۔ اس نے البیرونی کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور اسے حصول علم میں ہر ممکن سہولت پہنچائی چنانچہ البیرونی اپنی تصانیف میں منصور کو استاذی کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اس کا نام عقیدت و احترام کے ساتھ لیتا ہے۔ منصور ہی نے البیرونی کو اقلیدس کی جیومیٹری اور بطلیموس کی فلکیات کے ابتدائی درس دیے تھے۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا سٹی۔ کراچی

نینسی کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں ۔ ''یہ خوراک کم ہے؟''

''ہاں، جوانی میں اس سے بھی زیادہ تھی۔'' انہوں سرد آہ بھری۔ ''اور میرا وزن بھی ہمیشہ ایک جیسا رہا ہے یعنی تقریباً ایک سوبیس پاؤنڈز۔''

''لیکن آپ کچھ کرتی تو ہیں نہیں تو پھر وزن کیوں نہیں بڑھا؟''

''یہاں کچھ نہیں کر رہی ہوں، گھر میں تو سارا کام ہی میں کرتی ہوں۔ حد یہ کہ گھر پر رنگ اور مرمت کا کام بھی میں کرتی ہوں۔ تمہارے انکل کو اتنی فرصت کہاں، وہ تو بس اپنے بزنس میں مگن رہتے ہیں۔''

نینسی کو اس بات کی صداقت میں شک تھا کہ اس کی ساس ہل کر کچھ کرتی ہوں گی۔ امکان یہی تھا کہ گھر میں بھی ان کا زیادہ وقت اسی طرح کھانے پینے اور آرام کرنے میں گزرتا ہوگا۔ نینسی سوچ رہی تھی کہ ان سے صاف بات کر لے۔ اس نے گلا صاف کیا اور بولی۔ ''مام آج میں نے چھٹی کی تھی اس لیے یہ سارے کام ہو گئے لیکن کل سے میں کام پر رہوں گی اور اگر آپ کو دوپہر اور رات میں اسی طرح کھانا ہے تو آپ کو خود زحمت کرنا پڑے گی۔''

''تم نوکری کرتی ہو۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولیں۔ ''میرے بیٹے نے ایک ملازمت کرنے والی عورت سے شادی کی ہے؟''

''تو اس میں کیا برائی ہے؟ امریکا کی ستر فیصد شادی شدہ عورتیں ملازمت کرتی ہیں۔'' نینسی نے جوابی خفگی کے ساتھ کہا۔ ''میں نے بھی تو ایک ایسے آدمی سے شادی کی ہے جو ملازمت کی وجہ سے مہینے کے بیس دن گھر سے باہر رہتا ہے۔''

''تمہیں کیا ضرورت ہے ملازمت کرنے کی جبکہ تمہارا شوہر اچھا کماتا ہے۔''

''بس یہ میرا پروفیشن اور شوق ہے پھر میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''بچے نہیں ہیں یا تم لوگوں نے احتیاط کر رکھی ہے؟''

''جم کی خواہش ہے کہ ہمارے بچے ہوں لیکن ابھی تک ایسا کچھ ہوا نہیں ہے، ہم کوئی احتیاط بھی نہیں کرتے۔''

''دیکھنا جب بچے ہوں گے تو تم خود نوکری سے بیزار ہو جاؤ گی، ہمارے خاندان میں عورتوں سے نوکری کرانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''نہیں، میری نوکری ایسی نہیں ہے۔'' اس نے بور ہو کر کہا۔ ''لیکن میں بتا دوں کل سے میں سوائے ناشتے کے اور کچھ نہیں بناؤں گی۔ آپ کو کھانا ہے تو خود بنائیں اور خود کھائیں۔''

''اپنے ہی بیٹے کے گھر میں یہ دن بھی دیکھنے تھے۔'' بڑی بی نے گہری سانس لی۔ ''خیر ٹھیک ہے میں خود بنالوں گی۔ لیکن میں نے دیکھا ہے فریج میں زیادہ چکن اور گوشت نہیں ہے۔''

''آپ گوشت کے بجائے سبزیاں زیادہ کھایا کریں۔ اس عمر میں اتنا مرغن کھانا نقصان دہ... بھی ہو سکتا ہے۔''

''اب تک تو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ پھر رقم کا سب سے صحیح مصرف یہی ہے کہ اسے صحت پر لگایا جائے۔ اب چکن اور گوشت کا کیا ہوگا؟''

اس بار نینسی مسکرائی۔ ''وہ بھی آپ خود لے آیئے گا۔ اسٹور تو دیکھ لیا ہے آپ نے۔''

یہ سن کر بڑی بی گڑبڑا گئی تھیں۔ ''بھئی دیکھو میں زیادہ رقم لے کر نہیں آئی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، کھانا تو آپ نے ہے۔ انسان اپنی صحت پر لگائے تو یہ رقم کا سب سے صحیح مصرف ہوتا ہے۔'' نینسی نے ان کا جملہ ان ہی کو لوٹا دیا۔ اس پر ان کی جو صورت بنی اس سے نینسی کی سارے دن کی کوفت کا کسی حد تک ازالہ ہوا تھا۔ مگر آنے والے دنوں کی جو پیشگی پریشانی... ہو گئی تھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صبح وہ جلدی ناشتا بنا کر اور میز پر رکھ کر بڑی بی کو آواز دے کر اپنے کام والے کمرے میں آ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ اپنے ایک کسٹمر کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ بڑی بی چلی آئیں۔

''ناشتا بالکل ٹھنڈا ہے۔ مجھے گرم ناشتا کرنے کی عادت ہے۔''

''میں ایک گھنٹا پہلے آپ کو ناشتا کا کہہ کر آ چکی ہوں اور اس وقت میں جاب پر ہوں، مجھے ڈسٹرب مت کریں۔''

بڑی بی ناشتا بھول گئیں اور اس کے کام کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ نینسی نے بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی لیکن اتنی دیر میں اس کا کسٹمر جا چکا تھا۔ فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے اس نے غصے کے باوجود بڑی بی کو ناشتا گرم کر کے دیا اور کہا۔ ''اب میں کام کر رہی ہوں تو آپ وہاں نہیں آئیں گی۔ جو کرنا ہے خود کریں گی۔''

''اچھا اچھا اب سکون سے ناشتا تو کرنے دو۔'' بڑی بی نے ٹرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ نینسی ٹھنڈی سانس لے کر کمپیوٹر پر واپس آگئی۔ آنے والے تین چار دن اس کی توقع سے زیادہ دشوار ثابت ہوئے تھے۔ بڑی بی ناشتے کے بعد دو وقت کا کھانا خود بنا اور کھا رہی تھیں۔ وہ اس دوران میں سامان نہایت فراخ دلی سے استعمال کرتی تھیں۔ نینسی کو یہ بھی گوارا تھا لیکن پکانے کے دوران وہ اس کے نہایت صاف ستھرے کچن کا جو حشر کرتیں، اس سے اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ روزانہ رات وہ سونے سے پہلے ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ کر کچن کی صفائی کرتی تھی۔ اگلی رات تک کچن کا پھر وہی حشر ہو جاتا تھا۔ اس نے بھنّا کر بڑی بی سے کہا تو وہ اطمینان سے بولیں۔

''ہمارے ہاں کچن کھانا بنانے کے لیے ہوتا ہے، سجانے سنوارنے کے لیے اور بہت سی جگہیں ہیں۔''

''لیکن میں کچن صاف رکھنے کی عادی ہوں۔ پلیز آئندہ آپ جب کچن استعمال کریں تو اسے صاف بھی کریں۔''

بڑی بی سن کر خاموش رہی تھیں۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ان کا نینسی کی التجا پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جم جب کام کے لیے باہر جاتا تو عام طور سے اسے دوسرے تیسرے دن کال کرتا تھا لیکن اس بار اس کی کال چار دن بعد آئی تھی۔ البتہ اس کی خیریت کی ای میل اور ایس ایم ایس آتے رہتے تھے۔ نینسی نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تھا کہ اس کی ماں آئی ہے وہ یہ بات اسے فون پر بتانا چاہتی تھی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ خود اسے کال کرلے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔ نینسی سونے کے لیے لیٹی تھی کہ جم کی کال آگئی۔

''ڈیئر کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں اور یہاں تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' نینسی نے کہا اور اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ابھی جم کو اس کی ماں کے بارے میں نہ بتائے تاکہ وہ خود آکر اچانک اسے دیکھے تو اسے سرپرائز ملے۔

''کیسا سرپرائز؟''

''اگر پہلے سے بتا دیا تو وہ سرپرائز کہاں رہے گا۔'' نینسی ہنسی۔ ''لیکن تمہارے اس سرپرائز نے میری زندگی اجیرن کررکھی ہے۔''

''تم نے تو مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ اب میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے اب میں تمہارے ہر ٹرپ میں کوئی نہ کوئی سرپرائز تیار رکھنے کی کوشش کروں گی۔''

اگلے دن بڑی بی نے ناشتے پر اس سے پوچھا۔ ''تم رات کو کس سے بات کررہی تھیں؟''

نینسی کو غصہ آگیا۔ ''کیا آپ چھپ کر میری باتیں سنتی ہیں؟''

بڑی بی نے منہ بنایا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں تو واش روم جارہی تھی تو تمہیں باتیں کرتے سن لیا۔''

''آپ کے بیٹے کا فون تھا۔ میں نے آپ کے بارے میں بتایا نہیں ہے، سرپرائز دوں گی۔''

نینسی نے محسوس کیا کہ بیٹے کے بارے میں سن کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئی تھیں شاید اب تک ان کا دل صاف نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے جب آئے گا تو اس سے مل لوں گی۔''

''مجھے لگتا ہے آپ اب بھی جم سے ناراض ہیں؟''

بڑی بی نے سوال کیا۔ ''اگر تمہارا اکلوتا بیٹا تمہارے ساتھ یہ سلوک کرے تو تمہارا کیا ردِعمل ہوگا؟''

نینسی نے سوچا اور اعتراف کیا کہ کچھ اچھا نہیں ہو گا۔ ''لیکن پیشہ بدلنا کوئی اتنی بری بات تو نہیں ہے۔''

''ہمارے ہاں بری بات ہے۔'' بری بی نے سر ہلایا۔ ''تمہارے انکل کا کہنا ہے امریکا کا صدر بھی ملازم ہی ہوتا ہے اور ملازمت سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آدمی اپنا کام کرے بے شک وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ کاروبار کا ٹھیلا بھی اپنا ہوتا ہے اور امریکی صدر کے دفتر کی ایک چیز بھی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔''

''میرا تو خیال ہے کہ ملازمت کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ آخر جو خود سے کاروبار کرتے ہیں ان کا کاروبار ملازمت پیشہ لوگوں کے توسط سے چلتا ہے۔ وہ رقم خرچ نہ کریں تو کام کیسے چلے؟''

''یہ کاروبار کرنے والوں کے ادا کیے ہوئے ٹیکسوں کی رقم ہوتی ہے جس سے سرکاری ملازموں کو تنخواہیں دی جاتی ہیں اور نجی ملازموں کو براہِ راست کاروبا کرنے والے ہی تنخواہ دیتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی ملک کی ترقی کے لیے کاروبار کرنے والے اور ملازمت کرنے والے دونوں ہی بہت اہم ہوتے ہیں۔''

”میں یہ سب نہیں جانتی لیکن ہمارے ہاں ملازمت کرنا نہایت برا سمجھا جاتا ہے۔“ بڑی بی نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ ”جم سے اختلاف ہی اسی بات پر ہے ورنہ باقی معاملات میں وہ نہایت فرمانبردار اور اچھا بچہ ہے۔“

نینسی کے خیال میں خاندانی ضد جم میں بھی موجود تھی ورنہ وہ کچھ عرصے بعد اس کے ساتھ ماں باپ کے گھر جا کر ان سے معافی مانگ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایک بار بھی ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر نینسی نے اس بارے میں بات کی تو اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس لیے نینسی نے اس سے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اب اس کی ماں کو دیکھ کر نینسی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ جم کیوں اپنے ماں باپ سے اتنا بھاگتا تھا۔ کچن کے بارے میں بات کرنے کے بعد بھی بڑی بی کا رویہ نہیں بدلا تھا اور وہ روز ہی کچن اسی طرح گندا چھوڑتی تھیں۔ بس ایک اچھی بات تھی کہ وہ سوائے اپنے کمرے اور کچن کے اور کسی جگہ دخل نہیں دیتی تھیں۔ کمرے کو بھی انہوں نے کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ مگر نینسی نے کچھ کہا نہیں۔ کمرے کو روز ہی صاف یا ٹھیک کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اسے کمرا ایک ہی بار ان کے جانے کے بعد ٹھیک کرنا تھا۔

اب اس کی خواہش تھی کہ جم جلد از جلد گھر آ جائے اور بڑی بی کے واپس جانے کی تاریخ سامنے آئے۔ اب وہ اسے کام کے دوران نہیں چھیڑتی تھیں لیکن خود نینسی کو گھر اور خاص طور سے کچن کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اپنے کام پر صحیح طریقے سے توجہ نہیں دے پا رہی تھی اور اسے اپنے باس کی طرف سے کئی بار ٹوکا بھی گیا تھا۔ اگرچہ اس نے نینسی کو نوٹس نہیں دیا تھا کیونکہ وہ اسے اچھا آفیسر سمجھتا تھا۔ البتہ اسے حیرت تھی کہ نینسی، جو چند دن پہلے تک بہت اچھا جا رہی تھی اسے کیا ہوا ہے؟ اس وقت بھی اس نے الجھے ذہن کے ساتھ انکوائری کرنے والے کچھ کسٹمرز کو غلط انوائسز بھیج دیں اور ان کی طرف سے شکایت آئی تو باس نے بالآخر خود اس سے بات کی۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”نینسی تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے تم اتنی غلطیاں کیسے کرنے لگی ہو؟“

”سر آئی ایم سوری لیکن میں کچھ پریشان ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اس نے پشیمانی سے کہا۔

”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

وہ ہچکچائی پھر اس نے بتا دیا۔ ”سر آج کل پہلی بار میری ساس میرے گھر آئی ہیں اور انہوں نے ایک ہفتے میں مجھے تقریباً پاگل کر دیا ہے۔“

باس ہنس دیا۔ ”یہ ساس چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ جب میری ساس آتی ہے تو میں گھر میں کام کرنے کی بجائے دفتر چلا جاتا ہوں۔“

نینسی کا باس بھی گھر میں بیٹھ کر کام کرتا تھا۔ نینسی نے کہا۔ ”آپ تو دفتر جا سکتے ہیں۔ میرے گھر کے پاس تو فرم کا کوئی دفتر بھی نہیں ہے۔“

”تب تم ایسا کرو چھٹی لے لو اور آرام سے اپنی ساس کو بھگتاؤ اور جب وہ چلی جائیں تو دوبارہ جوائن کر لینا۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ وہ طویل عرصے تک رکنے کے ارادے سے آئی ہیں۔“

”تمہاری مرضی .... بات ابھی میری حد تک ہے۔ میں اسے سنبھال رہا ہوں لیکن اگر یہ مجھ سے آگے چلی گئی تو سمجھ سکتی ہو کہ کیا ہوگا؟“

نینسی جانتی تھی۔ یہ چیز اس کے ریکارڈ کو خراب کر دے گی۔ پانچ سال کی ملازمت کے دوران اسے ایک بار بھی سرزنش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”سر، میں اس بار کوئی غلطی نہیں کروں گی۔“

اس رات نینسی سونے کے لیے لیٹی تو اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے دوا کھائی اور سو گئی۔ صبح اٹھی تو جسم عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ واش روم میں آئی تو برش کرتے ہوئے اچانک ہی اسے چکر آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور واپس بستر تک آئی اور چکرا کر گر پڑی پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ کچھ دیر بعد بھوک سے بے تاب بڑی بی نے اس کے کمرے میں جھانکا اور اسے یوں بستر پر پڑے دیکھ کر چونک گئیں۔ ”نینسی کیا ہوا ہے تمہیں؟“ انہوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا تو اس کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔

”پتا نہیں مجھے بہت چکر آ رہے ہیں کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔“

بڑی بی یہاں آنے کے بعد پہلی بار فکر مند نظر آئی تھیں۔ انہوں نے نینسی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ”چلو اٹھو، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔“

اتفاق سے ایک کلینک پاس ہی تھا اور بڑی بی اسے وہیں لے گئیں۔ نینسی کی کار انہوں نے کسی نہ کسی طرح ڈرائیو کر لی تھی۔ ویسے وہ جس طرح کار چلا رہی تھیں اسے

دیکھ کر نینسی کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہ دونوں ہی کسی اسپتال نہ پہنچ جائیں مگر خیریت رہی اور بڑی بی نے اسے کلینک تک پہنچا دیا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر نے دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر پہلے اسے دیکھا۔ وہ اسے اندر معائنے کے کمرے میں لے گیا اور کوئی نصف گھنٹے بعد اس نے باہر آ کر بڑی بی سے پوچھا۔ ''یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟''

''بہو ہے۔''

''تب مبارک ہو، یہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن اس کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے اسے فی الحال آرام کی اشد ضرورت ہے۔ طاقتور اور سادا غذا کھانی ہوگی۔''

ڈاکٹر نے کچھ دوائیں بھی لکھ کر دی تھیں۔ دواؤں کی قیمت اور ڈاکٹر کی فیس دونوں بڑی بی کو دینا پڑی کیونکہ نینسی کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ اپنا پرس لاتی۔ بہر حال جز بز ہونے کے باوجود بڑی بی اسے سنبھال کر گھر تک لے آئیں۔ نینسی کو کام کی فکر تھی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے اپنے باس کو طبیعت کی خرابی کا بتا کر ایک ہفتے کی چھٹی لی اور پھر جم کو کال کی۔ ''تمہارے لیے ایک سرپرائز اور ہے۔''

''خدا خیر کرے ایک اور سرپرائز۔''

''ہاں میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ پتا ہے اس نے کیا کہا ہے؟''

جم پریشان ہوگیا۔ ''نینسی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ڈیئر۔'' وہ شرما کر ہنسی اور پھر اس نے بہ مشکل بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ سن کر جم تو فون پر ہی ناچ اٹھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ اس خوشخبری کا وہ کتنے عرصے سے منتظر تھا۔ لیکن ابھی اسے کم سے کم مزید ایک ہفتے کا لازمی کام تھا جسے کیے بغیر وہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ کام ایسے تھے جنہیں وہ التوا میں ڈال دیتا تب بھی مسئلہ نہیں تھا اس نے نینسی سے کہا۔ ''بس میں ایک ہفتے میں واپس آ رہا ہوں تم اکیلی ہو، مجھے فکر ہو رہی ہے۔ ایسا کرو مارشا سے بات کرو وہ تمہاری دیکھ بھال کر لے گی۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے آرام کرنے کو کہا ہے اور میں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔''

''تم اپنا ذہن بناؤ جب تک بے بی نہ ہو جائے تم ملازمت سے عارضی چھٹی لے لو۔''

''تم آؤ تو اس پر بھی غور کرتے ہیں۔ ابھی تو ایک ہفتے کی چھٹی ہے میرے پاس۔''

نینسی نے چھٹی تو لے لی تھی لیکن اسے یہ فکر تھی کہیں ساس اسے دوبارہ کچن میں نہ رگڑ دیں انہیں اپنے لیے پکانا بھی نہایت ناگوار گزرتا تھا اور وہ کئی بار اس پر اسے باتیں سنا چکی تھیں۔ اسے بیڈ روم تک پہنچا کر وہ کہیں چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد باہر کا دروازہ کھلا اور بڑی بی نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ ''تم ٹھیک ہو نا۔۔۔؟ لیٹی رہو میں تمہارے لیے سوپ تیار کر کے لا رہی ہوں۔''

نینسی کو ان کی بات سن کر چکر کو نہیں آیا لیکن وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد بڑی بی نے پہلی بار کوئی کام کرنے کی بات کی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ اس کے لیے بکرے کے گوشت اور مشروم کا گاڑھا سا سوپ بنا کر لے آئی تھیں۔ ''یہ پیو اس حالت میں یہ نہایت بہترین چیز ہے۔''

نینسی بکرے کا گوشت نہیں کھاتی تھی اور اسے مشروم سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہ گاڑھا سوپ دیکھ کر عجیب سا لگ رہا تھا لیکن جب بڑی بی کے اصرار پر اس نے چند چمچ لیے تو اسے اچھا لگا اور پھر وہ پورا پیالہ صاف کر گئی۔ اس کے بعد بڑی بی نے اسے دوا دی اور جب وہ لیٹ گئی تو انہوں نے اسے اطلاع دی۔ ''میں نے تمہارے پرس سے کچھ رقم نکالی ہے۔ میرے پاس جو رقم تھی وہ ڈاکٹر کی فیس اور دوائیاں لینے میں خرچ ہوگئی۔''

نینسی کا اچھا موڈ غارت ہو گیا اور اسے غصہ آ گیا۔ ''آپ مجھ سے کہہ سکتی تھیں، میں آپ کو دے دیتی۔''

''تم بے حال پڑی تھیں اس لیے نہیں پوچھا۔'' بڑی بی بھی دوبارہ اپنے اصل موڈ پر آ گئیں۔ ''صرف پچاس ڈالرز ہی تو لیے ہیں، سامان لے کر آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے برتن سنبھالے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ نینسی کو ندامت ہوئی کہ واقعی وہ اسی کے لیے تو سامان لائی تھیں اور اپنی رقم واپس تھوڑی مانگی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔ شام کو اٹھی تو بڑی بی نے ایک بار پھر اسے سوپ دیا۔ ان کا موڈ ٹھیک تھا اور رہا سہا نینسی کی معذرت سے ٹھیک ہو گیا اور جب اس نے ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی رقم دی تو وہ خوش ہو گئیں۔ رات کو انہوں نے اس کے لیے ایک خاص انداز میں ابالی مچھلی بنائی۔ یہ بھی سادہ سی تھی لیکن بہت مزے دار نکلی۔ بڑی بی نے اسے بتایا۔

''اگر ان دنوں میں اس طرح بنا کر مچھلی ہفتے میں ایک بار بھی کھائی جائے تو بچے کی ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں اور اسے ساری عمر جوڑوں کا مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''مجھے بھی بتایئے کہ کیسے بناتے ہیں؟'' نینسی بولی۔ اسے بھی فکر لگ گئی تھی کہ اس کا بچہ مضبوط اور صحت مند ہو۔ پھر بڑی بی اسے سکھانے لگیں کہ ان دنوں میں کیا چیزیں کس طرح بنا کر کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسے ٹھیک رہنے اور ممکنہ مشکلات سے بچنے کے گر بھی بتا رہی تھیں۔ ان کی بنائی چیزیں کھا کر اور بتائی ہوئی ترکیبوں پر عمل کر کے نینسی چار پانچ دن میں خود کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگی تھی۔ ابتدائی کمزوری کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ورنہ پہلے دن تو اسے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو اور سر مستقل چکرا رہا تھا۔ اب وہ خود کو معمول سے بھی زیادہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ چھٹے دن اس نے بڑی بی کو بتایا۔

''جم کل آ جائے گا اس نے کام سمیٹ لیا ہے اور یہ خوشخبری سن کر جلد آ رہا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' بڑی بی بولیں۔ ''میرے جانے کے بعد بھی تم خوراک اور دوسری بتائی گئی باتوں پر عمل کرتی رہنا، اس سے تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔''

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی سے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ میں اپنی پڑوسنوں کی حالت دیکھتی رہی ہوں ان دنوں وہ بہت پریشان بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کو کوئی گائڈ کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔''

بڑی بی نے ناگواری سے کہا۔ ''ظاہر ہے کون گائڈ کرے گا جب ساسوں کو برداشت نہیں کرتی ہیں۔''

''آپ جانتی ہیں اس بارے میں؟'' نینسی کو حیرت ہوئی تھی۔

''کیونکہ آج کل روز ہی آتے جاتے ان سب سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے میں کوئی ساس نہیں بلکہ عفریت ہوں اور یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں کھا کر جاؤں گی۔''

''میں ان کی یہ غلط فہمی دور کر دوں گی۔'' نینسی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ یقیناً بہت اچھی ساس ہیں جو اس طرح مشکل وقت میں میرا خیال رکھ رہی ہیں اور میری رہنمائی کر رہی ہیں۔''

''ناممکن ہے۔'' بڑی بی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ساسوں کے بارے میں بہوؤں کے آفاقی خیالات کبھی نہیں بدلیں گے۔''

نینسی کو خیال آیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اس خدمت گزاری سے قطع نظر اس کے اپنے خیالات بھی مختلف نہیں تھے ساس کے بارے میں اور ایک ہفتے پہلے تک وہ خود کتنی بیزار ہو چکی تھی۔ ''ہر انسان کی فطرت مختلف ہوتی ہے اس میں کچھ اچھائیاں ہوتی ہیں تو کچھ برائیاں بھی ہوتی ہیں۔''

''انسان دوسروں میں صرف برائیاں دیکھتا ہے۔'' بڑی بی نے ایک اور سرد آہ بھری۔ ''اچھائیاں کسی کو نظر نہیں آتیں۔''

اس وقت نینسی نے محسوس کیا کہ بڑی بی کچھ اداس ہو رہی تھیں۔ انہوں نے رات کو بھی اس کے لیے بڑی شاندار ڈش بنائی۔ یہ ایک اٹالین ڈش تھی جس میں چاول کے ساتھ جھینگے ہوتے ہیں لیکن یہ جھینگا پلاؤ نہیں تھا۔ ان چھ دنوں میں نینسی نے بہت مزے کے اور اچھے کھانے کھائے تھے۔ بڑی بی یہ کر رہی تھیں کہ وہ جو پکاتی تھیں اس کی ترکیب ایک کاغذ پر لکھ کر فریج پر لگا دیتی تھیں تاکہ نینسی بعد میں خود پکا سکے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی ڈائری تیار کی تھی جس میں اس کے لیے معمولات کی تفصیل لکھی تھی۔ اسے آنے والے دنوں کے لحاظ سے تیار کیا گیا تھا کہ کس مہینے کے دوران نینسی کو کیا کرنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان دنوں ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ نینسی کے لیے سوچتے اور کام کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔

نینسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی آرام طلب اور صرف کھانے پینے کی شوقین ساس اتنی گنی نکلیں گی۔ ان چھ دنوں میں وہ بالکل بدل گئی تھیں۔ انہیں اپنے کھانے پینے کا ذرا بھی خیال نہیں رہا تھا ان کا سارا ہی وقت نینسی کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ وہ اس کے لیے پکاتی تھیں اور خود بھی وہی کھا لیتی تھیں حالانکہ انہیں مرغن اور بھنی چیزوں سے دلچسپی تھی۔ مگر انہیں اپنے لیے کچھ بنانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے علاوہ بھی وہ نینسی کا مکمل خیال رکھ رہی تھیں۔ گھر کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی تھیں۔ حد یہ کہ ان دنوں اس کا کچن بھی خوب صاف ہو رہا تھا اگرچہ یہ ویسا تو نہیں تھا جیسا نینسی رکھتی تھیں لیکن پھر بھی پہلے کے مقابلے میں جب بڑی بی اسے گندا کر کے رکھتی تھیں، صاف ہی تھا۔ رات کے کھانے کے بعد نینسی ان کی ہدایت کے مطابق جلدی سونے کے لیے کمرے میں چلی آئی۔ بڑی بی صبح ناشتا بنانے کے لیے جلد بیدار ہو جاتی تھیں اور ناشتا تیار کر کے اسے بھی اٹھا دیتیں۔ لیکن اس صبح انہوں نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔ بیدار ہو کر وہ باہر آئی تو بڑی بی اسے کہیں نظر نہیں آئی

تھیں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی تو ان کا سامان بھی غائب تھا۔ البتہ کچن میں میز پر اس کا مکمل ناشتا تیار رکھا تھا اور ایک پلیٹ کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔ نینسی نے اسے اٹھا کر دیکھا اس پر بڑی بی کی تحریر میں لکھا تھا۔ ''ڈیئر نینسی، مجھے اچانک ہی جانا پڑا ہے۔ تم سو رہی تھیں میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُمید ہے تم سے پھر ملاقات ہوگی۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھنا، بہت سارے پیار کے ساتھ تمہاری.... ساس۔''

نینسی حیران رہ گئی۔ بہرحال اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کی ساس آئی بھی اچانک ہی تھیں اس لیے اچانک ہی بتائے بغیر چلے جانا اتنا تعجب انگیز بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ بیٹے سے بہ دستور ناراض تو نہیں تھیں اس لیے اس کا سامنا کرنے کی بجائے وہاں سے چلی گئیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور ابھی وہ ناشتا ہی کر رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ وہ اس خیال سے تیزی سے دروازے پر آئی کہ شاید بڑی بی واپس آئی ہیں لیکن دروازہ کھلنے پر سامنے جم نظر آیا۔ وہ ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر اس کے گلے لگ گئی۔ جم بہت خوش تھا۔

''تم نے سچ مچ مجھے سرپرائز دیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا اڑ کر پہنچ جاؤں۔'' جم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شام کو آنا تھا لیکن اتفاق سے ایک کلائنٹ نے میٹنگ ملتوی کر دی اور میں صبح والی فلائٹ سے آگیا۔''

''تم نے ناشتا کیا؟''

''نہیں ابھی کروں گا۔'' جم کوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتی ہو طیارے میں مجھ سے کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔''

نینسی اپنا ناشتا چھوڑ کر اس کے لیے بنانے لگی۔ جب تک جم شاور لے کر آیا اس نے ناشتا میز پر لگا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران جم کو اچانک خیال آیا۔ ''تم نے ایک سرپرائز کا اور بھی کہا تھا۔''

نینسی اسی سوال کی منتظر تھی۔ اس نے کہا۔ ''وہ سرپرائز تمہاری والدہ محترمہ تھیں لیکن آج وہ مجھے خود سرپرائز دے گئیں۔''

جم کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ گیا۔ ''کیا میری مام.... یہاں آئی تھیں؟''

''ہاں دو ہفتے رہ کر آج صبح ہی اچانک چلی گئی ہیں۔'' نینسی نے کہا اور پھر جم کو بتایا کہ کس طرح اس کی مام اچانک آگئی تھیں اور انہوں نے ایک ہفتے تک اس کا جینا حرام کر کے رکھا تھا لیکن ایک ہفتے بعد جب اس کی طبیعت خراب ہوئی تو انہوں نے اس کا اتنا خیال رکھا کہ وہ حیران رہ گئی۔ انہوں نے اسے ایک بھی کام کرنے نہیں دیا۔ جم حیران پریشان سن رہا تھا۔

''ہاں مام ذرا سخت طبیعت کی ہیں۔ لیکن اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہو تو وہ پھر پیچھے نہیں ہٹتی ہیں۔ آخر تک اس کے کام آتی ہیں اور تم تو ان کی بہو ہو لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی؟''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ مام یہاں کیسے آگئیں۔ وہ بہت ضدی ہیں اور جس سے ناراض ہو جائیں اس سے ان کا دل آسانی سے صاف نہیں ہوتا۔ جب تک میں معافی نہیں مانگتا وہ یہاں نہیں آتیں۔''

''ناراض تو وہ تم سے ہیں، مجھ سے نہیں، اس کے باوجود انہوں نے ایک ہفتے تک میرا وہ حال کیا جو میں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔ اس کے بعد اتنی اچھی ہو گئیں کہ میں اب تک حیران ہوں۔''

''مام ایسی ہی ہیں۔'' جم نے گہری سانس لی۔ ''بہرحال ان کا آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اب مجھ سے اتنی ناراض بھی نہیں ہیں۔''

''لیکن وہ اچانک اس طرح کیوں چلی گئیں؟''

''شاید کچھ ناراضی ابھی بھی باقی ہے۔ اسی کو ظاہر کرنے کے لیے وہ میرے آنے سے پہلے یہاں سے چلی گئیں۔''

''تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' نینسی بولی۔ ''جم، میں چاہتی ہوں ان کی ناراضی ختم ہو جائے۔ دیکھو، تم نے خاندانی پیشہ اختیار نہیں کیا وہ اس بات سے ناراض ہیں لیکن اب اس بات کو بھی طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ میرا خیال ہے اب ان کی خفگی بھی بہت کم رہ گئی ہوگی۔''

جم نے سر ہلایا اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگا لیکن اس بار اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نہیں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بھی سوچ رہا ہو کہ اب اسے ماں باپ سے مل لینا چاہیے۔ جم کو اس ٹرپ کے بعد دس دن کی چھٹی ملی تھی اور وہ کیونکہ آٹھ دن پہلے آگیا تھا اس لیے چھٹی بڑھ کر پندرہ دن کی ہو گئی تھی۔ چند دن جم نے دوسرے معاملات نمٹانے میں گزارے تھے، اس دوران میں اس نے نینسی سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس لیے ایک صبح جب اس نے

اچانک ہی نینسی سے کہا۔

''آج شام کی فلائٹ سے ہم ساؤتھ کیرولینا جا رہے ہیں۔''

نینسی چونکی۔ ''تمہارے مام کے گھر؟''

جم نے سر ہلایا۔ ''یہ تمہارے لیے سرپرائز تھا اور ان کے لیے بھی سرپرائز ہوگا۔''

''تم نے اچھا نہیں کیا، ابھی مجھے جلدی میں تیاری کرنی پڑے گی۔''

''اس کی تم فکر مت کرو، کل جب تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں تو میں نے تمہارا اور اپنا سارا سامان سوٹ کیس میں پیک کر دیا ہے۔ اب ہمیں صرف سوٹ کیس لینا ہے۔ دروازے کو لاک کرنا ہے اور ائرپورٹ روانہ ہو جانا ہے۔''

شام کو ایسا ہی ہوا، سب تیار تھا۔ وہ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ جم خوش تھا لیکن نینسی اس سے زیادہ خوش تھی۔ اس کی عرصے سے خواہش تھی کہ اپنے سسرال والوں سے ملے۔ طیارہ دو گھنٹے بعد ساؤتھ کیرولینا کے دارالحکومت کولمبیا ائرپورٹ پر اترا اور یہاں سے جم کا آبائی گاؤں دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس نے ائرپورٹ سے ایک کار کرائے پر لے لی۔ وہ ایک ہفتے کے لیے آئے تھے اس لیے جم نے کار بھی ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لی جب وہ واپس جاتے تو کار واپس کر جاتے۔ گاؤں شہر سے دور ایک سرسبز اور شاداب علاقے میں تھا۔ نینسی نے ایسے مناظر کم ہی دیکھے تھے۔ وہ خود جس علاقے میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی وہاں دھول مٹی اور پتھر زیادہ نظر آتے تھے۔ اس لیے وہ بہت خوش تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ قصبے میں داخل ہوئے جہاں آغاز میں ہی جم کے باپ جیری کولمین کا خاندانی اسٹور تھا۔ وہ جم کو دیکھ کر خلافِ توقع بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بنا کسی شکوے شکایت کے جم کو گرم جوشی سے سینے سے لگایا پھر نینسی کو گلے سے لگا کر پیار کیا۔

''پہلے میں تم دونوں سے معذرت کر لوں کہ ہم جم کی شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ اس وقت ہمیں بہت غصہ تھا لیکن اب ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے غلطی کی ہے۔''

''جی، مام کی باتوں سے مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' نینسی نے کہا۔ ''لیکن جم سے اور مجھ سے بھی غلطی ہوئی، ہم چھوٹے ہیں اور ہمیں شادی کے بعد آپ کے پاس آنا چاہیے تھا۔''

جیری نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کا مطلب ہے ساس بہو کی آپس میں بات ہو چکی ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہی گھر چلتا ہوں۔''

جیری ملازموں کو ہدایت دے کر ان کے ساتھ آ گیا۔

راستے میں نینسی نے سرگوشی میں جم سے کہا۔ ''لگتا ہے مام پاپا کو بتائے بغیر ہی ہمارے گھر آئی تھیں۔''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' جم نے جوابی سرگوشی کی۔ ''مام بہت سارے کام پاپا کو بتائے بغیر خاموشی سے کر لیتی ہیں۔''

چند منٹ بعد وہ قصبے کے دوسرے کنارے پر واقع جم کے آبائی گھر پر تھے۔ یہ خوب صورت اور آسمانی رنگ کا دو منزلہ گھر تھا۔ جیری ان کو لے کر اندر کی طرف بڑھا اور اس نے باہر سے اپنی بیوی کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ''میرل کہاں ہو، دیکھو کون آیا ہے؟''

وہ دروازے کے پاس پہنچے تھے کہ وہ کھلا اور ایک سفید بالوں اور کسی قدر سخت چہرے والی عورت باہر آئی۔ مگر جم کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کی سختی نرمی میں بدل گئی اور اس نے ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ وہ اس کے گلے جا لگا۔ نینسی دم بہ خود عورت کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ وہ عورت تو نہیں تھی جو ساس بن کر اس کے گھر آئی تھی۔

☆☆☆

کیتھی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے پاپ کارن کھا رہی تھی۔ اس کا شوہر جوزف ایک ٹرک ڈرائیور تھا اور لمبے روٹس پر جاتا تھا۔ اس کا ٹرپ عام طور سے دس سے پندرہ دن کا ہوتا تھا [illegible] کل ہی روانہ ہوا تھا اور وہ آج [illegible] ابھی بیٹھی [illegible] وہ اٹھ کر دروازے [illegible] آئی۔ اس نے [illegible] سے باہر جھانکا۔ ایک بوڑھی عورت شانے پر ہینڈ کیری ٹانگے کھڑی تھی۔ کیتھی نے دروازہ کھولا تو اسے نیچے رکھا سوٹ کیس بھی دکھائی دیا تھا۔ بڑی بی اسے گھور رہی تھیں۔ کیتھی چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر ہچکچا کر کہا۔ ''میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''ہٹو اب تم مجھے کہاں پہچانو گی۔'' وہ اسے ایک طرف کرتے ہوئے اندر آگئیں اور سیدھی لاؤنج میں جا پہنچیں۔ کیتھی ان کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کون ہے؟

''میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

''میں جوزف کی ایک خالہ ہوں۔'' بڑی بی نے کہا اور دل میں سوچا۔ ہر بار ساس بننا بھی مناسب نہیں ہوتا ہے۔

نئی زندگی

کاشف زبیر

انسانی زندگی اچھے بُرے واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن کوئی واقعہ ایسا بھی ہوتا ہے جو انسانی زندگی کا رُخ ہی بدل دیتا ہے۔ یہ اُس ڈاکٹر کا قِصّہ ہے جو شادی سے بھاگتا تھا مگر ایک حادثے نے اُسے شادی کا قابل کر دیا۔

دس سال قبل پیش آنے والے ایک خطرناک حادثے کی رُوداد

۱۴ فروری ۱۹۸۸ء یہ جمعے کا ایک سرد اور سُرمئی دن تھا۔ صبح سے بادل آسمان پر ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ اڑتیس سالہ فزیشن ڈاکٹر ہوورڈ بالیک نے اپنا چھوٹا سا ہوائی جہاز اولڈ برج ائرپورٹ کے ایک گوشے میں کھڑا کیا اور باہر پارکنگ میں آیا۔ جہاں اس کا دوست بوب اپنی زرد سیڈان لیے اس کا منتظر تھا۔ دونوں مخصوص امریکی انداز میں ایک دوسرے سے ملے۔ پھر دونوں کار میں برسٹل روانہ ہو گئے۔ جہاں بوب کا گھر تھا۔

بوب اور ہوورڈ کا بچپن ایک ساتھ ہی نیویارک کی گلیوں میں گزرا تھا۔ پھر بوب نیویارک چھوڑ کر برسٹل میں آباد ہو گیا۔ مگر اس سے ان کی دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ دونوں باقاعدگی سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ڈاکٹر ہوورڈ بھی تقریباً تین گھنٹے کی طویل پرواز کے بعد محض بوب اور کیرن سے ملنے آیا تھا۔ ہوورڈ نیویارک میں بہ حیثیت گائناکولوجسٹ کے پریکٹس کرتا تھا۔ اپنی جاب سے ہٹ کر اسکائی ڈرائیونگ اور پرواز اس کے مشغلے تھے۔ اس

کے پاس پائلٹ لائسنس بھی تھا۔ نیویارک میں اس نے اپنی کار ایک پرائیویٹ ائرپورٹ ٹیٹربورو کے پارکنگ لاٹ میں چھوڑی تھی۔ وہاں سے اس نے ایک چھوٹا طیارہ کرائے پر لیا اور برسٹل آگیا۔

بوب کے گھر میں اس کے لیے ایک شاندار ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈنر کے دوران بوب اسے ایک حسین اور پُرجوش عورت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جو ہوورڈ کے لیے نہایت موزوں تھی۔ ہوورڈ جب بھی اس کے گھر آتا وہ کسی نہ کسی عورت کا تذکرہ نکال کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ ڈاکٹر اب شادی کر ہی لے۔

”یقین کرو بالیک‘ وہ تمہارے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ خدا کی خاص تخلیق۔“ بوب اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

”پھر تو اس کے لیے کوئی خاص آدمی ہی ہونا چاہیے۔“ ہوورڈ ہنسا ”بھلا مجھ جیسا عام آدمی اس کی نگاہوں میں کہاں سمائے گا۔“ اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”ایسا کرو‘ تم خود اس سے مل کر دیکھ لو۔“ کیرن نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ ہوورڈ نے ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا ورنہ اس کی ساری شام اسی موضوع میں کٹ جاتی۔

دراصل ڈاکٹر ہوورڈ بالیک ایک سیدھا شخص تھا۔ اور سیدھی سادی محبت پر یقین رکھتا تھا۔ لیکن ایک ناکام محبت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ دل ٹوٹنا اتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ اندازہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس بات نے اسے آئندہ کسی عورت کے قرب سے محروم رکھا۔ حالانکہ ایک گائناکولوجسٹ کی حیثیت سے اس کا واسطہ دن رات عورتوں سے پڑتا رہتا تھا۔ عورت اس کے نزدیک ایک پُراسرار چیز تھی۔ جسے حاصل کرنا دشوار تھا۔ مگر حاصل کر کے اپنے پاس رکھنا دشوار تر تھا۔

ڈنر کے بعد کیرن نے ان کے لیے جام بنائے۔ مگر ہوورڈ نے وہسکی کے بجائے محض سوڈے پر اکتفا کیا۔ کیونکہ اسے ابھی مزید تین گھنٹے کی پرواز کر کے واپس نیویارک جانا تھا۔ اور نشے کی حالت میں فلائنگ خطرناک ترین کام تھا۔ موت سے کھیلنے کے مترادف۔ وہ ہمیشہ پرواز سے پہلے الکوحل سے پرہیز کرتا تھا۔ اس کی یہ شام بے حد پُرلطف گزری تھی۔ کیرن نے نہایت لذیذ ڈنر تیار کیا تھا اور بوب نے اس کے لیے موزوں ترین شریکِ حیات تلاش کر لی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ناقابلِ فہم سی بے چینی۔ رات گیارہ بجے بوب نے ایک بار پھر اسے اولڈ برج ائرپورٹ پر چھوڑا۔ جہاں اس کا طیارہ کھڑا تھا۔ دونوں دوستوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

ہوورڈ کو بچپن سے مشکل اور مہم جویانہ کام پسند تھے۔ اس کے باپ کا گرین وچ کے دیہی علاقے میں ہارڈ ویئر اسٹور تھا۔ ہوورڈ نے وہاں گھڑسواری اور اسکیٹنگ جیسے مشکل کام نوعمری میں سیکھ لیے تھے۔ جوانی میں اسے اسکائی ڈائیونگ کا شوق چرایا۔ جو عام پیراٹروپنگ سے کہیں زیادہ خطرناک کام تھا۔ پھر طیاروں کی قربت نے اسے پرواز سیکھنے کی طرف مائل کیا۔ اس نے تین سال پہلے ہی اپنا فلائنگ لائسنس حاصل کیا تھا۔ اس کا اب تک کا کیریئر بے داغ تھا اور اس نے کبھی کسی حادثے کا منہ نہیں دیکھا۔

طیارہ پارکنگ میں گارڈ نے مسکرا کر اسے گڈ نائٹ کہا۔ اور اس کے جہاز کی چابی اس کے حوالے کر دی۔ ہوورڈ نے جہاز کا دروازہ کھولا اور پائلٹ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک MOONEY 201... سنگل انجن طیارہ تھا۔ اس میں چار مسافروں کی گنجائش کا کیبن جدید ترین ڈیزائن کا تھا۔ پائلٹ کے پیروں کے عین اوپر انسٹرومنٹ پینل تھا۔ مونی ایک مختصر‘ ہلکا‘ مگر بے حد جدید جہاز تھا۔ اس کا پیٹرول خرچ حیرت انگیز طور پر ایک مرسیڈیز کار سے بھی کم تھا۔ ہوورڈ کو یہ طیارہ اپنی اسپورٹس کار جیسی کارکردگی اور جدید ترین آلات کی وجہ سے بے حد پسند تھا۔ یہ آلات خراب ترین موسم میں بھی مکمل رہنمائی... فراہم کرتے تھے۔

تمام ضروری چیکنگ کے بعد ہوورڈ نے مونی کا انجن چلایا اور طیارے کو آہستگی سے ٹیکسی کرتا ہوا رن وے کی طرف بڑھا۔ اولڈ برج ائرپورٹ محض ایک رن وے تھا۔ یہاں کسی قسم کی ریڈار یا ریڈیو تنصیبات نہیں تھیں لہٰذا کسی گراؤنڈ کلیئرنس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رن وے پر آتے ہی ہوورڈ نے ایک بار انجن کو ریس دے کر بریک ریلیز کر دیے۔ طیارہ رن وے پر لپکا اور محض ایک منٹ بعد وہ فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ مونی ٹیک آف اور لینڈنگ کے لیے رن وے کا کفایت سے استعمال کرتا تھا۔

مونی بلند ہوتے ہوئے دبیز بادلوں کی تہ میں گھس گیا۔ اس روز موسم بے حد خراب تھا۔ زمین اور آسمان نظروں سے اوجھل تھے۔ لیکن ہوورڈ کو کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کے پاس رہنمائی کا جدید ترین نظام موجود تھا۔ پھر اسے زمینی کنٹرول کی خدمات بھی حاصل تھیں۔ فی الوقت اس نے اپنے آلات پر انحصار کرنے کا فیصلہ کیا اور ریڈیو کھول کر راستے کی تازہ ترین معلومات لینے لگا۔ یہ سن کر

اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی کہ موسم کی خرابی کے باعث ٹیٹر بورو ائرپورٹ عارضی طور پر بند کردیا گیا تھا مگر یہ بھی کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ ہوورڈ نے ٹیٹر بورو کے قریب میونسپل ائرپورٹ پر اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ائرپورٹ کے گراؤنڈ کلیئرنس سے اجازت لی اور طیارے کا رخ اس ائرپورٹ کی طرف کردیا۔ اس کے چاروں طرف دبیز تاریکی تھی۔ صرف انسٹرومنٹ پینل کی سرخ روشنی ننھے سے دیئے کی طرح تاریکی کے خلاف نبرد آزما تھی۔

○☆○

ٹراکون' ٹریفک کنٹرول سینٹر کا مختصر نام تھا۔ یہ پورے شمالی امریکا میں پرواز کرنے والے طیاروں کو رہنمائی فراہم کرتا تھا۔ چاہے وہ مسافر بردار ہوں یا نجی طیارے۔ علاقے کے کنٹرول سینٹر نے ہوورڈ کی درخواست پر اسے مذکورہ راستے کا موسمی ڈیٹا دیا۔ جس کے مطابق درجۂ حرارت چھتیس درجے فارن ہائیٹ تھا۔ ہوا شمال مشرق سے جنوب مشرق کی طرف بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ موسم ابر آلود تھا اور دھند چھائی ہوئی تھی۔ تیز بارش کا اسّی فی صد امکان تھا۔ مگر موتی کے آلات بتا رہے تھے کہ باہر کا درجۂ حرارت ستائیس درجے فارن ہائیٹ تھا اور ہوائی رفتار چوبیس میل فی گھنٹا تھی۔ مگر کاک پٹ خوش گوار حد تک گرم تھا۔ بارہ بج کر ستائیس منٹ ہو رہے تھے۔ ہوورڈ کو پرواز کیے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ وہ ائرپورٹس کلائیڈ پاتھ عبور کرچکا تھا۔ اس وقت ریڈیو سے ٹراکون کے کنٹرولر کی آواز ابھری۔

"مونی دو سو ایک' بلندی دو ہزار فٹ برقرار رکھو۔ تم ٹھیک دو بج کر تین منٹ پر میونسپل ائرپورٹ کے رن وے پر ہوگے۔ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے۔ اوور۔"

ہوورڈ نے ہدایات ذہن نشین کرلیں اور کچھ دیر بعد جواب دیا "بیاسی ایکو' راجر' اوور اینڈ آل۔"

یہ کہنا دشوار تھا کہ بعد میں کیا ہوا۔ ہوورڈ نے آلات کو صحیح نہیں پڑھا تھا۔ اس نے ٹراکون کے کنٹرولر کی ہدایات پر عمل کرنے میں تاخیر کی تھی یا وہ کسی وجہ سے بدحواس ہوگیا تھا اور بلندی پر اڑنے کی ہدایت فراموش کر بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت ایک سطح مرتفع پر سے گزر رہا تھا کہ اونچے درختوں کے سرے اس کے جہاز سے ٹکرا گئے۔ ممکنہ طور پر ہوورڈ نے آلات کے بجائے اپنے محسوسات پر بھروسا کیا تھا۔ جو ایسے خراب موسم اور رات کی تاریکی میں صرف بدترین غلطی کہلائے جانے کا... مستحق تھا۔ مونی کا انجن سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہا تھا۔ ہلکا پھلکا طیارہ درختوں سے ٹکراتے ہی بری طرح لڑکھڑایا۔ ہوورڈ نے خطرے کا احساس کرتے ہی اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر مونی بے قابو ہو چکا تھا۔ وہ زمین سے جا ٹکرایا۔ شاخیں اور جہاز کے پر ٹوٹنے کی آوازیں بے حد مہیب تھیں۔ خوش قسمتی سے جہاز قلابازیاں کھانے کے بجائے زمین پر گھسٹنے لگا۔ اس کے پہیے پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ رگڑ سے بازو اور ڈھانچا بھی ٹوٹنے پھوٹنے لگا۔ زخمی طیارہ درختوں اور جھاڑیوں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جہاں ایک وسیع اور خوف ناک دلدل اس کی منتظر تھی۔ مگر ان سب باتوں سے بے خبر ہوورڈ اس وقت ہوش گنوا بیٹھا۔ جب طیارہ زمین سے ٹکرایا تھا۔

○☆○

ہوورڈ کو یوں لگا جیسے وہ تاریکی کے سمندر سے دھیرے دھیرے ابھر رہا ہو۔ جیسے وہ گہری نیند سے بیدار ہو رہا ہو۔ اس کا ذہن شل تھا اور جسم بے جان ہو رہا تھا۔ اس کے اردگرد مکمل اور دبیز تاریکی تھی۔ کئی لمحے تو یہ سوچنے میں ہی گزر گئے کہ وہ کہاں تھا اور اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ معاً اسے یاد آگیا کہ مونی ہمواری سے اڑتے اڑتے یک دم پاگل سا ہوگیا تھا۔ اور زمین سے آ ٹکرایا تھا۔

"تو میں کریش ہوگیا۔" اس نے پوچھا "مگر میں زندہ کیسے ہوں اور ہوں بھی یا نہیں ہوں۔"

اس کی نگاہ اپنی گھڑی کے چمکتے ہوئے ڈائل پر پڑی۔ بارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ صرف آٹھ منٹ پہلے وہ ایسی صورتِ حال کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بڑی جلدی ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس کے جسم کے نازک حصوں کا شدید نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنا جسم ٹٹولنا شروع کیا۔ جو بظاہر صحیح سالم اور گرم لگ رہا تھا۔ لیکن کہیں گڑ بڑ ضرور تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا۔ مگر وہ گڑ بڑ کا مرکز بتانے سے قاصر تھا۔ وہ آہستگی سے آگے جھکا۔ اس کے سامنے سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ انسٹرومنٹ پینل سے ٹکرائے جو بے جان پڑا تھا۔ مگر اس میں موجود ایمرجنسی لائٹ کا بٹن کام کر رہا تھا۔ ہوورڈ نے اسے چھوا اور کیبن میں ٹک کی آواز کے ساتھ ہی ہلکی سی روشنی کا بلب جل اٹھا۔

روشنی ہوتے ہی جو منظر سامنے آیا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ طیارے کے سامنے کا حصہ مع ونڈ شیلڈ کے غائب تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انجن اور سامنے کے حصے کو کسی دیو قامت بلیڈ نے کاٹ کر رکھ دیا۔ اس حصے میں پائلٹ کی ٹانگیں بھی ہوتی ہیں "میرے پیر!" دہشت کی ایک سرد لہر ہوورڈ کے جسم میں اس خیال کے ساتھ دوڑ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ طیارے کا اگلا حصہ غائب تھا اور وہ بالکل کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ باہر سے آتی سرد ہوا اس کے پیروں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹنا چاہیں تو گرم درد کی لہر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے بلبلا کر اپنی کوشش ترک کر دی اور جھک کر ٹانگوں کا جائزہ لینا چاہا۔ مگر جو نظر آیا وہ خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پر گھٹنے سے نیچے ایک طویل زخم تھا جس سے پنڈلی کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ دایاں پیر بھی ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پیر ہلانے کی کوشش کی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔

جگہ جگہ سے ٹوٹے اور زخم خوردہ پیروں سے... خون بہہ رہا تھا۔ اور اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ پہلے بھی ایسے زخم دیکھ چکا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس رفتار سے خون بہتا رہا تو زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکے گا۔

"اوہ نہیں۔" وہ کراہا "میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔"

اس کا جہاز حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کا جسم شدید زخمی تھا اور وہ ایک نامعلوم جگہ بالکل تنہا تھا۔ اس احساس نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے چیخنے لگے۔ اس نے بمشکل اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔ اس نے خوف کو اپنے ذہن سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

"خود پر قابو رکھو" اس نے خود کو ہدایت دی۔ خوف زدہ ہونا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اس حادثے سے بچ نکلنے کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ پہلے اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا کہ مزید کتنا نقصان ہوا ہے۔ اس کے بازو اور شانے ٹھیک تھے ان پر کسی قسم کا زخم نہیں تھا۔ سینہ بھی محفوظ تھا اور گردن بھی۔ لیکن وہ صحیح طور سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ میرے چہرے کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اس نے سوچا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اپنا چہرہ ٹٹولنا شروع کیا۔ جب اس نے اپنی بائیں آنکھ کو چھوا تو دہشت کی لہریں اس کے اندر اٹھنے لگیں۔ اسے بائیں آنکھ کی جگہ پر گوشت کا ایک لوتھڑا سا محسوس ہوا۔ اس کی انگلیاں چپچپاتے سیال سے تر ہو گئیں۔

"اف میرے خدا' کیا میں اپنی آنکھ سے محروم ہو چکا ہوں۔" اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا "اب میں زندہ کیسے رہوں گا؟ اور اب میں کام کیسے کروں گا؟"

شدتِ کرب سے اس کی سالم آنکھ میں آنسو آ گئے۔

اس حادثے نے اس کے جسم کا ایک قیمتی حصہ چھین لیا تھا۔ وہ ایک نامعلوم مقام پر شکستہ وجود کے ساتھ ایک ٹوٹے ہوئے طیارے میں پڑا تھا اور شاید کوئی اس کے بارے میں جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور نہ ہی کوئی اس کے لیے فکر مند تھا۔ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اس کی گمشدگی کو محسوس کرتا اور اس کے لیے پریشان ہوتا۔ پہلی بار اسے شادی کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ اگر اس کی کوئی بیوی ہوتی تو وہ اس کے واپس نہ آنے سے پریشان اور فکر مند ہوتی اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتی۔ دوسروں سے تو اس کی توقع محال تھی۔ بدقسمتی سے وہ پرواز بھی ریڈار کی حد سے نیچے کر رہا تھا اور اس کا ریڈیو بھی بند تھا۔ لہٰذا فوری طور پر کسی کو اس کی گمشدگی کا احساس نہیں ہوا ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ سرے سے احساس ہو ہی نہیں۔ کیونکہ اس علاقے میں دن رات ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے بڑے طیارے اڑتے رہتے تھے اور گراؤنڈ کنٹرول کے لیے ان سب پر توجہ دینا تقریباً ناممکن تھا۔ جب تک کہ کسی جہاز کی طرف سے کوئی خاص متوجہ کرنے والی بات نہ ہو۔ مثلاً وہ اچانک ریڈار سے غائب ہو جائے یا اس کا ریڈیو کا رابطہ ختم ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ یہ مقولہ کم از کم ہوورڈ کے معاملے میں درست ثابت ہوا تھا۔ ابھی وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور پھوٹ جانے والی آنکھ کو ہی رو رہا تھا کہ ایک نئی مصیبت بارش کی صورت میں نازل ہو گئی۔ کب سے برسنے پر تلے

کھڑے بادل یک دم ہی برس پڑے تھے۔ یہ کوئی عام بارش نہیں تھی۔ بلکہ وسطی امریکا کی موسم سرما کی برسات تھی جو برف باری سے زیادہ خطرناک تصور کی جاتی ہے۔ نسبتاً اوٹ میں ہونے کے باوجود تیز بوچھار ہوورڈ کو بھگونے لگی۔ باوجود اس کے کہ وہ لیدر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ مگر اگلے ایک منٹ میں اس کی قمیص اور پینٹ اس طرح بھیگ گئیں جیسے وہ شاور کے نیچے بیٹھا ہو۔ برفانی بارش کے ساتھ یخ بستہ ہوائیں بھی چلنے لگیں۔

"میں کب تک اس سردی کو برداشت کرسکوں گا؟" اس نے سوچا کہ اگر وہ مزید اگلے ایک گھنٹے تک یونہی بھیگتا رہا تو اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ اہم بات یہ تھی کہ کیا کنٹرول سینٹر کو اس حادثے کی اطلاع مل گئی تھی؟ کیا امدادی پارٹی اس کی تلاش میں نکل چکی تھی اور کیا وہ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکے گی؟ پہلے دو سوالوں کا جواب تو آسان تھا۔ مگر تیسرا سوال؟ اس بارش زدہ اندھیری رات میں کیا اس کی تلاش ممکن تھی۔ جواب مایوس کن تھا۔ یہ کام بھوسے میں سوئی ڈھونڈ نکالنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ حادثے کے وقت وہ ہینوور کے علاقے پر پرواز کررہا تھا۔ حادثہ بارہ بج کر ستائیس منٹ سے چونتیس منٹ کے درمیان میں ہوا۔ ان آٹھ منٹوں میں موونی گیارہ بارہ میل کا فاصلہ طے کرسکتا تھا۔ گویا حادثے سے فوری باخبری کی صورت میں بھی امدادی پارٹیوں کو دس بارہ میل تک اس کے روٹ کو چھاننا پڑے گا۔ اور یہ بھی صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ آسمان صاف ہو۔ بادل اور دھند کی موجودگی میں دن میں بھی اس کی تلاش اتنی ہی مشکل تھی جتنی کہ رات کو ہوسکتی تھی۔

معاً ہوورڈ کو امدادی پارٹیوں کی رہنمائی کرنے والا آلہ ای ایل ٹی یاد آیا۔ یہ ایمرجنسی لوکیٹر ٹرانس میٹر ایک جدید ترین آلہ تھا۔ جو طیارے کو حادثہ پیش آتے ہی آن ہوکر مخصوص فریکوئنسی سگنل نشر کرنے لگتا تھا۔ امدادی پارٹیاں سیٹلائیٹ کی مدد سے اس آلے کے سگنل کو مخصوص ریسیور سے کیچ کرکے عین حادثے کے مقام تک پہنچ جاتی ہیں۔ ہوورڈ کے علم کے مطابق پورے امریکا میں امدادی سینٹرز میں اس ٹرانسمٹر کے ریسیور لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی کوئی سگنل ملنا شروع ہوتا۔ امدادی پارٹی بذریعہ ہیلی کاپٹر روانہ کردی جاتی۔ جو سینٹر کے دعوے کے مطابق زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں جائے حادثہ تک پہنچ جاتی۔ اگر آلے نے کام شروع کردیا تھا اور امدادی پارٹی روانہ ہوچکی تھی تو پھر اسے زیادہ عرصے انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

مگر آدھے گھنٹے بعد ای ایل ٹی پر اس کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ پارٹی اب تک کیوں نہیں آئی؟ اس نے بے چینی سے سوچا کہ کیا حادثے میں آلہ بھی تباہ ہوگیا ہے۔ یہ خیال اتنا خوف ناک تھا کہ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی رہی سہی امید بھی اب دم توڑنے لگی۔ بارش بغیر رکے پوری شدت سے جاری تھی۔ یخ بستہ پانی اور ہوائیں اسے رہ رہ کر لرزا رہی تھیں۔ حادثے کو تقریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا خون مسلسل بہہ رہا ہے۔

میں یہیں بیٹھا رہا تو سردی سے مرجاؤں گا۔ اس نے سوچا اور پچھلی نشست پر منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یوں وہ بارش اور ہوا سے کسی حد تک محفوظ ہوجاتا۔ عام حالات میں اس کام میں چند سیکنڈ لگتے۔ مگر اب جبکہ وہ شدید زخمی تھا اور حرکت کرنا بھی اس کے نزدیک چوٹی سر کرنے کے برابر تھا۔ پھر کیبن بھی حادثے کے بعد بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ یہ ٹوٹی پھوٹی اشیا جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ ان حالات میں اسے پچھلی نشستوں پر جانا جوئے شیر لانے کے مترادف لگ رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے آہستگی سے اپنے برابر میں کو پائلٹ کی نشست کو تہ کرنا شروع کردیا۔ اس کی کوشش تھی کہ سوائے اس کے ایک ہاتھ کے پورا جسم ساکت رہے۔ خاص طور سے زخمی پاؤں۔ جن میں ذرا سی جنبش کرنے سے اذیت کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ نشست تہ کرنے کے بعد اس نے آہستگی سے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی۔ پھر اس نے دانت بھینچے اور برابر والی جگہ پر آگیا۔ ٹانگیں جیسے ہی حرکت میں آئیں۔ اسے صحیح معنوں میں کرب و اذیت کا مفہوم سمجھ میں آگیا۔ اس پر قیامت سی گزر گئی۔ سخت ترین سردی کے باوجود اس کا جسم پسینہ اگل رہا تھا۔ عقبی نشست تک پہنچنے کے لیے اسے درد اور تکلیف کا ایک سمندر عبور کرنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ جیسے ہی وہ عقبی نشست پر دراز ہوا تاریکی اور تھکن نے اس پر حملہ کردیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔

اس نے ہوش میں آکر گھڑی دیکھی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ امدادی پارٹی کے کم از کم ای ایل ٹی کے سہارے اس تک آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ بارش رک گئی تھی۔ مگر آسمان پر ابھی بھی گہرے بادل تھے۔ ہوورڈ نے پاؤں کے زخم دیکھے۔ خون بہنے کی رفتار اب کم ہوگئی تھی مگر وہ مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس نے پچھلی نشست کے پیچھے پڑے کپڑے اٹھا کر اپنے پیروں پر لپیٹ لیے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس طرح خون بہتا رہا تو وہ شاید ہی زندہ بچ سکے۔

"اونہہ صرف دس منٹ۔۔۔" اس نے تلخی سے ای ایل ٹی ریسکیو سینٹر کا اشتہاری جملہ دہرایا۔ پھر وہ خوف سے بے اختیار چلّا اٹھا "تم لوگ کہاں ہو۔ آخر آتے کیوں نہیں ہو" اس کی آواز باہر درختوں میں سیٹیاں بجاتی ہوا نے نگل لی۔ ایک بار پھر شدید تنہائی کے احساس نے اسے نڈھال کردیا۔

ہوورڈ بالیک خطرات پسند شخص تھا۔ قدرت نے بھی ہر معاملے میں اسے دل کھول کر مواقع دیئے۔ گھڑ سواری، اسکیٹنگ اور اسکائی ڈائیونگ کے دوران وہ متعدد بار خطروں سے دو چار ہوا۔ مگر وہ ہر بار بچ نکلا۔ زمانہ طالب علمی میں اس نے کئی بار مضامین اور کالج بدلے۔ آخر کار اس نے میڈیکل کالج کا انتخاب کیا اور حیرت انگیز طور پر ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرلی۔ قدرت بھی اس پر خاصی مہربان رہی تھی۔ لیکن اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے قسمت اس سے روٹھ گئی ہے۔ وہ نارمل پرواز کے دوران ناقابلِ فہم حادثے کا شکار ہوا۔ اگرچہ وہ مرا نہیں۔ لیکن مرنے کے قریب ضرور تھا اور دور دور تک کسی قسم کی امداد کا امکان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کیا قدرت اسے ایک اور موقع دے گی۔ زندہ رہنے کا دوسرا موقع؟ یہ سوال رہ رہ کر اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

معاً اسے احساس ہوا۔ وہ مسلسل موت کے بارے میں سوچے جارہا تھا۔ وہ لرز گیا۔ کیا وہ اس حد تک ناامید ہوگیا تھا کہ موت کے بارے میں سنجیدہ ہورہا تھا؟ اس نے اپنی توجہ دوسرے موضوع کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی زندگی کے لیے شعوری طور پر سوچنا چاہتا تھا۔ تب اس کے ذہن میں وہ عورت آگئی۔ جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور بوب جس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

○☆○

بروس ڈی ایلیسٹو اپنی نوکری سے تھکا ہارا آکر بستر پر لیٹا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تکیہ کانوں پر رکھ کر کروٹ بدلی۔ مگر گھنٹی کی آواز کانوں میں گھسی جارہی تھی۔ ڈی ایلیسٹو مورس ٹاؤن کے میونسپل ائرپورٹ کا آپریٹر سپروائزر تھا۔ جب گھنٹی مسلسل بجتی رہی تو وہ بادلِ ناخواستہ اپنے گرم بستر سے نکل آیا۔

"ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ دوسری طرف اس کا ماتحت تھا۔ اس نے غرا کر پوچھا "رات کے اس پہر کس بات نے تمہیں فون کرنے پر مجبور کردیا۔"

"ٹراکون کے ریڈار کنٹرولر نے اطلاع دی ہے کہ ایک نجی طیارہ میونسپل ائرپورٹ کی طرف آرہا تھا کہ اچانک ریڈار پر سے غائب ہوگیا ہے۔"

"اس میں اتنی پریشانی کی کون سی بات ہے۔" ڈی ایلیسٹو کا موڈ بدستور خراب تھا۔ اکثر طیارے اس موسم میں اونچی پرواز سے گریز کرتے ہیں۔"

"اس طیارے کو رات دو بجے ائرپورٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔" نائب نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا "مگر وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا۔"

"پرواز کی منسوخی کی کوئی اطلاع؟" ڈی ایلیسٹو نے پُر تفکر لہجے میں پوچھا۔

"نیگیٹو۔" نائب نے کہا اور فون بند کردیا۔ ڈی ایلیسٹو نے ریسیور رکھا اور تیار ہونے کے لیے باتھ روم کی طرف بھاگا۔ وہ میونسپل ائرپورٹ پہنچا اور اس نے فون سنبھال لیا۔ پہلے اس نے ٹیٹر بورو ائرپورٹ پر پارکنگ میں کھڑی ڈاکٹر ہوورڈ کی کار چیک کروائی جو موجود تھی۔ پھر اس نے وہاں کی پولیس سے استدعا کی کہ وہ کار کے تالے توڑ کر اس کی تلاشی لیں اور اس میں موجود کاغذات سے ہوورڈ کا پتا نکال لیں۔ دس منٹ بعد پولیس مین نے اسے نیویارک میں ہوورڈ کے گھر کا پتا اور فون نمبر بتایا۔ ڈی ایلیسٹو نے اگلی کال اس نمبر پر کی۔ مگر وہاں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اس نے مقامی پولیس سے ڈاکٹر کے گھر جاکر اسے دیکھنے کی درخواست کی۔ پولیس گئی۔ مگر اس نے بتایا کہ ڈاکٹر ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔

"گویا ڈاکٹر کہیں کریش کرگیا ہے۔" اس نے فون رکھتے ہوئے خود سے کہا۔ اگلا رابطہ اس نے ٹراکون کے کنٹرولر سے کیا۔

"غائب ہونے والے طیارے نے آخری رابطہ کب کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"بارہ بج کر چھبیس منٹ پر۔" کنٹرولر نے جواب دیا۔

"کیا وہ ریڈار پر تھا؟"

"نہیں۔ وہ کم بلندی پر پرواز کررہا تھا۔ ہم نے اسے دو ہزار فٹ کی لیول فلائٹ کی ہدایت کی۔ مگر اس کے بعد اس نے رابطہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی وہ ریڈار پر آیا تھا۔"

ڈی ایلیسٹو نے پُرخیال انداز میں کہا "گویا ہم فرض کرسکتے ہیں کہ اس کے فوراً بعد ہی حادثہ ہوگیا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کس علاقے پر تھا؟"

"ہینوور پر۔" کنٹرولر نے جواب دیا۔ ڈی ایلیسٹو نے شکریہ ادا کرکے فون بند کردیا۔ اس نے دفتر کے دیوار گیر نقشے کا جائزہ لیا اور ہینوور سے قریب ترین امریکی ائر ڈیفنس کمانڈ

کے ای ایل ٹی سینٹر سے رابطہ کیا۔
"کیا تمہیں کہیں سے کوئی سگنل مل رہا ہے؟" اس نے سینئر آپریٹر سے دریافت کیا۔
جواب نفی میں تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر ہوورڈ کا جہاز حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ ای ایل ٹی سگنل نہ ملنے کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں یا تو جہاز میں یہ آلہ نصب ہی نہیں تھا یا پھر حادثہ اتنا شدید تھا کہ آلہ بھی تباہ ہوچکا تھا۔ اگر ٹرانس مٹر حادثے میں تباہ ہوا تھا تو پائلٹ کی سلامتی کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ بہرحال ڈی ایلیسٹو کو اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ اس نے کاؤنٹی پولیس آفس میں رابطہ کرکے ان سے ڈاکٹر ہوورڈ کے جہاز کو تلاش کرنے کی درخواست کی۔ اگرچہ موسم اس قسم کی تلاش کے لیے سخت ناموزوں تھا۔

○☆○

ایک ڈاکٹر اور اسپورٹس مین کی حیثیت سے ہوورڈ اس امر سے نفرت کرتا تھا کہ حالات اس کی گرفت سے باہر ہوجائیں۔ وہ مکمل کنٹرول کا حامی تھا۔ مگر قدرت نے اسے اس ویرانے میں لا پھینکا تھا۔ جہاں وہ درد اور کرب کے سارے زخموں سے چُور جسم کے ساتھ خود کو خوف ناک حد تک تنہا اور حالات کو قابو سے باہر محسوس کررہا تھا۔ ماحول اس کے لیے مکمل طور پر اجنبی تھا۔ ٹانگوں میں اس قدر درد تھا کہ وہ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ اسے اس درد سے نفرت ہونے لگی تھی۔ مگر ایک فزیشن ہونے کے ناتے وہ جانتا تھا کہ یہ درد اس کے لیے ضروری تھا۔ یہ اسے ہوش میں رکھے ہوئے تھا۔ ورنہ وہ مارے نقاہت کے بے ہوش ہوجاتا اور ممکن تھا کہ خون کی کمی اُسے کوما میں لے جاتی۔ یہ درد اس بات کی نشانی بھی تھا کہ اس کی ٹانگوں میں خون کی گردش جاری تھی۔ وگرنہ اس کی ٹانگیں گینگرین کا شکار ہوکر بے حس ہونے لگتیں۔ اور یہ ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ سوالوں نے اسے پھر سے مضطرب کرنا شروع کردیا تھا۔ مثلاً۔
وہ اپنا کتنا خون ضائع کرچکا تھا؟
کیا وہ پھر اپنی ٹانگوں پر چل سکے گا؟
اور کیا اس کی بائیں آنکھ پھر سے دیکھنے کے قابل ہوگی؟
وغیرہ وغیرہ۔
اس کی خود تجزیے کی صلاحیت بحال تھی اور اس کا ذہن صحیح طور پر کام کررہا تھا۔ مگر یہ تجزیہ اسے خوف زدہ کررہا تھا۔ خاص طور سے وہ اپنی آنکھ کے بارے میں سخت فکر مند تھا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ گویا

☆ حقیقی واقعہ ☆

بھارت کے ایک اسپتال میں ڈاکٹروں نے ایک سپاہی کے جسم سے آپریشن کے ذریعے گرینیڈ نکال لیا یہ گرینیڈ سپاہی کے جسم کے اندر تک چلا گیا تھا لیکن پھٹا نہیں تھا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن سے قبل بم ڈسپوزل اسکواڈ کو طلب کرلیا اور انتہائی کامیاب آپریشن کے بعد بم نکال لیا۔ یہ بم ایک ٹینک کو اڑانے کی طاقت رکھتا تھا۔

☆☆☆

حادثے کو تقریباً ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا اور وہ یہیں پڑے پڑے ایک اذیت ناک موت مرجائے گا۔ یہ سوچ کر ہی وہ لرز اٹھا۔
"کاش میرے پاس کوئی خود کو تباہ کرنے والا بٹن ہوتا۔ تو میں اس سسکتی موت کے مقابلے میں اسے دبانے کو ترجیح دیتا۔"
یہ مایوسی کی انتہا تھی کہ وہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہوورڈ بہت پُرامید شخص تھا۔ یہ چیز اسے اپنے باپ سے ملی تھی۔ اس نے ایک بار ہوورڈ کو کہا "بیٹے، حالات سے کبھی ہارمت مانو۔ مجھے زندگی میں کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ میں متوقع چیلنج سے نہیں نمٹ سکوں گا۔ مگر پھر میں ڈٹا رہا اور مسائل ریت کی دیوار کی طرح گر گئے۔ حالات سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ان کے سامنے ڈٹے رہو۔ اکثر کم ہمت افراد وہاں حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ جہاں کامیابی ان سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہی تھی۔
ہوورڈ جیسے ایک جھٹکے سے بیدار ہوگیا۔ باپ کی بات یاد آتے ہی اس کے اندر کی مایوسی چھٹنے لگی۔ مصیبت سے زیادہ خوف ناک بات یہ تھی کہ آپ عین مصیبت سے چھٹکارے کے قریب پہنچ کر ہمت ہار دیں۔ وہ ان وجوہات کے بارے میں سوچنے لگا۔ جن کی وجہ سے اب تک امدادی پارٹی نہیں آئی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کے ای ایل ٹی نے کام نہیں کیا تھا۔ وہ تباہ ہوگیا تھا لیکن حادثے کی اطلاع یقیناً متعلقہ اداروں کو مل چکی تھی۔ ان کے لیے حادثے کے مفروضہ مقام کا پتا چلانا بھی مشکل نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں سب سے بڑی رکاوٹ خراب موسم اور دھند تھی۔ اتنی گہری تھی کہ اس فضا میں کسی قسم کی تلاش بھی ممکن

نہیں تھی۔ تاریکی کے باعث ہوورڈ یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ وہ کہاں کریش ہوا تھا۔ مگر یہ کوئی آباد علاقہ نہیں تھا۔ ہینوور کاؤنٹی میں ایسے جنگلی علاقے جابجا موجود تھے۔ مگر یہ جانوروں کے لیے مخصوص علاقہ نہیں تھا کیونکہ اتنی دیر میں ہوورڈ کو سوائے کچھ پرندوں کے کسی جانور کی آواز نہیں آئی تھی۔ ممکن ہے بارش اور سردی کی وجہ سے جانور اپنے مسکنوں میں دبکے ہوئے ہوں یا کسی اور وجہ سے اس علاقے میں نہیں آتے ہوں۔ پھر اس کے ذہن میں ایک سوال ابھر آیا۔ کسی علاقے کو شناخت کرنے کے لیے آنکھوں کے علاوہ اور کون سے ذرائع ہوسکتے ہیں۔ اس نے ارضیات کے بارے میں ایک رسالے میں پڑھا تھا کہ علاقے کو شناخت کرنے میں اہم کردار اس کی خصوصیات کا ہوتا ہے۔ وہاں کی آب وہوا، وہاں کی مہک اور وہاں کی نمی بتاتی ہے کہ یہ کون سا خطّہ ہے۔ ہوورڈ نے پہلی بار اپنی ناک پر زور دیا۔ اسے عجیب سی بو آئی، جیسے مٹی کے سڑنے اور لکڑی کے گلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی بو عموماً دلدلی علاقوں میں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا جہاز ہینوور کے کسی دلدلی علاقے میں گرا تھا۔

○☆○

تین بج کر پینتالیس منٹ پر ڈی ایلیسٹو کو اطلاع ملی کہ ہینوور پولیس نے ایک امدادی اور تلاش کی پارٹی تشکیل دی تھی۔ جو ہیلی کاپٹر کی مدد سے غائب جہاز کو تلاش کرتی ہے۔ فی الوقت انہوں نے ہینوور کاؤنٹی کا وہ علاقہ چھاننے کا فیصلہ کیا۔ جہاں پرواز کرتے ہوئے ڈاکٹر ہوورڈ نے آخری بار ٹراکون سے رابطہ کیا تھا۔ علاقے پر سے بادل چھٹ رہے تھے۔ لیکن موسم ہنوز بے حد خراب تھا۔ دھند کی وجہ سے زمین نگاہوں سے اوجھل تھی۔ تلاش ابھی بھی ممکن نہیں تھی۔

○☆○

صبح چھ بج کر پینتالیس منٹ پر دھند اتنی کم ہوگئی تھی کہ ہوورڈ اپنے اردگرد کا جائزہ اپنی اکلوتی سلامت آنکھ کی مدد سے لینے لگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ ایک غیر آباد جنگل تھا اور وہ ایک دلدل کے عین کنارے پر پڑا تھا۔ ممکن تھا کہ جہاز اگر تھوڑا سا آگے چلا جاتا تو وہ گزوں گہری دلدل میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوچکا ہوتا۔ اس نے قدرے اچک کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ تباہ شدہ جہاز کو چاروں طرف سے دلدل نے گھیر رکھا تھا۔ اگر امدادی پارٹی اسے تلاش کر بھی لیتی تو اس تک پہنچنا ہی ایک مسئلہ بن جاتا۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔" وہ بڑبڑایا "میں شاید اب نہ بچ سکوں۔"

گزشتہ چھ گھنٹوں میں اس کے جسم کا بیشتر خون بہہ چکا تھا اور اب زندگی خاتمے کے قریب محسوس ہورہی تھی۔ ہوورڈ نے آسمان کی طرف دیکھا جس پر سورج کی زرد کرنیں اجالا کررہی تھیں۔ دھند بھی چھٹ رہی تھی۔ اچانک ہوورڈ کو اپنا ذہن تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔

○☆○

سات بج کر دس منٹ ہوچکے تھے۔ ڈی ایلیسٹو اور تلاش کی پارٹی کے ارکان ابھی تک موسم کے صاف ہونے کے منتظر تھے۔ امدادی پارٹی دو پٹرول کاروں اور ایک ہیلی کاپٹر پر مشتمل تھی۔ پٹرول کاروں پر پولیس آفیسرز جیمس سوناگھان اور سارجنٹ تھوس سوارٹرز کے علاوہ اسپیشل پولیس کارکن والٹر فرانسس بھی تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی کاروں کے ریڈیو، کاپٹر کے ریڈیو کی فریکوئنسی سے ملائے اور ہینوور سے باہر جانے والی شاہراہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

خوش قسمتی سے نو بجے تک موسم اتنا صاف ہوگیا کہ ہیلی کاپٹر کی پرواز ممکن ہوسکے۔ فلائنگ سارجنٹ روبرٹ ڈیفس نے کاپٹر کا انجن چلایا اور تھروٹل کھینچ کر اسے فضا میں بلند کیا۔ دس منٹ بعد وہ تلاش کے لیے مخصوص علاقے پر پرواز کررہا تھا۔ نیچے تین پٹرول کاریں متوازی سڑکوں پر محوسفر تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا کام آسان نہیں تھا۔ یہ خطّہ جنگلوں اور دلدلوں سے پُر تھا۔ اور یہاں فضا سے تلاش ایک دشوار کام تھا۔ جب تک کہ قسمت ساتھ نہ ہو اس قسم کی تلاش ممکن نہیں ہوتی ہے۔ معاً جیمس اور تھوس کی کاروں کے ریڈیو جاگ اٹھے۔

"میرا خیال ہے۔ میں نے طیارہ تلاش کرلیا ہے۔" ریڈیو سے پائلٹ روبرٹ کی آواز ابھری "میں اس کے عین اوپر پرواز کررہا ہوں اوور۔"

"لوکیشن بتاؤ۔" جیمس نے کہا۔

جائے وقوع سے آگاہ ہوتے ہی دونوں نے اپنی کاروں کے فلیش آن کیے اور پوری رفتار سے روانہ ہوگئے۔ روبرٹ برابر ریڈیو پر ان کی رہنمائی کررہا تھا۔ کچھ دور آگے جا کر کچا راستہ شروع ہوگیا۔ جو ناہموار اور کیچڑ زدہ تھا۔ کاریں بار بار بے قابو ہورہی تھیں۔ جیمس اور تھوس کے لیے انہیں سنبھالنا دشوار ہوتا جارہا تھا۔

"ہے۔" اچانک روبرٹ کی آواز آئی "طیارے میں کوئی موجود ہے اور وہ زندہ ہے۔"

یہ سنتے ہی جیمس نے ایکسیلیٹر آخری حد تک دبادیا۔ معاً ہی راستہ ایک دلدل پر ختم ہوگیا۔ انہوں نے بمشکل بریک

لگا کر کاروں کو روکا۔ اسی لمحے پٹرول مین والٹر کی کار بھی وہاں پہنچ گئی۔ انہوں نے کچھ دور فضا میں معلق ہیلی کاپٹر کو دیکھ لیا۔ اس کے عین نیچے انہیں طیارے کا ڈھانچا جھاڑیوں میں پڑا نظر آیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہاں تک جاتے کیسے۔ ہر طرف دلدل تھی اور اس پر بھی گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ یخ بستہ پانی۔ تقریباً سو گز بعد کہیں زمین نظر آرہی تھی۔ دلدل کا خطرہ الگ تھا ایک غلط قدم خود انہیں مشکلات میں ڈال دیتا اور خود انہیں جان کے لالے پڑ جاتے۔

مگر ایک زخمی شخص ان کی مدد کا منتظر تھا۔ انہوں نے کار سے رسّی نکال کر ایک دوسرے کو تھمائی اور آگے پیچھے دلدل کے یخ پانی میں گھس گئے۔

"اف میرے خدا۔" جیمس کراہا "ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے پیروں کو چاقو سے کاٹا جا رہا ہے۔"

"اور میرے بھی۔" تھوس نے لقمہ دیا۔ اسی لمحے ان کے بوجھ سے کیچڑ اور برف کی ملی جلی تہ ٹوٹ گئی۔ وہ اب سینے تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد تھوس کا پیر کسی چیز میں پھنس گیا۔ وہ تکلیف سے چلا اٹھا۔

"جمی، میں حرکت نہیں کرسکتا۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا "تم جاؤ۔ میں اپنا ٹخنا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کہیں یہ دلدل تو نہیں ہے؟" جیمس نے پُر تشویش انداز میں کہا۔

"نہیں۔" تھوس پاؤں چھڑانے کی جدوجہد کرتے ہوئے بولا "یہ کوئی منحوس بیل ہے۔"

بادلِ ناخواستہ والٹر اور جیمس اسے چھوڑ کر آگے بڑھے۔ دلدل کی نرم تہ پر قدم پڑتے ہی وہ دھنسنے لگتے۔ مگر پانی انہیں بچا لیتا۔ آخر کار وہ تقریباً تیرتے ہوئے جہاز تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ جسے اب جہاز کی باقیات ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس کے اتنی بری طرح پرخچے اڑے تھے کہ پائلٹ کی سلامتی کا یقین نہیں آتا تھا۔ مگر وہ پچھلی نشست پر موجود تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے شکستہ تھا اور چہرہ کسی خوف ناک فلم کے کردار جیسا ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اس کا بایاں پاؤں خوف ناک حد تک زخمی نظر آرہا تھا۔ مگر وہ ہوش میں تھا۔ بھیگے ہوئے اور سردی سے تھرتھر کانپتے پولیس والوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولا "میں خاصا خوف ناک نظر آرہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر بے ہوش ہوگیا۔ جیمس طیارے کے کاک پٹ میں گھس کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ جبکہ والٹر ایک سرد آہ بھر کر واپس کار کی طرف چل دیا۔ پانی میں شرابور وہ کار تک پہنچا اور ریڈیو پر ایمبولینس اور ڈاکٹر کے لیے کال کی۔ اسی اثنا میں تھوس بھی اپنا ٹخنا چھڑا کر جیمس کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ وہ دونوں ہوورڈ کو ہوش میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اس کا اتنا خون بہہ چکا تھا کہ زندہ رہنے کے لیے اس کا ہوش میں رہنا ضروری تھا۔ مگر انہیں شبہ تھا کہ وہ زندہ بچ جائے گا۔ حادثے کے ٹھیک ساڑھے نو گھنٹے بعد ایمبولینس وہاں پہنچ گئی۔ ہوورڈ بالیک ابھی بھی ہوش میں تھا۔

○☆○

دس بج کر پچیس منٹ پر ہوورڈ نیو جرسی کے یونیورسٹی کے ٹراما سینٹر ہاسپٹل میں تھا۔ ہاسپٹل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر کلٹن گرفن نے اپنے مریض کا معائنہ کیا اور وہ بہت تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کے خون کا گروپ معلوم کرکے اسے خون اور پلازما دیا جا رہا تھا۔ زیادہ خراب حالت اس کی بائیں ٹانگ کی تھی۔ جس میں انفکشن کے آثار نمایاں تھے۔ خون کی کمی کے باعث اس کا بلڈ پریشر صرف ۴۰/۹۰ رہ گیا تھا جو نارمل سے انتہائی کم تھا۔ اس کا درجۂ حرارت بھی چھیانوے درجے سے کم ہوگیا تھا۔ اسے فوری طور پر ایمرجنسی آپریشن روم لے جایا گیا۔ اس وقت ہوورڈ کے بچنے کے امکانات چالیس فی صد سے بھی کم تھے۔ مگر اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے حیرت انگیز طور پر صحت یابی حاصل کی۔ اس کے جسم نے تیزی سے خون قبول کیا اور کومے کے خطرے سے نکل آیا۔

اس کے بعد سرجنوں کی ایک ٹیم نے چھ گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑ دیں اور زخم سی دیے۔ اس کی بائیں آنکھ بھی محفوظ تھی اور اس نے جس گوشت کے لوتھڑے کو اپنی آنکھ پر محسوس کیا تھا۔ وہ دراصل حادثے کے بعد اس کے ماتھے سے الگ ہو کر آنکھ پر چپک گیا تھا۔

اس شام اسے انتہائی نگہداشت کے یونٹ سے عام دیکھ بھال کے یونٹ میں منتقل کردیا گیا۔ دو ہفتے بعد اسے ہاسپٹل سے فارغ کردیا گیا۔ اس افسوس ناک حادثے کا منفی اثر یہ پڑا کہ ڈاکٹروں نے اسے اسکائی ڈائیونگ کے لیے ان فٹ قرار دے دیا۔ مگر اسے فلائنگ کی اجازت دے دی۔ امریکن ایوی ایشن ایسوسی ایشن نے بھی اس کا لائسنس منسوخ کرنے کے بجائے محض تنبیہہ پر اکتفا کیا۔ ڈاکٹر ہوورڈ بالیک آج کل خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اب تنہا نہیں رہا ایک حسین و جمیل خاتون اس کی شریکِ حیات بن گئی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ وہی خاتون ہیں۔ جس کا ذکر بوب نے حادثے کی رات ڈاکٹر ہوورڈ سے کیا تھا۔

جہنم کے درمیان

کاشف زبیر

آتش فشاں کا اثر میلوں دور تک محسوس کیا جاتا ہے، اس کی حدت جہنم کی یاد دلاتی ہے، اسی آتش فشاں میں گزارے گئے چند گھنٹوں کا پر ہمت ماجرا۔

عزم انسانی جس کے سامنے آتش فشانی نے شکست تسلیم کرلی

گزشتہ ایک ہفتے سے مسلسل بارش جاری تھی۔ ہوائی کے والکانوز نیشنل پارک میں ہالی وڈ سے آیا ہوا فلمی وفد بے صبری سے انتظار کررہا تھا کہ کب بارش رکے اور وہ فلم شوٹ کرسکیں۔ ہفتے کی صبح بالآخر ان کا صبر جواب دے گیا اور مائیکل بینسن نے اعلان کیا ''اب ہمیں جانا ہوگا' تیار ہوجاؤ دوستو۔''

انچاس سالہ بینسن سلور نامی اس فلم کے پس منظر پر کام کررہا تھا جو ایک آتش فشاں کے اردگرد گھومتی تھی۔ فلم کی شوٹنگ کے لیے اس کے ساتھ اکتیس سالہ کیمرا مین کرس بڈی اور ہیلی کاپٹر پائلٹ چونتیس سالہ کریگ ہوسکنگ تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس زندہ آتش فشاں پر نیچی پرواز کرکے ایک خصوصی کیمرے سے آتش فشاں کے فرش کی منظر کشی کرنی تھی کیونکہ عام کیمرے کے لینس ہزاروں ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم لاوے کی صحیح تصویر کشی نہیں کرسکتے کیونکہ اس درجہ گرم لاوے سے تیز روشنی کے علاوہ انفرا ریڈ شعاعیں بھی خارج ہوتی ہیں۔

آتش فشاں کے طور پر ہوائی کے مشہور آتش فشاں پواورینٹ آف کلائیو (PU'UOORENT OF KILEAVE)

سے تھا۔ اسے دنیا کا متحرک ترین زندہ آتش فشاں کہا جاتا ہے' گزشتہ دس برسوں میں اس کے بہتے لاوے نے متعدد گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے اور سمندر میں گر کر منجمد ہونے سے اس لاوے نے سیکڑوں ایکڑز زمین تشکیل دی تھی۔
قارئین کی دلچسپی کے لیے امریکا کی باونویں ریاست ہوائی بحرالکاہل میں خط استوا کے نزدیک واقع ہے' ہوائی کے جزائر کسی براعظم کا حصہ نہیں ہیں۔ بلکہ بحرالکاہل میں زیرآب سرگرم آتش فشاؤں کی وجہ سے یہ جزائر وجود میں آئے۔ ان کی زمین گرم لاوے سے تشکیل پاتی ہے جو زمین سے نکل کر جم گیا۔ مسلسل آتش فشانی کی وجہ سے آتش فشاں پہاڑ بلند ہوتے چلے گئے اور یوں جزائر سمندر سے نکل آئے۔ ہوائی میں بے شمار جزائر ہیں لیکن ان میں چند ایک ہی آباد ہیں۔ ہنولولو اس کا دارالحکومت ہے۔

کلائیو کا جزیرہ نسبتاً شمال میں ہے اور اس پر کئی سرگرم آتش فشاں پائے جاتے ہیں جن میں پو' اور رینٹ سب سے بڑا ہے۔ ایک عشرے میں اس کا دہانہ فٹ بال کے تین میدانوں سے زیادہ وسعت اختیار کر گیا۔ اس کا اندرونی حصہ پیلے پگھلے ہوئے لاوے کی ایک جھیل پر مشتمل ہے۔ جس کا درجۂ حرارت کئی ہزار ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ ہے اور بینسن کو اسی جھیل کی منظر کشی کرنا تھی۔ جب 12 نومبر 1992ء کے روز اس نے آتش فشاں کی فلم بندی کا فیصلہ کیا تو اس سے پہلے اپنا اور اپنی ٹیم کا انشورنس کرانے کا فیصلہ کیا' یہ مہم خطرناک تھی۔

یہی نہیں بلکہ اپنی شوٹنگ کو محفوظ بنانے کے لیے بینسن نے کچھ مقامی رواجوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا' ہوائی کے مقامی باشندے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ آتش فشاں دیوی مادامے پیلے کا گھر ہے' لاوے کی طرح پیلی آنکھوں اور آتش فشاں کے دہانے سے نکلنے والے سیاہ دھویں کی طرح بالوں والی مادامے پیلے شراب کی شوقین تھی۔ مادامے پیلے کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے شراب کی بھینٹ دی جائے۔ لہٰذا بینسن نے اپنے ساتھ جن کی ایک بوتل لے لی تھی تاکہ اسے آتش فشاں کے دہانے میں پھینکا جاسکے اسے یقین تھا کہ اس طرح مادامے خوش ہوگی اور اسے شوٹنگ کے لیے سازگار ماحول مل سکے گا۔ کیونکہ اس آتش فشاں کے دہانے سے بیشتر وقت سیاہ دھواں خارج ہوتا رہتا ہے۔ اس زہریلے دھویں کی وجہ سے آتش فشاں کے اوپر پرواز کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

12 نومبر کی صبح بینسن اور اس کے ساتھی ہوٹل سے اس ایرکلب کی طرف روانہ ہوئے جہاں ان کا مخصوص ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ بارش ہلکی ضرور ہوئی تھی لیکن اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ بینسن نے ہوٹل کی کار ہیلی کاپٹر کے پاس رکوائی تھی' کار رکتے ہی بینسن اور بڈی اپنی برساتی کو سر پر کرتے ہوئے جھک کر ہیلی کاپٹر میں چلے گئے جب کہ پائلٹ ہوسکنگ نے ایرکلب کے گراؤنڈ اسٹاف سے بات کرنے کے لیے ایرکلب کی عمارت کا رخ کیا۔ وہ پندرہ منٹ بعد واپس آیا۔

''فیول پورا ہے لیکن ایرکلب کے کنٹرولر نے اس موسم میں پرواز نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔''

''ہمیں صرف چند منٹ کے لیے اچھے موسم کی ضرورت ہے۔'' بینسن نے کوٹ کی جیب میں رکھی جن کی بوتل تھپتھپائی۔ ''ممکن ہے مادامے پیلے اس سے خوش ہوکر ہمارے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوجائے۔''

بڈی نے تعجب سے بینسن کی طرف دیکھا ''میں نے کبھی تمہیں اس قسم کی حرکتیں کرتے نہیں دیکھا۔''

بینسن نے قہقہہ لگایا ''میں نے بھی کبھی اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے...... لیکن کیا کیا جاسکتا ہے' ممکن ہے یہ جن کی بوتل کام کر جائے دیکھو اگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو نقصان بھی نہیں ہوگا لیکن ممکن ہے میں یہ کام نہیں کرتا تو مجھے فائدہ نہ ہو۔''

''تمہاری مرضی۔'' بڈی نے شانے اچکائے۔

ہوسکنگ نے ہیلی کاپٹر کا انجن چلایا۔ تیز ہوتی بارش میں ہیلی کاپٹر بلند ہوا اور اس کا رخ پو اور رینٹ کی طرف تھا۔ بارش کی وجہ سے ماحول دھندلا ہو رہا تھا' دو فٹ سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جب ہوسکنگ نے ہیلی کاپٹر بلند کیا تو دھند کم ہوگئی تھی' گہرے نیلے سمندر کے اوپر پو اور رینٹ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے دہانے سے خارج ہوتا سیاہ اور گاڑھا دھواں دھمکی دیتا دیو لگ رہا تھا۔ آتش فشاں کے دہانے کے آس پاس کا ماحول کسی قدر صاف تھا اور وہاں بادل نہیں تھے ویسے بھی دہانہ سطح سمندر سے کوئی چار ہزار فٹ بلند تھا۔ دہانے کے اردگرد کا سارا علاقہ اور ڈھلان کا اوپری حصہ یوں سفید ہو رہا تھا جیسے اس پر برف پڑی ہو۔ حالانکہ اس علاقے میں کبھی برف نہیں پڑتی۔ خط استوا سے نزدیکی کی وجہ سے چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر بھی برف نہیں پڑ سکتی۔ یہ دراصل آتش فشاں سے برآمد ہونے والی راکھ تھی جس نے اردگرد ہر شے پر قبضہ کرلیا تھا۔ بعض مقامات پر راکھ گزوں کے حساب سے پڑی تھی۔

''پہلے آتش فشاں کے اوپر ایک چکر لگاؤ۔'' بینسن نے

جن کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

ہوسکنگ نے چکر لگایا' جیسے ہی ہیلی کاپٹر دہانے کے اوپر سے گزرا بینسن نے کھڑکی سے شراب کی بوتل باہر اچھال دی۔ بڈی کیمرا سنبھالے منتظر تھا لیکن ایک لمحے کی تاخیر سے اس بوتل کے دہانے میں گرنے کا منظر شوٹ کرنے سے گنوادیا' ہوسکنگ دیکھ رہا تھا شراب کی بوتل پیلے کھولتے لاوے میں گری اور لمحے سے بھی پہلے پگھل کر غائب ہوگئی۔

بہر حال یہ ایک رسم تھی جس کا اصل شوٹنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اب بڈی کیمرا سنبھالے اصل منظر پکچرائز کرنے کے لیے تیار تھا۔ ہوسکنگ اب ہیلی کاپٹر کو دہانے کی دیواروں سے نیچے لا رہا تھا۔ یہ دیواریں کالڈیرا کہلاتی ہیں اور آتش فشاں کا یہ سب سے خطرناک حصہ ہیں خاص طور سے جب وہ سمندر کے کنارے ہوں۔ کیونکہ یہی گر کر بڑے پیمانے پر تباہی کا باعث بنتی ہیں ان کی گرد سے اردگرد کی آبادیاں مٹ جاتی ہیں اگر یہ دیواریں ٹوٹ کر سمندر میں جاگریں تو سمندر میں تباہ کن اونچی لہر پیدا ہوتی ہے یہ لہر آس پاس کے جزائر اور زمینوں پر دوڑتی ہے۔ آج سے کوئی سوا سو سال پہلے ایک آتش فشاں کالڈیرا پھٹا تھا اور اس کی کوئی تین میل بلند دیواریں سمندر میں جاگری تھیں جس سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ اونچی لہر پیدا ہوئی جس نے اردگرد کے بے شمار جزائر کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا تھا اس لہر نے کئی ہزار میل دور تک بندرگاہوں اور ساحلی آبادیوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ ان کالڈیرا کے بعض حصے آتش فشاں میں گر جاتے ہیں۔ کیونکہ مستقل ہلکے زلزلوں سے یہ دیواریں کمزور ہوتی رہتی ہیں۔ حصے گرنے سے لاوے کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔ اندر ہی اندر دباؤ بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ آتش فشاں بھیانک طاقت سے پھٹتا ہے۔

پواورینٹ کی کالڈیرا کی حالت بتاتی تھی کہ اس کا اکثر حصہ آتش فشاں میں گر چکا ہے اور اب آتش فشاں ایسا بم بن گیا تھا جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ دیواروں سے گرمی کے باعث موت کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور اندرونی فضا سخت گرم تھی۔ اس کا اثر وہ ہیلی کاپٹر کے بند ایئر کنڈیشنر کاک پٹ میں بھی محسوس کر رہے تھے۔ بڈی اس سے پہلے بھی کئی آتش فشاں پر کیمرا آپریٹ کر چکا تھا لیکن اس بار وہ خوف محسوس کر رہا تھا۔ پواورینٹ جیسے اسے دھمکا رہا تھا کہ میرے نزدیک مت آنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ دوسری طرف بینسن ہوسکنگ کو ہدایت دے رہا تھا کہ وہ دہانے میں زیادہ سے زیادہ نیچے جائے۔

''اور نیچے...... ممکن حد تک نزدیک ہوجاؤ۔'' بینسن چلّا رہا تھا۔

بڈی نے کیمرا سنبھالا اور آتش فشاں کے فرش کی فلم بندی کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ہوسکنگ نے ہیلی کاپٹر اوپر اٹھالیا تھا لیکن بینسن اس شاٹ سے مطمئن نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ہوسکنگ سے کہا ''ممکن ہے بڈی نے اچھا منظر فلم بند کیا ہو...... لیکن ایک چکر اور لگالینا بہتر ہوگا۔''

درحقیقت ہوسکنگ بھی خوف زدہ تھا اور اس کے خوف کی ٹھوس وجوہات تھیں۔ دہانے سے نکلنے والے دھوئیں میں راکھ کے ذرات زیادہ تھے اور یہ ہیلی کاپٹر کے انجن کی تیزی کو نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن باس بینسن تھا اس لیے ہوسکنگ کو اس کی بات ماننا پڑی تھی۔ یہ سین فلم بند کرنا دراصل بینسن جیسے شخص کے لیے بھی ایک چیلنج تھا۔ وہ ٹرمینیٹر ٹو اور پیٹریاٹ جیسی فلموں میں مشکل ترین سین فلما چکا تھا۔ بڈی اس قسم کے سین فلم بند کرنے والا سب سے تجربے کار کیمرا مین تھا اور ہوسکنگ ہالی وڈ کا ماہر ترین فلمی ہیلی کاپٹر پائلٹ تھا۔ بینسن بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والا طویل قامت شخص تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے پاس ایک بہترین ٹیم ہے' مستقل سفید بالوں اور ہیرو جیسے نقوش والا بڈی چالیس سے زیادہ فلمیں اپنے کریڈٹ پر رکھتا تھا۔ اس کے باوجود وہ جانتے تھے کہ پواورینٹ...... میں جاکر شوٹنگ کرنا دنیا کے خطرناک ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

گیارہ بج کر پچیس منٹ پر وہ دہانے میں کھولتے لاوے سے کوئی تین سو فٹ اوپر پرواز کر رہے تھے۔ بڈی ایک بار پھر خصوصی کیمرے سے پگھلتے لاوے کا منظر فلم بند کر رہا تھا اچانک ہیلی کاپٹر کو جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے نیچے گیا تھا عین اس مقام پر جہاں بینسن نے بوتل پھینکی تھی بڈی چلّایا ''کیا مسئلہ ہے؟''

''ہم طاقت کھو رہے ہیں۔'' ہوسکنگ چلّایا ''ہم نیچے جا رہے ہیں۔''

ہیلی کاپٹر کے انسٹرومنٹ پینل پر سرخ روشنی جل بجھ رہی تھی' اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے سرخ دہکتے لاوے کی طرف جانے لگے' لگ رہا تھا کہ وہ اگلے چند منٹ میں دہانے میں جاگریں گے ہوسکنگ ہیلی کاپٹر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی ساری طاقت سلب ہوچکی تھی پنکھے بے جان انداز میں گھوم رہے تھے۔ بڈی نے کھڑکی سے لاوے کو نزدیک آتے دیکھا اور چلّایا ''خدا کے لیے اترنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرو۔''

ہوسکنگ ریڈیو پر مے ڈے کا پیغام دیتے ہوئے چلّا رہا

تھا''ہم نیچے جا رہے ہیں......ہم نیچے جا رہے ہیں......کنٹرولر تم سن رہے ہو؟''

مگر ایر کنٹرولر کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ شاید دہانے کے اندر اترنے سے ریڈیو کا رابطہ ختم ہو گیا۔ اب ہوسکنگ کی توجہ دھویں میں کسی ایسی جگہ کی تلاش پر مرکوز تھی جہاں ہیلی کاپٹر اتارا جا سکے' کالڈیرا میں سطح کی تلاش دیوانے کے خواب سے کم نہیں ہوتی ہے مگر معجزانہ طور پر انہیں یہ چیز مل گئی اوپری دہانے سے کوئی دو سو فٹ نیچے اور لاوے کی سطح سے پچاس ساٹھ فٹ اوپر انہیں ایک ہموار جگہ نظر آئی جس پر بہ مشکل ہیلی کاپٹر اتارا جا سکتا تھا۔ اندازے کی ذرا سی کمی بیشی سے یا تو ہیلی کاپٹر کو لاوے کے پول میں جا گراتے یا کالڈیرا کی دیوار سے ٹکراتے ...... انجام اس صورت میں بھی مختلف نہ ہوتا۔ ہوسکنگ تقریباً کریش ہوتے ہیلی کاپٹر کو قابو کر کے اس طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی نوک آگے کی طرف تھی جیسے ہی لینڈنگ کی کوشش کی ہیلی کاپٹر کا اوپری پنکھا چٹان کے نکلے حصے سے ٹکرایا اور وہ زمین سے جا لگا اس کی دم کا حصہ ٹوٹ گیا اور ریڈیو کی بیٹریاں تباہ ہو گئیں جس کے نتیجے میں ریڈیو خاموش ہو گیا۔ کیبن لرز رہا تھا جیسے کسی لمحے بھی لاوے میں جا گرے گا' وہ آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ کیبن سلفیورک کی بو والے دھویں سے بھرا تھا اور انہیں سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ بینسن چلایا۔

''اس سے پہلے یہ نیچے جا گرے...... ہمیں اس سے نکل جانا چاہیے۔''

کریش نے انہیں جھنجوڑ دیا تھا۔ انہیں چوٹیں بھی آئی تھیں مگر جان بچانے کے لیے وہ فی الوقت انہیں فراموش کرنے پر مجبور تھے۔ باہر نکلتے ہی انہیں شدید قسم کی گرمی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تقریباً پچاس فٹ نیچے لاوا کھول رہا تھا۔ اس سے بھاپ اور دھویں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ان کے پیروں تلے تپتی چٹانیں بے حد گرم تھیں۔ ان کے جوتے جلنے لگے تھے۔ بڈی نے چاروں طرف دیکھا ''اگر اس دنیا میں کہیں جہنم ہے تو وہ اسی جگہ ہے۔''

''کیا ہمارے کریش کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا؟'' بینسن نے پُرامید ہو کر کہا ''وہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔''

''مشکل ہے۔'' ہوسکنگ نے چاروں طرف چھائی دھند کی طرف دیکھا۔ جس میں بیس فٹ کے فاصلے سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ''ہمیں فضا سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کوئی ہماری مدد کو نہیں آئے گا۔''

بڈی مایوس ہو گیا۔

''نہیں اس کا مطلب ہے ہمیں اپنی مدد آپ کرنی ہے۔'' بینسن بولا ''اوپر ایسی جگہ جانا ہے۔ جہاں ہمیں فضا سے دیکھا جا سکے۔ اس کے بعد ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے امدادی کارروائی کی جائے گی۔''

''درست ہمیں ممکن حد تک اوپر جانا ہے۔'' ہوسکنگ بولا ''اس جگہ زیادہ دیر رکنا خطرناک ہوگا۔ اس زہریلے دھویں کے اثر سے ہماری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔''

''لیکن اوپر کیسے جائیں۔'' بڈی نے چاروں طرف بلند و بالا چٹانیں دیکھیں۔ جن پر پاؤں جمانے کی جگہ بھی مشکل سے نظر آ رہی تھی ''اس طرف کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''کوئی نہ کوئی راستہ ہوگا۔'' بینسن نے اوپری حصے کی طرف قدم بڑھائے ''میرے پیچھے آؤ۔ یاد رکھو ہمیں ہر صورت یہاں سے جانا ہے۔''

''ایک منٹ میرا خیال ہے مجھے لیڈ کرنے دو۔'' بڈی نے کہا۔ ''مجھے اس قسم کی چٹانوں میں ہائکنگ کا تجربہ ہے۔''

بینسن نے سر ہلایا۔ وہ رک گئے۔ بڈی نے آگے جا کر جائزہ لیا پھر انہیں آواز دی ''احتیاط سے اس طرف چلے آؤ۔ میں نے راستہ دیکھ لیا ہے۔''

بڈی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کی آواز کے سہارے اس کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ زمین اتنی گرم تھی کہ ان کے جوتوں کے ربر سول پگھل کر چٹانوں سے چپکنے لگے تھے۔ خالی ہاتھوں سے وہ کسی پتھر کا سہارا بھی نہیں لے سکتے تھے۔ دہکتی چٹانوں کو ہاتھ لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر ان کے جوتے بیکار ہو جاتے تو ان کے لیے اس جہنم سے نکلنا بھی ناممکن ہو جاتا۔ ذرا دیر بعد وہ بڈی کے پاس کھڑے اس سلوپ کو دیکھ رہے تھے جو دائرے میں گھومتی ہوئی تین سو فٹ تک چلی گئی تھی۔ ڈھلان خاصی تھی اور اس پر ایک بار پھسلنے والے کے بعد کہیں رکنے کا موقع نہیں تھا۔

''اس پر چڑھنا......'' بینسن نے متفکر ہو کر کہا ''آسان نہیں ہے۔''

''فی الوقت یہی ایک راستہ ہے جس سے ہم لاوے کے دھویں سے دور جا سکتے ہیں اور یہ ڈھلان زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ بس قدم جما کر چلنے کی ضرورت ہے۔''

سچ مچ انہیں زیادہ مشکل نہیں پیش آئی تھی اور وہ صرف پندرہ منٹ میں کالڈیرا کی اوپری چٹانوں کے پاس جا پہنچے تھے مگر ابھی اتنی ہی بلندی اور طے کرنا باقی تھی۔ یہ حصہ دشوار لگ رہا تھا کیونکہ کہیں پر بھی کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جس کے ذریعے اوپر جایا جا سکتا۔ بعض مقامات پر تو سوائے

عمودی دیواروں کے کچھ نہیں تھا۔ اس جگہ راکھ اور چٹانوں کے جلے ٹکڑے پڑے تھے جس میں ان کے پاؤں ٹخنوں تک دھنس جاتے تھے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتے تھے تو پھسل کر تقریباً اتنا ہی پیچھے آجاتے تھے۔ جہاں ڈھلان پینتالیس ڈگری سے زیادہ ہوجاتی تھی۔ وہ چاروں ہاتھوں پیروں سے رینگنے لگتے تھے۔ اس جگہ بھی چٹانیں گرم تھیں مگر قابلِ برداشت حد تک۔ وہ کچھ دیر کے لیے ان پر ہاتھ رکھ سکتے تھے۔

''چٹانوں سے کم سے کم تین چیزوں کا مستقل رابطہ رہے۔'' ہوسکنگ نے ہائی کنگ کا ایک اصول بیان کیا۔

''دونوں پاؤں اور ایک ہاتھ...... یا دونوں ہاتھ اور ایک پاؤں۔''

اس وقت بڑی راستے کی تلاش میں ان سے خاصا اوپر جاچکا تھا۔ اب تک وہ دشوار ترین چٹانوں کو بھی عبور کرچکا تھا لیکن بالآخر ایک چھجا اس کی راہ کی رکاوٹ بن گیا۔ جو اتنا آگے نکلا تھا کہ اس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ اس نے چلا کر بینسن اور ہوسکنگ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا ''ادھر اوپر جانے کا راستہ نہیں۔ میں اوپر نہیں جاسکتا۔ تم لوگ کوئی اور راستہ دیکھو۔''

''میرا خیال ہے۔ یہ راستہ کسی قدر موزوں ہے۔'' بینسن نے ایک نسبتاً کم ترچھی ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔

یہ راستہ بے حد خطرناک تھا۔ پتلا اور ترچھا۔ اس پر ایک سے زیادہ آدمی کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ آگے بینسن تھا اور یہ راستہ بھی بالآخر ایک جگہ پہنچ کر ختم ہوگیا۔ اب ان کے آگے ناقابلِ گزر دیواریں تھیں۔ بینسن اور ہوسکنگ کو لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پیالے میں پھنس گئے ہوں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ پواورینٹ کا یہ حصہ کسی پیالے کی اوپری دیواروں کی طرح سیدھا تھا اور جہاں وہ کھڑے تھے کم سے کم وہاں سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہوسکنگ نے کہا۔

''اب ہمارے پاس بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔''

''وہ کیا......؟'' بینسن نے مڑ کر کہا۔

''میں نیچے جاتا ہوں اور ریڈیو سے پیغام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کسی بیٹری میں جان ہو اس دوران میں تم یہیں ٹھہرو۔''

بینسن پریشان ہوگیا ''تم نیچے نہیں جاؤ گے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''اگر ہم یہاں رکے رہے تو یا تو دھوئیں سے دم گھٹ کر مرجائیں گے یا نیچے گر کر۔ مجھے نیچے جا کر ریڈیو کو استعمال کرنا ہوگا۔ اسی صورت میں ہم باہر سے مدد کی امید کرسکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر ہوسکنگ دھند میں غائب ہوگیا۔ اس نے واپسی کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جس سے وہ اوپر آئے تھے۔ اسے راستے میں کہیں بڑی نظر نہیں آیا اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ کہیں وہ نیچے تو نہیں گر گیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ جیسے جیسے آتش فشاں کا فرش نزدیک آرہا تھا۔ ہوا میں ایندھن جیسی بو بڑھتی جارہی تھی۔ جس میں ہائیڈروجن سلفائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ کی بو بے حد نمایاں تھی اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ کئی بار اس کے ذہن پر غشی سی طاری ہونے لگی اور اس کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ آخر اس نے ایک جگہ رک کر اپنی قمیص اتار کر پھاڑی اور اس سے پٹیاں بنا کر چہرے پر منہ اور ناک کے اوپر لپیٹ لیں اس طرح وہ کسی حد تک زہریلے دھوئیں کے اثرات سے محفوظ ہوگیا تھا۔

بالآخر وہ کریش ہیلی کاپٹر تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے کیمرے سے بیٹریاں نکالیں کہ ان سے ریڈیو کو پاور دی جاسکتی تھی۔ ہیلی کاپٹر کی بیٹریاں کریش میں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں لیکن بیٹریاں نکالنے کے دوران دھوئیں کی شدت سے اس کے ذہن پر بار بار تاریکی چھارہی تھی۔ آخر وہ پلٹا اور رینگتا ہوا تقریباً پچاس فٹ تک اوپر آیا۔ جہاں ہوا کسی قدر صاف تھی۔ اس نے وہاں پر چند گہری سانسیں لیں اور واپس نیچے کی طرف آیا۔

کیمرے کی بیٹریاں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ان میں تار لگانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے ہوسکنگ تباہ شدہ ہیلی کاپٹر سے نکلے تاروں کو کھینچ کر انہیں بیٹریوں کے پوائنٹ سے منسلک کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل وہ اس میں کامیاب ہوا تھا پھر اس نے انسٹرومنٹ پینل سے ریڈیو کی وائرز کھینچ کر الگ کیں اور ان کو بیٹریوں سے لگی تاروں سے جوڑنے لگا۔ ایک چنگاری سی اڑی اور ریڈیو سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے مارے خوشی کے نعرہ لگایا اور جلدی سے مائیک اٹھا کر کہنے لگا۔

''یہ یلو بوائے ہے۔ ہم پواورینٹ کے دہانے میں کریش کر گئے ہیں۔''

وہ بار بار یہ الفاظ دہراتا رہا۔ حتیٰ کہ ریڈیو سے آواز آئی۔

''کیا تم لوگ دہانے کے اندر ہو۔'' یہ آواز اس پائلٹ کی تھی جسے بینسن نے بیک اپ میں رکھا تھا۔

''ہاں ہم دہانے کے اندر ہیں۔ کوئی زخمی نہیں ہے لیکن ہیلی کاپٹر اڑنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔ میں دہراتا ہوں۔

ہم دیواروں پر نہیں چڑھ سکتے۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔''

''ہم پہلے ہی تلاش اور مدد کے لیے کام کر رہے ہیں۔'' بیک اپ پائلٹ نے جواب دیا ''تم فکر نہ کرو۔ ایک ہیلی کاپٹر تمہاری طرف آ رہا ہے۔''

ہوسکنگ مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے کیبن سے نکل کر چلاّتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو مطلع کیا ''میں نے رابطہ کرلیا ہے۔ مدد آ رہی ہے۔'' لیکن بینسن اور بڈی اس کی آواز نہیں سن سکے تھے۔ کیونکہ لاوے کے کھولنے کا شور ہر آواز پر حاوی تھا اور نہ ہی وہ گاڑھے سیاہ دھویں کے پار اسے دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے وہ ہوسکنگ کی کامیابی سے بے خبر اس کے بارے میں اندیشوں میں مبتلا تھے۔ آخر وہ نیچے اتنی دیر کیوں لگا رہا تھا۔ جہاں زہریلے دھویں میں سانس لینا بھی محال تھا۔

☆☆☆

ڈان شیرر ایک کانٹریکٹ پر کام کرنے والا ہیلی کاپٹر پائلٹ تھا۔ دوپہر ڈیڑھ بجے اسے پیغام ملا کہ ایک ہیلی کاپٹر پو اور رینٹ کے دہانے کے اندر کریش ہوگیا تھا اور اس میں ابھی تک زندہ افراد موجود تھے۔ انہیں فوری امداد کی ضرورت تھی۔ اس پیغام نے شیرر کو دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے پارک رینجرز کے ساتھ مل کر کریش ہو جانے والے طیاروں، گمشدہ ہائیکرز کی بازیابی اور نظروں سے غائب ہو جانے والے ہیلی کاپٹرز کی تلاش کا کام ضرور کیا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ایک زندہ آتش فشاں میں اترنے کو کہا جا رہا تھا۔ بہرحال اسے جانا تھا۔

شیرر کے پاس کومانسکی قسم کا امدادی کارروائیوں کے لیے مخصوص ہیلی کاپٹر تھا اس میں امداد کے لیے مخصوص تمام چیزیں موجود تھیں۔ اس نے عجلت میں ہیلی کاپٹر میں فیول بھروا دیا اور جزیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ شیرر پہلی کال ریسیو کرنے کے... کوئی ایک گھنٹے بعد پو اور رینٹ کے دہانے تک پہنچا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ آتش فشاں پوری طرح متحرک ہے اور اس کے دہانے سے گہرا سیاہ دھواں نکل رہا تھا۔ اس حالت میں دہانے کے اندر جانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اسے ان لوگوں پر حیرت تھی جنہوں نے اپنا ہیلی کاپٹر پو اور رینٹ کے دہانے میں اتارا تھا۔ وہ جیسے ہی دہانے کے پاس پہنچا اس کے ریڈیو سے آواز نکلی۔

ہوسکنگ اپیل کر رہا تھا ''ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔'' اس کی آواز بے حد نحیف تھی ''ہمیں ہوا کی ضرورت ہے۔''

''یہ شخص اپنے حوصلے کے آخری دموں پر ہے۔'' شیرر نے سوچا ''اس دھویں میں اتنی دیر گزارنا یقیناً کمال ہے۔ پتا نہیں اس کے باقی ساتھی کس حالت میں ہیں۔''

شیرر قطعی بے خبر تھا کہ ہیلی کاپٹر کس جگہ کریش ہوا ہے اور اسے دہانے کے اندر ان لوگوں کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ اسے ہوسکنگ کی فکر تھی اس کی آواز سے لگ رہا تھا۔ اگر اسے جلد نہ وہاں سے نکالا گیا تو بہت دیر ہو جائے گی۔ اس نے اپنا مائیک آن کیا ''میں اندر آ رہا ہوں۔ تم آواز کی مدد سے میری رہنمائی کرو۔ مجھے نیچے بالکل بھی کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔''

ہوسکنگ نے اس سے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی اس نے سوال کیا ''بینسن اور بڈی کا کیا ہوگا۔ انہیں وہاں سے کیسے نکالا جائے گا؟''

''یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے۔'' شیرر نے جواب دیا ''لیکن پہلے میں تمہیں نکالوں گا۔ اس کے بعد تم ان کی درست نشان دہی کر سکتے ہو۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا۔'' ہوسکنگ نے کہا۔ اب اس کی آواز سے کسی قدر توانائی جھلک رہی تھی۔ شاید امداد آنے کے خیال سے اسے حوصلہ ملا تھا۔

شیرر نے اپنا کومانسکی گہرے دھویں کی چادر میں گھسا دیا۔ اسے بالکل کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ دہانے کا فرش اور دیواریں کہاں ہیں۔ وہ اندازے سے نیچے جا رہا تھا۔ ہوسکنگ نے پہلی رہنمائی کی ''اب میں تمہارے دائیں طرف ہوں۔''

وہ بتدریج ہیلی کاپٹر کو نیچے لے جا رہا تھا۔ اس نے رفتار اتنی سست رکھی تھی کہ کاپٹر کا کیبن یا اسکیز کسی چٹان سے ٹکرا بھی جائے تو اسے سنبھلنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کاپٹر کے پنکھوں کی تیز ہوا دھویں کو اڑا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ہوسکنگ اسے دیکھنے میں کامیاب رہا تھا ''ذرا اور نیچے آؤ۔'' اس نے کہا۔

''میں کہاں ہوں؟'' شیرر نے پوچھا۔

''عین میرے اوپر۔ دائیں طرف لاوے کی جھیل ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چلے آؤ۔ مجھ سے کوئی سترفٹ اوپر ہو۔''

شیرر نے نیچے اترنے کی رفتار مزید کم کردی تھی۔ چند لمحے بعد اسے تباہ شدہ ہیلی کاپٹر کا ملبہ نظر آنے لگا تھا۔

''میں نے گرا ہوا ہیلی کاپٹر دیکھ لیا ہے۔'' اس نے ریڈیو پر کہا۔

''میں اس کے کیبن میں ہوں۔''

''اب میں ہیلی کاپٹر واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔'' شیرر نے کہا۔ تباہ شدہ ہیلی کاپٹر جس کنارے پر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ستر درجے زاویے کی ڈھلان لاوے تک گئی تھی۔ اگر

ہیلی کاپٹر لڑھک جاتا تو سیدھا لاوے کی جھیل میں جا گرتا۔
''کیبن سے باہر آؤ اور میرے ہیلی کاپٹر کی نوک کی طرف آؤ۔''

''اوکے..... میں آرہا ہوں۔'' ہوسکنگ کی آواز آئی۔
چند لمحے بعد ہوسکنگ رینگتا ہوا تباہ شدہ ہیلی کاپٹر سے برآمد ہوا۔ اس نے ڈھلان پر قدم جماتے ہوئے شیرر کے ہیلی کاپٹر کا پایاں اسکی پکڑنے کی کوشش کی مگر ہیلی کاپٹر لہرا رہا تھا۔ اسکی اس کے ہاتھ میں نہ آسکا تھا اور وہ نیچے گرتے گرتے بچا۔ ڈھلان پر سہارے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

''احتیاط سے۔'' شیرر بے اختیار چلایا۔ حالانکہ ہیلی کاپٹر کے انجنوں کے شور میں کسی قسم کی آواز سننا ناممکن تھا۔ اس بار اس نے کاپٹر زمین سے زیادہ نزدیک کیا۔ ہوسکنگ نے زمین پر قدم جماتے ہوئے ہاتھ آگے کیا اور اسکی پکڑ لیا۔ اگلے لمحے وہ اسکی پر تھا اس نے قلابازی کھائی اور کھلے دروازے سے کاپٹر کے اندر آکر شیرر کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔

شیرر نے اپنے مشن کا پہلا مرحلہ مکمل کرلیا تھا۔ اب اسے ہوسکنگ کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانا تھا تاکہ پھر دوسرے افراد کی مدد کرسکے۔ ہوسکنگ نے کئی گھنٹے بعد صاف اور سلفر کی بدبو سے پاک ہوا میں سانس لیا تھا۔ وہ بے سدھ سا پڑا تھا۔ شیرر نے ایک نظر اس پر ڈالی اور انجنوں کو ممکنہ حد تک طاقت دیتے ہوئے ہیلی کاپٹر اوپر اٹھانا شروع کردیا۔ گاڑھا دھواں ہیلی کاپٹر کے پنکھوں سے ٹکرا کر منتشر ہو رہا تھا۔ اچانک ہوسکنگ چونکا ''اپنے چوپر کو اس دھویں سے بچاؤ مجھے شبہ ہے اس دھویں کی وجہ سے میرے چوپر کے انجن بیکار ہوگئے تھے۔''

لیکن فی الوقت شیرر کاپٹر کو دائیں بائیں کرنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ دہانے کی دیواروں سے اوپر نہیں اٹھ جاتا۔ آخر وہ کھلی فضا میں پہنچا اور کاپٹر کو آتش فشاں کے دہانے سے دور لے گیا۔ اس نے سکون کا سانس لیا ورنہ آتش فشاں کے اندر اس کا ایک ایک لمحہ تشویش میں گزر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ آتش فشاں سے باہر آئے۔ ہوسکنگ نے اپنے دونوں بازو شیرر کے گرد حمائل کردیے اس کی آنکھوں سے خوشی اور تشکر کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میرے دوست تم نے مجھے یقینی موت سے بچالیا۔ اگر تم کچھ دیر اور نہ آتے تو میں بے ہوش ہو جاتا اور پھر تم مجھے کبھی تلاش نہیں کرسکتے تھے۔''

''فکر نہ کرو۔ ابھی ہمیں تمہارے دوسرے ساتھیوں کی تلاش کرنی ہے۔'' شیرر نے جواب دیا۔

''میرے خدا آتش فشاں کی طرف دیکھو۔'' ہوسکنگ نے بوکھلا کر کہا تھا۔

شیرر نے دیکھا آتش فشاں سے نکلنے والے دھویں کی مقدار میں یک دم اضافہ ہوگیا تھا اور اس نے تقریباً سارے دہانے کو گھیر لیا تھا۔ اس دھویں کو دیکھنے کے بعد بینسن اور بڈی کے بچ نکلنے کی امید کمزور پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

بینسن اور بڈی نے ہیلی کاپٹر کو آتے اور ہوسکنگ کو بحفاظت لے جاتے دیکھا تھا۔ ہوسکنگ کے بارے میں انہیں جو خدشات تھے وہ غلط نکلے تھے اور انہیں ہوسکنگ کے بچ جانے کی یوں بھی زیادہ خوشی تھی کہ ہوسکنگ ہی ان کے لیے مدد لے کر آسکتا تھا۔ وہی جانتا تھا کہ دہانے کے اندر بینسن اور بڈی کہاں ہیں۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں نے دھویں کے بادل کچھ دیر کے لیے صاف کیے تھے جس سے انہیں تازہ ہوا میں چند سانسیں لینے کا موقع ملا تھا مگر کچھ دیر بعد لاوے سے اٹھنے والی بھاپ اور سلفر کے دھویں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا اور اس نے آتش فشاں کے پورے پیالے کو گھیرنا شروع کردیا تھا۔ بینسن اور بڈی تشویش سے اس دھویں کو اوپر آتے دیکھ رہے تھے۔ اس میں سیاہی زیادہ تھی اور وہ کسی ٹھوس شے کی طرح متحرک تھا۔ چند منٹ کے اندر بدبودار کمبل کی طرح موٹے تیزابی بادلوں نے ان دونوں کو گھیر لیا تھا۔ دھویں کی دبازت اتنی تھی کہ ان کے گرد تاریکی چھا گئی اور وہ چند فٹ کے فاصلے پر بھی کچھ دیکھنے سے قاصر ہوگئے تھے۔

اس سے پہلے کہ دھویں کے زہریلے اثرات ان کے ذہنوں کو ماؤف کرتے انہوں نے اپنی قمیص اتار کر اپنے چہروں پر لپیٹ لی تھیں۔ یہ زہریلے دھویں کے خلاف کسی حد تک فلٹر کا کام کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کے حلق اور پھیپھڑے اس دھویں کے اثرات سے جلنے لگے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اگلے دس پندرہ منٹ تک مدد نہ آئی تو وہ دھویں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اگر مرے نہیں تب بھی بے ہوش ضرور ہو جائیں گے۔ بے ہوش ہونے کا مطلب بھی موت ہی تھا کیونکہ بے ہوشی کی حالت میں وہ نیچے جا گرتے۔

''بڈی بات کرو۔'' بینسن چلایا۔ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

''کیا بات کروں۔'' بڈی نے جواب دیا۔

''بولتے رہو۔ ورنہ بے ہوش ہو جاؤ گے۔''

اس کے بعد وہ وقفے وقفے سے ایک دوسرے کو پکارتے

رہے تھے۔ بڈی کو موت کے خوف نے گھیر لیا تھا۔ وہ طلاق شدہ تھا اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ بیوی نے الگ ہوتے وقت دونوں لڑکے بخوشی اس کے حوالے کر دیے تھے۔ جواب نوجوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے ''میں اس وقت نہیں مرنا چاہتا میں اپنے بچوں کو جوان ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کو میری ضرورت ہے۔'' اس نے سوچا پھر اسے اپنے خاندان کا ایک ایک فرد یاد آنے لگا۔ وہ اسے پھر سے دیکھنا اور اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کا نام پکارتے پکارتے تھکنے لگے تھے۔ ان کے گلے خراش خراش ہو رہے تھے۔ بولنے کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ پھیپھڑے جیسے جل رہے تھے۔ دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔

''مدد کب آئے گی!''

☆☆☆

پارک رینجرز جیفری جڈ اور نیل آکنا آتش فشاں کے کالڈیرا کے عین اوپر بڈی اور بینسن کے لیے نیچے اترنے کی تیاری کر رہے تھے لیکن یہ امدادی مشن بے سود لگ رہا تھا۔ دھند اور دھویں کی وجہ سے اردگرد کا منظر غائب تھا۔ حدِ نظر ایک گز سے زیادہ نہیں تھی لیکن انہوں نے دہانے میں اترنے کی ابتدائی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ویسے چٹانوں سے باندھ کر فولادی کلپوں سے خود سے منسلک کر لیے تھے۔ ان کے پاس گیس ماسک بھی تھے اور وہ اضافی گیس ماسک بھی لے جا رہے تھے تاکہ بڈی اور بینسن کو پہنا سکیں۔

آکنا نے رسّی کو تھامتے ہوئے خود کو دیواروں کے کنارے سے اندر کیا۔ ایک جھکولے سے اس کے پاؤں دیوار پر جا لگے تھے۔ اب وہ آتش فشاں کے دہانے کے اندر تھا۔ جیفری جڈ اور متعدد دوسرے فائر فائٹرز اوپر موجود تھے ''میں نیچے جا رہا ہوں۔ مزید رسّے نیچے پھینکوں۔ اگر کسی رسّے کو کوئی گرفت میں لے لے تو اسے فوری طور پر اوپر اٹھا لینا۔'' آکنا نے چلّا کر کہا۔

خوش قسمتی سے بڈی اس کے عین نیچے تھا۔ اس نے آوازوں کو سنا تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

''ہم یہاں نیچے ہیں۔'' اس نے چلّا کر کہا۔

اس پر آکنا نے ایک شوخ اورنج رنگ کا رسّا نیچے پھینک دیا جو گہری دھند میں بھی نظر آتا تھا مگر بڈی کی آواز مسلسل آتی رہی۔ اس کا مطلب تھا اس نے رسّا نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ اسے گرفت میں لے سکتا تھا۔ لاوا ابلنے کے شور میں اس کا اندازہ لگانا دشوار تھا کہ بڈی صحیح معنوں میں کس جگہ ہے۔ دو تین بار آکنا نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے لیکن اس نے وضاحت نہیں کی۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کی آواز آ رہی تھی۔ ورنہ اس وسیع و عریض دہانے میں اسے تلاش کرنا مشکل ہوتا۔ خاص طور سے جب پورا دہانہ سیاہ دھویں سے بھرا تھا اور فٹ بھر کے فاصلے پر موجود چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

بینسن اتنا نیچے تھا کہ اسے اوپر ہونے والی سرگرمیوں کا علم ہی نہیں تھا۔ لاوا ابلنے کی آواز اتنی بڑھ گئی تھیں کہ وہ بڈی کی آواز سننے سے بھی قاصر تھا۔ اس کی امیدیں لحہ لحہ کم ہوتی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد ہوسکنگ بھی ان سے آ ملا تھا۔ اس نے آرام کرنے کے بجائے امدادی کارروائی میں حصہ لینے پر اصرار کیا تھا مگر کوشش کے باوجود وہ لوگ بڈی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے پھر تاریکی چھانے لگی اور امدادی کارروائی ناممکن ہوگئی تو وہ مجبوراً اپنے بیس کیمپ لوٹ آئے تاکہ بڈی اور بینسن کی مدد کے لیے نئی حکمتِ عملی تیار کر سکیں لیکن اس سے پہلے وہ آتش فشاں کی طرف جاتے آسمان پر چھائے بادل طوفانی انداز میں پھٹ پڑے تھے۔ ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی تھی کہ اس میں کسی قسم کی امدادی کارروائی ناممکن نظر آنے لگی۔

☆☆☆

بڈی اور بینسن سردی سے کانپ رہے تھے۔ طوفانی بارش کی وجہ سے درجہ حرارت دس ڈگری سینٹی گریڈ تک گر گیا تھا اور وہ بری طرح بھیگ گئے تھے۔ بارش کا پانی اتنی بلندی کی وجہ سے بے پناہ سرد تھا مگر اس کے چند فائدے ہوئے تھے۔ ایک ان کی پیاس بجھ گئی تھی۔ گزشتہ دس گھنٹے سے انہوں نے پانی نہیں پیا تھا۔ یہ پانی ان کے لیے آبِ حیات ثابت ہوا تھا۔ ان کے مردہ ہو جانے والے جسموں میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ اوپر سے پانی کی بوچھاڑ نے دھویں کے اثرات بھی زائل کر دیے تھے اور وہ تروتازہ ہوا میں سانس لے رہے تھے۔ نیچے سے سلفر کے دھویں کے بجائے بھاپ اٹھ رہی تھی اور یہ بھاپ بھی بارش کی وجہ سے دب رہی تھی۔ بڈی امداد آنے سے مایوس ہو رہا تھا اس نے چلّا کر بینسن سے کہا۔

''سسک سسک کر مرنے کے بجائے کیوں نہ نیچے چھلانگ لگا کر ایک ہی دفعہ اور آسان خاتمہ کر لیا جائے۔''

''ایسا مت کرنا۔'' بینسن گھبرا کر چلّایا ''حوصلہ رکھو۔ امداد آئے گی بس یہ بارش رکنے دو۔ اب تو دھواں بھی تنگ نہیں کر رہا ہے۔''

''ہم باہر نہیں جا سکتے۔'' بڈی مایوسی سے بولا۔

''ایسا نہیں ہے ذرا غور کرو۔ جب مائیک جا سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں جا سکتے۔ جبکہ وہ سب سے نیچے تھا۔''
بینسن نے نقطہ اٹھایا تو بڈی کو امید کی کرن نظر آنے لگی تھی ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ بینسن ہم انتظار کریں گے۔''

☆☆☆

اگلے روز اتوار تھا اور شیر را اپنے کاپٹر سمیت آرام کر رہا تھا۔ گزشتہ روز آتش فشاں سے نکلنے والے گاڑھے دھویں اور راکھ کے ذرات نے اس کے ہیلی کاپٹر کے ٹربائن انجنوں کو نقصان پہنچایا تھا اور گراؤنڈ کا عملہ اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ دوسری طرف خراب موسم اور گہری دھند کی وجہ سے پو اور پینٹ میں پھنسے افراد کی مدد میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ بارش مسلسل جاری تھی اور اب آتش فشاں کے دہانے سے بھاپ کے بادل نکل نکل کر اردگرد پھیلی دھند میں اضافہ کر رہے تھے۔ البتہ بارش نے زہریلے دھویں کو دبا دیا تھا اور جھیل کی سطح پر ابلنے والے لاوے کی حدت کم ہوئی تھی۔

بڈی اور بینسن رات بھر سردی سے ٹھٹرتے رہے تھے۔ جب بارش کا پانی زیادہ ہونے سے نیچے سے اٹھنے والی بھاپ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو انہیں ذرا سکون ملا تھا مگر یہ مصیبت بھی کم نہیں تھی کہ جب بھاپ کا کوئی ریلا گزرتا تھا تو وہ پسینے میں نہا جاتے تھے۔ اس کے بعد دوبارہ سردی لگنے لگتی تھی۔ اگلی صبح طلوع ہوئی تو بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دن طلوع ہونے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ چاروں طرف گہری دھند اور تاریکی تھی۔ بڈی نے کئی بار گھبرا کر بینسن سے کہا کہ وہ اس کے پاس آ جائے یا اسے اپنے پاس آنے کی اجازت دے مگر بینسن نے بجا طور پر اسے ہلنے سے منع کیا۔ بارش کے بعد ڈھلانوں کی راکھ کیچڑ بن گئی تھی اور ہر جگہ پھسلن تھی۔ اس پر حرکت کرنا بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔
دن ہوا تو ان کی امیدیں پھر سے تازہ ہو گئیں کہ اب مدد آئے گی۔ کئی بار ایسا لگا کہ اوپر رضا کار باتیں کر رہے ہیں مگر ان کی مدد کے لیے اپیلوں کا اوپر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یہ ان کا وہم تھا۔ کیونکہ بے پناہ بارش اور دھند کی وجہ سے امدادی کارکن اس طرف آئے ہی نہیں تھے۔ بے بسی اور امید و یاس کی اس کیفیت میں بینسن کے ذہن میں بھی کئی بار خودکشی کا خیال آیا مگر اس نے پوری ہمت سے اس کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کیفیت میں مایوسی کس طرح انسان پر حملہ کرتی ہے اور اسے جکڑ لیتی ہے۔ وہ نہ صرف خود حوصلے والی باتیں سوچتا رہا بلکہ بلند آواز سے بڈی کو بھی تسلی دیتا رہا۔ دن میں وہ نیند کی کمی اور تھکن سے بے حال تھا۔
بڈی بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ کئی بار اس کی ذہنی کیفیت خطرناک مرحلے تک جا پہنچی تھی مگر بینسن نے اسے سنبھال لیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ بے چین ہوتا جا رہا تھا اس نے کئی بار بینسن سے کہا ''وہ لوگ نہیں آئیں گے ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔''
''ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' بینسن نے مایوسی سے جواب دیا تھا۔ ''ان دیواروں پر عام حالات میں بھی کسی مدد کے بغیر چڑھنا ممکن نہیں ہے۔ بارش کے بعد ان پر پھسلن آ گئی ہوگی۔''
''کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے آدمی کوشش کرتے ہوئے مرے۔''
''صبر میرے دوست...... باہر والوں کو بھی ہماری اتنی ہی فکر ہے اور وہ ہمیں یہاں سے نکال لے جانے کی تدبیر کر رہے ہوں گے۔''
''اب تک تو اس کے آثار نظر نہیں آتے۔'' بڈی نے تلخی سے کہا ''ایسا لگتا ہے وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے ہیں اور جب موسم بہتر ہوگا تو ہماری لاشیں نکالنے آ جائیں گے۔''
''اتنی ناامیدی کی باتیں مت کرو۔'' بینسن نے اسے تسلی دی ''مدد ضرور آئے گی۔''
''پتا نہیں کب آئے گی۔'' وہ حد سے زیادہ مایوس لگ رہا تھا۔
وقت گزرتا رہا۔ دن کا بیشتر حصہ گزر گیا اور دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ موسم کے تیور اور بارش دیکھ کر لگ رہا تھا کہ آج کا دن بھی بیکار گزرے گا اور مدد نہیں آ سکے گی۔ بڈی کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے بینسن کو آواز دی ''اب میں اور صبر نہیں کر سکتا۔ میں اوپر جا رہا ہوں۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔''
بینسن نے اس کی آواز میں فیصلہ کن سختی محسوس کی تھی۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری ''گڈ لک بڈی!''
بڈی نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی انگلیاں چٹانوں کی درازوں میں پھنسا کر چڑھ رہا تھا۔ جو گیلی اور چکنی ہو رہی تھیں۔ ہاتھ جما کر وہ پاؤں سے سہارا تلاش کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر خوف سے لرز رہے تھے کیونکہ اس کا پورا جسم ہوا میں معلق تھا اور ذرا سی غلطی اسے آتش فشاں کی تہ تک لے جاتی۔ جہاں فوری موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی نظریں کالڈیرا کے آخری سرے پر مرکوز تھیں۔ جو اس سے

کوئی چالیس فٹ اوپر تھا۔ یہ چالیس فٹ اسے چالیس میل سے زیادہ لگ رہے تھے۔

ہر بار جب وہ نئے سرے سے اوپر جانے کے لیے ہاتھ جماتا تو اسے لگتا ابھی اس کا ہاتھ پھسل جائے گا۔ ایک جگہ ہاتھ جما کر وہ کئی منٹ تک اس جگہ چمٹا رہتا تھا اور مزید آگے جانے کے لیے ہمت جمع کرتا۔ بارش میں اس کے ہاتھ پاؤں اور خاص طور سے جوتے بھیگ کر مزید مشکل کا باعث بن رہے تھے۔ نہ جانے کون سی قوت تھی جو اسے اب تک گرنے سے بچائے ہوئے تھی۔ سست روی سے سہی لیکن وہ کنارے کے آخری سرے کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ ایک کسی قدر ہموار جگہ تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ جہاں ٹاپ اس کے ہاتھوں سے صرف چھ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن یہ چھ فٹ ایک بالکل ہموار اور کسی قدر باہر کی طرف نکلی ہوئی چٹان پر مشتمل تھا اور بظاہر اسے سر کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ کس طرح اس آخری رکاوٹ کو عبور کرے۔

"اب اوپر جانے یا واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

بڈی نے مایوسی سے سوچا۔ اس نے وہ راستہ دیکھا جس سے وہ اوپر آیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اتنا مشکل ترین کام کیسے کر لیا جبکہ حالات بھی ناموافق تھے۔ اس نے کنارے کی طرف دیکھا جو اس سے بے حد نزدیک تھا "مجھے آخری کوشش کرنی چاہیے۔" اس نے سوچا۔

اس نے چٹان کا جائزہ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ دائیں طرف والا حصہ کسی قدر کھردرا تھا اور اس پر ہاتھ جمایا جا سکتا تھا۔ اس نے دائیں طرف سرکتے ہوئے ہاتھ اس کھردرے حصے پر جمایا پھر پاؤں اوپر کیے۔ آہستہ سے ہاتھ مزید اوپر بڑھائے اب کنارہ اس سے صرف دو فٹ دور تھا اس کا جسم کسی چھپکلی کی طرح چٹان سے چمٹا تھا۔ ذرا سی غلطی اسے گرا سکتی تھی۔ جس کے بعد بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر لاوے میں نہ گرتا تب بھی چٹانوں پر گر کر اس کی ہڈی پسلی ضرور ایک ہو جاتی۔

اس نے آخری دو فٹ دیکھے ایک زبردست جست اسے اس جہنم سے نکال لے جاتی۔ جس میں وہ گزشتہ اٹھائیس گھنٹے سے پھنسے تھے۔ اس نے پاؤں جماتے ہوئے جسم کو جھولا دیا اور اس کے گرتے ہاتھوں نے آخری لمحے میں کنارے کو تھام لیا۔ اس کا دل جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لیا تھا۔ موت بے حد نزدیک آ کر اس سے دور چلی گئی تھی۔ چند منٹ تک وہ یونہی لٹکا ہمت جمع کرتا رہا پھر اس نے ہاتھوں کے بل پر خود کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کی کہنیاں مڑنے لگیں اور ایک زوردار جھٹکا اسے کنارے سے اوپر لے گیا۔ اب وہ پیٹ کے بل کا لڑیرا کے کنارے لٹکا تھا۔ ہمت کر کے وہ اوپر چڑھا اور ہموار زمین پر دراز ہو کر سانس درست کرنے لگا۔ اس نے ناقابلِ بیان جدوجہد کر کے بظاہر ناممکن نظر آنے والی مہم سر کر لی تھی۔

خاصی دیر بعد اس کا سانس قابو میں آیا تو اسے بینسن کا خیال آیا جو اب بھی کئی سو فٹ نیچے دہانے میں پھنسا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے منہ اندر کیا اور چلایا "بینسن میں اوپر آنے میں کامیاب رہا ہوں۔ اب میں تمہاری ٹھیک ٹھیک نشان دہی کر سکوں گا۔"

مگر بینسن نے کچھ نہیں سنا۔ ہواؤں، بارش اور لاوا ابلنے کا مشترکہ شور ہر آواز پر حاوی تھا۔ اسی لیے وہ بڈی کی کامیابی سے بے خبر تھا۔ وہ بے چین تھا کہ بڈی کے بارے میں معلوم کرے۔ بینسن ہائیکر نہیں تھا اس لیے وہ بڈی یا ہوسکنگ کی طرح آسانی سے ان چٹانوں پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اس لیے ابھی تک نیچے تھا۔ بڈی نے اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ارد گرد دیکھا اسے نارنجی رنگ کا رسا نظر آیا جو قریب ہی موجود رینجرز نے نشانی کے طور پر چھوڑ رکھا تھا۔ بڈی اس رستے کا تعاقب کرتا ان کے کیمپ تک جا پہنچا۔ وہاں موجود رینجرز رضا کار اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"تم کیسے اوپر آئے؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم لوگ بینسن کو باہر نکالو۔ وہ ڈیڑھ سو فٹ نیچے ٹھیک اس رسے کے بائیں طرف ہیں جو تم نے نیچے لٹکا رکھا ہے۔"

چند رضا کار آتش فشاں کے دہانے کی طرف بھاگے اور ایک بڈی کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ حیرت انگیز طور پر بتیس گھنٹے ایک آتش فشاں کے زہریلے دھویں میں گزارنے کے باوجود بڈی کی سانس کی نالی اور پھیپھڑوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دوسرے رینجرز بینسن کی مدد کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے خوراک، پانی، کپڑوں اور چھوٹے سے ریڈیو پر مشتمل پیک نیچے لڑھکانے شروع کر دیے۔ اس امید پر کہ ان میں سے ایک بھی بینسن کے ہاتھ لگ گیا تو اس سے رابطہ کر کے اس کی مدد کی جا سکتی تھی۔ رینجرز کے ارکان ابھی تک نیچے جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب تک موسم اس کے لیے سازگار نہ ہو جائے۔ یہ بات عجیب تھی کہ مدد کے لیے مخصوص رینجرز ایک ایسی جگہ جا کر ایک شخص کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جہاں ایک شخص گزشتہ بتیس گھنٹے سے بدترین حالات میں زندہ تھا۔ بڈی کی نشان دہی کے بعد تو یہ

کام اور بھی آسان ہوگیا تھا۔ اگر دو یا تین رینجرز بڈی کے بتائے مقام سے پہنچے جاتے تو بینسن کو اوپر لانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن امکانی خطرہ انہیں روکے ہوئے تھا۔

☆☆☆

بینسن پریشان اور ہراساں سا انتظار کررہا تھا کہ بڈی کی مہم کا کیا بنتا ہے۔ وہ خطرناک کام کرنے جارہا تھا کیونکہ جب تک روشنی رہی۔ انہوں نے یہی دیکھا تھا کہ اس جگہ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اب بڈی حالات کے دباؤ کو برداشت نہ کرسکا تھا۔ خاصی دیر گزر گئی۔ تیز ہواؤں، بارش کے شور اور لاوا ابلنے کی آوازوں میں اسے کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اچانک اوپر سے عجیب سی آواز آئی جیسے کوئی چیز لڑھک رہی ہو۔ آواز نزدیک آرہی تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہوا۔ سامنے سے دھند میں کوئی چیز تیزی سے اس کے سامنے سے گزری۔ اسے شبہ ہوا کہ اس کا رنگ اس شرٹ جیسا تھا جو بڈی نے پہن رکھی تھی۔ چند لمحے بعد وہ لاوے میں جاگری۔ خوفناک سی آواز آئی۔ اس نے اپنا سر تھام لیا ''یہ کیا کیا بڈی نے۔'' اس نے سوچا'' مجھے اسے روکنا چاہیے تھا۔''

''کرس!'' وہ بے اختیار چیخا اور گھٹنوں کے بل گر گیا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دہاڑیں مار مار کر روئے۔ اس نے بڈی کو کیوں نہیں روکا۔ وہ خود سے کہنے لگا ''سب میرا قصور ہے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ آخری سین شوٹ کرنے پر اصرار کرتا۔ سب میرا قصور ہے۔'' وہ سسکنے لگا۔

☆☆☆

رات نو بجے تک بارش رک گئی تھی مگر رات کی وجہ سے رینجرز آتش فشاں میں اترنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ بارش کی وجہ سے انہیں یہ موقع ملا تھا کہ وہ دھویں کا خطرہ مول لیے بغیر نیچے جاسکیں۔ بارش رکتے ہی دھواں اور زہریلے بخارات ایک بار پھر آتش فشاں کے دہانے سے خارج ہونے لگے تھے۔ بڈی بری طرح تلملا رہا تھا۔ ہوسکنگ نے بھی پارک رینجرز پر زور دیا کہ جب انہیں بینسن کی درست لوکیشن معلوم ہوگئی ہے تو وہ نیچے اتر کر اس کی مدد کیوں نہیں کررہے ہے۔

تیسرے دن کے طلوع ہونے تک بینسن کی امیدیں مایوسی کے گرداب میں ڈوبنے لگی تھیں۔ عجیب بات تھی اپنے ساتھیوں میں وہی سب سے زیادہ پُرامید اور باحوصلہ تھا۔ بڈی اور ہوسکنگ مایوس تھے۔ وہ انہیں تسلی دیتا رہا کہ جلد باہر سے مدد آئے گی لیکن اس کے دونوں ساتھی بہ حفاظت اس جہنم سے نکل گئے تھے اور وہ ابھی تک یہیں پھنسا تھا۔ رات بارش رکنے کے بعد زہریلا دھواں ایک بار پھر آتش فشاں سے اٹھنے لگا تھا اور اس کے گلے کا یہ حال تھا کہ خاصا زور لگانے پر جو آواز نکلتی تھی وہ چند گز سے زیادہ دور تک نہیں سنی جاسکتی تھی۔ اس نے رات تک بارش کا خاصا پانی پی لیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا حلق خشک اور کڑوا ہورہا تھا۔ یہ سب کاربن مونو آکسائیڈ اور سلفر ڈائی آکسائیڈ کے اثرات تھے۔ بینسن جانتا تھا کہ بعض حالات میں انسان ہمیشہ کے لیے بولنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ دھویں سے بچنے کے لیے اس نے اپنی قمیص ایک بار پھر منہ پر چڑھالی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنی نوجوان بیوی اور دو بچوں کا خیال آتا تھا۔ اسے لگتا جیسے وہ سب اسے حوصلہ دے رہے ہوں۔ گیس کے اثرات سے اپنا سر چکراتا محسوس ہوتا تھا اور خیالات مرتکز کرنا دشوار ہورہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہوکر کوئی ایسی حرکت نہ کرگزرے جو اس کی بے وقت موت کا سبب بن جائے۔ اسے بعض اوقات لگتا تھا کہ دھویں میں کسی عورت کی شبیہ ہے جو اسے اپنی طرف بلارہی ہے۔ وہ بڑبڑانے لگتا۔

''پیلے...... میں تمہیں جیتنے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں شکست دوں گا میں اس جگہ سے باہر جاکر رہوں گا۔'' پھر وہ خدا سے دعا کرنے لگتا'' خدایا...... کل موسم صاف رہے تاکہ وہ مجھے فضا سے دیکھ سکیں۔''

جب دن پوری طرح طلوع ہوگیا تو فلم کریو نے ایک امدادی پائلٹ کا بندوبست کیا۔ ٹام ہاچمین ایک اچھا امدادی پائلٹ تھا۔ وہ بڈی کے ساتھ آتش فشاں کے اوپر پہنچا۔ جس سے بدستور دھواں خارج ہورہا تھا۔ تب بینسن نے اپنے اوپر ایک گرج دار آواز سنی۔ دھویں کے بادل چھٹ گئے اور اسے ہیلی کاپٹر کی دم صاف نظر آنے لگی تھی پھر اس نے میگا فون پر آواز سنی'' ہم ایک جال نیچے پھینک رہے ہیں۔''

پہلی کوشش میں نیٹ بینسن سے دور رہا تھا۔ دوسری بار نیٹ کا رسا ایک چٹان میں پھنس گیا۔ اسے نکالنے میں وقت لگا اور نیٹ ایک بار پھر ہوا میں بلند ہوگیا'' یہ آخری موقع ہے!'' بینسن نے سوچا اور جیسے ہی نیٹ اس بار اس کے سامنے آیا تو اس نے بنا تذبذب کے اس میں چھلانگ لگادی۔ جب ہاچمین نے کاپٹر بلند کیا تو اس نے نیٹ میں بینسن کو دیکھ لیا۔ ''ہم نے آخری زندگی بھی بچالی ہے۔'' اس نے بڈی سے کہا تھا۔

حیرت انگیز طور پر اڑتالیس گھنٹے والکانوز (زندہ آتش فشاں) میں گزارنے کے باوجود وہ کسی بڑے نقصان سے بچ گیا تھا۔

مارسل سیکرٹ نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جہاں آسمان پر گہرے سیاہ بادل کسی چادر کی طرح تنے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے بجلی کڑک رہی تھی۔ پیرس کے مرکز سے میلوں فاصلے پر یہ ایک سادہ سی عمارت تھی جسے انٹرپول یعنی عالمی پولیس کا ہیڈ کوارٹر ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ مارسل سیکرٹ اس کا سربراہ تھا۔ وہ ۱۹۵۱ء میں انٹرپول میں شامل ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ فرانسیسی پولیس میں انسپکٹر جنرل تھا۔ اس کے اندر رہ رہ کر جرائم کے بارے میں بین الاقوامی تعاون کی خواہش اٹھتی تھی لہٰذا جب اسے انٹرپول کے سیکریٹری جنرل کے عہدے کی پیشکش ہوئی تو اس نے بلا تاخیر فرانسیسی پولیس سے استعفا دے دیا تھا۔ اس وقت وہ بے حد پرجوش تھا لیکن جلد اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد قائم ہونے والے اس ادارے کے عالمی ممبران کی تعداد بیس تھی مگر تمام ہی ممبران کی نظر میں یہ ایک بیکار ادارہ تھا۔ خود فرانسیسی اسے کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا جب انٹرپول کے ہیڈ کوارٹر کا معاملہ آیا تو وزارت داخلہ نے احسانِ عظیم کرتے ہوئے اپنی بیکار ترین عمارت اسے بخش دی تھی۔ اس لمبی اور بے ڈھنگی عمارت میں طویل برآمدوں کے سامنے دڑبے نما کمرے بنے تھے اور یہاں سوائے فون اور بجلی کے کوئی سہولت نہیں

انسانی فطرت کے معاملات بھی عجیب ہیں۔ کہتے ہیں فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ اس شخص کا احوال جو اپنے جرائم کے سلسلے میں دنیا بھر کی پولیس کو مطلوب تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی اصل شناخت کسی کو معلوم نہ تھی۔ اس کی گرفتاری کے لئے انٹرپول نے خصوصی طور پر تین ماہر ترین جاسوسوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ اس بین الاقوامی مجرم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید کیا جاسکے۔

جرم کے عادی ایک بین الاقوامی مجرم کی گرفتاری کے لئے کی گئی جدوجہد کا احوال

شاطر زمانہ

کاشف زبیر
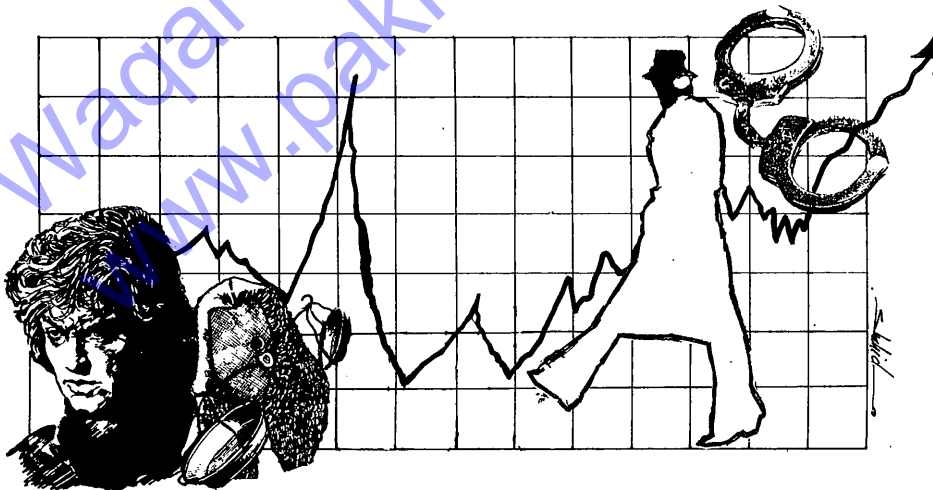
تھی۔ پوری عمارت میں صرف تین فائلوں کی الماریاں تھیں۔ مارسل حیران تھا کہ فائلنگ سسٹم کیونکر بنے گا۔ یہاں دنیا بھر کے جرائم، مجرموں کی خبریں اور ریکارڈ چلا آرہا تھا صرف فنگر پرنٹس کے دس ہزار سیٹ تھے۔ مختصر دفتر، مایوس کن حد تک کم عملہ اور مختصر ترین بجٹ جسے دیکھ کر بے اختیار کہا جاتا تھا کہ ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ ادارے کے تمام پیغامات عام ڈاک سے آتے جاتے تھے۔

مارسل کو احساس تھا کہ دنیا کو انٹرپول کی اہمیت جتانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ اگرچہ اس کے پاس نہ تو عملہ تھا اور نہ ہی اختیارات لیکن اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ کچھ عرصے سے وہ ایسے کیس کھنگال رہا تھا جن کی نوعیت بین الاقوامی ہو اور عام پولیس اسے حل کرنے میں ناکام رہی ہو۔ آج صبح وہ غیر حل شدہ جرائم کے کارڈ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک کارڈ پر پڑی یہ ان اوّلین کیسز میں سے ایک تھا جو انٹرپول کو ملے۔ ان کی ابتدا ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔

○☆○

جنگِ عظیم کے بعد دنیا بھر میں زیورات اور جواہرات کی چوری کا پراسرار سلسلہ جاری تھا اور چوری ہونے والی اشیا جیسے ہوا میں تحلیل ہوجاتی تھیں۔ ان وارداتوں کو چوری اور فراڈ کا ملا جلا شاہکار قرار دیا جاسکتا تھا۔ جرم نہایت مہارت سے کیا جاتا تھا اور چور اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ یکساں نوعیت ہونے کی وجہ سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ کسی ایک ہی فرد یا گروہ کی کارستانی ہے۔ چور نے ہر بار خریدار بن کر یا فروخت کرنے والا بن کر کسی جیولر یا زیورات کے ڈیلر تک رسائی حاصل کی اور بعد میں اسے رقم کے بجائے سادہ نوٹ کے سائز کے کٹے کاغذ یا بے قیمت نقلی زیورات یا جواہرات تھما گیا تھا۔ وہ متاثر کن اور باوقار شخصیت کا حامل تھا۔ اس کی زباں دانی بے مثال تھی اور ہر بار وہ سامنے والے شخص کو بے وقوف بنا کر فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ اسے ایک بار بھی پکڑا نہیں جاسکا تھا۔

پہلی رپورٹ زیورچ سے آئی جہاں چور نے اپنا نام ویبر بتایا تھا۔ اس کے بعد تو یورپ، شمالی و جنوبی امریکا، جنوبی افریقا اور ہندوستان تک سے رپورٹیں آنے لگی تھیں۔ ہر جگہ سے آنے والا مجرم کا حلیہ تقریباً یکساں تھا۔ عمر تیس سے پینتیس سال تھی۔ درمیانے قد اور سراپے کا مالک تھا۔ لہردار بھورے بال تھے اور ہلکی مونچھیں بھی تھیں۔ کئی جگہ اس نے ہلکی پاور کی عینک بھی استعمال کی تھی۔ گفتگو اور حلیے سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔ وہ ہسپانوی، ہنگرین، عبرانی، روسی، جرمن اور یائیڈش زبانیں روانی سے بولتا تھا۔ اس کے شکار عام افراد نہیں بلکہ دنیا کے گھاگ ترین کاروباری یہودی تھے۔ اس کے باوجود وہ باآسانی اپنا کام کرجاتا تھا۔ وہ مکڑی کی طرح اپنے شکار کو اپنی باتوں اور حلیئے کے جال میں پھنسالیتا تھا۔ وہ اتنا باوقار تھا کہ اس سے دھوکے کی توقع محال نظر آتی تھی اور شاطر اتنا کہ ایک بار بھی قانون کی گرفت میں نہیں آیا۔

اگر وہ کوئی ایک ہی فرد تھا تو اس کی سفر کرنے کی صلاحیت حیران کن تھی۔ وہ بڑی تیزی سے حرکت کرتا تھا جبکہ ابھی دنیا کے ذرائع سفر پسماندہ تھے۔ وہ کامیابی سے برا عظموں میں واردات کررہا تھا۔ کبھی کبھار دو افراد بھی واردات میں ملوث ہوتے تھے لیکن ہر جگہ ایک ہی شخص نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ خود مارسل کی چھٹی حس کہتی تھی کہ یہ فردِ واحد ہی تھا۔ خاصے غور و خوص کے بعد.... اس نے اس نامعلوم شاطر کو انٹرپول کے لیے ایک مناسب کیس قرار دیا تھا۔ ممکن تھا اس کیس کی وجہ سے انٹرپول کا نام سامنے آجاتا۔ مارسل نے اپنی سیکریٹری کو بلایا اور اسے درخواست لکھنے کا کہا۔ جس میں فرانسیسی پولیس سے تین بہترین جاسوسوں کی فرمائش کی گئی تھی اس شاطر کو گرفتار کرنے کے لیے۔

خوش قسمتی سے اگلے ہی روز تین عدد چست اور مستعد جاسوس مارسل کے دفتر کے سامنے موجود تھے۔ یہ ریمنڈ، ہانا اور سائٹراس رینالٹ تھے۔ ان کے آنے سے کمرا بھر گیا تھا۔ انہیں کھڑے رہنا پڑا تھا کیونکہ کمرے میں ایک ہی کرسی تھی۔ مارسل نے انہیں کیس اور چور کی شخصیت کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس کے طریقہ واردات اور جرائم میں استعمال ہونے والی اشیا پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مثلاً ہیرے کی طرح تراشے شیشے کے ٹکڑے، جعلی کرنسی کے سائز کے کٹے کاغذ۔ مارسل نے انہیں بتایا کہ خاص طور سے یورپ میں جواہرات کا سارا ہی کاروبار یہودیوں کے ہاتھ میں تھا لہٰذا اس کے زیادہ تر شکار بھی یہودی ہوتے تھے۔ یہودی ہمیشہ سے محتاط کاروباری رہے ہیں اور انہیں دھوکا دینا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ شاطر انہیں اس طرح تسلسل سے دھوکے دیتا رہا کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کا طریقۂ کار بے عیب تھا۔ یہودیوں کا کام کرنے کا انداز تھا کہ وہ ایک دوسرے پر بغیر کسی تحریری معاہدے یا ضمانت کے اعتماد کرتے ہوئے لاکھوں کی مالیت کی اشیا منتقل کرتے رہتے تھے لیکن اعتماد صرف یہودی اور جان پہچان کے تاجروں کے درمیان ہوتا تھا۔ سونے کی بہ نسبت جواہرات کی مخصوص قیمت نہیں

ہوتی۔ ہر پتھر اور ہر ڈیلر کے لیے اس کی قیمت الگ ہی ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کی آنکھ نے کیا خوبی دیکھی' اس سے جوہر کی قیمت طے ہوتی ہے۔ بالکل حسن کی طرح جو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔

دوسرا نقطہ یہ تھا کہ جواہرات کا کاروبار ایک خفیہ دنیا ہے۔ خریدنے و بیچنے والے اسے چھپاتے ہیں۔ ٹیکس کے چکر سے بچنے کے لیے نقد سودا کیا جاتا ہے یا چیز کے بدلے چیز۔ جواہرات بے حد مختصر ہوتے ہیں۔ آپ کی ہاتھ کی ہتھیلی میں کئی کروڑ ڈالرز مالیت کے جواہرات آسکتے ہیں۔ عموماً لٹنے والے ڈیلر شور نہیں کرتے اور پولیس میں رپورٹ کراتے بھی ہیں تو مالیت کہیں کم کرکے لکھواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وارداتوں کی کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی جاتی۔ وہ کسی کو بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ چور نفسیات کا ماہر تھا وہ عموماً لالچی اور لوٹے جانے کے قابل لوگوں کا انتخاب کرتا تھا۔ آخر میں مارسل نے تینوں جاسوسوں کو جوہری دنیا کے بارے میں خاص کتابچے دیے جن میں ان کے بازاروں کے نام پتے اور کاروبار کے طریقے درج تھے۔ جب جاسوسوں نے اپنے حصے کے کتابچے پڑھ لیے تو مارسل نے دوبارہ انہیں بتانا شروع کیا۔

طریقہ یہ ہے کہ بیچے جانے والے ہیرے کو ایک خاص قسم کے موی ڈائمنڈ پیپر میں رکھ کر اسے متعدد زاویوں سے موڑ کر اس پر ہیرے کا وزن لکھا جاتا ہے اور پھر اسے ایک لفافے میں ڈال کر بیچنے والا اس پر اپنی مہر لگاتا ہے۔ دوسری طرف خریدار بھی ایسا ہی ایک لفافہ قیمت کے نوٹوں کا تیار کرتا ہے' اسے سیل کرتا ہے اور پھر دونوں اپنے اپنے لفافوں کا تبادلہ کرلیتے ہیں۔ سادہ سا فول پروف طریقہ ہے لیکن ایک شاطر کے لیے نہیں۔ چور دکھاتا تو اصل ہیرا تھا لیکن جب تبادلے کا وقت آتا تھا تو کوئی اور لفافہ جسے وہ پہلے سے تیار کرکے لاتا تھا' تھما دیتا تھا۔ ہاں اگر ہیرا خرید رہا ہوتا تھا تو سادہ کاغذوں والا لفافہ اسے دے دیتا تھا۔ مہلت حاصل کرنے کے لیے وہ مزید کاروبار کی بات کرتا کہ وہ مزید ہیرے خریدنا یا بیچنا چاہتا ہے اور اصول تھا کہ جب تک ڈیل مکمل نہیں ہوجاتی دونوں اپنے لفافے نہیں کھول سکتے تھے اور ایک دن کی مہلت چور کے لیے کافی ہوتی تھی۔ وہ پتا چلنے تک ملک سے نکل چکا ہوتا تھا۔

"ہمارا مطلوبہ دوست ایک اعلیٰ درجے کا فنکار ہے وہ ڈیلر کو اپنی ایمانداری کا پختہ یقین دلا چکا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کسی اسٹیج کے شعبدہ باز کی طرح ہے جو سیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنا کام کر جاتا ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی اپنے شکار کو اس کی نگاہوں کے سامنے لوٹ جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کیس اور اس کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ چکے ہو اور اس چور سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگے۔"

مارسل نے کارڈ نکال کر ان کے سامنے کیا "اس کا جو پہلا نام ہمارے علم میں آیا ہے وہ ویبر ہے لیکن یقینی طور پر یہ جعلی نام ہے۔ چور نے یہ یا کوئی بھی نام دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس نے ہر بار ایک نیا نام اور شناخت استعمال کی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ اسے اتنی تیزی سے جعلی کاغذات کہاں سے مل جاتے ہیں۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک فرد نہیں بلکہ اس کے پیچھے پورا گروہ تھا۔ ایک فرد کے لیے یہ ناممکن حد تک مشکل ہے کہ نام بدلے' اس کے مطابق دستاویزات حاصل کرے اور تیزی سے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں واردات کرے۔ اس شخص کے کہیں فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے یہ ایک ہی شخص یا گروہ..." رینالٹ پہلی بار بولا تھا "اور وہ کون ہے اس کی شناخت کیا

ہے؟"

مارسل نے جواب دیا "گروہ والا نظریہ مضبوط ہے مگر میرے اندر کی آواز کہہ رہی ہے کہ یہ فردِ واحد ہی ہے۔ مجرم کا حلیہ ہر جگہ ایک ہی بیان کیا گیا ہے۔ اس کی شخصیت میں وقار ہے۔ اس کا لباس' اس کا حلیہ اور اس کی زبان عالمانہ ہے۔ اس کے اکثر شکاروں سے اس کی پہلی ملاقات یہودیوں کی عبادت گاہ سیناگوگ میں ہوئی۔ وہ بہترین عبرانی بولتا ہے۔ باقی زبانیں بھی وہ اہلِ زبان کی طرح بولتا ہے۔ اسے ایک شعبدہ باز قرار دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ کوئی گروہ ہے تو کیا اس میں شامل سب ہی افراد ان خوبیوں کے حامل ہیں؟ اس کی اضافی صلاحیت میں ہیروں کی مہارت شامل ہے۔"

رینالٹ نے ہی کہا "پیشگی معذرت سر' بظاہر تو یہ خوب دکھائی دیتا ہے کہ ایک شخص متعدد زبانیں روانی سے بولتا ہے اور لوگوں کو ان کے ملک میں جاکر بے وقوف بناتا ہے۔ وہ غیر معمولی تیزی سے سفر کرتا ہے ظاہر ہے ایسا سفر صرف طیارے سے ممکن ہے اور اس کے لیے بہت بڑی رقم صرف کرنا پڑتی ہوگی۔ ایک عقل مند چور کبھی اتنے تواتر سے وارداتیں نہیں کرتا ہے۔ وہ صرف اس وقت چوری کرتا ہے جب اسے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارا مفروضہ دوست' اگر اسے ایک ہی فرد تسلیم کیا جائے' اتنی تیزی سے دنیا کے محفوظ ترین مقامات پر ہاتھ صاف کرتا ہے کہ اس کی ذہانت اور مستعدی پر رشک آتا ہے مگر وہ اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ یوں تیزی سے جرائم کرکے وہ جلد یا دیر سے پکڑا ہی جائے گا۔ چوری شدہ اشیا کی مالیت ہمیں بتاتی ہے کہ وہ کم سے کم کروڑ پتی ضرور ہے۔ آخر پھر اسے اتنی جلدی جلدی وارداتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے سفر کرنے کا انداز بتاتا ہے کہ اسے جعلی شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور کرائے کی مد میں بہت بڑی رقم خرچ کرنا پڑتی ہوگی۔"

"سفر ہی تو اس سارے معاملے کی کلید ہے۔" مارسل نے کہا "وہ کم بخت کسی جگہ اتنی دیر ٹھہرتا ہی نہیں ہے کہ مقامی پولیس کو اس کے خلاف کچھ کرنے کا موقع ملے۔ جب تک پولیس حرکت میں آتی ہے وہ کسی ملک بلکہ برِاعظم جاچکا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ کیس انٹرپول کا ہے۔ اس چور کا پکڑا جانا بے حد ضروری ہے۔"

اگلے ہفتے کے دوران رینالٹ نے سیزن' زیورچ اور ویانا پولیس کو کیس کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے ان سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ درخواست انٹرپول کی طرف سے تھی اور کیس بھی خود مارسل نے تیار کیا تھا۔ بریجیڈٹ پیرس کی ہیروں کی مارکیٹ گیا تھا۔ مونٹ مارکرے کے نچلے علاقے میں واقع یہ ہیروں کا دنیا کا اہم ترین بازار تھا۔ ہانا اور بریجیڈٹ کا مقصد ڈیلروں کو اس چور سے خبردار بھی کرنا تھا۔ انہوں نے پتھروں کے کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ مارسل کے خیال میں اس کاروبار کے نشیب و فراز سیکھنے کے لیے مدت درکار تھی۔ آخر ایک چور بغیر شک و شبے کے اس دنیا میں داخل کیسے ہوا اور دنیا کے چالاک ترین تاجروں کو بے وقوف کیسے بنا گیا۔ مارسل کو یقین تھا وہ اس سے کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔

○☆○

وہ واقعی منفرد اور یکتا تھا۔ اس کا کوئی گروہ نہیں تھا۔ اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا' کوئی دوست نہیں تھا لیکن وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہر جگہ کامیاب رہا تھا۔ ریکارڈ میں اس کا نام برل فارکانہ ملتا ہے مگر کسی کو بھی اس کے اصلی ہونے کا یقین نہیں تھا۔ اس نے اتنے نام بدلے کہ یقین سے خود اپنا نام نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے کسی پُر شور پہاڑی ندی کی طرح اپنا راستہ خود بنایا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے سیلف میڈ تھا۔ حتیٰ کہ جرائم میں بھی اس کا کوئی استاد نہیں تھا۔ وہ خود اپنا استاد تھا۔ ایک ایسا چور جو مالک کے سامنے اس کی چیز اڑا لے جائے اور وہ بے چارہ اسے ہنسی خوشی رخصت کردے۔

اس کا اصل نام بیلاوین برگ تھا اور شمالی رومانیہ میں ساٹومیئر کا قصبہ اس کی جائے پیدائش تھا۔ کئی دریاؤں کے درمیان میں آباد یہ خطہ سوتی کپڑے کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ وہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ بیلا کا باپ ابراہام وینڈر کپڑے کا دولت مند تاجر تھا اس کا کپڑا پورے ملک میں جایا کرتا تھا۔ وہ صرف سوتی ہی نہیں بلکہ ریشمی اور لینن کے کپڑے کا بیوپار بھی کرتا تھا یہودی ابراہام کی شادی ڈریزل وین برگ سے ربی قوانین کے تحت ہوئی تھی۔ اس قانون میں اولاد ماں کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ بیلا اور اس کے درجن بھر بہن بھائیوں کے نام کے ساتھ ماں کا خاندانی نام لگا تھا۔ ساٹومیئر میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہاں پر یہودی مذہبی تعلیم کا اسکول ہیزیڈیم قائم تھا۔ اس اسکول میں یہودی تعلیم جدید انداز میں دی جاتی تھی۔ بعد میں یہودیوں نے دنیا بھر میں اس طرز کے اسکول اور کالج قائم کیے۔ بیلا کے آرتھوڈوکس جیوش ماں باپ ہیزیڈیم کی روشن خیال تعلیمات کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ مذہب پر سختی سے عمل کرنے کے قائل تھے۔ ان کے بچے ان کے ہم خیال تھے سوائے بیلا

کے جو بچپن سے شرارتی اور ذہین لڑکا تھا۔ اسے مذہبی پابندیوں سے چڑ تھی۔ اسے مقامی اسکول میں داخل کرایا گیا تو ناخوش ہونے کے باوجود اس نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جلد اسے ہیزیڈیم میں داخلہ مل گیا جہاں اس نے یہودیوں کی مذہبی تعلیم تاعود حاصل کرنا شروع کی۔ تاعود میں بے شمار کتابیں ہیں اور اسے پڑھنے والے کے لیے ذہین اور اچھی یادداشت کا مالک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تاعود کے الکاسوز یہودیوں میں خاص احترام رکھتے ہیں۔ جلد ہی بیلا نے اپنی ذہانت کے بل پر ہیزیڈیم میں بھی منفرد مقام حاصل کرلیا تھا۔ مزے کی بات ہے بیلا کی کامیاب مجرمانہ کارستانیوں میں اس کی یہی مذہبی تربیت کار فرما رہی تھی جو اس نے ہیزیڈیم میں حاصل کی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم کو جرائم میں استعمال کیا تھا۔ اس نے مذہبی تعلیم حاصل ضرور کی لیکن اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ اسے مذہبی پابندیوں سے چڑ تھی اور محض ان کی خلاف ورزی کرنے کے لیے وہ روز اسکول سے بھاگ کر فٹ بال کھیلنے چلا جاتا تھا۔ یہیں ایک معمولی سا لیکن اہم واقعہ پیش آیا۔ اسے کھیل کے دوران غیر یہودی ساتھیوں نے سور کے گوشت کا برگر پیش کیا۔ یہودی سور نہیں کھاتے لیکن بیلا نے یہ برگر اپنے کمرے میں کھایا۔ اسے مذہب کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے بے حد لطف آیا تھا اور جب نہ آسمان ٹوٹا اور نہ زمین پھٹی تو وہ بالکل مطمئن ہوگیا۔ اس واقعے نے مذہب کو اس کی نظروں میں بالکل بے وقعت کردیا تھا۔ اس نے اسکول میں چھپ کر وہ کتابیں پڑھنا شروع کردیں جنہیں ہیزیڈیم میں ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس نے اولیور ٹوئسٹ جیسے فحش نگار کو پڑھا تھا۔ اس نے سپنوزا، موپٹکسی اور ارسٹوٹیل جیسی بے ہودہ کتابیں پڑھیں، کوئی یقین نہ کرتا اگر اس جیسے ذہین اور سنجیدہ طالب علم پر انہیں پڑھنے کا الزام لگایا جاتا۔

یائیڈش اس کی مادری زبان تھی، ہیزیڈیم میں اس نے عبرانی سیکھی۔ بعد میں وسطی یورپ میں ادھر ادھر لڑھکنے کے دوران میں اس نے متعدد زبانیں سیکھی تھیں۔ ان میں رومانین اور ہنگرین اہم تھیں۔ یائیڈش کی وجہ سے اسے جرمن سیکھنے میں آسانی ہوئی تھی۔ اس سے اٹالین اور اسپینش جیسی مشکل زبانوں عبور حاصل کیا تھا۔ اس نے چیک اور پوش زبانیں سیکھیں۔ حتیٰ کہ اس نے اسرائیل کے ایک نائٹ اسکول میں عربی بھی سیکھی۔ سب سے آخر میں اس نے فرانسیسی پر دسترس حاصل کی۔ واحد زبان جس پر وہ ساری عمر حاوی نہ ہوسکا تھا، انگریزی تھی، مگر وہ کام چلالیتا تھا۔ مذہب اور اس کا ساتھ ماں اور شریر بچے کا تھا۔ وہ یہودی ازم سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی باتوں پر عمل نہیں کرتا تھا۔

مذہب اس کے نزدیک پابندی کا نام تھا۔ ہیزیڈیم میں تعلیم کے دوران اسے فٹ بال کھیلنے، دریا میں تیرنے، شراب خانے اور سینما جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کم عمری میں انہیں ڈھیلے اور مضحکہ خیز لباس پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اسے پابندیوں سے نفرت تھی وہ ہیزیڈیم کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر جاکر زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ آزاد زندگی کے لیے معاشی خود مختاری اوّلین شرط ہوتی ہے۔ ماں باپ کے منع کرنے کے باوجود وہ ایک دندان ساز کا شاگرد بن گیا۔ وہ سیکھنے میں ماہر تھا۔ جلد ہی وہ اس مشکل پیشے پر حاوی ہوچکا تھا۔ ماں باپ اور اسکول والے دونوں اس سے مایوس تھے ان کے خیال میں وہ اپنی صلاحیتیں غلط جگہ استعمال کررہا تھا مگر بیلا خوش تھا اس نے اپنی محدود آمدنی میں سے بھی اتنا پس انداز کرلیا تھا کہ بخارسٹ کا سفر کرسکے۔ مزید رقم کے حصول کے لیے وہ تاجروں کے درمیان کمیشن پر سودے کرانے لگا تھا۔ یہ کاروبار کا اس کے لیے اوّلین تجربہ تھا۔ اس نے گاہک کو ترغیب دینا اور من پسند قیمت طے کرانا سیکھا۔

بخارسٹ کے سفر نے اسے احساس دلایا کہ دنیا کتنی وسیع ہے وہ دنیا دیکھنا چاہتا تھا اس نے مزید رقم جمع کرنا شروع کردی۔ یہ عجیب بات تھی کہ یہودی ہونے کے باوجود اس نے بھی دولت یا آسائشوں کی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے لگژری کاروں، کشتیوں اور پرشکوہ ولاز کی خواہش نہیں کی۔ اس نے بے حساب کمایا لیکن نہ تو بچت کی اور نہ ہی بڑھاپے کے لیے کہیں سرمایہ کاری کی۔ وہ دولت کھلے ہاتھوں لٹاتا رہا۔ اس سے جو بھی ملتا وہ اس کی دریا دلی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا یہودی مذہب کی تعلیمات کی طرح وہ ان کی ازلی کنجوسی سے بھی بیزار تھا۔

۱۹۴۰ء کا عشرہ یورپ اور بالخصوص یہودیوں کے لیے بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ نازی جرمن ہر جگہ ان کا قتل عام کررہے تھے جرمنی کے یہودیوں کا صفایا کرکے نازی باقی یورپ کی طرف متوجہ ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا یورپ فتح کرڈالا۔ ۱۹۴۲ء میں نازی رومانیہ تک آپہنچے تھے۔ جب اپریل ۱۹۴۳ء میں سیفوکیش کے قریب سے اٹھائیس مال بردار ڈبوں والی ریل گاڑی تیرہ ہزار یہودیوں کو لے کر جرمنی کے عقوبت خانوں کی طرف روانہ ہوئی تو ان میں پچیس سالہ خوش پوش و خوش شکل بیلا بھی شامل تھا۔ اس کا

پورا خاندان اس کا ہم سفر تھا۔ انہیں کہاں بھیجا گیا اور ان کے ساتھ کیا گزری وہ کبھی نہیں جان سکا تھا جب مال گاڑی آشوٹز برگ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو اکثر افراد راستے کی صعوبتوں، بھوک، پیاس اور دم گھٹنے سے ہلاک ہو چکے تھے۔ بچ جانے والے خوش نصیبوں میں بیلا بھی شامل تھا۔ انہیں اپنے کپڑے اتار کر پلیٹ فارم پر آنے کا حکم ملا پھر یہ عبرت ناک منظر دیکھنے میں آیا کہ خود کو اعلیٰ ترین نسل اور خدا کی پسندیدہ قوم کہنے والے موت کے خوف سے گروہ در گروہ تن کے تمام کپڑے اتار کر گاڑی سے اتر آئے۔ ان میں بچے، جوان، بوڑھے، ماں باپ، بہن بھائی، باپ بیٹی، سب رشتے دار شامل تھے۔ کہتے ہیں قیامت کے دن سب اپنی قبروں سے برہنہ برآمد ہوں گے مگر یہودیوں کے لیے قیامت سے پہلے ہی قیامت آ گئی تھی۔ نازیوں کا مقصد تھا کہ وہ کوئی قیمتی شے اپنے لباس میں چھپا کر نہ لے جا سکیں۔ ساتھ ہی وہ براہِ راست دیکھ کر اپنے لیے صحت مند قیدی چن رہے تھے جن سے بیگار لی جا سکے۔ جو بھی انہیں صحت مند نظر آتا اسے حکم ملتا۔ "ریچ ٹیٹس" اور اس کا مطلب تھا دائیں طرف چلے جاؤ۔ ان میں بارہ برس سے لے کر پچاس برس تک کے مرد و زن شامل تھے۔ باقی کم عمر، معمر اور بیمار اور کمزور افراد کو "فینکس" (بائیں طرف) کیا جا رہا تھا۔ دائیں قطار والوں کو فوجی ٹرکوں میں بھر کر بیگار کیمپوں کے لیے روانہ کر دیا گیا جبکہ بائیں طرف والوں کے نصیب میں آشوٹز برگ کے گیس چیمبرز تھے۔ بیلا کی مزید خوش قسمتی کہ وہ دائیں قطار میں شامل تھا۔ پہلے انہیں آشوٹز برگ سے متصل ایک کیمپ میں رکھا گیا تھا پھر کسی اور کیمپ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس پورے عرصے میں قید کے دوران وہ ایک سے دوسرے کیمپ میں منتقل ہوتا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے لیے واحد اہمیت زندہ رہنے کی تھی۔ اسے ایک گھنٹے سلامتی کی ضمانت بھی غنیمت لگتی تھی۔

بیلا نے ظلم و تشدد، انسانیت کی توہین اور قتلِ عام کے لرزہ خیز مناظر دیکھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھیوں کی قبریں کھودیں۔ اس کا احساس ختم ہو گیا تھا لیکن زندہ رہنے کی جبلّت بہت طاقت ور تھی۔ اس نے دیکھا کہ جسم سے زیادہ روح اور جذبے کی طاقت نے فتح پائی۔ اس کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے شان دار جسموں والے سوکھ کر گیس چیمبر کی خوراک بن گئے مگر مختصر جسامت والے بیلا نے تمام مصائب کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ اپنا حوصلہ بحال رکھا اور آخر کار بچ نکلا۔

نازی کیمپوں میں ایک پل کا اعتبار نہیں تھا۔ خاص طور سے یہودیوں کی زندگی کتوں سے بدتر تھی۔ وہ حوصلہ ہار چکے تھے۔ بیلا زندہ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیمپ میں اس کی ملاقات روپوش شعبدہ بازوں سے ہوئی۔ بیلا کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر انہوں نے اسے متعدد شعبدے سکھائے۔ جیسے دوسروں کی نگاہوں کو دھوکا دینا بڑی اشیا کو ہتھیلی اور آستین میں چھپانا اور جیب تراشی، یہ فنون بعد میں اس کے بے حد کام آتے تھے۔ وہ شاطر ترین لوگوں کو آسانی سے دھوکا دے جاتا تھا۔

اپنے کام کا آغاز اس نے بیگار کیمپ میں ہی کر دیا تھا۔ اس نے گارڈز کو رشوت دے سامان کی اسمگلنگ شروع کی۔ اس کے پاس ایک معمولی سی گھڑی تھی۔ جو اس نے جعل سازی میں استعمال کی وہ دھات کے ٹکڑوں اور چمڑے کی مدد سے ایسی گھڑیاں بنا لیا کرتا تھا جو دیکھنے میں اصل نظر آتی تھیں۔ وہ خریدار کو اصل گھڑی دکھا کر سودا کرتا اور عین موقع پر اسے جعلی گھڑی تھما دیتا۔ وہ اتنا دلیر تھا کہ اس نے کیمپ کے گارڈز کو بھی یہ گھڑی فروخت کی تھی۔ اس کے بدلے وہ خوراک یا کوئی رعایت حاصل کر لیتا تھا۔ اسے جہاں بھی بھیجا گیا اس نے اپنی صلاحیتوں اور چرب زبانی سے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس میں موقع سے فائدہ اٹھانے کی بے مثال صلاحیت تھی۔ اس نے ایک بار ایک اندر سے خالی گھڑی میں مکھی پکڑ کر بند کی اور اسے خوراک کے بدلے دوسرے قیدی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ بے چارہ مکھی کی آواز کو گھڑی کی ٹک ٹک سمجھ کر خوش ہوتا رہا۔ ان دنوں بیگار کیمپوں میں خوراک سونے اور جواہرات سے زیادہ قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ نازی قیدیوں کو زیادہ خوراک دینے کے قائل نہیں تھے۔ انہیں قیدیوں کے کمزور ہونے کی پروا نہیں تھی کیونکہ تازہ قیدیوں کی آمد ہر وقت جاری رہتی تھی۔ قیدی اتنے بھوکے رہتے تھے کہ ایک ٹکڑے روٹی کے بدلے اپنے ساتھی کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ یہاں کسی کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہونے کا مطلب تھا اس کی جان خطرے میں ہے۔

جنگِ عظیم میں نازی جرمنی کی شکست کے بعد امریکی فوج نے میونخ کے پاس کے کیمپوں سے ہزاروں قیدیوں کو آزاد کیا تھا..... ان میں بیلا بھی شامل تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہی ساٹو میسز جا پہنچا۔ اس جگہ اس کا پورا خاندان آباد تھا لیکن اب وہ اپنے گھر کا واحد زندہ فرد تھا۔ اس کا حویلی نما آبائی مکان جلے ہوئے کھنڈر کی شکل میں باقی تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے باپ کی دکان اور اس میں موجود کپڑا محفوظ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو تلاش

کررہا تھا مگر ان میں سے کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ وہی نہیں بلکہ ساٹومیئر سے لے جائے جانے والے تیرہ ہزار یہودیوں میں سے صرف چھ سو واپس آسکے تھے۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر بیلا نے زندہ رہنے کی جدوجہد شروع کردی وہ اپنے باپ کی دکان پر بیٹھنے لگا اور کپڑا بیچ بیچ گزارہ کرتا رہا پھر اسے خوشخبری ملی کہ اس کی ایک بہن روزیلا بچ گئی تھی لیکن وہ اسے نہیں ملی۔ وہ امریکا چلی گئی تھی اور اس نے وہیں کی شہریت اختیار کرلی تھی۔ اسے بھی پیشکش ہوئی کہ وہ چاہے تو امریکی شہریت حاصل کرسکتا تھا اس نے اسے مسترد کردیا۔

ساٹومیئر کا یہودی تشخص ختم ہونے کے بعد بیلا خود کو یہاں اجنبی محسوس کرنے لگا تھا۔ جلد اس نے قصبے میں موجود اپنی ہر شے فروخت کردی اور ہمیشہ کے لیے وہاں سے نکل آیا۔ اس نے وسطی یورپ کا رخ کیا جہاں روسی قابض تھے۔ کچھ یہودی اسرائیل کا رخ کررہے تھے انہوں نے بیلا کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن مذہب بیزار بیلا نے مذہب کے نام پر قائم ہونے والی اس ریاست میں جانے سے انکار کردیا مگر اپنی پونجی کا بڑا حصہ اس نے ان خاندانوں کے حوالے کردیا جو اسرائیل جارہے تھے۔ اس وقت یورپ شدید انتشار کا شکار تھا۔ ساٹومیئر سے نکلتے ہی بیلا نے اپنا نام تبدیل کرلیا۔ بعد میں تو اس نے اتنی سرعت سے نام بدلے لگتا تھا وہ اپنا اصل نام بھول جانا چاہتا تھا۔ نام کی طرح اب اس کی کوئی منزل بھی نہیں تھی بس ایک شہر سے دوسرے شہر بھٹکتا رہا۔ ان دنوں پاسپورٹ کی پابندی نہیں تھی۔ ایک سرد اور کہر آلود شام وہ ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ میں داخل ہوا۔ اس کی جیب میں چند سکے تھے۔

آشوٹز برگ میں اس کی ملاقات ایک جعل ساز سے ہوئی تھی جو کسی بھی شخص کی تحریر یا دستخط کی بے مثال نقل کرلیتا تھا۔ کوئی بھی مہر ایک بار رکھ کر اس کی نقل تیار کرلینا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے اپنی اس مہارت سے قید خانوں میں خوب تازہ اٹھایا تھا اور بالآخر رہائی کے جعلی کاغذات بنا کر غائب ہوگیا تھا۔ بیلا نے اس سے جو سیکھا تھا وہ بعد میں جعلی شناختی اور سفری دستاویزات کی تیاری میں اس کے کام آیا تھا۔ بیلا بے مقصد شہر کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ریستوران میں بیٹھے ریڈ آرمی کے ایک گروپ پر پڑی جو کھانے پینے اور ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ بیلا نے جلدی سے شیشے میں دیکھ کر اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ کپڑے درست کیے اور رومال سے چہرہ صاف کیا اور پھر جوتے صاف کرکے ریستوران کے اندر داخل ہوا۔ لگا تار سانس لے کر اس نے اپنا چہرہ سرخ کرلیا تھا۔ اب اس کی شخصیت اور اس کی ہوا میں تیرتی چال دیکھنے والی تھی۔ اس نے یہ انداز بڑی ریاضت کے بعد سیکھا تھا۔

”راشے زڈوروے۔“ اس نے بلند آواز سے کہا ”اس بیزار کُن شہر میں پہلی بار کچھ روسی نظر آئے ہیں۔“

روسیوں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر زور سے بولے ”واشے زڈورے۔“ گویا انہوں نے اسے اپنا ہم وطن تسلیم کرلیا تھا۔ انہوں نے کرسیاں کھسکا کر اس کے لیے جگہ بنائی۔ ان میں ایک سارجنٹ اور چار کارپول تھے۔ وہ سب نشے میں تھے۔

”کامریڈ تم کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے ایک روسی فوجی سے پوچھا۔ اپنے بارے میں کوئی کہانی سنانے سے پہلے وہ ان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہیں کوئی اس کا ”ہم وطن“ نہ نکل آئے۔ ان سب کے تعارف کے بعد اس نے ان کو بتایا ”میں یعنی پیٹر سیمونووچ جارجیا سے آیا ہوں۔“ اس نے ممکنہ حد تک دور کے خطے کا انتخاب کیا تھا۔ بیلا کی جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ایک جام پی سکتا۔ اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور دائیں طرف بیٹھے فوجی کے کوٹ کی جیب ٹٹولی وہ خالی تھی مگر خوش قسمتی سے بائیں طرف بیٹھے فوجی کی جیب میں نوٹوں کی گڈی موجود تھی۔ بیلا نے گن کر اس میں سے دس نوٹ نکالے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میں وہ متاثر کن الفاظ میں اپنے وطن کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا۔ جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

”سروس۔“ بیلا نے چلا کر کہا ”واڈکا کی ایک بوتل اور اپنے باورچی خانے کے بہترین کھانے لے آؤ۔“

روسی کھل اٹھے۔ دیارِ غیر میں ایک سخی ہم وطن کسے برا لگتا ہے۔ بیلا نے نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے انہیں اپنے بارے میں پوچھنے سے پہلے بتانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے خود کو روسی فوج کا ترجمان قرار دیا جسے چند ضروری کاغذات دے کر دوسرے شہر بھیجا گیا تھا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی یونٹ وطن واپس جاچکی تھی اب وہ بغیر کاغذات اور حکومتی احکام کے یہاں پڑا تھا ”ان حالات میں ایک شخص سوائے شراب پینے کے اور کیا کرسکتا ہے؟“ اس نے سوال کیا تو روسی ہنس پڑے تھے۔

”اے ترجمان تم کیا بول سکتے ہو۔“ ایک فوجی نشے میں چلایا۔

”میں کیا بول سکتا ہوں۔“ بیلا نے حیرت سے کہا اور پھر

اس جملے کو ہر زبان میں دہرانا شروع کردیا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ روسی ہی رکھا تھا۔ بالآخر روسیوں نے یقین کرلیا۔ جب قہقہوں کا شور کم ہوا تو سارجنٹ نے کہا "دیکھو ہمیں کام کے لیے ایک ترجمان چاہیے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کاغذات میری ذمے داری ہیں۔ کون جان سکتا ہے کہ احکام کہاں سے آئے بلکہ میرے خیال میں کوئی پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کرے گا۔"

بیلا نے تجاہلِ عارفانہ سے کہا "مجھے کیا۔ مجھے ایک اجازت نامہ دو میں تمہارا ہو جاؤں گا۔"

جیسے جیسے روسی فوجیوں کا نشہ گہرا ہو رہا تھا بیلا کو خدشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ سو ہی نہ جائیں اور اس کا اجازت نامہ کھٹائی میں پڑ جائے۔ نشے میں سارجنٹ نے اسے بتایا کہ وہ کوارٹر ماسٹر ہے، گیریژن کے ذخیرے کا انچارج، وہ راشن سپلائی کرتے تھے۔ اتھارٹی کے تحت مقامی آبادی سے راشن جمع کرکے گیریژن بھجواتے تھے اور پھر اسے فوج میں تقسیم کرتے تھے۔ نشے کی وجہ سے روسی دیکھ نہیں سکے کہ بیلا کے چہرے پر کیسی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ قدرت نے اسے شان دار موقع فراہم کیا تھا۔ ایسا موقع ہزار میں ایک بار ہی ملتا ہے۔ روسی گوداموں میں وہ سب کچھ تھا جس کی عوام میں مانگ تھی اور وہ اس کے بدلے منہ مانگے دام دینے کو تیار تھے۔

"سمجھ گئے ناں؟" سارجنٹ نے جھومتے ہوئے کہا "تم۔ کل صبح ہیڈ کوارٹر آجانا۔"

اس کے بعد وہ ایک روسی گیت گانے لگے حتیٰ کہ ان کے سر میزوں سے جا لگے تھے۔ سوائے بیلا کے جس کا شاطر ذہن آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اگلی صبح وہ فوج کے مقامی ہیڈ کوارٹر جا پہنچا تھا۔ یہ عالی شان محل جو کسی نواب کا تھا اب ریڈ آرمی کے قبضے میں تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے نکال کر لکڑی کے تختے لگادیے گئے تھے اور جا بجا خندقیں اور مورچے بنے ہوئے تھے۔ چھت پر ریت کی بوریوں کے درمیان طیارہ شکن توپیں نصب تھیں۔ اس نے جاتے ہی سارجنٹ سے کہا۔

"پیٹر سیمونو وچ ڈیوٹی پر رپورٹ کرتا ہے کامریڈ سارجنٹ!" اسے خوف تھا کہ وہ کہیں بھول نہ گیا ہو لہٰذا اس نے پوچھنے کا خطرہ مول نہیں لیا "سرکاری ترجمان، ڈویژنل ہیڈ کوارٹر۔ بوڈاپسٹ!"

سارجنٹ نے اسے پہچان لیا تھا اور فوری طور پر کچھ کاغذات ترجمے کے لیے دے دیے تھے۔ اسٹور میں اس نے قدم رکھا تو اس کی آنکھیں وہاں موجود سامان دیکھ کر چمک اٹھی تھیں۔ تمباکو، گیسولین، گندم، روٹی، جوتوں اور کپڑوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ ان میں سے ہر شے سونے کے بھاؤ بک سکتی تھی۔ اس نے اپنے بڑے سے بریف کیس میں سے کاغذات نکال پھینکے اور وہاں سے تمباکو اور جوتے اٹھالیے تھے۔ وہ ہوشیاری سے کام لیتا تو اس گودام سے خاصے عرصے تک فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ گودام میں موجود اشیا کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ وہ روسیوں کو شبہ دیے بغیر اپنا کام کرنا چاہتا تھا۔ ترجمانی کی آڑ میں اس کا کاروبار چل نکلا تھا۔ کیونکہ خریداروں اور دولت کمانے کے خواہش مندوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بیلا نے بعد اپنے مددگار ڈھونڈ لیے اور ان کی مدد سے اسٹور میں بڑے پیمانے پر خُرد بُرد کرنے لگا تھا۔ اس کے گاہک وینے کے امرا تھے جو گندم، شراب، ایندھن، جوتوں اور تمباکو جیسی معمولی اشیا کے عوض فراغ دلی سے سونا اور جواہرات دے رہے تھے۔ ان دنوں ہنگری میں اس شخص کی شہرت سب سے زیادہ ہوتی تھی جو خوراک فروخت کرتا ہو۔ جلد بیلا شیطان کی طرح مشہور ہوگیا تھا۔ اس نے ہمیشہ فرضی نام استعمال کیا لہٰذا سیمونووچ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ روسیوں میں اس کی ساکھ برقرار رہی تھی۔ اس نے کئی مہینے تک یہ کام کیا اور بے تحاشا کمایا بعض اوقات اس نے ایک بوری گندم یا جوتوں کی جوڑی کے بدلے قیمتی جواہر حاصل کرلیے۔ کئی دفعہ وہ جب سامان بیچ کر واپس آتا تھا تو اس کی جیبیں سونے اور جواہرات سے بھری ہوتی تھیں۔

ایک آرین عورت نے اسے ایک خاصا قیمتی ہیرا دیا "میں اسے آٹھ کلو گوشت کے بدلے دے سکتی ہوں۔"

بیلا نے محدب عدسے سے اس کا معائنہ کیا "خوب پتھر ہے ڈھائی قیراط وزنی ہے لیکن میں صرف پانچ کلو گوشت دے سکوں گا۔"

عورت فوراً راضی ہوگئی تھی مگر بدقسمتی سے بازار میں گوشت دستیاب تھا ہی نہیں۔ لہٰذا اس نے ہیرا حاصل کرنے کا متبادل منصوبہ بنایا۔ اس نے بازار سے بالکل ویسا ہی ہیرا ترشوایا جو نقلی تھا۔ اگلے روز وہ مقررہ وقت پر بازار پہنچا عورت منتظر تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ کل چور بازار میں گوشت کے دام دوگنے ہوگئے ہیں۔ ممکنہ طور پر اب ہیرے کی قیمت پانچ کلو گوشت جتنی نہیں رہی ہے۔ میں پھر ہیرا دیکھنا چاہوں گا کہ اب اس کے بدلے کتنا گوشت دے سکوں گا۔"

عورت نے مایوسی سے اسے ہیرا دیا اور بیلا نے موقع

پاتے ہی اسے بدل دیا اور عورت سے بولا "میں کل سہ پہر اس جگہ گوشت لے کر آؤں گا۔" اس نے کہا اور جیب سے تمباکو کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکال کر اسے پیش کی "نیک تمنا کے طور پر۔"

عورت نے خوش ہو کر اسے گرم جوشی سے رخصت کیا۔ وہ بے چاری بے خبر تھی کہ جانے والا اس کی آخری جمع پونجی بھی لیے جا رہا تھا۔ وہ دوبارہ کبھی اس جگہ پر نہیں آیا تھا۔ عام حالات میں اسے اس کی پہلی باقاعدہ چوری کہا جا سکتا تھا۔ اس کے منہ خون لگا تو اس نے چوری اور دھوکے بازی بھی شروع کر دی۔ وہ شکار کا انتخاب بڑا دیکھ بھال کرتا تھا۔ جلد اس کے پاس سونے اور سونے کے زیورات کا ڈھیر لگ گیا تھا مگر اس کی خاص فیلڈ ہیرے تھے انہیں وہ ہر شے پر ترجیح دیتا تھا۔ کم وزن میں اس سے زیادہ مالیت رکھنے والی شے اور کوئی نہیں ہوتی اور دنیا میں ہر جگہ انہیں قبول کیا جاتا ہے۔ اس عرصے میں بیلا نے چوری کی تربیت حاصل کی۔ اسے نفسیات میں ملکہ حاصل تھا اور اس کی بے خوفی اس کا ہتھیار تھی۔ طویل عرصے تک روسیوں اور مقامی افراد کو لوٹنے کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ اب اس سلسلے کو جاری رکھنا مناسب نہ ہوگا۔ کامیابی کے ساتھ اس کے دشمنوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ نئے میدان تلاش کرے۔

۱۹۴۸ء میں تباہ شدہ یورپ سے لوگ گروہ در گروہ ارجنٹینا کا رخ کر رہے تھے۔ بیلا بھی ولی کرائٹزر بن کر وہاں جا پہنچا تھا۔ اس نے وہاں خاصے طویل عرصے قیام کیا لیکن مستقل رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ بعد میں وہ پورے لاطینی امریکا میں گھومتا رہا تھا۔ اس دوران میں اس کی ملاقات ہرز چازان نامی شخص سے ہوئی۔ وہ جعلی چیک لکھنے اور دستاویزات بنانے کا ماہر تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب بیلا نے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ نوسر بازوں کی بہترین ٹیم تھی۔ چازان اداکارانہ صلاحیتوں میں کس طرح بیلا سے کم نہیں تھا۔ وہ نفیس اور باوقار لباس پہنتا تھا۔ کبھی کبھی عینک بھی لگاتا تھا۔ انہوں نے مل کر دنیا بھر میں فراڈ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

وہ ہندوستان پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک مقامی ہندو راجا کو شیشے میں اتار لیا۔ وہ جب بھی اپنی ریاست سے آتا تھا تو بمبئی کے اسی محل میں ٹھہرتا تھا۔ مشرق کی دولت مندی کے قصے انہوں نے سن رکھے تھے لیکن اس کا مشاہدہ پہلی بار کر رہے تھے۔ انہوں نے راجا کے سامنے قیمتی پتھروں کا چارا ڈالا اور اس نے نگلتے ہوئے انہیں اپنے محل میں مدعو کر لیا۔ محل کی سج دھج دیکھ کر وہ مرعوب ہوئے تھے اور راجا کے لمبے تڑنگے محافظ دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوئے لگتے تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں ان کی خیر نہیں تھی۔ راجا کی شان و شوکت نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے آج تک کسی فردِ واحد کے جسم پر اتنے سارے اور اتنی قیمتی زیورات اور جواہرات نہیں دیکھے تھے۔ وہ اس سے مرعوب ہوئے تھے لیکن ان کا شاطر ذہن اسے لوٹنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ پورے اطمینان سے راجا کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے۔ بیلا کے خیال میں راجا کی پگڑی میں لگے ہیرے کی مالیت ہی کم سے کم ایک لاکھ ڈالرز تھی۔

ان کی توقع کے برعکس راجا خاصا گھاگ ثابت ہوا تھا۔ اس نے قیمت پر خاصی بحث کی اور پھر چند اچھے پتھر خریدنے پر رضامندی ظاہر کی۔ بالآخر سودا ہو گیا راجا نے اسے انڈین روپے کی گڈیاں دیں اور اس نے ہیروں کا لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ ظاہر ہے اس میں جعلی ہیرے تھے۔ اصل ہیروں والا پیکٹ گفتگو کے دوران بیلا کی جیب میں پہنچ چکا تھا۔ راجا کے محل سے نکلتے ہی انہوں نے بمبئی سے روانہ ہونے والے پہلے ہوائی جہاز پر نشست حاصل کی اور فرار ہو گئے۔ اس سفر کے دوران وہ دنیا کے کئی ممالک میں گئے تھے اور لازمی طور پر انہوں نے وہاں پر بھی فراڈ کی وارداتیں کی ہوں گی۔ ارجنٹائن واپسی پر اس نے دندان سازی کا کام شروع کر دیا لیکن یہ صرف ایک آڑ تھی۔ اس کے پردے میں وہ بڑے پیمانے پر سونے کی اسمگلنگ کر رہا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے جمع شدہ ہیرے بارہ ہزار ڈالرز میں فروخت کر دیے اور نہیں معلوم کہ اس نے اس خطیر رقم کا کیا کیا۔ اندازہ ہے کہ اس نے یہ رقم اسرائیلی یہودیوں کے آبادکاری فنڈ میں دے دی تھی۔ یہاں اس نے ہسپانوی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ لوگ اسے مقامی ہسپانوی سمجھنے لگے تھے۔ اس نے بہت کچھ سیکھا تھا سوائے ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے کے۔ احتیاطاً بھی وہ زیادہ عرصے ایک جگہ نہیں رہتا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں بیلا اور چازان آسٹریلیا گئے جہاں انہوں نے ایک جوہری پر ہاتھ صاف کیا اور فرار ہو کر ہانگ کانگ چلے آئے۔ چازان نے تجویز پیش کی کہ انہیں جنوبی افریقا چلنا چاہیے وہاں ہیروں کی کانیں ہیں۔ ممکن ہے انہیں سستے داموں ہیروں کی کوئی کان مل جائے ورنہ وہ کان کنی کرنے والی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کر سکیں گے۔ بیلا اس کے منصوبے سے متفق نہیں تھا لیکن وہ جنوبی افریقا چلے آئے۔ وہ ہیروں کی کان کنی

کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن ان کی ملاقات کان کنوں کے ایک گروہ سے ہوگئی جو ہیرے کی کانوں سے نکالے جانے والے ہیرے چرا کر سیاحوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ ان سے ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی چاژان فرانسیسی بنا ہوا تھا اور اس نے فرانسیسی اعزاز لیجن آف آنر اپنے کوٹ پر ٹانک رکھا تھا۔ وہ ان کان کنوں کو بتا رہا تھا کہ وہ کس طرح ہیرے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں چھپا کر لا سکتے تھے۔ اس پر کان کنوں نے اسے بتایا کہ وہ ان تمام طریقوں سے واقف ہیں اور یہ قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہیں کیونکہ جب کان کن کام کر کے باہر آنے لگتے ہیں تو ان کے پورے جسم کا ایکسرے لیا جاتا ہے۔ چاژان کھسیا گیا تھا۔ بعد میں بیلا نے اس پر خوب ہی قہقہے لگائے تھے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے اصل کام کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ساری دنیا کی طرح ٹمبرلے کی جوہری مارکیٹ پر بھی یہودیوں کا قبضہ تھا۔ بیلا نے چالاکی سے کام لے کر ان سے مارکیٹ کے بجائے سینا گوگ میں ملاقات کی تھی۔ ان پر اس نے اپنی مذہبی شخصیت اور قابلیت کا رعب جمایا اور انہیں چوٹ دے گیا۔ جنوبی افریقا سے واپسی پر اس کے پاس سولہ ہزار ڈالر زمالیت کے ہیرے تھے جن کی قیمت یورپ اور امریکا میں دوگنی ہو جاتی تھی۔ یہ ہیرے بعد میں اس کے پاس سے برآمد ہوئے جب وہ گرفتار ہوا تھا۔

○☆○

بیلا اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا تمام تر احتیاط اور اپنی مہارت کے باوجود وہ ایک نہ ایک دن ضرور گرفتار ہو جائے گا۔ وہ گرفتاری سے خوف زدہ نہیں تھا۔ بلکہ اب بھی وہ قید خانے جیسی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے ہر روز زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ اس وجہ سے اس کی زندگی بغیر کسی نظم کے بے ترتیب گزر رہی تھی۔ وہ رقم جمع کرنے کے بجائے جلد از جلد اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ کچھ رقم تو اخراجات میں کھپ جاتی تھی مگر اس کا بڑا حصہ وہ اسرائیل اور یورپ میں جنگ سے تباہ یہودیوں کی آبادکاری کے فنڈ میں دے دیا کرتا تھا۔ ایسا کر کے اسے بے حد سکون ملا کرتا تھا۔ وہ خود کو جدید دور کا رابن ہڈ قرار دیتا تھا۔ کبھی وہ لکھ پتی ہوتا تھا اور کبھی اس کی جیب میں ایک وقت کے کھانے کی رقم بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس نے کبھی رقم کی پروا نہیں کی لیکن ساتھ ہی اسے عالی شان زندگی گزارنا پسند تھا۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ مہنگے ترین ریستورانوں میں کھانا کھاتا تھا اور نفیس ترین ملبوسات استعمال کرتا تھا اپنی ذات کی حد تک اس کے یہی خرچے تھے۔ اسے نہ شراب کا شوق تھا اور نہ شباب کا۔ اس نے زندگی بھر کوئی مکان، کوئی جائداد نہیں بنائی اور نہ ہی کبھی کوئی کار خریدی۔ وہ ایک بے نام و نشان شخص تھا۔

اپنے دفتر میں مارسل جاسوسوں سے رپورٹ وصول کر رہا تھا۔ یہ دنیا بھر میں ہونے والی ان فراڈ نما چوریوں کے بارے میں تھیں۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی تفتیش کا راستہ متعین ہو رہا تھا لیکن چور کے بارے میں وہ اب بھی مکمل تاریکی میں تھے۔ اس نے درجنوں وارداتوں میں فنگر پرنٹ کا ایک نشان بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اگر ایک پرنٹ بھی مل جاتا تو ان کی مشکل آسان ہو جاتی لیکن اس بات سے واقف چالاک چور نے ایک بار بھی یہ حماقت نہیں کی تھی۔ مارسل نے کہا۔

"ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب وہ ہمارے قابو میں آئے گا۔"

۱۹۵۲ء میں انہیں پہلی بار کامیابی کے کچھ آثار نظر آئے تھے۔ سارجنٹ ہانا نے مارسل کے دفتر میں آکر کہا "ایک اور کیس۔ بالکل وہی طریقہ دو آدمی اور ہیروں کی چوری۔"

"مگر کہاں اور کب؟" مارسل نے دریافت کیا۔

"دو ہفتے پہلے میکسیکو میں، مگر اس وقت ذرا مختلف معاملہ ہے ہمیں دو عدد فنگر پرنٹس بھی ملے ہیں۔"

دو افراد میکسیکو کے اس قصبے باجا کیلی فورنیا میں ایک جیولری شاپ پر آئے۔ انہوں نے ہیرے خریدنے کی خواہش ظاہر کی حلیے سے وہ بہت امیر نظر آتے تھے۔ ایک نے خود کو نبین بلاس اور دوسرے نے وال رومانو کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ انہوں نے ہیرے دیکھے اور چلے گئے ان کے جانے کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ اصلی ہیروں کی جگہ جعلی ہیرے چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں پولیس کو شاپ کے شوکیس پر انگلیوں کے دو نشانات ملے تھے۔

مارسل نے فوری طور پر فائل انٹرپول کے فنگر پرنٹ سیکشن میں بھجوا دی اور سارے عملے کو اس پر کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ کئی گھنٹے کی جدوجہد کے بعد انہوں نے ایک ملتا ہوا فنگر پرنٹ تلاش کر لیا۔ کارڈ کے مطابق اس کا نام ہرز چاژان تھا۔ اس کا مکمل حلیہ تھا۔ وہ فرانسیسی تھا اور زیادہ ذہین نہیں تھا ہر واردات میں اس نے اصل نام استعمال کیا اور ہر جگہ اپنے فنگر پرنٹس چھوڑ آیا تھا۔ البتہ وہ جعلی دستاویزات اور کاغذات بنانے کا ماہر تھا۔ وہ صرف ایک بار

اسرائیل میں پکڑا گیا تھا اور مختصر سزا کے بعد رہا ہو کر غائب ہوگیا تھا۔ اس کا پول لزبن میں ہونے والی چوری میں پکڑے جانے والی فنگر پرنٹس اسرائیل بھیجنے سے کھلا تھا۔ اب اس کی بدقسمتی کہ بیلا جیسے مکار شخص کے ساتھ ہونے کے باوجود وہ انٹرپول کی نظروں میں آگیا تھا۔ فوری طور پر اس کے فنگر پرنٹس معہ حلیے کے تمام ممالک کو بھجوا کر ان سے چاژان کی گرفتاری کی درخواست کی گئی تھی۔

جلد مارسل کی خوش فہمی دور ہوگئی کہ چاژان جلد گرفتار ہوجائے گا۔ اسے شبہ تھا کہ چاژان اس کا مطلوبہ شخص ہے یقیناً دوسرا شخص ہی ان کا مطلوبہ مجرم تھا اور ان دونوں کی جوڑی ایک مہینے میں ایک واردات کی شرح سے جرائم کررہی تھی۔ وہ بے حد دلیری اور مہارت سے ان ممالک میں وارداتیں کررہے تھے جہاں پولیس بے حد مستعد ہوتی ہے۔ ہر جگہ سے وہ واردات کرکے کامیابی سے نکل جاتے تھے اور پولیس لکیر پیٹتی رہ جاتی تھی۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں دو افراد نے جینیوا میں ایک سیلزمین کے ساتھ دھوکا کیا اور دو ہزار ڈالرز کے مساوی سوئیس فرانک لے اڑے۔ یہ بلاشبہ چاژان اور اس کے ماسٹر کا کام تھا۔

سیلزمین اور ایجنٹ سوشے گردس باقاعدگی سے مقامی سیناگوگ جاتا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات ایک غیر مقامی یہودی گولڈ برگ سے ہوئی تھی۔ اس نے گردس کو بتایا کہ وہ اجنبی ہے۔ وہ خوف زدہ اور نروس نظر آرہا تھا۔ وہ یوکرائن سے آیا تھا اور خود کو دنیا میں اکیلا محسوس کرتا تھا۔ گردس کا دل اس کی تنہائی پر پگھل گیا اور اس نے اسے فوراً ڈنر پر اپنے گھر مدعو کرلیا تھا۔ ڈنر کے دوران مسز گردس انہیں کھانا سرو کرتی رہی اور وہ کھانے کے دوران مذہب پر بحث کرتے رہے تھے۔ گردس نے محسوس کیا کہ گولڈ برگ مذہب سے زیادہ متاثر نہیں تھا۔ ڈنر کے بعد گردس نے اسے بعض نایاب سوئیس گھڑیاں اور شوپیس دکھائے۔ گولڈ برگ نے دلچسپی سے انہیں دیکھا لیکن ساتھ ہی کہا کہ اسے ان چیزوں سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک دوست ان چیزوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ کل جینیوا آرہا ہے۔

گردس کی باچھیں کھل گئی تھیں "تم کل ہی اپنے دوست کو یہاں لاسکتے ہو۔"

گولڈ برگ نے موضوع بدل دیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کچھ عرصے پہلے ایک امریکی کو کچھ اشیا فروخت کرکے ڈالرز لیے تھے۔ راستے میں اس سے بریف کیس گم ہوگیا۔ جو خوش قسمتی سے مل بھی گیا تھا لیکن اس تجربے کے بعد وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے گردس سے کہا۔

"مجھے درخواست کرتے ہوئے شرمندگی ہورہی ہے لیکن مہربانی فرما کر تم میری یہ رقم اپنے پاس امانتاً رکھ لو۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں وہاں کا سیکیورٹی کا نظام زیادہ بہتر نہیں ہے۔ میرا دل تم پر اعتماد کرنے کو چاہ رہا ہے۔"

"ارے نہیں۔" گردس نے فخر سے کہا "مجھے تمہارے کام آکر خوشی ہوگی۔ مجھ پر اس سے پہلے کسی نے یوں اعتماد نہیں کیا۔"

یہ گولڈ برگ یعنی بیلا کا پرانا حربہ تھا۔ وہ شکار پر اعتماد کرکے اسے مجبور کردیتا تھا کہ وہ بھی اس پر اعتماد کرے اور یوں وہ مارا جاتا تھا۔ اس شام کو اس نے ایک تھیلے ڈیل لپیٹے ڈالرز گردس کو لاکر دے دیے۔ اس نے گردس سے کسی قسم کی رسید کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ اس نے گردس کو خوشی سے پھلا دیا تھا۔ وہ بالکل مسخر ہوچکا تھا لیکن بیلا میں عام چوروں کا سا چھچھورا پن اور جلد بازی نہیں تھی۔ شکار پھانستے ہوئے اس کی حرکات نہایت نپی تلی اور گفتگو باوقار ہوتی تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی ولی کاروبار کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کے انداز میں ایسی بات ہوتی تھی کہ اس کے شکار کو اس پر شبہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

اگلے روز وہ اپنے دوست ہوورنز کے ساتھ آیا۔ یہ دوست ظاہر ہے ہرز چاژان کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ اس نے گردس کے پاس موجود گھڑیاں اور شوپیس دیکھے۔ اس نے کہا "یہ مجھے پسند آئی ہیں۔ میں انہیں خریدنا پسند کروں گا مگر ساتھ ہی تین نادر ہیرے اور دو ہیرے کی انگوٹھیاں بیچنا پسند کروں گا۔"

گردس نے معذرت کی کہ اسے ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم اس لیے وہ ان کی ڈیل نہیں کرے گا لیکن اس نے انہیں اپنے ایک واقف کار جوہری سے ملوا دیا۔ اس نے ان ہیروں اور انگوٹھیوں کو بہترین قرار دیتے ہوئے ان کی قیمت بارہ ہزار ڈالرز لگائی تھی۔ گولڈ برگ اور اس کے ساتھی نے اس پیشکش کو مناسب قرار دیا تھا۔ اس کے بعد ہوورنز نے کہا "مجھے واپس جانے سے پہلے مختصر سی خریداری کرنی ہے۔ اگرچہ یہ مناسب ہے لیکن میری درخواست ہے کہ تم مجھے دو ہزار ڈالرز کے مساوی سوئیس فرانک دے دو۔ میں ہیرے تمہارے پاس چھوڑ دیتا ہوں اور ضمانت کے طور پر ایک چیک بھی لکھ دیتا ہوں۔"

شامت کے مارے گردس نے بخوشی چیک قبول کرکے اسے دو ہزار فرانک کے مساوی رقم دے دی۔ اس نے

انہیں پھر شام کے کھانے کی دعوت دی "مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر تم دونوں آج رات کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔"

مگر گولڈ برگ نے شائستگی سے معذرت کرلی "تمہاری دعوت کا شکریہ۔ دراصل آج رات ہم کہیں اور مدعو ہیں۔"

گردس نے ان کے ہیرے ان کے سامنے ڈرائنگ روم میں رکھے ایک گلدان میں ڈال دیئے۔ بقول اس کے یہ جگہ محفوظ تھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس معمولی سے گلدان میں ایسی کوئی شے ہوگی۔ گولڈ برگ اور اس کا ساتھی فوری طور پر جانے کے بجائے وہیں گلدان کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ ان کے ایک لطیفے پر گردس ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا تھا۔ شام کو جب اپنے کام سے فارغ ہوکر وہ سینا گوگ گیا تو طویل انتظار کے بعد بھی وہ دونوں نہیں آئے تھے۔ گردس شک میں پڑگیا تھا۔ اس نے جلدی سے گھر جاکر گلدان چیک کیا اور اسے خالی پاکر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اسے ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ جب اس نے لطیفے پر قہقہے لگائے تھے تو ان میں سے کسی نے گلدان سے ہیرے اور ان کے دیئے ڈالرز نکال لیے تھے۔ بعد میں ان کا دیا چیک بھی جعلی نکلا تھا' ایک اور کامیاب واردات بیلا اور چازان کے کھاتے میں درج ہوگئی تھی۔

○☆○

اس کے چند ہی دن بعد بیلجئم کے پولیس کمشنر جنرل فرمن فریسنین کو ایک مخبر نے خبردار کیا کہ دو عالمی چور بیلجئم میں داخل ہوچکے تھے اور وہ اینٹسورپ میں واردات کی فکر میں تھے۔ ان کے نام پاندے اور سیمو نیٹی بتائے گئے تھے۔ یہ سنتے ہی فرمن فکر مند ہوگیا تھا۔ وہ ایک اچھا اور فرض شناس پولیس مین تھا جو بعد میں انٹرپول کا صدر بھی بنا تھا۔ اینٹورپ بیلجئم کا ایک قصبہ تھا جو دنیا بھر میں ہیروں کی تجارت کا سب سے بڑا عالمی مرکز تھا۔ اب یہ اعزاز ایمسٹرڈیم کو حاصل ہے۔ یہاں روزانہ کروڑوں ڈالرز کا کاروبار ہوتا تھا اور اس قصبے کو پولیس کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل تھا۔ فرمن نے انٹرپول کا اعلامیہ دیکھا اس میں ایک نامعلوم شاطر چور کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا وہ خاص حد تک سیمونیٹی سے ملتا تھا۔ جہاں تک پاندے کا تعلق تھا پولیس کو یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ وہ دراصل چازان ہے۔ انٹرپول نے بیلجئم پولیس کو اس کا مکمل ریکارڈ فراہم کردیا تھا۔ فرمن نے بہتر سمجھا کہ سب سے پہلے امریکن ایف بی آئی سے معلوم کرے جس کے پاس عالمی جرائم کرنے والوں کے بارے میں سب سے بڑا ریکارڈ تھا لیکن وہاں سے بھی اسے کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔ سیمونیٹی نامی اس شخص کا وہاں پر کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے کبھی امریکا کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا تھا۔

○☆○

۱۰ دسمبر کے دن بیلا اینٹسورپ پہنچا تو آسمان پر تاریک بادل چھائے ہوئے تھے اور بے حد سردی تھی۔ حال ہی میں برف گری تھی۔ بیلا پہلے بھی کئی بار یہاں آچکا تھا۔ چمک دمک سے عاری اور قدیم طرز کی عمارتوں والا یہ قصبہ کہیں سے بھی دنیا کا امیرترین قصبہ نظر نہیں آتا۔ اس کا بوسیدہ جوہری بازار تو اور بھی گیا گزرا ہے۔ یہاں جوہری' جواہرات تراشنے اور انہیں پالش کرنے کی صنعت سے پندرہ ہزار افراد وابستہ تھے۔ دنیا کے کل جواہرات کا چالیس فیصد یہیں تراشا جاتا تھا۔ بیلا سب سے پہلے فالکن اسٹریٹ گیا جہاں ہر طرف زیورات کے شوکیسوں سے جگمگاتی دکانیں تھیں۔ اس گلی کے آخر میں ایک بھورے رنگ کی کئی منزلہ عمارت صرف جواہرات کے کاروبار کے لیے مخصوص تھی اور ہر کوئی اس میں نہیں جاسکتا تھا۔ لہٰذا بیلا نے پرانی ترکیب آزمائی اور کسی دکان پر جانے کے بجائے سیناگوگ چلا گیا۔ اجنبی ہونے کی وجہ سے سب اس سے گرم جوشی سے پیش آئے تھے۔ بیلا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے خود کو بنجامن یا بینووکسر کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ سیناگوگ میں تاعود کی تعلیم پر بحث چل رہی تھی۔ بحث کرنے والے اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ بیلا پہلے خاموشی سے انہیں سنتا رہا پھر اس نے خود عالمانہ انداز میں تاعود کی تعلیم پر بات شروع کی تو سب ہی اس سے متاثر نظر آنے لگے تھے۔ بعد میں پولیس کو بتایا گیا "وہ شخص تو کسی ربّی سے زیادہ عالم نظر آرہا تھا۔"

جوزف مینڈل نے پولیس کو بتایا کہ بنجامن مہذب اور تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔ اس نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس میں خاصا بڑا ہیرا جڑا تھا۔ اس کی یائیڈش زبان میں ہنگرین اور رومانوی زبانوں کے اثرات نظر آرہے تھے۔ وہ ممکنہ طور پر ان ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ سیناگوگ میں ہی اس کی ملاقات پنکس رابن سے ہوئی اور گفتگو کے دوران "انکشاف" ہوا کہ دونوں ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ جلد ان میں اتنی بے تکلفی ہوگئی کہ رابن نے اسے گھر پر چائے پر مدعو کرلیا۔ چائے پر ان کے درمیان جنگ کے بعد کے حالات پر بحث جاری تھی۔ اچانک بنجامن نے کہا "دوست میرے پاس کچھ ہیرے اور کچھ چھوٹے زیورات

ہیں کیا تم کسی ایسے بااعتماد شخص سے ملوا سکتے ہو جو انہیں خرید سکے۔"

بیلا نے اسے اپنے پاس موجود ہیرے دکھائے اور رابن نے اس کی کسی جوہری سے ملاقات کرانے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اگلے روز اس نے کمال ہوشیاری سے رابن کی مدد سے سیناگوگ میں جوہری ابراہام سل برسٹن سے ملاقات کی۔ سل برسٹن پہلے ہی اس مذہبی آدمی سے بے حد متاثر تھا۔ مختصر قامت کے سل برسٹن سے بیلا نے کہا "میں اپنی بیوی کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا ہیروں کا نیکلس لینا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی میں کچھ جواہرات فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

حسبِ توقع سل برسٹن پھنس گیا اور اس کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے اسے گھر تک لے جانے پر آمادہ ہوگیا جو سیناگوگ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سل برسٹن کے گھر آتے آتے ان میں پرانے شناساؤں کی سی بے تکلفی آگئی تھی۔ بیلا نے اسے شیشے میں اتار لیا تھا۔ سل برسٹن ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا جو قیمتی آرائش سے مزین تھا۔ اگرچہ وہ کوئی بڑا جوہری نہیں تھا۔ زیادہ تر کمیشن پر کام کیا کرتا تھا۔ بیلا اس کی مدد سے بڑے جوہریوں تک پہنچ سکتا تھا۔ جام پر انہوں نے گفتگو شروع کی بیلا نے براہِ راست کاروباری گفتگو کے بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردی تھیں۔ اس کے بعد بیلا نے اچانک جیب سے ہیرے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ سل برسٹن کے چہرے پر چمک آگئی تھی۔ اس کی تجربے کار نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ اچھے ہیرے تھے لیکن اس نے خود قیمت کا تعین کرنے کے بجائے اپنے جوہری دوست سے ان کی قیمت لگوانے کو کہا۔

"میں جوہری سے اس کی قیمت لگوالوں گا اور تمہاری بیوی کے لیے اس کے پاس سے کوئی مناسب نیکلس لے آؤں گا۔"

چالاک سل برسٹن نے اسے جوہری سے ملوانے کی بات نہیں کی۔ اسے اپنے کمیشن کے مارے جانے کا خطرہ تھا لہٰذا معاملہ اگلی ملاقات تک کے لیے ٹل گیا تھا۔ سل برسٹن اپنے ایک جاننے والے جوہری کے پاس یہ ہیرے لے گیا۔ اس نے ان کی قیمت چوتھائی ملین فرانک لگائی تھی۔ یہ تقریباً پانچ ہزار ڈالرز بنتے تھے۔ اس نے بھی اتنی ہی مالیت کا اندازہ لگایا تھا۔ ہیرے یقیناً بیش قیمت تھے اور اچھی قیمت پر بک سکتے تھے۔ اس وجہ سے اس نے بنجامن کو ہیروں کی مالیت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ وہ اس کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اس نے بنجامن کی بیوی کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا نیکلس پسند کیا تھا اسے یقین تھا کہ وہ کوئی گرا پڑا زیور پسند نہیں کرسکتی جو بنجامن جیسے نفیس اور مہذب شخص کی بیوی ہو۔ یہ پلاٹینیم سے بنا خوب صورت ترین نیکلس تھا جس میں چھوٹے بڑے سو کے قریب ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ہیرے متعدد پہلو سے تراشے گئے تھے اور ان سب کی سامنے والی سطح ہموار تھی۔ یہ سب بے رنگ اور شفاف ہیرے تھے۔ اس لاجواب نیکلس کی فروخت پر ڈیلر نے سل برسٹن کو دس فی صد کمیشن دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اگلے دن بیلا جازان کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ پہلے تو سل برسٹن نے اسے اس کے ہیرے دیے پھر اس نے ایک مخملی پاؤچ سے نیکلس برآمد کیا۔ اسے میز کے وسط میں رکھا تو وہ کھڑکی سے آنے والی دھوپ میں جگمگا اٹھا تھا۔ یہ اتنا خوب صورت تھا کہ بیلا اور جازان بھی مسحور رہ گئے تھے۔ وہی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی سل برسٹن کی بیوی اور اس کی خادمہ بھی سحرزدہ نظروں سے نیکلس کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا زیور نہیں دیکھا تھا۔ بیلا نے کہا۔

"بے حد حسین، کیا کوئی عورت اس کے سوا کسی شے کی خواہش کرسکتی ہے۔" اس نے جازان سے پوچھا۔

اس نے شانے اچکائے "کسی عورت کے بارے میں یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے۔ تم اسے کوٹ دو اور وہ ہیٹ مانگ لے۔ ہیٹ دو تو وہ جوتے کی فرمائش کردے۔"

"لیکن یہ خوب صورت ہے۔" بیلا نے اصرار کیا۔ سل برسٹن دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ یہ شخص اپنی زبان بند رکھے لیکن اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ جازان نے جھنجلا کر کہا "آخر تم نیکلس پر اتنا زور کیوں دے رہے ہو۔ جبکہ تم جانتے ہو وہ کسی زیور کی دیوانی ہے تو وہ بروچ ہے۔ اس پر وہ کسی اور زیور کو ترجیح نہیں دے گی۔"

بیلا نے منہ لٹکا کر کہا "واقعی وہ بروچ مانگے گی۔" اور سل برسٹن سے بولا "مجھے افسوس ہے میرے دوست میں یہ نیکلس شاید نہ خرید سکوں کیا تم مجھے اعلیٰ درجے کے کچھ بروچ دکھا سکتے ہو اس نیکلس کی طرح کے۔"

مایوسی سے سل برسٹن نے کہا "کیوں نہیں تم ایک بڑی رقم خرچ کر رہے ہو اور پھر لیڈی کی پسند بھی دیکھنا ہوگی۔ اگر تم انتظار کرسکو تو میں اپنے دفتر سے اعلیٰ قسم کے کچھ بروچ لے آؤں۔" اس نے نیکلس واپس پاؤچ میں رکھا تو بیلا کو موقع ہاتھ سے نکلتا ہوا لگا تھا۔ اس نے سل برسٹن سے کہا۔

"ایسا کرو تم نیکلس یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں اور بلاس

(چاژان) اس پر مزید تبادلہ خیال کریں گے۔ ممکن ہے ہم اسے خریدنے کے لیے تیار ہو ہی جائیں۔" اور سل برسٹن نے یہ چارہ نگل لیا۔ اس نے نیکلس واپس میز پر رکھ دیا۔ اس کا شک ختم کرنے کے لیے بیلا نے تجویز پیش کی "ایسا کرتے ہیں میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بلاس یہیں رکتا ہے۔"

"ارے نہیں۔" سل برسٹن نے جلدی سے کہا۔ اس کا شک ختم ہوگیا تھا "تم کیوں زحمت کرتے ہو۔ میں چند منٹ میں واپس آجاؤں گا۔"

بیلا کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔ جانے سے پہلے سل برسٹن نے بیلا کے ہیرے اٹھا کر جیب میں رکھنے چاہے تو اس نے اسے روک دیا "نہیں دوست آج کل گلی کوچوں میں چور اچکے پھر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہوجائے۔"

بادل نخواستہ سل برسٹن ہیرے چھوڑ کر روانہ ہوا۔ اس کے جاتے ہی بیلا نے کچن کے دروازے پر جاکر مسز سل برسٹن سے بات چیت شروع کردی پھر باتھ روم جانے کی اجازت مانگی۔ باتھ روم جانے کے لیے کچن سے گزرنا لازمی تھا۔ واپسی پر اس نے بظاہر بے دھیانی میں کچن کا دروازہ بند کردیا اور پھرتی سے آکر مسز نیکلس اور ہیرے جیب میں ڈالے پھر اس نے آکر سل برسٹن سے کہا "جب تک مسٹر سل برسٹن آتے ہیں۔ ہم ذرا شاپنگ کر آئیں بچوں کے لیے۔ تمہیں معلوم ہے جب میں گھر جاتا ہوں تو بچے چیختے چلاتے مجھ پر لد جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں ڈیڈی آپ ہمارے لیے کیا لائے ہیں۔" وہ اس کے لہجے پر ہنس دی تھی۔ اس نے ان سے مصافحہ کیا اور وہ جلد آنے کا کہہ کر ان کے اپارٹمنٹ سے نکل گئے۔

دس منٹ بعد ہانپتا کانپتا سل برسٹن سیڑھیاں چڑھ کر اپارٹمنٹ تک آیا تو کھلا دروازہ دیکھ کر بدحواس ہوگیا اور جب اس نے بنجامن، اس کے دوست بلاس کو معہ ہیروں اور نیکلس کے غائب پایا تو اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ بے دم ہوکر کرسی پر گر گیا تھا۔ جب مسز سل برسٹن اور اس کی خادمہ کو علم ہوا تو وہ چور چور چلاتی ہوئی باہر بھاگی تھیں لیکن دونوں عیار غائب ہوچکے تھے۔ بعد میں اس نے پولیس کو بتایا کہ ان کے یوں چلے جانے سے اسے پریشانی ہوئی تھی اس کا شوہر انہیں اس کے حوالے کرگیا تھا مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا شوہر ان کے پاس کوئی قیمتی نیکلس چھوڑ گیا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ تینوں پولیس اسٹیشن میں بیک وقت واردات کے بارے میں بتانے کی کوشش کررہے تھے۔ پولیس چیف نے انہیں ڈانٹ کر خاموش کرایا اور کسی ایک کو بولنے کا حکم دیا۔ اس پر سل برسٹن نے روتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کیے جانے والے فراڈ کے بارے میں بتایا تھا۔ تفصیلات سن کر اسے یقین ہوگیا یہ انہی دو چوروں کی کارروائی تھی جن کے بارے میں انٹرپول نے خبردار کیا تھا۔ اس نے ان سے دریافت کیا۔

"کیا انہوں نے تمہارے گھر میں کسی شے کو چھوا تھا؟"

"بے شمار۔" مسز برسٹن بولی "انہوں نے چائے پی، پانی پیا اور میز کو بھی ہاتھ لگایا تھا۔"

یہ سنتے ہی پولیس چیف نے کرائم لیب کے عملے کو سل برسٹن کے اپارٹمنٹ میں جاکر فنگر پرنٹس اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ پولیس نے مسز برسٹن، اس کی بیوی اور خادمہ کو اپارٹمنٹ میں جانے سے روک دیا تھا۔ مبادا کوئی نشان ضائع ہوجائے۔ پولیس نے مستعدی سے ہر ممکنہ جگہ سے فنگر پرنٹس اتارے لیکن انہیں بہترین فنگر پرنٹس چائے کے گلاسوں پر ملے تھے۔ پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یہ کافی ثبوت تھے اگر چور اس کے قابو میں آگئے تو وہ انہیں خاصے عرصے کے لیے جیل بھیج سکتا تھا۔ اس شام تک اسے لیب سے فنگر پرنٹس کی صاف اور انلارج کی ہوئی تصاویر مل گئی تھیں ان میں سے تین نشان یقینی طور پر چاژان کے تھے لیکن چوتھا نشان کسی نامعلوم فرد کا تھا اور یہ یقیناً وہی چور تھا جس کی انٹرپول کو تلاش تھی۔ اسے اب ماسٹر تھیف کہا جاتا تھا۔ پولیس کمشنر فرمن نے یہ فنگر پرنٹ انٹرپول اور ایف بی آئی کو بھجوا دیے اس درخواست کے ساتھ کہ اس فنگر پرنٹ کے حامل شخص کو فوری طور پر گرفتار کرلیا جائے۔

ایف بی آئی نے بتایا کہ میکسیکو کی وارداتوں میں یہی شخص ملوث تھا۔ بلاس، پاندرے یا چاژان ایک ہی شخص تھا اور بنجامن کے فنگر پرنٹس لوئیس سیمو نیٹی سے مل گئے تھے۔ اس نے اس نام سے پاسپورٹ حاصل کیا تھا۔ ان کے کچھ اور نام بھی سامنے آئے تھے یہ ویڈو اور شپیرو تھے۔ میکسیکو میں کی گئی ایک واردات میں انہوں نے یہ نام اختیار کیا تھا۔ وہ ایک ڈائمنڈ ڈیلر کے پاس گئے اور اس سے چھ ہزار ڈالرز مالیت کی انگوٹھیاں اور ہیرے خریدے تھے۔ ان کے پاس صرف چار ہزار ڈالرز نقد تھے۔ انہوں نے کہا کہ جوہری باقی رقم کا چیک لے لے۔ ان کی پرکشش شخصیت اور متاثر کن گفتگو سے متاثر ہوکر جوہری نے ان سے چیک لیا تھا اور جب وہ اگلے روز نہیں آئے تو اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے چیک

کیا تو ان کا دیا ہوا چیک بھی جعلی نکلا تھا۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے میکسیکو کے ایک اور علاقے میں جا کر واردات کی۔ اس بار انہوں نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور جوہری سے زیورات منتخب کرا کے انہیں چیک کرا دیا اور بہانہ کیا کہ ان کے پاس پوری رقم نہیں ہے اب جوہری اصولی طور پر ایک دن سے پہلے یہ لفافہ کھولنے کا مجاز نہیں تھا۔ سگریٹ کے لائٹر کے بہانے انہوں نے جوہری کو وہاں سے ہٹایا اور لفافہ بدل دیا۔ بعد میں اس میں سے کانچ کے ٹکڑے نکلے تھے۔ وہ جوہری کو چھ ہزار ڈالرز کی چوٹ دے گئے تھے۔ یہ تفصیلات امریکا میں میکسیکو کے سفارت خانے سے حاصل کی گئی تھیں۔ یہ پیرس میں مارسل کو مل گئی تھیں گویا قطعی طور پر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ان تمام وارداتوں کے پس پشت وہی دونوں چور تھے۔ یہ بات یقینی تھی اب وہ فرانس کی سرزمین پر قدم رکھتے اور پکڑے جاتے۔

مارسل نے محسوس کیا کہ ماسٹر تھیف کچھ بے پروا ہو گیا تھا۔ خاص طور سے جب سے اس نے چاژان کے ساتھ مل کر وارداتیں شروع کی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آگ سے جان بوجھ کر کھیل رہا ہو۔ وہ نہ صرف کئی جگہوں پر اپنے فنگر پرنٹس چھوڑ آیا تھا بلکہ اس نے کم سے کم دو مواقع پر واردات میں بھی وہی نام استعمال کیا تھا جس نام کے پاسپورٹ پر وہ سفر کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں معلومات فرانس کے تمام ائرپورٹس داخلے کے راستوں پر بھجوا دی گئی تھیں مگر دو ہفتے بعد ہی مارسل کی خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک شخص لوئیس سیمو نیٹی کے پاسپورٹ فرانس آیا اور پھر چلا بھی گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں ایک اور بدقسمت خاصی رقم گنوا بیٹھا تھا۔ پان بروکر نامی اس شخص کو میسل ہورورٹز نامی شخص نے ایک بیش قیمت نیکلس فروخت کیا تھا۔ یہ وہی نیکلس تھا جو سل برسٹن کے پاس سے چرایا گیا تھا۔ پان بروکر نے خوشی سے اس کے ایک ملین فرانکس ادا کر دیے تھے مگر اگلے روز اس نے جب پیکٹ کھولا تو سر پیٹ لیا تھا۔ اندر موجود نیکلس جعلی تھا۔ اس میں جڑے تمام ہیرے محض کانچ کے ٹکڑے تھے۔

مارسل کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کی کئی سال کی محنت پر فرانسیسی پولیس اور امیگریشن والوں کی نااہلی نے پانی پھیر دیا تھا۔ وہ ان کی ناک تلے آیا اور واردات کر کے چلا بھی گیا۔ جبکہ انہیں سیمو نیٹی کا نام بھی فراہم کیا گیا تھا۔ اس کے چند روز بعد ہی ایک جوہری نے پیرس میں رپورٹ کی کہ ایک شخص دھوکے سے اس سے چھ لاکھ فرانک مالیت کے ہیرے لے اڑا تھا۔ انداز اور مجرم کا حلیہ بتا رہا تھا کہ یہ سوائے لوئیس سیمو نیٹی کے کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مارسل کو حیرت تھی کہ یہ شخص آخر کتنے نام کے پاسپورٹ لے کر پھر رہا تھا۔ مارسل کو اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے دعا مانگنے کے کہ یہ کم بخت چور کچھ فاش قسم کی غلطیاں کر جائے۔

انٹرپول کو اگلی رپورٹ جنوبی افریقا سے ملی وہاں سے دو افراد کمبرے کے ہیروں کے مرکز میں آئے ان کے حلیے چاژان اور لوئیس سیمو نیٹی کے حلیوں کے عین مطابق تھے اور وہ کچھ جوہریوں سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ڈالرز مالیت کے ہیرے لے اڑے تھے۔ مارسل نے فوری طور پر انٹرپول کے تمام ممبر ممالک کو اس واردات کی خبر دیتے ہوئے ان سے ان دو افراد پر نظر رکھنے کی درخواست کی لیکن پہلی کامیابی ایک پس ماندہ ملک کی پولیس کے حصے میں آئی۔ چاژان جزائر ماریشس میں پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا مگر لوئیس بچ نکلا تھا۔ اطلاعات کے مطابق وہ یورپ جا چکا تھا۔ فوری طور پر یورپ کے تمام ائرپورٹس اور بندرگاہوں کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔ ایسی کھلبلی مچ گئی تھی کہ لگ رہا تھا چور اب پکڑا گیا کہ تب پکڑا گیا۔ وہ کہیں بھی لوئیس سیمو نیٹی کے نام کا پاسپورٹ استعمال کرتا تو فوراً پکڑا جاتا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے بیلا کو احساس ہو گیا تھا۔ اس نے پھر سیمو نیٹی کے نام کا پاسپورٹ استعمال نہیں کیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جب اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تو پولیس اور امیگریشن والے مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

○☆○

بیلا کے لیے صرف مارسل ہی پُر امید تھا اور وہی اپنے آدمیوں کو متحرک کیے ہوئے تھا۔ یہ مارچ کا آخری ہفتہ تھا۔ پیرس میں بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ شام ساڑھے پانچ بجے مارسل کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سارجنٹ ہانا تھا۔ اس نے جوش سے کہا۔

”ہمارا ممکنہ دوست پیرس میں ہے اور ہم اسے مختلف ہوٹلوں میں تلاش کر رہے ہیں۔“

سابقہ تجربات کی روشنی میں مارسل نے ضرورت سے زیادہ امید نہیں باندھی تھی۔ اس نے ہانا سے کہا ”ان تمام ناموں کو ذہن میں رکھو جو اس نے کبھی استعمال کیے تھے۔ ممکن ہے وہ اسی نام سے کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہو۔“

”ہم پوری کوشش کر رہے ہیں سر۔“

مارسل نے کار نکالی اور ہر ممکن تیزی سے اپنے دفتر

روانہ ہوگیا۔ اس کی خواہش تھی جب چور گرفتار ہو تو وہ اپنے دفتر میں ہو۔ اس سے زیادہ اس کی گرفتاری کی خواہش کسے ہوسکتی تھی لیکن انٹرپول کا سربراہ ہونے کے باوجود وہ کسی معمولی مجرم کو گرفتار کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ اسے خدشات بھی تھے وہ چور اتنا شاطر تھا کہ عین پولیس والوں کی ناک تلے آکر کام کرجایا کرتا تھا۔ ابھی بھی وہ اس شہر میں کہیں موجود تھا اور عین ممکن تھا کہ پولیس اسے نہ گرفتار کرپاتی۔ ممکن تھا اس نے بالکل کسی نئے نام سے کمرا لے رکھا ہو پھر لاکھوں افراد میں جو ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے محض اسے ہی تلاش کرنا بے حد دشوار کام تھا۔ اس قسم کے مجرموں کی چھٹی حس بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ اسے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ ان کے ہاتھ سے آکر نکل جاتا۔ جنگِ عظیم کے بعد فرانس میں قانون بنایا گیا تھا کہ ہوٹل میں ٹھہرنے والا ہر فرد ایک فارم بھرے گا جس میں وہ اپنے شناختی کارڈ یا پاسپورٹ کے بارے میں اندراج کرے گا۔ یہ فارم تمام ہوٹلوں کی طرف سے روزانہ جمع کرکے مقامی پولیس ہیڈ کوارٹر بھجوائے جاتے تھے۔ یوں پولیس کو کسی مبیّنہ مجرم کی تلاش میں ہوٹلوں کی خاک نہیں چھاننی پڑتی تھی۔ اس وقت بھی پولیس ہیڈ کوارٹر میں متعدد کلرکس فارموں کی چھان بین پوری احتیاط سے کررہے تھے۔ کیونکہ ان کے مفروضہ مجرم کے متعدد نام تھے اور وہ ان میں سے کسی بھی نام سے ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا۔ جب وہ دفتر میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس بار بریجیڈٹ تھا اس نے تھکے ہوئے انداز میں بتایا۔

"وہ جاچکا ہے۔ وہ بدمعاش سیمو نیٹی کے نام سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ بدمعاش پوری دیدہ دلیری سے یہ نام استعمال کررہا ہے۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"ہوٹل سینٹ جرمین میں۔ یہ لکسمبرگ گارڈن میں صرف تین بلاک فاصلے پر ہے۔ ہم نے وہاں کئی آدمی لگادیے ہیں۔"

"میں اس کی گرفتاری کی خبر کا منتظر رہوں گا۔" مارسل نے فون رکھ دیا۔

بریجیڈٹ، رینالٹ اور ہانا ہوٹل جرمین جا پہنچے تھے۔ سادہ لباس میں کئی پولیس والوں نے پورے ہوٹل کو گھیر رکھا تھا مگر وہ ناکافی ثبوت کی بنا پر تلاشی اور گرفتاری کا وارنٹ حاصل نہیں کرسکے تھے۔ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہوٹل کے باہر ہی اس کا انتظار کریں۔ ہوٹل والوں سے پوچھنے میں خطرہ تھا کہ کوئی ہمدردی میں آکر اسے آگاہ نہ کردے اس قسم کے مجرم ہوٹل کے ملازموں کو مٹھی میں لینے کے لیے فراغ دلی سے ٹپ دیا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے مخبری کریں۔ بالآخر بریجیڈٹ نے خطرہ مول لیتے ہوئے ہوٹل کی ڈیسک کلرک سے پوچھ ہی لیا اس نے تصدیق کی کہ سیمو نیٹی ہوٹل میں مقیم تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے پولیس کے آدمیوں کو چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ ایک آدمی کو اس نے چھت پر بھی بھیج دیا تاکہ فرار کا ہر راستہ بند ہوجائے پھر اس نے مارسل کو فون کرکے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا۔ مارسل فکرمند تھا اگر سیمو نیٹی ایک بار ان کے ہاتھ سے نکل جاتا تو اس کا دوبارہ سامنے آنا محال تھا اور وہ دوبارہ یہ نام بھی استعمال نہ کرتا۔

دوسری طرف بریجیڈٹ نے ہوٹل کے منیجر کو بلوالیا تھا۔ بریجیڈٹ نے اسے بتایا کہ ان کا مطلوبہ ایک غیر ملکی مجرم ان کے ہوٹل میں موجود ہے اور پولیس تصدیق چاہ رہی ہے کہ وہ اپنے کمرے میں ہے یا نہیں۔

"غالباً آپ کے پاس وارنٹ نہیں ہے۔" منیجر مسکرایا "ورنہ موسیو خود جاکر اسے گرفتار کرلیتے۔"

منیجر نے دوسرے فلور پر کام کرنے والی عورت کو بلایا اور اس سے سیمو نیٹی کے بارے میں پوچھا تھا۔ بریجیڈٹ نے اس سے سیمو نیٹی کے بارے میں پوچھا "کیا وہ اپنے کمرے میں ہے؟"

"موسیو صبح اپنے کمرے میں تھے جب میں انہیں چائے دینے گئی تھی۔" عورت نے یقین سے کہا۔

"اور اب وہ اپنے کمرے میں ہے یا نہیں۔ تم ایک دفعہ جاکر دیکھ آؤ۔" بریجیڈٹ کے حکم پر عورت نے ایک بار پھر جاکر دیکھا اور تصدیق کی کہ سیمو نیٹی اپنے کمرے میں ہی تھا۔ باہر آکر اس نے ہانا اور رینالٹ کو خوش خبری سنائی۔

"پرندہ ابھی پنجرے میں ہی ہے۔"

اب ان کے پاس سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ ساری رات وہ ہوٹل کے باہر نگرانی کرتے رہے تھے۔ صبح انہوں نے جاکر باری باری ناشتے اور دیگر ضروریات سے فراغت حاصل کی تھی۔ خاصی سردی میں رات کو باہر رہنا مشکل کام تھا۔

سورج نکلا تو ان کی جان میں جان آئی تھی مگر وقت گزرتا رہا سیمو نیٹی باہر نہیں آیا تھا۔ صبح بھی تمام ہوئی اور دوپہر سر پر آگئی۔ سہ پہر تک ان کی پریشانی کا آغاز ہوا یہ سوچ کر کہ کہیں وہ انتظار کررہے ہوں اور وہ اُڑن چھو ہوچکا ہو۔ اس

نے جس طرح قانون کو بخیے پر بخیے دیے تھے اس سے وہ سب بری خائف تھے۔ وہ آپس میں بحث کرنے لگے کہ کس طرح وہ ان کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل سے نکل سکتا ہے۔

"ممکن ہے وہ بھیس بدل کر نکل گیا۔" ہانا نے کہا۔

"کسی عورت یا کسی بوڑھے کے روپ میں۔" رینالٹ نے اس کی تائید کی۔ سردی اس غضب کی تھی کہ وہ کار میں بند ہونے کے باوجود سردی سے کانپ رہے تھے۔ وہاں سے گزرنے والا ہر شخص انہیں حیرت سے دیکھا کرتا تھا کہ آخر یہ اتنی سردی میں باہر کیوں بیٹھے ہیں۔ اپنے گرم گھروں میں جاکر آرام کیوں نہیں کرتے۔ ایک موقع پر بریجیڈٹ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا اور اس نے ہوٹل میں جاکر سیمو نیٹی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہانا اور رینالٹ نے بمشکل اسے باز رکھا۔ آخر سہ پہر ساڑھے تین بجے کے آس پاس ایک مختصر سے شخص نے ہوٹل کی لابی سے باہر قدم رکھا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پر سیاہ ہی رنگ کا فیڈورا ہیٹ لگا رکھا تھا۔ لباس نفاست سے سلا ہوا اور بیش قیمت کپڑے کا تھا۔ اس کے پیروں میں مگرمچھ کی کھال کے جوتے تھے اور اس کی چال سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا میں تیر رہا ہو۔ وہ سب ایک لمحے میں سمجھ گئے کہ یہی ان کا مطلوبہ شخص تھا۔ اس کا حلیہ، اس کی چال ڈھال اور اس کی شخصیت سیمو نیٹی کے عین مطابق تھی۔ جب وہ کار کے نزدیک سے گزرا تو بند کھڑکیوں کے باوجود انہیں مہنگے اور تیز خوشبو والے پرفیوم کی واضح مہک محسوس ہوئی تھی۔ یہ پرفیوم صرف طبقہ اُمرا ہی استعمال کرسکتا تھا۔

ہوٹل سے باہر آکر بیلا نے فیصلہ کیا کہ اسے ریو جونا پارٹ کی طرف چلنا چاہیے۔ وہ کئی دن سے محسوس کررہا تھا کہ اس کے گرد کوئی گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنی قوتِ فیصلہ کو مفلوج محسوس کررہا تھا۔ اسی لمحے اسے اپنے عقب سے تیز قدموں کی آواز آئی اور دو آدمیوں نے آکر اسے دائیں بائیں سے پکڑلیا۔ وہ گرفت سے جان گیا کہ یہ پولیس ہی ہوسکتی تھی۔

"موسیو سیمو نیٹی۔" ایک کھردری آواز نے کہا۔

"ہاں، مگر تم کون ہو اور میرے ساتھ کیا کررہے ہو؟" وہ کسمسایا جیسے شریف آدمی بدمعاشوں کے نرغے میں آگیا ہو۔

حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ بالآخر اس کی گرفتاری کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ کھردری آواز نے تصدیق کی "موسیو تم زیرِ حراست ہو۔"

"میں اس گرفتاری کی وجہ جان سکتا ہوں۔" بیلا نے ذرا بھی ہراساں ہوئے بغیر کہا۔

"ہم تمہارے فن کے مدّاحوں میں سے ہیں۔" رینالٹ نے اس کے لہجے میں کہا "اور خاصے عرصے سے تمہاری تلاش میں تھے تاکہ تمہارے فن کی داد دے سکیں۔"

انہوں نے بیلا کو کار میں بٹھایا اور پیرس کے پولیس ہیڈ کوارٹر جا پہنچے۔ جہاں ہانا نے سب سے پہلے مارسل کو فون پر اطلاع دی۔

"مشن مکمل ہوگیا ہے سر۔ ہم نے مطلوبہ شخص کو حاصل کرلیا ہے اور وہ سیمو نیٹی ہی ہے۔"

مارسل نے اسے مبارک باد دی۔ یہاں پر اس کا کردار ختم ہوگیا تھا۔ اب ملزم سے صرف پولیس ہی تفتیش کرسکتی تھی۔ انٹرپول کسی شخص کو گرفتار کرنے اور اس سے تفتیش کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی مگر مارسل کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس شخص کو اپنے روبرو دیکھے۔ اس نے فرانس کے پولیس کمشنر سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ اس شخص کو دو روز کے لیے اس کے حوالے کیا جائے۔ وہ ہر صورت میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون تھا۔ اس نے کیسے متعدد حیران کن جرائم کیے تھے اور ان سے حاصل شدہ رقم اس نے کہاں ٹھکانے لگائی تھی؟

اپنے وجدان اور تجربے کی بنا پر مارسل سمجھتا تھا کہ سیمو نیٹی پولیس کے لیے ایک مشکل ترین مجرم ثابت ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ بیلا نے فرانسیسی پولیس کو رونے پر مجبور کردیا تھا۔ توقع کے عین مطابق سیمو نیٹی ایک جعلی نام نکلا تھا۔ پولیس جب اس سے پوچھ گچھ کرتی وہ انہیں ایک نیا نام اور نیا حوالہ دے دیتا تھا۔ کہانی اصلی لگتی تھی اور اس کے ڈانڈے عموماً دوسرے ممالک سے جاملتے تھے لیکن پولیس تفتیش کرتی وہاں پہنچتی تو انہیں ناکامی نصیب ہوتی۔ دوبارہ پوچھنے پر وہ ایک اور نیا نام اور حوالہ دے دیتا تھا۔ ہر دفعہ اس کے ساتھی کا نام غلط ہی نکلتا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ پولیس کے تفتیشی ماہرین اس کے پاس جانے سے ہی گھبرانے لگے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اینٹسورپ میں سل برسٹن کے گھر میں چوری میں وہی ملوث تھا۔

فرانسیسی قانون میں ملزم کو ایک خاص مدت میں پولیس کے سامنے پیش کردینا ضروری تھا۔ لہٰذا بیلا کو بھی ایک عدالت میں پیش کردیا گیا مگر تفتیش ہنوز نامکمل تھی۔ جج بھی اس کی چالاکی سے عاجز تھے۔ مقدمے کا آغاز ممکن نہیں تھا کیونکہ واضح ثبوت ہونے کے باوجود اس کی شناخت معلوم نہ

ہونے کی وجہ سے اس پر فردِ جرم عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔
اس نے عدالت میں کہا اس کا نام بیلا وارجاز ہے اور وہ اٹلی کے شہر میلان میں پیدا ہوا تھا مگر یہ بات غلط ثابت ہوئی پھر اسے یاد آیا کہ اس کا نام تو بیلا وارجاز ہی ہے لیکن وہ میلان نہیں بلکہ ۱۹۱۷ء میں آسٹریا کے ایک قصبے اوڈن برگ میں پیدا ہوا تھا مگر وہاں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملا یہ قصبہ اب ہنگری میں شامل تھا۔ اس نے متعدد نام اور حوالے بدلے پھر اس نے پولیس کو دنیا بھر کے ہوٹلوں کی ایک طویل فہرست فراہم کردی تھی۔ جہاں اس نے کبھی قیام کیا تھا۔ یہاں سے اس کے متعدد نئے نام سامنے آئے تھے۔ پولیس کو دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا اس کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے۔ ناموں اور پتوں کی تصدیق آسان نہیں تھی۔ اکثر تو ایک ہی نام یا پتے کی تصدیق میں ہفتوں گزر جاتے تھے۔ آخر جج نے ہار مان لی اور فیصلہ کیا کہ سیمونیٹی وارجاز فارکیزیا جو بھی تمہارا نام ہو کیا تم اپنے اصل نام سے واقف بھی ہو؟"

بیلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مائی لارڈ! اگر میں آپ کو اپنا اصل نام بتاؤں یا اگر میں اپنا نام آئزن ہاور یا ونسٹن چرچل بتاؤں تو کیا آپ یقین کرلیں گے۔"

اب نام پر متفق ہوئے تو بیلا نے نیا مطالبہ کردیا۔ اس نے کہا کہ وہ صرف یائیڈش زبان میں بات کرے گا لہٰذا اسے ایک ترجمان فراہم کیا جائے پھر اس نے ایک ہسپانوی جاننے والے ترجمان کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ جرائم کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ کیونکہ وہ گرفتار ہوچکا ہے اس لیے پولیس اس پر یہ جرائم تھوپ رہی ہے۔ اس نے یہ جرائم نہیں کیے کیونکہ وہ ان اوقات میں کہیں اور تھا اس نے کچھ اور جرائم کا اعتراف کرلیا۔ نتیجے میں پولیس کو تفتیش کے لیے ایک بار پھر ان جگہوں پر جانا پڑا تھا۔ بیلا کا تخیل بے حد زرخیز تھا اس کی بنائی ہوئی کہانیوں کی تفتیش کے لیے پولیس کو بار بار ادھر سے اُدھر جانا پڑا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس کے کمرے سے جو سامان ملا تھا اس نے اس کی وضاحت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ اکثر جعل سازی اور دھوکے بازی کے لیے مخصوص تھیں۔ غرض کہ اس نے پولیس اور عدالت کو اتنا زچ کیا تھا کہ وہ اس کے نام سے ہی خائف نظر آنے لگے تھے۔ اس نے ہر موقع پر افراتفری پیدا کی اور ایسے نکات سامنے لایا۔ جنہوں نے مقدمے کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ گرفتاری کے وقت بیلا نے مگرمچھ کی کھال کے جو جوتے پہن رکھے تھے ان کی کھوکھلی ایڑیوں میں لاکھوں ڈالرز مالیت کے ہیرے چھپے ہوئے تھے۔ اس کی درخواست پر پولیس نے یہ سامان اس کے ایک دوست کے حوالے کردیا تھا۔ رہائی کے بعد اس نے یہ جوتے حاصل کرلیے تھے۔

اب کے پولیس نے اپنا ترپ کا پتا استعمال کیا اور سل برسٹن کو گواہ کے طور پر بلوالیا۔ اس نے زور و شور سے گواہی دی کہ یہی وہ شخص تھا جس نے اسے لوٹا تھا۔ اس کے فلیٹ سے نیکلس چرایا تھا۔ اس نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

"یہ شخص معزز مہمان بن کر میرے گھر میں آیا اور مجھے لوٹ کر چلا گیا۔"

بیلا نے اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھا "میرے دوست تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے ڈر ہے تم مجھے پہچاننے میں غلطی کررہے ہو۔ تمہیں یقیناً کسی نے لوٹا ہے مگر مجھے غور سے دیکھو وہ شخص میں نہیں ہوں۔"

سل برسٹن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس ڈھیٹ شخص کو قتل کردے جو کمال اطمینان سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بے بسی کے احساس سے رو دیا تھا۔ بیلا فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا تھا اس کے دو ہفتے بعد سوشے گردس کو عدالت میں پیش کیا گیا اس نے تصدیق کی کہ اس شخص نے اسے جینیوا میں دھوکا دے کر لوٹا تھا۔ بیلا حسبِ سابق پرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے اعصاب کتنے مضبوط تھے۔ اس نے گردس کو جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے پہچاننے میں غلطی کررہے ہو دوست۔ میں نے کبھی گولڈ برگ کا نام استعمال نہیں کیا اور جینیوا تو میں آج تک گیا ہی نہیں۔ تم نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ تم قطعی طور پر جھوٹ بول رہے ہو۔"

گردس بھونچکا رہ گیا تھا اس نے کسی کو اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اعصاب بکھر گئے اور وہ چیخنے چلانے لگا تھا اس نے بیلا کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ بالآخر دو پولیس والے اسے کھینچ کر باہر لے گئے۔ بیلا اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آخر جج نے اس بے معنی سلسلے کو روکنے کا حکم دیا۔ گواہوں کو بلانے کا مقصد مجرم کی پہچان تھا جو پورا ہوچکا تھا۔ پولیس نے مقدمہ پیش کردیا۔ اس پر فرانس میں دو چوریوں اور جعلی پاسپورٹ پر داخلے کا الزام تھا۔

○☆○

بالآخر پولیس کمشنر نے مارسل کی درخواست قبول کرتے ہوئے بیلا کو عارضی طور پر انٹرپول کی تحویل میں دینے پر

آمادگی ظاہر کی تھی۔ مارسل نے اس دوران میں بیلا کے گرد شکنجہ مضبوط کردیا تھا۔ وہ دنیا بھر میں ان ممالک کو گرفتار ہونے والے بیلا کے بارے میں بتا رہا تھا تاکہ وہ فرانس سے اس کا مطالبہ کرسکیں جب وہ فرانس میں اپنی سزا بھگت لے۔ اس نے دیکھا تھا کہ سیمونیٹی نے غیر معمولی انداز میں اپنا دفاع کیا تھا اور امکان یہی تھا کہ اسے معمولی سی سزا ہوگی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اسے بھی صحیح بات نہیں بتائے گا۔ اس کے باوجود وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس سے ہیروں کی چوری اور اس سلسلے میں کیے جانے والے فراڈ کو سمجھ سکے گا۔ اس کے خیال میں وہ اسے بہتر طور پر جانتا تھا لہٰذا اس سے بہتر طور پر پوچھ گچھ کرسکتا تھا۔

بیلا کو دو فرانسیسی پولیس افسر اپنی نگرانی میں انٹرپول کے ہیڈ کوارٹر تک لائے تھے۔ مارسل کے لیے ایک تاریخی موقع تھا انٹرپول کے ذریعے پکڑا جانے والا یہ شخص اہم ترین افراد میں سے ایک تھا اس کی گرفتاری سے پہلی بار اس بین الاقوامی ادارے کی اہمیت دنیا کے سامنے آئی تھی۔ بیلا کے انداز میں ایسا وقار تھا جیسے وہ کوئی مجرم نہ ہو بلکہ جرائم پر لیکچر دینے والا کوئی پروفیسر ہو۔ اس نے مارسل کی طرف دیکھا اور فوراً جان گیا کہ یہی شخص اس کی گرفتاری کا سبب ہوسکتا تھا۔ اس نے سکون سے کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگا اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے پتلون اوپر سرکائی تاکہ اس کی کریز نہ خراب ہو۔ مارسل حیران تھا کہ ایک سال جیل میں رہنے کے باوجود اس کی نفاست اور رکھ رکھاؤ برقرار تھا۔ اسے جیل میں استری میسر نہیں تھی اس کے باوجود اس کی پتلون پر کریز تھی۔ اس نے کوئی ایسا چکر چلایا تھا کہ اسے استری میسر آگئی تھی۔

"میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟" بیلا نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ پوری گفتگو کے دوران اس کا لہجہ برقرار تھا۔

"تم یہ سب کیسے کرلیتے ہو؟" مارسل نے بڑے سادہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

بیلا فوراً اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس نے اس کے جرائم کے بجائے اس پر بات کی "سوال ذرا وضاحت طلب ہے۔"

"میرا مطلب ہے ایک نوسرباز کے لیے سب سے آسان شکار بے وقوف لوگ ہوتے ہیں مگر تم نے ہمیشہ ان افراد پر ہاتھ ڈالا جو بہت ذہین تھے۔ ان سے دھوکا کرنا مشکل ترین کام تھا۔ جو اپنی بارگیننگ کے لیے مشہور تھے۔ تم نے کبھی بوڑھی عورتوں یا ریٹائرڈ بوڑھوں کو شکار بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ تم نے انہیں اپنا شکار بنایا جو اس کاروبار میں عقاب کی سی نگاہ رکھتے ہیں۔"

مارسل جانتا تھا اس شخص کو کسی اور طرح بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا حربہ کامیاب رہا تھا "یہ میرا فن ہے موسیو۔" بیلا نے کہا "میں بھانپ جاتا ہوں کہ دوسرے کے دل میں کیا ہے۔ کاروبار میں دو ہی طریقے ہیں بیچنا اور خریدنا اگر وہ خریدنا چاہتا ہے تو میں اسے ہیرے، سونا اور زیورات مارکیٹ سے کم ریٹ پر آفر کرتا ہوں یا ان سے مناسب قیمت دریافت کرتا ہوں اور خود کو اناڑی ظاہر کرتا ہوں۔ ہیرے کبھی یکساں قیمت نہیں رکھتے ہر شخص کے لیے ان کی قیمت الگ ہے۔ اگر وہ کم قیمت لگاتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ بدمعاش ہے۔ ایسے لوگوں کو میں کبھی نہیں چھوڑتا۔ اور اگر وہ صحیح قیمت لگاتا ہے تو میں معاملے سے دستبردار ہوجاتا ہوں۔ میں ٹیکس چوروں، قانون سے ہٹ کر کام کرنے والوں اور کرنسی کی چوربازاری کرنے والوں کو بھی نہیں بخشتا۔ اوہو آپ طنزیہ انداز میں مسکرا رہے ہیں موسیو۔" اس نے مارسل کی طرف دیکھا "میں ایسا اپنے ضمیر کی آواز پر نہیں کرتا بلکہ اس لیے کرتا ہوں مجھے معلوم ہے لٹنے کے اپنے بعد کرتوتوں کی وجہ سے یہ پولیس کے پاس نہیں جاتے کیونکہ پولیس تفتیش کرکے ان کے اصل کاروبار تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر پولیس کے پاس جاتے بھی ہیں تو پوری بات نہیں بتاتے اور نہ ہی چرائے جانے والے مال کی اصل مالیت بتاتے ہیں۔ بعض تو رپورٹ کرنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ میں دنیا کے کسی اور حصے میں پہنچ چکا ہوتا ہوں۔ صاف ستھرے لوگ فوراً ہی پولیس کے پاس دوڑے جاتے ہیں اور انہیں ہر بات صاف صاف بتا دیتے ہیں۔ میں کچھ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے پکڑا گیا ہوں۔"

"میرا سوال باقی ہے۔ تم یہ سب کیسے کرلیتے ہیں؟" مارسل نے کہا۔

"تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم یہودی نہیں ہو۔ میری پرورش ہیزیڈم میں ہوئی تھی۔ میں نے وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں میں مذہب سے بیزار ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہر دم مذہب کا راگ الاپنے والوں میں ایک طاقت ور شیطان چھپا ہوا تھا۔ تاعود میں لکھا ہے چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا گناہ ہیں۔ مجھے دن رات یہی بتایا جاتا تھا مگر عمل اس کے برخلاف کیا جاتا تھا۔ وہ سب چور تھے، دھوکے باز تھے اور جو یہ کام نہیں کرتے تھے وہ دوسروں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی ڈھال تھے۔ تم جانتے ہو دنیا میں ہیروں کا کاروبار ستر فیصد یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ یہ دنیا میں ہر جگہ ہیں جہاں ہیروں کا کاروبار ممکن ہے۔ میکسیکو

کے چھوٹے سے قصبوں میں بھی۔" اس کی بات پر مارسل چونکا تھا۔ اس نے پہلی بار کسی واردات سے اپنا تعلق تسلیم کیا تھا۔ مارسل نے دریافت کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے اور تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟"

بیلا معنی خیز انداز میں مسکرایا "یہ سب کچھ تمہیں میرے مقدمے کی فائلوں سے مل جائے گا۔"

مارسل نے گہری سانس لی "نہیں بتانا چاہتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"ہیزیڈم میں اچھے لوگ بھی تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی کہ تم ان کے کردار سے واقف ہو جاؤ تو ان کے مقابلے میں مجھے ان چوریوں پر حق بجانب قرار دو۔ وہ لوگ جو کرتے ہیں وہ چوری اور دھوکے سے بھی بدتر چیز ہے۔ وہ اپنے ہی بھائیوں کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔" بیلا کے انداز میں حقارت تھی۔

"تم نے اس رقم کا کیا کیا؟" مارسل نے پوچھا۔

بیلا نے گہری سانس لی "میں نے کسی کو اس بارے میں ایک لفظ نہیں بتایا لیکن تم سننا چاہتے ہو تو سنو میں نے اس رقم کا بڑا حصہ یورپ اور اسرائیل میں یہودیوں کی آباد کاری کے لیے بھجوا دیا تھا۔"

مارسل نے بیلا کے اس دعوے کی تصدیق کی تھی۔ جب اسے عدالت سے سزا سنائی گئی تھی تو دنیا بھر سے بے شمار خطوط اس کی معافی کے لیے آئے تھے۔ ان لوگوں نے بیلا کو فرشتہ صفت شخص قرار دیا تھا۔ اس سے پہلے شاید ہی کسی عام مجرم کے لیے لوگوں نے یوں اپیل کی ہو۔

"تم یہ سب کیسے کرتے تھے؟" مارسل نے تیسری بار اپنا سوال دہرایا۔

بیلا مسکرایا "میں تمہیں عملی طور پر دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر وہاں اسٹیشنری کی میز تک گیا۔ اس نے وہاں سے کچھ سادہ صفحے، کاغذات، لفافے، لیٹرپیڈ اور ایک قینچی اٹھائی۔ پہلے اس نے لیٹرپیڈ کو فرانس کے کرنسی نوٹوں کے سائز میں کاٹا اور انہیں ایک لفافے میں رکھ کر اسے بند کر دیا اور ان کے ایک کونے میں پانچ سو فرانک لکھ دیا۔ ایک اور لفافے میں اس نے دو عدد پیپر کلپ ڈالے اور اسے بھی سیل کر دیا "میری تکنیک کا اہم ترین حصہ وہ ہوتا ہے جب لفافوں کا چیزوں سے تبادلہ ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات میں میں دیکھتا ہوں کہ وہ شخص کس قسم کے لفافے اور مہریں استعمال کرتا ہے پھر میں متوقع قیمت معلوم کرتا ہوں اور جب میں دوسری ملاقات کے لیے اس کے پاس جاتا ہوں تو ایک اور ویسا ہی مہر لگا لفافہ میرے پاس تیار ہوتا ہے۔ اگر کچھ خرید رہا ہوں تو میرے لفافے میں سادہ کاغذ ہوں گے اور اگر کچھ بیچ رہا ہوں تو لفافے میں نقلی اشیا ہوں گی جو وزن اور سائز میں اصل کے برابر ہوں گی تاکہ خریدار کو شک نہ ہو۔" اس نے لفافے ان سے سامنے میز پر رکھے "اب کمی ہے تو ایک عدد بے وقوف خریدار کی۔" وہ ہنسا اور اپنے گارڈ جینڈرے کی طرف دیکھا "کیا تم مجھ سے بزنس کرو گے نوجوان۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس ایک بہترین گھڑی ہے۔ ہم مختصر بارگیننگ کے بعد قیمت پر تیار ہو جائیں گے۔ میں تم سے یہ گھڑی خرید سکتا ہوں۔"

بادل نخواستہ جینڈرے نے سر ہلایا اور گھڑی اتارنے کے لیے آستین چڑھائی تھی۔ وہ بھونچکا رہ گیا اس کی کلائی سے گھڑی غائب تھی۔ اس کلائی سے اس نے بیلا کو پہنائی جانے والی ہتھکڑی باندھ رکھی تھی۔ بیلا ہنسا "معاف کرنا میں بتانا بھول گیا تھا کہ گھڑی میں نے راستے میں ہی اتار لی تھی۔" اس نے گھڑی نکال کر سامنے میز پر رکھ دی۔ جینڈرے کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا تھا۔ بیلا کہہ رہا تھا "ہم ایک قیمت پر متفق ہو گئے ہیں۔ یعنی تم یہ گھڑی پانچ سو فرانکس کے عوض مجھے فروخت کر رہے ہو۔" مظاہرے کے لیے اس نے پانچ سو فرانکس مانگے جو ہانا نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد دے دیے تھے۔ بیلا نے رقم اور اصل گھڑی دو لفافوں میں ڈال کر انہیں سیل کر دیا۔ اسی لمحے ہر فرد کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر مرکوز تھی۔ وہ لفافوں پر پنسل سے رقم اور گھڑی کی قیمت لکھ رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کہا۔

"اب تم ان میں سے ایک چیز قبول کرسکتے ہو۔ رقم یا گھڑی۔ اب میں خوش ہوں۔ ورنہ مجھے ڈر تھا کہ تم اس قیمت کو قبول کرنے سے انکار نہ کردو۔" وہاں موجود افراد ہنس دیے تھے۔ سوائے جینڈرے کے جو خفت محسوس کررہا تھا۔ بیلا نے اس کی طرف دیکھا "اگرچہ دونوں لفافے میں نے ہی سیل کیے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ تم ایک شریف پولیس مین ہو اور میرے ساتھ ہرگز زیادتی نہیں کرو گے۔"

وہ سب پھر ہنس دیے تھے۔ جینڈرے نے گھڑی والا لفافہ اٹھالیا بیلا نے اس سے ہاتھ ملایا اور اٹھ کر اپنا کوٹ پہنا اور دروازے کی طرف بڑھا اس نے ناب پر ہاتھ رکھا اور مڑ کر پوچھا "شریف پولیس مین ذرا دیکھنا لفافے میں کتنی رقم ہے؟"

جینڈرے نے مسکراتے ہوئے لفافہ کھولا اور سب ایک بار پھر دنگ رہ گئے تھے۔ لفافے میں رقم کے بجائے سادہ کاغذ تھے مارسل سمیت سب قسم کھاسکتے تھے کہ انہیں قطعی پتا نہیں چلا کہ لفافہ کب بدل گیا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ سب ہی بے حد متاثر نظر آرہے تھے۔ بیلا واپس آیا "دیکھا تم نے یہ سب کتنا آسان ہے۔ پہلی بار جب تم اس شریف آدمی پر ہنس رہے تھے تو میں نے رقم کا لفافہ بدل دیا اور جب دوسری بار تم ہنسے تو یہ لفافہ میری جیب میں منتقل ہوگیا۔"

ان سب نے بے اختیار تالیاں بجائیں اور بیلا نے کسی شعبدے باز فنکار کی طرح انہیں جھک کر سلامی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ملاقات کا وقت ختم ہوگیا اور اب بیلا کو واپس جیل پہنچانا تھا۔ مارسل نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے رضاکارانہ طور پر اس شعبدے کا مظاہرہ کیا اور انہیں معلومات فراہم کیں۔ اس نے رقم والا لفافہ سارجنٹ ہانا اور گھڑی والا جینڈرے کو دے دیا۔ پولیس افسر نے ہتھکڑی اس کے دائیں بازو میں داخل کردی۔ جانے سے پہلے بیلا نے ان سے مصافحہ کیا اور اپنے نگرانوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ مارسل اور اس کے ساتھی اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ اس نے انہیں حیران ہی نہیں بلکہ لطف اندوز بھی کیا تھا۔ مارسل نے فیصلہ کیا کہ وہ پولیس حکام سے ایسی کم از کم دو اور ملاقاتوں کی فرمائش کرے گا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس شخص سے جعل سازی کے بارے میں مزید مفید معلومات حاصل کرسکے گا۔ جن سے اس نوعیت کے جرائم کی روک تھام میں مدد ملے گی۔ مارسل کو یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ وہ انہیں اپنے یا اپنے کسی ساتھی کے جرائم کے بارے میں بتائے گا۔ وہ بیلا کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ راہداری مڑنے سے پہلے بیلا ان کی طرف گھوما اور بولا "اچھے آدمیوں تم لوگ فطری طور پر اعتماد پرست ہو۔ میں نے تمہیں جو لفافے دیے تم نے انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا۔"

جینڈرے نے عجلت میں گھڑی والا لفافہ کھولا۔ اس میں گھڑی کے بجائے چھپے پیپر کلپ تھے پھر راہداری ان کے قہقہوں سے گونج اٹھی تھی۔

○☆○

مارسل کی بیلا سے مزید ملاقاتوں کی حسرت پوری نہ ہوسکی۔ کیونکہ یکم فروری ۱۹۵۴ء کو ایک فرانسیسی عدالت نے اسے تین سال قید با مشقت اور جرمانے کی سزا سنائی تھی۔ اپیل کرنے پر یہ سزا کم ہو کر تیس مہینے رہ گئی تھی۔ بعد میں جرمانے کی رقم بھی کم کردی گئی لیکن بیلا کی بدقسمتی کا دور شروع ہوچکا تھا۔ فرانسیسی جیل سے سزا بھگت کر وہ رہا ہوا تو اسے بیلجیئم کے حوالے کردیا گیا۔ جہاں اسے پھر تین برس کے لیے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوا اسے سوئزرلینڈ کے حوالے کیا گیا جہاں اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے برطانیہ، میکسیکو، جنوبی افریقا اور دیگر کئی ممالک نے ناکافی ثبوتوں کی بنا پر اس کے خلاف تحویلِ مجرمین کا معاہدہ استعمال نہیں کیا ورنہ شاید اس کی ساری ہی عمر جیل میں گزرتی۔ اس کے باوجود اسے اپنی زندگی کے پندرہ سال سلاخوں کے پیچھے گزارنے پڑے تھے۔

رہائی کے بعد وہ اسرائیل چلا گیا۔ جہاں اس نے چھ برس سکون سے گزارے تھے۔ وہاں اس کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ اسے سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ اسے محکمہ خارجہ میں ترجمان کے طور پر ملازمت دی گئی تھی مگر یہ پرسکون زندگی اسے راس نہیں آئی۔ وہ رضاکارانہ طور پر دوسرے ممالک سے آنے جانے والے افراد کو عبرانی بھی پڑھایا کرتا تھا۔ جلد ہی وہ اس زندگی سے اکتا گیا اور واپس جرائم کی دنیا میں لوٹ گیا تھا۔ اس نے پھر سے فراڈ اور چوریاں شروع کردیں۔ وہ کئی بار پکڑا گیا اور دنیا بھر میں اسے کئی جگہوں پر سزا ہوئی تھی۔ آخری بار اسے ۱۹۸۰ء میں فرانس کی ایک عدالت نے جیل بھیجا اس وقت اس کی عمر تریسٹھ برس ہوچکی تھی۔

مزے کی بات ہے۔ اس کی حتمی شناخت اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود تاریکی میں رہی تھی۔ اسے آخری سزا بیرل فارکیز کے نام سے ہوئی تھی۔ وہ اب تک فرانس اور انٹرپول کے ریکارڈ میں اس نام سے موجود ہے۔

✲ ✲

گھر

کاشف زبیر

انسان کا کُل اثاثہ اس کا کُنبہ اور مسکن ہوتا ہے... مسکن اور کنبے کے بغیر زندگی، زندگی نہیں رہتی... بے گھر ہو کے جائے پناہ ڈھونڈنا... خوب صورت گھروں اور بستی کو حسرت سے دیکھ دیکھ کے ماتم کرنا... امیدیں یاس... خوشیاں... غم و الم سب لمحوں میں بدل کے ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں... ایسے ہی ایک دل شکستہ... بے مسکن کا دکھ جو غم... اذیت اور مایوسیوں کے آہنی چُنگل میں گرفتار تھا۔

زمین پر تعمیر طاقتور انسانوں کے ناقابل تسخیر قلعوں کی نشانیاں

میرا کوئی گھر نہیں لیکن یہ جگہ میرا گھر ہے اور میرا گھر بہت خوب صورت ہے۔ یہ اب سے نہیں شروع سے خوب صورت تھا۔ جب یہاں صرف میں بستا تھا۔ اس وقت یہاں درخت تھے۔ چند ایک نالے تھے اور چھوٹی سی پہاڑی کی ڈھلان تھی۔ جہاں درخت نہیں تھے وہاں جھاڑیاں اور پودے تھے یا پھر گھاس تھی۔ کوئی جگہ سبزے سے خالی نہیں تھی۔ شمال کی طرف جانے والی ہائی وے یہاں سے کچھ فاصلے سے گزرتی تھی۔ پہاڑی پر چڑھ کر دیکھتا تو دور تک پھیلے

دارالحکومت کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ یہ جگہ کسی قدر اونچائی پر تھی۔
میں نے درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی بنائی ہوئی تھی، اس کی دیواریں کچی مٹی سے اور چھت لکڑی کی بنی تھی جس پر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ ہر بارش کے بعد مجھے نئے سرے سے جھونپڑی کی مرمت کرنا پڑتی تھی مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے پاس اور کوئی مصروفیت ہی نہیں تھی۔ اس لیے یہی واحد مصروفیت تھی۔ پیشے کے لحاظ سے بھکاری ہوں مگر فطرتاً بھکاری نہیں ہوں۔ صبح مانگنے جاتا اور جب اتنا مل جاتا کہ ایک دن کا گزارا ہو جائے تو واپس آجاتا۔ اگر اتنا مل جاتا جس سے دو دن گزر جائیں تو اگلے دن نہیں جاتا تھا۔
مجھے نہیں یاد کہ میں اس جنگل میں کب آیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ دارالحکومت نیا نیا آباد ہو رہا تھا اور اس وقت تو اس پہاڑی سے بہت دور تھا۔ میرا ایک گھر تھا۔ اس میں ایک عورت تھی اور ایک آدمی تھا۔ وہ شاید میرے ماں باپ تھے۔ میں نے ان کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ آدمی صبح گھر سے نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تو گھر میں چولھا جلتا تھا۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان کی یاد بھی دھندلی سی میرے ذہن میں ہے۔ میں شاید سات یا آٹھ سال کا ہوں گا۔ ایک رات کچھ لوگ ہمارے گھر میں داخل ہوئے انہوں نے آدمی کو فوراً مار دیا مگر عورت کو بہت دیر تک دوسرے طریقے سے قتل کرتے رہے۔ انہوں نے اس کا پورا جسم آزاد کر دیا تھا بس منہ بند کر دیا تھا ورنہ وہ بہت چلاتی۔ وہ جس طرح تڑپ رہی تھی اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ چیخیں اس کے اندر گھٹ رہی ہیں۔ میں ایک کونے میں دُبکا ہوا تھر تھر کانپتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔
بالآخر انہوں نے عورت کو بھی مار دیا اور میری طرف توجہ دیے بغیر گھر سے نکل گئے۔ ان کے خیال میں نہ تو میں ان کے لیے خطرہ تھا اور نہ اس قابل تھا کہ وہ مجھے قتل کرتے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی گھر سے نکل گیا اور جدھر منہ اٹھا چلتا رہا۔ چل چل کر میرے حواس جواب دے گئے تو میں ڈھیر ہو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں اسی جنگل میں تھا۔ عجیب بات ہے مجھے خوف کے بجائے یوں لگا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا ہوں اور بالکل محفوظ ہوں۔ شاید میں نے انسانوں کا جو روپ دیکھا تھا اس کے بعد یہ جنگل مجھے محفوظ لگنے لگا تھا۔ مگر یہاں پیٹ بھرنے کا سامان نہیں تھا اس کے لیے انسانوں کے درمیان ہی جانا تھا اور شہر جاتے ہوئے مجھے خوف آرہا تھا۔ کئی دن تک میں جنگل میں دبکا رہا مگر جب بھوک سے پیٹ میں بل پڑنے لگے تو مجھے شہر جانا ہی پڑا۔ اس وقت تک معاملہ بھی دب گیا تھا اور اگر پولیس کو میری گم شدگی کا علم تھا تو اب میری تلاش بھی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔
خوش قسمتی سے مجھے ایک بنگلے سے نہ صرف کھانا مل گیا بلکہ وہاں موجود مہربان عورت نے مجھے کچھ پرانے کپڑے اور پہننے کے لیے جوتے اور چپل بھی دیے۔ اس وقت مجھے ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ جب بھوک لگے وہاں آجانا۔ میں نے یہی کیا مجھے جب بھوک لگتی میں اس بنگلے تک چلا جاتا اور نہ صرف اس وقت پیٹ بھر کر کھاتا بلکہ دو تین وقت کا کھانا بھی مل جاتا۔ کئی سال تک میری روزی کا سلسلہ اسی مہربان عورت سے بندھا رہا۔ وہ مجھے رکھنے پر بھی آمادہ تھی مگر انسانوں سے میرا خوف ختم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ پانچ یا چھ سال بعد وہ عورت اچانک وہاں سے چلی گئی اور جب میں پیٹ بھرنے کے لیے بنگلے آیا تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے بتایا کہ یہاں دوسرے مالک آگئے ہیں اور وہ ایسے تھے کہ اپنے چوکیدار کو ایک کپ چائے نہیں دیتے تھے۔ مجھے کہاں سے کھانا دیتے۔
اس گھر کے چھوٹنے سے مجھے خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ اب وہاں اور بھی بنگلے بن گئے تھے۔ جب میں کسی بنگلے کے سامنے صدا لگاتا تو کہیں نہ کہیں سے پیٹ بھرنے کا سامان ہو جاتا تھا۔ عمر کے لحاظ سے ابھی بچہ تھا مگر تجربات کے لحاظ سے کسی جوان سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنی حفاظت کرنا آگئی تھی۔ ایک بار ایک شیطان صفت آدمی نے جنگل میں مجھے اکیلا پا کر قابو کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ کئی سردیاں گرمیاں جھیلنے کے بعد میں نے یہاں جھونپڑی بنا لی تھی۔ یہاں میں موسم سے محفوظ رہتا تھا۔ جو لوگ کھانے کو دیتے تھے وہ کبھی کبھی پیسے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی دیتے تھے جس سے میری ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں۔ میری ضروریات بھی بس اتنی ہی تھیں۔ میں نے کبھی نارمل زندگی گزارنے کا نہیں سوچا۔ میں اس زندگی سے خوش تھا۔ میں اسی جنگل میں جوان ہوا اور پھر ادھیڑ عمری آئی اور جب میرے بالوں میں سفیدی غالب آنے لگی تو ایک دن اچانک ہی سڑک کی طرف سے بھاری مشینوں کا ایک کانوائے جنگل میں داخل ہوا۔
مشینوں میں بلڈوزر تھے، کھدائی کرنے والی مشینیں اور درخت کاٹنے والے آرے تھے۔ ان کے ساتھ بہت سے خوش پوش اور صورت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے والے لوگ تھے۔ پہلے انہوں نے بہت احتیاط سے اس پورے علاقے کی زمین کی پیمائش کی اور پھر نشانات لگانے لگے۔ اگلے دن سے ان کے لگائے نشانات کے مطابق کہیں درخت کاٹے

جانے لگے، کہیں بلڈوزرز زمین ہموار کرنے لگے اور کہیں زمین میں کھدائی کی جانے لگی۔ اتفاق سے ان درختوں کی طرف کوئی نہیں آیا جہاں میری جھونپڑی تھی۔ مگر مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اگر یہاں کچھ بننے والا تھا تو مجھے یہاں سے لازمی جانا پڑتا۔ میں منتظر تھا کہ ابھی کوئی افسر، کوئی سپروائزر یا کوئی چوکیدار آئے گا اور مجھے حکم دے گا کہ میں اپنا سامان اٹھا کر یہاں سے دفع ہوجاؤں۔

لیکن عجیب بات ہے کسی نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ میری جھونپڑی بھی دیکھ لی گئی تھی۔ اس کے باوجود کسی نے اعتراض نہیں کیا بلکہ ان سے سہولت ہوگئی۔ وہاں مزدوروں کے لیے کینٹین کھل گئی تھی جس میں مزدور مفت میں کھاتے تھے۔ میں وہاں جا نہیں سکتا تھا کیونکہ میرا لباس ہی الگ تھا۔ ایک دن میں بھوکا تھا کیونکہ طبیعت خرابی کی وجہ سے جا نہیں سکا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا تھا کہ میں بہت وقت بھوکا رہا اس لیے مجھے عادت سی تھی۔ میں کینٹین کے باہر بیٹھا ہوا مزدوروں کو کھاتے دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک مزدور اٹھا اور میرے لیے پلیٹ میں سالن اور روٹی لے آیا۔ وہ اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ ''بابا یہ کھالو۔''

میں نے شکر گزاری سے اسے دیکھا اور کھانے لگا۔ اس کے بعد جب تک کام ہوتا رہا کوئی نہ کوئی مزدور مجھے کینٹین سے کھانے کو لا دیتا تھا۔ کینٹین والا بھی اعتراض نہیں کرتا تھا کیونکہ کھانا باہر سے بن کر آتا تھا اور اسے صرف تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران میں مجھے یہ علم ہوگیا تھا کہ یہاں ایک پرائیویٹ بلڈر کالونی بسا رہا ہے اور یہ کالونی پوش طبقے کے لیے ہوگی۔ ظاہر ہے اس میں میرے جیسے شخص کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شاید ابھی یہاں کام چل رہا تھا اور کالونی کی تعمیر میں وقت تھا اس لیے مجھے برداشت کیا جا رہا تھا۔ مگر جب یہاں لوگ آکر بستے تو ان کے درمیان میرا وجود ایسا ہی ہوتا جیسے صاف ستھرے جسم پر کوئی گندہ زخم۔ مجھے یہاں سے نکال دیا جاتا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا اور میں نے متبادل جگہ بھی دیکھ لی تھی۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ایسا ہی ایک پہاڑی جنگل تھا۔

رفتہ رفتہ کالونی کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ اس کے گرد پتھروں اور اینٹوں سے بنی چار دیواری بنائی گئی تھی۔ مگر زمین کی ساخت کو نہیں چھیڑا گیا تھا۔ اس دیوار کی وجہ سے کالونی محفوظ ہوگئی تھی۔ کالونی کی پلاننگ یقیناً بڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ اس میں ایک پارک تھا اور قدرتی جنگل بھی چھوڑا گیا تھا۔ اس کے بعد یہاں تعمیراتی کام شروع ہوا۔ چھوٹے دو منزلہ کاٹیج تھے۔ پھر چھوٹے بنگلے، ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ اور درمیانے درجے کے بنگلوز کے ساتھ یہاں کمرشل ایریا بھی بنایا جا رہا تھا۔ کام بہت تیزی سے شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے ہی بنیادوں سے تعمیر بلند ہونے لگی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک دن انچارج میری جھونپڑی تک آیا اور اس نے مجھے باہر بلا کر نرمی سے کہا۔

''بابا تمہیں اپنی جھونپڑی یہاں سے ہٹانا ہوگی۔ یہ پورا علاقہ کمپنی کی ملکیت ہے اور یہاں کمپنی کی مرضی کے بغیر کوئی بھی جھونپڑی بنا کر نہیں رہ سکتا۔''

میں پہلے ہی یہاں سے جانے کا سوچ چکا تھا۔ اس لیے مزاحمت نہیں کی اور انچارج سے وعدہ کیا کہ چند دن میں اپنی جھونپڑی یہاں سے ہٹا دوں گا۔ میں اس جنگل میں پہنچا جسے میں نے نئے گھر کے طور پر چنا تھا۔ مگر جب میں وہاں گیا تو مجھے وحشت سی ہوئی۔ حالانکہ یہ ویسا ہی جنگل تھا، ویسی ہی پہاڑی، ویسے ہی درخت، نالے اور جھاڑیاں تھیں جو ختم ہوجانے والے جنگل میں تھیں۔ اس کے باوجود مجھے لگا جیسے میں گھر سے کسی ویرانے میں آگیا ہوں۔ حالانکہ میں تو ہمیشہ سے ویرانے میں رہا تھا۔ اس کے باوجود میرا اس جگہ دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں جھونپڑی بنانے کے ارادے سے آیا تھا مگر گھبرا کر بنا کچھ کیے واپس آگیا۔ دوسرے دن پھر گیا اور پھر وہی کیفیت ہوئی اور میں کچھ کیے بغیر ہی آگیا۔ اب میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے میں نے اپنی جھونپڑی اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنا شروع کردی۔ میں نے اسے برسوں بنایا اور سنوارا تھا مگر جب گرانے پر آیا تو صرف ایک دن لگا تھا۔ سامان میرے پاس معمولی سا تھا جو سارے کا سارا ایک بورے میں آگیا۔ میں وہ بورا لے کر وہاں سے نکل رہا تھا کہ انچارج نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے آواز دے کر روکا اور پھر بولا۔

''بابا کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے ادب سے کہا۔ ''صاحب آپ نے ہی تو کہا تھا کہ جھونپڑا گرا دوں۔''

''بابا جھونپڑا گرانے کو کہا تھا۔ یہاں سے جانے کو نہیں۔ تم بے شک یہاں رہو۔ کہیں بھی سو جایا کرو۔ کھانا تم کو کینٹین سے ملتا رہے گا جب تک کینٹین ہے۔''

میں خوش ہوگیا۔ ''شکریہ صاحب۔''

''مجھے افسوس ہے مگر اوپر والوں کا حکم ہے اس لیے جھونپڑی ختم کرنا پڑی۔ اگر بارش ہو تو تم ہمارے کیمپ میں آجایا کرو۔''

وہاں مزدوروں کے لیے کیمپ لگا ہوا تھا۔ یہ ٹینٹ اور کینوس کا بنا ہوا کیمپ تھا۔ یہاں مزدور اور کام کرنے والا دوسرا عملہ رہتا تھا۔ بہت سارے آتے اور کام کر کے چلے جاتے تھے مگر کچھ عملہ مستقل یہیں رہتا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ جھونپڑی نہیں رہی تھی مگر درختوں تلے آرام کرلیتا تھا۔ بارش ہوتی تو میں کیمپ میں چلا جاتا۔ اب وہاں کے لوگ مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ مکانوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ پارک بھی بن رہا تھا اور اس کی بنچیں بنیں تو مجھے سونے کے لیے جگہ مل گئی۔ درمیان میں کچھ بنچیں شیڈ تلے بنائی گئی تھیں وہاں میں بارش سے بھی محفوظ رہتا تھا۔ دو سال میں کالونی مکمل ہوگئی اور بکنگ کرانے والوں کو قبضہ دیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کمرشل ایریا بھی کھل گیا۔ ہائی وے پاس تھی اور ہر طرح کی ٹرانسپورٹ چلتی تھی۔ پانی، بجلی اور گیس کی سہولت تعمیر کے دوران ہی آگئی تھی۔ اس لیے کالونی آباد ہونے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔

تعمیر مکمل ہونے کے بعد کالونی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ صاف شفاف چمکتی سڑکیں اور اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر سے بنے ہوئے فٹ پاتھ تھے۔ بہترین قسم کی اسٹریٹ لائٹس اور پارک لائٹس کی وجہ سے وہاں رات میں بھی دن کا سماں ہونے لگا تھا۔

کالونی کی تکمیل کے بعد کمپنی کی طرف سے اس کے لیے سیکیورٹی گارڈ رکھے گئے تھے۔ وہ سب مجھ سے مانوس تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ انہیں ضرورت ہوتی تو میں دوڑ کر ان کے کام کرتا تھا۔ بعض دفعہ ان کی جگہ ڈیوٹی بھی دیتا تھا۔ مگر ایسا کم ہوتا تھا۔ پھر لوگ آنا شروع ہوئے۔ یہاں آنے والی ساری کی فیملیاں تھیں۔ میری کوشش ہوتی کہ ان لوگوں کی نظروں میں کم سے کم آؤں تاکہ کوئی مجھ پر اعتراض نہ کر سکے۔ میرا وجود کسی کو کھٹکے نہیں۔ خوش قسمتی سے میں کامیاب رہا اور رفتہ رفتہ پوری کالونی آباد ہوگئی مگر کسی نے میری موجودگی پر اعتراض نہیں کیا یا اگر کیا تو خود تک محدود رکھا اسے کالونی کا مسئلہ نہیں بنایا۔ میری دبی ہوئی موجودگی بھی میرے کام آئی۔ میں ان جگہوں پر جانے سے گریز کرتا جہاں لوگ اور خاص طور سے عورتیں اور بچے ہوتے تھے۔ کالونی بسنے کے بعد میں رات بارہ بجے سے پہلے پارک نہیں جاتا تھا۔ اس طرح کمرشل ایریا سے دور رہتا تھا۔ بھوک لگنے کی صورت میں بھی کسی کے گھر جانے سے گریز کرتا تھا۔ میرا کھانا پینا کالونی کے سیکیورٹی گارڈ اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص عملے کے ساتھ تھا۔

اس کے باوجود رفتہ رفتہ کچھ لوگوں سے میری واقفیت ہو گئی اور وہ میرا خیال رکھنے لگے تھے۔ ان میں ایک رافعہ صبیح تھیں۔ ان کے شوہر صبیح الدین ایک اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر تھے۔ دونوں میاں بیوی اکیلے تھے کیونکہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ رافعہ تقریباً چالیس برس کی خوب صورت اور باوقار عورت تھیں۔ پھر مدثر علی شاہ تھے۔ مدثر صاحب تقریباً پچاس برس کے سوبر آدمی تھے۔ انہوں نے دو بار شادی کی اور دونوں بار انہیں ناکامی ہوئی۔ ان کے دو بیٹے تھے جو اپنی ماؤں کے پاس ہوتے تھے۔ وہ بھی اکیلے آدمی تھے۔ جب میں صبح پارک سے اپنا بستر اٹھا کر رخصت ہو رہا ہوتا تو ان سے سامنا ہوتا تھا اور وہ میری حیثیت سے قطع نظر مجھ سے سلام دعا کرتے تھے۔ پھر ایان اسماعیل تھا۔ ایان نوجوان تھا اور اس کے سارے شوق نوجوانوں والے تھے۔ میوزک، ہلا گلا، لڑکیاں اور تیز رفتار ڈرائیونگ، بہ ظاہر اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن وہ مجھ سے اچھی طرح پیش آتا تھا اور میرا خیال رکھتا تھا۔

سبحان احمد جن کا کمرشل ایریا میں ریستوران تھا۔ شبیر عثمان جو کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اعلیٰ افسر تھے۔ بوتیک چلانے والی مسز ناہید اصغر اور اسکول پرنسپل تہمینہ حیات۔ یہ سب مجھ سے واقف ہو گئے تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ مجھ سے عزت سے پیش آتے تھے۔ میری غربت کے باوجود مجھے انسان سمجھتے تھے۔ کالونی کو آباد ہونے میں بھی مختصر وقت لگا تھا۔ دو سال میں یہاں تقریباً سارے رہائشی یونٹ آباد ہو چکے تھے۔ آبادی ہوئی تو یہاں صبح سے شام تک چہل پہل ہونے لگی تھی مگر یہ چہل پہل ایک خاص حد تک تھی۔ یہاں بھی آبادی کا ہجوم یا گھٹا ہوا ماحول محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس بہت پُرسکون اور پُرامن ماحول ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے سارے ہی لوگ بہت مہذب اور دوسروں کا خیال کرنے والے تھے۔ وہ خود بھی سکون سے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی سکون سے رہنے دیتے تھے۔

☆☆☆

میں نے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے نالے میں ایک جگہ اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔ یہ قدرتی غار تھا جسے میں نے اپنے لحاظ سے مزید بہتر کرلیا تھا۔ یہاں عام لوگ نہیں آتے تھے۔ نالے میں اترنا ویسے بھی آسان کام نہیں تھا۔ دن میں عام طور سے میں صرف کھانے کے لیے باہر نکلتا تھا۔ ورنہ سارا وقت یہیں رہتا تھا۔ ہاں شام ہوتے ہی میں نکل کر جنگل میں آجاتا

اور یہاں سے آس پاس کی رونقیں اور لوگوں کی سرگرمیاں دیکھتا تھا۔ جنگل کسی قدر اونچی جگہ پر تھا اور یہاں سے تقریباً پوری کالونی کا منظر بہت صاف دکھائی دیتا تھا۔ نالے کی جگہ بھی میں نے اونچائی پر چنی تھی کیونکہ تیز ترین بارش میں بھی اس جگہ زیادہ پانی نہیں آتا تھا جبکہ نچلے حصوں میں پانی بعض اوقات ریلنگ سے باہر فٹ پاتھ تک آجاتا تھا۔ میرے ٹھکانے کے ساتھ جنگل تھا اور اونچائی کی وجہ سے یہاں بھی کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس کے بعد بنگلوز تھے اور پھر پارک تھا۔ اتفاق سے میں جتنے افراد سے قریب تھا وہ سب ان بنگلوز میں رہتے تھے۔

انسان جب اکیلا ہو اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو اور اسے اپنا ذہن اور جسم کہیں استعمال نہ کرنا ہو تو اس کے اندر کچھ حسیں بیدار ہو جاتی ہیں اور اس کے ذہن کے اندر کچھ کھڑکیاں سی کھل جاتی ہیں۔ عام لوگوں میں یہ حسیں خوابیدہ اور کھڑکیاں بند ہوتی ہیں کیونکہ وہ زندگی کی مصروفیات میں ان کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ہیں۔ جب تک میں جنگل میں تھا، مجھے پتا نہیں تھا کہ میری کچھ حسیں بیدار ہوگئی ہیں اور ذہن کی کچھ کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ پھر جب اس ویرانے میں لوگ آکر آباد ہوئے تو مجھے ان چیزوں کا احساس ہونے لگا۔ میں جس کے پاس جاتا اور جس سے بات کرتا مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ یہ بہت کچھ اس کی ظاہری شخصیت سے متضاد ہوتا تھا۔ یا کم سے کم مختلف ضرور ہوتا تھا۔ اس کے باوجود یہ اس کی زندگی کا بہت چھوٹا سا حصہ ہوتا تھا۔ ایسا حصہ جسے ہم بہت آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مگر لوگوں کو اس کا علم ہو جائے تو وہ اسے نظر انداز نہیں کرتے ہیں بلکہ اس شخص کی پوری زندگی پر محیط کر دیتے ہیں۔

یہ خالقِ کائنات کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اس معاشرے سے الگ رکھا جس کے لوگوں سے رویے بہ ظاہر انسانوں والے ہیں لیکن ان میں انسانیت کی شدید کمی ہو چکی ہے۔ یہ کمی اتنی زیادہ ہے کہ انہیں اپنے روزمرہ کے معمولات کو اچھے طریقے سے نمٹانے کے لیے ایک قسم کی اجتماعی منافقت اور اداکاری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شاید اس لیے میں نے لوگوں کے بارے میں ”کچھ“ جان لیا تو بھی میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرے نزدیک ان کے ظاہری رویے کی اہمیت تھی جو وہ میرے ساتھ برتتے تھے۔ میں ان کی معمولی سی عطا پر بھی ان کا احسان مند ہوتا تھا اور ہمیشہ ان کے آگے جھکا رہتا تھا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ میری ذات سے انہیں کوئی تکلیف یا ناگواری نہ ہو۔

اس کے لیے میں خود کو صاف ستھرا رکھنے لگا تھا۔ میں باقاعدگی سے ہر دوسرے تیسرے دن نہاتا، اپنے کپڑے صاف رکھتا اور اپنے سر و داڑھی کے بال سنوار کر رکھتا۔ مجھے کوئی غلط چیز کھانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے میرے تمام دانت سلامت تھے اور میں انہیں بھی صاف رکھتا۔ میں جہاں ہوتا اس جگہ کو بھی صاف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اگر مجھے کہیں کچرا نظر آتا تو میں اسے اٹھا کر آس پاس موجود ڈسٹ بن میں ڈال دیتا تھا۔ شاید میری یہی کاوشیں تھیں جس کی وجہ سے میں اس پوش کالونی میں رہنے میں کامیاب رہا۔ اس کے باوجود میں یہاں کے لوگوں کا احسان مند تھا کہ انہوں نے مجھے یہاں سے نکالنے کی مہم نہیں چلائی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی نے مجھے جھڑکا یا اپنے انداز سے ناگواری کا احساس دلایا۔ زیادہ تر مجھ سے اچھی طرح ملتے تھے۔ البتہ بچے شروع میں مجھ سے ڈرتے تھے اور اگر کسی بچے سے سامنا ہوتا تو وہ چونکا ہو جاتا تھا۔ اس لیے میں خود بھی بچوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا اور اگر مجھے کہیں کوئی بچہ یا بچے نظر آجاتے تو میں پلٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ بچے بھی مجھ سے مانوس ہوگئے مگر میں نے ان کے بارے میں اپنی روش برقرار رکھی تھی۔

شام سے رات تک میں اسی جنگل میں رہتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ شاید جنگل میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں بہت تیز تھیں اور مجھے دور تک بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں ہلکی سی روشنی میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ اوپر سے مجھے گلیاں اور مکانات پوری جزئیات کے ساتھ نظر آتے تھے۔ بہت سے گھر اس ساخت کے تھے کہ میں اندر تک دیکھ سکتا تھا اور مجھے علم ہوتا رہتا کہ گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ میں سب دیکھتا اور پھر اسے ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔

دس بجے میں گلیوں میں نکل آتا مگر مرکزی سڑکوں پر جانے سے گریز کرتا۔ کیونکہ ٹریفک رات بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ بارہ بجے کے قریب میں سبحان احمد کے ریستوران جاتا تھا۔ وہ بارہ بجے بند کر دیتا تھا اور اس وقت کچن میں بچ جانے والے کھانے میں سے مجھے میرا حصہ مل جاتا۔ یہی میرا ڈنر ہوتا اور جو بچ جاتا وہ صبح ناشتے کے کام آتا۔ دوپہر میں کھانا مجھے کسی بنگلے سے مل جاتا تھا۔ اگر رافعہ کھانا دیتی تو ساتھ میں کاغذی مگ میں چائے بھی دیتی تھی۔ کسی دوسرے بنگلے سے یہ عنایت نہیں ہوتی تھی۔ میں سبحان احمد کے ریستوران کے باہر ہی ڈنر کرتا اور پھر کچھ دیر کمرشل ایریا میں مٹرگشت کر کے پارک چلا جاتا۔ میں سوتا کم تھا بس لیٹا رہتا تھا۔ اس دن جب میں سبحان احمد کے ریستوران پہنچا تو اس کے اوپر والے فلور پر جہاں مختلف قسم کے دفاتر تھے۔ ان میں زیادہ تر ڈاکٹر تھے اور اسٹیٹ ایجنٹس تھے۔ وہاں مجھے ایک نیا بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے سبحان احمد سے پوچھا۔

''یہاں کون آیا ہے۔''

اس نے بورڈ دیکھا۔ ''ڈاکٹر شایان لودھی، لیکن یہ نفسیات کا ڈاکٹر ہے۔''

پڑھے لکھے لوگوں میں رہ کر میں بہت سی انگریزی اور اردو زبان کی اصطلاحات سمجھنے لگا تھا۔ ''وہ جو دماغ کا علاج کرتا ہے؟''

''ہاں، ابھی اس نے کلینک کھولا ہے۔''

مجھے ڈاکٹر شایان سے دلچسپی نہیں تھی۔ بس تجسس تھا کہ نیا آنے والا کون ہے۔ میں نے کھانا کھایا۔ بچا ہوا پیک کیا اور سبحان احمد کا شکریہ ادا کر کے پارک کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس سے اوپر موجود بنگلے بڑے تھے اور ان میں کار پورچ تھے اس لیے وہاں کوئی گاڑی باہر نہیں رکھتا تھا سوائے ان لوگوں کے جن کے پاس ایک سے زیادہ گاڑیاں تھیں اور وہ تمام گاڑیاں اندر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک دو سے زیادہ انہیں باہر پارک کرنا پڑتی تھیں۔ ان تمام گاڑیوں کو میں پہچانتا تھا جو رات کے وقت باہر کھڑی ہوتی تھیں۔ اس لیے جب ایک سیاہ بڑی گاڑی رافعہ صبیح اور مدثر صاحب والی گلی میں نظر آئی تو میں چونکا تھا، اس سے پہلے کبھی اس گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ گاڑی رافعہ کے گھر سے کچھ ہی دور پارک تھی۔ شاید کوئی کسی کے ہاں مہمان آیا تھا۔

مگر چند دن بعد میں نے وہی گاڑی سبحان احمد کے ریستوران کے سامنے سڑک کے دوسری طرف پارک دیکھی۔ سبحان احمد کے ریستوران میں مال لانے والے کارٹن جمع ہو گئے تھے اور وہ چاہتا تھا کہ انہیں کھول کر ان کے بنڈل بنا لیے جائیں۔ تاکہ انہیں آسانی سے ڈسٹ بن میں ڈالا جا سکے۔ کھلی صورت میں یہ ڈسٹ بن میں نہیں سماتے اور باہر رکھنے پڑتے۔ یہاں کوئی کباڑیا نہیں آتا اور یہ سارا کچرا میونسپلٹی والے لے کر جاتے تھے۔ یہاں کچرا چننے والوں اور کباڑیوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کالونی کو گندہ کرتے تھے۔ سبحان احمد نے مجھ سے کہا۔ ''بابا آکر ان ڈبوں کو کھول کر بنڈل بنا دو تاکہ میں آسانی سے ٹھکانے لگا دوں۔''

میں اسی کام کے لیے دن میں آیا تھا۔ تب میں نے گاڑی دیکھی اور جب میں اپنا کام کر کے واپس جا رہا تھا تو میں نے طویل قامت اور خوش پوش آدمی کو اس سیاہ گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ اس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور وہ چہرے

سے بہت پڑھا لکھا اور مہذب آدمی لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بنگلوز کی طرف جائے گا مگر سیاہ گاڑی گھوم کر کالونی کے خارجی راستے کی طرف چلی گئی۔ یعنی وہ آدمی کہیں باہر سے آیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ کئی دن بعد میں جب پارک میں لیٹا ہوا تھا تو کوئی گاڑی باہر سے آئی اور پارک کے ساتھ سے ہوتی ہوئی بنگلوز کی طرف جانے لگی۔ میں نے ایسے ہی دیکھا اور سیاہ گاڑی دیکھ کر چونکا۔ وہ اسی گلی میں داخل ہوئی تھی جہاں میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔

میں اٹھ کر تیزی سے پارک کے اوپری سرے کی طرف بڑھا۔ گیٹ سے نکل کر میں گلی کے سرے تک آیا تو میں نے سیاہ گاڑی کو اسی جگہ رکتے دیکھا جہاں وہ کئی دن پہلے کھڑی تھی۔ اس سے اتر کر وہی طویل قامت آدمی صبیح الدین کے گھر کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس نے کال بیل بجانے کے بجائے گیٹ کے پاس رک کر آس پاس دیکھا اور پھر چھوٹا دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا۔ میں حیران ہوا کہ رات کے ایک بجے گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں دبے قدموں گیٹ تک آیا تو اندر پورچ میں تاریکی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اندر صبیح الدین صاحب کی سرکاری گاڑی موجود نہیں تھی۔ وہ اسی پر دفتر یا کہیں اور آتے جاتے تھے۔ ہاں رافعہ صبیح کی چھوٹی کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم سے کم صبیح الدین گھر پر نہیں تھے اور امکان تھا کہ شاید رافعہ بھی وہاں نہیں تھی۔ تب یہ شخص یہاں کیا کرنے آیا تھا اور اس کے لیے گیٹ کس نے کھلا چھوڑا تھا۔

میں پیچھے آیا اور پھر کچھ سوچ کر اوپر والے جنگل کی طرف بڑھا۔ یہاں سے صبیح الدین کا بنگلا صاف دکھائی دیتا تھا خاص طور سے اس کا اوپر والا فلور جس کے دونوں بیڈ رومز کی کھڑکیاں اسی طرف کھلتی تھیں۔ میں نے نزدیک ترین جگہ رک کر دیکھا تو ایک بیڈروم کی کھڑکی تاریک تھی مگر دوسری میں روشنی تھی۔ کھڑکی کھلی تھی اور سفید رنگ کا پردہ اس پر موجود تھا۔ اچانک پردے پر ایک نسوانی سایہ آیا۔ اس کے پیچھے ایک مردانہ سایہ نمودار ہوا۔ اس کی طویل قامت اور عینک سے میں نے اسے پہچان لیا، وہ وہی سیاہ گاڑی والا تھا۔ عورت یقیناً رافعہ تھی۔ اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا مگر اس کے سوا یہاں اور کون عورت ہو سکتی تھی۔ مرد نے عورت کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچ کر کھڑکی کے سامنے سے لے گیا۔ میں دم بہ خود سا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مگر میں صرف سوچ سکتا تھا کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں کیا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں مگر وہ خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ میں بھی خاموش ہو کر واپس آ گیا۔ اگلی صبح روشنی ہونے سے پہلے سیاہ گاڑی گلی سے نکلی اور کالونی سے باہر چلی گئی۔ اس دن میں نالے میں واقع اپنی پناہ گاہ میں جانے کے بجائے سارا دن جنگل میں ایسی جگہ رہا جہاں سے مجھے کالونی کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔

میری نگرانی رائگاں نہیں گئی۔ چار بجے کے قریب سیاہ گاڑی کالونی میں داخل ہوئی اور کمرشل ایریا کی طرف جانے لگی۔ میں نے جہاں تک ممکن ہوا اسے اوپر سے دیکھا مگر ایک جگہ پہنچ کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ درمیان میں اونچی جگہوں پر مکانات اور بلند درخت تھے۔ میں تیزی سے نیچے روانہ ہوا۔ مختصر راستہ اختیار کرتے ہوئے میں کمرشل ایریا پہنچا تو سیاہ گاڑی ٹھیک اسی جگہ موجود تھی۔ طویل قامت آدمی کہیں نظر نہیں آیا۔ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ایک مناسب جگہ سے سیاہ گاڑی کی نگرانی کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ طویل قامت آس پاس کہیں سے برآمد ہوگا۔ تب میں نے ایان کو ریستوران کے اوپر والے فلور کی سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ وہ اتنا پریشان تھا اور اس کی پریشانی صورت سے ہی نظر آ رہی تھی۔

اس نے بے دھیانی میں سڑک کراس کی اور ایک طرف سے آتے ڈرائیور نے خود بریک مار کر اسے بچایا۔ مگر اس نے گاڑی کو دیکھا ہی نہیں اور اپنی نئے ماڈل کی اسپورٹس کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا پھر جس طرح سے کار کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا صاف لگ رہا تھا کہ اس کا ذہن بہت زیادہ دباؤ میں تھا۔ ورنہ میں نے اسے کالونی میں کبھی اس طرح سے گاڑی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ تیز رفتاری کا سارا شوق وہ ہائی وے پر پورا کرتا تھا۔ اس نے کار کو کالونی سے باہر کی طرف موڑ دیا اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ باہر جا چکا تھا۔ بھوک رفتہ رفتہ میری برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میرے پاس کچھ رقم تھی اور میں بیکری سے کچھ لے کر کھا سکتا تھا مگر میں اس جگہ سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ سیاہ گاڑی والا کہیں چلا نہ جائے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں سے آتا ہے۔

ٹھیک چھ بجے وہ ریستوران کے اوپری فلور سے نمودار ہوا۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا اور وہ چابیاں گھماتا ہوا سیاہ گاڑی تک آیا۔ اس میں بیٹھا اور کالونی سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریستوران کے اوپر جتنے بھی آفس

والے تھے میں ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پورے دو گھنٹے اوپر رہا تھا۔ اب بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ میں نے بیکری سے سموسے لے کر پیٹ کی آگ کو عارضی طور پر بجھایا۔ اس بار بھی میں نے کسی سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا تجربہ ہے کہ جو بات صبر سے کام لے کر علم میں آتی ہے وہ زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ میں واپس اوپر آیا۔ مسلسل نگرانی اور اوپر نیچے ہونے سے میرا بوڑھا جسم تھک گیا تھا۔ اس لیے میں شام تک آرام کرتا رہا۔

پھر سائرن کی آواز نے مجھے چونکایا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو ایک ایمبولینس کالونی میں داخل ہو رہی تھی۔ پارک کے نزدیک آ کر وہ بنگلوز کی طرف مڑی اور پھر گلی نمبر تین میں داخل ہوئی۔ ایمبولینس ایان اسماعیل کے گھر کے سامنے رکی۔ وہاں لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میرا دل دھڑکا۔ ضرور کچھ ہوا تھا۔ میں نیچے آیا اور گلی میں داخل ہوا تو ایمبولینس سے کفن میں پیک ایک لاش اتاری جا رہی تھی۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور باہر ایان کا باپ اسماعیل پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ لوگ اسے سنبھال رہے تھے اور دلاسا دے رہے تھے۔ لاش ایان کی تھی۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اس کی کار بہت تیز رفتاری سے ایک ٹرک سے جا ٹکرائی جب وہ ایک گاڑی کو اوورٹیک کر رہی تھی اور ٹرک سامنے سے آ رہا تھا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔

ایان مقبول لڑکا تھا اور سب ہی اس کی ناگہانی موت پر افسردہ تھے۔ خود مجھے بہت دکھ تھا۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے کیا کیا جا سکتا تھا۔ ایان کا ایک بڑا بھائی ملک سے باہر تھا۔ اس کی دو بہنیں دوسرے شہروں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کے آنے میں وقت لگا اس لیے ایان کی تدفین دوسرے دن شام کے بعد ہوئی تھی۔ اسے کالونی کے نزدیک ہی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ میں بھی اس کی تدفین میں شریک تھا۔ اس وجہ سے میں سیاہ گاڑی والے پر نظر نہیں رکھ سکا۔ ایان کی تدفین کے دوسرے دن میں شام چار سے پہلے نیچے کمرشل ایریا میں پہنچ گیا۔ سیاہ گاڑی ٹھیک چار بجے وہاں پہنچی اور طویل قامت عینک والا شخص اس سے اتر کر ریستوران کے اوپر والے فلور کی طرف بڑھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور میں چونکا جب وہ اس آفس میں گیا جس پر ڈاکٹر شایان کے کلینک کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کے لڑکے سے تصدیق کی، وہ ڈاکٹر شایان ہی تھا۔

اب ڈاکٹر شایان کا رافعہ یا اس کے گھر میں موجود کسی اور عورت سے کیا تعلق تھا جو وہ اتنی رات گئے وہاں موجود تھا۔ میں اس بات پر غور کرتا ہوا نیچے آیا۔ ڈاکٹر شایان بہ ظاہر نرم مزاج اور خوبرو شخص تھا۔ مگر میں نے اس کا باطن بھانپ لیا تھا۔ وہ نہایت مفاد پرست اور سفاک شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کا رافعہ (اس کا بہت امکان تھا کہ پردے پر نظر آنے والی عورت رافعہ ہی تھی) سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ رافعہ میں بھی انسانی کمزوریاں تھیں مگر بہ حیثیت انسان وہ بہت اچھی تھی۔ ہمدرد اور دوسروں کا خیال کرنے والی۔ وہ کسی صورت ڈاکٹر شایان جیسے شخص کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نیچے اتر رہا تھا تو میں نے اسماعیل صاحب کو اوپری فلور پر جاتے دیکھا۔

اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں نیچے آ کر اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے میں پہلے بھی سیاہ گاڑی کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسماعیل صاحب اوپر سے اترے تو ان کی تقریباً وہی حالت تھی جو دو دن پہلے ایان کی وہاں سے اترتے ہوئے تھی۔ تب میں چونکا۔ کیا ایان اور اسماعیل صاحب کا بھی ڈاکٹر شایان سے کوئی تعلق تھا۔ اسماعیل صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے اور جب انہوں نے گاڑی چلائی تو وہ ان سے ٹھیک سے چلائی نہیں جا رہی تھی۔ اگر سڑک پر ذرا بھی ٹریفک ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں حادثہ کر بیٹھتے۔ میرا خیال تھا کہ اسماعیل صاحب بنگلوز کی طرف جائیں گے جہاں ان کا گھر تھا۔ مگر وہ کمرشل اسٹریٹ پر ہی تھوڑا آگے گئے اور کالونی کے واحد بینک کے سامنے رکے۔ بینک کا وقت ظاہر ہے ختم ہو چکا تھا مگر اے ٹی ایم چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ اسماعیل صاحب اے ٹی ایم میں گئے۔

وہ دس منٹ بعد اندر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر اسی طرف واپس آئے۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر ریستوران کے اوپری فلور کی طرف بڑھے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ڈاکٹر شایان کے آفس میں گئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اتفاق سے وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے خاموشی سے ہینڈل گھما کر ذرا سا دروازہ کھول لیا۔ آفس دو حصوں پر مشتمل تھا ایک آنے والوں کے لیے تھا اور اس سے آگے والا حصہ جو لکڑی سے پارٹیشن کیا گیا تھا ڈاکٹر شایان کا تھا اور اسماعیل صاحب اسی میں گئے تھے۔ میں اندر جا نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو میرے پاس یہاں اپنی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے واپس آ گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ایان بھی ڈاکٹر شایان کے پاس آیا تھا۔ کیا اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا؟ ایسا ہو سکتا تھا کہ آج کل ہر انسان کے ساتھ نفسیاتی

مسائل ہوتے ہیں۔ بہ ظاہر ایان لاابالی نوجوان تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے ایک حساس لڑکا تھا۔

مسئلہ وہی تھا کہ میں کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کہ میں کسی سے کوئی سوال کرتا یا اس کے کسی معاملے میں دخل دیتا۔ کچھ دیر بعد اسماعیل صاحب اوپر سے نیچے آئے۔ وہ گاڑی میں بیٹھے اور کچھ دیر سر اسٹیئرنگ پر ٹکا کر بیٹھے رہے جیسے اندر سے ٹوٹ گئے ہوں اور خود کو جمع کر رہے ہوں۔ خاصی دیر بعد انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور روانہ ہوئے، اس بار ان کا رخ گھر کی طرف تھا۔ وہ ڈاکٹر شایان کے پاس کیوں آئے تھے اور اتنے ٹوٹے ہوئے کیوں لگ رہے تھے؟ بہرحال جو بھی تھا اس میں ڈاکٹر شایان کہیں نہ کہیں ملوث تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کی نگرانی جاری رکھوں گا۔ یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ ڈاکٹر دن میں اپنے آفس آتا تھا یا پھر رات میں صبیح الدین کے گھر آتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس وقت آیا تھا جب صبیح الدین گھر پر نہیں تھے۔ وہ سرکاری افسر تھے اور انہیں اکثر سرکاری کاموں سے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا تھا اور وہ ایک دو یا زیادہ دن بھی گھر سے غیر حاضر ہوتے تھے۔

رات کے وقت میں پارک میں ہوتا تھا اور آنے والی کوئی گاڑی میری نظروں سے بچ کر بنگلوز کی طرف نہیں جاسکتی تھی۔ اگر ڈاکٹر شایان صبیح الدین کے گھر آتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔ وہ اگلی رات بھی صبیح الدین کے گھر پہنچا۔ وقت وہی تھا یعنی رات کے ایک بجے اور اس بار بھی گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شایان خاموشی سے اندر چلا گیا۔ وہ پہلے آیا تب بھی پورچ اور گیٹ کی روشنیاں بند تھیں اور آج بھی روشنیاں بند تھیں۔ ایسا بندوبست اندر کا کوئی فرد کر سکتا تھا۔ کھڑکیوں کی روشنی دیکھنے کے لیے مجھے اوپر جنگل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رافعہ کے بیڈ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شایان وہیں تھا۔ اگرچہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے ڈاکٹر شایان پر غصہ آنے لگا۔ جب آدمی کو کسی پر غصہ آتا ہے تو وہ اسے نکالنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ دریافت کر لیتا ہے۔ میں واپس پارک آیا تو تقریباً تین گھنٹے بعد ایک وائٹ کیب کالونی میں آئی اور پارک کے پاس رکی تھی۔ اس کی آمد کے چند منٹ بعد ڈاکٹر شایان بنگلوز کی طرف سے نمودار ہوا اور کیب میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوا۔

جب روشنی ہوئی تو ایک آٹو ورکشاپ کی گاڑی وہاں آئی اور اس نے بنگلوز والی گلی میں کھڑی ڈاکٹر شایان کی گاڑی کے چاروں تباہ ہونے والے ٹائر بدل دیے اور اسے وہاں سے لے گئے۔ کسی نے چاقو سے گاڑی کے چاروں ٹائروں اور اس کے عقب میں لگے اسپیئر ٹائر کو بھی کاٹ کر ناکارہ کر دیا تھا۔ مکینکوں نے یہ کام بہت تیزی اور خاموشی سے کیا تھا۔ بہت کم لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ جب گاڑی گئی تو میں بھی مسکراتا ہوا اوپر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس صبح میں بہت دن بعد گہری نیند سویا تھا۔ میری آنکھ دوپہر میں کھلی تو میں باہر آیا اور رافعہ کے پاس پہنچا۔ کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ سُتا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ رات بھر سوئی نہ ہو اور روتی رہی ہو۔ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بابا، آج میں نے تازہ کچھ نہیں بنایا ہے البتہ کل کا سالن بچا ہوا ہے۔''

''بی بی، میرے لیے تو کل کا بھی تازہ ہی ہوگا۔''

رافعہ نے مجھے سالن اور روٹی لا دی۔ البتہ چائے کا مگ اس نے تازہ بنا کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''بی بی، میرے لائق کوئی خدمت؟''

''بابا، دعا کرو کہ اللہ میری مشکلیں آسان کرے۔''

''بی بی، بندہ اپنی مشکلیں خود پیدا کرتا ہے ورنہ وہ تو انسان کو آسانیاں ہی دیتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا مگر میں چیزیں تھام کر پلٹ گیا۔ کھانا کھا کر اور چائے پی کر میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر ڈاکٹر شایان کی نگرانی کے لیے نیچے آیا۔ وہ حسبِ معمول چار بجے آ گیا تھا۔ اس کا لباس اور اس کی گاڑی بتاتی تھی کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ شاید وہ اور جگہوں پر بھی بیٹھتا تھا اور خوب کماتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب مدثر صاحب ڈاکٹر شایان کے کلینک آئے۔ انہیں دیکھتے ہی میں پیچھے لگ گیا اور کلینک تک پیچھے آیا۔ مدثر صاحب کچھ دیر وہاں رہے اور پھر باہر آ گئے۔ میں

برائی

شیخ سعدیؒ کے پاس ایک شخص غصے میں بھرا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

''چوراہے پہ کھڑا ہوا ایک آدمی آپ کو گالیاں دے رہا ہے۔''

اس پر شیخ سعدی نے جواب دیا۔ ''اس نے فضا میں تیر چلایا اور تم نے لا کر میرے سینے میں مار دیا۔''

کسی کی برائی سن کر اس تک پہنچانا اس سے بڑی برائی ہے۔

نے ان کے چہرے پر ایک طرح کی مایوسی اور پریشانی دیکھی تھی۔ آگے پیچھے دو گلیوں میں رہنے والے تین گھرانوں کے لوگوں سے ڈاکٹر شایان کا تعلق سامنے آیا تھا۔ یہ تعلق نارمل نہیں تھا۔

وہ ڈاکٹر تھا اور آدمی اس کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے جاسکتا تھا۔ لیکن خاص بات یہ تھی کہ اس کے پاس جو جاتا تھا وہ پریشان اور مایوس ہی ہوتا تھا۔ میں نے رافعہ کی جو حالت دیکھی تھی اس کے بعد مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر شایان کی اس کے گھر آمد میں اس کی خوشی شامل تھی۔ وہ اسماعیل صاحب اور مدثر صاحب سے زیادہ پریشان نظر آئی تھی۔ چھ بجے ڈاکٹر شایان اپنا کلینک بند کر کے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات کو آئے گا کیونکہ آج بھی صبیح الدین اپنے گھر پر نہیں تھے۔ وہ صبح دفتر ضرور گئے تھے مگر شام کو ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مگر خلاف توقع ڈاکٹر شایان رافعہ کے گھر نہیں آیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ آج آیا تو آج بھی اس کی گاڑی کے ساتھ وہی کروں گا جو اس رات کیا تھا۔ اس نے کسی سے شکایت نہیں کی تھی اور خاموشی سے اپنی گاڑی ورکشاپ والوں کی مدد سے منگوالی تھی۔ وہ شکایت کر بھی نہیں سکتا تھا ورنہ اس بات کی کیا وضاحت پیش کرتا کہ اس رات اس کی گاڑی بنگلوز کی لائن میں کیوں موجود تھی؟

میں ڈاکٹر شایان کا انتظار کر رہا تھا کہ آدھی رات کو ایمبولینس کے سائرن نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ایمبولینس کالونی میں داخل ہوئی تھی اور تیزی سے سائرن بجاتی بنگلوز کی طرف آئی۔ میں بھی پارک سے نکل آیا اور جب رافعہ کے گھر والی گلی میں داخل ہوا تو وہاں ایمبولینس مدثر صاحب کے بنگلے کے سامنے رکی تھی۔ ان کے بنگلے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایمبولینس کا عملہ اسٹریچر اندر لے کر گیا اور پھر اس پر مدثر صاحب کو لٹا کر باہر لایا گیا۔ بہ ظاہر وہ بے ہوش لگ رہے تھے۔ ایمبولینس میں ان کو ڈالتے ہی وہ اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔ مدثر صاحب کے ساتھ ایک ملازم ہوتا تھا اور وہی پیش پیش تھا۔ البتہ وہ ایمبولینس کے ساتھ نہیں گیا۔ جب مدثر صاحب کو ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا تو مجھے گیٹ کے اندر کسی کی جھلک دکھائی۔ وہ عورت تھی اور اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں دیکھ سکا۔ ایمبولینس کے جانے کے بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ مدثر صاحب کا ملازم گیٹ بند کر رہا تھا کہ میں نے اس سے پوچھا۔

"صاحب کو کیا ہوا ہے؟"

"ان کی...... طبیعت خراب ہے۔" اس نے یوں رک کر کہا جیسے اصل بتانے یا نہ بتانے کا فیصلہ کر رہا ہو۔ ساتھ ہی اس نے اندر کی طرف بھی دیکھا تھا۔ مدثر صاحب کے ہاں کوئی عورت نہیں ہوتی تھی تب وہ سفید لباس والی کون تھی؟ میں واپس پارک میں آگیا۔ اگلی صبح روشنی ہوتے ہی مدثر صاحب ایک ٹیکسی میں گھر واپس آگئے۔ میں نے ان کو بنگلے کے سامنے اترتے دیکھا۔ وہ کمزور لگ رہے تھے مگر بہ ظاہر ان کی حالت ٹھیک تھی۔ اندر جانے سے پہلے انہوں نے رافعہ کے بنگلے کی طرف دیکھا تھا اور پھر اندر چلے گئے۔ حالات کی پُر اسراریت اور میرے اندر موجود الجھن بڑھ گئی تھی کیونکہ اس سارے معاملے کو جس طرح میں دیکھ رہا تھا اس طرح کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ان سب کے پیچھے ڈاکٹر شایان ہی ہے۔ اس کے پاس جو جاتا وہ پریشان واپس آتا تھا اور پھر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔

اس دن میں رافعہ کے بنگلے پر کھانا لینے گیا تو میں نے اسے سفید لباس میں پایا۔ یہ ملگجا ہوا اور گزشتہ روز کا پہنا ہوا لگ رہا تھا۔ تو کیا رات میں رافعہ مدثر صاحب کے بنگلے پر تھی۔ ایان کا مجھے افسوس تھا۔ اس کی زندگی نہیں لوٹائی جاسکتی تھی لیکن رافعہ اور مدثر صاحب کو بچایا جاسکتا تھا مگر کیسے؟ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں رافعہ یا مدثر صاحب سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کرتا تو ان کا ردِعمل یقیناً اچھا نہیں ہوتا۔ دو دن بعد مدثر صاحب صبح کی واک کے لیے پارک آئے تو میرا سامنا ہوا۔ میں وہاں سے نکل رہا تھا۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے حال احوال پوچھا اور موقع غنیمت جان کر میں نے ان سے پوچھ لیا۔ "صاحب، اس رات کیا ہوا تھا؟ آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی؟"

مدثر صاحب چونکے اور پھر انہوں نے سر ہلایا۔ "ہاں ہلکا سا انجائنا کا اٹیک تھا مگر فوری ٹریٹ منٹ سے بہتر ہوگیا۔ ڈاکٹر آنے نہیں دے رہے تھے مگر میں اصرار کر کے واپس آگیا۔ اسپتال میں دل گھبرا رہا تھا۔"

"صاحب، دل کا معاملہ ہے، آپ کو کچھ دن احتیاط کرنی چاہیے۔"

"کر رہا ہوں یار۔" وہ بے خیالی میں بولے۔ "مگر کیا کریں زندگی میں مشکلیں اتنی ہیں کہ دل اثر لے ہی لیتا ہے۔"

"صاحب، میرے لائق کوئی خدمت؟"

مدثر صاحب نے میری طرف دیکھا۔ "بابا تم اچھے آدمی ہو اور اوپر والا اچھے آدمیوں کی سنتا ہے، ہمارے لیے دعا کرنا۔"

وہ بے خیالی میں ہی ہمارے کہہ گئے تھے ورنہ انہیں

میرے کہنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے نشان دہی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے موضوع بدل دیا۔ ”صاحب، یہ جو کالونی میں نیا ڈاکٹر آیا ہے، کیا یہ بیماری کا علاج بھی کرتا ہے۔“

مدثر صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ ”نہیں وہ کسی مرض کا علاج نہیں کرتا ہے۔“

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”تب کیا کرتا ہے؟“

”وہ خود ایک مرض ہے جو دوسروں کو لگ جاتا ہے۔“ کہتے ہوئے مدثر صاحب کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ ”مگر اب اس کا علاج ضروری ہو گیا ہے۔“

”اسے علاج کی ضرورت ہے؟“

میری بات پر مدثر صاحب چونکے اور پھر شاید انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنے اندر کی باتیں کسی کے سامنے کر رہے تھے۔ انہوں نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”بابا ایسے ہی بول رہا تھا۔“

وہ آگے بڑھ گئے۔ میں ان کی باتوں پر غور کر رہا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر صرف دو ہی باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ڈاکٹر شایان کو پسند نہیں کرتے تھے اور دوسرے وہ اس کے خلاف کچھ کرنا چاہتے تھے۔ میں فکر مند ہو گیا، اگر وہ کچھ کر گزرتے اور معاملہ پولیس تک جاتا تو زیادہ خرابی ہوتی۔ ڈاکٹر شایان ایسا آدمی نہیں تھا جس کی خاطر کوئی شخص سزا بھگتے اور جیل جائے۔ کم سے کم مدثر صاحب کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے محدود ذہن پر زور دینا شروع کیا کہ اس مسئلے کا کوئی سرا سمجھ میں آئے۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ رافعہ، مدثر صاحب اور اسماعیل صاحب ڈاکٹر شایان سے پریشان تھے۔ وہ انہیں تنگ کر رہا تھا اور کم سے کم مدثر صاحب اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ رافعہ اور اسماعیل صاحب کا مجھے علم نہیں تھا۔ مگر وہ اسی شام مجھے پھر ڈاکٹر شایان کے دفتر میں جاتے دکھائی دیے۔

اسماعیل صاحب صورت سے ہی بہت پریشان لگ رہے تھے اور انہوں نے ایک چھوٹا سا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ دس منٹ بعد وہ واپس آئے تو ان کا ہاتھ خالی تھا اور انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جتنی قوت سے دروازہ بند کیا تھا اس سے ان کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر شایان اوپر سے نمودار ہوا اور وہ بہت مسرور لگ رہا تھا۔ اس کی خوشی کا تعلق یقیناً اسماعیل صاحب کی پریشانی سے تھا۔ اس نے سیٹی بجاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بریف کیس اندر رکھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے واپس آفس کی طرف گیا۔ وہ یقیناً کوئی چیز بھول گیا تھا اور اب لینے اوپر گیا تھا۔ اتفاق سے اس کی گاڑی اس طرح کھڑی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ فٹ پاتھ کی طرف آ رہی تھی۔ میں اس جگہ سے کچھ ہی دور تھا۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی میں اٹھ کر گاڑی تک آیا، گاڑی لاک نہیں تھی، اوپر جاتے ہوئے عجلت میں ڈاکٹر اسے ایسے ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس کا لاک ریموٹ سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا اور اندر جھکتے ہوئے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی اور ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنی ساری ساکھ داؤ پر لگا دی تھی کیونکہ میں نے آج تک کہیں سے کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی تھی اور یہ بات کالونی والے بھی اچھی طرح جانتے تھے بلکہ میں لوگوں کی گم ہونے والی چیزیں تلاش کر کے دیتا تھا۔ خاص طور سے گھر سے بھاگ جانے والی پالتو بلیاں تلاش کرنے کا ماہر تھا۔ اگر میں ڈاکٹر کی گاڑی میں گھسا ہوا پکڑا جاتا تو میری مٹی پلید ہو جاتی۔ چوری کا الزام لگتا یا نہیں لگتا میں یہاں سے ضرور نکالا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ بریف کیس بھی لاک نہیں تھا آسانی سے کھل گیا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں وہی پیکٹ تھا جو اسماعیل صاحب لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ پیکٹ کھولنے کی ضرورت نہیں تھی اس کی ساخت بتا رہی تھی کہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔

ڈاکٹر شایان، اسماعیل صاحب سے بہت بڑی رقمیں لے رہا تھا۔ اس روز اے ٹی ایم سے بھی انہوں نے رقم نکلوا کر یقیناً ڈاکٹر کو دی تھی۔ وہ ڈاکٹر کو اتنی رقم کیوں ادا کر رہے تھے۔ اس سوال کا جواب میں بعد میں بھی تلاش کر سکتا تھا۔ میں نے بریف کیس بند کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اسی لمحے اوپر سے ڈاکٹر نمودار ہوا اور اس سے پہلے وہ سڑک کے پار آتا، میں گاڑی سے دور جا چکا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں سگریٹ کیس تھا جو وہ اوپر بھول آیا تھا۔ اس سگریٹ کیس کی وجہ سے میری معلومات میں بیش قیمت اضافہ ہوا تھا اور اب میں اس سارے معاملے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر شایان کا کردار سامنے آ گیا تھا۔ وہ کسی طرح سے ان لوگوں کو بلیک میل کر رہا تھا اور ان سے رقمیں اور دوسرے فائدے حاصل کر رہا تھا۔ دیگر فوائد اسے رافعہ سے حاصل ہو رہے تھے جو ایک خوب صورت عورت تھی اور ڈاکٹر کی کئی راتیں اس کے بیڈروم میں گزر چکی تھیں۔

اب واضح ہو رہا تھا کہ ایان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ڈاکٹر کے آفس سے نکلنے کے بعد وہ اتنا پریشان کیوں تھا کہ ذہنی

دباؤ کے عالم میں خوفناک حادثہ کر بیٹھا جس میں اس کی جان بھی چلی گئی۔ ایان کے مرنے کے بعد کے والد اسماعیل صاحب دوبار ڈاکٹر کے پاس آئے اور ان کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مدثر صاحب میرے سامنے تھے، وہ ڈاکٹر شایان سے ملے اور اسی رات ان کو ہلکا سا دل کا دورہ پڑا۔ رافعہ بھی بہت پریشان تھی۔ یہ سب انسان تھے۔ ان میں انسانوں والی کمزوریاں اور خوبیاں تھیں مگر ڈاکٹر شایان مجھے شیطان لگا جو اس خوب صورت جنت میں گھس آیا تھا۔ وہ انسانوں کو اپنی شیطانیت کی بھینٹ چڑھا رہا تھا۔ اگر یہاں رہنے والوں کی کچھ کمزوریاں تھیں تو ڈاکٹر کو ان سے حساب لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہ حق صرف خالق کا تھا۔ اسے لوگوں کو تنگ کرنے سے روکنا تھا اور اب لگ رہا تھا کہ یہ کام مجھے ہی کرنا ہوگا۔

جس رات میں نے ڈاکٹر کی گاڑی کے ٹائرز ناکارہ کیے تھے اس رات کے بعد سے وہ رافعہ کے گھر کی طرف پھٹکا بھی نہیں تھا۔ شاید اسے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کے خلاف کارروائی کر رہا ہے، جو چاقو سے ٹائرز کاٹ سکتا ہے وہ چاقو سے اسے بھی کاٹ سکتا ہے۔ وہ بزدل بھی تھا اس لیے پھر رافعہ کے پاس نہیں آیا۔ مگر مجھے معلوم تھا وہ زیادہ دن اپنی شیطانیت سے باز نہیں رہے گا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ کب آتا ہے؟ اور مجھے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس رات بارش ہو رہی تھی اور موسم خوشگوار تھا مگر بارش کی وجہ سے کالونی میں سرِشام ہی سناٹا چھا گیا تھا۔ سڑکیں، گلیاں ویران تھیں۔ یہ اتوار کا دن تھا اس لیے لوگ اگلے روز معمولات کے آغاز کی وجہ سے جلدی سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ہر اتوار کو ایسا ہی ہوتا تھا۔ جیسے ہر جمعے اور ہفتے کے دن رات تک رونق لگی رہتی تھی۔

بارہ بجے کے قریب کالونی کے گیٹ کی طرف سے تیز بارش میں کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس لہرائیں اور میں چوکنا ہو کر بنگلوز کے ساتھ والی سڑک پر نکل آیا۔ کوئی بھی گاڑی یہاں سے گزرے بغیر آگے نہیں جا سکتی تھی۔ ایک منٹ بعد ڈاکٹر کی گاڑی اس طرف مڑی اور میں نے اسٹریٹ لائٹ میں اسے شناخت کر لیا۔ گاڑی ذرا آگے آئی تو میں نے سڑک پر آتے ہوئے دونوں ہاتھ لہرائے جیسے اسے رکنے کا اشارہ کر رہا ہوں۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی اور مجھے لگا کہ وہ رکے گی نہیں مگر میرے پاس آتے ہوئے اس کی رفتار کم ہوئی اور وہ رک گئی۔ جیسے ہی گاڑی رکی میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر نے شیشہ نیچے کر دیا تھا اور اس کا موڈ خراب تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”بڈھے کیا مرنا چاہتا ہے؟“

”صاحب ادھر ایک آدمی زخمی پڑا ہوا ہے۔“ میں نے اس کی بات نظرانداز کر کے سامنے کی طرف اشارہ کیا اور اس نے فطری طور پر سامنے کی طرف دیکھا۔ میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا جس میں چھوٹی سی لیکن وزنی ہتھوڑی دبی تھی، وہ اس کی کنپٹی سے لگی تو وہ کراہ کر آگے جھکا اور دوسری ضرب میں وہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے گھسیٹ کر نیچے اتارا اور ہاتھ بڑھا کر پہلے ہینڈ بریک کھینچا اور پھر سوئچ آف کر کے چابی نکالی اور گاڑی کا دروازہ لاک کر دیا۔ اب اسے کھینچ کر لے جانا تھا اور مجھ بوڑھے کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا۔ ایک تو یہاں ہر طرف اسٹریٹ لائٹس آن تھیں۔ دوسرے سیکیورٹی والے بھی وقفے وقفے سے گشت کرتے تھے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو کھینچ کر اوپر کے جنگل تک لے جانا میرے لیے ہمالیہ سر کرنے سے کم نہیں تھا۔ مگر مجھے یہ کام کرنا ہی تھا۔ اپنے لیے نہیں اس کالونی کے لوگوں کے لیے۔ میں نے اپنا کام شروع کیا۔

اس نے گاڑی بھی کنارے روکی تھی اس لیے اب گاڑی وہاں کھڑی تھی اور کسی کو شک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر میری توقع سے زیادہ وزنی ثابت ہوا تھا اور اسے کھینچنا کسی بھاری بھرکم بوری کو کھینچنے سے کم نہیں تھا۔ مجھے ہر چند قدم کے بعد رک کر اپنا سانس درست کرنا پڑتا۔ اگرچہ بارش کی وجہ سے سڑکیں چکنی ہو رہی تھیں اس کے باوجود یہ کام میری توقع سے زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ بنگلوز کی دو گلیاں میں نے کیسے عبور کیں یہ میں ہی جانتا ہوں۔ جب میں اوپر والے حصے میں پہنچا تو سانس درست کرنے کے دوران میں نے دیکھا کہ رافعہ کے کمرے میں روشنی تھی اور کھڑکی میں اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب آخری مرحلہ تھا میں ڈاکٹر کو کھینچ کر درختوں کے درمیان لے گیا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ہانپ رہا تھا اور بارش کے پانی سے زیادہ پسینا میرے جسم پر بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر رافعہ کے گھر کی طرف دیکھا تو اس بار کھڑکی میں دو سائے نظر آئے۔ دوسرا مردانہ تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شایان میری کھوہ میں دیوار سے اس طرح بندھا بیٹھا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گلے میں ایک رسی اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ وہ کسی قدر دقت سے سانس لے سکتا تھا اور دھیمی آواز میں بول سکتا تھا۔ اگر وہ زور سے سانس لینے کی کوشش کرتا یا چلاتا تو گلے کے مسل پھولنے کی صورت میں ردِعمل میں پھندا خود بہ خود سخت ہو جاتا۔

اسے ہوش آ گیا تھا مگر ابھی اس کی نظر یہاں کی تاریکی سے ہم آہنگ نہیں ہوئی تھی۔ جب اسے نظر آنا شروع ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ ''تم...... مجھے تم نے قید کیا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔

وہ کسمسایا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ تم اسی لائق ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم یہاں سے رہا ہونا چاہتے ہو یا ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہونا چاہتے ہو۔''

اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ ''تم مجھے ڈرا رہے ہو، تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''تم جانتے ہو تم کہاں ہو اور اس جگہ سے کتنی دور ہو جہاں میں نے تمہیں گاڑی میں بے ہوش کیا تھا۔ ذرا اپنے کپڑوں کا جائزہ لو یہ تقریباً پھٹ چکے ہیں۔ زمین پر گھسیٹنے سے تمہارا جسم زخمی ہے۔ اتنا طویل فاصلہ طے کروائے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ جب میں یہ مشکل ترین کام کر سکتا ہوں تو تمہیں قتل کر کے دفن کر دینا تو بہت آسان ہے۔ میں پہلے بھی یہ کام کر چکا ہوں۔''

اس کے چہرے پر خوف بڑھ گیا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا کہ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تم ایان، رافعہ اور مدثر صاحب کو بلیک میل کر رہے ہو؟''

اس نے گہری سانس لی۔ ''میں بلیک میل نہیں کر رہا، انہیں ان کے کیے کی سزا دے رہا ہوں۔''

''غلط، تم ان سے اپنا مفاد حاصل کر رہے ہو۔ تم نے ایان سے رقم وصول کی اور اب اس کے باپ سے وصول کر رہے ہو۔ یہ درست ہے؟''

''درست ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''تم رافعہ صبیح کے ساتھ راتیں گزارتے رہے ہو؟''

''یہ بھی درست ہے۔''

''تم نے مدثر صاحب کو بلیک میل کیا؟''

''تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

جواب میں، میں نے ہتھوڑی سے اس کے گھٹنے پر ضرب لگائی تو وہ گھٹے انداز میں چیخ اٹھا تھا۔ ''میری بات کا جواب دو۔''

''ہاں کیا؟'' وہ سسکتے ہوئے بولا۔

''ایان کو کیوں بلیک میل کیا؟''

''اس نے ہائی وے پر ایک مزدور لڑکے کو ٹکر ماردی تھی۔ وہ مر گیا اور ایان موقع سے فرار ہو گیا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس کے ضمیر پر بوجھ تھا اور اسے راتوں کو ڈراؤنے خواب آتے تھے، وہ علاج کے لیے میرے پاس آیا تھا۔''

''اور تم نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ رافعہ صبیح نے کیا کیا؟''

''وہ اپنے شوہر سے بے وفائی کر رہی تھی۔ اس سے چھپ کر مدثر سے جسمانی تعلقات رکھے تھے۔ اس کے ذہن پر بھی بوجھ تھا اور وہ میرے پاس علاج کے لیے آئی۔''

''مدثر تمہارے پاس علاج کے لیے نہیں آیا مگر تم نے اسے بھی بلیک میل کیا۔''

''ہاں کیونکہ یہ لوگ اسی قابل ہیں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب تم کو پتا چلا کہ یہ اندر سے کیا ہیں۔''

''میں جانتا ہوں تمہارے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں سب جانتا ہوں۔''

''تب تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ یہ اسی قابل ہیں۔''

''یہ عام لوگ ہیں جو گناہ کرتے ہیں اور اس پر ضمیر کا بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ انسان اور شیطان میں یہی فرق ہے، انسان گناہ پر ندامت کرتا ہے اور شیطان اس پر غرور کرتا ہے، اپنے گناہ کی تاویل پیش کرتا ہے۔ تم نے اپنے عمل سے خود کو شیطان ثابت کر دیا ہے۔''

''سنو میرے ساتھ مل جاؤ، میں تمہیں بہت دولت دوں گا۔''

میں نے ہتھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دولت کی نہیں، اپنے گھر کے سکون کی ضرورت ہے۔''

اگلے دن کالونی پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی کیونکہ یہاں آنے والا شیطان اب باقی نہیں رہا تھا۔ اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا کلینک تھا۔ پولیس اس کی گم شدگی کی تفتیش کرنے آئی مگر کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اسی کالونی کے جنگل میں دفن تھا۔ اس جگہ میں نے ایک شیطان کو اور دفنایا تھا جس نے میری کم عمری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے غلط نہیں کہا تھا، اسے ٹھکانے لگانا میرے لیے ذرا بھی مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ کہانی شاید ختم ہو گئی، ہاں ایک بات اور بتانے والی ہے۔ ایک مہینے بعد رافعہ نے صبیح الدین سے طلاق لے لی اور عدت پوری ہونے پر مدثر صاحب سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ اب وہ دونوں بنا گناہ کے ساتھ رہتے ہیں۔

خود غرضی کے اس دور میں ایک باہمت نوجوان کے جذبۂ ایثار کا سنسنی خیز ماجرا

حیاتِ نو

تحریر : کاشف زبیر

کہتے ہیں کہ دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے اور اُس نے بھی دوستی کا پورا حق ادا کیا۔ انسانی ہمت اور جذبوں نے نہ صرف بلند ترین پہاڑوں کو مسخر کیا، بلکہ گہرے سمندروں کو بھی اپنا تابع بنالیا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جذبِ صادق اور عزمِ صمیم کی ضرورت ہے پھر دیکھیے موت کا فرشتہ بھی راستہ چھوڑ دیتا ہے۔

یہ 19 فروری 1937ء کا دن تھا۔ ابھی جنگِ عظیم شروع ہونے میں دو سال کا عرصہ باقی تھا۔ ایک سٹنسن طیارہ جس پر پانچ مسافروں سمیت کُل سات افراد سوار تھے، برسبین سے سڈنی کی طرف جاتے ہوئے لاپتا ہوگیا۔ اس زمانے میں شہری ہوابازی نہایت محدود تھی۔ گنتی کی چند ائر لائنیں تھیں جو مقامی طور پر مسافروں اور سامان کی نقل و حرکت کا کام کرتی تھیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر اب بھی سڑک یا بحری جہازوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔

آسٹریلیا ایک وسیع و عریض زمین اور قلیل آبادی رکھنے والا ملک ہے۔ اس کی طویل مسافتوں کو طے کرنے کے لیے طیارہ ہی سب سے مؤثر ذریعۂ سفر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق موجودہ وقت میں آسٹریلیا کے نوے فیصد باشندے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے ہوائی سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلینڈ اور جاپان جیسے مختصر سے ممالک کے محض پچاس فیصد لوگ ہوائی سفر کرتے ہیں، اگر انہیں اپنے ملک میں سفر کرنا ہو۔ آسٹریلیا میں زمین یا سمندر کے راستے سفر بے حد طویل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ طیارہ سازی کے ابتدائی عرصے میں آسٹریلیا میں ہوائی سفر مقبول ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود معدودے چند افراد ہی ہوائی جہاز سے سفر کرنے کے قابل تھے، کیونکہ اس وقت یہ بے حد مہنگا ہوا کرتا تھا۔ کم سفر کی وجہ سے حادثات بھی کم ہوتے تھے اور کسی

طیارے کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں یہ واقعہ ہفتوں لوگوں کی زبان پر رہتا تھا۔

سٹن سن طیارہ راستے میں آنے والے ایک طوفان کے بعد غائب ہوا تھا اور اس کی اطلاع ملتے ہی آسٹریلیا کی مشرقی ریاستوں میں موجود تمام فوجی اور سویلین طیاروں نے غائب ہوجانے والے طیارے کی تلاش شروع کردی۔ مختلف جگہوں سے طیارے کو دیکھے جانے کے بارے میں کل چونسٹھ شہادتیں موصول ہوئیں کہ اس طیارے کو کس نے کس وقت اور کہاں دیکھا تھا۔ ان اطلاعات کو سامنے رکھ کر طیارے کی تلاش کی مہم شروع کی گئی مگر طیارے کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

عینی شاہدین کی گواہیوں کے مقابلے میں ماہرین کا اندازہ تھا کہ طیارہ سڈنی کے آس پاس کے سمندر میں کہیں ڈوب گیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ طوفان سے بچنے کے لیے طیارے کے پائلٹ نے اس کا رخ سمندر کی طرف موڑ دیا ہو کیونکہ اس طرف طوفان اتنا شدید نہیں تھا۔ راستہ بھٹکنے سے بچنے کے لیے طیارہ ساحل کے ساتھ اڑ رہا ہوگا کہ سمندر میں جا گرا۔ ماہرین کے اس خیال کی تائید ایک واتعاتی نشانی نے کی تھی۔ سڈنی کی بندرگاہ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر پانی پر سو مربع گز کے رقبے پر پھیلا ہوا تیل نظر آیا تھا مگر سمندر اس جگہ اتنا گہرا تھا کہ کسی قسم کی امدادی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دوسری طرف خشکی پر تلاش کی مہم پورے زور و شور سے جاری تھی۔ مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ طیارے کے مسافروں کی زندگی کے امکانات کم ہوتے جارہے تھے۔ اگر طیارہ خشکی پر گرا تھا اور اس کے کچھ مسافر زندہ بچ بھی گئے تھے تو اب تک انہوں نے لاچار بھوک پیاس سے دم توڑ دیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ حادثے کے آٹھ دن بعد طیارے کی تلاش کی مہم ترک کردی گئی مگر اسے مکمل طور پر مسترد نہیں کیا گیا۔ اب بھی حکومت کی طرف سے فوجی طیارے ملنے والی ہر اطلاع پر مذکورہ علاقے میں جاکر طیارہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مسافروں کے لواحقین بھی ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ ایک مسافر کی ماں نے طیارہ تلاش کرنے والوں کے لیے انعام میں ایک بڑی رقم رکھی تھی، اگرچہ اسے سمجھایا گیا تھا کہ یہ تلاش بے سود ہے اور اب کسی مسافر کے زندہ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک طرف ہوا بازی کے ماہرین اور اخبار والے طیارے کے جائے حادثہ کے بارے میں اندازوں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے، تو دوسری طرف آسٹریلیا کی دو ریاستوں، نیو ساؤتھ ویلز اور کوئنز لینڈ کی سرحد پر رہنے والے ایک کاشت کار کا ذہن بھی طیارے کی گمشدگی کے معمے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا نام برنارڈ اوریلی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک طیارے کے جائے حادثہ کے بارے میں جو بھی اندازے لگائے گئے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ اس کے خیال میں طیارہ اپنی منزلِ مقصود یعنی سڈنی تک پہنچا ہی نہیں تھا کیونکہ اس صورت میں اسے مزمور نامی جگہ پر اتر کر ایندھن حاصل کرنا تھا۔ یہ جگہ سڈنی سے چار سو میل کے فاصلے پر تھی۔ غائب ہونے والا طیارہ مزمور پہنچا ہی نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ماہرین نے اتنی اہم بات کیسے نظر انداز کردی۔ طیارہ درمیان میں ایندھن لیے بغیر سڈنی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا اور برسبن کے بعد مزمور اس کا پہلا اسٹاپ ہوتا۔ اوریلی نے اندازہ لگایا کہ طیارہ سڈنی کے آس پاس نہیں بلکہ اس کے علاقے کے قریب ہی میکفرسن کے گھنے جنگلا میں گر کر تباہ ہوگیا تھا۔

یہ حادثے کے چند دن بعد کی بات ہے۔ ایک روز اوریلی کے سر پر طیارے کی تلاش کی دھن سوار ہوئی اور وہ میکفرسن کے جنگلات کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ مشہور برگ ریز جنگلات نہایت دشوار گزار علاقے میں تھے۔ یہاں سطحِ زمین مشکل سے ہی دستیاب ہوتی تھی جہاں اونچی نیچی پہاڑیوں پر بے پناہ گھنے جنگل تھے جن میں سورج کی روشنی بھی بہ مشکل گھس پاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس علاقے کے اوپر تلاش کے لیے کی گئی پروازیں بے سود ثابت ہوئی تھیں۔ اوریلی مختلف پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ کر ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے حادثے کے کسی نشان کی تلاش تھی مگر اسے کیا پتا تھا کہ اس سے کچھ ہی دور دو انسان زندگی اور موت کی سرحد پر سسک رہے تھے۔

☆☆☆

سٹن سن امریکی ساخت کا طیارہ تھا۔ اس کے تین انجن ہوتے تھے اور یہ طویل اڑان کے لیے موزوں اور قابلِ اعتماد طیارہ تصور کیا جاتا تھا۔ جب طیارہ برسبن سے روانہ ہوا تو اسے آسٹریلیا کے دو انتہائی تجربہ کار پائلٹس اڑا رہے تھے۔ یہ ریکس بائیڈن اور اس کا ساتھی بیورلے شیفرڈ تھے۔ دن کے ایک بجے برسبن میں گرم موسم سے قطع نظر ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راستے میں ایک خوف ناک طوفان ان کا منتظر ہے۔ ان دنوں نہ تو ریڈار ہوتے تھے اور نہ ہی طیاروں کو موسم کا حال بتانے والے دوسرے آلات۔ حتیٰ کہ طیارے میں ریڈیو بھی نہیں تھا۔ گو اس

وقت تک ریڈیو طیاروں اور بحری جہازوں میں استعمال ہونے لگا تھا لیکن اس کا استعمال محدود تھا۔

سٹن سن طیارے میں کل آٹھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ اور یہ روزانہ ہی برسبن سے سڈنی جاتا تھا۔ اس روز طیارے میں کل پانچ مسافر تھے۔ پرواز کے تھوڑی دیر بعد ہی طیارہ افق سے اچانک سامنے آنے والے طوفان میں گھر گیا۔ اسے پانچ بجے مزمور کی ائرفیلڈ پر اترنا تھا لیکن جب طیارہ وہاں نہیں پہنچا تو اس کے بارے میں خدشات پیدا ہونے لگے اور یہ خیال پیدا ہوا کہ طیارہ طوفان میں گھر جانے کے باعث مزمور کی طرف آنے کے بجائے ساحل کی طرف چلا گیا اور پھر ساحل کے ساتھ ساتھ اڑتا سڈنی کے قریب جا پہنچا اور ناکافی ایندھن کی بنا پر سمندر میں گر کر تباہ ہوگیا۔ یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ بائیڈن جیسا زیرک پائلٹ جسے برسبن اور سڈنی کے درمیان پرواز کا بہت طویل تجربہ تھا، ایسی فاش غلطی کیسے کرسکتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اتنے ایندھن کے ساتھ طیارہ سڈنی تک جا ہی نہیں سکتا پھر اگر وہ ساحل کی طرف چلا ہی گیا تھا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ سڈنی تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ درمیان میں متعدد مقامات ایسے آتے تھے جہاں وہ اپنا طیارہ لینڈ کرسکتا تھا اور اس طرح اپنی اور اپنے مسافروں کی جان بچا سکتا تھا۔

شام تک کسی کو طیارے کا خیال نہیں آیا اس کے بعد دلوں کے خدشات ستانے لگے۔ ہر جگہ تار کھڑکائے جانے لگے۔ ساحلی اسٹیشنوں سے رابطہ کیا گیا۔ معلوم ہوا ہر جگہ کا ہی موسم خراب تھا جب صبح تک طیارہ اور اس کے مسافر کہیں نہیں پہنچے تو یقین کرلیا گیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہے مگر ہے کہاں؟ راستے میں آنے والے تمام شہروں اور قصبوں سے رابطہ کیا گیا، مگر ہر جگہ سے طیارے کے متعلق جواب نفی میں آیا تھا۔

☆☆☆

اوریلی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ طیارے کو طوفان نے عین میکفرسن کے اوپر آلیا تھا۔ ایک سو پینسٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتے طیارے کو طوفانی تھپیڑوں نے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ طیارہ فضا میں اس طرح اڑ رہا تھا جیسے تیز ہوا ایک پتے کو اڑا لے جاتی ہے۔ طوفانی ہواؤں نے طیارے کو بے قابو کردیا اور وہ تیزی سے پہاڑیوں میں گرنے لگا۔ خوف زدہ پائلٹس طیارے کو قابو کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے برعکس مسافر سکون سے اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ غالباً انہیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اچانک طیارے نے چند قلابازیاں کھائیں اور عین جنگل کے اوپر پہنچ گیا۔

کپتان بائیڈن نے طیارے کو سنبھالنے کی اپنی سی آخری کوشش کی اور اس کا اتنا اثر ہوا کہ زمین سے ٹکرانے سے پہلے طیارہ سیدھا ہوگیا۔ اس کے پہیے اور بازو درختوں سے ٹکرائے۔ اگلے ہی لمحے طیارہ کریش ہوگیا۔ زمین سے لگتے ہی یہ دائیں جانب گھوما اور دو چھوٹے درختوں کو گراتے ہوئے ایک بڑے درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کا دایاں حصہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ دونوں ہوا باز ریکس بائیڈن اور اس کا ساتھی بیورلے شیفرڈ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے، کیونکہ طیارے کا کاک پٹ مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ اسی طرف بیٹھے دو مسافر بھی حادثے کے فوراً بعد مرچکے تھے البتہ بائیں طرف بیٹھے تین مسافر مرنے سے بچ گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا انجام زیادہ دردناک ہوگا۔ کیونکہ دنیا کو ان کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

بچ جانے والے تین مسافر بھی صدمے سے اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ درحقیقت طیارے کو اتنا شدید حادثہ پیش آیا تھا کہ ان کا بچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ سٹن سن کی

باڈی کے ٹکڑے ہوتے گئے تھے۔ ایندھن رسنے سے طیارے کے عقبی حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ اسی وقت تک طیارے کے چار مسافر اپنی زندگیوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اور باقی تین بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ آگ تیزی سے انہیں بھی چاٹ لینے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے جان پرائینو نامی ایک نوجوان کو ہوش آیا۔ پہلے تو اسے یہ سب ایک بھیانک خواب لگا تھا لیکن جلد اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ طیارے میں آگ لگ گئی تھی اور اندر دھواں بھر رہا تھا۔ اگر وہ جلد طیارے سے نہ نکلتے تو ان شعلوں کی نذر ہو جاتے۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو جھنجوڑنا اور چلّانا شروع کر دیا ''اٹھو...... طیارے میں آگ لگ گئی ہے۔ جلدی سے باہر نکلو...... ورنہ مر جاؤ گے۔''

اندر دھواں بھر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں شعلے چمک رہے تھے۔ جوزف بن سٹیڈ کو جلد ہوش آ گیا۔ لیکن ان کا تیسرا ساتھی جو بدقسمتی سے طیارے کے جلتے ہوئے حصے کے پاس تھا بری طرح جھلس گیا تھا۔ اس کا گوشت نکل آیا تھا اور وہ از خود حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔ جوزف اور جان نے مل کر کسی طرح اسے طیارے کی ٹوٹی کھڑکی سے نیچے دھکیل دیا۔ جیمز ویسٹر چھ فٹ کی بلندی سے کچی زمین پر جا گرا۔ اسے چوٹ لگی لیکن جلنے کی اذیت میں اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس کے بعد جوزف نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور جیمز کے پاس زمین پر آ گرا۔ سب سے آخر میں جان نے باہر چھلانگ لگائی۔ بظاہر اس کی حالت سب سے بہتر تھی لیکن جب وہ زمین پر گرا اور اس نے جلتے طیارے سے دور بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ چلنے سے قاصر تھا۔ دوسری طرف طیارے کی آگ بے قابو ہو رہی تھی۔

''دوستو۔'' جان نے چلّا کر کہا ''میں چل نہیں سکتا۔ مجھے یہاں سے نکالو۔''

اس پر جیمز اور جوزف جو کسی نہ کسی طرح رینگتے گھسٹتے طیارے سے دور چلے گئے تھے واپس پلٹے اور جان کو بھی کھینچ کر طیارے سے دور لے جانے لگے۔ محفوظ فاصلے پر جا کر وہ بے حال زمین پر گر کر جلتے طیارے کو دیکھنے لگے۔ طیارے کی آگ ایک طرف تو ان کے لیے خطرہ تھی کہ کہیں اس سے جنگل میں آگ نہ لگ جائے۔ فروری آسٹریلیا میں گرم اور خشک مہینوں میں شمار ہوتا ہے اور اسی دوران میں آئے دن جنگلات میں آگ لگتی رہتی ہے۔ ذرا سی تیلی بعض اوقات میلوں پر پھیلے جنگلات خاکستر کرنے کا سبب بن جاتی ہے یہ تو ایندھن سے بھرا طیارہ تھا۔ جو پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا مگر خوش قسمتی سے طیارہ اس وقت جہاں گرا تھا وہاں زیادہ تر بڑے درخت تھے جو ذرا مشکل سے ہی آگ پکڑتے ہیں۔ اگر یہاں جھاڑیاں اور گھاس زیادہ ہوتی تو اب تک جنگل میں آگ لگ چکی ہوتی۔ دوسری طرف یہی آگ ان کے لیے واحد امید تھی کہ ان شعلوں اور دھوئیں کو دیکھ کر کوئی اس طرف آ نکلے یا فضا میں اڑتا کوئی طیارہ اس آگ کو دیکھ لے مگر کئی گھنٹے تک جلنے کے بعد آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ان کی مدد آنے کی امیدیں بھی سرد پڑتی چلی گئیں۔

اس وقت جوزف ان میں کسی قدر بہتر حالت میں تھا۔ اسے زخم آئے تھے لیکن اتنے نہیں کہ وہ بے حال ہو جاتا۔ اس نے پہلے جان کو ایک درخت کے ساتھ سہارا دے کر بٹھایا اور اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ ہڈی مکمل طور پر ٹوٹ گئی تھی اور ایک جگہ کھال سے باہر آ گئی تھی۔ جوزف نے اس کا پاؤں سیدھا کر کے اس پر دو لکڑیاں رکھ کر انہیں جان کی قمیص کی دھجیوں سے کس کر باندھ دیا تاکہ ٹوٹی ہڈی حرکت کر کے اسے تکلیف نہ دے۔ اس کے بعد وہ جیمز کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بری طرح جھلس گیا تھا اور اس کے حواس بھی بجا نہیں تھے۔ اس نے اٹھ کر جنگل میں جانے کی کوشش کی مگر جوزف نے اسے پکڑ کر زمین پر لٹا دیا۔

''اگر تم نے یہاں سے جانے کی کوشش کی تو میں تمہارے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤں گا اور تمہیں ہلنے بھی نہیں دوں گا۔'' اس نے جیمز سے درشت لہجے میں کہا۔

''میں جاؤں گا۔'' جیمز نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ''میں کسی بستی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

مگر جوزف اسے زمین پر لٹانے میں کامیاب رہا۔ ''ہمارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ ہم اکٹھے اس جگہ بیٹھیں رہیں اور مدد آنے کا انتظار کریں۔ مجھے یقین ہے جلد یا بدیر مدد ضرور آئے گی۔ جب طیارہ مزمور نہیں اترے گا تو اس کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔''

''بشرطیکہ موسم بہتر ہو جائے۔'' جان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر بادل چھائے ہوئے تھے اور طوفان کے آثار باقی تھے۔

جیمز کی حالت بدستور خراب تھی اور اس نے ہذیانی انداز میں بڑبڑانا شروع کر دیا تھا ''کل میں بحری جہاز سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ آج میرے دوست سڈنی میں میرے اعزاز میں الوداعی پارٹی دے رہے ہیں۔''

تینوں کو شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن ان کے پاس پانی بالکل نہیں تھا۔ جہاز کے جلے ہوئے ڈھانچے میں ایسی کسی شے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آس پاس کوئی ندی، چشمہ یا پانی کا تالاب بھی نظر نہیں آرہا تھا حتیٰ کہ چھوٹے موٹے حصوں میں جمع ہوجانے والا پانی بھی نہیں تھا۔ لگتا تھا اس علاقے میں کئی روز سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ طوفان بھی بس پتے اور مٹی اڑارہا تھا مگر سہ پہر چار بجے بادل سرمئی ہوگئے اور پھر تیز بارش ہونے لگی۔ تینوں منہ کھولے بارش کا پانی حلق کے اندر اتارتے رہے اور یوں کم سے کم ان کی پیاس بجھ گئی تھی۔ جیمز کے زخموں کی تکلیف بھی ذرا کم ہوگئی تھی مگر بارش کے بعد موسم یک لخت سرد ہوگیا تھا۔ تینوں سوچ رہے تھے کہ اس طرح کب تک رہیں گے۔ بارش کے بعد سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ رات سر پر تھی۔ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ سخت زمین پر پڑے تھے اور اگر اس طرف کوئی خطرناک جانور آنکلتا تو وہ اپنا تحفظ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ان جنگلات میں بڑی نسل کی بلیاں اور بھیڑیے تھے جو آدمیوں پر بھی حملہ کردیتے تھے۔ جان نے پہلو بدلنے کی کوشش کی تو اس کی ٹوٹی ٹانگ سے درد کی لہر اٹھی جو اسے بے چین کرگئی۔

رات ہوئی وہ سونے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی نیند حاوی ہوجاتی اور کبھی کسی جانور کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ رات خاصی سرد تھی لیکن وہ اتنی سردی برداشت کرسکتے تھے۔ البتہ بھوک رفتہ رفتہ ناقابل برداشت ہورہی تھی۔ اتفاق سے تینوں نے آخری کھانا صبح ناشتے کی صورت میں کھایا تھا۔ جوزف نے صرف دو سلائس لیے تھے اور اسے بھوک بھی جلد لگنے لگی تھی۔ رات مارے بھوک کے اسے نیند بھی نہیں آئی تھی۔ اگلی صبح روشنی ہوتے ہی جوزف نے اعلان کیا کہ وہ کچھ کھانے کی تلاش میں جارہا ہے کیونکہ اگر اس طرح پڑے رہے تو بھوک سے مرجائیں گے۔

جوزف کھانے کی تلاش میں نزدیکی نظر آنے والی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جیمز جواب خاصی بہتر حالت میں تھا یعنی دماغی طور پر ہوش میں ہی تھا۔ اگرچہ اس کے جلے ہوئے ہاتھ اس وقت قطعی طور پر ناکارہ تھے وہ ان سے کوئی چیز نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جان سے بولا ''اب میں مزید اور انتظار نہیں کرسکتا۔ تم لوگ یہاں بیٹھ کر بے شک مدد آنے کا انتظار کرو۔ میں خود اپنا راستہ تلاش کروں گا۔''

اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ جان قطعی اس قابل نہیں تھا کہ جیمز ویسٹر کو روک سکتا۔ اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''ٹھیک ہے دوست میں تمہیں روکنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے تم جاؤ۔ میں دعا کروں گا کہ تم کامیابی سے کسی جگہ پہنچ جاؤ اور دوست اگر ایسا ہوجائے تو ہمیں بھول نہ جانا۔ ہمارے لیے بھی مدد لانا۔''

جیمز نے بے دھیانی میں سر ہلایا۔ اس نے شاید جان کی بات پوری طرح سنی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف لڑکھڑاتے قدموں سے چل دیا۔ اس کے پیروں کو بھی آگ نے متاثر کیا تھا لیکن ان کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ وہ چل بھی نہ پاتا۔ اس نے سوکھے پتوں بھرا ایک راستہ منتخب کیا تھا اور اس پر چلتا ہوا جان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی جیمز ویسٹر کو نہیں دیکھا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جوزف واپس آیا تو جان نے اسے جیمز کے بارے میں بتایا۔

''بے وقوف آدمی۔'' جوزف فکرمندی سے بولا ''اسے ان جنگلات کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ یہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی رہتی ہے۔''

''کاش کہ وہ کسی انسانی آبادی تک پہنچ سکے۔'' جان نے حسرت سے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ اس جگہ سے کبھی کوئی انسان گزرا ہی نہیں ہے۔''

جان درست کہہ رہا تھا۔ میکفرسن کے جنگل کا یہ حصہ انسانی قدموں سے کم ہی آشنا تھا۔ جوزف اس کے پاس آبیٹھا۔ دونوں ہی جیمز کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ انگلینڈ کا رہنے والا تھا اور اس اندوہناک حادثے کا شکار ہونے والے طیارے کا واحد غیر آسٹریلین فرد تھا۔ پھر جوزف نے اپنی جیبوں سے جان کو بیر نما کچھ پھل نکال کر دکھائے۔ ''کھانے کے قابل یہی کچھ ملا ہے۔ خدا جانے یہ بھی کھانے کے لائق ہے یا نہیں۔''

وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ جنگل میں پائے جانے والے اکثر پھل زہریلے یا انسانی صحت کے لیے مضر ہوتے ہیں۔ وہ ان بیر نما پھلوں کو کھاتے ہوئے خوف محسوس کررہے تھے۔ متفقہ طور پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت تک یہ پھل نہیں کھائیں گے جب تک بھوک سے بالکل ہی نڈھال نہ ہوجائیں۔ جیسے جیسے دن چڑھ رہا تھا گرمی کی شدت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور اسی تناسب سے ان کی پیاس بھی بڑھتی جارہی تھی۔ جوزف نے سب سے پہلے کسی ایسی چیز کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو پانی لانے کے کام آسکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جہاز کے ملبے کو کھنگالا۔ جہاز میں تو نہیں البتہ کریش لینڈنگ کے دوران جہاز کے ٹوٹ جانے والے ایک حصے سے جوزف کو ایک ربر کی بوتل مل گئی۔ اس میں معمولی سا

سوراخ تھا جسے اس نے کسی نہ کسی طرح بند کردیا۔ اگلے روز دوپہر تک ایک دن پہلے ہونے والی بارش کا پانی گڑھوں میں جمع تھا۔ انہوں نے اسے پی کر اپنی پیاس بجھائی لیکن شام تک آگ برساتا سورج پانی کے ان قلیل ذرائع کو چاٹ گیا تھا۔ ان دونوں کے دل اس خیال سے لرز رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ پھلوں کی تلاش میں جوزف جہاں تک جنگل میں گیا تھا۔ اسے پانی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ملا تھا۔

''ہم جلد ہی پیاس سے مرجائیں گے۔'' جان نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''فکرمت کرو کل صبح میں سب سے پہلے پانی تلاش کروں گا۔''

جان ذرا دیر کے لیے خاموش رہا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''دوست تم چلے کیوں نہیں جاتے ہو؟ تم ابھی چل سکتے ہو تمہارے اندر ہمت ہے تم ضرور کسی آبادی تک پہنچ جاؤ گے۔''

جوزف نے چاروں طرف دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں دوست میں تمہیں اس خوف ناک جنگل میں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ مدد آئے گی تو ہم دونوں کے لیے آئے گی اور موت بھی آئی تو ہم دونوں کو آئے گی۔''

جان کا خیال تھا کہ اس کا ساتھی اس کی طرح نوجوان اور جذباتی ہے۔ اس وجہ سے حقائق کو نظرانداز کر رہا ہے۔ اسے اس جگہ کسی قسم کی مدد آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس نے سوچا کہ وہ اسے رفتہ رفتہ قائل کرلے گا کہ وہ اس کی فکر نہ کرے اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ بھوک سے اتنے بے تاب ہوگئے تھے کہ انہوں نے پھلوں میں ممکنہ زہر کی پروا کیے بغیر انہیں کھالیا۔ خوش قسمتی سے ان کے کوئی مضر اثرات ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ جوزف نے اٹھتے ہوئے کہا ''اچھا دوست میں پانی کی تلاش میں جاتا ہوں۔''

بیر نما پھل کی نمی سے ان کی تشنگی کچھ کم ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ جوزف نے پہلے جنگل کے اوپری حصے کا رخ کیا جہاں جھاڑیوں سے اسے بیر نما پھل ملے تھے۔ اس نے پہلے اپنی جیبوں میں یہ پھل بھرے اور کچھ کھائے۔ اس کے بعد وہاں پانی تلاش کرنے کی سعی کی۔ اس کا خیال تھا کہ جھاڑیوں کے درمیان کسی گڑھے میں اسے پینے کے لائق پانی مل جائے گا جس سے وہ آج کے روز اپنی اور جان کی پیاس بجھا سکے گا مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگل کے اس حصے میں اسے پانی تو ایک طرف زمین پر کہیں نمی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا زمین چالیس گھنٹے پہلے ہونے والی بارش کا ایک قطرہ پی گئی تھی۔

شاید مجھے جنگل کے نچلے حصے کا رخ کرنا چاہیے۔ جوزف نے سوچا اور پھر نیچے جانے کے خیال سے اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ نشیب خاصا ڈھلواں تھا اور اس پر چڑھنا اترنا دونوں ہی آسان کام نہیں تھے۔ مگر پانی تو تلاش کرنا ہی تھا اس کے بغیر وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ بادل ناخواستہ اس نے نشیب کا رخ کیا۔ جانے سے پہلے اس نے حاصل کیے ہوئے پھل جان کے حوالے کردیے۔ ''انہیں احتیاط سے استعمال کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان جھاڑیوں میں مجھے اب یہ بھی زیادہ نظر نہیں آرہے ہیں۔''

جان نے ایک بار پھر اسے چلے جانے کے لیے کہنا چاہا لیکن پھر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ جوزف احتیاط سے ڈھلان سے اترنے لگا۔ ابھی طیارے کے کریش میں آنے والے زخم پوری طرح نہیں بھرے تھے۔ اگر وہ پھسل جاتا تو مزید زخمی ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پیر تڑوا لیتا یا کوئی جان لیوا زخم کھا کر اس جہان فانی سے کوچ کر جاتا۔ اس صورتِ میں معذور پڑا جان بالکل ہی بے یارومددگار رہ جاتا۔ اسے خود سے زیادہ جان کا خیال تھا اور وہ اسی لیے احتیاط کر رہا تھا۔

تقریباً ڈھائی سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے مسلسل ترنم دیتی آواز سنائی دی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سچ مچ پانی بہنے کی آواز سن رہا تھا یا اس کے کان دھوکا کھا رہے تھے۔ پاس ہی جنگل میں کوئی چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی۔ جوزف نے پچاس گز کا فاصلہ مزید طے کیا تو اسے جھاڑیوں کے عقب میں پتھروں پر بہتا یہ شفاف پانی کا چشمہ نظر آ گیا۔ مارے خوشی کے اس نے بے تابی سے پانی میں ہاتھ ڈالا منہ پر ملا پھر جانوروں کی طرح لیٹ کر چشمے کا پانی پینے لگا۔ چشمہ چھوٹا سا تھا اس میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی مسلسل بہنے والا چشمہ نہیں تھا بلکہ ایک پہاڑی نالہ تھا جو بارش کے دنوں میں بہتا تھا۔ اس وقت نالے میں بہنے والا پانی یقیناً دو دن پہلے ہونے والی بارش کا تھا اور اوپر جھاڑیوں سے بہتا آرہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ آنے والے پانی کی مقدار مسلسل گھٹتی جاتی اور اگر اوپر پہاڑوں پر بارش نہ ہوتی تو یہ چشمہ مکمل طور پر خشک ہوسکتا تھا۔ اس امکان نے جوزف کو لرزا دیا تھا اس علاقے میں اسے پانی کے لیے یہی ذریعہ ملا تھا۔ یہ بھی خشک ہوجاتا تو وہ پیاس سے مرجاتے.... مگر فی الوقت تو جان کو پانی پلانا زیادہ ضروری تھا۔ چشمے کے خشک ہونے کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا تھا۔ واپسی کا

سفر اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اکثر اسے چاروں ہاتھ پیروں سے چلنا پڑتا تھا اور اوپر جاتے جاتے اس کے ہاتھ پیر زخمی ہوگئے تھے۔ جان پانی دیکھ کر کھل گیا تھا اور جوزف کی ساری تھکن اور تکلیف اسے خوش ہوتا دیکھ کر دور ہوگئی تھی۔ مگر اس روز ایک اور چکر لگا کر پانی لاتے لاتے اس کی حالت تباہ ہوگئی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور گھٹنے بری طرح زخمی ہوگئے تھے۔

دراصل حادثے کے بعد حالات کی سختی اور خوراک کی کمی نے جوزف کو بھی متاثر کیا تھا۔ اگلے روز وہ بہ مشکل ایک چکر لگا سکا تھا اور اس دوران میں اتنی پیاس لگی کہ اوپر آتے آتے نصف پانی وہ خود پی گیا تھا۔ حادثے کو آج تیسرا دن تھا اور انہیں جنگل میں اپنے علاوہ کوئی تیسری انسانی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ آسمان پر انہیں تلاش کرنے والا کوئی طیارہ تک نظر نہیں آرہا تھا۔ جان نے جوزف سے کہا۔

''ایسا لگتا ہے کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ہمارا طیارہ اس جنگل میں گرا ہے۔ شاید امدادی کارروائی کسی اور علاقے میں کی جارہی ہے۔'' جوزف نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

تیسرے دن انہیں کھانے کے لیے چند ہی بیر نما پھل ملے تھے اور ان کی تعداد بھی ناکافی تھی۔ ان کے پیٹ بھوک کی وجہ سے سکڑ گئے تھے اور کمزوری کی وجہ سے دن رات میں ان کا بیشتر وقت سوتے یا اونگھتے گزرتا تھا۔ چوتھے دن گرمی بے پناہ تھی جب جوزف صبح نیچے پانی لینے گیا تو اس نے دیکھا کہ چشمہ اب ایک پتلی سی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا اور لگ رہا تھا جب وہ اگلی بار یہاں آئے گا تو اسے چشمہ خشک ملے گا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس ہولناک جنگل میں یہ پانی ان کی زندگی کی واحد امید تھا۔ اگر یہ بھی خشک ہوجاتا تو ایک دو روز سے زیادہ زندہ نہ رہ پاتے لیکن اسے خشک ہونے سے روکنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے بغور چشمے کا جائزہ لیا۔ اور ایک ذرا سی نشیبی جگہ منتخب کرکے اس نے وہاں سے پتھر نکال کر ذرا آگے ایک دیوار سی بنانی شروع کردی۔ جس جگہ سے پتھر نکال رہا تھا۔ وہاں چشمے کا پانی جمع ہونے لگا۔ مزید پتھر نکالنے اور ان سے دیوار بنانے سے وہاں ایک اچھا خاصا تالاب بن گیا تھا جس میں پانی جمع ہورہا تھا۔ اب اگر اوپر سے پانی آنا بند بھی ہوجاتا تب بھی اس تالاب میں اتنا پانی ہوتا کہ اس سے وہ ایک دو روز پانی حاصل کرسکتے تھے۔ وہ پانی لے کر اوپر آیا۔ اس روز ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ باتوں اور لطیفوں سے جان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔

پانچویں دن جوزف نے ایک بار پھر ہمت کی۔ نیچے سے جان کے لیے پانی لانے کے بعد وہ اٹھا اور کھانے کے لیے کچھ تلاش کرنے اوپر والے جنگل کی طرف نکل گیا۔ پانی کے لیے نیچے آتے جاتے اس نے اتنا تو دیکھ لیا تھا کہ وہاں کھانے کے لائق کوئی شے نہیں تھی۔ کھانے کے لیے پھل اوپری جنگل میں ہی دستیاب ہوسکتے تھے۔ جن جھاڑیوں سے اس نے بیر... نما پھل حاصل کیے تھے۔ وہ اب ان پھلوں سے مکمل طور پر خالی ہوچکی تھیں اور اسے وہاں پر ایسی اور جھاڑیاں نظر نہیں آئی تھیں۔ غالباً ان پھلوں کا موسم ختم ہورہا تھا۔ اس نے جھاڑیوں سے مایوس ہوکر ان کے نیچے تلاش کیا تو اسے مشکل سے درجن بھر اور بعض پرندوں کے ادھ کھائے سوکھے پھل مل گئے۔ اس کے کپڑے بالکل پھٹ گئے تھے۔ ان میں جیب نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ اسے واپسی کے دوران بعض جگہوں پر چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلنا پڑتا تھا۔ اس لیے پھل ہاتھ میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے پھل اپنے منہ میں بھر لیے اور واپس چل پڑا۔ دو گھنٹے تک خاک چھاننے کے بعد اسے اتنے پھل ملے تھے جو ایک بچے کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتے تھے مگر کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں یہ چند پھل بھی غنیمت تھے۔

جان اسے دیکھ کر مسکرایا ''تم نے اتنی دیر لگادی۔''

جوزف رینگتا ہوا آکر اس کے پاس ڈھیر ہوگیا۔ ''یہ جنگل بدستور دشوار ہے۔'' اس نے پھل جوزف کے سامنے ڈال دیے۔

''اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ کسی مدد کا انتظار کرنا فضول ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ تم چلے جاؤ۔ جیمز عقل مند تھا۔ شاید وہ اب تک کسی انسانی آبادی تک پہنچ گیا ہو۔''

جوزف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس صورت میں ہماری مدد کے لیے بھی کوئی نہ کوئی پارٹی ضرور اس طرف آتی اس کے بارے میں مجھے خوف ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہوگیا ہو۔ وہ ویسے بھی خاصا زخمی تھا۔''

''ہم دونوں کے مرنے سے بہتر ہے کوئی ایک اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔ تم جتنی محنت میرے لیے پانی اور پھل لانے میں کرتے ہو۔ اتنی تگ و دو اگر جنگل سے نکلنے میں کرتے تو اب تک کہیں نہ کہیں پہنچ چکے ہوتے۔''

جان درست کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر ہمت تھی۔ اسے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی تھی۔ وہ چلتا تو اسے راستے میں پانی اور کھانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا اور وہ کسی نہ کسی

آبادی تک بھی پہنچ جاتا لیکن اس صورت میں یہ خوب صورت نوجوان جس نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ موت کی آغوش میں سو جاتا۔ یہ اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ وہ اس کا محسن تھا۔ اگر وہ اپنی ٹوٹی ٹانگ کے باوجود ہمت کر کے انہیں طیارے سے نہ نکالتا تو وہ وہیں جل کر راکھ ہو جاتے۔ جان بچانے کا صلہ وہ اس صورت میں دے کہ اسے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ جائے۔ یہ اس کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس نے جان سے کہا ''دوست بار بار مجھ سے ایک ناممکن بات مت کہا کرو۔ میں کسی بھی صورت میں تمہیں یہاں بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''اس صورت میں ہم دونوں ہی مر جائیں گے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''میں تمہارے ساتھ جان دینا پسند کروں گا۔ بہ نسبت یہاں سے جانے کے۔''

جان کی ٹانگ کا زخم خراب ہو رہا تھا جہاں سے ہڈی ٹوٹی وہاں سے ٹانگ سوج کر دو گنا سائز کی ہو گئی تھی اور اس کی رنگت بھی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ زخم سے نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی اور اس سے ہلکی سی بو بھی اٹھ رہی تھی۔ زخم میں انفیکشن تو لازمی ہو گیا تھا اور جوزف کو ڈر تھا کہ مدد آنے کے باوجود جان کی ٹانگ نہیں بچائی جا سکے گی اور یہ نوجوان ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے گا۔

''تم جذباتی ہو رہے ہو دوست۔'' جان نے آہستہ سے کہا۔

''تم بھی فضول باتیں کرنے کے بجائے اپنے دانے پر توجہ دو۔'' جوزف نے ایک پھل اس کے منہ میں ڈالا۔

چھٹے دن خاصی جدوجہد کے بعد بھی جوزف کو کھانے کے لائق کوئی شے نہیں ملی۔ سوائے ایک جگہ اوپر سے گرے کسی پرندے کے انڈے کے۔ انڈہ ٹوٹ گیا تھا اور اس کی سفیدی بہہ گئی تھی البتہ زردی چھلکے میں تھی۔ جوزف نے اسے ہی چاٹ لیا۔ اس روز بھی پانی لانے میں وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کسی پتھر سے لگا تھا اور وہ کلائی کے پاس سے سوج گیا تھا۔ یہی حال دونوں گھٹنوں کا تھا۔ چلنے کے دوران جب بھی اس کے گھٹنے کسی پتھر سے ٹکراتے۔ اس کی کراہ نکل جاتی تھی۔ ایک بار پانی لاتے ہوئے وہ دس بارہ گز کی ڈھلان سے لڑھکتا ہوا ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ایک گھنٹے تک تو وہ اٹھنے کی ہمت ہی نہ کر سکا تھا۔ اس کے بعد وہ بہ مشکل چاروں ہاتھ پیروں سے اوپر تک پہنچا تھا۔ اس دوران میں نصف سے زیادہ پانی ضائع ہو گیا تھا۔

جان اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' جوزف زبردستی مسکرایا۔ ''ایک جگہ سے لڑھک گیا تھا۔ کمر میں چوٹ آئی ہے۔''

اپنی سوجی ٹانگ کے باوجود جان اٹھ بیٹھا اور اس نے جوزف کی کمر کی مالش کی جو نیلگوں ہو رہی تھی۔ پھر اس نے اصرار کر کے جوزف کو پتوں کے بستر پر لٹا دیا جو جوزف نے پتے جمع کر کے اس کے لیے بنایا تھا۔ یہاں زمین سخت تھی اور اس پر لیٹنا بے حد تکلیف دہ ہوتا تھا۔ شام تک جوزف اپنی حالت بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ جتنا پانی لایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ دونوں بے حد پیاسے تھے۔ گزشتہ چھتیس گھنٹے سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا مگر پیاس کا احساس بھوک پر حاوی تھا۔ شام کو جوزف نے پانی لانے کے لیے جانا چاہا لیکن جان نے اسے روک دیا۔

''نہیں دوست تمہاری حالت ابھی اچھی نہیں ہے اور کچھ ہی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ تاریکی میں یہ راستے خطرناک ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہم یہ رات پانی کے بغیر گزار سکتے ہیں۔''

جوزف نے بہت اصرار کیا لیکن جان نے اسے جانے نہیں دیا۔ رات کسی پہر ہلکی سی بارش ہوئی اس سے ان کی پیاس کیا بجھتی ہاں سردی میں یک لخت اضافہ ہو گیا تھا۔ جوزف کے پیر کے زخم میں اتنی تکلیف تھی کہ اسے اب نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ رات بھر وہ کراہتا رہا تھا۔ اگر نیند بھی آتی تو تکلیف کی لہر اسے فوراً جگا دیا کرتی تھی۔ صبح روشنی کی پہلی کرن پھوٹتے ہی جوزف پانی لینے کے لیے نیچے روانہ ہو گیا۔ اس بار وہ کولھوں کے بل پنجوں اور ہتھیلیوں کی مدد سے نیچے اترا تھا اس طرح اس کے سوجے ہوئے گھٹنے محفوظ رہے تھے۔ چشمے پر پہنچ کر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب اس میں پانی روانی سے بہہ رہا تھا۔ شاید گزشتہ رات پہاڑوں پر جو بارش ہوئی تھی اس کا پانی نالے میں آ گیا تھا۔

اس نے جی بھر کر پانی پیا پھر اپنے گرد آلود ہاتھ پیر دھوئے۔ سر سے مٹی صاف کی۔ اسے بے حد سکون ملا۔ اس کے بعد اس نے بوتل میں پانی بھرا۔ ابھی وہ واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پانی کے ساتھ بہہ کر آنے والے ہلکے سبز رنگ کے امرود نما پھل دیکھے۔ اس نے پانی سے ایک پھل نکال کر چکھا اس کا ذائقہ ہلکا سا ترش تھا لیکن کھانے کے لائق تھا۔ اس نے جلدی سے مزید پھل اٹھانا شروع کر دیے۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ پھل حاصل نہیں کر سکا تھا۔ شاید زیادہ تر

پھل پہلے ہی بہہ کر جا چکے تھے۔ اس کے ہاتھ بہ مشکل چھ ساتھ پھل لگے تھے۔

پھل اور پانی لے کر اس نے واپسی کا سفر شروع کیا لیکن اس بار اسے اپنے پیروں کا استعمال کرنا ہی پڑا تھا۔ اس حالت میں بیک وقت پانی کی بوتل اور پھل سنبھالنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا بے شک کتنی دیر لگ جائے وہ ایک پھل اور پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں جانے دے گا۔ تین سو گز کا فاصلہ اس نے پورے دو گھنٹے میں طے کیا تھا۔ اس طرح وہ جان کے لیے پھل اور پانی لے جانے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے پانی پیا پھر انہوں نے ایک ایک پھل کھایا۔ کئی دن بعد ان کے کمزور معدوں میں کچھ پہنچا تھا۔ وہ زیادہ کھا کر پیٹ کی خرابی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اور وہ ان پھلوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے۔ اگر یہ زہریلے ہوتے تو وہ اس کمزوری کی حالت میں انہیں برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر جب چند گھنٹے تک کچھ نہیں ہوا تو وہ باقی پھل کھا گئے۔ شام کو جوزف اندھیرا ہونے سے پہلے ایک بار پھر پانی لے آیا۔ اس دوران میں اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ واپسی پر اس نے جان سے کہا ''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں نیچے چشمے تک لے جاؤں۔ اس طرح میں بار بار آنے جانے سے بچ جاؤں گا اور ہم کم سے کم پیاسے نہیں رہیں گے۔''

جان پھیکے سے انداز میں مسکرایا ''یہ ممکن نہیں ہے دوست۔ اس سوجی اور ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ نیچے جانا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے نیچے ہم بالکل ہی چھپ جائیں گے اس بلندی پر کوئی تلاش کرنے والا آیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ نیچے ایسا ممکن نہیں ہوگا۔''

جوزف نے سوچا۔ جان درست کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی جوزف کے بھاری جسم کو نیچے نہیں لے جا سکتا تھا اس ڈھلان پر بعض مقامات ایسے آتے تھے کہ صحیح سلامت انسان بھی اترتے ہوئے گھبراتا تھا۔ جوزف کے لیے تو قطعی ناممکن تھا۔ اس کی ٹانگ میں معمولی سی حرکت بھی ہوتی تھی تو وہ درد سے بے حال ہو جاتا تھا۔ تو کیا وہ اسی طرح بے بسی کی موت مر جاتے۔ جوزف نے سوچا آج ساتواں دن ہو گیا تھا۔ مسلسل فاقوں سے ان کے جسموں کی توانائی نچڑ گئی تھی۔ اب بات بھی کرتے تو ہانپنے لگتے تھے۔ انہوں نے موت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا جواب سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دن وہ اسی طرح رہتے تو مر ہی جاتے۔

آٹھویں دن جوزف کو نیچے چشمے سے جا کر پانی لانے میں پورے سات گھنٹے لگے۔ یہ تین سو گز کا فاصلہ اس نے نہ جانے کس طرح رینگ رینگ کر طے کیا تھا۔ اس روز تو وہ بھی زندگی سے مایوس ہو گیا اس نے جان سے کہا ''میں تازہ پتے جمع کرتا ہوں تاکہ ہم ان کا بستر بنا کر لیٹ جائیں اور موت کا انتظار کریں۔''

یہ سن کر جان رو دیا تھا اس لیے نہیں کہ اسے موت کا خوف تھا بلکہ اس لیے کہ اس کا یہ ساتھی کل تک اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ہنستا تھا اور اس سے مذاق کرتا تھا۔ وہ اسے پھل کھلاتے ہوئے کہتا تھا ''لو بیٹے، تمہاری ماں تمہارے لیے چونگا (جیسے پرندے اپنے بچوں کے لیے خوراک منہ میں جمع کر کے لاتے ہیں) لائی ہے۔'' پھر دونوں دل کھول کر ہنسا کرتے تھے اور آج وہ کتنے دل شکستہ انداز میں موت کے استقبال کی بات کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جوزف کو پتے جمع کرتا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ واقعی انجام قریب ہے۔

☆☆☆

عین اسی لمحے تین میل کے فاصلے پر برنارڈ اوریلی اپنی مہم پر روانگی کی تیاری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے سارے امکانات کا جائزہ لیا تھا۔ اس نے بعض لوگوں سے سنا تھا کہ انہوں نے حادثے کے وقت ایک طیارے کو میکفرسن کے پہاڑی سلسلے سے گزر کر مزمور کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان افواہوں کی بنیاد پر اس نے علاقے کے نقشے کو کھنگالا اور اندازہ لگایا کہ طوفان نے طیارے کو میکفرسن سے آگے جانے کا موقع نہیں دیا ہوگا اور وہ اس پہاڑی سلسلے میں کہیں گر کر تباہ ہو گیا ہوگا۔ برسبن سے مزمور تک ایک سیدھی لکیر نقشے پر کھینچنے کے بعد اسے طیارے کے ممکنہ جائے حادثہ کے بارے میں بھی کسی حد تک آگاہی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

''اس لکیر پر چار چوٹیاں آس پاس واقع ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ طوفان سب سے زیادہ شدید اس علاقے میں تھا۔ طیارہ ان چار میں سے کسی ایک پہاڑی پر گرا ہوگا۔ میں وہاں تک طیارے کے ملبے کو تلاش کرنے جاؤں گا۔''

''میرے خیال میں یہ کام آسان نہیں ہے۔'' اوریلی کی بیوی نے کہا ''تمہیں پوری تیاری کے ساتھ جانا ہوگا۔''

اوریلی نے سر ہلایا ''ہاں اس علاقے میں کوئی چیز تلاش کرنا دشوار کام ہے۔ ممکن ہے مجھے کئی دن لگ جائیں تم اور بچے گھبرانا مت۔''

اوریلی نے اردگرد کے رہنے والوں کو اپنی اس مہم کے بارے میں بتایا تھا لیکن ان میں سے کوئی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوا تھا اس لیے 27 فروری کو اوریلی خود ہی اپنی اس

ایک نفری مہم پر روانہ ہوگیا۔ روانگی سے پہلے اس نے ضرورت کا سارا سامان رکھ لیا تھا۔ اس میں دو بڑی ڈبل روٹیاں، جام اور پنیر، کچھ خشک دودھ، کافی، پانی کا ایک مشکیزہ، رسہ، کیلیں، ہتھوڑی، ایک کلہاڑی، سانپ کے کاٹے کی دوا اور رائفل اس کے پاس تھی۔ راستے میں بڑے جانور بھی مل سکتے تھے۔ رات سکون سے گزارنے کے لیے اس کے پاس کمبل تھا اور پیروں میں کیلوں والے لانگ شوز تھے جو پہاڑی مقامات پر سفر کرنے کے لیے ضروری تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر سب سے پہلے ماؤنٹ بیتھون گیبل کی طرف روانہ ہوا۔ ان چار چوٹیوں میں یہی پہاڑی سب سے پہلے آتی تھی۔ پہاڑی چار ہزار فٹ سے زیادہ بلند تھی اور یہ بے حد گھنے اور دشوار گزار جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

گھوڑے کی وجہ سے اوریلی نے یہ سفر تیزی سے کیا تھا۔ راستہ بے حد خراب تھا۔ کیونکہ میکفرسن کے اس حصے کی طرف چرواہے بھی نہیں جاتے تھے۔ کیونکہ یہ علاقے حد سے زیادہ دشوار گزار تھے اور ان کے مویشی اکثر چٹانوں سے گر جاتے تھے یا کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنس جاتے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کی آمدورفت نہ ہونے کے سبب اس علاقے میں راستے بھی نہیں تھے۔ اوریلی بہ مشکل راستہ تلاش کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ سامنے سے آنے والے طوفان نے طیارے کو کسی چوٹی کی ڈھلان پر دے مارا تھا اور اس صورت میں طیارے کا ملبہ شمال مشرقی ڈھلانوں پر ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس کا رخ ڈھلانوں کی طرف ہی تھا۔

آٹھ گھنٹے کے لگاتار سفر کے بعد وہ سہ پہر کے قریب پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہاں سے آگے ڈھلانوں پر بے حد گھنا جنگل تھا۔ جس میں گھوڑے سمیت سفر بے حد مشکل تھا اس لیے اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور سامان شانے پر لاد کر پیدل ہی آگے چل پڑا۔ اس حصے میں بے حد بلند اور گھنے درخت تھے جو آسمان سے باتیں کرتے محسوس ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر اوپر چھائی سبز بیلوں نے پوری کردی تھی۔ نیچے تاریکی مسلط تھی اور کہیں کہیں سورج کی روشنی اس تاریکی سے لڑ رہی تھی۔ ٹیلوں سے لگاتار پانی کے قطرے گر رہے تھے اور زمین سیلی ہو رہی تھی۔ زمین پر جا بہ جا زہریلے کانٹوں والی جھاڑیاں بکھری تھیں جن کے کانٹے اگر انسانی جسم میں چبھ جاتے تو تڑپانے والا درد پیدا کرتے تھے۔ ان سے بچ کر چلنا بے حد ضروری تھا۔

رات تک وہ پہلی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اس نے رات یہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور بارش شروع ہوگئی۔ کوئی جائے پناہ بھی نہیں تھی۔ وہ ایک درخت تلے پانی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ خدا خدا کرکے بارش تھمی تو سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ اس کا کمبل بھیگ گیا تھا اس نے آگ جلانے کی کوشش کی لیکن لکڑیاں گیلی ہونے کی وجہ سے آگ جل ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے سردی سے ٹھٹھرتے اور اونگھتے ہوئے یہ اذیت ناک رات بسر کرہی لی صبح ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ڈبل روٹی اور مکھن سے ناشتا کیا پھر مشرقی ڈھلان پر اترنے لگا۔ ابھی تک اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب وہ دوسری چوٹی پر جا پہنچا۔ تیسری چوٹی یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھی۔ اس جگہ جنگل اتنا گھنا نہیں تھا لیکن زمین ناہموار تھی۔ اسے دور ڈھلان پر ایک سیاہ دھبا نظر آیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس علاقے میں سیاہ رنگ کی کوئی چیز نہیں تھی۔ زمین سرخی مائل تھی اور چٹانوں کا رنگ خاکی تھا۔ تو کیا یہ سیاہ دھبہ کسی شے کے جلنے سے پیدا ہوا تھا۔ کیا اس نے جہاز کا ملبہ تلاش کرلیا تھا لیکن ابھی یہ بہت دور تھا۔ اس نے چوٹی سے اتر کر اس سمت میں بڑھنا شروع کردیا۔ جیسے ہی وہ نیچے پہنچا دھبا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن وہ اس کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس لیے جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے اس طرف بڑھتا رہا۔ اس جگہ جھاڑیاں بے پناہ گھنی اور سخت تھیں۔ ان میں راستہ بنانا آسان نہیں تھا۔ وہ تین میل تک ان جھاڑیوں میں چلتا رہا حتیٰ کہ اسے لگا وہ اپنی منزل کے پاس آگیا ہے۔ اس نے اب تک چھ میل کا فاصلہ طے کرلیا تھا اور یہاں جہاز کا ملبہ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اس امید پر کہ طیارے کا کوئی مسافر بچ گیا ہو۔ وہ آوازیں دینے لگا۔

''کوئی ہے...... کسی کو مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی ہے۔''

☆☆☆

جوزف غنودگی محسوس کررہا تھا۔ دو روز قبل انہوں نے آخری بار پانی پیا تھا اور پھل کھائے ہوئے انہیں تین روز ہوچکے تھے۔ وہ اتنی کمزوری محسوس کررہے تھے کہ ان سے بات بھی نہیں کی جارہی تھی۔ جان کل سے تیز بخار کی کیفیت میں تھا اور اس کا پاؤں بالکل سیاہ ہو رہا تھا۔ جوزف کی نظر جب بھی اس کے پاؤں پر پڑتی اس کے اندر خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا اگر کسی معجزے کے تحت ان کی جان بچ بھی گئی تو جان کی یہ ٹانگ شاید کاٹنی ہی پڑے۔ غنودگی میں اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی آواز دے رہا ہو۔ وہ چونکا۔ اس

نے آنکھیں کھول کر دیکھا اس کا خیال تھا کہ جان نے کچھ کہا ہے۔ مگر وہ تو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی اور آنکھیں جیسے کچھ سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔ شاید اس کے کانوں کو دھوکا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرنا چاہیں تو اسے آواز دوبارہ آئی۔ آواز دور سے ہوا کے دوش پر لہراتی آئی تھی لیکن آواز کسی انسان کی تھی۔ وہ مارے جوش کے اٹھ بیٹھا اس نے نیم بے ہوش جان کو جھنجوڑ دیا۔

''اٹھو میں نے ابھی ایک آواز سنی ہے۔ اس جنگل میں کوئی اور بھی ہے۔''

جان نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا ''وہم ہوگا تمہارا......''

''نہیں یقین کرو میں نے دوبار سنی ہے اور ایک بار تو بالکل واضح سنی ہے۔ اگر تم بھی کان لگا کر سنو تو سنائی دے گی۔''

جوزف کے کہنے پر جان نے خاموشی سے آواز سننے کی کوشش شروع کردی اور انہیں زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہوا کے دوش پر لہراتی وہ آواز واضح طور پر ان کے کانوں تک آئی تھی۔ جان بھی مارے جوش کے اچھل پڑا تھا۔

''یہ تو کوئی آدمی ہے اور شاید ہمیں ہی تلاش کرنے آیا ہے۔''

''ہمیں چلا کر اسے جواب دینا چاہیے۔'' جوزف بولا اور پھر دونوں اپنی کمزور آواز میں جواباً چلا چلا کر پکارنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگے پھر آوازیں قریب آنے لگیں۔ نیچے ڈھلان کی طرف ایک شخص جھاڑی ہٹاتا نمودار ہوا اور ان کے پاس آ کر انہیں گھورنے لگا۔ تینوں کے لیے یہ ایک حیرت ناک موقع تھا۔ جیسے ان دونوں کو اس بھیانک اور ویران جنگل میں کسی کی آمد کی توقع نہیں تھی تو آنے والے کو بھی اتنی امید نہیں تھی کہ اسے تباہ شدہ جہاز کے دو مسافر زندہ مل جائیں گے۔

برنارڈ اوریلی نے حیرت سے ان دونوں افراد کو دیکھا سب سے پہلے اس کی نظر جان پر پڑی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا اور اس کی کھال جیسے ہڈیوں پر منڈھی تھی۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ سب سے خوف ناک شے اس کی دائیں ٹانگ تھیں جو سوج کر معمول کی جسامت سے دوگنی سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اس کی رنگت سیاہ ہو رہی تھی اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دوسرا شخص اس سے ذرا فاصلے پر تھا لیکن اس کی حالت بھی پہلے والے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور پورا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ جھاڑیوں میں گھستا رہا ہو جسمانی حالت اس کی بھی ناگفتہ بہ تھی۔ تینوں ایک دوسرے کو حیرت ناک نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے جوزف کو ہوش آیا۔ اس نے کہا

''دوست کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں مگر میرے پاس ابھی کافی ہے۔'' اوریلی ان کے پاس بیٹھ کر اپنا سامان کھول رہا تھا۔

''دوست کرکٹ میچ کا کیا ہوا؟'' اس بار جان نے پوچھا۔ ان دنوں اسٹریلیا کی ٹیم ڈان بریڈمین کی قیادت میں انگلینڈ سے نبرد آزما تھی اور یلی نے کھانے پینے کا سامان نکالتے ہوئے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ ہم نے انگلینڈ کو شکستِ فاش دے دی۔''

ان سے باتیں کرتے ہوئے اوریلی انہیں یہاں سے لے جانے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ کام وہ اکیلے نہیں کرسکتا تھا۔ اسے واپس جانا تھا اور اپنے ساتھ پوری امدادی پارٹی لے کر آنی تھی۔ اس نے سب سے پہلے انہیں پانی دیا پھر ڈبل روٹی اور پنیر دینے لگا۔ اس نے خیال رکھا کہ وہ اتنا نہ کھائیں کہ ان کا معدہ جو خوراک سے خالی ہو رہا تھا

خراب ہو جائے۔ کھانے کے بعد اس نے ان کے لیے کافی بنائی۔ وہ اپنا مشکیزہ لے کر نیچے چشمے تک گیا اور اسے بھر کر لا کے ان کے پاس رکھ دیا۔ کھانا ابھی اتنا اور تھا کہ جوزف اور جان ایک وقت اور کھا سکتے تھے۔

''دوستو مجھے مدد لینے کے لیے واپس جانا ہوگا۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ کچھ دیر بعد تم انسانوں کے درمیان ہو گے۔''

اورلی نے اپنا کمبل جان کو اوڑھا دیا اور خود مدد لینے نزدیک ترین بستی کی طرف روانہ ہو گیا جو یہاں سے کوئی دس میل کے فاصلے پر مشرق میں تھی۔ اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو جیمز نے اختیار کیا تھا۔ اسے ایک میل بعد جا کر ہی اس کی لاش ایک درخت کے تنے سے ٹکی ہوئی مل گئی تھی۔ اورلی نے افسوس سے اس کے لیے دعا کی اور آگے روانہ ہو گیا۔ جوزف نے اسے کریش اور کریش کے بعد کی ساری کہانی سے آگاہ کیا تھا۔

اورلی نے حیران کن رفتار سے بے حد دشوار گزار یہ راستہ محض تین گھنٹے میں طے کیا اور اپنے ایک دوست کے فارم پر جا پہنچا۔ اس نے وہاں پر حالات بتا کر ایک امدادی پارٹی تیار کرنے کو کہا۔ گمشدہ طیارے اور اس کے مسافروں کے بارے میں سنتے ہی مقامی آبادی میں ہیجان پھیل گیا تھا اور رلی ایک معتبر اور معزز شخص تھا ورنہ لوگ سمجھتے وہ مذاق کر رہا ہے۔ بے حد تیزی سے پچاس سے زیادہ افراد نے ایک امدادی پارٹی تشکیل دی۔ یہ قصبہ ہیمگٹن کہلاتا تھا اور یہاں پر تار کی سہولت تھی۔ اس لیے فوراً ہی یہ خبر سارے ملک میں پھیل گئی تھی۔

دو پارٹیاں بنائی گئیں۔ اولین پارٹی خوراک اور ادویات لے کر پہلے روانہ ہوئی اس میں ایک ڈاکٹر سرجن بھی تھا کیونکہ اورلی نے جان کے بارے میں بتایا کہ اس کی ٹانگ کا زخم خطرناک حد تک خراب ہو گیا تھا اور اسے کسی ڈاکٹر کی اشد ضرورت تھی۔ یہ پارٹی آٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ اسے جان اور جوزف تک پہنچنے میں آٹھ گھنٹے لگے تھے اس سے اورلی کی حیرت انگیز رفتار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس نے اکیلے ہونے کے باوجود یہ فاصلہ محض تین گھنٹے میں طے کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ دونوں ابھی تک زندہ سلامت تھے۔

پہلی پارٹی نے جاتے ہی جان اور جوزف کی جسمانی حالت بہتر بنانے کے لیے انہیں شکر، دودھ اور انڈے کا محلول وقفے وقفے سے دینا شروع کر دیا۔ درمیان میں ان کے جسموں کی حرارت بحال کرنے کے لیے انہیں برانڈی بھی دی گئی تھی۔ ٹیم کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے جان کے پاؤں کا معائنہ کیا اور اس کی حالت کے پیش نظر فوری آپریشن کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دوسروں سے کہا ''اگر اس کی ٹانگ کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو اسے کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا اس لیے میں اسی جگہ آپریشن کروں گا۔''

پارٹی میں ایک شخص طبی امداد دینے کی تربیت حاصل کر چکا تھا اس نے ڈاکٹر کی مدد کی۔ اس نے آپریشن کر کے جان کی ٹوٹی ہڈی بٹھائی اور اس کے پاؤں کی سوجن کم کرنے کے لیے چیرے لگائے۔ خطرہ تھا کہ یہ سوجن شریانوں کو دبا کر نچلی ٹانگ میں خون کی فراہمی روک دے گی اور وہ مردہ ہو جائے گی۔ اس آپریشن نے جان کی ٹانگ بچالی تھی۔

پہلی پارٹی کے عقب میں روانہ ہونے والی دوسری پارٹی زیادہ بڑی تھی اس کا کام راستے کو اسٹریچر گزارنے کے قابل بنانا تھا۔ انہوں نے جھاڑیاں گرائیں اور راستے میں آنے والے گڑھوں کو پاٹ دیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک عدد اسٹریچر بھی لائے تھے۔ انہوں نے جان کو اس پر منتقل کیا اور جیسے ہی سورج کی روشنی نمودار ہوئی انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ کیونکہ اسٹریچر اٹھانے والوں کی کمی نہیں تھی اس لیے وہ تیز رفتاری سے سفر طے کر کے جلد اپنی منزل پر جا پہنچے اور جان اور جوزف کو اسپتال میں داخل کر دیا۔ یہ حادثے کا دسواں دن تھا اور اس عرصے میں ان کا وزن گھٹ کر نصف رہ گیا تھا۔ متواتر ایک ہفتے کے علاج سے وہ صحت یاب ہو گئے۔ جان کے پاؤں کا دوبارہ آپریشن ہوا اور اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ بٹھا کر اس کے پاؤں پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا۔

مقامی لوگوں نے جیمز ویسٹر کی لاش اور طیارے میں ہلاک ہونے والے باقی افراد کی باقیات اسی مقام پر دفنا دی تھیں۔ ان کی قبروں پر بعد میں ایک طیارے سے پھول برسائے گئے تھے۔ اورلی کو اس کارنامے پر پورے ملک میں ہیرو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسے ملک کے کونے کونے سے مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے۔ لوگوں نے ایک فنڈ کے تحت دو ہزار پاؤنڈ اکٹھا کر کے اسے بطور انعام دیے۔

آسٹریلیا کی ہوابازی کی تاریخ میں یہ پہلا بڑا حادثہ تھا اور اس نے شہری ہوابازی کے بارے میں حکومت کا رویہ بدل دیا تھا۔ حکومت نے فوری طور پر تمام ہوائی اڈوں اور طیاروں میں ریڈیو لگانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی موسمیات سے متعلق آلات کی تنصیب بھی کی گئی تاکہ آئندہ اس قسم کے حادثوں میں فوری امدادی کارروائی ممکن ہو سکے۔

پُراستقامت

ہر کام میں یکسوئی اور استقامت ضروری ہے اور اس کے لئے جذبے اور لگن کی بے انتہا ضرورت ہوتی ہے۔ کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جسے لوگ "کرکٹ بائی چانس" بھی کہتے ہیں۔ کسی حد تک یہ درست بھی ہے لیکن "چانس" تو ہر طرح کا ہوسکتا ہے۔ آپ اسی ایک چانس یا موقعے سے فائدہ اٹھالیں تو ایک نئی تاریخ لکھ سکتے ہیں ورنہ گنوائے گئے مواقع آپ کو گمنامی کے اندھیروں میں بھی پہنچا سکتے ہیں۔ کرکٹ کی تاریخ میں جتنے بھی اہم واقعات رونما ہوئے یا ریکارڈ بنے ان میں لٹل ماسٹر حنیف محمد کا ویسٹ انڈیز کے خلاف طویل ترین اننگ کا ریکارڈ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

کسی مضبوط ٹیم کے خلاف اسی کے ملک میں یہ کارنامہ معمولی بات نہیں

کاشف زبیر

آج کے دور میں کرکٹ میڈیا کا کھیل بن گیا ہے۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کرکٹ جاری رہتی ہے اور سال کے محدودے چند دن ہوتے ہیں جب دنیا میں کہیں کوئی ٹیسٹ یا ون ڈے میچ نہیں کھیلا جارہا ہوتا۔ اس کھیل میں کئی ایسی انفرادی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی دوسرے کھیل کو نصیب نہیں ہیں۔ اول اس کا طویل دورانیہ۔ دنیا میں اگرچہ گھنٹوں جاری رہنے والے کئی کھیل ہیں جیسے گالف یا شطرنج، لیکن ان کے شائقین کا حلقہ محدود ہے۔ بعض کھیل کئی دنوں بھی جاری رہتے ہیں جیسے طویل فاصلے کی ریس۔ سائیکلنگ اور کار ریس وغیرہ مگر انہیں مسلسل میڈیا پر نشر کرنا دشوار ہوتا ہے۔ پھر ان میں ہر ایک کو دلچسپی بھی نہیں ہوتی اور یہ کھیل گلیمر سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ طویل دورانیے کے کھیلوں میں کرکٹ وہ واحد کھیل ہے جو دلچسپ بھی ہے اور اسے عوام الناس کی توجہ بھی حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں گلیمر ہے جیسے جنوبی امریکا میں فٹ بال اور شمالی امریکا میں بیس بال کو لوگوں کی جنون کی حد تک دلچسپی حاصل ہے، یہی دلچسپی کرکٹ کو برصغیر کے خطے میں حاصل ہے جہاں دنیا کی بائیس فیصد آبادی رہتی ہے۔ دنیا کے پانچ براعظموں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔

طویل دورانیے اور عوامی دلچسپی نے دنیا کی تقریباً تمام ہی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو مجبور کردیا ہے کہ وہ اپنے اشتہاری بجٹ کا

ایک بڑا حصہ ان اسپورٹس چینلز کے لیے مختص کر دیں جو کرکٹ میچوں کو باقاعدگی سے نشر کرتے ہیں۔ میڈیا نے کھیل کے میدان کو اٹھا کر آپ کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا ہے۔ کھلاڑیوں کی ایک ایک حرکت، ہر گیند کی متعدد زاویوں سے لی گئی مووی، آوازیں، تاثرات اور میدان میں ہونے والی ہر حرکت آپ اپنے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ناظرین سو فیصد درستگی سے جان لیتے ہیں کہ امپائر نے جو فیصلہ دیا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ نہ صرف ناظرین بلکہ ٹی وی امپائر کے لیے بھی جدید ٹیکنالوجی نے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کرکٹ شائقین اب اسٹیڈیم جانے کے بجائے گھر میں بیٹھ کر میچ دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ اس طرح وہ سکون سے اور زیادہ بہتر انداز میں اپنے پسندیدہ اسٹارز کو ایکشن میں دیکھ سکتے ہیں جو کہ میدان میں ممکن نہیں ہے۔ اس چیز نے کرکٹ کو میڈیا کا کھیل بنا دیا ہے۔

آج جب برائن لارا چار سو رنز کا تاریخی سنگِ میل عبور کرتا ہے تو ٹی وی کے کروڑوں ناظرین اس کا ایک ایک شاٹ پوری تفصیل سے ملاحظہ کر سکتے ہیں اور ایک ایک رن کی داد دے سکتے ہیں لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جب حنیف محمد نے چار دن تک وکٹ پر کھڑے رہ کر تین سو سینتیس رنز بنانے کا کارنامہ انجام دیا تو پاکستان کے لوگوں کو ایک دن بعد یہ خبر ملی تھی۔ ستم ظریفی دیکھیے، آج اس تاریخ ساز اور ریکارڈ ساز اننگ کی چند ایک تصاویر ہی دستیاب ہیں۔ جن چند ہزار افراد نے اس اننگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان میں سے بھی بیشتر افراد اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس لیے اس اننگ کی تفصیلات بھی ہم تک پوری نہیں پہنچی ہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ حنیف محمد نے تقریباً ایک ہزار منٹ تک کریز پر کھڑے ہو کر یہ اسکور بنایا۔ اس اننگ کے دوران میں انہیں کتنے اعصابی دباؤ سے گزرنا پڑا۔ برق رفتار ویسٹ انڈین بالرز نے انہیں آؤٹ کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے، اس اننگ کے دوران میں وہ کتنے صبر آزما مراحل سے گزرے، کتنی بار جب گیند ان کے پیڈز سے ٹکرائی یا ان کے بلّے کے پاس سے گزری اور فیلڈرز نے گلا پھاڑ کر امپائرز سے اپیل کی (جنھوں نے اس اننگ میں حنیف کے ہر ساتھی کو غلط آؤٹ دیا تھا) تو جب تک امپائر کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا اس وقت تک حنیف محمد کے دل پر کیا گزرتی رہی تھی اور جب وہ ٹرپل سنچری بنا کر بریڈ مین اور لین ہٹن کے ریکارڈز کی طرف بڑھ رہے تھے، تو ان کی کیا حالت تھی؟

1952ء میں جب پاکستان نے ٹیسٹ کھیلنے والے ملک کی حیثیت حاصل کی تو اس کے اولین ٹیسٹ اسکواڈ میں کمسن حنیف محمد بھی شامل تھے جن کی عمر محض سترہ سال تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کرکٹ کو معمر افراد کا کھیل کہا جاتا تھا۔ چالیس سال کی عمر کے کھلاڑی ہر ٹیم میں عام ملتے تھے اور فرسٹ کلاس کرکٹ میں تو بے شمار کرکٹرز ایسے تھے جو پچاس برس سے بھی اوپر کے تھے۔ رنجیت سنجھی جیسے عظیم کرکٹر نے ستر سال کی عمر تک کرکٹ کھیلی تھی۔

ایسے میں حنیف محمد اور ان جیسے دوسرے کم عمر کھلاڑیوں کے ساتھ پاکستانی ٹیم تازہ ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح وارد ہوئی تھی۔ اس میں شامل زیادہ تر کھلاڑیوں کی عمریں بیس سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ ٹیم کے سب سے معمر رکن خود کپتان عبدالحفیظ کاردار تھے۔ اس وقت کرکٹ پر آسٹریلیا اور انگلینڈ کی طاقت ور ٹیمیں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے بعد ویسٹ انڈیز اور جنوبی افریقہ کا نمبر آتا تھا جبکہ نیوزی لینڈ اور انڈیا کی ٹیمیں سب سے کمزور مانی جاتی تھیں۔ عام طور سے ان کی ہر سیریز کا انجام عبرت ناک شکست ہوتا تھا۔ پاکستان تو بے بی آف کرکٹ تھا اس لیے کرکٹ ماہرین کا خیال تھا کہ اسے اپنی پہلی فتح حاصل کرنے کے لیے ایک عشرے تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

مگر پاکستان نے اپنی پہلی ہی ٹیسٹ سیریز اور دوسرے ہی ٹیسٹ میں انڈیا کی خود سے کہیں زیادہ طاقت ور ٹیم کو اننگ سے شکست دے کر سب کو حیران کر دیا۔ اگرچہ اس فتح میں کلیدی کردار فضل محمود کی شاندار بالنگ اور نذر محمد کی ناقابلِ شکست سنچری نے ادا کیا تھا لیکن حنیف محمد نے بھی نصف سنچری بنا کر اپنے آنے والے روشن دنوں کی جھلک دکھا دی تھی۔ اس فتح نے جہاں ساری دنیائے کرکٹ کو ششدر کر دیا تھا، وہاں ماہرینِ کرکٹ کو بھی اپنے اندازوں پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انڈیا کے بعد پاکستان کی ٹیم انگلینڈ کے دورے پر گئی۔ یہ سن 1954ء کا ذکر ہے یعنی پاکستان نے اپنی دوسری سیریز اپنی پہلی سیریز کے دو سال بعد کھیلی تھی۔ اس زمانے میں کرکٹ خاصی محدود تھی اور ون ڈے کرکٹ کا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا اس لیے کھلاڑیوں کے پاس کھیلنے کے محدود مواقع ہوا کرتے تھے اور ان کی کارکردگی میں تسلسل حیران کن ہی کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جب دو تین سال بعد ایک سیریز کھیلنے کو ملے تو تسلسل کہاں قائم رہتا ہے۔ جب پاکستانی ٹیم پہلی بار انگلینڈ پہنچی تو انگلش کرکٹرز نے اسے وہ اہمیت نہیں دی جو وہ آسٹریلیا یا ویسٹ انڈیز کی ٹیموں کو دیتے تھے۔ حالانکہ

پاکستان نے اپنے دوسرے ہی ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کی تھی جس کے لیے سوائے آسٹریلیا کے ساری ہی ٹیموں کو خاصے عرصے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ نیوزی لینڈ نے اٹھائیس سال بعد اور ویسٹ انڈیز اور بھارت نے بیس سال بعد ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی اولین فتح حاصل کی تھی۔ میچوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ ریکارڈ زمبابوے کے پاس ہے اور امید ہے کہ بنگلہ دیش کی ٹیم بھی یہ ریکارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ اپنے پچیس کے لگ بھگ میچوں میں اس نے صرف دو ٹیسٹ ڈرا کرائے ہیں باقی سب میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اس لحاظ سے انگریز کرکٹرز اور انگلش ماہرین کا رویہ پاکستانی ٹیم کے ساتھ منصفانہ نہیں تھا۔ انگریز کپتان سر لین ہٹن نے پریس کے سامنے شکوہ کیا کہ اسے ایک کمزور ٹیم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پھر ماہرین بھی پاکستانی ٹیم کو معیار میں کم تر اور آسان حریف قرار دے رہے تھے۔ مگر پہلے تو پاکستانی ٹیم نے فرسٹ کلاس میچوں میں اپنی کارکردگی سے ماہرین اور تماشائیوں کو چونکانا شروع کیا۔ یکے بعد دیگرے کئی مضبوط کاؤنٹی ٹیموں کو شکست دی۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے والی علاقائی ٹیمیں کسی طرح ٹیسٹ ٹیموں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سارے ٹیسٹ کھلاڑی باقاعدگی سے اپنی ڈومیسٹک کرکٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کاؤنٹی ٹیمیں معیار کے لحاظ سے ٹیسٹ کھیلنے والی ٹیم کے برابر ہی ہوتی ہیں۔ خاص طور سے ایسکس جیسی مضبوط ٹیم کے خلاف پاکستان نے حیران کن فتح حاصل کی تھی۔ کھیل کے آخری دن چائے کے وقفے پر اپنی دوسری اننگ میں ایسکس کی محض دو وکٹیں گری تھیں اور میچ بہ ظاہر ڈرا کی طرف گامزن تھا۔ مگر فضل محمود نے صحافیوں کے سامنے اعتماد سے کہا کہ ہم اب بھی یہ میچ جیت سکتے ہیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ پرانی ہوجانے والی گیند سے فضل محمود اور خان محمد نے سوئنگ بالنگ کا جادو جگایا اور ایسکس کے بلے باز یکے بعد دیگرے ان کی سحر انگیز بالنگ کا شکار ہوتے چلے گئے اور مقررہ وقت سے پہلے ہی ساری ٹیم آؤٹ ہوگئی۔ پاکستان نے حیرت انگیز انداز میں یہ میچ جیت لیا تھا۔ اگلے دن کے اخبارات اس فتح کے تذکروں سے بھرے ہوئے تھے۔

اس کے باوجود جب پاکستانی ٹیم اوول کے میدان میں اتری تو سب کو یقین تھا کہ انگلینڈ کی مضبوط ٹیم باآسانی بے بی آف کرکٹ کو آؤٹ کلاس کردے گی۔ مگر پاکستان کے حوصلہ مند کھلاڑیوں نے ایک بار پھر انگریزوں کے اندازوں کو غلط ثابت کردیا۔ گراسی اور بالنگ کے لیے سازگار اس وکٹ پر بلے بازی دشوار ترین کام تھا لیکن حنیف محمد نے میچ کی دونوں اننگز میں نصف سنچریاں اسکور کرکے اپنے بالروں کو موقع دیا کہ وہ انگلینڈ پر جوابی حملہ کرسکیں۔ فضل محمود اور خان محمد نے یہ کام بہ خوبی انجام دیا اور دونوں اننگز میں انگلینڈ کو کم اسکور پر آؤٹ کرکے اوول ٹیسٹ تاریخی انداز میں جیت لیا۔ جہاں اس میچ میں فضل محمود کی بارہ وکٹیں فتح گر تھیں وہیں حنیف محمد نے بھی اپنا حصہ بہ خوبی ادا کیا تھا۔ اس پورے انگلش دورے میں حنیف محمد کا بلا رنز اگلتا رہا تھا۔ انہوں نے کئی سنچریاں اور کئی نصف سنچریاں اسکور کی تھیں۔ ٹیسٹ میچوں میں وہ چار نصف سنچریاں بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کے بعد پاکستان نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی ٹیموں کو اپنی سرزمین پر ٹیسٹ سیریز میں شکست دی۔ خاص طور سے آسٹریلیا کی مضبوط ترین ٹیم جو رچی بینو کی قیادت میں پاکستان آئی تھی۔ کراچی کے واحد ٹیسٹ میں اسے ایک اننگ اور چھیاسی رنز کی بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مردِ میدان ایک بار پھر فضل محمود تھے۔

کارداز وزیر محمد اور امتیاز احمد جیسے بلے بازوں کی

موجودگی میں حنیف محمد کی کارکردگی اچھی ضرور تھی مگر اتنی نمایاں نہیں تھی کہ ماہرین کو چونکا سکتی۔ اب تک وہ حنیف محمد کو ایسا نوجوان کھلاڑی سمجھتے تھے جو اسٹیمنا اور توجہ تو کمال درجے کی رکھتا ہے لیکن اس کے پاس اسٹروکس کی کمی ہے۔ وہ اب تک ٹیسٹ کرکٹ میں کوئی بڑی اننگ کھیلنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زیادہ تر میچ تیز وکٹوں پر ہوتے تھے اور پاکستان کا مقابلہ بھی عالمی معیار کی ٹیموں سے تھا جن کے پاس اعلیٰ درجے کے بالرز تھے۔ میچوں کے درمیان طویل وقفہ بھی حنیف محمد کی کارکردگی پر اثر انداز ہو رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حنیف محمد کو اب تک ان کی پسند کی جگہ یعنی اوپنر کی پوزیشن نہیں ملی تھی۔ ان عوامل نے مل کر ان کی بلے بازی کو ذرا بجھا سا دیا تھا۔

1957ء میں جب پاکستان کی ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر روانہ ہوئی تو سلیکٹرز نے پہلی بار حنیف محمد کو مستقل اوپنر کے طور پر کھلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ عارضی طور پر اوپنر کی حیثیت سے کھیلتے رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حنیف محمد کی پاکستانی ٹیم میں شمولیت ایک وکٹ کیپر کے طور پر ہوئی تھی۔ وہ ایک ماہر بلے باز کے طور پر اپنی جگہ بعد میں بنانے میں کامیاب ہوئے تھے جب امتیاز احمد ٹیم میں مستقل وکٹ کیپر کے طور پر شامل ہوئے۔ ایسے عجوبے ہماری کرکٹ میں عام ہیں۔ مثال کے طور پر عظیم بلے باز ماجد خان فاسٹ بالر کے طور پر پاکستانی ٹیم میں شامل ہوئے تھے اور بہترین بلے باز مشتاق محمد کو لیگ اسپنر کی حیثیت سے اولین ٹیسٹ کھلایا گیا تھا اور تازہ ترین مثال شاہد آفریدی کی ہے۔ ایک لیگ اسپنر کو بلے باز اور اوپنر کی حیثیت سے کھلایا جاتا ہے اور اس کا کیریئر برباد کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ راقم کی رائے میں شاہد آفریدی میں ایک اچھا اور فتح گر لیگ اسپنر بننے کی تمام خوبیاں ہیں۔ بے حد تیز بالنگ ایکشن کے ساتھ اسے گیند پر اچھا کنٹرول اور اسپن پر عبور حاصل ہے۔ اس کی تیز رفتار گیند جو کسی فاسٹ بالر کی بال سے کم تیز نہیں ہوتی' اس کا بہترین خفیہ ہتھیار ہے۔ لیکن افسوس' بورڈ' ٹیم کے کوچز اور خود شاہد آفریدی نے بلے باز بننے کی کوشش میں خود کو بین الاقوامی کرکٹ میں بہت نمایاں نہیں کیا۔ حالانکہ بنا کسی مناسب کوچنگ کے اس کا بین الاقوامی کرکٹ میں آنا' اس کی بہترین خداداد صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی حنیف محمد کی۔ ان کی ساری تربیت ایک اچھے بلے باز کے طور پر ہوئی تھی۔ ان کے اسکول کے کوچ نے ان کی خامیاں دور کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی اور حنیف محمد نے بھی ان کی محنت کا پاس رکھا اور اپنی ساری توجہ بلے بازی پر مرکوز رکھی۔ اس کے باوجود جب پاکستان کو ٹیسٹ اسٹیٹس ملا تو کچھ حلقے حنیف محمد کی فرسٹ کلاس کرکٹ کی کارکردگی نظر انداز کر کے ٹیم میں ان کی شمولیت کی مخالفت کر رہے تھے۔ بہانہ ان کی کم عمری کو بنایا گیا اور مجبوراً سلیکٹرز کو ایک اچھے بلے باز کو وکٹ کیپر کی حیثیت سے کھلانا پڑا تھا۔ کیونکہ وہ بہرصورت حنیف کو ٹیم میں شامل کرنا چاہتے تھے اور مخالفت کرنے والوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

چند سیریز میں حنیف نے اپنی صلاحیتوں کو منوالیا تھا اور پھر اب ان کی کم عمری بھی جواز نہیں رہی تھی۔ اکیس سال کی عمر میں وہ میچور بلے باز کا روپ دھار چکے تھے۔ 20 دسمبر 1957ء کو جب پاکستانی ٹیم بحری جہاز کے ذریعے ایک طویل سفر پر ایک نئی سرزمین کی طرف روانہ ہوئی تو حنیف محمد اس کے لازمی رکن تھے۔ بحر اوقیانوس کے طوفانی سمندر میں چھوٹے چھوٹے بے شمار جزائر ہیں۔ ایک زمانے میں یہ جزائر برطانیہ کی عمل داری میں تھے۔ ان جزائر پر صدیوں سے آباد مقامی باشندوں کو اسپینی حملہ آور پہلے ہی ختم کر چکے تھے یا ان کی آبادی اتنی کم ہو چکی تھی کہ وہ ان جزائر کی ترقی کے لیے کسی قسم کا کردار ادا کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا برطانوی تجار نے افریقہ کے ساحلوں سے جفاکش سیاہ فاموں کو اتنی بڑی تعداد میں لاکر یہاں پر آباد کیا کہ ان جزائر کی غالب آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل ہوئی۔ جب دنیا سے برطانوی استعمار کا خاتمہ ہوا تو انہوں نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے ان جزائر کو کسی ایک ملک کی صورت میں آزاد کرنے کے بجائے الگ الگ ملکوں کی صورت میں آزاد کیا۔ حالانکہ چند مربع میل پر پھیلے اور چند لاکھ نفوس کی آبادی پر مشتمل یہ جزائر آزاد ملک سے زیادہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ملک کا الگ پرچم اور الگ حکومت ہے۔ یہ ہیں ویسٹ انڈیز یا جزائر غرب الہند۔

لیکن ایک معاملے میں ان ممالک نے اتحاد کیا اور ایسا اتحاد کیا جو مثالی بن گیا۔ ان میں سے ہر ملک کرکٹ کھیلتا ہے لیکن کم آبادی کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہر ملک الگ الگ کرکٹ کھیلنے کے لیے ٹیسٹ ٹیم کا درجہ حاصل کر سکے چنانچہ انہوں نے مل کر ایک ٹیم بنائی جس کا نام اپنے جزائر کے مجموعے کے نام پر ویسٹ انڈیز رکھا گیا اور یہ اتحاد صرف کرکٹ کے معاملے میں ہے ورنہ باقی کھیلوں میں ان ممالک کی الگ الگ ٹیمیں بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیتی ہیں۔

اس وقت پاکستانی کھلاڑیوں کو ویسٹ انڈیز کے بارے

میں تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ ایک ملک ہے یا الگ الگ ممالک ہیں اور کس براعظم میں شامل ہیں، وہاں کا موسم کیسا ہے اور وکٹیں کیسی ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں سے ہمارے کھلاڑی تقریباً ناواقف تھے۔ انگلینڈ کے تجربے کے پیشِ نظر تقریباً سب ہی کھلاڑیوں نے سوئٹر اور گرم کپڑے ساتھ لیے تھے۔ مگر جب وہ جزائر ویسٹ انڈیز کے پاس پہنچے تو گرمی کی شدت نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ خطِ استوا سے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہاں سارے سال ہی گرمی پڑتی ہے۔ بارشیں بے پناہ ہوتی ہیں اور بارش کے بعد موسم کسی قدر خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی دھوپ نکلتی ہے، دوبارہ شدت کی گرمی پڑنے لگتی ہے۔ اس طویل دورے میں پاکستانی ٹیم کو چھ ٹیسٹ میچز اور درجن بھر سائیڈ میچز کھیلنا تھے۔ دورے کا آغاز حسبِ روایت فرسٹ کلاس میچوں سے ہوا۔

اپنے اولین فرسٹ کلاس میچ میں حنیف کوئی بڑی اننگ کھیلنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن اپنے ٹمپرامنٹ اور تکنیک سے سب کو متاثر کیا۔ اسی وقت ویسٹ انڈین ماہرین نے بھانپ لیا کہ ان کی ٹیم کی فتح میں سب سے بڑی رکاوٹ حنیف محمد ثابت ہوں گے۔ انہوں نے حنیف محمد کو ایورٹن ویکس، سرفرینک وورل اور سرلین ہٹن کے پائے کا کھلاڑی قرار دیا تھا۔

17 جنوری کو پہلا ٹیسٹ بارباڈوس کے دارالحکومت کنگسٹن کے اوول پارک میدان پر کھیلا گیا۔ اپنی فاسٹ بالنگ کی بیٹری، خاص طور سے ''رفتار کا طوفان'' گلکرائسٹ کی موجودگی کی وجہ سے ویسٹ انڈین بورڈ نے اوول پارک پر بلے بازی کے لیے موزوں پچ کا انتخاب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بلے باز اس وکٹ میں پوشیدہ رنز کے خزانے کھود نکالیں گے اور ان کے بالرز پاکستان کی ناتجربے کار بیٹنگ لائن کو تہس نہس کر دیں گے۔ میچ کے پہلے ڈھائی دن ان کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ جس ٹیم میں ایورٹن ویکس، فرینک وورل اور الیگزینڈر جیسے بلے باز ہوں اسے بڑا اسکور بنانے سے کون روک سکتا تھا۔ وکٹ کی سطح شیشے کی طرح ہموار اور ایسی چمک دار تھی کہ ذرا سی کوشش سے اس میں اپنی صورت بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

کاردار اس روز چونتیس برس کے ہو گئے تھے اور سالگرہ والے دن وہ ویسٹ انڈین کپتان الیگزینڈر سے ٹاس ہار گئے جس نے فوری طور پر پہلے بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بلے بازوں نے فضل محمود، محمود حسین اور نسیم الغنی پر مشتمل معیاری بالنگ اٹیک کو دھن کر رکھ دیا۔ کونریڈ ہنٹ اور ایورٹن ویکس نے سنچریاں بنا ڈالیں اور محض پانچ سیشن اور ایک گھنٹے کے کھیل میں ویسٹ انڈین بلے بازوں نے 579 رنز کا پہاڑ سا ہدف کھڑا کر دیا۔ پاکستانی بالروں نے وکٹیں ضرور گرائیں لیکن وہ رنز کی رفتار روکنے میں ناکام رہے۔ اس میں ایک حد تک قصور وکٹ کا بھی تھا، جو بلے بازی کے لیے مادر مہربان تھی تو بالروں کے لیے اس کا رویہ سوتیلی ماں سے کم نہیں تھا۔

مگر جب ویسٹ انڈین ٹیم کے بعد پاکستان کی باری آئی تو یک لخت مادر مہربان کا رویہ بدل گیا اور اس میں زیادہ قصور پاکستانی بلے بازوں کی جلد بازی کا تھا۔ انہوں نے سکون سے ٹک کر بلے بازی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے چلے گئے۔ گلکرائسٹ نے بہت اچھی فاسٹ بالنگ کی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور پوری پاکستانی ٹیم ایک سو چھ رنز کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہو گئی یعنی ویسٹ انڈین اسکور سے چار سو تہتر رنز پیچھے تھی اور ابھی اسے اننگ کی شکست سے بچنے کے لیے اتنے رنز کی ضرورت تھی اور پورے ساڑھے تین دن کا کھیل باقی تھا۔ ماہرین نے شکست کو پاکستان کا مقدر قرار دے دیا تھا۔

جب کسی ٹیم کو اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہو اور حالات اتنے ناموافق ہوں تو عام طور سے شکست ہی مقدر بنتی ہے۔ پاکستانی ڈریسنگ روم پر ایک مایوسی سی طاری تھی۔ ایک سو چھ رنز کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہونا ان کے لیے باعث شرم تھا۔ حنیف محمد سر جھکائے دوسری اننگ کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر غور و فکر کے آثار تھے۔ امتیاز احمد کسی قدر غصے میں نظر آ رہے تھے۔ پہلی اننگ میں جہاں پاکستانی بلے بازوں کی جلد بازی اور ویسٹ انڈین بالرز کی نپی تلی بالنگ نے پاکستان کو ہزیمت سے دوچار کیا تھا، وہیں امپائرز کے بعض فیصلے بھی پاکستان کے خلاف گئے تھے۔ امتیاز احمد ایسے ہی ایک فیصلے کا شکار ہو گئے تھے اور ان کے ارادے دوسری اننگ کے لیے جارحانہ نظر آ رہے تھے۔

''ساتھیو!'' اچانک کاردار نے کہا ''اس طرح منہ لٹکا کر کیوں بیٹھے ہو۔ کرکٹ میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اگر ہم ہمت سے کام لیں تو میچ بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اگر ہاریں بھی تو مقابلہ کر کے ہاریں گے۔''

''ہاں، ہم میچ تھالی میں سجا کر انہیں نہیں دیں گے'' سعید احمد نے کہا۔

''بہ شرطیکہ امپائرز ہاتھ نہ دکھائیں'' فضل محمود بھی ناقص امپائرنگ سے نالاں تھے۔ ویسٹ انڈین اننگ کے دوران

میں انکی کئی زوردار اپیلوں کو امپائرز نے مسترد کردیا تھا۔

''امپائرز اور ویسٹ انڈین کھلاڑی کچھ نہیں کرسکتے'' کاردار نے اعتماد سے کہا تھا۔ ''بشرطیکہ ہم محنت سے کھیلیں۔ وکٹ پر رکیں اور کوئی غیر ضروری شاٹ نہ کھیلیں۔ ہمیں ایک کھلاڑی کی طرف سے بھرپور اسٹینڈ کی ضرورت ہے جو وکٹ پر رکا رہے اور ٹیم کو سہارا دے۔''

سب کی نظریں حنیف محمد کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ٹیم میں وہی ایک ایسے کھلاڑی تھے جو پوری ثابت قدمی سے وکٹ پر رکنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ آہستہ سے مسکرائے ''میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

کاردار کا شمار پاکستان کے بہترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ان کی قیادت تھی کہ پاکستان کی ناتجربے کار ٹیم نے ہر ٹیسٹ ٹیم کو اولین سیریز میں کم سے کم ایک ٹیسٹ ضرور ہرایا۔ بلکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے خلاف وہ اولین سیریز جیتنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔ بھارت اور ویسٹ انڈیز سے سیریز میں ان کے ملک میں شکست کھائی تھی اور انگلینڈ سے سیریز برابر رہی تھی۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ بھارت اور ویسٹ انڈیز میں امپائرنگ کا معیار کیا ہے۔ کاردار اپنے ساتھیوں میں جوش وولولہ پیدا کرنے کا فن جانتے تھے۔ ساتھ ہی وہ میچ میں مقابلے کی اسپرٹ برقرار رکھتے تھے۔ ان کا عزم ہمیشہ فتح کے لیے ہوتا تھا۔ ان کی قیادت میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے اولین دس سال بلاشبہ سنہرے سالوں میں سے تھے۔ اس دوران میں پاکستان نے 23 ٹیسٹ میچز کھیلے اور ان میں سے چھ جیتے' اتنے ہی ہارے اور باقی میچز ڈرا ہوئے۔ ان میں سے بھی اکثر موسم کی خرابی یا حد سے زیادہ بیٹنگ وکٹ کی وجہ سے ڈرا ہوئے تھے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کاردار مثبت کرکٹ کے قائل تھے۔ وہ میچ کو فتح کے لیے کھیلا کرتے تھے۔ ان کے بعد آنے والے کپتانوں میں سے اکثر اس جارحانہ اسپرٹ سے محروم پائے گئے اور یہی چیز پاکستانی کرکٹ کے زوال کا باعث بنی۔ کسی حد تک عمران خان کے دور میں پاکستانی ٹیم میں یہ اسپرٹ دیکھنے میں آئی تھی۔ کاردار کی ولولہ انگیز باتوں نے ڈریسنگ روم سے مایوسی کے بادل چھانٹ دیے تھے۔ اور اوپنرز اس عزم کے ساتھ وکٹ کی طرف روانہ ہوئے کہ وہ فتح تحفے میں نہیں پیش کریں گے۔

ویسٹ انڈین تماشائی اور کھلاڑی متوقع فتح کے نشے سے سرشار تھے۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ شاید وہ پہلی اننگ کا ایکشن ری پلے کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور تیسرے دن ہی میچ کا فیصلہ ہوجائے گا۔ انہوں نے پاکستانی کھلاڑیوں کے رویے پر غور ہی نہیں کیا جو قطعی بدلا ہوا تھا۔ حنیف محمد غضب کے پُرسکون تھے تو امتیاز احمد کچھ کر دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے جاتے ہی گلکرائسٹ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اب تک ویسٹ انڈین تماشائی اپنے ہی کھلاڑیوں کو جارحانہ بلے بازی کرتے دیکھتے رہے تھے مگر امتیاز احمد کی جارحانہ بلے بازی نے انہیں ششدر کردیا۔ گلکرائسٹ اپنے دور کا تیز ترین بالر تھا اور کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی غیر ملکی کھلاڑی اسے یوں بھی کھیل سکتا ہے۔ اس وقت ہیلمٹ نہیں ہوتے تھے۔ دستانے اور پیڈز بھی بس گزارے لائق ہوا کرتے تھے۔ ان حالات میں فاسٹ بالرز کو کھیلنا ہی بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ امتیاز نے اپنے مخصوص انداز میں زوردار اسٹروکس کھیلے اور تماشائیوں کا دل جیت لیا جو میچ کو ختم سمجھ رہے تھے۔

20 جنوری کی سہ پہر ڈھائی بجے پاکستان نے اپنی دوسری اننگ کا آغاز کیا تھا اور ابھی نصف دن کا کھیل باقی تھا۔ پچ بھی روز اول جیسی نہیں رہی تھی اور اس میں کئی جگہ گڑھے پڑگئے تھے۔ خاص طور سے جہاں زیادہ گیندیں گرتی تھیں اور جہاں بالروں کے پیروں کے نشان بنتے تھے' وہاں سے پچ خاصی خراب ہوگئی تھی۔ فاسٹ بالرز کے لیے اس میں اب بھی کچھ نہیں تھا لیکن اسپنرز کے لیے وکٹ میں تھوڑی جان پیدا ہوگئی تھی۔ ویسٹ انڈین کپتان مطمئن تھا کہ جب اس کے فاسٹ بالرز اپنا کام کرلیں گے تو اس کا مستند اسپنر ایرک پاکستانی کھلاڑیوں کو اپنی پرفریب اسپن بالنگ کا نشانہ بنا سکے گا۔ وہ محض دو قدم کے اسٹارٹ سے بڑی اچھی بالنگ کرتا تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے فرینک وورل تھے۔

مگر حنیف محمد اور بالخصوص امتیاز احمد نے سب کو حیران کردیا۔ کہاں تو پوری ٹیم ہی ایک سو چھ کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہوگئی تھی اور کہاں ایک سو باون رنز تک ویسٹ انڈین بالرز دونوں اوپنرز میں سے کسی ایک کو بھی آؤٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ امتیاز نے گلکرائسٹ سے اپنی پہلی اننگ کی ناانصافی کا بھرپور بدلہ لیا۔ وکٹ پر ان کے اسٹروکس دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی امتیاز احمد کو صحیح معنوں میں جارحانہ انداز میں کھیلنے والے پہلے پاکستانی بلے باز ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ نیوزی لینڈ کے خلاف وہ آٹھویں نمبر پر کھیلتے ہوئے تیز رفتار ڈبل سنچری بنا چکے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اوپنرز تیسرا دن بنا کسی نقصان کے گزار دیں گے۔ حنیف اور امتیاز کی کارکردگی نے شائقین کو

بھی ان کا گرویدہ کر دیا تھا۔ یقینی شکست کے دباؤ میں ایسا کھیل انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گیند بلے سے ٹکرا کر باؤنڈری کا رخ کر رہی تھی۔ امتیاز کی جارحیت کے مقابلے میں حنیف سکون سے کھیل رہے تھے۔ جو گیند وکٹوں سے باہر ہوتی اسے چھوڑ دیتے۔ وکٹوں میں آتی گیند کو وہ ہر ممکن احتیاط سے کھیلا کرتے تھے اور جو گیند شاٹ کھیلنے کے لائق ملتی اس پر اتنی خوبصورتی سے شاٹ کھیلتے کہ تماشائی بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ گلکرائسٹ اور ڈینس ایٹکنسن کی خطرناک تیز گیندیں انہیں متاثر کرنے میں قطعی ناکام رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کا جوش و خروش اور فوری جیت کا یقین ماند پڑنے لگا۔ انہیں جیتا ہوا میچ ڈرا کی طرف جاتا نظر آنے لگا تھا۔ ایسے میں امپائر ایک بار پھر بالر کی مدد کے لیے آگے آئے۔ پہلی اننگ کی طرح گلکرائسٹ کی ایک بال امتیاز احمد کے پیڈز سے ٹکرائی۔ گیند لیگ اسٹمپ سے خاصی باہر تھی' اس کے باوجود گلکرائسٹ نے چلا کر اپیل کی۔ اتنی دیر سے وکٹ پر موجود امتیاز احمد خاصی حد تک مطمئن تھے اور انہیں امپائرنگ پر بھی اعتماد ہو چلا تھا اس لیے جب ویسٹ انڈین امپائر نے انگلی فضا میں بلند کی تو وہ ششدر رہ گئے۔ خود بالر بھی اس طرح آؤٹ دیے جانے پر حیران ہوا تھا' اس نے تو مایوسی کے عالم میں اضطراری طور پر اپیل کی تھی۔ امپائر نے گویا موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس زمانے میں ٹی وی تو تھا نہیں کہ ایکشن ری پلے کا سوال پیدا ہوتا۔ اس کے باوجود تماشائیوں نے صاف محسوس کیا کہ امتیاز کو غلط آؤٹ دیا گیا ہے اور اس پر بارباڈوز کے عوام نے برملا ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ حالانکہ وہاں کے عوام جنون کی حد تک اپنی ٹیم کو فاتح دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

امتیاز کے پویلین سے لوٹ آنے پر سارے ہی پاکستانی کھلاڑی تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے گویا ان کا مقابلہ ایک ایسی ٹیم سے تھا جس میں گیارہ کے بجائے تیرہ کھلاڑی کھیل رہے تھے۔ امتیاز احمد اپنی سنچری سے صرف نو رنز کے فاصلے پر تھے اور 91 رنز پر امپائر کے نامنصفانہ فیصلے نے ایک خوب صورت اننگ کو قبل از وقت ختم کر دیا تھا۔ اگلے آنے والے بلے باز علیم الدین تھے۔ انہوں نے حنیف محمد کے ساتھ مل کر وہ دن پوری احتیاط سے گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی چند منٹ کا کھیل باقی رہ گیا تھا۔ دونوں سر جھکا کر ہر بال کو اس کے میرٹ پر کھیلتے رہے اور جب اس دن کا کھیل ختم ہوا تو پاکستان کا اسکور ایک وکٹ کے نقصان پر ایک سو باسٹھ رنز تھا۔

ابھی تین دن کا کھیل باقی تھا اور کرکٹ میں تو چند اوورز میں پانسا پلٹ جاتا ہے۔ گویا پاکستانی ٹیم کو شکست سے بچنے کے لیے ابھی خاصا طویل سفر طے کرنا تھا۔ میچ کھیل کر جب پاکستانی ٹیم واپس ہوٹل جا رہی تھی تو عوام سڑکوں پہ جمع ہو کر اس دن کے کھیل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ تقریباً ہر شخص نے پاکستانی ٹیم کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اگلے روز مزید محتاط ہو کر کھیلنے کا مشورہ دیا۔ اس روز ایسا لگ رہا تھا جیسے پاکستانی ٹیم اپنے ہی ملک میں کھیل رہی ہے۔ عوام کا رویہ اپنے امپائروں کے مقابلے میں کہیں سپورٹنگ اور منصفانہ تھا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اوول پارک کا اسٹیڈیم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں تماشائیوں کے بیٹھنے کی محدود گنجائش تھی اور میچ دیکھنے کے خواہش مندوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ جن لوگوں کو اندر جانے کے لیے ٹکٹ نہیں ملا انہوں نے میچ دیکھنے کے لیے میدان سے باہر اونچی جگہیں تلاش کیں۔ اسٹیڈیم کے چاروں طرف بلند درخت شاید اسی مقصد کے لیے تھے کہ لوگ ان پر چڑھ کر میچ دیکھ سکیں۔ درخت تو بے شار تھے مگر دیکھنے والوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ ان کے لیے درخت کم پڑ جاتے تھے۔ ایک ویسٹ انڈین تماشائی بہ مشکل ایک درخت پر جگہ حاصل کر سکا تھا۔ یہ شاخ خاصی پتلی سی تھی اور اس پر بیٹھنے کے لیے خاصی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے درخت کی دوسری شاخ تھام رکھی تھی۔ یہ تماشائی صرف حنیف محمد کی بلے بازی دیکھنے کے لیے اس خطرناک جگہ بیٹھا تھا۔ ایک بار حنیف محمد نے کسی بالر کو کور ڈرائیو کیا۔ شاٹ اتنا خوب صورت تھا کہ اس تماشائی نے بے اختیار ہاتھ شاخ سے ہٹا کر تالی بجا کر داد دی۔ نتیجہ ظاہر ہے وہ سر کے بل زمین پر آ رہا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

اس تماشائی کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے اس کے سر کی مرہم پٹی کر دی تھی مگر اسے ہوش نہیں آیا۔ اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا۔ اسے پورے چوبیس گھنٹے بعد ہوش آیا اور اس نے ہوش میں آتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا کہ حنیف محمد کھیل رہے ہیں یا آؤٹ ہو گئے؟ جب اسے بتایا گیا کہ وہ ابھی کھیل رہے ہیں تو تماشائی دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے حادثہ کھیل کے تیسرے دن شام کے وقت پیش آیا تھا اور اسے چوتھے دن شام کے وقت ہوش آیا تھا۔ دوبارہ بے ہوش ہونے کے بعد اسے پھر چوبیس گھنٹے تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹرز حیران تھے کہ یہ کس قسم کی بے ہوشی ہے۔ کیونکہ تماشائی کو بہ ظاہر کوئی سنگین چوٹ نہیں

آ ئی تھی۔ اسے دوسری بار میچ کے پانچویں دن ہوش آیا اور اس نے دوبارہ وہی سوال کیا اور جب اسے پہلے والا جواب ملا تو وہ دوبارہ غشی کی حالت میں چلا گیا۔ صورت حال ایسی دلچسپ تھی کہ بات اخبارات تک جا پہنچی اور لوگ کرکٹ اور حنیف کے اس دیوانے کو دیکھنے کے لیے اسپتال آنے لگے۔ بالآخر جب اسے میچ کے چھٹے دن ہوش آیا اور اسے بتایا گیا کہ حنیف محمد آؤٹ ہوگئے ہیں تب کہیں جا کر اس کے حواس پوری طرح بحال ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہ حنیف کا دیوانہ تھا یا بار بار صدمے سے بے ہوش ہو رہا تھا۔ بہرحال میچ کے بعد حنیف محمد بھی اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال گئے تھے۔

چوتھے دن کھیل کے آغاز پر ویسٹ انڈین بالرز پر امید تھے۔ انہیں علیم الدین سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک کر بلے بازی کر سکیں گے۔ پچھلی اننگ میں بھی وہ ایک غیر ذمے دارانہ شاٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہوئے تھے۔ جب اسکور رفتہ رفتہ آگے بڑھا اور علیم بھی پچھلی اننگ کے برعکس صبر و سکون سے کھیلتے رہے تو ویسٹ انڈین بالرز پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ علیم اور حنیف کی جوڑی کسی قدر سست روی سے لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ اننگ آگے بڑھا رہی تھی۔ امتیاز احمد کے آؤٹ ہونے کے بعد رنز بنانے کا کام حنیف نے سنبھال لیا تھا۔ ان کے اسٹروکس اور فیلڈرز کے درمیان سے بال نکالنا قابل دید منظر ہوا کرتا تھا۔ عجیب بات تھی، وہ غیر ملکی کھلاڑی تھے اور ابھی ان کی اننگ بھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی لیکن تماشائی ان کے ہر اسٹروک پر کھل کر داد دے رہے تھے۔ رنز بنیں نہ بنیں انہیں حنیف کی بلے بازی سے غرض تھی۔

چوتھے دن پاکستان کی اننگ سست رہی لیکن ویسٹ انڈین بالروں کے حصے میں وکٹ بھی صرف ایک ہی آئی تھی۔ علیم الدین لنچ کے فوراً بعد دوسو چونسٹھ کے اسکور پر آؤٹ ہوگئے۔ انہوں نے حالانکہ..... ذاتی طور پر صرف سینتیس (37) رنز ہی بنائے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف تین گھنٹے تک حنیف محمد کا ساتھ دیا اور ان کی سنچری بنوانے میں مدد دی بلکہ پاکستان کے لیے ایک اور سنچری کی شراکت قائم کی۔ حنیف اور علیم کی شراکت میں ایک سو بارہ رنز کا اضافہ ہوا تھا۔ حنیف نے اپنی سنچری لنچ سے ذرا پہلے مکمل کی تھی۔ اس میچ میں پہلے بھی دو سنچریاں بن چکی تھیں لیکن تماشائیوں اور خود ویسٹ انڈین کھلاڑیوں نے اس سنچری کی دل کھول کر داد دی۔ یہ داد سنچری سے زیادہ حنیف کے صبر و استقامت پر تھی۔ وہ گزشتہ پانچ گھنٹے سے کریز پر تھے اور ابھی انہیں مزید لمبا سفر طے کرنا تھا۔ تیسرے دن کے کھیل میں پاکستان نے 167 رنز کا اضافہ کیا۔ امتیاز احمد کے آؤٹ ہونے کے بعد رنز بنانے کی رفتار پر واقعی برا اثر پڑا تھا۔ پہلے ایک سو ساٹھ رنز صرف آدھے دن کے کھیل میں بن گئے تھے جبکہ اگلے نصف رنز اس سے دوگنے وقت میں بنے مگر اس وقت اہمیت رنز کی نہیں بلکہ وکٹ پر کھڑے رہنے کی تھی اور یہ کام پاکستانی بلے بازوں نے بہ خوبی انجام دیا تھا۔ انہوں نے بالروں کے ساتھ امپائروں کو بھی کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

اب بھی ویسٹ انڈیز کی پہلی اننگ کی برتری ختم کرنے کے لیے سوا سو سے زیادہ رنز کی ضرورت تھی۔ اطمینان بخش بات، جس نے پاکستانیوں کا حوصلہ بلند رکھا تھا وہ حنیف محمد کی وکٹ پر موجودگی تھی۔ اس وقت تک وہ کوئی ساڑھے چار سو منٹ تک بلے بازی کر کے ایک سو اکسٹھ رنز 161 رنز بنا چکے تھے۔ بال پرانی ہونے کے سبب گلکرائسٹ اس مردہ وکٹ پر کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام رہے تھے لیکن میڈیم پیسر ایرک ایٹکنسن اور اسپنر ڈینس نے خاصی اچھی بالنگ کرائی اور وکٹ سے اسپن حاصل کیا تھا۔ مگر وہ حنیف اور پھر سعید احمد کے اعتماد کو متزلزل کرنے میں ناکام رہے جو علیم الدین کے آؤٹ ہونے کے بعد کھیلنے آئے تھے۔ سعید احمد بعد کے سالوں میں پاکستان کے ایک اچھے مڈل آرڈر بلے باز ثابت ہوئے۔ اس وقت وہ بھی بالکل نوجوان تھے اور پہلی بار کوئی ٹیسٹ سیریز کھیل رہے تھے۔

حنیف محمد کتابی بلے بازی کا بہترین مظاہرہ کر رہے تھے۔ چھوڑنے والی بال کو چھوڑ دیتے، روکنے والی بات روک لیتے اور جو بال اسٹروک کی مستحق ہوتی تھی اسے ضرور اسٹروک سے نوازتے۔ ان کا فٹ ورک لاجواب تھا اور توجہ مثالی۔ چوتھے دن کھیل کے اختتام تک وہ اسٹیڈیم میں موجود ہر فرد کے ہیرو بن چکے تھے اور جب تماشائی واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو وہ یہ ارادہ پہلے ہی کر چکے تھے کہ اگلے دن حنیف محمد کی بیٹنگ دیکھنے آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچویں دن کا کھیل شروع ہوا تو اسٹیڈیم تو اپنی گنجائش سے کچھ زیادہ بھرا ہوا تھا ہی، اردگرد دستیاب ہر ایسی جگہ پر لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے جہاں سے میدان نہ سہی اس کے وسط میں وکٹ ہی نظر آتی ہو۔

پانچویں دن جب کھلاڑی میدان میں آئے تو وکٹ بدستور بلے بازوں پر مہربان تھی۔ اگرچہ اب اس پر رنز اسکور کرنا ذرا مشکل ہو رہا تھا یعنی اگر کوئی کھلاڑی رکنے کا ارادہ کر لے تو کسی بھی بالر کے لیے اسے آؤٹ کرنا دشوار ترین کام ثابت ہو سکتا تھا۔ کھیل کا آغاز ہی سست روی سے ہوا۔ حنیف

اور سعید پوری توجہ وکٹ پر ٹھہرنے پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔ حنیف خاص طور سے اب اتنے سیٹ ہوچکے تھے کہ انہیں کسی بالر سے ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں امپائرز کا خوف ضرور تھا۔ اب تک وہ چار فیصلے پاکستانی بلے بازوں کے خلاف دے چکے تھے اور تقریباً اتنی ہی بار ویسٹ انڈین بلے بازوں کو آؤٹ نہیں دیا گیا تھا۔

بیٹ اور بال کی اس کش مکش سے بور ہونے کے بجائے تماشائی پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ وکٹ نہیں گر رہی ہے اور رنز بھی سستی سے بن رہے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں کرکٹ کی اعصابی سنسنی خیزی کو محسوس کر رہے تھے۔ ہر اچھی بال پر داد دیتے تھے تو ہر اچھے اسٹروک کو بھی دل کھول کر سراہتے تھے۔ تیسری وکٹ کی شراکت میں پاکستان کا اسکور 418 تک جا پہنچا تھا۔ اس موقع پر عمدگی سے کھیلنے والے سعید احمد اسمتھ کی ایک پرفریب آؤٹ سوئنگر پر وکٹ کیپر دکپتان الیگزینڈر کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہوگئے۔ لنچ سے ذرا پہلے گرنے والی اس وکٹ نے پاکستان کے اسکور میں ایک سو چون رنز کا اضافہ کیا تھا۔ یہ مسلسل تیسری سنچری پارٹنر شپ تھی۔ عجیب بات ہے کہ جارحانہ کھیل کے لیے مشہور سعید نے اتنی بڑی شراکت میں صرف 65 رنز اسکور کیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بالرز کا زیادہ سامنا خود حنیف محمد کر رہے تھے۔

عام طور پر پورا دن وکٹ پر گزارنے والے بلے باز کا تھکن سے ایسا برحال ہو جاتا ہے کہ وہ بس جا کر بستر پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ حنیف کو تو وکٹ پر کھڑے ڈھائی دن ہوچکے تھے۔ اس کے باوجود جب وہ واپس ہوٹل جاتے تو ان کے انداز سے تھکن کے بجائے ایک قسم کی تازگی جھلک رہی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اعصاب شکن ماحول میں پرمشقت بلے بازی کے بجائے کہیں تفریح کر کے آ رہے ہیں۔ ہوٹل آنے کے بعد رات کا کھانا کھا کر بعض اوقات وہ باہر ٹہلنے بھی چلے جاتے تھے۔ دوسروں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس نارمل سی جسامت والے نوجوان کے جسم میں کتنی توانائی بھری ہوئی ہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ حنیف محمد نے اسکول کے زمانے میں ماسٹر عزیز سے کتنی کڑی ٹریننگ لی تھی۔ انہوں نے کم عمری سے حنیف کو سخت ورزشیں کرائی تھیں جو بلے بازی کی مشق کے علاوہ ہوا کرتی تھیں۔ ان ہی مشقوں سے حنیف محمد کا اسٹیمنا اس لائق ہوا تھا کہ بے حد طویل اننگ کھیلنے کے باوجود نہیں تھکتے تھے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ خاصی دیر تک وکٹ پر رہے' پاکستان کی ڈومیسٹک کرکٹ کے فرسٹ کلاس میچوں میں بھی وہ کئی بار طویل اننگز کھیل چکے تھے۔

پانچویں دن وہ آہستگی سے لیکن مستقل مزاجی سے اپنی اننگ آگے بڑھاتے رہے۔ وہ اتنی درست بلے بازی کر رہے تھے کہ اب تک انہوں نے ایک چانس بھی نہیں دیا تھا۔ ڈینس کی اسپن ہوتی بالوں پر کئی بار ان کے خلاف ایل بی ڈبلیو کی زوردار اپیل ہوئی تھی مگر امپائرز نے انہیں ناٹ آؤٹ قرار دیا۔ درحقیقت ان اپیلوں میں کوئی جان نہیں تھی۔ گیند ہر بار وکٹوں سے خاصی دور جا رہی ہوتی تھی۔ پانچویں دن لنچ کے وقفے کے بعد وکٹ میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار اب نمایاں ہونے لگے تھے اور اس سے اسپنرز کو بال گھمانے میں خاصی مدد مل رہی تھی۔ اس وجہ سے حنیف اور ان کے ساتھ نئے آنے والے ان کے بڑے بھائی وزیر محمد کو خاصی محتاط بلے بازی کرنا پڑ رہی تھی۔ سعید کو آؤٹ کرنے کے بعد ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کی یہ امید کہ وہ جلد باقی پاکستانی بلے بازوں کو پویلین بھیج کر میچ پر اپنی گرفت دوبارہ مضبوط کرلیں گے' وزیر اور حنیف کی جوڑی نے خاک میں ملا دی۔ دونوں بھائی مثالی ہم آہنگی سے بلے بازی کرتے رہے اور وہ رفتہ رفتہ پاکستانی ٹیم کو اننگ کی شکست کے خطرے سے دور لے جا رہے تھے۔

کپتان الیگزینڈر نے مایوس ہو کر آخری حربے کے طور پر نئی گیند لے لی۔ گلکرائسٹ نے بے حد تیز گیندیں پھینکیں مگر حنیف اور وزیر کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ پانچویں دن جب کھیل ختم ہوا تو پاکستان نے پانچ سو پچیس رنز بنا لیے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ اس سارے دن میں جان مارنے کے بعد ویسٹ انڈین بالرز صرف ایک وکٹ حاصل کر سکے تھے۔ اس دن پاکستان نے گزشتہ دن کے مقابلے میں نسبتاً بہتر کارکردگی دکھاتے ہوئے 186 رنز بنائے تھے۔ حنیف محمد نے گزشتہ روز کے اسکور 161 میں مزید 109 رنز کا اضافہ کیا اور دن کے خاتمے پر 270 رنز پر کھیل رہے تھے۔ جب وہ دو سو رنز تک پہنچے تو پہلی بار انہوں نے اپنے اسکور پر غور کیا تھا ورنہ اب تک حنیف محمد کی ساری توجہ صرف وکٹ پر کھڑے رہنے پر مرکوز تھی۔ دو سو کا ہندسہ عبور کرنے اور ویسٹ انڈیز کی پہلی اننگ کے اسکور کا بوجھ اتارنے کے بعد حنیف محمد نے پہلی بار سنجیدگی سے اپنی اس اننگ کو لینا شروع کیا۔ جب وہ واپس ڈریسنگ روم کی طرف آ رہے تھے تو ان کے ذہن میں تین سو کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ ڈریسنگ روم میں آ کر انہیں پتا چلا کہ ان کے سارے ساتھی بھی ان کی ٹرپل سنچری کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ سب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔

''یار حنیف! کل شیر کی طرح کھیلنا'' امتیاز احمد نے اپنے مزاج کے مطابق مشورہ دیا ''ان کالوں کی ٹھیک سے پٹائی لگانا۔''

''بالکل۔ اب حنیف بھائی کو ان سے دب کر کھیلنے کی ضرورت نہیں ہے'' سعید احمد نے لقمہ دیا۔

''نہیں یار! کل حنیف کو اور زیادہ محتاط ہونا ہوگا'' کاردار سنجیدگی سے بولے ''بات اتنے بڑے اعزاز کی ہے' یہ صرف حنیف کا ہی نہیں بلکہ پاکستان کا اعزاز بھی ہوگا۔''

حنیف خاموشی سے مسکراتے ہوئے پسینے میں شرابور پیڈز اور دستانے اتار رہے تھے۔

☆☆☆

صرف حنیف محمد اور پاکستانی ٹیم ہی نہیں بلکہ سارے بارباڈوز کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ کل حنیف محمد اپنی ٹرپل سنچری مکمل کرسکیں گے یا نہیں؟ اس رات حنیف کو اس وجہ سے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی تھی لیکن اگلے روز وہ اٹھے تو حسب معمول تروتازہ تھے۔ بچپن سے انہیں سحرخیزی کی عادت تھی۔ رات کو کتنی ہی دیر سے سوئیں' صبح جلدی بیدار ہوجاتے تھے۔

حسب معمول ناشتے سے فارغ ہوکر پاکستانی ٹیم جلد اسٹیڈیم پہنچ گئی تھی تاکہ خود کو وارم اپ کرسکے اور کھلاڑی حیران رہ گئے جب انہوں نے صبح کے وقت ہی بے شمار لوگوں کو پہلے سے اسٹیڈیم میں براجمان پایا۔ صرف حنیف اور ان کے ساتھیوں کو ہی نہیں بلکہ تماشائیوں کو بھی حنیف محمد کی اس اننگ کا انتظار تھا۔

وارم اپ سے فارغ ہوکر حنیف اور ان کے ساتھی اخبارات دیکھنے لگے تقریباً تمام اخبارات کی شہ سرخی حنیف کے بارے میں تھی۔ ایک اخبار نے انہیں ''اسٹیمنا کا شاہ'' قرار دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا ''آج کے دور میں کسی بھی شخص کے لیے ساڑھے سات سو منٹ وکٹ پر کھڑے رہنا باعث فخر ہوسکتا ہے لیکن حنیف کے لیے نہیں' کیونکہ اس کے لیے یہ عام سی بات لگتی ہے۔''

ایک اور اخبار نے لکھا ''اوول پارک کے میدان پر آج تک کسی بلے باز نے اتنی استقامت سے وکٹ پر قیام نہیں کیا۔ جب حنیف محمد کھیل رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے انہیں وکٹ سے ہٹانے کے لیے کسی بالر کی نہیں بلکہ پولیس کے ایک دستے کی ضرورت پڑے گی۔''

باقی اخبارات نے بھی شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ان الفاظ نے حنیف کو متاثر کیا تھا مگر اتنا نہیں کہ ان کی توجہ اپنی اننگ سے ہٹ جاتی۔ وہ جانتے تھے کہ اس ساری تعریف اور توصیف کے وہ اس وقت حقدار ہوں گے جب اپنی اننگ کو.... واقعی کارنامہ بنادیں گے۔ ان کی نظریں لین ہٹن کے 364 رنز کے ریکارڈ پر مرکوز تھیں (واضح رہے' اس وقت تک گیری سوبرز نے 365 رنز بنانے کا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا اور یہ موقع انہیں 1958ء کی اس سیریز کے دوران میں ہی مل گیا تھا) اس وقت تک صرف چار افراد نے ٹرپل سنچری بنانے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان میں سے تین کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور ایک یعنی بریڈمین آسٹریلیا سے تعلق رکھتے تھے۔ بریڈمین کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے دو بار ٹرپل سنچری بنائی۔ (پچھلے دنوں ویسٹ انڈیز کے برائن لارا نے بھی اس فہرست میں اپنا نام درج کروالیا ہے۔ وہ 375 اور 400 رنز کی اننگز کھیل کر دو ٹرپل سنچریاں بنانے والے دوسرے کرکٹر بن گئے ہیں)

حنیف کا اولین ہدف تو ٹرپل سنچری مکمل کرنا تھا' اس کے بعد ان کے آگے اینڈی سینڈہم کے تین سو پچیس رنز تھے' اس کے بعد بریڈمین کے تین سو چونتیس رنز تھے پھر سر والٹر ہیمنڈ کے 336 رنز اور سب سے آخر میں سر لین ہٹن کا تین سو سو چونسٹھ رنز کا عالمی ریکارڈ تھا۔ یہ تمام اہداف ان کی منزل تھے۔ ایک ایک کرکے انہیں ان اہداف کو حاصل کرنا تھا مگر پانچ دن کے کھیل کے بعد وکٹ خستہ ہوچکی تھی۔ اس پر شکست و ریخت کے آثار نمایاں تھے۔ خاص طور پر فاسٹ بالرز کے لیے اس پر گیند اٹھانا محال ہوگیا تھا۔ یہ اصول ہے کہ جن وکٹوں پر گیند اٹھ کر نہ آئے' وہ نہ صرف بالروں بلکہ بلے بازوں کے لیے بھی مشکل ہوجاتی ہیں۔ ان پر ٹھہرنا تو آسان ہوتا ہے لیکن رنز بنانا بے حد دشوار ہوجاتا ہے۔ انہیں عام طور سے منفی رویے والی وکٹیں کہا جاتا ہے جو کھیل کو سست اور بور کردیتی ہیں۔ پاکستان' انڈیا اور سری لنکا میں عام طور سے اسی قسم کی وکٹیں ملتی ہیں۔ اگر ان وکٹوں پر فی اوور رنز اور فی وکٹ گیندوں کا تناسب نکالا جائے تو یہ آسٹریلیا اور انگلینڈ کی وکٹوں سے مختلف نکلے گا۔ خاص طور سے آسٹریلیا میں نہ صرف فی اوور رنز زیادہ بنتے ہیں بلکہ وہاں فی وکٹ گیندوں کا تناسب بھی کم ہے۔ اس کی وجہ وہاں کی زیادہ اچھال والی وکٹیں ہیں جو بلے بازوں اور بالروں کو یکساں مدد دیتی ہیں۔

خوابوں میں آسان نظر آنے والا ہدف حقیقت میں بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ایک بال کو بے حد احتیاط سے کھیلنا پڑ رہا تھا۔ خاص طور سے ڈینس کی گیندیں نہ صرف تیز اسپن لے رہی تھیں بلکہ وہ بیٹھ کر بھی آ رہی تھیں۔ نیچی گیندوں کے پیڈز پر لگنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور ویسٹ

انڈین امپائرز ذرا سے شبہے پر فیصلہ اپنے بالر کے حق میں دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے لہٰذا ایسی گیندوں پر رنز بنانا اور بھی دشوار کام تھا۔

ڈینس نے ہی پہلی کامیابی حاصل کی۔ وزیر محمد جو گزشتہ روز 30 کے اسکور پر کھیل رہے تھے' اپنے اسکور میں صرف پانچ رنز کا اضافہ کر کے 35 رنز پر آؤٹ ہو گئے۔ اس وقت کل اسکور 539 رنز تھا۔ معمولی اسکور کے باوجود وزیر نے نہ صرف چار گھنٹے وکٹ پر گزارے بلکہ حنیف کے ساتھ مل کر اسکور میں 121 رنز کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ پاکستان کی جانب سے مسلسل چوتھی سنچری شراکت تھی۔ اس وقت تک ایک اننگ میں مسلسل تین سنچریوں کی شراکت کا ریکارڈ انگلینڈ کے پاس تھا اور اسی اننگ میں سرلین ہٹن نے ریکارڈ 364 رنز بنائے تھے اور انگلینڈ نے اس اننگ میں ریکارڈ 903 رنز بنائے تھے۔ (بعد میں یہ ریکارڈ سری لنکا کی ٹیم نے انڈیا کے خلاف 952 رنز بنا کر توڑ دیا)۔

وزیر محمد امپائر کے غلط فیصلے کا نشانہ بنے تھے۔ جس گیند پر انہیں آؤٹ قرار دیا گیا تھا وہ ان کے بلے کو چھوئے بغیر گئی تھی۔ اس کے باوجود امپائر کی انگلی فضا میں بلند ہو چکی تھی اور وزیر کو واپس جانا پڑا تھا۔ وزیر کے بعد ویلس میتھائس کھیلنے آئے لیکن وہ زیادہ دیر حنیف کا ساتھ نہ دے سکے۔ ایک ''ان سوئنگر'' ان کے پیڈز سے ٹکرائی اور امپائر نے بالر کی اپیل پر اپنی انگلی اٹھانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اب پاکستان کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے اور صرف کپتان کاردار ہی ایک ایسے کھلاڑی رہ گئے تھے جن سے کچھ دیر وکٹ پر رہنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

چنانچہ میتھائس کے بعد کپتان کاردار کریز پر آئے اور انہوں نے آتے ہی حنیف سے کہا ''ڈٹے رہنا حنیف! یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انشاء اللہ تم لین ہٹن کا ریکارڈ ضرور توڑو گے۔''

کاردار اگرچہ مستند بلے باز نہیں تھے لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا جانتے تھے۔ اس موقع پر حنیف نے فیصلہ کیا کہ انہیں اب زیادہ تر بالرز کا خود سامنا کرنا ہے اور رنز بنانے کی رفتار بھی تیز کرنی ہے۔ کیونکہ کاردار کے بعد کوئی ایسا بلے باز نہیں تھا جو وکٹ پر کھڑا رہ کر ان کا ساتھ دیتا۔ وکٹ اس قدر سست ہو گئی تھی کہ ایک ایک رن کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لنچ تک حنیف اپنی ٹرپل سنچری مکمل نہیں کر سکے تھے۔ مگر ان کے مسلسل سامنے رہنے کی وجہ سے ویسٹ انڈین بالرز بھی مزید کوئی وکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

لنچ تک پاکستان' ویسٹ انڈیز پر سو رنز سے زائد کی برتری حاصل کر چکا تھا اور اگر پاکستانی چائے کے وقفے تک کھیل جاتے تو میچ بچ سکتا تھا۔

اس کے برعکس ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کا خیال تھا۔ اگر انہوں نے پاکستان کے باقی ماندہ کھلاڑیوں کو چائے کے وقفے تک آؤٹ کر دیا تو ان کے بلے باز تیز رفتاری سے کھیل کر با آسانی یہ ٹیسٹ جیت سکتے تھے۔ مگر کاردار اور حنیف نے ان کا یہ آخری خواب بھی چکنا چور کر دیا۔ لنچ کے بعد جب حنیف واپس کریز پر آئے تو اننگ میں پہلی بار ان پر اضطرابی کیفیت نظر آئی۔ لنچ کے بعد تیسرے اوور میں انہوں نے اس تاریخی سنگ میل کو عبور کر لیا جو ان کے علاوہ مشکل سے درجن بھر کھلاڑیوں کے حصے میں آیا ہے۔ وہ ٹرپل سنچری بنانے والے دنیا کے پانچویں کھلاڑی تھے۔ کاردار نے انہیں گلے لگا کر اس اعزاز پر مبارک باد دی۔ اسٹیڈیم میں موجود ہر شخص نے انہیں کھڑے ہو کر داد دی تھی۔ حتیٰ کہ انہیں تین دن سے آؤٹ کرنے میں ناکام ویسٹ انڈین کھلاڑی بھی تالیاں بجا رہے تھے۔ حنیف محمد ایک خواب کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔ گزشتہ تین دن میں وہ کتنے ہی جاں گسل مراحل سے گزر کر اس کامیابی تک پہنچے تھے۔

ٹرپل سنچری کے بعد حنیف کے بلے میں تیزی آ گئی اور کچھ دیر بعد انہوں نے سینڈہم کے 325 رنز کے ریکارڈ کو بھی توڑ دیا۔ ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کی بجھتی امیدوں نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔ ابھی چائے کے وقفے میں پون گھنٹا تھا اور کاردار آخری کھلاڑی تھے جو ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ کسی طرح باقی کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے فتح کی راہ ہموار کی جا سکتی تھی۔ کاردار نے حنیف کے پاس آ کر کہا۔

''حنیف! بس ذرا سا ہی فاصلہ رہ گیا ہے' پوری احتیاط سے کھیلو۔''

حنیف اس معاملے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ بے شک انہیں لین ہٹن کا ریکارڈ توڑنے میں پورا دن لگ جائے مگر انہیں کوئی غلط شاٹ نہیں کھیلنا تھا۔ چائے کے وقفے تک کھیل کر کاردار اور حنیف نے ویسٹ انڈیز والوں کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پاکستان کا اسکور 623 رنز ہو چکا تھا اور اس کی صرف پانچ وکٹیں گری تھیں۔ گویا اسے ویسٹ انڈیز پر ڈیڑھ سو سے زائد رنز کی برتری حاصل ہو چکی تھی۔ حنیف اس وقت 331 رنز پر کھیل رہے تھے یعنی بریڈمین کے ریکارڈ سے 3 رنز والی ہیمنڈ کے ریکارڈ سے 15 رنز اور لین ہٹن کے ریکارڈ سے چونتیس رنز دور تھے۔ اس وقت تک انہیں کھیلتے

ہوئے سولہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔

ڈریسنگ روم میں تقریباً ہر فرد نے گلے لگا کر حنیف کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی تلقین کی کہ پوری احتیاط سے کھیلیں۔ کوئی غلط شاٹ نہ ماریں کیونکہ ابھی پورے دو گھنٹے کا کھیل باقی تھا' جس میں تینتیس رنز آسانی سے بنائے جا سکتے تھے۔ حنیف حسب عادت خاموشی سے سب کی سنتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ تین دن کی تھکن اب ان کی پور پور میں بس گئی تھی لیکن وہ اپنی قوت ارادی اور کڑی ورزش کی وجہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ بارباڈوز کے عوام پہلے ہی انہیں جن تسلیم کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں اتنی دیر تک وکٹ پر کھڑے ہو کر بالروں کا مقابلہ کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہو سکتا ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد دھڑکتے دل اور آنے والے وقت کے خیال سے امید و یاس میں ڈوبتے ابھرتے حنیف محمد وکٹ پر پہنچے۔ تماشائیوں نے پرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ کاردار مسلسل ان کی ہمت بندھا رہے تھے۔ کھیل شروع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی حنیف محمد بریڈمین کے ریکارڈ سے آگے نکل چکے تھے اور اب ان سے آگے دو ہی نام تھے' سر لین ہٹن اور والی ہیمنڈ۔ اسے عبور کر کے وہ کرکٹ میں سب سے بڑی اننگ کھیلنے کا اعزاز حاصل کر سکتے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ان کا اسکور 337 رنز ہوا تھا یعنی ہیمنڈ سے ایک رن آگے کہ ایک گیند ان کے بلے کے کنارے پر لگی اور سیدھی وکٹ کیپر الیگزینڈر کے ہاتھوں میں جا کر محفوظ ہو گئی۔ یہ واقعہ اتنا اچانک پیش آیا کہ خود بالر اور وکٹ کیپر بھی ششدر رہ گئے تھے۔ سارا اسٹیڈیم سکتے میں تھا' کسی کو حنیف محمد کے آؤٹ ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ خود حنیف محمد بھی کتنی دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے پھر انہوں نے دھیرے دھیرے ڈریسنگ روم کی طرف چلنا شروع کر دیا اور پھر سکتہ ٹوٹا تو اسٹیڈیم تالیوں کے شور سے گونج اٹھا تھا۔ ہر شخص پوری شدت سے تالیاں بجا رہا تھا۔ حنیف کو ان کی اس میراتھن اننگ پر خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ ویسٹ انڈیز کے سارے کھلاڑی حنیف کو باؤنڈری لائن تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ ڈریسنگ روم میں ان کے ساتھی بیک وقت خوش بھی تھے اور ان کے عالمی ریکارڈ کو نہ توڑنے پر افسردہ بھی۔

حنیف کے اس کارنامے کی خبر ساری دنیا میں پھیل چکی تھی اور انہیں ہر جگہ سے مبارک باد کے تار اور پیغامات آ رہے تھے۔ بارباڈوز کی عوام نے اسی شام ایک ریلی نکال کر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ حنیف اگرچہ لین ہٹن کا 364 رنز کا عالمی ریکارڈ نہیں توڑ سکے تھے لیکن انہوں نے اس اننگ میں تقریباً ایک ہزار منٹ وکٹ پر کھڑے رہ کر ایسا عالمی ریکارڈ قائم کیا جس کے ٹوٹنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ ریکارڈز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں مگر حنیف کے اس ریکارڈ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کرکٹ کی رہتی تاریخ تک ناقابل شکست ہی رہے گا۔

اس اننگ میں حنیف نے مزید کئی ریکارڈز میں اپنا نام درج کرائے۔ اس اننگ میں انہوں نے ریکارڈ بالیں کھیلیں۔ مسلسل چار وکٹ کی سنچری پارٹنرشپ قائم کی۔ پاکستان نے 657 رنز بنائے۔ دوسری اننگ میں یہ کسی بھی ٹیم کا ریکارڈ ہے۔ حنیف نے مسلسل چار دن تک وکٹ پر رہنے کا منفرد اعزاز بھی حاصل کیا جو ان کے علاوہ کسی اور بلے باز کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ پاکستان نے اس میچ میں یہ ریکارڈ بھی بنایا کہ اس کی دونوں اننگز میں 551 رنز کا فرق تھا۔ آج تک ٹیسٹ کھیلنے والی کسی ٹیم کی ایک میچ کی دو اننگز میں اتنا بڑا فرق نہیں آیا۔ (یہ تمام ریکارڈز چالیس سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک قائم ہیں) حنیف محمد نے اس ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں کل 349 رنز بنائے جو پاکستان کی طرف سے ریکارڈ ہے۔ حنیف محمد اولین کھلاڑی تھے جنہوں نے اپنی پہلی ہی سنچری ٹرپل سنچری کی صورت میں بنائی۔

اگرچہ رنز کے لحاظ سے حنیف محمد کا 337 رنز کا ریکارڈ اب خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور کئی کھلاڑیوں کے نام ان سے آگے جا چکے ہیں لیکن ٹرپل سنچری بنانے والے کسی بلے باز نے اننگ کی شکست کے دباؤ' غیر ملکی سرزمین اور جانب دار امپائروں کے ہوتے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بریڈمین اور آسٹریلیا کے ہی مارک ٹیلر نے بھی غیر ملکی سرزمین پر ٹرپل سنچریاں بنائیں لیکن انہیں ماحول سازگار ملا تھا اور انہیں امپائروں سے بھی کوئی خوف نہیں تھا اور پھر حنیف کی طرح طویل ترین وقت تک وکٹ پر کھڑے رہنے کا اعزاز تو کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ صرف یہی ایک اننگ حنیف محمد کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

قتل گاہیں

کاشف زبیر

ظلم وناانصافی پوری دُنیا کا مُستقل موضوع ہے۔ یہ جہاں بھی ہو وہاں عبرت ناک کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ کمبوڈیا بھی ایک ایسا ہی مُلک ہے جہاں ظلم وتشدد کا بازار گرم رہا ہے مگر اس صُورتِ حال میں بھی کوئی سرپھرا امن وانصاف کی شمع روشن کرنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ ایسے ہی ایک سرپھرے کی یادداشت،

آج کی مہذب دُنیا کے تاریک ترین گوشوں کی رُونمائی

ڈتھ پران لاس اینجلس کے فنرل چیپل کے عظیم ہال میں ایک تابوت کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کا سامنے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس تابوت میں اس کا بہترین دوست ہینگ نگور لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ابھی مرنے کی عمر نہیں تھی لیکن وہ مرگیا تھا۔ اسے اس کے گھر کے سامنے شوٹ کردیا گیا تھا۔ ڈتھ پران اور ہینگ نگور کی زندگی میں متعدد مواقع ایسے آئے تھے جب انہیں یقینی موت نظر آرہی تھی لیکن وہ ہمیشہ بچ نکلے تھے اور اب جب ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ موت اچانک ہی نگور کو اچک کرلے گئی تھی۔

۸ مارچ ۱۹۹۶ء کی صبح گرجا گھر کے باہر ہزاروں سوگوار جمع تھے۔ عجیب اتفاق تھا' عین اسی وقت ایک ٹی وی چینل سے ہینگ نگور کی ایوارڈ یافتہ فلم "دی کلنگ فیلڈ" دکھائی جارہی تھی۔ یہ فلم ڈتھ پران کی زندگی پر بنی تھی۔ جو تابوت کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا کردار ادا کرنے والا شخص ڈاکٹر

سرجن ہینگ نگور ہمیشہ کی نیند سوچکا تھا۔ اس فلم کا ایک سین پوسٹر بنانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جب کمبوڈیا کے کھمروج گوریلوں نے ڈتھ پران کو چاولوں کے کھیت میں گھٹنوں کے بل زمین پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گوریلے اس کے سر پر رائفل تانے کھڑے تھے۔ اس کے کپڑے چیتھڑے ہوچکے تھے۔ جن سے اس کا زخم زخم بدن جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مظلومیت اور خوف کا جو تاثر تھا اسے صرف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہینگ نگور کو دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ ایک آفتوں کے مارے جنگی قیدی کا کردار اس نے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں اس نے بیک وقت دو کردار ادا کیے تھے ایک اپنا اور دوسرا ڈتھ پران کا تھا۔ جو درحقیقت ایک ہی کردار تھا۔ دونوں میں بلا کی مماثلت تھی۔ وہ ایک جنگ زدہ ملک کے باسی تھے۔ جن کی پہلی ملاقات اپنے وطن سے ہزاروں میل دور امریکا میں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک ساتھ جان بچانے کی جدوجہد کی ہو۔ ان کے خواب مشترکہ تھے۔ وہ اپنے ملک کو امن کی سرزمین دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں ہر روز بے حساب لوگ مر رہے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ انہیں کیوں قتل کیا جارہا تھا اور مارنے والے بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں قتل عام کررہے تھے۔ لاکھوں افراد جان بچانے کے لیے پڑوسی ملک کا رخ کررہے تھے اور اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اپنے ہی ملک میں قیدی بن کر رہ رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف قاتل دندنا رہے تھے اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اگلے روز تک زندہ بھی رہے گا یا اس کی لاش کسی میدان میں چیل کووں اور جنگلی جانوروں کی خوراک بن رہی ہوگی۔ ان میں ہینگ نگور بھی تھا اور ڈتھ پران بھی۔

○☆○

جب کارل مارکس کمیونزم کا نظریہ وضع کررہا تھا تو شاید اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ قوموں کے حق میں یہ کس قدر تباہ کن ثابت ہوگا۔ لاکھوں نہیں کروڑوں افراد اس نظریے کے پیرو کاروں کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور مزید بدقسمتی کہ مارے جانے والے اکثر اپنے ہی ہم وطنوں کا نشانہ بنے تھے۔ سرمایہ داری نے تیسری دنیا کے غریب ملکوں کا استحصال کیا مگر ساتھ ہی انہیں نئی تہذیب کی روشنی بھی دی مگر کمیونزم نے اپنے ہی لوگوں کو نشانہ بنایا۔ انہیں دیا کم مگر ان سے سب چھین لیا۔ انہیں مشینی غلام بنالیا' جس کی سوچ تک اس کی اپنی نہیں رہتی۔

یورپ' ایشیا اور افریقہ کے جن ملکوں میں کمیونزم کی تحریک نے سر اٹھایا۔ ان ممالک کی سرزمین اس کے اپنے ہی عوام کے خون سے لالہ زار ہوگئی۔ پولینڈ' چیکوسلواکیہ' رومانیہ' مشرقی جرمنی' ویت نام' کوریا' لاؤس اور سب سے بڑھ کر کمبوڈیا جو اب تک کمیونزم کے "ثمرات" سے فیض یاب ہورہا ہے۔ افغانستان آج بھی بربادیوں سے دوچار ہے اور خود روس جو کمیونزم کا بانی تھا۔ ابھی تک اس کی آہنی گرفت سے نہیں نکلا ہے۔

مشرق بعید کے دیگر ممالک کی طرح کمبوڈیا بھی مخلوط النسل ملک ہے۔ یہاں مقامی نسلوں کے علاوہ چین سے ہجرت کرکے آنے والے کھمروج قبائل بھی آباد ہیں۔ ان کی زیادہ آبادی جنوب مشرقی حصے میں ہے۔ فطرتاً جنگ جو مزاج کھمروج مشرق بعید کے سب سے سفاک کمیونسٹ ثابت ہوئے تھے۔ ان کی قیادت پول پوٹ جیسا خوں خوار شخص کررہا تھا۔ جس کی درندگی کے آگے ہٹلر بھی شرم سار نظر آتا ہوگا۔ اس شخص نے بغیر کسی وجہ کے اپنے ہی ملک کے سترہ لاکھ بے گناہ عوام کو بے دریغ قتل کیا۔ کھمروج گوریلے جب چاہتے اور جسے چاہتے۔ گولی سے اڑا دیتے۔ انہوں نے چاول کے کھیتوں کو انسانوں کی قتل گاہیں بنا دیا تھا۔ جہاں بوڑھوں' بچوں' جوانوں' مردوں اور عورتوں کو بلا تخصیص قتل کردیا جاتا تھا۔

جب چین سے کمیونسٹ تحریک مشرق بعید کے دیگر ممالک تک پہنچی تو موقع پرست لیڈروں نے آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہا کیونکہ اس تحریک میں انہیں اپنے عزائم کی کامیابی نظر آرہی تھی۔ انہوں نے مغرب نواز حکومتوں اور بادشاہوں کے خلاف جدوجہد کا نعرہ لگایا اور عوام کو بھڑکانے لگے۔ ان کی لگائی آگ پر جلتی کا کام اسلحے کی فراوانی نے کیا۔ کسی بھی انقلاب کو اگر اسلحے کا سہارا مل جائے تو اس کی مثال جنگل کی آگ کی سی ہوجاتی ہے۔ جو چشم زدن میں سب جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔ بدقسمتی سے کمبوڈیا کے پاس ہی ویت نام میں کمیونزم کی تحریک نے کامیابی حاصل کی تھی۔ امریکا اور اس کے حواری اپنی فوجی طاقت کے زعم میں ایسی شکست سے دوچار ہوئے کہ جدید تاریخ میں اس کی مثال بن گئی۔ ایک جھوٹا نظام محض اس لیے فائح رہا کہ اس کی پشت پر عوام تھے۔ ویت کانگ اور کھمروج میں ابتدا سے نظریے کا اشتراک تھا۔ اس بنا پر کھمروج کو اسلحہ بھی ملا اور تربیت بھی۔ ان کی قیادت پول پوٹ کررہا تھا۔

جب کھمروج نے خاطر خواہ طاقت حاصل کرلی تو وہ بظاہر حکومت کے خلاف اور درحقیقت ملک کے عوام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک کامیاب لیڈر کی طرح پول

پوٹ نے نوجوانوں بلکہ کم سن بچوں کو اپنی فوج میں شامل کیا۔ عقل سے دور یہ جوشیلے جاں نثار اس کے اشارے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ سیکڑوں افراد کی جان بھی لے سکتے تھے اور اپنی جان بھی دے سکتے تھے۔ ابتدا میں ان کی قتل و غارت گری کا نشانہ دیہات بنے۔ کھمروج گوریلے طوفان کی طرح ان پُرامن دیہاتیوں پر نازل ہوئے، انہیں خاک و خون میں نہلا کر اور ان کے آشیانوں کو نظرِ آتش کر کے چلے جاتے۔ خوف زدہ لوگ دارالحکومت فنوم پنہہ اور دوسرے بڑے شہروں کا رخ کرنے لگے۔ جہاں مغرب نواز صدر سون نول کی حکومت تھی۔ اس کی فوج کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا لیکن یہ ہمت اور حوصلے سے تہی دست تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر سون نول کی حکومت صرف چند علاقوں تک محدود رہ گئی اور کھمروج ملک کے بڑے حصے پر قابض ہوگئے لیکن وہ جانتے تھے کہ فنوم پنہہ پر قبضہ کیے بغیر ان کی کامیابی ادھوری تھی۔ لہٰذا رفتہ رفتہ وہ دارالحکومت کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

○☆○

۱۷ اپریل ۱۹۷۵ء کمبوڈیا کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا۔ جب باغی کھمروج دارالحکومت میں داخل ہوگئے اور صدر سون نول کا تختہ الٹ دیا۔ اس روز عوام ڈرے سہمے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر نوعمر کھمروج گوریلے دندناتے پھر رہے تھے۔ سماعتوں میں ان کے وحشت ناک نعرے گونج رہے تھے۔

”انقلاب کا استقبال کرو!“

کھمروج پورے ملک پر چھاگئے تھے اور اس خوشی میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ برسوں جنگلوں میں گزارنے کے بعد انہیں کسی شہر میں آنا نصیب ہوا تھا۔ گھر، کوٹھیاں، بنگلے، ہوٹل، سینما گھر اور تفریح گاہیں ان کے لیے نئی چیز تھیں۔ جو اس سے پہلے انہیں نہیں ملی تھی۔ لہٰذا یہ سب ان کی نفرت کا نشانہ بن رہے تھے۔ وہ گھروں میں گھس کر انہیں لوٹ رہے تھے۔ ان کے مکینوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے اور انہیں قتل کر رہے تھے۔

ہنگ نگور ملٹری اسپتال کے آپریشن روم میں ایک مریض کے پیٹ کا آپریشن کر رہا تھا۔ جب دو نوعمر کھمروج گوریلے اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھ میں خود کار رائفلیں تھیں۔ نگور اور اس کے ساتھی دم بخود رہ گئے تھے۔

”تم ڈاکٹر ہو؟“ ایک گوریلے نے رائفل لہرا کر پوچھا۔

اس دوران میں نگور اپنے اوزار رکھ چکا تھا۔ آپریشن مکمل تھا اور مریض کا پیٹ سیا جا رہا تھا۔ نگور نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں۔ ڈاکٹر ابھی ایک منٹ پہلے جا چکا ہے۔“

”لعنت ہو!“ گوریلا چلایا ”مجھے فوراً ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”افسوس کہ تم نے ذرا سی تاخیر کردی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جا کر ڈاکٹر تلاش کرتا ہوں۔ اگر ڈاکٹر نہیں ملا تو میں واپس آکر تم سب کو قتل کردوں گا۔“

ان کے جاتے ہی نگور نے اپنے عملے سے کہا ”فرار ہو جاؤ، ورنہ یہ سچ مچ ہمیں قتل کردیں گے۔“

مریض پہلے ہی بھاگ چکے۔ کچھ دیر بعد عملہ بھی نکل گیا اور پیچھے صرف ویران اسپتال رہ گیا تھا۔

○☆○

عین اسی وقت بتیس سالہ ڈتھ پران ایک دوسرے اسپتال میں تھا۔ نیویارک ٹائمز کا رپورٹر سڈنی شین برگ اسپتال میں داخل مریضوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ ڈتھ پران امریکن سفارت خانے کے عملے میں شامل تھا اور اس وقت بطور مترجم شین برگ کے ساتھ تھا۔ اسے ویسے بھی صحافت سے دلچسپی تھی۔ ان کے ساتھ دو غیر ملکی یورپین اور بھی تھے۔ یہ بھی صحافی تھے۔ کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ کھمروج گوریلے اسپتال کی طرف آ رہے ہیں تو افراتفری مچ گئی۔

”ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ پران نے

کہا۔
پران کی کار ابھی اسپتال سے کچھ ہی دور گئی تھی کہ سامنے سے کھمروج نے انہیں روک لیا۔ ان میں سے کوئی چیخا۔
"یہ امریکن ہیں۔ پکڑو انہیں۔"
اگلے ہی لمحے وہ متعدد رائفلوں کی زد میں تھے۔ انہیں کار سے باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ وہ سروں پر ہاتھ رکھ کر باہر آگئے۔ موت انہیں سامنے نظر آرہی تھی۔ اس موقع پر ڈتھ پران نے ہمت سے کام لیا۔ اس نے گوریلوں سے کہا۔
"یہ فرانسیسی صحافی ہیں اور یہاں تم لوگوں کی فتح کی کوریج کرنے آئے ہیں۔"
ظاہر ہے گوریلے اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی اور ان کے سامان کی تلاشی لی۔ ان کے پاس کیمرے اور ریکارڈر تھے۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ صحافی تھے۔ خوش قسمتی سے ان میں سے کسی کو انگریزی پڑھنی نہیں آتی تھی ورنہ شین برگ اور دوسرے صحافیوں کے ریکارڈ ان کا بھانڈا پھوڑ دیتے۔ تقریباً گھنٹے بھر کی بحث کے بعد کھمروج نے انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔
انہوں نے فوراً فرانسیسی سفارت خانے کا رخ کیا۔ جو اس وقت پورے کمبوڈیا میں سفید فاموں کی واحد پناہ گاہ تھا۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک کے سفارت کار پہلے ہی کمبوڈیا سے نکل چکے تھے۔ حالانکہ جب ویت کانگ گوریلے ہوچی منہ سٹی (اس وقت کے سائیگان) میں داخل ہوئے تب بھی امریکی اور یورپی سفارت کار وہاں موجود تھے لیکن کھمروج کی وحشت خیزیوں کی داستانیں اتنی ہولناک تھیں کہ امریکا اور دیگر یورپی ممالک نے اپنے سفارت کاروں کی جان خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔
فرانسیسی سفارت خانہ اس وقت مہاجر کیمپ بنا ہوا تھا۔ جس میں یورپ اور امریکا سے تعلق رکھنے والے تاجر، سیاح اور صحافی شامل تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سفارت خانے کا لان بھی ان سے بھرا ہوا تھا۔ ڈتھ پران خود بھی امریکی سفارت خانے میں رہتا تھا اور اس کے امریکیوں سے تعلقات کے بارے میں بہت سارے افراد جانتے تھے۔ اسے خطرہ تھا جیسے ہی یہ بات کھمروجز کے علم میں آئے گی۔ اسے مع بیوی بچوں کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا لہٰذا جب امریکی سفارت کار اور ان کا عملہ جانے لگا تو پران نے اپنے بیوی بچوں کو بھی ان کے ساتھ کردیا۔ مگر خود امریکیوں کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔
"ابھی اس ملک کو اور بہت سارے لوگوں کو میری ضرورت ہے۔" ڈتھ پران نے کہا۔
ابھی انہیں سفارت خانے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کھمروج نے سفارت خانے کا محاصرہ کرلیا۔ انہوں نے تمام کمبوڈین افراد کو سفارت خانے سے باہر آنے کا حکم دیا۔ بصورت دیگر انہوں نے سفارت خانے کی تلاشی لینے کی دھمکی دی تھی۔ مجبوراً فرانسیسی سفارت خانے نے تمام کمبوڈین افراد کو سفارت خانے کی حدود سے نکال دیا۔ خوش قسمتی سے کھمروج نے ان افراد کو گرفتار نہیں کیا۔ یوں ڈتھ پران کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب وہ کہاں جائے۔ اس کا آبائی گاؤں سیم ریپ ملک کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔ پران نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ علاقہ بہت عرصے سے کھمروج کے قبضے میں تھا اور پران کو قطعی خبر نہیں تھی کہ اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر کیا گزری تھی۔
راستے میں متعدد مقامات پر قائم کھمروج چیک پوسٹوں پر اسے روکا گیا۔ اس نے خود کو فنوم پنہہ کا ایک ٹیکسی ڈرائیور ظاہر کیا۔ جس کی ٹیکسی فسادات میں تباہ ہوگئی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کی بیوی سرمون اور چار بچے کمبوڈیا سے نکل چکے تھے ورنہ وہ اس کا بھانڈا پھوڑ دیتے۔ وہ دس سال سے امریکی سفارت خانے کے عملے کے ساتھ رہتے آرہے تھے اور کسی طرح ایک ٹیکسی ڈرائیور کے بیوی بچے نہیں لگتے تھے۔ اگر وہ اس کے ساتھ ہوتے تو اسے پکڑوا دیتے، گرفتاری کے بعد جلد یا بدیر یہ راز کھل ہی جاتا کہ اس کا تعلق امریکی سفارت خانے سے تھا۔ جب ڈتھ پران اپنے گاؤں کی طرف جارہا تھا تو اس نے دو ملین سے زیادہ افراد کو سڑک کے راستے تھائی لینڈ کی طرف جاتے دیکھا یہ وہ بدنصیب تھے جو اپنے وطن میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں بے وطن ہوگئے تھے۔
بارشوں اور ٹریفک کے بوجھ سے ٹوٹی پھوٹی سڑک پر یہ افراد پیدل اور گاڑیوں میں سفر کررہے تھے لیکن گاڑیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ کھمروج لیڈروں نے ہر سواری قومی ملکیت میں لے لی تھی۔ ان میں سائیکل جیسی معمولی سواریاں بھی شامل تھیں کھمروج ہر اس شخص کو گرفتار کررہے تھے۔ جس کے پاس گاڑی تھی۔ دہشت کے مارے لوگ گاڑیاں چھوڑ کر پیدل سفر کررہے تھے۔ وہ بھرے پرے گھر چھوڑ کر نکل آئے تھے اور اب اپنے مختصر سامان سے بھی محروم ہوتے جارہے تھے۔ کھمروج گوریلے سامان کی تلاشی کے دوران میں ہر پسندیدہ چیز اپنے پاس رکھ لیتے اور جو سامان کو جان سے عزیز رکھتے تھے۔ انہیں بے دریغ قتل کردیتے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب جابجا لاشیں بکھری

ہوئی تھیں۔ ان بد نصیبوں کی لاشیں آخری رسومات سے محروم ہو کر گدھوں کی خوراک بن رہی تھیں۔

○☆○

عین اس وقت ہینگ نگور بھی اپنے گاؤں کی طرف محو سفر تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنی حسین منگیتر چینگ مائی ہوئی کی فکر بھی تھی۔ گاؤں تباہی و بربادی کی تصویر بن چکا تھا۔ اس کے گھر والوں کا کوئی پتا نہیں تھا اور جو ان کے بارے میں بتا سکتے تھے۔ وہ خود لاپتا تھے یا کھمروج کے مشقتی کیمپوں میں بیگار کر رہے تھے۔ راستے میں چیک پوسٹوں پر نگور نے بھی پران کی طرح اپنا پیشہ ٹیکسی ڈرائیور بتایا تھا۔ گاؤں پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی اسے سامرونگ ینگ کے علاقے میں ایک کان میں بھیج دیا گیا۔ بعد میں وہ چاول لگانے والے عملے میں شامل ہو گیا تھا اور یہاں ہوئی کو دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کی عزیز از جان ہوئی زندہ تھی تو کوئی غم اس کے لیے غم نہیں تھا اور کوئی تکلیف، تکلیف نہیں تھی۔

کھمروج اقلیت میں تھے لیکن طاقت کے بل بوتے پر انہوں نے اکثریت پر غلبہ پالیا تھا اور اب انہیں بے دردی سے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اب ہر کام کے لیے بیگار لیا جاتا تھا اور اس کے بدلے کھمروج انہیں صرف اتنا دیتے تھے جس سے جسم و جاں کا رابطہ بہ مشکل برقرار رہ سکے۔ نگور اور ہوئی صبح سورج طلوع ہونے سے لے کر رات تاریکی پھیلنے تک چاولوں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے اور سارا دن میں انہیں دو چھوٹے پیالے ابلے ہوئے چاول کے ملتے تھے۔ یہ خوراک نہ ہونے کے برابر تھی۔ بھوک کے مارے وہ کھیتوں میں ملنے والی چھپکلیاں، چوہے اور کیڑے مکوڑے تک کھا جاتے تھے۔ ایسی خوراک کی وجہ سے نگور کی حالت بگڑ گئی اور اسے مسلسل دستوں نے کمزور کر دیا تھا۔ محض چند دنوں میں اس کا وزن ایک سو ساٹھ سے گھٹ کر نوے پونڈ رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ اس کے جسم سے اکثریت پانی اور حیات بخش نمکیات خارج ہو چکے تھے اور وہ موت کی دہلیز پر تھا۔ ایک روز اس نے ہوئی سے کہا "میں مرنے والا ہوں۔"

ہوئی اب تک بہادری سے مقابلہ کرتی آ رہی تھی لیکن نگور کی بات نے اسے بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے کہا "یاد رکھو اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔"

وہاں کسی قسم کی کوئی دوا نہیں تھی۔ صرف نمک دستیاب تھا۔ جسے ہوئی پانی میں ڈال کر نگور کو پلاتی رہی تھی پھر غیر متوقع طور پر کھمروج انہیں قلیل مقدار میں گوشت اور سبزیاں بھی دینے لگے تھے۔ ہوئی خود بھوکی رہتی اور اپنے حصے کے گوشت اور سبزیوں سے سوپ بنا کر نگور کو دیتی رہی۔ اس سے اس کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہونے لگی تھی۔ دراصل ملک کی آبادی کے بڑے حصے کے فرار ہونے اور سترہ لاکھ افراد کے مارے جانے کے بعد ملک میں لیبر فورس کی کمی ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے کھمروج مجبور ہوئے تھے کہ وہ باقی ماندہ افراد کو زندہ رکھیں۔ ورنہ ان کے کھیتوں اور اسلحے کے کارخانوں میں کون کام کرتا۔ ان کے لیے سڑکیں اور پل کون بناتا۔

○☆○

ڈتھ کو اپنے ٹاؤن پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے ہی کھمروج نے اسے پکڑ کر ایک کیمپ پہنچا دیا تھا۔ وہاں ایک فاؤنڈری میں ملک بھر سے جمع ہونے والا لوہا اور ناکارہ گاڑیاں پگھلا کر اسلحہ تیار کیا جاتا تھا۔ ڈتھ دیکھ رہا تھا کہ کھمروج اس ملک کو ماضی میں لے جا رہے تھے۔ انہوں نے تمام اسپتال، اسکول اور کالج بند کر دیے تھے اور ان کا عملہ بیگار کیمپوں میں تھا یا قتل کر دیا گیا تھا۔ اسکول کے طلبا پڑھنے کے بجائے چاول کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ملک بھر کی منڈیاں اور مارکیٹیں بند کر دی گئی تھیں۔ کسی کو انفرادی طور پر کچھ بیچنے یا خریدنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنسی ختم کر دی گئی تھی اور تمام اشیاء حکومت یعنی کھمروج کے قبضے میں تھیں۔ کومیانے کی اس پالیسی کو "ان کاگا" کا نام دیا گیا تھا۔ اس لفظ کے معنی "صفر سال" کے ہیں۔ گویا کھمروج اس ملک کو صفر تک لے جانا چاہتے تھے۔

ڈتھ لوہاروں کے لیے کھانا تیار کرنے والے باورچی خانے میں کام کر رہا تھا لیکن کھمروج کی نگرانی اتنی کڑی تھی کہ مقرر کردہ خوراک کے علاوہ وہ چاول کا ایک دانا نہیں لے سکتا تھا اور خوراک اتنی ناکافی تھی کہ ڈتھ پران ہمہ وقت بھوکا رہتا تھا۔ مجبوراً وہ ہر وہ چیز کھا جاتا جو ذرا سی بھی کھانے کے قابل ہوتی تھی۔ ان میں جانور اور کیڑے مکوڑے بھی شامل تھے۔ ان کے کیمپ کے پاس ہی چاولوں کے کھیت تھے۔ جن میں نیم پختہ چاول آ گئے تھے۔ ایک رات پران خاموشی سے رینگتا ہوا کھیت تک گیا اور کچے چاول کھانے کے ساتھ توڑ توڑ کر اپنی جیبوں میں بھرنے لگا۔ جلدی میں وہ احتیاط کا خیال نہ کر سکا اور شور نے محافظوں کو اس کی طرف متوجہ کر لیا۔

"چور، خبردار گولی ماردوں گا۔" کوئی چلّایا۔

پران خوف کے مارے ایک ہی جگہ ساکت رہ گیا تھا اور گوریلوں نے اسے آرام سے پکڑلیا۔ اسے کیمپ کے میدان میں لایا گیا۔ وہاں متعدد گوریلے پہلے سے موجود تھے پھر سارے دن کے تھکے ہارے قیدیوں کو بے دار کرکے میدان میں لایا گیا۔ پران سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو ہونے والا ہے۔ وہ گوریلوں کے لیے تفریح کی حیثیت رکھتا تھا تو قیدیوں کے لیے باعث عبرت ہوتا۔ کیمپ کمانڈر نے تین نو عمر لڑکیوں اور تین لڑکوں کو الگ کیا اور وہ بھوکے کتوں کی طرح پران پر پل پڑے۔ ان کے پاس بانس تھے۔ جو بے دریغ پران کے ننگے بدن پر برس رہے تھے۔

"تم نے ان کا گا کی خلاف ورزی کی ہے۔ تمہیں مرنا پڑے گا۔" مارنے کے ساتھ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

جب وہ مارتے مارتے تھک گئے تو ایک درخت سے اس کے گھٹنے، پیر اور ہاتھ باندھ دیے گئے۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ صبح اسے شوٹ کردیا جائے گا۔ پران سمجھ رہا تھا کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے۔ لہٰذا وہ زیرلب دعائیں مانگتا رہا کہ بدھا اسے اگلا جنم کسی اچھی صورت میں دے۔ وہ بدھسٹ تھا۔ امن و آشتی کا پیروکار۔ بدھ مت کمبوڈیا کا اکثریتی مذہب ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بدھا کی مہربانی سے زندہ بچ گیا تو دنیا کو بتائے گا کہ کھمروج اس کے ملک اور اس کی قوم کے ساتھ کیا کررہے تھے۔

اگلی صبح کھمروج نے اس کی جاں بخشی کردی۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ اگر وہ دوبارہ کسی غلطی میں ملوث پایا گیا تو اسے بے دریغ قتل کردیا جائے گا۔ پران نے اس لمحے فیصلہ کرلیا کہ وہ موقع ملتے ہی کیمپ سے فرار ہوجائے گا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر وہ زیادہ دن یہاں رہا تو کسی نہ کسی بہانے موت اسے اچک کرلے جائے گی۔ کھمروج کی بندوق سے نہ سہی۔ وہ بھوک سے مرجائے گا۔ اسے اکثر اپنے بیوی بچے یاد آتے تھے۔ جو امریکا میں تھے اور نہ جانے کس حال میں تھے اگر وہ مرجاتا تو نہ جانے ان کا کیا ہوتا۔ سرمون اکیلی چار بچوں کی پرورش کیسے کرے گی۔ جن میں سب سے بڑا بھی ابھی چھ سال کا تھا۔

○☆○

نگور اب ٹھیک تھا اور حسب سابق چاول کے کھیتوں میں کام کررہا تھا۔ اس نے ہوئی سے شادی کرلی تھی۔ ویسے بھی وہ دن رات اس کے ساتھ رہتی تھی۔ نگور کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس سے دور رہ سکتا۔ چنانچہ گناہ سے دامن بچانے کے لیے اس نے ہوئی کو اپنالیا۔ ان کی شادی ایک طرح کی کورٹ شپ تھی کیونکہ کھمروج نے تمام مندر بھی بند کردیے تھے۔ ان کے پجاری اور لاما قتل کردیے گئے تھے یا وہ بھی بیگار کیمپوں میں تھے۔ یہ شادی عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ نہ نگور کے خاندان کا پتا تھا اور نہ ہوئی کے گھروالوں کا۔ ممکن ہے وہ ماردیے گئے ہوں یا موت سے بدتر حالات میں جی رہے ہوں۔ خود ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ انہیں صبح سے شام تک زندگی کا بھروسا نہیں تھا۔ ان کے چاروں طرف موت تھی، تشدد تھا۔ بھوک تھی اور انسانیت کی بے قدری تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو پاکر خوش تھے۔

پچھلے کچھ عرصے سے نگور محسوس کررہا تھا کہ کھمروج اس کے ماضی کے بارے میں متشکک ہوگئے تھے۔ اس نے اپنا پیشہ ٹیکسی ڈرائیور بتایا تھا لیکن وہ کہیں سے ایک ٹیکسی ڈرائیور نہیں لگتا تھا۔ اس کی صورت اور اس کی گفتگو ایک پڑھے لکھے شخص کی سی تھی اور یہی چیز کھمروج کو شک میں ڈال رہی تھی۔ ایک روز جب نگور چاول کے کھیت کے ساتھ اگی گھاس صاف کررہا تھا۔ دو نو عمر گوریلے آئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے نگور کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ پہلے اسے لاتیں اور گھونسے مارے اور پھر پوچھا۔

"تمہارا پیشہ کیا تھا؟"

"ڈرائیور، میں ٹیکسی چلاتا تھا۔"

"ٹیکسی کس کی تھی، اس کا نمبر کیا تھا؟"

"ٹیکسی کرائے کی تھی۔ نمبر مجھے یاد نہیں ہے۔"

"ٹیکسی کس کی تھی؟" ایک گوریلے نے پوچھا تو نگور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ حالانکہ سیدھا سا جواب یہ ہوتا کہ ٹیکسی اس کی اپنی تھی اور ہنگاموں میں جلادی گئی یا چھن گئی۔

"مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ ٹیکسی میرا ایک ساتھی کرائے پر لیتا تھا اور مجھے چلانے کو دیتا تھا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" گوریلے نے غضب ناک ہوکر کہا "خیر میرے پاس ایک طریقہ ہے۔ اگر تم سچے ہو تو سچ بولو گے۔"

اس نے ایک تیز دھار چاقو برآمد کیا اور نگور کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑلی "اب بھی وقت ہے۔ سچ بتادو۔"

"میں نے سچ کہا ہے۔" نگور نے دل کڑا کرکے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے سچ بول دیا تو وہ مارا جائے گا۔ ساتھ ہی ہوئی کو بھی اس کا راز چھپانے کے جرم میں عبرت ناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ وہ نازک سی

عورت تھی اور امید سے بھی تھی۔ وہ معمولی سا تشدد بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ گوریلے نے بلا تکلف اس کی انگلی کاٹ دی۔ درد سے وہ تڑپ اٹھا تھا لیکن اصل اذیت تو ابھی باقی تھی۔ گوریلوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے سامنے ایک عورت لائی گئی۔ جو نہ جانے کس جرم کی پاداش میں کیمپ لائی گئی تھی اور اس کے بعد سے کھمروج گوریلوں کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ حاملہ تھی اور آخری دنوں سے تھی۔

"اب بھی وقت ہے بتادو۔ ورنہ جو سلوک اس عورت سے ہوگا۔ وہی تمہاری بیوی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد بغیر کسی وارننگ کے گوریلے عورت پر ٹوٹ پڑے۔ نگور نے اس انسانیت سوز تماشے سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن عورت کی دلدوز چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ اپنے کان نہیں بند کرسکتا تھا۔ وہ دعا کررہا تھا کہ یا تو اسے موت آجائے یا عورت مرجائے۔ جسے نہ جانے کس جرم کی پاداش میں سزا دی جارہی تھی۔ آخر خدا نے اس کی سن لی۔ پہلے اس عورت کا حمل ساقط ہوا۔ وہ بچہ جسے دنیا میں آنا تھا۔ اس کی روح واپس خدا کے حضور جاکر شاید فریاد کناں تھی کہ اسے کس دنیا میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ عورت بھی مرگئی۔ اس کی آواز تھمی تو نگور نے بے پناہ سکون محسوس کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ مرنے والی عورت نے کیمپ کمانڈر پر الزام لگایا تھا کہ وہ اس کے بچے کا باپ تھا۔

گوریلوں نے تسلیم کرلیا کہ نگور سچ کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اسے کھول کر دوبارہ کیمپ بھیج دیا مگر اس کی بدقسمتی کہ ایک شخص نے اسے پہچان لیا اور شاید خوف کے مارے کھمروج کو بتا دیا کہ وہ ڈاکٹر تھا اور فنوم پنہہ کے ملٹری کے اسپتال میں کام کرتا تھا دو روز بعد ہی گوریلے نگور کو اس کی جھونپڑی سے کھینچ کرلے گئے۔ بے پناہ تشدد کے بعد اسے ایک کنویں نما گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ اس کنوئیں کی تہ میں کیچڑ جمع تھا۔ جس میں جونکیں تھیں اور بے شمار کیڑے مکوڑے، جن کے کاٹنے سے اس کا جسم سوج گیا تھا۔ جونکیں اس کا خون پی رہی تھیں۔ جنہیں وہ ہاتھ سے نوچ نوچ کر پھینکتا رہا لیکن ایک جونک الگ کرتا تو اس کی جگہ دوسری جونک چمٹ جاتی۔ یہی عذاب کم نہیں تھا کہ اوپر سے کھمروج گوریلوں نے ازراہ تفریح اس پر جلتی گھاس اور لکڑی کے ٹکڑے پھینکنا شروع کردیے۔ وہ ان سے بچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کے باوجود آگ نے اسے جگہ جگہ سے جلا دیا تھا۔ وہ چار دن تک بھوکا پیاسا عذاب کے اس گڑھے میں پڑا رہا۔ اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ اسے موت بھی یہیں آئے گی مگر گوریلوں نے اسے گڑھے سے نکال لیا ان کے خیال میں اس شخص نے جھوٹ بولا تھا۔ ورنہ نگور اتنی تکلیفوں کے بعد ڈاکٹر ہونے کا اعتراف کرلیتا۔ جب نگور کو وہاں سے لے جایا جارہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی مخبری کرنے والے کو اسی کنوئیں میں ڈالا جارہا تھا۔

کھمروج سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نگور نے محض اپنی بیوی کے لیے اتنی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ اگر وہ ڈاکٹر ہونے کا اعتراف کرلیتا تو اس کے ساتھ ہوئی کو بھی سزائے موت سنا دی جاتی۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے ہوئی کو بچانے کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ وہ امید سے تھی اور نگور کی مسلسل درخواستوں کے باوجود کیمپ کمانڈر نے اسے کام سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا تھا۔ ہوئی ساتویں مہینے تک مسلسل چاول کے کھیتوں میں جاتی رہی۔ جہاں نئی پنیری لگائی جارہی تھی۔ ہوئی کے لیے یہ کام بے حد خطرناک تھا اور وہی ہوا جس کا نگور کو خطرہ تھا اس کی حالت بگڑ گئی۔ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس نہ تو آلات تھے اور نہ دوائیں۔ بس وہ اسے اپنے بازوؤں میں لیے بیٹھا رہا۔ ہوئی رفتہ رفتہ موت کے قریب ہورہی تھی۔ نگور اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا اور ہوئی اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کررہی تھی۔ اسے تسلی دے رہی تھی اور اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔

"وعدہ کرو کہ میرے بعد تم اپنا خیال رکھو گے۔"

"ایسی بات مت کرو۔ تم زندہ رہو گی۔ ورنہ میں بھی مرجاؤں گا۔"

"نہیں تم زندہ رہو گے۔" ہوئی نے مضبوط لہجے میں کہا "اور ظلم کی یہ داستانیں دنیا کے سامنے لاؤ گے۔ وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" نگور نے کہا۔

"اب میں سکون سے مرسکوں گی۔" ہوئی نے کہا "میری روح خوش ہوگی۔ جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگے۔ دنیا میرے اور میرے ہم وطنوں کے قاتلوں کے مکروہ چہرے دیکھ سکے گی۔"

نگور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ ہوئی اپنی دھن میں کہے جارہی تھی "تم یہاں سے موقع ملتے ہی بھاگ جانا، ورنہ یہ درندے تمہیں بھی ماردیں گے۔"

رات آہستہ آہستہ ختم ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ہوئی بھی شمع کی طرح پگھلتی گئی۔ صبح سے پہلے اس نے آخری

سانس لیا اور مرنے سے پہلے صرف اتنا کہا "اپنا خیال رکھنا میری جان!"

"میں زندہ رہوں گا۔ میرا وعدہ ہے۔ اپنے مشن سے پہلے نہیں مروں گا۔ میرا انتظار کرنا ہوئی۔"

صبح نگور نے کیمپ کمانڈر کی اجازت سے ہوئی کو ایک درخت کے سائے تلے دفن کردیا۔ آخری مذہبی رسومات کی گنجائش نہیں تھی۔ نگور کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ اس کی ہوئی کو دو گز زمین ضرور نصیب ہوگئی۔ ورنہ اس ملک کے لاکھوں بدنصیبوں کو یہ بھی نہیں ملی تھی۔ اسی شام سرکاری اہلکار نگور کے جھونپڑے سے ہوئی کا سامان سمیٹ کر لے گئے۔ جس میں اس کا آئی ڈی کارڈ بھی تھا۔ جس پر ہوئی کی مسکراتی تصویر لگی تھی۔ نگور نے درخواست کی کہ اسے یہ تصویر دے دی جائے کیونکہ یہ سوائے اس کے کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ کیمپ کمانڈر نے احسان کیا کہ یہ تصویر آئی ڈی کارڈ سے پھاڑ کر نگور کو دے دی گئی۔ جسے اس نے شیشے کے دو ٹکڑوں کے درمیان رکھ کر انہیں ڈوری سے باندھ کر گلے میں لاکٹ کی طرح لٹکالیا۔ اب اسے انتظار تھا کہ کب اسے فرار کا موقع ملے اور وہ اس ملک سے نکل کر اپنا مشن پورا کرسکے۔ دنیا والوں کو کھمر وج کی بربریت سے آگاہ کرے۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے دعا مانگتا۔

"مجھے زندہ رکھنا بدھا' جب تک میں اپنا کام نہ کرلوں۔"

○☆○

ڈتھ پران بھی زندہ رہنے کی جدوجہد کررہا تھا۔ ایک بار وہ کھمروج گوریلوں کی بربریت سے بچ گیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ قسمت بار بار مہربان نہیں ہوتی۔ کھمر وج جس شخص کے پیچھے پڑجاتے تھے۔ اسے مار کرہی چھوڑتے تھے۔ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں رہنے دیتے تھے جو ان کی وحشت کا نشانہ بن چکا ہو اور ان کے خلاف گواہی دے سکتا ہو۔ خوش قسمتی سے اس کے گاؤں سیم ریپ کا چیف اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اب وہ اس کے گھر میں بطور ملازم کام کررہا تھا۔ یہاں زندگی بیگار کیمپ سے صرف اس قدر بہتر تھی کہ اسے کسی قدر اچھا کھانے پینے کو مل رہا تھا اور دن میں اسے باہر جانے کی اجازت تھی۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اسے صرف اپنی ماں اور ایک بہن ملی تھی۔ اس کے بعد اسے اپنے گھر جانے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا باپ ۱۹۷۵ء میں مارا گیا تھا۔ جب کھمر وج گاؤں پر حملہ آور ہوئے تھے۔

۱۹۷۸ء کے دسمبر میں ویت نام نے کمبوڈیا پر حملہ کردیا تھا کیونکہ پول پوٹ اور اس کے ساتھیوں سے ویت کانگ کا تنازعہ ہوگیا تھا۔ ویت کانگ طوفان کی طرح آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کمبوڈیا پر قابض ہوگئے۔ ان کے فوجی دستے اور ٹینک فنوم پنہہ میں گھوم پھر رہے تھے۔

گاؤں کے چیف کے پاس ایک ریڈیو تھا۔ جس پر ڈتھ پران روزانہ وائس آف امریکا سے خبریں سنتا تھا۔ اس سے اسے علم ہوا کہ ویت نام نے کمبوڈیا پر حملہ کیا ہے۔ اس سے اگلے روز وہ فرار ہوگیا اور اس وقت تک جنگل میں چھپا رہا جب تک آخری کھمر وج بھی گاؤں سے نہیں نکل گیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی پول پوٹ اور اس کے ساتھی سرحد عبور کرکے تھائی لینڈ چلے گئے۔ جہاں پہلے ہی دو ملین سے زیادہ کمبوڈین پناہ گزین کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ اس آس میں کہ کبھی تو انہیں اپنے وطن جانا نصیب ہوگا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ جن لوگوں سے جان بچا کر وہ سرحد پار کرکے آئے تھے۔ اب وہ بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے سرحد پار کرکے تھائی لینڈ آرہے تھے۔ ظالم اور مظلوم ایک ہی صف میں آگئے تھے۔

اگرچہ اب کمبوڈیا پر ویت نام کا تسلط تھا لیکن یہ لوگ کمبوڈین عوام کے حق میں کھمر وج سے بہتر ثابت ہورہے تھے۔ انہوں نے عوام کو کسی قدر آزادی ضرور دی تھی۔ جب پران اپنے گاؤں پہنچا تو وہ تباہی و بربادی کا نمونہ بن چکا تھا۔ گوریلے جاتے جاتے بھی متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتار گئے تھے اور نصف سے زیادہ گاؤں نذر آتش کرگئے تھے۔ خوش قسمتی سے پران کی ماں اور بہن بچ گئی تھیں۔ البتہ اس کے تین بھائی اور تین بہنیں بدستور غائب تھے۔ تلاش بسیار کے بعد معلوم ہوا کہ کھمر وج اس کے بھائیوں کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس کی ایک بہن جو شادی شدہ تھی' شوہر اور دو بچوں کے ساتھ قتل کردی گئی تھی۔ صدمے سے چور پران نے لوگوں سے پوچھا۔

"میرے بھائی بہنوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

ایک عورت بولی "آؤ میں تمہیں ان کی قتل گاہیں دکھاؤں۔"

وہ پران کو گاؤں کے باہر ایک میدان تک لے گئی۔ جس کے وسط میں صاف زمین پر بے شمار انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کھمر وج اس جگہ کو قتل گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ پورے کمبوڈیا میں ایسی سیکڑوں قتل گاہیں تھیں۔ جہاں لاکھوں افراد کو ایک ساتھ کھڑا کرکے گولیوں

سے بھون دیا گیا تھا اور ان کی لاشیں یونہی گلنے سڑنے اور جانوروں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں۔ کچھ دنوں بعد وہاں صرف ہڈیاں ہی رہ جاتی تھیں۔ پران روتے ہوئے ان ہڈیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔ میری بہنیں ہیں۔" اس نے سوچا "آخر ان کا قصور کیا تھا۔"

یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ کھمروج نے آخر کس لیے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جہاں تک سیاسی غلبے کا تعلق تھا تو وہ ملک پر پوری طرح قابض تھے پھر انہوں نے بلاوجہ کا قتل عام کیوں کیا۔ وہ بھی اپنے ہی ہم وطنوں کا۔ ان کی اس بربریت اور سفاکی کی خود کمیونسٹ ملکوں نے مذمت کی تھی۔ خود معتدل کھمروج بھی پول پوٹ اور اس کے جنونی ساتھیوں کے مخالف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں ملک چھوڑنا پڑا اور آج بھی کمبوڈیا پر کھمروج ہی مسلط ہیں لیکن پول پوٹ کا دور ماضی کی بات بن چکا ہے۔

○☆○

ہینگ نگور ہوئی کی موت کے بعد سے بالکل بجھ گیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کام کرتا اور اپنا راشن وصول کرکے جھونپڑی میں آجاتا۔ اس کے ذہن میں مسلسل ہوئی کے الفاظ گونج رہے تھے کہ وہ دنیا کو ان قاتلوں کا اصل چہرہ دکھائے۔ اس کیمپ تک ویت نامیوں کے آنے کی اطلاع پاتے ہی کھمروج میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ نگور دیکھ رہا تھا کہ وہ پریشان تھے اور اپنا مال و اسباب سمیٹ رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی کہ انہیں کس سے خطرہ لاحق ہے۔ کمبوڈیا کی عوام کو تو وہ پہلے ہی نیم جان کر چکے تھے۔ ایک صبح کھمروج نے افراتفری میں سامان سمیٹا، گاڑیوں پر لادا اور کیمپ سے فرار ہوگئے۔

ویت کانگ کی آمد نگور اور دوسرے قیدیوں کے لیے رہائی کا پیغام لے کر آئی تھی۔ نگور اپنے گاؤں پہنچا تو وہاں یہ لرزہ خیز سچ سامنے آیا کہ اس کے ماں باپ تین بھائی اور تین بہنیں کھمروج کی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور اب ان کی ہڈیاں قتل گاہ میں دوسرے سیکڑوں افراد کی ہڈیوں میں گھل مل گئی تھیں۔

کھمروج باغیوں نے گزشتہ دس سال کے عرصے میں کم و بیش سترہ لاکھ افراد کو قتل کیا تھا۔ بیس لاکھ افراد وطن چھوڑ کر تھائی لینڈ کے پناہ گزین کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے تھے۔ پانچ لاکھ کے قریب افراد کسی نہ کسی لحاظ سے معذور ہوچکے تھے۔ لاکھوں افراد بے گھر تھے۔ روزگار ختم ہوچکے تھے۔ خوراک کے ذخائر نہ ہونے کے برابر تھے ہر طرف موت، بھوک اور مفلسی ناچ رہی تھی۔ ان حالات میں لوگ مسلسل تھائی لینڈ کی طرف محوِ سفر تھے۔ نگور نے محسوس کیا کہ اب اس کے لیے کمبوڈیا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے بھی تھائی لینڈ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ہوئی کی طرف سے دیا جانے والا مشن اس کے ذہن میں تھا اور وہ اس ملک سے نکل کر ہی اس کی تکمیل کرسکتا تھا۔

سفر کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے عزم اور حوصلے کے۔ وہ پیدل، بھوکا پیاسا جنگلوں میں سفر کرتا رہا۔ جہاں جا بجا بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ کھمروج نے صرف جنگلوں میں ہی نہیں بلکہ عام راستوں اور سڑکوں پر بھی لاکھوں کی تعداد میں بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ ہزاروں افراد ان بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر مرگئے یا معذور ہوگئے تھے۔ آج بھی کمبوڈیا میں اوسطاً ہر مہینے بارودی سرنگوں سے دو سو حادثات پیش آرہے ہیں۔

کئی دن کی جاں گسل کوشش کے بعد نگور سرحد عبور کرکے تھائی لینڈ پہنچ گیا۔ ایک دریا کے کنارے قائم پناہ گزین کیمپ میں وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کس طرح اپنے مشن کی تکمیل کرے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے امریکا جانا ہوگا وہیں سے اس کی آواز تمام دنیا تک جاسکتی تھی پھر امریکا کمبوڈین عوام کا ہمدرد بھی تھا۔

○☆○

جس وقت نگور تھائی لینڈ کی سرحد عبور کرچکا تھا۔ ڈتھ پران جنگلوں میں سفر کررہا تھا۔ پہلے وہ اکیلا تھا لیکن بعد میں اور بھی اس کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے اور یوں قافلہ بنتا گیا۔ راستے میں بارودی سرنگوں کے کئی حادثات پیش آئے۔ کچھ لوگ مارے گئے کچھ زخمی ہوئے۔ بالآخر وہ تھائی لینڈ تک جاپہنچے۔

نیویارک میں سڈنی شین برگ مسلسل بنکاک کے امریکی سفارت خانے سے رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ جو ہر روز کمبوڈیا سے آنے والے پناہ گزینوں کی لسٹ جاری کرتا تھا۔ جیسے ہی سڈنی کو معلوم ہوا کہ ڈتھ پران تھائی لینڈ آچکا ہے۔ اس نے اگلی فلائٹ سے بنکاک کے لیے سیٹ بک کرائی تھی۔ تھائی لینڈ میں وہ خاصی تلاش کے بعد پران کو پاسکا تھا۔ کیونکہ وہ مختلف کیمپوں میں گھوم پھر کر اپنے بچ جانے والے دوستوں اور رشتے داروں کو تلاش کررہا تھا۔ جب اس نے شین برگ کو اپنی کہانی سنائی تو وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ پران نے اس سے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ تم یہ کہانی اپنے اخبار میں شائع کرو۔ تاکہ دنیا کو پتا چل سکے کہ کمبوڈیا میں کیا ہو رہا ہے۔"
"میں یہ سب لکھوں گا۔" شین برگ نے وعدہ کیا
"لیکن تمہیں میرے ساتھ امریکا چلنا ہوگا۔"
پران فوراً رضامند ہوگیا کیونکہ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کی بیوی نیویارک ٹائمز میں ملازمت کر کے اپنے بچوں کو پال رہی تھی اور اس آس پر جی رہی تھی کہ اس کا شوہر اس کے پاس آئے گا اور جب وہ مایوس ہوگئی تھی تو اسے ڈتھ پران کی زندگی کی خبر ملی تھی۔ ڈتھ پران اس کے پاس تھا۔ شین برگ کی مدد سے وہ بھی نیویارک ٹائمز میں بہ حیثیت فوٹو گرافر ملازم ہوگیا تھا۔ شین برگ نے وعدے کے مطابق اس کی کہانی لکھی اور یہ جنوری ۱۹۸۰ء کے ٹائمز میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کے توسط سے امریکیوں کو پہلی بار علم ہوا کہ کمبوڈیا میں کیا ہو رہا تھا مگر پران اس سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے ایک تحریک شروع کی جس کا مطالبہ تھا کہ کھمروج لیڈروں کے جنگی جرائم کی تحقیق کے لیے ایک بین الاقوامی ٹریبونل قائم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی پران نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لیکچر دینا شروع کردیے۔ ان لیکچرز میں وہ کمبوڈیا کی سیاسی، جغرافیائی، معاشی اور معاشرتی حالت بیان کرنے کے ساتھ اس کا موازنہ آج کے کمبوڈیا سے کرتا کہ کھمروج نے اس پر امن اور خوب صورت ملک کا کیا حشر کیا تھا۔ پران محسوس کر رہا تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی اور اس جیسے متعدد افراد کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ دنیا کمبوڈیا کے مسئلے سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔

○☆○

ہینگ نگور نے دوسری مرتبہ امریکا کا ویزا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب رہا کیونکہ پہلی دفعہ.... امریکی سفارت خانے نے اسے ویزا دینے سے انکار کردیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ اس کے پاس کمبوڈیا کا پاسپورٹ نہیں تھا لیکن دوسری بار اس نے اقوام متحدہ کا پناہ گزینوں والا پاس پیش کیا تو اسے ویزا مل گیا تھا۔ اگست ۱۹۸۰ء میں نگور امریکا روانہ ہوگیا۔ اس کے گلے میں ایک دل کی شکل کا لاکٹ تھا جس میں ہوئی کی وہ تصویر تھی جو اس کے شناختی کارڈ سے اکھاڑی گئی تھی۔
نگور ڈاکٹر تھا لیکن اس کے پاس فی الوقت کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا، اسے امریکا میں پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لہٰذا اس نے لاس اینجلس میں رہائش اختیار کی اور وہیں چائنا ٹاؤن سروس میں ملازمت کرلی۔ یہ ادارہ مشرق بعید سے آنے والے افراد کی مدد کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ان تھک محنت کی وجہ سے جلد نگور کو اس ادارے میں کونسلر کا عہدہ مل گیا۔ وہ پناہ گزینوں کے لیے مناسب روزگار تلاش کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمبوڈیا کے مسئلے پر اخبارات اور رسائل میں لکھنے لگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے امریکا میں موجود کمبوڈین افراد سے رابطہ کر کے ایک موومنٹ بنانے کی کوشش شروع کردی لیکن اس معاملے میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ اول تو امریکا میں کمبوڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسرے ان کے وسائل محدود تھے۔ ان میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اخبارات و رسائل کو اپنی طرف متوجہ کرسکتے۔
۱۹۸۰ء میں یہ خبر آئی کہ ہالی وڈ والے کمبوڈیا پر ایک فلم بنا رہے ہیں۔ نگور کے دوستوں کے خیال میں اس کے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ کمبوڈیا کے مسئلے کو اجاگر کرسکے۔ اس کے ایک دوست نے اسے مشورہ دیا۔
"تم اس فلم میں کام حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"
"میں ڈاکٹر ہوں۔ اداکار نہیں۔" نگور نے جواب دیا۔
ان ہی دنوں ایک کمبوڈین خاتون کی شادی کی تقریب میں نگور کی ملاقات فلم ساز اور ڈائریکٹر سے ہوئی تھی۔ جب نگور نے ان سے کمبوڈیا پر بات کی تو وہ خاصے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اسے اپنے فلم پروجیکٹ میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔
"اس سے تمہارے کاز کو بہت شہرت ملے گی۔" فلم ساز نے کہا تھا۔
اس بات نے نگور کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ اب تک جن امریکیوں سے ملا تھا۔ ان میں سے چند ایک ہی کمبوڈیا کے مسئلے سے پوری طرح واقف تھے لیکن فلم جیسے طاقت ور میڈیا کی مدد سے وہ کروڑوں امریکیوں تک اس مسئلے کو پہنچا سکتا تھا۔ اس نے اس بات پر جتنا سوچا، اتنا ہی قائل ہوتا گیا۔
"ایک سچی کہانی پر مبنی فلم، ان لوگوں کی آنکھیں کھول دے گی۔"
نگور نے اس معاملے پر متعدد افراد سے بات کی اور سب نے اس کی حوصلہ افزائی کی کہ اسے اس فلم میں ضرور کام کرنا چاہیے۔ بالآخر اس نے خود کو آمادہ کرلیا۔ اس نے وارنر برادرز فلم والوں سے رابطہ کیا۔ اسکرین ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد نگور نے ایک کنٹریکٹ سائن کیا جس کے تحت

وہ جب تک فلم میں کام کرتا اسے ہزار ڈالر فی ہفتہ معاوضہ ملتا۔

فلم "دی کلنگ فیلڈز" دراصل سڈنی شین برگ کے ان آرٹیکلز پر مبنی تھی جو اس نے ڈتھ پران کے بارے میں تحریر کیے تھے۔ ہدایت کار رونالڈ جوفی نے ان آرٹیکلز کو اسکرپٹ کی شکل میں ڈھالا۔ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد نگور نے فیصلہ کیا کہ اسے ڈتھ پران کا کردار ادا کرنا تھا۔ اگرچہ مرکزی کردار سڈنی شین برگ کا تھا۔ مگر فلم کا سب سے اثر انگیز کردار ڈتھ پران کا ہی تھا۔ شین برگ کے کردار کے لیے سام واٹرسن کو منتخب کیا گیا تھا۔ ایک بڑے بجٹ کی فلم کی حیثیت سے ڈبلیوبی والوں کی تمام تر توجہ "دی کلنگ فیلڈ" پر تھی۔ اس کی فلم بندی مسلسل دو سال تک ہوتی رہی تھی۔ نگور ایک جنون کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ فلم اسکرپٹ میں اس کی ہدایت کے تحت کئی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ وہ کھمروج کے شیطانی کردار کو دنیا کے سامنے لانے کی اپنی سی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہ پیشہ ور اداکار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی اداکاری متاثر کن تھی۔ اس نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا۔

"میری اداکاری اس وجہ سے متاثر کن ہے کہ اس میں کوئی اداکاری نہیں ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ وہ میرے لیے ایکشن ری پلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلم میں میں ڈتھ پران ہوں لیکن ہینگ نگور کی حیثیت سے میں یہ سب دیکھ اور بھگت چکا ہوں۔ میں فلم میں کام نہیں کر رہا بلکہ ان اذیت ناک دنوں کو دہرا رہا ہوں۔ جو میری زندگی کا مرکزی حصہ ہیں۔"

جب فلم مکمل ہوئی تو میڈیا پہلے ہی اسے پسندیدگی کی سند دے چکا تھا اور لوگ بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔ "دی کلنگ فیلڈ" کا پریمیر جنوری ۱۹۸۵ء میں نیویارک میں ہوا تھا۔ نگور سمیت فلم کی پوری کاسٹ اس پریمیر میں شریک تھی۔ سڈنی شین برگ نے اچانک ایک شخص کو نگور کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔

"اسے پہچان سکتے ہو؟"

نگور نے اس شخص کو دیکھا اور بے ساختہ کہا "ڈتھ پران۔"

جذبات سے نگور کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں "میں تم ہوں اور تم میں ہو۔"

"نہیں ہم دونوں ایک ہی ہیں۔" پران نے کہا "میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا کہ تم نے میرے مشن کو ایک مضبوط آواز دی۔ جسے لوگ سننے پر مجبور ہوں گے۔"

"یہ میرا بھی مشن ہے۔" نگور نے کہا۔

"اور میرا بھی۔" شین برگ نے لقمہ دیا۔

نگور کو فلم کی کامیابی سے زیادہ ڈتھ پران سے ملنے کی خوشی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے مشن کے لیے اسے مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ فلم نے نہ صرف عام فلم بینوں اور نقادوں میں بے پناہ کامیابی حاصل کی اور سال کی بہترین فلم قرار پائی' بلکہ اسے کئی شعبوں میں آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ جن میں معاون اداکار کا شعبہ بھی تھا۔ ہینگ نگور فلم میں اپنے کردار سے بے حد مطمئن تھا لیکن اسے امید نہیں تھی کہ اسے آسکر ایوارڈ مل سکے گا۔ جو دنیا بھر میں فلمی اداکاروں کے لیے ایک خواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جب مارچ ۱۹۸۵ء میں نگور کو بہترین معاون اداکار کا آسکر ایوارڈ دیا گیا تو اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے ایوارڈ کو اپنے مشن کی فتح قرار دیا تھا۔ وہ اچانک ہی لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس نے ایوارڈ لیتے وقت خاص طور سے وارنر برادرز کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"اب دنیا کو معلوم ہے کہ میرے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔"

کمبوڈیا شاہی حکومت کے تحت تھا اور پرنس سہانوک اس کے سربراہ تھے لیکن ملک کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد وہ مع اہل و عیال ملک سے چلے گئے تھے۔ جب ستمبر ۱۹۸۹ء میں ایک معاہدے کے تحت ویت نام نے کمبوڈیا سے اپنی فوج واپس بلانے کا اعلان کیا تو شاہ سہانوک پھر ملک کے بادشاہ بن گئے۔ ایک معاہدے کے تحت کمبوڈیا میں تمام سیاسی فریقوں نے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیابی کھمروج کے اعتدال پسند دھڑے کو ملی۔ (قارئین ان کی اعتدال پسندیاں سرگزشت کے ایک گزشتہ شمارے میں "عوام کی شہزادی" میں پڑھ چکے ہوں گے) لیکن پول پوٹ اور اس کے حواری بھی ملک واپسی کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔

ڈتھ نے نگور سے کہا "کیا خیال ہے کہ ہم اپنے ملک جائیں اور اپنے گھر دیکھیں۔"

"بالکل' اور یہ کام ہمیں جلد از جلد کر لینا چاہیے۔" نگور نے اس کی تائید کی "اس سے پہلے کہ کھمروج واپس آجائیں۔"

جب نگور اور ڈتھ پران کمبوڈیا پہنچے تو انہوں نے ہر شخص کو اس خوف میں پایا کہ کھمروج نہ آجائیں اور اس کے لیے وہ موجودہ حکومت کو بھی برداشت کرنے کو تیار تھے۔ جس کے کارنامے مشرق بعید کی دوسری کمیونسٹ حکومتوں سے

کم نہیں تھے۔ ملک اقتصادی بد حالی کے شکنجے میں تھا۔ پیداوار گنجائش سے کہیں کم تھی اور سب سے بڑھ کر امن و امان کی حالت بے حد خراب تھی۔ اگرچہ قتل و غارت گری جو پول پوٹ نے مچائی تھی دوبارہ ویسی صورت حال نہیں ہوئی تھی لیکن آئے دن پر اسرار قتل ہو رہے تھے۔ جس میں تمام ہی مارے جانے والے حکومت کے مخالفین یا ناپسندیدہ افراد تھے۔

اگلے چار برسوں تک نگور اور پران نے کمبوڈیا کے متعدد دورے کیے۔ جن میں وہ کھمروج دہشت گردی کا ریکارڈ جمع کر رہے تھے۔ انہوں نے متعدد دستاویزی اور زبانی ریکارڈ حاصل کیے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کی کوششیں رنگ لائیں اور امریکی کانگریس نے کھمروج دور کے جبر و تشدد کی معلومات جمع کرنے کے لیے ایک ایکٹ منظور کیا جو ”کمبوڈین جینو کوڈ جسٹس ایکٹ“ کہلایا۔ اس کے بعد امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے فوم پنہ کی یالے یونیورسٹی کو پانچ لاکھ ڈالرز کی امداد دی۔ تاکہ کمبوڈیا میں قتل ہونے والوں، زخمی اور معذور ہونے والوں اور پناہ گزینوں کا مستند ریکارڈ تیار کیا جاسکے۔ ڈتھ اس پروجیکٹ کا اعزازی مشیر تھا۔ جبکہ نگور پروجیکٹ کے ڈاکومینٹیشن سینٹر میں کام کر رہا تھا۔ اس پروجیکٹ نے بے پناہ ریکارڈ مرتب کیا۔ اس ریکارڈ میں موجود ثبوتوں کی بنیاد پر امریکا نے کمبوڈیا کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ پول پوٹ کی دہشت گردی کی تحقیقات کرائے۔ آخر وہ ایک کھمروج لیڈر ہی تو تھا۔ یہ نگور اور ڈتھ کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس سے پول پوٹ کی کمبوڈیا واپسی کے راستے بند ہوگئے تھے۔

○☆○

گرجا گھر میں تابوت کے سامنے کھڑا ڈتھ پران سوچ رہا تھا کہ نگور کو کیا ملا۔ اس کا گھربار، اس کے ماں باپ اور بیوی چھن گئی۔ وہ بچہ چھن گیا جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ وطن چھن گیا۔ اب اس کے پاس ایک زندگی رہ گئی تھی۔ دشمنوں نے اسے بھی چھین لیا۔ ہینگ نگور دو دن پہلے ہی کمبوڈیا سے واپس آیا اور بے حد خوش تھا۔

”اب میرے وطن میں امن کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اب ظلم نہیں ہوگا بلکہ انصاف ہوگا۔“

لیکن انصاف کی امید رکھنے والا خود ظلم کا شکار ہوگیا۔ وہ رات گئے ایک ڈنر سے واپس آیا تھا۔ ابھی اس نے اپنی کار روکی تھی کہ تاریکی سے ایک شخص برآمد ہوا اور اس نے لگاتار نگور پر کئی گولیاں چلائیں۔ گولیاں اس کے سینے اور ٹانگوں میں لگیں۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہوگیا اور اس کا قاتل رات کی تاریکی میں فرار ہوگیا۔ پولیس کو نگور کی جیب سے تین ہزار ڈالرز ملے۔ اس کی گھڑی اور سونے کے لاکٹ والی زنجیر بھی موجود تھی۔ لاکٹ میں ہوئی کی تصویر تھی۔ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں تھی بلکہ صریحاً قتل تھا۔

ڈتھ پران کو ایک فی صد شبہ بھی نہیں تھا کہ یہ قتل کھمروج کے اشارے پر نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا ”مجھے کوئی سنسنی محسوس نہیں ہوئی جب مجھ سے پوچھا گیا کہ اس قتل میں کھمروج ملوث ہیں۔“

پولیس بھی اسے سیاسی قتل قرار دے رہی تھی۔ اس نے تفتیش کے نتیجے میں تین نو عمر ایشیائیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان پر نگور کی ہلاکت کا شبہ تھا لیکن پران کا کہنا تھا کہ یہ صرف آلہ قتل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اصل قاتل امریکا سے ہزاروں میل دور محفوظ بیٹھے ہوئے تھے۔ اخبارات قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ کیا کھمروج اتنے بارسوخ تھے کہ امریکا میں بھی اپنے مخالفین کو قتل کرا سکیں۔ جب نگور کا جنازہ اٹھا تو ہزاروں افراد اس کے ہمراہ تھے۔ امریکا میں اس نے بہت سارے دوست بنائے تھے اور اس کے دشمن اس کے پیچھے چلے آئے تھے۔ اس موقع پر ڈتھ پران نے کہا۔

”میں نگور کے مشن کو جاری رکھوں گا۔ وہ دنیا کو کمبوڈیا کے زخم دکھانا چاہتا تھا۔ وہ میرا ہم وطن ہی نہیں، میرا بھائی بھی تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔“

○☆○

کمبوڈیا آج بھی ایک تشدد زدہ ملک ہے۔ اس کے حکمران وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو تیسری دنیا کے حکمرانوں کا وطیرہ بن چکا ہے۔ یعنی ہر قیمت پر اقتدار سے چمٹے رہنا اور ملک کی دولت پر عیش کرنا۔ ملک کے جنوب مغربی حصے میں کھمروج باغی بدستور سرگرم عمل ہیں اور ان کی رہنمائی انہتر سالہ پول پوٹ کر رہا ہے۔ جو تھائی لینڈ کمبوڈیا کی سرحد سے اپنے گوریلوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ دوبارہ طاقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کامیاب ہوگیا تو یہ کمبوڈیا کے عوام کی بدقسمتی کا تسلسل ہوگا۔

کچھ عرصے پہلے یالے یونیورسٹی نے کمبوڈیا میں قتل گاہوں سے بچ نکلنے والوں کی یادداشتوں پر مبنی ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام ہے۔ ”کمبوڈیا کے قاتل میدانوں کے بچے“ اس کتاب کی ایڈیٹنگ ڈتھ پران نے کی ہے اور اس کی بیوی سرمون نے مرتب کیا ہے۔ دلیر و باہمت پران آج بھی جینو کوڈ پروجیکٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔ اسے اعتماد ہے کہ آخر کار اسے انصاف مل کر رہے گا۔ ■

انسان کی جان کے دُشمن ننھے قاتلوں کا احوال!

انسانی جسم میں مصروفِ کار قوتوں کا موضوع نہایت دلچسپ ہے۔ عام آدمی بہ ظاہر ان سے غافل ہی رہتا ہے لیکن جو لوگ اس راہِ پُر پیچ پر سفر کرتے ہیں، ان کی تحقیق و جستجو ان پر قدرت کے پوشیدہ راز کھولتی ہے۔ زیرِ نظر تحریر ایسی ہی چشم کشا ہے۔

ننھے قاتل

کاشف زبیر

نومبر ۱۹۸۹ء کی ایک معمول کی صبح تھی۔ میں فورٹ ڈیٹرک، میری لینڈ میں واقع اپنے دفتر میں ہونے والی میٹنگ کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے ساتھی سائنس داں پیٹر جارہلنگ نے کمرے میں جھانکا۔

"کیا تم ایک نظر اسے دیکھو گے؟" اس نے ہاتھ میں موجود فولڈر لہرایا۔

پہلے میں نے سوچا کہ معذرت کرلوں۔ یہ فولڈر میں میٹنگ میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ مگر جارہلنگ نے میرے تاثر کو بھانپ کر جلدی سے کہا "یہ بہت ضروری ہے۔"

بادل ناخواستہ میں نے فولڈر لیا۔ اس کے اندر آٹھ بائی دس کے سائز کی متعدد تصاویر تھیں جو الیکٹرانی خوردبین سے کھینچی گئی تھیں۔ تصاویر میں انوکھے قسم کے جرثوموں کو بہت بڑا کرکے دکھایا گیا تھا۔ تقریباً دس لاکھ گنا بڑا۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہ گول اور لمبی شکل کے جرثومے تھے۔ سویوں کی طرح، اکثر بالکل سیدھے تھے۔ مگر کچھ خم کھائے ہوئے تھے، کچھ بل کھا کر آخر میں گرہوں کی شکل اختیار کرگئے تھے اور کچھ تو بالکل ہی چھلے بن کر رہ گئے تھے۔ امریکن آرمی میڈیکل ریسرچ سینٹر آف انفیکشن ڈیزیز میں ڈیزیز اسسمنٹ ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے میری ذمے داری تھی کہ عام بیماریوں اور جرثوموں سے پھیلنے والی بیماریوں میں امتیاز کروں۔ ان جرثوموں کے فوٹو دیکھتے ہی میرے اندر الارم بجنے لگا تھا۔ ایک منٹ بعد جارہلنگ نے پوچھا۔

"تم نے کیا نتیجہ نکالا؟"

"مجھے یہ فلو وائرس لگتے ہیں۔" میں نے ہچکچا کر کہا۔ یوں تو کئی ایک وائرس فلو پھیلانے میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں لیکن میرے ذہن میں دو نام آرہے تھے۔ ایک مربرگ وائرس اور دوسرا ایبولا وائرس۔ روئے زمین پر یہ قاتل ترین جرثومے ہیں۔ میں نے پوچھا "یہ وائرس کہاں سے آئے ہیں؟"

"ریسٹن ورجینیا سے۔"

جار ہلننگ کے جواب نے مجھے حیران اور حیران سے زیادہ خوف زدہ کردیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ قاتل وائرس امریکا کی سرزمین پر موجود ہوں گے۔ جار ہلننگ مجھے بتا رہا تھا کہ ریسٹن میں ہازلٹن ریسرچ پروڈکٹس کمپنی نے طبی مقاصد کے لیے افریقہ سے بندر درآمد کیے تھے۔ ان نئے آنے والے بندروں کو قرنطینہ میں رکھا گیا تھا۔ جہاں اچانک ہی ان میں سے کچھ بندر پراسرار طور پر ہلاک ہوگئے۔ ان جانوروں کی موت اندرونی جریان خون سے واقع ہوئی تھی۔ کمپنی نے ان جانوروں کے خون اور بافتوں کے نمونے ہمارے پاس تجزیے کے لیے بھیجے تھے۔ ہازلٹن کمپنی کے ماہرین ان پراسرار اموات سے پریشان اور متفکر تھے اور وہ اس کی وجہ ایک خاص قسم کے بخار کو قرار دیتے تھے۔ جسے ایس ایچ ایف کہا جاتا ہے۔ یہ بیماری بندروں میں عام ہے۔ لیب میں آنے والے نمونوں کی جانچ کے دوران میں نہ صرف ان میں ایس ایچ ایف کے ذمے دار وائرس دریافت ہوئے بلکہ کچھ ایسے وائرس بھی نظر آئے جو مربرگ کے خونی وائرس سے مشابہ تھے۔ ہمارے خوردبین آپریٹر ٹام گیس برٹ نے بلاشبہ ان کی بہترین تصاویر اتاری تھیں۔

میرے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ مربرگ وائرس کی ابتدا جرمنی میں واقع مربرگ کے علاقے سے ہوئی' وہاں ویکسین تیار کرنے والی کمپنی نے افریقہ سے بندر درآمد کیے تھے اور ان ہی سے یہ وبا وہاں پھیلی تھی۔ میں نے فوری طور پر یہ تصاویر جان رائٹ کو بھجوا دیں۔ جو ڈیٹرک میں فلو وائرس پر ہمارے بہترین ماہرین میں سے ایک تھا۔ کیونکہ فی الوقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں میٹنگ میں چلا گیا اور جب میں واپس آیا تو جان رائٹ میرے دفتر میں موجود تھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

"یہ ایبولا وائرس ہی ہے۔"

ایک لمحے کو میرا دل رُک سا گیا۔ مربرگ وائرس ہی کم خطرناک نہیں تھا لیکن ایبولا تو مجسم موت تھا۔ اس کے شکار بے تحاشا اندرونی جریان خون سے مرجاتے تھے اور دنیا میں چند ہی خوش نصیب ہوں گے جو اس کی زد میں آنے کے بعد بھی زندہ رہے۔ اب یہ خوفناک وائرس واشنگٹن سے کچھ ہی دُور موجود تھا۔

○☆○

خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں جانتا تھا کہ ہمارا سامنا کس قسم کے دشمن سے ہے۔ انفرادی نوعیت کا یہ لیتھل فلو وائرس سب سے پہلے ۱۹۶۷ء میں جرمنی کے شہر مربرگ میں نمودار ہوا۔ مربرگ' فرینکفرٹ سے ذرا دُور جنوب میں واقع ایک چھوٹا سا پُرسکون شہر ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر گستاف ایڈولف مارٹینی نے نوٹ کیا کہ یونیورسٹی کلینک اسپتال میں تواتر سے ایسے مریض آرہے ہیں۔ جو بظاہر تو فلو کی علامت رکھتے ہیں یعنی بخار' سرخ آنکھیں' نزلہ اور جسم میں درد۔ لیکن ساتھ ہی انہیں متلی اور دستوں کی شکایت بھی تھی۔ ڈاکٹر مارٹینی فوراً اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ انفلوائنزا نہیں ہوسکتا۔ ان مریضوں میں ایسی نئی علامات تھیں جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ ہر گزرتے دن نئی بیماری کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ وبا کے شکار کو اندرونی جریان خون کی شکایت ہوتی۔ جو اتنی بڑھتی کہ مریض کا بیشتر خون ضائع ہوجاتا۔ مرض کی شدت میں بیرونی جریان خون بھی شروع ہوجاتا۔ آنکھوں' کان' ناک' منہ اور مقعد سے بھی خون بہنے لگتا۔ لیکن بیشتر مریضوں میں موت دل اور پھیپڑوں کا فعل رک جانے سے واقع ہوتی تھی۔ چار میں سے ایک شخص ہلاک ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر مارٹینی نے نوٹ کیا کہ تمام ہی مریضوں کا تعلق ایک مقامی فارماسیوٹیکل کمپنی سے ہے' جو ویکسین تیار کرتی تھی۔ اکثر مریض اس کے ملازم تھے یا ملازموں کے اہل خانہ تھے۔ پہلے تین مریض افریقہ سے درآمد کیے گئے بندروں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ یہ بندر طبی تحقیق کے لیے منگوائے گئے تھے پھر ایسے ہی مریضوں کی اطلاعات فرینکفرٹ اور یوگوسلاویہ کے دارالحکومت بلغراد سے آنے لگیں۔ ہر جگہ پر وبا کا آغاز یوگنڈا سے درآمد کیے ہوئے بندروں سے ہوا۔ مریضوں کے خون اور بافتوں کے نمونے سب سے پہلے مربرگ یونیورسٹی کے شعبہ ڈائگنوسٹک کی لیب کو بھیجے گئے۔ جرمنی سائنس دانوں نے ان نمونوں میں انوکھی قسم کے وائرس پائے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ جرثومے گول اور لمبے تھے۔ اسے مربرگ وائرس کا نام دیا گیا۔ جو فلو وائرسوں کے ایک نئے خاندان کا آغاز تھا۔

فرینکفرٹ، مربرگ اور بلغراد میں اس خونی وائرس نے بہت تباہی مچائی۔ اس پر اینٹی بایوٹک اور اینٹی وائرل دواؤں کا اثر بھی کم تھا لیکن بالآخر وبا کی شدت خود ہی کم ہوتی چلی گئی اور پھر یہ وائرس یوں غائب ہوگیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وائرس صرف جان دار سے جاندار تک پھیل رہا تھا۔ یہ فضا اور پانی کے ذریعے پھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ ورنہ وبا نہ جانے کہاں تک پھیل جاتی اور اس پر قابو پانا ناممکن ہوجاتا۔ وائرس کی حتمی شناخت سے پہلے یہ غائب ہوچکا تھا۔

عام طور سے وائرس کسی ایک خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر دوسرے خطوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن وبا کی صورت میں، اگلی بار مربرگ وائرس ایک بالکل مختلف جگہ نمودار ہوا۔ یہ جرمنی سے ہزاروں میل دور جنوبی افریقہ میں سامنے آیا۔ دو آسٹریلین سیاح اکیس سالہ لڑکی اور اس کا انیس سالہ منگیتر قبائلی علاقوں کی سیر کررہے تھے۔ ایک روز لڑکے کو سردرد اور پٹھوں میں تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ اسے فوراً ہی جوہانسبرگ میں واقع فرسٹ ریٹ اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں وہ پراسرار طور پر ہلاک ہوگیا۔ اس کی موت شدید قسم کے اندرونی جریان خون سے ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کی منگیتر اور وہ نرس جو اس کی دیکھ بھال پر مامور تھی، بیمار پڑ گئے۔ وہ بھی اس بیماری کا شکار ہوئے تھے لیکن ڈاکٹروں کی غیر معمولی کاوشوں نے انہیں بچالیا تھا۔ لیب رپورٹ نے ماہرین کو دہشت زدہ کردیا۔ جس کے مطابق نوجوان کی موت کا اصل ذمے دار مربرگ وائرس تھا۔ عجیب بات تھی کہ وائرس نے صرف چند ایک افراد پر حملہ کیا۔ حالانکہ اس علاقے میں سیاہ فام بھی آباد ہیں لیکن متاثر صرف سفید فام ہوئے تھے۔ اس مختصر لیکن خونی حملے کے بعد وائرس ایک بار پھر غائب ہوگیا اور ماہرین متفکر تھے کہ اب یہ کہاں نمودار ہوتا ہے؟

اس کا جواب تھا زائرے۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۶ء کے دن ایک چوالیس سالہ اسکول ٹیچر مابالو لو کیلا کیتھولک مشن اسپتال میں لایا گیا۔ اسے تیز بخار تھا اور اس میں مربرگ وائرس سے متاثر ہونے کی تمام علامات موجود تھیں۔ بے تحاشا اندرونی جریان خون کے علاوہ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ لوکیلا کی بگڑتی حالت کے پیش نظر طبی عملہ اس کی جان بچانے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کررہا تھا۔ اینٹی بایوٹک، کلورین، ہائیڈریشن، وٹامنز غرض کہ سب کچھ استعمال کرلیا گیا۔ مگر کچھ کام نہیں آیا اور لوکیلا ایک ہفتے بعد ہلاک ہوگیا۔ جلد یہ واضح ہوگیا کہ لوکیلا اکیلا ہی مریض نہیں تھا بلکہ اس علاقے سے متعدد مریض مختلف اسپتالوں میں مسلسل پہنچ رہے تھے اور بے کسی کے عالم میں موت کا شکار ہورہے تھے۔

زائرے کے دیہاتوں میں وبا پھیل رہی تھی اور جب ایک بین الاقوامی طبی ٹیم زائرے پہنچی تو وائرس سولہ دیہاتوں تک پھیل چکا تھا۔ اسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے تھے اور متعدد طبی عملے کے ارکان بھی وائرس کا شکار ہوکر موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ نہ صرف وائرس کا حملہ بے حد شدید تھا بلکہ اس دفعہ یہ آدمی سے آدمی تک سرعت سے منتقل ہورہا تھا۔ وائرس کا شکار ہونے والوں میں سے نواسی فی صد افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے تھے۔ عین اسی وقت سوڈان سے اطلاع آئی کہ وہاں بھی اسی قسم کی وبا پھیل رہی تھی۔ وہاں پر ہلاک ہونے والوں کا تناسب ترپن فی صد تھا۔ ان دونوں مقامات سے بافتوں اور خون کے نمونے دنیا بھر کی لیبارٹریوں میں بھیجے گئے اور جب ان کے مجموعی نتائج سامنے آئے تو دنیا کو ایک نئے قاتل وائرس کا علم ہوا۔ یہ مربرگ کے قبیلے کا وائرس تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ تباہ کن، جس کی ہلاکت خیزی افریقہ کے لوگوں نے بھگتی تھی۔

کیونکہ اس وائرس کا پہلا مریض زائرے میں دریائے کانگو کے علاقے ایبولا سے آیا تھا۔ لہٰذا اسے ایبولا وائرس کا نام دیا گیا۔ اس کا ایک مختصر لیکن خونی حملہ ۱۹۷۹ء میں سوڈان کے علاقے میں ہوا۔ ماہرین کے مطابق یہ فلو وائرس کا نیا خاندان تھا۔ جس کے تین اراکین سامنے آچکے تھے یعنی مربرگ وائرس، ایبولا زائرے وائرس اور ایبولا سوڈان وائرس۔ ان میں فرق صرف جغرافیائی اور ماحولیاتی اثرات کا تھا۔ ورنہ یہ ایک ہی وائرس تھا۔ افریقہ میں غیر صحت مند ماحول نے اسے ہلاکت خیز بنا دیا تھا۔

اس وائرس کے لیے آج تک نہ تو کوئی موثر ویکسین بنی ہے اور نہ ہی یہ کسی دوا کا اثر قبول کرتا ہے مگر طبی ماہرین کے نزدیک اطمینان بخش پہلو اس کی ہلاکت خیزی کا محدود دائرہ ہے۔ انفلوئنزا یا طاعون یا چیچک کی وبا کے برعکس یہ صرف ایک مختصر علاقے میں محدود رہتا ہے اور اس میں نقل مکانی کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف مصنوعی ذرائع سے یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بار اس وائرس نے ایک نئی جگہ حملہ کیا اور پھر غائب ہوگیا۔ ماہرین کے لیے اس کا حملہ اتنا پریشان کن نہیں ہے، جتنا اس کا پوشیدہ رہنا۔ آخر عام دنوں میں یہ کہاں غائب

ہو جاتا ہے؟

○☆○

۱۹۷۶ء کے بعد سے ایبولا کے افریقہ میں اِکّادُکّا حملے ہوئے لیکن اس نے وبا کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے جب میں نے اپنے دفتر میں اس کی تصاویر دیکھیں تو میں خوف زدہ ہو گیا۔ اگر یہ واقعی ایبولا تھا تو ہم اس صدی کے سب سے بڑے وبائی خدشے سے دو چار تھے۔ میرے ذہن میں متعدد سوالات گردش کر رہے تھے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا کوئی شخص وائرس سے متاثر ہو چکا ہے اور اس بات کا امکان بہت زیادہ تھا۔ ریسٹن میں جو افراد ان بندروں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ ان کا وائرس سے متاثر ہونا قرین قیاس تھا۔ اس صورت میں وہ دوسروں کو بھی متاثر کر سکتے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ بندروں کی دیکھ بھال پر کتنے افراد متعین تھے۔ کتنے ان کے پنجروں کے پاس جاتے اور انہیں چھوتے تھے۔ ان بندروں سے حاصل شدہ نمونے کہاں کہاں بھیجے گئے تھے اور ان پر کتنے افراد کام کر رہے تھے۔ ان افراد کی تعداد خاصی ہو سکتی تھی اور ان کا وائرس سے متاثر ہونا قطعی ممکنات میں سے تھا جو خاصی خوفناک بات تھی۔

کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مذکورہ نمونوں میں ایبولا وائرس موجود تھا اور اب یہ معاملہ بے حد احتیاط کے زمرے میں آتا تھا۔ لہٰذا میں نے تمام نمونوں کو مخصوص جارز میں رکھ کر لیب کے لیول فور میں بھیجنے کا حکم دیا۔ فورٹ ڈیٹرک لیب میں چار لیولز تھے۔ جنہیں بی ایل ون، ٹو، تھری اور فور کہا جاتا تھا۔ بی ایل ون میں عام قسم کے جرثومے رکھے جاتے تھے جو انسانی زندگی کے لیے ہلاکت خیز نہیں تھے اس کے بعد بی ایل ٹو میں نسبتاً زیادہ خطرناک جرثومے رکھے جاتی تھے۔ بی ایل تھری میں اس سے زیادہ ہلاکت خیز اور بی ایل فور میں صرف وہی جرثومے رکھے جاتے تھے جو بے حد ہلاکت خیز ہوں اور میڈیکل سائنس بھی ان کے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر سکی ہو۔ ان جرثوموں کو بے حد حفاظت کے ماحول میں رکھا جاتا تھا۔ یہاں درجہ حرارت صفر ہوتا ہے۔ اس درجہ حرارت پر وائرس بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں کیونکہ متحرک ہونے کی صورت میں یہ کام کرنے والے کارکنوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس کے باوجود کارکنان نے مکمل احتیاطی تدابیر کے بعد ہی لیول فور میں جاتے ہیں۔ ان جرثوموں میں ایسے بھی ہیں جو ہوا کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ لہٰذا لیول فور میں ہوا مکمل طور پر ساکن رہتی ہے اور ہوائی دباؤ معمول کے دباؤ سے کم ہوتا ہے۔ تاکہ اگر کسی وجہ سے لیول فور میں کوئی رخنہ پیدا ہو بھی جائے تو ہوا باہر جانے کے بجائے اندر کی طرف آئے۔ یوں ہلاکت خیز جرثومے باہر نہیں جا سکیں گے۔ ائرکنڈیشنگ سسٹم میں ہوائی دخول کے راستوں پر ایسے فلٹر لگائے گئے ہیں جو جرثومے کو باہر جانے سے روک دیتے ہیں۔

وائرسوں پر کام کرنے کے لیے انہیں ایسے اسٹین لیس اسٹیل کے جارز میں رکھا جاتا ہے جن میں معمولی سا رخنہ بھی نہیں ہوتا پھر ان جارز کو شفاف پلاسٹک سے بنے ایک صندوق میں رکھا جاتا ہے۔ جو مکمل طور پر ائرٹائٹ ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرف سوراخ کے ساتھ دونوں ہاتھوں کے دستانے لگے ہوتے ہیں۔ جن میں کارکن ہاتھ ڈال کر ان خطرناک جرثوموں پر کام کر سکتے ہیں اور ان سے محفوظ بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات کارکنوں کو ایسے آلات بھی استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ جو ان صندوقوں کے ساتھ ممکن نہیں ہوتے لہٰذا وہ پھر خاص قسم کے لباس پہنتے ہیں۔ یہ لباس بھی مکمل طور پر ہوا بند ملبوسے سے تیار ہوتے ہیں اور ان میں کارکن جرثوموں سے محفوظ رہتے ہیں۔

لیول فور میں جانے سے پہلے کارکن اپنے کپڑے جراثیم کش ادویات سے پاک کرتے ہیں پھر اوپر خاص لچک دار پلاسٹک کا بنا لباس پہنتے ہیں۔ اس کے بعد ہاتھوں پر پہلے سرجیکل دستانے چڑھاتے ہیں اور پھر لباس کے ساتھ والے دستانے پہن کر انہیں ٹیپ کی مدد سے مکمل طور پر لباس سے منسلک کر دیتے ہیں۔ آخر میں وہ سر پر شفاف پلاسٹک کا ہڈ پہنتے ہیں۔ اس کے بعد دو مرتبہ اس سوٹ کا امتحان لیا جاتا ہے کہ اس میں کہیں کوئی رخنہ تو نہیں موجود ہے۔ لیول فور میں اُترنے سے پہلے کارکن ایک ائرلاک کمرے میں جاتے ہیں اور پھر لیول فور میں اترتے ہیں۔ ہڈ میں بیٹری سے چلنے والا ہوا کی فراہمی کا نظام موجود ہوتا ہے جو اندر کی طرف فلٹر شدہ ہوا پہنچاتا ہے لیکن اس سے اتنا شور ہوتا ہے کہ کارکنوں کے لیے ایک دوسرے سے بات کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کبھی ناگزیر تبادلۂ خیال کے لیے وہ عارضی طور پر اس نظام کو بند کر دیتے ہیں۔

پورے امریکا میں لیول فور قسم کی صرف دو تجربہ گاہیں ہیں۔ جہاں ان خطرناک جرثوموں کو پوری احتیاط سے رکھا جاتا ہے اور ان پر تجربات کیے جاتے ہیں۔ کسی حادثے کی صورت میں یہ آزاد ہو کر زبردست تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ لہٰذا ان پر تجربات ہی سب سے نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ چند کارکن

پوری طرح احتیاطی تدابیر سے لیس ہو کر ان جرثوموں سے انسانیت کی فلاح کے لیے نبرد آزما ہوتے ہیں۔

بندروں کے نمونے لیول فور میں محفوظ کر کے میں نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے باس میجر جنرل فل رسل کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ امریکن آرمی کی میڈیکل ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ کے ڈویژن کا سربراہ تھا۔ ایک وائرولوجسٹ کی حیثیت سے میں نے جن بہترین اور نفیس افراد کے ساتھ کام کیا۔ جنرل رسل ان میں سے ایک تھا۔

"جنرل۔" میں نے بلا تمہید کہا تھا "میرا خیال ہے۔ ہم رسٹن میں کام کرنے والی ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کے پاس موجود بندروں سے ایبولا وائرس کے خطرے سے دو چار ہیں۔"

وہ چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر بولا "تو ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟"

"سب سے پہلے حفاظتی تدابیر۔" میں نے کہا۔

جنرل نے میری رائے سے اتفاق کیا اور جب ہم میٹنگ سے اُٹھے تو ایک مربوط حکمت عملی اور آپریشن طے کر چکے تھے۔ جنرل نے مجھے اس آپریشن کا انچارج مقرر کیا تھا۔ آپریشن کا پہلا مرحلہ عوام کو اس خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ اس مہم میں ورجینیا کا اسٹیٹ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا شعبہ برائے ایگریکلچر، فش اینڈ وائلڈ لائف بھی ہمارے ساتھ شامل تھا۔ ساتھ ہی متعدی بیماریوں پر قابو پانے والے مراکز کی مدد بھی حاصل تھی۔

میں نے ریسٹن میں ہازلٹن کمپنی سے رابطہ کر کے انہیں خبردار کیا کہ انہوں نے مردہ بندروں کی بافتوں کے جو نمونے بھیجے تھے ان میں صرف بخار کے وائرس ہی نہیں تھے۔ بلکہ خطرناک ایبولا وائرس بھی موجود ہیں۔

سب لوگوں کو جانوروں اور ان کے حصوں سے دُور رکھو۔ بغیر احتیاطی تدابیر کے کوئی ان کے قریب نہ جائے اور جو لوگ اب تک جانوروں سے رابطہ کرتے آئے ہیں۔ انہیں فوری چیک اپ کی ضرورت ہے۔

اس دوران میں بندروں میں بے حد تیزی سے مرض پھیل رہا تھا۔ ریسٹن میں ہازلٹن کمپنی کے پاس قرنطینہ گھر میں بندر دو کمروں میں تھے۔ کمرا نمبر ایف ۲۹ کے تمام بندر ہلاک ہو چکے تھے اور اس کے قریب ہی کمرا اے ایچ کے بندر ہلاک ہونا شروع ہو چکے تھے۔ یہ بندر گھر بے حد خطرناک علاقے بن گئے تھے۔ جیسے زائرے میں اسپتال ایبولا وائرس کی تقسیم کے مراکز بن گئے تھے۔

اس خبر کو پھیلے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمیں ہازلٹن کمپنی سے ایک کال ملی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا ہم اے ایچ کمرے کے باقی ماندہ بندروں کو جو ایبولا وائرس کے حامل تھے، تباہ کرنے میں کوئی مدد کر سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ ہم ان کی مدد کریں گے لیکن اپنے کسی کارکن کو موت کے پھندے میں بھیجنے سے پہلے میں خود اس جگہ کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ بندروں کے قرنطینہ گھر ایک الگ تھلگ عمارت میں قائم تھے۔ مگر اس سے محض سو گز کے فاصلے پر بچوں کا ایک ڈے کیئر سینٹر تھا اور عمارت کے سامنے سڑک پار میکڈونلڈ اور ٹاکو بیل ریسٹورنٹ تھے۔ یعنی بچوں کی ایک بڑی تعداد اور دو عدد لوگوں سے بھرے فاسٹ فوڈ کے ریسٹورنٹ عین خطرے کے مرکز میں موجود تھے۔

میرے ساتھ ویٹرینری پاتھولوجسٹ نینسی جاکس بھی تھی۔ وہ ادارے کے چند اعلیٰ ترین بایو سیفٹی کے ماہرین میں شامل ہے۔ اے ایچ ایک طویل کمرا تھا۔ جس میں بندر پنجروں کی دو قطاروں میں موجود تھے اور ان قطاروں کا درمیانی فاصلہ بمشکل ایک گز تھا۔ جو میرے خیال میں بے حد خطرناک تھا۔ ایک آدمی بہت محتاط رہ کر ہی ان کے درمیان سے گزر سکتا تھا۔ بندر جسامت کے اعتبار سے بڑے، وحشی، سریع الحرکت اور طاقت ور تھے۔ ان کے تیز دانت چمک رہے تھے۔ وہ ویسے ہی مضطرب تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی اچھل کود میں بے پناہ تیزی آگئی تھی۔ تقریباً سب ہی اچھل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ سوائے ان بندروں کے جو مر چکے تھے یا بیماری نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ مجھے یہ صورت حال پسند نہیں آئی تھی۔

اگلے روز میں اور میری ٹیم قرنطینہ میں داخل ہوئی۔ ہم دو بے نشان وین گاڑیوں میں آئے تھے۔ ان میں ہمارا سامان اور آلات بھی تھے۔ سامان میں خاص قسم کے خلا سوٹ تھے۔ یہ اپنے نارنجی رنگ کے باعث الگ سے پہچانے جاتے تھے۔ یہ لباس اسی ماحول میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جہاں ماحول میں جراثیم موجود ہوں فورٹ ڈیٹرک کی لیب میں ایمرجنسی کے لیے یہ سوٹ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہ لباس نہ صرف جراثیم سے محفوظ رکھتا ہے۔ بلکہ ایسے افراد جو وائرس سے متاثر ہوں۔ انہیں یہ لباس پہنا کر انہیں وائرس پھیلانے سے روکا جا سکتا ہے۔ خاص مادوں سے بنے یہ سوٹ مکمل طور پر ائرٹائٹ تھے لیکن یہ سو فی صد تحفظ مہیا نہیں کرتے کیونکہ کسی جگہ سے رگڑ کھا کر یا معمولی ساکٹ لگ کر لباس میں ایسا سوراخ ہو سکتا تھا جو آنکھ سے نظر نہ آتا ہو مگر ایک بے حد

مختصر وائرس کے لیے یہ سوراخ بھی کافی تھا۔ اس لباس میں بھی ہوا کی آمدورفت کا اپنا نظام تھا جو بیٹری سے کام کرتا تھا۔ قرنطینہ گھر میں ہمیں اپنے لباس کی بے حد حفاظت کرنا تھی کیونکہ وہاں وحشی جانور تھے۔ تیز کونوں والے پنجرے تھے اور جابجا رکھا سامان بھی۔

جب ہم اندر جانے کے لیے تیار تھے۔ نینسی جاکس سب کو احتیاطاً لیکچر دے رہی تھی "اپنے لباس، دستانوں اور ہڈز کو دوسری اشیا سے محفوظ رکھو۔ کسی جگہ کٹ لگ جائے تو فوراً ٹیپ سے اس سوراخ کو بند کرلینا۔ کسی جسمانی زخم کی صورت میں خون نکل آئے تو اس جگہ کو فوراً جراثیم کش محلول سے دھولینا۔ یاد رکھو خون نکلنے کی صورت میں تم خاصی مشکل میں پڑجاؤ گے۔"

خاص بات یہ تھی کہ بندروں میں ایبولا وائرس موجود نہ ہو تو بھی وہ ہارپس بی وائرس تو منتقل کر ہی سکتے تھے۔ یہ بھی ہلاکت خیزی میں ایبولا سے کم نہیں تھا۔ زبانی لیکچر کے بعد نینسی اب عملی طور پر حفاظتی تدابیر سمجھا رہی تھی۔ وہ فورٹ ڈیٹرک کی محتاط ترین کارکن تھی۔ مجھے یاد ہے ۱۹۸۳ء میں وہ ایبولا وائرس پر کام کررہی تھی کہ حادثاتی طور پر اس کا دستانہ پھٹ گیا۔ بے حد خوف کے عالم میں اس نے اندرونی سرجیکل دستانہ چیک کیا۔ وہ سلامت تھا لیکن اس کے باوجود نینسی نے چیک کرنے کے لیے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبو کر دیکھا اور جب اسے اطمینان ہوا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی دستانے کے اندر نہیں گیا ہے تو اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وائرس نے اس کے جسم کو تو نہیں چھوا تھا۔

نینسی کی بریفنگ جاری تھی۔ آخر میں نینسی نے ہم سب کو خبردار کیا "بندروں سے ہوشیار رہنا اگر کسی نے تم پر حملہ کردیا تو تمہارے آخری لمحات ائرٹائٹ کمرے میں شیشے کی کھڑکی سے اپنے پیاروں کو دیکھتے ہوئے گزریں گے۔"

دو کارکنوں نے قطار کے پہلے پنجرے میں موجود بندر کو ایک اسٹک کی مدد سے قابو کیا۔ اسٹک کے آگے یو کی شکل کا آلہ تھا جسے بندر کی گردن میں پھنسا کر اسے پنجرے کی دیوار سے لگا دیا اور دوسرے کارکن نے پھرتی سے اسے مہلک انجکشن لگا دیا۔ ایک لمحے میں وہ بے ہوش ہوگیا اور اسی بے ہوشی میں اسے موت آگئی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین اور بندر اسی طریقے سے ہلاک کیے۔ ذاتی طور پر مجھے ایک زندہ اور صحت مند جانور کو مارنے سے نفرت ہے لیکن ہمیں یہ کرنا ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا جاتا تو یہ بندر وائرس انسانوں تک پھیلانے کا باعث بن جاتے اور ایک جانور انسان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا۔

چار بندروں کی ہلاکت کے بعد ہم نے احتیاط سے ان کی لاشیں پنجروں سے نکالیں۔ ان کے خون اور بافتوں کے نمونے لیے اور پھر ان کو ایک خاص قسم کے بکس میں بند کرکے فورٹ ڈیٹرک روانہ کردیا۔ جہاں لیول فور میں ان کا تجزیہ ہونا تھا۔ اس شام تک حتمی طور پر تصدیق ہوگئی تھی کہ ان جانوروں کے خون میں بھی ایبولا وائرس موجود تھا اور اس سے زیادہ تشویش ناک خبر یہ تھی کہ ریسٹن میں رہنے والے ہازلٹن کمپنی کے تین ملازمین جو بندروں کی دیکھ بھال پر مامور تھے۔ ان کے خون میں ایبولا وائرس پائے گئے تھے۔ ان افراد کو فوری طور پر سب سے الگ کرکے ان کا علاج کیا جارہا تھا۔

اب یہ واضح ہوچکا تھا کہ ایبولا وائرس قرنطینہ گھر سے نکل کر عام آبادی میں پہنچ چکا تھا۔ کمپنی نے باقی ماندہ جانوروں کو ہلاک کرنے اور قرنطینہ گھر کو سیل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ذمے داری انہوں نے ہم پر ڈال دی تھی۔ ہازلٹن کمپنی کے ایک ویٹرینری نے ہم سے کہا کہ اب جانوروں کو ختم کرنے اور قرنطینہ گھر کو وائرس سے پاک کرنے کی ذمے داری سی ڈی سی پر آتی ہے۔ اس نے کہا تھا۔

"ہم اس کام کو محفوظ طور پر نہیں کرسکتے۔"

میرا پہلا رد عمل تھا" ہرگز نہیں۔ میں ایبولا وائرس کے ایک ممکنہ پھیلاؤ میں حصہ نہیں لے سکتا" مگر جب یہ درخواست جنرل رسل تک پہنچی تو اس نے اسے قبول کرلیا۔ اس نے مجھ سے کہا" یہ کام ہم ہی کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے ہم وبا کو روکنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

بادل ناخواستہ میں راضی ہوگیا اور پانچ دسمبر کو ہم ایک بار پھر قرنطینہ گھر میں داخل ہوئے۔ اس دفعہ ہم زیادہ تعداد میں اور زیادہ سامان لے کر آئے تھے۔ اس وقت بھی وہاں سیکڑوں جانور موجود تھے اور مجھے ان کے قتل عام کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ ہازلٹن کے ویٹرینریز بھی افسردہ تھے لیکن انسانیت کی فلاح کے لیے ان ذہین جانوروں کی ہلاکت ضروری تھی کیونکہ یہ اپنے اندر ہلاکت خیز وائرس لیے ہوئے تھے۔ عمارت میں داخلے سے پہلے ہم نے اپنے لباس اور ہڈ ٹیپ کی مدد سے ائرٹائٹ کرلیے تھے۔ موسم نم اور گرم تھا۔ خاص طور سے قرنطینہ گھر میں تو خاصی گرمی تھی۔

اگلے چار دن تک ہم ان جانوروں کو مارتے رہے تھے۔ ہم نے دو دو افراد کی ٹیمیں بنا رکھی تھیں۔ جو باری باری جانوروں کو ہلاک کرتیں۔ اس طرح جب تمام جانور ہلاک

ہوگئے تو فیصلہ کیا گیا کہ ان کی لاشیں برقی بھٹی میں جلا کر راکھ کردی جائیں تاکہ وائرس پھیلنے کا ایک فی صد امکان بھی باقی نہ رہے۔

اس کے بعد قرنطینہ گھر کے ماحول کو پاک کرنے کا کام شروع ہوا۔ سب سے پہلے ہم نے عمارت کی ہر کھڑکی، ہر دروازہ اور معمولی سا رخنہ بھی یوں بند کردیا کہ وائرس کے باہر آنے کا کوئی راستہ باقی نہ بچا پھر ہم نے چالیس عدد برقی فرائی پان عمارت کے مختلف حصوں میں رکھ دیے اور ان میں مائع پارا فور مالڈیہانڈ مکسچر ڈال دیا۔ چولہوں میں خود کار ٹائمر تھا۔ چولہوں کے آن ہونے سے پہلے ہم نے باہر نکل کر عمارت کو پوری طرح سیل کردیا تھا۔ اندر جیسے ہی چولہے وقت مقررہ پر گرم ہوئے مکسچر سے قاتل ترین فور مالڈیہانڈ گیس اٹھنے لگی۔ یہ گیس کسی بھی جاندار کو سیکنڈوں میں ہلاک کردیتی ہے۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر عمارت میں موجود ہر جرثومہ یقینی طور پر موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

خوش قسمتی سے جن افراد کے خون میں ایبولا وائرس پائے گئے تھے۔ ان کے جسم میں حیران کن طور پر وائرس کے خلاف مدافعت پیدا ہونے لگی اور وہ بیمار ہونے اور پھر دردناک موت سے بچ گئے۔ ہم نہیں جانتے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ ماربرگ اور زائرے میں جو وائرس پھیلے وہ ناقابل علاج ثابت ہوئے تھے اور انسانی دفاعی نظام ان کی مدافعت میں ناکام رہا تھا۔ جنیاتی طور پر زائرے اور ریسٹن میں پائے جانے والے ایبولا ایک ہی قسم کے تھے۔ ان میں صرف ایک فرق تھا کہ ریسٹن ایبولا نے صرف جانوروں کو متاثر کیا تھا اور انسان اس سے محفوظ رہے تھے۔

ایبولا کی خصوصیت رہی ہے کہ یہ ہمیشہ غیر متوقع مقام پر حملہ کرتا ہے۔ اس کا اگلا ظہور دور دراز ملک فلپائن میں ہوا۔ وہاں وائرس جانوروں کی خوراک تیار کرنے والی کمپنی میں دریافت ہوا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وائرس افریقہ سے آیا تھا یا کہیں اور سے فلپائن منتقل ہوا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے انسان اس بار بھی محفوظ رہے۔ البتہ اس سے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ انسان آئندہ بھی محفوظ رہیں گے ایبولا حرکت میں رہنے والا جرثومہ ہے۔ یہ دنیا میں کہیں بھی کسی وقت نمودار ہوسکتا ہے اور وہ جگہ امریکا بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ہمیشہ بے حد محتاط رہنا ہوگا۔ اگرچہ فی الوقت ہم محفوظ ہیں لیکن یہ مستقبل کی ضمانت نہیں ہے۔

○☆○

میں ٹیکساس کی آئل فیلڈز میں پیدا ہوا تو میرا نام میرے والد کے نام پر کلارنس جیمس پیٹر جونیئر رکھا گیا۔ میرے والد اور والدہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہی میرا یہ نام منتخب کیا تھا لیکن میرے اکثر جاننے والے اور دوست مجھے سی جے یا پیٹ کہتے ہیں۔ مڈلینڈ کے اس آئل ٹاؤن میں دو طرح کے لوگ آباد تھے۔ ایک وہ جو آئل فیلڈز کے مالک تھے اور دوسرے وہ جو ان کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے کام کرتے تھے۔ کلارنس جیمس پیٹر سینئر کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا۔ وہ ایک آٹو ریپئر ورکشاپ میں فورمین تھے۔ جب میں چھ یا سات سال کا تھا تو ہم آئل ٹاؤن سے بیس میل کے فاصلے پر ہائی وے کے کنارے اوڈیسا نامی قصبے میں منتقل ہوگئے۔ یہاں کی معیشت بھی تیل کی تھی اور اکثر افراد کا روزگار ڈرلنگ یا تیل کے کنوؤں سے وابستہ تھا۔ میرا بچپن ان ہی دو جگہوں پر گزرا تھا اور یہاں سے میری بے شمار یادیں وابستہ ہیں۔ اکثر اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں میں اپنے دادا اور دادی کے فارم پر گزارتا تھا۔ یہ بے حد خوب صورت جگہ تھی۔ جہاں ہر طرف رنگ اور خوشبو تھی۔ دادا نے بے شمار مویشی بھی پال رکھے تھے۔ میں ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور جب چھٹیاں ختم ہوتیں تو میں واپس مام اور ڈیڈ کے پاس آجاتا۔

میری مام جسمانی لحاظ سے بے حد مضبوط تھی۔ میں ان پر ہی گیا ہوں۔ میں نے شاذ ہی انہیں بیمار دیکھا لیکن جب میں ساتویں کلاس میں تھا تو یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مام کو پھیپڑوں کا کینسر ہے۔ ان دنوں کینسر بالکل لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ میڈیکل سائنس نے خاصی ترقی کرلی تھی۔ اس کے باوجود کینسر کا کوئی علاج نہیں تھا۔ مام نے تو علاج کے کئی سال بے حد تکلیف میں گزارے۔ ڈیڈ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مام کا ہر ممکن علاج کرایا۔ حتیٰ کہ بے تحاشا قرض لاد لیا۔ ان کی تنخواہ مام کے علاج کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ مام کے متعدد آپریشن ہوئے۔ ہر آپریشن میں ان کے پھیپڑوں کا کوئی نہ کوئی حصہ کاٹ دیا جاتا۔ مگر وہ کمزور ہوتی چلی گئیں اور بالآخر انتقال کرگئیں۔

میں کم عمری میں ہی ماں کے سائے سے محروم ہوگیا تھا لیکن ان کی موت میرے لیے کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی پھر مام آخر دم تک مجھے اور ڈیڈ کو حوصلہ دیتی رہیں اور ہمیں تیار کرتی رہیں کہ اب ہمیں اکیلے ہی زندگی بسر کرنا ہوگی۔ وہ اپنی تکلیف اور بیماری کے باوجود جب تک ہمت رہی، گھریلو ذمے

داریاں بھی پوری کرتی رہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ زندہ نہیں رہیں گی لیکن ان کے مرنے کے بعد میں نے خود کو بے حد تنہا محسوس کیا تھا۔

مام کے انتقال کے بعد میری زندگی میں ایک اور خاتون داخل ہوئیں۔ جنہوں نے میری زندگی کا رخ بدلنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ میری بایولوجی کی ٹیچر تھیں۔ مسز ولی فل مین' ان کی عینک اکثر ان کے ماتھے پر ٹکی رہتی تھی اور تعلیم کے معاملے میں وہ بے حد سخت گیر تھیں۔ خاص طور سے مجھ پر ان کی نظر کرم رہتی تھی اور جب میں ان کے کسی ٹیسٹ میں فیل ہو جاتا تھا تو ان کا غصہ دیکھنے والا ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بایولوجی میں پہلے سے زیادہ محنت شروع کردی اور جلد کلاس کے بہترین طالب علموں میں شمار ہونے لگا تھا۔ جیسے جیسے میں بایولوجی میں بہتر ہو رہا تھا مسز فل مین کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ ہوتا جا رہا تھا۔

بایولوجی میرے لیے ہمیشہ ایک مشکل مضمون رہا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے اس سے محبت کی ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اگر مسز فل مین میرے ساتھ مغز ماری نہ کرتیں تو میں موجودہ مقام پر نہ ہوتا۔ ان دنوں میں تجربات کر رہا تھا۔ ایک روز میں مسز فل مین کے پاس گیا اور ان سے پوچھا۔

"آپ کے خون کا گروپ کیا ہے؟"

"تم جاننا چاہتے ہو کہ خون کتنے اقسام کا ہوتا ہے۔" وہ خوش ہو کر بولیں "میں ایک دوست سے واقف ہوں جو اسپتال لیب میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے اسکول کے ایک یا دو لڑکے مانگے تھے۔"

وہ شخص اسپتال لیب میں ہیڈ میڈیکل ٹیکنالوجسٹ ثابت ہوا۔ مسز فل مین خود مجھے اس کے پاس.... لے کر گئیں اور اس سے میرا تعارف کرا کے بولیں "رالف یہ میرا سب سے ہونہار شاگرد ہے۔"

رالف نے بغور مجھے دیکھا "اوکے' میں اسے رکھ لوں گا۔"

ایک لڑکے کے لیے جو محض ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ کاؤنٹی اسپتال کی لیب میں کام کرنا یقیناً بے حد اعزاز کی بات تھی پھر اس میں سنسنی اور جوش بھی تھا۔ میں جو کلاس میں پڑھتا اس سے زیادہ یہاں عملی طور پر سیکھتا تھا۔ ان دنوں میں نے جانا کہ بیماروں کا علاج کس طرح ہوتا ہے۔ ...دوسرے یہ کام آئل فیلڈ میں کام کرنے سے بے حد مختلف تھا کیونکہ اوڈیسا میں اس کے سوا کوئی کام دستیاب نہیں تھا جہاں ایک نو عمر لڑکا کچھ کر کے گزارے لائق رقم کما سکے۔ میں نے یہاں نہ صرف اپنا جیب خرچ پورا کیا۔ بلکہ بہت کچھ سیکھا اور لطف حاصل کیا۔

تین سال تک لیب میں کام کرنے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ اب میں ہائی اسکول کے آخری سالوں میں تھا اور اب میں اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم کو دینا چاہتا تھا۔

آخری سال کے موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے ہوسٹن میں لائن یونیورسٹی کے ایک سائنس کورس میں شرکت کی جو تین مہینے جاری رہا تھا اور اس پروگرام کے لیے میں نے ڈیڈ سے ایک پین بھی نہیں لی تھی کیونکہ وہ مام کے انتقال کے پانچ سال بعد بھی ان کے میڈیکل بل ادا کر رہے تھے۔ اس کورس میں شرکت کے بعد میں نے یونیورسٹی میں پڑھنے اور بایو کیمسٹری کا مضمون لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے لائن یونیورسٹی میں ہی داخلہ لیا اور یہاں کیمسٹری میں گریجویشن کے دوران میں محسوس کیا کہ میڈیکل کی طرف میرا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ خیال اسی وقت میرے ذہن میں آیا جب میں مام کی بیماری کے دوران میں متعدد ڈاکٹروں سے ملا اور ان میں سے بہت ساروں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ ان کا خلوص اور ان کی لگن دیکھ کر میں نے بھی ڈاکٹر بننے کا سوچا تھا۔ یونیورسٹی میں یہ سوچ پھر سے ابھر آئی تھی۔

میڈیکل اسکول کے طور پر میں نے بالٹی مور کی مشہور عالم ہاپکنز یونیورسٹی کا انتخاب کیا تھا۔ جب میں ٹیکساس کے اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ تب ہی مجھے جرثوموں سے پھیلنے والی بیماریوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے امریکن پبلک ہیلتھ سروس کے ادارے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں ملازمت کی درخواست دی۔ اس ادارے میں وبائی امراض اور خاص طور سے وائرس سے پیدا ہونے والے امراض پر تحقیق ہوتی تھی۔ یوں میرے وائرولوجسٹ کی حیثیت سے کیریئر کا آغاز ہوا جو اب تک جاری ہے۔ آج میں ملک کے اہم ترین ادارے کے اعلیٰ ترین تحقیقاتی عہدے پر ہوں۔

امریکی محکمہ صحت عامہ ۱۷۹۸ء میں تشکیل دیا گیا تھا۔ اس کا اولین مقصد وسائل کو مربوط کر کے وبائی امراض پر قابو پانا تھا اور لا علاج بیماریوں کا علاج دریافت کرنا تھا۔ ذرا سے ردوبدل سے یہی مقاصد آج بھی کار فرما ہیں۔ میں ان ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے حالات اور کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جنہوں نے انسانی صحت کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا۔ میرے خیال میں امراض اور خاص طور سے وبائی امراض پر تحقیق سے زیادہ کوئی خطرناک کام نہیں

ہے۔ ذرا سی غفلت سے بیماری خود ڈاکٹر پر حملہ کر دیتی ہے۔
میری پسندیدہ ترین کہانی نامور فزیشن جان اسنو کی خود نوشت حیات ہے۔ اس نے لندن میں واٹر پمپوں کا معائنہ کر کے ہیضہ پھیلنے کے اسباب کا پتا چلایا تھا کیونکہ سب افراد ایک ہی پمپ سے منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہیضے پر قابو پایا جاسکا۔ اس طرح مجھے ڈاکٹر والٹر ریڈ بھی بے حد پسند ہے۔ جس نے دریافت کیا کہ زرد بخار کیونکر ہوتا ہے اور مچھروں کو ختم کر کے اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں متعدد نوجوان ڈاکٹر چھوت کی بیماریوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ان دنوں اس میدان میں الگ سے کام نہیں ہو رہا تھا اور وبائی بیماریوں کو اینٹی بایوٹک دواؤں اور ویکسین سے قابو کیا جاتا تھا۔ میں بھی ان نوجوان ڈاکٹروں میں شامل تھا اور خود کو چھوت اور وبائی بیماریوں کے خلاف کام کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

○☆○

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ نے مجھے اپنے وسطی امریکا کے مرکز بھیجا جو پانامہ میں تھا اور پانامہ کینال بیس کہلاتا تھا۔ مارو کہلانے والے اس ادارے میں امریکی اور مقامی ڈاکٹر مل کر مقامی بیماریوں پر تحقیق کرتے تھے جو انفکشن کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں اور ان دنوں وہاں کچھ مہلک ترین وبائی بیماریوں پر کام ہو رہا تھا۔ جن کا فی الوقت کوئی علاج نہیں تھا۔ یہاں میں نے اپنے پہلے اسائنمنٹ پر فروری ۱۹۷۱ء میں کام شروع کیا۔ جب بولیویا کے شہر کوچبامابا میں وائرس کے بخار کی وبا پھیلی۔ لوگ شدید طور پر بیمار پڑنے اور پھر مرنے لگے۔

وائرس کا بخار بولیویا میں کوئی نئی چیز نہیں تھا لیکن ایک تو یہ ہمیشہ جانوروں سے انسانوں کو لگتا تھا اور دوسرے یہ ہمیشہ ملک کے نچلے علاقوں میں پھیلتا تھا۔ اس دفعہ بخار نے خوفناک وبائی صورت اختیار کر لی پہلے ایک مریض اسپتال میں آیا اور اس نے کئی دوسرے افراد کو اس مرض سے متاثر کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس دفعہ وائرس انفلوئنزا کے وائرس کی طرح ہوا سے منتقل ہو رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس سے پہلے کبھی وبا نے اتنی بلندی پر حملہ نہیں کیا تھا۔ کوچبامابا بولیویا کا تیسرا بلند ترین شہر ہے۔ جو سلسلہ کوہ ہائے اینڈیز میں واقع ہے۔ پہلے مریض نے دو نرسوں کو متاثر کیا اور ان سے یہ مرض دوسرے کو لگا تھا۔

اس وقت مارو میں میں واحد دستیاب فزیشن تھا۔ لہٰذا مجھے بولیویا جا کر صورت حال دیکھنے کا حکم ملا اور میں بوریا بستر باندھ کر روانہ ہو گیا۔ میں جوانی کے جوش میں تھا اور مجھے قطعی خیال نہیں تھا کہ اس طرح در حقیقت میں خود کو موت کے حوالے کر رہا ہوں۔ کوچبامابا سے باہر ائرپورٹ پر دو افراد میرے منتظر تھے ایک بولیوین حکومت کا افسر استقبالیہ اور دوسرا شخص طویل قامت اور سانولی رنگت والا باب لی بو تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی ہاپکنز یونیورسٹی میں پڑھ چکا تھا۔ میں اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ اقوام متحدہ کی امن فوج کے ساتھ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آیا تھا۔ بوب ٹھنڈے مزاج کا اور محتاط شخص تھا۔ وہ اس قسم کے حالات کے لیے مثالی شخص تھا، جو ان دنوں بولیویا میں جاری تھی۔

باب لی بو نے مجھے بتایا کہ کوچبامابا میں نرسنگ اسکول میں زیر تعلیم ایک نرس چھٹیوں میں اپنے گھر گئی۔ جو ملک کے نچلے علاقے میں ہے۔ دو ہفتے بعد وہ واپس آئی۔ اس نے خود کو بیمار محسوس کیا۔ اس کا فوری طور پر الزبتھ سیٹن اسپتال میں معائنہ ہوا اور دو ہفتے بعد وہ پراسرار طور پر ہلاک ہو گئی۔ بظاہر اسے وائرس کا بخار تھا لیکن اس کی موت اندرونی جریان خون سے ہوئی تھی۔ نرس کے مرنے کے ایک مہینے کے اندر اس کا باپ اور اس کی بڑی بہن اس بیماری کا شکار ہو کر چل بسے۔ دوسری طرف کوچبامابا میں مرنے والی نرس کی تیمارداری کرنے والی دو ساتھی نرسیں بھی وائرس کا شکار ہو گئیں۔ ان میں سے ایک جس نے براہ راست مریضہ کو چھوا تھا۔ ایک ہفتے بعد مر گئی اور اس کی دوسری ساتھی جو صرف کمرے میں آتی تھی۔ وہ بیمار تو ہوئی لیکن قسمت نے اسے دست اجل سے بچا لیا۔

بوب اور میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ پورا شہر خوف و دہشت کی لپیٹ میں تھا۔ یہاں کے باسیوں کو اس سے پہلے کبھی ایسی وبا کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے چار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ صرف ایک عورت بچی تھی لیکن وہ میری آمد سے پہلے ہی صحت یاب ہو گئی تھی۔ ہمارا پہلا کام یہ تھا کہ مرنے والوں کے خون اور بافتوں کے نمونے لے کر اس پراسرار مرض کی حقیقت کا پتا چلائیں۔ دوسرا کام یہ کیا کہ ان افراد کے خون کا نمونہ حاصل کریں جو مریضوں سے قریب رہے تھے۔ میں نے بیماری کی علامات کے بارے میں صرف زبانی طور پر سنا تھا لیکن اس کے کسی مریض... کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ اگلی بار کس شخص کو وائرس اپنا نشانہ بناتا ہے۔

ڈاکٹر ڈونا گوالگر الزبتھ اسپتال میں پیتھالوجسٹ تھا۔ وہ مرنے والی اولین نرس کا دوست بھی تھا اور اسے بھی تجسس تھا کہ کس جرثومے نے اس کی عزیز ترین دوست کو

اس سے چھین لیا تھا۔ اس نے آخری دنوں میں نرس کی تیمارداری بھی کی تھی اور جب اس کے پوسٹ مارٹم کا مرحلہ آیا تو اس نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کوئی دوسرا فرد پوسٹ مارٹم کے لیے اگلر کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر کا نائب یورولو جسٹ آگے آیا۔ اس نے ڈاکٹر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ پوسٹ مارٹم کے لیے اگلر نے نرس کا پیٹ چاک کیا اور اس کے اندرونی اعضا نکالنے لگا۔ اس موقع پر یورولو جسٹ سے وہ فاش غلطی ہوئی جس کا خمیازہ اگلر کو بھگتنا پڑا تھا۔ وہ حادثاتی طور پر اگلر سے جا ٹکرایا۔ اگلر کے ہاتھ میں تیز دھار کٹر تھا۔ جس سے وہ لاش کے اندرونی اعضا کاٹ رہا تھا۔ دھکے سے اگلر کا کٹر والا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے ٹکرایا اور کٹر کی مہلک دھار نے پلک جھپکنے میں اگلر کا دستانہ اور کھال کاٹ دی۔ پہلے تو وہ دونوں ہی دہشت سے سن رہ گئے پھر اگلر نے فوری طور پر ہاتھ پر لگا اپنا اور نرس کا خون صاف کیا اور پھر اپنا ہاتھ فور مالڈیہائڈ کے محلول میں ڈبو دیا مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ خون کا خون سے ملاپ تھا۔

اس حادثے کے چار دن بعد اگلر نے بخار اور جسم میں درد محسوس کیا۔ اسے خوف و دہشت کے عالم میں فوری طور پر اسپتال کے ایک الگ تھلگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں کوئی شخص بغیر احتیاطی تدابیر کے نہیں جا سکتا تھا۔ جب میں نے پہلی بار اگلر کو دیکھا تو وہ مجھے پوری طرح باحوصلہ اور زندہ دل نظر آیا۔ حالانکہ موت اس کے جسم میں گھر بنا چکی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ایک نرس بچ گئی تھی۔ وہ صحت مند اور جوان تھی۔ اگلر بھی جوان اور خاصا صحت مند شخص تھا۔ امید ہونے لگی کہ اگلر بھی اس بیماری پر قابو پالے گا۔ آنے والے دنوں میں میری تمام تر توجہ اگلر کو زندہ رکھنے پر مرکوز تھی۔ ایک ہفتے تک وہ ٹھیک رہا تھا لیکن آٹھویں دن اس کے جسم میں جریان خون شروع ہوگیا۔ نہ صرف اندرونی بلکہ بیرونی جریان خون بھی، اس کے پیشاب میں بھی خون آرہا تھا۔ جلد اس کے سینے میں اتنا خون بھر گیا کہ اس کی سانس رکنے لگی۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ اگلر کے حلق میں سانس دلانے والی نلکی ڈالی جائے اور یہ آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص طور سے اگلر جیسے مریضوں کے ساتھ جنہیں چھونے سے بھی قاتل وائرس جسم میں سرایت کرجاتا۔ میں خاصے عرصے سے آؤٹ آف پریکٹس تھا اور بوب کو اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس موقع پر یورو لو جسٹ آگے آیا اس نے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کردیں۔ ہم نے اسے خبردار کیا

کہ اس طرح وہ اپنی جان بھی خطرے میں ڈالے گا لیکن اس نے کہا۔

”میں اپنے دوست کے لیے سب کرنے کو تیار ہوں۔ شاید اس طرح میں اپنی غلطی کی کچھ تلافی کرسکوں۔“

یورولو جسٹ نے کامیابی سے اگلر کے حلق میں نلکی اتار دی تھی۔ اس سے اسے سانس لینے میں سہولت ہوگئی تھی مگر واضح طور پر ہم ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ ۷ مارچ کی رات گیارہ بجے یک دم اس کی حالت بگڑ گئی اور کچھ دیر بعد میں اس کی بیوی کو اس کے انتقال کی خبر دے رہا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے اس کے پوسٹ مارٹم کی تیاری شروع کردی کیونکہ ہمیں اس کے اندرونی اعضا کی ضرورت تھی۔ میں نے ہر ممکن احتیاط سے کام لیا تاکہ وائرس سے محفوظ رہ سکوں۔ چار گھنٹے بعد میں پوسٹ مارٹم مکمل کرچکا تھا۔

اگلر مرگیا لیکن اس کی قربانی رائگاں نہیں گئی کیونکہ ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ یہ وائرس جو بولیویا کے عام بخار کے وائرس سے قدرے مختلف تھا۔ ہوا کے ذریعے ایک سے دوسرے شخص کو منتقل ہوتا تھا اور ہم موثر پیسٹ کنٹرول کے ذریعے وبا پر قابو پاسکتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے بعد میں کیا۔ میں ڈونا گو اگلر کو کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔ اس کا شمار بھی ان افراد میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے سائنس اور انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جان دی تھی۔

○☆○

وائرس قدرت کی وہ مختصر ترین تخلیق ہے۔ جسے جان دار کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ زندگی کی اتنی سادہ شکل ہے کہ وائرس کو بمشکل ہی جانداروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ بعض سائنس داں اسے جان دار اور بے جان اشیا کی درمیانی کڑی مانتے ہیں۔ عام وائرس اتنا مختصر ہوتا ہے کہ عام خوردبین سے نظر بھی نہیں آتا۔ اسے دیکھنے کے لیے خاص الیکٹرانی خوردبین درکار ہوتی ہے اور کچھ وائرس تو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اس خوردبین سے بھی نظر نہیں آتے۔ اتنے سے قامت پر بھی یہ ایسی تباہی پھیلاتے ہیں کہ ان کے آگے عالمی جنگوں کی تباہی ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔

یہ مئی ۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ وسطی امریکا کے علاقے نیو میکسیکو میں واقع ایک انڈین ریزرو میں ایک اکیس سالہ ناواجو نسل کی عورت ایک صبح بیدار ہوئی تو اسے بخار اور جسم میں درد محسوس ہوا۔ اس نے خاص توجہ نہیں دی۔ دس روز بعد اسے سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی۔ وہ اسپتال

لائی گئی اور محض چند گھنٹوں میں ہلاک ہوگئی۔ پوسٹ مارٹم سے یہ بات سامنے آئی کہ اس کے پھیپڑوں میں مائع بھرگیا تھا جو اس کی موت کی وجہ بنا۔ اس کی موت معمے سے کم نہیں تھی۔ وہ صحت مند عورت تھی۔ وہ سینتانی نیو میکسیکو میں انڈین اسکول میں ٹریک ٹیم کی رکن تھی۔ پانچ دن بعد اس کا انیس سالہ منگیتر جو قومی سطح پر معروف طویل فاصلے کی دوڑ کا کھلاڑی تھا' اسی طرح بیمار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چل بسا۔ اس کے کچھ دنوں بعد عورت کا بھائی اور اس کی بیوی بھی اس بیماری میں مبتلا ہوئے اور ہفتوں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے تھے۔

اس پراسرار وبا نے جلد ہی دوسرے افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سب سے پہلے نیو میکسیکو میں ڈاکٹر بروس ٹیمس سٹ کے کلینک میں اس قسم کا ایک مریض آیا تھا۔ مرض سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر بروس نے پہلے اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے بات کی اور پھر علاقائی حکام کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ جلد ہی ایک اور کیس سامنے آیا جس میں مریض قریب المرگ تھا۔ جلد وبا نے انڈین ہیلتھ سروس کے ایپس ڈیمولوجسٹ ڈاکٹر جیمس چیک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ چیرو کی نسل کا ڈاکٹر حال ہی میں دو سال اٹلانٹا کے سینٹر فار ڈیزیز اینڈ پریوینشن میں گزار کر آیا تھا۔

کیونکہ اموات میں پھیپڑے ملوث تھے۔ اس لیے ڈاکٹروں کو شک ہوا کہ مریضوں کو کسی طریقے سے زہر دیا گیا ہے یا انہوں نے خود استعمال کرلیا ہے۔ کیونکہ بایوپس میں پھیپڑوں میں فوس جین اور فوس فائن نامی کیمیکل پائے گئے تھے۔ جو خون کے جمنے کی صلاحیت ختم کردیتے ہیں اور آدمی شدید قسم کے جریان خون سے ہلاک ہوجاتا ہے۔ یہ مہلک زہر مختصر مدت میں ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ دنیا بھر میں فوس جین صرف امریکا میں صنعتی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا چیک نے پہلے مرنے والے افراد کے گھروں کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اسے وہاں کسی قسم کے زہر کے کوئی آثار نہیں ملے۔ البتہ ڈاکٹر چیک کو بعض مقامات پر چوہوں کی مینگنیاں ضرور نظر آئی تھیں۔ لیکن ان سے امراض کا کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔

اس وبا کی رپورٹ کچھ دنوں بعد میرے دفتر کی میز پر موجود تھی۔ اس میں وضاحت کی گئی تھی کہ پہلے بخار ہوتا تھا اور مریض میں ملاجے اور ملائیے نامی بیماریوں کی علامات پائی جاتی تھیں۔ ملاجے پٹھوں کی بیماری ہے اور ملائیے کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ طبیعت خرابی کی علامت ہے۔ مگر مجھے اس میں شک تھا۔ کیونکہ یہ انڈین باشندے صرف اس صورت میں ڈاکٹر سے رجوع کرتے تھے۔ جب ان کا مرض حد سے زیادہ بڑھ جاتا تھا۔

مرنے والوں کے پھیپڑے بے حد بری حالت میں پائے گئے تھے اور ان میں ان کے وزن سے زیادہ خونی پلازمہ بھرا ہوا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ خون پھٹ رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں پھیپڑوں کے آکسیجن جذب کرنے والے ٹشوز ناکارہ ہوگئے۔ مریض کے لیے سانس لینا ناممکن ہوگیا تھا اور بالآخر وہ دم گھٹ کرہلاک ہوگیا۔ اس وبا کی خبر پھیلتے ہی انڈین باشندے خوف زدہ نظر آنے لگے۔ اپنے بچوں کے لیے' اپنے والدین کے لیے' اپنے دوست احباب کے لیے اور خود اپنے لیے۔ علاقے کے لوگوں کو خبردار کیا جارہا تھا سردرد' بخار اور جسم میں درد کی صورت میں فوراً اسپتالوں سے رجوع کریں۔ گالپ انڈین میڈیکل سینٹر بے حد سرگرم تھا۔

○☆○

یہ پہلی پُراسرار موت کے چند ہفتے بعد کی بات ہے۔ میری نیشنل فار انفیکشن ڈیزیز کے انیس چوٹی کے ماہرین کے ساتھ میٹنگ ہوئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں تیزی سے حرکت میں آنا چاہیے۔ لوگوں کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ تشویش ناک بات یہ تھی کہ مرنے والے تمام ہی افراد بے حد نوجوان اور صحت مند تھے اور ان میں اکثریت امریکا کے آبائی باشندوں کی تھی۔ سفید فام اس وبا کا بہت کم شکار ہوئے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ وبا کے علاقے میں بہت کم سفید فام آباد تھے۔ وبا کا زور بھی دیہی علاقوں میں تھا اور ان سب کی موت پھیپڑوں میں مائع بھرجانے سے واقع ہوئی تھی۔ کیا اس کی کوئی اور وجہ بھی تھی؟

اب سے پہلے بھی انڈین ریزرو میں اس قسم کا فلو پھیلتا رہا تھا اور میڈیا نے اسے ناواجو فلو کا نام دیا تھا۔ اگرچہ فلو میں دوسری اقوام بھی مبتلا ہوئی تھیں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ یہ فلو صرف انڈین علاقوں میں ہی کیوں پھیلتا تھا۔ بہرحال پریس کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام افراد انڈین ریزرو جانے ہچکچانے لگے۔ لاس اینجلس کے ایک اسکول نے ایک طلبا کا نیو میکسیکو کا تفریحی دورہ ملتوی کردیا۔ جن میں ستائیس ناواجو طلباء بھی شامل تھے۔ مجھے یہ تشہیر پسند نہیں آئی کیونکہ وبا میں انڈینز کا کوئی قصور نہیں تھا۔

مارے جانے والے تمام ہی افراد دیہات کے رہائشی تھے۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ یہ بیماری کسی جانور سے ان میں

منتقل ہوئی ہے۔ ابھی تک ایسی کوئی شہادت سامنے نہیں آئی تھی کہ بیماری انسان سے انسان کو لگی ہو۔ مجھے خاص طور سے پھیپڑوں میں مائع بھر جانے والی بات پریشان کر رہی تھی۔ ایسا عام طور سے وائرس کے شکار افراد کے ساتھ ہوتا تھا۔ مگر فلو کے یہ وائرس عام طور پر بوڑھے افراد، بچوں یا ان لوگوں پر حملہ کرتے ہیں جن کی قوت مدافعت کمزور ہو۔ جبکہ وبا صرف بہت صحت مند اور جوان افراد کو اپنا نشانہ بنا رہی تھی۔ میرا ذاتی خیال یہی تھا کہ موت کی وجہ زہر ہے اور اگر کوئی وائرس اس میں ملوث تھا بھی تو وہ صرف ایرینا وائرس ہی ہو سکتا تھا۔ یہ وائرس دیہاتی علاقوں میں عام تھا اور جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہوتا تھا۔

لیکن بیماری کی علامات ایرینا وائرس کی علامات سے مختلف تھیں۔ مرنے والوں کے خون میں سفید خلیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی اور صرف ایک وائرس ہے جس کی موجودگی میں انسانی دفاعی نظام کے ذمے دار ان خلیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ہنٹا وائرس۔ مگر ہنٹا وائرس صرف افریقہ اور ایشیا میں ملتا ہے اور اس نے کبھی امریکا میں حملہ نہیں کیا تھا۔ دوسرے ہنٹا ہمیشہ گردوں پر حملہ کرتا ہے۔ پھیپڑوں پر نہیں۔ اس صورت حال میں یوں لگ رہا تھا کہ ہم کسی نئی بیماری سے دوچار ہونے والے ہیں۔

وبا بتدریج پھیل رہی تھی اور اس نے تقریباً پوری انڈین ریزرو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے ایک تفتیشی ٹیم تشکیل دی۔ جو سب سے پہلے البوکورکو کے علاقے میں پہنچی۔ ٹیم نے وہاں مصروف ڈاکٹروں اور محکمہ صحت کے افسران کے ساتھ مل کر بچ جانے والے مریضوں اور ان کے اہل خانہ سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ ساتھ ہی تمام مریضوں کا طبی ریکارڈ حاصل کیا۔ ٹیم کا اصل کام مریضوں کا علاج کرنا نہیں بلکہ بیماری کے اسباب کا پتا چلانا تھا۔ یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ بیماری کے ذریعے کا پتا چلایا جائے۔ اس سلسلے میں یہ عجیب حقیقت سامنے آئی کہ انڈین ریزرو میں ہر تیس بتیس سال بعد ایسی ہی وبا پھوٹتی تھی اور بہت ساری جانوں کا نذرانہ لے کر لوٹ جاتی تھی۔ اس سے بھی عجیب بات تھی کہ قدیم ناواجو تاریخ میں ایک وبا کا ذکر ملتا ہے جو صدی میں چار بار آتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مسئلے کو ناواجو رسم و رواج کی روشنی میں ہی حل کیا جا سکتا تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ پڑھے لکھے ناواجو بھی جدید طریقہ علاج کے قائل نہیں تھے اور وہ پوسٹ مارٹم کے سخت خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے مرنے والے کی روح کو بہت زیادہ تکلیف ہوتی تھی اور یہ چیرپھاڑ خدا کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔ خوش قسمتی سے انڈین نیشنل ہیلتھ سروس اور ناواجو نیشنل کونسل ہماری حمایت کر رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں تفتیش کے لیے ایک گُر کی بات بتائی کہ ہم سچ مچ پچھ جاننا چاہتے ہیں تو اپنے منہ بند اور کان کھلے رکھیں۔ ہم سوال کر کے وہ پچھ نہیں معلوم کر سکیں گے جو سن کر معلوم کر لیں گے۔

انگریز کو ہم پر کئی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ وہ فطرت کے شیدائی تھے اور پھر ہزاروں سال سے اس علاقے میں آباد تھے۔ وہ حقائق کو قصے کہانیوں اور حکایات میں سمو دیتے تھے۔ اگر ہماری تفتیشی ٹیم صبر و تحمل سے ان کی بات سنتی تو کوئی نہ کوئی کارآمد بات معلوم ہو سکتی تھی۔ مجھ تک ٹیم کی جو پہلی رپورٹ پہنچی اس میں غیر متوقع طور پر پائن کی ایک قسم کا ذکر تھا۔ یہ دیو قامت درخت صدیوں زندہ رہتا ہے اور پھل دیتا ہے صدی میں کم از کم تین مواقع ایسے آتے ہیں جب پائن کی یہ قسم غیر معمولی مقدار میں پھل دیتی ہے اور زمین ان کے پھلوں سے چھپ جاتی ہے اور ان سالوں میں جب پھل بہت زیادہ ہوتا ہے تو خاص نسل کے جنگلی چوہے بہت زیادہ تعداد میں اسے کھانے آتے ہیں۔ یہ چوہے عام سالوں میں نظر نہیں آتے۔ غالباً جب زیادہ کھانے کو نہیں ملتا تو ان کی نسل بھی کم ہو جاتی ہے جو رفتہ رفتہ بڑھتی ہے حتیٰ کہ زیادہ پھل والا سال آ جاتا ہے۔ معمہ حل ہونا شروع ہو چکا تھا۔

جب تفتیشی ٹیم معلومات جمع کر رہی تھی تو میں فورٹ ڈیٹرک میں آپریشن کے دوسرے حصے کی نگرانی کر رہا تھا۔ ہمارے پاس ہلاک ہونے والے مریضوں کے خون اور بافتوں کے ہزاروں نمونے جمع ہو گئے تھے اور ہم نے ان کے تجزیے کا کام شروع کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہم بیماری کے ذریعے تک جا پہنچیں گے۔ اس کے لیے ہمیں وبا کا ذمے دار وائرس تلاش کرنا تھا۔ لیب میں عملہ چوبیں گھنٹے مصروف تھا اور بیک وقت کئی درجن افراد نمونوں کا تجزیہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ نمونوں کو ہر نظریئے سے دیکھیں۔ وائرس بیکٹریا اور زہر۔

۳ جون کی رات میں اپنے ٹیکنیشن کے ساتھ مصروف تھا۔ ہمارے پاس بلا مبالغہ ہزاروں طرح کے فلو وائرس تھے۔ ان سب سے موازنہ کرنے میں ہمیں شاید سال لگ جاتا۔ لہٰذا ہم مفروضے کی بنیاد پر صرف چند ایک وائرسوں پر کام کر رہے تھے۔ میں نے ایک ٹیکنیشن سے پوچھا کہ کیا خون میں

اریناوائرس پایا گیا ہے۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

اس پر میں نے دوسرے ممکنہ شک کے بارے میں پوچھا "اور ہنٹاوائرس؟"

اس بار اس کا جواب اثبات میں تھا۔ یہ سنتے ہی میں دوسرے ٹیکنیشن کی طرف لپکا اور اس سے بھی یہی سوال کیا "تم نے ہنٹاوائرس کیا چیک کیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ دوسرا ٹیسٹ چھوڑ کر پہلے ہنٹاوائرس چیک کرے۔

یہ ایک طویل چیک تھا۔ لہٰذا میں گھر چلا گیا۔ اگلی صبح جب میں دفتر پہنچا تو اس ٹیکنیشن کی رپورٹ میز پر تھی۔ نمونے میں ہنٹاوائرس پایا گیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔ ہنٹا بے شک افریقہ اور ایشیا میں عام تھا مگر شمالی امریکا میں اس کا پایا جانا حیرت انگیز امر تھا۔ مجھے طب کا ایک پرانا مقولہ یاد آیا۔ مشترکہ مسائل کا حل بھی مشترکہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آرہی ہے تو آپ کے ذہن میں زیبرے کا تصور نہیں آئے گا۔ لیکن اس معاملے میں مجھے زیبرا نظر آرہا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ امریکیوں کا ہنٹاوائرس سے واسطہ کورین وار کے دوران میں پڑا تھا اور اس کا نتیجہ معمول کی علامات کی صورت میں نکلا تھا۔ یعنی بہت تیز بخار، جسم میں درد، کمزوری اور بالآخر گردے ناکارہ ہوجانا۔ ڈھائی ہزار سے زیادہ امریکی فوجی وائرس کا شکار ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک سو اکیس موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ یہ وبا ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء کے درمیان پھیلی تھی۔ ہنٹا بہت پرانا لیکن خاصا پراسرار وائرس ہے۔ یہ بہت کم مواقع پر وبائی صورت میں حملہ آور ہوا تھا۔ چینی اس بیماری سے دسویں صدی سے واقف تھے۔ ۱۹۱۳ء میں سائبیریا میں اس کا حملہ ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں منچوریا اور سائبیریا میں پھر اس کا حملہ ہوا۔ بالآخر ۱۹۷۳ء میں ایک امریکی اور ایک کورین ماہر نے مشترکہ طور پر تحقیق کرکے اس وائرس کو ڈھونڈ نکالا۔ کیونکہ یہ سب سے پہلے ہنٹا دریا کے پاس دریافت ہوا تھا لہٰذا اسے ہنٹاوائرس کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ وائرسوں کے نام ان جگہوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں جہاں یہ دریافت ہوں)

ٹشوز کے تجزیئے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ امریکا میں کبھی ہنٹاوائرس نے حملہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے پاس اس کے جو نمونے تھے وہ چالیس برس پرانے تھے۔ اس عرصے میں وائرس اور بیکٹیریا کچھ نہ کچھ تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وائرس نے ہزاروں میل کا سمندر عبور کرلیا اور پھر وسطی امریکا میں نمودار ہوا تھا۔ میرے ساتھیوں کا ردعمل متوقع تھا۔ ہنٹا ہمیشہ گردوں کا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اس نے کبھی پھیپڑوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ ہی ہنٹاوائرس امریکا میں نظر آیا ہے۔

بہرحال وبا میں ہنٹاوائرس کی موجودگی کے واضح آثار ملے تھے۔ ہمیں اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا تھا کیونکہ متعدد افراد پہلے ہی مرچکے تھے اور ابھی وبا کے ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ہمارے وائرولوجسٹ وائرس کے جینی کوڈ کو پڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس طرح وائرس کی حتمی شناخت ممکن ہوجاتی۔ بالکل اسی طرح جیسے فنگر پرنٹس کی مدد سے ایک شخص کی یقینی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم تحقیق کے لیے بہت جدید اور درست ترین آلات استعمال کرتے ہیں لیکن کامیابی کے لیے ہمارا انحصار ابھی بھی تھوڑی سی قسمت اور ڈھیر ساری صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ہمارا چیف آف مولیکیولر وائرولوجسٹ اسٹیورٹ نکول سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ اس کا شمار دنیا کے چند ممتاز ترین وائرولوجسٹ میں ہوتا ہے۔ جب وہ وائرس کو چیک کررہا تھا تو ہم بے چینی سے نتیجے کے منتظر تھے۔ اگر وہ تصدیق کردیتا کہ وبا کا سبب ہنٹاوائرس ہی تھا تو ہمیں ایک نئی قسم کا ہنٹاوائرس ملتا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اگرچہ میرے خیال میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ہم نے اس بیماری کو ہنٹاوائرس پلمونری سینڈروم یا ایچ پی ایس کا نام دیا تھا۔ جیسے ہی ہمیں اس کی حتمی شناخت مل جاتی تو ہمیں یہ معلوم ہوجاتا کہ وائرس کس ذریعے سے انسان تک پہنچتا ہے۔ ہوا کے ذریعے یا جانوروں کے فضلات کے ذریعے۔ پھر یہ خوراک یا پانی کے ساتھ انسانی جسم میں داخل ہوجاتا۔ ایک دفعہ صورت حال واضح ہوجاتی تو ہم اس وبا پر قابو پاسکتے تھے۔ نکول بہت زیادہ احتیاط سے ٹیسٹ کررہا تھا کیونکہ اگر یہ ہنٹاوائرس نہ نکلتا تو اس سے ہمارا نظریہ غلط ثابت ہوجاتا اور سی ڈی سی کی ساکھ کو نقصان ہوتا۔ آخر کار ٹیسٹ کا نتیجہ ماہرین کے ایک پینل کے سامنے پیش کیا گیا اور انہوں نے متفقہ فیصلہ دیا۔

"یہ ہنٹاوائرس ہی کی ایک قسم ہے۔"

ہم نے اس دریافت کو دنیا کے سامنے پیش کیا تو سائنس کی دنیا میں ہلچل مچ گئی تھی۔ یہ بات کتنی حیرت انگیز تھی کہ ایک ہی وائرس ہزاروں سال سے دنیا کے دو الگ الگ خطوں میں سرگرم عمل تھا۔ جن کا آپس میں بظاہر کوئی تعلق

نہیں تھا۔ نہ جانے اس وائرس کا اصل وطن کون سا تھا اور یہ پہلے کہاں پایا گیا تھا۔

شناخت کے بعد اگلا مرحلہ علاج کا تھا۔ وائرس، بیکٹریا سے قطعی مختلف چیز ہے۔ اس پر اینٹی باڈیز بہت کم اثر کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کے خاتمے کے لیے اینٹی وائرل ادویات بنانی پڑتی ہیں۔ ان ہی دنوں ہم نے ایک نئی اینٹی وائرل دوا 'ریباوائرن' تیار کی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ نئی قسم کا یہ ہنٹا وائرس' پائن کے پھل کھانے والے جنگلی چوہوں کے پیشاب میں پایا جاتا ہے اور یہ چوہے جب بھی آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ وبا پھیل جاتی ہے۔ ہم چوہوں کو مار کر اس وبا پر قابو پا سکتے تھے۔ سی ڈی سی کے پیسٹ کنٹرول کے ماہرین نے اپنے آلات اور چوہے مار ادویات کے ساتھ ان علاقوں کا رخ کیا جہاں وبا کا زور تھا۔ چوہے مار مہم کے متوازی ہم نے وبا سے متاثرہ مریضوں پر "ریباوائرن" کا تجربہ شروع کر دیا۔ جس کے نتائج حوصلہ افزا نکلے۔ مریض تیزی سے صحت یاب ہونے لگے اور شرح اموات بھی بہت کم رہ گئی تھی۔

ناواجو روایات درست تھیں۔ بخار کی وبا ہمیشہ پائن کے پھلوں کی غیر معمولی پیداوار کے ساتھ پھیلی تھی۔ مجھے امید تھی کہ جب اگلی بار یہ وبا پھیلے گی تو ہم اس کی ویکسین تیار کر چکے ہوں گے۔ چوہے مار مہم کے ساتھ ہم نے عوام کو آگاہ کرنے کے لیے تشہیر کی ایک بھرپور مہم بھی چلائی تھی۔ اس مہم میں ٹی وی اور ریڈیو کے علاوہ پمفلٹ، پوسٹر اور دیگر چیزیں بھی استعمال کی گئی تھیں۔ جن میں بتایا کہ اس وبا سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا کہ اگر کسی کو بیماری کی علامات محسوس ہوں تو وہ بلا تاخیر طبی مراکز پہنچے کیونکہ تاخیر سے علاج ممکن نہیں رہتا۔

نومبر ۱۹۹۳ء میں ایک میٹنگ میں ہم نے اسے خود کار وائرس کا نام دیا۔ کیونکہ جس علاقے میں یہ وائرس دریافت ہوا تھا۔ وہاں پر امریکا کی چار ریاستوں کی سرحدیں ملتی تھیں مگر ناواجو اس کے مخالف تھے کیونکہ زیادہ تر یہ علاقہ کسی ریاست میں نہیں بلکہ ایک انڈین ریزرو میں شامل تھا۔ اس پر سی ڈی سی کی طرف سے ہیلتھ ڈائریکٹر آف ناواجو نیشن کی خدمت میں متبادل نام بھجوائے گئے۔ اس نے اس خط کا جواب نہیں دیا تو میں خود اس کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اس سے کہا۔

"دیکھیے میڈم، مجھے وائرس کو رجسٹرڈ کرانا ہے اور اس کے لیے اس کا نام ہونا ضروری ہے۔ موئیر گو کینن وائرس کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

یہ اس گلی کا نام تھا۔ جہاں پہلی عورت وائرس کا شکار ہوئی تھی۔ ڈائریکٹر نے مجھ سے کہا کہ وہ اس نام کو ناواجو نیشن کونسل کے پاس منظوری کے لیے بھیجے گی۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں یہ نام منظور ہوا ہی تھا کہ نیشنل پارک سروس نے اس پر اعتراض کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایری زونا میں موت کی وادی کے پاس پہلے ہی ایک مقام کینن ڈیل موئیر گو کے نام سے موجود تھا۔ انہیں اعتراض تھا کہ ایک قاتل وائرس کا یہ نام رکھنے سے ان کی سیاحت متاثر ہو گی۔ اس طرح ناواجو کمیٹی نے بھی اسے پسند نہیں کیا کیونکہ اس نام کا علاقہ ان کے ریزرو میں شامل تھا۔ آخر کار ہم نے ایک ایسا نام ڈھونڈ نکالا جس پر سب متفق تھے اور ناواجو نیشن کونسل نے بھی فوراً اس کی منظوری دے دی۔ ہم نے وائرس کو "سن نومبرے .... وائرس" کا نام دیا تھا۔ یہ ناواجو زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "بے نام" کے ہیں۔ یعنی یہ وائرس بے نام قاتل ہے۔

مجھے معلوم ہے ہماری کامیابی حتمی نہیں ہے بلکہ جلد ہمیں کسی اور ننھے قاتل سے واسطہ پڑے گا۔ انسانی صحت کے مفاد میں ہماری یہ جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔

○☆○

حرفِ آخر۔۔۔ قارئین بظاہر آپ کے نزدیک مندرجہ بالا واقعات محض ایک کہانی ہوں لیکن اس قسم کے ننھے منے قاتل ہمارے ملک میں بھی سرگرم ہیں۔ بلکہ حفظانِ صحت کے شعور کی کمی اور ناقص طبی سہولتوں کی بنا پر کچھ زیادہ ہی پھل پھول رہے ہوتے ہیں۔ آپ آئے دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ مختلف علاقوں میں کالرا، یرقان اور خسرہ جیسی مہلک وبائیں پھوٹتی رہتی ہیں۔

مگر اس سے بھی بڑھ کر خوف ناک بات یہ ہے کہ اب پاک سرزمین پر ایسی وبائیں نازل ہو رہی ہیں جو اس سے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھی گئیں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں تواتر سے ایسی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں جن کے مطابق چاغی کے تاریخی علاقے میں ایبولا وائرس پایا گیا۔ اس وائرس کی ہلاکت خیزی اوپر تحریر کی جا چکی ہے۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد سے چاغی کے پہاڑ بین الاقوامی طور پر بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ کیا یہ بات معنی خیز نہیں ہے کہ امریکا نے افغانستان پر جو کروز میزائل داغے تھے ان میں سے کچھ چاغی میں جا گرے تھے اور اس کے بعد سے وہاں ایبولا وائرس کی موجودگی ثابت ہوتی آئی ہے۔ حکومتی محکمہ صحت کے ذرائع نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ اس سلسلے میں پریس خاصا سرگرم رہا لیکن اچانک ہی یہ معاملہ جیسے پس منظر میں چلا گیا۔ عوام کو یہ نہیں بتایا گیا کہ حکومت نے وائرس پر قابو پانے کے لیے کیا اقدامات اٹھائے اور کیا اب خطرہ ٹل گیا ہے یا نہیں؟

♠♠♠